انجمن طیلسانین عثمانیہ حیدرآباد دکن

کا

سہ ماہی ترجمان

مجلہ طیلسانین

مجلس ادارت

مقاصد

(۱) علمی ادبی مضامین معیاری نظمیں۔ اور جامعۂ عثمانیہ کے ایم۔ اے۔ اور ایم۔ ایس۔ سی کی ڈگریوں کیلئے پیش شدہ تحقیقاتی مقالات یا ان کا خلاصہ

(۲) اردو معلومات پر تنقید و تبصرہ شائع کرنا۔

(۳) انجمن طیلسانیین عثمانیہ کی مختلف سرگرمیوں کی روئداد کی اشاعت

(۴) مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ اور دل آزار تنقیدیں کسی صورت میں قابلِ اشاعت متصور نہ ہوں گی۔

قواعد

(۱) یہ رسالہ بہمن اردی بہشت امرداد اور آبان مطابق جنوری اپریل جولائی اور اکٹوبر میں شائع ہوگا۔

(۲) رسالہ کی ضخامت کم از کم ۱۰۰ صفحے ہوگی۔

(۳) جواب طلب امور کے لیے جوابی کارڈ یا ٹکٹ کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

چندہ

خریداران حیدرآباد سے عہ سالانہ — فی پرچہ ۸ر
خریداران بیرون حیدرآباد سے عہ ۱۲ر سالانہ معہ محصول ڈاک — فی پرچہ ۱۲ر

نرخ اشتہارات

مقدار — سال بھر — فی اشاعت
پورا صفحہ: سرورق عہ؍ اندرونی عہ — عہ / عہ ۸ر
آدھا صفحہ: سرورق عہ؍ اندرونی ۱۲ر — ۲ عہ ر

انجمن طیلسانیین عثمانیہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی صحیفہ

مجلۂ طیلسانیین عثمانیہ

جلد ششم بابتہ ۱۳۵۱ف م ۱۹۴۲ء شمارہ اول

فہرست

مرتبہ ۔ عبدالقادر صاحب سروری

(مطبوعہ مطبع نظام دکن بازار عیسیٰ میاں)

اداریہ

یکم امرداد ۱۳۵۶ف کا یوم مسعود حیدرآباد کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ اس روز حضرت سلطان العلوم نے "سلطان الشعرا" کے لقب کو قبولیت کا اعزاز بخشا۔ اس تقریب کیلئے ٹاؤن ہال باغ عامہ میں جلسہ منعقد ہوا تھا جس میں حضرت اقدس و اعلیٰ نے بہ نفس نفیس شرکت فرمائی۔ استاد فن حضرت فصاحت جنگ جلیل نے بارگاہ خسروی میں اڈریس پیش کرنے کی عزت حاصل فرمائی جس کا برمحل جواب نطق ہمایونی سے ارشاد فرمایا گیا۔ جلسہ کے بعد باغ عامہ کے چمن میں کمیٹی کی طرف سے عصرانہ بھی ترتیب دیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک یادگار مشاعرہ بھی حضرت شہزادہ والاشان نواب معظم جاہ بہادر شجیع کی ممتاز صدارت میں منعقد ہوا جس میں ملک کے ممتاز شعراء نے حصہ لیا۔

ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی ام۔اے (عثمانیہ) بی آ آنرز (کیمرج)، پی ایچ ڈی (ہائیڈل برگ)، ڈی ایس سی اعزازی (عثمانیہ) پروفیسر ریاضیات جامعہ عثمانیہ کو جامعہ کی طرف سے اعزازی طیلسان ڈی ایس سی عطا ہونے کی مسرت میں گذشتہ ماہ خورداد میں انجمن طیلسانیین عثمانیہ اور انجمن طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ نے ایک شاندار عشائیہ راجہ پرتاب گیرجی کی کوٹھی میں ترتیب دیا تھا جس میں بلدہ کے اکثر طیلسانی طلبائے قدیم اور عہدہ داران حکومت مدعو تھے۔ ہمارے ممتاز طیلسانی کے اعزاز پر ساری عثمانی برادری کی مسرت اظہار کے لئے یہ ایک عمدہ موقع فراہم کیا گیا تھا جس کا اہتمام اور انصرام نہایت سلیقہ سے ہوا۔ ہندوستان کے بہت کم علما ہونگے جن کی قابلیتیں ڈاکٹر صدیقی کی سی کم عمری میں ایسے نمایاں علمی امتیازات کی مستحق تسلیم کی گئی ہوں۔ ہم اس اعزاز کو ڈاکٹر صاحب کے آنے والے بہت سے شاندار اعزازوں کا پیش خیمہ سمجھتے ہیں۔

پچھلے ماہ خورداد میں بمقام ناگپور یوم اقبال کی شاندار تقریب منائی گئی تھی جس کی صدارت کیلئے مشہور ادیب طیلسانی ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ کو مدعو کیا گیا تھا یہ جلسہ او مشاعرہ ناگپور کا غیر معمولی طور پر کامیاب اجتماع رہا۔ حالانکہ ان میں داخلہ کے لئے ٹکٹ مقرر تھا، جس کی آمدنی اشاعت اردو کے لئے صرف ہوگی۔

تلسی داس کی چوپائیاں

ہندی زبان کے شہنشاہ سخن تلسی داس جی سنہ ۱۵۳۲ء میں پیدا ہوئے۔ شہنشاہ جہانگیر کے عہد تک میں بقید حیات تھے۔ ذات کے برہمن تھے لیکن بنی نوع انسان کو اعضائے یکدیگر سمجھتے تھے۔ خود بھی پاک زندگی بسر کی اور عوام الناس کو بھی اعلیٰ اخلاق کا درس دیا۔ یہ فطرتاً ایک دردمند دل لے کر پیدا ہوئے تھے۔ انکی زندگی کا رُخ اس وقت بدلتا ہے جبکہ ایک مرتبہ انکی چہیتی بیوی رتناولی انہیں سخت تاکید اور تادیب کرتی ہے کہ وہ بجائے اسکے کہ کسی غیر سے دل لگائیں رامچندر جی کی محبت میں غرق ہو جائیں۔ محبوب بیوی کی اس نصیحت نے ان پر تازیانے کا کام کیا اور یہ اسی وقت مختلف تیرتھ گاہوں کو نکل پڑے۔ بالآخر ایودھیا (جو اس وقت رامچندر جی کا دارالسلطنت تھا اور اس وقت موجودہ فیض آباد کے قریب واقع ہے) اس میں مستقل سکونت اختیار کی۔ کہا جاتا ہے کہ اسی دوران میں رامچندر جی تلسی داس جی کے خواب میں آئے اور حکم دیا کہ وہ راماین کو عام فہم زبان میں لکھیں۔ غرض اس تائید غیبی ہی کی بنا پر انہوں نے سنہ ۱۵۷۲ء میں اسے لکھنا شروع کیا۔

یوں تو تلسی داس بڑے پُرگو تھے۔ انکی کئی تصنیفیں اب بھی دستیاب ہوتی ہیں لیکن انکی رامائن انکا شاہکار ہے۔ اسکے سات کھانڈ یعنے حصے ہیں یعنے بال کھانڈ، ایودھیا کھانڈ، آرنیا کھانڈ، کشکندھا کھانڈ، سندر کھانڈ، لنکا کھانڈ، اُتار کھانڈ ہیں جس میں رامچندر جی کے بچپن سے لیکر بڑھاپے تک کے حالات نہایت عمدگی اور سلیقے سے بیان کئے گئے ہیں۔ راماین چوپائی بحر میں لکھی گئی ہے جسکے حسن قبول کا سہرا انہیں کے سر ہے۔ چونکہ راماین میں بھی تلسی داس کی شاعرانہ لطافتوں کا معراج کمال ایودھیا کھانڈ ہی سمجھا جاتا ہے اس لئے اس مضمون میں یہی کھانڈ ہمارے پیش نظر رہے گا۔

راماین کا مقصد اور اس کا پس منظر

راماین کو تصنیف کرنے میں تلسی داس کا بڑا مقصد یہ تھا کہ رامچندر جی کی پرستش کو مقبول خاص و عام کر دیا جائے۔ انکے اعلیٰ اخلاق اور بلند کردار کو کچھ اسطرح پیش کیا جائے کہ انکی محبت کا سکہ لوگوں کے

[illegible] اس خوش قسمت ہیں کہ ان کے لئے انہیں والمیکی کی سنسکرت رامائن ہاتھ آگئی اور یہی [illegible]
[illegible] ثابت ہوئی [illegible] کی بنا پر اسے عام طور پر سنسکرت کا آزاد ترجمہ کہا جاتا ہے لیکن
[illegible] تو روایات نیم تاریخی اور افسانوی بیانات پر مبنی ہے مگر ط[illegible]
[illegible] کو دور کا تعلق بھی نہیں ہے۔

[illegible] اضافات [illegible] بہت بڑے ہیں۔ والمیکی نے رامچندر جی کو بحیثیت ایک انسان کے پیش کیا ہے لیکن تلسی [illegible] اوتار کے روپ میں جلوہ گر کیا ہے۔ یوں تو تلسی داس وحدت الوجود کے [illegible] تھے اور فلسفہ ویدانت کو عام مقبولیت بخشی مگر خدا کا تصور بغیر جسمانی صفات کے ان کے لئے ناممکن تھا اسلئے انہوں نے رامچندر جی کو خدا کا مظہر بتایا ہے۔

ساری رامائن میں جا بجا اسی تلقین کی ہے چنانچہ ایودھیا کھانڈ کا آغاز ہی اسطرح کیا ہے۔

شری گرو۔ چرن۔ سروج۔ رج۔ نج۔ من۔ مکر سدھاری
برنوں رگھوبر۔ بمل۔ جسو جو دایک پھل چاری

(شری گرو کے کنول کی مانند قدموں کے گرد سے اپنے دل کے آئینہ کو صاف کر کے رامچندر جی کی پاک شہرت کا بیان کرتا ہوں جو چار پھلوں کے عطا کرنے والے ہیں چار پھلوں سے مراد دھرم یعنے فرض ارتھ یعنے دولت کام یعنے خواہشات موکش یعنے نجات)

اسکے ماسوا انہوں نے اصل قصے میں جا بجا مناجاتیں بھی لکھی ہیں جن میں رامچندر جی سے التجا کی گئی ہے کہ وہ ان کے دکھ دور کر کے دل کو سکون بخشیں۔ غرض تلسی داس نے اپنے اس عقیدے اور ایقان کو کچھ اس والہانہ انداز، سوز و گداز اور دلی جوش کے ساتھ بیان کیا کہ راما نوجا کی بھکتی تحریک کی اشاعت میں اس نے زبردست مدد دی۔ اسطرح والمیکی اور تلسی داس کے مقاصد میں زمین و آسمان کا فرق پیدا ہو گیا۔ والمیکی نے تو دیو بانی زبان سنسکرت میں صرف رامچندر جی کی سوانح حیات لکھ دی مگر تلسی داس نے نہ صرف رامچندر جی کی پاک زندگی کے واقعات عوام الناس کی زبان میں قلمبند کر کے مقبول خلائق بنایا بلکہ انکو نیک نامی اور شہرت کا تاج پہنایا۔ اور انہیں غیر فانی بنا کے چھوڑا۔ سب کو رام نام کی رٹ لگا دی اور رام بھگتوں کا بول بالا کیا۔

رامائن کی زبان اور اسکی خوبیاں

زبان کا انتخاب رامائن کو شہرت دوام عطا کرنے والی سب سے بڑی چیز اس کی عام فہم زبان ہے — یہ قدیم بیسواڑی یا اودھی زبان میں لکھی گئی ہے جو مشرقی ہندی کی ایک شاخ ہے۔ یہاں ہم تلسی داس کے حسن انتخاب اور خوبی قلم کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یہ زبان باوجود اسکے کہ صوبہ بنگال تک ہی محدود ہے مگر رامائن اپنی سلاست اور عام فہمی کے باعث سارے ہندوستان میں پڑھی اور سمجھی جاتی ہے۔

بحر کا انتخاب رامائن میں چار چاند لگانے والی دوسری اہم چیز اس کی بحر ہے۔ چوپائی ایک ایسی بحر ہے جس میں حالات کی روانی اور واقعات کا تسلسل ٹوٹنے نہیں پاتا۔ یا یوں حقیقت سامنے آگئی کہ رامائن کو مختلف ... چوپائی بحر نے اسے آمد بنا دیا ہے۔ اسکی مثال ایک ندی کی سی ہے کہ کہیں یہ بڑے زور شور سے بہتی ہے تو کہیں سمبھالیاں کرتی اچھلتی کودتی چلی جارہی ہے اور کسی جگہ ایک صاف و شفاف حوض کے شفاف پانی کی طرح ساکت ہے کہ یا ... بالعکس بھی دیکھ لو۔ اسی بحر کے باعث قصے کی نوعیت بھی کچھ ایسی ہی ہوگئی ہے کہ کہیں کہیں ایسے ... آجاتے ہیں جو آندھی اور بگولے کی طرح خس و خاشاک کے ساتھ بڑی بڑی پیڑوں کو بھی اڑا لیجاتے ہیں کہیں یہ خوشی کی دیوی اپنا درشن اتنا عام کرتی ہے کہ سب کے دل ناچنے لگتے ہیں اور کہیں کوئی نامرادی ناامیدی اپنی بھیانک صورت دکھا کر سب کو بے حس بنا دیتی ہے۔ قصے کے اس اتار چڑھاؤ کے دکھانے میں شاعر کو اسی چوپائی بحر نے کامیاب کیا۔

کردار نگاری بحر کی موزونیت میں شاعر کی چابکدستی نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ تلسی بہترین نقاش ہیں اور انکے ہاں مصوری کے ایسے نادر اور مکمل نمونے ملتے ہیں جن میں قدرتی رنگ بھی ہیں اور جان بھی۔ انکی کردار نگاری کے متعلق بعض مغربی مستشرقین نے سچ کہا ہے کہ یہ اس صفت میں شیکسپیر کے مساوی ہیں — انہوں نے اپنے کرداروں میں ایسی روح پھونک دی ہے کہ وہ آج تک بھی چلتی پھرتی بولتی چالتی تصویریں معلوم ہوتی ہیں۔ تصویریں بھی ایک طرح کی نہیں، بعض کردار مجسم نیکی ہیں جیسے رامچندر جی اور بعض سراپا بدی جیسے کبٹری مختصر امثالیں ملاحظہ ہوں۔

راجہ دسرت رام کی تعریف میں کہتے ہیں :—

جا سُو سُبھاؤ اری ہی آنو کولا — سو کمی کری ہی ماتو یرتی کولا

بلند بلند سامانہین

(جسکی اچھی خصلت کی تعریف دشمن بھی کرتا ہو وہ کس طرح اپنی ماں کی مخالفت کرسکتا ہے)

کردار کی بلندی ملاحظہ فرمائیے کہ دشمن بھی اپنے دشمن کی نیکیوں کا قایل ہے - جس وقت رانی کیکئی

نے بیحد وسعت سے اپنے قول وقرار کا واقعہ سُنایا تو رامچندر جی کی حالت اور انکا بلند کردار دیکھئے -

من مسکائی بھانو کُل بھانو - رام سہج آنند ندھانو

بولے بچن بگت سب دوشن - میرد و منجل جنو باگ بھوشن

سنو جننی سوئی سوتو بڑبھاگی - جو پیتو ماتو بچن انوراگی

(رگھو خاندان کے آفتاب رام جو فطری طور پر آنند کے خزانے ہیں جی ہی جی میں مسکرائے اور

رام رانیوں کو دور کر کے ایسی میٹھی اور اچھی باتیں کیں جو خود زبان کے لئے زیور کا کام دے سکتی ہیں۔ (کہتے ہیں)

اے میری ماں سنائی وہی بیٹا خوش قسمت ہے جو ماں باپ کا کہا مانے اور ایسا بیٹا جو ماں باپ کو تسلی دے

دنیا میں بڑی مشکل سے ملتا ہے)۔

آگے چل کر اس موقعہ پر رامچندر جی اپنی بُرائی اور دکھ میں اچھائی اور سکھ کا پہلو نکال کر کہتے ہیں -

مُنی گن ملنو وشیش بن سب ہی بھانتی ہت مور

تے ہی منہہ پیتو آئسو بہوری سنمت جننی تور

(بہت مرتاضی کی صحبت خاصکر جنگل میں ایک ایسی نعمت ہے جس میں میرے لئے ہر قسم کی بھلائی

پنہاں ہے - بایں ہمہ باپ کا حکم اور پھر اے ماں تیری خواہش ! -)

جہاں دیوتاؤں جیسے رام کا کردار سنا ؛ ہاں منتھرا بھیلنی کا نقشہ تلسی داس کی زبان سے سُنئے -

دیکھ منتھرا نگرو بناوا - منجل منگل باج بدھاوا

پوچھے سی لوگنہ کاہ اچھاہو - رام تلک سُنی بھا اُردا ہو

کرئی بچار و کُبدھی کُجاتی - ہوئی آکاج کونی بدھی راتی

دیکھی لاگی مدھو کُٹیل کراتی - جمی گنتو تئی لیوں کے ہی بھانتی

بھرت ماتو پہین گئی بلکھانی - کا انمنی ہسی کہ ہنسی رانی

اُترو دے ئی نہ لے ئی اُساسو - ناری چرت کری ڈھاری آنسو

(کیکئی کی نوکرانی منتھرا نے جب یہ دیکھا کہ سارا شہر سج رہا ہے اور ہر طرف خوشی کے شادیانے بج رہے ہیں تو لوگوں نے پوچھا کہ اس مسرت کا آخر سبب ؟ جب اس نے سنا کہ یہ سب کچھ رام کی تخت نشینی کی تیاریاں ہیں تو اسکا سینہ جل اٹھا۔ وہ بے وقوف بدذات عورت سوچنے لگی کہ کس طرح ایک ہی رات کے اندر اندر یہ سب تہس نہس ہو جائے۔ جس طرح شہد کے چھتے کو پاکر ایک بھیلنی اُسے تکتی ہے اسی طرح یہ عورت موقع کو تکنے لگی۔ وہ بلبلاتی ہوئی بھرت کی ماں کے پاس گئی۔ رانی نے مسکرا کر وجہ دریافت کی کہ یہ اَمنی کیسی۔ وہ عورت کوئی جواب ہی نہیں دیتی لمبی لمبی سانسیں بھر رہی ہے عورتوں کی مکاری دکھا رہی ہے اور آنسو گراتی جا رہی ہے)

اسی طرح سیتاجی کے متعلق بیان کرتے ہیں:۔

پلنگ پیٹھ تجی گود ہنڈورا — سیئے نہ دیہہ پگ پوا ونی کٹھورا

(پلنگ کرسی، گود اور جھولے کے سوا سیتا نے سخت زمین پر قدم تک نہیں رکھا۔ یعنی بہت نازک ہے)

سیئے بن بسہتی نات کے ہی بھانتی — چتر لکت کپی دیکھی ڈرائی

(سیتا کس طرح بن میں رہ سکیگی وہ تو تصویر کے بندروں ہی کو دیکھ کر ڈر جاتی ہے)

سلیس اور سادہ بیان تلسی داس گوسائیں تھے انکا انداز بیان زاہدوں کا سا لیکن زبان ایسی خشک نہیں کہ سننے والے بے مزہ ہو جائیں۔ اُنکی نصیحتیں کڑی لیکن ایسی کہ طبع نازک پر بھی گراں نہ ہو۔ انکے منہ سے کوئی ایسا جملہ نہیں نکلتا جو بے جا شان و شکوہ دکھائے۔ وہ چھوٹے چھوٹے اور معمولی جملے ہی کہہ جاتے ہیں مگر انکی سادگی ہی اپنی پُر کاری دکھاتی ہے یہی وجہ ہے کہ انکے سارے کلام میں سوز و گداز پایا جاتا ہے۔ وہ اپنی زبان کے نشتر سے پڑھنے والے کے دل پر ایسے گھاؤ لگاتے ہیں کہ زخم خوردہ اُسے اپنے زخموں کا مرہم سمجھنے لگتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے رامچندر جی کی ماتا کہتی ہیں:۔

پتیو بن دیو ماتو بن دیوی = کھگ مرگ چرن سرورہ سو وی

آنتہو اُچت نرپہی بن باسو = بئے بلوکی ہیے ہوئی ہراسو

بڑ بھاگی بنو اودھ ابھاگی = جو رگھو ہنہ تلک تمہہ تیاگی

اے رام! بن کے دیوتا تمھارے والد ہونگے اور بن کی دیویاں تمہاری والدہ ہونگیں پرند اور چرند تمہارے کنول نما پاؤوں کے خادم ہونگے۔ بہرحال بڑے راجہ کو بن باس ہونا ہی مناسب ہے۔ اگرچہ کہ تمہاری عمر کو دیکھکر

جاعلیسانیین
جی یہ اس ہوتا ہے۔ جنکل خوش قسمت ہے اور وہ بد قسمت کہ تم جو رگھو خاندان کے تلک ہو تمہیں نے تیاگ دیا)
اور سنئیے!

بیاکل راؤ سیتھل سب کاتا ۔ کری نی کل تیر ومن ہوں نیاتا
کنٹھ سوکھ کھ آؤ نہ بانی ۔ جنو پاٹھی نی وینو بنو پانی
پنی کہ کٹو کھٹو کیکئی ۔ من ہوں گھاٹ منہیا ہرو دسائی

(راجہ دسرت) بے چین ہو گئے انکا سارا جسم ڈھیلا پڑ گیا گویا شجر بہ لی کو ہتھی نے گرا دیا۔ حلق سوکھ گیا،
منہ تک بات کا آنا بھی ناممکن ہو گیا گویا پانی بے آب ہو گئے۔ پھر سخت دل کیکئی نے کڑی بات کہ کر گویا زخم پر زہر لگایا)
اسی طرح اور بہت سی جگہوں پر تلسی داس نے راجہ دسرت کی بے چینی و اضطراب رامچندر جی کی قربانی بروانی
قربانی اور تیاگ، سیتا جی کی شوہر پرستی اور لکشمن جی کا ایثار نفس وغیرہ کو نہایت خوش اسلوبی اور اس سادہ
پن سے کہ جس پر ہزار بانکپن نثار ہو جائیں، ادا کیا ہے۔ گرو امہی تلسی داس نے کچھ اس فطری رنگ میں پیش کئے
ہیں کہ اچھوں کے ساتھ دل کی پوری ہمدردیاں پیدا ہوتی ہیں اور بروں سے سخت نفرت۔ بالکل ایسے ہی جیسے کسی
زندہ انسان سے ملاقات ہونے کے بعد ہو جایا کرتی ہے۔ آرٹ کا کمال اسی چیز پر مبنی ہے۔

سادگی ادا چونکہ تلسی داس حسن قدرتی کے دلدادہ و فریفتہ تھے اسلئے انکے کلام میں بناوٹ اور تصنع کو
دخل نہیں ہے۔ وہ بلا وجہ ایہام، ذو معنی اور دیگر زاید از ضرورت صنعتیں استعمال نہیں کرتے تھے۔ تاہم تشبیہ
اور استعارہ جو شاعری کی جان ہے کچھ اس گھلاوٹ کے ساتھ شعر میں داخل کر دیتے ہیں کہ ہر شعر ایک نمک پارہ
کا مزا دیتا۔ وہ اپنے چوپائی کے چمنستان میں تشبیہوں اور استعاروں کے گل بوٹے اس اصلیت اور خوبصورتی
سے کھلاتے ہیں گویا وہ صناع ازل ہی کا کارنامہ ہے۔ تشبیہیں اور استعارے مبالغہ سے بالکل پاک ۔ ایسی
چیزیں پیش کی جاتی ہیں جسکو معمولی سے معمولی نظر و فہم کا آدمی دیکھ سکتا ہے اور محسوس کر سکتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

دتّی اٹھیو سنی ہرتے کٹھور ۔ جنو چھوئی گیو پاک بر تور و

(یہ سنکر رانی کا دل جل ہی تو اٹھا گویا پکے بال توڑ کر کسی نے چھو لیا)

ایسئو پری بہتی تے ہی گوئی ۔ چور ناری جمی پرگٹ نہ روئی

(داس نے اپنی تکلیف کو ہنسکر اس طرح چھپایا جسطرح کسی چور کی بیوی ظاہرا طور پر ہنستی ہے اور اندر اندر ہی

اپنے شوہر کے کرتوت پر روتی ہے)

رام ہیں بندھو سوچ دن راتی ۔ انڈ نہیں کُٹھ ہرسے جے ہی بھاتی

(رام کو اپنے بھائی کی فکر رات دن اس طرح رہتی ہے جس طرح کوئی کچھوا اپنے انڈوں ہی کی فکر میں رات دن لگا رہتا ہے)

اسے ہی آوسر منگلو پرم سُنی رہ سیورنی واسو

سو بھت ملمی بدھو بڑھت جنو باردھی بیچی بلاسو

(سب رانیاں ایسے اچھے اور خوشی کے موقع کو دیکھکر جامے میں پھولے نہ سمائیں جیسے چاند کو خوبصورت دیکھکر سمندر کے بیچ موجیں بڑھ جاتی ہیں)

بعض وقت تلسی داس بڑے نازک استعارے استعمال کرجاتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں:۔

بہتی بیجو برسا رتو چیری ۔ بھوئیں بھئی کمتی کیکئی کیری

پانی کپٹ جل انکر جاما ۔ بر دوؤ دل دُکھ پھل پری ناما

(مصیبت کے بیج کے لئے نوکرانی موسم برسات اور کیکئی کی کم عقلی زمین ثابت ہوئی جس میں کپٹ کا پانی پڑتے ہی موڑ نکل آیا۔ رانی کے دو بر پتے تھے اور دُکھ اُسکا پھل)

کبھی کبھی شاعرانہ تخیل اور حسن تخیل بھی بڑی عمدگی سے بیان کرجاتے ہیں۔ سنئے!

پارو چرنکھ لیکھتی دھرنی ۔ نوپُر مکھ مدھور کبی برنی

منہو پریم بس بنتی کرہیں ۔ ہم ہیں سئے پدجنی پری ہرہیں

(سیتا جی جب شرم کے مارے اپنے مدعا کو اپنی ساس اور شوہر سے بیان کرنے میں جھجک جاتی ہیں تو نیچی نظر کئے اپنے پیر کے ناخنوں سے زمین کُریدنے لگتی ہیں۔ ایسے موقع پر بچھوؤں کی جو دھیمی سی آواز نکلتی ہے اس سے شاعر کو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اسکے بچھوے محبت کے مارے التجا کرتے ہیں کہ ہم سیتا کے پیر کبھی نہ چھوڑینگے۔)

منظر نگاری | تلسی داس کو نہ صرف کردار نویسی میں کمال حاصل ہے بلکہ منظر نگاری کو بھی یہ خوب جانتے ہیں۔ فیصلہ آپ ہی پر ہے۔ ملاحظہ ہو!

تلمیحات و نیرنگ نئین

پُر سوہت پور نر ناری سب سمجھیں منگل چار
ایک پر تیتھ ایک نیرگ ہیں بھیر بھوپ دربار

(شہر میں چاروں طرف سب عورت مرد خوشیاں منا رہے تھے۔ایک آرہا تھا، ایک جا رہا تھا غرض راجہ کے دربار میں ایک بھیڑ لگی ہوئی تھی۔)

باجہیں باجن بیادھ بدھانا — پور پرمود نہیں جائی بکھانا
بھرت آگمن سکل سنا وہیں — آوہیں دیگی نین پھل پاوہیں
ہاٹ باٹ گھر گلی اتھائی — کہیں پرس پر لوگ لوگائی
کالی لگن بھلی کیتک بارا — پوجہی بدھی ابھی لاشو ہمارا
کنک سنگھاسن سیتا سمیتا — بیٹھہیں رامو ہوئی چت چیتا
سکل کہہیں کب ہوای ہی کالی — بگھن منادہیں دیو کچالی

(مختلف قسم کے باجے بج رہے تھے شہر کی اس وقت خوشیاں بیان نہیں کی جاسکتیں۔سب لوگ بھرت کی آمد کی خوشیاں منا رہے تھے کہ وہ آجائیں تو اپنی آنکھوں کا پھل پاجائیں۔بازار راستہ گھر گلی اور دھرم سلے میں عورت مرد آپس میں یہی کہہ رہے تھے کہ کل ہی ایک اچھی گھڑی ہے۔خدا تعالیٰ ہماری مراد کو پوری کریگا۔کل رام اپنی سیتا کے ساتھ سونے کے تخت پر مسرت بھرے دل سے بیٹھینگے۔سب کہہ رہے تھے کہ کل کا روز کب آئیگا۔لیکن کھوٹی چال والے دیوتا رکاوٹ ڈالنے کی سوچ رہے تھے۔)

محاورے | محاورے کلام میں بے ساختہ پن پیدا کرتے ہیں۔تلسی داس کی زبان پر محاورے اور روزمرہ بھی بار بار آجاتے ہیں۔بعض محاورے ایسے استعمال کئے ہیں جو اپنی شکل یا تھوڑے سے تغیر کے ساتھ آج تک بھی اُردو اور ہندی میں رائج ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

دیکھ کھنچائی کہوں بلو بھاکی — بھامنی بھئے ہو دودھ کی ماکھی
(دودھ کی مکھی ہونا ۔ ذلیل ہونا)

تے ہی سم ہتو نہ مور سہارا — بہے جات کر بھئی سی آدھارا
(دنیا میں تم سے زیادہ دن میرا ساتھی ہے ۔ تم بہتے ہوئے کے لئے ہاتھ کا سہارا ہو۔)

بہتے ہوئے کے لئے ہاتھ کا سہارا ـــــ مددگار

جوں بدھی پرد منور تھو کالی — کروں تو ہی چش پتری آلی

(خدا اگر میری مراد کل پوری کرے تو میں تجھے اپنی آنکھ کی پتلی بناؤنگی)

آنکھ کی پتلی بنانا - اپنا پیارا بنانا

اَتی کٹو بچن کہتی کیکئی — مانہوں لون جرے پر دئی

(کیکئی نے ایسی کڑوی بات کہی گویا اُس نے جلے پر نمک چھڑکا)

جلے پر نمک لگانا — تکلیف میں اضافہ کرنا

سُنی مردو بچن کُمتی اَسی جرئی — منہوں انل آہوتی گھرت پرئی

(میٹھی بات سُنکر وہ کم عقل ایسی جل اٹھی گویا آگ پر گھی پڑ گیا)

آگ پر گھی پڑنا — آگ کا بھڑک اُٹھنا

تراکیب اور بندشیں عمدہ ترکیبیں اور چست بندشیں باندھنے میں تلسی داس کو استادانہ دسترس حاصل تھی۔ وہ تین تین چار چار الفاظ کو ایک ہی سلسلہ میں جوڑ جاتے اور بڑے سے بڑے جملے کا مطلب ادا کر جاتے۔ جیسے بینا - بینو - سنکھ - دُھنی (بین، بانسری اور ناقوس کی آواز) گُن - اُودھی - آگادھو (اوصاف کا گہرا سمندر) بِشے - سکھ - بھوری (عیش و عشرت سے بیگانہ) جَنَنی - جَنک - بندھو - سکھ داتا (ماں، باپ اور بھائیوں کو سکھ دینے والا) اسکے علاوہ دو لفظی ترکیبیں بھی بڑی نفیس ہیں۔ تیے مایا (عورت کا فریب) سُو مکھی (اچھی صورت والی) سلوچنی (اچھی آنکھ والی) پک بینی (خوش بیان) گجگامنی (ہاتھی کی سی مست چال والی) روش تیرنگنی (غصے کی ندی) جیون آسا (زندگی کی آس) پاہن کرم (پتھر کا کیڑا)

غیر زبانوں کے الفاظ تلسی داس زبان کے بارے میں تنگ نظر اور کوتاہ بین نہیں تھے۔ وہ ہر معمولی سی معمولی بولی اور غیر ملکی زبانوں کے الفاظ بلا تکلف استعمال کر جاتے تھے۔ چونکہ وہ عام بول چال کی زبان لکھتے تھے اور اپنی زبان کو ہمہ گیر بنانا چاہتے تھے اسلئے وہ جہاں برج بھاشا اور دیگر بولیوں کے الفاظ استعمال کرتے تھے وہاں عربی - فارسی لفظ بھی بے کھٹکے اخذ کرتے تھے۔ چنانچہ عربی فارسی کے بے شمار الفاظ اور ترکیبیں انکے ہاں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً غریب نواز، صاحب، برابری، بخشش، بازار، لائق، باغ، حال، فوج، بندی خانہ

ہنا طیا سا تیین
حوالے، صراف، ہنر، شک، کمان، خمر، تلوار، دربار، گرد، تاج، زور، کاغذ، غنی، غریب، جنس، دام، جہاز، بعد
لگام، زین، ذات، کل وغیرہ

بھئے رام سب بدھی سب لائق	لائق
بڑھت بانڑ جنو ہی سو ساکھا	اچھی شاخ
دھرم پات پٹ اگست سیانی	ذات
کہہ ہو بناوں بے کی بجارو	بزار
تو بھی دست ای ہی ہم ہیں سجائی	سزا
گنی گریب گرام نر ناکر	غنی۔ غریب
رام انیک گریب نوازے	غریب نواز
کتنی بھنک کلہ بھی کھوے	کل

اکثر ناقدین انکی زبان پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ انھوں نے بہت سے مقامات پر محض قافیہ کی ضرورتوں کے لئے بے قاعدہ تبدیلیاں کی ہیں اور بعض الفاظ اور محاوروں کی تکرار بھی کی ہے۔ اسکا جواب یہ ہے کہ بیسواری جیسی بے مایہ زبان میں ہر قسم کا مطلب ادا کرنا ہر شخص کا کام نہیں۔ وہ تو کہئے کہ انکو اتنی قدرت حاصل تھی کہ وہ لطیف سے لطیف خیال کو ادا کر گئے۔ زبان میں ایجاد کے پھول کھلائے۔ غیر زبانوں کے الفاظ کے نگینے چنے اور ہر لفظ کو نوع بہ نوع لباس اور رنگ میں پیش کیا۔ یہ انکی خامی نہیں بلکہ خوبی ہے کہ انہوں نے ہمارے الفاظ کے سانچے ڈھال گئے۔ یہی نہیں بلکہ غیر بولیوں کے قواعد کی شکلیں بھی وہ اخذ کرتے تھے۔ کہیں کہیں سنسکرت اور پراکرت کی قواعد کی شکلیں بھی استعمال کی ہیں۔ مثلاً برج بھاشا کا ماضی معطوف पै اور قنوجی کا औ اور بھوجپوری کا सन۔

رامائن کا مقام تلسی داس کی رامائن دنیا کے بڑے کلاسکل شاہکاروں میں شمار کی جاتی ہے۔ یہ ہماری زبان کے ارتقائی مدارج کے لحاظ سے نہایت اہم ہے۔ یہ ہندوستان کی مشترکہ زبان کیلئے ایک پس منظر کا کام دیتی ہے۔ اس نے ہندوستان کی دیگر کم مایہ بولیوں کے لئے اصلیت، کردار نگاری اور زبان سازی کے قدرتی اصول سکھائے۔ اسکا ترجمہ انگریزی، اردو، اور دیگر اہم زبانوں میں ہوا ہے۔ یوروپیوں نے اسکے متعلق اپنی بہترین

رائے پیش کی ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے "تلسی داس ہندوستان کے بہترین مصنفین میں سے ہیں اور انکا مرتبہ زبان میں اتنا ہی بڑا ہے جتنا کہ شیکسپیر کا درجہ انگریزی زبان میں ہے"۔[1]

تلسی داس کی رامائن کو اس قدر مقبولیت حاصل ہوگئی ہے کہ تمام رامائی شاعری اسی بیسواری میں ہونے لگی اور انکی طرز کے مصنفین بے شمار پیدا ہوگئے۔ باوجود اسکے آج تک کوئی بھی انکی برابری نہ کرسکا تلسی کی رامائن اب تک یگانۂ روزگار ہے۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں لکھا ہے "شمالی ہند کے ہندوؤں میں یہ اتنی زیادہ روشناس ہے کہ انگلستان کی دیہاتی آبادی بائبل سے بھی اتنی واقف نہ ہوگی"۔ شمالی ہند میں تلسی داس کی رامائن موجودہ دور میں بھی مقدس بائبل کا درجہ رکھتی ہے۔ حقیقت مند ہندو اب بھی اسکا ورد رکھتے ہیں۔

سید رشید الحسن۔ ام۔ اے (عثمانیہ)

---

[1] ۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جلد گیارہ (ہندی کے تحت)

انسانی معاشرہ کے بنیادی حقوق

عصر حاضر میں انسانی معاشرہ کے بنیادی حقوق پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ امر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عصری نقطہ ہائے نظر[1] کے بموجب کسی متمدن برادری میں انسان کے جو بنیادی حقوق تسلیم کئے گئے ہیں ان کی روشنی میں یہ دیکھا جائے کہ اسلامی قانون نے اسلامی جماعت کے کسی رکن کو کن عام حقوق کا مستحق قرار دیا ہے۔

حق کا مطلب اپنے نہایت وسیع مفہوم میں "حق" سے مراد ہر وہ منفعت ہے جو کسی فرد کو از روئے قانون حاصل ہو[2] چاہے اس کی وجہ سے دوسرے افراد پر کوئی فرض عاید ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو[3]

حقوق کی تقسیم اس لحاظ سے "حق" کی دو قسمیں قرار پاتی ہیں۔

۱۔ ایسے حقوق جنکی وجہ سے دوسرے افراد پر کوئی نہ کوئی فرض عاید ہو جاتا ہے۔ ان کو چاہیے کہ ارباب حق کے لئے بعض امور عمل میں لائیں۔

۲۔ ایسے حقوق جنکی وجہ سے دوسرے افراد پر کوئی فرض عاید نہیں ہوتا۔ ہر شخص کو ان حقوق کے عمل میں لانے یا نہ لانے کا اختیار ہے[4] اس قسم کے حقوق کو اصطلاحاً "آزادی" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے[5]

پہلی قسم کے حقوق کی پھر تقسیم ہے۔ یوں اسکی کئی قسمیں ہوسکتی ہیں۔ چنانچہ سرجان سامنڈ نے اس کی سات قسمیں بیان کی ہیں[6] لیکن دراصل یہ حقوق، نفس عزت اور جائداد سے ہی زیادہ تر متعلق ہیں

---

[1] روسی نقطۂ نظر سے یہاں بحث نہیں ہے، انفرادی حق ملکیت وامثالہ سے قطع نظر اکثر حقوق روسی دستور میں بھی مسلم ہیں اور اب تو انفرادی حق ملکیت محدود طور سے سہی تسلیم کرلیا گیا ہے [2] سامنڈ، جورس پروڈنس ص ۲۴۶

[3] سامنڈ جورس پروڈنس ص ۲۴۶ و ص ۲۴۷ [4] سامنڈ، جورس پروڈنس ص ۲۴۶ [5] سامنڈ، جورس پروڈنس ص ۲۴۴ تا ص ۲۴۵ [6] سامنڈ لا آف ٹارٹس ص ۸ مطبوعہ ۱۹۲۸ء

اسلامی حقوق | قانون اسلامی نے ان حقوق کو صراحت سے تسلیم کیا ہے۔ شارع علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ہے کہ
"ان دماءکم و اموالکم و اعراضکم علیکم حرام کحرمة یومکم هذا فی بلدکم هذا فی شهرکم هذا"
تمہارا خون تمہارا مال اور تمہاری آبرو ایک دوسرے پر اسی طرح حرام ہے جس طرح آج کا یہ دن
اس مہینہ اور اس بلدہ میں محترم ہے (خطبۂ حجۃ الوداع)
ان حقوق کے متعلق ذیل میں اختصار کے ساتھ توضیح کی جاتی ہے۔

۱۔ حق متعلق نفس و ذات انسان ۔ ہر انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ اسکی جان محفوظ رہے۔
اسکے جسم کو کوئی نقصان نہ پہونچے اور کوئی دوسرا انسان اسکو بلا وجہ قانونی قید و بند میں نہ رکھے اور نیز
یہ کہ ہر انسان اپنے اغراض و منافع کی خاطر بلا خوف دار و گیر جو عمل چاہے بروئے کار لائے [1] واضح ہو کہ
عام انسانی فلاح، انسانی حیات کے بقا و تحفظ کی متقاضی ہے۔ لیکن جماعت کی ابتدائی صورتوں میں اس حق کو
کوئی عام استناد حاصل نہیں ہوتا [2] ناموس کی خاطر لڑکیوں کو زندہ درگور کر دینا عرب کی ایک رسم تھی [3]
قوت لایموت کی تنگی سے ڈر کر بچوں کو مار ڈالنا لوگوں نے اپنا وتیرا کر رکھا تھا [4]
بعض وقت کوئی قوم مدنیت کے بہت سارے مدارج طے کر جاتی ہے لیکن افراد قوم بات بات پر مبارزت
طلب کرنا کھیل خیال کرتے ہیں [5]

بہر حال یہ امر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ انسانی حقوق میں مقدم ترین حق زندہ رہنے کا حق ہے [6]
اسلام نے یہ اصول طے کر دیا تھا اور قرار دیا کہ "لا تقتلوا النفس التی حرم اللہ الا بالحق" [7]

---

[1] آجرس، کامن لا، جلد اول، ص، نیز سامنڈ، جورس پروڈنس، ص ۲۴۴ و ص ۲۴۴ [2] جان ایس میکنزی
علم الاخلاق، ترجمہ مولوی عبد الباری صاحب، سلسلہ جامعہ عثمانیہ ص ۲۸۶۔ [3] الخازن، لباب التاویل فی
معنی التنزیل ص ۴۶۷، جلد ۴ مطبوعہ مصر [4] کتاب بیان شدہ نمبر ۳ (لباب التاویل) ص ۶۸ جلد ۲۔ [5]
۱۹ ویں صدی کے اوائل تک خود انگلستان میں تحقیقات بذریعہ جنگ قانوناً جائز تھی ۱۸۱۹ء میں اسکی تنسیخ
عمل میں آئی، ملاحظہ ہو سامنڈ، جورس پروڈنس، ص ۱۱۵ کی تعلیق ۔ نیز میکنزی علم الاخلاق ترجمہ مولوی عبد الباری
ص ۲۸۶۔ [6] میکنزی علم الاخلاق ترجمہ مولوی عبد الباری ص ۲۸۶ [7] قرآن شریف میں یہ حکم انہی
الفاظ میں دو جگہ مذکور ہے سورۂ الانعام ع ۱۹ اور سورۂ بنی اسرائیل ع ۴ اور نیز دوسرے مقامات پر بھی دوسرے الفاظ میں یہ حکم آیا ہے مثلاً سورۂ نساء ع ۲

(مار ڈالو جان جسکو حرام کیا اللہ نے مگر حق پر) [1]

اس حکم میں "الا بالحق" سے اس جانب اشارہ ہے کہ بعض اوقات افراد کی زندگی کو جماعت کی خاطر قربان کرنا حق بجانب ہوتا ہے[2] "ولکم فی القصاص حیٰوۃ"[3] (یعنی قصاص میں زندگی ہے) اس پر ناطق ہے۔ "الحر لا یدخل تحت الید و الاستیلاء"[4] یعنی کسی آزاد انسان کو نہ تو غلام بنایا جاسکتا ہے اور نہ اس پر غلبہ حاصل کیا جاسکتا ہے فقہ اسلامی کا ایک عام کلیہ ہے۔

۲۔ ملکیت کا حق۔ یہ حق اعلیٰ درجہ کی ترقی یافتہ قوم میں پایا جاتا ہے[5] اس حق کا منشاء یہ ہے کہ مالک شئے کو اس شئے پر قبضہ حاصل ہے اور وہ اس سے منفعت کامل حاصل کرے۔

سلطنت ملکیت کی حفاظت اور آزادی کی ضامن ہوتی ہے[6]

یہ اصول بہت سے ملکوں کے نظام سلطنت میں پایا جاتا ہے۔ انگلستان کے دستور اعظم ۱۲۲۵ء میں بھی اس مضمون کے کئی جملے ہیں[7]۔ انگریزی قانون نے شائستگی حقوق کے ضمن میں حق ملکیت کو تسلیم کیا ہے[8]

فرانسیسی نظام جمہوریت ۱۸۱۴ء کے فقرہ ۱۱ اور منشور ۱۸۳۰ء کے فقرہ ۹ میں یہ جملہ موجود ہے کہ "ہر ملکیت ناقابل دست اندازی ہے" پروشئی نظام سلطنت ۱۸۵۰ء کے فقرہ ۹ میں محکوم ہے کہ "ملکیت ناقابل دست اندازی ہے"[9]

قرآن میں مذکور ہے کہ "للرجال نصیب مما اکتسبوا وللنساء نصیب مما اکتسبن" (۱۰)

مطلب یہ ہے کہ مردوں کو حصہ ہے اپنی کمائی سے اور عورتوں کو حصہ ہے اپنی کمائی سے (۱۱)

---

[1] شاہ عبدالقادر موضح القرآن [2] میکنزی علم الاخلاق ترجمہ ع ص ۲۸۷ – یہ امر درست ہے کہ سزائے موت کو موقوف کر دینے کی کوشش عمل میں آتی رہی ہے لیکن اسکا کوئی بدل ابتک قرار نہ پاسکا اور سزائے موت کا قاعدہ بدستور جاری ہے [3] القرآن سورہ بقرہ ع ۲۲ [4] القواعد زرکشی [5] میکنزی علم الاخلاق ترجمہ ع ص ۲۰۵ [6] و [7] و [9] جے بلنچلی نظریہ سلطنت ترجمہ قاضی تلمذ حسین اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی سلسلہ جامعہ عثمانیہ ص ۲۶۲ مع تعلیق — [8] آجرمن کامن لا جلد اول ص ۵ –

(۱۰) القرآن سورہ النساء – (۱۱) شاہ عبدالقادر موضح القرآن –

عورت اور مرد ہر ایک جو کچھ پیدا کرے اس پر اس کو کامل حق حاصل ہے۔ افراد جماعت انسانی کو حق ملکیت حاصل ہونے کے متعلق یہ ایک صاف اور صحیح بیان ہے۔ بالخصوص عورتوں کا حق ملکیت اس زمانہ میں تسلیم کر لیا گیا جب کہ دنیا میں خیالات کی نئی روشنی ابھی پیدا نہیں ہونی تھی؛ اور بیچاری عورت کی ذات اور جائداد کو کوئی مشخص حیثیت حاصل ہی نہیں تھی۔

کسی شخص کو اس حق کے حاصل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تمام افراد پر یہ بات لازم ہے کہ دوسروں کے حقوق ملکیت کی حرمت قائم رکھیں، اور کسی ایسے فعل کے مرتکب نہ ہوں جس سے ان حقوق میں مداخلت ہو[1]

شارع علیہ السلام کا جو حکم اس سے پہلے خطبہ حجۃ الوداع میں بیان کیا جا چکا ہے اس سے نفس و ناموس کی حرمت کے ساتھ مال و ملکیت کی حرمت بھی فرض ہو جاتی ہے[2] "حرمۃ مال المسلم کحرمۃ دمہ"

یعنے کسی مسلمان کے مال کی حرمت، نفس و ذات کی حرمت کے برابر ہے[3]

(۳) حق متعلق عزت و ناموس۔ ہر شخص کو اپنی ناموس کی حفاظت کے متعلق جو حق حاصل ہے اسکو قانون نے تسلیم کر لیا ہے۔ بعینہ اسی طرح جیسے کہ کسی انسان کو اپنے مال کی حرمت کے متعلق حق حاصل ہے ہر انسان پر دوسرے کے حق ناموس کی حفاظت بھی لازم ہے[4]

شریعت اسلامیہ کا حکم ہے کہ۔

"کل المسلم علی المسلم حرام مالہ وعرضہ ودمہ"[5] ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کی مال و آبرو اور خون کی حرمت ضروری ہے۔

حفاظت خود اختیاری کا حق نفس و ناموس اور مال کے متعلق کسی متمدن جماعت کے ارکان کو جو حقوق حاصل ہوتے ہیں ان کا ایک ضمیمہ حفاظت خود اختیاری کا حق بھی ہے۔ بطور ایک قاعدہ مسلمہ کے ہر تعدی کا چارہ کار عدالت ہائے قانون کے ذریعہ سے ہی حاصل کرنا چاہئیے[6]

---

[1] آجرس، کامن لا، ص ۱۰ جلد اول۔ [2] کنز العمال، جلد اول حدیث نمبر (۴۰۶) مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن [3] حقوق ملکیت اور اسکے دوسرے متعلقہ امور پر میں نے اپنی ایک تالیف جنایات بر جائداد میں تفصیل سے بحث کی ہے [4] سامنڈ جورس پروڈنس ص ۲۴۴ [5] کنز العمال جلد اول حدیث نمبر ۱۲۸ [6] آجرس کامن لا، ص ۹۶ جلد اول۔

لیکن تمام صورتوں میں یہ بات ضروری نہیں ہے کہ کوئی شخص کسی متوقعہ تعدی سے حفاظت یا واقع شدہ تعدی کے چارہ کار کیلئے عدالتی کارروائی اختیار کرے اکثر صورتوں میں قانون ہر شخص کو یہ آزادی دیتا ہے کہ وہ خود اپنے ذاتی عمل اور اپنی قوت سے اپنی مدد آپ کرے یا دوسرے الفاظ میں قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لے۔ ضرور نہیں کہ کسی عدالت میں چارہ جوئی کی جائے اور استقرار حق کے لئے کوئی عدالتی فیصلہ حاصل کیا جائے۔ نفس، ناموس اور مال کی حفاظت کے لئے ہر شخص اپنی مدد آپ کرسکتا ہے [۱]

یہ اصول ایسا ہے کہ اسلامی شریعت نے اسکو تسلیم کیا ہے [۲] خذوا حذرکم [۳] یعنی کر لو اپنی خبرداری [۴] ایک عام اور ہمہ گیر حکم ہے۔ شارع علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ "من قتل دون مالہ فھو شھید، ومن قتل دون دمہ فھو شھید ومن قتل دون اھلہ فھو شھید" [۵]

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنے مال کے حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے نیز جو شخص اپنے جان کی حفاظت میں مارا جائے وہ بھی شہید ہے اسیطرح جو شخص اپنے بال بچوں کی حفاظت میں مارا جائے وہ بھی شہید ہے۔

حق معاہدہ ان بنیادی حقوق کے ساتھ ایک عام اور اہم حق کے متعلق کچھ نہ کچھ صراحت کردینی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ یہ حق معاہدہ کا حق ہے۔

انعقاد و نفاذ معاہدہ کا حق بھی اعلیٰ درجہ کی ترقی یافتہ قوم میں ہی ممکن ہے [۶]

معاہدات کا ایفا ارکان جماعت کا ایک اہم حق ہے [۷]

---

[۱] سامنڈ لا آف ٹارٹس ص ۲۱۶، مطبوعہ ۱۹۲۳ء، آ جرس کا من لا ص ، وص ۹۶ جلد اوّل نیز ملاحظہ ہو قانون دستوری تالیف اے، وی، ڈائسی، ترجمہ مسعود علی سلسلہ جامعہ عثمانیہ ص ۵۹۳ تا ص ۶۰۷ [۲] جائداد کے متعلق حفاظت خود اختیاری کا حق جو حاصل ہے اسکی تفصیلات کے لئے ملاحظہ فرمائی جائے راقم کی تالیف جنایات بر جائداد [۳] القرآن، سورہ النساء ع ۹ [۴] شاہ عبد القادر موضح القران [۵] احمد ضیاء الدین، راموز الحدیث، بحوالہ امام احمد بن حنبل، ابوداؤد، نسائی، ترمذی، بیہقی [۶] میکنزی علم الاخلاق ترجمہ مولوی عبد الباری ص ۲۹ [۷] میکنزی علم الاخلاق، ترجمہ مولوی عبد الباری ص ۲۸۹، اجرز کامن لا ص ۳۳ تا ص ۳۸ جلد اوّل۔

قانون اسلام نے یہ حق قطعی طور سے تسلیم کیا ہے اور قرار دیا ہے کہ ہر شخص پر ایفائے معاہدہ کی پابندی لازم ہے۔ چنانچہ قرآن میں محکوم ہے کہ "اوفوا بالعقود"[1] یعنے پورا کرو اقرار[2] علماء نے تسلیم کیا ہے کہ عقود سے مراد وہ معاہدے بھی ہیں جو لوگ آپس میں باہم قرار دیتے ہیں[3]

آزادیاں | یہ تو اُن حقوق کا بیان ہوا جنکی وجہ سے دوسرے افراد پر کوئی نہ کوئی فرض عاید ہوتا ہے۔ اب ان حقوق کا بھی مختصر طور سے تذکرہ کیا جاتا ہے جنکی وجہ سے دوسرے افراد پر کوئی خاص فرض عاید نہیں ہوتا۔ جیسے کہ اس سے قبل بیان کیا جاچکا ہے اس قسم کے حقوق کو اصطلاحاً آزادی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے آزادی دراصل ان سب امور کے عمل میں لاسکنے کا نام ہے جنکی قانون اجازت دیتا ہے[4] انسان اپنے حقوق کو حکمران طاقت کی مرضی کے مطابق نہیں بلکہ خود اپنی مرضی کے موافق عمل میں لاتا ہے[5]۔ لیکن اسکے ساتھ یہ امر پوشیدہ نہ رہنا چاہیئے کہ

"کسی جماعت انسانی میں ایک نظم مطلق العنانی نہ تو ممکن ہے اور نہ کبھی اس کا قصد کیا جا سکتا ہے۔ کسی خوش نظم جماعت میں یہ کبھی روا نہیں رکھا جا سکتا کہ اسکے ارکان جو بھی چاہے کر بیٹھیں حق آزادی کے یہ معنی ہیں کہ نظم جماعت کو باقی رکھکر دوسروں کے حقوق میں خلل اندازی کئے بغیر انسان کو اپنی ترقی کا جو موقع مل سکتا ہے ملنا چاہیئے"[6]

اس روشنی میں جب اسلام کے اصول و آئین پر نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام آزادی افراد کا اپنی ابتدا سے ہی حامی ہے۔ اسلام کے عقیدۂ توحید نے انسان کو ساری غیر فطری بندشوں سے آزاد کردیا ہے "ان الحکم الا للّٰہ"[7] کا حکم انسانی آزادی کا گویا سنگ بنیاد ہے۔ رسالت پناہ کے جو صفات قرآن شریف میں بیان کئے گئے ہیں ان میں یہ بھی وارد ہے کہ آپ نیک کام بتاتے ہیں اور برے کام سے منع کرتے ہیں۔ سب پاک چیزوں کو حلال کرتے ہیں تو ناپاک کو حرام[8]

---

[1] القرآن سورہ المائدہ ع ۱ [2] شاہ عبدالقادر صاحب موضح القرآن [3] الخازن ص ۴۶۲ جلد اوّل [4] اے، وی، ڈایسی "قانون دستوری" بحوالہ مونٹیسکو "روح قوانین" کتاب ۱۱ باب ۳ ترجمہ مسعود علی سلسلہ جامعہ عثمانیہ ص ۲۸۴ [5] جے کے بلنچلی "نظریہ سلطنت" سلسلہ جامعہ عثمانیہ ص ۱۹۰ [6] میکنزی "علم الاخلاق" ترجمہ مولوی عبدالباری ص ۲۸۷ [7] القرآن [8] القرآن سورہ الاعراف ع ۱۹

اسی کے ساتھ وارد ہے کہ

"یضع عنهم اصرهم والاغلل التی کانت علیهم" [1]

یعنی رسول اللہ صلعم نے لوگوں پر سے ان کے بوجھ اور پھانسیاں اتار دیں۔ دوسرے الفاظ میں انسانوں کو سبکو تمام غلامانہ اعمال و افعال کی پابندیوں سے آزاد کردیا۔ جو امور مباح ہیں یا دوسرے الفاظ میں وہ ابواب جنکی قانون اجازت دیتا ہے ان کو اپنے آپ پر حرام نہ کرلینے کے لئے صراحت کے ساتھ منع کیا گیا ہے [2]

لیکن اسلامی آزادی بھی قطعاً بے لگامی کی سند نہیں ہے۔ اس نے سارے انسانی اعمال میں توسط اور اعتدال کو ہی مدار قرار دیا ہے "لا تعتدوا" یعنی حد سے نہ بڑھو کی تاکید ایک سے زیادہ مرتبہ کی گئی ہے [3] اس لحاظ سے آزادی کے ساتھ بے حیائی، منکرات اور سرکشی کو حکماً ممنوع قرار دیا گیا ہے [4] "لا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحها" [5] کے حکم نے انسانوں کی آزادی میں مناسب بندش پیدا کردی ہے۔

آزادی کی قسمیں | آزادی کی چار قسمیں بیان کی گئی ہیں۔

۱۔ مدنی (سول) آزادی

۲۔ مذہبی آزادی۔

۳۔ سیاسی آزادی

۴۔ شخصی آزادی [6]

ان میں سے ہر ایک کے متعلق مختصر توضیح کیجاتی ہے۔

مدنی آزادی | مدنی آزادی سے مراد یہ ہے کہ ہر فرد رعیت اپنی جائداد اور ذات کے بارے میں قیود اور بندشوں سے آزاد ہو [7]

نفس ذات کے سلسلہ میں ابھی اوپر اشارہ کیا جاچکا ہے۔ ذیل میں جائداد کے متعلق صراحت کیجاتی ہے

یہ آزادی گویا حق ملکیت کی عملی مدلول ہے۔

جائداد چاہے منقولہ ہو یا غیر منقولہ مالک جائداد اپنی جائداد میں وسیع یا محدود حد تک ہر قسم کا تصرف کرنے کا مستحق ہے۔ مالک چاہے تو جائداد خود اپنے قبضہ میں رکھ سکتا اور غیر محدود طریقہ سے اوس پر حق مالکانہ کا استعمال کرسکتا ہے۔

---

[1] القرآن سورہ الاعراف ع ۱۹ [2] القرآن سورہ المائدہ ع ۱۲ [3] مثلاً ملاحظہ ہو قرآن سورہ المائدہ ع ۱۲ [4] القرآن سورہ النحل ع ۱۲ اور سورہ الاعراف ع ۴ [5] القرآن سورہ الاعراف ع ۷ [6] وائی کونٹ برائس ماڈرن ڈیموکریسیز ص ۶۰ جلد اول مطبوعہ ۱۹۲۱ء۔

اور اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ مالک کو آزادی حاصل ہے کہ چاہے تو اپنی جائداد بیع یا ہبہ کردے بلکہ اسکو اختیار ہے کہ اگر اپنی خوشی ہو تو زمین اجاڑ دے اور مال تلف کردے۔ اس سے قطع نظر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مالک چند مشخص حقوق کے ساتھ کسی عرصہ مقررہ کیلئے قابض جائداد رہے۔ غیر مشخص حقوق کے ساتھ بھی قبضہ حاصل رہ سکتا ہے۔ یہ غیر مشخص حقوق مشخص بھی کر دیئے جا سکتے ہیں۔ ان حقوق کی نوعیت اس حد تک وسیع ہو سکتی ہے کہ کامل حقوق مالکانہ سے بمشکل ہی اسکا امتیاز ہو سکتا ہے۔ ان حقوق کی نوعیت اسقدر محدود بھی ہو سکتی ہے کہ محض کسی خاص مقصد سے ان کا تعلق ہو [1]

شریعت اسلامی میں بھی یہ اصول مسلم ہے۔ قرآن شریف کے آیات کریمہ میں باہمی خرید و فروخت کا جو اشارہ ہے خود اس سے تصرف کا اختیار حاصل ہوا ہے [2] اسلامی فقہا نے طے کیا ہے کہ

"ایسی حالت میں جبکہ کسی غیر کو کوئی منازعت نہ ہو کوئی شخص اپنی مقبوضہ شئے میں تصرف کرنے سے ممنوع نہیں قرار دیا جا سکتا" [3] ملکیت کی جو تعریف اسلامی فقہاء نے کی ہے اس میں جواز تصرف کو ہی ملکیت کی اصلی خصوصیت قرار دی ہے [4]

اس ضمن میں قرار دیا گیا ہے کہ۔

"دریاؤں کے پانی کا استعمال کسی خاص فرد سے مختص نہیں ہے۔ کسی سے اجازت حاصل کئے بغیر ہر شخص پانی پی سکتا ہے۔ اگر کسی نے کچھ پانی اپنے برتن میں محفوظ کر لیا تو اس پر اس شخص کو ملکیت حاصل ہو گئی اب اس میں مالک جسطرح چاہے تصرف کرے۔ چاہے بیع کردے یا ہبہ اور چاہے تو صدقہ کے طور پر دیدے۔ غرض جسطرح چاہے عمل کرے" [5]

مالک کو تصرف کا جو اختیار حاصل ہے اسکو امام اعظم رح نے بڑی وسعت دی ہے جیسے کہ انگریزی قانون میں طے کیا گیا ہے [6] امام اعظم رح نے بھی قرار دیا ہے کہ

---

[1] سر فریڈرک پولک، لا آف ٹارٹس، ص ۳۵۲، مطبوعہ ۱۹۲۹ء [2] القرآن سورہ النساء ع ۵ [3] فصول عمادی مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ نمبر (۳۱۰) فقہ حنفی عربی فصل ۳۴ فی مالا یمنع الانسان عنہ [4] شرح مجلۃ الاحکام تالیف سلیم بن رستم ص ۵۵ بحوالہ رد المختار [5] قواعد زرکشی بحوالہ ابو حامد الاسفرائینی مخطوطہ کتب خانہ مدرسہ محمدی مدراس۔ نیز ملاحظہ ہو تعلیق صحیح بخاری ص ۳۱۹ مطبوعہ مطبع نظامی کانپور سنہ ۱۳۰۹ھ [6] سر فریڈرک پولک لا آف ٹارٹس ص ۳۵۲، م ۱۹۲۹ء

"ایسا آزاد شخص جو عاقل اور بالغ ہو، مقتضی عقل اور شرع کے خلاف اپنے مال کے
اتلاف و اسراف پر اتر آئے یا دوسرے الفاظ میں سفیہ ہو جائے تو اسکو اپنے مال
میں اس قسم کے تصرف سے منع نہیں کیا جائے گا۔ اپنے مال میں اس کا ہر تصرف درست
ہے گو یہ تصرف بیجا اسراف اور بے فائدہ و خلاف مصلحت اتلاف تک کیوں نہ پہنچ
جائے چاہے تو مال سمندر میں ڈبوئے پانی میں ڈالدے یا جلا ڈالے جو چاہے کرے"[1]
امام شافعیؒ نے قرار دیا ہے کہ بیجا اتلاف اور بے فائدہ اسراف کی صورت میں تصرف کرنے سے
مالک کو منع کیا جاسکتا ہے[2] لیکن اس ممانعت کی بنا پر مسرف اپنے حقوق مالکانہ سے محروم نہیں ہو جاتا
بلکہ بغرض مصالح عامہ اس پر صرف روک پیدا کیجاتی ہے تاکہ سوسائٹی میں بیجا اسراف سے کوئی فساد عمل
نہ پیدا ہو۔ چنانچہ اپنے مال میں اسراف و اتلاف سے کسی قسم کے ہرجہ کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی[3] اس
سلسلہ میں یہ امر بھی پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اسراف یا اتلاف اگر امور خیر میں کیا جاتا ہے مثلاً کوئی شخص اپنی
حیثیت سے بڑھ کر خیرات کرتا اور کھانا کھلاتا یا کپڑے پہناتا ہے اور اسی طرح دوسرے وجوہ خیر میں روپیہ
اڑاتا ہے تو امام شافعی نے بھی ممانعت ضروری نہیں قرار دی ہے البتہ حرام امور میں روپیہ لگایا جائے یا مال
سمندر میں ڈبو دیا جائے یا کسی معاملہ میں دھوکہ کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں حکم امتناعی جاری کیا جاسکیگا۔

مذہبی آزادی | مذہبی آزادی سے مراد یہ ہے کہ افراد پر مذہبی عقاید اور طریقہ عبادت کے سلسلہ پر
کوئی بندش نہ ہو[4]

مذہبی آزادی تہذیب حاضر کی ایک ممتاز خصوصیت ہے لیکن اسکے حصول سے پہلے بے شمار انسانوں
زندہ جلنا پڑا ہے درندوں کی غذا بننا پڑا ہے شکنجہ میں کسے جاکر جان کنی کی مصیبت برداشت کرنی پڑی
غرض موت کے گھاٹ اترنے کیلئے ہر وہ سختی گوارا کرنی پڑی ہے جو متعصب اور ظالم انسان کا ذہن اور دماغ ایجاد کرسکتا ہے

---

[1] المرغینانی، الهدایہ ص ۳۳۷ جلد چہارم آخرین مطبوعہ مطبع مصطفائی دہلی ۱۳۰۷ھ [2] النووی، المنهاج ص ۲
مطبوعہ مصر۔ امام محمد اور امام ابو یوسف امام شافعیؒ سے متفق ہیں۔ ملاحظہ ہو الهدایہ ص ۳۴۰ جلد چہارم آخر
[3] الزرکشی، القواعد تحت لاسکہ النووی المنهاج ص ۲۰۵ [4] وائی کونٹ برائس ماڈرن ڈیموکریسیز
جلد اول مطبوعہ ۱۹۲۱ء [5] مذہبی تعصب کی بنا پر انسانوں کو جو مصیبت اٹھانی پڑی ہے اسکا مفصل علم حاصل کرنے کیلئے ملاحظہ ہو عرض مذہب سائنس تالیف جان ڈریپر ترجمہ
ظفر علیخان باب ۵ و باب ۸۔

سزائے موت سے قطع نظر انسانوں کیلئے محض مذہب کی خاطر معاش کی تنگی اور سرکاری ملازمتوں کی نااہلی کا خطرہ علیحدہ سوہان روح بنا ہوا رہتا تھا۔ تعصب کی یہ گرفت حال حال تک بھی شدید تر تھی [۱]

یہ پہلو پوشیدہ نہ رہے کہ مذہبی آزادی کا نیا اصول ابھی عالمگیر طور پر تسلیم نہیں کیا گیا ہے بلکہ پوپ کے ماننے والوں کی طرف سے اس اصول کو برابر مطعون کیا جا رہا ہے [۲]

نہ صرف یہ کہ آزادئ مذہب کا اصول ان کیتھولکی سلطنتوں میں جہاں پادریوں کا اثر غالب ہے جزاً یا کلاً منسوخ کر دیا گیا ہے۔ بلکہ ناروے وغیرہ اب تک اس اصول سے منکر ہیں [۳] سوئزرلینڈ میں سنہ ۱۸۶۶ء کے نظام سلطنت تک میں سیاسی حقوق عیسائی مذہب کے اقرار پر منحصر تھے۔ انگلستان تک میں جہاں منحرفوں کیتھولکوں اور یہودیوں کے موانع اس صدی کے اوائل میں رفع کئے جا چکے ہیں نیا جدید اصول ابھی کامل طور پر مسلم نہیں ہوا ہے [۴]

بہرحال ازمنہ قدیمہ اور ازمنہ وسطیٰ کے مقابلہ میں دور جدید کی سلطنت مذہب کو قانونی معیار کی شرط نہیں خیال کرتی۔ قانون عامہ اور قانون شخصی دونوں اعتقاد مذہبی سے آزاد ہیں۔ عصری سلطنت آزادی اعتقاد کی حفاظت کرتی ہے [۵] اور غیر مذہب والوں کو کسی قسم کا آزار پہنچانے سے باز رہتی ہے [۶]

شریعت اسلامیہ نے مذہبی آزادی صاف طور سے تسلیم کر لی ہے "لا اکراہ فی الدین" [۷] اور دوسرا حکم "لکم دینکم ولی دین" [۸] نے دنیا کو مذہبی ظلم و تعدی سے ایسے وقت نجات دی ہے جبکہ حق و صداقت کی روشنی ہر طرف ماند پڑ چکی تھی۔ عمرو بن حزام کو جب رسالت پناہ نے نجران (یمن) کی جانب حاکم مقرر فرما کر روانہ فرمایا تو ایک ہدایت نامہ (عہد) بھی مرحمت فرمایا تھا۔ اس میں ان کے فرائض و ذمہ داریوں کی وضاحت فرماتے ہوئے یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ

---

[۱] تاریخ دستور انگلستان تالیف یف سی مانٹیگو ترجمہ سید علی رضا سلسلہ جامعہ عثمانیہ ص ۲۰۹ و ۲۱۰۔ [۲] نظریہ سلطنت تالیف جے۔ کے بلنچلی سلسلہ جامعہ عثمانیہ ص ۲۳۱ و ۲۳۲۔ [۳ و ۴] نظریہ سلطنت تالیف جے۔ کے بلنچلی سلسلہ جامعہ عثمانیہ ص ۲۳۱ و ۲۳۲ [۵ و ۶] نظریہ سلطنت تالیف جے کے بلنچلی سلسلہ جامعہ عثمانیہ ص ۲۴ [۷] القرآن سورہ البقرہ ع ۳۵ مطلب یہ ہے کہ زور نہیں دین کی بات میں (موضح القرآن) [۸] القرآن سورہ الکافرون ع ۱

"وان من اسلم من یہودی او نصرانی اسلاماً خالصاً من نفسہ ودان بدین الاسلام فانہ من المومنین لہ مثل مالہم وعلیہ مثل ما علیہم ومن کان علی نصرانیتہ او یہودیتہ فانہ لا یرد عنہا"[۵۱]

اس کا مطلب یہ ہے کہ

جو یہودی یا نصرانی اخلاص مندی کے ساتھ مسلمان ہوا اور دین اسلام پر چلنے لگا تو وہ مومن ہے، اسکو وہی حقوق حاصل ہونگے جو دوسرے مسلمانوں کو حاصل ہیں اور وہی ذمہ داریاں عاید ہونگی جو دوسرے مسلمانوں پر عاید ہوتی ہیں جو کوئی نصرانی یا یہودی نصرانیت یا یہودیت پر قائم رہیگا تو اسکو اس سے ہٹایا نہ جائیگا۔

سیاسی آزادی مذہبی اور مدنی آزادی کے ساتھ ہی سیاسی آزادی بھی اسلامی معاشرہ کی اسی طرح ایک نمایاں خصوصیت ہے جیسے کہ تمدن جدید میں۔

سیاسی آزادی کا مطلب یہ ہے کہ افراد معاشرہ کا امور حکومت میں حصہ ہے[۵۲]

قرآن مجید میں مسلمانوں کی شان یہ بتائی گئی ہے کہ "وامرہم شوری بینہم"[۵۳] یعنی مسلمانوں کے کاروباران میں باہمی مشورہ سے طے پاتے ہیں۔ یہ حکم صرف معاشرتی اور گھریلو کاروبار کی حد تک محدود نہیں ہے اس کا دائرہ سارے انسانی کاروبار پر محیط ہے۔ سیاسی معاملات بھی اس میں شامل ہیں۔ خود شارع علیہ السلام کو صاف طور سے حکم دیا گیا ہے کہ "وشاورہم فی الامر"[۵۴] اس سے مراد یہ ہے کہ صحابہ سے کاروبار میں مشورت لینی چاہیئے۔ یہ حکم آزادی رائے کی ایک حقیقی سند ہے۔

اس حکم کو اس وجہ سے خاص اہمیت حاصل ہے کہ یہ حکم واقعہ احد کے سلسلہ میں صادر ہوا[۵۵] اس غزوہ میں طریقہ مدافعت کے متعلق جمہور اھل اسلام میں اختلاف رائے تھا۔ نوجوان شہریوں نے میدان میں نکل کر مقابلہ کرنیکی رائے دی تھی معمر لوگوں کو اس سے اختلاف تھا۔ رسالت مآب نے نوجوانوں کی رائے پسند فرمائی اور احد کا ملال انگیز واقعہ پیش آیا۔ یہ امر ممکن تھا کہ شوری کی نتیجۃً اس ناکامیابی کے بعد آئندہ اسلامی معاشرہ کے معاملات میں شوری کو دخل نہ رہتا لیکن اس حکم قرآنی نے سارے شکوک رفع کردیئے اور شوری کو اسلامی معاشرہ کی ایک بنیادی خصوصیت قرار دیدی۔

---

[۵۱] حسین عبداللہ باسلامہ، حیاۃ سید العرب ص ۱۳۴ جلد ۲ مطبوعہ جدہ [۵۲] وائی کاؤنٹ برائس، ماڈرن ڈیموکراسیز، ص ۶۰

[۵۳] القرآن سورۂ شوریٰ ۴ [۵۴] القرآن سورۂ آل عمران ع ۱۷ [۵۵] شاہ عبدالقادر، موضح القرآن۔

حضرت عائشہؓ نے بیان کیا ہے کہ انھوں نے رسالت مآب سے بڑھ کر کسی اور کو مشورہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا [۱]

حریت رائے کی سینکڑوں درخشاں مثالیں تاریخ اسلام کے صفحہ صفحہ پر نمایاں ہیں [۲]

شخصی آزادی | شخصی آزادی سے مراد یہ ہے کہ مملکت افراد کے ایسے امور میں کوئی دخل نہ دے جن سے پورے معاشرہ کی سود و بہبود پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا [۳]

مخفی نہ رہے کہ مدنی آزادی اور شخصی آزادی میں جو کچھ فرق ہے وہ صرف تاریخی نقطۂ نظر سے ہے ورنہ عملاً ان میں کوئی بہت تفاوت نہیں ہے [۴] مدنی آزادی پر اس سے پہلے بحث کی جا چکی ہے اس اعتبار سے اس عنوان کے تحت کسی مزید توضیح کی ضرورت نہیں ہے۔

مساوات | مساوات عمومی کے میدان کو اسلام نے جس حد تک وسعت دی ہے اسکو دنیا میں ہر وقت حقیقی مساوات کے اصلی معیار کا رتبہ حاصل رہے گا۔

مساوات کی پانچ قسمیں قرار دی گئی ہیں۔

۱۔ فطرتی مساوات ۲۔ معاشی مساوات ۳۔ معاشرتی مساوات ۴۔ سیاسی مساوات ۵۔ مدنی (سول) مساوات [۵]

---

[۱] الخازن لباب التاویل جلد اول ص ۳۸۵ بحوالہ البغوی [۲] حکومت اسلامی کے ابتدائی دور میں سارے اہم معاملات بذریعہ شوریٰ انجام پائے ہیں مثلاً اسیران بدر سے فدیہ لینا، واقعہ احد میں بیرون شہر مقابلہ کے لئے نکلنا، جنگ خندق میں مدافعت کے نئے طریقے اختیار کرنا، واقعہ حدیبیہ کے موقعہ پر اکثر امور کا تصفیہ شوریٰ سے ہی ہوا ہے آنحضرت صلعم نے اپنی جانشینی کے مسئلہ کو بھی جمہور کی رائے پر چھوڑ دیا۔ نیز زمانۂ خلافت راشدہ میں مسئلہ ارتداد، عراق و شام پر فوج کشی، فوج کی تنخواہ، خراج کا تعین، دفتر کی ترتیب، عمال کا تقرر، غیر اقوام کی تجارتی آزادی، تخفیف محاصل وغیرہ معاملات کا فیصلہ بذریعہ شوریٰ عمل میں آیا۔

[۳] وائی کونٹ برائس، ماڈرن ڈیموکراٹیسیز ص ۷ جلد اول۔

[۴] وائی کونٹ برائس، ماڈرن ڈیموکراٹیسیز، ص ۶۲ جلد اول۔

[۵] 〃 〃 〃 ۶۸، ۶۹ جلد اول

فی الوقت فطری اور معاشی مساوات کے متعلق بحث مقصود نہیں ہے۔ معاشرتی سیاسی اور مذہبی مساوات پر یہاں روشنی ڈالی جاتی ہے۔

معاشرتی مساوات | معاشرتی مساوات سے مطلب یہ ہے کہ نہ تو از روئے قانون اور نہ از روئے عرف یا رواج مختلف طبقوں اور فرقوں میں کوئی رسمی امتیاز قائم کیا جائے ۔[۵۱]

ممالک متمدنہ جدیدہ اور بالخصوص ناروے، سوئزرلینڈ، ممالک متحدہ امریکہ اور ممالک متحدہ تحت انگلستان میں کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو محض اسکی دولت یا خاندان کی وجہ سے معزز یا حقیر نہیں خیال کرسکتا۔[۵۲] قدیم خاندانی غرور اور روایتی شرافت کو آج دنیا میں زمانہ قدیم کا ایک افسانہ خیال کیا جاتا ہے۔ مسند نشین تاج قیصری، صدارت فرانس و امریکہ اور انگلستان کی وزارت عظمیٰ کا استحقاق ایک معمولی کاشتکار، ایک فلاکت زدہ صناع، ایک محتاج سپاہی اور بے سرمایہ مزدور کو قانوناً حاصل ہے۔ قدیم بندی ذات پات کا تار و پود تو اب بکھرا چلا ہے۔ ہر شخص آزاد ہے کہ وہ جس کام کو چاہے اختیار کرے ۔[۵۳]

وہ منظر کتنا دل آویز تھا جب کہ بطحا کی وادیوں میں یہ آواز اپنی پوری دلکشی کے ساتھ فضا میں گونجی تھی کہ

"لیس للعربی فضل علی العجمی ولا للعجمی فضل علی العربی کلکم ابناء آدم و آدم من تراب ان کل مسلم اخو المسلم وان المسلمین اخوۃ"[۵۴]

(کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم خاک سے بنے تھے، ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور سارے مسلمانوں کی ایک ہی برادری ہے۔ خود حکم قرآنی ہے کہ "انما المؤمنون اخوۃ"[۵۵] نیز صراحت سے یہ بھی مذکور ہے کہ

"یاایھا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثی وجعلناکم شعوبا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم"[۵۶]

مطلب یہ ہے کہ خدا نے سب انسانوں کو مرد اور عورت سے پیدا کیا اور قبیلے اور خاندان بنائے کہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچان لئے جائیں لیکن خدا کے پاس شریف وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

---

[۵۱] وائی کونٹ برائس ماڈرن ڈیموکراسیز، جلد اول ص ۸۰ [۵۲] وائی کونٹ برائس ماڈرن ڈیموکراسیز جلد اول ص ۶۹
[۵۳] جے کے بلنچلی نظریہ سلطنت سلسلہ جامعہ عثمانیہ ص ۶۰ [۵۴] شبلی نعمانی سیرت النبی حصہ اول مجلد دوم طبع سیوم ص ۱۵۱
یہ دو اصل خطبہ حج کا حصہ ہے۔ [۵۵] القرآن سورہ الحجرات ع ۱۔
[۵۶] القرآن سورہ الحجرات ع ۲

اسلام کی یہ معاشرتی مساوات ۱۳½ صدیوں کی طویل مدت اور سینکڑوں انقلابوں کے بعد آج بھی اسی طرح کامل اور مستحکم ہے جیسے کہ ابتدا میں۔ اسکی تازگی اب بھی سرور افزا ہے۔

ہجرت کے بعد انصار اور مہاجرین میں جو مواخات قائم ہوئی تھی وہ دنیا کی تاریخ میں بے مثال ہے

سیاسی مساوات | سیاسی مساوات کا منشا یہ ہے کہ سارے ارکان معاشرہ یا کم از کم معاشرہ کے سب بالغ ذکور کو ملک کے معاملات حکومت میں مساوی حصہ حاصل رہے اور سب افراد ملک حکومت کی ہر خدمت اور ملازمت پر مامور ہونے کے اہل اور مستحق ہوں [1]

زمانہ رسالت پناہی اور نیز زمانہ خلافت راشدہ میں جو عام مجالس شوریٰ منعقد ہوتے تھے اسکا دروازہ سب کیلئے کھلا رہتا تھا۔ اظہار رائے کی سب کو آزادی تھی۔ خلافت کے لئے جو بیعت ہوتی تھی وہ انفرادی ہوتی تھی خلیفہ اور عہدہ داران خلافت کا ہر ایسا فعل جس کا براہ راست کاروبار سلطنت پر اثر پڑتا ہو کھلی اور کھری تنقید سے کسی طرح مستثنیٰ نہیں تھا۔ [2]

سلطنت اسلامی کا ہر عہدہ ہر قابل شخص کے لئے برابر کھلا ہوا تھا۔ چنانچہ رسالت مآب کے زمانہ میں ایک آزاد شدہ غلام حضرت زید بن حارث کا جنگ موتہ کے موقع پر امیر لشکر مقرر ہونا اور عین زمانہ انتقال میں حضرت زید کے صاحب زادے حضرت اسامہ کو لشکر کی امارت پر مامور فرمانا تاریخ اسلام کی درخشاں مثالیں ہیں [3] ان دونوں لشکروں میں کبار صحابہ ماتحت قرار دیئے گئے تھے [4]۔

زمانہ نبوت میں جو اصحاب مختلف عہدوں پر مقرر ہوئے وہ صرف ہاشمی یا قریشی نہیں تھے۔ جو صاحب چاہے وہ کسی قبیلہ کے ہوں جس خدمت کیلئے موزوں اور اہل نظر آگئے انکو اس خدمت پر مامور فرما دیا گیا۔ سلمان فارسی صہیب رومی اور بلال حبشی غلام رہ چکے تھے لیکن اسلامی معاشرہ میں انکی قدر منزلت اکابر قریش سے بڑھ کر تھی۔

اس موقع پر بے محل نہ ہوگا اگر دوسرے عہدہ داروں سے قطع نظر صرف حکام بلاد کے متعلق مختصر صراحت کیجائے یہ بات ذہن نشین رہے کہ اس وقت حکام کے فرائض میں فصل خصومات کا کام بھی تھا۔

---

[1] دانی کونٹ برائس' ماڈرن ڈیموکراٹیسیز' جلد اول ص ۶۰ [2] ان مباحث کے لئے شبلی ملاحظہ ہو الفاروق کی دوسری جلد [3] شبلی نعمانی' سیرت النبی' حصہ اول' مجلد اول طبع سوم ص ۴۶۳ و ۴۶۴ [4] مولانا شبلیؒ نے زمانہ نبوت کے مختلف عہدہ داروں کے نام ایک جگہ جمع کر دیئے ہیں۔ ملاحظہ ہو حصہ اول مجلد دوم ص ۲۲ تا ۲۴ اور از ص ۶۵ تا ص ۷۲

خلفائے راشدین

۱۔ باذان بن ساسان، بہرام گور کی اولاد سے تھے، اور کسریٰ کی جانب سے یمن کے حاکم۔ مسلمان ہوئے تو رسالت پناہ نے ان کو علی حالہ حاکم یمن رہنے دیا اس طرح وہ یمن کے پہلے اسلامی حاکم ہیں۔

۲ شہر بن باذان، باپ کے مرنے کے بعد ان کو صنعاء کا حاکم مقرر فرمایا گیا۔

۳۔ خالد بن سعید بن العاص، اموی تھے۔ نجران اور زمع کے درمیانی علاقوں کے حاکم تھے۔

۴۔ زیاد بن لبید انصاری تھے حضرموت کی حکومت ان کے سپرد تھی۔

۵۔ ابوموسیٰ الاشعری، مہاجرین میں شامل ہیں لیکن قریشی اور مکی نہیں ہیں۔ عدن وغیرہ علاقوں پر مامور تھے

۶۔ معاذ بن جبل انصاری تھے اور قبیلہ خزرج سے تعلق تھا، یمن پر مامور فرمائے گئے۔

۷۔ یعلی بن امیہ التمیمی الحنظلی جند کے حاکم تھے۔

۸۔ عامر بن شہر الھمدانی، خود ھمدان کی حکومت ان کے تفویض ہوئی تھی۔

۹۔ الطاہر بن ابی ہالہ تمیمی قبیلہ بنی اسد کے فرد تھے، عک کے حاکم مقرر ہوئے تھے۔

۱۰۔ یزید بن ابوسفیان اموی (قریشی) تھے تیما کی حکمرانی پر مامور تھے۔[۱]

مزید نام ترک کر دیئے گئے ہیں۔ بہر حال خود اس فہرست سے نظر آئیگا کہ اسلامی حکومت کی عہدہ داریاں سب کے لئے کھلی ہوئی تھیں۔

زمانۂ مابعد میں کسی قابل غلام کے تخت و تاج حاصل کر لینے اور سلطنت و حکمرانی کے نئے قواعد مرتب کرنے کی ایک سے زیادہ مثالیں موجود ہیں[۲]

مدنی مساوات | مدنی مساوات سے مطلب یہ ہے کہ قانون کی نظر میں سارے افراد ملک کی ایک ہی حیثیت ہوتی ہے سارے افراد قوم اس امر کا مساوی حق رکھتے ہیں کہ اپنی ذات، جائداد اور خاندانی تعلقات کے مستحکم رکھنے میں بذریعہ قانون حفاظت حاصل کریں ان کو یہ حق ہے کہ عدالت ملک قانون میں مرافعات دائر کریں[۳]

۱۔ تفصیل حسین عبداللہ باسلامہ مکی کی تالیف "حیاۃ سید العرب" سے ماخوذ ہے جلد ۴، از ص ۲۶۴ تا ۲۶۷ مولانا شبلی سیرۃ النبی ملاحظہ ہو جلد اول حصہ دوم طبع دوم ص ۶۶ و ۶۷ ۲۔ مثلاً سلطان محمود غزنوی غلام زادہ تھا اسکے باپ نے غلامی سے شاہی حاصل کی اور نیز ہندوستان کے شاہان خاندان غلامان کی مثال بھی موجود ہے۔ ۳۔ دائی کونٹ برائس ماڈرن ڈیموکراسیز، جلد اول ص ۶۷۔

جلسوں کی سیادت

(قواعد اور ضوابط)

میر مجلس یا صدر جلسہ

یہ ضروری ہے کہ ہر جلسہ کا ایک صدر ہو۔ مجالس بلدیہ میں میر بلدیہ میر مجلس ہوتا ہے۔ دیگر مقامی مجالس انتظامی (Local governing bodies) میں مقامی مجلس کا صدر صدارت کے فرائض انجام دیتا ہے۔ اسیطرح اُن انجمنوں اور جمعیتوں میں جن کا ایک دستور ہوتا ہے بالعموم یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ صدر انجمن اس کے تمام جلسوں کا بھی صدر ہوتا ہے اگر وہ جلسہ میں موجود ہو۔ لیکن کوئی پبلک جلسہ (جلسۂ عامہ) چاہے تو اپنا صدر خود منتخب کر سکتا ہے۔

چونکہ مسائل پر مناسب غور کرنے اور ان کا تصفیہ کرنے کے لئے جلسہ کی صحیح سیادت نہایت ضروری ہے اس لئے کرسی صدارت کے لئے ایک اہل شخص کا انتخاب بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

ایک میر مجلس میں تین خوبیاں ہونا ضروری ہیں — موقع شناسی (یا مصلحت اندیشی) مستقل مزاجی اور غیر جانبداری۔ جس شخص میں یہ خوبیاں ہوں وہ مطالعہ اور تجربہ کے ذریعہ اُن تمام دوسری خصوصیات کو حاصل کر سکتا ہے جو اس کو صدارت کے عہدہ کا اہل بنانے کیلئے ضروری ہیں۔

میر مجلس میں یہ اہلیت بھی ہونی چاہیئے کہ وہ دستور اور طریقہ کار سے متعلق تمام سوالات کا فوری تصفیہ کر سکے۔ لیکن جب کبھی ایسے سوالات یا مسائل سے متعلق اپنی قطعی رائے دینا ہو جنکے لئے تحقیقات یا ماہرین سے مشورہ کی ضرورت ہو تو ایسا کرنے کے لئے اسے چاہیئے کہ ضروری مدت مانگ لے اور اسکے بعد جس قدر جلد ہو اپنے فیصلہ سے ایوان کو مطلع کر دے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ پبلک جلسوں میں یہ طریقہ اختیار نہیں کیا جا سکتا۔

چونکہ بالعموم میر مجلس کو اپنی رائے یا فیصلہ بلا تامّل دینا پڑتا ہے وہ بعض اوقات قدرتی طور پر غلطیاں بھی کر جاتا ہے۔ بر ایں ہم یہ نہ ہونا چاہیئے کہ غلطی کرنے کا خوف اسکی خود اعتمادی کو متاثر کر دے

اور اسے کمزور بنا دے ۔ چونکہ یہ عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ غیر ارادی غلطیاں ناگزیر ہیں ۔ اور وہ لوگ جو میر مجلس کی غیر جانبداری سے مطمئن ہیں ان غلطیوں کو نظر انداز کر دینگے ۔

ایک غیر جانبدار میر مجلس جلد ہی اس ایوان کا اعتماد اور اس کی خوشنودی حاصل کر لیتا ہے جس کا وہ صدر ہوتا ہے ۔ اعتماد اور خوشنودی حاصل ہونے کے بعد اگر اس کے فیصلوں پر اعتراض بھی کیا جائے تو ہمیشہ اسے اپنے فیصلوں کی تائید میں ایک اکثریت حاصل ہو جائیگی ۔

جلسوں کی نفسیات ایک دلچسپ مضمون ہے لیکن اسے بہت کم سمجھا گیا ہے ۔ بہت لوگ تو اسکے وجود ہی کے قائل نہیں ۔ ہر میر مجلس تجربہ کے ذریعہ یہ فوری معلوم کر لیگا کہ ایک فرد کی طرح ہر جلسہ کا ایک خاص ذہنی رجحان اور ایک خاص جذباتی کیفیت ہوتی ہے ۔ اسے اسکا بھی علم ہو جائیگا کہ ایوان خود اسکے سلوک اور مزاج کا آئینہ دار ہوتا ہے ۔ اگر میر مجلس روکھا پھیکا ، لاپرواہ ، سبک سر اور تنک مزاج ہو تو ارکان جلسہ کارروائی میں کوئی دلچسپی نہیں لینگے ، گڑبڑ پیدا ہو جائیگی ۔ بیہودہ مذاق شروع ہو جائیگا یا شدید بدنظمی پیدا ہو جائیگی ۔ ایک منکسر لیکن وجاہت آمیز انداز ہی تمام موقعوں پر بہترین ثابت ہوگا ۔

میر مجلس کا ایک اہم فرض یہ بھی ہے کہ وہ نظم قائم رکھے اور یہ دیکھے کہ کرسی صدارت کا مناسب احترام کیا جاتا ہے ۔ لیکن اس سلسلہ میں ہر میر مجلس کو یہ ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ دوسروں کو اپنے اقتدار میں رکھنے کے لئے شرط مقدم یہ ہے کہ وہ خود اپنے آپ پر قابو رکھنے کے قابل ہو ۔

جلسہ میں جو کچھ بھی کہا جائے صدر کو چاہیئے کہ اسے غور سے سنے تاکہ وہ بحث کو زیر غور مسئلہ کی حد تک محدود رکھ سکے ۔ بحث میں نا واجب اور تکلیف دہ تکرار کو روک سکے اور اعتراضی سوالات (پوائنٹ آف آرڈر) کے متعلق فوری فیصلہ صادر کر سکے ۔ اسے یہ بھی چاہیئے کہ ایسے بیان کو فوراً واپس لے لینے کا مطالبہ کرے جو نادرست اور توہین آمیز ہو یا جس کے متعلق یہ سمجھا جا سکے کہ وہ غالباً کسی کو دکھ پہنچائیگا ۔

صدر کے حکم کے باوجود اگر کوئی رکن توہین آمیز یا اعتراض انگیز جملوں کو واپس لینے سے انکار کرے تو وہ "گستاخانہ رویہ" کا مرتکب قرار پاتا ہے ۔ اگر صدر اس معاملہ میں کوتاہی یا غفلت کرے تو کوئی رکن جو یہ خیال کرتا ہے کہ مباحثہ میں استعمال کئے ہوئے خاص الفاظ توہین آمیز ہیں تحریک کر سکتا ہے کہ "الفاظ قلمبند کر لئے جائیں" اس تحریک کو یا تو فوراً پیش کرنا چاہیئے یا اُس وقت جبکہ رکن زیر بحث اپنی نشست پر بیٹھ جائے

لیکن بہرصورت تحریک اس سے قبل پیش زدنی چاہئیے کہ کوئی اور رکن صدر کو مخاطب کرے۔

جب کوئی تحریک کہ "الفاظ قلمبند کر لئے جائیں" پیش کر دی جائے تو میر مجلس یہ دریافت کرتا ہے کہ آیا جلسہ کی بھی یہی خواہش ہے۔ اگر ایوان یہ طے کرے کہ "الفاظ قلمبند کر لئے جائیں" تو میر مجلس معتمد یا اہلکار کو ضروری حکم دے دیتا ہے یا خود ہی ان الفاظ کو لکھ لیتا ہے۔ جس رکن کے الفاظ اس طرح قلمبند کر لئے جائیں وہ "گستاخانہ رویہ" کا مرتکب قرار پاتا ہے اور اسے اس کے مطابق سزا دی جاتی ہے۔

لیکن اعتراض انگیز الفاظ کے استعمال کے خلاف یہ طریقہ کار ایسا نہیں ہے کہ پبلک جلسوں میں اس کا استعمال کیا جا سکے۔

میر مجلس کا یہ فرض ہے کہ تمام ایسی تحریکات یا مجوزہ ترمیمات کو "خلاف ضابطہ" قرار دیکر خارج کر دے جو تصفیہ طلب امور و مسائل سے راست تعلق نہ رکھتی ہوں۔ دستوری انجمنوں کے جلسوں میں میر مجلس کو چاہئیے کہ تمام ایسے سوالات و مسائل کو "خلاف ضابطہ" قرار دیکر خارج کر دے جو اس انجمن کے قواعد و ضوابط کے مطابق نہ ہوں۔

کارروائی کی ایک نوبت پر جو تحریکات یا ترمیمات خلاف ضابطہ قرار دے دیجائیں اُنہیں مابعد کسی اور نوبت پر پیش کیا جا سکتا ہے اور اس وقت یہ باضابطہ ہو سکتی ہیں۔ ایسی صورتوں میں میر مجلس کو چاہئیے کہ بشرط ضرورت اس امر کو ایوان پر واضح کر دے۔ نیز اگر ایوان اجازت دیدے تو جلسہ میں ایسی تحریکات بھی پیش کی جا سکتی ہیں جو ان مسائل سے متعلق نہ ہوں جن کے تصفیہ کے لئے جلسہ منعقد کیا گیا ہے۔ ایسی صورتوں میں ایوان ہی کو حق حاصل ہے کہ وہ یہ طے کرے کہ بحث کس وقت یا کس نوبت پر ہو گی۔

ہر تحریک یا ترمیم سے متعلق جس کی تحریک و تائید ہو چکی ہو میر مجلس کو چاہئیے کہ مجلس کے غور کے لئے "مسئلہ بیان کرے" اور بعد میں تصفیہ کے لئے "مسئلہ پیش کرے"۔ کسی امر یا معاملہ کے تصفیہ سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اسے کسی معینہ شکل میں ایوان کے سامنے پیش کیا جائے۔ اور ایوان سے یہ سوال کیا جائے کہ وہ اس کی موافقت میں ہیں یا مخالفت میں۔ مسئلہ یا تو ایک تحریک کی شکل میں ہوتا ہے یا ترمیم کی شکل میں۔ اور جو سوال کیا جاتا ہے وہ دراصل یہ ہوتا ہے "کیا آپ اس کی موافقت میں ہیں؟" یا "کیا آپ اسکی مخالفت میں ہیں؟"۔ پارلیمان میں جو الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں وہ ان سے مختلف ہوتے ہیں لیکن ان کا مطلب یہی ہوتا ہے۔ الفاظ یہ ہیں "جتنوں کو اس رائے سے اتفاق ہے "ہاں" کہیں" "جتنوں کو اس رائے سے اختلاف ہے "نا" کہیں"

جب کسی تحریک کی تحریک و تائید ہو چکی ہو تو میر مجلس حسب ذیل طریقہ پر مسئلہ بیان کرتا ہے "مسئلہ یہ ہے (تب وہ تحریک کے الفاظ پڑھتا ہے)"۔ پارلیمان میں اسے صدر نشین یا کرسی کی جانب سے تحریک کرنا کہتے ہیں۔ اور یہ اسلئے کہ صدر نشین مسئلہ کو رائے شماری کے لئے پیش نہیں کر رہا ہے بلکہ اسے صرف بیان کر رہا ہے تاکہ اراکین اس مسئلہ کو سمجھ لیں جس کے متعلق ان سے بعد میں رائے طلب کی جائیگی۔

جب کسی تحریک سے متعلق ترمیم کی تحریک اور تائید کی جائے تو خطیب (اسپیکر) حسب ذیل الفاظ میں مسئلہ بیان کرتا ہے۔

"ابتدائی مسئلہ یہ تھا (وہ ابتدائی تجویز کے الفاظ بیان کرتا ہے) اب بطور ترمیم کے یہ تجویز کیگئی ہے کہ (ترمیم کی تشریح کرتا ہے)۔ اب مسئلہ یہ ہے (ترمیم کی نوعیت کے لحاظ سے نیا مسئلہ بیان کرتا ہے)"

[دیکھئے باب تحریکات اور ترمیمات]

جب میر مجلس کسی مسئلہ پر رائے شماری شروع کرتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ "وہ مسئلہ پیش کر رہا ہے" مسئلہ حسب ذیل طریقہ پر پیش کیا جاتا ہے۔

میر مجلس مسئلہ کو انہیں الفاظ میں دہراتا ہے جن کے ذریعہ وہ مسئلہ "بیان" کرتا ہے اور پھر یہ الفاظ استعمال کرتا ہے "جتنوں کو اس رائے سے اتفاق ہے ہاں کہیں۔ جتنوں کو اس رائے سے اختلاف ہے نا کہیں"۔

"ہاں" اور "نا" کی آوازوں کو سن لینے کے بعد میر مجلس اعلان کرتا ہے کہ اسکی رائے میں "ہاں والوں کی جیت ہے" یا "ناوالوں کی جیت ہے" ["موافق آراء کا غلبہ ہے" یا "مخالف آراء کا غلبہ ہے"]

اگر ایوان میر مجلس کی رائے سے اتفاق کرلے تو وہ قطعی ہو گی جس کے بعد وہ حسبۂ اعلان کرتا ہے کہ آیا "ہاں والوں کی جیت ہے" یا "ناوالوں کی جیت ہے"۔ لیکن اگر کسی رکن کو میر مجلس کی رائے سے اتفاق نہ ہو تو وہ "تقسیم" کا مطالبہ کرسکتا ہے اور آراء کو قلمبند کرا سکتا ہے۔ (دیکھئے باب تقسیم)

مسئلہ کو پیش کرنے کا سب سے زیادہ شاندار اور وقار آمیز طریقہ وہ ہے جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے یعنی "جتنوں کو اس رائے سے اتفاق ہے ہاں کہیں جتنوں کو اس رائے سے اختلاف ہے نا کہیں"۔ لیکن عملاً اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ یہ طریقہ بہت سست کار ہے بالخصوص اس وقت جبکہ معمولی اہمیت کے یا تفصیل طلب مسائل زیر بحث ہوں۔ اور کرسی صدارت سے متعدد مسائل یکے بعد دیگرے پیش کرنے ہوں۔ ان موقعوں پر زیادہ

مختصر فقرے استعمال کرنا مناسب سمجھا گیا ہے مثلاً موافق ہاں کہیں، مخالف نا کہیں۔ دانشمندی اس میں ہے کہ میر مجلس دونوں قسم کے فقروں کو حالات کی نوعیت کے اعتبار سے استعمال کرے یعنی مفصل فقرہ جب کہ وہ غور کرنے کے لئے وقت دینا چاہتا ہو اور مختصر فقرہ جبکہ وہ کارروائی جلد کرنا چاہتا ہو۔

میر مجلس کے لئے یہ نہایت ضروری اور اہم ہے کہ وہ واضح اور مستحکم لہجہ میں پڑھے اور تقریر کرے۔ کارروائی کے دوران میں اس کو چاہیئے کہ حزم واحتیاط کے ساتھ آگے بڑھے اور بحث کے لئے اور ضرورت ہو تو مکرر بحث کیلئے ایوان کو موقع دے۔ جب کبھی ایوان سے مخاطب ہو تو اس کو چاہیئے کہ استادہ ہو جائے اور دوسروں کو بیٹھنے کی اجازت دیدے یا انہیں اُٹھنے نہ دے۔ تاکہ اس کی تقریر کو توجہ اور احترام کے ساتھ سُنا جائے۔ مسئلہ پیش کرنے کے دوران میں اسے چاہیئے کہ وہ ہر شخص کو جو مباحثہ جاری رکھنا چاہے اس کی اجازت دے تاآنکہ وہ آوازوں کے مطابق رائے شمار نہ کرلے اور اس اثنا میں خود نشست پر بیٹھ جائے۔

اگرچیکہ میر مجلس کے فرائض میں سے یہ نہیں ہے کہ وہ بحث کی دعوت دے یا یہ دریافت کرے کہ کوئی ترمیمات ہیں یا نہیں لیکن اگر وہ مناسب سمجھے تو ایسا کر سکتا ہے۔ بعض مواقع ایسے بھی آتے ہیں جبکہ میر مجلس یہ محسوس کرتا ہے کہ ایوان کا طرز عمل یا رُجحان مذبذب ہے۔ ایسے موقعوں پر بہتر طریقہ یہ ہوگا کہ وہ کارروائی کو ڈھیل دے تاکہ بحث پیدا ہو۔ ایک مصلحت اندیش میر مجلس جذبات کو ٹھیس لگائے بغیر جھجکنے والوں کے حوصلے بڑھانے اور کّی اشخاص کو بکواس سے باز رکھنے کے لئے بہت کچھ کر سکتا ہے۔ کیونکہ مباحث کے سلسلہ میں اسے وسیع اختیارات حاصل رہتے ہیں۔

بہر حال قاعدہ یہ ہے کہ جونہی ایک رکن اپنی نشست پر بیٹھ جائے میر مجلس فوراً مسئلہ پیش کرے بجز اس صورت کے کہ کوئی دوسرا رکن ایوان کو مخاطب کرنے کے لئے کھڑا ہو۔

اگر میر مجلس اس جماعت یا انجمن کا رکن ہو جس کے زیر اہتمام دستور کے تحت جلسہ منعقد کیا گیا ہے۔ اور وہ کسی مسئلہ پر بحث کرنا چاہے تو اسے چاہیئے کہ اپنا قائم مقام مقرر کرنے کے بعد بشرطیکہ ایک نائب میر مجلس پہلے ہی سے منتخب یا مقرر نہ کیا جا چکا ہو، وہ اپنی کرسی چھوڑ دے۔

۲۔ پبلک جلسے یا جلسہ ہائے عامہ

ایک پبلک جلسہ بالعموم اعلان کے ذریعہ طلب کیا جاتا ہے۔ جمع ہونے کے بعد اس کا فرض ہے کہ وہ لیتا ہے

ایک صدر کا انتخاب کر لیتے ہیں
وہ میر مجلس کا انتخاب کرے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ داعیان جلسہ پہلے ہی سے
اور انعقاد جلسہ کے اشتہار میں اسکے نام کی صراحت ہونے کی وجہ سے وہ صدارت کے فرائض انجام دیتا
ہے۔ یہ طریقہ پسندیدہ ضرور ہے لیکن اس کے باوجود بہر حال جلسہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جسے چاہے
میر مجلس منتخب کرے۔ یہ حق مسلمہ ہے اور آسانی سے اسکی پابندی کرائی جاسکتی ہے۔ کیونکہ اگر حاضرین کی
اکثریت میر مجلس کے خلاف ہو تو جلسہ کی کارروائی ہرگز آگے نہیں بڑھ سکیگی۔

پبلک جلسوں کی صدارت بالعموم میر بلد یا کوئی دوسرا پبلک عہدہ دار بحیثیت عہدہ کرتا ہے
لیکن یہ امر جلسہ کے اپنا صدر خود آپ منتخب کرنے کے حق پر اثر انداز نہیں ہوسکتا۔ ایسی صورت میں ایک تحریک
کہ "جناب . . . . اس جلسہ کی صدارت فرمائیں" پیش کی جانی چاہیئے جسکی تائید کے بعد جلسہ کی
اکثریت کی منظوری ضروری ہے۔

صدر کے کرسئ صدارت پر بیٹھ جانے کے بعد کارروائی اسی ترتیب میں ہوگی جس ترتیب میں داعیان
جلسہ مسائل تصفیہ شدنی کو پیش کریں بجز اس کے کہ جلسہ اسکے خلاف طے کرے۔ ایسی صورت میں جلسہ یہ بھی طے
کرتا ہے کہ کارروائی کی ترتیب کیا ہوگی۔

چونکہ پبلک جلسے اشخاص کی غیر معینہ و غیر محدود تعداد پر مشتمل ہوتے ہیں اس لئے کاروبار انجام دینے
کے لئے "نصاب" کی پابندی ضروری نہیں ہے۔ جونہی صدر کرسئ صدارت پر بیٹھ جاتا ہے جلسہ شروع ہوجاتا ہے
اور جونہی وہ کرسئ صدارت چھوڑ دیتا ہے جلسہ ختم ہوجاتا ہے چاہے حاضرین کی تعداد کچھ ہی ہو۔

کرسئ صدارت پر بیٹھنے کے بعد صدر ان رسمی امور کا تصفیہ کر دیتا ہے جو لائق توجہ ہوں اور پھر
داعیان جلسہ میں سے کسی ایک سے یا اس شخص سے جو اس مقصد کے لئے مقرر کیا گیا ہو خواہش کرتا ہے کہ وہ ایک
تحریک پیش کرے۔ اس کی تحریک اور تائید ہوجانے کے بعد تحریک عام مباحثہ اور ترمیم کے لئے ایوان کے
سامنے ہوتی ہے۔ اور اس پر اٹھے ہوئے ہاتھوں کے ذریعہ رائے شماری کی جاتی ہے اگر "ہاں" اور "نا" کی
آوازوں کے مطابق دی ہوئی صدر کی رائے سے اختلاف کیا جائے۔ اس طور پر جلسہ کی کارروائی آگے
بڑھتی رہتی ہے یہانتک کہ تمام مسائل کا تصفیہ ہوجائے یا جلسہ ملتوی کر دیا جائے [دیکھئے باب مباحثہ]

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ میر مجلس کو بیک وقت تحریک ترمیم اور متعدد مزید ترمیمات سے

سابقہ پڑتا ہے اور چونکہ پبلک جلسہ کی کارروائیاں پارلیمانی دستور کی روشنی میں کم و بیش بے قاعدہ ہوتی ہیں۔ اکثر اس کی وجہ سے الجھن پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسی صورتِ حال کے حل کا سادہ اور موثر طریقہ یہ ہے کہ میرِ مجلس سب سے پہلے اصلی تحریک پر رائے شماری کرے۔ اور اگر وہ نامنظور ہو جائے تو پھر ترمیمات کو اسی ترتیب میں پیش کرے جس ترتیب میں وہ اسے وصول ہوئی ہیں۔ اکثر اوقات تجاویز جو برائے نام ترمیمات کی شکل میں پیش کی جاتی ہیں درحقیقت جداگانہ تحریکوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ عملاً اس کے مساوی ہیں کہ اصلی تحریک کے پہلے پانچ الفاظ (اس جلسہ کی رائے میں) کے بعد کے تمام الفاظ کو خارج کر کے انکی بجائے الفاظ درج کر دیئے جائیں

پارلیمان میں اس قسم کی ترمیمات کی صورت میں حسب ذیل طریقہ پر عمل کیا جاتا ہے خطیب (اسپیکر پارلیمان کا میرِ مجلس) مسئلہ کو اسطرح بیان کرتا ہے "اصل مسئلہ یہ تھا (تب اصلی تحریک پڑھتا ہے) اب بطور ترمیم یہ تجویز کی گئی ہے کہ الفاظ "اس جلسہ کی رائے میں" (پہلے پانچ الفاظ) کے بعد کے تمام الفاظ خارج کر دیئے جائیں اور ان کی بجائے ذیل کے الفاظ درج کر دیئے جائیں (ترمیم کے الفاظ پڑھتا ہے) اب مسئلہ یہ ہے کہ جن الفاظ کو خارج کرنے کی تجویز کی گئی ہے وہ مسئلہ کا جزو رہینگے" (یعنی اصلی تحریک قائم رہے گی) اب اگر رائے شماری کرنے کے بعد یہ پایا جائے کہ موافق آراء کا غلبہ ہے (ہاں والوں کی جیت ہے) تو اصلی تحریک کے الفاظ برقرار رہتے ہیں اور۔ اب ان میں کوئی ترمیم نہیں ہو سکتی اور اس لئے اصلی تحریک سے متعلق تمام مجوزہ ترمیمات مسترد ہو جاتی ہیں تاوقتیکہ جب کسی جلسہ کا صدر ترمیمات کے پیش ہونے کی صورت میں اصلی تحریک کو پہلے پیش کرے تو وہ درحقیقت ایک بدلی ہوئی شکل میں پارلیمانی ضابطہ کے مطابق عمل کر رہا ہے [دیکھئے باب تحریکات و ترمیمات]

اگر رائے شماری کے بعد یہ پایا جائے کہ "نا والوں کی جیت ہے" (مخالف آراء کا غلبہ ہے) تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اصلی تحریک کے الفاظ برقرار نہیں رہ سکتے۔ اس لئے ان کو تحریک سے خارج کر دیا جاتا ہے اور ترمیم کے الفاظ خود تحریک بن جاتے ہیں اور پھر ان کے ساتھ وہی طریقہ کار اختیار کیا جاتا ہے جو اصلی تحریک کی صورت میں کیا گیا تھا۔

ایک حد تک یہ عام قاعدہ ہو گیا ہے کہ ایسی ترمیمات کے سلسلہ میں جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے پہلے ترمیمات کو پیش کیا جائے اور اصل تحریک کو روک لیا جائے۔ یہاں تک کہ تمام ایسی مجوزہ ترمیمات خارج ہو جائیں

ان میں سے کوئی منظور ہو جائے۔ اس طریقہ میں جو دشواریاں ہیں وہ ذرا سے غور و تامل کے بعد واضح ہو جائیگی
یہ ممکن ہے کہ جلسہ کی اکثریت تحریک کی موافقت میں ہو۔ ایسی صورت میں اصل تحریک پر رائے لی جائے تو وہ
منظور ہو جائیگی اور مسائل تصفیہ شدنی کا اتنا حصہ ختم ہو جائیگا۔ لیکن اگر مذکورہ بالا قسم کی ترمیمات کو مقدم کیا
گیا تو چونکہ ترمیمات کی تعداد پر کوئی حد قائم نہیں کی جاسکتی جلسہ کی ایک اقلیت شرارتاً چاہے تو کارروائی کی
ترقی میں رکاوٹ پیدا کر سکتی ہے اور اصل تحریک پر جس پر غور کرنے کیلئے جلسہ طلب کیا گیا ہے قطعی اور فوری
رائے دینے سے جلسہ کو روک سکتی ہے۔

ایک طریقہ کار کو جو صحیح یا غلط رواج پا چکا ہو بدلنا آسان کام نہیں ہے۔ اس لئے ایک میر مجلس کو
یہ ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ اگر وہ تجویز کے مطابق سب سے پہلے اصل تحریک پر رائے شماری کرے تو اس کے عمل پر
اعتراض کیا جائیگا لیکن یہ واضح کر دینے کے بعد کہ وہ پارلیمانی ضابطہ کے مطابق چل رہا ہے اعتراض باقی نہ
رہنا چاہیئے۔ اگر ضرورت ہو تو وہ جلسہ کو صورت حال سمجھا سکتا ہے اور اس مسئلہ پر اُن کی رائے بھی لے سکتا ہے کہ
آیا وہ پہلے اصل تحریک پر غور کرنا پسند کرتے ہیں یا مجوزہ ترمیم پر۔

۳۔ آئین والی جماعتوں کے جلسے

پارلیمانی ضابطہ کو پبلک جلسوں کی بہ نسبت بلدیہ اور دیگر مقامی مجالس انتظامی یا انوں مزدور
تنظیموں مباحثہ اور کھیل کی انجمنوں اور نمائندوں کی کانفرنسوں میں زیادہ مکمل طریقہ پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔
اُن تنظیموں یا جماعتوں کے ارکین جو پابندی سے جمع ہوتے رہتے ہیں بہت جلد اس طریقہ کار سے
واقف اور مانوس ہو جاتے ہیں جو اختیار کیا جائے۔ اس لئے یہ اچھا ہوگا کہ جو بھی ضابطہ مرتب کیا جائے
وہ بہترین ہو۔

عام طور پر جو طریقے اختیار کئے جاتے ہیں جانچ کرنے پر معلوم ہوگا کہ وہ ایک حد تک پارلیمانی ضابطہ
پر منحصر ہوتے ہیں لیکن اکثر وہ بہت نامکمل ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ارکین غلط تصورات اور ارتسامات
حاصل کر لیتے ہیں جنکا بعد میں دور کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ پارلیمانی ضابطہ موجودہ طریقہ ہائے کار میں بہترین
ہے اور کسی تنظیم یافتہ جماعت کے جلسوں میں اس کے استعمال سے اس کے ارکین کی اچھی تربیت ہوگی۔
مناسب طریقہ پر تشکیل پائی ہوئی جماعتیں جماعت کے قواعد و ضوابط کی پابند ہوتی ہیں اور دیگر امور کے

منجملہ قواعد میں یہ صراحت بھی ہوتی ہے کہ کسی جلسہ میں مسائل کا تصفیہ کرنے کے لئے کم از کم کتنے اراکین کی موجودگی ضروری ہے۔ اس اقل تعداد کو "نصاب" کہتے ہیں۔

اگر کسی وقت یہ توجہ دلائی جائے کہ نصاب مکمل نہیں ہے تو میر مجلس کو چاہئیے کہ گنتی کرکے یہ یقین کرلے کہ حاضرین کی تعداد حقیقتاً نصاب سے کم ہے اس کے بعد اسے چاہئیے کہ حاضر اراکین کے نام قلمبند کرلے اور کوئی مسئلہ پیش کئے بغیر اعلان کردے کہ جلسہ ملتوی کیا جاتا ہے۔

کسی جلسہ میں نصاب پورا ہونے کی صورت میں صدر کرسیٔ صدارت پر بیٹھ جاتا ہے۔ جلسہ میں کارروائی کا طریقہ بالعموم حسب ذیل ہوتا ہے۔

سابقہ جلسہ کی روئداد پڑھ کر سنائی اور اس کی توثیق کی جاتی ہے، یا اگر کہیں غلطی ہو تو اسکی ترمیم کردی جاتی ہے اور ہر ترمیمہ صورت میں جلسہ کی جانب سے اسکی توثیق عمل میں آتی ہے اور میر مجلس اس پر اپنے دستخط ثبت کرتا ہے اسکے بعد رسمی امور انجام پاتے ہیں مراسلات پڑھے جاتے ہیں اور ان کے متعلق تصفیہ کیا جاتا ہے۔ پھر ان تحریکات پر غور کیا جاتا ہے جنکی اطلاع (نوٹس) دی جا چکی ہو۔ بقیہ امور اسی ترتیب میں پیش کئے جاتے ہیں جس ترتیب میں کہ وہ مطبوعہ یا تحریر شدہ نظام نامہ میں درج ہوں اور جب کوئی نظام نامہ مرتب نہ کیا گیا ہو تو ہو اس ترتیب میں طے پاتے ہیں جس ترتیب میں میر مجلس انہیں پیش کرے۔

کسی مسئلہ پر کوئی مباحثہ اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک کہ اسکی تحریک اور تائید نہ ہو چکی ہو اور میر مجلس نے اسے پڑھکر اس سے متعلق مسئلہ بیان نہ کردیا ہو (دیکھئیے باب تحریکات و ترمیمات)۔ جب تک کہ یہ نہ ہو صرف محرک اور موئید کو تقریر کرنے کا حق ہوتا ہے اور ان کی تقریریں صرف تحریک کی موافقت میں ہونی چاہئیں۔

۴۔ تحریکات و ترمیمات

(الف) تحریکات

اگر کسی تحریک کی قبل از قبل اطلاع نہ دی گئی ہو تو تاوقتیکہ جلسہ سے اسکی اجازت طلب نہ کی جائے اور جلسہ اجازت نہ دیدے اس پر غور نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن قاعدہ ان تحریکات پر اثر انداز نہیں ہوتا جو ان امور و مسائل سے متعلق ہوں جن پر غور کرنے کے لئے جماعت کے اراکین جمع ہوئے ہیں۔

کسی رکن کی جانب سے تحریک کی اطلاع (نوٹس) دینے کے معنی یہ ہیں کہ وہ جس جلسہ میں تحریک پیش کرنا چاہتا ہو

اس سے سابق کے کسی جلسہ میں اس تحریک کو پڑھ دے اور اسکی ایک نقل جس پر اس کے دستخط ثبت ہوں میر مجلس کے حوالہ کر دے۔

تحریک کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے۔ ایک باقاعدہ تجویز جو ایک غور کرنے والے اجتماع میں پیش کی گئی ہو۔ تحریک کی عبارت "الفاظ" "اس جلسہ کی رائے میں" کے ساتھ شروع ہونی چاہیے اور اسے اثباتی ہونا چاہیے۔ یعنی کوشش یہ کرنی چاہیئے کہ تحریک کے الفاظ جلسہ کے منشا کو اثباتی شکل میں پیش کریں۔

میر مجلس کو چاہیئے کہ وہ ہر اس تحریک سے متعلق جس کی تحریک و تائید ہو چکی ہو اس پر مباحثہ سے قبل مسئلہ بیان کرے اور جب اس تحریک پر مباحث ختم ہو جائیں یا کوئی مباحث نہ ہوں تو وہ مسئلہ کو دوبارہ ان کے سامنے رائے شماری کے لئے انہی الفاظ میں پیش کرے جن الفاظ میں اس نے اراکین کی اطلاع کے لئے مسئلہ بیان کیا تھا۔

جب ایک تجویز کی تحریک و تائید ہو چکی تو میر مجلس مسئلہ اسطرح بیان کرتا ہے "مسئلہ یہ ہے کہ (تحریک کے الفاظ پڑھتا ہے)۔ تاوقتیکہ ایک تحریک کی تائید نہ کی جائے میر مجلس مباحث کا آغاز نہیں کرتا بجز اسکے کہ وہ ضرورت سمجھے تو یہ دریافت کرسکتا ہے کیا کوئی رکن اسکی تائید کرتا ہے"؟ جس تحریک کی تائید نہ ہو وہ خود بخود ساقط ہو جاتی ہے (یا گر جاتی ہے)

پارلیمان میں جب خطیب مسئلہ کو اراکین کی اطلاع کے لئے بیان کرتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ وہ ایسے "تجویز کرتا ہے" "ایک مسئلہ کو" "تجویز کرنے" کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایوان واضح طور پر یہ جان لے کہ کس مسئلہ پر غور کرنا ہے اور کس تحریک سے متعلق اسکو اپنی رائے دینا ہوگا۔

جب خطیب کسی مسئلہ یا تحریک پر رائے لینے لگتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ وہ "مسئلہ پیش کرتا ہے"۔ وہ مسئلہ اس طرح پیش کرتا ہے "مسئلہ یہ ہے (تحریک کے الفاظ پڑھتا ہے)۔ جتنوں کو اس رائے سے اتفاق ہے "ہاں" کہیں جتنوں کو اس رائے سے اختلاف ہے "نا" کہیں" وہ چاہے تو مختصراً یوں کہہ سکتا ہے "موافق ہاں کہیں مخالف نا"

ہاں اور نا کی آوازوں کو سنکر خطیب اعلان کرتا ہے کہ آیا اس کی رائے میں "ہاں والوں کی جیت ہے" یا "نا والوں کی جیت ہے" اس رائے سے اگر کسی کو اختلاف نہ ہو تو اسے قطعی تسلیم کر لیا جاتا ہے۔

جن الفاظ میں اور جس طریقہ پر خطیب کی رائے پر اعتراض کیا جاتا ہے وہ پہلی دفعہ سننے والے کو بہت

بداخلاقانہ اور غیر مہذب معلوم ہونگے۔ خطیب اعلان کرتا ہے کہ "ہاں والوں کی جیت ہے" تب ایک رکن جس نے اپنی صدا "نا" والوں کے ساتھ لگائی تھی چیختا ہے "نا والوں کی جیت ہے" بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خطیب کو قطعی طور پر جھٹلایا جا رہا ہے۔ لیکن وہ اس اعتراض کو ایک دوستانہ اسپرٹ میں قبول کر لیتا ہے۔

جب خطیب کی رائے پر اعتراض کیا جائے تو وہ مسئلہ کو دوبارہ پیش کرتا ہے اور اراکین میں سے چند کو بحیثیت رائے شمار کنندہ نامزد کر لیتا ہے "تقسیم" عمل میں آتی ہے اور مسئلہ کا تصفیہ ان رایوں کے مطابق ہوتا ہے جو اس کی موافقت یا مخالفت میں دی جاتی ہیں۔ (دیکھو باب تقسیم)

جب کبھی خطیب سے استدعا کی جائے یا وہ خود ضرورت سمجھے وہ اراکین کے علم کے لئے ایک مسئلہ تجویز کرتا ہے یا بالفاظ دیگر بیان کرتا ہے۔ بار بار اس کا اعادہ مفید ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ اس سے اراکین پر مسئلہ کی اہمیت اور اس کا حقیقی منشاء واضح ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ مسئلہ کو صرف ایک مرتبہ پیش کرتا ہے یعنی اس وقت جبکہ وہ "ہاں" اور "نا" کی آوازیں شمار کرتا ہے۔ یا اعتراض کئے جانے پر "تقسیم" کے ذریعہ مسئلہ کا تصفیہ کرتا ہے۔

مسئلہ کو بیان کرنے اور اس کو پیش کرنے میں جو فرق ہے اسے کسی سابقہ باب میں بتا دیا گیا ہے لیکن چونکہ یہ ایک اہم امر ہے صدر نشین کو چاہئیے کہ جب بھی ضرورت ہو اس فرق کو سمجھا دے اور ایوان پر یہ واضح کر دے کہ مسئلہ کو بیان کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ مباحث کے لئے موقعہ نہیں دینا چاہتا بلکہ اس کے برعکس مباحث کو صحیح طور پر سمجھنے اور اس کو جاری رکھنے کے لئے مسئلہ بیان کیا جاتا ہے۔

کسی مسئلہ کو یا تو منظور کیا جاتا ہے یا نامنظور۔ جبکہ جلسہ کی اکثریت مسئلہ کے خلاف ہو تو اسے "نامنظور کرنا" کہتے ہیں۔ نامنظور کئے ہوئے کسی مسئلہ پر دوبارہ بھی غور کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ اس خصوص میں ایک تجویز پر اتفاق کر لیا جائے یا ایسا کرنے کیلئے جلسہ اجازت دیدے۔

ایک جامع تحریک کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ پایا جائیگا کہ یا تو اس میں ایک سے زیادہ تجاویز ہیں یا وہ پیچیدہ قسم کی تحریک ہے۔ ایسی صورتوں میں میر مجلس کو ایوان پر یہ واضح کر دینا چاہیئے کہ تحریک کو مناسب حصوں میں تقسیم کر دینا ضروری ہے۔ اسے یہ بھی بتا دینا چاہئیے کہ وہ کسطرح تقسیم کرنا چاہتا ہے۔ ان حصوں کو پہلے علیحدہ علیحدہ پیش کرنے کے بعد تحریک کو مجموعی حیثیت سے پیش کرنا چاہیئے۔ میر مجلس کو چاہئیے کہ اس طریقہ کا بھی اظہار کر دے لیکن جب کبھی میر مجلس سے استدعا کی جائے اسے چاہئیے کہ وہ تحریک کو ایسے حصوں میں پیش کرے

جس کی ایوان خواہش کرے۔ لیکن اصول یا قاعدہ یہ ہو کہ صرف پیچیدہ سوالات کی تقسیم اسطرح عمل میں آئے۔
طول طویل تحریکات یا ترمیمات تحریری ہونی چاہئیں اور ان پر محرک کے دستخط بھی ثبت ہونا چاہیئے۔
جب وہ زبانی بیان کی جائیں تو میر مجلس کو چاہیئے کہ انہیں لکھ لے اور ایوان کے سامنے پڑھ دے۔

جب ایک تجویز کی تحریک اور تائید ہو جائے اور میر مجلس اس کی بنا پر مسئلہ بھی بیان کر دے تو پھر وہ تجویز ایوان کی ملک ہو جاتی ہے اور تاوقتیکہ ایوان اسکی اجازت نہ دے واپس نہیں لی جا سکتی۔ پارلیمان میں ایسی اجازت بالاتفاق ہونی چاہیئے اور اس لئے ایک واحد "نا" اجازت سے انکار تصور کیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ ایسا ہے کہ اسکے ذریعہ شرارت کرنے والے اراکین کو رکاوٹ پیدا کرنے کا موقع ملجاتا ہے لیکن اس میں ترمیم کی جا سکتی ہے اور نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔ تجویز یہ ہے کہ اگر اجازت سے انکار کیا جائے تو میر مجلس رائے لے لے اور اکثریت کے موافق اس کا فیصلہ کر دے۔

بالعموم ہر تحریک میں ترمیم کی جا سکتی ہے۔ لیکن چند رسمی تحریکات اس سے مستثنیٰ ہیں مثلاً
(ا) یہ کہ میر مجلس صاحب براہ کرم کرسی چھوڑ دیں۔ (ب) یہ کہ جلسہ ملتوی کر دیا جائے"۔
لیکن اگر تحریک التوا آئندہ جلسہ کیلئے وقت او مقام کا تعین کرے تو اس تحریک میں صرف وقت او مقام کی حد تک ترمیم کی جا سکتی ہے۔

(ب) ترمیمات

ترمیم کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے۔ ایک تحریک میں تبدیلی یا مجوزہ تبدیلی ترمیم ہے۔ ایک تجویز میں کئی طریقوں سے ترمیم کی جا سکتی ہے۔
(ا) الفاظ کو خارج کر کے۔ (ب) نئے الفاظ داخل کر کے۔ (ج) چند الفاظ خارج کر کے اور اُن کی بجائے نئے الفاظ درج کر کے (د) تحریک کے آخر میں الفاظ بڑھا کے۔ (ھ) پہلے پانچ الفاظ اِس جلسہ کی رائے میں' کے بعد کے تمام الفاظ خارج کر کے اور ان کی بجائے اس مسئلہ سے متعلق نئے الفاظ درج کر کے۔

میر مجلس کو چاہیئے کہ ہر تجویز کے متعلق جسکی تحریک اور تائید ہو چکی ہو ایوان کے سامنے مسئلہ بیان کر دے۔
جب ایک تحریک کے سلسلہ میں ایک سے زیادہ ترمیمات پیش کی جائیں تو میر مجلس ترمیمات کو ایک ایک کر کے اسی ترتیب میں پیش کرتا ہے جس میں کہ وہ پہلے لفظ سے شروع کر کے تحریک کے الفاظ پر اثر انداز ہوں۔ یعنی ایک ایسی ترمیم جو تحریک کے پہلے لفظ کو متاثر کرتی ہو باقی تمام ترمیمات پر قابل ترجیح ہے۔ اسیطرح پانچویں لفظ یا بعد الفاظ کو

متاثر کرنے والی ترمیم پر وہ ترمیم قابل ترجیح ہے جو پچھلے اس سے پہلے کے الفاظ کو متاثر کرتی ہو۔ وقس علیٰ ہذا۔
اگر کسی تجویز کے ایک حصہ میں ترمیم منظور کی جا چکی ہو تو ماقبل کے کسی حصہ میں پھر ترمیم نہیں ہو سکتی۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ ارکین اس کا اطمینان کرلیں کہ میر مجلس ترمیمات کو صحیح ترتیب میں وصول اور پیش کرتا ہے۔

جب ایک ترمیم کی تحریک کی جا چکی ہو اور یہ علم ہو جائے کہ ایک رکن "مقدم ترمیم"[1] پیش کرنا چاہتا ہے تو قاعدہ یہ ہے کہ زیر بحث ترمیم کا محرک اخلاقاً اپنی ترمیم کو عارضی طور پر واپس لے لے لیکن ایسا کرنے کیلئے اسے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

پارلیمانی طریقہ کار کے مطابق تحریکات اور ترمیمات کا جس طرح تصفیہ کیا جاتا ہے ایک مثال کے ذریعہ نہایت اچھی طرح اس کی وضاحت ہو جائے گی۔

فرض کیجئے کہ ایک رکن نے حسب ذیل تحریک پیش کی ہے اور اسکی موافقت میں تقریر بھی کر چکا ہے۔
"اس جلسہ کی رائے میں اس جماعت کے جلسوں کی اہم تر کارروائیاں پارلیمانی ضابطہ کے مطابق چلائی جائیں"۔
ایک رکن تحریک کی تائید کرتا ہے اور موافقت میں تقریر بھی کرتا ہے یا صرف تائید کرتا ہے اور حق تقریر کو آیندہ کے لئے محفوظ رکھتا ہے۔

تب میر مجلس مسئلہ بیان کرتا ہے۔ وہ کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے "مسئلہ یہ ہے (تحریک پڑھتا ہے)"
اگر کوئی مباحثہ نہ ہو تو وہ بلا تاخیر حسب ذیل الفاظ میں مسئلہ پیش کرتا ہے۔
"مسئلہ یہ ہے (تحریک پڑھتا ہے) جتنوں کو اس رائے سے اتفاق ہے 'ہاں' کہیں 'جتنوں کو اس رائے سے اختلاف ہے 'نا' کہیں۔ تب وہ آوازوں یا آراء کے مطابق جو بھی صورت ہو مسئلہ کا تصفیہ کر دیتا ہے۔

مثال کو مکمل کرنے کی خاطر ہم یہ فرض کرینگے کہ مباحثہ ہوتا ہے اور ایک رکن ترمیم (ا) پیش کرتا ہے وہ تحریک کرتا ہے کہ الفاظ "اہم تر" خارج کر دیے جائیں۔ ترمیم کی تائید ہو جانے پر میر مجلس مسئلہ بیان کرتا ہے
"اصلی مسئلہ یہ تھا (تحریک پڑھتا ہے) اب بطور ترمیم تجویز کی گئی ہے کہ الفاظ "اہم تر" خارج کر دیئے جائیں۔ مسئلہ اس لئے اب یہ ہے کہ جن الفاظ کے خارج کرنے کی تجویز کی گئی ہے وہ مسئلہ کا جز رہینگے"
مباحثہ جاری رہتا ہے۔ ختم پر میر مجلس مسئلہ پیش کرتا ہے۔ ایسا کرنے میں وہ تمام وہ الفاظ دہراتا ہے

---

[1] "مقدم ترمیم" ایسی ترمیم ہے جو اصلی تحریک کے اس حصہ پر اثر انداز ہوتی ہے جو زیر بحث ترمیم سے متاثر شدہ حصہ کے ماقبل ہو۔

"... پہلے مسئلہ بیان کرنے میں استعمال کئے تھے۔ اور کہتا ہے" جتنوں کو اس رائے اتفاق ہے ہاں کہیں جتنوں کو اس رائے سے اختلاف ہے ناکہیں" رائے شماری کے نتیجہ کے مطابق وہ یہ اعلان کرتا ہے کہ آیا" ہاں والوں کی جیت ہے" یا" ناوالوں کی جیت ہے"۔ اگر یہ پایا جائے کہ ہاں والوں کی جیت ہے" تو الفاظ" اہم تر" خارج نہیں کئے جاتے وہ قائم رہتے ہیں اور بعد میں ہرگز نہیں بدلے جا سکتے۔ اور نہ ہی الفاظ" اہم تر" سے ما قبل تحریک کے کسی حصہ میں ترمیم کی جا سکتی ہے لیکن اگر یہ پایا جائے کہ" ناوالوں کی جیت ہے" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جلسہ یہ طے کرتا ہے کہ الفاظ" اہم تر" قائم نہیں رہینگے اور تب میر مجلس ان الفاظ کو تحریک سے خارج کر دیتا ہے۔ ہم یہ فرض کرینگے کہ الفاظ" اہم تر" خارج کر دیئے جاتے ہیں۔

وہی یا دوسرا رکن تب کھڑا ہوتا ہے اور ایک دوسری ترمیم (ب) پیش کرتا ہے۔ وہ تحریک کرتا ہے کہ لفظ" کارروائیاں" کے بعد لفظ" آئندہ" کا اندراج کیا جائے۔ بعد کی ترمیمات کے لئے طریقہ کار وہی ہے جو پہلی ترمیم کے سلسلہ میں استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن میر مجلس اعادہ سے نجات حاصل کرنے کے لئے جو غیر ضروری اور ... دینے والا ہے ذیل کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔

" ایک ترمیم پیش کی گئی ہے کہ لفظ" کارروائیاں کے بعد لفظ" آئندہ" درج کیا جائے۔ مسئلہ یہ ہے کہ جن الفاظ کے درج کرنے کی تجویز کی گئی ہے وہ حسبہ درج کر دیئے جائیں۔

اگر یہ پایا جائے کہ" ہاں والوں کی جیت ہے" تو سمجھا جائیگا کہ جلسہ نے طے کیا ہے کہ لفظ آئندہ درج کیا جائیگا۔ اور اس لئے میر مجلس اس کو تحریک میں درج کر دیتا ہے۔ اگر یہ پایا جائے کہ" ناوالوں کی جیت ہے" تو لفظ درج نہیں کیا جاتا۔ ہم فرض کرینگے کہ لفظ آئندہ درج کر دیا جاتا ہے۔

ایک رکن تب ایک اور ترمیم (ج) پیش کرتا ہے۔ وہ تحریک کرتا ہے کہ الفاظ" چلائی جائیں" خارج کر کے ان کی بجائے الفاظ" طے پائیں" درج کئے جائیں۔ میر مجلس تب مسئلہ کو یوں بیان اور پیش کرتا ہے۔

" ایک ترمیم پیش کی گئی ہے کہ الفاظ" چلائی جائیں" اس مقصد سے خارج کر دیئے جائیں کہ ان کی بجائے الفاظ طے پائیں درج کئے جا سکیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ جن الفاظ کو خارج کرنے کی تجویز کی گئی ہے وہ تحریک کا جزو رہینگے۔

اگر یہ پایا جائے کہ" ہاں والوں کی جیت ہے" تو الفاظ" چلائی جائیں" قائم رہینگے اور ترمیم نامنظور سمجھی جائیگی۔ لیکن اگر" ناوالوں کی جیت ہے" تو جلسہ نے یہ طے کیا ہے کہ الفاظ" چلائی جائیں" قائم نہیں رہینگے

اور میر مجلس اس کو خارج کر دیتا ہے۔ اب تحریک میں ایک "خالی جگہ" باقی رہ جاتی ہے اور اسلئے میر مجلس دوسرا مسئلہ پیش کرتا ہے۔

"مسئلہ یہ ہے کہ جن الفاظ کو درج کرنیکی تجویز کیگئی ہے وہ حسبہٗ درج کردیئے جائیں"

اگر اس مسئلہ کو منظور کر لیا جائے تو میر مجلس تحریک میں "الفاظ طے پائیں" کا اندراج کر لیتا ہے لیکن اگر منظور نہ کیا جائے تو الفاظ مندرج نہیں کئے جاتے اور دوسرا لفظ یا دوسرے الفاظ بصورت منظوری خارج شدہ الفاظ کی بجائے مندرج کردیئے جاتے ہیں۔ ہم یہ فرض کرینگے کہ الفاظ "طے پائیں" مندرج کئے جاتے ہیں۔

ایک ترمیم (د) تب ایک رکن کی جانب سے پیش کی جاتی ہے۔ جو تحریک کرتا ہے کہ "تحریک کے آخر میں الفاظ جس کی وضاحت محمد علی صاحب نے "جلسوں کی سیادت" میں کی ہے بڑھائے جائیں" جن الفاظ کو درج کرنیکی تجویز کی گئی ہے چونکہ ان میں اسطرح ترمیم کی جاسکتی ہے جسطرح ایک تحریک کے الفاظ میں ایک اور رکن یہ تحریک کرتا ہے کہ جن الفاظ کے بڑھانے کی تجویز کی گئی ہے ان میں الفاظ "جلسوں کی سیادت" سے پہلے الفاظ "اپنی کتاب موسومہ" درج کردیئے جائیں۔ اس کو منظور کرنے پر میر مجلس ترمیم میں یہ الفاظ درج کر دیتا ہے۔ اور حسب ذیل مسئلہ پیش کرتا ہے۔

"مسئلہ یہ ہے کہ جن ترمیم شدہ الفاظ کو آخر میں بڑھانیکی تجویز کیگئی ہے وہ حسبہٗ بڑھادیئے جائیں"

اگر اس کو نامنظور کر دیا جائے تو الفاظ نہیں بڑھائے جاتے لیکن اگر منظور ہو جائے تو میر مجلس تحریک کے آخر میں یہ الفاظ بڑھا دیتا ہے۔ ہم یہ فرض کرینگے کہ ترمیم شدہ الفاظ بڑھا دیئے جاتے ہیں۔

مزید ترمیمات کی کوئی تحریک نہ ہونیکی وجہ سے میر مجلس مرتمہ تحریک کو جلسہ کے سامنے پڑھتا ہے۔ ترمیم ہونے کے بعد تحریک حسب ذیل ہوگی۔

"اس جلسہ کی رائے میں اس جماعت کے جلسوں کی کارروائیاں آئندہ پارلیمانی ضابطہ کے مطابق طے پائیں جس کی وضاحت محمد علی صاحب نے اپنی کتاب موسومہ "جلسوں کی سیادت" میں کی ہے"

میر مجلس تب حسب ذیل مسئلہ پیش کرتا ہے "یہ کہ ترمیم شدہ تحریک منظور کر لی جائے"

تمام دوسرے مسئلوں کی طرح یہ مسئلہ بھی منظور کیا جاسکتا ہے یا نامنظور۔ اگر نامنظور کیا جائے تو تحریک ساقط ہو جاتی ہے لیکن اگر منظور کر لی جائے تو جلسہ کی کارروائی کا وہ حصہ جو تحریک سے متعلق تھا ختم ہو جاتا ہے۔

ہم یہ فرض کرینگے کہ تحریک منظور کر لی گئی۔

اس مثال میں ہم نے دیکھا کہ ایک تحریک کا چار مختلف طریقوں سے ترمیم پانے کے بعد بالآخر تصفیہ کیا جاتا ہے۔ یعنی (ا) الفاظ خارج کرکے (ب) الفاظ مندرج کرکے۔ (ج) چند الفاظ خارج کرکے اُن کی بجائے دوسرے الفاظ مندرج کرکے اور (د) الفاظ بڑھا کے۔ اب صرف ایک اور طریقہ (ھ) باقی رہجاتا ہے جس کے ذریعہ ایک تحریک میں ترمیم کی جاسکتی ہے۔

ایک تحریک کی اسطرح بھی ترمیم کی جاسکتی ہے کہ پہلے پانچ الفاظ (اس جلسہ کی رائے میں) کے بعد کے تمام الفاظ اس غرض سے خارج کردیے جائیں کہ ان کی بجائے دوسرے الفاظ درج کئے جاسکیں۔

اس قسم کی ترمیم (ھ) کے محرک کو چاہیئے کہ وہ جن الفاظ کو درج کرنیکی تجویز کرتا ہے (اگر اصلی تحریک کے الفاظ خارج کردیے جائیں) انہیں ایوان کے سامنے پڑھے اور اپنی ترمیم کی موافقت میں دلائل بھی پیش کرے۔ اگر ترمیم کی تائید ہو جائے تو میر مجلس بالکل اسیطرح مسئلہ بیان کرتا ہے جسطرح سابق میں مثال کے ذریعہ واضح کیا گیا ہے۔

"اصلی مسئلہ یہ تھا (اصلی تحریک پڑھتا ہے) اب بطور ترمیم یہ تحریک کی گئی ہے کہ الفاظ اس جلسہ کی رائے میں کے بعد کے تمام الفاظ خارج کردیے جائیں تاکہ ان کی بجائے الفاظ (ترمیم پڑھتا ہے) درج کئے جائیں۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ جن الفاظ کو خارج کرنیکی تحریک کی گئی ہے وہ مسئلہ کا جزء قائم رہینگے"

اگر مسئلہ کے پیش کئے جانے پر یہ پایا جائے کہ "ہاں والوں کی جیت ہے" تو الفاظ قائم رہتے ہیں اور بعد میں ان میں ترمیم نہیں کی جاسکتی سوائے اسکے کہ اخیر میں الفاظ بڑھائے جاسکیں۔ اگر "نا" والوں کی جیت ہے تو میر مجلس مجوزہ الفاظ کو خارج کردیتا ہے اور وہ ایوان سے دوسرا مسئلہ بیان کرتا ہے۔

"مسئلہ یہ ہے کہ جن الفاظ کو مندرج کرنے کی تجویز کی گئی ہے وہ حسب درج کردیے جائیں"۔

ترمیم کے الفاظ میں اسیطرح ترمیم کی جاسکتی ہے جسطرح ایک تحریک کے الفاظ میں اور انہیں منظور کیا جاسکتا ہے یا نامنظور۔ جب اصلی حالت میں یا ترمیم شدہ حالت میں منظور کرلیے جائیں تو انہیں اصلی تحریک کے الفاظ کی بجائے درج کردیا جاتا ہے۔ اور اب آئندہ ان میں ترمیم نہیں کی جاسکتی سوائے اسکے کہ اخیر میں الفاظ بڑھائے جاسکیں۔ اگر جلسہ کی یہ خواہش ہے کہ جن الفاظ کے مندرج کرنے کی تجویز کیگئی ہے ان میں ترمیم کی جائے تو اسے چاہیئے کہ

مندرج کرنے سے پیشتر ان الفاظ کی ترمیم کرے۔
جن الفاظ کے مندرج کرنے کی تجویز کی گئی ہے اگر ان کی نفی کر دی جائے تو جلسہ کے سامنے اب کچھ
باقی نہیں ہے اور اس لئے دوسری تحریک پر غور کیا جا سکتا ہے۔
ترمیم کے اس طریقہ (ھ) کے ذریعہ ایک تحریک کو مسترد کر کے ایک دوسری تحریک کو جو پہلی تحریک سے
بالکلیہ جداگانہ ہو زیر غور لایا جا سکتا ہے اور اسے منظور کیا جا سکتا ہے۔
اس قسم کی ترمیمات کے متعلق کارروائی کا سادہ ترین طریقہ یہ ہے کہ تحریک اور ترمیم کو دو مختلف تحریکات
سمجھا جائے اور اصلی تحریک پر پہلے غور کیا جائے جس طرح کہ باب "پبلک جلسے" میں تجویز کیا گیا ہے۔ لیکن بعض اوقات
جبکہ ایک تحریک اور ترمیم (ھ) کی تجویز کی جاتی ہے مشکل یہ پیش آتی ہے کہ ایوان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی
بالکلیہ منظور نہیں کر سکتا چونکہ ایوان کی رائے میں دونوں ترمیم کے قابل پائے جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں
میر مجلس کو چاہیئے کہ وہ پارلیمانی ضابطہ کے مطابق کارروائی کرے۔
یہ تجویز کہ تحریک پر پہلے غور کر لیا جائے صرف پبلک جلسوں کے اغراض کیلئے کیگئی ہے جہاں پر عموماً کارروائیاں
ممکنہ طور پر کم سے کم رسمی ہوتی ہیں۔ یہ کارروائیوں کو طے کرنے کا ایک سادہ لیکن تیز تر طریقہ ہے جو کسی صورت میں بھی کامل نہیں ہے
لیکن بلاشبہ اس طریقہ سے تو بہتر ہے کہ نوعیت کا لحاظ کئے بغیر تمام ترمیمات پر پہلے غور کر لیا جائے اور انکے تصفیہ تک اصل تحریک کو روک لیا جائے۔
اگر پارلیمان میں ایسی صورت پیش آجائے تو تحریک اور ترمیم کے متعلق اراکین کا رجحان معلوم کرنے کے لئے
خطیب تحریک کے پہلے چند الفاظ لیتا ہے اور یہ مسئلہ پیش کرتا ہے۔
"یہ تجویز کی گئی ہے کہ الفاظ (الفاظ پڑھتا ہے) خارج کر دیئے جائیں تاکہ ان کی بجائے دوسرے الفاظ
مندرج کئے جائیں مسئلہ یہ ہے کہ جن الفاظ کو خارج کرنیکی تجویز کی گئی ہے وہ مسئلہ کا جزء قائم رہینگے"۔
اگر اسے منظور کر لیا جائے تو الفاظ قائم رہتے ہیں، ترمیم ساقط ہو جاتی ہے اور تب تحریک کے باقی الفاظ پر غور
کیا جاتا ہے۔ اختتام پر خطیب یہ مسئلہ پیش کرتا ہے "یہ کہ تحریک (مرممہ تحریک) منظور کر لی جائے۔"
لیکن اس مسئلہ کی کہ "الفاظ قائم رہینگے" نفی کر دی جائے تو تحریک ساقط ہو جاتی ہے۔ اور تب ترمیم کے الفاظ پر
اسطرح غور کیا جاتا ہے گویا کہ وہ ایک اصل تحریک کے الفاظ ہیں جب مباحثہ ختم ہو جائے تو خطیب حسب ذیل مسئلہ پیش کرتا ہے۔
"یہ کہ جن الفاظ یا مرممہ (الفاظ) کے مندرج کرنیکی تجویز کی گئی ہے وہ حسبہٖ مندرج کر دیئے جائیں"۔

محمد علارم اعثانہ

رموز

دل کی نبضیں نوکِ خنجر سے کوئی چھوتا نہیں
یہ حدیثِ آرزو ہے اے نگارِ نکتہ چین

اس تکلف سے پلائی رات ساقی نے شراب
جھکنے والی تھی مرے قدموں پہ گردوں کی جبین

کون پوچھے گا جہانِ آب و گل میں رازِ شوق
آسمانوں سے اُدھر آباد ہے میری زمین

رابطہ مرگ و زندگی کیا ہے جنوں سے پوچھئے
عقل اس نازک حقیقت کو سمجھ سکتی نہیں

پیرِ میخانہ مری پستی پہ حیراں ہو گیا
میں نے جب کرلی گوارا آپؐ دردِ تہہ نشیں

وسعتِ کونین سے آگے نکل آیا ہے عشق
اب تنگ ظرفی نظر آتی ہے دُنیا ہو کہ دین

شمع روشن کر رہا ہوں آنے والوں کیلئے
اخترؔ ناشاد میں اس عہد کا شاعر نہیں

علی اختر، اختر

کلامِ باقی

سیاہ کاری کی زندگی میں نجات کا انتظار کب تک
رحیم و رحمٰن کے پجاری مصیبتوں کا شکار کب تک

تری نگاہوں میں ہیں دُعائیں تری دُعاعوں میں ہی محبت
فلک پر آنکھیں اٹھانے والے یہ زحمت بار بار کب تک

گناہ کی بے پناہ مستی کرے گی دل کو تباہ کتنا
خلیفۂ ارض زندگی میں رہے گا بے اعتبار کب تک

ظہور و اخفا کی رسمِ کہنہ مزاجِ الفت پہ اگراں ہے
یہ جلوۂ پردہ دار کب تک یہ خلوتِ آشکار کب تک

فلک کا جب حسن سرمدی ہے تو پھر فنا سے نباہ کیسی؟
رہیگی کونین کی فضائیں کسی کی آئینہ دار کب تک

کسی کا دیدار کرنے والی نگاہ مایوس ہو تو کیونکر
وہ آنکھ جو شاہدِ ازل ہے رہیگی یوں اشکبار کب تک

بہت گنہ گار کر رہا ہے جہاں کو رنگِ مجاز تیرا
حقیقتوں کے بنانے والے یہ رقصِ برق و شرار کب تک

عبدالقیوم خان باقی

ممالک محروسہ سرکار عالی کے حرفتی و معاشی ترقی کے امکانات

(تقریر جو معاشی کانفرنس میں پڑھی گئی)

جناب صدر نشین صاحب و حضرات محترم!

خاکسار خلوص دل سے معاشی کمیٹی کا ممنون ہے کہ اوس نے اظہار خیالات کا موقع عطا فرمایا ہے۔ میرے مقالہ کا عنوان ہے کہ "ممالک محروسہ آصفیہ سرکار عالی میں حرفتی و معاشی ترقی کے کسقدر وسیع امکانات موجود ہیں" اس مضمون سے خاکسار کو اپنی طالب العلمی سے جسکو تقریباً ۴۰ سال کا عرصہ گذرتا ہے دلچسپی رہی ہے اسلئے چند تفصیلات و خیالات مختصراً عرض کئے جاتے ہیں مضمون بہت وسیع ہے مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ پر عمل ہوگا۔

معاشی کمیٹی قابل مبارکباد ہے کہ اوس نے ۷ سال قبل کے بند شدہ نمائشوں کا سلسلہ پھر قائم کر دیا ہے جس نے تمام حیدرآباد میں دلچسپی پیدا کر دی ہے اور جو نہایت کم مصارف میں رضاکارانہ شوق خدمت ملک کی بدولت منعقد ہو رہی ہے اور اسکے ساتھ معاشی کانفرنس بھی قائم کیگئی ہے۔ مجھکو یہ عرض کرنا ہے کہ یہ خوش آئند آغاز ہے مگر بالکل ناکافی ہے ملک کے حرفتی و معاشی ترقی کیلئے آپ کو بہت کچھ کام درپیش ہے۔ نیشنل کانگریس اس سے بڑی بڑی نمائش ہندوستان میں جا بجا کرتی رہی ہے اور خود حیدرآباد میں سرکاری دو بڑی نمائشیں ایک سنہ ۱۳۱۱ھ اور دوسری جوبلی حضرت غفران مکان کے وقت سنہ ۱۳۲۳ھ میں ہو چکی ہیں۔ بہرحال آپ کا تجربہ سہ سالہ نہایت کامیاب رہا اور اب وقت آگیا ہے کہ آئندہ بہت وسیع اور بلند پیمانہ پر نمائش منعقد کریں کہ سارے ممالک محروسہ بلکہ سارے ہندوستان کے لوگ اسکو دیکھنے آئیں۔ اور وہ ہمارے ملک میں کامیاب بنیاد صنعت و حرفت اور معاشی ترقی کی بن سکے۔

افتتاح نمائش کے دن آپ کی کمیٹی نے حیدرآباد کے معاشی و صنعتی سروے پر زور دیا ہے۔ مگر مجھکو عرض کرنا ہے کہ حضرت مغفرت منزل سکندر جاہ آصفجاہ ثالث کے عہد حکومت سے بکثرت یوروپین اور دیسی افسروں نے جنمیں آخر میں مسٹر ویکفیلڈ کا نام بھی لیا جا سکتا ہے ملک کے معاشی ذرائع کی تحقیقات اور سروے کافی بلکہ وافی طور پر کر لی ہے ملک میں جو معاشی ذرائع ہیں اونکی تفصیلات سررشتۂ اعداد و شمار کی رپورٹوں سے اور خود اس نمائش میں مختلف سررشتوں کے اسٹال میں ڈایا گراموں سے نہایت تفصیل کے ساتھ مل سکتی ہے۔ آپ اکنامک اور انڈسٹریل سروے کے

بھول بھلیاں میں ہرگز نہ جائیے۔ تقریباً سو سال سے ہم اس میں گم کردہ راہ ہو گئے ہیں۔ آپ اس پر زور دیں اور خود بھی کام کریں کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے جس طرح ایک کمیٹی کے ذریعہ نیشنل پلاننگ کا کام شروع کر دیا اور بڑی بڑی حرفتوں کے قیام کے امکانات کی تحقیقات کی اوسی طرح یہاں بھی کام ہو۔

آپ بھی اپنے ملک کے حرفتی ترقی کے متعلق تجاویز مرتب کریں کہ وسیع پیمانہ پر کس قسم کے کاروبار کہاں اور کس طرح ہمارے ملک میں قائم ہو سکتے ہیں۔ اور پھر ہماری حکومت اور ہمارے سرمایہ داروں کو آمادہ کیا جائے کہ وہ قومی طور پر اس میں مشترکہ و متحدہ سرمایہ لگائیں اور کاروبار شروع کریں۔

کسی ملک کے تمول اور خاص کر حرفت و معاشی ترقی کا اندازہ سب سے پہلے اوسکے رقبہ و آبادی پھر قدرتی ذرائع و پیداوار سے ہوتا ہے۔ ان نقطہ ہائے نظر سے ہم اپنے ملک کے اعداد و شمار پر خوشی اور اطمینان سے نظر ڈال سکتے ہیں۔

ہمارا آصفی پرچم علاوہ برار ۸۲ ہزار مربع میل پر لہرا رہا ہے۔

پرتگال۔ ہالینڈ۔ سوئٹزرلینڈ۔ بلجیم۔ ڈنمارک کے یورپی علاقہ کے مجموعی رقبہ یا جزائر برطانیہ انگلینڈ اسکاٹ لینڈ۔ ویلز کے مجموعی رقبہ سے یہ صرف چھ سات ہزار میل کم ہے۔ بہار۔ بنگال بمبئی۔ سی۔ پی۔ پنجاب کے رقبہ میں اور ہمارے ملک کے رقبہ میں چنداں فرق نہیں ہے۔

بعض حالات میں رقبہ ملک جب ریگستان۔ بنجر اراضی یا پہاڑی حصہ سے بھرا ہوا ہو تو وہ ملک متمول شمار نہیں ہوتا۔ یا یہ کہ بعض ممالک قدرتاً زرخیز ہوتے ہیں اور کسی ملک کے تمول کے لئے ساحل سمندر کا وجود بھی لازم ہے مملکت آصفیہ فی الحال ساحل سمندر سے محروم ہے بعض خاص باتوں میں قدرتی فیاضی کم ہے مگر بحیثیت مجموعی وہ قدرتی خزائن سے مالامال اور کافی زرخیز و شاداب ملک ہے۔

ممالک محروسہ میں ایک کروڑ پینتالیس لاکھ نفوس آباد (سنہ ۳۱ء کے مردم شماری سے) ہیں اور گذشتہ پچاس سال میں اسکی آبادی میں ۴۶ فیصدی کا اضافہ ہوا ہے لیکن جب یورپی ممالک کے قطع نظر۔ بہار میں فی مربع میل ۲۵۴ بنگال میں ۶۴۰ بمبئی میں ۲۳۳۔ برار میں ۱۹۴۔ مدراس میں ۳۲۹۔ پنجاب میں ۲۲۰۔ یوپی میں ۴۵۶۔ بڑودہ میں ۲۹۹ میسور میں ۲۲۴۔ ٹراونکور میں ۶۶۸۔ کوچین میں ۸۱۴ نفوس اوسطاً آباد ہیں۔ تو ممالک محروسہ میں اب بھی کافی گنجایش توسیع آبادی اور خاص کر شہری و حرفت پیشہ آبادی کے لئے موجود ہے۔

رقبہ و آبادی کے بعد معاشی دولت و ثروت کیلئے پہلی نظر موسم پر پڑتی ہے ممالک محروسہ کے موسم معتدل ہے

سردی گرمی ۔ بارش کی انتہائی شدت وقلت سے سابقہ نہیں رہتا ہے ۔ ہر چیز اعتدال کے ساتھ ہے ۔

اسکے بعد یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ پانی کی بہم رسانی میں قدرت نے کہاں تک فیاضی برتی ہے ۔ اس میں بھی ہم قدرت کو ممالک محروسہ پر مہربان پاتے ہیں دکن کی مشہور ندیاں گوداوری کرشنازیادہ تر مملکت سرکار عالی کو سیراب کرتے ہوئے ایک سرے سے دوسرے تک گذرتی ہیں ۔ گوداوری کی جملہ ۹ سو میل مسافت کے منجملہ ۷ سو میل اور کرشنا کے سات سو منجملہ ۵ سو میل کا بہاؤ ممالک محروسہ کو سیراب کرتے ہوئے گذرتا ہے ۔ ان بڑی ندیوں میں شامل ہونے والی پچاس ندیاں ہیں جنکا پورا یا بہت بڑا حصہ ممالک محروسہ کے اندر ہی بہتا ہے ۔ پائن گنگا ۔ وردہا مانیر گوداوری کے اور تنگبھدرا مانجرا بھیما موسی کرشنا میں شامل ہوتی ہیں ۔ ہمارے ہمسایہ صوبہ مدراس گوداوری کرشنا تنگبھدرا کاویری ۔ اور ہماری قریب ریاست میسور کاویری سے جو فائدے حاصل کر رہی ہے وہ علی العموم معلوم ہے

قدرت نے ساخت ارضی ایسی بنائی ہے کہ جابجا تالاب کنٹے پہاڑیوں کے پانی کو روک کر بنائے گئے ہیں یا بنائے جاسکتے ہیں ۔ نہریں ندیوں سے نکالنے میں ناقابل حل مشکلات حائل نہیں ہیں ۔

زمین کی زرخیزی پر بھی ہم خوشی کا اظہار کرسکتے ہیں ۔ اگرچہ یہ جداگانہ امر ہے کہ ہندوستان کا کوئی خاص اور محدود خطہ کسی خاص قسم کی پیداوار کے لئے بہت زیادہ زرخیز اور بہت زیادہ شہرت رکھتا ہے ۔ بہ حیثیت مجموعی ممالک محروسہ کی ارضی قوت پیداوار میں اپنے ہمسایہ برطانی قلمرو بمبئی مدراس سنٹرل پراونس کے بالکل ہم پایہ ہے زمین کالی اور لال مٹی کی افراط سے ہر جگہ موجود ہے ۔ سرکار عالی کے اضلاع مرہٹواڑی بمبئی کے زرخیز اضلاع مہاراشٹر و گجرات سے قوت روئیدگی میں کسی طرح کم نہیں ۔ اسی طرح تلنگانہ کے اضلاع ممالک محروسہ کرشنا ۔ گوداوری راجمندری گنٹور کے بالکل مماثل و مشابہ ہیں ۔ خشک حصہ کنڑا اضلاع مفوضہ (سیڈڈ ڈسٹرکٹ) اننت پور بلاری کڑپہ کرنول اور شولاپور و ریاست میسور کے علاقہ سے قوت افادہ و استفادہ میں کسی طرح کم نہیں ہیں ۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ اس زرخیزی کی قوت کا اثر کس طرح ظاہر ہوتا ہے ۔ قدرت نے سینکڑوں میل کے رقبہ میں نہایت گھنے جنگل ہمارے ملک میں اگائے ہیں اور ان میں ساگوان بانس اور دوسرے قسم کا کارآمد چوب بہ افراط موجود ہے ۔ اور کارآمد اشجار صحرائی میں بھی کسی قسم کی کمی نہیں ہے ۔ اور واقفین کا بیان ہے کہ صندل ۔ یوکلپٹس سنکونا کافی ۔ ربر اور دیگر مختلف قسم کے صحرائی درختوں کی روئیدگی ممالک محروسہ کے مختلف حصوں میں افراط سے ہوسکتی ہے ۔ مویشی کے چارہ کے لئے گھانس وغیرہ کی کسی طرح کمی نہیں ہے جنگل صحرا خودرو پیداوار سے قطع نظر

ممالک محروسہ زراعتی ملک بھی ہے۔ اور آئمیں چاول گیہوں۔ جوار۔ ہر قسم کی دال۔ اور دیگر غذائی پیداوار یں اس وافر مقدار میں پیدا ہوتی ہیں کہ کل ممالک محروسہ کیلئے باہر کے غلہ کی محتاجی سقامت ہنگام سے قطع نظر دوسرے اوقات میں محسوس نہیں ہوسکتی ہے۔

ضروریات غذا کے بعد ایسی زرعی پیداوار جو حرفتی کاروبار کیلئے لازمی چیز ہے شلاً روئی جھوٹ، جن نیشکر، تمباکو، سن کی بہت وسیع اور وافر مقدار میں کاشت ہوتی ہے اسی طرح ترکاریاں میوے اور پھول بھی اچھی مقدار میں پیدا ہوتے ہیں اور ہو سکتے ہیں۔

نمائش ہائے باغبانی میں ہم نے چشم دید معائنہ کیا ہے نیز حالیہ سیلو وغیرہ میں کونلہ موسمبی کے باغات ظاہر کرتے ہیں کہ توجہ کی صورت میں کیا کچھ ترقی کا امکان ہے یہ پایا جاتا ہے کہ بیشتر اضلاع اورنگ آباد بیڑ کو میوہ کی کاشت میں خاص شہرت اور وسعت حاصل تھی۔ سابقہ خشک سالیوں میں باغات خشک ہوگئے اور پھر ان کی تجدید کیجانب توجہ نہیں کیگئی۔

صحرائی اور زرعی پیداوار کے بعد قدرت معدنیات کیلئے بھی ممالک محروسہ پر مہربان ہے تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ الماس و یاقوت اور سونا کبھی دکن میں معتد بہ مقدار میں برآمد ہوتا تھا۔ اب بھی لاکھوں ٹن کوئلہ ہر سال نکالا جاتا ہے سرکاری رپورٹوں میں لوہے کی بہت بڑی تعداد زیر زمین موجود ہونیکی تصریح و توضیح موجود ہے اور اسکے علاوہ دوسرے کار آمد معدنیات ابرک سیلیٹ سلفم وغیرہ کی ایک طویل فہرست مرتب ہوسکتی ہے جس سے بخوبی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ یہاں کا پتھر سمنٹ سازی کنکریٹ کے پلوں اور سمندری گودیوں کی تعمیر کیلئے بہت کچھ کار آمد ثابت ہوا ہے۔ قیمتی جواہرات ممکن ہے اب نہ ہوں مگر قیمتی پتھر کثرت سے موجود ہیں۔ اب سونے کی وافر مقدار موجود ہونے کا امکان ظاہر کیا جا رہا ہے اور پرانی کانوں میں زمین کے عمیق حصوں میں اوسکی برآمدگی کے لئے انتظام کیا جا رہا ہے۔

مویشی کے لئے بھی ہمارا ملک مفلس شمار نہیں ہوسکتا۔ گھوڑے گائے۔ بیل بھینس بکرے وغیرہ ہر جگہ ملتے ہیں۔ اور انکی عمدہ نسلیں ملک میں پھیلائی جا سکتی ہیں۔ بیشتر مرہٹواڑی کے پابو خاص شہرت رکھتے تھے اور مرہٹہ حکومتوں کے زمانوں میں اونکی بڑی مانگ تھی مرہٹواڑی کے مسطح میدانوں میں جو گوداوری ندی کے متصل ہوں افزائش نسل مویشی کیلئے بہت کچھ کام کیا جا سکتا ہے۔ مرغ وغیرہ پرندوں کی حد تک امکانات ترقی ہم حالیہ نمائش ہائے باغبانی و مرغبانی میں دیکھ چکے ہیں۔

قدرتی دولت کی تو یہ نہایت نامکمل اور مختصر توضیح ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ بیشتر کیا فائدہ حاصل کیا جاتا تھا

اور اب کیا حالت ہے۔ پیشتر جبکہ برق و بخار کی قوتیں مغرب نے تسخیر نہ کی تھیں ہمارے ملک کی تجارت خارجہ ایسی وسیع نہ تھی جیسی کہ اب ہے لیکن اوس زمانہ میں زراعت ملازمت تجارت کے علاوہ حرفت و صنعت کے کاروبار میں بھی لاکھوں اہل ملک کی کامل مصروفیت تھی اور وہ اونکا فائدہ مند ذریعہ معیشت تھا۔ ملک کی ضرورت کی اشیار کی بیشتر مقدار ملک ہی میں تیار ہوتی تھی اور پھر ملک سے باہر بھی بہت کچھ فروخت کیلئے جاتی تھیں اوسوقت صنعت وحرفت کی یہ حالت تھی کہ ورنگل میں ایسے قالین بنے جاتے تھے جسکے ایک مربع انچ میں سینکڑوں گرہیں دی جاتی تھیں اور عجائبات بافندگی شمار ہوتے تھے۔ پٹن کے ایک کمخواب کے تھان کی قیمت سے اوسکے بنانیوالے کا کارخانہ تین سال تک چلایا جاسکتا تھا۔ پٹن کی ساڑیاں عجیب وغریب تناسب وخوشنمائی رکھتی تہیں۔ ناندیڑ کے سیلے اس درجہ نازک اور باریک ہوتے تھے کہ اونکو انگشتری کے حلقہ سے نکال لیا جاسکتا تھا۔ پٹن اورنگ آباد۔ دولت آباد ناندیڑ بیڑ ورنگل نارائن پیٹھ۔ عالم پور نرمل۔ گدوال۔ بیدر۔ رائچور۔ میدک وغیرہ بیشتر صنعت وحرفت کے مرکز تھے مگر اب صرف نام باقی رہ گیا ہے۔

ہمارے ملک نے سب سے زیادہ تنزل صنعت وحرفت اور دستکاری کے شعبہ میں کیا ہے۔ بہت ہی تھوڑی حرفتیں باقی رہ گئیں ہیں اور وہ نہایت پس ماندہ اور گری ہوئی حالت میں ہیں اونکا نام کہیں باقی ہے تو جذبات حب وطن اور رواج قدیم کے تحت اسکی توقع کہ ہم اس دور الکٹرسٹی اور اسٹیم میں انکو سابقہ حالت میں پہنچا سکینگے مطلقاً نہیں کیجا سکتی۔

ہم نے کچھ سرمایہ لگا کر دخانی اور برقی قوتوں سے کچھ کام لینا شروع کیا ہے اور وہ کام کامیاب رہا ہے۔ مگر یہ اسقدر کم ہے کہ یورپ امریکہ جاپان درکنار ہندوستانی صوبہ جات تک سے ہم مقابلہ نہیں کرسکتے۔

صنعت وحرفت کے بعد تجارت کا کاروبار ہے اور ہمارے ملک کی تجارت خارجہ کی سالانہ مقدار گزشتہ پندرہ سال میں ۲۰ اور ۴۰ کروڑ روپیہ کے درمیان رہی ہے اوسکی عملی صورت یہ ہے کہ ہم اپنی خام پیداوار وں کو باہر بھیجتے ہیں۔ اور باہر کے مصنوعات کو اوسکے معاوضہ میں لیتے ہیں۔

تجارتی کساد بازاری نے تجارت پیشہ اور مزارعین کے حال پر جو عظیم اثر پیدا کیا ہے اسکا دہرانا غیر ضروری ہے اسکے علل واسباب میں بعض حلقوں سے زرمالگزاری کی کثرت وشدت کی صدا بلند کی گئی ہے۔ لیکن خاکسار نے جہاں تک اعداد وشمار اور حالات پر نظر دوڑائی ہے وہاں اس شکایت میں زیادہ وزن نظر نہیں آتا۔

نواب مختار الملک مرحوم کے دور وزارت میں آج سے ساٹھ اور پینسٹھ سال قبل تک سرکار عالی کے محصول مالگذاری کی

وصول دو اور پونے دو کروڑ روپیے کے مابین تھی اور اسوقت محصول مالگذاری ناقابل برداشت ہونے کی کوئی شکایت نہ تھی۔ اس ۶۵ سال کے عرصہ میں سرکار عالی کا حصہ آمدنی مالگزاری ۳ کروڑ سے کچھ زاید تک پہونچا ہے اس ۶۵ سال کے عرصہ میں سالانہ لاکھوں روپیہ کی آمدنی کی جاگیرات مقطعے اور انعامات اراضی شریک خالصہ ہوچکے ہیں لاکھوں ایکڑ اراضی افتادہ مزروعہ ہوچکی ہے اس مدت میں کروڑوں روپیہ کے صرفہ سے آبپاشی کے کام انجام پائے ہیں۔ جنکی وجہ کثیر رقبہ خشکی تری ہوگیا۔ ساتھ ہی ساتھ ریل اور سڑکوں کی بدولت معاشی کاروبار میں ترقی عظیم نمودار ہوئی ہے متذکرہ بالا امور کو ملحوظ رکھا جائے تو یہ پایا جاتا ہے کہ گذشتہ ۶۵ سال میں سرکار عالی نے محصول مالگزاری میں جو اضافہ کیا ہے اوسکی اوسط مقدار فی روپیہ تین چار آنے سے زیادہ نہ ہوگی۔

اضافہ محصول مالگذاری کے مقابل یہ بھی دیکھنا ہے کہ اس ۶۵ سال میں قیمت اجناس میں کہاں تک اضافہ ہوا ہے ہر وہ شخص جو کم از کم میری عمر رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ اوسکے بچپن میں نرخ اجناس کیا تھی اور اب باوجود عظیم کسادبازاری کے کیا ہے سررشتہ اعداد و شمار کے رپورٹوں میں مختلف تختے ملتے ہیں جن سے سابقہ و حالیہ تھوک نرخ اجناس کو معلوم کیا جا سکتا ہے مثلاً ۱۳۱۲ف میں موٹے چاول کی قیمت فی پلہ ۵؎ تھی یعنی روپیہ کو ۱۱ سیر سے کچھ زیادہ ۱۳۲۱ف میں ۵؎ فی پلہ قیمت تھی یعنی روپیہ کو ۷ سیر سے کچھ زیادہ یہ نرخ زیادہ ہوتا رہا یہاں تک کہ ۱۰؎ ۵ پلہ یا روپیہ کو ۵ سیر سے کم ملتے ہیں ۱۳۴۴ف میں جو کسادبازاری کا انتہائی دور تھا ۵؎ فی پلہ یا روپیہ کو دس سیر یہ نرخ ۱۳۱۲ف کے نرخ سے گراں ہے ۱۳۱۲ف سے دس پندرہ سال قبل تو نرخ اور ارزاں تھا۔ بہرحال جس زرعی پیداوار کا آپ مقابلہ کریں گے یہی حال پائینگے۔ پینتالیس پچاس سال قبل روپیہ کو گھی سوا سیر ملتا تھا۔ یہ نرخ حالیہ کسادبازاری کے دور میں بھی خواب و خیال تھا۔

گرانی اجناس یا کاروباری ترقی کے دور میں جب تجارت خارجہ زور و شور سے تھی ہر سال لکھوکھا روپیہ کی مالیت کا سونا چاندی اس ملک میں آیا جسکی مقدار کئی کروڑ تک ہوگی۔

سرکار کا دہارہ خشکی فی ایکڑ روپیہ سوا روپیہ کے اندر ہے اور تری کا بھی اسی تناسب سے۔

روپیہ کو سوا سیر بجائے آدھ سیر اور ڈیڑھ پاؤ نرخ سے گھی فروخت ہونے کا جو نفع ملا وہ کس کی جیب میں گیا کس کے کام میں آیا۔

بلاشبہ سررشتہ اعداد و شمار و ماہران معاشیات کی تحقیقات کے قابل یہ امر ہے کہ آخر اس موجودہ تجارتی کسادبازاری سے قبل جو منافعہ ملا وہ کس کو ملا اور کیا ہوا۔ کسادبازاری کے زمانہ سے بھی سرکار نے زر مالگزاری کے محاصل میں فی روپیہ ۲ سے ۴ تک معافی بھی عطا فرماتی رہی ہے جسکے یہ معنی ہوئے کہ تقریباً پچاس ساٹھ سال پہلے کے شرح سے

محصول مالگزاری وصول کرتی رہی - اور گرانی محصول کا یہ دکھڑا مصنوعی ہے -

تجارتی کساد بازاری نے ہمارے سامنے یہ سوال پیدا کر دیا ہے کہ صرف اس بناء پر لنکا شائر نے سیاسی اغراض سے ہماری روئی نہیں خریدی اور جاپان بھی خرید نہیں رہا ہے یا بیرون ملک کے بازاروں میں ہمارے تخم روغن اور چرم پوست تمباکو کی پہلے کی طرح مانگ نہیں ہے جو خوفناک حالت ہمارے ملک میں پیدا ہوئی ہے اسکا کیا چارہ کار ہے -

جو کچھ ہم اشارتاً و عملاً سنتے اور دیکھتے ہیں اوسکا مفہوم یہی ہے کہ ہم کو اس پر قانع ہونا چاہیے کہ ہمارا ملک زراعتی اور خام پیداوار مہیا کرنے کا ذریعہ بنا رہے ہم کو چاہیے کہ روئی کا ایک ایسا تخم تلاش کریں کہ بڑی ریشہ کی روئی پیدا ہو اور لنکا شائر میں آسانی سے گراں نرخ پر فروخت ہوسکے ہم کو چاہیے کہ بعض قسم کے میوے کے درخت افراط سے لگائیں ہم کو چاہیے کہ گھریلو صنعتوں مثل دستی پارچہ بافی چرخہ وغیرہ کو ترقی دیں - مرغیوں کی نسل بڑھائیں انڈے بیچیں گائے بھینس پالیں اور اسکی ترقی کے لئے سائنسی تحقیقات سے کام لیں ان سب امور کے مفید اور ضروری ہونے میں کلام نہیں لیکن اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے معاشی حالت شاہراہ ترقی پر پہنچ جائیگی تو آپ یقین فرمائیے کہ یہ کھلونا ہے جس سے آپ کو بہلانے کی کوشش کی جاتی ہے -

آپ یقین فرمائیے کہ ہماری معاشی ترقی کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ اس دخانی اور برقی قوت کے زمانہ میں ہم بھی دخانی اور برقی قوت سے اسطرح کام لیں کہ وہ گھریلو حرفت ہو جائے اور اسکے لئے سرمایہ داری کی قوت (اوسکی برائیوں کو رفع کرتے ہوئے) ناگزیر ہے یورپ، امریکہ جاپان کی طرح حرفتی گرم بازاری کے لئے ہندوستان کے صوبہ جات کے مقابل ممالک محروسہ کو عظیم ترین آسانیاں حاصل ہیں کہ حرفتی کاروبار کے لئے جو عناصر یا اجزا لازمات سے ہیں وہ سب ہمارے ملک میں تخمیناً پائے جاتے ہیں - سب سے اول وہ اشیاء جو حرفتی کاروبار کیلئے ضروری ہیں ہمارے ملک میں کثرت سے موجود ہیں روئی اس افراط سے ہے کہ ہر طرح کا کپڑا ہم ملک میں بنائیں تو نہ صرف ملک کی ساری ضرورتوں کو بلکہ دیگر صوبہ جات ہند کی ضرورتوں کو رفع کر سکتے ہیں - لنکا شائر اور جاپان اپنے پارچہ بافی کے کاروبار کے لئے باہر سے روئی خریدنے پر مجبور ہیں - کلوں کو چلانے کیلئے لیبر کٹنگ آئیل یا روغن کی ضرورت ہے انگلینڈ و جاپان کو یہ بھی باہر سے منگوانا ناگزیر ہے ہم اسکے لئے بھی کسی ملک کے محتاج نہ ہوسکینگے - اسیطرح نیشکر چمڑا - تمباکو - سن جو صنعتی ضروریات کے لازمات سے ہیں ہمارے ملک میں پیدا ہوتے ہیں اور پیدا کئے جا سکتے ہیں - کارخانوں کو چلانے کو کوئلہ باہر سے لانیکی ضرورت نہیں - پانی کیلئے بھی کوئی دشواری نہیں - زمین آسانی سے نسبتاً کم قیمت سے مل سکتی ہے - مزدوری کچھ گراں نہیں کارخانوں کی تعمیر کیلئے

معاملہ طیلسانیین
بچھ لکڑی وغیرہ کی کمی نہیں۔ برقی اور دخانی قوت کے جو محدود کارخانے ملک میں چل رہے ہیں وہ مثال ہیں کہ کام دشوار نہیں۔
ضرورت اور سوال حل طلب ہے تو سرمایہ اور ماہران فن کی فراہمی کا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ہمارے ملک کا روپیہ
دو کروڑ سے زیادہ ہی محفوظ ہو گا کم نہ ہو گا۔ ساہوکاری تجارتی کاروبار میں بھی کروڑوں روپیہ کا لین دین ہوتا ہے۔
جب سرکار عالی پرامیسری نوٹس جاری فرماتی ہے تو روپیہ آسانی سے فراہم ہو جاتا ہے۔ آخر شاہ آباد سمنٹ عثمان شاہی
معظم جاہی پارچہ بافی کے دو بڑے کاروبار میں ملک ہی کا روپیہ زیادہ مقدار میں فراہم ہوا ہے۔ آجکل ملک میں جو کوئی
باشندہ بھی کچھ روپیہ رکھتا ہے اوسکو محفوظ کرنے کیلئے مستحکم کاروبار کو دریافت کرتا رہتا ہے خود سرکار اپنی بچت کو بھی
جو کئی کروڑ روپیہ تک پہنچ گئی ہے برٹش پرامیسری نوٹوں یا کسی نفع آور کاروبار میں لگائی ہوئی ہے۔ بہرحال سرمایہ کی
فراہمی عملاً کوئی اہم مشکل نہیں جو حل نہ ہو سکتی ہو۔ صرف صحیح رہنمائی اور ماہرانہ پیش روی سے تمام دشواریاں بآسانی حل ہو سکتی ہیں۔
اس ملک میں معاشی پستی کی حقیقی وجہ وہ تصور ہے جسکو خاموشی سے اختیار کیا گیا ہے کہ ہمارا ملک
اشیائے خام باہر کے علاقوں کو فراہم اور اونکی بنائی ہوئی مصنوعات کو خریدکرے اشیائے خام کو باہر جانے کیلئے
ہر قسم کی سہولتیں ہیں مثلاً روئی بآسانی فروخت ہونے ریلوے اسٹیشنوں کے موقوعہ قصبات پر بازار بنائے گئے اور
تاجروں کے لئے ممکن سہولتیں اور آسانیاں مہیا کی گئیں۔ روئی سے بنولہ نکالنے اور گٹھے باندھنے کے کارخانے ہر ریلوے
اسٹیشن پر کثرت سے قائم ہوئے اسی طرح روغن نکالنے کے معمولی کارخانے جابجا بکثرت قائم ہوئے مگر کوئی خصوصی
کوشش اسکے جانب نہ کی گئی کہ پارچہ بافی کے لئے اور اعلیٰ قسم کے بیبر کٹنگ اور کوڈلا آئیل نکالنے کے لئے کارخانے
مشترکہ سرمایہ اور مشترکہ کوششوں سے قائم ہو جائیں۔

بظاہر کہا جاتا ہے کہ ملک میں تجارتی صنعتی حرفتی کاروبار پبلک کی کوششوں کیلئے بالکلیہ کھلا ہوا ہے
اور سرکار خود کو تجارتی کاروبار سے علیحدہ رکھتی ہے تاکہ ملک کی سرمایہ داری کے کوششوں پر کوئی اثر قائم نہ ہونے
پائے اور یہی طریقہ برطانیہ وغیرہ کا بھی ہے۔ مگر یہ کہنے والے اور اس قسم کے خیالات رکھنے والے اور لکھنے والے
بظاہر اس امر کو مطلقاً نظرانداز کر جاتے ہیں۔ کہ برطانیہ کا یہ کاروباری اصول صدیوں کے ارتقا کا نتیجہ ہے فی الوقت
برطانیہ کے ایک ایک سرمایہ دار کے پاس قارون کی دولت سے زیادہ ثروت موجود ہوگی وہ ہر قسم کے کاروبار کیلئے
آمادہ رہتا ہے اور اوسکے نام اور طلب پر خود لاکھوں پونڈ کا سرمایہ جمع ہو جاسکتا ہے۔ ہمارے ملک کے سرمایہ داروں میں
نہ ایسی روشن خیالی ہے نہ ایسی تنظیم لہذا نتیجہ سب پر روشن ہے۔ بہرحال سرکار عالی نے تو اب اپنی پالیسی تبدیل فرمائی ہے

انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ قائم کرکے عملاً یہ طے فرمایا گیا ہے کہ کسی بڑے کاروبار میں سرکار کا اور پبلک کا مشترکہ سرمایہ لگایا جاسکتا ہے۔ اور بورڈ آف ڈائرکٹرز میں اعلیٰ حکام سلطنت شامل ہوسکتے ہیں۔ اور چھوٹی صنعتوں کے لئے سرکاری قرضہ دیا جاسکتا ہے۔ ناندیڑ۔ ورنگل میں پارچہ بافی بودہن میں شکر سازی اور سرپور میں کاغذ سازی اور شاہ آباد میں سمنٹ سازی کے کارخانے اسی اصول پر چلائے جاتے ہیں اور ان کارخانوں کے بورڈ آف ڈائرکٹرز میں محترم صدر اعظم معزز صدر المہام اور نامور امراء و معتمدین سرکار شامل ہیں جب ایسا عمل ہوا ہے اور بنیادی اصول بھی عملاً قائم کردیا گیا ہے تو انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ وہ سب کچھ کرسکتا ہے۔ جو کسی کارخانے کے قیام کیلئے اور سکے بورڈ آف ڈائرکٹرز اور مینجنگ ایجنٹ کرسکتے ہیں وہ کاروبار بآسانی قائم کئے جاسکتے ہیں جو یوروپ جاپان اور امریکہ سے قطع نظر ہندوستان میں کامیابی سے چل رہے ہیں مثلاً

(۱) حبوب روغن دار کیلئے ممالک محروسہ سرکار عالی کو ارنڈی السی مونگ پھلی بنولہ وغیرہ میں۔ دنیا میں امتیازی شہرت ہے کروڑوں روپیہ کی پیداوار ہر سال برآمد ہوتی ہے۔ فی الحال بمبئی کے بیرونی سرمایہ داروں نے معمولی کارخانے ریلوے لائن پر ہر موقوعہ قصبات میں قائم کردیئے ہیں تاکہ حبوب روغن دار کے بجائے روغن کم مصارف میں بمبئی وغیرہ کو برآمد ہوسکے۔ مگر اسکی صفائی اور پھر ریفائننگ آئیل میں منتقل بمبئی وغیرہ میں ہوتی ہے۔ یہ صاف شدہ روغن پھر لاکھوں روپیہ کی مالیت کا ممالک محروسہ میں درآمد ہوتا ہے اور فروخت ہوتا ہے معمولی سرمایہ اور غیر ماہرین فن کی نگرانی میں ایسے کارخانے قائم کرنے کا تجربہ ممالک محروسہ میں ناکام ہوا مگر کافی سرمایہ اور قابل ماہرین ایماندار منتظمین کی نگرانی میں یہ کام بآسانی کامیاب ہوسکتا ہے کہ ہمارے ملک کے حبوب روغن دار سے مصفا اور معطر روغن نکالنے کے کاروبار سے جو منافعہ ہوسکتا ہے وہ خود حاصل کریں اور ساتھ ہی ہزاروں افراد کیلئے کاروبار مہیا کریں۔ پانڈیچری اور دیگر مقامات میں ٹاٹا کمپنی وغیرہ یہ کام کرسکتی ہے تو ہم کیوں نہیں کرسکتے۔

(۲) روئی کی پیداوار بھی ہمارے ملک میں کثرت سے ہے اور کروڑوں روپیہ کی روئی سال بہ سال باہر جاتی ہے۔ کیا مزید پارچہ بافی کے کارخانے قائم نہیں ہوسکتے اسکے لئے سر فاضل بھائی پر اعتماد کیا گیا مگر "وہ بلاک میلر" ثابت ہوئے۔ جب لنکا شائر اور جاپان ہمارے ملک میں روئی خرید کر پھر ہمارے پاس کپڑا فروخت کے لئے روانہ کرتے اور فائدہ اٹھاتے ہیں تو ہم کیوں نہ اسطرح نفع اٹھانے کی کوشش کریں۔ اگر کوئی خاص وجوہات ایسے پیدا ہوگئے ہیں کہ صنعت پارچہ بافی کے لئے کافی منافعہ نہیں ملتا تو ان کا ازالہ کیا جاسکتا ہے۔

ہمارے اہل ملک کی ہمتیں کسقدر پست ہیں اور کسطرح ہمارے ملک کو اشیائے خام فراہم کرنیوالے کی حیثیت

رکھنے کی کسطرح خاموش پالیسی قائم کی گئی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ گوداوری ریلوے کے قیام کے ساتھ تمام ریلوے لائن کے موقوعہ قصبوں میں روئی صاف کرنے اور گٹھے باندھنے کے کارخانے جا بجا قائم ہوگئے اور اسکے ساتھ بڑی لائن کے موقوعہ قصبات میں بھی یہی کارخانے کھل گئے۔ بہرحال ممالک محروسہ میں اس نوعیت کے کارخانے جابجا وسعت کے ساتھ موجود ہوگئے ہیں جن ذمہ دار افراد کے ہاتھ میں ملک کی تجارتی پالیسی اور اجازت قیام کارخانہ جات ہے انہوں نے اس قسم کے کارخانوں کے قیام میں پوری ہمت افزائی کی۔

چند دن قبل میں نے قصبۂ سیلو موقوعہ گوداوری لائن دیکھا کہ ۱۳ ایسے کارخانے روئی سے بنولہ نکالنے اور گٹھے باندھنے کے ہیں۔ ہر ایک کیلئے وسیع احاطے ہیں اوس میں پانی کی فراہمی کا انتظام بھی ... ذریعہ ہوتا ہے۔ کسی میں برقی قوت پیدا کرنیکی مشینیں بھی ہیں۔ ان کارخانوں میں کم ... ۲۵ لاکھ روپیہ ... لگا ہوگا۔ ہر سرمایہ دار شخص نے اسکو فائدہ مند کام تصور کیا اور کارخانے قائم کر دیئے مگر اب حالت یہ ہے کہ ... ضرورت کارخانے قائم ہوگئے ابتداء میں کارخانہ داروں نے نرخ کی کمی میں باہمی مقابلہ کیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ کسی کو نفع نہ ملنے لگا بالآخر باہمی سمجھوتے سے یہ تصفیہ ہوا کہ ہر سال موسم پر چند کارخانے کام کریں باقی بند رہیں اور منافعہ سب کارخانہ دار باہم مل کر تقسیم کر لیتے ہیں۔ موسم کے بعد یہ کارخانے بھی بند ہو جاتے ہیں اور مزدور و کاریگر منتشر ہو جاتے ہیں نتیجہ یہ ہوا کہ جو کچھ سرمایہ لگا اوس پر کافی منافعہ اب نہیں مل سکتا اور دوسری طرف کارخانے اور مشین سال کے بڑے حصہ کیلئے کسی مصرف کے نہیں رہتے۔ مزدوری بھی موسم میں تین چار ماہ مل سکتی ہے۔ باقی مدت سال میں کوئی کام نہیں رہ سکتا۔ یہ ممکن تھا کہ پہلے ہی پیش اندیشی کر لی جاتی کہ اس قدر کارخانے قائم ہوں تو اون کے لئے کام اور نفع کا امکان ہو بظاہر یہ کہا گیا کہ کاروبار تجارت میں کسی کو "مونا پلی" نہیں ہے۔ جو شخص سرمایہ رکھتا ہے وہ کارخانہ قائم کر سکتا ہے۔ بات میں بات یاد آگئی کہ اس اصول کو چار مینار سگریٹ سازی کے کارخانہ کی خاطر دوسرے سگریٹ سازی کے کاروبار کو اجازت دینے میں ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ دراصل مطمح نظر یہ تھا کہ جب کارخانے زیادہ ہونگے تو روئی صاف کرنے اور گٹھے باندھنے کی اجرت کم سے کم ہوتی جائیگی اور یہ بمبئی اور لنکا شائر کے خریداروں کے لئے فائدہ مند ہوگا اور ہر سرمایہ دار نے پیش اندیشی نہ کی ہر ایک نے خیال کیا کہ ہمارے پاس جسقدر سرمایہ ہے اوس سے ہم اپنا حد تک کارخانہ قائم کر دیں بعض کارخانے تو بمبئی کے تاجران پنبہ کے تھے اونہوں نے اپنی ہی ضرورت اور آسانی کا خیال رکھا۔ اگر کوئی بلند نظر حاکم یا کاروباری سرمایہ دار اس خیال کو سامنے لاتا کہ اس قدر مجموعی سرمایہ کو ملا کر

نیز اور بھی سرمایہ پبلک سے لیکر ہم سال بھر چلنے والے پارچہ بافی کے کارخانوں کو کامیابی سے چلا سکتے اور زیادہ منافعہ حاصل کر سکتے ہیں جس قدر روئی سیلو میں فروخت کے لیے آتی وہ باہر جاکر کپڑا بننے اور پھر خود سیلو میں اور ممالک محروسہ میں فروخت کیلئے آنیکے بجائے سیلو میں ہی کپڑے کی صورت میں تبدیل ہو جا سکتی ہے۔ اور یقیناً دو کارخانے مشترکہ سرمایہ سے کامیابی سے چلتے کافی منافعہ ہوتا مستقل مزدوروں کاریگروں ملازموں کی بہت بڑی تعداد آباد ہو جاتی اور عام طور پر ملک کے کاروبار کو جو کچھ مدد ملتی محتاج بیان نہیں۔ جو صورت سیلو کی ہے وہی تمام اون مقامات کی ہے جہاں ایسے کارخانے روئی صاف کرنے گٹھے باندھنے کے قائم ہوئے۔

ایسی رہنمائی اور عمل کو جو بظاہر لاینحل دشواری نہیں رکھتے اسلئے بروئے کار نہیں لایا جاتا کہ اسکو بہت ہی دشوار اور لاینحل سمجھا گیا یا یہ کہ اوسکے لئے کوئی پوشیدہ ہاتھ مانع و مزاحم رہا۔

بہرحال پارچہ بافی کی حرفت کو چھوڑ کر اور صورتوں پر نظر ڈالنے کی زحمت فرمائے۔

(۳) چمڑا کثرت سے مملکت میں ہے چمڑے کی دباغت کے لئے ترڈوڑ کی چھال بھی کثرت سے پیدا ہوتی ہے ترڈوڑ چھال کی لاکھوں روپیوں کی مالیت میں بیرون ملک سے مانگ تھی اور پیشگی روپیہ چھال مہیا کرنیوالوں کو دیا جاتا تھا۔ بیرون ملک کے بیوپاری اسکے لئے آتے تھے اور بلا خوف وخطر اپنا سرمایہ لگاتے تھے مگر دوسرے کیمیائی اشیاء یوروپ امریکہ میں تیار کرلئے گئے اور ترڈوڑ کی چھال کو چھوڑ دیا گیا۔ ترڈوڑ کی چھال اور چمڑے کی برآمد بیرون ملک کرنیکے خیال کو چھوڑ کر کیا ہم بڑے پیمانہ پر دباغت چرم۔ چرمی اشیاء اور جوتوں کو تیار کرنے کا کاروبار جابجا قائم نہیں کر سکتے۔ کر سکتے ہیں۔ آج باٹا کمپنی کی مثال ہمارے لئے درس عبرت ہے جو سارے ہندوستان کی طرح ممالک محروسہ میں بھی جوتوں کا کاروبار بڑی حد تک اپنے لئے مخصوص کر چکی ہے۔

(۴) صابون سازی کے کارخانے کی ناکامی سمجھ میں نہ آسکی۔ کیونکہ صابون بنانیوالی اشیاء کے خام ہمارے ملک میں بھی موجود ہیں اور صابون کی مانگ روز بروز زیادہ ہوتی جا رہی ہے۔ میسور کا صابون۔ ٹاٹا کمپنی کا صابون سن لائٹ کا صابون اور دوسرے اعلیٰ اور معمولی صابون کس قدر کثرت سے ہمارے ملک میں آتے ہیں۔ یہ ماجرائے حیرت ہے کہ مسدود شدہ سرکاری کارخانہ صابون سازی کو سرکار عالی کے وظیفہ یاب ناظم صاحب صنعت و حرفت خرید کر خود چلانا چاہتے ہیں۔ آں حالیکہ جب کارخانہ انکی ذمہ داری میں چل رہا تھا مسدود کیا گیا۔

(۵) مغربی طب کی ادویات اور عطریات کا کارخانہ مثل کیمیکل ورکس بنگال کارخانہ وغیرہ قائم

اور کامیابی سے چل سکتا ہے۔ ملک میں ادویات طب مغرب اور عطریات بنانے کے لئے خام مصالحہ وافر مقدار میں موجود ہے۔ یہ تجویز زوروں کے ساتھ سر رشتہ متعلقہ کے پیش نظر رہی اور پھر خاموشی کے ساتھ محافظ خانہ اسلہ میں دفن ہو گئی۔

(۶) کانگریسی کروڑپتی سرمایہ دار سیٹھ نے چند روز قبل اخبارات میں سائیکل سازی کے لئے کارخانے قائم کرنے اور دس لاکھ سرمایہ فراہم کرنے کا پرا سپکٹس شائع کیا ہے۔ سائیکل کے کثرت استعمال میں حیدرآباد دنیا کا بہت بڑا شہر ہے۔ تھوڑی توجہ سے دس نہیں بیس لاکھ کے سرمایہ سے سائیکل بنانے کا کاروبار ممالک محروسہ میں چلایا جا سکتا ہے۔

(۷) آہن سازی اور آہنی اشیا بنانے کا موٹر ریلوں کے واگنوں کی ساخت کا کاروبار بھی تھوڑی توجہ مگر عزم راسخ کے ساتھ رائج کیا جا سکتا ہے۔ ہماری اسٹیٹ ریلوے کو ہماری حکومت کو ہمارے ملک کی پبلک کو موٹروں کی کثرت سے ضرورت ہے جب ریلوے سرکار عالی کو تمام ہندوستان میں اسکا امتیاز ہے کہ وہ ریلوے کے ساتھ روڈ ٹرانسپورٹ کا کاروبار بھی اپنے ذمہ لے چکی ہے۔ نیز ریلوے کا معدنی کاروبار بھی ہاتھ میں لینے کا میلان ہے تو اوس کو حکمائیہ کاروبار بھی چلانے کا ذمہ دار بنایا جا سکتا ہے۔

(۸) اولوالعزمی سے ہم ریڈیو کے آلات بنانے اور فروخت کرنے کا کاروبار کر سکتے ہیں۔

(۹) اسٹیٹ بنک قائم اور تمام اضلاع و تعلقات میں اوسکی شاخیں کامیابی سے کھولی جا سکتی ہیں اور اپنے ملک کے سکہ کے چلن کو استوار کر سکتے ہیں۔ امپیریل بنک اور سنٹرل بنک میں نہ تو ملک کا سرمایہ ہے نہ ممالک محروسہ میں وسعت ہے اور ہماری حکومت کو ان پر کوئی عملی اقتدار یا جور شدکشن نہیں ہے۔

(۱۰) لائف انشورنس کا کاروبار ممالک محروسہ میں وسیع کیا جا سکتا ہے۔

(۱۱) اسی طرح اور بھی بکثرت ایسی صورتیں ممالک محروسہ کے صنعتی و تجارتی کاروبار کو ترقی دینے کی ہیں۔ اب تھوڑی تفصیل دستکاریوں کے متعلق کیجاتی ہے۔ ہمارے ملک کی دستکاروں کو اس قدر بھی اجرت نہیں ملتی کہ قوت لایموت کو کافی ہو سکے اور ملک کی بدمذاقی اور کاریگروں کی لاپروائی کی وجہ تاجروں کو مصنوعات ملک کی فراہمی میں سرمایہ لگانے پر جبلہ اونکی فروخت اور مناسب منافعہ ملنے کی توقع ہی نہیں ہوتی۔ یہ تو واقعہ اور بحقیقت نفس الامر ہے کہ دستکاریوں پر طوں کے بنائے ہوئے اشیاء کے بدولت عظیم اثر پڑا باوجود اسکے کہ اب بھی ہندوستان سے قطع نظر خود ممالک محروسہ میں دستکاریوں کی مانگ ہے۔ مگر عموماً خود ممالک محروسہ میں حیدرآباد سے باہر کے بنے ہوئے اشیاء اور دستکاریوں کی زیادہ قدر و قیمت ہے۔ ملک میں

زرین ریشمی ساڑیوں زرین توروں زرین مصالحہ کی اب بھی مانگ ہے۔ مگر بنارس۔ احمدآباد۔ سورت۔ پونا۔ مدورہ
(مدراس) وغیرہ کے اولوالعزم کارخانہ داروں نے پٹن۔ اورنگ آباد۔ ناندیڑ، نارائن پیٹھ وغیرہ کے کاروبار کو بٹھا دیا ہے۔

پٹن اپنی زرین پارچہ بافی کے لئے انتہائی شہرت رکھتا تھا۔ مرہٹواڑی اور حیدرآباد سے قطع نظر تمام مہاراشٹر
گجرات میں اوسکی طلب قدر و قیمت کے ساتھ تھی مہاراجگان بڑودہ و دیگر ریاستوں میں اور مرہٹہ خاندانوں میں شادی کے
تقریبات میں یہاں کی ساڑیاں وغیرہ پہنی جاتی تھیں۔ مگر اب پٹن کے تقریباً تمام کارخانے ویران اور کاریگر منتشر ہو چکے
ہیں۔ دو چار باقی ہوں تو وہ بھی بے بسی کے کسی پر روتے ہیں۔ ایک تاسف انگیز واقعہ سناتا ہوں۔ غدر سے پہلے مشہور و
معروف بابا سیٹھ نے جو اورنگ آباد میں کاروبار کرتا تھا پٹن سے دو ساڑیاں تیار کرائیں جو عجائبات بافندگی میں
شمار ہونے کے قابل تھیں اور قیمت ہر ایک کی ایک ہزار سے کچھ کم و بیش تھی یہ ساڑیاں غدر کے تفرقہ میں فروخت نہ ہو سکیں
اور پھر بابا سیٹھ کا دوالیہ نکل گیا جو شخص ان ساڑیوں کا قابض ہوا اوسکے پاس کوئی خریدار نہ آیا۔ ایک ساڑی کو
جلا کر اس کا زر نکال لیا گیا دوسری ساڑی اسی طرح رکھی رہی تا آنکہ شاہ ایڈورڈ معظم کے تاج پوشی کی یادگار میں
لارڈ کرزن نے دہلی میں دربار اور دربار کے ساتھ ہندوستانی صنعتوں کی نمایش منعقد کرنیکی تیاری شروع کرائی
اور نمایش کے اہتمام اور ساز و سامان فراہم کرنے میں سر جارج واٹ اور مسٹر پرسی براون جنکو فنون لطیفہ میں خاص
مہارت تھی مقرر ہوئے۔ مسٹر پرسی براؤن نمایش کے لئے سامان جمع کرنے اورنگ آباد آئے اونہوں نے اورنگ آباد
وغیرہ سے متعدد نوادرات کو تلاش کرتے ہوئے سرکاری طور پر حکومت ہند کی جانب سے خرید کیا اور نمایش دہلی دربار
میں یہ نوادرات بھی رکھے گئے اور اسکے بعد کلکتہ میوزیم کے شعبہ مصنوعات میں یہ قرینے سے محفوظ کر دیئے گئے ہیں
اوسکا تذکرہ سر جارج واٹ نے اپنی کتاب "انڈین آرٹ اٹ دہلی" دربار میں جو نمایش کی سرکاری روئداد ہے
کیا ہے۔ اونہوں نے اپنی کتاب میں پٹن کی ان دونوں ساڑیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک ساڑی جو
باقی رہ گئی تھی مسٹر پرسی براؤن نے نمایش کیلئے خرید لی سر جارج واٹ نے کتاب کے معدودے چند تصاویر میں
اس ساڑی کا فوٹو بھی شامل کیا ہے اور اسکی خوبیوں کی تفصیل میں دو تین صفحے لکھے ہیں کہ اسکی ساخت اورنگ آباد میں
عجیب تناسب کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ طاؤسان زمرد خام - اپنی چونچ میں موتیوں کی مالا
لئے ہوئے رقص کے لئے کھڑے ہیں۔

اس ساڑی کو میں نے بھی کلکتہ میوزیم میں دیکھا ہے تقریباً سو سال گذرنے پر بھی اسکی آب و تاب باقی ہے

اور حقیقت میں صنعت کا کمال اوس میں نظر آتا ہے اوسکو دیکھ کر اس کا تذکرہ کتاب میں پڑھنے کے بعد میں نے اپنے دل میں سوال کیا کہ ہمارے ملک میں خدا کے فضل سے ایسی متمول و معزز خواتین موجود ہیں جو ہزار ڈیڑھ ہزار روپیہ کی ساڑی باندھ سکتی ہیں اور اسکو خرید کر اور اوسکے مماثل ساڑیاں تیار کرا کر ملک کی کاروباری ترقی میں ہمت افزائی کر سکتی ہیں؟ مگر باوجود اسکے یہ نمونہ کمال صنعت تقریباً ساٹھ سال تک بلا فروخت رہ جاتا ہے اور بالآخر ایک انگریز متلاشی کمال آتا اور اوسکو خرید کر لیجاتا ہے اور ممالک محروسہ سے باہر کلکتہ میں اب بھی وہ نمونۂ کمال منظر عام کیلئے رکھا ہوا ہے اور زبان حال سے کہتا ہے ۔ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو ۔

ممالک محروسہ میں پٹن کی طرح اور بڑے بڑے مقام دستکاریوں کیلئے مشہور تھے ناندیڑ سیلون کیلئے ورنگل قالین کے لئے اور نارائن پیٹھ ریشمی ساڑیوں وغیرہ کیلئے اور خود اورنگ آباد کی دستکاریاں وغیرہ انتہائی شہرت رکھتی تھیں اور انکی فروخت بہت کافی مقدار میں ہوتی تھی اونکے تنزل کی جو اہم وجوہات تھے وہ میرے خیال میں حسب ذیل ہیں

ممالک محروسہ کے دستکاریوں پر جو حیدرآباد میں فروخت ہوں چنگی کا محصول (ﮐﮧ) فی صد قائم تھا نیز ممالک محروسہ سے باہر بھی فروخت کے لئے جائیں تو محصول کروڑگیری (ﮐﮧ) فیصد قائم تھا برٹش انڈیا کے ساختہ دستکاریوں پر اس قسم کے محصول قائم نہ رہے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں تک برٹش انڈیا کے بازاروں کا تعلق تھا ممالک محروسہ کے مصنوعات بوجہ محصول اونکا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے چند ہی سالوں میں وہاں کے بازار ممالک محروسہ کی دستکاریوں سے خالی ہو گئے اسکی ایک مثال سے میں توضیح کرتا ہوں دیول گاؤں میں جو برٹش انڈیا کا علاقہ ہے ہر سال بہت بڑی جاترا ہوا کرتی تھی وہاں جالنہ اورنگ آباد وغیرہ کے ریشمی و زرین ساڑیاں کافی مقدار میں فروخت ہوتی تھیں۔ جب محصول چنگی و کروڑگیری قائم ہوئے تو ممالک محروسہ کی ساختہ ساڑیوں پر محصول لگ گیا اسکے مقابل اورنگ آباد کے متصلہ مقامات برٹش انڈیا سے سامان ممالک محروسہ میں دیول گاؤں روانہ کیا جاتا تھا تو کوئی محصول اوسپر عاید نہ ہوتا تھا چنانچہ اکولہ ضلع ناسک اور احمد نگر کے مصنوعات جالنہ سے ہو کر دیول گاؤں جاتے تھے اور عدم محصول کی وجہ ارزاں فروخت ہوتے تھے اور نتیجہ چند سال میں یہ ہوا کہ ممالک محروسہ کی مصنوعات سے بازار خالی ہو گیا ۔

ایک بڑی وجہ یہ ہوئی کہ بنارس ۔ احمد آباد ۔ سورت وغیرہ ابتدا ہی میں ریلوے لائن سے پیوست ہو گئے اوسکے مقابل اورنگ آباد ۔ ناندیڑ ۔ ورنگل میں ۔ بہت عرصہ کے بعد ریلوے لائن قائم ہوئی اور پٹن و نارائن پیٹھ تو ہنوز ریلوے لائن سے محروم ہیں ۔ بنارس ۔ احمد آباد ۔ سورت وغیرہ میں اولوالعزم مہاجنوں نے

کافی سرمایہ اپنے کاروبار میں لگایا اور اونکی ایجنسیاں بھی قائم کیں ممالک محروسہ کی تجارت بمبئی والوں کے ہاتھ میں
جلد سے جلد آگئی اور انہوں نے جہاں تک ممکن تھا ممالک محروسہ میں بیرون ملک کے پارچہ کو فروخت کیلئے آسانی سے پھیلا دیا۔
بنارس وغیرہ کی مصنوعات میں جدید ڈزاین وغیرہ اختیار کئے گئے ممالک محروسہ کے کارخانہ دار گویا پرانی
لکیر کے فقیر تھے انہوں نے اپنے کاروبار میں جدت نہ پیدا کی نتیجہ ظاہر ہے۔
اب حالت یہ ہے کہ ممالک محروسہ کے کاریگر نہایت مفلوک الحال ہیں کافی سرمایہ نہیں رکھتے ۔ سامان
تیار ہو تو فروخت کیلئے اوسکو بازار میں پہنچانے کی سہولتیں حاصل نہیں ہیں اوسکے ساتھ ساتھ حرکت میں برکت کی
مثالیں بھی موجود ہیں اورنگ آباد میں بڑے پیمانہ پر ریشمی ساڑیاں اور شیروانیوں کے پارچوں کا وسیع پیمانہ پر
انتظام ہوا اور حیدرآباد میں دوکان قائم کی گئی نتیجہ یہ ہوا کہ کافی مقدار میں اب یہ فروخت ہوتے ہیں۔
حیدرآباد میں بی ڈبلیو ل اور یم۔یس۔ل وغیرہ کی جانب سے ساڑیوں کی تیاری اور اون کی
ایجنسیوں کا اہتمام کیا گیا اور اسکی وجہ فروخت بھی زیادہ ہو گئی۔
مصنوعات ملکی کی فروخت زیادہ کرنے اور کاریگروں کو مناسب مشورہ دینے ادارۂ مصنوعات ملکی
قائم کیا گیا سرکار کی جانب سے اوسمیں معتدبہ روپیہ صرف کیا جاتا ہے اور اوسکا کچھ نہ کچھ مفید اثر مرتب ہوا ہے
لیکن اوسکے اعداد بمقابل مصارف کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں ہیں۔
آپکی معاشی کمیٹی نے بھی ایک تجارت گاہ مصنوعات ملک کے فروخت کے لئے معظم جاہی مارکٹ میں قائم کی ہے
مگر وہ جس قدر مصنوعات فروخت کر سکی ہے اوسکے اعداد کچھ ہمت افزا نہیں ہیں آپکی کمیٹی کیلئے ممکن تھا کہ وہ اس تمام
کاروبار کی ایجنسیاں حاصل کرتی جنکے اسٹال نمائش میں قائم ہیں اور اسطرح کافی دستکاریاں اسکے ذخیرۂ تجارت میں
جمع ہو جاتیں اور جب مال زیادہ ہوتا ہے تو فروخت بھی لازماً زیادہ ہوتی ہے۔
آپکی نمائش مصنوعات بلاشبہ ملک کیلئے قابل مسرت ہے اور آپ کا کام مختلف اعتبارات سے اچھا ہی
رہا ہے لیکن ذمہ داران نمائش معاف فرمائیں اگر یہ عرض کروں کہ ہنوز اونکو بہت کچھ کام کرنا ہے۔
ہر سال کسقدر افراد نمائش میں آئے ہیں اگرچہ بڑی تعداد میں لوگ آتے ہیں لیکن ممالک محروسہ کی آبادی
چھوڑ کر حیدرآباد وسکندرآباد و مضافات کی آبادی کسقدر ہے اور کیا آپکی نمائش کو ان تمام لوگوں نے کم از کم
ایک وقت بھی دیکھا ہے؟ میرا خیال ہے کہ نہیں دیکھا۔ نمائش میں بہت سے افراد کئی کئی مرتبہ آئے ہیں اونکی

منہا ہی ہو تو پھر کس قدر اوسط روزانہ ہوتا ہے؟

آپ کو نمائش میں اس قدر وسعت دینی اور اس قدر دلبستگی پیدا کرنی چاہیئے کہ روزانہ نمائش دیکھنے والوں کی تعداد ۴۰۰۰۰ ۵ ہزار تک پہنچ جائے اور تمام اضلاع و دیہات سے ہزاروں افراد اسکو دیکھنے آئیں۔

اوسکے بعد آپ اس بات کا اندازہ فرمائیں کہ نمائش میں کس قدر مال فروخت کے لئے جمع ہے اور کسقدر فروخت ہوتا ہے۔ اکل و شرب کی اشیاء کو نہ تیا کیا جائے تو دستکاریوں کی حد تک میرے خیال میں ڈیڑھ دو لاکھ سے زیادہ کا سامان فروخت نہیں ہوتا۔ یہ اعداد ایک وسیع ملک میں جسکی آبادی ڈیڑھ کروڑ کے قریب ہے اور جہاں کی تجارت خارجہ سالانہ پچیس تیس کروڑ تک ہے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔

آپ کو عام طور پر ملک میں احساس پیدا کرنا چاہیئے کہ آپکی نمائش میں روزانہ ایک ایک لاکھ روپیہ کا سامان تو فروخت ہو۔ اور ایسی صورت میں ہی آپ مصنوعات ملک کی ترویج پر بڑا اہم اثر پیدا کرسکتے ہیں۔

آپ کو اس پر بھی غور کرنا چاہئیے کہ خالص ملکی دستکاریوں کا کس قدر حصہ آپکے نمائش میں ہے چونکہ نمائش میں بہت نکاسی ہوتی ہے۔ مگر اکثر وہ باہر سے آتی ہیں۔ ٹک وغیرہ اوپر لگا دیئے جاتے ہیں اور ملکی مصنوعات میں وہ شامل ہوجاتی ہیں۔ بیرونی کپڑا بلکہ جاپان ریو روپ کا پارچہ ہے اسکے بلوز بنائے گئے ہیں۔ اور وہ ملکی ہوگئے ہیں بیرونی پارچہ پر آری کا کام کیا گیا اور ملکی مصنوعات میں شامل ہوگیا۔ بیرونی مخمل پر کارچوبی کام ہوا اور وہ مصنوعات ملک میں داخل کیا گیا۔ اسی طرح اور مثالیں بہت سی ہیں۔

آپ کی نمائش کمیٹی کے پُرجوش اور عملی کارفرما ارکین ایک اور طریقہ سے ملکی مصنوعات کو ترقی دے سکتے ہیں وہ یہ کہ پتھرگٹی۔ لاڈ بازار۔ مصطفےٰ بازار سکندرآباد کے بڑے بڑے تاجران پارچہ کو ترغیب دیں کہ وہ ملکی مصنوعات کو اپنے دوکانوں میں مہیا کریں جب اسطرح ملک کے بڑے بڑے بازاروں میں مصنوعات ملک کو جگہ مل جائیگی تو پھر خود بخود ترویج مصنوعات ملک آسان ہوجائیگی۔ سینکڑوں دوکانیں کپڑوں کی حیدرآباد و سکندرآباد میں ہیں اور ہر ایک دوکان میں اوسطاً ماہانہ سینکڑوں روپیوں کا پارچہ فروخت ہوسکتا ہے۔ عام طور پر گاہک سہولت کو دیکھتے ہیں وہ جہاں کفایت اور آسانی سے سامان ملتا ہے اور جہاں اونکا کھاتہ اور کاروبار رہتا ہے وہاں سے لیا کرتے ہیں اگر ملک کے تاجران پارچہ متوجہ ہوجائیں اور اونکو متوجہ کرنا معاشی کمیٹی کے لئے آسان ہے تو وہ پھر ملکی مصنوعات کو بآسانی مہیا کرسکتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام مصنوعات ملک بازاروں میں مہیا ہوجائینگے۔

اس طویل تقریر کی آپ سے معافی چاہتے ہوئے بالآخر میں آپکے محترم صدر نشین جناب نواب احسن یار جنگ بہادر کی توجہ ملک کی کاروباری ترقی کے متعلق منعطف کرانے کی جسارت کرونگا۔

نواب سر آسمانجاہ مرحوم کی مدار المہامی میں آج سے زاید از پچاس سال پیشتر سرکار عالی نے ایک محکمہ نظامت تجارت و حرفت قائم فرمایا اور اس پر مولوی سید محمد حسین صاحب مرحوم کو برٹش انڈیا سے طلب کر کے ناظم مقرر کیا گیا تھا مولوی سید محمد حسین صاحب مرحوم نے کچھ نہ کچھ کام آغاز کیا اور رپورٹیں بھی لکھیں اونکے انتقال کے بعد یہ عہدہ تخفیف ہو گیا۔ اونکی ایک مطبوعہ رپورٹ میں ایک بلیغ فقرہ جسکو ہمیشہ یاد رہنا اونہوں نے لکھا تھا کہ جو کچھ کام ترقی صنعت و حرفت کے لئے ممکن ہو سکتا ہے اوسکو جلد سے جلد عملی جامہ پہنانا چاہئیے آگے چل کر یہ توضیح کی تھی کہ "خیالات کیسے ہی عالی اور کیسے ہی فصیح و بلیغ کیوں نہوں اگر عمل میں نہ آئیں تو وہ "بخیل کا سونا" ہیں جس سے دنیا کو کوئی فائدہ نہیں ہے"۔

میں نواب احسن یار جنگ بہادر کی خدمت میں ان الفاظ کی یاد دہانی کراتا ہوا یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جب دنیا میں اسٹیم اور الکٹرسٹی کا دور ہے تو حیدرآباد کی معاشی ترقی کا ذریعہ بڑی حد تک بہت بڑے پیمانہ پر برق و بخار کی قوت سے کام لینے اور بڑے وسیع مشترکہ سرمایہ جمع کرنے پر منحصر ہے۔ اسکے لئے قابل ترین افراد راہ عمل میں آگے بڑھیں تو سب دشواریاں اور مشکلات رفع ہو جا سکتی ہیں۔ نواب احسن یار جنگ بہادر اعلیٰ قابلیت رکھتے ہیں۔ ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ دولت بھی ہے کاروباری قابلیت بھی ہے۔ میں نہایت ادب سے جناب ممدوح کی خدمت میں عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں کہ وہ کاروبار کے شعبہ میں قدم رکھیں اور کسی بہت بڑے تجارتی حرفتی کاروبار کو مشترکہ سرمایہ سے آغاز کریں۔ جناب ممدوح کے لئے کوئی بڑی کمپنی قائم کرنا اور ڈیڑھ دو کروڑ کا سرمایہ جمع کرنا اور کاروبار میں لگانا کچھ مشکل نہیں ہے ـــــ خود بھی اوس سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ ملک و قوم کو بھی مستفید فرما سکتے ہیں۔ ورنہ خیالات عالی بلا عمل بخیل کی دولت ہیں جو دنیا کو فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔

اس عرض کے بعد میں اپنے مقالہ کو ختم کرتا ہوں۔

محمد مظہر (اعزازی معتمد حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس)

ورود شاہانہ

نمائش میں اعلحضرت بندگانعالی کی تشریف آوری کیلئے ۲۹ ذیحجہ ۱۳۶۰ھ روز شنبہ وقت ۱۰½ ساعت مقرر تھا۔ ایک روز قبل آخری یوم خواتین مقرر تھا۔ کم و بیش بیس ہزار خواتین جمع ہوئی تھیں رات کے ایک بجے خواتین کا یہ عظیم الشان مجمع برخاست ہوا۔ کارکنان نمائش نے ٹکٹ داخلہ کے حسابات سے تین بجے رات کو فرصت پائی۔ لیکن اسکے بعد ہی وہ ورود خسروی کے لئے انتظامات میں منہمک ہوگئے اور صبح ہوتے ہی وہ اصحاب جنکی حاضری ضروری تھی۔ نمائش گاہ میں اپنے محبوب القلوب بادشاہ سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کے دیدار پُرانوار کیلئے کمربستہ تھے ٹھیک دس بجے ہز اکسلنسی صدر اعظم بہادر اور سر محمد یعقوب صاحب مشیر اصلاحات ارشاد خسروی کے بموجب نمائش گاہ میں تشریف فرما ہوئے۔ نواب کاظم یار جنگ بہادر چیف سکریٹری نواب زین یار جنگ بہادر چیف آرکٹکٹ نواب رحمت یار جنگ بہادر۔ حکیم مقصود علی خاں صاحب مولوی ناظر الحسن صاحب ہوش بلگرامی اور نواب شہید یار جنگ بہادر بھی بمتابعت حکم محکم تشریف لائے پونے گیارہ بجے سیٹیوں کی گونج نے نمائش میں ورود خسروی کا اعلان کردیا۔

شاہزادگان بلند اقبال بھی تشریف فرما ہوئے تشریف آوری پر وکٹوریہ میموریل آرفنیج اور سری چتر گپت زورس کے بیانڈ نے سلامی دی۔

صدر نمائش و اراکین مجلس عاملہ مجلس مشاورت داعیان ذیلی کمیٹی اور ان سرکاری سررشتوں کے نظماء نے جن کے اسٹال نمائش میں قائم تھے آداب بجا لانے کی عزت حاصل کی۔

سب سے پہلے سواری شاہانہ محکمہ اعداد و شمار کے اسٹال پر رونق افروز ہوئی۔ شعبۂ بٹن سازی کے اسٹال بھارت بٹن فیکٹری سے گذرتے ہوئے محمدیہ بٹن سازی کے اسٹال پر گلٹ کے کام کی نسبت استفسار فرمایا گیا۔ اسکے بعد پربھات بٹن فیکٹری اور پریم بٹن فیاکٹری پر نظر شاہانہ متوجہ ہوئی۔

گولکنڈہ سگریٹ فیاکٹری کے اسٹال پر جہاں مرحوم عبدالستار صاحب مالک فیاکٹری کی کمسن دختر بھی اسٹال کی نگران تھی عبدالستار صاحب کی فوٹو کے متعلق استفسار فرمایا گیا اور اسٹال میں طلائی تمغہ جس فریم میں آویزاں تھا اوسکی ماہیت بھی دریافت فرمائی گئی۔

جے۔ تاراچند محکمہ ریلوے اور فروخت گاہ مصنوعات ملکی کے اسٹالوں کے معائنہ کے بعد جوہریوں کے اسٹال
یس جے۔ موتی لال شیوچندر رائے موہن لال پر چاندی کے گلدان وغیرہ ملاحظہ فرمائے گئے۔ محمود حسین مشتاق حسین صاحب کے
اسٹال پر شبیہ مبارک انگشتری کے نگینہ کے طور پر رکھی ہوئی تھی اسے ملاحظہ فرمایا گیا۔ اس موقعہ پر نشتر گاہ مصنوعات ملکی سے
تشریف آوری شاہانہ کی تقریب میں نغمات سرود نشر ہوئے۔ حاجی شیخ بالے۔ شیخ جہانگیر اور راگھولو چوڑی سازوں
اور اسلامیہ اگربتی یل۔ سی۔ آنند کے دوکانات ملاحظہ فرماتے ہوئے اورنگ آباد سلک ملز اور کشمیر سلک فیاکٹری کے
اسٹال پر توقف فرمایا گیا اور ہمرو کے تھان پسند فرمائے گئے۔ سلک میوزیم اور جیون ٹکسٹائل ملز اور حیدرآباد سلک ملز
ملاحظہ کے بعد ناگوٹ نارائن کے اسٹال پر ارشاد ہوا کہ توروں کی چوڑائی کا موجودہ نیا فیشن کوئی نزاکت نہیں رکھتا۔
بی۔ ڈبلیو ملز اور یم۔ یس۔ ملز مدوری ویوینگ ملز بلوز امپوریم ملاحظہ فرماتے ہوئے اقبال احمد صاحب
علوی کی گھریلو صنعتوں کا دیرتک بہ کمال پسندیدگی ملاحظہ فرمایا گیا۔ انکے کشیدہ کئے ہوئے تکیہ کے کام اور آرائش
گلدان کو بہ نظر خوشنودی ملاحظہ فرماتے ہوئے اونکے کام کی بابت مختلف تفصیلات بھی دریافت فرمائی گئیں۔
اسٹال مدرسہ فیض النسواں پر بھی توجہات خسروی مبذول ہیں۔ جہاں غریب بیواؤں اور یتیم و نادار لڑکیوں کو
کشیدہ کاری اور زردوزی کا کام سکھایا جا کر روزگار سے لگایا جاتا ہے۔
منجن شفیع کے اسٹال پر کرولی کے بنے ہوئے آرائش ہار کو بہ نظر استحسان ملاحظہ فرمایا گیا۔
گلبہار کمپنی کے اسٹال پر ارشاد ہوا کہ حکیم مقصود علیخاں صاحب نے اس کمپنی کے تیار شدہ روغنیات کی
بابتہ بھی معروضہ کیا ہے۔ مالک کمپنی نے اپنے ہاں کے نمونہ کا ایک سٹ بھی ملاحظہ میں پیش کیا۔
عبدالغنی صاحب کے اسٹال اور یوسفی مسالہ گلبرگہ کے مسالے اور دہونیوں کو دیکھتے ہوئے جو بہت مقبول اور
اپنا جواب نہیں رکھتے ہیں ارشاد ہوا کہ میسور کی عودبتیاں بھی اس خصوص میں ممتاز ہوتی ہیں۔ اسکے بعد صابن سازی کے
کارخانہ پہ توجہ مبذول فرمائی گئی۔ بلدہ سوپ فیاکٹری میں جو چرمی پاکٹ بطور ذیلی صنعت تیار ہوتا ہے۔ انکے
بابت دریافت فرمایا گیا۔ امیر سوپ فیاکٹری کے ہاں جو صابن کی ٹکیاں حمام کی ضروریات کے لئے تیار ہوتی ہیں اونکی
قیمت اور نکاسی کے متعلق استفسارات فرمائے گئے۔ ٹائیگر سوپ کے بنے ہوئے ٹریڈ مارک شیر پر بھی نظر ڈالی گئی۔
اسکے بعد یم قیصر کے پاس فراک اور جمپر پسند فرمائے گئے اور ارشاد ہوا کہ کام بہت ہی نازک اور دلکش ہے
دکن ایوری آرٹ کے ہاتھی دانت اور صندل کا کام دیکھا گیا اور اسکی باریکی نوٹ فرمائی گئی۔

پھر انیس الغربا کے یتیم لڑکوں اور لڑکیوں کی جماعت سے تسلیم سلامی قبول فرمائی گئی اور انکے پاس کے تیار کردہ صوفے پسند خاطر ہوئے بعد ازاں سررشتہ جنگلات کے اسٹال میں سواری شاہانہ رونق افروز ہوئی اور یہاں کے ایک چوبی قلمدان کو نفس نفیس کھولکر ملاحظہ فرمایا گیا۔

نشر گاہ مصنوعات ملکی سے گذرتے ہوئے حضرت اقدس اعلیٰ کی خدمت میں میر اکبر علی خاں صاحب صدر مجلس نمائش معاشی کمیٹی نے یہ معروضہ پیش کیا کہ ہماری یہ نشر گاہ نمائش میں اطلاعات علمی تقاریر اور موسیقی بڑی کامیابی کیساتھ نشر کرتی رہی ہے

اسکے بعد حضرت اقدس و اعلیٰ اسٹال ڈیمونار پر تشریف فرما ہوئے جہاں فرنیچر نہایت اچھے ڈزاین کا تیار ہوتا ہے مالک اسٹال قدیم جاگیرداروں کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ حضور پرنور نے انکے فرنیچر کو بہترین اور اپ ٹو ڈیٹ تصور فرمایا اسکے ملاحظہ کے بعد مرکز مصنوعات ملکی کے اسٹال پر قدوم ہمایونی متوجہ ہوئے۔

عبدالروف صاحب دوم تعلقدار نے زیر سرپرستی مجلس نمائش اسکا انتظام کیا تھا۔ اور یہاں ایسے کم استطاعت صناعوں اور خواتین کے کام جمع کئے گئے تھے۔ جو اپنا علیحدہ اسٹال قائم نہیں کرسکتے نیک سنگھ صاحب آرٹسٹ کی تیار کردہ شبیہ مبارک اور عبدالرزاق صاحب فاروقی آرٹسٹ کی تیار کردہ مصروف نماز لڑکی کی تصویر کے متعلق بعض امور دریافت فرمائے گئے۔ کشیدہ کے کام بھی دیکھے گئے شاہان آصفی کی شبیہیں جاذب توجہ رہیں نواب زین یار جنگ بہادر نے اس اسٹال کی افادیت کو عرض کیا۔

وکٹوریہ میموریل آرفنیج کے صوفوں کے متعلق ارشاد ہوا کہ کام اچھا ہے۔ موون لائٹ کمپنی ادارہ دار التشہیر عثمانیہ عثمانیہ لیدر ورکنگ اسکول مدرسہ صنعت و حرفت نامپلی اور جے کے۔ اینڈ برش ورکس آلیر کے اسٹال ملاحظہ فرماتے ہوئے شیخ احمد جان محمد گپتی ساز ضلع بیڑ کو اسکی عزت عطا ہوئی کہ وہ اپنی جدید گپتیاں ملاحظہ کرائیں۔ ارشاد ہوا کہ یہ کارآمد چیزیں ہیں۔

انجمن خادم المسلمین کے ہاں کے چرمی کام خصوصاً دریائی سفر کیلئے موزوں چرمی صندوق ملاحظہ فرمائے گئے۔

بیدری صنعت کے اسٹال میں گلزار دکن کے اسٹال پر بیدری کام کے بگلوس ملاحظہ ہوئے اور تاج دکن کے اسٹال پر ٹیبل لیمپ کو پسند فرمایا گیا۔ ارشاد ہوا کہ بیدری کام میں خوب دیدہ ریزی سے کام لیا جاتا ہے۔

یہاں سے سرکاری محکموں کے اسٹالس کی طرف سواری شاہانہ متوجہ ہوئی ہوش بلگرامی صاحب نے سررشتہ حفظان صحت و صحت عامہ کے اسٹال کی طرف حضرت ظل سبحانی کی توجہات عالیہ مبذول کرائیں۔

دار الطبع کے اسٹال میں نستعلیق ٹائپ میں اسی وقت طبع شدہ القاب شاہانہ کا نمونہ پیش ہوا مسٹر یکتھال کے

مجلۂ طیلسانیین ... سے گذر ہوا
انگریزی ترجمہ شدہ قرآن کا نسخہ بھی ملاحظہ عالی میں پیش ہوا۔ ساتھ ہی سررشتہ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ سے گذر ہوا
اور نواب شہید یار جنگ بہادر نے گذارش کی کہ طیلسانیین جامعہ عثمانیہ کیلئے شعبہ تالیف و ترجمہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

محکمۂ زراعت، محکمۂ علاج حیوانات، نظام شوگر فیاکٹری کے اسٹال ملاحظہ فرمانے کے بعد محکمۂ بندوبست کے
اسٹال پر استفسار ہوا کہ یہ محکمہ اس نمائش میں کسطرح شریک ہوا ہے۔ میر اکبر علی خاں صاحب نے گذارش کی کہ یہاں ملک کے
زمینات کی پیمائش اور نقشے تیار ہوتے ہیں چنانچہ پیمائش و بندوبست کے کام کے ماڈل او نقشہ جات پر نظر عالی ہوئی۔
محکمہ آبکاری کے اسٹال پر رکھا ہوا سیندھی بن کا ماڈل اور مصنوعات درخت سیندھی جاذب توجہ رہے۔
واپسی کے وقت میر اکبر علی خان صاحب کی خردسال لڑکی نے کورنش و آداب عرض کیا۔ فرط نوازش سے بچی کو ہمراہی میں
رہنے کے لئے امر عالی صادر رہوا۔ سررشتہ جات بلدیہ، آرائش بلدہ، معدنیات، کندیدگی باؤلیات عثمان آباد۔ ڈورینیج
اور انجمن ترک مسکرات کے اسٹال پر نظر ڈالتے ہوئے اعظم ٹائیم پریس کے اسٹال کی طرف مراجعت ہوئی۔ سید اسمٰعیل اینڈسنس کے
بنے ہوئے کاغذ کا ملاحظہ ہوا۔ یہ ارشاد ہوئے پر کہ کاغذ میں روشنائی کا قلم رکتا ہے اور سرمئی پنسل سے کافی گہرا نہیں لکھا
جاسکتا۔ سید اسمٰعیل صاحب نے ایک پیاڈ پیش فرماتے ہوئے یہ گذارش کی کہ اب اسکی کوشش کی گئی ہے اور اب سابقہ
کاغذ کے مقابل زیادہ ہموار و صاف کاغذ تیار ہو رہا ہے۔ چنانچہ اسکو دست مبارک سے ملاحظہ فرمایا گیا۔ حیدری کشتی کتب خانے
اور حمیدیہ کارخانہ جلد سازی کے ملاحظہ کے بعد کریمیہ کارخانہ پر عرض کیا گیا کہ سرکاری ضروریات کی یہاں سے فراہمی ہوتی ہے
کتابستان کے اسٹال پر یہ یاد کیا گیا کہ گذشتہ سال بھی کلام مجید کے اس قلمی نسخے کو ملاحظہ کیا گیا ہے۔ شاہزادگان بلند اقبال نے
احتراماً و عقیدتاً اس نسخہ کو سر سے لگایا۔ سررشتہ محبس، اعظم جاہی ملز، عثمان شاہی ملز، رام گوپال ملز، اسپننگ اینڈ ویونگ ملز
رایل بے بی واٹر طبی امداد سررشتہ بلدیہ کے اسٹال پر سے گذر کر جلوس شاہانہ سنکاریڈی کے اسٹال کیطرف متوجہ ہوا۔ سنکاریڈی کے
ریشم کے متعلق ارشاد ہوا کہ یہ بھی بہت نفیس ہوتا ہے۔ مایل ورکس کے دوکان پر اس گذارش سے دلچسپی لیگئی کہ اب آگرہ کا کام
یہاں بھی ہونے لگا ہے اور ارشاد ہوا کہ صنعتی ترقی اس کا نام ہے کہ جو اشیاء باہر تیار ہوتی ہیں وہ ملک میں تیار ہوں۔
محمد جیلانی اینڈ سنس اور دکن شوز فیاکٹری میں دیسی کفش، چڑا اسٹال پر توقف فرماکر زنانی کفش کی بابت بعض امور
دریافت فرمائے گئے اور یہ ارشاد شاہانہ ہوا کہ عورتیں کتنی تکلیف سے انکو پہنتی ہونگی۔ دکن اسٹور کارخانہ رنگوائی، بابا دادا اینڈ
ٹام کمپنی، شہاب الدین کاغذ ساز دولت آباد، روز بسکٹ ورکس سے گذرتے ہوئے محمد اعظم معین الدین کے اسٹال پر
صالح بن محمد کی تیار کردہ چھڑی ملاحظہ میں پیش ہوئی اور ارشاد ہوا کہ بہت ہی نازک کام ہے۔

اسکے بعد ابراہیم علی تلوہے
چارمینار خانی کے اسٹال پر کانی کے پٹنے کا مظاہرہ ہورہا تھا۔ اسکا معائنہ فرمایا گیا۔
اسٹال پران کے کمسن لڑکوں کے زربفت اور زردوزی کا کام بہ نظر التفات و تحسین ملاحظہ فرمایا گیا۔

شعبہ تفریحات سے گذرتے وقت عرض کیا گیا کہ یہاں گورنمنٹ کالج آف فزیکل ایجوکیشن ہا اسکوٹس

حیدرآباد اور جوڑواں عورت کے کرتب کے اسٹال قائم ہیں۔

شعبۂ جاگیرات میں اسٹیٹ راجہ دھرم کرن بہادر میں تیار ہونیوالی مصنوعات ایک ایک کرکے ملاحظہ کیگئیں

اسکے بعد مستان امرچنتہ وگدوال ویہوم کے اسٹال پر ارشاد ہوا کہ مقامی دیہاتی آبادی کے مذاق کی اشیاء وہاں

تیار ہورہی ہیں مٹ پلی کے کھادی کے اسٹال کی بابت بھی شاہانہ توجہ کا اظہار رہا۔

نواب بہادر یار جنگ بہادر کی جاگیر لال گڑہی کے پارچہ کی بابت ارشاد ہوا کہ وہ بہت ہی دیدہ زیب ہے

اسکے بعد سررشتہ تعلیم صنعت وحرفت کے اسٹال پر سواری شاہانہ رونق افروز ہوئی مدرسہ کے اللہ جمیلٌ ویحبّ الجمال

کی تصویر پسند فرمائی گئی۔ شبیہ مبارک کی بابتہ جواسٹال کے درمیان آویزاں تھی ارشاد ہوا کہ اس میں بہت مشابہت ہے۔ سررشتہ

تعلیم صنعت وحرفت اور مرکزی مدرسہ فنون لطیفہ کے اسٹال سے واپسی پر ارشاد ہوا کہ شاہی ذخیرۂ نوادر مصنوعات ملکی کا

جب عوام کیلئے معائنہ ممکن کردیا جائیگا تو پھر میر اکبر علی خاں کی نمائش گاہ سے اس کا کامپٹیشن (competition) ہوگا۔

میر اکبر علی خاں صاحب نے مودبانہ گذارش کی کہ انکی کیا مجال اور کیا طاقت ہے کہ اس کا تصور تک کرسکیں۔ اسی مقام

سے مظاہرات کے شعبے کی بابت میر اکبر علی خاں صاحب نے معروضہ کیا کہ طلبائے جامعہ عثمانیہ ٹکنیکل کالج نیز دوسرے

اچھے میکانک وہاں ہوائی جہاز ریڈیو کے کل پرزے بنانے کا مظاہرہ کررہے ہیں۔ اور جہاں چارمینار ٹائل ورکس

لال جی میگ جی، انڈین ایرن اینڈ اسٹیل کارپوریشن، اعظم پن کمپنی، کارخانہ ہائے قلم سازی وکھلونے سازی

حسین خاں فرخ نگر، دکن اسکول چاک ورکس، شعبہ ہارٹی کلچر سررشتہ زراعت، یل۔جی۔ ہوم بال، اسمارٹ انجنیرنگ ورکس

انیتا زرگر، کرمینگر، مدرسہ کوروکروگننگ سرکار عالی، آل دیو ریڈیو صدیق موٹر اینڈ انجنیرنگ ورکس، شعبہ کیمیا جامعہ عثمانیہ

انڈسٹریل لابری مصنوعات دیہی مشیرآباد محکمہ تجارت وحرفت کے اسٹال قائم ہیں۔

اسکے بعد سواری شاہانہ اگزبیشن کلب کی طرف متوجہ ہوئی ارشاد ہوا کہ اس شاندار اور خوبصورت نمائش گاہ میں

ٹیٹیوں سے سال بہ سال عارضی طور پر کلب کا بنایا جانا مناسب نہیں معلوم ہوتا اسکے لئے ایک خوشنما مستقل عمارت

ہونا چاہیئے۔ اور بہ الطاف شاہانہ سرصدر اعظم بہادر سے ارشاد ہوا کہ فرمان روانہ کیا جائیگا کہ دس ہزار روپیہ کی رقم سے

نمایش کلب کی تعمیر منجانب سرکار باغ عامہ میں عمل میں لائی جائے۔ سر صدر اعظم بہادر نے عرض کیا کہ مجلس نمایش کے لئے یہ عمارت بہترین عطیہ ثابت ہوگی اور اجازت حاصل کی کہ عمارت میں برقی روشنی اور پنکھوں کی تنصیب کی انہیں اجازت عطا ہو اسکو منظور کیا گیا۔

اسکے بعد ہی نواب دوست محمد خاں صاحب شبیہ مبارک سر محمد یعقوب صاحب مشیر اصلاحات نے گھڑیال پریم جی لال جی صاحب نے کمان، ویکاجی ہوٹل نے وہ سٹ جو سرکار کے لئے استعمال ہوا تھا۔ اکبر علیخاں صاحب نے ڈنر سٹ. راجہ مبک راج نے کٹلری، ولی داد خاں صاحب جمعدار نے قالین پیش کیا۔ سید محمد عسکری جعفری صاحب نے انڈور گیمس کا سٹ۔ راجہ گرو داس صاحب نے نقرئی فریم برائے آٹو گراف ریڈیو سٹ راجہ دھرم کرن بہادر نے پیش کیا۔ سرکار نے یہ یاد فرمایا کہ سال گذشتہ بھی کلب میں چائے نوش فرمائی گئی تھی۔ لیکن آج نمایش کلب کی تعمیر کا حکم مقدر تھا۔ سرکار کا ارشاد ہوا کہ اس عمارت کی تکمیل ایک سال میں نواب زین یار جنگ بہادر کرا دینگے تاکہ یکم ذی الحجہ کو سال آئندہ اسکا نمائش کے ساتھ بہ نفس نفیس افتتاح فرمائیں۔

بہ دوران چائے نوشی میر اکبر علی خاں صاحب کی دختر کو بہ کمال الطاف چائے کی پیالی عطا کرنیکا حکم ہوا عبدالروف صاحب دوم تعلقدار نے "مسلمانوں کا تیری سلطنت سے ہے نشان باقی" کا قطعہ دعائیہ پیش کیا ارشاد ہوا کہ اسکو فریم کروا کر نمایش کلب میں لگوا دیا جائے اور یہ اجازت بھی مرحمت ہوئی کہ وہ خود اسکو فریم کروا دیں۔

خواجہ حمید احمد صاحب نے رہبر نمائش کی ایک جلد پیش کی اور نیز معین الدین صاحب کو لاس نے نمایش بلیٹن بھی ملاحظہ میں پیش کیا۔

صدر نمائش اور ارکان مجلس عاملہ و مجلس مشاورت، و اعیان کمیٹی نواب دوست محمد خاں صاحب نائب صدر و نواب سید محمد عسکری صاحب جعفری معتمد کلب و اراکین کلب نے نذر گذارنے کی عزت حاصل کی اور معتمد کلب کی درخواست پر (Autograph) بھی سرفراز ہوا۔

اس طرح تقریباً دو گھنٹے تک تفصیلی معائنہ کے بعد سواری شاہانہ مراجعت فرما ہوئی اور کارکنان نمائش کو نہال کر گئی۔

یکشنبہ ۱۴ ذی الحجہ صبح میں اطلاع ملی کہ سواری شاہانہ دوبارہ نمائش گاہ میں رونق افروز ہو رہی ہے اور آرٹ گیالری کا معائنہ فرمایا جائے گا معلوم ہوا کہ نواب مہدی نواز جنگ بہادر نے بحیثیت صدر ذیلی آرٹ کمیٹی نواب کاظم یار جنگ بہادر کے ہاں عریضہ گذرانا تھا کہ جہاں صناعان دکن نہال و شادمان ہوئے کہ سرکار نے

ان کا کام ملاحظہ فرمایا وہاں نقاشان دکن کے دل سرد ہوچکے ہیں - یہ عریضہ بہ ملاحظہ خسروی پیش کر دیا گیا اور اس پر الطاف شاہانہ مبذول ہوئے اس طرح اس دفعہ کی نمائش کو یہ اعزاز حاصل رہا کہ دو مرتبہ سواری شاہانہ کے نزول اجلال سے سرفرازی ہوئی - صبح جس وقت یہ اطلاع ملی صناعان کا سامان اسٹال اسٹال میں باندھا جا رہا تھا اور برخاست ہو رہا تھا - چنانچہ جب پانچ بجے سواری شاہانہ کی سیٹیاں گونجنے لگیں تو تمام اسٹال خالی ہوچکے تھے ایک دن کے اندر اندر ایک عجیب منظر سامنے تھا۔

سری چترو درس کے بیانڈ نے سلامی دی۔ سواری شاہانہ کے رونق افروز ہوتے ہی ارکان شعبہ فنون لطیفہ وصدر و معتمد نمائش نے آداب بجا لانیکی عزت حاصل کی۔ تصاویر کا ملاحظہ شروع فرمایا گیا۔ دکن کے مشہور مصور عبدالقیوم کی تاریخی تصاویر - جہانگیر و پدماوتی چاند بی بی اور محاصرہ احمدنگر شبیہ نورجہاں پر توقف فرمایا گیا۔

نواب مہدی نواز جنگ بہادر نے واقعات تاریخی کی صراحت کی۔ مجید اللہ صاحب نائب کوتوال کی کھینچی ہوئی ایک لڑکی کی تصویر پر بھی توقف فرمایا گیا - ہندوستانی مصورین کی تصاویر کا بھی معائنہ فرمایا گیا۔ اسکے بعد اجازت بخشی کہ چائے پیش ہو۔

بہ دوران چائے نوشی نواب مہدی نواز جنگ بہادر نے عرض کی کہ اکثر اسکولوں کی لڑکیوں اور لڑکوں نے یہ تصاویر اتاری ہیں جس پر اظہار مسرت فرمایا گیا نطق شاہانہ اسکے بعد یورپ میں آرٹ کی ترقی کے متعلق اظہار واقعات فرماتے ہوئے اس طرف بھی متوجہ ہوا کہ اہل یورپ نے فن دایہ گیری میں بھی ید طولیٰ حاصل کیا ہے اور اسے بھی ایک فن کر دیا ہے۔

سرکار نے پھر یہ امر بیان کیا کہ مہاراجہ ٹیگور کے والد اور انکے دادا نے ایک نادر روزگار ذخیرہ تصاویر اپنے محل واقع کلکتہ میں جمع کیا ہے۔

اسکے بعد نذور پیش ہوئیں اور مراجعت شاہانہ عمل میں آئی۔

شرف الدین بی اے (عثمانیہ)
اعزازی معتمد مجلس نمائش معاشی کمیٹی

حیدرآباد دکن

مجلۂ طیلسانیین کے مقاصد و قواعد

(۱) "مجلۂ طیلسانیین" انجمن طیلسانیین عثمانیہ حیدرآباد دکن کا ترجمان ہے۔

(۲) اغراضِ انجمن کے لحاظ سے مجلہ میں مضامین مقالے اور نظمیں شایع ہونگی۔

(الف) جامعۂ عثمانیہ کے منظورہ مابعد طیلسان مقالے شایع کئے جائینگے۔

(ب) اردو مطبوعات پر تنقید و تبصرہ کیا جائیگا۔

(ج) انجمن طیلسانیین عثمانیہ اور اسکے ملحقہ اداروں کی سرگرمیوں اور کاروبار کی تفصیلات کی اشاعت عمل میں آئیگی۔

(د) علمی اور ہمہ جہتی ترقی کے معلومات اطلاعات شایع کی جائینگی۔

(ھ) سیاسی اختلافات و … مذہبی … مضامین وغیرہ کسی صورت میں شائع نہ کئے جائینگے۔

(۳) حسبِ ضرورت مجلہ کے مختلف حصے خاص خاص علوم و فنون سے مختص ہونگے۔ فی الوقت مجلہ کے دو حصے ہونگے ایک عام دوسرا …

(۴) مجلہ … جنوری، اپریل، جولائی، اکتوبر میں شایع ہوگا۔

(۵) مجلہ کے ہر حصہ کی ضخامت کم از کم … صفحات ہوگی۔

(۶) مضمون یا مقالہ نگار کو ان کے مضمون یا مقالہ کے ۲۵ نسخے بلا قیمت ارسال ہونگے۔ اگر ۲۵ نسخوں سے زاید نسخے درکار ہوں تو کاغذ کی قیمت قبل از قبل ادا کرنے پر انتظام عمل میں لایا جائیگا۔

(۷) اگر مضمون یا مقالہ نگار پہلے سے مجلہ کے خریدار نہ ہوں تو مجلہ کا وہ شمارہ جسمیں مضمون شایع ہو بلا قیمت ارسال کیا جائیگا۔

(۸) سال بھر میں کسی صاحب کے دو مضمون یا مقالے شایع ہونے کی صورت میں سال مابعد کے لئے اگر قواعد انجمن طیلسانیین عثمانیہ مانع نہ ہوں تو مجلہ بلا قیمت جاری کیا جائیگا۔

(۹) اگر کوئی مضمون یا مقالہ یا نظم قابلِ اشاعت قرار نہ پائے تو اسکو واپس کردیا جائیگا۔

(۱۰) اگر کسی مضمون یا مقالہ کیلئے مجلہ اپنے خرچ سے تصاویر کے بلاکس تیار کرے تو ان کو مناسب قیمت پر جسکا تصفیہ مہتمم مجلہ کریگا فروخت کیا جا سکیگا۔

(۱۱) اگر مجلہ کا کوئی شمارہ اشاعت کے مقررہ مہینہ میں وصول نہ ہو تو اسکی اطلاع مہتمم کو دوسرے مہینہ میں کردینی …

برائے تبصرہ و تبادلہ

انجمن طیلسانین عثمانیہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی ترجمان

مجلۂ طیلسانین

جلد ششم سنہ ۱۳۵۱ف مطابق سنہ ۱۹۴۲ء شمارہ سوم و چہارم

مجلس ادارت

فہرست

صفحہ

اداریہ

عرض حال

چھے سال کی مدّت ہوئی کہ "مجلّہ طیلسانین" کی اشاعت کا آغاز ہوا۔ بہمن ۱۳۴۶ف میں مجلّہ کا پہلا شمارہ شائع ہوا تو اسکے اداریہ میں مجلّہ کے اغراض و مقاصد حسب ذیل بیان کئے گئے :۔

۱۔ یہ مجلّہ طیلسانین عثمانیہ کا ترجمان ہے۔

۲۔ اس مجلّہ میں طیلسانین عثمانیہ کے حالات اور خیالات پیش کئے جائینگے۔

۳۔ ان مقالوں کو بالاقساط شائع کیا جائیگا جو ام اے اور ام یس سی وغیرہ کے امتحانوں کے لئے جامعۂ عثمانیہ کے طیلسانین نے قلم بند کئے۔

۴۔ اُردو مطبوعات پر تنقید و تبصرہ کیا جائیگا۔

اپنے ان مقاصد کی تکمیل میں مجلّہ نے اپنی عمر کی چھے منزلیں طے کرلی ہیں، ہر چند اس عرصہ میں انجمن طیلسانین عثمانیہ کی سرگرمیاں برابر جاری ہیں، اور اسکے بعض ملحقہ اداروں نے کام کرنے اور آگے بڑھنے کا کامیاب مظاہرہ کیا، لیکن مجلّہ کو ہر منزل پر گوناگوں دقّتوں اور مشکلات کا سامنا ہوا۔ یہ نہیں کہ ان مشکلات کو دُور کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ لیکن چونکہ ناکامی ہی کامیابی کا پیش خیمہ ہوتی ہے اسلئے مجلّہ کی ترقی کیلئے پھر ایک اور کوشش کی جاتی ہے۔ خدا کرے کہ یہ کوشش سازگار ثابت ہو۔

یہ امر برمحل نظر آتا ہے کہ مجلّہ کے مطمح نظر کے متعلق کچھ وضاحت کی جائے، اس وضاحت سے قبل نامناسب نہیں اگر پلٹ کر پاؤ صدی پہلے کے حیدرآباد پر نظر ڈالی جائے۔

۳۸ سال قبل حیدرآباد میں ایک انجمن "انجمن معارف" کے نام سے قائم تھی۔ اسکے سرپرست مشہور محب وطن اور خادم قوم ملا عبدالقیوم مرحوم تھے، اسکے ترجمان کی حیثیت سے ۱۳۱۶ف میں صحیفہ ماہواری کا بہ ادارت مولانا محمد اکبر علی صاحب آغاز ہوا۔ اسکے خیر مقدمی مقالہ میں مولانا محمد مرتضیٰ مرحوم نے لکھا تھا کہ :۔

"اے حیدرآباد! تجھ میں اور فرنگستانی نامور شہروں میں کیا فرق ہے؟ جیسے ان کی فضا میں بسنے والے آدمی ہیں

تیری فضا میں بھی بسنے والے آدمی ہیں دنیا تو وہی جو ان کے ہیں ہم بھی رکھتے ہیں وہی تمدنی ضرورتیں جو ان کو درپیش ہیں ہم کو بھی ہیں فرق ہے تو یہی کہ ان شہروں کے بسنے والے اپنے کاموں کا مقصد اپنے وطن کی عزت سمجھتے ہیں اور ہم محض اپنی ذاتی خواہشوں میں سرگرداں ان کے بسنے والے اپنے ملک کی خوبیوں کی شہرت پھیلاتے ہیں اور ہم صرف اپنی خوبیوں کے اظہار میں مستغرق ان کے بسنے والے اپنے وطن کی قدرتی خوبیوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور ہم ان سے بے خبر ان کے بسنے والے اپنی ضرورت پر اپنے طرز تمدن اور معاشرت کی بنیاد رکھتے ہیں اور ہم اندھی تقلید کے جال میں پھنسے ہوئے ان کے بسنے والے اپنی تاریخ کو حرز جان بنائے رکھتے ہیں اور ہم اس سے محض نا آشنا ان کے بسنے والے اپنی مادری زبان کے لئے جان لڑائے دیتے ہیں اور ہم الٹے اسکو ذبح کر دینے میں دریغ نہیں کرتے مختصر یہ کہ جو کچھ وہ لیتے ہیں ہم اس سے غافل ہیں اور جس چیز سے وہ کبھی غافل نہیں ہوتے"

عام طور سے ملک و اہل ملک کے بارے میں آج سے (۲۱) برس پہلے جب کہ صحیفہ ماہانہ نے صحیفہ روزانہ کی شکل اختیار کی یہ تصویر کھینچی گئی تھی کہ :—

"ہماری علمی زندگی کا عام طور سے کوئی پتا ملتا ہی نہیں معاشرت اور تمدن کی جیسی کچھ ابتر اور روبہ تنزل حالت ہے وہ ابنائے وطن سے چھپی ہوئی نہیں ہے لٹریچر کے لحاظ سے یہ امید ابھی پوری نہیں ہوئی کہ حیدرآباد دکن بلحاظ شاہی زبان کا دار السلطنت ہونے کے بہمہ وجوہ مستند بن جائے مشرقی علوم کی اشاعت کی کچھ بھی کوشش نہیں ہو رہی ہے بلکہ یہ چمن اور سوکھتے ہی چلے جا رہے ہیں اگر کسی پہلو میں کوئی ترقی بھی ہوئی ہے تو وہ اسقدر آہستگی کے ساتھ کہ اس سے اس خوفناک رفتار تنزل کا کسی طرح مقابلہ نہیں ہو سکتا جو بد قسمتی سے جاری ہے تمدن کی کونسی شاخ ایسی ہے جس سے ہم اپنے دل کو تسلی دے سکیں اور یہ کہیں کہ ہاں حیدرآباد اس میں ترقی کر رہا ہے علمی حلقے جن کی تازگی پر ملک کی تازگی منحصر ہے اس طرح سنسان ہیں جس طرح پہلے تھے بلکہ اور زیادہ کوئی دماغ دکھائی نہیں دیتا جو فیضان مغرب سے منور ہونے کے بعد ملک کی اس بے حس و حرکت علمی حالت میں ذری سی بھی جنبش دلانے کی کوشش کرتا ہوا پایا جائے جو چند دردمند دل حسن اتفاق سے پیدا ہو گئے ہیں ان کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ نئی نسل ان کو مدد دینے کے لئے تیار نہیں ہو رہی ہے تو ان کی دردمندی اور بڑھ جاتی ہے"

ایسے رہبران طریقت کا جلوہ نظر نہیں آتا جو ابنائے ملک کے صدیوں کے محکم عیوب کو دور کریں اور ان کو زمانہ کی رفتار سے آگاہ کریں، قحط الرجال کا خوفناک اثر ہم یہاں علیٰ حالہ جاری ہے۔ جس طبقہ سے کوئی نامور فرد اٹھ جاتا ہے تو اس کا جانشین نہیں ملتا، اور نہ اسکی کوشش ہو رہی ہے نئی نسل کو کوئی نمونہ بنکر دکھانے والا نظر نہیں آتا کہ پرانی فطرت اور قدیم خصائص اور نئی ضرورتوں کو کسی عمدہ سانچہ میں ڈھال کر ہماری معاشرت و تمدن کی بنیاد قائم کر سکے۔ مالی حالت اس سے بھی بد تر ہے۔ سرمایۂ ملک دن بدن گھٹتا چلا جا رہا ہے، ذرائع کسب دولت جو باعث رفاہ قوم و ملک ہوں، مشترکہ سرمایہ سے کام لینا، ملک کے پیداوار وصنائع کو ترقی دینی ان سب باتوں سے ہم اسی طرح کورے ہیں جیسے پہلے تھے غرض کہ تعلیم کی قوت جو تمدن کی تمام شاخوں کو زندہ کرنے والی اکسیر ہے ویسی ہی پژمردہ ہے جیسے پہلے تھی بلکہ اور زیادہ"۔

اس ۳۰ اور ۳۱ سال کی طویل مدت میں دنیا کے طول وعرض میں بیسیوں انقلابات ہو گئے اور ترقی کی دوڑ میں قومیں اور ممالک کہاں سے کہاں پہنچ گئے، شکر ہے کہ حیدرآباد بھی اعلیحضرت جلالت الملک نواب میر عثمان علیخاں بہادر مدظلہ العالی کے عہد آفرین دور میں بیدار ہو رہا ہے، اور چاہتا ہے کہ عظمت و شرف کے وہ منازل طے کرے جنکو دنیا کی زندہ قومیں اپنا حق سمجھتی ہیں۔ اعلیحضرت خسرو حیدرآباد و برار کی نگاہ دقیقہ رس نے جان لیا کہ ملک میں جب تک اپنی جامعہ قائم نہ ہو ترقی اور سربلندی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جامعہ عثمانیہ کا قیام سینکڑوں آرزوں اور تمناؤں کے ساتھ عمل میں آیا۔

ایک حیدرآبادی جامعہ سے جو تمنائیں ہو سکتی ہیں ان کو بھی مولوی محمد مرتضیٰ مرحوم سے[1] ہی سننا چاہیئے۔

"اے حیدرآباد! جامعہ تیرے بسنے والوں کو خواب غفلت سے جگائیگی اور بتائیگی کہ ان کے کیا فرائض ہیں، اور اگر وہ اپنی زندگی چاہتے ہیں تو ان کو کیا کرنا ضرور ہے۔ تیری سنگستانی زمین

---

[1]۔ ہر چند مرحوم نے ان امیدوں کو انجمن معارف کے ترجمان سے وابستہ کیا تھا لیکن ایسی بڑی امیدیں کوئی جامعہ ہی پوری کر سکتی ہے، مرحوم کے الفاظ میں تھوڑا سا تصرف کر لیا گیا ہے۔

کیسے کیسے انمول جواہر ہیں اور تیری صاف فضا میں کیسے کیسے نایاب پھول کھلتے ہیں، جامعہ انہیں
انمول جواہر کا ہار اور نایاب پھولوں کا گلدستہ بنانے والی ہوگی، انہی پھولوں کی مہک تیرے بسنے والوں کے
مردہ دلوں میں تازگی کی وہ روح پھونک دیگی جو فرنگستانی شہروں میں پائی جاتی ہے۔ تیرے علمی
حلقوں میں جو سنسان پڑے ہوئے ہیں وہ ایک ہلچل مچادیگی، وہ تیری خوبیوں کو عام شہرت دیگی۔
تیرے بے شمار قدرتی وسائل سے جو اس وقت تک معطل پڑے ہوئے ہیں فائدہ اٹھانے کے ذرائع
بتائیگی، تیری معاشرت کے لئے جو اس وقت تزلزل اور ضغطہ کی حالت میں ہے صاف اور سیدھا
راستہ بتائیگی، جامعہ بتائیگی کہ اندھی تقلید کی بجائے کن اصولوں پر معاشرت کی بنا ڈالی جائے۔ وہ
تیری تاریخ کو جو تاریکی میں پڑی ہوئی ہے اور جس سے تیری خوش آیند زندگی وابستہ ہے روشنی میں لائیگی۔
تیری زبان کو صاف کرکے اس درجہ پر پہنچا دیگی جس سے آئندہ تو ہی اُردو زبان کے لئے ٹکسال
بن جائے اس طرح سے وہ تیرے باشندوں کو ایک زندہ طاقت بنا دیگی"

جامعۂ عثمانیہ سے یہ اُمیدیں کس حد تک پوری ہوئیں، اس کا جواب تو خیر آیندہ کسی مورخ کا قلم ہی دے سکیگا لیکن اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ آج حیدرآباد نے جو اُمید بخش کروٹ لی ہے وہ جامعۂ عثمانیہ کی ہی مسیحائی کی مرہون منت ہے زندہ باد شاہ عثمان! پائندہ باد جامعہ عثمانیہ!!

لیکن یہ چند نوجوان جنکو جامعہ نے پیدا کیا ہے دراصل پانی کے ان چند قطروں کے مماثل ہیں جو اس آگ کو بجھا نہیں سکتے جو ورد مند دلوں کے دل جگر کے سوز سے پیدا ہوکر زندگی کا لازمہ بن جاتی ہے ایسی حالت میں گو خوشی کا موقع تو ضرور ہے لیکن دم لینے کا کوئی موقع نہیں ہے۔

جامعۂ عثمانیہ کی برادری کے جو فرائض ہیں ان کی اہمیت سے انکار کس طرح ہوسکتا ہے، جامعہ کی چار دیواری سے باہر آجانے کے بعد عثمانیین کا کام صرف یہی نہیں ہے کہ فکر معاش کی پریشانیوں میں مبتلا ہوکر دنیا و ما فیہا سے بے خبر ہو جائیں، زندگی کی صعوبت اور مشقت ہر زمانہ میں قوموں اور ملکوں کا امتحان لیتی رہی ہے اور آخر کار اس امتحان میں وہی قومیں کامیاب ہوئیں جن کا عزم راسخ جن کا ارادہ مضبوط اور جن کا عمل خالص ہوتا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کی برکتوں سے فیض یاب ہونے کے باعث جامعۂ عثمانیہ کی برادری کا یہ فرض ہے کہ وہ عزم راسخ کیسا تھ

اس بات پر کمر باندھ لے کہ اپنے عزیز ملک کو عزّت اور مرتبت کے بلند ترین کنگرہ پر پہنچا دے۔ ملک میں ترقی کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے اور اسکے باشندے صحیح رہبری اور رہنمائی کے منتظر ہیں، وہ اسباب موجود اور مہیا ہیں جو ترقی کے کاروان کو ایک منزل کے بعد دوسری منزل پر پہنچاتے ہیں، ضرورت صرف جوش اور سرگرمی کی ہے اور صحیح قیادت کی۔

انجمن طیلسانین عثمانیہ کا یہ ایقان ہے کہ ملک کا مستقبل تعلیم یافتہ نوجوانوں کے ہاتھ میں ہی ہے اور ان کی صحیح رہبری میں ہی ملک کی نجات مضمر ہے۔ انجمن کی ساری کوششوں کا مآل محض "خدمت ملک و مالک" ہے۔ انجمن کوشش و سعی کا جو حق ادا کرنا چاہتی ہے اس کا ایک ذریعہ یہ مجلّہ بھی ہے۔ مجلّہ کی ہمیشہ یہ کوشش رہیگی کہ وہ اپنے فرض کو انجام دینے میں انجمن کے لئے نیک نامی کا ذریعہ ثابت ہو۔

مجلّہ طیلسانین کا کام محض یہ نہیں ہے کہ اپنے ناظرین کیلئے بہ اوقات مقررہ تفریح طبع کا سامان فراہم کرے افسانوں اور نام نہاد ادب لطیف کی بھول بھلیاں میں سرگرداں رہنے اور تنقید و تبصرہ کی وہ روش اختیار کرے جس سے صرف باہمی رقابت اور آویزش کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اسکے صفحات پر کوئی چیز ایسی نہ آنی چاہیئے جو ملعی ذہنی تعیش کی مظہر ہو۔ مجلّہ طیلسانین کو حقیقی علم اور صحیح تاریخ کی اشاعت کا علم بردار ہونا چاہیئے، اسکو ادب آموز بھی ہونا چاہیئے اور اخلاق ساز بھی، اس کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ بلاخوف اعدے معاشرت کی ان خرابیوں کو بتائے جو نہ صرف مردگی اور پستی کی علامتیں ہیں بلکہ جو گھن کی طرح قوم کی اصلی قوت کو اندر ہی اندر کھائے جا رہی ہیں، مشاہیر ملک کی زندگی کے حالات کو روشنی میں لانا، ان کی کامیابی اور ناکامی کا پتہ چلانا، ان کے کام کو صحیح تنقید کے معیار پر جانچنا، معاشی برتری کے وسایل کی تلاش و تحقیق، غرض ملک کی ہر جہتی صلاح و فلاح کے لئے غور کردہ خیالات کو خالص علمی نقطۂ نظر سے پیش کرنا مجلّہ کا مسلک ہونا چاہئیے، ہر حالت میں راست گفتاری اس کا شعار اور دیانت اس کا وتیرہ ہونا چاہیئے۔

اس آرزو اور اس نیت سے مجلّہ اپنا راستہ چلنا چاہتا ہے۔ کوشش و سعی کے اس ارادہ میں خلوص عطا ہونا اور بالآخر کامیابی بخشنا، بخشندۂ ازلی کے ہاتھ میں ہے۔

مجلّہ کی ترتیب

مجلّہ کی اس اشاعت سے "معاشیات" کا حصہ اور بعض دوسرے ابواب مستقل طور سے شروع کئے جارہے ہیں
اس سلسلہ میں بعض امور کے متعلق ضروری صراحت مناسب معلوم ہوتی ہے۔

۱۔ مجلّہ کا ہر ناظر اس بات سے واقف ہے کہ اردو رسایل اور مجلّات میں ایک ہی علم یا فن کے متعلق اختصاصی مجلّے یا رسالے زیادہ تر حیدرآباد سے ہی شاذ و نادر شائع ہوتے ہیں کچھ عرصہ قبل حیدرآباد سے "تاریخ" کے نام سے ایک مجلّہ فن تاریخ کے موضوع پر تحقیقی مقالات جمع کرنے کیلئے شائع ہونا شروع ہوا تھا اور گو وہ اب بھی شائع ہوتا ہے لیکن [illegible] یہ بات ظاہر ہے کہ وہ اپنے مالیہ سے تب تک نہیں ہو سکتا ہے۔ اسی طرح قانون کے موضوع پر معیاری مقالات شائع کرنے کے لئے [illegible] سے حیدرآباد میں "مقنن" وجود میں آیا تھا لیکن جاری نہ رہ سکا۔ گو قانون کے موضوع پر حیدرآباد سے اب بھی بعض مجلّے شائع ہو رہے ہیں لیکن وہ زیادہ تر سرکاری احکام اور قانونی نظائر کے [illegible] ہیں۔ اکونٹنگ کے موضوع پر ایک اچھا رسالہ حیدرآباد سے ہی نکلتا تھا لیکن باقی نہ رہ سکا۔ "المعلم" [illegible] حیدرآباد [illegible] جو حیدرآباد میں طبع او شائع ہوتے ہیں مسائل تعلیمی کے اختصاصی رسایل ہیں اور کافی عرصہ سے جاری ہیں۔ ابھی حال میں انجمن ترقی اردو نے "سائنس" کے نام سے ایک ماہواری مجلّہ کامیابی کیساتھ حیدرآباد سے شایع کرنا شروع کیا ہے۔ سیاسیات کے موضوع پر "سیاسیات" کے نام سے ایک معیاری مجلّہ بھی حیدرآباد سے ہی پابندی کے ساتھ طبع ہو رہا ہے۔ طب اور طبابت کے متعلق دو ایک خاص رسایل ہندوستان اور حیدرآباد سے شائع ہو جاتے ہیں۔ باقی دوسرے بیسیوں اردو مجلّے بلا کسی اختصاص کے ہر موضوع پر مقالے اور مضامین چھاپ دیا کرتے ہیں۔

معاشیات کے سیر حاصل اور خاص اہمیت کے موضوع پر اکثر اردو رسائل میں کافی معیاری مضامین طبع ہو جاتے ہیں لیکن اس موضوع کی اہمیت اس بات کی متقاضی ہے کہ اس پر ایک خاص مجلّہ شائع ہوا کرے چنانچہ مجلّہ طیلسانیین کی اس اشاعت کے ساتھ اسکے حصہ معاشیات کا آغاز کردیا گیا ہے۔ اُمید کہ مجلّہ کی یہ کوشش پوری طرح کامیاب ہوگی اور ملک میں خوشحالی اور فارغ البالی پیدا کرنے کے لئے اسکے مضامین ہر طرح ممد و معاون ثابت ہونگے۔

۲- سب اصحاب علم پر یہ بات واضح ہے کہ مشرق کے علوم و فنون کے سب کار اب بھی صرف مخطوطات کی شکل میں ہی محفوظ ہیں۔ مخطوطات کے مالکوں اور محافظوں کی جہالت یا غفلت سے سینکڑوں قیمتی کتابیں یا تو کیڑوں اور دیمک کی غذا ہوگئیں یا غیر ملکوں کے قدردانوں کے ہاتھوں میں پہنچ گئیں لیکن اسکے باوجود اس وقت بھی ہندوستان کے طول و عرض اور خود مملکت آصفیہ کے گوشہ گوشہ میں سینکڑوں مخطوطات شائقین اور اصحاب ذوق کی خبر گیری اور استفادہ کی منتظر صندوقوں اور الماریوں میں بند ہیں۔ مشرقی علوم و فنون اور مشرقی تمدن و ثقافت کے طلبہ کسی تحقیق و تلاش کا پورا حق اس وقت تک ادا نہیں کر سکتے جب تک کہ وہ مخطوطات سے استفادہ نہ کریں۔

اس سلسلہ میں بڑی مشکل یہ ہے کہ مملکت آصفیہ کے ذخائر کی تفصیلی فہرستیں تا حال مرتب نہیں ہوئی ہیں' یا اگر مرتب ہوئی بھی ہیں تو ان سے عام استفادہ نہیں ہوسکتا' دو ایک کتب خانوں نے اپنے ذخائر کے کسی خاص حصہ کی تفصیلی فہرست شائع کی ہے جیسے کہ جامعہ عثمانیہ کے کتب خانے اُردو مخطوطات کی فہرست یا کتب خانۂ آصفیہ کے بعض مخطوطات کی کیفیت۔ البتہ ہندوستان کے بعض کتب خانوں نے اپنی تفصیلی فہرستیں یا تو شائع کر دی ہیں یا ان کا سلسلہ جاری ہے۔ بہر حال مخطوطات کے متعلق مضامین کا ایک خاص سلسلہ ایک بڑی مدت کیلئے مستقل طور سے جاری رہ سکتا ہے۔

مجلّہ کی حالیہ اشاعت سے اُس میں ایک باب کا مستقل اضافہ کیا گیا ہے تاکہ مخطوطات کے جو خزانے مملکت آصفیہ میں یا اسکے باہر موجود ہیں ان سے عام آگاہی کا سامان ہو۔ اُمید ہے کہ اسطرح مختلف علوم و فنون کے شائقین کو قیمتی مخطوطات سے وقت بوقت آگاہ ہونے کا موقع حاصل ہوگا یا دوسری ضروری معلومات فراہم ہونگی۔

۳- ہندوستان کی تاریخ لکھنے میں تا حال کاغذات سے بہت کم استفادہ کیا گیا ہے۔ اس بارے میں اس وقت تک جو توجہ کی گئی ہے وہ گویا نہ ہونے کے برابر ہے' حالانکہ اسکی ضرورت اور اہمیت مسلّم ہے۔
ہندوستان کے ہر گوشہ میں ایسے کاغذات جو تاریخ کا ماخذ بن سکیں بہ تعداد کثیر حاصل ہو سکتے ہیں' حیدرآباد بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے' یہاں کے بیسیوں قدیم خاندانوں میں ایسے سینکڑوں کاغذات موجود ہیں کہ انکی اشاعت عمل میں آئے تو بے شمار تاریخی امور پر روشنی پڑیگی' اور کئی مختلف فیہ مسائل حل ہو جائینگے۔

اسی نقطۂ نظر سے مجلّہ کے اس شمارے سے ایک باب مستقل طور سے قایم کیا گیا ہے تاکہ اہم اور دلچسپ تاریخی کاغذات کی اشاعت عمل میں لائی جائے اور بشرط امکان ان کے عکس شامل کئے جائیں اس شمارے میں تبرکاً دو ایسے عکس شامل کئے گئے ہیں جن میں سے ایک پر حضرت آصفجاہ اوّل کی مہر اور بیض ثبت ہے دوسرے عکس میں حضرت ناصر جنگ شہید کی مہر اور بیض کے علاوہ حضرت موصوف کی خود نوشتہ تحریر بھی موجود ہے ان کے متعلق تفصیلی کیفیت اپنے مقام پر ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہے ۔

توقع ہے کہ یہ سلسلہ ایک مدّت دراز تک جاری رہ سکیگا اور بے شمار ضروری اور اہم کاغذات تاریخی کے عکس اصحاب تاریخ کے فائدے کے لئے مہیا ہو جائینگے ۔

۴ - ہندوستان کی جامعات میں وقتاً فوقتاً ترقی اور اصلاح کے جو مراتب عمل میں آتے رہتے ہیں ان سے عام آگاہی کا کوئی ذریعہ مہیا نہیں ہے کوئی ایسا رسالہ یا اخبار نظر سے نہیں گزرا جس میں سب جامعات کی کیفیتیں فراہم کی جاتی ہوں حالانکہ اس علم کیلئے یہ امر بہت ضروری ہے کہ وہ دوسری جامعات یا اعلی علمی اداروں کے حالات سے واقف رہیں اسکے مدنظر مجلّہ کے اس شمارے سے ایک باب جامعاتی معلومات کیلئے مختص کر دیا گیا ہے اس باب میں بالعموم ہندوستانی جامعات یا مماثل اداروں کے ضروری حالات فراہم کئے جائینگے اور حالات اجازت دیں تو دُنیا کی بڑی بڑی جامعات کے متعلق بھی معلومات فراہم کی جائینگی ۔

خوش قسمتی سے ہندوستان کے انٹر یونیورسٹیز بورڈ کا مستقر الہ آباد کی بجائے اب حیدرآباد قرار پایا ہے اور اسکی معتمدی پر جناب پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی صدر شعبۂ تاریخ و سیاسیات جامعہ عثمانیہ کا انتخاب عمل میں آیا ہے ۔ جناب موصوف نے اپنی مہربانی سے اس بات کا یقین دلایا ہے کہ وہ بورڈ کی جانب سے ہر قسم کی سہولت مہیا فرمائینگے ۔ اس باہمی تعاون سے توقع ہے کہ بہت کچھ علمی اور عملی فواید حاصل ہونگے ۔

فکر و نظر

۱۳۴۲ف میں کانفرنس طیلسانیین عثمانیہ نے یہ تحریک منظور کی تھی کہ جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ قانون میں ال ال بی کے مافوق قانونی تعلیم کا انتظام عمل میں لایا جانا مناسب ہوگا ۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ ال ال بی کا امتحان

کامیاب ہونے کے بعد طلبہ فکر معاش کی پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتے تھے، وکالت یا ملازمت کے حلقہ میں گھر جانے کے بعد قانون کا مطالعہ بھی محدود ہو کر رہ جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گو مملکت آصفیہ میں نصف صدی کے زیادہ عرصہ سے مجلس عالیہ عدالت قائم ہے اور اس سے مافوق ایک اور اعلیٰ عدالت جوڈیشل کمیٹی کے نام سے موجود ہے لیکن اعلیٰ قانونی ادب وجود میں نہ آسکا۔ قانون پر علمی نقطۂ نظر سے بہت ہی کم کتابیں لکھی گئیں جو قانونی ادب موجودہ بھی ہے وہ محض عدالت کے فیصلوں پر مشتمل ہے۔ کتابیں لکھی بھی گئیں تو بالعموم نظائر، شرح اور خلاصہ کے طور پر۔ ملک میں اب جو قانون رائج ہے اور پہلے جو قانون رائج تھا اسکے تقابل اور تنقید اور نتائج کو جانچنے کی گویا کوئی نوبت ہی نہیں آئی، عدالتوں سے جو فیصلے صادر ہوتے ہیں ان کی بھی خالص قانونی اور علمی نقطۂ نظر سے کبھی جانچ پڑتال نہیں ہوئی۔ غرض ملک میں اعلیٰ قانونی ادب مہیّا کرنے، وکالت اور عدالت کے کاروبار کے معیار کو بلند تر کرنے اور مختلف قوانین کے تقابل اور تنقید کا صحیح ذوق پیدا کرنے کے لئے اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ جامعۂ عثمانیہ میں اعلیٰ قانونی تعلیم کا انتظام عمل میں لایا جائے۔ بہت خوشی کی بات ہے کہ سنہ ۱۳۵۰ف کے تعلیمی سال کے آغاز سے جامعۂ عثمانیہ میں ال ال ایم ابتدائی کی جماعت کھل گئی۔ اس کے قیام کیلئے جو جد و جہد کی گئی اسکی مشکلات کا اندازہ مجلہ کا محرر نہیں کرسکتا بہر حال سعی جو مشکور ہوئی وہ قابل مبارک باد ہے۔ ال ال ایم کے مضامین امتحان اور نصاب میں دوسری جامعات ہند کے مقابل جدّت اور عملیت کو پیش نظر رکھا گیا ہے، نیز خانگی اُمیدواروں کیلئے بھی شرکت امتحان کی صورت پیدا کی گئی ہے۔

یوں انجمن طیلسانیئین عثمانیہ کی تحریک سے اب ام اے کے امتحان کا دروازہ بھی خانگی اُمیدواروں کے لئے کھل گیا ہے

سنہ ۱۳۴۰ف میں کانفرنس طیلسانیئین عثمانیہ نے تحریک کی تھی کہ کتب خانۂ آصفیہ کے اوقات مطالعہ میں وسعت دی جائے، تعطیلات کم کی جائیں، اور فہرستوں کی عصری نقطۂ نظر سے تکمیل کی جائے۔ یہ تحریک بڑی حد تک منظور ہو چکی اور اب ہمیں یہ مسرت حاصل ہے کہ کتب خانۂ آصفیہ اب بلا تعطیل تمام ہفتہ کھلا رہتا ہے، اوقات مطالعہ بلا وقفہ صبح کے آٹھ سے شام کے آٹھ تک مقرر ہیں اور یہ کہ سال بھر میں بجائے ۳۱ یوم کے صرف ۹ یوم تعطیل دیجائیگی، جیسے کہ انجمن کی سالانہ رپورٹ بابتہ سنہ ۱۳۵۰ف میں ظاہر کیا گیا ہے، یہ ثبوت ہے

اس امر کا کہ کسی ادارہ کا انتظام کسی نوجوان عثمانیہ طیلسانی کے سپرد ہونے سے کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں۔
جریدۂ اعلامیہ مورخہ ۲ آبان ۱۳۵۲ف میں مرتبہ دستور العمل کتب خانہ آصفیہ شایع ہوا ہے یہ توقع بے جا نہیں کہ اس جدید دستور العمل کے نفاذ سے دکن کے اس عظیم الشان ادارہ کی خوش نظمی اچھے معیار پر پہنچ جائیگی۔ جدید قواعد میں ایک خوش خبری یہ ہے کہ کتب خانہ آصفیہ کے لئے سرکاری موازنہ میں سالانہ جو رقم کتابوں کی خریدی کیلئے فراہم کی جائیگی وہ عدم خرچ کی صورت میں بحق سرکار بازگشت نہیں ہو جائیگی بلکہ بحق کتب خانہ محفوظ رہیگی۔
جدید قواعد کی رو سے جو مجلس قائم ہوئی ہے اسکو سب سے پہلے اپنی توجہ فہرستوں کی اصلاح اور ترتیب جدید پر مبذول کرنی چاہیئے فہرستوں کی عصری ترتیب کے بغیر اس عظیم الشان علمی ادارہ کی سودمندی مکمل نہیں ہوسکتی اس بارے میں مہتمم صاحب کو علحدہ متوجہ کیا جا چکا ہے۔

سرکاری مشاورتی مجالس کے قیام سے مملکت آصفیہ کے دستور اور نظم و نسق میں ایک جدید باب کا اضافہ ہوا ہے۔ کونسل آف اسٹیٹ، کیبنٹ کونسل مجلس وضع قوانین اور باب حکومت سب اپنی اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک ایک نئے دستوری پہلو کے حامل تھے۔ آٹھ مشاورتی مجالس سے جو مالیات، امور مذہبی، ترقی صنعت، تعلیم، صحت عامہ، زرعی ترقی، اوقاف مسلمین، اور اوقاف ہنود کے متعلق قائم ہوئی ہیں ایک نئی دستوری ترقی کی ابتدا ہوئی ہے۔

اسی سلسلہ میں "آئین موضع پنچایت" عمل نافذ ہوا ہے۔ اس آئین کا منشا یہ ہے کہ ڈھائی ہزار سے پانچ ہزار تک کی آبادی والے مواضع کے لئے بلدیاتی کاروبار انجام دینے کے لئے مجالس قائم کی جائیں اس آئین کی رو سے قرار دیا گیا ہے جہاں کہیں پنچایت قائم ہو اسکے ارکان کی تعداد اس علاقہ کا اول تعلقدار مقرر کریگا، ارکان کی تعداد ۶ سے کم اور ۱۲ سے زیادہ نہ ہوگی، ارکان کے انتخاب کا طریقہ یہ قرار دیا گیا ہے کہ تحصیلدار اس موضع میں جہاں پنچایت قائم کرنا مقصود ہے، موضع کے بالغ مالکان مکان کا ایک کھلا جلسہ منعقد کریگا اور اس جلسہ کے مشورے سے تعلقدار کی مقرر کی ہوئی تعداد سے مضاعف تعداد میں پنچایت کے قابل لوگوں کو نامزد کریگا، اس طرح جو لوگ نامزد ہوئے ہوں ان میں سے تعلقدار اپنی مقرر کردہ تعداد میں پنچ منتخب کریگا۔

اس سرکاری نوشتہ میں "آئین" کا لفظ غالباً پہلی مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ اس وقت تک منشور، قانونچہ، قانون، ضابطہ، دستور العمل اور قواعد کے الفاظ استعمال ہوتے آرہے ہیں، پہلے سے زیر استعمال الفاظ کے ساتھ ایک نیا لفظ سرکاری نوشتوں کی اصطلاحات میں شامل ہوا ہے۔ اسی طرح "پنچایت" بھی اب ایک جدید غرض کیلئے عمل میں آگئی۔

پنچایتوں کے اختیار تمیزی پر جو امور منحصر رکھے گئے ہیں ان میں موضع میں پیدا ہونے والے افراد کی ولادت وموت کا اندراج بھی ہے، ضرورت ہے کہ اس قومی اہمیت کے مسئلہ کے بارے میں ہر پنچایت پوری طرح توجہ کرے ملک کے طول وعرض میں اس نوعیت کے انتظام کی سخت ضرورت ہے۔ دوسرے فوائد سے قطع نظر ملازمت کے نقطۂ نظر سے مختلف نوعیت کے جو صداقت نامے سعی وکوشش سے حاصل کرلئے جاتے ہیں ان کا حقیقی اور قطعی سدباب صرف اسی وقت ہوسکیگا جب کہ کل مملکت آصفیہ میں ولادت اور موت کے رجسٹروں کا تشفی بخش انتظام ہوجائے۔

کانفرنس طیلسانیین عثمانیہ نے سرکاری ملازمت کے سلسلہ میں ۵۵ سالہ عمر کی تکمیل کے بعد مزید توسیع کے خلاف ۱۳۵۳ف سے آواز بلند کی، بعد میں انجمن کی کابینہ اور خود کانفرنس نے توجہ دہانی کا تسلسل قائم رکھا۔ مسرت کا مقام ہے کہ سرکار عالی نے اس مسئلہ کی اہمیت محسوس فرمائی اور اب جو احکام صادر فرمائے ہیں اسکی رو سے جس گزیٹیڈ ملازم کی عمر ۵۵ سال کی ہوچکی ہو وہ ملازمت میں نہیں رکھا جاسکیگا بجز اسکے کہ صرف ناقابلِ تردید وجوہ نظم ونسق کی بناپر ایسی توسیع ناگزیر ہو اور ملازم سرکار کی صحت جسمانی اچھی ہو نیز یہ کہ شرایط مصرحہ کے تحت اگر کوئی توسیع دیجائے تو اسکی مدت وقت واحد میں ایکسال سے زیادہ نہوگی۔ کانفرنس کی تحریکوں کا مفہوم بالکل یہی تھا۔

فصلی سالِ نو کا جشن منانے کی تحریک جناب غلام محمدؐ خاں صاحب ام اے (عثمانیہ) رکن مجلس بلدیہ نے شروع کی تھی، پہلا جشن آج سے چار سال پہلے بڑی دھوم دھام سے منایا گیا بعد میں بھی اس کا سلسلہ بیش وکم جاری رہا سالِ حال بھی اس کا جلسہ اور عشائیہ منعقد ہوا۔ اور بعض گوشوں سے اختلاف کی صدا بلند ہونے کے باوجود دونوں تقریبیں کامیاب ثابت ہوئیں، نہ صرف سالِ نو بلکہ جلالت الملک خسرو دکن وبرار کی سالگرہ اور جشن خودمختاری کو شایانِ شان

طریقہ سے منانے کے لئے مستقل انتظام کی ضرورت ہے۔ اسکے بغیر کوششوں میں تسلسل باقی نہیں رہ سکتا اور بے دلی پیدا ہوجانا لازمی ہے۔

بلدہ فرخندہ بنیاد کی قدیم ترین درس گاہ دارالعلوم کی ۹۰ سالہ سالگرہ اور جشن تاسیس منانا بعض سرگرم اور مخلص فرزندان دارالعلوم کے پیش نظر ہے۔ غالباً اس بات کا کم علم ہوگا کہ ۳۰ برس پہلے اس مدرسہ کی ۶۰ سالہ جوبلی منائی گئی تھی مدارالمہام وقت نواب سالارجنگ بہادر جو بانی مدرسہ کے پوتے ہیں جلسہ کے صدر تھے یہ جلسہ کچھ اس طرح مبارک ثابت ہوا کہ اسکی آواز بازگشت میں حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا آوازہ بلند ہوا۔ اُس جلسہ میں حیدرآباد میں یونیورسٹی کے قیام کیلئے بھی ایک مخلصانہ صدا بلند ہوئی کہ۔

"ہمارے ملک میں دارالعلوم قائم ہے جسکے امتحانات ہمارے ہی ہاتھ میں ہیں ضرورت ہے کہ ان امتحانات کی بنا مستحکم طور سے قائم ہو یا بالفاظ دیگر نظام یونیورسٹی قائم کی جائے مشرقی یونیورسٹی قائم ہونے کے لئے حیدرآباد میں کسی قسم کی کوئی دقت نہیں ہے"

اس صدائے اخلاص کو بہت جلد سمع قبول حاصل ہوا اور آج جامعہ عثمانیہ ملک کے نوجوانوں کی زندگی کا محور بنی ہوئی ہے خدا کرے کہ دارالعلوم کی صبحی مبارک درس گاہ کی ۹۰ سالہ سالگرہ ملک کے لئے نئی برکتوں نئی امیدوں اور نئی سعادتوں کی ایک سرور بخش اور دل نواز صبح ثابت ہو۔

نواب مرزا یار جنگ بہادر جوڈیشل کمیٹی کے صدر وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوگئے۔ نواب صاحب موصوف ۱۳۲۲ ف میں حیدرآباد آئے اور مجلس عالیہ عدالت کی میر مجلسی پر فائز ہوئے۔ کئی سال اس اہم ترین خدمت کے فرائض انجام دینے کے بعد ان کو حضرت بندگانعالی نے صدرالمہام عدالت و امور مذہبی کے عہدہ جلیلہ پر مامور فرمایا پھر جوڈیشل کمیٹی کی صدارت پر فائز ہوئے۔

ہرچند نواب صاحب کو پہلے سے حیدرآباد سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن آنے کے بعد تھوڑے ہی عرصہ میں اپنے مکارم خصائل، اخلاق اور ہمدردی سے ملک کے سب طبقوں میں ہردلعزیزی حاصل کرلی۔ اپنے بڑے عہدوں کے اہم فرائض بخوبی و بخوش اسلوبی انجام دئے سررشتہ عدالت کی اصلاح و ترقی میں کامیابی حاصل کی انتظامی عدالتی و تقنینات کی علیحدگی کے لئے نواب صاحب نے جو کوشش کی اور اپنی کوشش میں جس طرح کامیابی حاصل کی اسکو

مملکت آصفیہ کے نظم و نسق عدالت کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائیگا۔ اسکے علاوہ نواب صاحب نے مملکت کے تعلیمی اور معاشرتی امور میں بھی گرم جوشی سے حصہ لیا۔ انجمن طیلسانیین عثمانیہ سے بھی ابتدا سے ہی ہمدردی برتی اور اسکے کاروبار میں دلچسپی لی بہرحال جو اصحاب باہر سے حیدرآباد میں بڑے عہدوں پر آتے ہیں ان کو نواب مرزا یار جنگ بہادر کی شخصیت اور عملیت اپنے پیش نظر رکھنی چاہیئے۔

سواحل ہندوستان پر مسلمانوں کا توطن

از مولانا محمد مرتضیٰ مرحوم

پیش لفظ

از جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب استاذ قانون جامعۂ عثمانیہ

مولوی مرتضیٰ مرحوم کی مجسمۂ علم وعمل شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ انہیں اپنے علمی مشاغل میں تاریخ تمدن سے بڑی دلچسپی تھی۔ "سواحل ہندوستان پر مسلمانوں کا توطن" نہ معلوم کتنے عرصے سے ان کی توجہ منعطف کئے ہوئے تھا۔ بہر حال جہاں تک مجھے علم ہے اس کی ایک قسط کو انہوں نے ماہنامہ صحیفہ (حیدرآباد دکن) میں جمادی الاول ۱۳۲۵ھ ۱۹۰۷ء میں — یعنی راقم الحروف کی پیدائش سے بھی پہلے — شائع کرایا تھا اور کئی سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ بعد میں ان مضامین کو از سرِ نو مرتب کیا چنانچہ مرحوم کا جو قلمی مسودہ اس وقت میرے سامنے ہے اس کا مطبوعہ مضمون سے مقابلہ کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ مسودہ اصل میں گویا مطبوعہ مقالوں کا دوسرا اڈیشن ہے اور جابجا اس میں اضافے عمل میں لائے گئے ہیں۔

یہ ایک قیمتی دستاویز ہے جسے بعینہ شائع کرنا ہی مناسب خیال کیا گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ گذشتہ پچیس ایک سال میں عرب اور ہند کے تعلقات پر کافی وسیع لٹریچر پیدا ہو گیا ہے۔ خود اردو میں مولانا سید سلیمان ندوی کی تالیفیں ارض القرآن (سنہ ؟)، عرب و ہند کے تعلقات (سنہ ۱۹۳۰ء) اور عربوں کی جہازرانی (سنہ ۱۹۳۵ء) کافی معلومات کی حامل ہیں۔ پانکر کی انگریزی تالیفیں ملیبار کے متعلق کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ ہائڈ کی جرمن تالیف کے فرانسیسی اڈیشن "مشرقی تجارت کی تاریخ" میں جو بھی ہمارے موضوع کے متعلق ہے وہ اپنے مولف کی عظیم اہمیت کے باعث قابل ذکر ہے۔ زین الدین المعبری کی عربی تاریخ ملیبار (تحفۃ المجاہدین) سے مرحوم واقف تھے اور اس کا بھی ذکر کیا ہے کہ اس کا نسخہ ان کی نانی کے بھائی کے ہاں موجود ہے[1] مگر نہ معلوم کیا اتفاقات

---

[1] قاضی عبید اللہ مرحوم کے اس نسخے سے جو بڑا نفیس اور صحیح ہے، حکیم شمس اللہ قادری صاحب نے یہ کتاب ۱۹۳۱ء میں شائع کی لیکن غیر عربی داں پروف بینوں نے اس کی مٹی پلید کر دی ہے۔ اس کا ۱۸۹۸ء میں لزبن میں پرتگالی ترجمے کے ساتھ جو عربی متن چھپا ہے وہ ہمارے پیش نظر ہے۔

پیش آئے کہ اس سے۔ اس مضمون کے چھپنے تک راست استفادہ نہ کیا اور تاریخ فرشتہ پر تکیہ کرلیا جس میں تحفۃ المجاہدین ہی سے ملیبار کے حالات اخذ کئے گئے ہیں۔ تاریخ فرشتہ کے مولف کو عربی زیادہ نہیں آتی تھی چنانچہ زیر ذکر اقتباسات میں کئی جگہ تحفۃ المجاہدین کا ترجمہ اس قدر غلط کیا گیا ہے کہ مطلب اُلٹ گیا ہے۔

چند اور فرانسیسی اور جرمن کتابوں یا مضمونوں کا مجھے علم ہے جن سے اس موقع پر استفادہ ضروری تھا لیکن موجودہ ناتسی ملحمۂ کبریٰ نے فی الحال ان کے منگوانے کے راستے بند کر رکھے ہیں۔ مرحوم نے تمدن عرب مترجمۂ سید علی بلگرامی سے پورا استفادہ کیا ہے لیکن لُبوں کی۔ (جو اُردو میں لی بان بن گیا ہے) ۔ اصلی فرانسیسی تالیف ۱۸۸۴ء میں چھپی تھی۔ میں نے ایک زمانے میں اصل اور ترجمے کا مقابلہ کرنا شروع کیا تھا اور کافی نظرثانی اور تصحیح کی ضرورت محسوس ہوئی تھی البتہ جو دو ایک اقتباس مرحوم نے دیئے ہیں انکی حد تک اب مکرّر اطمینان کرلیا گیا ہے کہ ان میں اصلی فرانسیسی کا مفہوم بدل نہیں گیا ہے۔ ملیبار فخر کر سکتا ہے کہ اس نے ایک امیر البحر خانوادہ کنج علی مرکار پیدا کیا جو کئی پشت تک ہند کے مغربی ساحل کا واحد محافظ بنا رہا۔ اسکے حالات اور کارگزاریاں تلاش بھی چاہتی ہیں اور تفصیل بھی اور ان کا ذکر مختصر حواشی میں نہ ممکن تھا اور نہ مناسب۔

میرے پیش نظر ملیالم زبان میں "ملبار چرترم اتام کھنڈم"، ملیبار کی ایک اسلامی تاریخ مولفہ ابراہیم الملوی الملباری کا حصّہ اوّل ہے۔ کہیں کہیں سے جو سمجھ میں آسکا یہ رسالہ بہت دلچسپ معلوم ہوا لیکن کسی ملیالم جاننے والے کی مدد سے اس کو پوری طرح سمجھے بغیر اس کا کوئی حوالہ دینا مناسب نہ ہوگا اور فی الحال یہ ممکن نہیں ہے۔ مجھے ہمت نہیں ہوتی تھی کہ مرحوم کے مقالے پر کچھ حواشی لکھنے کی ذمہ داری لوں۔ اسکے لئے طویل مطالعے کی ضرورت ہے لیکن مرحوم کے فرزند مولوی محمد غوث صاحب کا اصرار ہے کہ میں ہی اسے انجام دوں اور وہ بھی جلد۔ مجبوراً مذکورہ بالا اور بعض دیگر کتابوں کی مدد سے، جن کا اپنی اپنی جگہ حوالہ مل جائیگا، چند تعلیقات سپرد قرطاس کئے جاتے ہیں[1]۔ قدرت کو منظور نہ تھا کہ مرحوم خود اپنے مضمون کی اس وقت نظرثانی کرسکتے۔ اب جھدُ المُقِل کے سوا کیا چارہ ہے۔ (اصل مضمون اگلے صفحے سے شروع ہے مجلہ)

---

[1] یہ تعلیقات اصل مضمون کے آخر ضمیمے کے طور پر شامل کئے گئے ہیں متن میں دائروں کے اندر جو نشانات ہیں وہ تعلیق کی رہبری کیلئے ہیں۔

عربوں اور ہندوؤں کے قدیم تعلقات

جدید تحقیقات نے یہاں تک پہنچا دیا ہے کہ "عربوں کے تعلقات ہندوؤں کے ساتھ ابتدا از زمانہ تاریخی ت شروع ہوئے ہیں لیکن کل واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ قبل زمانہ اسلام وہ ہندوستان ہی کے لوگ تھے جو اپنے ملک کی پیداوار کو سواحل عرب تک لاتے تھے نہ یہ کہ عرب تاجر اُن کی تلاش میں ہندوستان جاتے تھے۔ اور جس وقت یمن کی بندرگاہوں سے ہندوستان کو جہاز جانے لگے وہ زمانہ آنحضرت علیہ السلام کی بعثت سے بہت قریب تھا" (۱) (تمدن عرب صفحہ ۵۰۳) ان تعلقات کی تصدیق فرشتہ سے اس طرح ہوتی ہے:۔

"از عہد آدم علیہ السلام تا آں زماں (یعنی زمان فتح سندھ) از جزیرہ سرندیپ از راہ دریا کشتی ہا بمکہ و دیار عرب متردد بودند و براہمہ ہندوستان پیش از ظہور اسلام جہت زیارت خانۂ کعبہ و پرستش اصنام آنجا بمکہ و دیار عرب متردد بودند" (تاریخ فرشتہ جلد دوم ذکر سندھ)

آدم علیہ السلام کے ہند یا سرندیپ میں ہبوط کی تاریخی روایت گویا ان تعلقات کی مشہور یادگار دستاویز ہے۔ (الف)۔

یہودیوں اور مسیحیوں کی آمد ہندوستان میں

قبل اسکے کہ فرنگستان کے مسیحی ساحل ہند پر اپنا قدم جمائیں صدیوں پہلے ایشیا کے یہودی اور مسیحی ہندوستان میں اسی بحری راستے سے پہنچ چکے تھے جسکی تصدیق تحفۃ المجاہدین سے اس طرح ہوتی ہے:۔

"پیش از ظہور اسلام و بعد از ظہور اسلام طائفۂ یہودی و نصارٰ برسم تجارت از راہ دریا بدان دیار آمد و شد می کردند و در آخر الامر میان ملیباریان ایشان بواسطہ منافع دنیوی الفتے بہم رسید بعضے از بازرگان یہود و نصاری در شہرہائے ملیبار ساکن شدہ منازل و بساتین ساختند" (ب)

(الف) سبحۃ المرجان میں آزاد بلگرامی نے اسبارہ میں تاریخی روایات جمع کئے ہیں۔ تمام مورخین کا ماخذ امام طبری کی تاریخ ہے جلد اول طبع یورپ صفحہ ۱۲

(ب) یہودی چین میں بھی نہایت قدیم زمانہ سے آباد تھے (دعوت اسلام آرنلڈ) اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اسی راستے چین گئے۔

(تحفۃ المجاہدین سے فرشتہ نے فارسی ترجمہ کیا ہے۔ (۲) اصل تحفۃ المجاہدین کا نسخہ شمس العلماء مولوی قاضی عبداللہ صاحب کے پاس موجود ہے)۔ اسوقت بھی کوچین و ترانکور میں یہ پرانے عیسائی بکثرت موجود ہیں اپنے کو سریانی چرچ کا متبع بیان کرتے ہیں۔ کسی اور مقام پر اتنے عیسائی نہیں ہیں۔ پانچویں صدی عیسوی میں نسطوری فرقہ نے ہندوستان میں نصرانیت کی اشاعت کی تھی (ج)۔ ان قوموں کے فرسودہ آثار مختلف بلاد سواحل میں اب بھی موجود ہیں جن میں سب سے زیادہ اہم سینٹ توما (تھامس) کا مقبرہ واقع میلاپور (مدراس) ہے۔

سینٹ توما

مختصر تاریخ کنیسۃ المسیح میں (جسکا حوالہ اوپر دیا گیا ہے) لکھا ہے "نیقو فورس نے بیان کیا ہے کہ یہ مبشر اخیر میں ہندوستان گیا۔ یہاں کے باشندوں نے پرتگیزوں سے بیان کیا کہ مبشر مذکور سب کے اخیر میلاپور دارالحکومت کورومنڈل میں آیا اور بہت سے لوگ اس کی تلقین سے ایمان لے آئے حتیٰ کہ یہاں کا فرمانروا سا گاموس نامی بھی ہدایت پایا اور اب اس نے کنیسہ (چرچ) بنانا چاہا۔ برہمن لوگ اس سے غصہ میں آگئے۔ اور موقع تاک کر ایسے وقت جبکہ وہ تنہا نماز پڑھ رہا تھا اسکو گھیر لیا اور نیزہ سے مار ڈالا" (صفحہ ۱۸)۔ فی الحال یہ مقبرہ رومن کیتھلک فرقہ کے قبضہ میں ہے۔ عربی دائرۃ المعارف میں بھی جس کا مولف شام کا عیسائی ہے سینٹ تھامس کا مختصر تذکرہ ہے (صفحہ ۲۷۔ جلد ۶) جس میں وہ یہ بھی لکھتا ہے "بعض نصرانیوں کے پاس سینٹ تھامس کے واقعات مہند فرقہ (ح) مانویہ کے اختراع ہیں۔ ہندوستان کا سینٹ تھامس مانی کا شاگرد تھا"

ج۔ مختصر تاریخ کنیسۃ المسیح زبان عربی طبع یورپ صفحہ ۱۰۶ مطبوعہ ۱۸۳۹ء۔ یہ کتاب کتب خانہ جناب قاضی الملک بدرالدولہ مرحوم کے صندوق متعلقہ کتب عیسائیان میں موجود ہے۔ پروفیسر آرنلڈ نے بھی نسطوریوں کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے اسلام کے زمانہ میں مسیحی مشن کے کاموں کو بھی بڑی دھوم دھام سے بیرونی ممالک میں جاری کیا چین اور ہندوستان کو اپنے مشنری روانہ کئے (دعوت اسلام صفحہ ۸۲)

ح۔ مانی نے مجوسی و نصرانی مذہب کو ملا کر ایک نیا مذہب پیدا کیا تھا شہرستانی کی ملل والنحل جلد اوّل صفحہ ۱۴۳۔ رسایل شبلی صفحہ ۳۴۵۔

نسطوریہ فرقہ کا مرکز بھی ایران تھا (دعوت اسلام صفحہ ۸۲) اور اسی بنا پر گویا نسطوریوں کی کوشش مانویہ کی طرف منسوب کی گئی ہے لیکن حسب بیان مختصر تاریخ کنیسہ نسطوریوں کی دوبارہ کوشش کی بنا پر سینٹ تھامس کے پہلی صدی عیسوی میں ہندوستان آنے کی تردید نہیں کیجاسکتی۔ مشہور فرنگستانی سیاح مارکو پولو جس نے تیرھویں صدی عیسوی میں (مطابق ساتویں صدی ہجری) ہندوستان کی بھی سیاحت کی تھی سینٹ تھامس کے مقبرہ کا ذکر اسطرح کرتا ہے "صوبہ معبر (کارومنڈل) میں سینٹ تھامس کا مزار ہے۔ یہ مزار میلاپور میں واقع ہے۔ وہاں تاجر کم جاتے ہیں کیونکہ تجارت کی کوئی چیز نہیں ملتی عیسائی اور مسلمان دونو اس قبر کی زیارت کرتے ہیں مسلمان بھی سینٹ تھامس کو ایک ولی مانتے ہیں وہ اسے حواری کے لقب سے یاد کرتے ہیں" (مارکو پولو سفرنامہ ترجمہ اردو مطبوعۂ متن پنجاب ریلجیس بک سوسائٹی صفحہ ۱۵۲) یہ مسیحیوں کا بیان ہے۔ ابن اسحق نے حواریوں میں توماس کا نام لکھا ہے اور بتایا ہے کہ وہ بابل بھیجا گیا۔ھ مابعد اسلامی مورخین مثلاً طبری و کا ماخذ ابن اسحق ہے۔ ابن اسحق کا ماخذ نصرانیوں کی ہی روایتیں ہیں گی کیونکہ ظاہر ہے کہ ما قبل زمانۂ اسلام کے حالات کی نسبت بجز غیر مسلموں کی نقل کے اور کوئی ذریعہ تاریخی نہیں ہو سکتا۔ بہر حال اسلامی اصول کے لحاظ سے توما حواری کے ہندوستان میں آنے کی نفی نہیں کیجاسکتی۔

مسلمانوں کی آمد ساحل ہندوستان میں

جب حضرت خاتم النبین علیہ السلام کی ہدایت سے فیض یاب ہو کر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی حواریان حضرت مسیح علیہ السلام کی بشارت کی طرح دعوت اسلام کیلئے اپنی زندگی وقف کردی تو یہ امر کسی طرح مستبعد نہیں ہوسکتا کہ ساحل ہندوستان بھی ان کے آثار سے محروم نہ رہا۔ چنانچہ حضرت تمیم انصاری کا مزار بمقام کولم (۳) جو ساحل مدراس سے جانب جنوب (۱۲ میل) کے فاصلہ پر واقع ہے جسکی زیارت سے میں بھی متعدد دفعہ مشرف ہو چکا ہوں اور حضرت عکاشہ رضی اللہ عنہ کا مزار بمقام محمود بندر ح اس کے ثبوت میں

ھ۔ سیرۃ ابن اسحاق بروایت ابن ہشام طبع یورپ صفحہ ۹۷۲۔ و۔ جلد دوم صفحہ ۳۸ ۔ ن ۔ ابن اسحاق کی نسبت مسلم ہے کہ یہود و نصاریٰ سے بھی اخذ کرتا تھا۔ علامہ ابن الندیم کی کتاب الفہرست۔ ح۔ مدراس کے جانب جنوب ساحل کارومنڈل پر واقع ہے۔

موجود ہے۔ جبکہ چین کے بندر کیانٹین ④ میں حضرت وہب رضی اللہ عنہ کا مزار گویا تواتر سے ثابت ہے تو پھر ساحل کارومنڈل میں ان کے وجود سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اور ان متبرک ناموں کی شہرت خود ایک قوی ثبوت ہے۔ یہ تو مسلّم تاریخی واقعہ ہے کہ مسلمان سواحل ہند پر اپنی حکومت قائم ہوتے ہی پہنچ گئے لی بان لکھتا ہے کہ اپنی حکومت قائم ہو جانے کے ساتھ ہی عربوں نے تعلقات تجارتی کو بہت بڑی وسعت اور ترقی دی۔ وہ بہت جلد ساحل کارومنڈل۔ ملابار۔ سوماٹرا۔ جزائر بحر ہند کو طے کرتے ہوئے جنوب چین تک پہنچ گئے (تمدن عرب صفحہ ۵۰۳) ⑤ موجودہ عربی تاریخوں میں انکا ذکر نہ ہونے سے ان کی نفی نہیں کی جا سکتی۔ قبل اسکے کہ ہم روایات سماعی قلمبند کریں عربوں کی بحری تاریخ کے متعلق کتابی مواد جو دستیاب ہوا قلمبند کرینگے۔ اس قسم کی تاریخیں جن میں عربوں کے بحری کارنامے بتلائے گئے ہوں اگرچہ عربوں نے بہت کچھ لکھی تھیں لیکن ہندوستان میں وہ مفقود ہیں۔

مسلمانوں کی بحری اور تجارتی حالت

اس سلسلہ میں صرف ایک کتاب کتب خانہ آصفیہ میں ہماری نظر سے گذری جس کا نام "عجائب الہند برّہ وبحرہ" جو ایک ایرانی النسل مسلمان جہاز ران "بزرگ بن شہریار ناخدا رام ہرمزی" کی تصنیف ہے اور یورپ کے علمی شغف کی بدولت ۱۸۸۶ء میں پروفیسر فان ڈر لائٹ کے ضروری تحشیہ اور فرنچ ترجمہ کے ساتھ نہایت اہتمام سے بمقام لیڈ چھاپی گئی ہے سنہ کتابت ۳۴۲ھ درج ہے معلوم ہوتا ہے کہ دیگر نامور گذشتہ قوموں کی طرح عربوں میں بھی اس وقت ہندوستان عجائب کا گھر شمار کیا جاتا تھا اور اسی ادبی ذوق رکھنے والے جہاز ران نے اپنی بحری سیاحتوں میں سُنے ہوئے عجائبات کا تحفہ متمدن عربوں کی خدمت میں پیش کیا ہے اور اپنے موضوع کے لحاظ سے بجائے عام تمدنی حالت کے جو آج عجائبات سے زیادہ قابل تحقیقات شمار کی جاتی ہے غیر معمولی واقعات کو اس رنگ میں پیش کرنا زیادہ مناسب خیال کرتا ہے جس سے سند باد جہازی کے سے قصّوں کا لُطف آئے۔ فی الواقع ایک جہاز ران سے اس تحقیق کی اُمید کسطرح کیجا سکتی ہے جو ابوریحان بیرونی جیسے محقق کے شایان ہو لیکن بہرکیف اس کتاب سے ضمناً عربوں کے ہندوستان کے ساتھ تجارتی و بحری تعلقات کی تاریخ پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ اس کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسوقت عربی جہاز رانی اور تجارت کسقدر باعث عظمت تھی۔ بہت سے عرب اجداد کے

کارنامے معلوم ہوئے ہیں جنہوں نے اس زمانہ میں کمال فن اور نہایت شہرت و ناموری حاصل کی تھی محمد بن بابشاد ایک جہازران اور عبہرہ نامی ایک دوسرے جہازران کے حالات معلوم ہوتے ہیں جس نے چین تک جہازرانی کو ترقی دی تھی۔ بحر ہند و چین و ہندوستان کے متعدد شہر و جزائر مثلاً انڈمان وغیرہ کے حالات بھی اس کتاب سے دریافت ہوتے ہیں۔ غرض اسلامی جہازرانی کی ترقی کی تاریخ اس کتاب سے نہایت عمدہ طور سے واضح ہوتی ہے، ان آفات و مصائب کے حالات بھی معلوم ہوتے ہیں جو اس وقت کے غیر دخانی جہازوں کو پیش آیا کرتے تھے چنانچہ سنہ ۳۰۶ھ میں تین بڑے جہازوں کی تباہی کا حال لکھا ہے جن میں (۱۲) سو آدمی سوار تھے اور جو سیراف (عرب کے اُس زمانہ کے مشہور بندرگاہ سے ساحل ہند پر آرہے تھے) کنارے کے قریب پہونچکر سمندر میں طوفان کی وجہ سے باستثناء (۳۳) آدمیوں کے جو ایک کشتی میں سوار ہو کر ساحل سے آلگے، سب کے سب غرقاب فنا ہوگئے۔ اس کتاب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کس انداز سے امن و امان کے ساتھ جہازوں کے ذریعے سے اسلام کا اثر پھیلا کرتا تھا۔ چنانچہ متعدد نومسلموں کے حالات لکھے ہیں۔

سب سے زیادہ اہم تاریخی واقعہ جزیرۂ سیلون کی سفارت کا حضرت ختم المرسلین علیہ السلام کی نبوت دریافت کرنے کیلئے جانا ہے۔ سراندیپ کے جوگیوں میں سے ایک فرقہ بیکور نامی کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ مسلمانوں کو چاہتے ہیں اور ان کی طرف بہت میلان رکھتے ہیں۔ تحفۃ المجاہدین میں جس کا ذکر آئندہ آتا ہے، ملیبار میں اسلام پھیلنے کا زمانہ تیسری صدی ہجری قرار دیکر اس روایت کو غیر صحیح قرار دیا ہے جس میں حضرت ختم المرسلین علیہ السلام کے زمانہ میں ہی راجہ ملیبار کے اسلام لانے کا بیان ہے۔

ملیبار اور سیلون کی تاریخ ایک حد تک ملی جلی ہوئی ہے (ملاحظہ ہو عجائب الاسفار ترجمہ سفرنامہ ابن بطوطہ جس میں پیرزادہ مولوی محمد حسین ایم۔ اے نے نہایت تحقیقات کی ہے) اور ایک عرصہ تک ملیباری راجہ ہی سیلون پر حکمران ہوگئے تھے۔ چنانچہ پہلی صدی ہجری میں ملیباری راجہ بھی سیلون میں حکمران تھے پس جو روایت اس جہازران نے اہل سیلون سے سنکر بیان کی ہے اور مصنف تحفۃ المجاہدین کے زمانہ میں سات سو برس کے امتداد سے مالک بن دینار کے واقعہ سے مل کر مخلوط ہوگئی ہے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل دو الگ الگ واقعات ہیں اور جس طرح مالک بن دینار کا واقعہ (جس کا ذکر آئندہ آئے گا) بجائے خود بالکل ثابت ہے۔ اسطرح کوئی وجہ نہیں کہ اس سیلونی یا ملیباری سفارت کے واقعہ کو

جو مالک بن دینار کے واقعہ سے علیحدہ ہے صحیح تسلیم کیا جائے جبکہ سواحل ہند پر آثار صحابہ کرام تو اتر سے ثابت ہیں

راجہ سیلون کا اسلام لانا پروفیسر آرنلڈ نے اگرچہ سیلون کے متعلق لکھا ہے کہ "معلوم ہوتا ہے کہ سیلون میں تبلیغ اسلام کیلئے زیادہ عملی کوشش صرف نہیں کی گئی" لیکن مجمع الجزائر ملایا کے بیان میں وہ لکھتے ہیں "دوسری صدی ہجری میں جزیرۂ سیلون کی تجارت عربوں کے ہاتھ میں تھی" (صفحہ ۳۸۱) پس جبکہ عربی تاجروں نے سیلون میں ایسا طاقتور اثر قائم کر لیا تھا تو ضرور یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ دعوت اسلام کی کوشش ضرور ہوئی ہو گی چنانچہ فرشتہ نے سندھ کے بیان میں عربوں اور ہندوؤں کے پرانے تعلقات ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:۔

"ہر آئینہ حاکم سراندیپ پیشتر از رایان دیگر مواضع ہندوستان بر حقیقت اسلام مطلع شد در عہد صحابۂ کرام مقلد قلادۂ شریعت مصطفوی گردیدہ بود چوں لسلاطین اسلام اعتقاد فراوان داشت از دریا کشتی مملو از تحف و ہدایا جہت ولید روانہ در الخلافہ ساخت"

فرشتہ نے یہ روایت سندھ کی قدیم تاریخوں سے اخذ کی ہے اور ان کے غیر صحیح قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ بلاذری نے اس واقعہ کو تو لکھا ہے لیکن راجہ کا مسلمان ہونا نہیں لکھا۔

سواحل ہند پر مسلمانوں کی نو آبادی پہلی صدیوں میں

مابعد مصنفین مثل مصنف تحفۃ المجاہدین اور ابن بطوطہ نے سواحل ہند پر اسلامی آبادی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اور جس کا ذکر آئندہ آئیگا اسکی تصدیق اور ابتدائی حالات اس کتاب عجائب الہند سے معلوم ہوتے ہیں سواحل ہند خصوصاً ساحل بمبئی و سندھ کے شہروں میں بکثرت مسلمان تاجروں کے توطن کا حال معلوم ہوتا ہے۔ مصنف نے تصریح کی ہے کہ ہندو راجا مسلمانوں کے ساتھ لطف و مہربانی سے پیش آتے تھے اور درباری مراسم وغیرہ کی پابندی سے ان کو معاف رکھا گیا تھا۔ مسلمانوں کی اندرونی حکومت ان ہی کے قاضی وغیرہ کیا کرتے تھے۔ کولم مالی میں ناگ سانپ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ وہاں ایک مسلمان شخص موجود ہے جسکو ہندی میں بنجی بولتے ہیں یہ شخص پابند صلوۃ ہے اور ناگ کے کاٹے ہوئے پر کچھ پڑھکے پھونکتا ہے اگر زہر پوری طور سے سرایت نہ کر گیا ہو تو اس کا پڑھنا اثر کرتا ہے۔ ہندو منتر پڑھنے والوں کا بھی ذکر کرکے لکھا ہے کہ بہ نسبت ان کے اس مسلمان شخص کے

پڑھنے میں تاثیر زیادہ ہے۔ ملیبار کوارٹرلی ریویو (۷) کے کسی نمبر میں ملیبار کے ماپلے مسلمانوں کی نسبت ایک مضمون چھاپا گیا تھا۔ جو نئی بات اس مضمون سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ "گو یلنڈی کے قریب ایک پتھر پر کندہ ہے کہ علی بن عبدالرحمٰن نے اس جہان فانی کو چھوڑ کر عالم بقا کو سدھارا ۱۲۶ھ" بہرحال یہ تاریخی طور سے ثابت ہے کہ مسلمان پہلی دوسری صدی ہی میں سواحل ہند پر آباد تھے۔ (۸)

سواحل ہند پر اسلامی آبادی کا دوسرا دور

مسلمانوں کے تجارتی اثر کے ساتھ ان کا معاشرتی اثر بھی دن بدن بڑھتا گیا اور تیسری صدی کے بعد داعیان اسلام کی کوششیں سواحل ہند پر پوری طور سے بار آور ہوئیں۔ یہ دوسرا دور مالک بن دینار مشہور داعی اسلام کے ہندوستان میں آنے کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ "تحفۃ المجاہدین فی اخبار البرتکالین" کی ہی وہ کتاب ہے جس کی بدولت اس دعوت کا حال محفوظ رہا۔ یہ رسالہ مع ترجمہ انگریزی میں بھی طبع ہوا ہے اور اسی سے پروفیسر آرنلڈ نے بھی انتخاب کیا ہے۔ اس کا قلمی نسخہ جناب شمس العلماء قاضی عبیداللہ صاحب کے پاس موجود ہے اور اس رسالہ کے مطالعہ کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک خلاصہ اس رسالہ کے متعلق لکھا جائے جس سے اسکی وقعت، اس کے اغراض تصنیف اور اعتبار روایت پوری طرح ظاہر ہو اور اس ضمن میں ساحلی تاریخ بھی ساتھ ساتھ معلوم ہوتی جائے اس رسالہ کے مصنف شیخ زین الدین مشہور شافعی فقیہ ابن حجر مکی کے شاگرد ہیں جو ملیبار میں آکر متوطن ہو گئے تھے اور بہت سی فقہی کتابیں بھی ان کی یادگار موجود ہیں۔ اس نامور فقیہ نے اسی تاریخی تصنیف سے ثابت کر دیا ہے کہ فقہا جب تاریخ پر توجہ کریں تو وہ اسکو کس اعلیٰ پیمانہ پر لکھ سکتے ہیں۔ رسالہ کے پڑھنے سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ مصنف ضرور کوئی عالم ہے جس کا دل اپنی قوم کی بگڑی ہوئی حالت دیکھ کر بے تاب ہو جاتا ہے، اس عالم میں یہ رسالہ لکھ کر علی عادل شاہ کے نام پر معنون کرتا اور اسکو مسلمانان ملیبار کی اسوقت کی بگڑی ہوئی حالت پر توجہ دلاتا ہے۔

دیباچہ میں اس نے صراحتاً بیان کیا ہے کہ اللہ نے اہل ملیبار کو دین اسلام بطوع و رغبت قبول کرنے سے اکرام بخشا نہ کہ خوف و بربادی کے ذریعہ سے یہ اس طور سے ہوا کہ مسلمانوں کی ایک جماعت ملیبار کے بندرگاہوں میں آئی اور یہاں اپنا وطن بنا لیا۔ ان کے باشندے روز بروز اللہ کے دین میں داخل ہونے لگے اور

اس طرح اسلام کو پورا عروج ہوا تا آنکہ مسلمانوں کی کثرت ہوئی اور ان سے اس سرزمین کے شہر بس گئے۔ بوجہ اس کے کہ ہندو راجا ظلم نہیں کرتے تھے نہ اپنے رسوم قدیم سے تجاوز کرتے تھے۔ اس کے بعد پرتگال والوں کا غلبہ ہوا اور ان کے ظلم و ستم کی وجہ سے مسلمانوں کی حالت نہایت خراب ہوگئی۔ بلحاظ ضعف بے زوری ذلت کے جو مصیبت مسلمانوں پر نازل ہوئی اس کے دور کرنے کیلئے باوجود طاقت و شوکت کے مسلمان بادشاہوں میں سے کسی نے توجہ نہ کی۔ اس رسالہ کو میں ان کی ترغیب کے لئے لکھتا ہوں کیونکہ اہل پرتگال نے بہت سے مسلمانوں کو قید کیا، بہتوں کو مار ڈالا اور ایک جماعت کو مرتد کرکے نصرانی بنا لیا۔ بہت سی مسلمان عورتوں کو گرفتار کر لیا، جس سے نصرانی اولاد پیدا ہوئی جو مسلمانوں سے ہی لڑتے اور ان کو اذیت دیتے ہیں۔ اس رسالہ کے چار حصے ہیں۔ دوسرے حصہ میں ملیبار میں اشاعت اسلام کی تاریخ قلمبند کی ہے۔

اس تاریخ اشاعت اسلام کو بحذف زواید مختصر طور سے اس طرح قلمبند کیا جاسکتا ہے کہ مسلمان زائرین کی ایک جماعت قدم آدم کی زیارت کیلئے سیلون جا رہی تھی۔ راستہ میں کرانکانور میں یہ لوگ اُتر پڑے۔ وہاں کے راجہ چیرامن پیرومل (حسب بیان عجائب الاسفار) نے ان کے ساتھ عمدہ اخلاق کا برتاؤ کیا۔ قافلہ سالار نے حضرت علیہ السلام کے حالات راجہ کے سامنے بیان کئے اور اسلام کی حقیقت اسکو بتائی۔ تائیداً معجزۂ شق القمر پیش کیا۔ راجہ مسلمان ہوا اور ملک کی تقسیم کر دینے کے بعد ان کے ساتھ پوشیدہ طور سے حجاز میں گیا اور وہیں اس کا انتقال ہوگیا۔ مرتے وقت اس نے اپنے رفیقوں کو وصیت کی کہ ملیبار میں تبلیغ اسلام کا جو مصمم قصد تھا اسکو تجارت و سیاحت کے وسیلہ سے پورا کیا جائے اور اس کام میں مدد کے لئے راجہ نے سفارشی کا خط نائب ملیبار کے نام لکھا۔ یہ جماعت جس میں شرف بن مالک۔ مالک بن دینار، مالک بن حبیب سربرآوردہ تھے ملیبار میں آئی اور راجہ کا خط اس کے نائب کے سامنے پیش کیا جس نے ان کے ساتھ عمدہ برتاؤ کیا اور جہاں چاہیں توطن اور مسجد و مکانات۔ باغات تیار کرنے کی اجازت بخشی چنانچہ کرانکانور میں یہ جماعت مقیم ہوئی اور پھر اس کے بعد مالک نے کل ساحل ملیبار کا دورہ کیا اور مسجدیں تعمیر کیں۔

پروفیسر آرنلڈ نے اس روایت کی نسبت یہ ریمارک کیا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ تاریخی حیثیت سے مستند ہو یا غیر مستند۔ ہمارے خیال میں گو زواید روایت پورے طور سے صحیح نہ ہوں لیکن مالک بن دینار کے

اسلام کی دعوت کرنے اور راجہ کے اسلام قبول کرنے کے اصل واقعات کو تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے جبکہ مقامی روایتوں سے اسکی پوری شہادت ملتی ہے مثلاً سنکلر (جسکی تاریخ مدراس یونیورسٹی کے کورس میں داخل ہے) گویا انہی مقامی روایتوں کی بنا پر لکھتا ہے کہ ملیبار نویں صدی (مطابق تیسری صدی ہجری) تک کرلا کے ماتحت رہا لیکن وہاں کا راجہ دین محمدی قبول کرنے کی وجہ سے لوگوں نے بغاوت کی سلطنت متفرق حصوں میں جدا ہوگئی لیکن اسکا جزو اعظم کلی کوٹ کے راجہ زامورن (سامری) کے ماتحت تھا۔ط

ملیبار کوارٹرلی ریویو کے اس مضمون میں جس کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے لکھا ہے کہ چیرامن پیرول نو مسلم راجہ ملیبار (جس کی قبر شحر یا ظفار میں ہونا تحفۃ المجاہدین میں منقول ہے) کے متعلق مسٹر لوگن نے ایک عرب سے سنا ہے اسی راجہ کی قبر ظفار میں ہے اور اس کے سنگ مزار پر کندہ ہے تاریخ ورود ظفار ۲۱۲ھ وفات ۲۱۶ھ نام عبدالرحمٰن سامری۔ ان سماعی شہادتوں سے قطع نظر سب سے زبردست شہادت وہ مسجدیں دے رہی ہیں: جن کی تعمیر حسب بیان تحفۃ المجاہدین مالک بن دینار نے کی تھی اور جو آج کے دن بھی دعوت اسلام کی اس قدیم روایت کی تصدیق اپنے زبان حال سے کر رہی ہیں۔ جن جن مقامات میں یہ مسجدیں بنائی گئیں انکی فہرست یہ ہے

نشان شمار	نام مندرجہ تحفۃ المجاہدین	نام موجودہ حسب تحقیق عجائب الاسفار
(۱)	کدنکلور	کرانکانور
(۲)	کولم یا کولن	کولن صفحہ ۲۹۹ عجائب الاسفار یہ گویا ملیبار کا آخری شہر ہے (جو مدراس کے قریب کولم سے علحدہ ہے) باقی (۸) مقام اسی ساحل پر ہنور اور کوچین کے مابین واقع ہیں
(۳)	ہیلی	اب آباد نہیں۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ ہیلی کے شہر کو ہندو مسلمان متبرک سمجھتے ہیں کیونکہ اسمیں ایک جامع مسجد ہے جو برکت میں مشہور ہے صفحہ ۲۸۰ عجائب الاسفار
(۴)	جرفتن (پٹن)	سری کنداپورم مسجد اب بھی موجود ہے عجائب الاسفار صفحہ ۲۸۹

ط ترجمہ تاریخ سنکلر مترجمہ ریورنڈ سیل موجود بہ کتب خانہ شرف الدولہ مرحوم۔

(۵)	درفتن	درمہ پٹن - یہاں بھی مسجد تھی - یہاں کے راجہ کے مسلمان ہونے کا ذکر ابن بطوطہ نے کیا ہے عجائب الاسفار صفحہ ۲۸۹
(۶)	فندرنیہ	پیندارانی صفحہ ۲۹۱
(۷)	جالیات	پیرزادہ مولوی محمد حسین صاحب ایم اے کا قیاس ہے کہ بدتمین جسکا ابن بطوطہ نے ذکر کیا ہے جالیام ہوگا کیونکہ وہاں بھی مالک بن دینار کی مسجدوں میں سے ایک مسجد تھی مگر جالیام کا نام تحفۃ المجاہدین میں نہیں ہے اور جالیات (۱۰) الگ وہ مقام ہے جسکا ذکر ابن بطوطہ نے کلی کوٹ کے بعد کیا ہے اور جسکو خود انہوں نے بھی تسلیم کیا ہے صفحہ ۳۰۲
(۸)	فاکنور	برکور صفحہ ۲۸۶
(۹)	منگلور	منگلور صفحہ ۲۸۷
(۱۰)	کنجرکوٹ	مولوی محمد حسین صاحب نے شاید اسکا نام سہواً چھوڑ دیا ہے

مالک بن دینار کے زمانہ کے متعلق تحفۃ المجاہدین میں اسطرح درج ہے کہ ان کے زمانہ کی تحقیق نہ ہو سکی۔ لیکن ظن غالب یہ ہے کہ ان کا زمانہ دوسری صدی ہجری کے بعد ہے ۔ مسلمانان ملیبار کے شافعی مذہب ہونے سے فرشتہ نے یہ قیاس قائم کیا ہے کہ مالک بن دینار وغیرہ بھی شافعی ہونگے جس سے یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ وہ تیسری صدی کا ہی واقعہ ہے کیونکہ امام شافعی خود دوسری صدی کے آخر اور تیسری صدی کے شروع میں ہوئے ہیں۔ کتبۂ قبر سے تو چوتھی صدی کا واقعہ معلوم ہوتا ہے ۔ تحفۃ المجاہدین میں مالک بن دینار کے تو یہاں واپس جانے کا ذکر ہے ۔ مالک بن حبیب کے انکا نوں میں پیوند زمین ہوئے اور ان کی اولاد کولن میں بسی اسکے بعد تحفۃ المجاہدین میں مختصراً بتایا ہے کہ ملیباری بتدریج دین اسلام میں داخل ہونے لگے - ہر طرف سے عرب تاجر وہاں پہونچنے لگے اور بہت سے شہر مسلمانوں اور ان کی تجارت کی بدولت آباد ہوئے ۔

پھر اس نے کسی قدر تفصیل سے بتایا ہے کہ ہندو راجاؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کس قدر اچھی حالت میں تھے۔

ہندو راجا ان سے اچھا برتاؤ کرتے تھے ۔ نومسلم ملیباریوں کو ان کے ہم وطنوں کی طرف سے کوئی اذیت نہیں پہنچائی جاتی تھی بلکہ خود اصل مسلمانوں کی طرح انکا بھی احترام کیا جاتا تھا گو وہ اسلام لانے کے پہلے پنچ ذاتوں کے کیوں نہ ہوتے، مسلمان تاجر گویا چندہ کرکے اپنے نومسلم بھائیوں کی مدد کرتے تھے ۔ کتاب کی قسم ثالث میں مولف نے ملیباریوں کی سوشل حالت پر نہایت عمدہ طور سے روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ اسلام کی کامیابی کا ایک سبب ملیباریوں کی وہ فرقہ بندی تھی جسکی بدولت ان کی سوشل حالت میں رخنہ پیدا ہوگیا تھا دو تین جگہ اس نے تصریح کی ہے کہ افراد ملک سے کوئی امر مخالف فرقہ بندی سرزد ہوتا تو ان صورتوں میں خود بخود ان کو اسلام کے سایہ میں پناہ لینے کی ترغیب ہوتی تھی ۔ اس ضمن میں یہ بھی بتایا ہے کہ ملیباریوں کے بعض رسوم و رواج کا اثر مسلمانوں میں بھی ہوگیا ہے ۔

غرضکہ داعیان اسلام کی کوششوں سے ملیبار میں وہ اسلامی زبردست نوآبادیاں قائم ہوگئیں جسکی عظمت و شان کا اندازہ کسی قدر ابن بطوطہ کے بیانات سے ہوتا ہے اور جن کی یادگار میں آج بھی ماپلے مسلمان موجود ہیں۔

کتاب کی قسم رابع میں جو اس رسالہ (تحفۃ المجاہدین) کا اصل مقصد ہے پرتگالیوں کے سواحل ہند پر آنے اور رفتہ رفتہ یہاں ان کی حکومت قائم ہونے کے حالات نہایت تفصیل سے بتائے ہیں اور کل مورخین ہند میں یہی فقیہ مورخ ہے جو اس حصۂ تاریخ کا پہلا جامع ہے اور میرے خیال میں خود پرتگالی مورخین نے اس سے زیادہ نہیں لکھا ہوگا جسقدر اس رسالہ میں لکھا گیا ہے ۔ فرشتہ نے اس کو مناسب اختصار کے ساتھ اپنی تاریخ میں درج کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہوسکتا ہے کہ اندلس میں مسلمانوں پر جو ظلم وحشی پرتگالیوں کے ہاتھوں برپا ہوا تھا مثلاً جبراً عیسائی بنانا مسجدوں کی اہانت عورتوں کی بے حرمتی حج کی ممانعت وغیرہ ان سب کا پورا نمونہ ساحل ہندوستان نے بھی دیکھ لیا ۔ (اسکی تصدیق انگریز مورخوں نے بھی کی ہے جو پرتگالیوں کے عیوب اچھے طرح ظاہر کرتے ہیں ملاحظہ ہو تاریخ ہند مولفہ ذکاء اللہ)

اس حصۂ کتاب میں جو بات سب سے زیادہ قابل تعجب و ستایش ہے وہ واقعات کے علل و اسباب پر غور کرنا ہے پرتگالیوں کی ترقی کے اسباب عالم مصنف اس طرح بیان کرتا ہے ۔ وہ اہل مکر و دھوکا والے ہیں اپنے معاملات کی مصلحتوں سے باخبر وقت ضرورت اپنے دشمنوں سے عاجزی کرنے لگتے ہیں اور جب ضرورت نکل جاتی ہے تو پھر ہر ممکن طور سے ان پر اپنا اثر ڈالتے ہیں سب کے سب نہایت اتفاق رکھتے ہیں اپنے افسروں کے

حکم کی مخالفت نہیں کرتے۔ باوجودیکہ وہ اپنے بادشاہوں سے نہایت دور مسافت پر ہیں بایں ہمہ ان میں بہت کم اختلاف ہے اور یہ کبھی نہیں سنا گیا کہ ان میں سے کسی نے اپنے افسر کو حکومت حاصل کرنیکی غرض سے مار ڈالا ہو اس لئے باوجود ان کی اقلیت کے ملیبار کے راجہ ان کے مطیع ہوگئے۔ اس کے برعکس مسلمان بادشاہوں میں باہمی نااتفاقی ایک دوسرے سے بدگمانی اپنی ذات کے خلاف سازش کا خوف وغیرہ اسباب تنزل نہایت وضاحت سے آئینہ کرکے بتاتا ہے۔

غرضکہ اس قابل قدر عالم مصنف نے دسویں صدی ہجری میں قوموں کی ترقی و تنزل پر جو فلسفیانہ نظر ڈالی ہے اور ساحل ہند کی جیسی مکمل تاریخ مرتب کی ہے اس پر اب چودھویں صدی میں بھی کوئی اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ پرتگالیوں کی تاریخ کے ضمن میں اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ مسلمان تاجروں کی تجارت کس طرح گھٹ گئی اور کس طرح پرتگالی بتدریج تمام تجارت پر قابض ہوگئے اور کسطرح مسلمانوں کی عظیم الشان جہاز رانی کا صرف نام باقی رہ گیا۔

ساحل کارومنڈل

تحفتہ المجاہدین میں ان داعیان اسلام کے صرف ملیبار میں توطن اور ساحل ملیبار پر ہی مسجدیں بنانے کا ذکر ہے لیکن مغربی ساحل ملیبار کی طرح مشرقی ساحل کارومنڈل میں بھی ان داعیان اسلام کے آثار دینی ملتے ہیں اور ان کا ذکر تحفتہ المجاہدین میں نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ تحفتہ المجاہدین چونکہ صرف ملیبار کی تاریخ ہے لہذا اس میں ساحل کارومنڈل کے متعلق ذکر نہیں کیا گیا۔ لیکن تحفتہ المجاہدین میں انکا ذکر نہ ہونے سے کسی طرح ان کی نفی نہیں کی جاسکتی، جبکہ تواتر سے اور صحیح قرائن سے انکا ثبوت مل رہا ہے۔ چنانچہ اسی کولم میں جو مدراس کے قریب واقع ہے اور جہاں حضرت تمیم انصاری رضی اللہ عنہ کا مزار واقع ہے ایک قدیم مسجد اسی ہندی طرز کی موجود ہے جسکو اسلامی تعمیر ہند کا سب سے پہلا دور کہا جاسکتا ہے۔ یہ مسجد بھی مالک بن دینار کی مسجد کے نام سے مشہور ہے اگر کوئی شخص جس نے ملیبار کی قدیم مسجدوں (۱۱) کو دیکھا ہے ان کا اس مسجد سے مقابلہ کرے تو اس کا قطعی فیصلہ ہوجائیگا کہ یہ مسجد بھی انہی کے ساتھ بنی ہوئی ہے۔

مولوی نجم الدین صاحب مرحوم تحصیلدار کولم نے جن کا نام ان کے عمدہ خیر کے کاموں کی وجہ سے

وہاں مشہور ہے، اپنے خاندان کی ایک تاریخ لکھی ہے اس میں ضمناً کولم کے حالات آگئے ہیں۔ بہرحال جس قدر تاریخی واقعات اس کتاب سے معلوم ہوئے ان کی نقل یہاں درج کی جاتی ہے نواب سعادت اللہ خاں مرحوم ۱ جو کرناٹک کے مشہور اور سب سے پہلے نواب ہیں) ۱۱۱۱ھ میں حضرت سیدنا تمیم انصاری رضی اللہ عنہ کے مزار مقدس کی زیارت کے واسطے فائز کولم ہوئے اسوقت مسجد مالک بن دینار کے منبر پر خطبہ خواجہ احمد مرحوم نے (تحصیلدار صاحب مولف تاریخ کے جد اعلیٰ) جو نواب صاحب مرحوم کے ساتھ آئے تھے زبانی پڑھا ۱۱۵۹ھ میں اس مسجد کی خطابت و موتونی کا پروانہ اور اخراجات مسجد کیلئے جاگیر کدمباری ان کو نواب مزبور کی طرف سے عطا ہوئی جسکو انہوں نے اپنے بڑے بھائی شیخ محمد مرحوم کے نام سے کرادیا ۱۱۶۷ھ میں درگاہ حضرت تمیم انصاری رضی اللہ عنہ کے عرس وغیرہ خدمات کیلئے موضع پرمالٹری کا پروانہ ان کے نام عطا ہوا یہ دونوں پروانے اور جاگیر ان کے خاندان میں اب بھی بحال ہیں۔ نواب سعادت اللہ خاں کے زمانہ سے کولم کی تاریخ روشنی میں آتی ہے جب سے اس کا نام سعادت بندر رکھا گیا۔ محمد حسین حاکم شرع بھی جو نواب سعادت اللہ خاں کے ساتھ ۱۱۱۱ھ میں کولم میں آئے تھے یہیں بس گئے اور ان کے مشہور عمارتی آثار اب بھی موجود ہیں ۱۱۴۲ھ میں ان کا انتقال ہوا اور مزار مقدس کے پائیں مدفون ہوئے جہاں اب بھی ایک چوکھنڈی ہے اور ان کی تاریخ وفات کا کتبہ تین شعر میں کندہ ہے

غرضکہ جب سے کرناٹک میں اسلامی نوابوں کا دور شروع ہوا کولم کی تاریخ روشن ہوئی ہے لیکن یہ سوال کہ حضرت تمیم انصاری کس طرح یہاں تشریف لائے ابھی تک تاریخی روشنی میں صاف نظر نہیں آتا۔ عام طور پر جو روایت مشہور ہے وہ شاید تاریخی طور سے تسلیم نہ کی جاسکے۔ بہرحال جبکہ چین کے بندر کیانٹن میں ایک صحابی کا مزار تواتر سے ثابت ہے تو ساحل کارومنڈل پر اسکی نفی نہیں کی جاسکتی۔ کولم کے قریب جو ساڈراس منجا کویم کے مشہور دیول ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بھی بڑی آبادی اور راجاؤں کا مستقر ہوگا جسکی تاریخ بہت کچھ غور طلب ہے حضرت تمیم انصاری رضی اللہ عنہ کے مزار مقدس کے آگے مسجد مالک بن دینار کے محاذی ایک چوکھنڈی ہے اور اس میں عام مروجہ قد وقامت کی قبروں سے کلاں قد وقامت کی قبر ہے۔ انکا نام مولوی نجم الدین صاحب کے فرزند مولوی عبدالرحیم صاحب کے زبانی سید سلیمان معلوم ہوا مسجد مالک بن دینار کی پشت پر اطراف میں ایک قدیم قبرستان ہے جسکی قدامت ان کتبوں کے خطوط سے ثابت ہوتی ہے جو بعض قبروں کے پاس

پتھروں پر کندہ ہیں بعض کتبے نہایت قدیم طرز کے عربی خط میں ہیں ایک کتبہ جو نہایت قدیم عربی خط میں ہے افسوس ہے کہ باوجود کئی احباب کی کوشش کے پوری طور سے پڑھا نہیں گیا۔ زیادہ سے زیادہ "اسمٰعیل بن عبداللہ بن علی" پڑھا جاتا ہے لیکن یہ بھی یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا۔ اور اس کے بعد آخری سطریں تو بالکل پڑھی نہیں جاتیں۔ (۱۲) یہ کتبے اس کے مضبوط گواہ ہیں کہ نواب سعادت اللہ خاں کے بہت زمانہ پیشتر کے ہیں اور بلحاظ ان کے طرز خط اور بلحاظ اس تاریخ دعوت اسلام کے جو اسوقت تک قلم بند کی گئی ہے تیسری یا چوتھی صدی میں انکا لکھا جانا قرین قیاس ہے یہ عربی آثار قدیمہ ہیں جن کی طرف اب تک کسی متجسس آثار قدیمہ نے کوئی نگاہ لطف نہیں ڈالی اور جو اس وقت کے منتظر ہیں جبکہ عربی آثار قدیمہ کے متجسس ان کا پتہ لگانے کی کوشش کریں۔ نہ معلوم ہمارے عربی سے محبت رکھنے والے طلبائے علم میں کب یہ ذوق پیدا ہو کہ وہ اپنے اسلاف کی بالکل بھولی ہوئی تاریخ کا ان کتبوں کے ذریعہ سے پتہ لگائیں اور تاریخ ہند میں ایک ایسا اضافہ کریں جس کی طرف اسوقت تک بہت کم توجہ کی گئی ہے۔

ساحل کارومنڈل پر کولم کے علاوہ محمود بندر میں حضرت عکاشہ رضؓ کا مزار بیان کیا جاتا ہے۔ اس بات کا باوجود دریافت کوئی پتہ نہ لگا کہ محمود جسکے نام پر یہ بندرگاہ آباد ہے کون تھا۔ حضرت عکاشہؓ کی نسبت بھی بیان کیا جاتا ہے کہ نواب والاجاہ مرحوم کے پروانہ میں عکاشہ صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم درج ہے (مجھے جناب مولوی محمود صاحب نے جناب طراز شخاں مرحوم سے سُنی ہوئی یہ بات کہی ہے)

بہرحال ملیبار کی طرح کارومنڈل میں بھی عرب مسلمانوں کا زبردست اثر موجود ہے۔ ابن بطوطہ معبر (کارومنڈل) کے حصۂ زیریں مشہور مدرہ اور کاویری پٹن تک آیا تھا جہاں اسوقت اسلامی شاہان معبر کی حکومت تھی (اسلامی شاہان معبر کی تاریخ مولوی محمد حسین صاحب نے نہایت تلاش سے لکھی ہے عجائب الاسفار) علاء الدین خلجی و محمد تغلق نے جب دکن سے راس کماری تک فتح کیا ہے تو اسوقت ساحل پر مسلمان تاجر پہلے سے موجود تھے۔ اس ساحل پر کولم کے قریب سدرن پٹن کے حالات بھی قابل لحاظ ہیں۔ میرے مہربان سید شاہ محمد یحیٰی حبیب اللہ صاحب نے سدرن پٹن کے متعلق قابل لحاظ حالات قلم بند کئے ہیں (جو صحیفہ ماہواری میں

ی ا۔ یہ صاحب اب صدر محاسبی سرکار عالی میں منتظم ہیں۔

شائع ہوئے) جن سے اس قیاس کی تصدیق ہوتی ہے کہ مالک بن دینار کی کوششیں ملیبار میں محدود نہ رہیں بلکہ کل ساحل کارومنڈل میں اس عظیم الشان حقیقی مجاہد و داعی اسلام نے دورہ کیا تھا۔ صاحب صوف نے جو حالات لکھے وہ یہاں نقل کیے جاتے ہیں " سدراس کولم سے ۱۹ میل کے فاصلہ پر زمانہ قدیم کا ایک مشہور و آباد شہر سمجھا جاتا ہے مسلمانوں کی آبادی تخمیناً ۸۰۰ - ۹۰۰ افراد کے مابین ہوگی۔ ڈچ لوگوں کا ایک پرانا قلعہ فی الحال شکستہ حالت میں ہے۔ یہ قلعہ بھی انہی قلعوں میں سے ہے جن کو انگریزوں سے ڈچ نے بروقت معاہدہ توڑ دینے کا اقرار کیا تھا۔ یہاں دو مسجدیں ہیں ایک فتح خاں کی مسجد کہلاتی ہے جو چھوٹی سی پتھر چونے کی مسجد ہے مسجد کے سامنے ایک گنبد میں فتح خاں کی قبر ہے - اور مسجد کے داہنے جانب گنبد نما رواق میں فتح خاں کے بھائی کی قبر ہے - اسی دوسری گنبد کے بلند حصہ پر کچھ عبارت فارسی خط میں کندہ ہے۔ جو بلندی اور خود رو بیلوں کے ڈھک جانے سے سمجھ میں نہیں آئی - یہ گنبد اور مسجد اس قدر تباہ و شکستہ حالت میں ہیں کہ اندر قدم رکھتے ہوئے خوف ہوتا ہے۔ مسجد کے ہر ایک حصہ میں جنگلی جھاڑ و درخت ایستادہ ہیں۔ دوسری مسجد جو زیادہ قدیم اور تاریخی طور سے قابل لحاظ ہے کسی قدر اچھی حالت میں ہے مسجد میں ایک بوریہ بچھا ہوا ہے جہاں ایک یا دو آدمی یا کوئی مسافر نماز پڑھتے ہوئے نظر آجاتا ہے۔ اس مسجد کی وضع تعمیر ویسی ہی ہے جیسے کولم میں مسجد مالک بن دینار کی ہے اور اس مسجد کے متصل بھی ایک قبرستان ہے جس کی الواح مزار کی وضع تحریر و تراش بھی ویسی ہی ہے جیسی کولم میں مالک بن دینار کی مسجد کے متصل قبرستان میں اس مسجد کے متولی مولوی نجم الدین صاحب مرحوم تحصیلدار کے برادر زادے ہیں اور ان کی سکونت سدرن پٹن سے چند میل کے فاصلہ پر کسی قریہ میں ہے۔ کولم میں ان سے ملاقات ہوئی تھی انہوں نے بیان کیا کہ ان کے والد کہتے تھے کہ سدرن پٹن کی مسجد بھی مالک بن دینار کی تعمیر کی ہوئی ہے - سدرن پٹن سے دو میل جانب شمال ایک موضع موسوم بہ کل پاک ہے جہاں آبادی سے دور لب ساحل دو کچی قبریں ہیں عام طور سے ایک قبر کے مدفون کا نام نوربی مشہور ہے اور ان کے پہلو میں ان کے فرزند کی قبر بیان کیجاتی ہے۔ نوربی صاحب کرامت مشہور ہیں۔ ہر سال ان کا عرس بتاریخ ۲۱ ذی الحجہ ہوتا ہے یہ دونوں قبریں باوجود اس کے کہ ساحل پر ہیں اور بجز ایک تودہ ریت کے اور کچھ نہیں بایں اپنی اصلی حالت پر قائم ہیں۔ ان دو قبروں کے متعلق کوئی زیادہ تحقیقات نہ ہو سکی۔ نوربی کی قبر پر سرہانے اور پائیں دو پتھر نصب ہیں سرہانے کے پتھر پر شمال کی جانب کچھ عبارت کندہ ہے۔

جو قدامت نیز لوحِ مزار کے روغن آلود ہونے کی وجہ سے کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ شاید آیت "کُل من علیھا فان" ہوگی۔ اس پتھر کی وضع تراش بھی ویسی ہی ہے جیسے کولم میں مالک بن دینار کے قبرستان میں یہاں تک مدراس کے جانبِ جنوب کی تاریخ قلمبند کی گئی۔ مدراس کے جانبِ شمال ساحل پر پلیا گھاٹ میں بھی قدیم وضع کی مسجدیں ہیں اور عربی آبادی کا زبردست اثر ہے جو ملیبار اور دوسری جگہ کے مسلمانوں کی طرح اب زمانہ کی رفتار سے تنزل میں ہے ظاہر ہے کہ ان کی عظمت تجارت کی وجہ سے تھی جو اب یورپ کے بخار و برق کی طاقتوں کے روبرو ٹھیر نہیں سکتی تھی۔ پلیا گھاٹ کے رومال پائیداری میں مشہور تھے۔

پلیا گھاٹ کے آگے عربوں کا نشان نہیں ملتا۔ بظاہر یہ امر قابل تعجب معلوم ہوگا کہ مدراس سے نیچے تک تو عربی بین آثار موجود ہوں لیکن جب اس سے اُوپر بنگالہ کی طرف بڑھیں تو یہ آثار معدوم ہو جائیں۔ لیکن اس میں درحقیقت عرب داعیان اسلام کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ قدرتی طور سے یہ حصہ بالکل غیر آباد دشوار گذار واقع ہوا ہے۔ سمندر و ساحل میں بہت نشیب و فراز ہیں چنانچہ عربوں سے پہلے آرین متمدن حکومتوں کا اثر بھی یہاں بہت کم پہونچا تھا۔ جغرافیۂ مدراس مرتبہ محمد ابوالحسن (موجودہ کتب خانہ شرف الدولہ) میں لکھا ہے کہ "اُن تمام شمالی وساحلی ضلعوں میں جنوبی اضلاع ساحلی کے جیسے بڑے بڑے خوبصورت مندر بالکل کم نظر آتے ہیں" یہ اس لحاظ سے کہ مشرقی ساحل کا شمالی بالائی حصہ تجارتی و تمدنی لحاظ سے اس کے جنوبی حصہ زیرین کا مقابل نہیں تھا بلکہ غیر آباد ملک تھا۔ لہٰذا عرب تاجروں اور داعیان اسلام کا بھی یہاں زیادہ اثر نظر نہیں آتا۔ شمالی اضلاع نیلور۔ گنٹور۔ مچھلی بندر۔ راجمندری میں عربی قدیم آثار ملیبار و کرناٹک جنوب کی طرح بالکل نہیں پائے جاتے۔ ان اضلاع میں جو کچھ اسلامی آثار ہیں بھی تو وہ مابعد اسلامی دور علی الخصوص ہماری سلطنت آصفیہ کی یادگاریں ہیں مثلاً ضلع گنٹور میں نظام پٹن جو سرکار آصفیہ کی مبارک کوششوں کی نشانی ابھی اپنے نام سے ظاہر کر رہا ہے۔ راجمندری کی مسجد حال میں ازروئے قانون آثار قدیمہ قابل حفاظت قرار دی گئی ہے اسکے حالات بھی دریافت طلب ہیں۔ اس ساحل میں سب سے آخری ضلع اسحٰق پٹن ہم کو یاد دلاتا ہے کہ عربی قدیم اثر یہاں بھی موجود ہے۔ اسحٰق کا نشان مابعد اسلامی دور میں نہیں ہے اور اسلئے یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ بلحاظ اپنی نام کی وضع کے پرانے عربوں ہی سے ہوگا۔ غلام دستگیر صاحب داماد عبدالرحیم صاحب پالونچہ نے بیان کیا کہ یہ وہاں اسحٰق مدینہ کے نام سے مشہور ہیں۔

اور قدیم زمانہ میں یہاں آئے تھے۔ کل اس ساحل میں سچ پٹن ہی ایسا بندرگاہ ہے جو جہازوں کے لنگرانداز ہونے کیلئے بہت ہی ٹھیک طور سے واقع ہوا ہے اور اسلئے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ عرب جہاز ران اس ساحل کو پوری طرح چھانتے ہوئے آخر ایک ایسے انتہائی مرکز پر پہنچ گئے جہاں اس ساحل کا خاتمہ ہوتا ہے اور جس کے بعد صرف ضلع گنجام ایسلئے ہے جہاں ہندوستان کی قدیم قومیں بھیل اور گونڈ بستی ہیں۔ ساحل ہند کو چھانتے ہوئے عرب تاجروں نے عظیم الشان اسلامی آثار چھوڑے ہیں انکی تاریخ اس نقطہ پر ختم ہوتی ہے۔

مغربی ساحل

واضح رہے کہ مشرقی ساحل کی طرح مغربی ساحل بھی ابتداء ہی سے مسلمان عرب تاجروں کی کوشش سے معمور رہا فرشتہ لکھتا ہے:-

"بعد از انکہ رفتہ رفتہ تردد مسلمانان درآں ملک بسیار شد وابیاری از ملوک ملیبار بحلقۂ اسلام درآمدند راجہائے بندرگوا کـ دابل وجیول وغیرہ بطریق حکام ملیبار مسلمانانے راکہ از عربستان آمدند درسواحل دریا مسکن دادو وایشاں را مخاطب بہ نوایت گردانیدند"

بلحاظ تقدم مکانی میرے خیال میں ملیبار رو ساحل کارومنڈل سے پہلے یہاں اسلام کا اثر مستحکم ہوگیا تھا۔ جیساکہ عجائب الہند سے معلوم ہوتا ہے، اور اس کی بڑی تصدیق ابن بطوطہ سے ہوتی ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حملہ کے بعد سے ہی یہاں مسلمانوں کے آثار ملتے ہیں۔ بمبئی کے قریب تھانہ میں صحابۂ کرام کا مدفون ہونا بیان کیا جاتا ہے عرس وغیرہ بھی ہوتا ہے۔

یہ تاریخ جس پر دراصل سرسری نظر ڈالی گئی ہے اس قابل ہے کہ اس کی پوری تحقیقات کیجائے۔

ک۔ دابھول اور جیول مغربی ساحل پر دو بڑے بندرگاہ تھے۔ سلطنت بہمنیہ کے زمانہ میں بھی ان کی شہرت قائم تھی۔ بقول فرشتہ محمود شاہ بہمنی کے وقت میں بڑے شہروں میں ان کا شمار تھا فیروز شاہ کے زمانہ میں جب بحری ترقی ہوئی تو یہ بندر بھی بحری کارناموں کے مرکز تھے۔ دابھول کوکن میں اب ضلع رتن گرھی میں واقع ہے سیرۃ المحمود صفحہ ۶ مولفہ مولوی عزیز مرزا صاحب۔

بے شبہ عرب زندگی کی ضرورتوں کے لحاظ سے آئے لیکن کشت وخون اور جوع البقر کی طرح نہیں بلکہ تہذیب وتمدن فاضلہ کے اس جائز اور لازمی طریقہ کے موافق جس کا بقول محققین یورپ یوروپین تہذیب وتمدن میں صرف نام باقی ہے۔ ان اسلامی مشنوں کے بے شر ہونے کا اس سے زیادہ کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ مہمان نواز ہندووں نے بلا مزاحمت اُن کو "خوش آمدید" کہا اور کئی صدیوں تک مسلسل ایسے میل جول کے ساتھ بسر کرتے آئے[ل] جس کی ایک جھلک اب بھی ساحلی مقامات پر نظر آتی ہے۔ (۱۴)

تقسیم قومی

اس طرح بغیر کشت وخون یا مکروفریب کے محض پُرامن طریقہ سے جس عمارت کی بنا ڈالی گئی تھی اُس کی بنیادیں اب بھی علی حالہ مستحکم ہیں، نوایتہ، ماپلے، لبّے، چولئے کیلان وغیرہ مختلف کثیر التعداد قبائل اسی عمارت کا مختلف قسم کا مسالہ ہیں جن کی باہمی تفریق ایک دشوار کام ہے اور علمی تحقیقات کی شعاعیں اس کی ماند پڑتی ہیں۔ صرف دو کتابیں میری نظر سے ایسی گزری ہیں جن میں اس کے متعلق کسی قدر لکھا گیا ہے۔ ایک سراج التواریخ جو نواب غلام غوث خاں مرحوم کے حسب الحکم مرتب ہوئی لیکن افسوس ہے کہ اس کا مکمل نسخہ دستیاب نہیں ہوتا صرف ایک خام مسودہ نظر سے گذرا ہے (موجود نزد جناب مفتی محمد سعید خاں صاحب مرحوم) دوسرے مولوی نجم الدین صاحب مرحوم کی خاندانی تاریخ جیسا پہلے ذکر ہوچکا ہے۔ ان دونوں کتابوں سے جس قدر سوادمل سکا وہ قلم بند کیا جاتا ہے۔ ماپلے ملیبار کے مسلمان ہیں وجہ تسمیہ میں مختلف اقوال ہیں لیکن کوئی صحیح قول معلوم نہیں ہوا چولئے بقول سراج التواریخ وہ مسلمان ہیں جو چولامنڈل میں بسے۔ چولامنڈل چولاراج کی عملداری سے جس میں ترناولی، مدھرہ، تنجاور شامل ہیں جو کایل میں بسے وہ کایلان کے نام سے مشہور ہوئے۔ لبے جن کی شہرت کل تجارتی دنیا میں چھپی ہوئی نہیں ہے ان کی وجہ تسمیہ سراج التواریخ میں یہ بیان کی گئی ہے کہ چونکہ یہ لوگ

ل۔ تحفۃ المجاہدین میں صراحتاً مذکور ہے کہ ہندو راجہ مسلمانوں کے ساتھ نہایت عمدہ برتاؤ کرتے تھے۔ اور مسلمان بھی ہندوؤں کے ساتھ کسی قسم کی برائی نہ کرتے تھے مسلمانوں کی وجہ سے ملک میں تجارت اور تمول کی ترقی ہوئی دعوت اسلام ابن بطوطہ اور عجائب الہند سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے جیسے اُوپر درج کیا گیا ہے۔

لبیک لبیک بکثرت استعمال کرتے تھے لہذا اسی لفظ سے ان کی شہرت ہوگئی جو کثرت استعمال سے لبّہ ہوگیا۔ جبکہ اس امر پر غور کیا جائے کہ اب بھی ان قابل عزت سماعتوں میں لبیک کا لفظ بکثرت استعمال کیا جاتا ہے تو بلحاظ اصول علم الالسنہ یہ وجہ تسمیہ بعید نہیں بلکہ قرین قیاس ہے۔ یہ قبائل ان مسلمانان ہند سے جو مابعد زمانہ میں براہ خشکی ہندوستان میں داخل ہوئے بالکل متمائز ہیں۔ عموماً شافعی ہیں۔ ان کی تجارت مشہور عالم ہے سرسری نظر سے بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ ان قبائل کی زبان (عرب نائطی وغیرہ) بہترین عادات لباس۔ وضع قطع چال ڈھال وغیرہ میں کسی قدر عربی شان ہے۔ یورپ کے تجار اور تجارتی طاقتوں نے ان کی تجارت پر بھی اپنا مہیب اثر ڈالا اور ان کی پہلی عظمت باقی نہ رہی۔

نوائتیہ

نوائتیہ کے متعلق بہ نسبت دوسرے قبائل کے زیادہ مواد دستیاب ہوتا ہے اور تاریخی مذاق رکھنے والوں کے پاس یہ امر بہت قابل قدر ہے کہ عزیز جنگ بہادر نے اردو زبان میں سب سے پہلے تاریخ النوایط لکھ کر اس قبیلہ کی تاریخ روشنی میں لانے کی کوشش کی ہے۔ یہاں ہم کو ان کی قومی تاریخ سے قطع نظر صرف عام تاریخ سے بحث ہے سب سے اوّل غور طلب یہ ہے کہ صحیح املا ط سے ہے یا ت سے۔ ط کا املا لکھنے والوں کی بنیاد قبیلہ کے جدا علی کے لقب پر بیان کی جاتی ہے۔ یہ املا جہانتک تحقیقات سے پتہ چلتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ بارھویں صدی ہجری سے رائج ہوا ہے (مثلاً مولوی محمد باقر آگاہ کی تحریر النفحۃ العنبریہ میں) اور جویائے حقیقت کو یہ تسلیم کرنے کے بغیر چارہ نہیں کہ جن روایتوں پر اسکی بنا قرار دی گئی ہے وہ بالکل معرض تزلزل میں ہیں۔ اور ایسی متزلزل روایات کی بناء پر مختلف تفریعین (جیسی کہ تاریخ النوایط میں کی گئی ہیں) صحیح نہیں قرار دیجاسکتیں۔ پس اس حالت میں اسکے سوا چارہ نہیں کہ ت کا املا بھی درست قرار دیا جائے۔ سب سے پرانی کتاب جس میں اس قوم کا ذکر آیا ہے یعنے فرشتہ اس میں ت سے ہی لکھا گیا ہے فرشتہ نے ہر جگہ یہی املا لکھا ہے۔ قاضی عبدالنبی احمد نگری (کتاب جامع العلوم) اور آزاد بلگرامی وغیرہ کی تحریروں میں بھی یہی املا درج ہے لیکن فرشتہ نے نوائتہ کا معنی جو خداوند بیان کئے ہیں وہ حقیقی نہیں سمجھے جاسکتے بلکہ میرے خیال میں اسکے اصل معنی وہی ہیں جو عموماً لغت کی کتابوں میں بیان کئے گئے ہیں ملاح وجہازران کو نوتی کہتے ہیں اسی کی

جمع نوتی (۱۴) ۔ نوتیہ ہے اور نواتیہ (ن) بھی غلطی سے زبان زد ہے ۔ بلحاظ اس قدر مستند تحقیقات تاریخی کے جو ساحل ہندوستان پر مسلمانوں کے ورود و توطن کے متعلق اس وقت تک قلم بند کی گئی ہے ۔ یہ صاف نظر آتا ہے کہ نو وارد جہازوں پر آنے والے معزز عربوں کا بھی نوتیہ کے لقب سے مشہور ہونا ناقابل تعجب نہ تھا جو آخر چلکر کثرت استعمال اور ہندی لہجہ میں نوایہ ہو گیا ۔ یہ ایک جداگانہ نسبی بحث ہے کہ ان نواتیہ میں بعض سادات بعض بنی ہاشم بعض قریشی سے ہوں ۔ فرشتہ نے علاء الدین خلجی کے عہد کے ناموروں کے بیان میں تصریح کی ہے کہ " دیگر از سادات کہتیل سید مغیث الدین و برادر او سید نجیب الدین کہ ایشان سادات نوتیہ می گفتند "

لیکن اصل کتاب تاریخ فیروز شاہی ضیاء برنی جس سے فرشتہ نے یہ اقتبا کیا ہے اس میں نوحتہ لکھا ہے

(تاریخ فیروز شاہی طبع کلکتہ مصححہ سید احمد خاں)

تعلیقات

از جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب
استاذ قانون جامعہ عثمانیہ

(۱) مضمون کا آغاز لیوں کے ایک اقتباس سے ہوا ہے جو اصل فرانسیسی کتاب کے صفحہ ۵۹۹ تا ۶۰۰ پر موجود ہے ۔ اس میں کوئی حوالہ نہیں ہے کہ قدیم تر زمانے میں ہندیوں کا عرب جانا قابل قبول ہے اور کیوں عربوں کا ہند آنا نہیں ۔ مسقط و عمان اور سندھ و بلوچستان میں اتنی جغرافی قربت ہے کہ عربوں کا وہاں نہ جانا حیرت کی بات ہوگی عربوں کا اپنے مرز بوم کی صحرائی اور غیر زرخیز حالت کے باعث کچھ نہیں تو چار ہزار سال قبل مسیح سے ترک وطن کے سیلاب برپا کیا کرنا مسلم ہے (عنایت اللہ جیوگرافکل فیاکٹرس ان عربین لائف ۱۹۴۲ء صفحہ ۲۶) زمانہ قدیم کی سب سے بڑی سمندری قوم فنیقی یا کنعانی ، انہیں مہاجر عربوں پر مشتمل تھی ۔ عرب اپنے روزگار کے لئے زراعت و حرفت سے محروم ہونے کے باعث محض تجارت پر تکیہ کرنے پر مجبور تھے ۔ بخنت اور پیٹ بھرے ہندی کو کیا پڑی تھی کہ تجارت کے لئے عرب جیسے خشک اور مفلس ملک ہی کو جائے ۔ ہندیوں کو تجارتی بحری سفر کا شوق رہا ہو تو علمی حلقوں میں ابھی تک درخور التفات نہیں سمجھا گیا ہے ۔ عہد نبوی میں یمن و عمان ہی نہیں ، حجاز کی عربی زبان بھی

م ۔ قاموس تاج العروس ۔ محیط المحیط جلد دوم طبع بیروت ۔ ن ۔ شفاء العلیل ۔ للشہاب الخفاجی صفحہ ۲۲۹ طبع مصر ۔

بحریات کی اصطلاحوں سے اتنی مالا مال ہے کہ وہ کسی طویل بحری روایات کے پس منظر کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی۔ قرآن مجید میں سمندری سفر اور بحری تجارت کا جو کثیر اور دقیقہ رس ذکر ہے، اس کے اوّلین مخاطب حجازی عرب ہی تھے۔ اگر "رحلۃ الشتاء والصیف" پر دار و مدار معشیت رکھنے والے بحری تجارت سے ناآشنائے محض رہے ہوتے تو قرآن مجید کا شد و مد سے اور بار بار بحری سفر کی نعمتیں یاد دلا کر خالق بحر کی طرف بلانا بے اثر ہوتا۔ عہد نبوی کی اور خود زمانہ جاہلیت کی کئی دستاویزوں میں "ما بلّ بحرٌ صوفۃً" کا بحری محاورہ تقریباً تکیہ کلام کے طور پر برتا جاتا نظر آتا ہے۔ قرآن مجید کی مزید اصطلاح "لتذھب الحکم" بھی بادبانوں سے متعلق اصطلاح سمجھی جاتی تھی۔ (ان دونوں محاروں کی تشریح کے لئے دیکھئے میری "الوثائق السیاسیہ حصہ غریب اللغات")

"عرب و ہند کے تعلقات" کے صفحہ پر مولانا سلیمان ندوی نے لکھا ہے "عرب تاجر ہزاروں برس پہلے سے ہندوستان کے ساحل تک آتے تھے اور یہاں کے بیوپار اور پیداوار کو مصر اور شام کے ذریعہ یورپ تک پہنچاتے تھے اور وہاں کے سامان کو ہندوستان، جزائر ہند، چین اور جاپان تک لے جاتے تھے"۔ مگر کوئی حوالہ نہیں دیا گیا ہے۔ اسی کے صفحہ ۱۱۱ کا یہ اقتباس بھی دلچسپی سے پڑھا جائیگا کہ "ستیارتھ پرکاش کے مصنف سوامی دیانند جی نے گیارہویں سمولاس (پہلا پر واد ھیایہ ۱۷۷) میں لکھا ہے کہ: مہابھارت میں جب کوروں نے لاکھ کا گھر بنا کر پانڈوؤں کو اس کے اندر جلا کر پھونک دینا چاہا تو ودرجی نے یدھشٹر کو عربی زبان میں بتایا اور یدھشٹر جی نے اسی عربی زبان میں ان کو جواب دیا"

سردار کے ام پانکر کی تالیف "ملیبار اینڈ دی پورچگیزز" (۱۹۲۹ء) صفحہ ۱ و ما بعد میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ ہندوستان کی بحری تجارت "زیادہ تر مصریوں اور ایشیائی یونانیوں" کے ہاتھ میں تھی۔ ملیبار میں قدیم رومی سکے بڑی کثرت سے دستیاب ہوئے ہیں اور جیسا کہ بلاذری نے لکھا ہے عرب چونکہ خود اپنے سکے نہیں رکھتے تھے اس لئے وہ رومی اور ایرانی سکوں ہی سے کاروبار چلاتے تھے۔ صفحہ ۹ پر پانکر نے یہ بھی لکھا ہے کہ "عرب، مصر اور مغرب سے اس قریبی تعلق ہی کے باعث ملیبار میں یہودی اور سینٹ ٹامس کے فرقے کے عیسائی آئے" یونانی اور رومی جغرافیہ نویسوں وغیرہ کے بیان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کو جہاز جاتے تھے نہ کہ ہندوستان سے جہاز آتے ہوں۔ دے ورٹے کی فرانسیسی تالیف "عرب" صفحہ ۴ میں بھی یہی لکھا کہ عرب اپنے ملک کی صحرائی کیفیت کے باعث

غلّہ وغیرہ حاصل کرنے ہند اور دیگر ممالک کو جایا کرتے تھے اور اس بارے میں توریت سے بھی استدلال کیا ہے (حزقیل ۲۷/۱۵)

غرض بحر احمر اور خلیج فارس اور بحر عرب کی بندرگاہوں سے جہازوں کا جانا بعثت نبوی سے بہت قریب نہیں بلکہ سینکڑوں ہزاروں برس سے جاری معلوم ہوتا ہے۔

(۲) تحفۃ المجاہدین مطبوعہ لزبن صـ۲۱ کی اصل عربی عبارت کا ترجمہ یہ ہے :-

"حصہ دوم اسلام کا ملیبار میں شروع ہونا۔ وہ یہ کہ یہودیوں اور عیسائیوں کی ایک جماعت ملیبار کے ایک شہر میں آئی جسے کڈنگلور کہتے ہیں۔ یہ وہاں کے بادشاہ کے رہنے کی جگہ ہے۔ یہ لوگ ایک بڑے جہاز میں اپنے عیال و اطفال کے ساتھ آئے اور اس (بادشاہ) سے زمینیں اور باغ اور گھر مانگے اور وہیں بس گئے۔ اس کے برسوں بعد وہاں مسلمان فقیروں کی ایک جماعت آئی جن کے ساتھ ایک شیخ بھی تھا۔ یہ لوگ ہمارے باپ آدم علیہ السلام کے قدم کی زیارت کے قصد سے نکلے تھے۔"

پانکرنے (ملیبار اور پرتگالی صـ۶) لکھا ہے کہ "یہودیوں اور عیسائیوں کی آمد کا ٹھیک وقت ہمیں معین طور سے معلوم نہیں۔ اس کی شہادت موجود ہے کہ وہ ساتویں صدی عیسوی میں ملیبار میں پھل پھول رہے تھے۔" بظاہر یہ اسلام کی آمد سے ایک آدھ نسل سے زیادہ قدیم نہیں۔

(۳) کولم (Coveleng) مدراس کے جنوب میں ساحل پر کوئی چالیس میل پر ایک چھوٹی سی بستی ہے جہاں ایک پرتگالی قلعے کے کھنڈر بھی تا حال پائے جاتے ہیں۔ محمود بندر ایس آئی ریلوے پر ایک اسٹیشن ہے جو پونڈی چری اور کڈلور جنکشن کے جنوب میں پرنگی پیٹ جنکشن سے ریل پر پورے (۱۱۰) میل پر واقع ہے۔ انگریزی میں اسے پرتگالی نام سے پورٹو نووو (نئی بندرگاہ) (Porto Novo) کہتے ہیں اور تامل زبان میں اسے پرنگی پیٹ (فرنگی پیٹ) جیسا کہ اسٹیشن پر نام کا تختہ بتاتا ہے۔ حضرت عکاشہ رضؓ کو مقامی مسلمان ہرکاس کہتے ہیں۔ مگر وہاں کتبے نہیں ہیں اور موجودہ مقبرہ سو پچاس سال سے زیادہ پرانا نہیں معلوم ہوتا۔ اسی محمود بندر میں علاوہ حضرت عکاشہ رضؓ کے مزار کے میں نے منصور حلاج کا مزار بھی ۱۹۳۷ء میں دیکھا تھا حالانکہ منصور حلاج کی لاش کو جلا کر بغداد میں دریائے دجلہ کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ نواب بہادر یار جنگ کے سفرنامے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ناموں کے صحابہ کے مزار انہوں نے افغانستان میں بھی دیکھے تھے۔

(۴) بروم ہال نے انگریزی میں "اسلام چین میں" کے نام سے جو تاریخ لکھی ہے، اس کے صفحہ ۶۶ پر چین کی ایک مقامی روایت کا ذکر ہے کہ شہنشاہ چین نے اپنے اسلام کے اظہار کے لئے ایک سفیر مدینہ روانہ کیا تھا۔ اور اسی کتاب میں صفحہ ۸۳ تا ۱۲۰ پر تفصیل سے اس مسئلے پر بحث ہے کہ جناب رسالت مآب نے اپنے ایک قریبی رشتہ دار نیز حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو چین روانہ کیا تاکہ سنگان فو میں ایک مسجد تعمیر کریں۔ یہ مسجد اب بھی موجود ہے اور کینٹن میں مقبرہ بھی ہے۔ اُن کے کتبوں کے حالات غالباً اردو دانوں کے لئے نئے ہونگے اس لئے کسی قدر تفصیل سے خلاصہ بیان کیا جاتا ہے۔

چین کی اسلامی یادگاروں میں ۱۲۵ھ / ۷۴۲ء کا کتبہ جو شہر سیان فو میں ہے، سب سے پُرانی چیز ہے۔ اس کا ذکر خانوادہ منگ کے سرکاری "عظیم الشان جغرافیا" میں بھی ہے اور کینٹن کے اسلامی کتبوں میں بھی لیکن یہ دونوں قسم کے بیانات سیان فو کے خود اصل کتبے پر مبنی ہیں اس لئے کوئی تائیدی شہادت کی حیثیت نہیں رکھتے۔ یہ کتبہ چینی زبان میں سیان فو شنسی کی سب سے قدیم مسجد میں ہے۔ اس کا حجر، چار فٹ آٹھ انچ لمبا اور دو فٹ ساڑھے تین انچ چوڑا ہے اور اس پر جو چینی تاریخ ہے وہ ۷۴۲ء کے مطابق ہے۔ علاوہ عنوان کے اس میں اکیس کھڑی سطریں اور ہر سطر میں کوئی تیس لفظ ہیں۔ اس کا ترجمہ یہ ہے:-

"پہلی مسجد بنانے کی یادگار

"یادگاری کتبہ جو پہلی مسجد بنائی جانے کے متعلق ہے
اسے حکیم القانون وانگ کنگ معتمد مجلس مال و احتساب نے لکھا ہے"

"جو چیز شک و شبہ کئے بغیر سو نسلوں تک مانی جاتی رہی ہے اور وہی صداقت ہے۔

(انسان کو) جس ذریعے سے یقین حاصل ہوتا ہے وہ دل ہے۔ تمام عقلمندوں کا دل ایک ہوتا ہے اور صداقت بھی ایک ہی ہوتی ہے۔ اسی لئے ان میں سے ایک کی بات سے دوسرے کو یقین حاصل ہو جاتا ہے اور شبہے کی گنجائش نہیں رہتی چاہے (دونوں میں) سو نسلوں کا فصل ہی کیوں نہ ہو۔

"دنیا کے تمام حصوں میں عقلمند پیدا ہوتے ہیں جو اسی وحدت دل اور صداقت کے حامل ہوتے ہیں۔ مغرب کے بڑے عقلمند (حضرت) محمدؐ نے عرب میں، چین کے عقلمند کنفوشس کے بہت بعد زندگی گذاری

اگرچہ ان میں باہم نسلوں اور صدیوں کا فصل تھا لیکن ان دونوں کی تعلیمات یکساں ہیں کیوں؟ اس لئے کہ وہ ایک ہی دل اور صداقت کے مالک تھے مثل مشہور ہے کہ ہزاروں عقلا ہوں بھی تو ان کا دل ایک ہوتا ہے اور دس ہزار قرن بھی گزر جائیں تو ایک ہی صداقت برا جتی ہے۔

"اگرچہ اس بڑے مغربی عقلمند (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کو گزرے ہوئے نسلیں ہوگئیں لیکن قرآن اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ مافوق الفطرت حکمت لے کر پیدا ہوئے تھے۔ آپ پیدائش اور ترقی عالم کے قوانین سے واقف تھے۔ آپ نے زندگی اور موت کا ذکر کیا ہے۔ آپ کی تعلیم میں یہ امور بھی تھے کہ نہا کر پاکی حاصل کرو، روزے رکھ کر جذبات پر قابو حاصل کرو، تربیت نفس کے لئے ضروری ہے کہ اپنی خامیوں کو دور کرو، دوسروں کو یقین دلانے کیلئے صداقت اور دیانت کے حامل بنو، شادیوں اور جنازوں میں شرکت کرو۔ اہم ترین اخلاقیاتی مسائل سے لے کر روز مرہ زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل تک میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو معقولیت کی حامل نہ ہو یا جس کے متعلق آپ نے احکام نہ دئیے ہوں اور ان میں ہمیشہ خدا کے احترام کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ اگرچہ آپ کی تعلیمات کی تفصیل دراز ہے لیکن ان سب کا منشا صرف ایک چیز کو حاصل کرنا ہے یعنے خلاق عالم خدا کی عزت کی جائے۔

"شہنشاہ یاؤ نے کہا تھا کہ آسمان کی عزت کرو۔ شہنشاہ ٹمنگ نے کہا تھا کہ "عزت ملحوظ رکھنے سے روز اپنی اصلاح ہوسکتی ہے"۔ شہنشاہ وین وانگ نے کہا تھا کہ "خدا کی عبادت کرو"۔ کنفوشس نے کہا تھا کہ "جو آسمان کے خلاف گناہ کا ارتکاب کرے اسے عبادت کام نہیں دیتی"۔ یہ تمام کہاوتیں عملاً ایک ہی چیز ہیں۔ ظاہر ہوتا ہے کہ ان سب کو ایک ہی چیز پر یقین اور ایمان تھا۔

"تعلیمات مقدسہ (محمدیہ) صرف مغرب میں پھیلیں اور چین میں خانوادہ سوی کے حکمران کائی ہوانگ (۵۸۱ تا ۶۱۰ء)[۱] کے زمانے تک پہنچ نہ سکی۔ لیکن تب سے وہ برابر چین میں رفتہ رفتہ ہر طرف پھیل رہی ہے۔ "جلالت مآب شہنشاہ تیئن پاؤ نے یہ دیکھا کہ اس بڑے عقلمند کی تعلیم خود ہمارے یہاں کے عقلا کی

---

[۱] یہ نہ بھلایا جائے کہ جناب رسالت کی ولادت ہی ۵۷۰ء میں ہوئی تھی اور نبوت ۶۱۰ء میں حاصل ہوئی۔

تعلیم کے مطابق ہے کیونکہ وہ سب ہی راہ راست میں ہیں۔ اسی لئے اس (شہنشاہ) نے توئیں جوکو
جو تعمیرات عامہ کا مہتمم تھا حکم دیا کہ اس مسجد کی تعمیر کا بیڑا اٹھائے تاکہ اس مذہب کے پیروؤں اور
ان کے سرگروہ پاتا ایرتی کے لئے سہولت حاصل ہو۔ یہ سرگروہ اپنے مذہب کے امہات کتب کا
خوب واقف ہے اور بطور سرگروہ کے اس میں یہ صلاحیت ہے کہ مقدس مذہب کی باقاعدہ عبادت
کی امامت کرے اور شہنشاہ کی درازیٔ عمر کے لئے دعا کرتا رہے۔

" اس عمارت کی تعمیر تینین یاؤ کے سنہ جلوس کے پہلے سال کے تیسرے چاند (مہینے) (۷۴۲ء)
میں شروع ہوئی اور اسی سال آٹھویں چاند کی بیسویں کو مکمل ہوگئی۔

" یہ واقعہ آئندہ نسلوں میں بھلایا نہ جانے کے لئے یہ یادداشت ایک کتبے میں کندہ کرائی گئی ہے۔

" المرقوم: موسم خزاں کا خوش نصیب دن، تینین یاؤ کا پہلا سنہ جلوس۔
" یہ پتھر ... میں بمقام کوان چنگ[۵] تراشا گیا "

جیسا کہ کتبے سے ادعا ہوتا ہے، اسلام چین میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی بننے سے بھی پہلے آگیا تھا۔ مزید یہ کہ "مسجد" کے لئے اور "عرب" کے لئے جو الفاظ اس کتبے میں برتے گئے ہیں وہ کتبے کی تاریخ سے چھے سو سال بعد مروج ہوئے۔ کتبے کے عہد میں دوسرے الفاظ پائے جاتے تھے۔ اس میں کسی کے عرب سے بطور سفیر و مبلغ آنے کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے۔ چین کے مورخ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس مسجد کا نام تین وقت بدلا اور کتبے میں جو نام ہے وہ پہلا نہیں بلکہ تیسرا یعنی اس وقت کا ہے جب سنہ ۷۱۵ھ / ۱۳۱۵ء میں اس مسجد کی مرمت عمل میں لائی گئی تھی۔
رسول کریم کی ولادت سنہ ۵۷۰ء میں، بعثت سنہ ۶۱۰ء میں اور ہجرت سنہ ۶۲۲ء میں ہوئی تھی لیکن چینی مورخ اپنے حکمرانوں کے سنہ ہائے جلوس کے حوالے سے ان امور کی تاریخ بیان کرتے ہیں، اس کے مطابق ولادت سنہ ۵۴۶ء میں، بعثت سنہ ۵۸۶ء میں اور ہجرت سنہ ۵۹۹ء میں ہو جاتی ہے۔ گویا پورے چوبیس سال کا فرق پڑ کر واقعات قبل از ہو جاتے ہیں۔

بے شبہہ اگر ولادت باسعادت واقعی چوبیس سال پہلے ہوئی ہوتی تو کتبے میں اسلام کی آمد جو ۶۵۱ء سے

۵۔ یہ شہر سیان فو کا نام ہے جو تسی این خاندان کے زمانہ میں مروج تھا اور تاریخ کتبہ سے دو ڈھائی سو سال بعد دیا گیا تھا۔

کچھ پہلے ہوئی بیان کی گئی ہے وہ کم وبیش قیصر وکسریٰ کے نام تبلیغی خطوط کی ترسیل یعنی سنہ ۶ھ کے مطابق ہو جاتی ہے۔
اس کی وجہ سمجھنی کچھ زیادہ دشوار نہیں؛ اور اتفاق سے ہمارا ماخذ یعنی بروم ہال بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہے۔ اصل میں چین میں بھی قمری کبیسہ سال کا رواج ہے اور عموماً ہر تیسرے سال ایک مہینے کا اسی طرح اضافہ کرلیا جاتا ہے جس طرح عرب میں زمانۂ جاہلیت میں رواج تھا۔ (اس کے متعلق تفصیلی معلومات' اور سیرت نبویہ پر اس کے اثرات کے لئے جولائی سنہ ۱۹۴۲ء کے رسالہ معارف اعظم گڈھ میں مضمون "عہد نبوی کے عربی ایرانی تعلقات" ملاحظہ ہوسکتا ہے) اگر کوئی شخص خالص قمری اور کبیسہ قمری سال کا فرق نہ جانتا ہو' جیسا کہ خود بعض عربی مولفوں مثل واقدی وغیرہ کے ہاں نظر آتا ہے' تو چوبیس سال کا فرق آٹھ سو سال کے عرصہ میں پیدا ہو جاتا ہے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ سیان فو کے کتبے پر جو تاریخ ہے وہ آٹھ سو سال بعد کندہ ہوئی۔ اس زمانے کے مورخوں نے دیکھا کہ سنہ ھ پر اب چونکہ آٹھ نو سو قمری سال گزر چکے ہیں اسلئے چین کے قمری کبیسہ آٹھ نو سو سال پہلے کے حکمران کا نام معلوم کیا اور اپنے زمانے میں جو روایات مروج تھے کہ اسلام سنہ ۶ھ میں چین میں آیا اور اس مسجد کی تعمیر سنہ ۱۲۵ھ میں ہوئی تو اس کا کتبہ حقیقت میں سنہ ۲۵ھ میں کندہ نہیں کرایا گیا بلکہ اس کے پورے آٹھ سو سال بعد۔

اگر اسلام کی سنہ ۶ھ میں چین پہنچنے کی کوئی اور تائیدی شہادت حاصل ہو جائے۔ جو تا حال حاصل نہیں ہوئی ہے۔ تو تقویمیات سے نابلد چینی مسلمان مورخوں کی اس غلطی کو ہم آسانی سے نظر انداز کرسکتے ہیں[1]۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ چین میں اسلام کی سنہ ۶ھ میں آمد کا ذکر عرب کے سیرت نگاران نبوی کے ہاں

---

[1] خاص کر اس لئے کہ بروم ہال (صفحہ ۷) میں شہر کینٹن کے ایک کتبے کا ذکر ہے کہ:-

"چند لوگ ادعا کرتے ہیں کہ قدیم عقلمند (یعنی آنحضرت کا سفیر) سمندری راستے سے تنگ خانوادے کے دور حکومت (یعنی سنہ ۲ ق ھ تا سنہ ۲۸۱ھ) میں تجارت کے لئے آیا۔ لیکن یہ غلط ہے۔ وہ حقیقتاً چین کو سوئی خانوادے کے زمانے میں (یعنی سنہ ۱۱ ولادت نبوی تا سنہ ۵ ق ھ) آیا تھا"

جس چیز کو جھٹلایا گیا ہے وہ کبیسہ سال کے فرق سے چند واقفوں کا معلوم ہوتا ہے جسے بھولے بھالے لوگ سمجھ نہ سکے اور خیال کیا کہ اس طرح سفیر کی آمد بجائے سنہ ۶ھ کے سنہ ۳۰ھ حضرت عثمان کی خلافت میں ہو جائے گی۔

بالکل نہیں اور ہمارے معلومات کا واحد ماخذ یہی چینی دعوے ہیں اور ان کے دعوے کا واحد ثبوت مذکورہ بالا کتبہ ہے جس کی ماہیت ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ گیارھویں صدی ہجری کا ہے۔

اب ہم رسول کریم کے ماموں کی چین میں آمد اور وہیں ان کی وفات و مزار کا ذکر کرینگے۔ شہر کینٹن کی ایک نہایت قدیم مسجد کے متعلق روایت چلی آرہی ہے کہ ابتداءً اسے سعد وقاص یعنی حضرت سعد بن ابی وقاص نے تعمیر کیا اور قریب ہی ان کا مزار بھی تاحال موجود ہے۔

چینی مسلمانوں میں سب سے مستند سیرت النبی نان کنگ کے ایک عالم لیوچی کی ہے۔ ان مولف کا نام کیٹی لیین بھی ہوتا ہے۔ یہ سنہ ۱۱۳۳ھ (۱۷۲۱ء) میں لکھی گئی اور بعد میں دس جلدوں میں شائع ہوئی۔ اس میں آغاز اسلام کے متعلق لکھا ہے کہ چین کے بادشاہ نے ایک ڈراونا خواب دیکھا کہ اس کے محل میں بھوت گھس آئے ہیں پھر ایک عمامہ پوش شخص آکر اپنے ہاتھ میں کی ایک کتاب تلاوت کرنے لگا تو بھوت گڑگڑانے لگے مگر تلاوت جاری رہی تو تھوڑی دیر میں وہ خاک کا تودہ ہوگئے۔ تعبیر یہ کی گئی کہ چین پر مصیبت آنیوالی ہے اور اس کا علاج یہی ہے کہ اس عمامہ پوش سے مدد لی جائے۔ مشورے پر یہ طے ہوا کہ ایک چینی سفیر مکہ معظمہ بھیجا جائے۔ جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "سعد وقاص" کو تین دیگر ہمراہیوں کے ساتھ بھیجا۔ سعد نے شہنشاہ کی اجازت سے کینٹن میں وہ مسجد تعمیر کی جو اب تک "مسجد ذکری" کے نام سے موجود ہے۔

چند دن کے بعد وہ حجاز واپس ہوئے اور کوئی بیس سال بعد تازہ دم نازل شدہ قرآن کی نقل ساتھ لے کر مکرر چین آئے اور آنحضرتؐ کے حکم سے چین ہی میں متوطن ہوگئے اور اسی سال جناب رسالت کی مدینۂ منورہ میں وفات ہوگئی۔

قبل اس کے کہ اس روایت کی تنقید کی جائے، دو امور قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو یہ کہ لیوچی کا تذکرہ "سعد وقاص" چین کی جس قدیم ترین تالیف میں ملتا ہے وہ خانوادۂ منگ کا عظیم الشان جغرافیہ ہے جو سنہ ۷۷۱ھ (۱۳۷۰ء) میں مرتب ہونا شروع ہوا اور سنہ ۸۶۶ھ (۱۴۶۱ء) میں شائع ہوا۔ اس میں شہر مدینہ کے حالات پر بھی ایک باب ہے اور اس میں لکھا ہے کہ "سعد وقاص صحابی کی چین میں آمد خانوادۂ سوی کے حکمران کائی ہوانگ کے زمانے میں (یعنی سنہ ۵۸۱ء [۱۱ ولادت نبوی] تا سنہ ۶۰۰ء [۳۰ ولادت نبوی] کے مابین یعنی قبل بعثت نبوی) ہوئی۔" دوسری

قابلِ ذکر چیز یہ ہے کہ چینی رسم الخط کے باعث جن شخص کے بطور سفیر و مبلغ چین آنے کا ذکر کیا گیا ہے ان کا نام مختلف کتبوں اور کتابوں میں بدلا ہوا ہے اور وہب ابی کبشہ، وکاسہ (وقاص) وانگ کا سے، سعد ابو وقاص: وانگ کے چی، وانگ کوسی، کوسن، سہابہ (صحابی)، ساہوتی سرتی سرتا وغیرہ وغیرہ پڑھے جاتے ہیں۔

سنہ کی پیچیدگی کو ہم اوپر حل کر چکے ہیں۔ محض وہ اس روایت کے بنیادی امور کو غلط قرار دینے کے لئے کافی نہیں۔ اب رہا نام، سعد بن ابی وقاص اور وھب ابوکبشہ دو قابلِ غور ہیں۔ چینی مسلمان اسے عام طور پر حضرت سعد کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ابن عبد البر کی الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب ۲۲۱ میں لکھا ہے کہ آنحضرت ان کو اپنا ماموں کہا کرتے تھے۔ یہ فاتح ایران تھے۔ ان کی وفات ۵۵ھ میں مدینۂ منورہ میں ہوئی اور وہیں دفن کئے گئے۔ ان کا چین جانا ثابت نہیں۔

ابوکبشہ جن لوگوں کی کنیت تھی ان میں آنحضرت کے نانا وہب بھی شامل ہیں؛ ورا ستیعاب ۶۸۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہب بن الاسود نامی ایک صحابی آنحضرت کے ماموں زاد بھائی گذرے ہیں جن کے مزید حالات معلوم نہیں۔ وہب ابوکبشہ نامی کسی صحابی سے۔ جو چینی روایت کے مطابق آنحضرت کے ماموں تھے۔ میں باوجود تلاش واقف نہ ہو سکا۔

حضرت صحابی مذکور کا جو مقبرہ کینٹن میں ہے اس کا فوٹو بھی بروم ہال کی کتاب میں ہے اسے چینی طرز تعمیر سے دور کا بھی تعلق نہیں وہ خالص عربی یا کم از کم عراقی ایرانی وضع کا گنبد ہے کینٹن کی مسجد ذکری میں ایک منارہ بھی اذاں کیلئے ہے جو خالص غیر چینی نمونے کا ہے۔ میری حقیر، ناچیز رائے میں یہ خلافت عباسیہ کے زمانے کی چیزیں ہیں۔ اس مقبرے میں کوئی پرانا کتبہ نہیں ہے۔

(۵) یہ عبارت لیوں کی اصل فرانسیسی کتاب میں صفحہ ۱۰ پر ہے اور وہ وہاں یوں ہے "اپنی سلطنت کے اچھی طرح مستحکم ہوتے ہی انہوں نے اپنے تجارتی تعلقات کو قابلِ لحاظ وسعت دی اور ہم انہیں دیکھتے ہیں کہ وہ جلدی ہی ....." خط کشیدہ لفظ اصل اور تمدن عرب کے فرق کو ظاہر کریگا۔

(۶) بزرگ بن شہریار الرامہرمزی نے ۳۴۲ھ کے کچھ ہی بعد اپنی کتاب تالیف کی۔ یہ ناخداؤں اور ملاحوں کی داستانوں پر مشتمل ہے اور ۲۸۸ھ تا ۳۴۲ھ تک کے تذکرے اس میں ملتے ہیں۔ اس میں ص۲ تا ۴ پر کسی ہندی زبان (غالباً سندھی) میں قرآن مجید کے ترجمے اور تفسیر کا ذکر ہے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے فارسی ترجمۂ سورۂ فاتحہ کے بعد (جس کا ذکر مبسوط سرخسی جلد ۱ ص ۳۷ میں ہے) غالباً یہ پہلا مکمل ترجمہ تھا۔ اس ذکر کا ترجمہ یہاں بے محل نہ ہوگا۔

"ہندوستانی واقعات کے متعلق ہم سے ابو محمد الحسن بن عمرو بن حمویہ بن حرام بن حمویہ النجیرمی نے بصرے میں بیان کیا کہ میں ۲۸۸ھ میں منصورہ (سندھ کا اسلامی پائے تخت) گیا ہوا تھا۔ وہاں بعض معتبر شیوخ نے مجھ سے کہا کہ علاقہ رَا کے راجا نے جو ہندی راجاؤں میں سب سے طاقتور ہے اور جس کی عملداری بالائی قشمیر (کشمیر) اور نشیبی قشمیر (پنجاب) کے مابین ہے اور جس کا نام مہروک (؟ مہراج) بن رائق ہے ۲۷۰ھ میں منصورہ کے حاکم عبداللہ بن عمرو بن عبدالعزیز کو ایک خط لکھا کہ شریعت اسلامی کی ہندی زبان میں تشریح کا اس کے لئے انتظام کیا جائے۔ حاکم منصورہ عبداللہ نے منصورہ ہی کے ایک آدمی کو بلا بھیجا جو عراقی الاصل اور تیز فہم اور سمجھ دار اور شاعر تھا اور جس کی پرورش ہندی ممالک میں ہوئی تھی اور وہ وہاں کی مختلف زبانوں سے واقف تھا۔ حاکم مذکور نے اس سے رَا کے راجہ کی استدعا بیان کی۔ اس نے ایک نظم لکھی جس میں تمام مطلوبہ چیزوں کا ذکر تھا اور وہی راجہ کے پاس بھیج دی گئی۔ جب وہ راجہ کو سنائی گئی تو اس نے اسے بہت پسند کیا اور حاکم منصورہ سے مراسلت کی کہ اس نظم نویس کو اس کے پاس بھیج دیا جائے۔ وہ وہاں گیا اور تین سال مقیم رہ کر واپس آیا۔ واپسی پر حاکم منصورہ نے اس سے رَا کے راجہ کے حالات پوچھے جو اس نے تفصیل سے بیان کئے اور کہا کہ جب میں وہاں سے چلا ہوں تو اس نے دل اور زبان دونوں سے اسلام کو قبول کر لیا تھا البتہ حکومت اور ریاست ہاتھ سے چلے جانے کے خوف سے اس کا علانیہ اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ علاوہ اور واقعات کے

راجا نے مجھ سے فرمائش کی کہ اسے قرآن مجید کی تفسیر ہندی زبان میں سناؤں اور میں نے ایسا ہی کیا۔ اور جب سورۂ یٰس کی اس آیت پر پہنچا کہ: "اس نے کہا کہ کون ہے جو بوسیدہ ہو چکنے والی ہڈیوں کو زندہ کریگا؟ کہہ کہ ان کو وہی زندہ کریگا جس نے ان کو پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا اور وہ ہر قسم کی پیدا کاری سے واقف ہے!" جب میں نے اس آیت کی تفسیر کی تو وہ ایک مرصع زرین جوہر نگار موتیوں سے آراستہ لاقیمت تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا، ذرا پھر دہرانا۔ جب میں نے دہرایا تو وہ اس تخت سے نیچے اتر پڑا اور کھلی زمین پر آیا جہاں چھڑکاؤ ہو کر مٹی گیلی تھی۔ وہاں وہ اپنا گال زمین پر رکھ کر اتنا رویا کہ اس کا چہرا کیچڑ سے لت پت ہو گیا۔ پھر اس نے مجھ سے کہا کہ یہی رب معبود اور اوّلِ قدیم ہے جس جیسا کوئی اور نہیں۔ پھر اس نے اپنے لئے ایک خاص گھر بنایا اور ظاہر کیا کہ وہ اہم معاملات کے لئے اس میں تخلیہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ اس میں وہ خفیہ طور سے نماز پڑھا کرتا تھا تاکہ اس سے کوئی واقف ہونے نہ پائے۔ اور یہ کہ اس نے تین دفعہ کر کے مجھے چھے سو سیر سونا انعام دیا۔"

اس کتاب میں بہ کثرت دیگر دلچسپ تمدنی و قانونیاتی وغیرہ واقعات بھی ہندوستان کے متعلق ہیں۔ بزرگ بن شہریار سے بھی پہلے کی بعض عربی تالیفیں جن میں ہند کے حالات ہیں، اب دستیاب ہو رہی ہیں۔[1] ان میں شاید سب سے قدیم محمد بن حبیب (فوت ۲۴۵ھ) کی کتاب المحبّر ہے جس میں عرب کے بعض میلوں میں اسلام سے بھی پہلے ہندی تاجروں کی آمد کا ذکر ہے۔ دوسرا مولف ابن خرّداذبہ تقریباً سنہ ۲۳۰ھ کا ہے جس کی جغرافیہ کتاب المسالک والممالک میں ان معلومات کا ذکر ہے جو بطور افسر ڈاک خانہ بغداد اسے سندھ وغیرہ کے متعلق حاصل تھے۔ سلیمان تاجر کا ایک گمنام سفرنامۂ ہندوستان و چین "سلسلۃ التواریخ" کے نام سے ۱۸۱۱ء میں پارلیس میں چھپا۔ اندرونی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ سلیمان تاجر کا زمانہ تقریباً سنہ ۲۳۷ھ کا ہے۔ اس کتاب کا ضمیمہ یا تکملہ ابو زید الحسن السیرافی (از زمانہ تقریباً سنہ ۳۰۰ھ) نے لکھا ہے۔ ان دونوں کتابوں نیز بزرگ بن شہریار کی کتاب سے ہند کے متعلق معلومات کی خاص تفصیلی تحلیل مولانا سلیمان ندوی کی اُردو کتاب

---

[1] اس مضمون کا پروف پڑھتے وقت ڈاکٹر مقبول احمد کا انگریزی مقالہ "دکن پر عرب جغرافیہ نویسوں کے معلومات" چھپ کر آیا ہے۔

"عرب و ہند کے تعلقات" میں ہے۔ اسی طرح مسعودی، اصطخری، ابن حوقل، بشاری مقدسی، البیرونی، اور ابن بطوطہ کے معلومات بھی اسی لئے ان کی مزید تفصیل یہاں غیر ضروری ہے۔ ابو دلف مسعر بن المہلہل الینبوعی کا سفرنامۂ ہند جو چوتھی صدی ہجری کے نصف اول سے تعلق رکھتا ہے اس کا ایک ٹکڑا مولانا سلیمان ندوی کے بیان کے مطابق برلن میں چھپا ہے مگر انہیں کی طرح میں بھی اس کو دیکھنے سے محروم رہا ہوں۔ ایک حالیہ اطلاع ہے کہ مشہد کے کتب خانے میں اس کا مکمل نسخہ دستیاب ہو گیا ہے۔ الہمدانی (فوت ۳۳۴ھ) کی دس جلدوں والی جغرافیہ کتاب الاکلیل" تا حال پوری نہیں چھپی ہے۔ معلوم نہیں اس میں ہند کا کیا کیا ذکر ہے۔

(۷) اس سے غالباً ۱۹۰۶ء مراد ہے۔ اس کے جون نمبر سے" ملیبار کے مائلے کے عنوان سے اے ایس ویدیا ناتھا ائیر کا مضمون چھپنا شروع ہوا ہے۔

(۸) یہاں وہ باب ختم ہوتا ہے جو" سواحل ہند پر اسلامی آبادی کا پہلا دور" کہا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں اتنا اور اضافہ کر دینا چاہیئے کہ بلاذری کی فتوح البلدان کے مطابق ہندوستان پر سب سے پہلا عربی حملہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں ۱۵ھ میں تھانہ (بمبئی) اور بھروچ پر پھر دیبل (قریب کراچی) پر ہوا۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے زمانے میں بھی مختلف کاروائیوں کا پتہ چلتا ہے پھر حضرت معاویہ پھر یزید کے دور حکومت میں آخر حجاج بن یوسف کے زمانے میں لنکا سے آنے والے عربوں کے سندھ کے سمندروں میں لٹنے کے باعث محمد بن قاسم کا حملہ ہوا۔ ان ابتدائی حالات کی خاص تفصیل قدامہ بن جعفر کی کتاب الخراج کے اس واحد ٹکڑے میں ہے جو استانبول کے کتب خانہ کوپرولو میں مخطوطے کی صورت میں ہے۔ یہاں ان حوالوں سے زیادہ تفصیل شاید غیر ضروری ہوگی۔

(۹) قدیم شہر ظفار کہتے ہیں کہ موجودہ ظفار کے علاوہ کوئی اور جگہ ہے۔ بہرحال ۱۳۲۵ھ میں موجودہ ظفار سے آئے ہوئے متعدد حجاج سے مکہ معظمہ میں دریافت پر پتہ چلا کہ وہاں اب ایسی کوئی قبر نہیں ہے بلکہ وہ سرے سے اس روایت ہی سے بے خبر پائے گئے۔

(۱۰) شالیات اور چالیم ایک ہی چیز ہے اصل میں نام چالیت ہے۔ ملیالم ناموں کے آخر میں

عربی تنوین کے مماثل میم بڑھ جاتا ہے۔ اس کو معرب کر کے شالیات کیا گیا ہے۔ یہ تاحال چالیت کہلاتا اور بڑا زرخیز، باغات سے بھرا ہوا مقام ہے اور یہاں کے فاضل شہاب الدین احمد کویا کے ہاں ۱۹۲۷ء میں میں نے ایک نفیس ذخیرہ عربی مخطوطات کا دیکھا ہے۔ یہ دریائے بے پور میں جزیرہ ہے[1]۔

(۱۱) مجھے کولم (واقع کارومنڈل) کی مسجد مالک بن دینار اور ساحل ملیبار کی متعدد مساجد مالک بن دینار کے دیکھنے کا ۱۹۲۷ء میں دوسری مرتبہ موقع ملا۔ میں تعمیریات اور نہندسے نابلد ہوں لیکن مجھے یہ سب مساجد ایک ہی نمونے نقشے کی معلوم ہوئیں بلکہ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ملیبار کی عام مسجدوں کا نمونہ مساجد مالک بن دینار سے بالکل الگ ہے۔ ملیبار کی ان مسجدوں کے ساتھ جو قبرستان ہیں وہاں بہت سے پرانے کتبے بھی نظر آئے لیکن وقت کی کمی کے باعث ان پر جو صرف چند منٹ صرف کئے جا سکے، وہ ان مٹے گھسے ہوئے الفاظ کو پڑھنے کے لئے قطعاً ناکافی ہیں۔ البتہ مقامی طور پر ان پرانی قبروں میں کسی صحابہ و تابعین کی طرف منسوب کوئی چیز سننے میں نہیں آئی۔ مزید یہ کہ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو بھٹکل میں بھی (جو منگلور اور گوا کے مابین ایک بندرگاہ ہے) ایک مسجد مالک بن دینار ہے۔ یہ بظاہر ایک خالص عربی آبادی ہے کیونکہ شہر میں صرف مسلمان ہیں، غیر مسلم ایک بھی نہیں اور آبادی کے آداب مجلس بھی خالص عربی ہیں جو کہیں اور ہند میں دیکھنے میں نہیں آتے۔ ملیبار کی طرح شہر بھٹکل میں (جو شمال کنڑا میں ہے) شافعی مذہب عام ہے۔

(۱۲) مولانا محمد غوث مرحوم مدرس مدرسۂ دینیات سرکار عالی حیدرآباد نے ۱۴ ستمبر ۱۹۳۱ء کے روزنامہ صحیفہ حیدرآباد میں جو مضمون شایع کیا اس میں اس کتبے کی عبارت یوں پڑھی ہے :-

اسمعیل بن
مالک ۱۰۹
بن دینار

اور اسی کا حوالہ جامعۂ پاریس کے کلیۂ علوم اسلامیہ کے رسالے R.E.I. بابتہ ۱۹۲۹ء میں

---

[1] چالیم اصل میں جزیرہ چالیت کے محاذی ساحل ریلوے اسٹیشن کا نام تھا۔ فرانس خانہ تا حال چالیم کہلاتا ہے۔

صفحہ ۱ پر آیا ہے اور وہاں مضمون نگار نے "۱۰۹ھ (؟ ۹۰۱ھ)" لکھا ہے۔ حال میں اس کتبے کی پشت پر محمد غوث صاحب مرحوم کی مذکورہ قراءت ہی کندہ کرادی گئی ہے جو نہایت بدخط ہے۔ خوف ہے کہ چند روز بعد کہیں اسی کو اصل کتبہ نہ سمجھ لیا جانے لگا۔ اصل کتبہ دوسرے رُخ پر بالکل مٹ چکا ہے اور گارے جیسے کالے پتھر پر ہے۔

(۱۳) NAUTA ایک خاص لاطینی لفظ ہے جس کے معنے ملاح کے ہیں۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے شام میں حضرت معاویہؓ وغیرہ کے زمانے میں جب عربوں نے جہازرانی اور جہاز سازی سے دلچسپی لی تو یہ لفظ عربی میں آ گھسا اور ... خلفاء ہی کے زمانے میں جرمنی تک مسلمانوں نے اسے لا پہنچایا۔

نوایت کے متعلق کچھ بحث عبدالجبار ملکاپوری کی تاریخ دکن میں بھی ہے۔

نوائن کے متعلق عبدالجبار ملکاپوری کی تاریخ دکن "محبوب الوطن" صفحہ ... پر لکھا ہے کہ ہوا نے بر موافق و مخالف مختلف بنادر میں پہنچے۔ ہنود اس نئی قوم کو دیکھکر اترنے میں مانع ہوئے۔ آخر میں نہایت عاجزی و التجا کرنے کے بعد عہد و پیمان لے کر اترنے کی اجازت ملی۔ اولاً انہیں بنادر میں قول و قرار نامہ دے کے فروکش ہوئے۔ اقرار نامہ اس بات کا تھا کہ ہنود کی طرز روش میں رہیں اور لباس بھی اسی دیس کا اختیار کریں۔ غربائے اسلام نے بامر لاچاری بمصداق ضرب المثل جیسا دیس ویسا بھیس ہنود کا لباس اختیار کیا اور اہل اصنام کے ساتھ مل جل کر شیر و شکر کی طرح رہنے لگے اور مقتضائے حال کے موافق ہر ایک نے ایک پیشہ و حرفہ اختیار کیا اور کمال ہوشیاری سے زندگی بسر کرتے تھے اور اسلامی شعار نہایت احتیاط سے ادا کرتے تھے۔ اذان و قراءت و قرآن اس طرح پڑھتے تھے کہ کوئی فرد ہنود نہ سُنے۔"

بہتر سلوک بعد کے زمانے کی چیز ہوگی جب مسلمان مفید رعایا اور جانباز مددگار ثابت ہوئے اور ان کی تجارت سے راجاؤں کی آمدنی بڑھ گئی۔

خاندان والاجاہی کی حکومت کا خاتمہ

یہ مقالہ انڈین ہسٹری کانگریس میں جو بمقام بلدہ حیدرآباد منعقد ہوئی تھی سنایا گیا تھا

از محمد غوث صاحب ام۔اے

"ہندوستان میں ہم نے اپنے ملک کی بھلائی کے واسطے انگلش حکومت قایم کی ہندوستان میں انگلش حکومت قایم ہونے میں ہم اور وہ مثل قینچی کے دو پلڑوں کے شریک تھے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان دونوں میں کس نے زیادہ کام کیا ہے"

یہ الفاظ سر سید نے ایک مرتبہ اپنی ایک تقریر میں کہے تھے اور ان پر از حقیقت الفاظ کا اصلی مصداق کسی جگہ نظر آتا ہے تو وہ قطعہ کرناٹک ہے۔ خاندان والاجاہی نے انگلستان کے ایک حلیف اور ایک سچے دوست کی حیثیت میں وہ سب کچھ کیا جو حلیفی اور دوستی کا مقتضیٰ ہے۔

جن اصحاب نے کرناٹک کی تاریخ کی فارسی کتابیں پڑھی ہیں ان پر یہ حقیقت آشکارا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی مدراس میں ابھی صرف تاجرانہ کاروبار کے نشیب و فراز سے دوچار تھی، کہ فرانسیسی حکمت عملی کے ایک استاد دوپلے نے انگریزی تاجروں کو مدراس سے بے دخل کر دیا۔ محض کمپنی کی دردبھری التجاؤں پر اس وقت کے حاکم صوبہ کرناٹک نواب انورالدین خان شہید نے جن کا مستقر حکومت ارکاٹ تھا فرانسیسی کار پردازوں کی قرار واقعی تنبیہ کی اور یکے بعد دیگرے اپنے فرزندوں نواب محمد محفوظ خان اور نواب محمد علی خان والاجاہ کو فرانسیسی فوج سے مقابلہ کے لئے روانہ کیا اور بالآخر مدراس کو فرانسیسی اقتدار سے آزاد کرا کے پھر انگریزی کمپنی کے سپرد کر دیا۔[1] نواب انورالدین خان کی شہادت کے بعد فرانسیسیوں نے انگریزی کمپنی اور اس کے اثر کا نام و نشان مٹا دینا چاہا، اس نازک وقت میں نواب محمد علی خان والاجاہ نے اپنی قوت کا جو مظاہرہ کیا اس سے فرانسیسی اقتدار کی کمر ٹوٹ گئی، اسی زمانہ میں مدراس کے انگریزی تاجروں کی کمپنی آہستہ آہستہ زمینداری

---

[1] توزک والاجاہی، مخطوطہ کتب خانہ سعیدیہ۔

اجارہ داری اور جاگیرداری کے مراتب طے کرتی جاری تھی؛[۱] نواب والاجاہ نے متعدد مواضع ایسٹ انڈیا کمپنی کے سپرد کئے چنانچہ میلاپور کی سپردگی کے وقت جو سند دی گئی اس کا اقتباس یہ ہے ۔

"مرقوم غرہ شہر ذی قعدہ ۱۱۶۲ھ آنکہ نیس والا بندر میلاپور متعلقہ کرناٹک پایان گھاٹ صوبہ فرخندہ بنیاد حیدرآباد بشرط رفاقت و فدویت کہ ہر گاہ برائے کارہائے سرکار طلب داشتہ شود باجمعیت و سرانجام خود بحضور رسیدہ شرائط رفاقت بجا آرند سپرد انگریزان چینا پٹن و دیوتام پٹن حسب الضمن مقرر گشتہ باید کہ بخاطر جمع در فدویت و اطاعت سرکار دولتمدار سرگرم باشند"[۲]

جب کونٹ لالی نے دوبارہ مدراس کا محاصرہ کیا تو اس خوف و خطر سے مملو وقت میں خود نواب والاجاہ نے فوج کی کمانڈ کی، رسد اور مال کو بے دریغ بہایا گیا۔ وندی واش کے تاریخی معرکہ میں اور پھر پانڈی چری کو فتح کرکے فرانسیسی امنگوں کو ہندوستان میں ہمیشہ کے لئے ختم کردینے میں بھی نواب والاجاہ نے ہی فوج کی قیادت کی، کرناٹک کے مورخوں کا یہ دعویٰ ہے کہ خود بنگالہ میں بھی کلایو کے ساتھ نواب والاجاہ کی نئی تربیت یافتہ فوج نظر آرہی تھی،[۱] اس سے قطع نظر سلطنت آصفیہ کے ساتھ مشہور آفاق تاریخی دوستی کی ابتدا کے وقت سفراء انگریزی کے پشت پناہ نواب والاجاہ ہی تھے[۲] غرض برطانیہ کے کنگ اور کرناٹک کے ناظم میں بالراست روابط قایم ہوئے جس کی نظیر اس وقت طول و عرض ہندوستان میں کسی اور جگہ موجود نہیں تھی اور توزک والاجاہی کے الفاظ میں

"ربستہ وداد و اتحاد فی مابین حضرت اعلیٰ نواب والاجاہ، و جرد و بادشاہ انگلانڈ یعنی جارج ثانی و ثالث بآں مرتبہ محکم گردید و رابطہ دوستی طرفین بآں حد رسید کہ بہ پیمان برادری انجامید۔"

توزک والاجاہی میں ایک دوسرے مقام پر لکھا ہے کہ

---

[۱] ملاحظہ ہوں توزک والاجاہی تعمر والاجاہی و تحفۃ الاخبار .... [۲] کتب خانہ سعیدیہ میں اسکی نقل موجود ہے، [۳] توزک والاجاہی و تحفۃ الاخبار [۴] تعمر والاجاہی۔

"قوم انگریز مجدداً از وقوع اعانت وقت مشکل ممنون و مشکور و متفق و یکدل با حضرت اعلیٰ گردیدہ چنانچہ تا حال . . . . اتحاد و ارتباط حضرت اعلیٰ و قوم انگریز جاریست

. . . . چنانچہ دو بادشاہ عزیزہ انگلانڈ ملقب بجارج دویم و سیوم

. . . . . . نامہ ہائے موافقت با لقاب برائے حضرت اعلیٰ باین مضمون فرستادند

کہ تا قیام سلطنت انگلانڈ و اولاد خود ریاست کرناٹک بحضرت اعلیٰ بطناً بعد بطن قائم و برقرار . . . . وقت . . . دولت تا سلسلہ اولاد این از محبت و الفت جانبین باقی و پائیدار . . . بود"

۱۱۶۲ھ سے ۱۱۷۵ھ تک کا زمانہ وہ ہے جب کہ نواب والاجاہ نے ایک طرف چندا صاحب وغیرہ سے نبرد آزمائی کرکے کرناٹک میں اپنی حکمرانی کی بنیاد مضبوط کی تو دوسری طرف انگریزوں کی تائید و اعانت بہی (؟) رفاقت پوری طرح ادا کیا۔ اس پورے زمانہ کی روئداد سنانے کا اس وقت کوئی موقع نہیں ہے بہر حال نواب والاجاہ اس وقت انگریزی دوستی کا دم بھرتے اور انگریزان سے اپنی کاربراری کا موقع ڈھونڈتے رہتے تھے۔ اس زمانہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارپردازوں کی جانب سے جو عرائض نواب والاجاہ کی خدمت میں گزرانے جاتے تھے اور جو قرار و عہد کیا جاتا تھا اس کے چند نمونے اس موقع پر پیش کرنا برمحل ہے۔

گورنر سانڈرس نے ربیع الاول ۱۱۶۴ھ کو لکھا کہ:—

"ما . . . . از سر کار جاگیر یافتیم کہ در کار ہائے سرکار معاونت بعمل آریم لہذا در ہمہ وقت بہ حتی المقدور مراتب اعانت بعمل خواہیم آورد"

۱۲ رمضان ۱۱۶۴ھ کو گورنر چینا پٹن بہ اجلاس کونسل نے حسب ذیل تحریر روانہ کی:—

"بر آں صاحب نیز روشن خواہد بود کہ کمترین در ہمہ اوقات لوازم اخلاص . . . در کار آں صاحب بہ تقدیم رسانیدہ۔ فی الحقیقت فتح صاحب فتح خود می داند و شکست! ہم بدستور . . . دانند یقین تصور فرمایند کہ حتی المقدور استحکام کارہائے تصور نخواہد کرد۔ بعد شہید شدن

نواب ناصر جنگ آن صاحب بجزیت بمکان ترچناپلی رسیده اند ازین معنی بسیار خوش وقت شده به مجرد رسیدن خط اول . . . . خوبی ہائے آن صاحب وہم بنا بر اظہار وفاداری انگریزان . . . . سولداران بجمعہ سامان بسرکردگی مسٹر کوپ برائے کمک آن صاحب روانہ ساختیم۔"

مسٹر ساندرس گورنر مدراس نے ۴ شعبان ۱۱۶۵ھ مطابق ۲۷ جون ۱۷۵۴ء کو لکھا کہ :۔

"در خاطر مبارک آن صاحب ثابت باشد کہ بیازمند شریک امور سرکار است۔ بغیر از استرضائے آن صاحب ہیچ کار بہ عمل نخواہد آورد۔"

مسٹر پیکیٹ گورنر مدراس نے ۱۳ ذی قعدہ ۱۱۶۹ھ مطابق ۵ اگست ۱۷۵۹ء کو لکھا کہ :۔

"انگریزان ہمیشہ بہ خبرداری پرداختہ و خواہند پرداخت کہ استحکام حکومت سامی را بہ پایہ قائمے تا بحدیکہ تواند محکم سازند۔"

مسٹر پیکیٹ گورنر مدراس نے ۱۱ ذی حجہ ۱۱۷۲ھ مطابق ۵ اگست ۱۷۵۹ء کو لکھا کہ :۔

"آرزو و خوشی این جانب این است کہ آن صاحب بوجہ احسن بر مسند تحکم و تحمل و تفاخر بدستور عمل والد خود قائم شدہ ملک پایان گھاٹ را تمام و کمال متصرف باشند و اہل کمپنی بہ قسمیکہ در سایۂ حکام پیشین پیشہ تجارت بامینت جاری می داشتند در سایہ عاطفت آن صاحب ہم اجرا دارند۔"

۸ ذی قعدہ ۱۱۷۳ھ مطابق ۲۲ جون ۱۷۶۰ء کو گورنر مدراس با جلاس کونسل نے لکھا کہ :۔

"مرقوم بود کہ اہل کمپنی بہ مستاجران سرکار . . . . . . بہ قلعہ داران و پالیکاران رو نباید داد در جواب آن این است کہ این را بخوشی دل قبول دارم و بہ ہیچ وجہ بالعکس منفعت سرکار کسے را رو نہ خواہم داد بہ حمایت نخواہم پرداخت مرقوم بود کہ بنام سرداران انگریزیہ کہ در قلاع ہستند تاکیدات اطلاع باید کہ دنکار ہائے ملک و قضایائے سکنہ مداخلت نہ کنند۔ در جواب آن این کہ۔ آن امر بخوشی دل قبول دارم و بموجب ایمائے آن صاحب تاکیدات ابلاغ خواہد یافت

مرقوم بود کہ موافق درخواست نائب سرکار از اہل کمپنی مراتب معاونت متاجران بظہور رسد
و در کمپنی بہ تعلقداران سرکار کارے تعرض نہ گردد۔ درجواب آں این است کہ اہل کمپنی بہ حسب
اقتضائے کار موافق گفتہ نائب سرکار مدد و معاونت بہ عمل خواہند آورد و متعلقداران سرکار
را در کمپنی کار نخواہد داد۔ مرقوم بود کہ آنچہ سوال و جواب با نواب صلابت جنگ و نظام علی خاں
و دیگر اعیان بہ تجویز اں صاحب بہ عمل آمدند درجواب این کہ بہ فضل الٰہی فی مابین آن
صاحب و اہل کمپنی ہیچ جدائی متصور نیست تمامی امورات ملک و سوال جواب با نواب
صلابت جنگ و نظام علی خان بہادر وغیرہ . . . . بصلاح آں صاحب
بہ عمل خواہد کہ صلاح سامی را بر صلاح دیگران مقدم می دانند "

اقتباس خط گورنر پکیٹ و کونسل بنام نواب بیگم شانزدہم ذی قعدہ ۱۱۷۳ھ مطابق غرہ
جولائی ۱۷۶۰ء

" اہل کمپنی کارہائے سرکار را موافق دلخواہ نواب صاحب بخوشی تمام قبول نمودند۔
رونق امورات و متابعت بندگان نواب صاحب از دل و جان بخوشی می خواہند۔
اہل کمپنی را در کارہائے ملکی اصلا دخل نیست و نخواہند کرد و بہ عنایت ایزدی
ریاست تمام کرناٹک بنام نواب صاحب و اولاد ایشان مستحکم و مضبوط تا قیام کوٹھی انگریز
در ملک ہند و دکن و بنگالہ صورت قیام خواہد داشت اہل کمپنی در متابعت و امداد
کارہائے کرناٹک ساعی و سرگرم ہستند و دوست سرکار دوست و دشمنان سرکار را دشمن
تصور نمودہ اند و می نمایند و تمامی اہل کونسل اقرار نامہ این معنی نوشتہ دادہ اند۔ "[۵]

عہود و مواثیق اور تدبیر فرزانگی کے جو مراتب کرناٹک کی سرزمین میں طے ہوئے وہ یکسر ایک

---

[۵] یہ تمام اقتباسات ان کاغذات سے ماخوذ ہیں جو کتب خانۂ سعیدیہ میں افرادِ نقول فقرات
گورنمان کے نام سے موجود ہیں۔

داستان) عبرت خیز ہے۔ ایک قطعہ کرناٹک پر کیا موقوف ہے۔ ارض ہندوستان میں ایک سرے
سے دوسرے سرے تک اس زمانہ میں فتنوں نے سر اٹھایا تھا۔ ارباب ہمت کی ہوس اقتدار باہمی
جنگ و جدل اور دغا و فریب کی شرمناک صورت اختیار کر لیتی تھی، باہمی تنازعوں کا بول بالا
تھا۔ مغلیہ اقبال کی جو شکایت شاہ خلد مکان اورنگ زیب کے زمانہ میں شروع ہوئی تھی وہ اب
عالمگیر ہو چکی تھی۔ پس پردہ جو طوفان قیامت ڈھانا چاہتا تھا اس کا احساس کسی کو نہ تھا۔ خود سری
نے کچھ اس طرح تسلط حاصل کر لیا تھا کہ ہر طرف اس کی کارفرمائی تھی۔ باہم دیگر جھگڑنے والے
مدعیان حکومت کو اقوام مغرب سے مدد لینے کا خیال پیدا ہوا۔ ان مدد لینے والوں نے خیال نہ کیا کہ غیر
ملکی اور کرایہ کی فوج مدد دیتے دیتے جب یہ دیکھے گی کہ اب اس کی قوت بادشاہ گری کر سکتی ہے تو فوراً
موقع کو اپنے موافق بنا لینے میں کچھ پس و پیش نہ کرے گی جیسے کہ عباسی دور خلافت میں غلامان ترک نے
مثال قائم کی تھی۔ کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت بھی بعض بقیۃ السلف مشرقی ارباب دانش و بینش حالات
کی نزاکت سے سمجھ جاتے تھے۔ لیکن ان کے ہاتھ اس قدر قوی نہیں تھے کہ آنے والے
طوفان کو روک دیتے۔ اسی زمانہ میں یا زمانہ مابعد میں طول و عرض ہندوستان میں لوگوں نے کئی عبرت
انگیز مناظر دیکھے۔ کرناٹک میں جو منظر نظر آیا اس کی روداد یہ ہے۔

۲۲ صفر ۱۲۱۶ھ[۱] مطابق ۵ جولائی ۱۸۰۱ء کو نواب والاجاہ کے فرزند اور جانشین نواب
عمدۃ الامرا حالت نزع میں مبتلا ہوئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج ۴ توپوں ۵۰۰ سے زیادہ جوانان
بار ۲۳۲ سوار اور ترپ سواروں کے ساتھ نواب صاحب کے سکونتی باغ واقع چیپاک[۲] میں کرنل میکلین
کی ماتحتی میں داخل ہوئی اور باغ کے دروازوں پر اپنے پہرے قائم کر دیئے۔ ۳ ربیع الاول ۱۲۱۶ھ
کو ۱۰½ بجے نواب عمدۃ الامرا نے آخری سانس لی اور ساتھ ہی گورنر مدراس کی جانب سے مسٹر ویب چیف سکریٹری

---

[۱] ان واقعات کی تفصیل کیلئے ملاحظہ ہوں تحفۃ الاخبار و سوانح ممتاز جس کا انگریزی ترجمہ ابھی حال میں مدراس یونیورسٹی
نے شائع کیا ہے [۲] اس مکان اور باغ میں اب گورنمنٹ کا ریونیو ڈپارٹمنٹ قائم ہے۔

اور کرنل کلوس حاضر ہوئے۔ اور محمد تقی علی خان بہادر بہرام جنگ اور محمد نجیب خان بہادر سالار جنگ اور نواب عمدۃ الامرا کے پرتگیزی دیوان کرنل بارڈ سے کہا کہ اگر نواب صاحب نے کچھ وصیت کی ہے تو ظاہر کی جائے نواب صاحب کے عہدہ داروں نے جواب دیا کہ تحریری[۵۱] وصیت نامہ موجود ہے جس کو نواب صاحب نے اپنے فرزند نواب تاج الامرا ولیعہد کو تفویض کیا ہے بعد ایام غم اس کے مطابق عمل کیا جائے گا۔ دونوں انگریزی عہدہ داروں نے مجبور کیا کہ اسی وقت وصیت نامہ دکھایا جائے۔ ان کے اصرار پر وصیت نامہ دکھایا گیا۔ دونوں انگریزی عہدہ داروں نے مارکوئیس ولزلی گورنر جنرل کے ایک خط کی نقل دکھائی جو انہوں نے نواب عمدۃ الامرا مرحوم کے نام تحریر کیا تھا اور یہ بات ظاہر کی کہ مارکوئیس ولزلی کو اس امر کا علم ہونے کے بعد کہ نواب عمدۃ الامرا نے ٹیپو سلطان کے ساتھ مراسلت کی تھی یہ حکم دیا تھا کہ یہ خط نواب صاحب کو دکھا کر ملک کرناٹک ضبط کر لیا جائے جس وقت مارکوئیس ولزلی کا یہ خط آیا نواب صاحب مرحوم کا مزاج علیل تھا۔ اسلئے ہم نے ان کی صحت یابی کا انتظار کیا اب جب کہ ان کا انتقال ہو چکا ہے وہی صورت حال پرنس تاج الامرا کے ساتھ بھی باقی ہے ٹیپو سلطان کے ساتھ مراسلت ثابت ہو جانے کے بعد ریاست کے تمام حقوق سورنٹی (sovereignty) اور کمپنی کی پناہ جو نواب والاجاہ اور نواب عمدۃ الامرا کو حاصل تھی ختم ہو گئی اور ۱۷۹۲ء کا معاہدہ ٹوٹ گیا۔ اس وجہ سے اہل حکومت ملک کرناٹک ضبط کر لینگے۔ لارڈ صاحب اپنی اس مہربانی کی وجہ سے جو ان کو پرنس تاج الامرا کے ساتھ ہے چاہتے ہیں کہ پرنس کرناٹک کی تمام سرزمین کمپنی کو دے دیں اگر پرنس اس طرح عمل کریں تو لارڈ صاحب (گورنر مدراس) ان کی جانشینی کا اعتراف کریں گے اور کچھ حصہ پرنس اور ان کے خاندان کے لئے مقرر کر دینگے۔ بہرام جنگ اور سالار جنگ نے جواب دیا کہ نواب عمدۃ الامرا کو ٹیپو سلطان سے دو پشت کی دشمنی تھی۔ نواب عمدۃ الامرا اور نواب والاجاہ کے ساتھ ٹیپو سلطان اور ان کے والد نے جو کچھ لڑائی کی اور نقصان پہنچایا وہ سب پر ظاہر ہے لیکن جس وقت مارکوئیس کارنوالس نے خاندان ٹیپو سلطان کو قلعہ میں لا رکھا تو نواب والاجاہ سے ان کی ملاقات کرائی اور سفارش کی اور یہ

۵۱۔ اصلی وصیت نامہ کتب خانہ سعیدیہ میں محفوظ ہے۔

کہا کہ ان کے ساتھ جو کچھ مراعات کئے جائیں گے ان کو میں یہہ خیال کرونگا کہ میرے ساتھ
عمل میں لائے جا رہے ہیں اس پر نواب والاجاہ نے ٹیپو سلطان کے فرزندوں کے ساتھ محبت
آمیز برتاؤ کیا اور پھر مارکوئیس کارنوالس نے یہ بھی کہا کہ ٹیپو سلطان کے ساتھ کمپنی نے دوستی اور
مصالحت کر لی ہے اس لئے نواب والاجاہ کو بھی اب ٹیپو سلطان کے ساتھ دوستانہ مراسلت کا سلسلہ
جاری رکھنا ضرور ہے۔ اس بنا پر نواب والاجاہ اور ان کے بعد نواب عمدۃ الامرا نے ٹیپو سلطان
کے ساتھ دوستی کا سلسلہ جاری اور قایم رکھا جو خطوط ٹیپو سلطان کو بھیجے جاتے تھے بہ وقت ان کے
نقول گورنر صاحب مدراس کے پاس بھیجے جاتے تھے۔ وہ تمام خطوط یا تو تعزیت کے ہیں یا تہنیت
کے۔ دونوں انگریزی عہدہ داروں نے ایک خط کی نقل دکھائی اس کے دیکھنے کے بعد سالار جنگ
اور بہرام جنگ نے کہا کہ یہہ خط شادی کی مبارکباد کا ہے اور ضرور اسکی نقل گورنر کے دفتر
میں موجود ہوگی۔ اس خط سے کیا قباحت لازم آتی ہے۔ اس کے بعد دونوں انگریزوں نے ایک
فرد کی نقل دکھائی اور کہا کہ اصل فرد ٹیپو سلطان کے دفتر سے برآمد ہوئی جس میں نواب والاجاہ
اور نواب عمدۃ الامرا کے رموز درج تھے اور اسکے بموجب کمپنی کی دشمنی میں مراسلت ہوا کرتی تھی۔
سالار جنگ اور بہرام جنگ نے کہا کہ اگر اصل فرد نواب والاجاہ یا نواب عمدۃ الامرا یا ان کے کسی
منشی کے ہاتھ کی ہو تو دکھائی جائے۔ یہہ بات قسم کھا کر کہی جا سکتی ہے کہ دونوں نواب صاحبوں نے
کمپنی کے خلاف کوئی مراسلت ٹیپو سلطان کے ساتھ نہیں کی۔ ہندوستان کے رئیسوں سے ان کی مراسلت
کمپنی کے ذریعہ سے ہوا کرتی تھی۔ اگر یہہ فرد ٹیپو سلطان کے دفتر سے برآمد ہوئی ہے تو ممکن ہے کہ
دغا بازوں نے کمپنی کی دوستی میں خلل ڈالنے کیلئے کوئی سازش کی ہوگی۔ مسٹر ویب اور کرنل کلوس نے
کہا کہ ہم عدالت کے محکمہ میں نہیں آئے اصل کاغذ دکھانے یا قسم لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اس
وقت صرف دو باتیں کہنی ہیں، یا تو دوستانہ طریقہ سے تمام ملک کرناٹک کمپنی کو دے دیا جائے،
اس وقت لارڈ صاحب اپنی مہربانی سے پرنس کی جانشینی کا اعتراف کرینگے اور ان کے لئے اور
ان کے خاندان کیلئے کوئی چیز مقرر کر دینگے، اگر اس بات کو قبول نہ کیا جائے تو لارڈ صاحب چونکہ حکم

کے تابع ہیں اس لئے وہ تمام ملک ضبط کرلیں گے اور اس وقت انجام نیک نہ ہوگا، اس کا جواب ابھی وقت دیا جائے، بہرام جنگ اور سالار جنگ نے کہا کہ نواب صاحب کی میت بلا تجہیز و تکفین پڑی ہوئی ہے اور ہر طرف سے درد و غم کی آواز بلند ہے ہمیں سوال و جواب کا ہوش و حواس نہیں ہے، اس قدر مہلت مطلوب ہے کہ نواب صاحب کا تابوت روانہ کردیں اور کل آپ کے سوال کا جواب دیں، بہت بحث و تکرار کے بعد دونوں صاحبوں نے بات قبول کی اور چلے گئے۔

دوسرے روز دونوں صاحب پھر آئے اور گزشتہ روز کی تقریر کا اعادہ کیا، بہرام جنگ اور سالار جنگ نے کہا کہ تمام ملک کا کمپنی کو دے دینا ان کے اقتدار سے زیادہ ہے، اس بات کو چھوڑ کر باقی دوستانہ سوال و جواب جس میں کمپنی کے فوائد ملحوظ ہوں بیان کئے جائیں حتی المقدور کمپنی کو خوش کرنے کی کوشش کی جائیگی، اگر تقسیم ملک کا کوئی جدید نقشہ بنایا گیا ہے تو دکھایا جائے۔ دونوں صاحبوں نے کہا کہ جدید نقشہ یہی ہے کہ کرناٹک کی تمام زمین کمپنی کو دے دی جائے، اس وقت لارڈ صاحب پرنس کی جانشینی کا اعتراف کرینگے، اور ان کے لئے حصہ معین کرینگے۔ بہرام جنگ اور سالار جنگ نے دریافت کیا کہ وہ حصہ کیا چیز ہے، جواب ملا کہ پہلے قبولیت دی جائے اس کے بعد لارڈ صاحب غور کرینگے، ورنہ ملک ہر طور سے کمپنی ضبط کریگی، پرنس کی جانشینی کا اعتراف نہ کیا جائیگا اس کے انجام پر نظر ڈالی جائے، اسکے جواب میں یہ بتایا گیا کہ نواب صاحب گریٹ برٹن کے بادشاہ کمپنی اور قوم انگریز کے قدیم دوست تھے، اور انہوں نے اپنے فرزند کو اسی دوستی کی پناہ میں چھوڑا ہے، ہم لوگ پوری طرح اس باانصاف قوم سے مطمئن ہیں، لارڈ صاحب پرنس حال کے لئے ان کے والد کے مقام پر ہیں، ان سے پوری امید ہے کہ پرنس کیساتھ وہ کسی قسم کی برائی نہ کریں گے، کمپنی کے دونوں عہدہ داروں نے جواب دیا کہ کمپنی کی پناہ، نواب صاحب کی قدیم دوستی اور سنہ ۱۷۹۲ء کا معاہدہ سب ختم ہوگئے، لارڈ صاحب حکم کے مطابق ضرور ملک ضبط کرلیں گے، اور پرنس کا انجام برا ہوگا، نواب تاج الامرا کے دونوں وکلا نے دریافت کیا کہ کیا

انجام بدیہی ہے کہ ان کا ملک ضبط کرلیا جائیگا اور لارڈ صاحب ان کی جانشینی کا اعتراف نہ کرینگے، دونوں انگریز عہدہ داروں نے کہا کہ اس سے زیادہ بھی ہوگا، ان کا تمام مال ضبط کرلیا جائیگا، پرنس کے وکلا نے جواب دیا کہ نواب صاحب کے پاس مال کچھ نہیں ہے، مسٹر ڈیب اور کرنل کلوبس نے کہا کہ اس کے سوا برا انجام اور بھی ہے۔

نواب تاج الامرا کے وکلا نے خود نواب تاج الامرا، ان کے خاندان اور اعلیٰ عہدہ داران ریاست سے رات میں مشورہ کرکے ایک نقشہ اور اپنے حقوق کے متعلق دلائل مرتب کئے تھے، دونوں صاحبان انگریز کو یہ چیزیں دکھائی گئیں۔ ان لوگوں نے دیکھ کر ڈال دیا اور کہا کہ صرف دو باتوں میں ایک بات اختیار کی جائے یا تو کرناٹک کی ساری زمین کمپنی کو دے دی جائے یا خود لارڈ صاحب سارے ملک کو ضبط کرلینگے، اس حالت میں انجام برا ہے، پرنس کے لئے کوئی چیز معین نہ ہوگی، اور نواب صاحب کے سکونتی باغ پر کمپنی کی پناہ باقی نہ رہے گی، قرض خواہاں اور عدالت کے لوگ آئینگے اور ان کا جی جو چاہے گا وہ کرینگے، اور پرنس کی حالت اس وقت مثل ایک عام آدمی کے ہو جائیگی، جواب دیا گیا کہ دونوں نوابان سابق اور پرنس جو اپنے والد کے جانشین اور ولی عہد ہیں، بادشاہ معظم گریٹ برٹن اور کمپنی اور وفادار قوم انگریز کے دوست رہے ہیں، ہمیں پرنس کے دوستوں سے خوبی کی امید ہے، تمام ملک کمپنی کو دے کر اگر ہم اپنے آقا کے حقوق برباد کردیں تو پرنس، ان کے خاندان اور رعائے علائق کو ہم کیا جواب دینگے، اگر لارڈ صاحب اپنے اختیار اور حکومت کی بنا پر ملک ضبط کرلیں اور وہ تمام امور جو رحم و انصاف سے دور ہیں عمل میں لائیں تو ہم سے بجز اس کے کہ مثل گدایوں کے انگریزی جھنڈے کے نیچے رہ کر جب تک کہ ہماری جان ہے جان نثاری کریں اور کیا ہو سکتا ہے، آپ مہربانی فرماکر اس نقشہ کو جو مرتب کیا گیا ہے لارڈ صاحب کو ملاحظہ کرائیں اور ان کی خدمت میں ہماری جانب سے اور واجب الرحم پرنس کی جانب سے ہماری عاجزانہ درخواست پیش کردیں، دونوں صاحبوں نے جواب دیا کہ یہ خواہش کبھی منظور نہ ہوگی، سالار جنگ اور بہرام جنگ نے کہا کہ کمپنی کو خوش کرنے اور اسکی دوستی قایم

رکھنے کے لئے ہم سے جو کچھ ہو سکتا ہے وہ یہی ہے ایک مرتبہ لارڈ صاحب کو اسے دکھلا دیجئے۔
ہم بھی نواب صاحب کے خاندان اور دوسرے عہدہ داروں پر آپ کے بیان کو ظاہر کرکے کل
جواب دینگے، بڑی منت سماجت کے بعد دونوں صاحب رخصت ہوئے۔

تیسرے روز دونوں اصحاب پھر آئے اور پھر اپنے مطالبہ پر اصرار کیا، ان سے دریافت
کیا گیا کہ جو جدید نقشہ مرتب کیا گیا تھا اسکے دیکھنے کے بعد گورنر صاحب نے کیا کہا، جواب
ملا کہ ہم نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ یہ نقشہ منظور نہ ہوگا، نواب تاج الامرا کے نائبوں نے اس
موقع پر یہ امر واضح کیا کہ ہم نے نواب صاحب کے اہل خاندان اور عہدہ داران ذمہ دار کو جمع
کرکے مشورہ کیا اس بات پر اتفاق رائے ہے کہ مرتبہ نقشہ میں جو ملک کمپنی کو دینا تجویز کیا گیا
ہے اس سے زیادہ ملک دینا ہمارے اقتدار سے باہر ہے۔ یہ سنکر کمپنی کے دونوں عہدہ داروں
نے کہا کہ اب اس صورت میں مزید سوال و جواب کی ضرورت باقی نہیں رہی، ہم پھر نہیں آئینگے،
اس کے جواب میں کہا گیا کہ سوال و جواب کو منقطع کرنا منشا نہیں ہے اور مقدور بھر کمپنی
کو خوش کرنا پیش نظر ہے، البتہ یہ مطالبہ کہ ملک کرناٹک سارے کا سارا دے دیا جائے
بہ مقدور سے زیادہ ہے اور یہ کام ہرگز نہ ہو سکے گا، اس نوبت پر صاحبان انگریز نے اصرار
کیا کہ خود نواب تاج الامرا کی خدمت میں ان کو پیش کیا جائے تاکہ ان سے ان کا منشا بالمشافہ
دریافت کر لیا جائے۔ اس خواہش کے جواب میں نواب صاحب کے دونوں وکلا نے بتایا کہ
اگر خود پرنس کو سوال و جواب کی طاقت ہوتی تو نواب صاحب مرحوم کی جانب سے ہم لوگ
کیوں ایجنٹ اور نائب مقرر ہوتے، اول تو ان کی عمر بالمشافہ ایسے اہم سوال و جواب کی مقتضی
نہیں ہے، اسکے علاوہ اپنے شفیق باپ کی جدائی سے وہ بہت ملول ہیں اس لئے راست ان سے
گفت و شنید کرنے کو معاف رکھا جائے تو موجب ترحم ہے، دونوں انگریز صاحبوں نے اپنی بات
پر اصرار کیا اور آخر میں کہا کہ بہ لحاظ اس اقتدار کے جو لارڈ صاحب کو حاصل ہے حکم دیا جاتا ہے
کہ پرنس کو بلایا جائے، بدقت تمام ایک روز کی مہلت لی گئی، چوتھے روز نواب تاج الامرا کا

مزاج درست نہیں تھا، پانچویں روز سالارجنگ اور بہرام جنگ نے کمپنی کے عہدہ داروں کو طلب کیا اور نواب سے جو غمگین تھے ان کی ملاقات کرائی، دونوں صاحبوں نے اپنے مرکو خاطر کو ظاہر کیا ترغیب اور تخویف کے دونوں پیرائے اختیار کئے۔ نواب تاج الامراء نے ظاہر کیا کہ میرے نائبوں نے کمپنی کے خوش کرنے کے لئے جو نقشہ میری رضامندی سے طے کیا ہے اس سے زیادہ کے لئے مجھے قدرت نہیں ہے، اس موقع پر دونوں صاحبوں نے گورنر کو ایک چٹھی لکھی، اس کا جواب آنے پر ظاہر کیا کہ لارڈ صاحب اس خیمہ میں جو نواب صاحب کے باغ میں کرنل میکلن کے لئے نصب کیا گیا ہے آگئے ہیں۔ نواب تاج الامرا کو ان کے پاس چلنا چاہئے چنانچہ نواب تاج الامرا، سالارجنگ اور بہرام جنگ گورنر کے پاس خیمہ میں گئے، تعارف کے بعد گورنر نے دونوں وکلا کو علحدہ خیمہ میں بٹھادیا اور خود نواب تاج الامرا سے دیر تک گفتگو کی۔ گورنر کے چلے جانے کے بعد نواب تاج الامرا نے اپنے مشیروں سے بیان کیا کہ وہی حالات پیش آئے جواب تک بہرام جنگ اور ان کے ساتھی سالارجنگ کو پیش آچکے ہیں، گورنر نے کرناٹک کا سارا ملک کمپنی کو دے دینے کی درخواست کی، سوال و جواب سے تنگ آکر میں نے کہا کل تجویز کرکے کہونگا۔

دوسرے روز جو گفتگو کا چھٹا روز تھا مسٹر ویب اور ان کے ساتھی پھر آئے اور نواب صاحب سے ملاقات کی، اور یہ خواہش ظاہر کی کہ گورنر سے ملنا بہتر ہے۔ نواب تاج الامرا نے ان لوگوں پر واضح کیا کہ میں نے اس معاملہ میں غور و تامل کیا ہے، میری خواہش ہے کہ جہاں تک مجھ سے ممکن ہے کمپنی کو فائدہ پہونچاؤں اور خوش کروں لیکن میرے دونوں مشیروں نے جو نقشہ مرتب کیا ہے اس سے زیادہ ملک دینا میری قدرت سے باہر ہے، اس حالت میں اگر میں لارڈ صاحب کے پاس جاؤں تو اسی امر کو ظاہر کرنے کے سوا کوئی اور صورت نہیں ہے، لارڈ صاحب میرے شفیق باپ کے مقام پر ہیں، مجھے فکر ہے کہ وہ میرے اس جواب سے ناخوش ہوجائینگے اگر مجھے چلنے سے معاف رکھا جائے تو میں ممنون ہونگا، دونوں صاحبان انگریز نے چلنے پر مجبور کیا،

بالآخر نواب تاج الامرا اپنے دونوں مشیروں کے ساتھ خیمہ میں گئے جہاں گورنر گورنر موجود تھے، انہوں نے نواب صاحب سے تخلیہ میں گفتگو کی ملاقات کے اختتام پر نواب تاج الامرا نے بیان کیا کہ انہوں نے گورنر کو وہی جواب دیا جو دونوں عہدہ داروں کو دیا تھا، گورنر نے نواب صاحب سے کہا کہ آپ اسباب دولت اپنے ہاتھ سے کھو رہے ہیں، آج سے آپ کے ساتھ گفت و شنید منقطع ہو چکی، نواب تاج الامرا نے کہا کہ لارڈ صاحب! آپ میرے بہترین باپ کے مقام پر ہیں، مجھے کوئی خوف نہیں ہے آپ سے شفقت پدری کی توقع ہے۔

نواب عمدۃ الامرا کے انتقال کے ساتویں روز نواب تاج الامرا نے اس مکان کا رخ کیا جو نواب والاجاہ کے زمانہ میں دربار کے لئے کام میں لایا جاتا تھا، واپسی کے وقت کرنل سکلن نے کہا کہ سنا ہے کہ آپ لوگوں نے ارادہ کیا ہے کہ پرنس کو مسند پر بٹھائیں اور نذر پیش کریں، جواب میں یہ بات واضح کی گئی کہ مسند نشینی کی رسم خاندان کے دستور کے مطابق نواب عمدۃ الامرا کے انتقال کے تیسرے روز انجام پذیر ہو چکی ہے، نذریں گذر چکی ہیں، البتہ چند ماتحت متصدیوں وغیرہ کی نذریں ہونی ہیں، یہ انتظام کیا گیا ہے کہ کل یا پرسوں یہ لوگ بھی اپنی اپنی نذر دے دیں، کرنل سکلن یہ سنکر گورنر مدراس کے پاس گئے اور یہ کہا کہ اس انتظام پر عمل آوری نہ ہونی چاہیئے۔

اس موقع پر کرنل سکلن نے گورنر مدراس کی جانب سے یہ حکم دیا کہ جہاں جہاں نواب صاحب کے علاقہ کے جوانوں کا پہرہ ہے اس کے بجائے سولجروں کا پہرہ قایم کیا جائے، اس حکم پر نواب صاحب کی جانب سے یہ عذر کیا گیا کہ زنانی ڈیوڑھی پر اور ان مقامات پر جو زنانی ڈیوڑھیوں سے متصل ہیں سولجروں کا پہرہ رکھنا مناسب نہیں ہے، دوسرے مقامات پر اگر گورنر صاحب کا حکم ہے تو مجبوری ہے، کرنل صاحب نے کہا مجھے جو حکم ہے میں ضرور اسکی تعمیل کرونگا اسکے بعد انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ سرکاری جوانوں کو جو جابجا پہرے پر ہیں موقوف کر دیا جائے، نواب صاحب کے عہدہ داروں نے کہا کہ یہ ہو نہیں سکتا۔ باقی زبردستی سے جو چاہے کر لو، کرنل صاحب نے تمام سرکاری جوانوں سے بندوقیں چھین لیں اور ان کو پہرہ سے علحدہ کر کے ہر جگہ سولجروں کے پہرے قایم کر دئے۔

اس انتظام کے بعد کرنل میکلن نواب تاج الامرا کے چچیرے بھائی نواب عبدالعلی خاں عظیم اللہ کے پاس گئے اور ان سے سالانہ بارہ لاکھ روپیہ اور پنجم حصہ آمدنی پر معاملات طے کر لئے اور دوسرے روز ان کو اپنے خیمہ میں بلوایا اور مسٹر ویب اور کرنل کلوس سے ان کی ملاقات کرائی۔

بعدازاں ہر روز ان کی آمد و رفت شروع ہوگئی، نواب تاج الامرا حزن و ملال سے علیل ہوگئے، ان کے یوروپین ڈاکٹر کی رائے سے کرنل میکلن نے باغ کے اندر ہوا خوری کی اجازت دی،

نواب عمدۃ الامرا کے انتقال کے دسویں روز کرنل میکلن نے کہا کہ گورنر مدراس کا حکم ہے کہ سولجروں کا گارڈ فتح چوکی پر جو پرنس کی نشست کا مکان ہے مقرر کیا جائے گا، ہر چند عذر کیا گیا لیکن کرنل نے فتح چوکی کے اندر اور باہر سولجروں کا پہرہ بٹھا دیا، اور دفتر میں جاکر کرنل بارڈ اور دوسرے عہدہ داروں و متصدیوں کو یہ حکم سنایا کہ تمام لوگ دربار میں آنے سے باز رہیں، سارے دفاتر اور خزانہ پر اپنی مہر کر دی، گویا نواب صاحب تاج الامرا اور ان کے متوسلین پر قیامت قایم ہوگئی، تمام سوال و جواب اور نوشت و خواند موقوف ہوگئی، جو تھوڑا سا روپیہ محلات اور چار پایوں کے اخراجات کے لئے خزانہ میں تھا اس پر بھی مہر توڑا ہوگیا۔

۱۵ ربیع الاول کو کرنل میکلن کے پاس سے ترپ سوار آکے پیام دیا کہ فتح چوکی کا مکان نواب عظیم الدولہ کے لوگوں کو دکھایا جائے، جواب میں نواب تاج الامرا کے عہدہ داروں نے کہا کہ یہ مکان پرنس ولی عہد کا سکونتی ہے اس کو دوسرے کے تفویض کرنے کا خیال نہ کرنا چاہیئے، اس کے بعد پیام آیا کہ ہمایون محل کی کنجی بھیج دی جائے اور یہ مکان عظیم الدولہ کے لوگوں کو دکھایا جائے اسکے جواب میں یہ کہا گیا کہ اس مکان سے نواب والاجاہ کے محلات کے مکانوں میں مد نظر ہوتا ہے اس لئے اس کی کنجی خود ولی عہد کے پاس رہا کرتی ہے، جس مقام پر ناموس کا اندیشہ ہے اس کی کنجی دوسرے کو کس طرح دیجا سکتی ہے، کرنل میکلن نے بہرام جنگ کو طلب کر کے ان سے کہا کہ گورنر مدراس کا حکم ہے کہ اگر کنجی نہ دیجائے تو آپ لوگوں کو بہت تکلیف پہونچیگی، بعد الساں

بار بار نرپ سوار آکر کنجی کا مطالبہ کرتا رہا، نواب تاج الامراء ان حالات کو دیکھکر محل میں چلے گئے اور ان کے مشیروں نے کرنل میکلن کے اصرار پر ہمایوں محل کی کنجی نواب صاحب سے طلب کرکے بھجوا دی، اس کے بعد سرکاری فراشوں پر نگرانی قایم کرکے ہمایون محل اور اسکے بالاخانہ پر بانات کا فرش بھجوایا گیا۔

نواب تاج الامراء نے دو کاغذات اپنے حقوق اور کمپنی کے فوائد کے متعلق اپنے یورپین اکٹر کے توسط سے اہل حکومت کے پاس بھیجے لیکن یہ کاغذات واپس کر دیئے گئے، ۱۷ ربیع الاول کو مسٹر ویب وغیرہ کمپنی کے عہدہ دار بڑے دیوان خانہ میں جہاں دربار ہوا کرتا تھا آئے، یہ لوگ جب بالاخانہ پر آئے تو چونکہ زنانہ میں مدنظر ہوتا تھا محل کی ساری خواتین خوف کے مارے کانپنے لگیں۔

۱۸ ربیع الاول کو علمائے مدراس نے فتویٰ دیا کہ نواب عظیم الدولہ جانشین نہیں ہو سکتے اور اہل خاندان نے بھی محضر بھجوایا۔

علماء مدراس کے فتویٰ[1] کی نقل حسب ذیل ہے:—

"حکم شرع شریف و عرف قدیم و عادات خلفاء و سلاطین کہ والی شخص پسر و سے می شود و چون پدر پسر را والی گرداند، و ہمہ اشیاء خود بہ آن پسر بہ آن پسر والی می گردد خواہ آن پسر از بطن بیگم باشد یا غیر، و یا آنکہ والی با وجود بودن پسر غیر را کہ متبنی است یا اجنبی وصی و قائم مقام خود کند، غرض کہ والی ملک اگر احدے را قایم مقام و ولی عہد کند خواہ پسر باشد یا غیر آن ولی عہد والی ملک می گردد و اطاعت وے لازم می گردد و بر ہمیں حکم توارث از خلفائے راشدین واقع کہ خلیفہ اول امیر المومنین رض با وجود داشتن پسران امیر المومنین عمر رض را وصی و جانشین خود فرمودا و امیر المومنین شد۔ و ہمہ مومنان در اطاعت وے آمدند، و ہم ایں حکم متوارث گشت میان سلاطین کہ بعد خلفاء راشدین بودند و از زمان عبدالملک کہ بادشاہ عرب و عجم بود تا سلطنت بنی عباس ابو منصور و ہارون رشید و مامون رشید کہ پسر کنیز بود

---

[1] اس فتویٰ کا مسودہ بخط و مہر مولانا عبدالعلی بحرالعلوم فرنگی محل کتب خانہ سیدیہ میں موجود ہے۔

ہارون بود، از ہمین قبیل سلطنت قایم شد، مستنصر باللہ و متوکل … شد، این ہمہ بادشاہان عرب و عجم بودند۔ ہم چنیں سلاطین کہ بعد ایشان شدند تا این زمان … ہر … کہ می مرد وصیت می کرد کسے را بہ قیام بہ مقام خود، ان کس خلیفہ و سلطان می شد و ہمہ کسان در اطاعت وے می شدند و کسے کہ از اطاعت وے خارج می شد حکم بہ حبس و قتل می کردند و بریں … علمائے کرام چنانکہ برہمیں دلائل شرعیہ و عادات سلاطین حال و سلاطین سلف وراثت و حقیقت … حقوق و املاک متعلقہ نواب والاجاہ امیر الہند علیہ الرحمتہ بہ نواب عمدۃ الامرا مغفرت مآب رسید و از مغفرت مآب بہ نواب تاج الامرا بہادر کہ پسر و وارث و وصی و ولی عہد نواب مغفرت مآب است رسید۔ نواب تاج الامرا را ولی عہد خود و جانشین خود ساختند و وارث حقوق مرقوم الصدر نواب تاج الامرا بہادر است مداخلت غیر شرعاً و عرفاً نمی تواند شد۔"

اس فتوے پر حسب ذیل علماء کے دستخط تھے۔

مولانا عبدالعلی ملک العلماء بحر العلوم۔ مولانا غلام حسین خان قاضی العلوی، مولانا سید عبداللہ، مولانا محمود ساوی، مولوی محمد علی، مولوی محمد صادق۔ مولوی کریم اللہ، مولوی علی الدین احمد، مولوی عبدالرب فرزند ملک العلماء، مولوی محمد باقر

اہل خاندان نے جو محضر[۱] پیش کیا وہ یہ ہے:۔

"مایاں کہ مردم نسلی نواب والاجاہ علیہ الرحمہ و نواب عمدۃ الامرا بہادر ایم ظاہر اہل حکومت تجویز جانشین کردن عبدالعلی عرف عظیم الدولہ دارند، از روئے شریعت اہل اسلام بہ ہیچ وجہ حقیقت این معنی بہ مشارالیہ کہ محروم الارث است نمی رسد۔ امیر الامرا مرحوم ہیچ وصیت در باب فرزندی و وراثت عظیم الدولہ نکردہ بودند۔ بندگان نواب والاجاہ علیہ الرحمتہ نیز ہیچ چیز از متعلقہ امیر الامرا و از حقوق متعلقہ خود بہ مشارالیہ ندادند۔

---

[۱] اصلی محضر کتب خانہ سعیدیہ میں محفوظ ہے۔

مایان اصلا از جانشینی مشار الیہ مذکور راضی نیستم، تحریر فی التاریخ چہاردہم ربیع الاول ۱۲۱۶ھ
اس پر حسب ذیل افراد کے دستخط تھے:۔

عبد القادر خان امیر جنگ امیر الدولہ بہادر، اعتماد الملک، محمد عبد اللہ خان اعتماد الدولہ حسام الملک بہادر، انتظام الدولہ نصیر الملک بہادر، افتخار الدولہ بہادر، سلطان النساء بیگم، عمدة النساء بیگم رئیس النساء بیگم، عبد الغفار خان بہادر ثابت جنگ، زیب النساء بیگم، اشرف الملک بہادر، اعتضاد الملک بہادر، محمد حسین خان بہادر، رحیم النساء بیگم، خدیجہ بیگم، پرسن بی بی۔

اہل حکومت نے یہ کاغذات واپس کر دیئے۔ انجام کار یہ کہ ۱۹ ربیع الاول کو نواب عظیم اللہ وارث مسند نواب انور الدین خان شہید مقرر کر دیئے گئے اور ان کو نذریں دلوائی گئیں۔ نواب تاج الامراء کے دونوں مشیر سالار جنگ بہادر اور بہرام جنگ بہادر علیحدہ کر دیئے گئے اور انکو اور دوسرے لوگوں کو باغ سے باہر کر دیا گیا، تا آنکہ نواب تاج الامراء کی ڈیوڑھی پر ایک آدمی بھی باقی نہیں رہا[1] (۹) ماہ کے عرصے کے بعد غرہ ذی حجہ ۱۲۱۶ھ کو نواب تاج الامراء بہادر نے دنیا ناپائیدار کو داع کہی، حسب بیان صاحب تذکرہ صبح وطن اعظم بہ عمر ہیجدہ سالگی کاسۂ حیاتش پر شد۔

تذکرہ گلزار اعظم میں بیان کیا ہے کہ:۔

"الحق شاعرے با این نازک خیالی مدین کم سالی از خاندان انوریہ برنخاستہ بلی احدے دریں ممالک بازار سخن را بایں گرمی نیاراستہ۔" افسوس اس باہمت جوان کی قبر بھی مدراس میں عام لوگوں کو معلوم نہیں ہے۔

مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

---

[1] یہ ساری تفصیلات ایک یادداشت سے ماخوذ ہیں جو کتب خانۂ سعیدیہ میں محفوظ ہے اس میں اور بھی کاغذات محفوظ ہیں۔

حیدرآباد کا دفتر دیوانی و مال

انڈین ہسٹری کانگریس میں۔ جو بمقام بلدہ حیدرآباد منعقد ہوئی تھی سنایا گیا

از جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی

میرے مضمون کا عنوان جیسا کہ آپ سب کو معلوم ہے۔ حیدرآباد کا "دفتر دیوانی و مال" ہے۔ بظاہر عنوان کے لحاظ سے یہ ایسا موضوع نہیں معلوم ہوتا ہے جو آج کی اہم صحبت میں سماعت کے لئے پیش کیا جائے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ حیدرآباد کے دفاتر میں دفتر دیوانی و مال ہی کو قدامت اور اہمیت کے مدنظر دوسرے تمام دفاتر پر تفوق حاصل ہے۔ اس لئے اس کی سرگذشت موجب دلچسپی ہو سکتی ہے۔

دنیا کی ہر متمدن سلطنت کیلئے نظم و نسق۔ آئین اور قوانین کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ہر ملک کا آئین حکومت جدا۔ نظام سیاست مختلف اور طریقۂ حکمرانی جداگانہ ہوتا ہے۔

نظام سیاست۔ اور آئین جہاں بانی کی اجرائی کیلئے ایک صدر دفتر کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کے بغیر نظام سیاست نہ جاری ہو سکتا ہے اور نہ کاروبار مملکت چل سکتے ہیں، نظم و نسق کی پابندی ہو سکتی ہے اور نہ آئین و قوانین پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال ہر زمانہ میں ہر ملک میں اسکے انتظام کے لئے ایک خاص دفتر کی ضرورت لازمی ہے۔ جس کی مختلف شاخیں ہوتی ہیں جو اپنا اپنا کام انجام دیتی ہیں۔ صدر دفتر کو ایک درخت کے تنہ سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ جس کی کئی شاخیں ہوتی ہیں جس کے بغیر درخت کا وجود ناممکن ہے۔

آصفی حکومت ارباب تاریخ سے یہ امر پوشیدہ نہیں ہے کہ نواب آصفجاہ اول پہلی مرتبہ بزمانہ فرخ سیر سنہ ۱۱۲۴ھ میں دکن کی صوبہ داری پر مامور کئے گئے تھے اور دو سال سے زیادہ عرصہ تک آپ نے اس خدمت کو انجام دیا۔ اس کے بعد دوسری مرتبہ سنہ ۱۱۳۶ھ میں دکن کی جانب روانہ ہوئے اور زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ آپ کا دور حکمرانی زیادہ تر جدال و قتال میں گذرا۔ چنانچہ مبارز جنگ

اور مظفر جنگ کے قلیل زمانہ کے بعد نواب صلابت جنگ نے کئی سال تک حکمرانی فرمائی آپکے زمانہ میں بھی جنگ وجدل کے بادل دکن کی فضا پر منڈلاتے رہے کبھی شمالی حصہ میں خونریزی ہوتی رہی تو کبھی جنوب میں حتی کہ نواب نظام علی خان آصفجاہ ثانی کا دور حکومت آیا۔ اگرچہ انکے ؒ میں بھی سیاسی فضا مکدر رہی۔ اندرونی و بیرونی لڑائیوں سے دکن کی زمین خون سے رنگی جا رہی تھی لیکن چونکہ آپ مستقل طور پر عرصہ دراز تک حکمرانی کرتے رہے اس لئے باضابطہ نظم و نسق قائم کرنے کا موقع ملا۔ آپ بنفس نفیس امور مالی و ملکی کو انجام دیتے تھے حتی کہ ایک ایک دن کی سپاہی کی رخصت بھی آپ نے منظور فرمائی ہے۔ آپ کے بعد یہ بات باقی نہیں رہی۔ دیوان یا مدارالمہام وقت ہی زیادہ تر انصرام امور ملک اور کاروبار مملکت کے ذمہ دار ہو گئے تھے۔

اس امر کی صراحت کردی گئی ہے کہ ہر بادشاہ یا حکمران کے لئے ایک دفتر کی ضرورت داعی ہے اسی طرح سلطنت آصفیہ کا شاہی دفتر دفتر دیوانی اور مال تھا۔

وجہ تسمیہ | دفتر دیوانی اور مال کی وجہ تسمیہ پر ہم کو سب سے پہلے نظر ڈالنے کی ضرورت ہے اس کی وجہ تسمیہ کے متعلق بقول بعض "دفتر دیوان دکن ہی کا مخفف بظاہر دفتر دیوانی ہے" عام طور سے خیال یہ ہے کہ دفتر دیوانی "دیوان" کا دفتر تھا اس لئے اس نام سے موسوم ہوا۔ دکن کی کسی تاریخ میں دفتر دیوانی و مال کی وجہ تسمیہ کے متعلق کوئی وضاحت کم از کم میری نظر سے نہیں گزری۔ اس لئے کوئی صحیح رائے تاریخوں کے حوالہ سے بیان نہیں کی جا سکتی۔ البتہ میں اپنی ذاتی رائے اور خیال کا اظہار کرونگا۔

اگر اس کو دیوان کے دفتر سے موسوم کیا جائے تو فرض کرنا ہوگا کہ یہ دفتر اس وقت قائم ہوا جب کہ عہدہ دیوانی کا وجود ہوا تاریخوں سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ حضرت آصفجاہ اول نے کسی کو اپنا دیوان نہیں بنایا تھا۔ البتہ نواب ناصر جنگ نے اپنی مسند نشینی کے بعد سنہ ۱۱۶۲ ہجری میں صمصام الملک کو اس خدمت سے سرفراز فرمایا اس کے برخلاف دفاتر دیوانی و مال میں اسکے پہلے کے کاغذات موجود ہیں اس لئے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ اس کے قبل دفتر کا وجود تھا۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اگر دفتر دیوانی کو دیوان کا دفتر تسلیم کیا جائے تو پھر یہ بحث پیدا ہوتی ہے کہ آخر حکمران وقت کس طرح انصرام امور ملک کرتے تھے مہمات سلطنت کس طور پر انجام پاتے تھے۔ اگر کوئی شاہی دفتر علحدہ تھا تو وہ کون سا تھا حالانکہ حیدرآباد میں دفاتر دیوانی و مال سے قدیم دفتر کوئی نہیں ہے اور نہ قدیم کاغذات کسی اور جگہ محفوظ ہیں۔

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ دیوان یا مدار المہام کے فرائض مالی امور کا انجام دینا تھا۔ فوج کا تعلق بالکلیہ پیشکار اور بخشی الملک سے ہوتا تھا۔ فوجی کاغذات سے جو دفتر دیوانی میں موجود ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بخشی الملک کے اجراکردہ ہیں اس لئے دفتر دیوان کو ان سے تعلق نہیں ہوسکتا۔ حالانکہ قدیم زمانہ سے دفتر دیوانی و مال میں فوجی کاغذات بھی موجود ہیں۔

دفتر دیوانی میں خاص شاہی "سیاہہ" موجود ہے حالانکہ دیوان کے دفتر کو خاص شاہی سیاہہ سے کوئی تعلق نہیں ہوسکتا۔ اس سیاہہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں چار قسم کے کاغذات ہوتے تھے یعنے مال، سپاہ، محلات اور متفرق۔ بہرحال ان وجوہ سے میرا خیال ہے کہ دفتر دیوانی اور مال دیوان کے دفاتر نہیں تھے بلکہ شاہی دفاتر تھے ان کا تعلق بادشاہ وقت سے ہوتا تھا۔ البتہ زمانۂ مابعد میں جب کہ دیوان یا مدار المہام امورات مالی و ملکی میں زیادہ دخیل ہوگئے تو یہ دفاتر بھی ان کی نگرانی میں آگئے تھے۔

میرا خیال ہے کہ لفظ "دیوان" سے جس کے معنی دفتر کے ہیں لفظ دیوانی مخفف ہوا ہے۔ زمانۂ مابعد میں اس کے ساتھ دفتر کا لفظ مکرر اضافہ ہوگیا ہوگا۔ اس طرح "دفتر دیوانی" کی اصل قرار دی جاسکتی ہے۔

دفتر کو دیوان سے موسوم کرنے کی ابتدا حضرت عمرؓ سے ہوئی ہے چنانچہ الفاروق کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ آپ نے جو سرکاری عمارتیں تعمیر کرائی تھیں ان میں دار الامارۃ، بیت المال، قید خانے، مہمان خانے اور "دیوان" شامل تھے۔

دیوان کے متعلق یہ صراحت ہے کہ ایک مکان تھا جہاں دفتر کے کاغذات ملکی اور مالی

رہا کرتے تھے۔ فوج کا دفتر بھی اسی مکان میں رہا کرتا تھا۔ سلطنت کے نظم ونسق، حساب کتاب کا بھی یہی مکان مخزن ومعدن تھا۔ بہ الفاظ دیگر اس کو شاہی محکمہ کہا جا سکتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں یہی دستور حکومت اسلامیہ میں رائج رہا مگر چونکہ کام کی کثرت ہونے لگی اس لئے بجائے ایک دیوان کے مختلف دیوان ہوتے تھے۔ چنانچہ دیوان الانشا۔ دیوان الزمام۔ دیوان استیفا۔ دیوان الجند۔ دیوان الخراج وغیرہ ناموں کا پتہ چلتا ہے۔

ہندوستان کی اسلامی حکومتوں اور خود مغلیہ دور میں یہ لفظ مستعمل رہا ہے۔ اس طرح سلطنت آصفیہ کے ابتدائی دور میں شاہی دفتر کو لفظ "دیوان" سے موسوم کرتے ہوں گے اور زمانۂ مابعد میں وہ دفتر دیوانی کی صورت میں آگیا ہوگا۔ اس دفتر کو دفتر دیوانی سے موسوم ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ دور مغلیہ میں ہر صوبہ دار کے ساتھ "دیوان" یا چیف سکریٹری کا تقرر بھی ہوتا تھا اس طرح آصفجاہ اول کے ساتھ دکن کا جو دیوان مقرر ہوا ہوگا اس کا دفتر دفتر دیوان سے موسوم ہوا ہو۔ چونکہ دفتر دیوانی میں آپ کی صوبہ داری کے زمانے کے کاغذات بھی ہیں اس لئے اس خیال کی تائید بھی ہوتی ہے۔ اسی طرح دفتر مال کی وجہ تسمیہ کے متعلق میرا خیال ہے کہ چونکہ مالی امور اس دفتر سے متعلق تھے اس لئے دفتر مال سے اس کو موسوم کیا گیا ہوگا۔ اسکی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ دفتر دیوانی میں جو سیاہہ ہے نواب آصفجاہ ثانی کے تخلیہ کاغذات کا موجود ہے۔ اس میں "مال" کے عنوان کے تحت جن کاغذات کی کھتاونی ہوئی ہے وہ عموماً مالی انتظام سے متعلق ہیں۔ فوج یا محلات اور دیگر متفرق نوعیت کے کاغذات کی اس کے سلسلے میں کھتاونی نہیں ہوئی ہے بلکہ ان کو جداگانہ عنوانوں کے تحت رکھا گیا ہے۔

بہرحال جیسا کہ میں نے ظاہر کیا ہے اس دفتر کی وجہ تسمیہ کے متعلق کسی تاریخ سے کوئی صحیح خیال ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔ جو خیال میں نے ظاہر کیا ہے ممکن ہے کہ صحیح ہو اور ممکن ہے غلط ہو۔

دفاتر دیوانی اور مال کی ابتدا۔

ان دفاتر کی وجہ تسمیہ کے بعد ان کی ابتدا کے متعلق صراحت کرنے کی ضرورت ہے۔ بعض اصحاب کا خیال اسکی ابتدا کے متعلق یہ ہے کہ

”حضرت مغفرت مآب نواب آصفجاہ اول نے دکن میں سلطنت آصفیہ کا نظم ونسق وہی رکھا جو سلطنت مغلیہ میں رائج تھا۔ تمام امور کی انجام دہی کے لئے دفتر دیوانی قائم کیا گیا“

اس سے واضح ہے کہ حضرت آصفجاہ اول نے دفتر دیوانی قائم کیا تھا لیکن دفتر دیوانی میں ایسے کاغذات بھی موجود ہیں جو ۱۱۲۶ھ میں جاری ہوئے ہیں اس سے یہ تصور کرنا ہوگا کہ آپ کے ابتداء صوبہ داری کے کاغذات بھی یہاں موجود ہیں اس لئے دفتر دیوانی کی ابتدار کو ۱۱۲۶ھ سے تسلیم کرنے میں کوئی امر مانع نہیں معلوم ہوتا۔

دفتر مال کی ابتدار کے متعلق دکن کی مشہور اور معتبر تاریخ گلزار آصفیہ میں مرقوم ہے:-

”نواب آصفجاہ بہادر برائے انتظام دکن از پیشگاہ خلافت رخصت انصراف یافتند راجہ ساگرمل بہادر را بقدر دانی وافزائش مراتب عزت وحرمت ہمراہ از دارالخلافۂ شاہ جہاں آباد بدکن آوردہ مختار کاروبار دفاتر مال وملک ساختند۔ مشہور آفاق است کہ ہفت صد متصدیان ذی مرتبہ در کچہری مال در پیش دستی واطاعت امر راجہ موصوف می بودند صفحہ (۲۵۳)	نواب آصفجاہ بہادر جب دہلی سے دکن کی جانب روانہ ہوئے تو راجہ ساگرمل کو عزت وحرمت کے ساتھ اپنے ساتھ دارالخلافہ شاہ جہاں آباد سے ہمراہ لاکر دفاتر مال کا مختار کل فرمایا۔ مشہور ہے کہ آپ کی کچہری میں سات سو متصدی کام کرتے تھے۔

اس سے واضح ہے کہ دفتر مال ۱۱۲۶ھ میں قایم ہوا ہے۔

سر دفتر: اس امر کی وضاحت ہوچکی ہے کہ دفاتر دیوانی اور مال نواب آصفجاہ اول کے زمانہ میں قایم ہوئے ہیں۔ ان دفاتر کے افسر اعلیٰ سر دفتر سے موسوم تھے۔ دفتر مال کے پہلے سر دفتر راجہ ساگرمل تھے۔ ان کے بعد ان کی اولاد سے کوئی شخص اس خدمت سے سرفراز ہوتا رہا آخری شخص راجہ شیوراج آنجہانی تھے جن کے مرنے پر ۱۳۳۴ف مطابق ۱۹۲۴ء میں یہ دفتر دفتر دیوانی کے ساتھ ضم کردیا گیا۔ دفتر مال کی وجہ سے راجہ ساگرمل کا خاندان

مال والوں کے خاندان سے موسوم ہوا ہے۔ اور ان کے رہنے کا محلہ آج تک مال والوں کی گلی کہلاتا ہے۔ راجہ دہرم کرن بہادر صدرالمہام تعمیرات اس وقت اس خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔

آصفجاہ اول کے زمانہ میں دفتر دیوانی کے سردفتر کون تھے، ہنوز تحقیق طلب ہے۔ البتہ نواب میر نظام علی خان آصفجاہ ثانی کے زمانے میں راجہ رائے رایاں کلاں دفتر دیوانی کے سردفتر مقرر ہوئے۔ راجہ صاحب کے بعد ان کے خاندان میں یہ خدمت رہی راجہ شنکر راؤ رائے رایاں کے انتقال پر ۱۳[illegible]ھ سے یہ دفتر سر چارج کیین واکر نے راست سرکاری نگرانی میں لے لیا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے دفتر مال، دفتر استیفا، دفتر ملکی وغیرہ دفتر دیوانی کے ساتھ ضم ہوتے گئے۔ راجہ رائے رایاں کے خاندان کے چشم و چراغ راجہ شام راج راجونت بہادر اس وقت بقید حیات ہیں۔

دفتر دیوانی و مال سے کیا کام لیا جاتا تھا

اب مجھے یہ بیان کرنا ہے کہ زمانہ سابق میں دفتر دیوانی اور مال سے کیا کام لیا جاتا تھا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے یہ شاہی دفاتر تھے جملہ امور سلطنت اور انصرام مملکت کا کام ان ہی دفاتر سے وابستہ تھا۔ خواہ وہ کام مالی ہوں یا حسابی، فوجی ہوں یا انتظامی، سیاسی ہوں یا تجارتی سب کا تعلق بالکلیہ ان ہی دفاتر سے متعلق تھا۔

اگر ہم ان دفاتر کے کاروبار کے متعلق مزید وضاحت کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ تقرر عمالان و تعہداران انتظام مالیہ، حساب و کتاب ریاست، ترتیب موازنہ، وصولی مال گزاری و دیگر ابواب اجرائی اسنادان معاش عطار "جاگیر" انعام" یومیہ اور منصب وغیرہ نگہداشت جمعیت تقرر تبدیل تعیناتی و برطرفی اہل سیف، اہل قلم وقائع نگاری عہدنامہ جات سیاسی و تجارتی غرض ایسا کوئی کام نہیں تھا جو ان دفاتر سے متعلق نہ ہو۔

دفتر مال سے متعلق صرف صوبہ جات حیدرآباد اور بیدر رہتے اور دفتر دیوانی سے

صوبہ خجستہ بنیاد، برار اور بیجاپور کو تعلق تھا علاوہ ازیں دفتر مال سے زیادہ تر مالی امور طے ہوتے تھے اس کے برخلاف دفتر دیوانی کو ہر قسم کے کاروبار سے تعلق رہا لیکن حضرت آصفجاہ ثانی کے بعد اس میں کچھ تغیر ہو گیا تھا۔ دفتر مال میں بھی دوسرے امور طے ہونے لگے تھے۔

اب ان دفاتر سے کیا کام لیا جاتا ہے اب میں اس امر کی صراحت کروں گا کہ گزشتہ چالیس پچاس سال سے ان دفاتر سے کیا کام لیا جارہا ہے نواب مختار الملک نے جب ۱۲۸۶ف ۱۸۸۳ء میں دیگر دفاتر سرکار عالی قائم کرائے تو یہ دفاتر گویا بے کار ہو گئے تھے البتہ صرف تصدیق اسناد کا کام لیا جاتا رہا، جاگیرداران انعام دار اور یومیہ دار وغیرہ اپنی معاشوں کا دعویٰ متعلقہ دفاتر میں دائر کریں تو ان کے اصل اسناد کی تصدیق ان دفاتر سے چاہی جاتی ہے یہاں ہر نوعیت کی معاش کے داخلے مختلف ہوتے ہیں جن کے مدنظر سند اور معاش زیر بحث کی تصدیق یا تکذیب کی جاتی ہے۔

دوسرا کام ان دفاتر میں تہذیب کاغذات کا ہوتا رہا ہے چونکہ یہ دفاتر ایک عرصہ دراز تک غیر مہذب حالت میں تھے ان کا کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ اس لئے ردی کی سی حالت ہو گئی تھی اس طرح صدہا کاغذ تلف بھی ہو گئے تھے باقی ماندہ کاغذ کو اچھی حالت میں لانا اور رکھنا ایک ضروری امر تھا اس کے مدنظر یہ کام بھی ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ تہذیب اور ترتیب کا بہت کچھ کام ہو چکا ہے۔

چونکہ اس دفتر کو ایک کارآمد دفتر اور تاریخی مخزن بنانا سرکار عالی کے پیش نظر ہے اس لئے ایک مختصر مگر نادر کتب خانہ بھی فراہم کر لیا گیا ہے۔

آئندہ کیا کام لیا جاسکتا ہے مجھے بالآخر یہ بتانا ہے کہ اس دفتر سے کیا کام لیا جاسکتا ہے اور پبلک کو کیا فائدہ پہونچ سکتا ہے۔

(۱) سب سے پہلے تو یہ ہے کہ تاریخ دکن سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہاں کافی ذخیرہ موجود ہے خواہ وہ تاریخ ملکی ہو یا انتظامی فوجی ہو یا سیاسی۔

دفتر دیوانی اور مال کے ذخیرہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ملک سرکار عالی کی تقسیم کیا تھی کتنے صوبے ضلع اور تعلقے تھے۔ مواضعات کتنے تھے کون کون موضع کس تعلقہ اور ضلع کے تحت تھا، صوبہ میں کتنے ضلع اور کتنے تعلقے ہوتے تھے ان کی حیثیت کیا تھی سرکاری خالصہ میں شامل تھے یا کسی کی جاگیر وانعام میں۔ ان کا محاصل سالانہ کیا تھا اس کے وصول کرنے کے کیا طریقے رائج تھے سرکاری آمدنی کے کیا کیا ابواب تھے، سالانہ آمدنی کیا ہوتی تھی، رقم کہاں جمع ہوتی ارسال رقم کا کیا طریقہ تھا، سرکاری خزاین کہاں کہاں تھے۔

آمدنی وخرچ کا توازنہ کس طرح مرتب ہوتا، خرچ کے ابواب کیا ہوتے تھے۔ اخراجات کے بعد بچت ہوتی تھی یا فاضل خرچ بہ آمد ہوتا، قرضہ تھا تو اس کی ادائی کا کیا طریقہ تھا کون کون سکے رائج تھے ان کی مالیت کیا ہوتی تھی، دارالضرب کہاں کہاں تھے اور اس کا انتظام کیا تھا،

مالی اور انتظامی عہدہ دار کون کون ہوتے تھے ان کے فرائض منصبی کیا تھے ان کے تقرر تبدیل تنزل برطرفی کا کیا طریقہ تھا، رعایا کے ساتھ ان عہدہ داروں کا برتاؤ کیا ہوتا تھا۔

ملک میں عدالت اور پولیس کے انتظامات کیسے تھے، قاضی کے فرائض کیا تھے اور کوتوال کیا کیا امور انجام دیتا تھا، تعمیرات۔ پبلک ورکس بلدی انتظامات کیا تھے، ملک میں آب پاشی کے کیا ذرائع تھے ان کی کس طرح تعمیر و ترمیم ہوتی تھی۔

تعلیم کا کیا انتظام تھا دواخانوں حکیموں، ویدوں، مشائخوں، حافظوں، عالموں، پنڈتوں کو کس لئے روزینے مقرر ہوتے تھے، مسجدوں دیولوں خانقاہوں، مٹوں وغیرہ کو معاش کیوں جاری ہوتی تھی، ان کے انتظامات کیسے تھے۔

ملک میں ٹپہ کا کیا طریقہ اور کیا انتظام تھا۔ قحط کے موقع پر کیا انسدادی تدابیر اختیار کئے جاتے تھے۔

فوج کا کیا انتظام تھا۔ اسکی تقسیم کیا تھی۔ ان کی تنخواہیں کیا ہوتی تھیں۔ قلعے کتنے تھے، کون کون قلعے مشہور تھے، قلعہ دار کون تھے، ان کے فرائض کیا تھے قلعوں کی حفاظت کا کیا انتظام تھا۔

سرکار آصفی کے معاہدات اور عہد نامہ جات سرکار کمپنی پیشوا اور حیدر علی کے ساتھ کیا کیا ہوئے، تھے۔

ان پر کس طرح عمل ہوا۔ باہر کی کیا کیا خبریں کہاں کہاں سے آتی تھیں۔ ان کا طریقہ کیا تھا۔

بہرحال تاریخ دکن کے متعلق ہر قسم کا ذخیرہ ان دفاتر میں دستیاب ہو سکتا ہے۔

(۲) اگر کسی شخص کو دکن کی ملکی اور سیاسی تاریخ کے قطع نظر صرف قلمرو آصفی کے معاش داروں کے متعلق معلومات فراہم کرنے کی ضرورت ہو تو اسکے لئے بھی یہاں بیش قیمت اور کارآمد مسالہ موجود ہے۔ اس دفتر سے معلوم ہو سکتا ہے کہ کن کن کو کب کب کتنی معاش عطا ہوئی بعد عطا اس میں کس طرح کیا کیا تغیرات ہوئے ہر صوبہ ضلع اور تعلقہ میں کتنی معاش کس کس نوعیت کی جاری تھی۔

ملک میں خطاب یافتہ کون کون اصحاب تھے۔ کس کس سنہ میں ان کو کیا کیا خطابات ملے تھے خطاب کے ساتھ کیا لوازمات تھے۔

اس طرح امراء رؤساء اور جاگیردار، منصب دار کی فہرستیں تیار ہو سکتی ہیں اور ان کے معاش کے متعلق ہر قسم کا مواد مل سکتا ہے۔

(۳) جس طرح تاریخ دکن کے ریسرچ اسکالر کو مواد مل سکتا ہے، اسی طرح تاریخ ہند سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے یہاں کافی مسالہ فراہم ہے۔ اورنگ زیب خلد آشیاں اور شاہ جہاں صاحب قران کے عہد کے ایسے کاغذات یہاں موجود ہیں جن سے ان کے عہد حکومت پر بہت کچھ روشنی پڑ سکتی ہے۔ ایسے بے شمار کاغذات جو ایک عرصہ تک اورنگ آباد میں مقفل اور ردی کی حیثیت سے پڑے ہوئے تھے اب دفتر دیوانی میں محفوظ ہو چکے ہیں۔

ان کاغذات میں اخبارات، روزنامچے انتظام ملک کے کاغذات، بوقت محاصرہ اور جنگ قلعوں کی امداد، مردم شماری، بہائم شماری وغیرہ اس نہج کا کافی ذخیرہ مل سکتا ہے۔

اس کے علاوہ دہلی لکھنؤ، پونہ، میسور کے اخبارات وغیرہ سے وہاں کے حالات اور بادشاہوں کے روزانہ مشاغل پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔

(۴) شائقین تاریخ کی طرح معاشیات کے محققین کو یہاں سے کارآمد مواد حاصل ہو سکتا ہے۔ آج سے سو دو سو تین سو سال پیشتر کے اجناس کے نرخنامے، قحط کے زمانہ میں ان کا نرخ کیا ہوتا تھا، سرکاری محصول کن کن اشیاء پر لیا جاتا تھا اور کیا لیا جاتا تھا۔

ملک کی ثروت اور دولت کیا تھی، چاندی سونے کا کیا نرخ تھا۔ غرض یہ ایک سرسری خاکہ ہے جو دفتر دیوانی و مال کے ذخیرہ کے متعلق پیش کیا گیا ہے۔ فقط

مجلہ:۔ جس وقت یہ مقالہ کانفرنس میں پڑھا گیا تھا مقالہ نگار صاحب سے بعض امور کے متعلق سوالات

بھی ہوئے تھے، ایک سوال یہ بھی تھا کہ سبیل بند کو عصری موازنہ کہنا کس حد تک درست ہو سکتا ہے۔
اس وقت اس بارے میں بحث مختتم صورت اختیار نہ کر سکی۔ اس بارے میں ضرورت ہے کہ مزید تحقیق
عمل میں لائی جائے، نواب عزیز جنگ مرحوم نے اپنی کتاب سیاق دکن میں لکھا ہے کہ سبیل بند، قاب اضافت
ہے بند سبیل کی، بند سے بند کا غذ مراد ہے اور سبیل عربی زبان کا لفظ ہے معنی راہ، سبیل بند سیاق
عجم میں اس کاغذ کا نام ہے جو مداخل اور مخارج کی راہ دکھلاتا ہے یعنی کس آمدنی اور کس خرچ کو کس صدر مد
اور مد اور باب سے تعلق ہے اور کس خرچ کی گنجائش ہے اور کس خرچ کے لئے گنجائش نہیں ہے یہ سب امور
سبیل بند سے ظاہر ہوتے ہیں، سیاق عرب میں اس کاغذ کا نام موازنہ ہے، موازنہ عربی زبان کا لفظ ہے
جس کے معنی ہم وزن رہنے کے ہیں، لیکن اصطلاح سیاق میں موازنہ سے وہ کاغذ مراد ہے جس میں
رقوم جمع اور رقوم خرچ دونوں کی نسبت خرچ حقیقی سال گزشتہ ....

....

اور تخمینہ و اندازہ کا مقابلہ کیا جاتا ہے اور اسی مقابلہ کے ذریعہ سے ایک معتدل رقم سال آئندہ
کیلئے مداخل و خارج کی بابت باب وار قائم کی جاتی ہے۔

سیاق عرب و دکن میں سبیل بند کا نام فی زمانناموازنہ ہے جب تک دکن میں سیاق قدیمہ کا عمل
رہا موازنہ کو سبیل بند سے موسوم کرتے تھے (اور اسکی ترتیب بندات پر ہوا کرتی تھی لیکن سیاق جدید قائم
ہوتے پر اس کو محاسبین دکن نے موازنہ سے موسوم کیا اور اسی کی ترتیب جدید قائم کی۔ (صفحات ۹۳ و ۹۴)
ایا مقالہ نگار صاحب سے یہ ممکن ہے کہ کسی قدیم سبیل بند کی اشاعت فرمائیں تاکہ موازنہ کا جو عصری
معیار ہے اس پر اسکو جانچا جائے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک سبیل بند پر کیا موقوف ہے ہمارے ملک
کے نظم و نسق کا ہر پہلو تحقیق و تلاش کا مستحق ہے۔ یوں اس مضمون کے دوسرے امور بھی تنقید و بحث کے قابل ہیں۔

مخطوطات کے خزانے

از محمد غوث صاحب ایم۔ اے

(۱)

میر عبدالرزاق صمصام الدولہ شہنواز خاں کے خطوط

نواب ناصر جنگ شہید اور نواب صلابت جنگ مرحوم کے زمانہ میں صمصام الدولہ شہنواز خاں نے اپنی خداداد قابلیت اور وفا شعاری کی بدولت بڑی نام آوری حاصل کی۔ وکیل مطلق کے اہم ترین عہدہ پر ان کو مامور کیا گیا تھا۔ اس زمانہ کے نازک اور پیچیدہ حالات کو سنبھالنے کیلئے انھوں نے اپنی سفر و حضر کی کوشش عمل میں لائی تھی۔ مآثر الامرا اور بہارستان سخن کے مولف کی حیثیت سے تذکرہ نویسوں کی صف اول میں بھی انھوں نے اپنی جگہ حاصل کی ہے۔

ان کی شخصیت کی اہمیت کے لحاظ سے ان کی خط و کتابت کو بھی جیسی کچھ اہمیت حاصل ہونی چاہئے وہ صاف طور سے واضح ہے۔ کتب خانہ آصفیہ میں حضرت آصفجاہ اول کے میر منشی موسوی خان جرأت کے منشآت کا ایک نسخہ انشائے میر محمد ہاشم کے نام سے محفوظ ہے[۲]۔ اس کے آخر میں ناقل کتاب نے بہارستان سخن کا تکملہ بھی شامل کر دیا ہے۔ اس تکملہ میں شہنواز خان کے ۶۶ مکاتیب بھی شامل ہیں۔

واضح ہو کہ بہارستان سخن کا موضوع شعرائے فارسی کا تذکرہ ہے۔ قدما کے علاوہ ہندوستان کے فارسی گو شعراء کے حالات بھی اس میں قلم بند کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کا تکملہ مولف کے فرزند میر عبدالحی خان صارم نے مرتب کیا اور لکھا ہے کہ بہارستان سخن کی ترتیب کے بعد مولف کو یہ خیال پیدا ہوا کہ چند دوسرے سخن سراؤں کے حالات بھی لکھے جائیں چنانچہ ان کے نام مولف نے کتاب کے اپنے نسخہ کی پشت

---

[۱] اس کے متعلق مزید تفصیلات کیلئے ملاحظہ ہو راقم کا مضمون مطبوعہ رسالہ شباب جلد ۵ نمبر ۲ ص ۲۰۱ انشا فارسی

لکھ دیئے تھے۔ قبل اسکے کہ ارادہ کی تکمیل ہوتی شہ نواز خان اس زمانہ کی افراتفری میں قتل ہو گئے۔ بعد ازاں میر عبدالحی خان "صمصام" نے ان باقی ماندہ شعرا کے حالات خود قلم بند کئے اور اصل کتاب میں متعلقہ باب[1] کے آخر میں "تکملہ" لکھکر ان کا اضافہ کر دیا۔[2]

انشائے میر محمد ہاشم کے ساتھ جو "تکملہ" شامل ہے وہ گویا آخری باب (طبقہ) کا تکملہ ہے۔ میر عبدالحی خان "صمصام" نے صراحت کی ہے کہ انہوں نے یہ امر پسند کیا کہ میر غلام علی آزاد بلگرامی اور میر رضی "تبسم" کے حالات قلم بند کئے جائیں اس تقریب میں چند دوسرے شعرا کے حالات بھی مرتب کرکے آخری باب کا ضمیمہ کر دیئے گئے۔

اس "تکملہ" میں "صمصام" نے لکھا ہے کہ ان کے والد اپنے شباب کے زمانہ میں کبھی کبھی شعر کہہ لیا کرتے تھے لیکن لوگوں کو ان کی نثر زیادہ پسند ہوتی تھی کہ اس کی ایک طرز خاص تھی۔ اسی کے مدنظر ان کے چند "رقعات" فراہم کرکے اس تکملہ کے ذیل کے طور پر درج کئے گئے۔

یہ منشات تعداد میں ۶۶ ہیں مکتوب الیہم اور ہر مکتوب الیہ کو جس تعداد میں یہ خطوط لکھے گئے ان کی تفصیل ذیل میں درج ہے۔

(۱) عرضداشت بہ پیشگاہ عزیز الدین عالمگیر ثانی ایک قطعہ (۲) خط جو نواب صلابت جنگ کی جانب سے فیروز جنگ کو بموجب مسودہ شہ نواز خان لکھا گیا۔ ایک قطعہ۔ (۳) فیروز جنگ کی خدمت میں عرائض دو قطعے (۴) خطوط بنام راجہ کمیتھیہ راؤ ہرکارہ بادشاہی دو قطعے (۵) نواب ناصر جنگ کی خدمت میں عرضداشتیں ۵ قطعات (۶) خطوط بنام راؤ بالاجی پنڈت پردھان دو قطعے (۷) خطوط بنام ملہار راؤ ہلکر دو قطعے (۸) خط بنام گورنر پانڈی چری ایک قطعہ (۹) خط رکن الدولہ نصیر جنگ کے نام پر ایک قطعہ (۱۰) خطوط بنام امانت خان ۴ قطعات (۱۱) خطوط بنام قطب الدولہ محمد انور خان تین قطعات (۱۲) خط بنام قسورہ جنگ ایک قطعہ (۱۳) خط بنام قوی جنگ ایک قطعہ (۱۴) خط بنام احمد علی خان ایک خط (۱۵) خطوط بنام مہاراجہ ارجن بہادر دو قطعات (۱۶) کمال الدین کے نام پر خط ایک قطعہ (۱۷) شاہ علی درویش کے نام ایک قطعہ (۱۸) رائے سنبھو لال کے نام ایک قطعہ (۱۹) نصیر الدین علی خان کے نام

[1] اصل کتاب میں "باب" کو طبقہ قرار دیا گیا ہے۔ [2] ملاحظہ ہو صفحہ ۳۰۷ و ۳۰۸ نسخہ کتب خانہ آصفیہ انشا فارسی ۲۱۰

ایک قطعہ (۲۰) دلاور خان کے نام ۱۱ قطعات (۲۱) میر غلام علی آزاد بلگرامی کے نام ۱۱ قطعات (۲۲) درگاہ علی خان کے نام ۶ قطعات (۲۳) میر محمد حسین خاں کے نام دو قطعات (۲۴) سید غلام حسین کے نام ایک قطعہ (۲۵) بنام رستم خان ایک قطعہ۔

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ جن اصحاب کو یہ خطوط لکھے گئے ہیں ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو اس زمانہ میں واقعات وحوادث کا محور تھے۔ ان خطوط سے اس وقت کے سیاسی اور معاشی ومعاشرتی حالات کا کھلا اندازہ ہوتا ہے۔ جب تک ان سارے خطوط کی تاریخ کی کتابوں کی روشنی میں ترتیب عمل میں نہ آئے ان کی اہمیت کما حقہ ظاہر نہیں ہوسکتی۔ ضرورت ہے کہ یہ اور اس قسم کے دوسرے مکاتیب کی ترتیب اور اشاعت کا ایک خاص سلسلہ قایم کیا جائے تاکہ تاریخ کی کتابوں میں جو امور تشنہ رہ گئے ہیں ان کی تکمیل ہوجائے۔ جامعۂ عثمانیہ کا شعبۂ تاریخ اگر ام۔ اے کی جماعت میں اس نوعیت کے مکاتیب کی ترتیب مقالہ نگاروں کا موضوع قرار دینے پر غور کرے تو شاید جلد ایسے مکاتیب کی ترتیب واشاعت کی صورت پیدا ہوسکے۔ نامناسب نہ ہوگا اگر یہاں شہ نواز خان کے بعض مکاتیب کا خلاصہ درج کیا جائے۔

نواب صلابت جنگ نے دولت آباد کے قلعہ پر تاخت کی تھی اسکے وجوہ واسباب کے متعلق شہ نواز خان نے اپنی عرضی میں نواب وزیر ممالک فیروز جنگ کو لکھا ہے کہ:—

قلعہ داران دولت آباد نے جاگیرات کی بحالی کے باوجود اشرار کو پناہ دینا اپنا شعار کرلیا تھا، اس سلسلے میں قلعہ داروں کو پند ونصیحت کی گئی کہ اگر کوئی شخص کسی ظالم کے ظلم سے تنگ آکر امان طلب کرے تو اس کو امان دینا درست ہوگا لیکن ہمشہ ایسے افراد کو پناہ دینا جن کے ذمہ سرکاری محاسبہ ہوتا ہے امور شاہی کیلئے نقصان رساں ہے قلعہ داروں نے یہ نصیحت نہیں سنی، چونکہ بندگانعالی (نواب صلابت جنگ) کو کار بادشاہی کے سلسلہ میں اکثر دور دراز مقامات پر جانا ہوتا ہے اس لحاظ سے ہمیشہ اس بات کی خلش رہتی تھی کہ اورنگ آباد میں کوئی مقام ایسا نہیں ہے کہ جہاں ضرورت کے وقت سب اہل محل کی نگہداشت ہوسکے۔ پھر جب کہ ابدالی کی آمد آمد کا شہرہ ہے۔ علاوہ ازاں یہ بات ظاہر ہوی کہ قلعداروں نے یہ بات ٹھان لی تھی کہ قلعہ مخالفوں کے سپرد کردیا جائے بنابراں نواب صلابت جنگ نے مصلحت وقت کی بنا پر قلعہ پر یورش کی اور قلعہ داروں کو انکے

حسب خواہش دوسری جاگیر دے دی۔ .... اس زمانہ میں بھی دربار دہلی سے سند کا حصول لازم تھا چنانچہ نواب صلابت جنگ کے نام قلعہ دولت آباد کی سند عطا ہونے کے لئے شہ نواز خان نے فیروز جنگ کو توجہ دلائی ہے "از توجہ حضرت یقین است کہ زود سند مرحمت شود"

اسی خط میں شہ نواز خان نے فیروز جنگ کو یہ بھی لکھا ہے کہ نواب صلابت جنگ نے بادشاہ کی خدمت میں یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ خود کو امیرالممالک کا خطاب مرحمت فرمایا جائے اور بادشاہ نے اسکو پسند بھی کیا تھا۔ لیکن ابھی فرمان صادر نہیں ہوا۔ اگر جلد شقہ والا صادر ہو جائے تو بہتر ہوگا۔

واضح ہو کہ نواب فیروز جنگ بھی حضرت آصف جاہ اول کے فرزند اور دہلی میں مقیم تھے۔ ابتداء میں انہوں نے دکن کی حکومت حاصل کرنے پر توجہ نہیں کی بلکہ اولاً نواب ناصر جنگ شہید اور بعد میں نواب صلابت جنگ کو صوبہ دار دکن تسلیم کر لیا۔ چنانچہ شہ نواز خان کے ان مکاتیب سے بھی یہی امر واضح ہے لیکن بعد میں نواب فیروز جنگ نے صوبہ داری دکن کی سند نواب صلابت جنگ کے برخلاف دہلی کے دربار سے حاصل کر لی اور اپنے لشکر کے ساتھ اورنگ آباد پہونچ گئے تھے کہ انتقال کر گئے۔ یہ بات تحقیق طلب ہے کہ نواب فیروز جنگ کو نواب صلابت جنگ سے اختلاف کب پیدا ہوا اور اسکے اسباب کیا تھے۔

نواب صلابت جنگ کے دربار میں فرانسیسی ارباب تدبیر کو جو رسوخ حاصل تھا وہ تو سب کو معلوم ہے لیکن ابھی اس بات کی کافی تحقیق ہوئی ہے کہ فرانسیسی لوگوں کے رسوخ سے کیا کیا نقصانات عاید ہوئے، آیا انہوں نے اپنے واجبات کی کماحقہ تعمیل کی یا نہیں۔ نواب شہ نواز خان نے راجہ کیشوراؤ ہرکارہ بادشاہی کو اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ اس سال ارادہ تھا کہ سری رنگ پٹن کی جانب روانگی عمل میں آئے لیکن فرانسیسی لوگ ضرورت کے وقت نہ آنے سے کورٹکال پر توقف کرنا ضروری معلوم ہوا۔

اس زمانہ میں مالیہ کی جو خراب حالت تھی اسکے سلسلہ میں بھی راجہ کیشوراؤ ہرکارہ بادشاہی کو ایک خط میں مطلع کیا ہے کہ اب نہ خزانہ ہے اور نہ جنس۔ کارخانجات رکاب نواب ناصر جنگ کے ساتھ میں برباد ہو گئے۔ ایک چھاونی میں ہر چند اس بات کی کوشش کی گئی کہ بعض اجناس تنخواہ داروں کو دیئے جائیں لیکن کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ اس جملہ کا مطلب واضح نہ ہو سکا کہ از کتاب خانہ حیدرآباد ہفت ہزار

کتاب بود یکہزار و پانصد جلد برآمد کہ بہ پنج ہزار روپیہ نمی رسد گفتم برائے ایں قدر بدنامی اموال فروشی نمی تواں گرفت"

ایک اور جملہ سے حالات کس درجہ تاریک نظر آتے ہیں۔

"طرفہ ایں کہ سررشتہ کاغذ نیست و سررشتہ داران موجود۔ انہا می گویند جنس بہ بکار رفتہ، ایں ہا می گویند کاغذ جنس ہمہ بہ بوط رفتہ" کاغذ تک بھی اس وقت موجود نہ تھا۔

نواب ناصر جنگ نے حکومت دکن حاصل کرنے کے بعد دہلی کا قصد کیا تھا بعد میں ارادہ ترک کر کے حافظ ہدایت محی الدین خان مظفر جنگ کی سرکوبی کے لئے کرناٹک کا قصد فرمایا۔ اس وقت ناصر جنگ شہید نے شاہنواز خان سے بھی غالباً مشورت کی۔ انہوں نے صاف طور سے یہ رائے دی ہے کہ دہلی کا قصد نہ کرنا بہتر ہوگا۔ من جملہ اور وجوہ کے یہ بھی لکھا ہے کہ

"بادشاہ وقت مستقل صاحب عزیمت نوکری بالاصالۃ تو اندشد، مثل عالمگیر بادشاہ می باید"

لیکن شاہنواز خان تاڑ گئے تھے کہ ان کی رائے پر عمل نہ ہوگا چونکہ متوقعہ اور متحصلہ نتائج ہمیشہ ایک نہیں ہوتے اس لئے اس پر تکیہ کر کے آخر میں یہ لکھا کہ

"باوصف ایں ہمہ اقبال کارہا وارد بفضل الٰہی ہمت خداداد حضرت یار و راست۔ آنچہ بوہم درنیاید از پردۂ غیب بظہور خواہد رسید فاذا عزمت فتوکل علی اللہ"

راؤ بالاجی پنڈت پردھان نے لکھا تھا کہ جانب کرناٹک عزیمت کرنی چاہیے اسکے جواب میں لکھا ہے کہ کرناٹک کی جانب راؤ بالاجی کی روانگی دو حال سے خالی نہ ہوگی یا تو انگریزوں سے پرخاش منظور ہے یا اس کے برعکس، اگر انگریزوں سے پرخاش منظور ہے تو ہمیں آپ کی امداد کرنی پڑیگی اور یہ عہد و پیمان کے منافی ہے۔

شاہنواز خان نے گورنر پانڈی چری کو خط لکھا ہے کہ ۱۵ لاکھ روپئے قرض دیئے جائیں تاکہ سپاہ کی تنخواہ ادا ہو سکے۔ اور جس طرح سے کہ رقم روانہ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے اس سے صاف

ظاہر ہوتا ہے کہ حالات کس قدر نازک تھے۔ غرض تمام خطوط کا بامعان مطالعہ کیا جائے اور واقعات مندرجہ کتب تاریخ سے مطابقت دی جائے تو نئے امور روشنی میں آئینگے یا جو امور معلوم ہیں ان کی مزید توثیق و تصدیق ہوگی۔

یہ مشارت کتب خانہ آصفیہ کے نسخہ ع۲۰۱ انشا فارسی میں شامل ہیں نیز بہارستان سخن کے نسخہ ع۱۹۳ تذکرہ فارسی میں بھی یہ مکتوبات موجود ہیں، خود بہارستان سخن پر آئندہ علحدہ لکھا جاسکے گا۔

(۲)
"چند فرامین بادشاہان دہلی موسومہ رؤسائے دکن وغیرہ"

متذکرہ صدر نام سے کتب خانۂ سعیدیہ میں کاغذات تاریخی کے ذخیرہ کے ساتھ ایک رسالہ مخزون ہے۔ اس مخطوطہ کی تمہید یا اسکے ترقیمہ سے رسالہ کے مرتب کی نسبت کوئی اطلاع حاصل نہیں ہوسکی، نیز ان ماخذوں کی نسبت بھی کوئی علم حاصل نہ ہوسکا کہ جن سے یہ مشارت ماخوذ ہیں، البتہ صفحہ اول پر "خواجہ حبیب اللہ" بطور دستخط تحریر ہے، شان خط سے یہ امر صاف ظاہر ہے کہ مرتب رسالہ نہ سہی ناقل یہی صاحب ہیں، نیز یہ عبارت بھی صفحہ اول پر درج ہے " مالکہ غلام محمد بن عبدالوہاب عفی اللہ عنہما" اول الذکر غلام محمد (شرف الدولہ) نواب غلام محمد غوث خان آخری نواب کرناٹک کے زمانہ میں بخشی کے عہدہ پر مامور تھے، ثانی الذکر عبدالوہاب (مدارالامر) نواب صاحب موصوف کے دربار میں دیوان تھے ۱۲۸۵ھ میں وفات پائی۔

بہرحال اس مجموعہ میں ایسے مشارت فراہم کئے ہیں جن کے اصل نظر سے، وہ اصل نہ معلوم کہاں مخزون ہیں۔ نقل بھی کہیں نظر سے نہیں گزری، اس مجموعہ کے مکاتیب کا بڑا حصہ تاریخ مملکت آصفیہ سے متعلق ہے، اور اس زمانہ سے متعلق ہے کہ جس کے واقعات وحالات پر تاریکی ہی تاریکی چھائی ہوئی ہے۔

حضرت آصف جاہ اول کے انتقال کے بعد جانشینی کا جو ہنگامہ برپا ہوا اسکے سلسلہ میں اصلی کاغذات کو اب عنقا کہا جائے تو بجا ہے کہ معدودے چند اصلی کاغذات اب تک دیکھنے میں آئے ہیں۔ چنانچہ حضرت ناصر جنگ شہید اور نواب صلابت جنگ نے تنجاور[1] کے راجہ کے نام جو عنایت نامے

[1] انگریزی تالیفات میں تنجاور کو Tanjore لکھا جاتا ہے۔

اُس زمانہ میں تحریر فرمائے تھے۔ اُن کا ایک مجموعہ کتب خانۂ سعیدیہ میں محفوظ ہے اور رسالہ معارف اعظم گڈھ کے دو شماروں نمبر۶ جلد ۳۱ و نمبر ایک جلد ۳۲ میں شائع کرائے جا چکے ہیں۔

پیش نظر رسالہ میں بھی اسی زمانہ کے فرامین اور مکاتیب جمع کئے گئے ہیں، ان کے اسلوب تحریر اور تاریخوں کا کتب خانۂ سعیدیہ کے مخزونہ عنایت نامجات موسومہ راجہ نجا ورسے مقابلہ کیا جائے تو صاف واضح ہے کہ یہ اصل کی ہی نقل ہیں۔

اس رسالہ کے گویا تین حصے ہیں،

۱۔ فرامین بادشاہان دہلی موسومہ روسائے دکن۔

۲۔ فرامین بادشاہ عالمگیر، بنام فرزندان خود و امرائے دکن

۳۔ (الف) عنایت نامجات نواب ناصر جنگ شہید بنام امرائے کرناٹک۔

(ب) عنایت نامجات نواب صلابت جنگ بنام امرائے کرناٹک۔

(ج) روسائے کرناٹک کی باہمی مراسلت اور نواب والاجاہ کے عرائض موسومہ نواب ناصر جنگ و نواب صلابت جنگ۔

ان سب کے متعلق مزید وضاحت ذیل میں کی جاتی ہے۔ بادشاہ کی جانب سے نواب صلابت جنگ کے نام جو فرامین صادر ہوئے وہ تعداد میں ۶ ہیں، نواب بسالت جنگ کا موسومہ ایک فرمان بھی شامل ہے، نواب سراج الدولہ انورالدین خان والاجاہ کے نام کا بھی ایک فرمان درج کیا گیا ہے۔ عبدالنبی خان نواب کڑپہ کے نام کے بھی ایک فرمان کو نقل کیا گیا ہے۔ ایک فرمان کے متعلق لکھا ہے کہ ناظم دکن کے نام پر صادر ہوا۔ ان کے علاوہ علی گوہر شاہ کا ایک فرمان موسومہ نواب محمد علی خان والاجاہ درج ہے۔

نواب صلابت جنگ کے موسومہ پہلے فرمان میں یہ حکم مندرج ہے کہ بخشی الممالک غازی الدین خان فیروز جنگ کی بجائے نواب صلابت جنگ کو صوبجات دکن کی صوبہ داری عطا کی جاتی ہے دوسرے فرمان میں بھی اسی کی صراحت ہے، البتہ فرمان اول میں یہ مرقوم ہے کہ

"بہ عطائے خدمت صوبہ داری صوبجات دکن از تغیر بخشی الممالک امیر الامرا نظام الملک۔

غازی الدین خان بہادر فیروز جنگ بدستور معزول سرمایہ اندوز مفاخرت و مباہات ساختہ"

دوسرے فرمان میں لکھا گیا ہے کہ

"بعطائے خدمت صوبداری دکن بدستور آصف جاہ ناصر جنگ مرحوم از انتقال فیروز جنگ سرمایہ اندوز مفاخرت و مباہات ساخت"

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا پہلا فرمان فیروز جنگ کی زندگی میں ہی عطا ہوا یا بعد۔ اگر زندگی میں ہی عطا ہوا تھا تو پھر فیروز جنگ کو کب اس خدمت کا فرمان عطا ہوا۔ کیونکہ سب تاریخوں سے واضح ہے کہ انہوں نے حکومت دکن کا فرمان حاصل کر کے اورنگ آباد کا قصد کیا تھا اور اورنگ آباد تک چلے آئے تھے کہ انتقال ہو گیا" افسوس ہے کہ مرتب رسالہ نے فرامین کے ساتھ ان کی تاریخیں درج نہیں کی ہیں ورنہ کئی شبہات دور ہو جاتے۔

نواب صلابت جنگ کے موسومہ تیسرے فرمان میں ابوالمنصور کی نمک حرامی کا تذکرہ مختصر طور سے کر کے یہ ہدایت کی گئی ہے کہ صوبجات دکن کا بندوبست حزم و احتیاط سے عمل میں لایا جائے۔

چوتھے فرمان میں یہ تذکرہ ہے کہ بادشاہ نے تخت پر جلوس کیا ہے۔ نواب صلابت جنگ کو چاہیئے کہ اپنے علاقہ کے بند وبست میں کوئی اہمال عمل میں نہ لائیں اور نماز جمعہ میں پڑھنے کے لئے جو خطبہ ارسال کیا گیا ہے وہ صوبجات دکن کی تمام مساجد میں جاری کیا جائے۔

پانچویں فرمان میں یہ اطلاع دی گئی ہے کہ ایک ہزار اشرفی بابت نذر جلوس وصول ہوئے اور یہ کہ خلعت دوشالہ ملبوس خاص عطا کی گئی ہے۔

چھٹے فرمان میں احمد شاہ ابدالی کے ہنگامہ کا تذکرہ کیا گیا ہے اور مطلع کیا گیا ہے کہ وزیر الملک ملہار جی ہولکر اور جیاجی مرہٹہ کو لاہور روانہ کیا جا رہا ہے، نواب صلابت جنگ سے بھی یہ خواہش کی گئی ہے کہ وہ بھی دہلی آئیں، اس سلسلہ میں فرمان کے الفاظ یہ ہیں۔

"آں فرزند عزیز ازیں معنی تردد رانجا طرا راہ نداده با ستقلال و استعداد تمام برتق و فتق مہام و بندوبست صوبجات دکن پرداز دے چوں آں فرزند عزیز را بمنزلۂ فرزند علینی می دانیم

"از کمال تفضل والا این معنی رقم پذیر خامہ اعجاز طراز شدہ ۔ فرزند عزیز من! اگر آں فرزند عزیز
لباس احسن و سرانجام تحسن خود را بحضور والا رساند رفع مخالفہ بسہل وجوہ خواہد شد
والا انتظام تعلقات آں فرزند ہم اہم است ——"

اسکے متعلق نواب صلابت جنگ نے آنے سے معذوری ظاہر کرکے جو جواب ادا کیا وہ نشاءت
شہ نوازخان میں شامل ہے جس کے متعلق ایک نوٹ ابھی اوپر گزر چکا ہے۔

علی گوہر شاہ کے فرمان موسومہ نواب محمد علی خان والاجاہ میں یہ مرقوم ہے کہ بدستور سابق
دیوانی وفوجداری ارکاٹ اور قلعداری وفوجداری ترچناپلی کے خدمات بحال و برقرار کئے گئے ۔
یہ فرمان توزک والاجاہی میں بھی نقل کیا گیا ہے ۔

نواب بسالت جنگ کے موسومہ فرمان کا مطلب یہ ہے کہ "صوبہ داری دارالظفر بیجاپور و تعلقہ
انتظام ہمگی آنطرف دریائے کشنا" کی سند عنقریب عطا کی جائگی۔

نواب سراج الدولہ انورالدین خان والاجاہ کے موسومہ فرمان میں ان کو منصب وعلم و دیگر
اعزازات اور خطاب عطا ہونے کا تذکرہ کیا گیا ہے، اس فرمان کے دو ایک فقرات کو یہاں نقل کرنا نامناسب
نہیں،

"از معروض وزیر الملک بہادر مویدا گشت کہ آں فدوی بہ رہبری سیف الدولہ عمدۃ الملک
بہادر و بطریق اطاعت وفرماں برداری وعقیدت و خدمت گزاری بارگاہ والا موفق گشتہ"

واضح ہو کہ سیف الدولہ عمدۃ الملک بُسے کا خطاب تھا اور اگر اس فرمان میں اسی کی جانب اشارہ ہے تو
اس کے سلسلہ میں مزید تحقیق ضروری ہے کیونکہ نواب محمد علی خان والاجاہ کو فرانسیسی لوگوں سے کبھی موافقت
نہیں تھی، بُسے سے بھی ان کو ہمیشہ اختلاف رہا، نہ معلوم اس فرمان میں "رہبری" سے کیا منشا ہے اور
سیف الدولہ عمدۃ الملک سے کونسی شخصیت مراد ہے،

ان فرامین کے بعد اورنگ زیب عالمگیر کے چند فرامین درج ہیں، جہاں تک دیکھا گیا سب فرامین
متداول کتابوں میں موجود ہیں، کوئی نیا خاص فرمان نہیں ہے البتہ تیسرے حصہ کے مکاتیب

کے متعلق مختصر توضیح ضروری ہے

نواب ناصر جنگ شہید مسند نشینی کے بعد جانب دہلی روانہ ہوئے تھے، دریائے نربدا پر پہونچکر فرمان بادشاہ کی بنا پر اورنگ آباد واپس چلے آئے، اس دوران میں حافظ ہدایت محی الدین خان مظفر جنگ نے کرناٹک میں شورش شروع کر دی تھی اور ایک ہنگامہ میں صوبہ دار کرناٹک نواب انور الدین خان قتل کر دیئے گئے۔ کرناٹک میں جب حالات نازک ہوتے گئے تو خود حضرت ناصر جنگ شہید نے کرناٹک کی جانب عزم فرمایا اور راستہ سے حکام و زمینداران کرناٹک کے نام عنایت نامے صادر فرمانے کا تسلسل قائم رکھا، چنانچہ پیش نظر رسالہ میں نواب ناصر جنگ کے وہ عنایت نامے نقل کئے گئے ہیں جو نواب محمد علی خان والاجاہ کے نام پر صادر ہوئے۔ تعداد میں یہ عنایت نامے (۸۱) ہیں اور سب کے سب اثنائے راہ سے صادر ہوئے ہیں، یہ عنایت نامے مختصر بھی ہیں اور طویل بھی، ان عنایت ناموں میں نواب ناصر جنگ نے بکرات و مرات شورش کے رفع کرنے پر اپنے عزم مصمم کا اظہار فرمایا ہے اور نواب والاجاہ کو مناسب ہدایات دیئے ہیں۔ مرتب منشارت نے ان عنایت ناموں کو غالباً تاریخ وار مرتب نہیں کیا ہے، بریں ہم ان کی تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان عنایت ناموں سے واضح ہوتا ہے کہ ہمراہ رکاب کون کون سردار تھے دکن کے زمینداروں اور مرہٹہ سرداروں سے کس قسم کی مدد کی توقع تھی، کرناٹک کے زمینداروں اور انگریزوں نے کیا مدد بہم پہونچائی، چھوٹے چھوٹے معرکوں کے کیا نتائج برآمد ہوئے، کس تاریخ کو کہاں مقام ہوا، مختلف دریائیں مانجرا، بھیما اور کرشنا و تنگ بھدرا کو کب عبور کیا گیا، فرانسیسی لوگوں پر عتاب کی وجہ کیا ہے، ایک عنایت نامہ میں حکم صادر فرمایا ہے کہ:-

"باید کہ آں شہامت پناہ بہ تفحص و تفتیش، نقود و اجناس و امتعہ و اقمشہ قوم فرنگ سیس مزبور را ہر جا سراغ یابند و املاک و بیوتات آنہا را ہر جا باشد از قرار واقعی بضبط در آرند، ضبط اموال کسان پھول چری (پانڈی چری) تنہا مقصود نیست از قوم اینہا در ہر بندرے کہ باشد یا بشراکت می بودہ باشد یا اموال آنہا را ضبط باید کرد۔

چو از قوم یکے بید النسی کرد۔ ذکر را منزلت ماند نہ مسر را (؟) اقوام دیگر فرنگی انگریز و ولندیز و غیرہ بے گناہ۔

انداز آنہا را ہیچ نباید گفت و مزاحم احوال آنہا نباید شد باہمین قوم فرنگ سیس کہ یکے از آنہا رفاقت باغی اختیار کردہ مورد عتاب گردیدہ۔ مخالفوں کے منصوبے کیا تھے، ان کی کامیابی اور ناکامی کی کیا صورتیں تھیں، راستہ میں کیا واقعات ظاہر ہوئے، ہمراہی عہدہ داروں نے وفا شعاری کے کیا مراتب انجام دیئے۔ راستہ میں جو مقابلے وقوع میں آئے اسکے نتائج کیا رہے، غنیمت میں کیا کیا مال حاصل ہوا، راستہ سے دوسرے اور لوگوں کے نام کس قسم کے احکام صادر ہوئے، باغیوں کی استمالت اور ان کے ساتھیوں سے کس قسم کا برتاؤ کیا گیا، ان سب امور کا ان عنایت ناموں سے صراحت ہوتی ہے۔

نواب محمد علی خان والاجاہ کے موسومہ عنایت ناموں کے علاوہ نواب ناصر جنگ کا ایک عنایت نامہ موسومہ غلام مرتضیٰ خان قلعہ دار ویلور بھی اس مجموعہ میں شامل ہے۔

ان عنایت ناموں کے علاوہ اور جو مشارت اس مجموعہ میں شریک ہیں ان کا بھی مختصر تذکرہ کردیا جاتا ہے۔

۱۔ نواب صلابت جنگ کا ایک عنایت نامہ موسومہ نواب محمد علی خان والاجاہ اس عنایت نامہ میں نواب والاجاہ کو اپنی مخالفت سے باز آنے کے لئے ایما کیا گیا ہے اور ہدایت کی گئی ہے کہ ملک نواب حسین دوست خان چندا صاحب کے سپرد کرکے نواب والاجاہ دربار میں واپس چلے آئیں، ان سے دوسرا کام لیا جائے گا۔

۲۔ نواب صلابت جنگ کا عنایت نامہ نواب حسین دوست کے نام بہ اس مضمون کا کہ نواب والاجاہ کی بقرار واقعی تنبیہ کی جائے۔

۳۔ نواب صلابت جنگ کا عنایت نامہ گورنر مدراس کے نام بہ۔ اس عنایت نامہ میں یہ صراحت کی گئی ہے کہ بادشاہ کی جانب سے صوبہ داری کا فرمان حاصل ہوچکا ہے، ترچناپلی کا علاقہ نواب والاجاہ کی بجائے نواب حسین دوست خان کے سپرد کیا گیا ہے، کیوں مدراس سے نواب والاجاہ کے لئے مدد روانہ کی گئی؟ چاہیئے کہ اپنے کام سے کام رکھیں یعنی یہ ہے کہ تجارت اور خرید و فروخت، آخر میں لکھا ہے کہ:-

"اگر باوجود ممانعت دست از رفاقت و موافقت برنخواہند داشت زود مکافات خواہند دید۔ از راہ نصایح و لطف نوشتہ شد کہ بے جہت خود را بدنام کردن فائدہ ندارد و نظر بر بندگیہائے موروثی کہ در جناب حضرت علیہ الرحمٰن والغفران بود برہمان وتیرہ خود ثابت قدم وقایم باشند والا ہرچہ خواہند دید از خود خواہند دید، دریں باب تاکید اکید دانند۔"

۴۔ نواب والاجاہ کی عرضداشت نواب ناصر جنگ کی خدمت میں بعض تدابیر جنگ کے متعلق اور ملک کے جغرافیائی حالات کی توضیح، پانڈیچری کی تسخیر کا فائدہ اور اسکے مواقع۔

۵۔ نواب والاجاہ کی عرضداشت نواب صلابت جنگ کی خدمت میں برائے عطا سند معاش بسلسلہ مقبرۂ والد خود،

۶۔ نواب شہ نواز خان کا مکتوب نواب والاجاہ کے نام پر۔

۷۔ نواب والاجاہ کا مکتوب نواب شہ نواز خان کے نام پر کرناٹک کی صوبہ داری کے متعلق۔

۸۔ نواب والاجاہ کا خط تہور جنگ کے نام پر، اس وقت کے حالات جب کہ نواب ناصر جنگ شہید کرناٹک میں تشریف فرما تھے،

۹۔ نواب والاجاہ کا مکتوب نواب عبدالحکیم خان کے نام پر، نواب ناصر جنگ کی شہادت کے بعد جو واقعات ظاہر ہوئے ان کی تفصیل، مشہور محاصرۂ ارکاٹ اور نواب حسین رحمت خان چندا صاحب کے قتل کی تفصیلات۔

غرض ان مکاتیب کو تاریخ کی کتابوں کی روشنی میں مرتب کیا جائے تو بہت سارے کارآمد امور کی توثیق و تصدیق ہوگی۔

تاریخی کاغذات کے ذخیرے

از محمد غوث صاحب ایم۔ اے [1]

کتب خانۂ سعیدیہ میں دفتر والاجاہی (کرناٹک) کا جو حصہ محفوظ ہے اس میں ایک مجموعہ ان عنایت ناموں کا بھی موجود ہے جو رؤسائے آصفیہ کی جانب سے تنجاور کے راجہ کے نام پر صادر ہوا۔ یہ تو معلوم ہے کہ حضرت آصف جاہ اول کے زمانہ میں اور نواب ناصر جنگ شہید کی مسند نشینی کے وقت جنوبی ہند کے راجہ اور نواب سب کو اپنی سلامتی کے لئے آصف جاہی زلہ ربائی ضروری تھی۔ تنجاور کے اس زمانہ کے راجہ پرتاب سنگھ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ عنایت ناموں کے اس مجموعہ سے واضح ہوتا ہے کہ راجہ پرتاب سنگھ نے بھی نواب ناصر جنگ شہید سے عقیدت کا اظہار کیا، نذر گزرانی اور تعمیل احکام کا یقین دلایا۔ شہادت مآب کی پیشگاہ سے بھی الطاف و عنایات کے اظہار کے لئے عنایت نامے بہ دستخط و مہر خاص نافذ ہوئے۔

مجلۂ طیلسانیین کی اس اشاعت کے لئے یہ امر مناسب متصور ہوا کہ عنایت ناموں کے اس مجموعہ سے دو عنایت ناموں کے عکس طبع کرلئے جائیں۔ دونوں عنایت ناموں کے متعلق ضروری تشریح ذیل میں قلم بند کی جاتی ہے۔

(۱) یہ عنایت نامہ حضرت آصف جاہ اول کی جانب سے صادر ہوا ہے اس پر مہر خرد ثبت ہے مہر کی عبارت یہ ہے۔

"نظام الملک آصف جاہ ۱۱۲۹"

عنایت نامہ کی پشت پر سلطنی خاتم بھی ثبت ہے۔

عنایت نامہ کی عبارت یہ ہے۔

---

[1] یعنی شہزادہ وہ علامت ہے جو خط کے آخر پر کاتب اپنے قلم سے درج کرتا تھا۔

"ہوالکریم

شہامت وجلادت دستگاہا

دریں وِلا شہامت پناہ راؤجانوجی نوشتہ کہ کسان آن جلادت دستگاہ نقد وجنس واسپان کسان مرار راؤرا متصرف شدہ اند لہٰذا نوشتہ می شود کہ انچہ متصرف شدہ باشند تاکید نمودہ حوالہ راوجانوجی نمایند۔ زیادہ چہ نوشتہ شود" (بیض خاص)

مطلب یہ ہے کہ راوجانوجی کی تحریر سے واضح ہوا کہ تمہارے علاقہ کے لوگوں نے مرار راؤ کے مال واسباب پر اپنا تصرف کیا ہے لہٰذا لکھا جاتا ہے کہ یہ مال حاسب راوجانوجی کے سپرد کر دیا جائے۔

یہ عنایت نامہ اس سے پہلے کسی مجلہ میں طبع نہیں ہوا عکس اور متن پہلی مرتبہ شائع کئے جاتے ہیں۔

یہ عنایت نامہ نواب ناصر جنگ کی جانب سے راجہ پرتاب سنگھ کے نام پر صادر ہوا۔

اس پر جو مہر ثبت ہے اسکی عبارت صاف اور مختصر یوں ہے "نظام الدولہ ۱۱۵۲"

یہ عنایت نامہ اُس زمانہ میں صادر ہوا جب کہ نواب ناصر جنگ شہید، حافظ ہدایت محی الدین خاں مظفر جنگ کی شورش کے انسداد کی غرض سے کرناٹک کے جانب رہ سپار تھے، عنایت نامہ کے مضمون سے واضح ہے کہ وہ اثنائے سفر سے صادر ہوا ہے۔

بیض[۱] خاص ثبت ہونے کے علاوہ اس عنایت نامہ کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس پر نواب ناصر جنگ شہید کی خود نوشتہ تحریر بھی درج ہے جس کو اصطلاحاً "شرحِ دستخط خاص" کہا جاتا ہے[۲]

عنایت نامہ کی نگارش یوں ہے۔

"ہوالکریم

شہامت وجلالت دستگاہا

---

[۱] بیض سے مراد وہ علامت ہے جو خط کے آخر پر کاتب اپنے قلم سے درج کرتا تھا۔

[۲] جس تحریر پر اسکے مبیضہ ہونے کے بعد جو عبارت بخط خاص درج کیا جاتا ہے اسکو شرح دستخط خاص کہتے ہیں۔

"بنصر و تائید الٰہی موکب منصور بارادہ تنبیہ باغیاں قریب رسیدہ، باید آن شہامت پناہ با جمعیت شایستہ خود را بحضور رسانیدہ در قتل و اسر فرقۂ ادبار نصیب مصدر تر ودات نمایاں شوند۔ زیادہ چہ توقیع خوشنما
(شرح دستخط) شنیدہ شد تا حال اشقیا ہمانجا با سید اد بار اند، افواج قاہرہ و سرداران نامی عنقریب می رسند، خود بخود اشقیا خود را گرفتار وبال و نکال کردہ اند، درصورتے کہ ہمانجا ہستند و فوج منقلا برسد آنہارا جائے گریز ہم نمی ماند، دریں وقت استقلال از دست ندہند ہمیں کہ فوج منقلا رسید محمد علی خان کہ ملقب بہ انورالدین خان شدہ یقین کہ شریک فوج منقلا خواہد شد، از چار طرف اشقیا را درمیان گرفتہ قسمے تنگ باید کرد کہ از جان بتنگ آیند، دریں صورت گروہ نکبت پژوہ آنہا پراگندہ می شود و تا ہم بالشکر قیامت اثر بسرعت تمامی میسیم بحول و قوۃ الٰہی"

عنایت نامہ کے متن کا مطلب یہ ہے کہ باغیوں کی تنبیہ کے لئے ہم قریب پہونچ چکے ہیں، تمہیں بھی چاہیئے کہ اپنی فوج لیکر لشکر میں شامل ہو جائیں اور باغیوں کے قتل اور قید کرنے میں نمایاں کوشش عمل میں لائیں،

شرح دستخط خاص کا مطلب یہ ہے کہ معلوم ہوا ہے کہ باغی لوگ ابھی وہاں ہیں عنقریب افواج قاہرہ اور سرداران نامی پہونچتے ہی ہیں، ان اشقیا نے اپنے آپ کو گرفتار وبال کر لیا ہے اگر وہ اس مقام پر رہیں اور فوج پہونچ جائے تو بھاگنے کی جگہ بھی نہیں رہے گی۔ اس وقت استقلال کو ہاتھ سے جانے نہ دینا چاہیئے! جونہی فوج پہونچ جائے یقین ہے کہ محمد علی خان (والا جاہ) بھی پہونچ جائیں گے۔ اشقیا کو چار طرف سے گھیر کر اس طرح تنگ کرنا چاہیے کہ اپنی جان سے تنگ آجائیں، اس صورت میں باغیوں کا گروہ پراگندہ ہو جائے گا، ہم بھی لشکر قیامت اثر کے ساتھ ہم بھی آ گئے ہیں۔

واضح ہو کہ یہ عنایت نامہ اس مجموعہ کے دوسرے عنایت ناموں کے ساتھ مع ضروری یادداشتوں کے رسالہ معارف اعظم گڈھ کی جلد ۱۳ نمبر ۳ میں طبع کرایا گیا تھا لیکن اس کا عکس اب تک شائع نہ ہوا تھا۔

تنقید و تبصرہ

(۱) ہندوستان کے آثار قدیمہ

یہ مولوی غلام یزدانی صاحب ناظم آثار قدیمہ ریاست حیدرآباد کا ایک مقالہ ہے جو اُردو اکاڈیمی میں پڑھا گیا تھا۔ اس موضوع پر یزدانی صاحب سے بہتر کہنے کا کوئی حق نہیں رکھتا لیکن ہندوستان کے آثار قدیمہ ایک بہت بڑا موضوع ہے اور ایک چھوٹا سا مقالہ آثار قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والوں کو مطمئن کرنے کی بجائے اولتا بے چین کر دیتا ہے۔ یزدانی صاحب فرماتے ہیں "حال میں مجھے یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ سر جان مارشل کی معیت میں ہندوستان کے قدیم آثار کی ایک جامع تاریخ لکھوں۔ چنانچہ آج کل ہم دونوں اس کام میں مصروف ہیں"۔ زیر تنقید مقالہ ۱۹۳۷ء میں پڑھا گیا تھا، اور ہمیں نہیں معلوم کہ اوس جامع تاریخ کا کام اب کس نوبت پر ہے لیکن کتاب جب بھی شایع ہو بڑی قابل قدر ہوگی۔ موجودہ مقالہ کو بھی پڑھنے کے بعد دلوں میں ان کی عظمت کا احساس ضرور پیدا ہو جاتا ہے اور ایک اُمنگ پیدا ہوتی ہے کہ اس مضمون کا تفصیل سے مطالعہ کیا جائے اور اس مختصر مقالہ سے غالباً غرض بھی یہی تھی کہ اسکے پڑھنے والوں کے دلوں میں آثار قدیمہ سے دلچسپی لینے کا شوق پیدا ہو۔ مقالہ نہایت اچھے کاغذ پر اچھی کتابت و طباعت کے ساتھ شایع ہوا ہے۔ آثار قدیمہ کی مختلف تصویریں بھی شریک کی گئی ہیں۔ کتاب مجلد ہے اور مکتبہ جامعہ دہلی سے شایع ہوئی ہے لیکن قیمت درج نہیں ہے۔ ک۔ ل

(۲) جنگ ۱۹۳۹ء کیوں ہوی؟

یہ کتاب "عبدالحق اکاڈیمی" (حیدرآباد دکن) سے شایع ہوئی ہے اور بقول ناشران "دنیا کے سب سے بڑے موضوع یعنی موجودہ جنگ سے متعلق ہے"۔ ہمیں اس میں بہت شبہ ہے کہ دورانِ جنگ

میں جنگ کے اسباب سے متعلق کوئی اچھی کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ "دنیا کے سب سے بڑے موضوع" پر چھوٹے سائز کے ڈیڑھ سو صفحات کی کتاب کچھ زیادہ روشنی بھی نہیں ڈال سکتی اسلئے ہمیں تعجب ہے کہ "عبدالحق اکاڈمی" میں اس کتاب کو اشاعت کے لئے کیوں منتخب کیا گیا۔ ناشران خود اس سوال کا جواب اس طرح دیتے ہیں۔

"آپ سوال کرینگے کہ عبدالحق اکاڈمی نے علم و ادب کی کوئی معیاری کتاب آپ کے لئے کیوں نہ منتخب کی۔ عبدالحق اکاڈمی بھی چاہتی تھی۔ مگر آج کل آپ کو ایسی کتاب پڑھنے اور اس سے فائدہ اوٹھانے کی فرصت ہے؟ ہم نہیں چاہتے تھے کہ آپ کے ذوق پر بار ڈالیں"

اس جواب سے متعلق ہم کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے اور پر ہم نے جو کچھ لکھا ہے اوسکا یہ مطلب نہیں ہے کہ کتاب مفید یا دلچسپ نہیں ہے۔ آج کل ہر شخص جنگ سے متعلق اپنی معلومات کو مکمل اور اپنے حافظہ کو تازہ رکھنا چاہتا ہے۔ کتاب میں جنگ سے قبل کے بہت سے واقعات ترتیب وار درج ہیں اور کتاب ہاتھ میں آنے کے بعد ان واقعات پر ایک نظر ڈالنے کو جی چاہتا ہے۔ کاغذ و طباعت کی اس گرانی کے زمانہ میں کتاب کی قیمت بلحاظ حجم زیادہ نہیں ہے۔ طباعت و کتابت اچھی ہے اور اچھا کاغذ استعمال نہ کرسکنے کی مجبوریاں توی ہیں۔ فولڈنگ جلد خوبصورت ہے۔ ہم کتاب کے مطالعہ کی سفارش کرتے ہیں۔

ک۔ و

(۳) خنداں

خنداں اور دوسرے مضامین، مصنف پروفیسر رشید احمد صدیقی صدر شعبہ اردو علی گڈھ یونیورسٹی۔ ناشر مکتبہ جامعہ دہلی، حجم (۱۸۲) صفحات قیمت (عہ/) یہ وہ مضامین ہیں جو آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی سے نشر کئے گئے اور اب بہ اجازت نشرگاہ شایع ہوئے ہیں،

اردو زبان میں مزاحیہ نویسی یا ظرافت نگاری کی ابتدا نظیر سے قرار دی جا سکتی ہے، گو اس زمانہ میں اسکو حقارت کی نظر سے دیکھا گیا تھا لیکن بعد میں یہ عیب ہنر بن گیا۔ بہرحال نظیر اکبرآبادی نے

اردو میں طنز نگاری کی بنا ڈالی، اس کے بعد عرصہ دراز تک اس ڈگر پر چلنے والا کوئی نہیں تھا، انیسویں صدی کے آخر میں منشی سجاد حسین مرحوم نے اخبار اودھ پنچ کے ذریعہ نثر میں مزاحیہ نویسی شروع کی، منشی صاحب مرحوم کو چند اور ساتھی بھی مل گئے، مثلاً سرشار، ستم ظریف اور حضرت اکبر الہ آبادی وغیرہ، اودھ پنچ اور اودھ اخبار کے بعد جو سجاد حسین اور سرشار کی ادارت میں شایع ہوتے تھے پھر ظرافت نگاری پر اوس پڑ گئی تھی، اب بیسویں صدی میں جو مزاحیہ نگاری ہو رہی ہے یہ مغربی مضراب کا ایک سر ہے، مغربی ادب کی تقلید میں اب اردو میں مزاحیہ نویسی ہوتی ہے، اس وقت شمالی ہند، پنجاب، اور دکن میں کئی ایک اہل قلم نے مزاحیہ نویسی میں نام پیدا کیا ہے، مثلاً شمال میں پروفیسر رشید احمد، پطرس، عظیم بیگ مرحوم، شوکت تھانوی، ملا رموزی، یم اسلم، حجاب امتیاز علی، عصمت چغتائی وغیرہ اور دکن میں مرزا فرحت اللہ بیگ، ناکارہ اور آصف جہاں بیگم کے نام اس عنوان کے تحت پیش کئے جا سکتے ہیں۔

ان مزاحیہ نگاروں کی طرز نگارش میں بڑا فرق ہے ہر ایک کا مذاق جداگانہ ہے، کوئی سیرت نگاری میں مزاحیہ نگاری کرتا ہے، کوئی طنز کے ذریعہ ہماری خامیوں کو ظاہر کرتا ہے، اور کوئی زبان کی لطافت اور اسلوب بیان کے ذریعہ ہنسی کا سامان مہیا کرتا ہے۔

پروفیسر رشید احمد طنزیہ نگاری کے استاد ہیں، رمز اور کنایہ کے ذریعہ اپنا مافی الضمیر ظاہر کرتے ہیں، اپنے ذاتی جذبات اور احساسات کو طنزیاتی انداز میں پیش کرتے ہیں، جن کو پڑھنے والا مذاق سمجھ کر ٹال نہیں سکتا، اگرچہ ان کے مضامین عام فہم نہیں ہوتے، ان کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا، اور اسکو وہی سمجھ سکتا ہے جس کو تاریخ اور سیاسیات میں اچھی طرح دخل ہو، مگر زیر نظر مجموعہ میں یہ بات نہیں ہے، کیونکہ یہ ریڈیو کے لئے لکھے گئے ہیں، اس لئے ان کو عام فہم ہونے کے علاوہ ہر طبقہ اور ہر عمر کے لوگوں کے استفادہ کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے اس کے ساتھ ریڈیو کی نشری تقریریں ہونے کے لحاظ سے کئی اور شرایط بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً زبان ایسی ہو جس کو زیادہ لوگ سمجھ سکیں، یہ تقریریں صرف پندرہ منٹ کی ہوں، اور پھر اس کے ساتھ ہی ریڈیو والے کاٹ چھانٹ کا حق بھی رکھتے ہیں، بلکہ اکثر مباحث اور عنوان خود ریڈیو والوں کی جانب سے مقرر ہوتے ہیں،

جب یہ شرائط ہوں تو ظاہر ہے کہ مضمون لکھنا کس قدر دشوار ہے، کیونکہ اول تو طنزیہ مضمون لکھنا دشوار ہے اور پھر جب اس میں کئی شرائط ہوں تو اس کا لکھنا دشوار تر ہوجاتا ہے طنزیہ مضمون میں ذرا سی لغزش ہوجائے تو پورا مضمون بے کار ہوجاتا ہے۔ مگر یہ بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ پروفیسر رشید احمد صاحب نے نہایت کامیابی کے ساتھ اس میدان کو طے کیا ہے سخت سے سخت نکتہ چیں بھی اعتراض کرنا چاہے تو اس کو مشکل سے کامیابی ہوگی۔

"خنداں" میں کل (۲۹) تقریریں شامل ہیں جن کو پانچ عنوانوں میں تقسیم کیا گیا ہے یعنی ادھر اُدھر، چند معروف اور غیر معروف ہستیاں، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا، چند خاکے، طنزیات"

ہر نوعیت کے چند عنوان یہاں پیش کئے جاتے ہیں مثلاً ریڈیو سننے والے احمق کی جنت، ہوٹل میں ٹیڈیو دعوت وغیرہ۔ خنداں، ایڈیٹر قدوی، لیڈر، بابو، بہرہ وغیرہ، اگر میں فاونٹن پن ہوتا، اگر میں چور ہوتا، الکشن، عدالت، بیمہ کا ایجنٹ، عاشق، ناصح، رقیب وغیرہ،

ان عنوانات سے واضح ہوگا کہ پروفیسر رشید نے کیا کیا موضوع انتخاب کئے ہیں، اور پھر ان کی نوعیت جس طرح جداگانہ ہے وہ بھی مخفی نہیں، لیکن اس کے باوجود پروفیسر رشید صاحب نے جس قابلیت سے ان کو لکھا ہے وہ خاص ان ہی کا حصہ ہے حق یہ ہے کہ کوئی اور شخص اس میدان میں ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

اُن کتابوں کی رسید جو مجلہ میں تنقید کے لئے وصول ہوئیں

۱۔ قائد ملت نواب بہادر یار جنگ بہادر کی مختصر سوانح، تالیف مولوی عبدالرحمن سید صاحب صدیقی بی اے (عثمانیہ)، ناشران سید علی شبر حاتمی بی ایس سی (عثمانیہ) اور چودہری اقبال سلیم گاہندری۔ قیمت ۸، کتب خانہ انجمن ترقی اردو ہند عابد روڈ حیدرآباد دکن سے مل سکتی ہے۔

۲۔ "محمد رسول اللہ" ٹامس کارلائل کے مقالہ کا ترجمہ۔ مترجم مولانا عبیدالرحمن عاقل رحمانی۔ ناشر، کتابستان، پوسٹ بکس ۲۱۶۲ بمبئی نمبر ۳ قیمت ۸،

۳۔ جواہر العلوم۔ علامہ طنطاوی جوہری مصری کی عربی کتاب کا اُردو ترجمہ۔ مترجم مولوی فاضل

عبدالرحیم صاحب استاذ عربی اسلامیہ کالج پشاور۔ ناشر کتابستان، پوسٹ بکس ۳۱۶۴ بمبئی نمبر ۳ قیمت دو روپیے۔

۴۔ شان خدا۔ تالیف مولانا عبیدالرحمٰن صاحب عاقل رحمانی، ناشر کتابستان، پوسٹ بکس ۳۱۶۴ بمبئی نمبر ۳ قیمت ایک روپیہ۔

۵۔ جنگ ۱۹۳۹ء کیوں ہوئی تالیف شیخ رحمٰن بخش صاحب بی اے ال ال بی ناشر عبدالحق اکیڈمی حیدرآباد دکن، قیمت ۱۲/ (تبصرہ اس شمارہ میں کیا گیا ہے)،

انجمن طیلسانین عثمانیہ کے کتب خانہ میں جدید اضافہ

سررشتۂ تالیف و ترجمہ جامعۂ عثمانیہ سے مندرجہ ذیل کتابیں تحفۃً وصول ہوئی ہیں:۔

۱۔ علم امراض النساء، جلد اول ترجمۂ ڈاکٹر غلام دستگیر صاحب، ۲۔ علم طب جلد دوم، ترجمۂ ڈاکٹر محمد عثمان خان صاحب۔ ۳، تاریخ فلاسفۃ الاسلام، ترجمۂ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب، ۴۔ بحر وطی نراشیں ترجمہ محمد نذیر الدین صاحب۔ ۵، مضبوطی اشیا، ترجمۂ ضیاء الدین صاحب انصاری ۶، اصول قانون معاہدۂ انگلستان، ترجمۂ حسین علی مرزا صاحب، ۷، فتوح البلدان، حصہ دوم، ترجمہ سید ابوالخیر صاحب مودودی۔ ۸، اتحیروں کا نظریہ اور تجوبز، ترجمۂ ضیاء الدین صاحب انصاری۔ ۹، تاریخ انگلستان، حصہ دوم، ترجمۂ سید ہاشمی صاحب فرید آبادی، ۱۰، تاریخ طبری، جلد اول، حصہ چہارم ترجمہ سید محمد ابراہیم صاحب۔ ۱۱، مقدمہ فلسفۂ حاضرہ، ترجمۂ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب۔ ۱۲، فلزیات، ترجمۂ محمد عبداللہ حسین صاحب۔ ۱۳، اسفار اربعہ، حصہ اول، جلد اول، ترجمۂ سید مناظر احسن صاحب گیلانی۔ ۱۴، قانون و رواج ہنود، جلد اول ترجمۂ اکبر علی صاحب موسوی۔ ۱۵، امراض چشم، ترجمہ ڈاکٹر محمد عثمان صاحب

مندرجہ ذیل کتابیں سررشتہ معلومات عامہ سے وصول ہوئیں۔

۱، رپورٹ نظم و نسق سررشتۂ کورٹ آف وارڈز۔ ۲، رپورٹ سررشتۂ طبابت یونانی ۱۳۴۹ف ۳، رپورٹ سررشتۂ رجسٹریشن ۱۳۵۰ف ۴، رپورٹ نظم و نسق مملکت آصفیہ ۵، رپورٹ سررشتۂ کوتوالی بلدہ ۱۳۵۰ف

۶، رپورٹ بلدیۂ حیدرآباد سنہ ۱۳۵۰ف

کتب مندرجہ ذیل بطور عطیہ وصول ہوئے۔

۱، سلیس اردو، مرتبہ انجمن ترقی اردو حیدرآباد۔ ۲، سر سید احمد خان، ۳، دفتری معلومات کتب نمبر ۱و۲ کے مولف ظہیر الدین احمد صاحب ام اے یکے سی ایس ہیں۔

کتب خانہ معاشی کمیٹی حیدرآباد میں جدید اضافہ

۱، ترتیب جنگلات، تالیف ابو یوسف احمد محی الدین حسین فاروقی مرحوم۔ ۲، مصرف جنگلات، تالیف ابو یوسف احمد محی الدین حسین فاروقی مرحوم۔ ۳، رپورٹ ٹکنیکل کالج سنہ ۱۳۵۰ف و ۱۳۵۱ف دو جلد۔ ۴، رپورٹ سررشتۂ جنگلات سنہ ۱۳۵۰ف۔ ۵، اقتصادی ہند، تالیف برج نارائن صاحب ام اے۔ ۶، ہندوستان کا دیہی قرض تالیف پروفیسر محمد عاقل صاحب ام اے۔ ۷، ہمارا مزدور، تالیف محمد عبد القادر صاحب بی ایس سی آنرز لندن، ۸، ہماری بلیس اور ٹیکس، تالیف ڈاکٹر جعفر حسن صاحب۔ ۹، رپورٹ نظم و نسق سررشتۂ کروڑ گیری سنہ ۱۳۴۹ف، ۱۰۔ رپورٹ سررشتۂ علاج حیوانات، ۱۱۔ کسان، تالیف چودہری مختار سنگھ۔ ۱۲، علم دولت، تالیف برج نارائن صاحب ام اے ۱۳، مالیات عامہ اور ہمارے افلاس کے اسباب، ترجمہ قاضی محمد حسین صاحب۔ ۱۴، جاگیرداری، تالیف عبد اللہ ملک صاحب۔ ۱۵، مشین اور مزدور تالیف کامریڈ باری صاحب۔ ۱۶، سوشلزم شائع کردہ مکتبہ اردو لاہور۔ ۱۷، سرمایہ داری، تالیف عبد اللہ ملک صاحب۔ ۱۸، مبادی معاشیات، تالیف ذاکر حسین خان صاحب ۱۹، روٹی تالیف حسین بن حسن نظامی صاحب، ۲۰، مفہوم زر، تالیف رشید احمد صاحب۔ ۲۱، اصول و طریق محصول، تالیف حبیب الرحمن صاحب ایم اے بی ایس سی آنرز لندن، ۲۲، مبادلات تالیف رشید احمد صاحب ۲۳۔ اصول معاشیات، تالیف رشید احمد صاحب، ۲۴۔ دنیا کی موجودہ کساد بازاری کے اسباب، تالیف حبیب الرحمن صاحب ام اے بی ایس سی آنرز لندن، ۲۵، تبویب حیدری، تالیف فضل اللہ احمد صاحب۔

۲۵، اصطلاحات پیشہ وران، جلد اول و دوم، تالیف ظفر الرحمن صاحب دہلوی، ۲۶، رپورٹ سررشتۂ زراعت سنہ ۱۳۴۹ف، ۲۷، رپورٹ تنقیح اقتصادی تالیف نواب معشوق یار جنگ بہادر، ۲۸، روئداد حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس آئین جلد

۲۹، ہندو ونکالیش، شایع کردہ دارالتشہیر، ۳۰۔ موضع پنڈ کی معاشی تحقیق، تالیف محمد ناصر علی صاحب ام اے۔ ۳۱، سکھی کسان، تالیف محمد عبدالحمید صاحب۔ ۳۲، مسلمانوں کی صنعت و حرفت زراعت اور تجارت، تالیف خان کریم، ترجمہ جمیل الرحمن مرحوم۔ ۳۳، اسلام اور اشتراکیت، تالیف مسعود عالم صاحب۔ ۳۴، ہماری غذا، شایع کردہ انجمن ترقی اردو ہند۔ ۳۵، اسلام کا اقتصادی نظام، تالیف محمد حفیظ الرحمن صاحب سیوہاروی۔ ۳۶، معاہدۂ عمرانی از روسو ترجمہ ڈاکٹر محمود حسین خان صاحب ۔ ۳۷، ہمارا ہندوستان تالیف نسانی ترجمہ نواب منظور جنگ بہادر۔ ۳۸، اصلاحات پیشہ وران، جلد سوم تالیف ظفر الرحمن صاحب۔ ۳۹، برطانیہ اور امداد باہمی تالیف اے، ایم سانڈرس۔ ۴۰، مناظر امداد باہمی، تالیف ایم، ایل ڈارلنگ۔ ۴۱، امداد باہمی اور ہندوستان، تالیف پی مکرجی۔ ۴۲، معاشیات دیہات، تالیف تہامس نکسن۔ ۴۳، امداد باہمی۔ ۴۴، رہنمائے امداد باہمی تالیف سی، ایف کلنڈ۔ ۴۵، جمہوریت امداد باہمی، ایف، سی، ہو ۴۶، مالیات دیہات، تالیف ایم ٹی ہیرک۔ ۴۷، آئینہ پنجاب، تالیف ایچ کیلورٹ۔ ۴۸ چراغ ہدایت، تالیف سید مصطفی علی صاحب

۴۹، معاشیات، حبیب الرحمن صاحب ام اے، بی یس سی، آنرز (لندن)

۵۰، رپورٹ سررشتۂ آبکاری، جلد ۱۳۴۸-۳۶ ف

کتب از نمبر ۳۹ تا ۴۷ پنجاب کوآپریٹیو یونین لاہور کی شایع کردہ ہیں۔

۵۱. (AGRICULTURAL ECONOMIC RESEARCH) تالیف حبیب الرحمن صاحب

۵۲۔ (INDIGENOUS BANKING) تالیف ڈاکٹر انور اقبال صاحب

۵۳۔ (POULTRY SURVEY REPORT) مرتبۂ سررشتہ زراعت سرکار عالی

۵۴۔ (SUGAR CANE CULTIVATION) مرتبۂ راؤ بہادر ٹی یس وینکٹ رامن

۵۵۔ (FRUIT SURVEY) مرتبہ ایم آر سدر رامیا

۵۶۔ (ECONOMIC HISTRY OF INIA) تالیف رومیش چندر دت

۵۷۔ (PRINCIPLES OF PUBLIC FINANCE) تالیف آر ڈالٹن

(ENGLISH INDUSTRIAL HISTRY) تالیف شینس گری راؤ ایم اے

(OUTLINES OF ENGLISH INDUSTRIAL HISTRY) تالیف ڈبلیو کننگ ہام، ڈی ڈی

رہبر نمائش مصنوعات ملکی بابتہ ۱۳۵۱ف

مولفہ

خواجہ حمید احمد صاحب بی اے (عثمانیہ)

چند گراں قدر تبصرات

ہز ہائنس پرنس آف برار حضرت ولی عہد بہادر بالقابہ

"اس مرتبہ نمائش کے حالات کی کیفیت ایک کتابچہ کی شکل میں شائع کی جاکر ایک بہت بڑی ضرورت کو پورا کیا گیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ ارشاد شاہانہ جس سے کتاب کے سرورق کو مزین کیا گیا ہے شمع ہدایت کا کام دے گا اور نمائش ملکی صنعتوں کی موثر تشہیر اور ترقی کا باعث ہوگی۔"

سرایم وشوشیرایا کے۔ سی۔ آئی۔ ای میں نے رہبر نمائش بابتہ ۴۲-۱۹۴۱ء کا خاص دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیا اس میں اعلیٰ حضرت حضور نظام کی قلمرو کی چوتھی صنعتی نمائش کی بعض موثر خصوصیات درج ہیں۔

"رہبر مذکور میں نمائش کے مقاصد اس وسیع سلطنت کی معاشی صلاحیتیں نمائش میں سرکار عالی کے مختلف محکموں نے جو دلچسپی لی ہے اور انجمن طیلسانین عثمانیہ کی کاوشیں اجمالی طور پر واضح کی گئی ہیں۔ اس ضمن میں انجمن طیلسانین عثمانیہ نے جو ایک مستقل ادارہ ہے اپنی مساعی سے اس تحریک کی جو رہبری کی وہ عامتہ الناس سے خراج تحسین حاصل کرنے کی مستحق ہے۔"

رعایتی قیمت دو روپیہ سکہ عثمانیہ ملنے کا پتہ دفتر مجلس نمائش معاشی کمیٹی معظم بلڈنگ حیدرآباد

معاشی کتب خانہ کا قیام

زیر اہتمام معاشی کمیٹی (انجمن طیلسانین عثمانیہ)

اس کتب خانہ میں علم معاشیات کے نظری اور عملی کتب کے علاوہ حسب ذیل شعبہ جات سے متعلق کتب، رپورٹیں، رسائل اور اخبارات جمع کئے جا رہے ہیں۔ (۱) زراعت (۲) جنگلات (۳) تنظیم دیہی (۴) معدنیات (۵) آبپاشی (۶) آبکاری (۷) صنعت و حرفت (۸) مالیات (۹) تجارت (۱۰) بنک کاری (۱۱) بیمہ (۱۲) امداد باہمی (۱۳) تحریک مزدوران (۱۴) ساہوکارہ (۱۵) ریلوے (۱۶) مشترکہ سرمایہ دار ادارے (۱۷) کارخانہ جات (۱۸) بازارات (۱۹) اعداد و شمار (۲۰) تعمیرات (۲۱) گروگیری (۲۲) بے روزگاری۔

حیدرآباد میں یہ کتب خانہ اپنی نوعیت کا پہلا واحد فنی کتب خانہ ہوگا۔ اراکین معاشی کمیٹی کے علاوہ اہل فن حضرات اور عوام اس کتب خانہ سے استفادہ کر سکیں گے۔ معاشی امور میں اس سے کافی مدد ملے گی۔ جو حضرات مذکورہ بالا فنون سے متعلق اپنی تالیفات و رپورٹیں یا رسائل اس کتب خانہ میں بطور عطیہ دیں وہ شکریہ کے ساتھ قبول کئے جائیں گے۔

اطلاع

مجلہ طیلسانین کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اسکے ذریعہ جامعہ عثمانیہ کے ایم۔ اے اور ایم۔ ایس سی کے امتحانات کی غرض سے لکھے ہوئے مقالے طبع ہوں چنانچہ ابتک تین مقالے طبع ہو چکے ہیں۔ اور ایک مقالہ زیر طبع ہے۔ مجلہ طیلسانین کے نئے انتظامات کے تحت اب توقع ہے کہ مزید مقالے جلد جلد طبع ہو سکیں گے۔ جو صاحب اپنا مقالہ مجلہ میں طبع کرانا پسند فرمائیں وہ براہ کرم معتمد انجمن طیلسانین عثمانیہ معظم بلڈنگ سڑک نظام شاہی حیدرآباد کے پتہ سے مراسلت فرمائیں یا بہ تعین وقت ملاقات فرمائیں۔ مقالہ کے طباعت کی منظوری جامعہ عثمانیہ سے حاصل کرنی ضروری ہے اگر کسی مقالے کی طباعت مناسب قرار پا جائے تو انجمن کی جانب سے اجازت حاصل کرلی جائے گی۔

معاصروں کے صفحے

۱۔ "ہماری زبان" دہلی ۶ ستمبر ۱۹۴۲ء

حیدرآباد کے دفاتر میں زبان سرکاری کے وقار کو مستحکم کرنے کے لئے عرصۂ دراز سے انجمن طیلسانین عثمانیہ کوشاں ہے بعد میں اسکی اہمیت اور ضرورت نے دوسرے اداروں کی توجہ بھی حاصل کرلی مقامی صحافت بھی اس کی پوری طرح موید ہے۔ "ہماری زبان" نے دہلی سے انجمن کی کوششوں میں ہاتھ بٹایا ہے۔ اس سے قبل اس نے انجمن کی تفصیلی یادداشت جو سرکار عالی کی خدمت میں ارسال کی گئی تھی اخبار پیام حیدرآباد کے حوالہ سے بہ تمام وکمال اپنے صفحات پر نقل کردی تھی اور ادارت کی جانب سے اس یادداشت کی تائید کی تھی۔ اب پیش نظر شمارے میں نہ صرف انجمن کی وہ یادداشت جو جدید گشتی کے نفاذ کے بعد سرکار عالی کی خدمت میں ارسال کی گئی اخبار پیام کے حوالہ سے نقل کردی ہے بلکہ ادارت کی جانب سے ایک علحدہ مقالہ میں انجمن کے مطالبات کی پرزور تائید کی ہے، لکھا ہے کہ :—

"یہ کسی غیر ملکی زبان کا معاملہ تو ہے نہیں، معاملہ ہے اردو زبان کا جو قدامت کے اعتبار سے نہ صرف ملکی بلکہ وطنی حقوق و روایات و مراعات کی حامل ہے، عام ہے، عام فہم ہے، سہل ہے، صرف ایک نقص ہے کہ بعض لوگ اسے خلاف فیشن اور خلاف شان سمجھنے لگے ہیں مگر ایسے لوگ ہیں کتنے ؟ اور کے دن کے ؟ غرض یہ کہ اردو زبان سے گریز کا سبب ایک طفلانہ فریب کتری ہے اور اسکے ازالے کی بڑی اچھی سبیل یہ ہے کہ حکومت کے ذمہ دار ارباب اقتدار اردو کو سرکاری زبان سمجھنے لگیں تو ساری دقت رفع ہوجائیگی"

آگے اس سلسلہ میں لکھا ہے کہ :—

"فنی اعتبار سے اردو زبان کو اتنا مفلس اور ناقابل اعتنا سمجھ لینا کہ ریلوے اور تعمیرات وغیرہ کے محکموں میں پوری طرح کام دینے سے اردو زبان قاصر ہے تو یہ اردو کی موجودہ ترقیوں، اسکے ادب میں نئے اضافوں اور اردو کی فنی کتابوں سے لاعلمی کا ثبوت ہے اور اس سے بڑھ کر یہ جامعہ عثمانیہ کی نفی کرنا ہے۔ کیا جامعہ عثمانیہ صرف فاضل دینیات وادب اور ماہرین فلسفہ وتاریخ ہی پیدا کرتی رہی !؟ جامعہ عثمانیہ سے

سائنس ریاضی اور انجنیرنگ کے جو فارغ التحصیل طلبہ برآمد ہوئے ہیں انہوں نے آخر اردو زبان ہی میں تو پڑھا ہے؟ خود ان فارغ التحصیل طلبہ پر کتنا بڑا ظلم ہے کہ وہ پڑھیں تو اردو میں اور توقع ان سے یہ کی جائے کہ وہ کام کریں غیر زبان میں اور یا پھر مادر جامعہ کے ان فرزندوں کی حیثیت مادر وطن کی آغوش میں وہی ہوگی جو ہندوستانیوں کی انگلستان میں!"

اپنی زبان کی حفاظت کے جذبہ کی ایک تازہ مثال یہ بیان کی ہے کہ :—

"سنہ ۱۹۴۲ء میں بیرونی منگولیا نے روسی زبان کی ترویج کے خلاف احتجاج پر وفاق روس سے علیحدگی اختیار کر لی اور اس وقت تک شرکت نہ کی جب تک اپنی زبان کے استعمال کی آزادی نہ مل گئی۔ حیدرآباد کے ریلوے کے محکمے کو اُردو زبان کے استعمال کا پابند بنانے میں جو ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی ہے وہ اس مثال سے رفع ہو جانا چاہئیے اور یہ عذر بھی دور ہو جانا چاہئیے کہ چونکہ ہماری ریلوے بیرونی ریلوے سے متصل ہے اس لئے بیرونی زبان کا جاری رہنا ضروری ہے۔"

آخر میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ :—

"ہندوستان اس وقت ایک سیاسی ولسانی (خلفشار) میں مبتلا ہے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ آئین کس شکل کا ہو۔ ایسی حالت میں مختلف ممکنہ صورتیں پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے لسانی مفاد کی حفاظتی تدابیر سے غافل نہیں رہنا چاہئیے۔ یہ خطاب ارباب حیدرآباد سے بھی ہے اور ارباب اردو سے بھی!"

۲۔ المعلّم۔ اعادی نصاب نمبر۔ اور دوسرے دو عادتی شمارے (مہر و آبان ۱۳۵۱ف) یہ مجلہ ۱۸ سال سے مسلسل جاری ہے اور اپنی وضع داری کو مشکلات کے باوجود جس طرح نبا رہا ہے وہ ہر طرح قابل ستائش ہے، یہ مجلہ محض تعلیمی رسالہ ہے جس میں تعلیم کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہوتے ہیں، امرداد و شہریور سنہ ۱۳۵۰ف کے شمارے کو "اعادی نصاب نمبر" کا نام دیا گیا ہے اعادی نصاب کا جو مفہوم ہے وہ المعلم کے عمل پسند اور سرگرم مدیر کے الفاظ میں یہ ہے "جن ممالک میں مدرسین کو اپنے پیشے سے دلچسپی ہوتی ہے متعلقہ کتب کا برابر مطالعہ کرتے رہتے ہیں رسالجات پڑھتے اور خود مضمون لکھتے رہتے ہیں، لیکن وہاں بھی اس کی ضرورت محسوس کی گئی ہے کہ چند سال

کے وقفہ سے مدرسین کو یکجا کر کے ماہرین تعلیم کے خیالات سے مستفید ہونے کا اور اپنی مشکلات کو حل کرنے کا موقع دیا جائے .... ہمارے ملک میں اول تو عموماً مطالعہ کا شوق نہیں، دوسرے مطالعہ کی سہولت نہیں تیسرے ایسے مواقع بھی بہیا نہیں کئے جاتے کہ حاصل کردہ معلومات کو تازہ رکھنے کی ضرورت محسوس ہو،

بہرحال "اعادی نصاب" کا مطلب یہ ہے کہ حاصل کردہ معلومات کو تازہ رکھا جائے۔ چنانچہ خورداد ۱۳۵۱ف میں اس قسم کے اعادہ یا آموختہ کا انتظام عمل میں آیا۔ مدیر المعلم کے الفاظ میں سررشتۂ تعلیمات مملکت آصفیہ کی تقریباً ایک صدی کی عمر میں یہ پہلا موقع تھا کہ مدرسین تربیت یافتہ کے طریقۂ تعلیم میں اصلاح، ان کی معلومات میں اضافہ اور کارکردگی میں ترقی کے لئے اعادی نصاب کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس کی یاد تازہ رکھنے کے لئے المعلم کی یہ اشاعت مختص کردی گئی ہے۔ اور پڑھنے کے لئے بعض دلچسپ صفحات ضرور موجود ہیں۔

اسکے اداریہ سے ایک بات کا اعادہ شاید نامناسب نہیں۔ اداریہ میں ظاہر کیا گیا ہے کہ اس کی تحریک ۱۳۴۷ف میں کی گئی لیکن عمل آوری ۱۳۵۱ف میں ہوئی ہمارے ملک میں اس قسم کی مفید اور کم خرچ تجاویز بھی ۴۔ ۴ سال کی مدت میں عمل پذیر ہوں تو ہماری کارکردگی کیلئے کسی درخشاں مستقبل کی امید بے سود ہے۔ آخر حیدرآباد کب بیدار ہوگا!

المعلم کے شمارہ ماہ مہر میں اعادۂ نصاب کے مقصد کے متعلق خواجہ یوسف الدین صاحب لکچرار عثمانیہ ٹریننگ کالج کے ایک توضیحی مضمون سے مزید معلومات حاصل ہوتے ہیں۔

اردو کے پڑھنے اور پڑھانے سے جن اصحاب کو دلچسپی ہو ان کو ماہ مہر کے شمارے میں دو مضمون ...... ضرور پڑھنا چاہئیے۔ ایک مضمون ہے "ابتدائی شہری مدارس میں مادری اور دیگر زبانوں کی تعلیم" عبدالحکیم صاحب لکچرار عثمانیہ ٹریننگ کالج نے یہ مضمون لکھا ہے۔ دوسرے مضمون کا عنوان "اردو کی تدریس" ہے عظیم الدین صاحب مددگار سینٹ جارجس گرامر اسکول نے یہ مضمون لکھا ہے،

ماہ آبان ۱۳۵۱ف کے شمارہ میں "پہننے سے پہلے کی تیاری" کا مضمون ہر اس شخص کو پڑھنا چاہئیے

جسکو گھریلو صنعتوں سے دلچسپی ہو اور جو ملک کے پھلوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہوں، اور جو ملک میں پھلوں کی کاشت کو وسعت دینے کا خیال رکھتے ہوں ۔ المعلم شروع سے ہاتھ سے بنائے ہوئے دیسی کاغذ پر طبع ہوتا رہا ہے ۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ سرپور کے کاغذ کا کیا ردعمل ہوتا ہے ۔

۴۔ سب رس بابتہ ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۲ء

ادارۂ ادبیات اردو نے جنم لیتے ہی اپنی سود مندی جس طرح ثابت کر دی ہے وہ ہر کام کرنیوالے ادارہ کے لئے ایک مثال ہے ۔ اس نے اردو امتحانات کا جو نظام رائج کیا ہے اس کی قدر کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اردو کو نہ صرف دفاتر بلکہ ملک کے سارے کاروبار میں رائج ہوتے دیکھنے کے لئے بیقرار اور بے چین ہیں ۔

ادارہ کا ترجمان "سب رس" سب کے لئے دلچسپ ہے لیکن اس کی سود مندی اب اور زیادہ ہو جائیگی، اکتوبر کے شمارے میں ادارت کی جانب سے واضح کیا گیا ہے کہ :—

"سب رس میں جو علمی مضامین شایع ہوتے ہیں ان کو آئندہ سے خاص مسائل کے تحت مرتب اور شریک کیا جائے گا ۔ فی الحال یہ مسائل ہونگے، ۱۔ حیدرآباد بحیثیت مسلم تعلقات ۔ ۲۔ اردو زبان کے مسایل ۔ ۳۔ دکن کے آثار قدیمہ ۔ ۴۔ دکنی مشاہیر" نومبر کا شمارہ غالباً اسی باب واری تقسیم پر مشتمل ہوگا ۔

۴۔ "سلطنت" بلدہ فرخندہ بنیاد کا ایک ہفتہ وار اخبار ہے ۔ اور ہر ہفتہ پابندی سے شایع ہوتا ہے مولوی سید شمس اللہ صاحب قادری جیسے کہنہ مشق اور مطالعہ کے دھنی بزرگ کے فرزندوں نے اپنے والد کے ذوق مطالعہ سے کافی حصہ حاصل کیا ہے ۔ "سلطنت" کے ہر شمارہ میں کوئی نہ کوئی مضمون ایسا ضرور ہوتا ہے کہ جس کا پڑھنا کسی نہ کسی وجہ سے ضروری ہوتا ہے ۔

۵۔ سررشتۂ معلومات عامہ سرکار عالی کی جانب ایک ماہ نامہ "معلومات حیدرآباد" کے نام سے اردو اور دوسری زبانوں میں شایع ہوتا ہے، اسکے شمارہ ماہ آبان ۱۳۵۲ف میں "دور ماضی سے ارتباط"

کے عنوان سے دفتر دیوانی و مال و ملکی کے حالات پر ایک مفید مضمون شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں ادعا کیا گیا ہے کہ دفاتر مذکور میں ڈیڑھ کروڑ قدیم سرکاری کاغذات محفوظ ہیں۔ ان کاغذات کی قدر و قیمت کا اندازہ ان دو کاغذات کے عکس سے ہو سکتا ہے جو اس شمارے میں شائع ہوئے ہیں۔ ایک کاغذ جنگ ٹیپو کے تاوان کی نسبت ہے اور دوسرا حیدرآباد اور پونا کے درمیان ٹپہ کے انتظامات کے متعلق۔ دونوں کاغذات پر نواب میر نظام علی خان مرحوم کی خود نوشتہ تحریر موجود ہے۔

ادارہ انجمن طیلسانین عثمانیہ کی مطبوعات

۱۔ اردو ادب بیسویں صدی میں موجودہ صدی کے اردو ادب پر ایک سیر حاصل تنقیدی مقالہ مولفہ سید علی حسین صاحب زیبا ایم۔ اے (عثمانیہ) قیمت بارہ آنے ۱۲/

۲۔ عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی کے متولیاں ریاست عادل شاہی دور تولیت کی بسیط اور محققانہ تاریخ مولفہ سید علی محسن صاحب ایم۔ اے عثمانیہ قیمت دو روپیہ (عـ)

۳۔ سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی مفصل محققانہ اور مستند تاریخ مولفہ ظہیر الدین صاحب ایم۔ اے (عثمانیہ) قیمت ۱۴ (عہـ)

۴۔ موضع دوبلی کی معاشی تحقیق از محمد ناصر علی صاحب ایم۔ اے (عثمانیہ)۔ زیر طبع اراکین انجمن اور خریداران مجلہ طیلسانین عثمانیہ سے نصف قیمت کتب فروشوں کے ساتھ خاص رعایت۔

بغرض سہولت کتابیں تبادلے میں بھی دیجاتی ہیں

ملنے کے پتے

(۱) دفتر مجلہ طیلسانین (انجمن طیلسانین عثمانیہ) حیدرآباد دکن نظام شاہی روڈ

(۲) مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد۔

جامعاتی معلومات

۱۳۵۱ف کے سال تعلیمی کے آغاز سے جامعۂ عثمانیہ کے شعبۂ قانون میں ال ال ایم کی جماعت کا افتتاح عمل میں آیا ہے۔ ال ال ایم ابتدائی میں ایسے طلبا داخل ہوسکیں گے جو جامعہ عثمانیہ یا کسی مسلمہ جامعہ سے ال ال بی یا اسکے مماثل کسی امتحان میں کامیاب ہوں۔ ال ال ایم آخری میں صرف وہی طلبہ شریک ہوسکیں گے جو جامعۂ عثمانیہ سے ال ال ایم ابتدائی کا امتحان کامیاب ہوں، نصاب تعلیم کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

ال ال ایم ابتدائی، چار پرچے

۱۔ تقابلی اصول قانون و اصول وضع قانون،

۲۔ قانون دستور (انگلستان، برطانوی ہند وحیدرآباد)

۳و۴ مندرجہ ذیل مضامین سے کوئی دو:۔

الف۔ شرع شریف مع تاریخ و اصول قانون

ب۔ دھرم شاستر مع تاریخ و اصول، قانون ہنود

ج۔ قانون حقیت اراضی۔

برطانوی ہند کے مختلف صوبوں اور حیدرآباد کے قوانین کا تقابلی مطالعہ

د۔ قانون انتقال جائیداد۔

ھ۔ تصادم قوانین

و۔ قانون بین الممالک

ز۔ قانون معاہدہ

ح۔ قانون مضرات (ٹارٹ)

ط ۔ قانون جرائم وجرمیات

ال ال ایم آخری

دو پرچے اور ایک مقالہ

۱۔ دکن کے کسی دور کا قانونی موضوع ۔

۲۔ مضامین ال ال ایم ابتدائی کے کسی خاص مضمون کا تفصیلی مطالعہ ۔

نیز مقالہ جس کے موضوع کا تعین مجلس نصاب کریگی ۔

انڈین سرامک سوسائٹی کی از سر نو تاسیس عمل میں آئی ہے اور اس کا مستقر شعبہ سرامک ہندو یونیورسٹی بنارس میں قایم کیا گیا ہے ۔ سوسائٹی اپنا ایک مرکزی کتب خانہ قایم کریگی، عجائب خانہ بھی قایم کیا جائیگا، اس عجائب خانہ میں ہندوستان میں پیدا ہونے والی ایسی خام شئے بھی فراہم کیجائیں گی جن سے سرامک صنعتوں کی تیاری عمل میں آتی ہے ، (کرنٹ سائنس بنگلور جولائی ۱۹۴۲ء) ،

دہلی کی جامعہ کو (RHODES TRUSTEES (امن ، رہوڈس) کی جانب سے دو ہزار پانچسو پونڈ کا ایک عطیہ حاصل ہوا ہے تاکہ اس رقم سے ایک وقف قائم کرکے اس سے سیاسیات یا زبان انگریزی کی پروفیسری یا لکچراری قایم کی جائے (کرنٹ سائنس ، بنگلور ، جولائی ۱۹۴۲ء)

حکومت میسور نے یکمشت ایک لاکھ روپیے بطور سرمایہ اور سالانہ پندرہ ہزار روپیے کی متوالی امداد انڈین انسٹیٹیوٹ آف سائنس بنگلور کے لئے منظور کی ہے ۔ تاکہ اس سے (AUTOMOBILE) اور (AIRONAUTICAL) انجینرنگ کا شعبہ قایم کیا جائے (کرنٹ سائنس ، بنگلور ، اگسٹ ۱۹۴۲ء) ،

"ہندوستان ایرکرافٹ کنسٹرکشن کمپنی" کے صدر نے تین سو پونڈ سالانہ کا ایک وظیفہ چار سال کے لئے انڈین انسٹیٹیوٹ آف سائینس بنگلور کے ایک ایسے طالب علم کے لئے عطا کیا ہے جو کسی امریکی ادارہ میں (AIRONAUTICAL) انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔ (کرنٹ سائینس بنگلور، اگسٹ ۱۹۴۲ء)

کلکتہ کی جامعہ کے صدر شعبۂ نفسیات (کلیۂ سائینس) پروفیسر بی ایس بوس ، ڈی ایس سی نے پیشہ ورانہ رہبری کے سلسلے میں یہ اطلاع شائع کرائی ہے کہ تعلیمی اور پیشہ ورانہ رہبری کے لئے دماغی اور ذہنی صلاحیتوں کے امتحان کا کام پھر آغاز کیا گیا ہے۔ یہ امتحان کسی قسم کی فیس لینے کے بغیر عمل میں لایا جاتا ہے۔ جو لوگ اس قسم کے امتحان کے خواہشمند ہوں وہ اس کام سے متعلق لکچرار سے مراسلت عمل میں لائیں پتہ یہ ہے۔

LECTEURER-IN CHARGE APPLIED SECTION
DEPARTMENT OF PSYCHOLOGY
UNIVERSITY COLLAGE OF SCIENCE
92 UPPER CIRCULAR ROAD
CALCUTTA

(ماڈرن ریویو، کلکتہ، اگسٹ ۱۹۴۲ء)

آندھرا یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد میں خطبہ پڑھنے کے لئے مہارانی ٹراونکور کا انتخاب عمل میں آیا ہے۔ نیز مہاراجہ ٹراونکور انامالی یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد میں خطبہ پڑھیں گے۔ (انڈین ریویو مدراس، ستمبر ۱۹۴۲ء)

۱۷ر جولائی ۱۹۴۲ء کو رسماً کولمبو میں جامعۂ سیلون کا قیام عمل میں آیا۔ اس وقت تک سیلون کی

اعلیٰ تعلیم کا تعلق لندن کی جامعہ سے تھا۔ اور بہت عرصہ سے یہ کوشش عمل میں لائی جارہی تھی کہ مقامی حالات اور خصوصیات کے مدنظر خود سیلون میں جامعہ کا قیام عمل میں لایا جائے، یہ جامعہ اقامتی ہے اور فی الوقت فنون، سائینس، مشرقی السنہ، اور طب کے شعبوں پر مشتمل ہے، تجویز ہے کہ آئندہ شعبہ قانون بھی قایم کیا جائے۔ (کرنٹ سائینس، بنگلور، جولائی ۱۹۴۲ء)

ہندوستان ریویو کے شمارہ جولائی ۱۹۴۲ء میں ایک مصری مصطفیٰ زادہ پی، ایچ، ڈی، مددگار پروفیسر تاریخ جامعۂ مصر نے مصر کی علمی نشاۃ ثانیہ پر ایک مختصر مضمون لکھا ہے، اس سے جو معلومات حاصل ہوئے ان کو ذیل میں دہرانا بے محل نہ ہوگا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ۱۹۰۸ء سے قبل مصر میں کوئی جامعہ قائم نہیں تھی، اور قدامت و تاریکی سے مقابلہ کرنے کے لئے صرف شیخ محمد عبدہ کا مدرسہ ازہر اور چند سرکاری کلیات تھے، شیخ محمد عبدہ کے مدرسہ میں محض محدود تعداد میں چند افراد تعلیم پایا کرتے تھے۔ سرکاری کلیات میں سرکاری نوکریاں حاصل کرنے کی خاطر لوگ تعلیم پاتے تھے، ان میں سے ہی بعض طلبہ یورپ کو بھیجے جاتے تھے، کوئی شبہ نہیں کہ ان میں بعض قابل افراد بھی پیدا ہوئے لیکن ان کی تعداد بھی محدود تھی، یہ واقعہ کہ مصر میں جامعہ تعلیم ایک شئے درآمد کی صورت میں حاصل ہوا اس بات کی محرک ہوئی کہ سرزمین مصر میں کم از کم ایک جامعہ کا قیام عمل میں لایا جائے۔

بہرحال ۱۹۰۸ء میں خانگی عطیات سے جامعہ قایم ہوئی، تا آنکہ اوسکو ۱۹۲۵ء میں حکومت نے شاہی حکم سے ایک سرکاری ادارہ قرار دے دیا۔ اس کا سالانہ میزانیہ دس ہزار مصری پونڈ سے بڑھکر ۱۹۳۲ء ۲ لاکھ ۸ ہزار سات سو چھیاسی پونڈ ہوگیا۔ طلبہ کی تعداد ۱۹۲۵ء سے قبل (۱۰۷) تھی، لیکن ۱۹۳۲ء میں ان کی تعداد (۲۳۸۱) ہوگئی، اس وقت جامعہ فنون، سائینس، قانون اور طب کے چار شعبوں پر مشتمل ہے، یوں پہلے صرف دو شعبے فنون اور قانون کے ہی قایم تھے دوسرے دو شعبے بعد میں قایم ہوئے ۱۹۳۵ء میں شعبوں کی تعداد سات ہوگئی یعنی شعبہ جات فنون، سائینس، قانون، طب، انجینرنگ، زراعت اور تجارت شعبہ طب کے ساتھ بیطاری، ادویہ سازی، دنداں سازی اور دوایہ گری کے مکاتیب علٰحدہ

ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں سالانہ موازنہ ۸ لاکھ پچاس ہزار مصری پونڈ ہوگیا اور تعداد طلبہ (۶۰۸۱) جامعہ کی جانب سے ہر سال شام میں عام لکچر ہوتے ہیں۔ نیز ایک مجلس اشاعت بھی موجود ہے جو تحقیقاتی کتابیں شایع کرتی ہے۔

ستمبر ۱۹۴۱ء میں شیکاگو کی جامعہ نے اپنی پچاسویں سالگرہ منائی، اس جامعہ کے ساتھ اس کا مطبع شروع سے قائم ہے، اس مطبع نے اپنے سلسلے کی اب تک (۳۰۰۰) کتابیں شایع کی ہیں، اس کی جانب سے (۱۸) مجلات شایع ہوتے ہیں، سب سے پہلا مجلہ ۱۸۹۲ء میں "جرنل آف پولیٹیکل اکانومی" کے نام سے شایع ہونا شروع ہوا۔ یہاں لیا گیا ہے اس جامعہ کی سالگرہ کے موقع پر ۴۳ مشاہیر کو جامعہ کی جانب سے اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی گئی اور جا
صرف عمرانیات کے موضوع پر ۱۹۴۰ء میں ممالک متحدہ امریکہ اور کناڈا کے اداروں سے (۵۰) افراد نے ڈاکٹریٹ کا اعزاز حاصل کیا۔ اور (۱۰۰) افراد نے ماسٹر کی ڈگری حاصل کی۔ جولائی ۱۹۴۱ء میں اس موضوع پر ممالک متحدہ امریکہ اور کناڈا کے اداروں میں جو لوگ مصروف کار تھے ان کی تعداد ڈاکٹریٹ کے لئے (۱۱۱) تھی اور ماسٹر کے لئے (۱۹۱)۔ (امریکن جرنل آف سوشیالوجی جولائی ۱۹۴۱ء)

امریکہ کا ایک خیراتی فنڈ موسوم بہ (JULIUS ROSEN WALD FUND) اپنے سرمایہ سے ۶۲ فیلوشپ عطا کرتا ہے جس کی مجموعی رقم ایک لاکھ اسٹرلنگ ہوتی ہے۔

پرنسٹن (PRINCETON) کی جامعہ کے ایک طالب علم نے جغرافیہ کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کرنے کیلئے گراموفون کا جدید ذریعہ اختیار کیا۔ ٹائپ کرانے کی بجائے مقالہ گراموفون پر رکارڈ کرا دیا گیا اور ممتحنوں کی سہولت کے لئے نقشے اور خاکے ایک کتابچہ کی صورت میں مہیا کرائے گئے۔ (انڈین ریویو، مدراس، ستمبر ۱۹۴۲ء)

عثمانیہ ٹریننگ کالج حیدرآباد کی سالانہ رپورٹ بابتہ ۱۳۵۰-۵۱ف میں صدر صاحب نے اس کالج کی علمی اور تحقیقاتی سرگرمی کے متعلق بیان کیا ہے کہ:-

"یہ کالج تدریسات کے نصابوں کی تکمیل کے علاوہ علمی اور تحقیقاتی کام بھی کرتا رہتا ہے اب تک اٹھائیس معیاری درسی انگریزی کتب کا ترجمہ ہو چکا ہے جن میں سے ستائیس شایع ہو چکی ہیں، تقریباً چار ہزار اصطلاحات تدریسات وضع کی جا چکی ہیں جو عرصہ سے دارالطبع جامعہ عثمانیہ میں زیر طبع ہیں۔ تالیف و تصنیف کا بھی آغاز ہو چکا ہے اور ملک سردار علی صاحب نے نفسیات اور اصول تعلیم پر قابل قدر کتابیں شایع کی ہیں . . . . میر احمد علی خان صاحب نے ممالک محروسہ کے لئے سماجیت پر ایک کتاب تیار کی ہے جو عنقریب شایع ہوگی، کالج کے زیندار اساتذہ بھی ترجمے اور تالیفیں شایع کر رہے ہیں، متعدد مسودات اہم عنوانات پر تیار ہیں لیکن اخراجات کی تنگی کے باعث یوں ہی پڑے ہوئے ہیں۔" (المعلم بابتہ خورداد و تیر ۱۳۵۱ف)

زبان اردو کی کم سے کم مدت میں موثر تدریس کے متعلق عثمانیہ ٹریننگ کالج (حیدرآباد) میں جو کامیاب تجربہ کیا جا رہا ہے اسکے متعلق بھی کالج کے صدر صاحب نے اپنی حالیہ رپورٹ میں واضح کیا ہے۔

ممالک محروسہ آصفیہ میں جب سے مادری زبان پر بحیثیت ذریعۂ تعلیم زور دیا جا رہا ہے تدریس زبان کا مسئلہ روز بروز اہم اور پیچیدہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس بارے میں عام طور پر یہ فراموش کر دیا جاتا ہے کہ ہمارے وطن میں چار زبانیں نہیں بلکہ ۱۲ زبانیں بولی جاتی ہیں، اس لئے ہم دو یا تین زبانی ہونے پر مجبور ہیں، چنانچہ ہمارے ہاں کے ناخواندہ بھی ایک سے زیادہ زبانیں بولتے ہیں۔ لیکن یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ان سب زبانوں میں ایک زبان ایسی ہے جو خانوادۂ آصفیہ کی زبان ہے، سرکاری زبان ہے، اور ساتھ ہی وہ ہندوستان کی بین الصوبجاتی اور ایشیا کی بین الاقوامی زبان بھی ہے چنانچہ اس زبان اردو یا ہندوستانی کی اہمیت

کے مدنظر اس کالج نے اس کی کمی سے کم مدت میں موثر تدریس کے لئے اردو داں اور غیر اردو داں دونوں کے لئے چند نئی ویز اختراع کی ہیں، جن پر تجربہ کیا جا رہا ہے۔ اردو داں بالغ کی تعلیم کے لئے جو تجویز کی گئی ہے اس کو حیدرآباد کے مشہور ادارہ ادبیات اردو نے رائج کیا ہے اسکے متعلق معتمد صاحب کا بیان ہے کہ وہ مقبول اور کامیاب ثابت ہوا۔ غیر اردو داں کے لئے جو طریقۂ تعلیم ارتھولاجیکل انسٹیٹیوٹ موجد بیسک انگلش کے اشتراک سے وضع کیا گیا ہے اس کا ایک تجربہ افواج باقاعدہ کے ناخواندہ اور غیر اردو داں سپاہیوں پر کیا گیا۔ عہدہ داران متعلقہ نے اس کی غیر معمولی کامیابی کا اعتراف کیا ہے۔ (المعلم بابتہ خورداد و تیر ۱۳۵۱ف)

مجلۂ طیلسانیین کے ناظرین سے

۱۔ مجلۂ طیلسانیین کے خریداروں سے استدعا ہے کہ اپنے پتہ کی تبدیلی سے بروقت مطلع کر دیں۔

۲۔ تنقید کے لئے کتابیں بھیجی جائیں تو مدیر کے پاس بہ ست دفتر مجلہ بھیجی جائیں۔

۳۔ مضامین، مقالوں اور دیگر متعلقہ امور میں مدیر کو مخاطب کرنا مناسب ہے۔

۴۔ اشتہارات، خریدی اور دوسرے مماثل امور میں مہتمم کو مخاطب کرنا بہتر ہے۔

مجلّہ کے دفتر کا پتہ

دفتر انجمن طیلسانیین عثمانیہ کمرہ نمبر ۱۹۔ مجرد گاہ

نظام شاہی روڈ حیدرآباد دکن

انجمن اور اس کے ملحقہ اداروں کی اطلاعیں

۱۳۵۲ف کے لئے جو انتخابات عمل میں آئے ہیں وہ کئی اعتبارات سے قابل لحاظ ہیں ۔

انجمن کی کابینہ کے سب عہدہ دار اور ارکان بالاتفاق منتخب ہوئے ۔ دس سال کی مدت میں یہ پہلا وقع ہے کہ یہ مثال قایم ہوی ۔ جو اصحاب عہدہ دار اور ارکان کابینہ منتخب ہوئے ان میں بعض پہلی مرتبہ کابینہ میں شریک ہوئے ہیں اور بعض پہلے سے خدمت گزاری میں معروف ہیں ، جو اصحاب منتخب ہوئے ہیں ان میں وہ بھی ہیں جو جامعہ کا دور ختم کر کے عملی زندگی میں بہت آگے نکل چکے ہیں اور وہ بھی ہیں جو ابھی ابھی نئی امنگوں اور نئی آرزوں کے ساتھ میدان عمل میں آئے ہیں ۔ غرض انجمن کے لئے جو کابینہ منتخب ہوئی وہ یہ ہے ۔

صدر ۔ ظہیر الدین احمد صاحب ام لے پی ایچ سی یس

نائب صدر ۔ ڈاکٹر قاضی معین الدین صاحب ایم یس سی ، پی ایچ ڈی

معتمد ۔ محمد غوث صاحب ۔ ایم اے

نائب معتمد ۔ عبد العلی صاحب بی یس سی ، ال ال ، بی

خازن ، شرف الدین صاحب بی اے

ارکان میر اکبر علی خان صاحب بیرسٹر ایٹ لا ، عبد المجید صاحب صدیقی ۔ ام ، اے ، ال ال بی ، شنکر جی صاحب بی اے ، ال ال بی ، سید فضل حق صاحب ام اے ، گرو داس صاحب بی آ ، ال ال ، بی ، سید عبد الرزاق صاحب قادری جعفر ام اے ، نیر الدین صاحب بی اے ۔ معتمدی پر محمد غوث صاحب کا انتخاب عمل میں آیا ۔ لیکن چونکہ ان کو تعلیمی مصروفیت ہے اس لئے اس سلسلہ میں کابینہ مناسب انتظام عمل میں لائیگی ۔

معاشی کمیٹی کے سالانہ انتخابات میں صدر ، نائب صدر ، معتمد اور خازن کا انتخاب بلا اختلاف عمل میں آیا ۔ مجلس عاملہ کی تشکیل یوں ہے ۔

صدر۔ ال، ان گپتا صاحب بی اے، ایچ سی ایس
نائب صدر۔ عبدالقیوم صاحب بی اے، ایچ سی ایس
معتمد۔ خواجہ حمید احمد صاحب بی اے
نائب معتمد۔ محمد یوسف الدین صاحب ام اے
خازن۔ عزالدین محمد صاحب

ارکان، اشتاق احمد صاحب ام اے، دکنتب، عبدالمجید صاحب صدیقی ام اے، ال ال، بی، میر محمود علی صاحب ام اے، عبدالقادر صاحب بی ایس سی آنرز (لندن)، کا بینۂ انجمن کی جانب سے معاشی کمیٹی کی مجلس عاملہ میں حسب ذیل ارکان کی نامزدگی عمل میں آئی، ظہیرالدین احمد صاحب صدر انجمن، محمد غوث صاحب ام اے، شرف الدین صاحب خازن انجمن شنکرجی صاحب۔

جماعت اتحاد و ترقی کی مجلس عاملہ کی تشکیل حسب ذیل قرار پائی۔

صدر۔ میر اکبر علی خان صاحب بیرسٹر
نائب صدر، ڈرنشا جی اٹالیہ صاحب
معتمد، راے گروداس صاحب
نائب معتمد، خواجہ سردار اللہ خان صاحب جاگیردار
خازن، سری کشن صاحب

ارکان، سید محمد علی صاحب موسوی، ڈاکٹر لطیف سعید صاحب، میر زاہد علی صاحب کامل بی اے ال ال بی، سیٹھ سکھ دیو پرشاد صاحب۔ محمد عبداللہ پاشاہ صاحب اڈوکیٹ، سید حسن صاحب بنکٹ پرشاد صاحب بی اے ال ال بی،

نمائش مصنوعات مملکت آصفیہ سال بہ سال

۱۳۴۸ف میں ملکی مصنوعات کی پہلی نمائش کا افتتاح نواب اکبر یار جنگ بہادر نے فرمایا۔ اس نمائش میں تقریباً سو اسٹال قائم ہوئے تھے اور ایک لاکھ روپیہ کی مالیت کا سامان فروخت ہوا۔ پچاس ہزار سے زاید اشخاص نے نمائش دیکھی یہ نمائش دس دن جاری رہی۔

صدر مجلس نمائش معاشی کمیٹی مولوی سید محمود علی صاحب ایم، اے لکچرار سٹی کالج تھے ۱۳۴۹ف میں ملکی مصنوعات کی دوسری نمائش کا افتتاح حضرت شہزادہ جنرل والا شان ڈاکٹر نواب اعظم جاہ بہادر نے فرمایا۔ اس نمائش میں (۲۰۵) اسٹال قائم ہوئے تھے اور دو لاکھ روپیہ کی مالیت کا سامان فروخت ہوا ایک لاکھ سے زاید اشخاص نے نمائش دیکھی اعلیحضرت بندگانعالی نے بطور خاص نمائش کا تفصیلی معائنہ فرماکر اپنے تاثرات کا اظہار فرمان مبارک کے ذریعہ فرمایا یہ نمائش دو ہفتے جاری رہی۔

صدر مجلس نمائش معاشی کمیٹی مولوی محمد فاروق صاحب بی، سی، ایس، دوم تعلقدار تھے۔

۱۳۵۰ف میں تیسری نمائش کا افتتاح نواب سر اکبر حیدری نواز جنگ بہادر صدر اعظم باب حکومت نے فرمایا، اس نمائش میں (۲۵۰) اسٹال قایم ہوئے تھے دو لاکھ روپیہ کی مالیت کا سامان فروخت ہوا۔ ڈیڑھ لاکھ اشخاص نے یہ نمائش دیکھی۔ اس نمائش کے ساتھ حسب فرمان خسروی نمائش باغبانی و مرغبانی کا بھی اضافہ کیا گیا، یہ نمائش تین ہفتہ تک جاری رہی۔ صدر مجلس نمائش المعاشی کمیٹی مولوی سید محمد صاحب موسوی رکن بلدیہ تھے۔

۱۳۵۱ف کی چوتھی نمائش حسب ارشاد شاہانہ یکم ذیحجہ سے شروع اور ایک مہینہ تک جاری رہی اس نمائش کا افتتاح نواب سر محمد احمد سعید خان بہادر صدر اعظم باب حکومت نے فرمایا۔ اس نمائش میں ۴۰۰ اسٹال قایم ہوئے۔ دو لاکھ سے زائد کا مال فروخت ہوا۔ تین لاکھ اشخاص نے نمائش دیکھی جس میں بیرونی مشاہیر اور کانفرنسوں کے اراکین بھی شامل تھے۔ حضرت اقدس و اعلیٰ نے دو دفعہ نمائش کا معائنہ فرما کر عثمانیہ کلب اور نمائش گھر کے تعمیر کا حکم محکم صادر فرمایا۔ صدر مجلس نمائش اور معاشی کمیٹی نواب میر اکبر علی خان صاحب بیرسٹر تھے۔

نمائش مصنوعات ملکی آصفیہ ۱۳۵۲ ف

خلاصہ پیش نامہ

ف ۔ نمایش مصنوعات مملکت آصفیہ میں ملک کی صنعتی ترقی کے لئے نہ صرف ایسی اشیا پیش ہونگی جو اہل ملک کی بنائی ہوئی ہوں بلکہ ملک کے سامان خام سے ہر قسم کے مصنوعات تیار کرنے کے عملی مظاہروں کا بھی انتظام ہوگا۔

ف ۔ نمایش کے دوران میں معاشی کمیٹی کی طرف سے پانچویں معاشی کانفرنس سررشتہ زراعت کی جانب سے نمایش باغبانی و مرغبانی اور عثمانیہ بلدی جماعت کی امداد سے نمایش اطفال اور رفیالنی ٹرلیس کے مظاہرہ کا انعقاد بھی ہوگا۔ نمائش ۱۰ بہمن سے شروع ہوکر ۱۴ اسفندار تک جاری رہے گی۔

ف ۔ سال ضمنی امور کے سوا نمایش کے مستقل پانچ حصے ہونگے ۔ (۱) تیار مصنوعات ۔ ایسے صناع جو علحدہ اسٹال قایم نہ کرسکتے ہوں یا ایسی دستکار خواتین جن کیلئے یہ ممکن نہ ہو مرکز مصنوعات ملکی کے اسٹال میں مقررہ فیس داخلہ کی ادائی پر قواعد منظورہ کے تحت اپنے اپنے اشیاء کی نمایش اور فروخت کا انتظام کرسکتے ہیں ۔ (۲) سرکاری محکموں کی افادیت اور ترقیات ۔ (۳) غیر سرکاری رفاہی اداروں کے مقاصد و اغراض کی تبلیغ و تشہیر (۴) مظاہرات (۵) معصوم و دلکش تفریحات ۔

ف ۔ قیام اسٹال کی درخواست دو روپیہ فیس شرکت کے ساتھ ۲۵ مہر ۱۳۵۲ ف تک دفتر مجلس نمایش میں وصول ہوجانا چاہیے۔ کرایہ اور دیگر تفصیلات کے لئے پیش نامہ نمائش ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

ف ۔ اضلاع اور برار کے صناعوں کو اسٹال کا ایک تہائی کرایہ معاف رہیگا۔ مصنوعات کی تیاری کے مظاہرات کیلئے اسٹال بلا کرایہ دیا جائیگا آمد و رفت اور سامان کے لانے اور لیجانے میں سررشتہ ریلوے سے رعایتیں متوقع ہیں۔

ف ۔ احاطہ نمایش کی آرایش اور سجاوٹ نیز رات میں روشنی کیلئے مجلس نمایش سال حال بھی اپنے موازنہ میں کافی رقم محفوظ کررہی ہے ہر اسٹال کو ایک برقی گولہ بلامعاوضہ دیا جائے گا۔ مزید روشنی کیلئے بھی مجلس نمایش اخراجات کی ادائی پر انتظام کرسکے گی اسٹال پر کام کرنے والوں کیلئے احاطہ نمایش میں اجازت نامے بلاقیمت دیئے جائیں گے نیز رعایتی شرح پر میعادی ٹکٹ بھی اجرا ہوں گے کارکنان اسٹال کی سیکلوں کی رکھوائی کا انتظام بھی ہوگا۔

ف ۔ مالکان اسٹال احاطہ نمایش میں اپنی مصنوعات کی تشہیر کیلئے اشتہارات نصب کرسکیں گے اور تقسیم

بھی کراسکتے ہیں تصویرکشی اور پھیری کرکے مصنوعات کی فروخت کی اجازت بھی مل سکے گی۔ آلۂ مکبر الصوت کے ذریعہ بھی تشہیر ہوسکے گی اس غرض سے ایک رہبر نمایش طبع ہوگی اور اخبار نمایش بھی شایع ہوگا۔

ف۔ اضلاع اور بیرونی مقامات سے آنے والوں کیلئے صلع سرائے جو حیدرآباد کی بڑی پٹری کے ریلوے اسٹیشن نامپلی سے بالکل متصل ہے اور نمایش گاہ سے دو فرلانگ دور ہے جگہ محفوظ ہوسکے گی۔ یہاں منجانب سررشتہ بلدیہ ہر وجہ کے قیام وطعام کی بہت اچھی سہولتیں حاصل ہیں بشرطیکہ اطلاع دینے پر نیز اخراجات کی ادائی پر فرنیچر کی فراہمی کی کوشش کی جائے گی۔

ف۔ نمایش منظورہ قواعد کے تحت صبح میں ۹ بجے سے ۱۲ بجے تک اور شام میں ۴ بجے سے ۱۰ بجے تک کھلی رہے گی۔ صبح میں ایک آنہ ٹکٹ رہیگا تاکہ اطمینان سے لوگ خریدی کیلئے آسکیں اور شام میں دو آنے کے ٹکٹ سے داخلہ ہوگا۔ طلبا کے لئے رعایتی ٹکٹ بھی جاری ہونگے۔

ف۔ مجلس نمایش کثیر ترین تعداد میں عوام مشاہیر اور تجار کے نمایش کو معائنہ کرنیکے لئے ہر قسم کا انتظام کرے گی۔ کیونکہ ان ہی کی دلچسپی سے نمایش میں شرکت کرنے والے صناعوں کی ہمت افزائی ہوتی ہے۔ اور کاروبار کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ پردے کے انتظامات کے ساتھ خواتین کے معائنہ کیلئے بھی ایام مخصوص رکھے جائیں گے۔

ف۔ مجلس نہ صرف اپنی جانب سے بلکہ حکومت سرکار عالی نیز امرا و عمائدین ملک کی جانب سے نمایش کے بہترین مصنوعات اور ان کی سجاوٹ کی بابت اسناد نقد رقم اور تمغے تقسیم کرے گی۔ بہترین مظاہرات اور ایجادات کیلئے بھی اسی طرح کے انعامات دیئے جائیں گے۔ اس کے سوا جلالت الملک حضرت اقدس اعلیٰ بندگانعالی کی بارگاہ ہنر پرور سے جو پیام شاہانہ رونق افروزی شاہانہ کے بعد سرفراز ہوتا ہے اس کا عکس منجانب سرکار عالی ہر شریک نمایش کو عطا ہوگا۔

ف۔ مصنوعات کی زیادہ سے زیادہ فروخت پر مجلس نمایش پوری طرح متوجہ رہیگی کیونکہ یہ اس کا بنیادی مقصد ہے۔

ف۔ ایسے صناعوں کی رقمی اعانت بھی کی جائیگی۔ جو مجلس کی رائے میں خصوصی امداد کے مستحق ہوں۔

تفصیلی قواعد اور مزید اطلاعات کے لئے پیش نامہ نمایش بلا قیمت طلب کیا جاسکتا ہے۔ فقط۔ رشیدالدین احمد فاروقی معتمد دفتر مجلس نمایش معاشی کمیٹی حیدرآباد معظم بلڈنگ، روبرو معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد دکن۔ ٹیلیفون نمبر (۲۵۰۳)

ـدرآباد دن

مرداد ۱۳۵۱ف

آمدنی	روپیہ	آنہ	پائی
ست ٹکٹ داخلہ	۱۶۹۳۶	۳	۸
ں شرکت وکرایہ اسٹال	۴۱۳۳	۱۵	۴
ادارہ انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ	۸۰۰۰	.	.
بہ جات	۹	.	.
رہ اراکین	۸۴	.	.
سامع	۱۰	۲	۶
فرق	.	.	۶
میزان	۲۹۱۷۳	۶	.

ت کی جانچ کی گئی درست پائے گئے فقط

(شرح دستخط) وی۔ کے۔ ڈھکے اینڈ کمپنی

مجلّۂ طیلسانین

حصّہ

معاشیات

فہرست مضامین

صفحہ

"اس سال بھی میں نے سالانہ نمایش صنعت ملکی باغ عامہ کا بغور مطالعہ کیا اور اس امر سے محظوظ ہوا کہ الحمدللہ ہر سال اس میں بیّن ترقی نمایاں ہے جو کہ ایک قابلِ اطمینان امر ہے اور ملک کے لئے ایک فالِ نیک ہے!

متعلقہ عہدہ داران جو کہ اپنے فرائض کی بجا آوری میں منہمک یا مستعد دکھائی دے رہے ہیں یہ بھی ضرور قابل ستایش ہے کہ بیداری کے آثار چوطرف رونما ہیں اور اگر واقعات کی رفتار یہی رہی تو وہ زمانہ دُور نہیں ہے کہ ملک خوشحالی اور ارتقاء کے منازل سرعت سے طے کرتے ہوئے کہاں سے کہاں پہنچ جائیگا جسکی تمنّا ہر بہی خواہ ریاست کو ہے

۲۹ر ذی حجہ ۶۰ھ بقلم آصف سابع"

پروانۂ خوشنودی

مملکت آصفیہ کے کسی ادارہ کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا چیز باعثِ فخر و مباہات ہو سکتی ہے کہ اسکی خدمت گزاری خود حضرت جلالت الملک کی بارگاہ عالی مرتبت میں اس قابل قرار پائے کہ پروانۂ خوشنودی مرحمت فرمایا جائے۔ نہ صرف مجلس نمائش اور معاشی کمیٹی، بلکہ انجمن طیلسانین عثمانیہ کی ساری تنظیم جس قدر فخر کرے بجا ہے کہ اسکی حقیر کوششیں ملک کے لئے مفید اور مالک کے پاس شرفِ قبولیت حاصل کر رہی ہیں۔

گزشتہ نمائش مصنوعات مملکت آصفیہ کے ملاحظہ کے بعد بارگاہ جہاں پناہی سے صناعوں کو جو پروانۂ خوشنودی مرحمت فرمایا گیا اس کو پہلی مرتبہ "معاشیات" کی اس اوّلین اشاعت میں سرنامۂ عزت و افتخار بنایا گیا ہے۔

ملازمانِ حضرت بندگان عالی کے اس گہر ریز ارشاد ملوکانہ سے تمام وابستگان سلطنت آصفیہ اور خدمت گذاران ملک کے حوصلے اور ارادے زیادہ قوی اور زیادہ مضبوط ہوجاتے چاہئیں، اور اپنے عزیز ملک کو خوشحالی اور ارتقا کے بلند ترین کنگرہ پر پہنچا دینے کے لئے جو سعی عمل میں آرہی ہے اس میں مزید تیز گامی پیدا کرنی چاہیئے۔

خداوند کریم جل شانہ کی درگاہ صمدیت میں یہ دعا ہے کہ ارادوں میں مضبوطی اور عمل میں خلوص نصیب ہو اور کام کے ایسے نمایاں نتائج حاصل ہوں کہ ہر کام کرنے والا یہ کہہ اٹھے کہ

شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

مجلہ

حرفِ آغاز

مملکت آصفیہ قدرت کی بے شمار فیاضیوں سے مالامال ہے ان قدرتی فیاضیوں سے کام لیکر ملک کی زراعت، صنعت اور تجارت کی ایک ایسی تنظیم جسکی بنیاد ضروریات ملک پر رکھی جائے اور جس سے ملک میں خوش حالی اور فارغ البالی کا دور دورہ ہو ازبس ضروری ہے۔

یہ امر ملک کی خوش بختی کا باعث ہے کہ اب اہل ملک میں معاشی ترقی کا کافی میلان پیدا ہو چکا ہے اور آئے دن سرکار اور رعایا کی کوششوں سے نئی نئی تدبیریں اختیار کی جا رہی ہیں۔

عملی جد و جہد کے ساتھ ملک کے معاشی مسایل پر علمی نقطۂ نظر سے غور و فکر کا بھی ذوق پیدا ہو رہا ہے چنانچہ جامعۂ عثمانیہ کے شعبۂ معاشیات میں بیسیوں نوجوان دنیا کے دوسرے ممالک کے معاشی مسایل کے ساتھ خود اپنے ملک کے معاشی حالات کا بھی جوش و انہماک سے جائزہ لے رہے ہیں بلکہ ملک میں دوسرے اصحابِ ذوق بھی معاشی امور پر غور و خوص کر رہے ہیں، ملک کی معاشی ترقی کی جد و جہد میں ہاتھ بٹانے کے لئے معاشی کمیٹی اور مجلس نمایش دونوں گرم عمل ہیں ان حالات میں یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ معاشی امور پر خیالات اور آراء کے اظہار کیلئے ایک ترجمان مہیا کیا جائے۔ مجلۂ طیلسانیین اس کوشش کا آغاز کرتا ہے۔ خدا کرے کہ یہ کوشش کامیاب ثابت ہو اور مجلۂ طیلسانیین کا حصۂ معاشیات خدمت اور اخلاص مندی کی روایات قائم کرے۔

دُنیا کے اس خلفشار میں کسی نئے کام کا آغاز بیسیوں مشکلات کا سامنا کرنے کے مترادف ہے۔ یوں تو ہر کام کی ابتدا میں دقتوں کا پیش آنا لازمی ہے چنانچہ اس کوشش میں بھی گوناگوں دقتیں پیدا ہوئیں لیکن تکیہ اس بات پر ہے کہ حرکت میں برکت ہوتی ہے اور کوشش مسلسل سے ہی ہر مشکل کامیابی کا مقدمہ بن جاتی ہے۔ مجلہ کی ادارت، معاشی کمیٹی اور کابینۂ انجمن طیلسانیین عثمانیہ کے باہمی اشتراک عمل سے توقع ہے کہ جلد سب مشکلات دور ہو جائینگی۔

"معاشیات" کے آغاز کے موقع پر ارادوں اور خیالات کا کوئی مزید اظہار غیر ضروری ہے البتہ سب

بہی خواہان ملک سے یہ استدعا ہے کہ اعانت فرمائیں یہ اعانت جس قدر قوی ہوگی اسی قدر "معاشیات" کی خدمت گزاری اور کامیابی بھی نمایاں ہوگی۔

اس اشاعت میں جو خطبے شایع کئے جا رہے ہیں وہ گزشتہ معاشی کانفرنس میں پڑھے گئے تھے۔ ان خطبات پر اہل ملک کو مزید غور و فکر کی ضرورت ہے۔ ان مشوروں کی روشنی میں جو ان خطبات میں درج ہیں دوسرے اصحاب کو اپنے خیالات اور عملی صورتیں پیش کرنے کا موقع ہے۔

"حیدرآباد میں دیہی تنظیم" اور "تنظیم دیہی کے بعض معاشی پہلو" کے عنوان سے جو دو مقالے اس اشاعت میں شامل کئے گئے ہیں وہ بھی گزشتہ معاشی کانفرنس میں پڑھے گئے تھے۔

اس اشاعت کے ساتھ "موضع دوبلی کی معاشی تحقیقات" کا مقالہ بھی شامل ہے۔ واضح ہو کہ مجلہ "طیلسانیین" میں اس مقالہ کی اشاعت کا سلسلہ کچھ عرصہ قبل شروع کیا گیا تھا لیکن ختم نہ ہوسکا۔ فی الوقت اس اشاعت میں اس مقالہ کا ایک مزید حصہ شایع کیا جاتا ہے اور کوشش کیجائیگی کہ آیندہ دو ایک اشاعتوں میں یہ مقالہ جسکے مولف ناصر علی صاحب ام اے ہیں مکمل ہوجائے۔ جن اصحاب کو اس کے ابتدائی صفحات کی ضرورت ہو مجلہ کے دفتر سے طلب فرمالیں۔

جن کرم فرماؤں نے اپنی نوازش سے ہمت افزائی کے مد نظر پیامات مرحمت فرمائے وہ مخلصانہ شکریہ کے ساتھ شایع کئے جاتے ہیں۔

"وقت کم ہے اور کام بہت، رستہ کٹھن ہے اور منزل مقصود دور، اسلئے ایک زبان اور ایک دل ہوکر ہم سب کو ملک کی معاشی ترقی اور خوشحالی کے لئے وہ سب کچھ کرنا چاہیئے جو ہوسکتا ہے۔

دعاء ہے کہ اعلیحضرت بندگان عالی متعالی آصف سابع خلد اللہ ملکہ کے عہد مسعود میں مملکت آصفیہ معاشی ترقی کے بلند ترین درجہ پر پہنچ جائے۔

پیامات

"انجمن طیلسانیین عثمانیہ اور اس کے مجلہ ادارے ملک و ممالک کی جو خدمت گزاری کر رہے ہیں اور مجلس نمائش نے جو نمایاں حیثیت انعقاد صنعتی نمائشات حاصل کی ہے اس کا لازمی تقاضا یہ تھا کہ کوئی اخبار یا مجلہ مستقل طور پر معاشی اور دیگر مسائل ملکی کے متعلق انجمن کی جانب سے نکالا جائے میں بحیثیت ایک شریک کار کے ان تمام دقتوں اور مشکلات کو محسوس کرتا ہوں جو کسی مجلہ کو ذمہ داری سے چلانے میں پیش آتے ہیں۔ لیکن ان مشکلات کی وجہ سے اس خصوص میں کوئی قدم نہ اٹھانا بھی نامناسب ہی تھا مجھکو دلی مسرت ہے کہ بعض باہمت بھائیوں نے نہ صرف مجلۂ طیلسانیین کو پابندی سے چلانے کا ارادہ کیا ہے بلکہ اس میں حصۂ "معاشیات" کا اضافہ کرکے استفادہ کے مواقع میں اضافہ فرما دیا ہے۔ میری دلی تمنا ہے کہ ملک کی معاشی ترقی میں اس مجلہ کو رہبری کا شرف حاصل رہے"

میر اکبر علی خان صاحب سابق صدر مجلس نمائش و معاشی کمیٹی

"مجلہ کے پڑھنے والوں کے لئے یہ امر نہایت مفید ثابت ہوگا کہ اس کا ایک حصہ معاشی مضامین کیلئے مختص کیا جائے۔ ملک کو "حیدرآبادی معاشیات" کے مطالعہ اور "حیدرآبادی معاشیات" کو ملک کے سنجیدہ افراد کے غور و فکر کی سخت ضرورت ہے۔ ممالک کی سیاسی اور آئینی ترقی اور ان کے موقف کا انحصار بڑی حد تک انکی معاشی آزادی پر ہے اور آپ بڑی خدمت کرینگے اگر ہماری جامعہ کے طالب علموں اور طیلسانیین کو اس مسئلہ میں دلچسپی لینے کی ترغیب دلائیں اور ان کی عالمانہ تحقیقات اور ذہنی کاوش سے ایسے تدابیر پیش کئے جا سکیں جو قابل عمل ہوں اور جنکے اختیار کئے جانے سے معاشی آزادی نصیب ہو سکے"

نواب علی یاور جنگ بہادر معتمد امور دستوری سرکار عالی

"یہ امر باعث مسرت ہے کہ مجلۂ طیلسانیین کے جدید انتظامات کے تحت اس کا ایک حصہ معاشیات کے لئے مختص کر دیا گیا ہے جس میں اس موضوع کے متعلق مقالات اور خاص مضامین

شایع ہونگے۔ میں اسکی کامیابی کے لئے دل سے خواہاں ہوں۔"

میر لایق علی صاحب نایب جنگ ڈائرکٹر نظام شگر فیاکٹری

"جامعۂ عثمانیہ کے قدیم طلبہ نے معاشی کمیٹی قایم کرکے علمی اور عملی طور پر ملک کی جو خدمت شروع کی ہے وہ بفضلہ امید افزا ہے۔ اللہ تعالٰے اسعی مشکور فرمائے۔ خاص کر اس کمیٹی کے زیر اہتمام جو سالانہ نمایش بلدہ میں منعقد ہوتی ہے، اور نمایش کے سلسلے میں جو کیفیت شایع ہوتی رہی ہے، اس سے کمیٹی کی کارگزاری کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ حالات مساعدت کریں تو عجب نہیں یہ معاشی کمیٹی آیندہ ترقی کرکے ملک کی کوئی مستقل خدمت انجام دے سکے

معاشی نوعیت کے مضامین کا سلسلہ آپ مجلۂ طیلسانین میں شروع کرنا چاہتے ہیں۔ یہ تجویز مفید ہے"۔

مولوی محمد الیاس برنی صاحب ناظم سررشتۂ تالیف و ترجمہ جامعۂ عثمانیہ

"معاش و معیشت کی موجودہ کشمکش میں عامۃ الناس کو اصول معاشیات سے واقف کرانے کی کوشش قابل مبارکباد اور لایق استحسان ہے میری دلی تمنا ہے کہ جن مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے آپ اس مجلہ کو شائع کر رہے ہیں ان میں خدا آپ کو کامیاب کرے"۔

جہانگیر جی دہتا صاحب ناظم بندوبست سرکار عالی

"میں اپنے اُن رفقاء کار کی عدیم المثال اور انتھک کوششوں کو کبھی فراموش نہیں کرسکتا جو انہوں نے آج سے تقریباً پانچ سال قبل بغیر کسی سابقہ تجربہ اور سرمایہ کے نہایت ہی مختصر سی مہلت میں سب سے پہلی کامیاب نمایش مصنوعات ملکی کے انعقاد سے نہ صرف سالانہ کامیاب نمایشوں کی تاسیس کی بلکہ اپنی عملی قابلیتوں کے ذریعہ ملک پر یہ بات واضح کردی کہ زیر سایہ ہمایونی اگر ایثار و محنت اور تنظیمی قابلیت سے کام لیا جائے تو دکن کا مستقبل ماضی سے زیادہ درخشاں ہوسکتا ہے اور یہاں کے معاشی وسائل سے کماحقہ استفادہ کیا جائے تو ہمارا ملک خوش حال اور دولت سے مالامال ہوسکتا ہے۔
مجھے توقع ہے کہ طیلسانی برادری کا یہ مجلہ ملک کے معاشی مسائل کا بہترین ترجمان ثابت ہوگا"۔

میر محمود علی صاحب صدر اولین معاشی کمیٹی و مجلس نمایش

"کمالِ تخیل و انتہائے تصور کی حد پر پہنچ کر جو علوم یا فنون تکمیل طلب رہ جاتے ہیں انہیں میں فنون لطیفہ کا شمار ہے اور جس کی قدر بہ صورت زر کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ابتذال ہے۔
کسی فن کار حُسن کار کا محض مقصد حسن کاری کے حصول میں فنا و منہمک ہو جانا ضرور ایک اہمیت رکھتا ہے مگر روزمرہ زندگی میں سطحی انسانوں کے لئے کچھ مفید نہیں ہوتا۔ فنون لطیفہ کے احیاء و ترویج کمال سے تخیل کا امکان اور صحیح ذوق پیدا ہو سکتا ہے جو انفرادی و مجموعی ثقافت کا ضامن ہے۔ لیکن اس کو محض کمائی کا ذریعہ سمجھنا غلطی ہے۔
البتہ دستکاریوں کی مدد سے شکم پروری ہو سکتی ہے۔ جو ایک آرٹسٹ کے خیال میں معاشیات کا مقصد اوّل ہے۔ بعض دستکاریوں میں آرٹ کا مظاہرہ ہو سکتا ہے اور اس قسم کی دستکاریاں ریاست ابد مدت میں کافی موجود ہیں۔ ان قدیم دستکاریوں میں قدیم و جدید آرٹ کے صحیح امتزاج کے ساتھ ایک خوش گوار ہم آہنگی اور زیادہ افادیت کی طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے۔
بعید یا بالواسطہ ہی سہی لیکن قوم کی تاریخی عظمت تخیل کا بلند معیار اور قدیم آثار بھی معاشیات کے پیش نظر ہوتے ہیں جس کے مدِ نظر آرٹ سے متعلق صحیح ذوق پیدا کرنے اور معیاری آرٹ کو بلند سے بلند تر کرنے کی کوشش لازمی ہے۔
یہی امور مرکزی مدرسۂ فنون لطیفہ و دستکاری سرکار عالی حیدرآباد کے اساسی اصول ہیں جن پر کارگزار رہ کر ضروری رہبری میں یہ ادارہ مشغول ہے۔ نونہالانِ ملک اور ابنائے وطن کو اس طرف زیادہ سے زیادہ متوجہ ہونا چاہیئے کہ جس کی بدولت ملک میں دستکاری کی ترقی اور بہ حصول معشیت ملک کی ثروت میں اضافہ ہو سکے۔"

خان بہادر سید احمد صاحب پرنسپل مرکزی مدرسۂ فنون لطیفہ

"معاشیات کو انسان کی معاشرتی بلکہ ہر جہتی ترقی میں جو دخل ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ اسلئے منتظمین مجلۂ طیلسانیین کا یہ اقدام کہ مجلّہ کا ایک حصہ "معاشیات" کیلئے مختص کر دیا جائے ہر آئینہ مستحسن ہے۔
اس میں شک نہیں کہ معاشیات کے بحرِ زخار میں قدم رکھنے سے پہلے اس کے مبادیات اور اصول سے

واقف ہونا ضروری ہے کیونکہ مستحکم اساس کے بغیر قدم قدم پر ٹھوکر کھانے اور نقصان اٹھانے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی تو نہالان ملک اس اہم مضمون کے مطالعہ سے ملک کو صرف اسی وقت کوئی مادی فائدہ پہنچا سکتے ہیں جب کہ وہ یہ دکھلائیں کہ عام اصول کا اطلاق ملکی اور مقامی حالات پر کس حد تک اور کس طرح ہوتا ہے اور مقامی مسائل کا تفصیلی اور غائر مطالعہ کرکے ایسا مواد پیش کریں جو ملک کی معاشی ترقی میں ممد و معاون ثابت ہو۔ مقام مسرت ہے کہ جامعۂ عثمانیہ کے طیلسانیین اس فرض کو ایک حد تک پورا کر رہے ہیں۔ لیکن ابھی بہت کچھ کام ہونا باقی ہے جو طیلسانیین کے عزم راسخ اور سعی مسلسل ہی سے طے پا سکتا ہے۔

میں مجلہ کے حصۂ "معاشیات" کا پرجوش خیر مقدم کرتا ہوں اور اسکی کامیابی کا دل سے متمنی ہوں"۔

مولوی خواجہ معین الدین صاحب انصاری ایچ سی ایس معتمد سیاسیات

"میں رسالۂ معاشیات کی اشاعت کے موقع پر یہ یاد کرتا ہوں کہ کس طرح نہایت کم وقت اور بہت ہی قلیل سرمایہ سے طیلسانیین عثمانیہ نے نمائش کے انعقاد کی ابتدا کی اور بفضل خدا اسے اتنا کامیاب کر دکھایا کہ سرکار عالی نے اسکا اعتراف کیا اور سال بہ سال نمائش مصنوعات اور نمائش باغبانی و مرغبانی کے انعقاد کو مجلس نمائش سے ہی متعلق کر دیا۔ سرکار عالی کے اکثر اعلیٰ عہدہ داروں نے اسکے متعلق یہ قبول کیا کہ یہ کامیابی اسلئے ہوئی ہے کہ طیلسانیین کو اپنے اس قومی و وطنی کام سے محبت ہے۔

توقع ہے کہ اس طرح انشاءاللہ حصۂ معاشیات کی اشاعت اپنی ابتداء کے بعد ترقی کے مراحل کی مسلسل تکمیل کرکے ملک کی اس علمی برادری کی پوری ہمدردی حاصل کریگا کہ جو معاشیات سے دلچسپی رکھتی ہے اور اسکے متعلق غور و فکر کرتی ہے۔

میری توقعات یہ ہیں کہ "معاشیات" کے مباحث کو اتنا وزنی ہونا چاہیئے کہ ملک کے سارے معاشی مسائل میں اس کی رائے کو وقعت ہو"۔

محمد فاروق صاحب ایچ سی ایس صدر مجلس نمائش معاشی کمیٹی (۱۳۴۹ف)

"مجلۂ طیلسانیین کے حصۂ معاشیات کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ حیدرآباد اور ممالک محروسہ میں معاشی ترقی کیلئے

نمبر ۲

اس قسم کی اشاعت نہایت ضروری ہے۔ معاشی کمیٹی کے ارتقار کے لئے اس کے پاس اس کے خیالات کی ترجمانی
اور تمام ملک کے اہلِ قلم کی کوششوں کو جو معاشیات سے متعلق ہوتی ہیں مجتمع کرنے کیلئے رسالہ لازمات سے ہے۔
مجھ کو یقین ہے کہ معاشی کمیٹی کی ہر حرکت کی طرح اس میں بھی برکت اور کامیابی جلد نظر آنے لگے گی۔

یہ ناچیز پیرکہن سال گوشہ نشین بھی حیدرآباد کے عملی معاشیات کا ۴۵ سال سے شوقیہ طالب علم رہا ہے
۳۰ سال قبل اس نے "قلمرو آصفی کی دولت" اور "ہندوستان کی صنعت" کے نام سے دو مقالے مرتب
کئے تھے۔ اس کی طباعت میں اور نیز اس قسم کے مضامین کے ترتیب کے بعد اشاعت میں جو دشواریاں ہوتی تھیں
وہ بہت زیادہ تھیں۔ آخر الذکر مقالہ کو جو اُردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کوشش تھی اخبار وکیل امرتسر کے ادارے نے
طباعت کے لئے طلب کیا تھا اور وہ وہاں لاپتہ ہوگیا۔ اپنے دورِ نوجوانی کا جب موجودہ دور سے مقابلہ کرتا
ہوں تو موجودہ نوجوانوں کو قابلِ تبریک و توصیف خیال کرتا ہوں کہ انہوں نے ملک کی معاشی ترقی کے لئے
قوت پیدا کر لی ہے۔

اس ملک میں بہ حیثیت مجموعی معاشی ترقی کے جو امکانات ہیں وہ دوسرے صوبہ جات اور ریاستہائے
ہند میں مجموعی اور یکجا پائے جائیں گے۔ تھوڑی توجہ اور صحیح قوت کا استعمال ہم کو کدھر سے کدھر پہونچا
دے سکتا ہے۔ اس کی تفصیل بارہا ہو چکی ہے۔

کمیٹیوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا ÷ کچھ کرلو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں

"ان اللہ لا یضیع عمل عامل منکم"

مولوی حافظ محمد مظہر صاحب اعزازی معتمد اگریکلچرل کانفرنس

"میں اس موقع پر اپنی دلی تبریک پیش کرتا ہوں کہ مجلہ طیلسانین میں ایک مفید حصہ معاشیات کیلئے
مختص کیا گیا ہے۔ ماہران علم انسانیات نے حضرت انسان کی تعریف صحیح طور پر بیان کرنے کی بڑی کوشش کی ہے
بالآخر ایک مکتب خیال نے انسان کو "معاشی ہستی" سے موسوم کیا ہے

ایک زمانہ تھا کہ اورنگ آباد اور اس کے نواح اپنے خاص صنایع کے لحاظ سے تمام ہندوستان میں
شہرت رکھتے تھے۔ اب یہ حالت ہے کہ صرف نام ہی نام رہ گیا ہے۔ اورنگ آباد نہ صرف اپنے مصنوعات میں

بلکہ اپنی اراضی کی زرخیزی اور خاصیتہً میوہ کی پیداوار میں بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ اگر تفصیلی نظر پرانے واقعات پر ڈالی جائے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دریائے گوداوری کا بالائی حصہ اپنے تیرتھ گاہوں اور اپنے مصنوعات کے سبب قدیم دُنیا میں کافی شہرت رکھتا تھا۔

تاریخ یونان میں پلی تھین اور ٹیگیرا ہندوستان کے جو مشہور مقامات مذکور ہوئے ہیں اور جنکو فتح کرنے کا سکندرِ اعظم نے ارادہ کیا تھا وہ پٹن اور دولت آباد سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ میں نے اپنے مشاہدہ سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ دریائے گوداوری کے اکثر مقامات قدیم زمانہ میں پارچہ بافی کے اہم مرکز تھے۔ چنانچہ شاہ گڑہ ایک مقام دریائے گوداوری پر واقع ہے۔ جہاں چند سال پیشتر ایک خوبصورت پُل تعمیر ہوا ہے اور جہاں دربار اکبری کی مشہور ہستی ابوالفضل کا قیام رہا ہے۔ وہاں قدیم آبادی میں میں نے تہ خانے دیکھے جہاں مہین سوت تیار ہوتا تھا۔ قصبہ ناندیڑ میں اس وقت بھی سو بلکہ ایک سو بیس کونٹ کا سوت تیار ہوتا ہے۔ اور افسوس ہے کہ یہ چند مٹھی جوار کے معاوضہ میں فروخت کیا جاتا ہے۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ مصر کے مومیاؤں پر جو ململ لپٹا گیا ہے وہ ناندیڑ ہی کی پیداوار ہے۔ مجھے حال میں پٹن کے کمخاب کا ایک ٹکڑا دیکھنے کا اتفاق ہوا جس کی نسبت تحقیق سے یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ تختِ طاؤس کی گدی کے غلاف کا ایک حصّہ ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار! ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔

شہر اورنگ آباد میں اب خالص ریشم سے ہمرو اور مشروع تیار کرنے کے چند ہی کارخانہ رہ گئے ہیں مصنوعی ریشم جو قیمت میں نسبتہً بہت ارزاں ہوتا ہے۔ اُس نے اس صنعت کو بہت نقصان پہنچایا۔ دراصل واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کا تمول اسقدر کم ہو گیا اور بیرونی ساخت کے مال کی سرپرستی اتنی زیادہ ہونے لگی کہ اصل ریشم کے تیار کردہ مال کا بازار بالکل دھندلا ہو گیا۔ یہ ماحول کا نتیجہ تھا کہ مصنوعی ریشم کا استعمال ہونے لگا اور جو اصلی خوبی اورنگ آباد کے مصنوعات کی تھی وہ جاتی رہی۔

یہی حال زر کے تار کا ہے۔ اب بھی اورنگ آباد میں زر کا تار کھینچنے والے لوگ کچھ باقی ہیں۔ قصبہ پٹن کی یہ صنعت بہت مشہور تھی لیکن احمد آباد اور سورت کی مشنری سے جو زر کا تار تیار ہونے لگا اُس نے اس صنعت کو بھی سخت نقصان پہنچایا۔ قصبہ پٹن میں اس وقت بھی کئی سو جولاہوں کے مکان ہیں اور یہ لوگ بیکاری میں مبتلا ہیں۔ میں نے کوشش کر کے سررشتہ کوتوالی اضلاع و کروڑگیری وغیرہ میں شملے تیار کرنے بھیجے۔ لیکن یہ ایک عارضی صورت تھی

ان مصنوعات کو مستقل بنیاد پر قائم کرنے کے لئے ایک اسکیم سرکار عالی نے منظور فرمایا ہے جسکا نفاذ میرے زمانۂ قیام صوبہ داری میں ہو چکا تھا۔ اس ادارہ کا طریقہ یہ تھا کہ ہر صنعت کے متعلق خام مال خرید اجائے، اور وہ کاریگروں کو دیا جائے جب مال تیار ہو جائے تو ان کی اُجرت اور منافع ساتھ ہی ساتھ ادا کر کے ادارہ میں یہ مال رکھ لیا جائے اور ادارہ کی جانب سے فروخت کا انتظام کیا جائے۔ یہ طریقہ کار بظاہر آسان معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے دیسی مال کی خریدی کا ماحول باقی نہ رہنے سے وقت پر فروخت میں بڑی دشواری ہوتی ہے جن صاحبوں کو اس خصوص میں دلچسپی رہی ہے۔ ان کے لئے دیہی ہفتہ وار بازار کا یہ معمولی مشاہدہ ہے کہ دور دور سے غریب لوگ اپنا تیار کردہ مال مثلاً کھادی کمبل بازار میں لاتے ہیں اور اونے پونے فروخت کر دیتے ہیں۔ دولت آباد سے قریب ایک مقام ہے جو کاغذی پورہ کہلاتا ہے۔ قدیم زمانہ سے یہاں کاغذ تیار ہوتا ہے۔ خود ان لوگوں کا خیال ہے کہ یہ شہنشاہ تغلق کے زمانہ میں یہاں منتقل ہوئے تھے۔ اس موضع کے کھنڈروں سے یہ ثابت ہے کہ کسی زمانہ میں یہ ایک آباد اور مرفہ الحال مقام رہا ہے۔ چند سال پہلے تو یہ صنعت بالکل مردہ ہو چکی تھی۔ اورنگ آباد کیلئے جو اسکیم صنعتی ترقی کا سرکار سے منظور ہوا اُس میں ایک بڑا مکان ان لوگوں کے کام کرنے کیلئے تیار کرایا گیا اور کاغذ سازی کے حوض اس میں تیار کئے گئے ہیں۔ اب کچھ کام اُن غریب کاریگروں کو مل رہا ہے۔

ہندوستان کیلئے بڑی ضرورت اس کی ہے کہ گھریلو صنعت کا رواج جہاں تک ہو سکے دیا جائے۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ میں مشنری کی مخالفت کر رہا ہوں اگر مشنری استعمال کرنا ہو تو سویٹ روسیہ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ سب سے پہلے وہاں مشنری بنانے کی مشنری قائم کیگئی اور جب اسکا انتظام ہوا تو مقامی طور پر مشنری اور اس کے کل پرزے تیار کئے جانے لگے۔ باہر سے مشنری کو حاصل کرنا اور سرمایہ داری کے تحت ان مشنری کے کارخانوں کو چلانا اور ہماری غریب آبادی کی کثیر تعداد کو گرنی کے مزدور بنا دینا موجودہ تہذیب کی رجعت قہقری ہے۔ ہزارہا کی تعداد میں غریب عورتیں اسوقت موجود ہیں جنکی معاش کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ خلد آباد جو ایک اُجڑا ہوا دیار ہے۔ وہاں سوت کاتنے کا کام اس ادارۂ صنعت اورنگ آباد کے تحت آغاز کیا گیا اور روزانہ ایک دو سکہ عورت معمولی طور پر کمانے لگی۔ بڑے سے بڑے کارخانہ کی رسائی ان غریب گھروں تک نہیں ہو سکتی اور مشنری کے کل پرزوں کی خریدی میں جو ہزارہا روپیہ صرف ہوتا ہے وہ باہر چلا جاتا ہے۔ ملک کے معاشی حالات کیلئے یہ تباہ کن ہے۔

دیسی صنعت کو فروغ دینے کیلئے اورنگ آباد کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں کے روایات اسکی تائید میں ہیں
اور مختلف قسم کے صنایع کا یہ مقام حامل رہا ہے۔ اس جنگ عظیم کے بعد دنیا کے حالات بدلنے والے ہیں۔ آئندہ گھریلو صنعت کا
موقف کیا ہوگا؟ اور غریب سے غریب اور بے سہارا شخص کو بیکاری سے بچانے کیلئے کیا تدابیر اختیار کئے جائینگے؟ ان پر
غور کیا جائے۔ صورت حال یہ ہے کہ ملک کی آبادی میں روز افزوں اضافہ عمل میں آرہا ہے۔ ۱۹۳۹ء میں کی
مردم شماری میں چودہ فیصد اور حالیہ مردم شماری میں بارہ فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔ اس کے مقابل میں زراعتی رقبہ
صرف چند فی صد کا اضافہ ہوا ہے، اور صنعتی پیداوار کا اضافہ اسکے مقابل جو ہوا ہے وہ بہت کم ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے
ممالک میں صرف چار پانچ سال کی مسلسل محنت و توجہ سے اپنے ملک کی بیکاری کو قطعاً مٹا دیا گیا ہے۔ ہندوستان اور
خاصتہً ملک دکن میں جو گنجائش صنعتی ترقی کی ہے اور جو امکانات ممالک محروسہ سرکار عالی میں قوت برقی پیدا کرنے کیلئے ہیں
ان کے لحاظ سے ملک کے ہر ایک گوشہ میں صنعتی ترقی کو نافذ کرنا غیر معمولی دشوار نہیں ہے۔ ہم اپنے ملک دکن سے یہی خطاب کرسکتے ہیں۔

بال بکشا و صفیر از شجر طوبیٰ زن ٭ حیف باشد چو تو مرغے اسیر قفسے

مولوی غلام احمد خاں صاحب میر مجلس پائیگاہ نواب ظہیر یار جنگ بہادر

"مجھے مجلہ طیلسانین کے حصۂ معاشیات کیلئے پیام دیتے ہوئے بے انتہا مسرت ہے۔ مجلہ طیلسانین
ملک کے اچھے لکھنے والوں کے ٹھوس اور علمی مضامین شایع کرنے میں اپنے دیگر ہمعصروں سے ممتاز رہا ہے۔ اس مجلہ میں
"معاشیات" کا اضافہ بلاشبہ اپنے اندر بہترین مفاد رکھتا ہے۔
کسی ملک کی معاشی ترقی ہی حقیقی معنوں میں ترقی کہلانے کی مستحق ہے۔ انجمن طیلسانین عثمانیہ کی
معاشی کمیٹی ہر سال نمایشوں کے انعقاد سے ملکی صنعتوں کو پھلنے پھولنے کا بہترین موقع فراہم کر رہی ہے اور
یہ بہتر کام ملک سے خراج تحسین حاصل کرچکا ہے۔ اس عالمگیر اور ہولناک جنگ نے ہمیں معاشی اور صنعتی
ترقی کے بھی خاص مواقع فراہم کر دیئے ہیں۔ جبکہ سابقت کا امکان بھی کم ہوگیا ہے۔ ہماری صنعتیں بہت جلد
قائم اور مستحکم ہوسکتی ہیں۔ جنگ کے زمانہ میں صنعتوں کا قیام نہ صرف فتح حاصل کرنے میں مدد دیتا ہے بلکہ اس سے
ہر جہتی ترقی کی ایک مستقل اور مضبوط بنیاد پڑسکتی ہے۔
مجلہ طیلسانین کے حصۂ معاشیات کو ملک کی معاشی اور صنعتی ترقی میں بہت زیادہ کام کرنا چاہیئے۔

مجھے ملک کے ترقی پسند اور سرگرم عمل طیلسانیین سے توقع ہے کہ وہ ملک کے وافر وسائل کو کام میں لاتے ہوئے سارے ملک کو فائدہ پہنچانے کے اس زرین موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیں گے۔ مملکت حیدرآباد کی موجودہ قابل رشک علمی اور ذہنی ترقی کے ساتھ صنعتی ترقی نہایت ضروری ہوگئی ہے جسکے بغیر کوئی ملک ترقی کر سکتا ہے نہ کوئی قوم اپنا بچاؤ کر سکتی ہے۔ ہماری مشترکہ اور متحدہ کوششیں اس میدان میں جاری ہیں تو وہ دن دور نہو گا جبکہ ایک عظیم تر حیدرآباد اور اسکے باشندوں کے مستقبل کو درخشاں بنانے میں ہمارا حصہ بھی شاندار رہے"۔

نواب دوست محمد خاں صاحب جاگیردار

"معاشیات ایک ایسا فن ہے جسکے مقررہ اصول انسان کی مادی زندگی سے متعلق ہیں جسطرح کہ اخلاقیات کے قوانین انسان کی روحانی زندگی سے متعلق ہیں۔ معاشیات کے اصول ماحول کے سانچے میں ڈھلتے ہیں ہر ملک کا معاشی نظام اس ملک کی جغرافی کیفیت ضروریات زندگی اور زمانہ کے مطابق ہوتا ہے۔ اس عالمگیر جنگ نے دنیا کی معاشی زندگی کو درہم برہم کر دیا ہے جنگ کے بعد کے حالات شاید اور بھی تباہ کن ہوں حیدرآباد کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ آج ہی حالات حاضرہ کے تحت اپنا معاشی نظام مستحکم کرلے اور کل کے لئے ایک ایسا لائحہ عمل تیار کرے کہ آنے والی دوڑ میں ہم کسی سے پیچھے نہ رہیں۔

معاشی کمیٹی انجمن طیلسانیین عثمانیہ نے معاشیات کے ایک جزو یعنی صنعت و حرفت کو فروغ دینے میں جو عملی کام کیا ہے وہ مصنوعات ملکی کی سالانہ نمائش سے اور اسکے سلسلہ میں جو "رہبر" (گائیڈ) شائع ہوتا ہے اس سے صاف ظاہر ہے۔ معاشی کانفرنس بھی منعقد ہوئی ہے۔ ملک کے معاشی سروے اور پلاننگ کا کام بھی جاری ہے اور اب مجلہ طیلسانیین کا ایک حصہ جو آئے دن کے معاشی مسائل پر احتیاط کے ساتھ غور و فکر کرکے بہ شکل مضامین تجاویز پیش کرنے مختص کیا گیا ہے ایک مبارک اقدام ہے۔

مجھے توی امید ہے کہ ماہرین معاشیات اور ملک کی معاشی ترقی سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس مفید اور ضروری کام میں عملی حصہ لینگے"۔

مولوی سید محمد علی صاحب موسوی سابق صدر معاشی کمیٹی و مجلس نمائش

خطبۂ استقبالیہ

از جناب مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ایم۔اے۔ ال ال بی
پروفیسر کلیۂ جامعۂ عثمانیہ

خواتین و حضرات!

ملک کے اس معاشی اجتماع میں جو آج ایک اہم مقصد کیساتھ منعقد ہو رہا ہے، میرا کام صرف اسقدر ہے کہ میں آپ حضرات کو اس کی اہمیت اور مقاصد سے روشناس کراؤں، یہ اپنی نوعیت کی اہم اور نئی کانفرنس ہے جو اس وقت چوتھی مرتبہ نمایش مصنوعات ملکی کے آغوش میں منعقد ہو رہی ہے یہ دراصل ملک کے معاشی مفاد سے متعلق ایک دعوت غور و فکر ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ ملک کے ارباب بصیرت جو ملک کی حیات سیاسی و معاشی سے وابستہ ہیں ایک جگہ جمع ہو کر اپنے گردوپیش کا جائزہ لیں اور ماضی کی روشنی میں حال و مستقبل کے متعلق مشورہ دیں تاکہ ملک اور حکومت کے سامنے معاشی زندگی کا ایک اچھا لائحہ عمل تیار ہو جائے ایسے سنجیدہ اجتماعوں کی ہر جگہ ضرورت سمجھی گئی اور حیات معاشی کی صحیح تعمیر کا یہی طریقہ ہے آج چار سال سے یہ کانفرنس اس بات کی کوشش کر رہی ہے کہ ملک کی حیات معاشی کے مختلف شعبوں پر سیرحاصل مقالے لکھوائے، مبصرین کی قیمتی رائیں جمع کرے اور بحث و تمحیص کا بیش بہا مواد فراہم کرے تاکہ اس طریقے سے ملک اور حکومت کے سامنے غور اور فکر کا ایک اچھا سرمایہ جمع ہو جائے اور

ملک کی خاطر خواہ معاشی رہنمائی ہو سکے۔

معاشی کمیٹی جس کے اہتمام سے یہ کانفرنسیں منعقد ہو رہی ہیں بڑی امنگوں کیساتھ قائم کیگئی اور اس کا بست وکشا دلایق طیلسانیین کے دامن خلوص کے ساتھ وابستہ کیا گیا کہ یہ ملک کے سچے خدمت گزار ہوں اور ملک کی خوشحالی کے لئے انتھک کوشش کریں' اس کمیٹی کا نصب العین ملک کے تمام معاشی حالات پر نظر رکھنا اور لائحہ عمل بنانا اور پیچیدہ مسائل سلجھانا ہے تاکہ پیدائش تقسیم اور صرف دولت کے خوشگوار وسائل دریافت ہو سکیں اور ملک کو وہ معاشی اطمینان نصیب ہو جو ہونا چاہئے۔ ہر متمدن مملکت کا معیار ترقی یہ ہے کہ وہ ایک طرف افراد مملکت کے ذہنی و اخلاقی قوتوں کی تربیت کا خاطر خواہ سامان کرے' دوسری طرف ملک کے قدرتی وسائل کا جائزہ لے کر ان سے پورا فائدہ اٹھائے' دنیا کی تمام ترقیوں کی یہی مختصر تفسیر ہے۔ جن ممالک نے ہمارے سامنے ترقی کی انھوں نے درحقیقت انہیں دو ذرائع سے کام لیا۔ جو ممالک ان سے غافل رہے وہ شاہراہ مسابقت میں بہت پیچھے پڑ گئے۔ حیدرآباد کی مملکت بھی اسی غور و فکر کی طالب ہے جس طرح اس کی سیاست خاص ہے اسی طرح اس کے معاشی مسائل بھی جداگانہ نوعیت رکھتے ہیں' ان کے سلجھانے کے لئے اس ملک کی طبعی جغرافی خصوصیات اور تاریخی روایات کو پیش نظر رکھنا چاہئے جو صدیوں سے چلی آ رہی ہیں' اگرچہ معاشی حالات پر سکون زمانے میں بھی بدل جاتے ہیں اور ہر وقت ایک نئے غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے لیکن جنگ عالم کے انتشار میں ان کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ اسی بین الاقوامی تلاطم میں جس کی تاریکی بحر اوقیانوس سے لیکر بحر الکاہل تک پھیلی ہوئی ہے مستقبل کا پتہ لگانا بہت مشکل ہے کہ یہ کارواں کس منزل پر دم لیگا لیکن ارباب بصیرت پیشین گوئی کر رہے ہیں کہ یہ دنیا کا بہت بڑا انقلاب ہے جس میں سیاست و معاشرت کے پرانے تصورات ٹوٹ پھوٹ جائیں گے اور عجب نہیں کہ حیات معاشی بھی ایک نیا قالب اختیار کرے اور ظاہر ہے کہ ہماری معاشی زندگی کا موجودہ طریقہ کار ان بدلتے ہوئے حالات کا جواب نہیں

ہوسکتا بلکہ ہمیں اپنے جدید سرمایہ پر غور و خوض کے ساتھ مقابلہ کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

جب معاشی کمیٹی نے ملک کی معاشی خدمت اپنے ذمہ لی تو اُس نے ایک طرف نمائش مصنوعات ملکی کا آغاز کیا جو مخلص کارکنوں کی انتھک کوششوں سے پروان چڑھ رہی ہے اس نمائش کی بدولت نہ صرف تمام ملک کی مصنوعات بہ یک وقت اہل ملک کے سامنے آگئیں اور ان کے استعمال کی جایز ترغیب ہونے لگی بلکہ صناعوں کی خاطر خواہ حوصلہ افزائی ہورہی ہے، دوسری طرف معاشی کانفرنسیں منعقد کرکے بحث و تمحیص کا دروازہ کھول دیا گیا۔

حضرات! دکن ایک وسیع سرزمین کا نام ہے جس کے طول وعرض میں جو ست پڑا کے پہاڑوں سے لیکر جنوب میں دریائے کاویری تک پھیلے ہوئے ہیں اور مشرقی و مغربی گھاٹوں سے اس کے دانڈے ملتے ہیں بڑی دولت چھپی ہوئی ہے جو اس ملک کی طبعی اور جغرافی خصوصیات کی پیداوار ہے۔ ان دلکش مناظر کے ساتھ جو سرسبز وادیوں اور شفاف ندیوں میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے گھنے جنگلات زرخیز مزرعوں اور سونے اور جواہر کے معدنوں میں بیش بہا معاشی ذخائر موجود ہیں۔ انہی طبعی خصوصیات اور اس کے معاشی ذخیروں نے اس ملک کی تاریخ بنائی اور اس کے تمدن کو سنوارا۔ دکن کے قدیم اور وسطی سلاطین نے جس طرح اس ملک کی سیاسی خدمت کی اسی طرح اپنے جذبۂ وطنیت کے ساتھ اس کی معاشی خدمت بھی انجام دی، بہمنی بادشاہوں نے اس ملک کی معاشی ترقی کے لئے مختلف معاشی وسائل اختیار کئے، زراعت کی خاص پرداخت کیگئی اور مختلف طریقوں سے کاشتکاروں کو خوشحال بنایا گیا کیونکہ اس زمانہ میں بھی شعبۂ معاش سلطنت کے مالیہ کا سرچشمہ تھا۔ اس کے علاوہ صناعوں کی حوصلہ افزائی کیگئی۔ اپنے خاص ذوق سے مصنوعات میں لطافت اور شگفتگی پیدا کی گئی۔ خطۂ دکن کی مصنوعات ایشیا اور یورپ کے بازاروں میں فروخت ہوتی تھیں۔ جب سترھویں صدی میں دکن کی سیاست ملک عنبر کے ہاتھ آئی تو

اس محسن اعظم نے دکن کی معاشی ترقی کے لئے ایک عظیم الشان لائحہ عمل تیار کیا۔ پہلی مرتبہ زمینات کی پیمائش کروائی، بندوبست کا انتظام کیا، آب رسانی اور آب پاشی کے لئے بڑی بڑی نہریں دوڑائیں، اوزان اور پیمانوں کا تعین کرکے تجارت میں خوش اسلوبی پیدا کی تلنگانہ میں قطب شاہیوں نے زراعت کی ترقی کے لئے بڑے بڑے تالاب بنائے اور مسولی پٹم اور مدراس کی بندرگاہیں کھول کر تجارت خارجہ میں جان ڈالدی۔

سلطنت آصفیہ ایک وسیع مملکت ہے جو اسلاف سے ہمیں ورثے میں ملی ہے یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ اس سلطنت نے دکن کی قدیم روایتوں کی حفاظت کی۔ اس کی تاریخی یاد ہمیں بتاتی ہے کہ ایک زمانہ میں اسی سلطنت ابد مدت کے حدود دریائے تاپتی سے شروع ہو کر دریائے کاویری پر ختم ہوتے تھے اور مشرق میں تمام ساحل کارومنڈل اس کے زیر نگیں تھا۔ سلاطین آصفیہ نے اپنے خون دل سے اس کی آبیاری کی اور یہ مقدس امانت آئندہ نسلوں کے لئے چھوڑی، اس بات کی ضرورت تھی کہ ہر زمانہ میں پوری وفاداری کے ساتھ اس کی سیاسی و معاشی خدمت کی جاتی لیکن افسوس ہے کہ اس سلطنت کی یہ خدمت نہیں ہوئی اور بجائے اضافے اس کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ اٹھارھویں صدی کے وسط میں اس سلطنت کو مشرق اور جنوب کے زرخیز اضلاع سے ہاتھ دھونا پڑا جو اضلاع شمالی اور مفوضہ کہلاتے ہیں اب نہ صرف ان اضلاع کی بازیافت بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے بلکہ اُن کے معاوضہ کی بھی توقع نہیں ہے۔ ہم برار کے زرخیز صوبے سے محروم ہوگئے جو آصف جاہی دولت کا سرچشمہ تھا۔ ۱۸۰۲ء کے معاہدہ کی رو سے حیدرآباد کو مسولی پٹم کی بندرگاہ سے استفادہ کرنے کا پورا حق حاصل ہے جو تجارت خارجہ کا بہت بڑا دروازہ ہے۔ چنانچہ سولھویں اور سترھویں صدی میں قطب شاہی سلطنت اس بندرگاہ سے کام لیتی تھی اور اپنی قومی دولت میں بیش بہا اضافہ کرتی تھی لیکن معاہدہ کی تاریخ سے آج تک اس سلطنت کو اس بندرگاہ سے فائدہ اٹھانے کا

موقع نہیں دیا گیا سکندرآباد کنٹونمنٹ کے محاصل آبکاری سے حیدرآباد محروم ہے
ان کے علاوہ اکثر اندرونی مسائل بھی ایسے ہیں جو کس مپرسی کے عالم میں پڑے ہوئے
ہیں اور اُن کی وجہ سے معاشی مشکلات ہر روز بڑھ رہے ہیں بعض مصنوعات پر
جو جنگ کے زمانے میں بہت ضروری ہیں، بیرونی قیود عائد ہیں۔ تعلیم یافتہ
بے روزگاروں کا ابتک دیانتداری کے ساتھ حل نہیں کیا گیا۔ بے روزگاروں
کے لئے جو سررشتہ تحصیل معیشت قائم ہے وہ صرف مخصوص لوگوں کا ذریعۂ معیشت
بنا ہوا ہے۔ مجھے یہاں یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ ہم ان مسائل کی عقدہ کشائی سے گریز
نہیں کر سکتے۔ اگر ان سے بے پروائی کی جائیگی تو ملک کو بے شمار معاشی مشکلات
کا سامنا کرنا پڑیگا۔

حضرات! بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس کانفرنس کو آج ملک کی دو بزرگ
شخصیتوں کی صدارت کا فخر حاصل رہا ہے۔ مولوی عبدالرحمن خان صاحب کے
کسی تعارف کی ضرورت نہیں ہے۔ موصوف نہ صرف طبیعیات کے بہت بڑے
عالم ہیں بلکہ ایک بڑے ماہر تعلیم بھی ہیں جن کے ساتھ تعلیم و تربیت کا دیرینہ تجربہ ہے
ملک کی علمی و اخلاقی خدمت موصوف کا ہمیشہ حقیقی نصب العین رہا ہے۔ جامعہ
عثمانیہ کی تعمیر میں مولوی عبدالرحمن خان صاحب کا جو حصہ ہے وہ اس مختصر [illegible]
میں ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔ موصوف نے دس سال جامعہ کی خدمت کی اور سچ پوچھو
تو موصوف نے ہی اس جامعہ اور اس کے تمام شعبہ ہائے حیات کی حقیقی تعمیر کی ہے۔
جامعۂ عثمانیہ کے فرزند جو اس وقت علم کی مشعلیں لئے ہوئے حیدرآباد کے طول و عرض
میں پھیل رہے ہیں وہ سب موصوف کے خوشہ چیں ہیں، میں کہہ سکتا ہوں کہ ابھی [illegible]
موصوف کی علمی رہنمائی کی ضرورت ہے۔

مولوی لیاقت اللہ خان صاحب معتمد فینانس کی صدارت بھی ہمارے لئے

باعث فخر ہے معاشیات موصوف کا خاص مضمون رہا ہے اور موصوف نے وقتاً فوقتاً ملک کی معاشی وسیاسی حالات کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور آپ میں ملک کا صحیح احساس ہے اور اس وقت موصوف کو ملک کے اہم شعبہ ہائے نظم ونسق کے ساتھ جو گہرا تعلق ہے وہ ہماری رہنمائی کے لئے بہت ضروری ہے اور میں .... سمجھتا ہوں کہ اس زمانہ میں جب کہ سیاسی حالات ہر روز بدل رہے ہیں موصوف اپنے بیش بہا عملی تجربوں سے ملک کی صحیح رہنمائی کرسکتے ہیں۔ جب معاشی کمیٹی کی طرف سے صدارت کی درخواست کی گئی تو صاحبان نے نہایت فراخدلی کے ساتھ درخواست منظور کرلی جس کے لئے یہ کمیٹی شکرگزار ہے۔

آخر میں یہ خطبہ اعلیٰحضرت بندگان عالی خلد اللہ ملکہٗ کی دعائے عمر و اقبال پر ختم کرتا ہوں۔ فقط

خطبۂ صدارت

از عالیجناب مولوی محمد عبدالرحمن خان صاحب بی ایس سی آنرز لندن
اے آر سی ایس ایف ۔ بی ایس ایل ایف آر ۔ اے ۔ ایس

اجلاس اول

حیدرآباد کی معاشی ترقی کے مبادیات پر تبصرہ!

عثمانی طیلسانئین کی معاشی کمیٹی نے ازراہِ محبت مجھ کو اپنے اس سال کے پہلے اجلاس کی صدارت کے لئے جو منتخب فرمایا ہے اس کا میں تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں میں بخوبی یہ جانتا ہوں کہ معاشیات کے متعلق میری معلومات بخیر فنی ہیں میرے پاس نہ تو معاشیات کی کوئی ڈگری ہے اور نہ میں نے اس کا درسی نصاب ختم کیا ہے ۔ مضمون سے مجھ کو جو بھی واقفیت ہے وہ محض مشاہدہ اور ذاتی تجربہ پر مبنی ہے ۔ اگر میری زندگی ملک اور اہل ملک کی خدمت میں صرف نہ ہوتی اور سائنس کی تحقیقات اور ایجادات سے دائمی وابستگی نہ ہوتی تو میں کبھی اس صدارت کے فریضہ کو انجام دینے کی جسارت نہ کرتا۔ سب سے بڑا محرک اس دعوت کے قبول کرنے میں عثمانین سے میرا گہرا تعلق ہے جو جامعۂ عثمانیہ کے قیام سے ایک نہ ایک طریقہ پر ابتک چلا آرہا ہے ۔ اگرچہ سرکاری حیثیت سے اس کو ختم ہو کر کئی سال گذر چکے جب تک انسان کے دل کی حرکت موقوف

نہ ہو جائے خلوص و محبت کا احساس برقرار رہتا ہے۔

طالب علمی کی جنت سے نکلکر نوجوان جب کسب معاش کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں تو دنیاوی امور کے متعلق ان کے سابقہ کتابی تصورات نقش برآب کی طرح ٹوٹ کر بہہ جاتے ہیں۔ مسابقت کی کشمکش برسر اقتدار ارکان اور خود ان کی نگاہ کے زاویوں کے مطابق اہل اقتدار کا اپنے محصلہ فوائد پر دائمی اور موروثی قبضہ قائم رکھنے کی کوشش اور سب سے بڑھکر نوجوان کی ناتجربہ کاری یہ سب ملکر ان کو اتنا پریشان کرتے ہیں کہ وہ اکثر اوقات سوسائٹی اور تمدن کو اپنا بدخواہ سمجھنے لگتے ہیں اور اس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ جماعت جس کی تکوین دنیا کو جوان سرسبز اور خوشحال رکھنے کے لئے قدرت کا بنایا ہوا فطرت کا عظیم الشان قانون بے معطل اور ماؤف ہو جاتی ہے اور دنیا اسی قدر ترقی کے راستے میں پیچھے پڑ جاتی ہے۔

اس میں ذرا بھی کلام نہیں کہ نوجوانوں کو ان کی ناتجربہ کاری کی وجہ سے تجربہ کار بوڑھوں اور پیش رؤں کی نیک نیت اور پرخلوص ہدایتوں کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ بوڑھوں کو اپنی جانشینی کے لئے بلند ہمت مستعد اور سعادتمند نوجوانوں کا تیار کرانا۔ ان دونوں ضرورتوں کے صحیح توازن کے ساتھ جو کوئی کام کئے جاتے ہیں نشائے فطرت کے موافق انجام پاتے ہیں اور دنیا ترقی کے راستے پر بغیر کسی رکاوٹ کے چلنے لگتی ہے۔

میں نے اس مسئلہ کا ذکر اس لئے کیا کہ بعض لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ عثمانی طیلسانئین سے پہلے بھی نوجوان دوسرے جامعات سے طیلسان لیکر نکلتے تھے۔ کبھی انہیں ایسی انجمن بنانے کی ضرورت نہیں ہوئی اور نہ معاشی اور متمدن دنیا کے دیگر مسائل پر ان کو دماغ لڑانا پڑا۔ اس کے جواب میں سردست اتنا کہنا کافی ہے کہ جامعۂ عثمانیہ کا قیام اور اس میں قوت عمل پیدا ہونے سے پہلے اس ملک میں گنتی کے چار پانچ گراجویٹ سالانہ پیدا ہوتے تھے اور چند مخصوص خدمات کو چھوڑ کر سعی اور سفارش کے ذریعہ انکو ملازمت ملجاتی تھی جو گراجویٹ

ہوتے تھے انھیں بھی تحصیل معیشت یا ملازمت میں کوئی دقت نہیں محسوس ہوتی تھی بلکہ بعض
اوقات کلیۂ اتفاقات یا اثرات کے تحت (کچھ مدت تک امیدواری کرنیکے بعد) فارغ التحصیل
اشخاص سے پہلے اور بہتر خدمات پر مامور ہو جاتے تھے لیکن اب طیلسانئین کی بڑھتی ہوئی
تعداد اور ان کا احساس خودی اور دنیا کی عام بیداری کی تیز تر رفتار یہ سب انکو مجبور
کرتے ہیں کہ تحصیل معاش کے بہتر اور بیشتر ذرائع دریافت کئے جائیں اور حکومت کا ہاتھ
بٹایا جائے کیونکہ اس میں طرفین کا فائدہ ہے ۔ میں معاشی کمیٹی کے خیالات وجذبات کی
صحیح ترجمانی کرنے سے قاصر رہونگا اگر محض تحصیل معاش و ملازمت کو ان کا نصب العین
یا محرک عمل قرار دیا جائے حب وطن انسانی ہمدردی شوق ریاضت اور ایثار کو بھی
اس میں بہت کچھ دخل ہے انسان کا کوئی کام جو محض حصول منفعت کی خاطر کیا جاتا ہے
کبھی ایسی کامیابی اور عام مقبولیت حاصل نہیں کرسکتا جو ایثار کے لئے قدرت کا عطیہ
ہے ۔ اس کانفرنس کے عملی کوششوں کی کامیابی خود اس کی صداقت کا بین ثبوت ہے ۔
جب تعلیم یافتہ اشخاص ہی نے تعلیم یافتہ بیروزگاری کے انسداد کی کوشش شروع
کردی ہے اور تعمیری تجاویز پیش کیجارہی ہیں تو قوی امید ہے کہ حکومت بھی اسکی طرف
کافی توجہ کرے گی ۔

میرا روئے سخن اس مقالہ میں زیادہ تر پبلک اور ان میں بھی طیلسانئین کی طرف رہیگا
اس وجہ سے کہ میں چاہتا ہوں کہ طیلسانئین نے جس خدمت کا بار اپنے اوپر آپ خود عائد
کرلیا ہے وہ زیادہ تر انھیں کی کوششوں اور ہمت سے پورا ہوسکے مصنوعات ملکی کی نمائش کے
ذریعہ آپ حضرات نے ملک میں جو معاشی بیداری پیدا کردی ہے تعریف سے بالاتر ہے
اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کی ان کوششوں سے ملکی صنعتیں نہ صرف اپنے پیروں پر
آپ کھڑی ہوجائیں بلکہ ان کی مسلسل ترقی سے ملک کے صناعوں کی تعداد اور انکی خوشحالی

میں اضافہ ہوتا جائے۔

یورپ اور امریکہ کے ممالک کی صنعتی ترقیوں کو دیکھ کر یقیناً آپ پر واضح ہو گیا ہوگا کہ جس پیمانے پر یہ کام وہاں ہو رہے ہیں سالہا سال کی منفردہ و متفقہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ حالیہ زمانہ [illegible] حکومت کی ساری قوت اس کے ذرائع پیداوار و سائل حمل و نقل اور ماہران فن کی مستقہ دماغی محنت جبتک منظم طریقہ پر متحد ہو کر خاص اغراض کو پیش نظر رکھے ہوے کام نہ کریں وہ حیرت انگیز نتائج حاصل نہیں ہو سکتے جو بیرونی ممالک میں دیکھے اور سنے جارہے ہیں۔ جرمنی اور جاپان کے حالات تو اسوقت تک راز میں رہے جب تک کہ انھوں نے اپنے ظالمانہ اچانک حملوں سے دنیا کو مصیبت اور تباہی میں نہ جھونک دیا۔ انگلستان اور امریکہ ان کے ردعمل میں دن رات مصروف ہیں اور خدا سے دعا ہے کہ ان کے [illegible] ظلم و ستم کی قوتوں کو شکست دیں ان مساعی میں برطانوی امپائر کے [illegible] اقلیم ہند شریک ہیں۔

[illegible] روس کی قبل جنگ کوششوں کا حال جو پروفیسر برنال نے حال میں نیچر کی ایک اشاعت میں مختصراً بیان کیا ہے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اگر سویٹ روس مذہب سے منحرف نہ ہوتا تو دنیا اس سے بدظن نہ ہوتی ہیں خذ ما صفا دع ما کدر پر عمل پیرا ہونا چاہئے۔ انگلستان کا عمل بھی روس کے ساتھ یہی ہے۔ روس کو ان دنوں جرمنی کے مقابل میں جو فتح نصیب [illegible] بالکلیہ اس کی سابقہ وحالیہ معاشی تنظیم ہی کا نتیجہ ہے سنہ ۱۹۱۴ء سے سنہ ۱۹۱۸ء کی [illegible] سے پہلے روس میں صرف گنتی کے ماہران سائنس پیدا ہوئے انیسویں صدی تک روس کی ایک سو ملین آبادی میں سے لومونوف، چیبنکاف، منڈیلئیف، پادلوو، لوباٹیوسکی، میڈام کوالیوسکی اور کلاوس کے سوا کوئی بڑی ہستی دنیائے سائنس سے خراج تحسین حاصل نہ کر سکی۔

سارے روس میں سنہ ۱۹۱۹ء میں صرف چالیس تربیت یافتہ طبیعیات کے عالم تھے

جب اس کو اپنی علمی بے بساطی کا احساس ہوا تو نئے مدارس نئے جامعات (علاوہ لینن گراڈ موسکو اور کازان کے جو ۱۹۱۷ء تک قائم ہو چکے تھے) کھولے گئے اور ان میں سائنس کے آلات کی تیاری کا بھی انتظام ہونے لگا اور اس طرح بیس سال کے اندر اس کے مختلف الاقوام باشندے تعلیم اور علی الخصوص سائنس سے ایسے مانوس ہو گئے کہ اس وقت وہاں کی پانچ فیصد آبادی جامعات کے نصاب تک تعلیم پا رہی ہے۔ درآں حالیکہ برطانیہ جیسے دیرینہ تعلیم کے حامی ملک میں صرف دو فیصد آبادی اس درجہ تک پہنچی ہے اب حکومت کی پنجسالہ تنظیموں کے سلسلہ میں تقریباً تمام رعایا سائنس کے انکشافات سے مستفیض ہو کر زراعت، صحت عامہ، میکانیات اور برقی انجینیری اسقدر عام کر دی گئی ہے کہ سائنس ہر روسی متنفس کی روزمرہ زندگی کا جزو لاینفک بن گئی ہے (کاپٹسا کے نام سے کون واقف نہیں ہے)۔ ایسے چند اور ماہران سائنس کے علاوہ روس میں متوسط قابلیت کے بے شمار سائنس دان ملک کے صنعتی زرعی اور رفاہی مسائل کی تحقیق میں جابجا اپنے معملوں میں کام کئے جا رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ روس باوجود جرمنی کی ہلاکانی قوت اور تجربہ کار سپاہ سے شدید ترین نقصان اٹھانے کے بالآخر اس کو شکست دے سکا۔

ہمارا ملک بھی اگر سائنس کی تحقیقات سے استفادہ کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ قلیل المدت میں دنیا کے منظم سے منظم ملک کے ساتھ دوش بدوش نہ چل سکے۔ اس کیلئے جامعاتی تعلیم میں سائنس کو حالیہ مقام سے بہت زیادہ بلند مقام دے رکھنے کی ضرورت ہوگی تاکہ موجودہ تعداد سے زیادہ طلباء اور حالیہ معیار سے بالاتر معیار کی تعلیم و تربیت کا انتظام ہو سکے تعلیم عملی ہو نہ کہ کتابی۔ اس عالمگیر جنگ کے زمانے میں مشنری اور دیگر سائنٹفک سامان کی فراہمی ناممکن ہے کیونکہ باہر سے درآمد مشکل ہے اور خود ہمارے ملک میں ان کی تیاری صنعتی ملہوں کے فقدان کی وجہ سے ناممکن ہے سردست ہمیں چاہئے کہ قدرت سے جو ذرائع زراعت، جنگلات اور معدنیات کی پیداوار سے

دستیاب ہوتے ہیں انھیں کو سائنٹفک طریقہ پر استعمال کرنے کی کوشش کریں۔
ہمیں پاور الکحل اور چوبی اسپرٹس کی تیاری، برقی طاقت کی تحصیل ادویات سازی، پارچہ بافی اور معدنیات کی فراہمی پر اجتماعی حیثیت سے عمل پیرا ہونا چاہیئے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ایسے کاموں پر متعین کرنے سے تھوڑی ہی مدت میں نمایاں ترقی محسوس ہونے لگے گی اور بیروزگاری کا مسئلہ آپ سے آپ حل ہوجائیگا۔
سرکار عالی کی مالی امداد سے سمنٹ، پارچہ بافی، اور شکر سازی کے جو کارخانے قائم ہوئے ہیں ان سے ملک کو براہ راست اور بالواسطہ جو فائدہ پہنچ رہا ہے محتاج صراحت نہیں۔ اگر برقی طاقت کی فراہمی کی اسکیم سرکار سے منظور ہوجاوے تو برقی کیمیائی ذرائع سے ہمارے ملک میں روزمرہ استعمال کی بہت سی چیزیں کافی مقدار میں سستے داموں پر مہیا ہوسکیں گی مثلاً سوڈا، پوٹاش، کلورین اور ان کے مرکبات الومنیم وغیرہ۔ اور باہر سے ان کا منگوانا کم ہوجائیگا۔ امید کیجاتی ہے کہ جب یہ کارخانے قائم ہونگے تو ان میں ملک کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی روزافزوں تعداد شرکت حاصل کرتی جائیگی۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اگر بعض شریر اقوام نے سائنس جیسے متبرک علم کو (جو بنی نوع انسان کے لئے فی الحقیقت اللہ تعالےٰ کے قادر مطلق ہونے کی سب سے زیادہ موثر دلیل ہے) تعمیری اور مستحسن کاموں پر استعمال کرنے کے بجائے تخریبی اور شیطانی افعال کا آلہ بنا رکھا ہے تو فی نفس یا بذات سائنس پر اس کی ذمہ داری عائد نہیں کیجا سکتی بلکہ شریر اقوام ہی پر جو ایسے افعال کے مرتکب ہیں۔ معہذا سائنس کے برے استعمال کا انسداد سائنس کی طاقتوں سے ہوسکتا ہے۔ زمانہ جنگ میں پند و نصیحت یا اچھا سے نہیں۔
بڑی خوشی کی بات ہے کہ حکومت اب خود زراعت کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوگئی ہے۔ اگرچہ جامعہ عثمانیہ میں بزمانۂ قریب زراعت کی فیکلٹی قائم کرکے اس شعبہ سے طیلسان

ا صل کرنے والوں کو مناسب زمینات دیگر تقاوی اور چند سالہ معافی محصول کیساتھ
رات خود بمشورہ محکمۂ متعلقہ زراعت کرنے کی ترغیب دلائی جائے تو یقیناً بڑے
وائد حاصل ہونگے۔

مجھ کو بزمانۂ صدارت کلیہ جامعۂ عثمانیہ ایک کمیٹی کے اجلاس میں جو زراعت
ی فیکلٹی کے قیام پر غور کرنے کے لئے منعقد ہوا تھا بعینہٖ یہی مشورہ دینے کا موقع ملا
تھا۔ افسوس ہے کہ اس کے بعد جامعہ کی طرف سے میرے زمانے میں کوئی مزید
کارروائی عمل میں نہیں آئی۔ اب بھی اس خصوص میں کام ہو سکتا ہے اور بڑی کامیابی
کے ساتھ ہو سکتا ہے۔

میں اپنے آپ کو بڑا ہی خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ میرے زمانۂ صدارت میں مجھ کو
طیلسانین جامعۂ عثمانیہ کو اعلیٰ تعلیم دلانے اور دنیائے علم میں نام آور بنانے کا
موقع ملا۔ نہ صرف جامعۂ عثمانیہ ہی کے طیلسانین کو بلکہ نظام کالج وغیرہ کے بھی قابل
افراد کو بتوسط اسکالرشپ کمیٹی یورپ کی جامعات میں اعلیٰ سے اعلیٰ طیلسان حاصل
کرانے میں کامیابی نصیب ہوئی۔

آج جن نوجوانوں کے علمی کارناموں پر حیدرآباد کو فخر ہے۔ اُن میں سے
اکثر و بیشتر میرے طالب علم اور میرے ہی سفارشی ہیں۔ میں جانتا تھا کہ جامعہ کو
خصوصاً اور ملک کو عموماً کن شعبوں کے ماہروں کی ضرورت ہوگی اور میں نے ان کو
تیار کرانے میں دل کھول کر کوشش کی اور بالآخر کامیاب ہوا۔ اس قسم کے مواقع ہر
شعبہ میں اب بھی موجود ہیں۔ اللہ تعالےٰ اچھے کام کرنے والوں کو بہتر توفیق
عطا فرمائے۔

۱۹۲۷ء میں جب مجھکو جامعہ عثمانیہ کی طرف سے یونیورسٹی کالج لندن کے
صد سالہ جشن میں بطور نمائندہ شریک ہونے کے لئے انگلستان بھیجا گیا تھا۔ میں نے

بطور خود آکسفورڈ کیمبرج اور لندن کی جامعات کے سرآوردہ اساتذہ و منتظمین سے ملاقات کرکے عثمانیئن کی اعلیٰ تعلیم کے لئے موزونیت بتا کر بیرونی جامعات میں نہ صرف ان کی شرکت بلکہ انکو تحقیقاتی کاموں پر متعین کرانے کے وعدے لئے۔ اس طرح جامعۂ عثمانیہ کے اکثر یورپی وظیفہ یاب بہترین تعلیم و تربیت حاصل کرسکے جیسا کہ میری سرکاری رپورٹ ڈیپوٹیشن (مندوبیت) جس کی نقل اس وقت کے مجلہ کلیہ جامعہ عثمانیہ کی ایک اشاعت میں طبع ہوئی ہے پڑھنے سے معلوم ہوسکیگا۔

اب بھی جامعۂ عثمانیہ سے ایسے ہونہار نوجوان تیار کرائے جاسکتے ہیں جو اپنے لائق پیش رؤں کے قدم بقدم چل سکینگے۔

سر علی امام مرحوم کی صدارت عظمیٰ میں جبکہ میں نظام کالج کی سائنس لابوریٹریوں کو بحیثیت پروفیسر سائنس کے عملی جامہ پہنا چکا تھا۔ ان کے ایک دوست نے مجھ سے غیر رسمی طور پر مشورہ کیا کہ حکومت کے پیش نظر بعض فنی شعبوں کے لئے چند ہونہار طلباء کو یورپ بھیجکر اعلیٰ تعلیم دلانا مقصود ہے۔ کن مضامین کا انتخاب موزوں ہوگا میں نے فوراً مٹلرجی کاغذسازی گلاس ٹکنالوجی اور میکانیکل انجینرنگ کی عملی تعلیم کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ حکومت نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور چند ہی سال میں ان فنون کے مستند قابلیت کے افراد تعلیم پاکر واپس ہوئے اور کام پر لگائے گئے چنانچہ آج بھی وہ اپنے اپنے دائرۂ عمل میں ملک کی مفید خدمات انجام دے رہے ہیں۔

زراعت کی ترقی کا میدان بہت وسیع ہے۔ ہمارے ملک میں نواب علی نواز جنگ بہادر اور ان کے شرکاءکار کی کوششوں اور حکومت کی مالی امداد سے بڑے بڑے تالاب موجود ہیں جن کی وجہ سے زراعت کو بہت ترقی دیجاسکتی ہے۔ میرے زمانہ صدارت میں شعبہ حیاتیات کے ایک لکچرار صاحب کے لئے دوران تعلیم میں اسی جامعہ سے ایم۔ ایس۔ سی کی ڈگری حاصل کرنے کی سہولتیں تہیا کیجاسکیں اب وہ محکمۂ سمکیات (فیشریز ڈپارٹمنٹ) میں منتقل ہوئے ہیں

امید ہے کہ ان کی کوشش سے بنگالہ کی طرح یہاں بھی مچھلیاں افراط سے ملنے لگیں گی عثمانیہ کے ایک سابق طالب علم نے جامعہ لندن سے انٹومالوجی میں ریسرچ ڈگری لی ہے۔ اگر زراعت کا ایک باضابطہ ریسرچ انسٹیٹیوٹ قائم کیا جائے تو اس کے مشورہ سے آلات زراعت کی تیاری کے ساتھ نباتات کے مہلک جراثیم کا استیصال مقامی ذرائع ہی سے کھاد کی تیاری، چوپایوں کی افزائش اور اجناس کی بیشتر پیداوار کا خاطر خواہ انتظام ہو سکتا ہے۔

قدرت نے ہمارے ملک کو بعض میووں سے مالا مال کر رکھا ہے لیکن ہم ان کی قدر نہیں جانتے مثلاً آم۔ لیمو۔ موسمبی۔ شریفہ۔ کرونده۔ املی وغیرہ۔ ان سب کی کاشت کے لئے صرف بیج کا بو دینا اور معمولی سی دیکھ بھال کافی ہے۔ آخری تین کے تو جنگل ہی جنگل دکھائی دیتے ہیں اور تقریباً خود رو ہیں یہ نہ صرف اپنے پھلوں سے حیدرآباد کی تقریباً مفت خدمت بجا لاتے ہیں بلکہ اس کے پہاڑوں کی چٹانوں کو خاموش طریقہ پر ہزار ہا سال سے مسلسل مٹی میں تبدیل کئے جا رہے ہیں جو بارش سے نیچے بہہ کر اجناس کی کاشت کا سامان قدرتی طریقہ پر بہم پہنچاتی چلی آرہی ہے۔ ان درختوں کی سنبھال اور نگہبانی ملک کی آمدنی میں معتدبہ ترقی پیدا کر سکتی ہے سب لوگ جانتے ہیں کہ ہمارے جنگلوں میں آملہ، چرنجی، تاڑ اور کویٹ وغیرہ کے درخت بھی بکثرت موجود ہیں۔ ان کے پھلوں کی پیدائش اور افادیت میں وافر اضافہ ہو سکتا ہے۔ اگر سائنس سے مدد لی جائے۔

حیدرآباد فارمر کی ایک سابقہ اشاعت میں ایک مقامی مفکر نے بے تخم شریفہ کی کاشت کا کامیاب طریقہ بتایا ہے۔ تخم والا ہو یا بے تخم شریفہ کو اس ملک میں جس بے اعتنائی اور حقارت سے دیکھا جاتا ہے قابل افسوس ہے اس کے برخلاف بلاک بیری ڈامسن وغیرہ انگلستان کے جنگلی پھلوں کی خود وہاں اور پھر ہمارے پاس یہاں آنے پر جو قدر ہوتی ہے ہر شخص بخوبی اس سے واقف ہے۔ اگر میوہ جات سے مربہ سازی اور اس کے تحفظ کا معقول انتظام کیا جائے (جو ذرا سی محنت سے لیکن غور و فکر کے ساتھ بآسانی دریافت

ہوسکتا ہے) تو اس کو نہ صرف سال بھر دیگر لذیذ غذاؤں کی طرح استعمال کیا جا سکتا ہے، بلکہ بیرون ملک بھی تجارتی اشیا کے ساتھ بھیجا جا سکتا ہے۔

ارواح وعطریات کی بھی سائنٹفک طریقہ پر تیاری ہوسکتی ہے سینتھٹک (تالیفی) طریقوں کے جاری ہونے سے پہلے ملک میں نامیاتی کیمیا کے ماہروں اور معدنی زغال کے مختلف کیمیائی اطلاقات کا خیر مقدم کرنا ہوگا۔ سردست ذراسی توجہ سے کشید کے موزوں ترکیب اگر اختراع کئے جائیں تو ہمارے باغات کے پھولوں ہی سے نہ صرف مختلف قسم کے قیمتی اور حقیقی عطر بلکہ بعض مفید دوائیں بھی کشید کئے جا سکیں گے اور پھول کا مصرف جو زمانہ دراز سے شادی اور موت کے موقعوں پر محض موقّت زینت اور نمائش چلی آرہی ہے مستقل اور دیرپا کاموں میں تبدیل ہوسکیگا۔

ہماری ارضیاتی پیمائش بتاتی ہے کہ دکن کے تاریخی جواہر اور قیمتی فلزات یا تو اب ختم ہوچکے ہیں یا زیر زمیں ایسے مدفون ہیں کہ ان تک رسائی بڑی جد وجہد اور صرفہ کثیر کی محتاج ہے۔ انڈیاس منرل ویلتھ (ہندوستان کی معدنی دولت) مصنفہ کاگن براؤن ۱۹۳۶ء کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہٹی کے سونے کے معادن پر ۱۹۰۳ء میں کام آغاز ہوا اور ۱۹۲۰ء میں تین ہزار پانچ سو فٹ کی گہرائی تک پہنچنے کے بعد بند کردیا گیا۔ اس اثناء میں ایک لاکھ دس ہزار سات سو ننانوے پونڈ اسٹرلنگ کا سونا برآمد کیا گیا۔ نہیں معلوم کمپنی کے حصہ داروں کو کس شرح سے منافع تقسیم کیا گیا۔ ہٹی میں از سر نو حکومت کی طرف سے کام جاری ہوا ہے۔ امید کہ اس سے ملک کو حقیقی اور گرانقدر فائدہ حاصل ہوگا۔ اسی کتاب کے حوالے سے کہتا ہوں کہ گارنیٹ (ایک قسم کا یاقوت جو تامڑا بھی کہلاتا ہے) شفاف اور سرخ رنگ کا غریب پیٹھ تعلقہ کھم سے کوئی پندرہ سال پہلے کافی مقدار میں یورپ بھیجا گیا جو زیورات کی تیاری میں استعمال ہوا۔ اگر مزید تلاش کی جائے تو کیا عجب دوسرے مقامات پر بھی اس کا پتہ چلے۔ سنگ زغال اور سنگ مرمر کی کانیں اور سنگ سیلو کے طبقات اب بھی

برابر کام کر رہے ہیں۔ اپنے ذاتی مشاہدہ سے کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے ملک میں دریاؤں کے بطن اور پہاڑوں کی جیبوں میں اگیٹ ایمیتھسٹ بلور اور کیلسائیٹ کی اچھی قسمیں موجود ہیں جو ڈھونڈنے والوں کو ملجاتی ہیں پائیرائٹز کی قلمیں بھی جو پتھر کا پھول کہلاتی ہیں سنگ سلیٹ کی تہوں میں چھپی ہوئی ہیں لیکن میرا ذاتی تجربہ ہے کہ وہ اس مقدار میں نہیں ملتی ہیں کہ ان سے گندھک یا اس کے مرکبات کی تیاری سود مند ہو۔ سرسری معائنہ اور باضابطہ تفتیش میں بہت فرق ہے اگر منظم تحقیق کی جائے تو شاید صورت حال اس سے کہیں بہتر ثابت ہو۔

سلیکا کی جن شفاف اور نیم شفاف رنگین اور بے رنگ اقسام کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے ان سے اکثر ممالک میں نگینہ کا کام لیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں کھمبائت اور راجپوتانہ وغیرہ اس کے لئے مشہور ہیں۔ امریکہ میں تو وارڈ نامی کمپنی نے اس کو بطور گھریلو صنعت استعمال کرنے کے لئے کم داموں کے حکاکی کے آلات بھی بنا رکھے ہیں اور وہ فروخت کئے جا رہے ہیں۔ ہمارے صناع بہ ان آلات کو رواج دیکر نام نہاد جڑاؤ زیورات کی جھوٹی جھلک سے مستورات کو نجات دلا سکتے ہیں۔ سر تھیوڈور ٹاسکر سے ایک مرتبہ میں نے اس بارے میں بالخصوص نمونہ جات اشیاء صنعتی پر گفتگو کی تھی۔

جنگلات کے محکمہ کی رپورٹوں سے پتہ چل سکتا ہے کہ ہمارے ملک میں چوبینہ اور دیگر اقسام کی لکڑی کی پیداوار کیسے ترقی کر سکتی ہے۔ میں نے چند سال قبل میسور سے درخت صندل کے بیج لائے اور اپنی مختصر زمین میں ان کو بویا۔ جب تک ان کی معاونت کیلئے کوئی میزبان درخت ان کا ساتھ نہ دے صندل اچھی طرح نشوونما نہیں پاتا۔ میں نے دیکھا کہ ببول ان کی میزبانی کے لئے تیار رہے اور ہمارے ملک میں اس کی کمی نہیں۔ اگر تجربہ کے طور پر ببول کے جنگلوں میں صندل کی کاشت کی کوشش کی جائے تو ذاتی معلومات کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ یقیناً کامیاب ثابت ہوگی۔

طبیعیات سے طبیعی ہیئت (اسٹروفزکس) اور طبیعی ارضیات (جیوفزکس) کو قریبی
تعلق ہے۔ جامعہ کے معملوں سے دور ہونے پر میں نے اپنا وقت زیادہ تر انھیں علوم کی
تحقیقات پر وقف کر دیا ہے اور اس سے علم کی کچھ خدمت کر لی ہے اور کر رہا ہوں یا خدا ان
تو ان سے بھی دور ہٹے ہوئے شعبوں تک پہنچ سکتا ہے۔ اسی لئے میں ان مختلف امور کے
متعلق کچھ کہہ سکا۔ اپنے اتفاقیہ مشاہدات سے چند مفید معلومات جو مجھ کو حاصل ہو سکیں میں نے
ان کو اہل ملک کی خدمت میں پیش کر دیا۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ ان تمام علوم و فنون سے
واقفیت کا اظہار مقصود ہے۔ من آنم کہ من دانم۔

اگر مجھکو اجازت دیجائے تو میں آپ حضرات کو مشورہ دونگا کہ اپنے ذوق رضا کاری
میں آپ حیدرآباد کے چھوٹے کاریگروں مثلاً پارچہ بافوں، چرم کی دباغت کرنے والوں اور
تل، مونگ پھلی اور ارنڈی وغیرہ کا تیل نکالنے والوں سے دریافت کریں کہ انھیں کس قسم کی
مدد چاہئے۔ روپیہ پیسہ کی یا سرکاری مراعات کی یا کاردان ملازمین کی یا تیار شدہ سامان
کے خریداروں کی۔ اکثروں کو غالباً روپیہ کی ضرورت داعی ہوگی۔ ان کو بلند ہمت سرمایہ داروں
سے (جو صنعتی کاموں سے مہاجنانہ طریقہ پر نہیں بلکہ تجارتی اصول پر دلچسپی رکھتے ہوں) روشناس
کرایا جائے تاکہ کافی اطمینان کے بعد قرضہ وغیرہ کا انتظام ہو سکے اور طرفین کو ایک دوسرے
پر اعتماد ہو جائے۔ اگر آپ کی کوئی ذیلی کمیٹی اس کار خیر کے انجام دہی کے لئے قائم ہو جائے
اور باقاعدہ رجسٹروں کے ذریعہ پیشہ وروں اور ارباب سرمایہ داروں کے صحیح پتے درج کر کے
انھیں ایک دوسرے سے متعارف کرایا جائے (بغیر خود اپنے پر کوئی ذمہ داری لئے) تو امید ہے
کہ کئی چھوٹی چھوٹی صنعتیں چلنے لگیں گی۔ محکمۂ امداد باہمی کے توسط سے روپیہ بطور قرض یقیناً
مل سکتا ہے لیکن شاید اس کے شرائط کی تکمیل چھوٹے پیشہ وروں کے لئے مشکل ہے۔ ممکن ہے
آگے چل کر حکومت ایسے کاروبار کے لئے آسان شرائط نافذ کر سکے۔ ساہوکار تو ان کو روپیہ
فوراً دیتے ہیں لیکن قرضہ کے ساتھ بیچارے غریب سود اور کفالت کی زنجیروں میں اس بری طرح

سے پھنس جاتے ہیں کہ مر کر یا دیوالئے ہو کر ہی نجات پاتے ہیں۔

جہانتک مجھے علم ہے دستی پارچہ بافوں کو ان دنوں روپیہ کے بعد روئی کے دھاگے اور خام ریشم کی بڑی ضرورت ہے۔ ان کی فراہمی کے لئے حکومت کی امداد اور ماہران فن کے مشورہ کے ساتھ اگر چھوٹے پیمانے پر اقل سرمایہ کی کمپنیاں قائم ہو کر کام کرنے لگیں تو مقامی پارچہ باف اپنے حالیہ افلاس سے ایک گونہ چھٹکارا حاصل کر سکیں گے۔ اسی طرح شیشہ سازی، چرم سازی اور تیل نکالنے کے لئے چھوٹے سرمایہ کی کمپنیوں کے قیام پر بھی فنی نقطۂ نظر سے غور ہو سکتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ حکومت کے بعض محکمہ جات اس قسم کی اطلاعیں اور مشورہ پبلک کے مواد کے خاطر از راہ استحسان بہم پہنچا سکیں یا بہم پہنچانے کا آگے چلکر انتظام کر سکیں۔

شیشہ کی ایک صنعت کو حیدرآباد میں جو کامیابی ہوئی ہے اس سے ہر شخص واقف ہے محنت و استقلال اور حساب و کتاب کی صحیح جانچ اور سب سے بڑھکر کارپردازوں کی ایمانداری فنی مہارت کی کمی کو بھی بالآخر پورا کر دیتے ہیں شاید اس کے بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہمارے ملک میں گار کا پتھر جو شیشہ کی تیاری میں سب چیزوں سے زیادہ تصرف ہوتا ہے جا بجا بافراط ملتا ہے خود بلدہ کے قرب و جوار میں اس قسم کی پہاڑیاں اور ٹیلے ہیں گار کا پتھر ۹۹ فیصد خالص سلیکا ہے اور اس کو ۸۰۰ درجے تک گرم کرنے سے اس قدر پھوٹک ہوجاتا ہے کہ تقریباً آٹے کی طرح پیس لیا جا سکتا ہے سوڈا اور پوٹاش وغیرہ بیرون ہند ممالک سے خریدنا پڑتا ہے لیکن جب برقی طاقت سستی ہو جائیگی تو جیسا کہ میں اوپر ذکر آچکا ہے نمک طعام سے سوڈے کی تیاری آسانی اور سستی ہو جائیگی۔ میں یہاں تاج گلاس ورکس کی کامیاب صنعت کا ذکر کئے بغیر رہ نہیں سکتا۔ یہ کامیابی تعاون دولت و دماغ کے مفاد کی درخشاں دلیل ہے اور ثابت کرتی ہے کہ اس تعاون سے مٹی بھی سونا بن جاتی ہے۔

ایک زمانہ سے میرا خیال تھا کہ دیہات کے باشندوں کے لئے تل ارنڈی کھوپرے اور مٹی کے تیلوں کا ایک ایسا آمیزہ تیار کیا جائے جو زیادہ دھواں نہ دے۔ ہاتھ کی بنائی ہوئی دیسی بتی میں بلا تکلف اپر کو چڑھ آئے اور معمولی مین گروں کے تیار کردہ لیکن صحیح اصول پر جلنے والے چراغوں میں بلا خوف آتش زدگی دیر تک جل سکے۔ میری دانست میں اب یہ مسئلہ جنگ کے اندفاعی مسائل کے ساتھ شہری و دیہاتی امیر و غریب سب کے لئے اہم اور حل طلب ہو رہا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوگا اگر کوئی نوعمر سائنس دان مقامی صناعوں کے ساتھ ملکر اس کے حل میں مصروف ہو جائے۔ ہندوستانی دماغ سائنٹفک ایجاد کے لئے کسی طرح ناموزوں نہیں۔ متعدد ہندوستانی موجد حکومت ہند سے اپنے ایجادات کے تحفظ کے متعلق پیٹینٹ حاصل کئے ہیں۔ جامعہ عثمانیہ اور نظام کالج اور بعض مدارس کے طالب علم بھی ورٹیکل آپٹیکل بنچ کے برطانوی پیٹنٹ سے واقف ہونگے۔ کیا اس کی یاد کو تازہ کرانے سے انھیں اس قسم کے آلات کی ایجاد کا شوق نہ ہوگا۔

(مجھے افسوس ہے کہ حال میں لفٹننٹ کرنل ای۔ ڈبلیو۔ سلاٹر ایم۔ بی۔ ای نے انسٹیٹیوٹ آف انجینئرز حیدرآباد کے سامنے مملکت آصفیہ کی صنعتی ترقی کی تجاویز و تدابیر پر جو مقالہ پڑھا اس کے سننے کا موقع نہ ملا مجھے یقین ہے کہ اس مقالہ میں انھوں نے فنی نقطۂ نظر سے نہایت دلچسپ اور مفید باتیں بیان کی ہونگی۔ اگر یہ جلد طبع ہو جائے تو پبلک اس سے بہت فائدہ اٹھا سکیگی) اس عالمگیر جنگ کے دوران میں ہندوستان کو صناعی ملکوں کے ساتھ دوش بدوش چلنا ہوگا جس سے توقع ہے کہ سلطنت حیدرآباد بھی میکانیات و برقیات میں بہت ترقی کریگی۔ ہمارے سرکاری ٹکنیکل کالج اور مدارس نوجوانوں کو مشین کا کام سکھائے چلے جا رہے ہیں۔ امید ہے کہ ان اداروں میں امیدوار بکثرت شریک ہونگے اور یہاں سے تربیت پاکر بیوین بائنڈر کی طرح ملک کی صنعتوں کو ترقی کے راستہ پر چلا سکیں گے۔ اگر گلائنڈرز کے استعمال اور اون کی صنعت کی تعلیم کا بھی سرکار انگریزی سے انتظام ہو جائے تو ہمارے

نوجوانوں کو فن پرواز کی بہت جلد رغبت ہوگی۔ لاعلمی کی وجہ سے اس کی جو وحشت دلوں میں بیٹھی ہوئی ہے دور ہوجائیگی۔ سرکار عالی سرکار عظمت مدار کی امن اور جنگ کے تمام کاموں میں حلیف ہے اس جنگ میں فن پرواز کو جو اہمیت حاصل ہے محتاج شرح نہیں۔

اس موقع پر میں معاشی کمیٹی کے ارکان صاحبان کو خصوصاً اور جمیع باشندگان حیدرآباد کو عموماً یاد دلانا چاہتا ہوں کہ کسی فن یا علم یا پیشہ میں اگر صرف معدودے چند کارکن ہوں تو اُن کے بعض ماہر شہرہ آفاق ہونے پر بھی ملک کی ضرورت کسی طرح پوری نہیں ہوسکتی اس کے لئے متعدد اور مستقل کارکنوں اور ماہروں کا ہونا لازمی ہے۔ یہ خیال کہ قابل اشخاص کی افراط سے علم و ہنر کی قدر و منزلت کم ہوجائیگی یا ان کے لئے نوکریاں مہیا نہ ہوسکیں گی درست نہیں۔ لایق لوگ ملازمت سے مستغنی ہونگے بلکہ ایسے کاموں کی بنا ڈالیں گے جن سے ملک کی پیداوار بڑھ جائیگی اور نئی ملازمتیں از خود پیدا ہونے لگیں گی۔

خالص علمی کاموں میں بھی جو ترقی جامعہ عثمانیہ کے توسط سے گذشتہ پندرہ سال کے اندر ہوئی ہے محتاج بیان نہیں۔ کلیۂ جامعہ عثمانیہ کے ریسرچ جرنل کی اجرائی کا میں نے جب (اپنے صدارت کے زمانہ میں) خیال ظاہر کیا تو بہت کم اصحاب اس کے حامی نظر آئے۔ تاہم میں نے کافی گنجائش نکال کر اساتذہ کا ایک ریسرچ بورڈ اپنی نگرانی میں قائم کیا چند ہی ماہ میں اس جرنل کی شہرت جاپان سے لوس انجیلوس تک ہوگئی جس کی دلیل وہ خطوط ہیں جو میرے نام ان مقامات کے محققین نے روانہ کئے۔ حیدرآباد اکیڈیمی جس کا علمی ہفتہ چند ماہ قبل اس نے حضرت شہزادہ والاشان اعظم جاہ ہز ہائینس پرنس آف برار کی سرپرستی میں منایا اس بات کی تازہ دلیل ہے کہ ملک میں بین الاقوامی شہرت کے حامل افراد کی کمی نہیں۔ اس کے علاوہ بیرونی علمی کانفرنسوں میں حصہ لینے والے حضرات بھی کافی تعداد میں موجود اور پیدا ہوتے جارہے ہیں یہ کام حکومت کی توجہ سے انجام پارہے ہیں اور مزید ترقی کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اب میں ان تعلیم یافتہ بیروزگار حضرات کی خدمت میں ایک مشورہ پیش کرتا ہوں جو اگرچہ بیروزگاری کا فوری علاج متصور نہیں ہوسکتا تاہم اس پر کاربند ہونے سے سکون قلب ضرور پیدا ہوسکیگا۔ وہ یہ کہ جو صاحب کسی خاص پیشہ یا صنعت یا ملازمت کے لئے کوشاں نہ ہوں اپنے فرصت کا وقت عبادت اور جسمانی ورزش کے بعد کتب خانۂ آصفیہ یا اس کے مماثل اداروں میں صرف کریں۔ کتب خانۂ آصفیہ کے موجودہ اہتمام سے اوقات و ایام مطالعہ میں اتنا اضافہ ہوگیا ہے کہ ہر نوع کا جویائے علم اس سے خاطر خواہ استفادہ کرسکتا ہے۔

اس کے بعد میں ارکانِ معاشی کمیٹی کا مکرر شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے مجھ کو اس جلسہ کی صدارت کا اعزاز بخشا اور جو کچھ میں نے کہا اس کو توجہ سے سنا۔ آخر میں اپنی تقریر کو اس دعا پر ختم کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے آقائے ولی نعمت حضور پرنور ہز اگزالٹیڈ ہائینس دی نظام حیدرآباد و برار و شاہزادگانِ بلند اقبال و شاہزادیان فرخندہ فال کے عمر و اقبال میں ترقی عطا فرمائے اور ہمارے ملک کو اس عالمی جنگ کی ہولناکیوں سے محفوظ رکھے۔ آمین
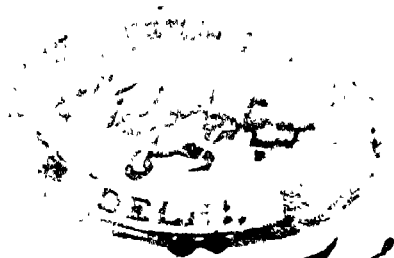
خطبۂ صدارت

از جناب مولوی محمد لیاقت اللہ خان صاحب سی ایس معتمد فینانس سرکار عالی

اجلاس دوم

معاشی کمیٹی نے کانفرنس کے آج کے اجلاس کی صدارت مجھ ہیچمدان کے تفویض کرکے جو عزت بخشی ہے اُس کے لئے میں بدل ممنون ہوں ! اور بلا کسی تمہید کے اپنے ناچیز خیالات کو ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں آپ کے آگے پیش کرتا ہوں ۔ میرا خیال ہے کہ ہر ملک کے معاشیات اُس ملک کے جملہ طبقوں پر محیط ہوتے ہیں خواہ وہ اہل حرفہ ہوں یا زراعت پیشہ ملازم پیشہ ہوں یا خانگی پیشہ ور ۔ پس معاشی پستی کے رفع کرنے کے لئے ہر طبقۂ ملک کے حالات کا مطالعہ ضروری ہے ۔ جب اسباب دریافت ہو جائیں تو اُن کا حل مشکل نہ ہوگا چنانچہ ایک طبیب نسخہ تجویز کرنے سے پہلے مرض کی تشخیص کرتا ہے ورنہ اگر تشخیص صحیح نہ ہو تو علاج غلط اور نتیجہ سودمند ہونے کے بجائے نقصان رساں ہوگا ۔

آپ حضرات واقف ہیں کہ زمانۂ قدیم میں جبکہ رسل و رسائل کے ذرائع موجود نہ تھے مختلف قطعات عالم معاشی حیثیت سے ایک دوسرے سے بالکل بے تعلق اور اپنی ایک علحدہ دنیا میں زندگی بسر کرتے تھے ۔ چنانچہ ممالک محروسہ سرکار عالی کی قدیم دیہی تنظیم بھی یہی تھی کہ ہر گاؤں میں بلوتہ دار مقرر تھے مثلاً بڑھائی ۔ لوہار ۔ کمار ۔ موچی وغیرہ

جن کا یہ فرض تھا کہ کاشتکاروں کے جملہ ضروریات کی تکمیل بلا رقمی معاوضہ کے کریں، اور جب کھیت تیار ہو جائے تو اپنا بلوتہ بشکل اناج حاصل کرلیں۔ گویا خدمت کا بدل خدمت سے ہوتا تھا۔ جیسے جیسے رسل و رسائل کے ذرائع مہیا ہوتے گئے شہریوں کی زندگی دیہاتیوں کی زندگی پر اثر انداز ہونے لگی۔ حتیٰ کہ ریلوں، جہازوں موٹر کاروں اور طیاروں کے عالم وجود میں آنے کے بعد مختلف ممالک ایک دوسرے سے اس قدر متصل ہو گئے کہ وقت اور فاصلہ کوئی چیز نہ رہے اور تمام دنیا گویا ایک خطہ بن گئی اور مختلف ممالک کے تمدن میں اختلاط ہو گیا۔ بالفاظ دیگر دنیا کے مختلف ممالک کی اب وہی شکل ہو گئی ہے جو زمانہ قدیم میں ایک موضع کی تھی اور افراد کے مابین خدمات کے بدل کے بجائے اب ممالک اور اقوام کے درمیان اپنی اپنی پیداوار کے بدل کا طریقہ رائج ہو گیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اُس وقت انسانیت کا یہ اصول کارفرما تھا کہ خود بھی جیو اور دوسروں کو بھی زندہ رہنے دو۔ اور اب بربریت کا دور دورہ ہے کہ صرف ہم زندہ رہیں گے۔ دوسروں کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ چنانچہ جو ہولناک جنگ اس وقت جاری ہے وہ اس کا بیّن ثبوت ہے۔ آج ہی کی تمدن سوز تہذیب کے متعلق ہندوستان کے مایۂ ناز شاعر اقبال مرحوم نے کہا تھا۔

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا

جن ممالک میں قدرتی ذرائع بافراط موجود تھے اور جن کے باشندوں نے ان سے استفادہ کی صلاحیت حاصل کرلی وہ قدرتاً اُن ممالک پر سبقت لے گئے جہاں ایسے قدرتی ذرائع نہ تھے یا اگر تھے تو ان سے استفادہ کی کافی صلاحیت وہاں کے باشندوں میں پیدا نہیں ہوئی تھی بدقسمتی سے حیدرآباد کو ان دونوں کوتاہیوں کا سامنا ہے۔ صنعت و حرفت کے کارخانوں کے قیام کے لئے سستی قوت برقی جس پر ان کا بڑا

دارو مدار ہے یہاں مفقود ہے کیونکہ میسور کے مماثل یہاں کوئی قدرتی آب شار نہیں ہیں جس سے برقابی قوت حاصل کیجا سکے۔ نظام ساگر کی تعمیر کے بعد تھوڑی مقدار میں برقابی قوت کی تولید کے امکانات پیدا ہوگئے ہیں اور حکومت نے ماہرین کی ایک کمیٹی اس بارے میں تجاویز مرتب کرنے کے متعلق مقرر کردی ہے۔ دوسرے آبپاشی کے کارہائے سرمایہ بھی مثلاً تنگبھدرا پراجکٹ وغیرہ جیسے جیسے تعمیر پائیں گے برقابی قوت کو ان سے حاصل کرنیکے مواقع دستیاب ہوسکیں گے۔ دوسری کمی ہمارے پاس اس چیز کی ہے کہ ہماری اپنی کوئی بندرگاہ نہیں ہے جہاں سے مال کی درآمد برآمد میں سہولت ہوسکے۔ ریلوے کی حد تک بھی ہمارا جغرافیائی محل کچھ ایسا واقع ہوا ہے کہ چاروں طرف سے ہم دوسرے علاقہ کی ریلوں سے گھیرے ہوئے ہیں! ور ان ریلوں سے نرخوں کے متعلق معاہدے کئے بغیر جدید ریلوے لائن قائم نہیں کرسکتے مثال کے طور پر اگر ہم کوئی لائن ایسی قائم کریں جس سے بمبئی یا مدراس بندرگاہوں سے مسافت کم ہوتی ہو تو معاہدہ کے وقت ہمارا حصہ ریلوے پر جو کرایہ مال اور مسافروں کو لے جانے کے لئے مقرر ہوگا وہ ایسا ہوگا کہ ہم ان ریلوں سے مسابقت نہ کرسکیں جو ہماری سرحد سے بندرگاہوں تک جاتی ہیں۔ ایک طریقہ بیرونی ریلوں کا یہ ہے کہ اگر مال ہماری ریلوں کے زیادہ حصہ پر سے گزرتا ہو تو وہ اپنے کمتر حصہ ریلوے کا کرایہ اسقدر زیادہ مقرر کردیتے ہیں کہ مال بھیجنے والے کے لئے یہ زیادہ کفایت آمیز ہوتا ہے کہ وہ ہمارے قریب تر راستہ سے مال روانہ کرنے کے بجائے بیرونی ریلوں کے بعید تر راستہ سے جن کا مجموعی کرایہ کمتر ہے روانہ کریں ظاہر ہے کہ کوئی ملک اپنا سرمایہ ایسی ریلوں کی تعمیر پر صرف نہ کریگا جن سے خسارہ ہونے کا اندیشہ ہو۔ بریں ہم کم سے کم منافعہ پر بھی حکومت سرکارعالی نے بعض ریلوے لائن قائم کردی ہیں۔ جو اصحاب اس کی تبلیغ کرتے ہیں کہ ملک میں ریلوں کا جال بچھا دیا جائے وہ اس نقطۂ نظر کو پیش نظر نہیں رکھتے۔

معدنی ذخائر کے معاملہ میں بھی حیدرآباد میں سوائے کوئلہ اور سونے کی کانوں کے کوئی بڑی کانیں موجود نہیں ہیں۔ رائچور میں سونے کی قدیم کانوں کو کرر کھولنے کا کام سرکار عالی نے شروع کردیا ہے جس کے لئے اسوقت تک ۵۵ لاکھ کی رقم منظور کی جاچکی ہے اور توقع ہے کہ تجارتی اصول پر سونے کی برآمدگی ممکن ہوسکے گی۔

حکومت سرکار عالی نے بڑے ماہرین سے کریم نگر اور دوسرے مقامات پر جہاں لوہے کے موجود ہونے کا امکان معلوم ہوا تفتیش کرائی مگر یہ سب اس نتیجہ پر پہنچے کہ نہ صرف لوہا گھٹیا قسم کا ہے بلکہ اس کی مقدار اتنی نہیں ہے کہ تجارتی اصول پر اس سے کوئی فائدہ اٹھایا جاسکے۔ ہیرے کے کان کی دریافت میں بھی سرکار عالی نے بہت تجسس کیا مگر کوئی قدرتی کان دریافت نہ ہوسکی۔ بریں ہم رائچور میں ہاسپیٹ کے مقام پر کچھ ہیرے سطح زمین پر پائے گئے اور امتحاناً ایک کمپنی کو وہاں پراسپکٹنگ کا لائسنس دینے کی کارروائی جاری ہے۔ اس کے برخلاف ہمسایہ ریاست میسور کو لیجئے وہاں ایک زبردست قدرتی آبشار سے قوت برقی کی وافر تولید ہورہی ہے اور بہت سستے نرخ پر وہاں کے کارخانے برقی قوت حاصل کر رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں کے مصنوعات پر لاگت نسبتاً کم آتی ہے۔ علاوہ سونے کی زرخیز کان کے وہاں لوہے کی کان بھی موجود ہے اور ریاست میسور کی ترقی کا بڑا راز یہی ہے کہ وہاں سونا اور لوہا جیسے قیمتی دھاتوں کے ساتھ برقابی قوت بھی دستیاب ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مملکت حیدرآباد میں ہر قسم کی معدنی اشیاء اور دیگر اشیاء خام پائی جاتی ہیں اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیوں نہیں ان سے استفادہ کیا جاتا محض خام اشیاء کی موجودگی کسی کارخانۂ صنعت کے قیام کے لئے کافی نہیں ہے اولاً خام اشیاء کا اتنی مقدار میں ہونا ضروری ہے کہ ایک کارخانہ کے تجارتی اصول پر چلانے کے لئے جس اقل مقدار کی ضرورت ہے وہ موجود ہو۔ دوم یہ کہ تیار شدہ اشیاء کی لاگت اس

قیمت سے نہ بڑھے جس قیمت پر بیرون ملک کی تیار کردہ اشیاء یہاں آکر فروخت ہوتی ہوں۔ اگر ان دو شرطوں میں سے کوئی ایک شرط بھی پوری نہ ہو تو سمجھنا چاہئے کہ ایسی صنعت نفع آور طریقہ پر ملک میں قائم نہیں ہو سکتی۔ کسی خام پیداوار کا بڑھانا جو معدنی ہے انسان کی قدرت سے باہر ہے۔ البتہ ایسی خام پیداوار جو انسانی محنت سے پیدا ہو سکتی ہے وہ بڑھائی جا سکتی ہے۔ چنانچہ حکومت سرکار عالی نے حال ہی میں سررشتۂ زراعت کی تقسیم شعبۂ تحقیق اور شعبۂ اشاعت میں کر دی ہے تاکہ ہمارے ہاں کی زرعی پیداواروں کی اقسام کو ترقی دینے اور مختلف قسم کی کھاد کے طریقوں اور اچھے بیج کے فراہم کرنے سے متعلق تجربات کئے جائیں اور ان کی تشہیر گاؤں گاؤں کیجائے۔

معدنی ذخائر کی دریافت اور ان کے استعمال سے متعلق بھی ایک خاص پروگرام مرتب کیا گیا ہے اور ڈاکٹر ہیرن وظیفہ یاب ڈائرکٹر جنرل سروے آف انڈیا کے خدمات دو سال کے لئے حاصل کئے گئے ہیں۔ تاکہ پیمائش طبقات الارض کے کام کی تکمیل جلد سے جلد ہو جائے۔ جہاں تک معدنی ذخائر کی دریافت اور تجسس اور صنعتوں کو فروغ دینے کے لئے سستی قوت برقی کی سربراہی کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہے اس کی تکمیل مختلف صورتوں میں ہو رہی ہے۔ مگر محض حکومت کی کوشش کافی نہیں ہیں تاوقتیکہ مختلف طبقات ملک بھی اپنے اپنے دائرۂ عمل کو حالات وقت کے مطابق نہ کریں۔ سرمایہ دار طبقہ کا یہ فرض ہونا چاہئے کہ وہ ملک میں صنعتی کارخانے محدود ذمہ داری کی کمپنیوں کی شکل میں فوراً قائم کریں۔ حالیہ تلخ تجربہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے سرمایہ دار ایک جمود کے عالم میں ہیں۔ نظام شوگر فیکٹری اور کارخانۂ کاغذ سازی میں اس طبقہ نے کوئی قابل لحاظ حصہ نہیں لیا اور اگر حکومت کی جانب سے ان کمپنیوں کے حصص نہ خریدے جاتے تو یہ کارخانے عالم وجود میں نہ آتے۔ معاشی کمیٹی

کے پروگرام میں اگر ملکی سرمایہ داروں کے ذریعہ چھوٹے بڑے کارخانوں کے قیام کی جدوجہد بھی شامل کی جائے تو مناسب ہوگا۔

ایک اہم کمی ہمارے ملک میں کاریگروں یعنے میکیانکس اور آرٹیسنس کی ہے جن کے بغیر کوئی صنعتی کارخانہ قائم نہیں ہوسکتا۔ اس کمی کو محسوس کرکے حکومت نے ایک ماہر فن تعلیم صنعتی مسٹر ایبٹ کے خدمات حاصل کئے تھے اور ان کی سفارشات کے بموجب سررشتہ تعلیم صنعتی قائم کرکے ممالک محروسہ میں صنعتی تعلیم کے مدارس کھولے جارہے ہیں اور کارہائے جنگ کے ضمن میں بھی ٹرننگ سنٹرس قائم کرکے اُن میں تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔ مگر اسوقت تک اہل ملک کماحقہ ان شعبوں سے استفادہ نہیں کررہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل ملک کا رجحان ملازمت سرکاری کی طرف زیادہ ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ سرکاری ملازمت ایک باوقعت پیشہ ہے اور ایک مقررہ ماہوار بلاکم وکاست ملجاتی ہے اس کے علاوہ وظائف حسن خدمت اوران کے پسماندوں کو ان کے بعد وظائف رعایتی بھی ملتے ہیں جس کی وجہ سے وہ آئندہ کی فکر سے سبکدوش ہوجاتے ہیں یہ خیال ایک حدتک صحیح ہے مگر ساتھ ہی اس کا دوسرا رُخ بھی ذہن نشین رہنے کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ سرکاری ملازمتیں محدود ہیں گزیٹیڈ وغیر گزیٹیڈ خدمات کی جملہ تعداد (۸۰،۰۰۰) کے قریب ہے اور ملک کی آبادی ڈیڑھ کروڑ سے زائد ہے۔ بالفاظ دیگر آبادی کی صرف (۰،۵) فیصد کی کھپت ملازمت سرکاری میں ہوسکتی ہے اگر ملک کے ہر نوجوان کا نصب العین ملازمت سرکاری ہو اور والدین بھی اس خیال سے اپنے بچوں کو تعلیم دلوائیں تو لازم ہے کہ ان کی بہت بڑی تعداد بالآخر ملازمت حاصل کرنے سے محروم رہیگی اور جو روپیہ ان کی تعلیم پر صرف مہیا کیا نہ صرف وہ رائیگاں جائیگا بلکہ یہ سب نوجوان بے روزگاری کی مصیبت میں مبتلا ہوجائینگے۔ اس کا ایک علاج یہ ہوسکتا ہے کہ معاشی کمیٹی اس جزو کو بھی اپنے

لائحہ عمل میں شریک کرکے اہل ملک کو ترغیب دے کہ وہ اپنی اولاد کو پیشہ ورانہ تعلیم دلائیں جس کے لئے ملک میں وسیع میدان موجود ہے۔ ساتھ ہی میرا ذاتی خیال ہے کہ ملازمت سرکاری میں جو دلکشی ہے وہ دور کردی جانی چاہئیے اور ان کے شرائط ملازمت بھی وہی ہونی چاہئیں جو کارخانوں کے ملازموں کے ہوتے ہیں جنگ کی وجہ سے بیرون ملک سے اشیاء کی درآمد رک گئی ہے اور یہی موقع ہے کہ حیدرآباد میں مختلف کارخانے فوراً قائم کئے جائیں۔ چنانچہ سرکار عالی نے بھی حیدرآباد ڈیولپمنٹ کارپوریشن کے نام سے ایک بہت بڑے ادارہ کے قیام کی منظوری دیدی ہے۔ جس کے زیر نگرانی مختلف کارخانے قائم کئے جائینگے۔ جن میں پچاس فیصدی سرمایہ حکومت کا ہوگا۔ اب یہ اہل ملک کا کام ہے کہ ان کمپنیوں کے قیام میں حصہ لیں جس سے نہ صرف ملک کی ضروریات زندگی ملک ہی میں مہیا ہوجائینگی۔ بلکہ اہل ملک کے لئے روزی کے ذرائع کھل جائینگے اور بے روزگاری کا مسئلہ بڑی حد تک حل ہوجائیگا۔ معاشی کمیٹی کا شعبۂ اشاعت اگر چاہے تو اس کو بھی اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہے۔

اسوقت تک جو میں نے عرض کیا وہ مختصراً صنعت و حرفت سے متعلق تھا اب میں زراعت پیشہ طبقہ کی معاشی حالت سے متعلق کچھ عرض کرونگا۔ سب سے پہلے یہ امر ذہن نشین رکھنے کے قابل ہے کہ حیدرآباد ایک زرعی ملک ہے اور زراعت کو پس پشت ڈالکر محض صنعت و حرفت ہی پر ساری توجہ منعکس نہیں کیجا سکتی۔ سب سے بڑی مصیبت جس میں یہ طبقہ مبتلا ہے وہ قرضہ ہے جس کے بوجھ میں وہ دبے ہوئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ رفتہ رفتہ کاشت کاروں کی زمینات قرضخواہوں کے ہاتھ میں چلے گئے ہیں اور ان کی حیثیت اب صرف ایک قولدار کی رہ گئی ہے۔ قولدار کو زمین میں دلچسپی اس لئے نہیں رہتی کہ اس کا قول دوامی نہیں ہے۔ اس طرح زمینات کی حالت دن بدن گرتی جارہی ہے اور نتیجتہً ملک کی زرعی پیداوار کی مجموعی مقدار

گھٹ رہی ہے۔

کاشت کاروں کو قرضہ سے نجات دلانے کی غرض سے حکومت سرکار عالی نے قانون مصالحت قرضہ کو نافذ کر کے مصالحتی مجالس قائم کر دی ہیں اور ایسے مصالحت شدہ قرضوں کی سبیل کے لئے زمین گروی بنک کے قیام کے لئے بھی قانون منظور فرمایا ہے جس کے (۵۰) لاکھ کے ڈبنچر کی ذمہ داری حکومت نے اپنے سر لی ہے۔ اس کے علاوہ حکومت سرکار عالی نے قانون انتقال اراضی بھی نافذ کر کے کاشت کار طبقوں کا تعین کر دیا ہے تاکہ کسی کاشت کار طبقہ کی اراضی غیر کاشت کار کے دوامی قبضہ میں نہ جاسکے TENANCY-ACT بھی مرتب کیا جا رہا ہے تاکہ قولداروں اور شکمیداروں کے حقوق کی حفاظت ہو سکے۔ یہاں تک تو حکومت نے کاشتکاروں کے مرض کی تشخیص اور اس کا قانونی بندوبست کر دیا مگر اس کی کیا ذمہ داری ہے کہ آئندہ پھر یہ کاشت کار جدید قرضے کر کے اپنے لئے پھر وہی مصیبت پیدا نہ کرینگے۔ اس کا حل حکومت کے اقتدار سے باہر ہے لیکن آپ اگر چاہیں تو اس حصہ میں کاشت کار طبقہ کی مدد کر سکتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ تبلیغ کے ذریعہ اس طبقہ میں کفایت شعاری کی عادت پیدا کرائیں۔ شادیوں اور دوسرے تقاریب پر جو فضول خرچی ہوتی ہے اس کو روکیں۔ انجمن ہائے امداد باہمی سے جو قرضہ کاشتکار حاصل کرتے ہیں ان کو تخم اور جانوران کی خریدی یا زمینات کی استواری وغیرہ پر صرف کرنے کی نگرانی کا انتظام کریں۔ ایک اور چیز جو آپ مقامی معاشی انجمنوں کے ذریعہ کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ کاشت کار اپنے فرصت کے اوقات میں جبکہ فصل کی درو ختم ہو جائے اور دوسری فصل کی تیاری کا وقت آئے یہ لوگ گھریلو صنعتوں کا کام کریں۔ اہل دیہہ کو یہ بھی ترغیب دیجا سکتی ہے کہ اپنے مکانات کے صحن میں ایک یا دو میوہ دار درخت لگائیں جن کے لئے کسی خاص اہتمام کی ضرورت نہیں ہے

کھاد ان کے ہاں موجود رہتا ہے اور روزمرہ پانی کا جو استعمال وہ کرتے ہیں اسی سے دو ایک میوہ کے درخت پل سکتے ہیں۔ ترکاری کی ایک آدھ بیل وہ اپنے مکان یا صحن کی دیوار پر چڑھا سکتے ہیں۔ اگر ہر موضع میں ہر شخص اس پر عمل کرے تو نہ صرف اس کو کھانے کے لئے ترکاری اور معمولی میوہ مل سکیگا بلکہ گاؤں کی صحت اور خوشنمائی میں بھی اضافہ ہوگا۔ غرض کہ دیہاتی کاشتکاروں کی معاشی حالت کو سدھارنے کا دارومدار بہت کچھ خود اُن کی توجہ پر منحصر ہے اور یہ بہت آسانی سے ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ اپنی معاشرت کو درست کرلیں۔

اب میں ملازم پیشہ طبقہ کے حالات سے مختصراً بحث کرونگا۔ اس طبقہ کی حالت بظاہر اچھی معلوم ہوتی ہے مگر سطح کو اگر کھروچا جائے تو آپ دیکھیں گے کہ ان کی حالت کچھ زیادہ قابل رشک نہیں ہے۔ یہ سفید پوش مفلس ہیں۔ ان کی آمدنی معین ہے مگر اخراجات غیر محدود ہیں ان میں کم از کم پچھتر فیصدی ایسے ہیں جو آمدنی سے بہت زیادہ ہر مہینے صرف کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کا طرز زندگی اپنی حیثیت سے بہت زیادہ بلند ہے اور جب سے سینماؤں اور چائے خانوں کی بہتات ہوگئی ہے ان کی کم از کم ایک ربع تنخواہ ان کے نذر ہو جاتی ہے۔ کثرت چاء خوری اور سینماؤں کی حاضری سے ان کی صحت علیحدہ متاثر ہو رہی ہے۔ کوئی چھوٹی سی چھوٹی تقریب پر بھی یہ طبقہ بے حد و حساب روپیہ صرف کر دیتا ہے۔ ان سب عادتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ آئے دن قرضخواہوں کا تقاضا اور عدالتی ڈگریوں سے یہ پریشان رہتے ہیں اور تعجب نہیں کہ ان پریشانیوں کی وجہ سے ان کی کارکردگی بھی متاثر ہوتی ہو اس طبقہ کی اصلاح کے لئے میرے خیال میں دفتر واری معاشی کمیٹیاں قائم کرنے کی ضرورت ہے تاکہ غیر ضروری رسم و رسومات پر قرض لے کر روپیہ صرف کرنے سے اُن کو باز رکھا جائے اور ان کے لئے معاشی کلب گھر مہیا کئے جائیں جہاں کفایت آمیز طریقہ پر ان کی تفریح کا

سامان مثلاً ریڈیو اخبارات رسائل وغیرہ رکھے جائیں تاکہ سینماؤں اور چائے خانوں
میں ان کو جا کر روپیہ اور صحت ضائع کرنے کی ضرورت نہ رہے۔
میں آخر میں ہمارے ہاں کے طبقۂ اناث کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا ہمارے
ملک کا یہ طبقہ جو سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے بہت زیادہ فراموشی کی حالت
میں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے ہاں اناث کی تعلیم کا بہترین انتظام ہے مگر
اس سے صرف متوسط اور اعلیٰ طبقے کے لوگ استفادہ کر رہے ہیں اور یہ استفادہ بھی
اس حد تک ہے کہ شادی سے پہلے لڑکیاں مدرسوں میں جا کر لکھنے پڑھنے اور سوزن کاری
کی تکمیل کر لیتی ہیں۔ مگر بیاہ کے ساتھ ہی ان کی ایک نئی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔
کوئی کام جسمانی محنت کا یہ نہیں کرتیں اور متعدد ملازمین کی ان کو ہر آن محتاجی رہتی
ہے جیسے کہ کسی مریض کو نرس کی۔ گھر کا کاروبار سب ملازمین کے تفویض رہتا ہے اور
ہر قسم کی فضول خرچی ہوا کرتی ہے۔ بچے آیاؤں کے تفویض ہو جاتے ہیں۔ ماں باپ
کے ساتھ یہ اٹھتے بیٹھتے نہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ماں کی ذاتی توجہ و تربیت سے یہ
محروم ہو کر بڑے ہوتے ہیں۔ رسم و رواج کو ہماری مستورات اس درجہ اہمیت دیتی
ہیں کہ چاہے کل اثاث البیت فروخت ہو جائے یا قرضہ لیا جائے مگر مقررہ تقاریب
نہ ٹلیں۔ ان کی اصلاح مردوں کے بس سے باہر ہے اس لئے ان ہی کے ہاتوں انکی
اصلاح کا انتظام ہونا چاہئے اگر سر برآوردہ مستورات کی ایک معاشی کمیٹی قائم کر کے
اس بارے میں اصلاح کی کوشش کی جائے تو مناسب ہوگا فقط

حیدرآباد میں دیہی تنظیم

از جناب مولوی رضی الدین صاحب شریک ناظم سررشتۂ امداد باہمی سرکار عالی

ا۔ ہندوستان ایک زرعی ملک ہے۔ اور حیدرآباد اس کا ایک حصہ ہے۔ اس لحاظ سے اس ملک کی آبادی کا بڑا حصہ دیہات میں رہتا اور کاشت کاروں پر مشتمل ہے۔ یہاں بھی ہندوستان کے اور حصوں کی طرح شہروں اور دیہات میں بڑا فرق ہے۔ ہم شہر کے رہنے والے ہر قسم کی ترقیوں سے مستفید ہو رہے ہیں۔ ہم میں تعلیم زیادہ ہے ہمارے گھر صاف ستھرے اور سڑکیں اور گلیاں پاک صاف ہیں۔ ہم کپڑے اچھے پہنتے ہیں۔ ہماری آمدنیاں نسبتاً زیادہ مستحکم ہیں۔
ورزش اور تفریح کے طرح طرح کے اسباب مہیا ہیں۔ طبی امداد ہمیں ہر وقت حاصل ہے اس کے برعکس ان شہروں سے دور مواضعات میں رہنے والوں کی حالت کیا ہے! ان پر جہالت چھائی ہوئی ہے۔ مقروضیت کے بار سے دبے ہوئے ہیں۔ ان کے مکانات اور بستیاں غلیظ، ان کے کپڑے میلے کچیلے، غذائیں نہایت خراب طرح طرح کے تنقیہ [illegible] وہ عادی۔ اگر ملک کی آبادی کا اتنا بڑا حصہ ایسی خراب حالت میں ہو تو پھر شہری [illegible] رونق بھی نمائشی چیز ہوگی۔ اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ہم حقیقت میں اسی وقت اپنے ملک کو ترقی یافتہ ملک سمجھ سکتے ہیں جب ہم ان دیہات کے رہنے والوں کی

زندگی کا معیار بلند کر سکیں۔ ان کے افلاس کا حل معلوم کریں انکی زندگی کو زیادہ خوشگوار اور زیادہ صحت بخش بنائیں۔ چونکہ ان تمام خرابیوں کا ایک بنیادی سبب افلاس ہے، بہتر ہوگا کہ پہلے کاشتکار کی زندگی کے معاشی پہلو ہی پر روشنی ڈالی جائے۔

۲۔ گو حیدرآباد کا کاشتکار اپنے اطراف کے بیرونی ممالک کے کاشتکاروں سے کسی قدر زمین زیادہ ہی رکھتا ہے لیکن معاشی حالت اس کے پڑوسی سے بہتر نہیں۔ وجہ کیا ہے؟ ہمارے کاشتکار زمین رکھتے ہیں اور محنت میں بھی کسی سے پیچھے نہیں لیکن بڑا سوال سرمایہ کی فراہمی کا ہوتا ہے۔ بغیر سرمایہ فراہم کئے نہ تو کاشتکار ہل جوت سکتا ہے اور نہ تخم بو سکتا ہے۔ سرمایہ کی فراہمی بھی کسی نہ کسی طرح ہو جاتی ہے لیکن ایسے کٹھن شرائط پر کہ اس کو اپنی محنت کے معاوضہ میں بھی واجبی طور پر محروم رہنا پڑتا ہے۔ ایک تو وجہ یہ ہوئی۔ دوسرے کاشت کے ناقص طریقے، خراب تخم کا استعمال کھاد کا صحیح طریقہ پر تیار نہ کرنا، اپنی زمین پر ایک ہی جنس کا سالہا سال تک کاشت کرنا، اور جب فصل تیار ہو جائے تو اس کو بازار کا اتار چڑھاؤ دیکھے بغیر من مانے داموں پر مقامی ساہوکاروں اور اڑتیوں کے ہاتھ فروخت کر دینا۔ ان چیزوں نے مدت سے ہمارے کاشتکار کے بجٹ کو اتنا متاثر کیا ہے کہ مشکل ہی سے کوئی خاندان ایسا ملیگا جو ساہوکاروں کے پنجوں میں نہ پھنسا ہوا ہو۔

۳۔ حکومت سرکار عالی نے مختلف تعمیری سررشتہ جات کے ذریعہ ان خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ مثلاً سررشتہ جات زراعت، علاج حیوانات، تعلیمات، صحت عامہ وغیرہ عرصہ دراز سے دیہات سدھار کی تدابیر اختیار کر رہے ہیں لیکن ان تمام سررشتہ جات کی کوشش حال حال تک ایک دوسرے سے الگ تھی اور ہر سررشتہ کی کوشش محدود تھی۔ کاشتکار کی زندگی کے اس

مخصوص پہلو تک جو اس سے متعلق تھا مثلاً لاکھوں روپے سالانہ سررشتہ مال سے تقاوی تقسیم کیجاتی تھی۔ باوجود اس کے کاشتکاروں کی مقروضیت میں قابل لحاظ کمی نہیں ہوئی۔ سررشتہ زراعت کی جانب سے ہزارہا آزمائشی مزرعہ جات قائم ہوئے لیکن ان مواضعات کے بجز چند کاشتکاروں کے دوسرے کاشتکاروں نے بہتر طریقہ زراعت کو اختیار نہیں کیا۔ اسی طرح علاج حیوانات کے ڈاکٹر مواضعات میں دورہ کرکے مختلف قسم کی بیماریوں اور ان سے بچنے کی تدابیر کا پروپگنڈا کرتے رہتے ہیں لیکن جیسی چاہیے کامیابی مشکل تھی۔ کسی چیز کا پروپگنڈا اسی وقت خاطر خواہ کامیاب ہوسکتا ہے جب وہ مسلسل اور بڑے پیمانہ پر کیا جائے ان سررشتہ جات کی کوششوں میں ایک طرح سے عوام سے براہ راست تعلق پیدا کرنے کی کمی تھی اس کو دور کرنے کے لئے پہلا قدم سررشتہ امداد باہمی کا قیام تھا۔ جس کے ذریعہ کاشتکار کو یہ بتلانے کی کوشش کی گئی کہ اس کو اپنے مسائل پر انفرادی طور پر غور کرنا نہیں ہے بلکہ دیہی طبقہ کے ایک رکن کی حیثیت سے مشترکہ مفاد کو پیش نظر رکھکر کام کرنا ہے۔ چونکہ قرضہ کا سوال سب سے اہم تھا فطرتاً پہلے بڑی تعداد میں اتحادی اصول پر قرضہ کی انجمن دیہات میں قائم کیگئی جہاں کفایت شعاری اور اپنی آپ مدد اور ایک دوسرے کی مدد کے زرین اصولوں پر ہر رکن کو کاربند کرنے کی سعی کیگئی۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ ہر انجمن کامیاب رہی لیکن کامیاب انجمنوں کی اتنی کافی تعداد ہے کہ اس سے یہ نتیجہ ضرور اخذ کیا جاسکتا ہے کہ جب ان انجمنوں کے اراکین نے کامیابی حاصل کی ہے تو دوسری انجمنوں میں بھی ایسے نتائج کا حاصل کرنا ناممکن نہیں۔ اسوقت تقریباً (۳۵۰۰) زرعی انجمنوں میں کوئی (۴۳۰) زرعی انجمنیں ایسی ہیں جو بالکل اپنے ذاتی سرمایہ سے کام کرنے لگی ہیں جن کا سرمایہ زیر استعمال (۱۵) لاکھ سے زیادہ ہے۔ بلا تامل یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان انجمنوں کے گیارہ ہزار سے زیادہ اراکین نے

بیرونی مقروضیت اور ساہوکار سے بالکلیہ نجات حاصل کرلی ہے۔ جب امداد باہمی کے اصول پر کاربند ہونے سے قرضہ اور فراہمی سرمایہ کی حد تک یہ کامیابی حاصل ہوئی تو یہ ایک فطرتی بات تھی کہ انہی اصول کو دیہی زندگی کے دوسرے مسائل پر بھی منطبق کیا جاتا۔ اسی مقصد کے پیش نظر آج سے چار سال قبل ۱۳۴۲ف میں حکومت سرکار عالی نے دیہی تنظیم کی ایک اسکیم کو منظور فرمایا۔ جو اسی بنیاد پر پیش کیگئی تھی کہ حتی الامکان یہ کام ایسے ادارہ کی نگرانی اور ہدایات کے بموجب کئے جائیں جو مختلف تعمیری سررشتہ جات میں ہم آہنگی وربط پیدا کرسکے اسلئے یہ طے کیا گیا کہ انجمن ہائے امداد باہمی کے ذریعہ دیہی مسائل کو حل کرتے اور مشکلات کو دور کرنے کی کوشش کیجائے اور ان انجمنوں پر مجالس تعلقہ واضلاع اور پھر مرکزی مجلس حیدرآباد کی نگرانی رہے۔

۴ ۔ ایک مرکزی مجلس تنظیم دیہی کا قیام زیر صدارت ہز اکسلنسی صدر اعظم بہادر باب حکومت عمل میں آیا۔ جس کے تمام معزز ارکان باب حکومت کے علاوہ صدر ناظم ومعتمد صاحب مال صوبہ دار صاحبان اور تمام تعمیری سررشتہ جات کے نظماء صاحبین ارکان ہیں۔ ہر ضلع میں زیر صدارت اول تعلقدار صاحب ایک بورڈ قائم ہے جسکے ارکان مقامی عہدہ دار صاحبان سررشتہ جات تعمیری کے علاوہ کچھ مقامی غیر سرکاری اصحاب بھی ہیں جن کو دیہات سدھار سے دلچسپی ہے۔ اسی طرح ہر تعلقہ میں ایک کمیٹی ہے جس کے صدر تحصیلدار ہیں اور مقامی عہدہ داران سررشتہ جات تعمیری اور کچھ غیر سرکاری مقامی حضرات رکن ہیں۔ اب تک ۱۶ اضلاع میں بورڈ اور ۶۰ تعلقات میں کمیٹیاں قائم ہوچکی ہیں اور ہر تعلقہ میں ایک موضع کا انتخاب کیا گیا ہے تاکہ اس موضع میں پوری توجہ سے کام کرکے اس کو نمونہ کا موضع بنایا جاسکے۔ ہر ایسے منتخب موضع میں انجمن تنظیم دیہی کا قیام اتحادی اصول

پر عمل میں آچکا ہے ۔

۵ ۔ چونکہ ایک ضلع کے حالات دوسرے ضلع سے مختلف ہوتے ہیں بلکہ یہ کہنا بھی بیجا نہ ہوگا کہ ہر تعلقہ اور ہر موضع کے حالات دوسرے موضع سے جدا ہوتے ہیں اس لئے یہ مناسب سمجھا گیا کہ ہر موضع میں اس کی اپنی مخصوص ضروریات و مسائل کے لحاظ سے دیہی تنظیم کا پروگرام مرتب ہونا چاہئے ۔ مگر تجربہ یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ اگر کوئی پالیسی بنیادی مسائل کی حد تک ہی کیوں نہ ہو معین نہ کی جائے تو کام میں تسلسل اور استقلال باقی نہیں رہتا ۔ مثلاً ممکن ہے کہ کسی ایک سال انجمن تنظیم دیہی کے اراکین آبنوشی کے کنوئیں کھودنے پر اپنا روپیہ پیسہ اور محنت صرف کریں تو دوسرے سال مکانات کی صفائی اور روشندان بنانے پر یا تیسرے سال اسپورٹس پر ۔ اسی لئے یہ ضروری خیال کیا گیا کہ کم از کم ایسے بنیادی مسائل کی حد تک جو عام طور پر پائے جاتے ہیں کسی پالیسی کا معین ہونا ضروری ہے ۔ مرکزی مجلس تنظیم دیہی نے اس بات پر زور دیا ہے کہ معاشی ترقی کو دیگر مساعی اور سرگرمیوں پر ترجیح دینی چاہئے اور اس کے لئے مجالس اضلاع و تعلقات زرعی ترقی کو سب سے مقدم تصور کریں ۔ یہ بات بہت واضح کر دیگئی کہ ہر موضع کے مقامی حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد ایسا لائحہ عمل تیار کرنا چاہئے جس سے دیرپا نتائج حاصل ہوسکیں ۔ اس کام سے احتراز کیا جائے جس سے صرف عارضی اور دکھاوے کی چیزیں حاصل ہوں یہ بہت ہی اہم ہے کہ ہر دیہات کے رہنے والے پر ترقی یافتہ طریقہ کاشت کی اہمیت واضح کیجائے ۔ عمدہ مویشی رکھنے کے فوائد بتائے جائیں ۔ اتحادی اصول پر نکاسی پیداوار کی ترغیب دیجائے اور سب سے بڑھ کر کفایت شعاری اور اپنی آپ مدد کرنے کے زرین اصولوں پر کاربند کیا جائے ۔

۶ ۔ ابتک (۱۲۰) انجمنہائے تنظیم دیہی قائم ہوچکی ہیں جن کے اراکین کی تعداد (۱۲۶۲۶) ہے ۔ انھوں نے سنہ ۱۳۴۹ف میں (۱۱۹۴۰) روپیہ چندہ جمع کیا تھا ۔ جس میں سے

(۱۰۵۶۰) روپے مختلف دیہی اغراض پر صرف کیا۔

۷۔ (۱۲۰) انجمنہائے تنظیم دیہی میں سے (۹۲) مواضعات میں قرضہ کی انجمنیں قائم ہیں۔ اور اس بات کی کوشش کیجا رہی ہے کہ بقیہ مواضعات میں بھی قرضہ کی انجمنوں کا قیام عمل میں آجائے تاکہ ان مواضعات کے رہنے والوں کو کم شرح سود پر قرضہ اتحادی اصول پر مل سکے۔ ان قرضہ کی انجمنوں کا سرمایہ زیر استعمال تقریباً تین لاکھ روپے ہے۔ جس میں سے ان کا ذاتی سرمایہ ایک لاکھ [illegible] ہزار روپے ہے۔ اور یہ انجمنیں اب زیادہ سے زیادہ ساڑھے چھ فیصد شرح سود سے قرضہ [illegible] کر رہی ہیں۔

۸۔ ترقی یافتہ تخم علاوہ تخم پنبہ جس کی سفارش سررشتۂ زراعت نے کی تھی کوئی (۱۴۰۰) من ان (۱۲۰) منتخب مواضعات میں ۱۳۴۹ف میں تقسیم کیا گیا۔ کپاس کے اچھے بیجوں میں گورانی نمبر (۶) کو ضلع ناندیڑ میں کافی اہمیت حاصل ہے۔ انجمن نکاسی پیداوار ناندیڑ کے ذریعہ اس تخم کی اشاعت اتحادی اصول پر ہو رہی ہے۔ اس تخم سے کاشتکار کو جو فائدہ ہو رہا ہے وہ صرف اس بات کے ظاہر کرنے سے معلوم ہوگا کہ مقامی کپاس کی قیمت سے تقریباً (۲۰) روپے فی کھنڈی زیادہ قیمت گورانی (۶) کو ۱۳۴۹ف و ۱۳۵۰ف میں ملی۔

سررشتۂ انجمن ہائے امداد باہمی اور سررشتۂ زراعت باہم کوشاں ہیں کہ کاشتکاروں کو کھاد کے استعمال کی ترغیب دیں اور کھاد کے گڑھے کھدوا کر گاؤں کے تمام کچرے وغیرہ سے صحیح اصول پر کھاد تیار کرائیں۔ اب تک (۳۰۰۰) کھاد کے گڑھے ان منتخب مواضعات میں کھدوائے جا چکے ہیں ان کے علاوہ تقریباً ہر سال پانچ سو تھیلے مصنوعی کھاد کے بھی تقسیم کئے جاتے ہیں۔ اس قسم کا کھاد زیادہ تر ضلع نظام آباد کے منتخب مواضعات میں فروخت ہوتا ہے۔ جہاں شکر کی کاشت ہوتی ہے۔ گذشتہ دو سال میں آہنی آلات زرعی تقریباً چھ ہزار روپے کے انجمنہائے تنظیم دیہی نے خریدے جو ایسے اراکین کو جو خود ایسے آلات نہیں خرید سکتے نہایت معمولی شرح پر کرایہ پر دئے جاتے ہیں۔

۹۔ بہتر نسل کے مویشی حاصل کرنے کے لئے (۳۲) سانڈ سر رشتہ علاج حیوانات نے انجمن ہائے تنظیم دیہی کو مفت دئے۔ ہر سال بڑی تعداد میں خراب بیلوں کو آختہ کروایا جارہا ہے اور مختلف امراض سے بچنے کے لئے انجمنوں کی کوشش سے بڑی تعداد میں جانوروں کو مانع امراض ٹیکے دلوائے جارہے ہیں۔

۱۰۔ کاشتکار کو اپنی پیداوار کی پوری پوری قیمت حاصل کرنے کے لئے اس بات کی کوشش کیجارہی ہے کہ انجمنہائے نکاسی پیداوار کے ذریعہ اتحادی اصول پر خرید و فروخت کا انتظام کیا جائے۔ خرید و فروخت میں جو مختلف قسم کی بدعنوانیاں ہوتی تھیں وہ بڑی حد تک قانون مارکٹ کے نفاذ سے دور ہوچکی ہیں۔ اگر کاشتکار اپنی پیداوار انجمنہائے نکاسی پیداوار کے ذریعہ فروخت کریں تو توقع کیجاسکتی ہے کہ ان کو اپنے مال کی پوری قیمت حاصل کرنے میں دشواری نہ ہوگی۔ حکومت سرکار عالی نے ایسی انجمنوں کی امداد اور فروغ کی خاطر وعدہ فرمایا ہے کہ ابتدائی تین سال تک (۳۰) روپے ماہانہ محاسب کی تنخواہ خود ادا کریگی اور ہر ایسی نکاسی پیداوار کی انجمن کو (۵۰۰۰) تعمیر گودام کے لئے قرضہ دیا جائیگا۔ جس میں سے (۱۲۰۰) روپیہ بطور عطیہ متصور ہونگے۔ اسوقت تک (۹) انجمنہائے نکاسی پیداوار قائم ہوچکی ہیں جن کا سرمایہ زیر استعمال تقریباً سوا لاکھ روپے ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور اسکیم دیہی بنکوں کے قیام کی ہے جس پر تجربہ کیا جارہا ہے کہ ارکین دیہی بنک کو سیل سوسائٹی سے ملحق کردیا جائے۔ تاکہ دیہی بنک سے اپنی فصلی ضروریات کے لئے قرضہ حاصل کرنے کے بعد وہ لازماً اپنا مال متعلقہ سیل سوسائٹی کے توسط سے فروخت کریں۔

۱۱۔ کاشتکار کی آمدنی میں مختلف چھوٹی چھوٹی ضمنی صنعتوں سے اضافہ کرنے کی کوشش بھی بارآور ہورہی ہیں۔ ایک بات یہاں قابل ذکر ہے کہ صرف انہی صنعتوں کی ترغیب دیجانی مناسب ہے جو زراعت سے قریبی تعلق رکھتی ہیں ہر سال

ان منتخب مواضعات میں کاشتکار تقریباً تین ہزار روپیہ کا گھی فروخت کر رہے ہیں۔ اسی طرح مرغبانی سے کوئی سالانہ آٹھ ہزار روپیہ کی آمدنی ہوتی ہے۔ پھلوں کے درخت بھی زیادہ تعداد میں لگانے کی ترغیب دیجارہی ہے تاکہ اس سے بھی کچھ نہ کچھ آمدنی ہو یا کم از کم ان کے بال بچوں کے کھانے کے لئے کچھ پھل مل سکیں۔

۱۲۔ بہتر زراعت اور بہتر معاملت کے ساتھ ساتھ بہتر معاشرت کی سرگرمیاں بھی کسی طرح کم نہیں ہیں۔ آبنوشی کے انتظام کو بہتر کرنے کے لئے تقریباً تیس ہزار روپیہ گزشتہ دو سال میں صرف کئے گئے۔ کچھ نئے کنوئیں کھدوائے گئے یا پھر پرانی سیڑھیوں والی باولیوں پر چرخ لگا کر سیڑھیاں بند کی گئیں تاکہ پانی صاف رہے۔ سڑکیں درست کیجارہی ہیں جس پر نہ صرف لوکلفنڈ سے روپیہ صرف ہو رہا ہے بلکہ خود انجمنوں کے اراکین بھی حصہ لے رہے ہیں۔ خواہ وہ چندہ کی شکل میں ہو یا محنت مزدوری کی شکل میں۔ بچوں کو مانع چیچک ٹیکہ لگانے میں بڑی کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔ مکانات کو زیادہ ہوادار بنانے کی کوشش بھی جاری ہے۔

۱۳۔ ان منتخب مواضعات میں تعلیم کی طرف بھی کافی توجہ بڑھ گئی ہے۔ ہر سال ان مواضعات کے مدارس میں طلباء کا اضافہ ہو رہا ہے بچوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ تعلیم بالغان کی طرف بھی انجمنیں متوجہ ہیں اور اپنے مقدور بھر خرچ کر رہی ہیں۔ تعلیم بالغان میں اس بات کا کافی لحاظ رکھا جاتا ہے کہ پڑھنے لکھنے سے زیادہ اہم ایسی باتوں کا بتلانا ہے جس سے ان دیہات کے رہنے والوں کو اپنی روزمرہ کی زندگی میں مدد ملے۔ مثلاً بہتر طریقۂ زراعت کا بتلانا یا اتحادی اصول پر نکاسی پیداوار کے فوائد۔ یا یہ مالگزاری کی ادائی کے بعد یا انجمن کے مطالبات کی ادائی کے بعد کس طرح اپنی پاسبک میں تمام رقوم کا اندراج کرالینا چاہیئے۔ کفایت شعاری اور اتحادی اصول سے کیا فوائد حاصل ہوئے ہیں صفائی اور صحت کے عام اصول وغیرہ۔ انجمنہائے تنظیم دیہی

تعلیم بالغاں کیلئے اپنے فنڈ سے اساتذہ کو الونس دیتی ہیں! ور روشنی وغیرہ کے معمولی اخراجات بھی برداشت کرتی ہیں۔

۱۴۔ تقریباً ہر تعلقہ میں سال میں دو تین مقامات پر اتحادی میلے منائے جاتے ہیں۔ جہاں نمایش اطفال و اسپورٹس اور نمایش مویشی و آلات زرعی وغیرہ میں کافی انعامات دئے جاتے ہیں تاکہ تحریک تنظیم دیہی زیادہ سے زیادہ مقبول ہو۔ صدر جمعیتہ اتحاد امداد باہمی کی جانب سے ناشرین اضلاع میں متعین ہیں جو انجمنہائے تنظیم دیہی کے کاروبار پر نگرانی کرتے ہیں! ور تحریک کی اشاعت و تعلیم کا انتظام کرتے ہیں! دارۂ مذکور کی جانب سے ایک رسالہ گاؤں سدھار تمام ملکی زبانوں میں جاری ہے۔ جو اتحادی انجمنوں کو ہزاروں کی تعداد میں مفت تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس کی اشاعت میں مرکز تنظیم دیہی پٹنچرو کے انتظامات کے لئے حکومت سرکار عالی نے سالانہ پندرہ ہزار روپیہ کا عطیہ عنایت کیا ہے اور صدر جمعیتہ خود اپنے فنڈ سے (۳۰۰۰) روپیہ سے زیادہ رقم انھیں اغراض کے لئے دیتی ہے۔ طبی امداد کی غرض سے انجمنہائے تنظیم دیہی اپنے سرمایہ سے سالانہ کوئی ہزار ڈیڑھ ہزار روپیہ مختلف ادویہ پر صرف کر رہی ہیں۔ حال میں آپ نے اخباروں میں ملاحظہ کیا ہوگا کہ مرکزی مجلس تنظیم دیہی کی درخواست پر ہر ہائینس شہزادی صاحبہ برار نے دیہات کی دایاؤں کی ٹریننگ کے لئے چندہ کی اپیل فرمائی تھی۔ توقع ہے کہ شہزادی صاحبہ کی اس دلچسپی اور ہمدردی سے دیہات کی دایائیں سرکاری دواخانوں اور زچگی خانوں میں ٹریننگ پا سکیں گی۔

۱۵۔ جیسا کہ اس سے قبل بھی میں نے ذکر کیا ہے کہ تحریک تنظیم دیہی کے بنیادی اصول کفایت شعاری اور اپنی آپ مدد کرنا ہیں۔ اس مقصد کے پیش نظر ہر انجمن تنظیم دیہی کے ساتھ غلہ گودام کا قیام عمل میں آرہا ہے تاکہ غریب کاشتکار اپنی قلیل آمدنیوں سے کچھ نہ کچھ آئندہ کے لئے بچا سکیں۔ کاشتکار کے لئے بجائے نقد کے ہر سال تھوڑا بہت

غلہ محفوظ کرنا آسان ہے اسوقت تک ان (۱۲۰) مواضعات میں تقریباً (۱۰۰) غلہ گودام قائم ہو چکے ہیں ۔جن میں (۵۰۰۰) اراکین نے (۶۶۲۳۰) من غلہ گزشتہ تین سال میں جمع کیا ہے ۔اگر چار روپیہ فی من کے حساب سے اس غلہ کو نقد میں تبدیل کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان غریبوں نے کوئی (۲۶۵۰۰۰) روپیہ گزشتہ تین سال میں جمع کئے جس کا فی کس اوسط (۵) روپیہ ہوتا ہے ۔ان غلہ گوداموں کے ذریعہ عمدہ تخم کی تقسیم بھی ہو رہی ہے اور جو غلہ تخم کے لئے لیا جاتا ہے اس پر کوئی منافع نہیں لیا جاتا ۔توقع ہے کہ اس قسم کے گودام دیہی معاشیات میں کافی اہمیت اور کامیابی حاصل کرینگے ۔جیسے ہی ان منتخب مواضعات میں کاروبار تنظیم دیہی صحیح اصول کامیابی کے ساتھ چلنے لگیں ۔اس تحریک کو وسعت دی جائیگی اور دوسرے مواضعات میں کاروبار پھیلائے جا سکینگے ۔

غرض یہ کوشش اسی بلند مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جاری ہے کہ ہمارے دیہات کے رہنے والے بہتر زندگی بسر کر سکیں ۔انکی آمدنی میں اضافہ ہو ۔ان کا معیار زندگی بلند ہو اور ان میں وہ صحیح شعور پیدا ہو جس سے سارے ملک کے امن و چین اور خوشحالی میں اضافہ ہو سکے فقط

تنظیم دیہی کے بعض معاشی پہلو

از جناب مولوی برہان الدین حسین صاحب بی۔ اے۔ جی

سرکار عالی کی مسلمہ پالیسی کے تحت ممالک محروسہ کے تقریباً ہر تعلقہ کے دو ایک مواضعات میں تنظیم دیہی کا کام گزشتہ چند سال سے جاری ہے۔ یہ حقیقت اب واضح تر ہوتی جارہی ہے کہ مواضعات کی ہر جہتی معاشی ترقی کا پروگرام مرتب کرنے سے قبل ہمیں نہ صرف ملک کے مختلف اضلاع اور تعلقات بلکہ چند مواضعات کے مجموعہ کے لئے معاشی تحقیقات عمل میں لانی ضروری ہوگی۔ اس کے بغیر تو یہ ممکن ہے کہ ہم مجموعی طور پر ایک تعلقہ یا ایک موضع کی دولت میں اضافہ کرسکیں۔ مگر یہ قطعاً ناممکن ہے کہ ہر فرد رعایا کے لئے آسودہ حال معیار زندگی فراہم کیا جاسکے۔

گزشتہ ربع صدی سے ہندوستان کے تقریباً ہر صوبہ میں دیہات کی معاشی تحقیقات کا کام سرکاری اور غیر سرکاری طور پر انجام پاتا رہا ہے۔ ممالک محروسہ سرکار عالی میں بھی اضلاع کی معاشی تحقیقات کے لئے مسٹر اینگار کا تقرر بحیثیت اسپشل آفیسر عمل میں لایا گیا تھا۔ انھوں نے ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۰ء میں اضلاع نظام آباد، محبوب نگر، ورنگل، رائچور، ناندیڑ اور اورنگ آباد کے منتخب مواضعات کی معاشی پیمائش کا کام مکمل کیا اور اُن کے کام کے نتائج پانچ ضخیم جلدوں میں .... (اکنامک

انوسٹی گیشن ان حیدرآباد اسٹیٹ) کے نام سے منجانب سرکار عالی طبع اور شائع ہوئے۔ اس سے قبل نواب معشوق یار جنگ بہادر نے ضلع رائچور کے موضع تونگور کے معاشی تحقیق کے نتائج کو ایک کتابی صورت میں شائع فرمایا تھا۔ نیز جامعۂ عثمانیہ کے بعض طلباء معاشیات نے اس موضوع پر تحقیقی مضامین مجلہ عثمانیہ اور دیگر رسالوں میں شائع کرائے ہیں۔ چندروز پیشتر میں نے بھی جناب مولوی ظہیر احمد صاحب ایچ۔ سی۔ ایس اول تعلقدار ضلع رائچور کی توجہ سے جو مواد موضع اخلاص پور کے متعلق جمع ہوا تھا اسکی ترتیب کا کام انجام دیا ہے۔

اس مضمون کا یہ منشاء نہیں ہے کہ مواضعات کی اصلاح اور تعمیر جدید کا ایک لائحہ عمل آپ حضرات کے ملاحظہ کے لئے پیش کیا جائے۔ اسکی ترتیب کے لئے وسیع معلومات اور اعلیٰ درجہ کی قابلیت درکار ہے۔ اور میں ان دونوں سے محروم ہوں۔ البتہ اس فن پر جو تحقیقی مقالے لکھے گئے ہیں اُنکے مطالعہ اور ایک حد تک ذاتی مشاہدہ و تجربہ سے میں جن نتائج پر پہنچا ہوں اس کے پیش نظر تنظیم دیہی کے بعض معاشی پہلو پر نظر ڈالی جاتی ہے۔ ان پر غور کرنے سے یہ پتہ چل سکیگا کہ مواضعات کی مادی خوشحالی اور معیار زندگی کی بلندی کے لئے کن کن دشواریوں سے مقابلہ کرنا ہے۔ اور ان پر قابو پانے کے لئے حکومت اور رفاہ عام سے دلچسپی رکھنے والے اداروں کو کس طرح میدان عمل میں آنا ہوگا۔

ہمارے دیہات کی جو ناگفتہ بہ حالت ہے اُسکی تفصیلات کے بغیر صرف یہ کہنا کافی ہے کہ مواضعات کی چالیس فیصد سے زاید آبادی نیم برہنہ اور فقر و فاقہ کی حالت میں بسر کرتی ہے۔ جب یہ حالت ہو تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے دیہات اور دیہات میں رہنے والوں کی کس قسم کی معاشی خوشحالی ہمارے پیش نظر ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہندوستان کے کاشتکاروں اور مزدور پیشہ افراد کی مالی حالت بھی

اس درجہ ترقی کرجائے کہ وہ یورپ اور امریکہ کے معیار زندگی کو اختیار کرسکیں۔ کیا یہ
خواب کبھی شرمندۂ تعبیر ہوسکتا ہے کہ امریکہ کی طرح ہندوستان کے کاشتکاروں کے
پاس بھی سواری کے لئے موٹر کار اور رہنے کے لئے آراستہ مکان موجود ہوں۔ ہندوستان میں
آبادی کی کثرت۔ سرمایہ کی کمی۔ لوگوں کی طبیعت میں قنوطیت اور تعلیم کا فقدان یہ وہ
رکاوٹیں ہیں جو ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ یورپ اور امریکہ کے معیار زندگی کو لازماً نظر انداز
کردیا جائے۔ اس لحاظ سے مواضعات کی اصلاح اور تعمیر جدید کے لئے ہمارا مطمح نظر صرف
یہ ہونا چاہئے کہ خس پوش جھونپڑیوں کی بجائے پختہ یا نیم پختہ مکانات تعمیر کردئے جائیں۔
گنجان آبادی کو ہوادار بنایا جائے۔ آمد و رفت کے لئے راستے درست کردئے جائیں۔
پینے کے لئے پاک و صاف پانی میسر آئے۔ طبی امداد کا انتظام ہو۔ بچوں کو تعلیم دلائی جائے
اور تباہ حال اشخاص کے لئے بھی اقل معیار آسودگی پر زندگی بسر کرنے کے مواقع
فراہم ہوں۔

واضح ہو کہ اس معمولی نصب العین کی تکمیل بھی تاوقتیکہ ملک کے سرکاری و غیر سرکاری
تمام وسائل اسکی جانب متوجہ نہ ہوں مشکل نظر آتی ہے۔ اس کام کی وسعت کا اندازہ
اس سے ہوسکتا ہے کہ صرف ایک موضع میں مدنی آسائشیں یعنے راستوں اور نیم پختہ مکانوں
کی تعمیر، حفظان صحت کے انتظام۔ مدرسہ کی عمارت اور بازی گاہ اور ایک پبلک ہال
کی تعمیر کے لئے اوسطاً بارہ ہزار روپیہ کی ضرورت ہے۔ ملک سرکار عالی کے مواضعات کی جملہ
تعداد (۲۱۶۹۷) ہے۔ اس لحاظ سے ان تمام مواضعات کی بلدی اصلاح کے لئے
(۲۵) کروڑ (۳) لاکھ (۶۴) ہزار کا سرمایہ درکار ہوگا۔ اور اگر اسکی تکمیل کے لئے دہ سالہ
پروگرام ترتیب دیا جائے تو سالانہ (۲) کروڑ (۵۰) لاکھ سے زائد مصارف عائد ہونگے۔
یہ صرفہ خواہ رعایا بطور خود برداشت کرے یا خزانہ سرکاری سے رقم منظور ہو۔ بہر صورت
اندرون ملک ہی سے اسکی پابجائی کرنی ہوگی۔ یا بالفاظ دیگر ملک کی سالانہ آمدنی میں

اسقدر اضافہ کرنا ہوگا کہ سالانہ (۲) کروڑ (۵۰) لاکھ کے صرفہ کا بار آسانی کے ساتھ برداشت کیا جا سکے۔

اضلاع سرکار عالی کی معاشی تحقیقات کی تکمیل کے بغیر وثوق کے ساتھ تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ملک کی آبادی کا کس قدر حصہ ادنیٰ معیار آسودگی کے ساتھ بھی زندگی بسر کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ البتہ مضافات رائچور کے ایک موضع کی معاشی تحقیق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ (۱۵۴) خاندانوں کے منجملہ (۶۰) خاندان یا (۴۰) فیصد اس قدر محتاج ہیں کہ اقل معیار پر بھی زندگی بسر کرنا ان کے لئے دشوار ہے۔ حالانکہ جو اقل معیار اخراجات کا اندازہ میں نے قائم کیا تھا وہ (۵) افراد کے خاندان کے لئے جس میں میاں بیوی اور اور تین بچے شامل ہوں۔ کاشتکار خاندان کی صورت میں علاوہ ضروری اخراجات کاشت کے (۲۴ ـــہ) اور غیر کاشتکار خاندان کی حالت میں (۲۲۵ ـــہ) سالانہ سے زیادہ نہ تھا۔ مجھ کو ملک کی معاشی حالت کے مطالعہ کا جو تھوڑا بہت موقع حاصل ہوا ہے اس کے نظر کرتے یہ عرض کیا جا سکتا ہے کہ موضع اخلاص پور کی معاشی تصویر میں ملک سرکار عالی کے دیگر مواضعات کے خد و خال بھی نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اندرونی مواضعات کی حالت بہ نسبت اخلاص پور سے بھی گری ہوئی ہے۔ اور ہمارے ملک میں مجموعی طور پر دیہات کی (۵۵ تا ۶۰) فیصد آبادی اقل معیار آسودگی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی استطاعت نہیں رکھتی۔ یہ حالات کچھ ملک سرکار عالی سے ہی مختص نہیں ہیں بلکہ برطانوی صوبہ جات ہند کا بھی یہی نقشہ ہے۔ ڈاکٹر ہیرلڈ مان نے جو کچھ عرصہ تک سرکار عالی کے مشیر زراعت بھی رہ چکے ہیں سنہ ۱۹۱۷ء میں ضلع پونہ کے ایک موضع پیپلا سوداگر کی معاشی تحقیق عمل میں لائی تھی۔ اور اس تحقیقات کے نتائج کو (Land and Labour in a Deccan Village) کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع کیا تھا۔ اس موضع کے متعلق ڈاکٹر موصوف نے لکھا ہے کہ (۱۰۳)

خاندانوں کے منجملہ (۸) خاندان مرفع الحال ہیں۔ (۲۸) خاندان اقل معیار آسودگی کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں۔ مگر (۶۷) خاندانوں کی معاشی حالت ابتر ہے یعنی (۶۵) فیصد خاندان اقل سے کمترین زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

مسٹر کیشو آئنگار کے اندازہ کے بموجب زراعت پیشہ آبادی کا تناسب محبوب نگر میں (۶۰) فیصد نظام آباد۔ رائچور اور ورنگل میں (۸۰) فیصد۔ ناندیڑ اور اورنگ آباد میں (۷۶) فیصد کے قریب ہے مسٹر غلام محمد بی۔ اے عثمانیہ نے موضع چوسالہ ضلع بیڑ میں زراعت پیشہ کا تناسب (۶۶) فیصد قرار دیا ہے اور موضع اخلاص پور میں جو شہر رائچور سے دو ڈھائی میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ زراعت پیشہ آبادی کا تناسب صرف (۵۲) فیصد ہے۔ لہذا بحیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اضلاع سرکار عالی کی (۷۰) فیصد آبادی کی گزر بسر زراعت پر ہے اور بقیہ (۳۰) فیصد آبادی دیگر ذرائع سے اپنی روزی پیدا کرتی ہے۔ ملک کی ہر جہتی معاشی ترقی کے پروگرام میں ہمیں اس لحاظ سے کہ دو تہائی آبادی کے وسائل معاش زراعت سے وابستہ ہیں اور انسان کی اولین ضروریات یعنی خوراک اور لباس کی پابجائی اسی سے ہوتی ہے۔ سب سے اول زراعتی اصلاح کے لئے ہی کوشش کرنی ہوگی۔ اور ہمارا دائرہ عمل اسی نقطہ سے آغاز ہونا چاہئے۔ بعض وہ بڑی دشواریاں جنکی وجہ سے ملک کی زراعت پیشہ آبادی کی کمرِ ہمت ٹوٹ چکی ہے۔ اُنکی تفصیل یہ ہے کہ اول تو (۶۰) فیصد کاشتکار قرض میں زیربار ہیں۔ اور اسکی مقدار سرکاری اندازہ کے بموجب (۴۰) کروڑ روپیہ سے کم نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ ملک سرکار عالی میں اوسط اراضی خشکی فی کس (۲۱) ایکر برآمد ہونے کے باوجود تقریباً دو تہائی تعداد کاشتکاروں کی ایسی ہے جن کے قبضہ میں اوسط سے کم زمین موجود ہے۔ اس کے علاوہ ایک افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ کاشت کے لئے موجودہ مویشی نہ صرف غیر مکتفی بلکہ ایک حد تک ناکارہ ہیں بعض کاشتکاروں کے پاس تو زراعتی جانور

ضرورت سے کم ہیں۔ اور بعض کی یہ حالت ہے کہ جانور ہی موجود نہیں ہیں۔ آلات زرعی کا بھی تقریباً یہی حال ہے۔ اور یہ دیکھا گیا ہے کہ بجز بعض مرہٹواڑہ کے اضلاع کے جدید آہنی آلات تو کجا خود مقامی آلات کشاورزی اور تخم ریزی کی بھی کمی ہے۔ اور کرایہ یا مانگے کے آلات سے بڑی حد تک کام چلایا جاتا ہے تقریباً (۷۵) فیصد کاشتکاروں کے پاس بنڈیاں بھی موجود نہیں ہیں۔

نتیجہ اس تفصیل کا یہ ہے کہ اصلاح زراعت کا کام واقعی اتنا سہل نہیں ہے جیسا کہ بادی النظر میں سمجھا جا سکتا ہے۔ دراصل منزل پر منزل طے کئے بغیر اس نصب العین کی تکمیل مشکل نظر آتی ہے۔ مگر یہ کام ناممکن نہیں ہے! اور ملک کی آئندہ فلاح و بہبودی کے لئے یہ کام جب ہمیں کرنا ہی ہے تو ہمیں اپنی مسافت جلد طے کرنے کا عزم کر لینا چاہئے۔

کاشتکاروں کو قرضہ سے نجات دلانے کے لئے قانون مصالحت قرضہ جات کا نفاذ نہایت مستحسن سمجھا جا رہا ہے۔ اور یہ امر متوقع ہے کہ اس سے کاشتکاروں کو قرضہ جات کے تصفیہ میں بہت بڑی مدد ملیگی۔ ڈاکٹر میاں کے بقول اگر کاشتکاروں کے سارے قرضہ بے باق کر دئے جائیں تو پھر بھی ملک کے (۵۰) فیصد کاشتکار علی حالیہ اقل معیار آسودگی سے کمتر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہونگے۔ اس بناء پر کاشتکاروں کی معاشی اصلاح ہی انکو قرضہ کے بار سے سبکدوش کرنے کی بہترین ضمانت ہے۔ بعض ضروریات کی تکمیل کے لئے کاشتکاروں کا قرضہ حاصل کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ مگر فصل تیار ہونے پر اگر اس قدر پیداوار حاصل ہو کہ اسکی آمدنی سے قرضہ کی رقم بھی بے باق کر دیجا سکے یا سالانہ اقساط ادا ہو سکیں تو پریشانی کا باعث نہیں ہے! اسی طرح کاشتکاروں کے قدیم قرضہ جات کا بھی آسانی کے ساتھ تصفیہ ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ اُنکی آمدنی کا معیار بلند کر دیا جائے اس ایک سبب سے بھی کاشتکاروں کے ذرائع آمدنی کا بڑھایا جانا ملک کی اولین

ضرورت ہے۔

اکنامک ہولڈنگ یا زیر کاشت اراضی کا اسقدر رقبہ جسکی بدولت (۵) افراد کے ایک خاندان کی معمولی آسودگی کے ساتھ پرورش ہو سکے ابھی زیر بحث مسئلہ سمجھا جاتا ہے مسٹر ایگنگار نے ملک کار علاقے میں (۱۵) ایکڑ کے خشکی کے رقبہ کو اکنامک ہولڈنگ قرار دینا مناسب سمجھا ہے۔ ڈاکٹر میاں کے خیال میں (۲۰ تا ۲۵) ایکڑ کی خشکی اراضی اضلاع دکن علاقہ بمبئی میں اکنامک ہولڈنگ قرار دیجا سکتی ہے۔ میری یہ رائے ہے کہ (۱۵ تا ۳۰) ایکڑ کی متوسط درجہ کی اراضی (۵) افراد کے خاندان کیلئے بشرطیکہ وہ خود محنت کرے اور ذاتی لوازمات کاشت (جانور اور آلات) موجود ہوں اقل معیار آسودگی پر بسر کرنیکے لئے کافی ہو سکتی ہے۔ مگر یہ حقیقت نظر انداز کرنیکے قابل نہیں ہے کہ بعض خاندان جنکے قبضہ میں چالیس پچاس ایکڑ سے زیادہ زمین ہے اور افراد خاندان بھی (۶ یا ۷) سے زیادہ نہیں ہیں نہایت تنگدستی سے بسر کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ایسی مثالیں بھی دیکھنے میں آتی ہیں کہ بعض خاندان جنکے قبضہ میں زیر کاشت اراضی (۱۵) ایکڑ سے بھی کم ہے معاشی نقطہ نگاہ سے بہتر حالت میں ہیں۔ مزید وضاحت کیلئے میں دو تین مثالیں موضع اخلاص پور کی آپ کے ملاحظہ کیلئے پیش کرونگا۔ اس موضع میں ایک کولی خاندان آباد ہے۔ افراد خاندان (۷) ہیں اور (۵۵) ایکڑ ۱ گنٹہ اراضی قبضہ میں ہے اور زیر کاشت ہے۔ قرضہ کا بار صرف (۳۰۰) ہے ۱۳۴۹ف تا ۱۳۵۰ف کے دوران میں اس نے کپاس و جوار کی کاشت کی تھی۔ کڑبی اور زر مالگزاری کے قطع نظر صرف (۲۱۱) کی مالیتی پیداوار حاصل ہوئی (یعنے فی ایکڑ ۳ ۱۲) زراعتی جانوروں میں نر گاؤان کی ایک جوڑی موجود ہے اور زرعی آلات کی کل کائنات صرف ایک چوبی ناگر ہے۔ اس سے یہ قیاس قائم کیا جا سکتا ہے کہ اس اراضی میں کس پایہ کی زراعت ہوتی ہوگی۔ نتیجہ یہ ہے کہ حقیقی ضروریات کی تکمیل کیلئے بھی اس خاندان کو مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور تباہ حالی سے گذر رہی ہوتی ہے۔ اسکے بالعکس اسی موضع میں ایک (۶) افراد کا گولر خاندان بھی رہتا ہے۔ اراضی خشکی موازی (۱۰) ایکڑ (۲۴) گنٹہ پر کاشت کی جاتی ہے۔ ایک جوڑ نر گاؤان کے لئے علاوہ ایک گائے ہے اور

بھینس بھی موجود ہے۔ زراعت سے علاوہ کرایٔی اور زر مالگزاری کے (۱۸ عہ ۲) یعنے فی یکر (۵ عہ ۲۵) اور گھی اور دودھ کی تجارت سے (۲۰ عہ ۸) اس طرح (۳۱۸ عہ ۴) کی سال ۱۳۲۹ف تا ۱۳۲۵ف میں آمدنی ہوئی۔ آمد و خرچ اگرچہ برابر ہے۔ مگر آسودہ حالی سے بسر ہوتی ہے! اور ایک کوئی خاندان جس میں (۵) افراد شامل ہیں۔ (۱۳ ایکر ۲۵ گنٹہ) اراضی پر کاشت کرتا ہے ایک بیل موجود ہے مگر دوسرے کاشتکار کے ساتھ ساجھا کر لیا جاتا ہے۔ آمدنی علاوہ زر مالگزاری اور کرایٔی کے (۱۶۲ عہ ۷) یا (۱۲ عہ ۸) فی یکر رہی۔ مزدوری سے بھی اس سال (۲۰ عہ ۸) کی آمدنی ہوئی۔ اسکے باوجود اقل معیار کے ساتھ اس خاندان کی گزر اوقات مشکل ہوگئی ہے حالانکہ طریقۂ کاشت قابل اعتراض نہیں ہے۔ ان تمثیلی واقعات پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ

(۱) رقبۂ زیر کاشت کے مقررہ معیار سے زیادہ ہونے پر بھی تا وقتیکہ بہتر کاشت کیلئے ذرائع عمل آوری موجود نہ ہوں اور فصل کی اچھی طرح دیکھ بھال نہ کیجائے معاشی خوشحالی پیدا نہیں ہوسکتی۔

(۲) ارضیات زیر کاشت کا رقبہ اگر معیار سے کم ہو تو اقل درجہ کی آسودگی کا قائم رکھنا باوجود دیکہ طریقۂ کاشت میں کوئی نقص نہ ہو۔ دشوار ہوجاتا ہے۔

(۳) کمتر رقبہ کی اراضیات سے بھی بعض خاص حالات میں جیسے خشکی اراضی پر باغات کی کاشت کے وسائل مہیا کرنا۔ یا دقیق کاشت کا بندوبست کرنا یا دیگر ذرائع آمدنی کا فراہم کرنا ہر صورت میں فارغ البالی کے ساتھ زندگی بسر کیجا سکتی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان اور اسی طرح ملک سرکار عالی میں جو ذرائع آمدنی فراہم ہیں انمیں معاشی توازن موجود نہیں ہے! اور یہی سبب ہے کہ ملک کی نصف سے زائد آبادی عسرت اور تنگدستی سے بسر کرتی ہے تاہم خوش قسمتی سے ملک سرکار عالی میں زراعت پیشہ آبادی کی ابھی وہ کثرت نہیں ہے۔ جیسے بعض صوبہ جات ہند میں پائی جاتی

ہے۔ زیر کاشت رقبہ کو مساوی طور پر تقسیم کرنے سے ہر کاشتکار خاندان کیلئے (۲۱) ایکڑ
خشکی زمین فراہم ہوسکتی ہے۔ اس کے علاوہ بعض اضلاع میں افتادہ زمینات کو بھی قابل
کاشت بنایا جاسکتا ہے۔ ذرائع آبپاشی کی بدولت دقیق کاشت کے ذرائع بھی موجود ہیں یا
بالفاظ دیگر ملک سرکار عالی میں (۷۰) فیصد آبادی کیلئے پیشہ زراعت سے کم از کم اقل ترین
معیار آسودگی فراہم کرنا ناممکن نہیں ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ جن کاشتکاروں کے پاس
زمینات تو زیادہ ہیں مگر ذرائع کاشت موجود نہیں ہیں اور اس وجہ سے زراعت کی حالت
ادنیٰ درجہ کی ہے وہ خود صرف اسقدر اراضی پر کاشت کریں جس کا وہ بخوبی انتظام
کرسکتے ہوں اور تتمہ اراضی کو منافعہ پر اُن کاشتکاروں کے حوالہ کریں جن کے پاس
کافی زمینات موجود نہیں ہیں۔ اس طرح اگر ایک طرف بعض کاشتکاروں کی نااہلی کی وجہ
معاشی اسراف کا سدباب ہوجائیگا وہاں ایسے کاشتکاروں کے لئے جو اراضی کی قلت
کی وجہ آسودہ حالی سے بسر نہیں کرسکتے فارغ البالی کے اسباب فراہم ہوسکیں گے۔ اوپر جو
مثالیں دی گئی ہیں اُن پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کاشتکار نمبر (۱) کے پاس
(۵۵) ایکڑ اراضی موجود ہے مگر آمدنی (۱۳) فی ایکڑ سے زیادہ نہیں اگر کسی طرح یہ ممکن
ہوجائے کہ وہ صرف (۳۵) ایکڑ اراضی پر خود کاشت کرے اور بقیہ (۲۰) ایکڑ اراضی قول پر
کاشتکاران نمبر ۲ و ۳ کے حوالہ کردے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ان دونوں کاشتکاروں کے پاس
بھی کافی اراضی زیر کاشت ہوگی اور خود کاشتکار اول کے پاس اسقدر زمین موجود
رہیگی کہ اگر وہ ذرا توجہ کرے تو موجودہ پیداوار سے زائد پیداوار حاصل کرنے کے علاوہ
(۲۰) ایکڑ اراضی کے قول پر اٹھا دینے سے کم از کم (مائو) سالانہ کی آمدنی اور ہوسکیگی اور
یہ کاشتکار خاندان نہ صرف ادنیٰ معیار پر بلکہ فارغ البالی سے بسر کرسکیگا۔ اس ایک
سبب سے بھی بڑی حد تک ملک کے کاشتکاروں میں معاشی خوشحالی پیدا کیجاسکتی ہے۔
جن کاشتکاروں کے پاس کافی سے زیادہ زمینات موجود ہیں اور بہتر طریقہ پر کاشت

کیجاتی ہے انکی زمینات انھیں کے قبضہ میں رہنی چاہیئے ۔ تاکہ انکی آسودگی اور فارغ البالی سے ملک کی عام دولت و ثروت میں اضافہ ہوتا رہے ۔

ذرائع آب کے فراہم کرنے اور باغات یا تری کی کاشت میں توسیع دینے سے بھی ملک کے بہت سارے مواضعات میں خوشحالی پیدا کیجاسکتی ہے ۔ جہاں زیرزمین پانی کے دستیاب ہونے میں دشواری نہ ہو وہاں معمولی سرمایہ کے مہیا کرنے سے باولیاں کھدوائی جاسکتی ہیں ۔ اسی طرح تالابوں اور کنٹوں کی مرمت اور تعمیر سے بھی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے ۔ مگر ہر صورت میں یہ دیکھ لینا چاہیئے کہ فلاں علاقہ کے لئے تری یا باغات کی کاشت سودمند ہوسکتی ہے یا نہیں ۔ اگر یہ طریقہ سودمند بھی ہو تو اول اسکی جانچ کرلینی چاہیئے کہ کاشتکاروں میں خشکی کاشت کی بجائے باغات اور تری کی کاشت کی اہلیت موجود ہے یا نہیں ۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ وسیع پیمانہ پر ذرائع آبپاشی قائم کئے بغیر بھی صرف باولیات کی تیاری یا موجودہ منہدم باولیوں کی مرمت اور چھوٹے چھوٹے دیگر ذرائع آبپاشی کے قائم کرنے سے بھی کاشتکاروں کی موجودہ گری ہوئی حالت کی اصلاح اور ذرائع آمدنی میں اضافہ کیا جاسکتا ہے ۔

کاشتکاروں کی معاشی حالت کے سدھارنے کا ایک اور ذریعہ لوازمات کاشت Equipment کا مناسب تعداد میں فراہم کرنا ہے ۔ ڈاکٹر ٹیلر کے بقول ممالک متحدہ امریکہ میں اوسطاً ہر ایک بگہ اراضی زیر کاشت کیلئے (۸) ڈالر یا اندازاً مبلغ (۲۵ روپے) کے آلات اور مویشی موجود ہیں ۔ ملک سرکار عالی میں کاشتکاروں کے آلات اور مویشی کی مالیت کا ایک عمومی اندازہ (ایک روپیہ) فی بگہ سے زیادہ نہیں ہے ۔ حالانکہ (۲۵) بگہ کسی اراضی کے لئے [illegible] درجہ کے تنگا وان کی ایک جوڑ ۔ ایک بنڈی اور دیسی آلات جیسے ناگر ۔ بکھر وغیرہ لازمی ہیں اسطرح (۲۵) بگہ اراضی کیلئے بعض سودمند جدید آلات ، جیسے آہنی ناگر کلٹیویٹر وغیرہ کو نظر انداز کرنے پر بھی کم از کم دو سو روپے کی مالیت کے مویشی اور مقامی آلات کی ضرورت ہے

اسطرح ان لوازمات زراعت کی فراہمی کیلئے اوسطاً (عہ۸) فی یکر کا مزید صرفہ ناگزیر ہے گویا مجموعی طور پر بحساب فی موضع (۵۰۰) (۲۱۶۹۷) مواضعات کیلئے (۳ کروڑ ۲۵ لاکھ) کا سرمایہ فراہم کرنا ہے۔ جسکے بغیر اصلاح زراعت کا کام ادھورا رہ جائیگا اگر ایک پنجسالہ پروگرام کے تحت اسکی پابجائی کیجائے تو سالانہ (۶۵) لاکھ کے صرفہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے بہر طور ملک کے کاشتکاروں کی اصلاح کیلئے جو معاشی پروگرام ترتیب دیا جائے اُسمیں اس سرمایہ کی فراہمی بھی اولین درجہ رکھتی ہے۔ کیونکہ عاملین پیدائش یعنے زمین مختلف محنت اور لوازمات کاشت میں جبتک توازن نہ موجود ہو زراعت پیشہ افراد کی معاشی اصلاح نہایت دشوار ہے۔ ہمارے ملک میں محنت کی کمی نہیں ہے۔ ضرورت اسکی ہے کہ جملہ کاشتکاروں کیلئے اکنامک ہولڈنگ اور مکمل طور پر لوازمات کاشت فراہم کردئے جائیں اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے کاشتکار صدہا سال کے تجربہ کی بناء پر فن کاشتکاری سے بخوبی واقف ہیں۔ یہ علحدہ بات ہے کہ بعض دفعہ سرمایہ کی کمی یا کبھی اپنی سستی اور کاہلی سے جو کچھ وہ خود جانتے ہیں اُس پر عمل نہیں کرتے ضرورت ہے کہ اُن کا بھلایا ہوا سبق پھر انھیں یاد دلایا جائے۔ نیز کام ہمارا ہے کہ سائنس کی ترقی کی وجہ سے جو جدید اور موثر طریقے انسان کے علم میں آئے ہیں اُس سے کاشتکاروں کو بھی مستفید ہونیکا موقع دیا جائے۔ صرف ترقی یافتہ تخم کی اشاعت اور امراض فصول کی انسدادی تدابیر کی تبلیغ سے ہی بیش بہا نتائج حاصل ہوسکتے ہیں۔

اگر یہ حالت پیدا ہوجائے تو توقع ہے کہ ملک کی (۷۰) فیصد آبادی پیشۂ زراعت کی بدولت آسودہ حال زندگی بسر کرسکتی ہے۔ اگر ان تدابیر کے اختیار کرنیکے باوجود ہماری ساری زراعت پیشہ آبادی کیلئے معاشی خوشحالی پیدا نہ ہوسکے تو ساتھ ہی ساتھ دیگر ذرایع آمدنی کی طرف توجہ کرنی مناسب ہوگی اور معمولی سرمایہ فراہم ہوسکے تو ہر غیر فارغ البال خاندان۔ دودھ اور گھی کی تجارت سے بھیڑ بکری کی پرورش سے یا فرصت کے اوقات میں بعض آسان گھریلو صنعتوں کے اختیار کرنے سے اپنی آمدنی میں کافی اضافہ کرسکتا ہے۔

کاشتکاروں کی معاشی حالت کی اصلاح اور درستی کے ساتھ دیہات کی تتمہ (۳۰) فیصد
آبادی کی طرف بھی یہی توجہ کرنی ہے۔ بجز زراعت پیشہ آبادی کی اس تعداد میں مشہ آنکار کے
اندازہ کے بموجب اوسطاً (۲۲) فیصد مزدور پیشہ افراد ہیں۔ اور وثوق کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ
اندرونی مواضعات میں انکی حالت بہت گری ہوئی ہے۔ اور باوجود کوشش اور تردد کے ان کو روزگار
ملنا دشوار ہوتا ہے۔ میرا یہ خیال ہے کہ بحالت موجودہ اچھوت اقوام کے مقابل و پچھڑی ذات
کے ہندو اور مسلمان جو مزدور پیشہ ہیں انہی کی حالت زیادہ سقیم پائی جاتی ہے۔ (۷۰) فیصد زراعت
پیشہ کی خوشحالی کے پیدا ہونے سے اگرچہ مزدوروں کی مانگ بھی بڑھ جائیگی تاہم مزدور پیشہ کی
ایک ثلث آبادی کی کھپت کیلئے بھی ایک موثر لائحہ عمل تیار کرنا لازمی ہے۔ دستی پارچہ بافی
اور دیگر خاص قسم کی گھریلو صنعتوں کی ترویج اور تعمیرات عامہ کے آغاز کرنے سے انکے لئے ذرائع
معاش پیدا کئے جاسکتے ہیں۔ یا ملک میں بڑے پیمانہ پر کارخانے قائم کئے جاکر انکی بے روزگاری
کا ازالہ کیا جاسکتا ہے۔

زراعت پیشہ اور مزدور پیشہ کے علاوہ دیہات کی تقریباً (۸) فیصد آبادی صنعت و
تجارت، ملازمت اور دیگر ذرائع سے اپنی معاش حاصل کرتی ہے۔ مزدور پیشہ اور بعض مواضع
میں کاشتکاروں کے مقابل اگرچہ انکی معاشی حالت نسبتاً اچھی ہے مگر آسودہ حال و فارغ البال
لوگ کم ہیں۔ اور صنعت پیشہ افراد خصوصاً پارچہ بافوں کی حالت عموماً ادنیٰ معیار سے گری
ہوئی ہے۔ بڑے پیمانہ پر پارچہ سازی کے کارخانوں کے قائم ہوجانیکے باوجود دستی پارچہ سازی
کی صنعت ہندوستان میں ہنوز قائم اور زندہ ہے۔ اگر خاص قسم کی پارچہ سازی اور پارچہ سازوں
کی تنظیم کیجانب توجہ کیجائے تو آسانی کے ساتھ انکی معاشی حالت کو بھی سنوارا جاسکتا ہے۔
اسکے علاوہ زراعت پیشہ اور مزدور پیشہ کی معاشی اصلاح سے جو نتائج مرتب ہونگے اور صنعت و
تجارت کو جو فروغ حاصل ہوگا اسکی بدولت مواضعات کی تتمہ (۸) فیصد آبادی بھی معاشی
فوائد حاصل کرسکتی ہے۔

اس نمائش کے افتتاح کے موقع پر جناب صدر نے اپنے سپاسنامہ میں اس امر کا اظہار فرمایا تھا کہ اسوقت دنیا میں معاشی سوال وقت کا سب سے بڑا سوال بنگیا ہے۔ اور موجودہ جنگ کی ہولناک حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ زبردست اور منظم اقوام کمزور اور غیر منظم قوموں کو اقتصادی اور معاشی محکومیت میں رکھنا چاہتی ہیں۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس ہیبت انگیز اور عالمگیر جنگ کے شعلے آج چوطرف بھڑک رہے ہیں اور دنیا کی ہر چھوٹی بڑی سلطنت اسکی زد میں ہے تاہم حق اور صداقت کی فتح بہر طور لازمی ہے مگر یہ صاف دکھائی دیرہا ہے کہ اس جنگ عظیم کے اثرات بھی بڑے ہی انقلاب انگیز ہونگے اور ہندوستان بھی اسکی زد سے محفوظ نہ رہیگا اسلئے ضرورت ہے کہ ملک کی ہر جہتی معاشی ترقی کا ایک قابل عمل اسکیم ابھی سے تیار کر لیا جائے کہ بعد از اختتام جنگ ہم اپنی پوری قوت کے ساتھ اس پر عمل پیرا ہوسکیں۔ گزشتہ معاشی کانفرنس کے صدر مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب کا یہ ارشاد بالکل درست ہے کہ موجودہ زمانہ میں حکومت کا اثر افراد کی زندگی کے ہر شعبہ پر روز بروز گہرا ہوتا جا رہا ہے عدم مداخلت کا قدیم مسلک اب فرسودہ ہو چکا ہے۔ سوسائٹی کی زندگی کا کوئی شعبہ اب ترقی نہیں کر سکتا جبتک کہ اسمیں حکومت کا ہاتھ نہ ہو۔ مگر یہ واضح رہے کہ ملک کی ہر جہتی معاشی ترقی کے نصب العین کی ساری تکمیل خود حکومت کے بھی بس کی بات نہیں ہے۔ ملک کے رفاہ عام کے کام انجام دینے والے غیر سرکاری اداروں کو بھی تعاون عمل کیلئے تیار رہنا ہوگا اور ضرورت ہے کہ ممالک محروسہ کے با اثر اور متمول اشخاص "خوار دیدن خویش را از خواری ابنائے جنس" کے اصول پر عمل کریں۔ مگر اس سے بھی اہم ترین مسئلہ خود افراد رعایا میں اپنی حالت آپ سدھارنے اور معاشی خوشحالی میں اضافہ کرنے کے صحیح جذبات کا پیدا ہونا ہے۔ معلمین اخلاق اور مذہب کیلئے بھی کام کرنیکا وسیع میدان موجود ہے۔ ترک مسکرات ہی کے پرچار سے دیہی آبادی خصوصاً مزدور پیشہ طبقہ کی معاشی حالت کے سدھارنے میں حیرت انگیز کام انجام دیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اخراجات شادی کے کم کرانیکی کوشش کیجائے تو نہایت ہی بہتر اثرات مترتب ہوسکتے ہیں۔ اور آیندہ کیلئے توفیق حاصل کرنے کی ایک بڑی مد کو حذف کیا جا سکتا ہے۔

میں نے اس مضمون میں یہ عرض کیا ہے کہ ملک سرکار عالی کے دیہات میں مدنی آسائشیں فراہم کرنیکے لئے کم از کم (۲۵) کروڑ روپئے کے سرمایہ کی ضرورت ہے۔ آلات اور مویشی کی خریدی کے لئے سوا تین کروڑ کے اخراجات ناگزیر معلوم ہوتے ہیں۔ ذرایع آبپاشی کی فراہمی کے لئے بھی ایک خطیر رقم کی ضرورت ہے۔ طبی امداد اور تعلیم کے لئے بھی کثیر متوالی اخراجات برداشت کرنے ہونگے۔ اگر یہ سوال بھی تو پایا جاتا ہے کہ اگر پانچ یا دس سال کی مدت اس پروگرام کی تکمیل کیلئے مقرر کیجائے تو پھر بھی کئی کروڑ سالانہ کے اخراجات کس طرح برداشت کئے جاسکتے ہیں۔ اس سوال کا حل درحقیقت ایک کٹھن معاملہ ہے۔ اور ملک کے ارباب اقتدار اور ماہرین معاشیات ہی اس گتھی کو سلجھا سکتے ہیں مگر اس مضمون کو ختم کرنے سے قبل میں ایک خیال آپ کے غور و فکر کے لئے چھوڑتا ہوں مدنی آسائشیں جیسے سڑکوں اور مکانات کی تعمیر و ترمیم۔ باؤلیوں کی کھدوائی نالوں اور بدرو کی تیاری۔ بازی گاہوں کا قیام یہ چیزیں ایسی ہیں جنکی تیاری کا مال مسالہ بڑی حدتک خود مواضعات میں قدرتی طور پر دستیاب ہوتا ہے انکی تعمیر کیلئے نہ بڑے ماہرین فن کی ضرورت اور نہ خاص قسم کے کاریگر درکار ہیں۔ بلکہ خود مواضعات کے رہنے والے انکی [illegible] بھی کرسکتے ہیں۔ ہمارے کاشتکار جو خشکی اراضی پر کاشت کرتے ہیں سال میں دو مہینے تقریباً بیکار رہتے ہیں بعض متمدن ممالک کی رعایا کی طرح جنکو جبری طور پر سال میں چند مہینے فوجی تعلیم حاصل کرنا لازمی ہوتا ہے اسی طرح مواضعات کی اصلاح اور درستی کے لئے ہمارے زراعت پیشہ اور دیگر افراد سال میں کچھ دنوں کیلئے اپنی خدمات مفت پیش کریں تو امداد باہمی کے اصول پر رفتہ رفتہ مواضعات بھی درست ہوسکتے ہیں۔ مواضعات میں سڑکیں بھی تیار ہوسکتی ہیں حفظان صحت کا بھی انتظام کیا جاسکتا ہے اور بڑی حدتک سرمایہ کی فراہمی کا سوال خود بخود حل ہوجاتا ہے۔ صرف شوق اور ہمت کی ضرورت ہے۔

کونکی کے ذریعہ کھیت کے کونوں کی مٹی نرم اور کھوکلی کیجاتی ہے۔ کھرپی سے اُن جنگلی پودوں کو نکالدیا جاتا ہے جو تمباکو اور مرچ کے کھیتوں میں اُگ آتے ہیں۔ اسی طرح دیگر آلات بھی مختلف کاموں میں استعمال کئے جاتے ہیں۔[۱]

یہاں تک تو ہم نے اقسام آلات کا حال تبلایا۔ اب ہم متذکرہ آلات کی تعداد دریافت کرینگے۔[۲]

اقسام آلات	تعداد	اقسام آلات	تعداد
ناگر (ہل) بڑے اور چھوٹے	۳۹۴	درانتیاں	۴۶۳
بکھر	۱۰۳	سبل	۶۵
دورسے بڑے اور چھوٹے	۱۲۱	پھاوڑے	۱۵۱
دانریاں	۱۲۴	کھرپیاں	۶۳
دوشیا	۱۰	کونکیاں	۳۵۴
پتھن	۶۷	کلہاڑیاں	۲۱۵
بنڈیاں (چھکڑے)	۲۶	تپائیاں	۳۶
کولہو	۴	سوپ وچھبیاں	۳۹۹

بحیثیت مجموعی جملہ دیہات میں ہل، بکھر، دورسے اور دانریوں کی تعداد زیادہ ہے۔ کیونکہ جملہ رقبۂ مزروعہ مختلف غیر معاشی اراضیات میں منقسم ہے۔ زمین خواہ معاشی ہو یا غیر معاشی ہر اس شخص کو جو زراعت

۱۵۔ آلات شماری بذات خود کی گئی ہے۔

کرتا ہے ہل ۔ بکھر ۔ دورا اور دواتری رکھنا پڑتا ہے ۔ اس طرح بلحاظ مجموعی ان آلات کی تعداد بہت بڑھ جاتی ہے

ووشیا تعداد میں اسقدر کم اس لئے ہیں کہ زیر بحث موضع میں ماہوری جوار بہت کم بوئی جاتی ہے

موضع ہذا کی مزروعہ خشک زمینات کا لحاظ کرتے ہوئے تھنوں کی یہ تعداد بھی زیادہ ہے جہاں تک کہ بنڈیوں کا

تعلق ہے ان کی تعداد بہت ہی کم ہے ۔ وجہ یہ ہے کہ دیگر دیسی آلات کے مقابل بنڈی بہت قیمتی ہوتی ہے جن کو

ہر کسان آسانی کے ساتھ نہیں خرید سکتا ۔ حالانکہ ہر کسان کے ہاں بنڈی کا رہنا ضروری ہے

کیونکہ اس کے ذریعہ مکان سے کھیتوں تک کھاد لیجانے ۔ کھیت سے پیداوار مکان لانے اور پھر اس کو منڈی لیجانے

میں غیر معمولی مدد ملتی ہے ۔ یہاں کے اکثر کسان اپنا غلہ تجارتی نوبرس لئے بھی فروخت کر دیتے ہیں کہ ان کے ہاں ذاتی

بنڈی نہیں ہوتی ۔

یہ سوال ہو سکتا ہے کہ کولہو کی طرح بنڈی بھی مشترکہ طور پر کیوں نہیں خریدی جاتی ۔ سوال بالکل معقول

ہے ۔ کسانوں کو مشترکہ طور پر بنڈیاں خریدنا چاہیئے لیکن اس طرف وہ بہت کم توجہ کرتے ہیں گو کہ بنڈی کے نہونے

کی وجہ سے انہیں آئے دن مختلف وقتیں اور قابل لحاظ نقصان اٹھانا پڑتا ہے ۔

متفرق آلات میں دراتیوں ۔ کونکیوں ۔ سوپ اور جھیبوں کی تعداد بہت زیادہ معلوم ہو رہی ہے لیکن

فی نفسہ یہ زیادہ نہیں ہے کیونکہ ان کی اہمیت کی مدنظر ہر کسان کے ہاں ان کی ضروری تعداد موجود رہتی ہے ۔

زرعی آلات کی مذکورہ تشریح سے ہمیں دو باتیں معلوم ہوئیں ۔ ایک یہ کہ موضع ہذا میں کس قسم کے آلات

مستعمل ہیں ۔ دوسرے یہ کہ ان کی تعداد کیا ہے ۔

قسم آلات کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ کولہو کے سوائے جملہ آلات مستعملہ وہی قدیم اور پرانے ہیں

جو آج سے کئی نسل قبل مروج تھے ۔

جب ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ ہمارے کسان قدیم آلات کیوں استعمال کرتے ہیں تو ہمیں اسکے چند وجوہ نظر آتے ہیں ۔

سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ جدید آلات کی قیمت قدیم آلات کے مقابل زیادہ ہوتی ہے اور کسان

انہیں نہیں خرید سکتے ۔ چنانچہ چند آلات کی تقابلی قیمتوں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ قدیم آلات کے مقابل جدید

آلات کی قیمتیں کسقدر زائد ہوتی ہیں ۔

قدیم آلات	قیمت کلدار	جدید آلات	کلدار قیمت	قیمتوں میں فی صد فرق
ہل	۴ روپیے	ہل	۷ روپیہ ۸ آنے	۴۷
بکھر	۳ "	بکھر	۹۵ "	۹۷
پتّھن	۸ "	پتّھن	۶۰ "	۸۷
دورا	۴ "	دورا	۴۵ "	۴۱
داتری	۳ "	داتری	-	-

مانا کہ جدید آلات کے مقابل قدیم آلات ارزاں ہوتے ہیں۔ انہیں آسانی کے ساتھ منتقل کیا جاسکتا ہے۔ مقامی بیلوں کی استطاعت کے موافق ہیں اور انکی درستی بھی بہ آسانی ہوسکتی ہے لیکن محض ان خصوصیات کی بنا پر یہ خیال کرلیا کہ ہماری زراعت کیلئے پرانے آلات ہی موزوں ہیں ٹھیک نہیں۔ یہ خیال درست ہے کہ کسانوں کے موجودہ افلاس اور جانوروں کی ناگفتہ بہ حالت کے تحت مروجہ آلات کے سوا جدید آلات کا استعمال کرنا بہت دقت طلب ہے لیکن اگر ہم اپنی زراعت کو بہتر بنانا چاہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل ہوسکے تو ہمیں نہ صرف مویشیوں کی حالت کو بہتر کرنا ہوگا بلکہ جدید اور مناسب حال آلات کا استعمال بھی ضروری ہے۔

(ج) مصنوعی ذرائع آبپاشی ——— زرعی اصل قائم کا تیسرا جز مصنوعی ذرائع آبپاشی ہیں۔ مصنوعی ذرائع آبپاشی سے ہماری مراد تالاب اور نہریں ہیں۔ واضح رہے کہ موضع ہذا میں ایک بھی باؤلی آبپاشی کے لیے مستعمل نہیں۔

نہر نظام ساگر کی اجرائی سے قبل (سنہ ۱۳۴۰ف مطابق سنہ ۱۹۳۱ء) موضع زیر بحث کا جملہ رقبۂ کاشت

۱۱۴۵۲ ایکر تھا۔ اس رقبہ میں ۹۲۶ ایکر خشک اراضیات یعنی ۱۰،۲۶ ۵۲۶ ایکر تر اراضیات پر مشتمل تھے۔ بالفاظ دیگر مجموعی رقبہ کاشت کا لحاظ کرتے ہوئے رقبۂ آبپاشی ۳۶ فیصد تھا۔ اس رقبہ کی آبپاشی حسب ذیل تین تالابوں کے ذریعہ ہوا کرتی تھی

تالاب	وسعت		گہرائی		فی تالاب رقبہ آبپاشی	
	ایکر	گنٹہ	فٹ	انچ	وسعت ایکروں میں	فی صد
تہور تالاب	۸۲	۱۸	۱۶	۶	۲۴۱	۱۶٫۵
اوسرگاپلی تالاب	۸۹	۱۴	۹	۶	۲۲۹	۱۵٫۷
ماسانی تالاب	۲۸	۱۸	۶	-	۵۶	۳٫۸
جملہ	۲۰۰	۱۰	۳۲	-	۵۲۶	۳۶٫۰

سابقہ جدول سے واضح ہو رہا ہے کہ ۳۶ فی صد رقبہ آبپاشی کے منجملہ ۱۶٫۵ فیصد تہور تالاب کے ذریعہ ۷٫۵ا فیصد اوسرگاپلی تالاب سے اور ۳٫۸ فیصد رقبہ ماسانی تالاب سے سیراب ہو سکتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ مذکورہ تین تالابوں کے ذریعہ فصل آبی اور خصوصاً تابی کی کاشت میں بڑی مدد ملتی تھی لیکن اس امداد کا مدار بالواسطہ طور پر بارش سے تھا کیونکہ اگر بارش ٹھیک ہوتی تو تالابوں میں بھی خوب پانی جمع رہتا تھا۔ اور اس طرح نسبتاً وسیع رقبہ پر تری کاشت کی جا سکتی تھی۔ برعکس اس کے اگر بارش ٹھیک نہ ہوتی تو تالابوں میں بھی پانی کی مقدار قلیل ہوتی جسکی بنا پر رقبۂ کاشت کو محدود کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ قلت آب کی وجہ سے

سنہ ۱۳۲۸ف (۱۹۱۹ء)، سنہ ۱۳۲۹ف (۱۹۲۰ء) اور سنہ ۱۳۳۰ف (۱۹۲۱ء) میں فصول تابی کاشت ہی نہیں کئے گئے۔ قلت آب ہی کی بنا پر سنہ ۱۳۱۹ف (۱۹۱۰ء) سنہ ۱۳۲۰ف (۱۹۱۱ء) سنہ ۱۳۲۱ف (۱۹۱۲ء) سنہ ۱۳۳۴ف (۱۹۲۵ء) اور سنہ ۱۳۳۵ف (۱۹۲۶ء) میں پانچ ایکڑ سے بھی کم رقبہ کاشت کیا گیا حالانکہ معمولی سالوں میں فصل ہائے تابی کا رقبہ پچاس سے سو ایکڑ تک کاشت کیا جاتا تھا۔

اجرائی نہر (۱۳۴۳ف مطابق ۱۹۳۴ء میں نہر کی اجرائی عمل میں آئی) کے بعد ذرائع آبپاشی میں دو قسم کی سہولتیں بہم پہونچیں۔ ایک یہ کہ بمقابل سابق رقبۂ آبپاشی میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا۔ یعنی یہ کہ اجرائی نہر سے قبل جملہ رقبہ کاشت ۱۴۵۲ ایکڑ تھا۔ اس میں ۹۲۶ ایکڑ خشک زمین تھی اور ۵۲۶ ایکڑ تر اراضی۔ لیکن اجرائی نہر کے بعد ۱۳۶۰ ایکڑ رقبۂ کاشت[1] میں سے ۹۸۴ ایکڑ تر زمین ہوگئی اور خشک زمین صرف ۳۷۶ ایکڑ رہ گئی۔ گویا نہر جاری ہونے کی بدولت رقبۂ آبپاشی میں فیصد کا اضافہ ہوا۔ نہر کی اجرائی سے قبل مجموعی کاشت کا لحاظ کرتے ہوئے جملہ رقبۂ آبپاشی صرف ۳۶ فیصد تھا لیکن اب وہ ۷۲ فیصد ہوگیا جن ذرائع سے یہ رقبہ سیراب ہوتا ہے وہ ذیل میں درج ہیں۔

تالاب و نہر	رقبۂ آبپاشی بذریعہ نہر و تالاب	
	وسعت ایکڑوں میں	فی صد
تین تالاب (تھور۔ اوسرگاپلی اور ماساگی)	۶۱۵	۴۵٫۲
تین نہر (نمبر ۱۔ نمبر ۱۔ نمبر ۱/۲)	۳۶۹	۲۷٫۸
جملہ	۹۸۴	۷۳٫۰

[1] واضح رہے کہ سنہ ۱۳۴۰ف کے (مطابق سنہ ۱۹۳۱ء) کے مقابل سنہ ۱۳۴۳ف مطابق سنہ ۱۹۳۴ء میں جملہ رقبہ کاشت ۱۴۵۲ ایکڑ سے گھٹ کر ۱۳۶۰ ایکڑ ہوگیا۔

نہر کی اجرائی سے دوسری سہولت یہ ہوئی کہ اب فصل تابی کی کاشت میں بارش کی اہمیت نسبتاً کم ہوگئی کیونکہ اگر ایک آدھ سال قلت بارش کی وجہ سے تالابوں میں پانی کی مقدار کم رہے تو نہروں کے ذریعہ مدد لی جاتی ہے اور فصول تابی کے رقبۂ کاشت میں غیر معمولی کمی نہیں ہونے پاتی جس طرح کہ اجرائی نہر سے قبل ہوا کرتی تھی۔ اجرائی نہر سے اب تک ۱۳۴۳ف تا ۱۳۴۸ف مطابق ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۹ء فصل تابی کی کاشت میں پانی کی قلت کبھی بھی محسوس نہیں ہوئی۔ حالانکہ اجرائی نہر سے قبل فصل تابی کی کاشت بہت ہی غیر یقینی ہوتی تھی۔ چنانچہ ذیل کے اعداد سے ہمیں اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ نہر جاری ہونے سے قبل کس طرح فصل تابی کا رقبہ ایک سال میں بہت زیادہ ہوتا تھا تو دوسرے سال میں بہت ہی کم۔

سال فصلی	مزروعہ فصل تابی		سال فصلی	مزروعہ فصل تابی		سال فصلی	مزروعہ فصل تابی	
	ایکر	گنٹے		ایکر	گنٹے		ایکر	گنٹے
۱۳۳۴	۳	-	۱۳۳۷	۳	۳۱	۱۳۴۰	۷	۲۲
۱۳۳۵	۳	۱	۱۳۳۸	۱۱۹	۱۷	۱۳۴۱	۲	۱۰
۱۳۳۶	۲۴	۱۴	۱۳۳۹	۱	۳۶	۱۳۴۲	۷۲	۱

لیکن نہر کی بدولت فصل تابی کے رقبۂ کاشت میں اگر ایک طرف بہت اضافہ ہوگیا تو دوسری طرف قلت بارش کی وجہ سے سابقہ غیر یقینی صورت حال بھی باقی نہیں رہی۔ چنانچہ ۱۳۴۳ف مطابق ۱۹۳۴ء کے بعد سے فصل تابی کی کاشت حسب ذیل رہی۔

سال فصلی	مزروعہ فصل تابی		سال فصلی	مزروعہ فصل تابی		فصلی سال	مزروعہ فصل تابی	
	ایکر	گنٹے		ایکر	گنٹے		ایکر	گنٹے
۱۳۴۳	۳۲۶	۳۱	۱۳۴۵	۳۰۲	۲۳	۱۳۴۷	۳۰۶	۳۲
۱۳۴۴	۲۹۹	۱	۱۳۴۶	۳۱۶	۳۳	-	-	-

بہر طور موضع ہذا کے ذرائع آبپاشی کے متعلق ہم یہ رائے قائم کرسکتے ہیں کہ وہ بہت تشفی بخش ہیں۔

لیکن جب ہم اس امر پر غور کرتے ہیں کہ ہمارے کسان مذکورہ ذرائع آبپاشی سے کس طور پر اور کیونکر استفادہ کر رہے ہیں تو حالات بہت ہی مایوس کن نظر آتے ہیں اکثر کسان ذرائع آبپاشی کی مزید سہولتوں سے خوش نظر آنے کی بجائے اس امر کے شاکی پائے گئے کہ نہر کی اجرائی سے انہیں بجائے فائدے کے نقصان ہو رہا ہے[1]۔

جب ہم کسانوں کی زبان سے یہ سنتے ہیں تو ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ ایک زرعی مقام کے باشندے، ذرائع آبپاشی جیسی اہم سہولتوں کی شکایت کریں!! اس شکایت کی وجہ یہ بتلائی جاتی ہے کہ چونکہ خشک اراضیات کے مقابل تر اراضیات کی مالگزاری زیادہ ہوتی ہے لہذا تر زمینات کی کاشت میں اسقدر گنجایش نہیں ہوتی کہ مصارف پیدائش اور مالگزاری کی منہائی کے بعد قابل لحاظ آمدنی ہوسکے بعض مرتبہ یہ آمدنی اسقدر قلیل ہوتی ہے کہ اس سے مصارف پیدائش اور رقم مالگزاری بمشکل حاصل ہوتے ہیں۔

لیکن مزارعین کی اس شکایت سے ہمیں اتفاق نہیں۔ ان کا یہ خیال کہ چونکہ تر زمینات کے مقابل خشک زمینات کی مالگزاری کم ہوتی ہے لہذا ان کے لئے بہتر اور مناسب یہی ہے کہ موضع کی زمینات کا ایک بڑا حصہ خشک اراضیات پر مشتمل ہو[2] بہت ہی غیر معقول ہے۔ تر زمینات کی کاشت میں انہیں قلیل آمدنی محض اس لئے نہیں ہو رہی ہے کہ خشک زمینات کے مقابل تر زمینات کی مالگذاری زیادہ ہے۔ بلکہ قلیل آمدنی کی اصل اور بنیادی وجہ غیر اصولی نظام زراعت ہے۔ پیدائش دولت کا خواہ کوئی شعبہ کیوں نہ ہو عاملین پیدائش کا ایک موزوں اور مفید تناسب میں مشغول رہنا ضروری ہے۔ ورنہ خاطر خواہ آمدنی کی توقع نہیں رکھی جاسکتی۔ موضع ہذا میں ہمیں متعدد مثالیں ایسے کسانوں کی ملتی ہیں جن کے ہاں زرعی عوامل پیدائش (زرعی زمین۔ زرعی محنت اور زرعی اصل) بہت ہی غیر متناسب ہیں، نہ صرف عوامل پیدائش میں عدم تناسب پایا جاتا ہے بلکہ زرعی طریقہ ہائے کاشت بھی ناقص ہوتے ہیں۔ دھان کی کاشت جوار کے مقابل بہت ہی

---

[1] ضمیمہ دوم ملاحظہ فرمایا جائے۔

۱۳۳۴ف	۱۳۳۶ف	۱۳۳۸ف	۱۳۴۰ف
۱۳۳۵ف	۱۳۳۷ف	۱۳۳۹ف	۱۳۴۱ف
			۱۳۴۲ف

[2] ضمیمہ دوم بیان نمبر (۲) دیکھئے۔

اہتمام طلب ہوتی ہے۔ اس کے لئے نہ صرف زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے بلکہ سرمایہ اور کھاد بھی زیادہ صرف کرنا پڑتا ہے۔ محنت کے لحاظ سے ہمارے کسان کبھی پیچھے نہیں ہٹتے۔ لیکن جب روپیہ اور کھاد کا سوال اٹھتا ہے تو اس کی بہم رسانی سے قاصر رہتے ہیں۔ دھان کی فصلیں بھی (چند کسانوں کے سوائے) عموماً اسی لاپرواہی سے بوئی جاتی ہیں جس طرح کہ جوار بوئی جاتی ہے۔ کھاد بہت ہی قلیل مقدار میں دی جاتی ہے اور روپیہ بچانے کی خاطر ضروری کلیجائی نہیں کی جاتی نتیجہ یہ کہ پیداوار فی ایکڑ بہت ہی ادنیٰ اور معمولی ہوتی ہے۔ اس پیداوار کو فروخت کرنے کے طریق بھی حد درجہ ناقص ہوتے ہیں[1]۔ لہٰذا ان حالات کے تحت اگر آمدنی بہت ادنیٰ ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ کسانوں کو بعض مرتبہ تر زمینات کی کاشت سے اس قدر آمدنی بھی نہیں ہوتی کہ اس سے صرف مصارف پیدائش اور مالگزاری وصول ہو سکیں۔ لیکن ہمیں اس امر کا بخوبی علم ہونا چاہیئے کہ ادنیٰ آمدنی اس لئے نہیں ہو رہی ہے کہ حکومت نے نہر جاری کی یا تر زمینات کی مالگزاری خشک اراضیات کے مقابل زیادہ ہے بلکہ اس کے سب سے اہم وجوہ (جن سے تقریباً تمام کسان ناواقف ہیں) زرعی عوامل پیدائش کا عدم تناسب۔ غیر اصولی طریقہ ہائے کاشت، ناقص طریقہ ہائے فروخت اور ناجائز طریقہ ہائے لین دین ہیں[2]۔ لیکن افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے کسان جب کبھی ادنیٰ آمدنی پر غور کرتے ہیں تو وہ مذکورہ وجوہ میں سے ایک وجہ کا بھی لحاظ نہیں کرتے اور یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ چونکہ خشک زمینات کے مقابل تر زمینات کی مالگزاری زیادہ ہے لہٰذا انہیں خشک اراضیات کے مقابل تر اراضیات کی کاشت میں کوئی قابل لحاظ فائدہ نظر نہیں آتا۔ بالفاظ دیگر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ خشک اراضیات کی بجائے تر اراضیات کی کاشت میں انہیں نقصان ہوتا ہے۔ مگر ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اگر تر زمینات کی کاشت مناسب اور موزوں طریق پر کی جائے تو خشک زمینات سے کہیں زیادہ منافع تر زمینات سے حاصل ہو سکتا ہے لیکن کسان اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ جہاں تک ہو سکے کم سے کم تر اراضی کاشت کی جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ نقصان برداشت نہ کرنا پڑے۔ بعض کسان تر زمینات کی کاشت محض اس لئے کرتے ہیں کہ انہیں خشک زمینات

---

[1] فروخت پیداوار کے عنوان پر آٹھویں فصل میں مفصل بحث کی جائے گی۔

[2] مقروضیت کے عنوان پر آٹھویں فصل میں بحث کی جائے گی۔

دستیاب نہیں ہوتیں۔ چنانچہ ان کا بیان ہے کہ اگر انہیں خشک زمینات دستیاب ہوں تو وہ تر زمینات کی کاشت سے بڑی حد تک دست کش ہو جائیں گے[1]۔ مزارعین کے اس رجحان کا نتیجہ یہ ہے کہ تقریباً تمام خشک اراضی زیر کاشت رہتی ہے۔ برعکس اس کے تر زمینات کا بہت بڑا حصہ خارج از کاشت رہتا ہے جس کی وجہ سے حکومت کو (موضع ہذا کے ذرائع آبپاشی کا لحاظ کرتے ہوئے) جس قدر آمدنی ہونی چاہیئے تھی نہیں ہو رہی ہے۔ بندوبست اراضی کا لحاظ کرتے ہوئے حکومت کو موضع زیر بحث سے سالانہ ۱۹۳۷۴ روپئے وصول ہونا چاہیئے تھا لیکن چونکہ تر زمینات کا ایک بڑا حصہ خارج از کاشت رہتا ہے۔ لہٰذا اب صرف ۹۰۲۴ روپیے وصول ہو رہے ہیں۔ بالفاظ دیگر ۱۳۴۷ف (مطابق ۶ اکتوبر ۱۹۳۷ء تا ۵ اکتوبر ۱۹۳۸ء) میں متوقعہ رقم مالگذاری (۱۹۳۷۴) سے ۱۰۳۵۰ روپیے کم وصول ہوئے۔ آمدنی کا نقصان کس طرح قابل قبول ہو سکتا ہے۔

اگر ذرائع آبپاشی سے حقیقی معنی میں فائدہ اٹھایا جائے اور حکومت کو متوقعہ آمدنی وصول ہو تو اسکے ذریعہ فلاح عامہ کے بہت سے تعمیری کام کئے جا سکتے ہیں

ذرائع آبپاشی سے خاطر خواہ طور پر استفادہ کرنے کا مسئلہ بہت ہی اہم ہے۔ یہاں تک تو ہم نے

۲۔ زرعی اصل دائر ـــــ زرعی اصل کے ایک جزو یعنی زرعی اصل قائم (جس میں مویشی، آلات زراعت اور مصنوعی ذرائع آبپاشی کو شامل کیا گیا ہے) کے حالات بیان کئے۔ لیکن اب ہم زرعی اصل کے ایک دوسرے جزو یعنی زرعی اصل دائر (جس میں کھاد اور تخم شامل ہیں) کے حالات بیان کریں گے۔

(الف) کھاد ـــــ خشک اراضیات میں کاشت کی جانے والی اجناس کو (مرچ و تمباکو کے سوا) کسی قسم کی کھاد نہیں دی جاتی۔ ان اراضیات کی قوت زرخیزی کو برقرار رکھنے کے لئے ادواری طریق کاشت سے مدد لی جاتی ہے۔ ادواری طریقہ کاشت کے تحت کسان مقررہ کھیتوں میں ہر سال اجناس بدل کر بوتے ہیں جس کی وضاحت صفحۂ آئندہ پر کی گئی ہے۔

---

[1] ضمیمہ دوم۔ بیان نمبر (۴) دیکھئے۔

سال	کھیت			
	پہلا	دوسرا	تیسرا	چوتھا
پہلا	جوار	تل	السی	کپاس
دوسرا	تل	السی	کپاس	جوار
تیسرا	السی	روئی	جوار	تل
چوتھا	کپاس	جوار	تل	السی
پانچواں	جوار	تل	لسی	کپاس

حسب صراحت بالا فرض کیجئے کہ ایک کسان کے ہاں کھیت کے چار ٹکڑے ——— پہلا۔ دوسرا۔ تیسرا اور چوتھا ——— ہیں۔ پہلے سال ان چار ٹکڑوں میں سے ایک ٹکڑے پر جوار کی کاشت کی جاتی ہے۔ دوسرے پر تل بویا جاتا ہے۔ تیسرے پر السی اور چوتھے پر کپاس۔ دوسرے سال مذکورہ کھیتوں میں علی الترتیب جوار۔ تل السی اور کپاس کاشت نہیں کئے جاتے کیونکہ اس طرز عمل سے زمین کی قوت پیدائش نسبتاً گھٹ جاتی ہے لہذا اس قوت کو برقرار رکھنے کے لئے اجناس کاشت بدل دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً پہلے سال جس کھیت میں جوار بوئی گئی تھی دوسرے سال تل کی کاشت کی جاتی ہے جس کھیت میں تل بویا گیا تھا اس میں السی کاشت کی جاتی ہے جس میں السی کاشت کی گئی تھی اس میں کپاس بوئی جاتی ہے اور جس میں کپاس بوئی گئی تھی اس میں جوار بوئی جاتی ہے۔

اس طرح ہم دیکھ رہے ہیں کہ سال اول جوار پہلے کھیت میں بوئی گئی تھی تو اب وہ چوتھے کھیت میں بوئی گئی ہے۔ تل دوسرے کھیت میں بویا گیا تھا تو اب وہ پہلے کھیت میں بویا گیا ہے۔ السی کی کاشت تیسرے کھیت میں کی گئی تھی تو اب دوسرے کھیت میں کی گئی ہے۔ کپاس چوتھے کھیت میں بوئی گئی تھی تو اب تیسرے کھیت میں بوئی گئی ہے۔

جدول کے دیکھنے سے واضح ہو رہا ہے کہ تیسرے سال پھر اسی قسم کا رد و بدل کیا جاتا ہے۔ چوتھے سال بھی یہی تبدیلی جاری رہتی ہے حتیٰ کہ پانچویں سال زیر بحث چاروں کھیتوں میں بالترتیب وہی اجناس کاشت کئے جاتے ہیں جو کہ چار سال قبل کاشت کئے گئے تھے۔ مابعد سالوں میں پھر وہی ترکیب اختیار کی جاتی ہے۔

واضح رہے کہ مزارعین کے بیان کے مطابق جوار کی کاشت سے زمین کے بہت سے قوتی اجزا کم ہو جاتے ہیں لیکن جب دوسرے سال جوار کے کھیت میں تل کی کاشت کی جاتی ہے تو تل کے پودوں کی پتیاں کھیت میں جھڑتی ہیں اور ان پتیوں کی بدولت کھیت کو قوت حاصل ہوتی ہے۔ چونکہ تل کی کاشت کی وجہ سے زمین قوت دار ہو جاتی ہے لہٰذا تل کے بعد السی کی کاشت کی جاتی ہے۔ جوار کی طرح (مزارعین کے بیان کے مطابق) السی کے پودے بھی زمین کی بہت قوت کھینچ لیتے ہیں لہٰذا اسکے بعد کپاس بوئی جاتی ہے۔ کپاس کی پتیاں بھی زمین کو قوت دیتی ہیں۔ کپاس کی کاشت کے بعد جب زمین قوت دار ہو جاتی ہے تو پھر جوار بوئی جاتی ہے۔ اس طرح کسان ایک مرتبہ ایسے پودوں کی کاشت کرتے ہیں جو زمین کی قوت بہت کچھ کھینچ لیتے ہیں۔ دوسری مرتبہ اس نوعیت کے پودے لگائے جاتے ہیں جو زمین کی قوت کو جذب کرنے کی بجائے اپنی پتیوں کی ذریعہ اس کو زرخیز بناتے ہیں۔ جوار اور السی کی کاشت سے زمین کی زرخیزی گھٹ جاتی ہے لیکن تل اور کپاس کی کاشت سے اس کی زرخیزی پھر سے عود کر آتی ہے۔ لہٰذا کسان جوار، السی، تل اور کپاس میں رد و بدل کر کے کاشت کرتے رہتے ہیں۔ اور وارہ طریق کاشت کسانوں کے حق میں بہت مفید ہے چونکہ وہ اس کے ذریعہ کھاد میں بہت کچھ کفایت کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اس طریق پر عمل پیرا ہو کر وہ خشک زمینات پر کاشت کی جانے والی اجناس کو سوائے مرچ و تمباکو کے، کھاد نہیں دیتے[1]۔

جہاں تک کہ استعمال کھاد کا تعلق ہے سیدھی سادی اور قدرتی کھاد استعمال کی جاتی ہے۔ گوبر کے ساتھ مکانات کا کوڑا کرکٹ خراب گھانس اور کڑبی وغیرہ جمع کی جاتی ہے۔ جب یہ چیزیں سڑ گل کر گوبر میں مل جاتی ہیں تو اس مرکب کو بطور کھاد استعمال کیا جاتا ہے۔ اس مرکب کو گوبر کی کھاد کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مینگنی کی کھاد گوبر کی طرح جمع نہیں کی جاتی بلکہ کھیتوں میں منڈھے بٹھلائے جاتے ہیں۔

مزارعین کا بیان ہے کہ موضع کی زمینات کا لحاظ کرتے ہوئے شدہ پیداوار حاصل کرنے کے لئے

---

[1] واضح رہے کہ کھاد صرف دھان، مرچ، تمباکو اور شکر کے کھیتوں میں ڈالی جاتی ہے۔ باقی اجناس کی کاشت بلا کھاد کی جاتی ہے۔

دیکھئے جس کے بعد ۱۲۰ بنڈی مینگنی - ۲۴۰ بنڈی خالص گوبر کے مساوی ہوگی - ایک بنڈی خالص گوبر میں چونکہ دو بنڈی کھاد تیار ہوتی ہے - لہٰذا ۲۴۰ بنڈی خالص گوبر ۴۸۰ بنڈی کھاد کے مساوی ہے - اس طرح ہم دیکھ رہے ہیں کہ گوبر کی کھاد کی سالانہ پیداوار (۵۶۸۱ + ۴۸۰) ۶۱۶۱ بنڈی ہوگی -

واضح رہے کہ گدھے اور گھوڑوں کی لید بھی رائیگاں نہیں کی جاتی - رات میں جسقدر لید حاصل ہوتی ہے اس کو جمع کر کے بطور کھاد استعمال کیا جاتا ہے - پانچویں فصل میں ہم معلوم کر آئے ہیں کہ موضع ہذا میں جملہ دو گدھے اور دو گھوڑے ہیں - دیہاتیوں کے اندازہ کے مطابق ان جانوروں سے سالانہ ۲۴ بنڈی لید حاصل ہوتی ہے جان کینی نے بتلایا ہے کہ گوبر کے مقابل لید ڈیڑھ گنی قوی ہوتی ہے[1] اس حساب کے مطابق لید کی ۲۴ بنڈیوں کو گوبر کی بنڈیوں میں تبدیل کرنے سے ۳۶ بنڈیاں حاصل ہونگی - چونکہ ایک بنڈی خالص گوبر میں دو بنڈی کھاد تیار ہوتی ہے لہٰذا ۳۶ بنڈیوں میں ۷۲ بنڈی کھاد تیار ہوگی - اگر ہم ان بنڈیوں کو کھاد کی سابقہ بنڈیوں (۶۱۶۱) میں جمع کریں تو موضع زیر بحث میں کھاد کی سالانہ پیداوار مکمل طور پر حاصل ہوگی اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ موضع ہذا میں سالانہ (۷۲ + ۶۱۶۱) ۶۲۳۳ بنڈی کھاد تیار ہوتی ہے - فرض کیجئے کہ ایک سو بنڈی کھاد کی حمل و نقل میں ایک بنڈی ضائع ہوتی ہے لہٰذا ۶۲۳۳ بنڈی کھاد کی حمل و نقل میں ۶۲ بنڈی سے کسقدر زائد کھاد ضائع ہوگی - ۶۲۳۳ بنڈی میں سے ضائع شدہ ۶۲ بنڈی منہا کرنے کے بعد ۶۱۷۱ بنڈی کھاد بچ رہتی جب اوسط ۱۳۴۲ف (مطابق ۷ اکتوبر ۱۹۳۲ء تا ۵ اکتوبر ۱۹۳۳ء) میں دھان مرچ اور تمباکو کی کاشت کے لئے استعمال کیا گیا - واضح رہے کہ عمدہ پیداوار حاصل کرنے کے لئے بحیثیت مجموعی ۱۰۲۷۱ بنڈی کی مطلوب تھی - لیکن صرف ۶۱۷۱ بنڈی دستیاب ہوئی - کھاد کی اس کمی کو بیان کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ عمدہ پیداوار حاصل کرنے کے لئے اگر سو بنڈی کھاد درکار تھی تو صرف ۵۵ء۸۰ بنڈی دستیاب ہوئے - بالفاظ دیگر یوں کہا جا سکتا ہے کہ عمدہ پیداوار حاصل کرنے کے لئے بحیثیت مجموعی جس قدر کھاد مطلوب تھی اس سے ۴۴ء۱۵ فی صد کم دستیاب ہوئی - جب کہ کمی کھاد کی یہ حالت ہو اور

---

[1] ہندوستان میں کاشت تحقیق مترجم منظر حسین صاحب صفحہ (۹۳) دیکھئے -

جب کہ یہی حالت کم و بیش کئی سال سے جاری ہے تو بھلا ایسی صورت میں زمین کی قوت پیداوری ایک اچھے معیار پر کیوں کر برقرار رہ سکتی ۔ جس طرح ناکافی اور غیر صحت بخش غذا کی وجہ سے نسل انسانی دن بدن کمزور ہوتی چلی آرہی ہے اسی طرح ناکافی اور ناقص طریق کھاد کی بدولت زمین کی زرخیزی کا مسئلہ بھی اہم سے اہم تر ہوتا جارہا ہے ۔

(ب) تخم ——— یہاں تک تو ہم نے زرعی اصل واثر کے ایک جزو یعنی کھاد کی تشریح کی لیکن اب ہم اس کے دوسرے جزو یعنی تخم کا حال معلوم کرینگے ۔

عمدہ پیداوار حاصل کرنے کے لئے جہاں اور امور کا لحاظ ضروری ہے ساتھ ہی ساتھ عمدہ تخم کی اہمیت کو بھی کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ۔ کھاد کسقدر زائد کیوں نہ ڈالی جائے اگر تخم بھی عمدہ نہ ہوں تو خاطر خواہ پیداوار نہیں حاصل ہوسکتی ۔

جملہ اجناس کے تخم مقامی طور پر حاصل کئے جاتے ہیں ۔ تقریباً تمام کسان اختتام فصل پر اجناس کا ایک مناسب حصہ آئندہ تخم ریزی کے خاطر احتیاط کے ساتھ محفوظ کرلیتے ہیں ۔ دھان کے تخم عام طور پر گمیوں میں رکھے جاتے ہیں ۔ گمی بانس کی بنی چٹائی ہوتی ہے ۔ تخم کو گمی میں بھرنے کے بعد اس پر دھان کا گھاس ڈالا جاتا ہے ۔ اور بعد ازاں مٹی کی ایک پتلی تہہ اس طور پر بچھا دی جاتی ہے کہ گمی کا منہ مکمل طور سے بند ہوجائے ۔ تخم ریزی سے قبل گمی کو چار پانچ مرتبہ کھولا جاتا ہے اور دھان سوکھاتے رہتے ہیں ۔ دھان کو سوکھانے کے بعد گمی کو پھر اسی طرح بند کردیا جاتا ہے ۔ مزارعین کا بیان ہے کہ اس طرز عمل سے بیج خراب ہونے نہیں پاتا ۔ چنے مونگ وغیرہ کے تخم میں راکھ نیم کا پتا اور بھلانوے ڈالکر کسی محفوظ جگہ میں رکھ دیا جاتا ہے ۔

حفاظت تخم کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسان انتہائے ہوشیاری کے ساتھ اسکو عمدہ حالت میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن قسم تخم پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت ہی ادنیٰ اور معمولی ہے ۔ نہ صرف دھان بلکہ ہر جنس گھٹیا قسم کی بوئی جاتی ہے ناکافی کھاد اور گھٹیا تخم کی وجہ سے پیداوار فی ایکڑ بھی ادنیٰ ہوتی ہے ۔ چنانچہ موضع ہذا کی مختلف پیداواروں کا تفصیلی حال آئندہ فصل میں بیان کریں گے ۔

ساتویں فصل

طریقہ ہائے کاشت۔ زرعی پیداوار۔ زرعی فروخت

۱۔ طریقہ ہائے کاشت | دیگر امور کے علاوہ زرعی پیداوار کی زیادتی یا کمی پیطریقہ ہائے کاشت کا بھی بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ اگر طریقہ ہائے کاشت اصولی ہوں تو پیداوار بھی زیادہ ہوگی۔ برعکس اس کے غیر اصولی طریقہ ہائے کاشت کی بنا پر پیداوار کی تخفیف ایک لازمی امر ہے۔ اصولی طریقہ ہائے کاشت سے ہماری مراد یہ ہے کہ کھیت کی جتائی۔ کھاد دلوائی۔ بوائی۔ کلچائی (ویڈنگ)، سنچائی، نکائی، اور کٹائی بروقت اور مناسب طریق پر کیجائی چاہئیے۔ خصوصاً اچھی جتائی عمدہ پیداوار حاصل کرنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ جتائی کی اہمیت کے متعلق جتھیروٹل (جو کہ بہت بڑا عالم زراعت گذرا ہے) کہتا ہے کہ "کھیت کی جتائی کرنا کھاد دینا ہے" کانپور کے سرکاری مزرعہ زراعت پر ۲۵ سال متواتر تجربہ کے بعد یہ ثابت ہوا ہے کہ اچھی جتائی کھاد دینے سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ (واضح رہے کہ اچھی جتائی کا مدار بڑی حد تک عمدہ آلات پر بھی ہے۔) حقیقت تو یہ ہے کہ کھاد کا پورا پورا فائدہ بھی اسی وقت اٹھایا جاسکتا ہے جب کہ کھیت عمدگی کے ساتھ جوتا گیا ہو۔ عمدہ پیداوار حاصل کرنے کے لئے کھیت کو نہ صرف عمدگی کے ساتھ جوتنا چاہئیے بلکہ اس کا بروقت جوتا جانا بھی ضروری ہے۔ ماہرین کی رائے میں کھیت کی جتائی بارش سے قبل ہوجانی چاہئیے۔ کیونکہ اسکی وجہ سے مختلف فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ بارش کا پانی گہرائی تک پہونچ سکتا ہے جنگلی پودے بہت کم اُگتے ہیں اور مہلک کیڑے بھی مرجاتے ہیں۔

واضح رہے کہ موضع زیر بحث میں ۲ قسم کے کسان ہیں۔ ایک وہ جن کو "کبنی" کہا جاتا ہے۔ "کبنی"

انجمن طیلسانین عثمانیہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی ترجمان

مجلۂ طیلسانین

ساتویں جلد۔ اردی بہشت ۱۳۵۲ف ، ربیع الاول ۱۳۶۲ھ ، مارچ ۱۹۴۳ء ، دوسرا شمارہ

مدیر: محمد غوث ام اے ، ال ال ، بی (عثمانیہ)

فہرست مضامین

عرضِ حال

مجلّہ کی گزشتہ اشاعت میں یہ بات واضح کی گئی تھی کہ کابینۂ انجمن نے سنہ ۱۳۵۱ف کی ابتداء میں ہی مجلّہ کی ادارت کے متعلق بعض امور طے کئے تھے لیکن جناب مولوی عبدالقادر صاحب سروری کے میسور جانے کی وجہ سے نئے انتظام کی ضرورت ہوئی اور یہ کہ کابینۂ انجمن کے تصفیہ کے بموجب سرکاری محکموں میں کارروائی چل رہی ہے۔

واضح ہو کہ کابینۂ انجمن نے یہ طے کیا کہ مجلّہ کی ادارت سابقہ مجلس ادارت کے بجائے راقم الحروف (محمد غوث) کے سپرد کی جائے۔ ادارت کی تبدیلی کے لئے ضابطہ کے چند امور عمل میں لانے ضروری ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ مراحل طے ہو کر گزشتہ شمارے کے اداریہ کی تحریر کے بعد تبدیل ادارت کی منظوری سرکار سے حاصل ہوگئی جس سے سرورق پر مجلس ادارت کے بجائے مدیر کا نام لکھا گیا۔

مجلّہ کی ادارت کی ذمہ داریاں بہت ہیں۔ گزشتہ چار چھ مہینوں میں اس بات کا کافی اندازہ ہو چکا ہے کہ مشکلات کسقدر زیادہ اور آسانیاں کسقدر کم ہیں۔ بریں ہم خدمت کی یہ نئی ذمہ داری بھی اس توقع میں قبول کی گئی کہ عثمانیہ برادری کی اعانت اور تائید ان شاء اللہ سب مشکلات حل کر دیگی۔

اس موقع پر ان محترم برادران کی محنت و کاوش کی سپاس گزاری ضروری ہے جن سے سابق میں مجلّہ کی مجلس ادارت تشکیل پائی تھی۔ کسی چلتے ہوئے کام کو چلاتے رہنا اور بات ہے اور کسی کام کی تاسیس و ابتدا اور بات۔ مجلّہ کی مجلس ادارت کے اولین ارکان نے مجلّہ کو جاری کیا، اس کا معیار قائم کیا اور اس کے لئے جگہ پیدا کر دی۔ مجلّہ اپنے ان ابتدائی محسنوں کو کبھی بھلا نہیں سکتا۔ اور یہ توقع کرتا ہے کہ وہ بھی اسکو نہ بھلائینگے۔ خدمت چاہے کسی کے ذمہ کیوں نہ ہو تعاون اور اشتراک عمل سب کا حاصل ہونا چاہئیے۔

مجلّہ کے اس نئے دور میں معاشی کمیٹی اور مجلس نمائش نے جو اعانت عمل میں لائی وہی دراصل اُمید کی کرن ثابت ہوئی، مجلّہ کو بھر یہی بات رہرانی چاہئیے کہ خدا کرے کہ اسکو اپنے محسنوں کے پاس نادم نہ ہونا پڑے۔

ترتیبِ مجلّہ

۱۔ مجلّہ کے گزشتہ دو شماروں سے ابواب کی جو ترتیب قائم کی گئی ہے اور حصۂ معاشیات کا جو اضافہ عمل میں آیا اسکی وجہ سے مجلّہ کو بلا شبہ طول و عرض ہندوستان کے اُردو مجلات میں ایک خصوصی امتیاز حاصل ہوگا چنانچہ آہستہ آہستہ مجلّہ کو ممتاز مشاہیر علم کے پاس اعتنا حاصل ہو رہا ہے۔

۲۔ مجلّہ کی ترتیب کے متعلق جو امور مجلّہ کی چھٹی جلد کے تیسرے اور چوتھے شمارے میں واضح کئے گئے تھے وہ کافی ہیں۔ مجلّہ کچھ مدت اسی ترتیب سے شائع ہوگا۔ البتہ صفحات کی عدم گنجایش بعض وقت کسی نہ کسی باب کے ترک کرنے پر مجبور کریگی چنانچہ بادل ناخواستہ بعض ابواب کو آئندہ اشاعت کیلئے اٹھا رکھنا اس وقت ضروری متصور ہوا۔

۳۔ یہ بات مناسب نظر آئی کہ معاشی کمیٹی کے زیر اہتمام ماہ اسفندار میں جو پانچویں معاشی کانفرنس منعقد ہوئی اسکی مکمل روداد اس مرتبہ حصۂ معاشیات میں شائع کر دی جائے تاکہ کانفرنس میں مختلف وقتی مسائل پر جو مقالات پڑھے گئے یا جو مباحثہ ہوا اس پر ملک کے اہل حل و عقد بر وقت کافی غور کر سکیں۔ نیز نمائش مصنوعات مملکت آصفیہ کی بعض ضروری تفصیلات جو وقت پر اخباروں میں شائع نہ ہو سکیں حصۂ معاشیات میں شامل کر دی گئیں ہیں۔ لامحالہ مجلہ کے عام حصہ میں صفحات کم کرنے پڑے تاکہ کاغذ کی مشکلات عین وقت پر سد راہ نہ ہو جائیں۔

۴۔ مجلہ کے گزشتہ شمارہ میں مولوی محمد غوث صاحب محبوب نگری ام اے (موصوف کی شخصیت مدیر کی شخصیت سے علیحدہ ہے) کا مقالہ "امام غزالی کے کلامی خصوصیات" شروع کیا گیا تھا۔ اسکو اس شمارے میں بہ تمام و کمال شائع کر دیا گیا ہے۔

۵۔ یہ امر محسوس ہوا کہ اس نوعیت کے مقالے قسط وار شائع ہونے سے اپنی قدر و قیمت کھو دیتے ہیں اور ان کی افادیت کم ہو جاتی ہے۔ اس لئے ارادہ یہ ہے کہ آئندہ ایسے مقالے ایک ہی اشاعت میں بہ تمام و کمال شائع کر دیے جائیں لامحالہ مختصر مضامین کے لئے جگہ کم کرنی پڑیگی لیکن مجلہ کا اصلی مقصد زیادہ خوبی کے ساتھ تکمیل پا سکیگا۔ البتہ اگر کوئی مقالہ بہت طویل ہو تو مجبوراً اسکو قسط وار شائع کرنا پڑیگا۔

۶۔ مجلہ کے آیندہ شمارے میں توقع ہے کہ محمد اعظم خاں صاحب ام اے لکچرار جامعہ عثمانیہ کا مقالہ طبع ہوگا۔ اس مقالہ کا موضوع "دربار اودھ کا اثر اردو شاعری پر" ہے

۷۔ مولوی فاضل ڈاکٹر میر سیادت علی خاں صاحب کے قابل قدر مضامین کی دوسری قسط اس شمارے میں شائع ہوئی ہے۔ ان مضامین کا موضوع متقابلہ علم اصول قانون ہے۔ اس موضوع پر جہاں تک علم ہے ڈاکٹر صاحب نے ہی پہلی مرتبہ اردو میں قلم اٹھایا ہے اسکی افادیت مسلم ہے۔ مجلہ کو بھی یہ امتیاز حاصل ہوا کہ اس کے صفحات پر پہلی مرتبہ اردو میں اس موضوع پر یہ مضامین شائع ہوئے۔ جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ قانون میں امسال حال ال ال ام کی جماعت قائم ہوئی اسکے طلبہ کے لئے مضامین کا یہ سلسلہ جسقدر مفید ہوگا وہ ظاہر ہے۔ کاش مجلہ کے ذرائع اس بات کی اجازت دیتے کہ جامعہ کے اس نئے اقدام میں وہ زیادہ سے زیادہ تعاون کر سکتا۔

فکر و نظر

انسداد گداگری سب خوش تھے کہ سالہا سال کی کوشش کے بعد آخر کار انسداد گداگری کا قانون نافذ ہوگیا۔ لیکن صورت حال یہ ہے کہ مجلس بلدیہ نے پیش روی کے بجائے التوا پسند کیا۔ اور صدر کی فیصلہ کن رائے سے قانون کے نفاذ کو تین مہینوں کے لئے ملتوی رکھنے کی تحریک منظور کرلی۔ غالباً مجلس بلدیہ کے عذرات پر اسکی تحریک سرکار میں بھی منظور ہو گئی۔ خدا نہ کرے کہ تین ماہ کا مصلحت آمیز التوا، دائمی التوا کا پیش خیمہ ثابت ہو تصویر کا ایک رخ یہ ہوا۔ دوسرا رخ یہ ہے کہ انسداد گداگری کی کمیٹی اس بات پر خوش ہے کہ قانون نافذ ہوگیا اور بلدۂ فرخندہ بنیاد کے رخ زیبا سے گداگری کا بدنما داغ مٹ گیا۔

اگر کمیٹی اس بات پر مسرور ہے کہ بیت المعذورین میں نئے ۳۶ معذور داخل ہوگئے تو غالباً مجلس بلدیہ یہ کہیگی کہ ... ۸ معذوروں میں سے ۳۶ معذور بیت المعذورین میں داخل ہوئے تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ درحقیقت قانون نافذ ہوگیا۔ غرض یہ اپنی جگہ اور وہ اپنی جگہ تاویل و دلیل کے گرداب میں سرگرداں ہیں۔ اس موقع پر اس بات کا اظہار بے محل نہ ہوگا کہ حیدرآباد سال ہاسال کی کارروائی کے بعد بھی اسی جگہ رہتا ہے جہاں سے وہ پہلے چلتا ہے خود یہی مسئلہ انسداد گداگری اور قیام بیت المعذورین کم ازکم ۵۵ برس سے خود مجلس بلدیہ میں زیر کارروائی ہے۔ اگر یہ مجلس، خواہ وہ پہلے مجلس انتظام صفائی اور اب مجلس بلدیہ کیوں نہ ہو، بلدۂ حیدرآباد کے مسئلہ گداگری کو ۵۵ سال کے بعد بھی حل نہیں کرسکتی اور مزید مہلت مانگتی ہے تو نہ صرف مجلس بلدیہ بلکہ ہر شہری کو غور و خوض کرنا چاہیئے۔

۵۵ برس پہلے نواب اقبال یار جنگ مرحوم کی مرتب کی ہوئی ایک یادداشت اس وقت پیش نظر ہے۔ اس کی ساری تفصیلات بیان کرنے کے لئے مجلہ کے صفحات میں گنجائش نہیں۔ صرف دو ایک باتیں واضح کی جاتی ہیں۔

نواب اقبال یار جنگ مرحوم نے لکھا ہے کہ ۱۳... ہجری میں انہوں نے مجلس انتظام صفائی میں یہ تحریک کی کہ متعدی امراض میں مبتلا لوگ راستوں پر بھیک مانگتے ہیں ان کے لئے کوئی بندوبست کیا جائے۔ نواب اکبر جنگ مرحوم کوتوال بھی اس کے موید تھے۔ یہ تحریک مجلس میں بالاتفاق منظور ہوئی اور سرکار میں بھیجی گئی۔ سرکار نے بھی اسکو پسند کیا اور تفصیلات طلب کئے۔ مجلس نے اسکیم مرتب کرنے کا کام نواب اقبال یار جنگ کے سپرد کیا۔ جسپر انہوں نے ایک مفصل اسکیم مرتب کی، یہ تجویز بصورت نقل اس وقت پیش نظر ہے۔

بعد میں یہ معاملہ تعویق میں پڑ گیا تا آنکہ تعلیمانی ... و دموسی کے بعد موجودہ بیت المعذورین قایم ہوا۔ اسکے سلسلہ میں بھی اس وقت کچھ مواد پیش نظر ہے لیکن اسکی صراحت غیر ضروری ہے۔ عام طور سے یہ بات مشہور ہے کہ بیت المعذورین کے ایک سابق اعزازی مہتمم کے ذمہ کئی ہزار روپے جو وصول طلب تھے وہ حسابات سے خارج کردئے گئے۔ مجلس صفائی کی وہ حالت اور ابنائے ملک کی یہ حالت۔ پھر انسداد گداگری ہو تو کیونکر ہو۔ انسداد گداگری تو ایک طرف خود ملک کے ترقی نہ کرسکنے کے جو دو سبب ہیں وہ یہی سستی اور بددیانتی ہیں۔ جب ملک کی نئی نسل ان پر غلبہ پالیگی اس وقت کامرانی اور نیک بختیاری کی بھی نوبت آئیگی۔

یہ صفحات بالکل تیار ہوچکے تھے کہ مولانا شمس اکبر علی صاحب مدیر صحیفہ چل بسے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون دو ایک سطروں میں ان کی خدمات کا تذکرہ ادا نہیں ہوسکتا۔ مجلہ مرحوم کے محزون پسماندوں سے مخلصانہ اظہار تعزیت کرتا ہے۔

قانون کا تحکمی نظریہ

از جناب مولوی فاضل ڈاکٹر سید سیادت علی خان صاحب

ادبیات

(۱) کرکوناف کتاب ۲ دفعہ ۲۳ ۔ جیتھر یاؤں باب ۱ - اور (۲)

(۳) برائس کی نوٹ ۔ نویں لکچر اطاعت پر - آسٹن باب ۶ سامنڈ دفعہ ۱۷ ۔ برائس لکچر ۵ -

اور ۸ - آسٹن لکچر ۱ - وینوگراڈ آف ۔ باب ۲ ص ۵۲

قانون کی ماہیت کے متعلق جو دوسرا تصور یا نظریہ ہے وہ یہ ہے کہ قانون ایک مقتدر اعلیٰ کی مرضی کا مظہر ہے بالفاظ دیگر قانون حکم مملکت ہے ۔ یہ انگریزی علم اصول قانون کا خصوصی تصور ہے اس کے اساتذہ علم اصول قانون کی تحلیلی اسکول کے اساتذہ کہلاتے ہیں اس کا ب بھی بڑا اثر ہے اس کی خوبی بھی کچھ کم نہیں گو ہمیں ماننا پڑیگا یہ ایک رخی یا غیر مکمل ہے

(۱) مفہوم قانون قدرتی مظاہر میں یکسانیت سے جدا مفہوم ہے۔

پس قانون کے مفہوم کی تحلیل اس اسکول کے اساتذہ اس طرح شروع کرتے ہیں کہ ایک طرف تو شروع زمانہ سے یعنے اس وقت سے جبکہ چرواہا اپنے گلہ کو احکام دے کر یا پدر خاندان اپنے خاندان کو احکام دے کر ان کی تعمیل کراتا تھا اور تعمیل نہ ہونے پر سزا دیتا تھا، قانون کا مفہوم کم و بیش صحیح سمجھا گیا ہے تو دوسری طرف لفظ قانون کا استعمال قانون اخلاق، قانون حسن، قانون فطرت، قانون الہی، اور قانون مروت وغیرہ وغیرہ بیسوں مبہم الفاظ میں کیا گیا ہے ۔ یہی نہیں یورپ کے اکثر ممالک میں قانون کے لئے جو لفظ استعمال ہوتے ہیں - یعنے لاطین میں [illegible] جرمن میں Recht اور فرنچ میں Droit ان کے معنے نہ صرف قانون کے ہیں بلکہ حق اور انصاف کے بھی ۔ ایک ہی لفظ کو اتنے مختلف معنوں میں استعمال کرنا ۔ دینیات، طبیعات، اخلاقیات، جمالیات

۔ علم اصول قانون کے مختلف مضامین کا ایک غیر معمولی خلط مبحث معلوم ہوتا ہے۔ اگر ہمیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ تقسیم علوم ایک جدید کارنامہ ہے جس سے قدما واقف نہیں تھے اس لئے وہ دنیا بھر کے مضامین کا ایک ہی ساتھ مطالعہ کرتے تھے تقسیم علوم ہوگئی ہے اور علوم یا تو نظری اور طبیعاتی یا عملی اور اخلاقی قرار دیئے گئے ہیں۔ اس تقسیم علوم کے ساتھ ہی قانون کا مفہوم بھی ان علوم میں معین ہوگیا ہے طبیعاتی علوم میں قانون سے مراد قدرتی مظاہر میں یکسانیت اور ان کا یکساں عمل ہے اور عملی یا اخلاقی علوم میں انسان کے لئے ایک قاعدہ عمل اب ہمیں یہاں صاف طور پر کہنا اور سمجھ لینا چاہیئے کہ علم اصول قانون میں لفظ قانون پہلے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا ۔

(۲) قانون محض انسانوں کیلئے قاعدہ عمل ہی نہیں ۔

رہا عملی یا اخلاقی علوم میں قانون کا مفہوم کہ وہ انسانوں کے لئے قاعدہ عمل ہے تو یہ بھی علم اصول قانون کے مقصد کے لئے بہت وسیع اور بہت مبہم مفہوم ہے۔ صحیح معنوں میں قانون قواعد عمل کا ایک خاص حصہ ہے اس کی توضیح ہم اگلے فقرہ میں کریں گے۔ یہاں ہم یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ انسانوں کے لئے قواعد عمل جن کو قوانین ہی کہا جاتا ہے کتنے مختلف قسم کے ہیں بعض تو جہاں کہیں انسان مل کر رہتے ہیں پائے جاتے ہیں بعض کسی خاص مذہب کے ماننے والوں پر قابل پابندی ہیں بعض معاشرہ کے بنیادی اصولوں سے متعلق ہیں تو بعض رسومات کے ادنیٰ تفصیلات سے بعض ایسے ہیں کہ ان کی پابندی سلطنتوں اور شاہنشاہیت کی پوری قوت سے کرائی جاتی ہے تو بعض ایسے کہ ان کی خلاف ورزی ہر وہ شخص کرسکتا ہے جسے اپنے ملاقاتیوں کے طعن و تشنیع کا خیال نہ ہو۔ لیکن ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ ان تمام قواعد عمل میں چند خصوصیات مشترک ہیں یعنے وہ صریحی قضیئے ہیں۔ ان میں ذی عقل انسانوں سے خطاب ہے۔ اور وہ صرف مشورے ہی نہیں بلکہ احکام ہیں یعنے ان کی پابندی کے لئے تہدید موجود ہے۔ یہ تہدید سزا کی دھمکی نہ سہی لیکن اتنی تو ضرور ہے کہ خلاف ورزی کی صورت میں کچھ نہ کچھ اور کسی کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچایا جائے گا اور یہ احکام عام ہیں یعنے ان سے کسی خاص فعل یا عمل کا حکم نہیں دیا ہے بلکہ ایک قسم کے بہت سے افعال اور اعمال کا۔ ان قواعد عمل میں سے بعض تو مثلاً قواعد مروۃ یا قواعد فیشن ایسے ہیں کہ ان کو جاہل سے جاہل عامی شخص بھی صحیح معنوں میں قانون سے مخلوط نہیں کرسکتا لیکن بعض دوسرے ایسے ہیں جن کو اکثر اساتذہ تک بھی صحیح معنوں میں قانون سے مخلوط کرتے ہیں ہماری مراد ہے

قوانین، قوانین قدرت اور قوانین اخلاق سے ہے۔

(۳) قانون اور قواعد اخلاق میں فرق۔

اس لئے ایک فقیہ یا علم اصول قانون کے طالب علم کا کام ہے کہ ان اخلاقی علوم کے قوانین اور صحیح معنے میں قانون میں صاف صریح اور معین طریقہ پر فرق کرے۔ اس کام کے لئے ہمیں پہلے جاننا چاہیئے کہ تمام اخلاقی یا عملی علوم میں انسانوں کی مرضی یا ارادہ سے بحث ہوتی ہے اور ان اخلاقی یا عملی علوم میں اخلاقیات ہی ایک ایسا علم ہے جس میں زیادہ تر انسان کی مرضی یا ارادہ سے بلا لحاظ اس کے ظاہری افعال میں ظہور کے بحث ہوتی ہے۔ بقیہ اخلاقی یا عملی علوم میں جس میں علم اصول قانون بھی شامل ہے انسان کی مرضی یا ارادہ سے جس کا ظہور ظاہری جسمانی افعال میں نہ ہو بحث نہیں ہوتی۔ پس ظاہر ہے کہ ہمیں اخلاقیات کے ان قوانین سے جن میں محض انسان کی مرضی یا ارادہ سے بلا لحاظ اس کے ظاہری جسمانی افعال میں ظہور کے بحث ہوتی ہے کچھ سروکار نہیں اور علم اصول قانون میں ہمیں ان کو بھی یکسر ترک کر دینا چاہیئے کیونکہ قانون میں محض انسان کی مرضی سے بلا لحاظ اس کے ظاہری جسمانی افعال میں ظہور کے بحث نہیں ہوتی ہے۔ اخلاقیات کے قوانین یا قوانین کے اخلاق میں اور صحیح معنے میں قانون میں چونکہ فرق یہ ہے کہ تمام اخلاق محض انسان کی مرضی کو منضبط کرنے کے قوانین ہوتے ہیں۔ اور اسی لئے ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کے لئے ظاہری قانون بنانا ناممکن ہے اور صحیح معنے میں قانون میں محض انسان کی مرضی کو منضبط کرنے کے کوئی قوانین نہیں ہوتے۔ علم اصول قانون میں جب تک انسانی مرضی افعال میں ظاہر نہ ہو کوئی قواعد عمل یا قوانین نہیں بنائے جاتے۔ الحاصل ہمیں علم اصول قانون میں قوانین اخلاق کے اس حصہ کو جس میں محض انسان کی مرضی سے بلا لحاظ اس کے ظاہری افعال میں ظہور کے بحث ہوتی ہے قطعاً ترک کر دینا ضروری ہوا۔

(۴) قانون اور اصول اخلاق میں فرق۔

اب رہا قوانین اخلاق کا وہ باقی حصہ جس میں علاوہ انسان کی مرضی کے ظاہری جسمانی افعال کو منضبط کرنے کے بھی قوانین ہوتے ہیں اور جن قوانین کو اصول اخلاق بھی کہتے ہیں۔ ان قوانین یا

اخلاق اور صحیح معنے میں قانون میں فرق ماخذ اور تہدید کا ہے۔ کیونکہ ان قوانین اخلاق کو وضع کرنیوالا
جماعت ایک غیر معین جماعت یعنی عوام یا عوام کا کوئی ایک حصہ ہوتا ہے۔ جو بقول پالے ماحول کے،
مثلاً آب وہوا، مقامی ضرورتوں یا حالات کے لحاظ سے یا محض شخصی یا جماعتی (Caprice)، یا وہم کی
بنا پر ان کو وضع کر دیا جاتا ہے اور عوام کی پسندیدگی کی وجہ سے ان پر عمل ہونے لگتا ہے۔ اگر کسی شخص سے
ان کی خلاف ورزی ہوتی ہے تو اس کو گناہ سمجھا جاتا ہے۔ اور ان کی خلاف ورزی نہ کرنے کی تہدید صرف
یہ ہوتی ہے کہ کچھ تو خود اس شخص کی ضمیر ملامت کرتی ہے اور کچھ عوام کی ملامت اور نفرت کا خوف
رہتا ہے۔ برخلاف ان قوانین یا اصول اخلاق کے صحیح معنی میں قانون کا (یعنے اس قانون کا جس سے علم اصول
قانون میں بحث ہوتی ہے) ماخذ ایک معین سیاسی اقتدار جسے مقتدر اعلیٰ کہتے ہیں ہوتا ہے۔ اور
ان کی خلاف ورزی کی تہدید نفرت یا ملامت نہیں ہوتی بلکہ معینہ اور معلنہ سزا ایسی سزا جس سے خلاف ورزی کرنے
کا جسمانی، مالی یا جانی نقصان ہوتا ہے یا جس سے وہ نعمت آزادی سے محروم کیا جاتا ہے۔

(۵) قانون اور قانون قدرت میں فرق۔

قانون اور اخلاق میں واضح طور پر فرق کرنے کے بعد تحلیلی اسکول کے حامی اساتذہ قوانین قدرت
اور صحیح معنی میں قانون میں بھی فرق کرتے ہیں۔ قوانین قدرت جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں وہ قوانین ہیں جن کو
عقل انسانی نے سکھایا ہے، جو انسانوں کے دلوں پر کندہ ہوتے ہیں اور جو تمام انسانوں کی ساخت ایک
ہونے کی وجہ سے مختلف اقوام اور قبائل میں پائے جاتے ہیں ان قوانین قدرت کے متعلق تحلیلی نظریہ
قانون کے اساتذہ کہتے ہیں کہ ذرا غور تو کیجئے کہ ان کا ماخذ کیا ہے۔ وہی عوام یا عوام کی عقل۔ اور ان کی
خلاف ورزی نہ ہونے کی تہدید کیا ہے، وہی خوف، نفرت یا ملامت، پس چونکہ قوانین قدرت بھی مثل
قوانین یا اصول اخلاق کے عوام کے احساس پسندیدگی پر مبنی ہوتے ہیں اور جب تک کوئی مقتدر اعلیٰ ان کو
تسلیم کر کے ان کی خلاف ورزی کے لئے سزا مقرر نہیں کرے ان کی خلاف ورزی پر خوف نفرت یا ملامت
سے بڑھ کر کوئی تہدید نہیں ہوتی ہے، اسی لئے وہ بھی قوانین یا اصول اخلاق کی ایک قسم ہیں اور علم اصول
قانون کے طالب علم کو ان قوانین قدرت کو بھی اسی طرح یک لخت ترک کر دینا چاہیئے جس طرح کہ اصول

قوانین یا اصول اخلاق کو ترک کیا تھا کیونکہ مثل اخلاقی قوانین کے قوانین قدرت اور صحیح معنی میں قانون میں فرق ماخذ اور تہدید کا ہے۔

(۶) قانون اور الہامی قانون میں فرق۔

قانون اور اخلاق میں اور قانون اور قانون قدرت میں فرق کرنے کے بعد تحکمی نظریہ قانون کے اساتذہ قانون اور قانون الہامی یا قانون الہی میں بھی فرق کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس میں شک نہیں کہ برخلاف قانون اخلاق اور قانون قدرت کے الہامی قانون کا ماخذ ایک غیر معین جماعت نہیں بلکہ ایک معین الحسینی ذات باری تعالیٰ ہوتی یا سمجھی جاتی ہے اور الہامی قوانین کی خلاف ورزی کو گناہ سمجھا جاتا ہے اور گناہ کی سزا یا تو یہودیوں کے عقاید کے بموجب اسی دنیا میں ملتی ہے یا عیسائی عقاید کے بموجب بہ روز حشر آئندہ دنیا میں ملتی ہے اور یہ سزا مالی، جسمانی اور محرومی آزادی کی شکل میں بھی ہوتی ہے۔ اس طرح پر الہامی قانون اور صحیح معنی میں قانون میں ہر امر میں مشابہت اور اتفاق ہے۔ لیکن ہمیں بھولنا نہیں چاہیئے کہ ان قوانین کے وضع کرنے والی ذات ایک فوق البشر ہستی ہوتی ہے۔ اس کی تہدید بھی ممکن ہے کہ حسب عقاید یہود دنیوی ہو لیکن وہ کچھ بہت زیادہ معین اور یقینی نہیں۔ اس لئے الہامی قوانین میں اور صحیح معنی میں قانون میں فرق وہی ماخذ اور تہدید کا ہو کیونکہ صحیح معنی میں یعنی علم اصول قانون کے معنی میں قانون کا ماخذ ایک فوق البشر ہستی نہیں بلکہ ایک معین انسانی ہستی یا جماعت ہوتی ہے اور اس کی تہدید بھی معین اور یقینی طور پر سزا ہوتی ہے۔ لہذا علم اصول قانون کے طالب علم کو الہامی قوانین کو بھی کلیتاً ترک کر دینا چاہیئے۔

(۷) قانون اور قواعد میں فرق

قانون میں اور مذکورہ بالا قوانین میں فرق کرنے کے بعد تحکمی نظریہ قانون کے اساتذہ ایک اور آخری فرق قانون اور قواعد میں کرتے ہیں۔ قواعد اگرچہ مثل قانون کے قواعد عمل ہوتے ہیں اور ظاہری امور سے متعلق معین انسانی ماخذ کے وضع کردہ ہوتے ہیں لیکن ان کا وضع کرنے والا برخلاف قوانین کے سیاسی مقتدر اعلیٰ نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ کوئی سیاسی ماتحت جماعت مثلاً کسی تجارتی کوٹھی یا کمپنی کے قواعد۔ یا ریلوے کمپنی کے قواعد۔ بہ الفاظ دیگر قوانین اور قواعد میں فرق صرف ماخذ کی نوعیت کا ہے۔ قوانین کا ماخذ سیاسی مقتدر اعلیٰ ہوتا ہے اور قواعد کا

یا فذ ایک سیاسی ماتحت جماعت۔ علم اصول قانون میں بحث قوانین سے ہوتی ہے۔ لہذا ہمیں انہیں بھی ترک کر دینا چاہیئے۔

اس طرح پر قواعد عمل کے مفہوم کی تحلیل کر کے اور یکے بعد دیگرے مختلف اقسام کے قواعد عمل کو ساقط کر کے تحکمی نظریہ کے اساتذہ بالآخران قواعد عمل تک پہونچتے ہیں جو صحیح معنے میں یعنے علم اصول قانون کے معنے میں قانون ہیں۔ اور قانون کی تفصیلی طور پر تعریف یوں کرتے ہیں۔

۸۔ قانون کی تعریف

"قانون سے صحیح معنے میں مراد انسانوں کے ظاہری عمل کا ایک عام قاعدہ ہے جس کو ایک ایسی معین انسانی قوت نافذ کراتی ہے جو ایک سیاسی معاشرہ میں مقتدر اعلیٰ ہوتی ہے۔"

مختصر الفاظ میں قانون انسانوں کے ظاہری عمل کا ایک عام قاعدہ ہے جس کو ایک سیاسی مقتدر اعلیٰ نافذ کراتا ہے یا اور بھی مختصر الفاظ میں یہ کہ قانون حکم مملکت ہے۔

تحلیلی اسکول کی قانون کی اس تعریف کے حسن و قبح پر بحث کرنے سے پہلے مختصر طور پر اس تعریف میں جو تین تصورات مملکت، مقتدر اعلیٰ، لازر حکم کے مضمر ہیں ان کے متعلق کچھ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ قانون کی اس تعریف کی پوری طرح توضیح ہو جائے۔

۹۔ مملکت

مملکت بہت سے اشخاص کے ایک اجتماع پر مشتمل ہوتی ہے۔ جو بالعموم روئے زمین کے ایک رقبہ پر قابض ہوتا ہے اور جن میں اکثریت کی یا ایک خاص معین جماعت کی مرضی یا ارادہ اس اکثریت یا معین جماعت کی قوت کی وجہ سے اس اجتماع کے کسی رکن کی مخالف مرضی یا ارادہ پر غالب رہتی ہے۔ مملکت کی یہ روایتی تعریف ہے۔ اسی کو سامنڈ نے زیادہ مختصر الفاظ میں یوں بیان کیا ہے کہ مملکت یا سیاسی معاشرہ انسانوں کا ایک اجتماع ہے جو چند خاص مقاصد کو چند خاص ذرائع سے حاصل کرنے کے لئے قائم کیا جاتا ہے اس میں اور انسانوں کے اور دوسرے اجتماعوں میں مثلاً، کلیسا، بڑی تجارتی کمپنیوں وغیرہ میں فرق وظائف کا ہے۔

یوں تو آج کل مملکت کے وظائف گوناگوں ہیں لیکن مملکت کے دو وظیفے خصوصی اصلی اور لازمی ہیں یعنے عدل گستری کے ذریعہ اندرونی امن کا قیام اور فوجی طاقت کے ذریعہ خارجی دشمنوں سے اراکین مملکت کی حفاظت۔ اس طرح پر مملکت دوسرے انسانی اجتماعوں سے اپنے ان دو خاص وظیفوں کے وجہ سے ممتاز ہوئی اور گو ان دونوں وظیفوں میں چند فرق ہیں مثلاً عدل گستری عدالتی کارروائیوں کے ذریعہ عمل میں آتی ہے تو جنگ بغیر کسی عدالتی کارروائی کے۔ یا عدل گستری مقررہ قانون کے مطابق ہوتی ہے تو جنگ بقول (inter arma leges silent) بالعموم کسی مقررہ قانون کے مطابق نہیں ہوتی۔ عدل گستری میں مملکت کی طاقت کا اندرون مملکت اظہار ہوتا ہے تو جنگ میں بیرون مملکت اور عدل گستری میں مملکت کی طاقت پس پردہ رہتی ہے تو جنگ میں بیرونی پردہ اور نمایاں۔ ان دونوں اصلی اور لازمی وظائف کے سوا مملکت کے باقی ثانوی وظائف میں دو وظیفے بہت اہم ہیں۔ ایک قانون سازی یعنے ان اصولوں کا وضع کرنا جن کے مطابق عدل گستری ہوگی اور دوسرے لگان کا لگانا جس کے لئے مملکت کے تمام وظائف کو پورا کرنے کے لئے روپیہ فراہم ہوتا ہے۔ آج کل دنیا کی ہر مملکت نے اور بھی بہت سے ثانوی وظائف کو مثلاً پوسٹ آفس تعلیم، تعمیرات، وغیرہ وغیرہ کو اپنے ذمہ لیا ہے۔ کیونکہ تجربہ سے پایا گیا ہے کہ طاقت ذرائع اور دولت کی وجہ سے مملکت ان امور کو بہ نسبت خانگی اشخاص کے اچھی طرح انجام دے سکتی ہے۔

۱۰۔ رکنیت مملکت

آج کل تمام متمدن ممالک میں رکنیت مملکت کی بنا ر استحقاق یا تو شہریت ہے یا سکونت۔ شہریت مملکت سے شخصی اور مستقل رشتہ ہوتا ہے۔ اور سکونت مقامی اور عارضی۔ اسی لئے آج کل مملکت کے ارکان وہ تمام اشخاص ہیں جو یا تو شہریت کے شخصی یا مستقل رشتہ کی وجہ سے اس کے شہری یا رعایا ہوتے ہیں یا وہ اشخاص جو وقتاً فوقتاً مملکت میں سکونت پذیر ہونے کی وجہ سے اس عارضی اور مقامی رشتہ کی بنا پر اس کے ارکان ہوتے ہیں۔ اکثر صورتوں میں یہ دونوں بنائے استحقاق ایک ہی شخص میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً اکثر برطانوی رعایا ر (شہری) برطانیہ ہی میں رہتے ہیں

اور برطانیہ کے اکثر باشندے اس کے شہری ہوتے ہیں۔ لیکن بعض صورتوں میں ایسا نہیں بھی ہوتا ہے بعض برطانوی شہری برطانوی مملکت سے باہر رہتے ہیں اور بعض ایسے لوگ بھی برطانیہ میں رہتے ہیں جو برطانوی رعایا نہیں ہوتے بلکہ اجنبی ہوتے ہیں ان دونوں قسم کے بنائے استحقاق میں شہریت کے بہ نسبت سکونت کے زیادہ امتیازات ہوتے ہیں۔ مثلاً شہریوں کو سیاسی حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ حال حال تک صرف شہری ہی برطانیہ میں زمین خرید سکتے تھے۔ اب بھی صرف شہری ہی برطانوی جہاز یا ان میں حصہ خرید سکتے ہیں۔ بیرون ممالک بھی شہریوں کی حفاظت کا فرض مملکت پر عاید رہتا ہے۔ ان زیادہ امتیازات کی وجہ سے شہریوں پر ذمہ داریاں بھی زیادہ ہوتی ہیں۔ مثلاً وہ جہاں کہیں ہیں ان پر اپنے مملکت کے قوانین کی پابندی لازمی ہوتی ہے۔ آج کل رجحان یہ ہے کہ رکنیت مملکت کے استحقاق بربنائے سکونت کو بہ نسبت استحقاق بربنائے شہریت کے زیادہ اہمیت دیجائے۔ تاریخ پر نظر ڈالنے سے ظاہر ہو جائے گا کہ چونکہ مملکتیں قومیتوں سے نکلی ہیں یعنی مملکتوں کو ایسے اجتماع اشخاص نے بنایا ہے جو زبان مذہب یا نسل کے مشترک ہونے کی وجہ سے باہم متحد تھے۔ اس لئے پہلے شہری حقوق و امتیازات کا فائدہ ارکان قوم ہی تک محدود تھا اور قومی قوانین سے اجنبی فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے۔ کیونکہ مملکت کے تحفظ اور بقا میں شہریوں ہی کو دلچسپی ہو سکتی تھی۔ بعد میں تجارت اور فتوحات کی وجہ سے شہریت محض شہریوں کی حد تک محدود نہیں رہ سکی۔ اجنبیوں کو بھی بشرط سکونت اس سے فائدہ اٹھانے دینا ضروری ہوا اور یہ ممکن ہوا کہ کوئی شخص باوجود رومن نہ ہونے کے رومن مملکت کا شہری بن سکے۔ ہم کہہ نہیں سکتے کہ آیندہ رکنیت مملکت محض سکونت ہی پر مبنی ہو جائے گی یا ہونی چاہیئے۔ بہت ممکن ہے کہ موجودہ حالت یعنی دونوں قسموں کی رکنیت مستقل ثابت ہو۔

۱۱۔ دستور مملکت

مملکت کے وظائف کے انجام دہی کے لئے ضروری ہے کہ ان کی ایک عضویت یا چند ادارے ہوں۔ مملکت کے اہم وظائف کی انجام دہی کے لئے جو ادارے ہوتے ہیں انھیں

مقننہ۔ عاملہ اور عدلیہ کہتے ہیں انھیں کے تعلقات کو منضبط کرنے والے قانون کو قانون دستوری کہتے ہیں۔
ظاہر ہے کہ ان اداروں کا یعنی مملکت کی عضویت کا فی الواقع ان کے متعلق قانون وضع ہونے سے قبل ہونا ضروری
ہے۔ واقعۃً قوم پہلے مملکت کو عملاً قائم کرتی ہے پھر مختلف جماعتوں کو مختلف مقننہ عاملہ اور عدلیہ وغیرہ کے
فرائض سپرد کرتی ہے انھیں کے عمل سے قانون اند قانون دستوری پیدا ہوتا ہے جیسا کہ بغاوت کے بعد امریکہ
کی نوآبادیوں کی مثال سے ظاہر ہوگا۔ قیام کے بعد دستوری قانون اور دستوری واقعہ کا ایک دوسرے پر عمل اور
ردعمل ہوتا ہے اور باہم وہ متوافق ہوتے جاتے ہیں گو دستوری واقعہ اور دستوری قانون میں پھر بھی کچھ نہ کچھ فرق
رہ جاتے ہیں جیسا کہ انگلستان کی مثال سے ظاہر ہوگا۔

۱۲۔ اقسام مملکت

مملکت کے اقسام کی تقسیم یا تو مین قومی نقطۂ نظر سے کی جا سکتی ہے یا ان کے دستوروں کے لحاظ سے بین قومی نقطۂ نظر سے مملکتیں یا آزاد ہیں
یعنی جبکہ وہ بذاتہٖ خود مکمل ہوں مثلاً سلطنت برطانیا یا تحت۔ جب وہ کل کے جزو ہوں مثلاً کنیڈا۔ دستور کے لحاظ سے مملکتیں فردیہ ہوتی ہیں یعنے جبکہ
وہ دوسرے مملکتوں پر شامل نہ ہوں مثلاً مملکت انگلستان یا وفاقیہ جب کہ وہ دوسرے مملکتوں پر شامل ہوں۔
مثلاً ممالک متحدہ امریکہ۔

مملکت پر اس مختصر سے تبصرہ سے ظاہر ہو گیا کہ وہ انسانوں کا ایک ایسا اجتماع ہے جو چند مقاصد کو
چند ذرائع سے حاصل کرنے کے لیے قائم کیا جاتا ہے اور جس میں ایک شخص یا جماعت کی مرضی اس اجتماع کے کسی
رکن کی مخالف مرضی پر غالب رہتی ہے۔ اس آخری پہلو پر آسٹن نے زور دیکر مملکت کی تعریف یوں کی ہے
کہ مملکت مقتدر اعلیٰ سے مراد ہے اور اس سے مراد کوئی شخص یا اشخاص ہے جن کو ایک آزاد
سیاسی معاشرہ میں اعلیٰ ترین اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ الحاصل مملکت انسانوں کا ایک ایسا اجتماع ہوا
جس میں ایک شخص یا جماعت کی مرضی اس اجتماع کے کسی رکن کے مخالف مرضی پر غالب رہتی ہے آسٹن
اس شخص یا جماعت کو مقتدر اعلیٰ اور انسانوں کے اس اجتماع کو آزاد سیاسی معاشرہ کہتے ہیں پس آسٹن کے
مقتدر اعلیٰ کی تعریف بروایتی الفاظ میں یہ ہوئی کہ:-

مقتدر اعلیٰ کی تعریف

"اگر ایک معین انسانی برتر (شخص یا جماعت) جو ایک ایسے ہی برتر (شخص یا جماعت) کا عادتاً مطیع نہ ہو اور جس کی کسی معاشرہ کی اکثریت عادتاً اطاعت کرتی ہو تو یہ معین برتر (شخص یا جماعت) اس معاشرہ میں مقتدر اعلیٰ ہے اور وہ معاشرہ بشمول اس برتر (شخص یا جماعت) کے ایک سیاسی اور آزاد معاشرہ ہے۔" سلہ

اگر غور سے دیکھا جائے تو آزاد معاشرہ کا وہ حصہ ہوتا ہے جو مقتدر اعلیٰ ہو نہ کہ خود معاشرہ۔ لیکن آزاد سیاسی معاشرہ سے ہماری مراد ایسا سیاسی معاشرہ ہوتی ہے جو دونوں پر یعنی مقتدر اعلیٰ اور ماتحتوں پر شامل ہو ایسے آزاد سیاسی معاشرہ کا متضاد وہ معاشرہ ہوتا ہے جس میں صرف ماتحت ہوتے ہیں اور جو آزاد سیاسی معاشرہ کا ایک جزو ہو سکتا ہے مثلاً ہندوستان بشمول وائسرائے کے اور برطانوی پارلیمنٹ۔

اس طرح برٹن کے نزدیک اقتدار اعلیٰ کے مفہوم میں ایک آزاد سیاسی معاشرہ ہمیشہ داخل ہوتا ہے اور اسی لئے اقتدار اعلیٰ کے مفہوم کے لئے ضروری ہوا کہ

(۱) کہ کسی معاشرہ کی اکثریت ایک ہی برتر (شخص یا جماعت) کی عادتاً اطاعت کرتی ہو۔

(۲) یہ برتر (شخص یا جماعت) ایک ایسے ہی برتر (شخص یا جماعت) کی عادتاً مطیع نہ ہو۔ یہ اقتدار اعلیٰ کے دو پہلو یا معیار ہوئے ایک مثبت دوسرا منفی۔

(۱) مثبت معیار کو پورا کرنے ضروری ہے کہ

(الف) شہریوں یا ماتحتوں کی اکثریت ایک ہی معین برتر (شخص یا جماعت) کی اطاعت کرے۔ اگر چند افراد یا مجموعۂ افراد حکمران جماعت کی مخالف ہو جائے تو اس سے اقتدار اعلیٰ کے وجود پر اس وقت تک اثر نہیں پڑیگا جب تک کہ یہ افراد یا مجموعۂ افراد اتنے زیادہ قوی ہو جائیں کہ قوم کے اکثر حصہ پر حکمرانی نہ ہو سکے۔

سلہ If a determinate human superior not in the habit of obedience to a like superior receive habitual obedience from the bulk of a given society that determinate superior is sovereign in that society and the society including the superior is a society poltical and independent.

فرض کیجئے کہ کسی قوم یا معاشرہ میں خانہ جنگی شروع ہوجاتی ہے۔ اگر اس وقت ان دو یا زیادہ متحارب جماعتوں کی طاقت تقریباً برابر ہے تو اس معاشرہ کی دو میں سے ایک حالت ہوگی اگر ہر جماعت کی اکثریت کسی ایک ہی معین برتر شخص یا جماعت کی مطیع ہو تو اس وقت معاشرہ دو یا زیادہ آزاد سیاسی معاشروں میں منقسم ہوجائے گا اور اگر ہر جماعت کی اکثریت اس طرح پر اطاعت نہ کرتی ہو تو اس وقت معاشرہ میں حالت فطری یا بدنظمی قائم ہوجائے گی۔ اس آخری صورت میں یا تو نام کو بھی نظم یا حکومت نہیں رہے گی یا اتنے چھوٹے چھوٹے معاشرے قائم ہوجائیں گے کہ انھیں مشکل ہی سے آزاد سیاسی معاشرہ کہا جائے گا کیوں کہ آزاد سیاسی معاشرہ کے لئے رقبہ کی ایک خاص وسعت اور افراد کی ایک خاص تعداد ضروری ہوتی ہے۔

(ب) اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ شہریوں یا ماتحتوں کی اکثریت عادتاً ایسے ایک ہی معین برتر شخص یا جماعت کی اطاعت کرے۔ اگر اطاعت شاذ و نادر یا عارضی ہو تو اقتدار اعلیٰ اور ماتحتی کا تعلق نہیں پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً ۱۸۱۵ء میں احلاف نے فرانس پر قبضہ کر لیا۔ احلاف کے مقتدر اعلیٰ کے احکام فرانسیسی حکومت کو اور فرانسیسی حکومت کے ذریعہ فرانسیسی قوم کو ماننے پڑے۔ لیکن چونکہ احکام اور ان اطاعت عارضی اور شاذ تھی، ان کی وجہ سے احلاف کے مقتدر اعلیٰ اور فرانسیسی قوم میں رشتۂ اقتدار اعلیٰ اور ماتحتی نہیں قائم ہوا۔ اور باوجود ان احکام اور ان کی اطاعت کے فرانسیسی حکومت مقتدر اعلیٰ اور آزاد تھی۔ اور اگر فرانسیسی قوم ان احکام اور ان کی اطاعت سے پہلے حالت فطری یا بدنظمی میں ہوتی تو ان کی وجہ سے وہ ایک آزاد سیاسی معاشرہ نہیں ہوجاتی۔

اسی طرح ایک کمزور مملکت کی آزادی معرض خطر میں یا طاقتور مملکتوں کے رحم پر منحصر ہوتی ہے کیوں کہ ایسی مملکت اور اس کے ماتحتوں کی اکثریت ان طاقتور مملکتوں کے احکام کو جو وہ کبھی کبھی صادر کرتے ہیں مانتی ہو۔ مثلاً اس کی مثال سکسن حکومت اور (Holy alliance) کے مقتدر اعلاؤں سے ملتی ہے۔ لیکن ان میں اور سکسن حکومت میں رشتہ اقتدار اعلیٰ اور ماتحتی اس لئے قائم نہیں کیا جاسکتا کہ احکام اور ان کی اطاعت شاذونادر ہوتی ہے اور باوجود ان احکام اور ان کی اطاعت کے کمزور سکسن سوسائٹی مقتدر اعلیٰ اور آزاد تھی۔

(ج) اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ مقتدر اعلیٰ ایک معین شخص یا جماعت ہو کیونکہ ایک غیر معین جماعت ایک جماعتی حیثیت سے کارفرما نہیں ہو سکتی۔ اس لئے نہ وہ احکام جاری کر سکتی ہے۔ اور نہ اُس کی اطاعت کی جا سکتی ہے۔

(د) اور نیز اسی معاشرہ کے ارکان یعنے شہریوں یا ماتحتوں کی تعداد اتنی کم نہیں ہونی چاہیئے کہ ایک آزاد سیاسی معاشرہ کے لئے ناکافی سمجھی جائے ہم معین طور پر نہیں کہہ سکتے کہ کس قدر تعداد ہونی چاہیئے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ یہ تعداد اتنی زیادہ ہو کہ خاندانوں سے آزاد سیاسی معاشروں کو ممتاز کیا جا سکے۔ وگرنہ خاندان بھی آسٹن کی تعریف میں مملکت اور آزاد سیاسی معاشرہ کے تحت آ جائیں گے ایسے پدرسری خاندان خود آزاد سیاسی معاشرہ نہیں بلکہ آزاد سیاسی معاشرہ کے رکن ہوتے ہیں۔

(۲) مقتدر اعلیٰ کے منفی معیار کو پورا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ یہ برتر شخص یا جماعت کسی دوسرے انسانی برتر معین شخص یا جماعت کی عادتاً مطیع نہ ہو جیسے مثلاً ہندوستان کا وائسرائے مقتدر اعلیٰ نہیں ہے کیونکہ وہ وائٹ ہال کے احکام کی عادتاً تعمیل کرتا ہے اور ہندوستان سیاسی معاشرہ ہے لیکن آزاد نہیں۔ اسی طرح نوآبادیاں بھی سیاسی معاشرہ ہیں لیکن آزاد نہیں۔

پس آسٹن کے نزدیک مقتدر اعلیٰ کل سیاسی معاشرہ نہیں بلکہ اس کا ایک معین حصہ ہوتا ہے۔ انگلستان میں اقتدار اعلیٰ آسٹن کے نزدیک بادشاہ ۔ دارالعوام اور رائے دہندوں کی مخصوص جماعت کو حاصل ہے یعنے رائے دہندوں کی اس جماعت کو جسے آسٹن کے زمانہ میں رائے دینے کا حق حاصل تھا۔ آج کل تو رائے دینے کا حق کل جوان مرد اور عورتوں کو حاصل ہے لیکن آسٹن کے زمانہ میں یہ حق بہت محدود تھا۔ امریکہ میں آسٹن کے نزدیک مقتدر اعلیٰ وفاقی حکومت نہیں بلکہ وفاقی حکومتوں کے مجموعہ کی اکثریت ہے۔

۱۴۔ اقتدار اعلیٰ کے چند خواص

اسی طرح آگے چل کے آسٹن نے بودین ۔ ہابس وغیرہ کی پیروی میں اقتدار اعلیٰ کے چند خواص گنائے ہیں یعنے یہ کہ :-

(۱) **اقتدار اعلیٰ ناقابل تقسیم ہے** ۔ وہ کہتے ہیں کہ اقتدار اعلیٰ بلحاظ اپنی نوعیت ہی کے ناقابل تقسیم ہوتا ہے۔ ورنہ مملکت میں ایک مرضی نہیں بلکہ کئی مرضیاں ہونے کی وجہ سے دو رائی ہو جائیگی۔ یہ صحیح ہے کہ بعض مملکتوں اور حکومتوں میں اختیارات کی تقسیم ہوتی ہے لیکن تقسیم اختیارات تقسیم اقتدار اعلیٰ نہیں بلکہ اقتدار اعلیٰ کے اختیارات کی تفویض ہوتا ہے۔ مقتدر اعلیٰ جماعت اگر چاہے تو ان اختیارات پر تصرفات کر سکتی ہے۔

(۲) **اقتدار اعلیٰ پر کوئی قانونی روک نہیں ہوتی** ۔ گو واقعتاً بہت سے روک ہوں مثلاً خوف بغاوت یعنی احکام اگر حد سے زیادہ ناقابل برداشت ہو جائیں تو محکومین ان کی پابندی نہیں کرتے۔ ہر برتر شخص یا جماعت اس واقعہ سے اچھی طرح واقف ہوتی ہے اسی طرح بعض افعال ہر مقتدر اعلیٰ کے لئے بھی ناممکن ہیں، مثلاً کسی مرد کا عورت بنا دینا۔ بین قومی تعلقات سے بھی ہر مقتدر اعلیٰ پر روک رہتی ہے مثلاً اگر کوئی مملکت محض علمی اور اخلاقی ترقی پر اپنے سارے ذرائع صرف کر دے تو ایک دوسری چھوٹی مملکت کے ہاتھوں جس نے فوجی تیاری میں کمال حاصل کیا ہو تباہ ہو جائے گی اس طرح مقتدر اعلیٰ شخص یا جماعت اپنی خصلت و کردار کے خلاف بھی کوئی فعل نہیں کر سکتی مثلاً خلیفۂ اسلام ما اسلام کو ممنوع قرار دے سکتا تھا نہ مسولینی رومن کیتھولک عیسائیت کو۔ آسٹن ان تمام حدبندیوں یا قیود سے جو مقتدر اعلیٰ پر فی الواقع ہوتے ہیں خوب واقف تھا اور بہت متاثر بھی ان کو تسلیم کرتے ہوئے اس نے یہ فرق دکھلانا چاہا کہ مقتدر اعلیٰ پر کوئی قانونی روک نہیں ہوتی یعنی مملکت میں کوئی جماعت ایسی نہیں ہوتی جو اس کے احکام یا قوانین کو ناجائز اور خلاف قانون قرار دے سکے۔ ججوں کا فریضہ اس کے نزدیک قانون کی تعبیر و اطلاق قوانین ہے چاہے کوئی جج ذاتی طور پر کسی قانون کو کتنا ہی ناپسند کرے لیکن اس پر عمل کرنا اس کا فریضہ ہے اگر مقتدر اعلیٰ پر کوئی قانونی روک ہو سکے تو پھر مقتدر اعلیٰ حادثاً کسی دوسرے کا مطیع ہو جائے گا اور مقتدر اعلیٰ ہی نہیں رہے گا اسی طرح آسٹن کے نزدیک۔

(۳) **مقتدر اعلیٰ کو نہ کوئی حق حاصل ہوتا ہے اور نہ اس پر کوئی فرائض عاید ہوتے ہیں** ۔ یعنی وہ حقوق و فرائض سے بالاتر ہے کیوں کہ ہر قانونی حق اور اس کے متلازم تصور کے لئے تین فریق ضروری ہوتے ہیں شخص جس کو حق حاصل ہو شخص جس پر فرض عاید ہو اور مقتدر اعلیٰ جو حق عطا اور

فرض عاید کرسکتا ہے ایسا حق یا فرض جس کی پابندی تہدید اور سزا کے ذریعہ کرائی جاسکے۔ بالفاظ دیگر چونکہ مقتدر اعلیٰ حقوق و فرائض کا منبع ہوتا ہے اور ان کی حفاظت کرتا ہے اس لئے اس کے خود کوئی حقوق و فرائض نہیں ہوتے اور جس طرح مقتدر اعلیٰ حقوق و فرائض کا منبع و ماخذ ہوتا ہے۔ اسی طرح۔

(۴) مقتدر اعلیٰ تمام قوانین کا ماخذ ہوتا ہے۔ یعنے بغیر مقتدر اعلیٰ کے کوئی قانون ہو نہیں سکتا۔ مقتدر اعلیٰ ہی تمام قوانین کا ماخذ ہے۔ قانون اسی کے احکام یا اسی کی مرضی کے مظہر ہوتے ہیں۔ سارے قوانین اسی سے نکلتے ہیں اس لئے مقتدر اعلیٰ کا وجود قوانین سے پہلے ہونا ضروری ہے۔

الحاصل آسٹن کے نزدیک مقتدر اعلیٰ ایک ایسا انسانی برتر شخص یا جماعت ہے کہ جس کی کسی آزاد سیاسی معاشرہ کی اکثریت عادتاً اطاعت کرتی ہے اور جو کسی ایسی ہی برتر شخص یا جماعت کی عادتاً مطیع نہیں ہوتی۔ اقتدار اعلیٰ کی خصوصیتیں یہ ہیں کہ وہ ناقابل تقسیم ہے۔ کوئی قانونی روک اس پر نہیں اور قانونی حقوق و فرائض سے وہ بالا ہے۔ اور جس طرح وہ حقوق و فرائض کا ماخذ و منبع ہے اسی طرح تمام قوانین کا وہی معین اور تنہا ماخذ ہے۔

۱۵۔ قانون کی تین خصوصیتیں۔

قانون آسٹن کے نزدیک ایسے ہی مقتدر اعلیٰ کی مرضی کا مظہر یا اس کا حکم ہے اسی وجہ سے آسٹن نے قانون کے بھی تین خصوصیتیں گنائے ہیں۔

(۱) یہ کہ وہ قانون ہدایتی ہوتا ہے یعنے قانون ایک ایسا قاعدۂ عمل ہوتا ہے جس پر عمل کرنے کے لئے کسی آزاد سیاسی معاشرہ کے ارکان کو ایسے معاشرہ کا ایک معین انسانی برتر شخص یا جماعت یعنے مقتدر اعلیٰ ہدایت کرتا ہے۔ قانون کے ایسے معین انسانی برتر شخص یا جماعت کی ہدایت ہونے کی وجہ سے وہ قانون الٰہی اور قانون قدرت سے ممتاز ہوتا ہے۔

(۲) قانون کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ تحکمی ہوتا ہے یعنے قانون حکم ہوتا ہے یا بالفاظ دیگر مقتدر اعلیٰ اپنی مرضی یا خواہش کے اظہار کے ساتھ ہی اس کی تہدید کا بھی اظہار کردیتا ہے۔ کہ اگر اس مرضی پر عمل نہیں کیا جائے تو سزا دیجائیگی۔

(۳) تیسرے یہ کہ قانون عام ہو۔ مثلاً یعنی اس سے بالعموم ایک قسم کے تمام افعال کرنے یا نہ کرنے کا حکم ہوتا ہے۔

اب ہمیں مختصر طور پر پہلے آسٹن کے نظریۂ اقتدار اعلیٰ پر تنقید کرنی چاہیے پھر اس کی قانون کی (ماہیت) اور تعریف پر نقادانہ نظر ڈالنی چاہیے اور آخر میں ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ہمیں قانون کی صحیح ماہیت دریافت کرنے میں آسٹن اور تحلیلی اسکول کے اساتذہ سے کتنی مدد ملتی ہے۔

۱۶۔ آسٹن کے نظریہ پر تنقید

آسٹن کے نظریۂ اقتدار اعلیٰ میں بہت کم صداقت اور بہت زیادہ غلطیاں ہیں۔ آپ پہلے آسٹن کے اس مقولہ پر غور کیجیے کہ انگلستان میں اقتدار اعلیٰ۔ دارالامرا اور رائے دہندوں میں ہے۔ اس قول کی ایک غلطی تو یہ ہے کہ اگر یہ آج کل بھی صحیح ہے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آج کل جبکہ ہر بالغ شخص کو چاہیے وہ مرد ہو کہ عورت حق رائے دہی حاصل ہے انگلستان میں کل بالغ مرد اور عورت مقتدر اعلیٰ اور کل نابالغ لڑکے اور لڑکیاں ماتحت ہیں اس سے قطع نظر مقتدر اعلیٰ کو بادشاہ دارالامرا، اور رائے دہندوں میں کہنا اور دارالعوام کو خارج کر دینا بقول برائس نہ صرف قانون بلکہ تاریخ کے بھی خلاف ہے۔ انگلستان کے قانون کی رو سے اقتدار اعلیٰ آسٹن کی اس جماعت میں نہیں ہے۔ تاریخ کی رو سے بھی ان دونوں میں اقتدار اعلیٰ نہیں ہے۔ اور دارالعوام کو حذف کرنا بالکل حال کے خلاف ہے۔ نیز رائے دہندوں میں اقتدار اعلیٰ کہنا واقعہ کے بالکل خلاف ہے۔ کیونکہ بقول برائس انگلستان کے رائے دہندہ قانون سازی نہیں کرتے اور نہ ان کے پاس قانون سازی کے کوئی ذرائع موجود ہیں۔ انقلابی سے انقلابی قانون کے لیے ان کی منظوری درکار نہیں ہوتی۔ اور یہاں انگلستان میں بالکل ممکن ہے کہ ایک ایسا قانون بنایا جائے جو ہے رائے دہندوں کو سخت ناپسند ہو لیکن وہ برابر اسی طرح اور اس جیسے قانون کی قوت اور وقعت رکھے گا۔ جس کے خلاف ایک بھی رائے دہندہ نہ ہو۔ پارلیمنٹ قانوناً ایسے بھی فعل کر سکتی ہے جس کی رائے دہندوں کا پسند کرنا یا اجازت دینا تو کجا یہ فعل ان کے حاشیہ خیال میں بھی نہ گذرا ہو۔ مثلاً (Septennial Act) کا وضع کرنا جس کی رو سے پارلیمنٹ نے اپنی زندگی سات سال

کی کرلی کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو رائے دہندے یقیناً اس کو شکست کر دیتے۔

انگلستان ہی کی مثال میں جس سے آسٹن انگریز ہونے کی وجہ سے بخوبی واقف تھے اور جہاں بنسبت دوسرے ممالک کے اقتدار اعلیٰ کا تعین کہیں زیادہ آسان ہے جب آسٹن سے اتنی بہت سی غلطیاں ہوئی ہیں تو ظاہر ہے کہ کہیں نہ کہیں اس کے نظریہ میں بہت بڑی خامی ہے اور دراصل خامی ہے بہت بڑی۔ اور اس کو شاید سب سے پہلے ڈائسی نے بتلایا ہے وہ یہ کہ آسٹن نے قانونی اقتدار اعلیٰ اور سیاسی اقتدار اعلیٰ میں فرق نہیں کیا ہے۔ عوام یا رائے دہندوں کو آج کل ہر جمہوریت میں سیاسی اقتدار اعلیٰ حاصل ہوتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ گو وہ قانونی مقتدر اعلیٰ جماعت کو منتخب کریں اور حکومتوں میں جگہ کرتے ہیں لیکن ان میں خود قانون سازی کے نہ کوئی اختیارات ہیں اور نہ اس کے لئے ان میں کوئی ذرائع حاصل ہوتے ہیں اس لئے آج کل سائنس سیاسی اور قانونی مقتدر اعلیٰ میں فرق کرتے اور اس کو ضروری سمجھتے ہیں۔

برائیس قانونی مقتدر اعلیٰ کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"مقتدر اعلیٰ وہ شخص یا جماعت ہے جس کی ہدایتوں کو قانون، قانونی قوت عطا کرے۔ وہ شخص یا جماعت جس میں استحقاقاً آخری قوت تمام قواعد یا منفرد قواعد یا احکام کے دینے کی ہوتی ہے اور جس (شخص یا جماعت) کی قوت خود قانون کی عطا کردہ قوت ہوتی ہے۔

مقتدر اعلیٰ کو خود قانون قوت عطا کرتا ہے غور کیجئے اور دیکھئے کہ یہ تعریف آسٹن کی تعریف سے جدا ہے۔ آسٹن کی تعریف میں مقتدر اعلیٰ کی قوت سے قانون کی قوت ہے۔ مقتدر اعلیٰ ہی کے احکام قانون ہیں۔ وہی قانون بناتا ہے اس تعریف میں مقتدر اعلیٰ کی قوت قانون سے ہے۔ اور مقتدر اعلیٰ خود قانون کا ایک حصہ ہے۔

بات یہ ہے کہ ہر مملکت کے لئے جس کی حیثیت قبائلی حیثیت سے زیادہ ہو کوئی دستور ضروری ہے۔ عوام کو سیاسی اقتدار اعلیٰ حاصل ہوتا ہے۔ وہی دستور بناتے ہیں۔ اور وہی قانون سازی کے اختیارات ایک معین شخص یا جماعت کو سپرد کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ عوام یا

بھی سیاسی اقتدار اعلیٰ کسی خاص شخص یا جماعت کو بوجہ شخصیت اور وجاہت کے حاصل ہوتا ہے۔ یہی شخص یا جماعت قانون ساز جماعت میں شریک ہو جاتے ہیں اور مرور زمانہ کے بعد بھی جس شخص یا جماعت کو سیاسی اقتدار اعلیٰ حاصل ہوتا ہے اسی کو قانون ساز جماعت میں غالب حصہ بھی ملتا ہے۔ ہمیں مضبوطی سے ذہن نشین کرنے کی جو بات ہے وہ یہ ہے کہ ہر مملکت میں ایک دستور ہوتا ہے یہ دستور وہ لوگ جنھیں سیاسی اقتدار حاصل ہوتا ہے بناتے ہیں اور ہر دستور کی رو سے ایک معین شخص یا جماعت کو قانون سازی کے اختیارات حاصل ہوتے ہیں بہ الفاظ دیگر ہر دستور میں ایک معین قانون ساز شخص یا جماعت ہوتی ہے۔ یہی قانون بناتی ہے۔ اسی کی ہدایتوں یا احکام کو قانون کی قوت ہے اس کا قانون نظم، امن اور یکسانیت کے لئے معین ہونا ضروری ہے۔ اور آسٹن کے ایک معین شخص یا جماعت پر بار بار اصرار کرنے کا فایدہ یہی ہے پس اگر ہم آسٹن کے نظریہ قتدار اعلیٰ میں قانونی اور سیاسی اقتدار اعلیٰ کا فرق کر دیں اور اس کے نظریہ کو صرف قانونی اقتدار اعلیٰ سے متعلق سمجھیں تو یہ نظریہ فائدوں سے خالی نہیں۔ بہ الفاظ دیگر آسٹن کا قانون کو ایک معین شخص یا جماعت کی مرضی کا مظہر کہنا فائدوں سے خالی نہیں۔ اس کا ایک فائدہ تو مثلاً یہی ہے یہ آج کل کے حالات کے مطابق ہے اور دوسرے یہ کہ اس سے قانون اور اخلاق وغیرہ میں واضح فرق ہو جاتا ہے نیز نظم و یکسانیت کے فوائد بھی قانون دانوں کو حاصل ہوتے ہیں۔

۱۷۔ اقتدار اعلیٰ کے خواص پر ایک نظر

اب ہمیں قانونی اور سیاسی اقتدار اعلیٰ کے فرق کو نظر رکھتے ہوئے آسٹن کے بیان کردہ اقتدار اعلیٰ کے خواص پر ایک سرسری نظر ڈالنی چاہیئے سو اگر قانونی مقتدر اعلیٰ خود قانون یا نظام قانون کا ایک حصہ ہو تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ کیوں اس پر کوئی قانونی روک نہ ہو۔ بہ الفاظ دیگر مقتدر اعلیٰ پر قانونی روک ہو سکتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انگلستان میں اقتدار اعلیٰ پر کوئی قانونی روک نہیں ہے۔ اور پارلیمنٹ کے قانون سازی کے اختیارات بغیر کسی قانونی روک کے ہیں لیکن سوائے انگلستان کے شاید ہی کسی ملک میں اقتدار اعلیٰ قانونی روک سے خالی ہے امریکہ میں قانونی اقتدار اعلیٰ پر یقیناً قانونی روک ہے۔

اس طرح اقتدار اعلیٰ قابل تقسیم بھی ہو سکتا ہے۔ دستور کی رو سے اس کی تقسیم کی جا سکتی ہے مثلاً امریکہ میں وفاقی حکومت اور ملکتوں کی حکومت میں قانونی اقتدار اعلیٰ منقسم ہے۔

یہ صحیح ہے کہ قانونی اقتدار اعلیٰ حقوق وفرائض سے بالا ہوتا ہے اس کے کوئی حقوق وفرائض
نہیں ہوتے۔ بلکہ اسی سے حقوق کی حفاظت اور فرائض کی پابندی کرائی جاتی ہے لیکن تاہم ہمیں زیر بحث
فرق کے لحاظ سے ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ مملکت میں محض اقتدار اعلیٰ ہی نہیں ہوتا۔ قانونی مقتدر اعلیٰ یہ نہیں کہہ سکتا
کہ (L'Etat c'est moi) بہ الفاظ دیگر قانونی مقتدر اعلیٰ مملکت کا ایک جزو یا حصہ ہوتا ہے۔

۱۸۔ آسٹن کی تاریخ سے بے اعتنائی

کیا تمام قوانین کا ماخذ مقتدر اعلیٰ ہی ہے؟ کیا مقتدر اعلیٰ کا وجود قوانین سے پہلے ضروری ہے؟
بہ الفاظ دیگر کیا آسٹن کا یہ قول صحیح ہے؟ آسٹن نے تاریخ سے جو خوفناک غفلت برتی یہ قول اسی کا نتیجہ ہے
اور اس کی یہ رائے تاریخی اساتذہ کی رائے کی بالکل ضد ہے۔ تاریخی اساتذہ کی رائے میں قانون کا وجود مقتدر اعلیٰ
کے وجود سے پہلے ہوتا ہے۔ قانون کا وجود پہلے اس لئے کہ قانون معاشری اور سماجی ضرورتوں کی وجہ سے پیدا
ہوتا ہے آسٹن کی جانب سے کہا جاتا ہے کہ اس کو معاشرہ یا سماج کی ابتدائی منزلوں سے بحث نہیں۔ مثلاً
سامنڈ کہتے ہیں کہ مملکت یا مقتدر اعلیٰ سے پہلے اگر کوئی قواعد ہوں تو وہ قانون سے بہت مشابہ سہی، قانون کے
تاریخی ماخذ سہی لیکن وہ خود قانون نہیں ہو سکتے۔ اس کی مثال یہ ہوگی کہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہزارہا سال قبل بندر اور انسان
میں کوئی فرق نہیں تھا لیکن کیا ضروری ہے کہ ہم اب بھی انسان کی تعریف ایسے الفاظ میں کریں جس میں بندر
کا لفظ ضرور آئے ابتدائے معاشرت یا ابتدائے ارتقاء میں دو چیزوں کا ماخذ ایک ہی سہی لیکن ارتقاء
کے بعد ان میں ضروری فرق پیدا ہو جاتے ہیں۔ تو کیا ماخذ کے ایک ہونے سے ان ضروری فرقوں کو نظر انداز
کرنا غلطی نہیں؟ یہ تو صحیح ہے۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ جدید مملکتوں میں قانون عام طور پر مقتدر اعلیٰ ہی سے
نکلتا ہے۔ وہی قانون کا ماخذ ہوتا ہے۔ اسی لئے بھی تو ہم نے مانا ہے کہ آسٹن کا قانون کو ایک معین
شخص یا جماعت یعنی مقتدر اعلیٰ کی مرضی کا مظہر کہنا فائدوں سے خالی نہیں۔ لیکن تاہم اگر ہمیں قانون اور
مقتدر اعلیٰ کے درمیانی تعلق کو صحیح طور پر سمجھنا ہے تو ہم ہرگز اس تاریخی ترتیب کو فراموش نہیں کر سکتے
کہ قوم نے پہلے معاشری اور سماجی ضرورتوں کی وجہ سے قانون بنانا اور پھر اپنے میں سے ایک جماعت
کو قانون سازی کے اختیارات دیئے حتیٰ کہ آج کل قانون تقریباً تمام تر مقتدر اعلیٰ ہی کے ذریعہ

واضح ہوتا ہے کیونکہ اس تاریخی ترتیب کو پیش نظر رکھنے سے واضح طور پر قانونی اور سیاسی مقتدر اعلیٰ کا فرق سمجھ میں آتا ہے اور جس فرق کا کرنا جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے نہ صرف مقتدر اعلیٰ کو کسی بھی دستور میں صحت کے ساتھ متعین کرنے ([illegible]) کرنے کے لئے ضروری ہے بلکہ اس کے خواص کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے بھی۔

۱۹۔ آسٹن کی تعریف قانون پر اعتراض

بنتھم اور آسٹن کی قانون کی تعریف پر کہ وہ حکم مملکت ہے تین زبردست اعتراض ہوتے ہیں پہلے ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ بنتھم اور آسٹن کی قانون کی اس تعریف سے یہ مراد ہوتی ہے کہ قانون کو مملکت نے بنایا ہے اور اس کی پابندی کلیتاً مملکت کی قوت ہی پر موقوف ہوتی ہے یعنی سزا کے اس خوف پر جو خلاف ورزی کرنیوالوں کو دلایا جاتا ہے اور اسی لئے قانون کی جو پابندی کی جاتی ہے وہ محض سزا کے خوف کی وجہ سے ہوتی ہے پہلا اعتراض اس تعریف اور اس نظریہ پر یہ ہے کہ اس سے قانون کے ماخذ کی غلط توجیہہ ہوتی ہے۔ کیونکہ بہت سی قومیں ایسی گذری ہیں کہ ان پر قانون تو ہوتا ہے لیکن کوئی ایسی مملکت یا مقتدر اعلیٰ نہیں ہوتا جو اس طرح خوف سزا دلا کر قانون کی اطاعت کرائے اور اکثر ممالک میں قواعد یا قوانین کا اکثر حصہ جس [illegible] اپنے [illegible] باہمی تعلقات منضبط ہوتے ہیں حال حال تک رواج یعنی لمبے طویل عمل پر جس کو ہر شخص سمجھتا اور جس کی ہر شخص پابندی کرتا ہے مبنی رہا ہے ان ممالک میں رواج قانون تھا اور ہے۔ اور کسی مقتدر اعلیٰ کی جانب سے اس کے اظہار اور اعلان کی اس کی پابندی کے لئے ضرورت نہیں ہوتی۔ آسٹن کی جانب سے اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ آسٹن کو ایسے معاشرہ یا سماج سے بحث نہیں جس کی حالت ابتدائی ہو۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ اس جواب سے خود اس کی تعریف قانون کے یک رخی اور غیر مکمل ہونے کا اعتراف ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ قانون کا ماخذ سمجھ میں نہیں آتا۔

دوسرا اعتراض قانون کی اس تعریف اور نظریہ پر یہ ہے کہ جدید مملکتوں میں بھی قوانین کا اکثر حصہ ایسا ہوتا ہے کہ ان کی شکل اور نہ ان کے مضمون کے لحاظ سے انہیں احکام کہا جا سکتا ہے۔

مثلاً کسی بھی جدید ترین مملکت کے ان قوانین پر نظر ڈالئے جن سے شہریوں کے باہمی خانگی تعلقات

منضبط ہوتے ہیں مثلاً تجارتی اور دیگر معاہدات کے متعلقہ شرائط ان معاہدوں کی تعبیر۔ ان سے جو ذمہ داری پیدا ہوتی ہے یا جائداد کے حقوق، وراثت اور ورثا اور وصیتوں سے برتاؤ کے طریقے۔ قانون کے اس بڑے حصہ کو احکام نہیں کہہ سکتے یہ بڑا حصہ احکام پر مشتمل نہیں۔ یہ تو وہ اصول ہیں جن کو مذہب رواج یا عدالتوں نے ایجاد کیا ہے۔ عوام نے اس کو پسند کیا اور ان پر عمل کرنے لگے۔ اور قانونی مقتدر اعلیٰ اپنے قیام اور مضبوطی سے قیام کے بعد ایسی عوام کی پسندیدگی کی وجہ سے مملکت کی قوت سے ان کی پابندی عدالتوں کے ذریعہ کرانے لگا۔ اس طرح پر ظاہر ہے کہ قوانین کے اس حصہ کو صحیح معنی میں نہ اس کی شکل اور نہ اس کے معنے یا مواد کی رو سے احکام کہہ سکتے ہیں۔ اور یہہ واقعہ آسٹن والوں کے اس جواب سے بھی نہیں بدل سکتا کہ اس قسم کے قوانین کو احکام اس لئے کہنا چاہیئے کہ جو کچھ مقتدر اعلیٰ روا رکھے وہی اس کے احکام ہیں۔ موجودہ قوانین میں صرف تعزیراتی قوانین ہی ایسے ہیں جن کی شکل گو معنی نہیں احکام کی ہے۔ اس طرح پر قانون کی یہ تعریف کہ وہ حکم مملکت ہے موجودہ قوانین کے بھی ایک بڑے حصہ پر بھی صادق نہیں آتی۔ اور اسی لئے جدید مملکتوں کے قوانین کی تعریف کی حیثیت سے بھی غلط ہے۔

تیسرا اعتراض اس تعریف پر یہہ ہے کہ یہ غلط ہے کہ قوانین کی اطاعت محض یا زیادہ تر خوف کی وجہہ سے کی جاتی ہے۔ قوت سے مملکت کا وجود نہیں ہوا ہے اور نہ مملکت کی اساس صحیح معنی میں قوت پر ہے۔ مملکت کی بنیاد تو اس صداقت پر ہے کہ انسان ایک معاشری ہستی ہے۔ وہ اپنی ساخت کے لحاظ سے باہم مل کر رہنے ایک دوسرے کی نقل کرنے بہت باتوں کو روا رکھنے اور بہت سے پسندیدہ امور کی اطاعت کرنے پر مجبور ہے۔ انسانوں کی ساخت ہی کے انہی خصوصیتوں پر مملکت کی اساس قائم ہے۔ ظاہر ہے کہ نہ صرف یہ سچ ہے بلکہ بدیہی امر ہے کہ قوانین کی اطاعت کرانے مملکت کی قوت ضروری ہوتی ہے ایسی قوت کے استعمال کی قابلیت سے مملکت کی شیرازہ بندی قائم رہتی ہے۔ لیکن ہمیں پوچھنا چاہیئے کہ مملکت قوت کا استعمال کرنے پر کیوں اور کس طرح قادر ہوتی ہے اس کا جواب یہی ہے کہ ایک منظم اور معمولی مملکت میں وہی اثرات اور رجحانات جن کی وجہ سے انسان باہم مل کر رہنے لگے۔ ان کو باہم ملا کر رکھتے بھی ہیں اور ان کے ہاتھوں ان کی اپنی پسند اور مرضی اور ارادہ سے

مملکت کو وہ قوت اور قوت حاصل کرنے وہ ۔ دیر یہ عطا کرتے ہیں جو مملکت کے اغراض کے لئے ضروری ہوتی ہے ۔ تاریخ میں جن ممالک میں خودسریاں قائم بھی ہوئی ہیں اور میکسیکو اور جنوبی امریکہ کے بعض ممالک میں جو اب بھی قائم ہوتی رہتی ہیں تو یہاں بھی ہمیں بھولنا نہیں چاہیئے کہ مملکت کی بنیاد محض قوت پر نہیں ہوتی ۔ ان خودسر حکمرانوں کو فوج کی تائید حاصل ہوتی ہے اور فوج اور نیز عوام کے ایک حصہ کی پسند اور مرضی ہی سے وہ راج کرتے ہیں اور پھر یہ بھی ہے کہ انہیں چونکہ عوام کی اکثریت کی مرضی یا پسندیدگی حاصل نہیں ہوتی ، ان کی پائیداری بہت ہی کم ہوتی ہے ۔ اس لئے ظاہر ہے کہ محض قوت درحاصل مملکت یا قانون کے لئے بہت ہی ناپائیدار اساس ہے ۔

اس طرح پر ان تین اعتراضوں میں ہم نے دیکھا کہ نہ صرف تاریخ کی رو سے بلکہ نفسیاتی اور عمرانیاتی نقطۂ نظر سے بنتھم اور آسٹن کی قانون کی تعریف اور نظریہ کچھ زیادہ وقیع ثابت نہیں ہوتا۔ مختصر اور عام تعریفیں بالعموم وقیع نہیں ہوتے ۔ گو یہ کم الفاظ میں ہوتے ہیں لیکن آسان نہیں ہوتے ہیں ۔ وہ حقیقت پر زیادہ مبنی نہیں ہوتے ۔ بلکہ مصنوعی ہوتے ہیں ۔ اور ان کے مختصر الفاظ میں بہت سے مغالطے ہوتے ہیں اور انسان اور معاشرت کی توجیہات آسان اور مختصر تعریفوں سے ہونا معلوم ۔

آسٹن کی قانون کی تعریف پر تنقید کو ختم کرنے سے پہلے ہمیں اس پر ایک اور اہم اعتراض کو ملحوظ رکھنا چاہیئے وہ یہ کہ چونکہ بین قومی قانون اور نیز قانون دستوری کے ایک بڑے حصے یعنے دستوری روایات کو نافذ کرنے معینہ اور معلنہ تعدید نہیں ہوتی اور نہ یہ ایک آزاد سیاسی معاشرہ کے مقتدر اعلیٰ کی مرضی کے مظہر ہوتے ہیں ، اسی لئے آسٹن بین قومی قانون اور نیز دستوری روایات کو قانون ماننے سے انکار کرتے ہیں اور اس طرح ان کی تعریف سے قانون کا یہ بڑا اور اہم حصہ بھی نکل جاتا ہے اور اس طرح پر بھی ان کی قانون کی تعریف بحرفی اور غیر مکمل ہو جاتی ہے ۔

۲۔ قانون کی ماہیت کی دریافت

ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ ہمارا اصلی مسئلہ قانون کی ماہیت کی دریافت ہے ۔ یعنے ہمیں اس سوال کا جواب دینا ہے کہ قانون کیا ہے ۔ اس کے متعلق ہم نے دیکھا کہ انگلستان کے سوائے یورپ کے

اکثر ممالک کے اساتذہ کے نزدیک قانون ایک مطلق عالمی اور اخلاقی اصول کا مظہر ہے یعنے قانون وہی ہے جو فطرت یا عقل انسانی کا سکھایا ہوا ہے یا اس کا مظہر ہے۔ قانون کی ماہیت میں فطرت یا عقل انسانی کے دخل سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس سے قانون کی ماہیت کا پوری طرح پتہ نہیں چلتا۔ کیوں کہ ایک تو محض فطرت اور عقل انسانی کو قوانین کی اساس قرار دینے اور منطقی نتائج نکالنے سے قانونی نقطۂ نظر سے کچھ زیادہ مفید باتیں معلوم نہیں ہوتیں۔ بلکہ ہم مجردات کے بھول بھلیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں کیوں کہ تمام قوانین کی جان تجربہ ہے نہ کہ منطق۔ اور دوسرے یہ کہ محض فطرت یا عقل انسانی کسی مجموعۂ قوانین کی اساس نہیں ہو سکتی جب تک کہ ان کے تبلائے ہوئے اور سکھلائے ہوئے قوانین تجربہ کی کسوٹی پر بھی پورے نہ اترے ہوں۔ اس طرح یورپ کے اکثر اساتذہ کی قانون کی ماہیت کی یہ تعریف غیر مکمل اور ادھوری ہے۔ اور یہ ہمیں لئے جچی نہ اس تجربہ سے استناد وسا تھ ہے اسی طرح ہم نے دیکھا کہ انگریزی اساتذہ قانون کو مرضی کی پیداوار کہتے ہیں۔ یعنے قانون وہ قاعدۂ عمل ہے۔ جس سے مقتدر اعلیٰ کی مرضی کا اظہار ہوتا ہے۔ یا قانون وہ قاعدۂ عمل ہے جو حکم مملکت ہوتا ہے ان کے اس نظریہ کو حکمی نظریۂ قانون کہتے ہیں۔ اس کی خامیوں مثلاً سیاسی اور قانونی مقتدر اعلیٰ کا فرق نہ کرنے یا اس سے قانون کے ماخذ کی غلط توجیہہ ہونے یا موجودہ مملکتوں میں بھی بہت سے قوانین مثلاً معاہدہ، وراثت، وصیت یا ازدواج کے حکم مملکت نہ ہونے کے واقعہ سے اگر ہم قطع نظر کر جائیں تو اس نظریہ کا مغز یا نچوڑ یہ نکلتا ہے کہ قانون کی ماہیت جبر ہے۔ یعنے قانون وہ قاعدۂ عمل ہے جس کی بالجبر اطاعت معینہ اور معلنہ تہدید کے ذریعہ کرائی جاتی ہے۔ اس امر سے تو انکار نہیں ہو سکتا کہ قانون کی ماہیت میں جبر کا بھی ایک پہلو داخل ہے۔ اور یہی حکمی نظریہ قانون میں صداقت کا جزو ہے۔ لیکن قانون کی ماہیت کی دریافت میں یہ پوری صداقت نہیں کیونکہ جبر یا قوت قانون کی پوری ماہیت نہیں۔ پہلے تو اس لئے اگر جبر ہی قانون کی ماہیت ہے تو وہ صرف ماتحتوں اور شہریوں پر قابل پابندی ہوگا اور مملکت کے مقتدر ترین شخص یا جماعت پر اس کی پابندی لازمی نہیں ہوگی۔ مثلاً انگلستان میں پارلیمنٹ عدالتوں کے تعزیری اور جبری احکام

کی پابند نہیں اور نہ شاہیوں میں بادشاہ قانونی کارروائیوں کی گرفت میں آسکتے یا اس کے پابند ہوسکتے ہیں
ان صورتوں میں کہنا پڑتا ہے کہ قوانین جن کی پابندی ماتحتین سے جبر یا قوت کے ذریعہ کرائی جاتی ہے
مقتدر اعلیٰ شخص یا جماعت اس کی پابندی اس وجہ سے کرتے ہیں کہ فی الجملہ وہ قوانین کی پابندی اور اطاعت
کرنے کو اپنے لئے پسند کرتے ہیں۔ اس پسندیدگی کے وجوہات مختلف ہوسکتے ہیں مثلاً خوف بغاوت یا رائے
عامہ کا لحاظ۔ یا اپنے قول کا پاس۔ غرض پسندیدگی کے وجوہات چاہے مختلف ہوں لیکن ان مملکتوں
میں مقتدر اعلیٰ جماعت کی قانون کی پابندی پسندیدگی کی وجہ سے ہوتی ہے نہ کہ جبر یا قوت کی وجہ سے
اور شاید بہت سے شہری بھی قانون کی پابندی اور اطاعت پسندیدگی ہی کی وجہ سے تہدید کو سوچے
اور اس سے متاثر ہوئے بغیر کرتے ہیں۔

اس طرح جبر یا قوت قانون کی پوری ماہیت اس لئے بھی نہیں کہ قانون بین الاقوام کی پابندی
کرانے کوئی جبر یا قوت یا تہدید نہیں ہوتی۔ اس لئے تحکمی نظریہ کے اساتذہ اس قانون کو قانون ہی نہیں
کہتے بلکہ صریحی یا ایجابی اخلاق کی ایک شاخ کہتے ہیں لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیوں کہ قانون بین الاقوام
کی عملاً وقعت بہت ہوتی ہے۔ ہر صورت میں نہ سہی لیکن بالعموم اس کی پابندی کی جاتی ہے۔ اور
اس پابندی یا اطاعت کی وجہ بھی پسندیدگی ہے۔ آزاد مملکتیں اس امر کو پسند کرتے ہیں کہ اثنائے
جنگ میں ڈم ڈم کی گولیاں نہ استعمال کی جائیں، یا صلیب احمر کی جماعتوں پر آتشباری نہ کیجائے
یا غیر جانبدار مملکت کی غیر جانبداری کا لحاظ رکھا جائے اور اس پسندیدگی کے وجوہات وہی اپنے
قول یعنے صلحناموں کا پاس اور دنیا کی متمدنہ ممالک کی رائے عامہ کا لحاظ ہوتے ہیں۔ یہی حال دستوری
روایات کا بھی نظر آتا ہے کہ ان کی بھی پابندی کی بنیاد زیادہ تر مقتدر اعلیٰ جماعت کے مختلف اجزاء کی
پسندیدگی ہے۔

اسی طرح جبر یا قوت قانون کی پوری ماہیت اس لئے بھی نہیں کہ بہت سی صورتوں میں قانون
کی تہدید ناکافی ہوتی ہے۔ اور اس کا کوئی علاج یا چارہ کار نہیں ہوتا۔ مثلاً اگر کسی تجارتی انجمن اتحاد
(Trade union) کے کارندوں نے الف کے کارخانہ کے مزدوروں سے ہڑتال کرادے

اور یونین کے نمائندے شخصی طور پر ذمہ دار بھی ٹھہرائے جائیں تو کیا ان کی شخصی ذمہ داری سے ہڑتال کی وجہ سے الف کے لاکھوں کے نقصان کی تلافی ہو سکتی ہے؟ اسی طرح اگر کوئی شخص راستہ میں الف کو ٹکر دے کر سخت جسمانی نقصان پہونچائے اور عدالت مقدمہ کے حالات کے لحاظ سے ہزاروں کا ہرجانہ بھی دیدے اور اس شخص میں اس ہرجانہ کی ادائی کی استطاعت نہ نکلے تو کیا ایسی صورت میں قانون کی تہدید ناکافی نہیں؟

۲۱۔ خلاصہ بحث

خلاصہ یہ کہ قانون کی ماہیت کو جبر یا قوت کہنا قانون کی ماہیت کی یکرخی اور غیر مکمل تعریف کرنا ہے۔ جبر یا قوت قانون کی ماہیت کا صرف ایک پہلو ہے اور گو ہم اس کو قانون کی پابندی کرانے کا مناسب ترین ذریعہ بھی سمجھیں، وہ قانون کی پوری ماہیت نہیں۔ قانون کی ماہیت کو پوری طرح بیان کرنے ضروری ہے کہ ہم اس یکرخی تصویر کی تکمیل پسندیدگی سے قانون کی معاشری ضرورتوں کی پیداوار ہونے کے واقعہ سے اور نیز قانون کے مدنظر جو مقاصد ہوتے ہیں ان کے بیان سے کریں۔

پہلے اس نظریہ کو لیجئے جس کی رو سے قانون معاشری یا سماجی ضرورتوں کی پیداوار ہے یہ علم اصول قانون کے تاریخی اسکول کا نظریہ ہے۔ اس کا سب سے بڑا استاد ساوینی (۱۷۹۹-۱۸۶۱) ایک جرمن ہے۔ (Ehrlich) جس نے ساوینی سے اس کے تنقید کے نظریہ میں اختلاف کیا۔ کہا ہے کہ موجودہ علم اصول قانون کی ابتدا ساوینی سے ہوتی ہے۔ قانون کی ماہیت کی بابتہ ساوینی کی رائے کو مختصر ترین الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ قانون کسی شخص کی نہیں بلکہ جمیع اشخاص کی تخلیق ہے اور وہ معاشری اور سماجی ضرورتوں کے موافق ہوتا اور اسی وجہ سے بنایا جاتا ہے۔ وہ مجرد اصول سے نشو و نما نہیں پاتا ہے کیونکہ ابتدائی معاشرت میں ایسے مجرد اصول نہیں ہوتے بلکہ اس کا نشو و نما عملی ضرورتوں کی وجہ سے ہوتا اور معمولی روزمرہ کی ضرورتوں کی وجہ سے بنایا جاتا ہے۔ ایک وقت اسی طرح پر بن جانے کے بعد اس کی پابندی۔ عادت اور نقل کی انسانی خصوصیتوں کی وجہ سے ہونے لگتی ہے۔ قانون کی اس ابتدائی حالت میں بہت زمانہ تک۔ باقی نہیں رہتا بہت جلد اس میں

اصطلاحی عنصر شریک ہو جاتے ہیں کیونکہ اسکے اطلاق دینے میں اطلاق دینے والے اشخاص ایک حد تک نئے قوانین بناتے ہیں اس طرح پر روایاتی قانون کے ساتھ ساتھ نظائر اور قانون سازی کے ذریعہ بھی قانون ظہور پذیر ہوتا ہے۔ ماضی کے ساتھ ساتھ حال کی ضرورتوں کا لحاظ ہو جاتا ہے اور روایات اور تغیر کے درمیان ایک تناسب پیدا ہو جاتا ہے جو تمام قوانین کی زندگی کا اہم اصول ہے ۔

ساوینی اور تاریخی اسکول کے اساتذہ کا صحیح موقف یہی ہے اور اس کی صداقت عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے چونکہ اس میں حال کی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ ماضی کے تجربہ کا لحاظ کیا جاتا ہے ۔ اس لئے اس کو احتیاط کے ساتھ قدامت پسندانہ موقف کہہ سکتے ہیں بمقابلہ اسکول کے اساتذہ کا موقف بھی یہی معلوم ہوتا ہے چنانچہ مین، ساوینی ہی کے کام کو کرتے اور اس میں اضافہ کرتے نظر آتے ہیں ۔

قانون کی ماہیت کی پوری تصویر کھینچنے کے لیے ان مقاصد کا مختصر ذکر کرنا جو قانون کے پیش نظر رہتے ہیں ۔ اور جو قانون کے ذریعہ پورے ہوتے ہیں ضروری ہے ۔ یہ مقاصد فصل خصومات کے ذریعہ حفظ امن، عدل گستری، کل کی آزادی کے ساتھ ساتھ فرد کی زیادہ سے زیادہ آزادی کا حصول اور اس کی حفاظت اور نیز زیادہ سے زیادہ اشخاص کی زیادہ سے زیادہ خوشی اور خوشحالی کا بہم پہونچانا بیان کئے جاتے اور بڑی حد تک ہوتے ہیں ۔ بالفاظ دیگر قانون کو جو معاشری ضرورتوں کی پیداوار کہا جاتا ہے تو اس جملہ سے ہمیں یہ بھی سمجھنا چاہیئے کہ یہ معاشری اور سماجی ضرورتیں واقعتہً ہوتی ہیں - اور قانون کے ذریعہ سے ان کو حاصل کیا جاتا ہے - یہی قانون کے مقاصد ہوتے ہیں - شعوری قانون سازی میں یہی پیش نظر رہتی ہیں -

اردو کے اسالیب بیان

از جناب سید محمود احمد صاحب بی اے، ال ال بی (عثمانیہ)

جو لوگ کتب کا مطالعہ کرتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ بعض تحریریں ایسی ہوتی ہیں کہ پڑھتے وقت انسان کا دل پسیجتا ہے۔ آنکھوں میں پانی آجاتا ہے۔ کوئی قصۂ غم اس قدر موثر پیرایہ میں بیان کیا جاتا ہے کہ پڑھنے والا بغیر متاثر ہوئے نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح بعض تحریریں ایسی ہوتی ہیں کہ پڑھتے وقت بے ساختہ قہقہہ نکل پڑتا ہے اور قریب کے لوگ دیکھنے لگتے ہیں کہ کتاب پڑھتے پڑھتے ہنسی کیوں آگئی کوئی دیوانگی تو نہیں پیدا ہوگئی؟ بات یہ ہوتی ہے کہ بعض جگہ کتاب کی تحریر چٹکیاں لینے لگتی ہے۔ پڑھنے والا اس کا اثر قبول کرنے پر مجبور ہو جاتا اور مجبور ہو کر ہنسنے لگتا ہے۔

یہ دو متضاد اثرات مختلف اسلوب بیان کا نتیجہ ہیں۔ لکھنے والے کی خوبی ہوتی ہے کہ وہ پڑھنے والے کو کبھی تڑپا دے کبھی گرما دے اور کبھی ساکت و صامت بنا دے۔

اب اس طرز بیان کی حقیقت پر غور کیا جاتا ہے جس کا اثر فطرت انسانی پر پڑتا ہے کبھی وہ انسان کو ہنسا دیتا اور کبھی رلا دیتا ہے۔

مافی الضمیر یا دل پر جو کچھ گذرتا ہے اس کی ماہیت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یا تو اس کا تعلق محسوسات سے ہوتا ہے یا دوسری ذہنی قوتوں سے۔ حواس سے انسان کو معلومات حاصل ہوتی ہیں مثلاً وہ دیکھتا ہے، سنتا ہے، چکھتا ہے، سونگھتا ہے اور لمس سے انسان محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح ذہنی قوتوں سے بھی کام لے کر بہت سی معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ کبھی حافظہ سے کام لے کر اس مواد پر جو خارجی اشیا رسے حواس کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے تخیل کی رنگ آمیزی کی جاتی ہے اور ایسی معلومات حاصل کی جاتی ہیں جو صرف حواس کے ذریعہ حاصل نہ ہو سکتی تھیں۔ گویا علم یا معلومات کے ماخذ تین قرار پائے۔ ایک کا تعلق

بالکلیہ حواس سے ہوتا ہے، دوسرے کا بالکلیہ ذہنی قوتوں سے اور تیسری قسم معلومات کی حواس اور ذہنی قوتوں کے مشترک عمل سے حاصل ہوتی ہیں حواس کے ذریعہ جو خارجی علم ہوتا ہے اس میں بھی دماغ کی بعض قوتیں کام کرتی ہیں لیکن ان معلومات میں جو تمام تر حواس پر مبنی ہوں، اور ان میں جو قوای ذہنی کے مرہون ہوں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اسی لیے بعض معلومات کو خارجی اور بعض کو داخلی معلومات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(الف) ذاتی یا داخلی معلومات کے بھی مختلف اجزا ہوتے ہیں یا تو ان کا تعلق انسان کی نفسی جذبات کیفیات خواہشات اور میلانات سے ہوگا مثلاً ان میں غم، غصہ، عشق، رشک، حسد، خوشی، مسرت، یاس اور امید کے جذبات کی ترجمانی ہوگی یا اور نفسی کیفیات کا بیان ہوگا۔ کردار نویسی ان ہی داخلی معلومات سے تعلق رکھتی ہے۔

(ب) دوسرے وہ معلومات ہیں جو بالکلیہ محسوسات سے متعلق ہوں گے مثلاً محسوسات بصر کو لیجئے، انسان باغ کو دیکھتا ہے اس میں سبزہ ہے، درخت ہیں، پھول ہیں، پھولوں میں خوشبو ہے اور اس خوشبو کو پسند کرنے والے کچھ پرندے بھی ہیں، یہ بہار تھی۔ اس کے بعد خزاں آتی ہے چمن سب اُجڑ جاتا ہے فقط ویرانی ہی ویرانہ رہ جاتا ہے۔ غرض کہ خوشنما مناظر دلفریب فطرتی نیرنگیاں، جھاڑ، پہاڑ، چاند تارے، ندی، نالے، جمادات، حیوانات، غرض کہ خارجی فطرت کے جملہ پہلو پیش نظر ہوتے ہیں۔

(ج) اس خارج کی دنیا کا اثر فطرت انسانی پر جو کچھ پڑتا ہے وہ بھی بیان کا موضوع بن جاتا ہے۔ انسان باغ کو دیکھتا ہے، ہر چیز سبز و شاداب ہے وہ خود بھی یا تو مسرت محسوس کرتا ہے یا ان مسرتوں میں اس کا غم اور بڑھ جاتا ہے۔ اس خارجی دنیا سے اس کی اندر کی دنیا میں تلاطم پیدا ہو جاتا ہے اس کے دل کی تاریکی اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ ان حالات میں وہ جو کچھ بیان کریگا اس کا تعلق خارج اور ذات کے مشترکہ تجربہ کا نتیجہ ہوگا۔

معلومات کا تیسرا ماخذ بالکلیہ ذہنی ہوتا ہے اس کی مثال علوم ذہنی سے مل سکتی ہے مثلاً فلسفہ ہے۔ فلسفہ میں مابعد الطبیعات، اخلاقیات، نفسیات، جمالیات، منطق داخل ہیں، اسی طرح سائنس نظری ہے جس میں طبعیات کیمیا و ریاضی داخل ہیں، تاریخ بھی ایک ماخذ ہو سکتی ہے جس میں علم سیاسیات و دستور وغیرہ شامل ہیں ان تمام علوم کا تعلق ذہن سے ہوتا ہے۔ ان تمام نظری اور عملی معلومات کی تقسیم میں نے مضمون

زیر بحث کی سہولت کے لئے دو عنوانوں میں کی ہے۔

۱۔ ادب جس میں نظم، نثر، ڈرامہ، ناول، اور فسانے داخل ہیں۔

۲۔ دیگر علوم جس میں فلسفہ، سائنس، تاریخ، وغیرہ داخل ہیں۔

ادب کا لفظ اگر وسیع معنی میں استعمال کیا جائے تو ان تمام بیان کئے ہوئے معلومات پر حاوی ہوگا۔ اور اگر محدود معنی لئے جائیں تب بھی ادب میں نظم، نثر، ڈراما، ناول اور فسانے تو ضرور داخل ہوں گے، یہ تقسیم اس لئے بیان کی گئی ہے کہ ان تینوں قسم کی معلومات کے اظہار کے لئے ایک ہی طرز بیان سے کام نہیں چل سکتا۔ فلسفہ سائنس، اور تاریخ کی معلومات بیان کرنے میں ایک خاص اسلوب مناسب ہوگا اسی طرح ادب کے مختلف شعبوں میں بھی ایک ہی رنگ کا اسلوب موزوں نہ ہوگا۔

نظم، نثر ڈراما، ناول اور افسانے، ان سب میں اسلوب کے رنگ جدا جدا ہوں گے۔ ہم اس وقت صرف ادب کے اسلوب بیان سے بحث کریں گے اور ادب میں بھی خاص کر نثر کا اسلوب بیان ہمارا موضوع ہے۔ ممکن ہے کہ یہ اصول عام طور پر باہم متعلق ہو جائیں۔ لیکن ہم اس وقت ان اسالیب بیان پر غور کر رہے ہیں جو زیادہ تر اردو نثر سے متعلق ہیں۔

اسالیب بیان پر ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی ایک تصنیف موجود ہے۔ مگر اس میں الفاظ کے لحاظ سے اسالیب بیان پر بحث کی گئی ہے۔ اور ہم الفاظ سے زیادہ معنی کے اعتبار سے طرز بیان پر بحث کر رہے ہیں۔

طرز بیان کی قسمیں یہ ہو سکتی ہیں۔

(۱) قنوطی یا رجائی (۲) ظریفانہ یا سنجیدہ (۳) سادہ یا مغلق یا پیچیدہ (۴) فارسی یا عربی کی ترکیبیں ملی ہوئی۔ یا بھاشا، سنسکرت کی۔ (۵) عام روزمرہ کی زبان یا وہ جس میں ادبی شان ہو۔

ان مختلف طرز بیان کے نمونے دیکھئے۔

غم کا اظہار: وفات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر حضرت سیدہ کی حالت کا اظہار کیا گیا ہے۔

"کس کا گھر اور کہاں کا شوہر، رات دن مزار مبارک پر بیٹھی آنسو بہاتی، اور جب نیند کا غلبہ ہوتا تو

وہیں باپ کے پائنتی پڑی رہتیں حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ روٹھ کے جاتے تو وہیں تھوڑا بہت کھالیتیں حضرت علی رضؓ تشریف لے جاتے تسکین دیتے تو ان کے ساتھ گھر آجاتیں مگر جب دل میں ہوک اٹھتی اور رسول ؐ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی تو بیتاب ہو کر دیوانہ وار مزار مبارک پر گرتیں اور کہتیں "آج میرا باپ مجھ سے جدا ہو گیا ہے وہ شمع جس نے عرب کے جنگل روشن کر دیے گل ہو گئی۔ اب دنیا کی مصیبتیں میرے سامنے ہیں اور میں بے ماں کی بچی فاطمہ اس وقت باپ کے فراق میں رو رہی ہوں۔" قیامت خیز تھی وہ رات جس نے میرے سر پر مصیبت کا پہاڑ ڈھایا۔ میری زندگی برائے ہے جو اس صدمہ سے بھی ختم نہ ہوئی اے خدا کے سچے رسول میری دعا پر آمین کہہ اے الہ العالمین مصیبت زدہ بیٹی کو اس کے باپ سے ملا دے اور اس کی آنکھیں روشن کر۔" ۵

جذباتی تحریر کا نمونہ غدر کے حالات کے سلسلہ میں ایک شخص کی مدح مقصود ہے

"قومیت کا خیال سالہا سال سے مٹ چکا تھا۔ اخوت اور محبت کے اثر دلوں سے محو ہو چکے تھے البتہ مذہب سے محبت ضرور تھی مگر دنیا، ان دولت کی محبت سے زیادہ نہ تھی حکومت جا چکی تھی۔ اقبال منہ موڑ چکا تھا۔ دولت سے بہرہ نہ تھا۔ علم پاس نہ تھا۔ اغیار تو اغیار خود یار و مددگار رجان کے لیوا تھے۔ آفات کا نزول تھا، ادبار کی چڑھائی تھی ایسے آڑے وقت پر ایسے نازک زمانہ میں ایسے ہنگامہ رستخیز میں جبکہ نفسی نفسی کا عالم اور عزت و غیرت کا ماتم بپا تھا، اپنے بھائیوں کے کام آنا عین جوانمردی اور اصل انسانیت ہے۔" ۶

شبلی نعمانی کا خط بنام عطیہ بیگم۔

"شعراء اور اہل ادب عموماً کنایہ سے نام لینا نہایت بلاغت اور لطافت خیال کرتے تھے جو لوگ جہانگیر بادشاہ کی مدح میں قصیدے لکھتے تھے عموماً اس میں نور جہاں کا نام لاتے تھے۔ لیکن ہمیشہ کنایۃً۔ کبھی کسی نے تصریح نہیں کی مثلاً سعیدہ کا ایک قصیدہ ہے جس کا ایک شعر یہ ہے:- اے سایۂ خدا ز تو پر نور شد جہاں ؛ بادا ہمیشہ نور خدا سائباں تو

۵۔ ماخوذ از زہرہ تالیف راشد الخیری ص۴ ۶۔ ماخوذ از مقدمات عبدالحق۔ مرتبہ مولوی مرزا محمد بیگ ص۱

اسی اصول پر میرا یہ شعر بھی ہے اور یوں صراحتاً تمہارے لئے خیر مقدم وغیرہ سب کچھ لکھ چکا ہوں۔ اور علیہ لکھنے پڑھنے کی کیا بات ہے، میرا ہر رونگٹا اور ہر موئے بدن تمہاری توصیف و تعریف کا ایک شعر ہے"۔[1]

سادہ و رجائی تحریر کا نمونہ۔

"مدت کے بعد خط آیا تسلی بھی تسکین بھی خشم و عتاب بھی زخموں پر نمک کہ دیا۔ اور وہاں نمک پاشی بھی کی۔ خط اچھے اچھے حرفوں والے پیارے پیارے مطلب والے آ۔ بہت راہ دکھائی تجھ کو پہلے آنکھوں سے لگاؤں کلیجے پر رکھوں۔ آنکھوں اور دل پر بھی۔ جو بہتر کہتا ہے اور مجھ کو تکتا ہے۔ تو کس کا نامہ ہے؟ تجھ میں کیا لکھا گیا ہے؟ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب۔ قاصد پر نثار کیا ہی اچھا پیام لایا ہے ہاں تو نے یہ تاکید کر دی ہے کہ میرے مکتوب کا ادب کیا جائے۔ ناپاک ہاتھ نہ لگیں دل و جان سے منظور۔ پیارے نیارے کا خط ہے بھلا اس کی بے ادبی ہو سکتی ہے"۔[2]

ظریفانہ طرز تحریر۔ مچھر کے متعلق۔

"یہ بھنبھناتا ہوا ننھا سا پرندہ بہت ستاتا ہے۔ رات کی نیند حرام کر دی ہے۔ ہندو مسلمان، عیسائی یہودی، سب بالاتفاق اس سے ناراض ہیں۔ ہر روز اس کے مقابلہ کے لئے تیار ہوتی ہیں۔ جنگ کے نقشہ بنائے جاتے ہیں مگر مچھروں کے جنرل کے سامنے کسی کی نہیں چلتی شکست پر شکست ہوتی چلی جاتی ہے"۔[3]

"موحد دنیا میں اور سیکڑوں ہوتے چلے آئے ہیں۔ مگر توبہ توبہ خدا کسی کو میرے دوست مشر جیسا موحد نہ کرے، بندۂ خدا کو دنیا سے کوئی واسطہ ہی نہیں رہا تھا۔ جب دیکھو اپنے دارالتجربہ میں بیٹھے ہیں جب جاؤ، اس کو توڑ اس کو جوڑ رہے ہیں۔ بیٹھے بیٹھے انڈہ آ جاتی ہے مگر وہ اللہ کا بندہ یہ بھی نہیں پوچھتا کہ میاں خیریت سے تو ہو"۔

"اگر باپ دادا نے جائداد نہ چھوڑی ہوتی تو میرے یار کبھی کے محتاج خانہ پہنچا دیئے گئے ہوتے" "وہ یا مین یہ گھوڑا کہاں سے مار لائے اور لا کر کہاں رکھا ہے کہ دارالتجربہ میں کیا خون کا امتحان کر بیٹھو

---

[1] ماخوذ از مقدمات عبدالحق حصہ دوم صفحہ ۱۱ [2] ماخوذ از سی پارۂ دل تالیف خواجہ حسن نظامی صفحہ ۳ [3] سی پارۂ دل صفحہ ۹۵

یا بجلی سے علاج"۔ [۱]

ایسی تحریر کا نمونہ دیکھنا ہو جو سنجیدگی اور ظرافت سے مملو ہو تو غالب کے خطوط" اردوئے معلیٰ"، میں دیکھیے۔ آج گویا وہی اُردو کے بہترین نمونے ہیں گنجلک۔ اوق اور دیگر قسم کے طرز تحریر کے نمونے "اردو کے اسالیب بیان" مصنفہ ڈاکٹر زور میں مل سکتے ہیں سنجیدہ طرز تحریر دیکھنا ہو تو حالی اور شبلی کی تصنیفات کا مطالعہ فرمایئے۔ ہم چاہتے تھے کہ مختلف رنگ کی تحریروں مثلاً قنوطی، رجائی، سنجیدہ، ظریفانہ وغیرہ میں جو امور تمیز پیدا کرتے ہیں ان کو تفصیل سے تحریرات کے نمونے دیکر بیان کیا جائے مگر یہ ایک مستقل مضمون ہے جس پر آئندہ کسی وقت توجہ کیجائیگی۔

مختلف مصنفین کی تصنیفات کے مطالعہ سے ظاہر ہوگا ایک کا طرز بیان دوسرے مصنف کے طرز بیان سے جدا ہوتا ہے کسی تصنیف میں قنوطیت اور کسی کی تحریرات میں رجائیت پائی جاتی ہے کوئی غم کے پہلو نہایت خوبی سے بیان کرتا ہے اور کسی کی تحریر میں رجائیت کا عنصر زیادہ نظر آتا ہے کسی کی عبارت بالکل سادہ اور کسی کے بیان میں طوالت اور جملوں کی ترکیب پیچیدہ ہوتی ہے۔ کسی مصنف کی تحریرات میں اضافتیں اور فارسی عربی الفاظ اور ترکیبیں ہوتی ہیں اور کسی کی عبارت میں بھاشا اور سنسکرت کے الفاظ زیادہ پائے جاتے ہیں کوئی مصنف روزمرّہ کی زبان لکھتا ہے اور کسی مصنف کی تحریرات میں ادبی شان زیادہ ہوتی ہے۔ راشدالخیری کے مصنفات میں غم کا پہلو زیادہ نظر آئیگا جب وہ رنج والم کی تصویر کھینچتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک دریا کا بہاؤ ہے کہ چلا جارہا ہے۔ الفاظ کا انتخاب جملوں کی ترتیب اور عام تحریر کا رنگ، آہ و فغاں سے بھرا ہوا نظر آتا ہے۔ برخلاف اس کے حسن نظامی وغیرہ کے طرز بیان کو دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ عام طور پر مصنف کی تحریرات میں ایک جوش مسرت اور ایک کیفیت راحت ہے۔ جس چیز کو وہ بیان کرتا ہے اس سے مسرت ہی ٹپکتی ہے زندگی کو وہ مصیبت وتکلیف کی جگہ نہیں بلکہ مقام راحت سمجھتا ہے۔ اس کو رات کی تاریکی میں دن کا اجالا نظر آتا ہے۔ یہ قنوطی اور رجائی طرز بیان ہوا۔ ظریفانہ وسنجیدہ طرز بیان کو دیکھیے جو مصنف ظریفانہ طرز بیان رکھتا ہے اس کی تحریرات ہنسانے والی ہوتی ہیں۔ وہ واقعات کے ان پہلوؤں کو روشن کرتا ہے جن سے زندگی کے بھیانک رخ نظر سے اوجھل ہو جاتے ہیں ان کو پڑھ کر انسان محسوس کرتا ہے کہ واقعی دنیا ہنسنے ہنسانے کے لئے ہے اسکی تحدیدات سے یہ واضح ہوتا ہے

[۱] ۔ مضامین فرحت حصہ اوّل ص۲

کہ دنیا بازیچۂ اطفال سے زیادہ نہیں۔ اس رنگ کے استاد انشا اللہ خان، ملا رموزی، فرحت اللہ بیگ ہیں برخلاف اس کے حالی، شبلی وغیرہ کی تحریرات میں سنجیدگی زیادہ ہوتی ہے۔ بعض خوش قسمت مصنف ایسے بھی ہیں جن کی تحریر میں سنجیدگی اور ظرافت دونوں پائے جاتے ہیں جیسے کہ مرزا غالب کے خطوط۔

حسن نظامی کی تحریر اتنی سادہ ہوتی ہے کہ اس کو سہل ممتنع کہہ سکتے ہیں وہ روزمرہ کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ الفاظ سادہ، جملوں کی ترکیب غیر پیچیدہ اور کبھی کبھی ذرہ دوں کے چٹخارے۔ لیکن یہ طرز جملہ اصناف تحریر میں بلا و کام نہیں آسکتا۔ اس کے برعکس حالی، شبلی اور سرسید کا طرز بیان ادبیات کے زیادہ موزوں ہے۔

کسی مصنف کے اسلوب بیان پر غور کیا جائے تو اس میں تین چیزیں پائی جاتی ہیں ایک تو الفاظ کا انتخاب و استعمال۔ دوسری چیز ان الفاظ کے معنی اور تیسری چیز جملوں اور خیالوں کی ترتیب، زندگی کے معمولی واقعات بیان کئے جائیں تو ان کو صاف ستھرے الفاظ میں ادا کیا جاسکتا ہے۔ لیکن جہاں زندگی کے حقایق سے بحث ہوتی ہے تو وہاں مصنف کتنی ہی کوشش کرے عام فہم الفاظ اور طرز میں بیان نہیں کرسکتا۔ الفاظ اگر غیر معمولی نہ بھی ہوں تب بھی تشبیہات، استعارے اس میں پائے جائیں گے۔ انگریزی زبان میں بہت سے مصنفین مثلاً برنارڈ شا وغیرہ ایسے ہیں کہ ان کے شاہکار تصنیفات کا سمجھنا آسان نہیں ہوتا۔ ان کے معمولی الفاظ بر مفہوم کے وہ سمندر پنہاں ہوتے ہیں کہ ان کو سمجھنے کے لیے کافی غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس مضمون میں تخیل کی گلکاریاں ہوں اس کو خواہ کتنے ہی سادہ الفاظ میں بیان کیا جائے۔ آسانی سے سمجھ میں نہیں آئے گا۔

معلوم ہو کہ ہر مصنف کا ایک خاص اسلوب بیان ہوتا ہے۔ اب یہ امر غور طلب ہے کہ آخر یہ اسلوب بیان کیوں مختلف ہوتا ہے اس کے دو وجوہ قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ ایک وجہ تو فطری ہوتی ہے ہر شخص فطرتاً خاص جذبات اور خاص میلانات رکھتا ہے یا جیسے جیسے وہ زندگی کے مراحل طے کرتا ہے اس کے جذبات، خواہشات اور میلانات میں تغیر واقع ہوتا رہتا ہے اور اسی تغیر کی وجہ سے اس کی زندگی کے نصب العین اور نقطۂ نظر میں بھی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ جس شخص کی فطرت میں غم زیادہ پیوست ہوتا ہے یا جس کی سرشت و خمیر میں غم کے اجزا زیادہ رہتے ہیں اس کا نقطۂ نظر ہمیشہ قنوطی رہے گا۔

نہ تجربہ نہ علم اس کو رجائی بنا سکتا ہے اور نہ عقل کی رہنمائی اس کو قنوطیت سے ہٹا سکتی ہے ایسے شخص کے طرز بیان میں ہر وقت قنوطیت کا رنگ جھلکتا رہے گا۔ اس کے بالکل برعکس رجائیت پسند کی فطرت ہوگی اسی طرح بعض لوگوں کا ذہن بہت سلجھا ہوا ہوتا ہے ان کے معلومات اور ان کے خیالات میں یکرنگی ہوتی ہے۔ ایسے اشخاص کا طرز بیان سلجھا ہوا اور مربوط ہوگا برخلاف اس کے اگر کسی شخص کی معلومات میں انتشار اور اس کے خیالات میں نظم نہ ہو تو ظاہر ہے کہ وہ جو چیز بیان کرے گا اس میں بھی کوئی نظم و ترتیب نہ ہوگی معلومات اور تخیل میں پراگندگی ہو تو اسلوب بیان بھی پیچیدہ رہے گا۔

اسلوب بیان کے مختلف ہونے کی دوسری وجہ اکتسابی ہوتی ہے کوئی شخص چند خاص مصنفین کو پسند کرتا ہے اور ان کے اسلوب کی نقل کرنا چاہتا ہے نقالی کرتے کرتے اس کا اسلوب بیان بھی اسی طرح کا ہو جاتا ہے یوں تو کثرت مشق سے ہر شخص کا ایک خاص اسلوب بن سکتا ہے۔

اس سے پہلے بتایا گیا ہے کہ اسلوب بیان علیحدہ موضوع کے بھی مختلف ہو سکتا ہے ڈرامہ میں اسلوب کا رنگ ناول سے جدا اور ناول نویسی کا اسلوب افسانہ نگاری سے کسی نہ کسی طرح مختلف ہوگا۔ دیگر قسم کی ادبی تصانیف کے لئے جو موزون اسلوب ہو سکتا ہے وہ ان دونوں اسالیب سے کچھ نہ کچھ جدا نوعیت کا ہوگا۔ اس وقت ان تمام اسالیب پر تفصیلی روشنی ڈالنی ممکن نہیں ہے آیندہ کسی فرصت میں ان پر تفصیلی بحث کی جائے گی البتہ چند عام اصول بیان کئے جاتے ہیں جو ہر قسم کے اسلوب بیان سے متعلق ہو سکتے ہیں۔

(۱) مصنف کو فطرت کا مطالعہ نہایت غور سے کرنا چاہیئے۔ اگر واقعات کا تعلق خارج سے پایا جائے تو ان کا اسی ترتیب سے بیان ضروری ہے جس ترتیب سے وہ مشاہدہ میں آتے ہیں۔ خارج میں ایک واقعہ کو دوسرے واقعہ کے ساتھ جو تعلق ہوتا ہے اس تعلق کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے مثلاً وہ چمن کو دیکھے تو اس پر غور کرے کہ سبزہ کو پودوں سے کیا تعلق ہے اور پودوں کو پھولوں سے کیا واسطہ ہے چمن کن چیزوں کا نام ہے اور اس کے اجزا کی ایک دوسرے کے مقابلہ میں کیا اہمیت ہے۔ اسی طرح پہاڑ، دریا، بیابان، چاند، تارے غرض کہ دنیا کی یہ سب چیزیں ایک دوسرے سے کیا تعلق رکھتی ہیں، اسلوب بیان کی عمدگی کے لئے ان سب چیزوں کے گہرے مطالعہ کی ضرورت ہے۔

(۲) خارجی اشیاء کا انسان سے کیا تعلق ہے اور ان کے تعلق سے انسان کے دل پر کیا اثرات مترتب ہوتے ہیں اس پر بھی کافی توجہ کرنی چاہیئے ۔

(۳) انسان کے جذبات خواہشات میلانات کی حقیقت کیا ہے ان سے جب کوئی متاثر رہتا ہے تو اس کی نفسی کیفیات کیا ہوتی ہیں مثلاً کسی ایسی بیوہ عورت کی تصویر کھینچنی ہو جس کا خاوند مرگیا ہو تو اس امر پر غور کرنا ہوگا کہ جب کسی عورت کے ساتھ ایسا واقعہ پیش آئے تو وہ کیا محسوس کرتی ہے اس کے احساس کی جس قدر صحیح ترجمانی ہوگی اس قدر وہ بیان موثر ہوگا۔ جب کسی واقعہ کو بیان کرنا ہو تو پہلے اس کی تصویر آنکھوں کے روبرو لائی جائے اور اس طرح بیان کیا جائے کہ پڑھنے والوں کے سامنے اس کی تصویر کھنچ جائے ۔

(۴) الفاظ جہاں تک ممکن ہو سادہ، مانوس، عام فہم استعمال کئے جائیں جملے بھی ممکن حد تک مختصر ہوں اور ان کی ترکیب بھی سادہ ہے۔ زیادہ طویل جملوں سے تحریر کا لطف باقی نہیں رہتا ایسے جملے جلد سمجھ میں نہیں آتے اور پڑھنے والے بہت جلد اکتا جاتے ہیں ۔

(۵) محض الفاظ کی سادگی کی خاطر معنی کو قربان نہ کیا جائے۔ الفاظ کی حالت جسم اور معنی کی حیثیت روح کی سی ہوتی ہے جسم سے زیادہ روح کا خیال ضروری ہے ۔

نظم کی طرح نثر میں بھی بڑی حد تک شعریت ودیعت ہونی چاہیئے جب موضوع تخلیقی ہو اور اس کا تعلق زیادہ تر تخیل سے ہو تو ظاہر ہے کہ الفاظ خیال کے بوجھ کو عمدگی سے برداشت نہ کرسکیں گے ان حالات میں معنی کو مقدم رکھنا ضروری ہے ۔ دور حاضر کے انگریزی نثر کے بعض شاہکار ایسے ہیں کہ ان کی انگریزی آسانی سے سمجھ میں نہیں آتی۔ حالانکہ اس زمانہ میں انگریزی بقول شخصے پانی ہوگئی جس برتن میں چاہو ڈال دو اسکی شکل برتن کی سی ہوجائے گی معنی کے وزن اور اہمیت کو برقرار رکھتے ہوئے سادہ الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

(۶) جس قسم کا موضوع ہو انداز بیان بھی اسی طرح کا ہو۔ درد و غم کے مضمون کو قنوطی طرز میں بیان کیا جائے تو اس کا اثر ہوگا۔ اسی طرح خوشی و مسرت کے جذبات کا رجائی پیرایہ میں بیان کرنا ضروری ہے سنجیدہ مضامین کو سنجیدہ انداز میں اور ظریفانہ واقعات کو ظریفانہ طرز میں بیان کرنا چاہیئے ۔

آخر یہ مولانا شبلی کے خیالات کا اظہار نامناسب نہ ہوگا جو انھوں نے فن بلاغت سمجھانے کے سلسلے میں

معنی و الفاظ کی مناسبت کے عنوان کے تحت ظاہر فرما دیئے ہیں۔

"حسن کلام کا ایک بڑا نکتہ یہ ہے کہ مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے الفاظ استعمال کیے جائیں۔ لفظ چونکہ آواز کی ایک قسم ہے اور آواز کے مختلف اقسام ہیں مہیب، پر رعب، سخت، نرم، شیریں، لطیف، اسی طرح الفاظ بھی صورت اور وزن کے لحاظ سے مختلف طرح کے ہوتے ہیں۔ بعض نرم شیریں اور لطیف ہوتے ہیں بعض سے جلالت اور شان ٹپکتی ہے بعض سے درد اور غمگینی ظاہر ہوتی ہے، اسی بناء پر غزل میں سادہ سہل اور لطیف الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ قصیدہ میں پر زور شاندار الفاظ کا استعمال پسندیدہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح رزم و بزم، مدح ذم، فخر و ادعا، وعظ و پند ہر ایک کے لئے جدا جدا الفاظ ہیں شعراء میں سے جو اس نکتہ سے آشنا ہیں وہ ان مراتب کا لحاظ رکھتے ہیں اور یہ ان کی کلام کی تاثیر کا راز ہے یہی نکتہ ہے کہ سعدی سے رزم اور فردوسی سے بزم نہیں نبھ سکتی۔ رزم، بزم، فخر، حسرت، شوق، ہر ایک مضمون کیلئے خاص خاص قسم کے الفاظ موزوں ہیں اور انہی الفاظ کو استعمال کرنا چاہیئے۔" [1]

مولانا شبلی کے یہ اصول نثر سے بھی اسی طرح متعلق ہیں جس طرح انھوں نے نظم کی بلاغت کے لئے ضروری قرار دیئے ہیں۔

اسلوب بیان کی یہ تمام خوبیاں ہر مصنف میں پائی نہیں جاتیں۔ اردو کو پیدا ہوئے کتنے دن ہوئے انگریزی ادب میں بھی شکسپیر کے سوا کسی دوسرے مصنف کو طرز بیان کی تمام خوبیاں میسر نہیں ہوئیں فقط

---

[1] مقالات شبلی جلد دوم صفحہ ۹۶۔

صفحہ (۳٦) سے امام غزالی
کے کلام کی خصوصیات کا مقالہ شروع ہوا ہے
بسلسلہ شمارہ گذشتہ

کے متعلق امام صاحب نے لکہا ہے کہ یہہ علم حساب وہندسہ اور علم ہیئت سے متعلق اور ان امور کی کوئی چیز علوم دینی سے متعلق نہیں بلکہ یہ تمام علوم ایسی مضبوط اور مستحکم دلیلوں پر مبنی ہیں کہ ان کے سمجھنے کے بعد ان کی مخالفت کے لئے کوئی راہ ہی نہیں ہے ۔

علم منطق کے متعلق لکھا ہے کہ اس کے مسائل کو دینیات سے کچھ تعلق نہیں ہے ۔

علم طبعی کے متعلق امام صاحب نے "المنقذ من الضلال" میں کم لیکن اپنی کتاب "تہافتہ الفلاسفہ" میں زیادہ لکہا ہے جس میں تشریح کی ہے کہ علوم طبعیات آٹھ اصولوں پر منقسم ہیں۔

(۱) وہ جو جسم سے بحیثیت جسم ہونے کے اوس کی تقسیم اور حرکت او تغیر سے اور حرکت کے توابع سے یعنی زمانہ جگہہ اور خلا سے متعلق ہیں ۔

(۲) وہ علوم جن میں آسمانوں کا اور عناصر اربع خاک و آب ۔ باد و آتش اور ان کی طبیعتوں اور ان کے اپنی اپنی جگہہ پر ہونے کی وجہہ کا بیان ہے ۔

(۳) وہ علم جن میں چیزوں کے وجود پانے اور فنا ہونے او چیزوں کی پیدائش اور بڑے ہونے اور بڈھے ہونے اور ایک چیز دوسری چیز میں منقلب ہو جانے کا بیان ہوتا ہے ۔

(۴) وہ علوم جن میں ان باتوں کا بیان ہے جو عناصر اربعہ کے باہمی امتزاج و ترکیب سے ظاہر ہوتے ہیں اور ان سب کے آثار علویہ ۔ بادل ، مینہ ، کڑک ، بجلی ، ہالہ ، قوس قزح کا ہونا بجلی کا گرنا ، ہوا کا چلنا ، بھونچال کا آنا ظہور میں آتے ہیں ۔

(۵) علم معدنیات (۶) علم نباتات (۷) علم حیوانات (۸) علم نفوس حیوانی ۔ یعنے ان قوتوں کا بیان جن سے حیوانات چیزوں کو دریافت کرسکتے ہیں اور یہ کہ نفس انسانی بدن کے مرجانے سے نہیں مرتا اور وہ ایک جوہر روحانی ہے اوس کو فنا نہیں ۔

امام صاحب فرماتے ہیں کہ یہہ اٹھوں امور تو بطور اصول کے تھے ۔ اون کے فروعات سات ہیں ۔

(۱) طب (۲) احکام نجوم (۳) علم فراست ۔ (علم قیافہ) (۴) تعبیر (۵) علم طلسمات

(۶) علم نیرنجات (۷) علم کیمیا۔ اور وہ معدنی چیزوں کے خواص کا تبدیل کرنا ہے تاکہ اس سے سونا چاندی بن جائے۔

علوم فلسفہ کے وہ چار مسائل جن سے شرعًا اختلاف لازم ہے۔

ان تمام علوم کو تفصیل وار بیان کر چکنے اور بہ شرح وبسط ان کی تعریفات سے فارغ ہونے کے بعد امام صاحب نے فرمایا ہے کہ ان علوم کے کسی امر سے شرعًا مخالفت لازم نہیں ہے البتہ صرف چار مسئلے ان علوم کے ایسے ہیں جن سے ہم کو اختلاف ہے۔

پہلا مسئلہ حکماء کا یہ قرار دینا ہے کہ دو چیزوں یعنے سبب اور مسبب کا ملنا لازمی اور ضروری ہے اور نہ تو یہ قدرت میں ہے اور نہ امکان میں ہے کہ سبب بغیر مسبب کے پیدا ہو اور مسبب بغیر سبب کے۔

دوسرا مسئلہ ان کا یہ قول ہے کہ نفوس انسانی مستقل چیزیں ہیں۔ اور خود اپنے آپ سے موجود ہیں۔ جسم میں پیوست نہیں ہیں اور موت کے معنے بدن سے ان کا منقطع ہو جانا ہے مگر وہ بدستور ہر حال میں اپنے آپ موجود ہیں۔

تیسرا مسئلہ۔ ان کا یہ قول ہے کہ ان نفوس کا معدوم ہونا محال ہے بلکہ جب یہ پائے جاتے ہیں تو ابدی اور سرمدی ہو کر ان کا فنا ہونا متصور نہیں۔

چوتھا مسئلہ۔ ان کا یہ قول ہے کہ ان نفوس کا جبکہ وہ جسموں سے علیحدہ ہو جائیں تو پھر ان کا جسموں میں دوبارہ آنا محال ہے۔

علوم فلسفہ سے متعلق امام صاحب کی رائے پر تبصرہ

امام صاحب کے اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ بجز ان چار مسائل کے ان کے نزدیک فلاسفہ کے علوم کے کسی امر سے شرعًا مخالفت لازم نہیں ہے۔ لیکن اگر ہم کو امام صاحب کی اس رائے سے بالکلیہ اتفاق نہ ہو تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے خیال میں ان علوم کے اور بعض کثرت ایسے مسائل ہیں جو اسلامی نقطہ نظر سے قابل تسلیم نہیں۔ یونانی علم ہیئت

ہی کو لیجیے کہ اس کے مسائل کو مفسرین کی اون توضیحات سے جو انھوں نے علم ہیئت سے متعلق
آیات کی کی ہیں یا احادیث و روایات مرویہ سے کیا تعلق۔ آسمانوں میں دریاؤں کا وجود۔
ایک آسمان سے دوسرے آسمان کے درمیان پانچ سو برس کی مسافت، آفتاب کا گرم پانی
کے چشمے میں ڈوبنا، عرش فلک الافلاک کے گرد چار نہروں کا ہونا۔ (ایک نور کی۔ ایک نار کی
ایک برف کی اور ایک پانی کی) یا عرش کی اتنی ہی بولیوں کا ہونا جتنی کل دنیا کے لوگوں کی
ہیں یا مثلاً زمین کے گرد بیتی کے پہاڑ کا ہونا جو زمین کا محیط ہے یا مثل سات آسمانوں پر سات
زمینوں کا پرتو ہونا اور ہر زمین کی دبازت پانچ سو برس کی راہ چلنے کے برابر ہونا اور ہر ایک
طبقۂ زمین کو ایک دوسرے سے اسی قدر فاصلہ کا ہونا، رعد کو ایک فرشتہ اور اس کی آواز
کو کڑک ماننا یا آسمانوں کو مثل ایک قبہ کے کہنا اور اس میں دروازے قرار دینا یا یہ کہنا کہ فرشتہ
جب سمندر میں پاؤں رکھ دیتا ہے تو مد ہوتا ہے اور جب نکال لیتا ہے تو جزر۔ یہ اور
اسی قسم کے بیسیوں مسائل ایسے ہیں کہ جن کو علماء نے مثل مسلمہ مذہبی روایات کے اپنی تصنیفات
میں جگہ دی ہے۔ عام مسلمان ان پر یقین رکھنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر
جلال الدین سیوطی کے مرتبہ رسالۂ ہیئت اسلامی مسمی بہ "الہیئۃ السنیۃ فی الہیئۃ السنیۃ"
کو پیش کیا جا سکتا ہے جو اسی قسم کے صدہا مسائل سے پر ہے اور جن میں سے ایک کی بھی
قدیم یونانی علم ہیئت تصدیق نہیں کرتا۔

ان حالات میں یہ کہنا کہاں تک درست ہو سکتا ہے کہ ہیئت یونانی کو مسائل
دین سے کوئی تعلق نہیں؟ ہماری رائے میں تو یہ مسائل علم ہیئت یقیناً ایسے ہیں کہ پیشوایان
مذہب اور علمائے دین یا تو ان کی تردید و تکذیب فرمائیں یا ان سے اتفاق کی صورت میں
روایات و احادیث مرویہ کی وجہ تطبیق بیان فرمائیں۔

اسی طرح علوم طبعیہ کے متعلق بھی امام صاحب کے خیال سے ہم اختلاف کرنے پر
مجبور ہیں۔ کیا علوم طبعیہ کا ان تمام امور کے وقوع سے انکار جو فوق الطبعۃ ہیں موجودہ مسائل

مسلمہ اسلام کے کلیتاً برخلاف اور معجزات انبیاء علیہم السّلام اور کرامات اولیاء اللہ سے قطعی انکار کو مستلزم نہیں ہے اور کیا علوم طبعیہ کا امکان محض کو حجت نہ قرار دینا تاوقتیکہ ان کا وقوع نہ متحقق ہو جائے، دلائل علم کلام کے بطلان کو مستلزم نہیں ہے؟ اور کیا علوم طبعیہ کا قلب ماہیت اشیاء سے انکار موجودہ اصول اسلام کے مخالف نہیں ہے؟ یقیناً طبعیات کے اس طرح کے اور بہت سے مسائل ایسے ہیں جو اصول اسلام سے متصادم ہیں۔ اور علمائے اسلام کا فرض ہو جاتا ہے کہ ان کی تردید کریں یا بصورت تائید وجوہ تطبیق پیش کریں یہی حال علم نجوم اور علم طلسمات کا ہے کہ جن کے بکثرت ایسے مسائل ہیں جن کو نہ صرف اسلام غلط اور جھوٹا بیان کرتا ہے بلکہ ان کا انکار عقلاً ہر مسلمان پر واجب ہے۔

علم کیمیا کے متعلق امام صاحب کے معلومات کی حد درجہ تحدید کا اندازہ صرف اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے مسائل کو صرف سونا اور چاندی بنانے پر منحصر قرار دیتے ہیں۔

فلاسفہ الٰہیین کے تین ما بہ النزاع مسائل جن کو امام صاحب موجب کفر قرار دیتے ہیں۔

الٰہیات کے متعلق امام صاحب نے فرمایا ہے کہ خود فلاسفہ کے مسائل الٰہیات میں اختلاف ہے۔ مگر ارسطو کا مذہب جیسا کہ فارابی اور ابن سینا نے بیان کیا ہے قریب مذہب اسلام کے ہے صرف بیس مسئلوں میں غلطی ہے تین مسئلے تو ایسے ہیں جن کے سبب سے ان کی تکفیر واجب ہے اور ۱۷ مسئلے ایسے ہیں جن کے سبب سے ان کو اہل بدعۃ کہنا لازم ہے۔ "المنقذ من الضلال" میں امام صاحب نے صرف ان تین مسئلوں کو مختصراً بیان کیا ہے۔

پہلے تو ان کا یہ کہنا کہ اجساد محشور نہیں ہوں گے اور ثواب یا عذاب روح مجرد کو ہوگا اور روحانی ہوگا نہ کہ جسمانی۔

دوسرے ان کا یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ کو کلیات کا علم ہے۔ جزئیات کا نہیں۔

تیسرے ان کا یہ کہنا کہ عالم قدیم وازلی ہے۔ باقی مسائل جو صفات کی تقریر و تفہیم سے متعلق ہیں۔

یا ان کا یہ کہنا کہ خدا اپنی ذات سے عالم ہے اور ذات سے زیادہ نہیں جانتا اور اسی طرح کے اور مسائل ہیں۔ ان مسائل میں ان کا مذہب معتزلیوں کے قریب ہے۔ اور معتزلیوں کی تکفیر واجب نہیں۔ "التفرقۃ بین الاسلام والزندقہ" میں امام صاحب نے اس کی زیادہ توضیح اور تفصیل فرمائی ہے۔ امام صاحب نے ان مساعی کی کامل تشریح کی ہے جو وہ اپنی زندگی کے بیسویں سال سے حق تک پہونچنے کے لئے برابر کرتے رہے ہیں۔ اس دشت کی اچھی طرح خاک چھاننے اور فلاسفہ و متکلمین اور باطنین کے اصول کا عمیق مطالعہ کرنے کے بعد امام صاحب نے بالآخر تامل و انجذاب اور تصوف میں اپنے نفس کے لئے ہدایت کی آخری منزل دریافت کی۔

تصوف کی پناہ لے کر امام صاحب نے اطمینان کی سانس لی اور اس کے دامن میں پہنچکر پہلا کام جو انھوں نے کیا تھا وہ اصول فلسفہ اور مبادی عقل پر جارحانہ وار تھا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ فلسفہ اور عقل کی دنیا میں اطمینان اور سکون کی توقع محال ہے۔ اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ تصوف سے اس قدر گہرا ارتباط پیدا کر کے امام صاحب نے صوفیا کے اصول اور مبادی میں کوئی نمایاں اثر پیدا کیا۔ اس کے برعکس ان کا زبردست اثر عربی فلسفہ کی تاریخ میں اس طرح ضرور نمایاں ہوا کہ اس شک اور عام انکار کو جس کا اگرچہ کہ بطور ایک اصول موضوعہ کے انھوں نے کبھی اعلان نہیں کیا تھا تاہم اس چیز کو اصول فلسفہ پر اپنے شہرۂ آفاق حملہ کے لئے بطور حربہ استعمال کیا۔

امام صاحب کی دو معرکتہ الآرا تصنیفات
مقاصد الفلاسفہ اور تہافت الفلاسفہ

ان کی تصنیفات میں دو کتابیں زیادہ شہرت رکھتی ہیں۔
(۱) مقاصد الفلاسفہ۔ (۲) تہافت الفلاسفہ۔ جن سے بحث کئے بغیر سلسلہ بیان جاری رکھنا دشوار ہے۔

مقاصد کی تالیف سے امام صاحب کا مقصد علوم فلسفہ کی تلخیص تھا۔ اس میں ہم ان
کو مسائل منطق و فلسفہ کی ارسطو کے اصول موضوعہ کے مطابق ہی توضیح و تشریح کرتا ہوا پاتے ہیں۔
اس کتاب کا ترجمہ لاطینی زبان میں ہو چکا ہے ۱۵۰۶ء میں یہہ کتاب وینس میں
"منطق العرب و حکمتہم للغزالی" کے نام سے طبع ہوئی تھی۔ انسان کی حیرانی کی کوئی حد نہیں
رہتی جب وہ ایک طرف تو مقاصد الفلاسفہ میں امام صاحب کو اصول فلسفہ کی توضیح و
تشریح میں فلاسفہ کی وکالت کرتا ہوا پاتا ہے اور پھر تہافتہ الفلاسفہ میں انہیں اصول کو
ہدم اور مسمار کرنے پر تلا ہوا۔ استعجاب کے اس جذبہ نے اکثر مفکرین کو امام صاحب کے بظاہر
اس متضاد عمل کی تاویل پر مجبور کیا۔

مقاصد کے متعلق موسیو ریتر کے خیال پر تنقید

چنانچہ مشہور مستشرق موسیو ریتر نے اپنی کتاب تاریخ الفلاسفہ جلد (۸) صفحہ (۵۹)
(Geschichte der philosophie) میں اس کی یہہ توجیہہ کی ہے کہ مقاصد کے تالیف
کے زمانہ میں امام صاحب ارسطو کے اصول فلسفہ سے متفق تھے اس کے بعد ان میں
ایک فکری انقلاب پیدا ہوا جس کا نتیجہ تہافتہ الفلاسفہ ہے لیکن مقاصد کے ایک
مقدمہ سے جو موجودہ عام لاطینی مخطوطات میں ناپید ہے۔ البتہ کتب خانہ مریون یونیورسٹی
کے دو عبرانی قلمی نسخوں میں پایا جاتا ہے موسیو ریتر کے اس خیال کی تردید ہوئی ہے اور
یہہ ثابت ہوتا ہے کہ مقاصد کی تالیف سے ان کی غرض ان تمام اصول فلسفہ کی تکذیب
تردید کے لئے خود کو تیار کرنا تھا جن کی اس درجہ بسط کے ساتھ تشریح کی گئی ہے۔
امام صاحب نے اس مقدمہ میں ایک مستفسر کے جواب میں لکھا ہے۔

لما التمسی یا اخی تالیف کتاب کامل و اضح للرد علی الفلاسفة وتبیین خطأ
مبادیھم لتتقی بذالک الوقوع فی الخطاء، ولکن ھذا عبث قبل ان تعرف
مبادیھم و لتعالیمھم تمام المعرفة لان الرغبة فی الوقوف علی خطاء

لبعض الآراء قبل الوقوف عليها تماما فالوقوف لعله خطا ينتهى بالعمى والخلط تظهر لي من الضرورى قبل الشروع فى نقض آراء الفلاسفة ان اضع كتاباً. اشرح فيه ميول علومهم المنطقة والطبيعية والالهية دون التميز بين الخطاء والصوب فى مبادئهم لان غايتى هى شرح نتائج اقوالهم دون الاسهاب فى امور زائدة عن الحاجة ولا علاقة لها بالبحث فسا كتفى بشرح مبادئهم مضيفا اليها الادلة التى يثبتون بها اقوالهم فغاية هذا الكتاب هى شرح مقاصد الفلاسفة ولهذا اخترت له ذالك الاسم۔

ترجمہ:- برادرم آپ نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ میں ایسی مکمل اور واضح کتاب فلاسفہ کے رد میں لکھوں اور ان کے مقدمات کی غلطیوں کو ظاہر کروں جس کی وجہ سے انسان پھر غلطی میں نہ پڑ سکے۔ لیکن یہ بات بے نتیجہ ہوگی اس لئے پہلے ان کے مقدمات سے واقف ہوجانا اور ان کے علوم کو مکمل طور پر جان لینا ضروری ہے۔ بغیر اس کے دوسروں کی غلطی نکالنا خود بڑی غلطی ہے میں نے اس لئے یہ مناسب سمجھا کہ فلاسفہ کے خیالات کی تردید سے قبل ان کے علم منطق۔ فلسفہ طبیعی فلسفہ الہی کو مفصل طریقہ پر بیان کروں۔ اور اس وقت یہ بتاؤں کہ ان کے مقدمات میں کون کون غلط ہیں۔ اور کون صحیح۔ کیوں کہ بالفعل میرا مقصد ان کے اقوال کے نتائج کی شرح ہے۔ غیر ضروری باتوں میں طول نہیں چاہتا ہوں اور نہ اس پر بحث۔ صرف ان کے مقدمات کی شرح پر اکتفا کروں گا۔ ہاں ان دلائل کا بھی اضافہ ہوگا جن سے وہ اپنے مقصد کو ثابت کرتے ہیں۔ اس لئے اس کتاب کا نام میں نے شرح مقاصد الفلاسفہ رکھا ہے تاکہ اسم اپنے مسمی پر پورے طریقہ پر دلالت کرے۔

اس سے بڑھ کر امام صاحب نے مقاصد کے خاتمہ میں بایں الفاظ تشریح فرمائی ہے

فهذا ما اردنا ان نحكيه من علومهم المنطقية والالهية والطبيعية من غير اشتغال بتميز الغث من السمين والحق من الباطل

ولنفتتح هذا الكتاب تهافتة الفلاسفة حتى يتنفع برهان ما هو باطل من هذه الجملة۔

ترجمہ :۔ اس سے ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہم فلاسفہ کے علم منطق فلسفہ طبیعیہ و الٰہیہ کو نقل کریں اور نقل میں حق و باطل کے امتیاز کرنے میں ہم مشغول نہ ہوجائیں اور یہ کام ہم کتاب تہافت الفلاسفہ میں کریں گے اور وہاں دلیلیں تبلائیں گے کہ کون امر حق ہے اور کون باطل۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مقاصد کی تالیف کے وقت ہی تہافت کا خیال امام صاحب کے پیش نظر تھا اگر وہ فلاسفہ کے اصول سے زمانۂ تالیف مقاصد میں متفق تھے تو پھر یہ تصریح کیا معنے رکھتی ہے۔

خود امام صاحب کی ان عبارتوں کو پڑھنے کے بعد اب یہ بات حل تعجب نہیں رہتی کہ انھوں نے مقاصد میں اصول فلاسفہ کی تشریح کی اور تہافت میں انہی اصول کو نقد و تبصرہ کی کسوٹی پر رکھ کر متعارض اور متناقض آدلہ کے ذریعہ اصول عقل سے ان کی لغت کے اظہار کی کوشش کی ہو چنانچہ کتاب التہافت کے خاتمہ میں امام صاحب نے لکھا ہے

وبعد الفراغ من هذه الرسالة سنشرع في تاليف غيرها في اثبات الرائي الصحيح الذي غايته تشييد الحق كما ان غايتنا من هذا الكتاب هي هدم الباطل۔

مطلب یہ کہ :۔ اور اس کتاب سے فارغ ہوجانے کے بعد دوسری کتاب تالیف کروں گا۔ تاکہ رائے صحیح کو ثابت کردں ۔ اور اس کتاب کی غایت اثبات حق ہے جیسا کہ کتاب التہافت کی غایت ہدم باطل ہے۔

اس کے علاوہ اس کے مقدمہ میں امام صاحب نے فلاسفہ کے ہم خیال اور مذہب دیں سے منحرف افراد کے افکار و آرا پر تنقید کی ہے اور قواعد دین کی مخالفت میں ان کی ہرزہ سرائی کو محض لغو اور بے بنیاد ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے بعد امام صاحب نے

میں ما بہ النزاع مسائل میں فلاسفہ کے باہمی اختلاف کے بیان اور ان کے دلائل کو توڑنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں سے (۱۶) الٰہیات سے متعلق ہیں اور چار طبعیات سے۔

مسببات سے متعلق امام صاحب کا فلاسفہ سے اختلاف

اس ضمن میں زیادہ اہم وہ فصل ہے جو مسببات سے متعلق ہے۔ اس خصوص میں امام صاحب کے بیان کا مرجع دو ہی مسئلے ہیں (۱) اگر دو چیزیں اکٹھی پائی جائیں تو ایسی صورت میں کوئی قطعی دلیل اس کی نہیں پائی جاتی کہ پہلی چیز دوسری کی علت ہے۔ (۲) اگر کسی طبعی قانون کی بنا پر کسی ایک چیز کے ساتھ دوسری چیز کے ارتباط و تعلق کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ مماثل حالات میں کسی قسم کا معین اثر مترتب ہوگا اگرچہ کہ مماثلت اشیاء میں بھی پائی جائے اس لئے حق سبحانہ تعالیٰ کے ارادہ کی بنا پر یہ ممکن ہے کہ روئی ایک ایسی شکل اختیار کرے جو اس کو آگ سے متعلق ہوتے ہوئے بھی جلنے سے بچا سکے۔ بالفاظ دیگر امام صاحب کا منشا یہ ہے کہ جس چیز کو فلاسفہ قوانین طبیعت یا قاعدہ علت و معلول قرار دیتے ہیں وہ ایک ایسی چیز ہے جو اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور منشاء کے مطابق ہی واقع ہوتی رہتی ہے اور ہم اس کو امر واقعہ اور امر محقق کے طور پر اس لئے قبول کرتے ہیں کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ اپنے علم سابق میں اشیاء کے انجام کو معلوم فرما لیا تھا اور اب اس نے ہم کو اسی کا علم دیا ہے۔ اس بناء پر امام صاحب کی رائے میں کوئی ایسا مقرر اور ثابت طبعی قانون نہیں پایا جاتا جو خالق جل و علی کے ارادہ کو مقید کر سکے۔

فلاسفہ کے خلاف امام صاحب کے مساعی کی حیثیت ابن رشد کی نظر میں

ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بعض فلاسفہ مثلاً ابن رشد اس امر کا یقین رکھتے تھے کہ امام صاحب اپنے قول میں مخلص اور صادق نہ تھے اگرچہ امام صاحب اور فلاسفہ کے درمیان بیّن اختلاف چند ہی مسائل کے متعلق تھا لیکن محض اپنے متعلق اہل سنت کی خوش عقیدگی اور اعتماد میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کر لینے کے لئے فلاسفہ کے ہر خیال اور فکر کی مخالفت کو انھوں نے ضروری سمجھا۔

امام صاحب اور موسیٰ ابن ناربون

موسیٰ ابن ناربون نے مقاصد کی شرح کے ابتدا میں ابن رشد کی سابقہ رائے کا ذکر کرنے کے بعد یہہ بیان کیا ہے کہ تہافت الفلاسفہ کی تالیف سے فراغت پالینے کے بعد امام صاحب نے ایک چھوٹا سا رسالہ لکھا تھا جس سے بجز چند مقربین کے اور کوئی واقف نہ تھا اس میں انھوں نے فلاسفہ کے اصول سے اپنے بعیز اختلافات سے رجوع کیا ہے اور ان اصول کو تسلیم کر کے حکما کے آگے اپنے صحیح خیالات کی ترجمانی کی ہے۔ اس رسالہ کے نام ہی سے اسکے محتویات پر ایک حد تک روشنی پڑتی ہے "رسالۂ وضع ابو حامد بعد التہافتہ لیکشف عن فکرہ للعلیا، وفیہا مقاصد المقاصد والبیب تخفیۃ الاشارۃ"۔ اس کتاب میں ایسے الٰہیاتی مباحث پائے جاتے ہیں جن کی عظیم اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا البتہ اسکا انداز بیان غامض و مشکل اور عوام کی فہم سے بلند ہے۔

امام صاحب نے اس کی ابتدا دوائر علیا ان کے حرکات ان کے نفوس سے اس کے بعد محرک اول اور اس کے صفات اور پھر نفس سے بحث کی ہے۔

کتاب التہافت میں فلسفہ کی تحقیر کا جو رنگ پایا جاتا ہے اسکا اس رسالہ میں شائبہ تک نہیں بلکہ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ دلائل قائم کرتے ہوئے امام صاحب نے متکلمین کی نہیں بلکہ خود حکما کی شان اختیار کی ہے۔ اس میں الٰہیاتی مسائل کو اُن عقلی دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جن کے نقد و تردید میں انھوں نے کتاب التہافت میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا۔ یہہ امر قابل غور ہے کہ اس رسالہ میں امام صاحب دوائر سماویہ اور ازلیت زمان سے متعلق فلاسفہ کے ہم زبان ہیں۔ اپنے اس رسالہ کے خاتمہ میں امام صاحب نے نبی کریم صلعم کے اس ارشاد گرامی کی پناہ میں کہ "خاطبوا الناس علی قدر عقولھم"۔ بجز اہل نفوس قویہ اور اصحاب عقول سلیمہ کے عوام پر اس رسالہ کا مطالعہ حرام قرار دیا۔

امام صاحب اور ابن طفیل

ابن طفیل باوجود امام صاحب سے اپنے شدید خلوص اور عقیدت کے ان کے اپنے مقررہ

اصول میں تردد اور اضطراب کے اظہار پر مجبور ہوئے۔ اس لئے کہ ابن طفیل کی تصنیف "حی بن یقظان" صفحہ (۱۹ تا ۲۱) کی طرف رجوع کرنا مناسب ہوگا۔ ابن طفیل نے امام صاحب کی کتابوں سے چند اقتباسات بھی دیے ہیں کہ جس سے مترشح ہے کہ امام صاحب نے چند ایسی مخفی کتابیں بھی لکھی ہیں جن پر بجز چند خاص مقربین کے اور کوئی اطلاع نہیں پاسکتا۔ یہ وہ کتابیں ہیں جو اندلس کے کتب خانوں میں نہیں پائی گئیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم کتاب "المضنون بہ" کا ایک قلمی نسخہ امام صاحب کے اور چار رسالوں کے ساتھ پیرس کے قومی کتب خانہ میں نمبر ۸۸۴ کے تحت پایا جاتا ہے جس کا مشہور مستشرق شمولڈرس نے اپنے مقالہ میں ذکر کیا ہے۔ اس کتاب میں امام صاحب نے مسئلہ قدامت عالم میں فلاسفہ کے ساتھ کھلے بندوں اپنا اتفاق ظاہر کیا ہے اور فلاسفہ کی طرح اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ ذات باری تعالیٰ امور کا تفصیلی نہیں بلکہ اجمالی علم رکھتی ہے۔ یعنے علم باری کلیات ہے جزئیات سے اس کو کوئی سروکار نہیں اور اس امر کا بھی اعتراف کیا ہے کہ ذات باری مجرد عن الصفات ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض مؤلفین نے امام صاحب سے اس کتاب کو منسوب کرنا اس لئے غلط قرار دیا ہے کہ ان خیالات میں اور ان اقوال میں جن کو حجۃ الاسلام نے اپنی چوٹی کے تصانیف میں رواج دینے کی ممکنہ سعی کی ہے۔ زمین و آسمان کا فرق پایا جاتا ہے (ملاحظہ ہو فہرست حاجی خلیفہ طبقہ میوفلوجل جلد ۵ صفحہ ۹۵)

بالاختصار یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر امام صاحب اپنے سے مخصوص کسی خاص اصول کے مالک تھے تو وہ ایک ایسا اصول تھا جس تک محض تامل اور انجذاب کے ذریعہ انھوں نے اپنی زندگی کے اس دور میں رسائی حاصل کی جس میں کہ وہ تصوف کے رنگ میں رنگ چکے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ جذب و تامل کا کوئی نتیجہ نفس الامر میں کوئی فلسفی اصول نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اس کے علاوہ امام صاحب نے عمل پر بہت زور دیا ہے جس کو انھوں نے پھل اور علم کو شجر کے مماثل تبلایا ہے۔ کتب اخلاق میں امام صاحب کی ایک اہم تصنیف میزان العمل بھی ہے جس کی ایک عبرانی شرح سنہ ۱۸۳۹ء میں بمقام لیپزگ طبع ہوئی ہے۔ عربی سے عبرانی میں

شرح و ترجمہ کا کام اندلس کے مشہور یہودی ابراہیم ابن حدائی نے انجام دیا تھا۔

امام صاحب یورپ کی نظر میں

یورپ امام صاحب کو علوم فلسفہ کے ایک زبردست مخالف کی حیثیت سے جانتا ہے علمائے یورپ کا بیان ہے کہ امام صاحب نے مشرق عربی میں فلسفہ پر ایک نہایت خطرناک اور مہلک وار کیا ہے۔ مغرب میں بھی فلسفہ کو اسی روز بد کی صورت دیکھنی پڑتی اگر اس کو ابن رشد کی حمایت و سرپرستی نہ حاصل ہوئی ہوتی جس کی عقلی مساعی نے تقریباً ایک صدی تک فلسفہ کا بول بالا رکھا۔

امام صاحب اور ابن رشد

اسلامی فلسفہ کی تاریخ میں تہافتہ الفلاسفہ اور تہافتہ التہافہ ان دونوں کتابوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے امام صاحب کے مویدین اور معتقدین نے اسی کتاب تہافتہ الفلاسفہ اور احیاء علوم الدین کی بناء پر اور اس وجہ سے بھی کہ انھوں نے اسلامی عقیدہ کی مدافعت اور فلسفہ اور فلاسفہ کے مقابل میں شریعت الہی کی حمایت کو اپنا نصب العین قرار دے رکھا تھا۔ امام اور حجتہ الاسلام جیسے وقیع القاب کا مستحق قرار دیا تھا۔ امام صاحب کی عظمت نے انسانی عقول پر کچھ اس طرح تسلط کر رکھا تھا کہ ان کے خیالات اور تصنیفات پر نقد و تبصرہ کی جرارت اگر کسی نے کی تو کتاب تہافتہ الفلاسفہ کے اشاعت کے کامل ایک صدی بعد حکیم اندلس ابن رشد نے اپنی شہرہ آفاق کتاب تہافتہ التہافتہ میں شریعت کی حمایت اور مدافعت میں جو زور امام صاحب نے تہافتہ الفلاسفہ میں دکھایا تھا تہافتہ التافتہ میں اس سے بڑھ کر ابن رشد نے فلسفہ اور فلاسفہ کی تائید و حمایت میں اپنے کس اور بل دکھائے ہیں۔ ابن رشد کی اس تصنیف کو یونانی فلاسفہ سے لیکر اپنے زمانہ تک یعنی امام صاحب کی وفات سے تقریباً ایک صدی بعد تک حکماء اور فلاسفہ کی نصرت اور اعانت ابن رشد کی زندگی کا ایک زبردست اور نمایاں کارنامہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس طرح اگر امام صاحب کو شریعت کی تائید اور بدعت کے اعتراف میں حجۃ الاسلام جیسے ممتاز لقب سے یاد کیا جاسکتا ہے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ فلسفہ اور فلاسفہ کی اس عدیم المثال تائید اور حمایت کے بعد ابن رشد کو حجۃ الحکمۃ والحکماء کے وقیع اور بالکل بجا لقب سے یاد نہ کیا جاتا۔

کتاب تہافتۃ التہافتہ

کامل ایک صدی تک امام صاحب کی کتاب تہافتۃ الفلاسفہ نے فلسفہ اور آزاد فکر پر اپنا حملہ برقرار رکھا تھا، کے خیالات کا مضحکہ اڑانا فلاسفہ کی تکفیر اور تفسیق کرنا غذاب جہنم کا ان کو تنہا وارث قرار دینا اور ان کے خلاف خالق اور مخلوق کے عتاب اور غصہ کا اصرار مطالبہ اس معرکۃ الآرا تصنیف کا نمایاں وصف رہا ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس پوری مدت میں فلاسفہ کے خلاف اس کھلے اعلان جنگ اور بعض غلط الزامات کی تردید کیلئے مشرق و مغرب کی پوری وسعت میں کسی فلسفی نے جرارت نہ کی۔ اور کامل ایک صدی بعد اس طرح کے پرخطر اقدام کی اگر کسی نے ہمت وجسارت کی تو وہ ابن رشد تھا اور یہی واحد وجہ اس کو حجۃ الحکمۃ والحکماء بنا دینے کے لئے کیا کم ہے۔ واقعہ نفس الامر بھی یہی ہے کہ ابن رشد نے غزالی کی اس کتاب کی تنقید و تردید سے اپنے حکمت دوست اساتذہ سلف۔ تلامیذ۔ اور احباب کے سر سے بدنامی اور ننگ وعار کے اس بار کو اتار پھینکنے کی وہ کوشش کی ہے جس کی کسی اور سے توقع بھی دشوار تھی۔ اسی کوشش کے نتیجہ کے طور پر فلسفہ کی مردہ جان میں از سر نو زندگی سرایت کرگئی اور اپنے سابقہ حسن وجمال کی درخشانی وتابناکی سے اس نے از سر نو انسانی عقول کے لئے سامان ضیافت مہیا کیا۔ فلسفہ کی تائید میں ابن رشد کی انتہائی اور کامیاب سعی کا سب سے زیادہ بہتر نمونہ اس کی ایسی شہرہ آفاق تصنیف تہافتۃ التہافتہ کو قرار دینا پڑیگا۔ جو امام صاحب کی تہافتۃ الفلاسفہ کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ اس شخص کے لئے جو امام صاحب کی کلامی خصوصیات پر قلم اٹھانا چاہے از حد ضروری ہوتا ہے کہ

تہافتہ الفلاسفہ کے ساتھ ساتھ تہافتہ التہافتہ کو بھی پیش نظر رکھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں کتابوں سے کسی قدر مزید تعارف کو ہم نامناسب نہیں سمجھتے۔ امام صاحب نے کتاب التہافتہ کے نام اور مقصد تالیف کے متعلق جو امر لکھا ہے اس کو ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

کتاب تہافتہ الفلاسفہ میں امام صاحب کا طریقہ بحث

ابتدات بتحریر هذا الکتاب ردا علی الفلاسفة القدماء مبینا۔ تهافت عقیدتهم و تناقض کلمتهم فیما یتعلق بالالهیات و کاشفا عن غوائل مذهبهم والتی هی علی التحقیق مذاهب العقلاء عبرة عند الاذکیاء اعنی ما اختص به عن الجماهیر والدهماء من فنون العقائد والآراء۔

مطلب یہ ہے۔ میں نے کتاب "تہافت الفلاسفہ" فلاسفہ کی رد میں لکھنی شروع کی تاکہ ان کے عقائد کا تصادم اور ان کے متناقض اقوال جو خصوصاً الٰہیات کے مسئلہ میں ہیں معلوم ہو جائیں اور ان کے مذہب کی جو دشواریاں ہیں وہ واضح ہو جائیں۔

امام صاحب کا طریقۂ بحث یہ رہا ہے کہ فلاسفہ کے مسلک کو بلا کسی تصرف کے اپنی حقیقی شکل میں پیش کر دیا جائے تاکہ ملاحدہ اور مقلدین باطل پر یہ امر بخوبی روشن ہو جائے کہ مشاہیر فلاسفہ متقدمین اور متاخرین میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو ایمان باللہ اور حشر کا قائل نہ ہو اور اسی طرح وہ لوگ بھی جو تقلیدی کفر ہی کو اپنی اصابت رائے اور ذہانت کے مظاہرہ کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں معلوم کر لیں کہ وہ تمام اساطین فلاسفہ اور اکابر حکماء جن کی تقلید ہی ان کا سرمایہ امتیاز ہے، شرائع الٰہیہ کے انکار سے متعلق ہر طرح کے اتہامات سے پاک ہیں۔ اللہ پر ایمان اور انبیاء کی تصدیق ان کا شعار تھا۔ البتہ اصول شرائع الٰہیہ کو تسلیم کرنے کے بعد تفصیلات میں پڑ کر ان کے قدم ضرور ڈگمگائے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ یہ خود بھی گمراہ ہوئے اور لوگوں کی بھی گمراہی و ضلالت کا باعث ہوئے۔

التہافتہ الفلاسفہ کی تالیف سے امام صاحب کا منشاء

وجہ تالیف امام صاحب نے یہہ بیان فرمائی ہے کہ ایک ایسے گروہ کو انھوں نے دیکھا جو اپنی ذہانت کے زعم پر اپنے ہم چشموں کے مقابلہ میں ایک خاص امتیاز و افتخار کا دعویدار تھا۔ ان لوگوں نے اسلامی فرقوں سے علٰحدگی اختیار کر لی عبادات سے روگردانی کی شعائر دینی کی تحقیر و تذلیل اپنا شیوہ بنا لیا۔ گمراہ کن خیالات سے اقصال اور سقراط۔ بقراط۔ افلاطون اور ارسطو وغیرہ سے مرعوبیت اور ان مشاہیر کی عقل دقت علمی اور فرط ذکاوت سے متعلق انکے پیرووں کی مبالغہ آمیز خوش عقیدگی اور یہ خیال کہ باوجود اتنی جزیل عقل اور بے مثال فضل وکمال کے انھوں نے شرائع الہیہ کا انکار کیا اور مذہب کی تفصیلات کو شعبدہ اور خرافات وافسانہ تصور کیا وغیرہ ہی اس تمام تر کفر وضلالت کی محرکات ہوئیں۔ یہی چیز تھی جس نے اس گروہ کو ان فضلاء اور مشاہیر کی تابعت اور کفر وضلال کے اختیار کرنے پر آمادہ کیا۔ اسا میں فلاسفہ میں شمار کئے جانے کے شوق نے صحیح اسلامی عقیدہ سے دوری اور اپنے آبائی مذہب سے بے تعلقی پر ان کو مجبور کیا۔ ابتداء میں تو امام صاحب نے فرمایا تھا کہ ان سب کے سرگروہ ارسطو ہی کی تناقص خیالی اور متضاد آراء کے چہرہ سے نقاب چاک کرنے پر اکتفا کریں گے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے صرف ارسطو ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ تمام فلاسفہ کے آراء وخیالات کو خلط ملط کر دیا۔

امام صاحب نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ وہ اپنی بحث مسائل الہیہ کی حد تک محدود رکھنا چاہتے ہیں اس لئے کہ حسابی ہندسی اور منطقی علوم جو یقینی ہیں اور شکوک وشبہات سے پاک ہیں، ان کے انکار کے کوئی معنی نہیں لیکن فلاسفہ کا ان علوم کی ایجاد کو اپنے مخترعہ الہیاتی علم کی حقانیت اور صداقت کی تائید میں بطور ایک حربہ کے پیش کرنا درحقیقت ضعیف العقل انسانوں کو چکما دینا ہے۔ اس لئے کہ اگر ان کی الہیات بھی اس درجہ اتقان اور کمال کو پہونچی ہوئی ہے جس درجہ کہ علوم حساب وہندسہ ومنطق تو پھر کیا وجہ ہے کہ ان علوم کے برخلاف الہیات میں یہہ حضرات آپس میں اس شدت کے ساتھ مختلف الرائے دکھائی دیتے ہیں چونکہ امام صاحب

کے خیال میں اس طور کے مترجمین تبدیل وتحریف سے نہ بچ سکتے تھے اور خود ان کے تراجم اس درجہ تفسیر وتاویل کے محتاج قرار پائے کہ نئے نئے اختلافات اور نزاعات کا مصدر بن گئے۔ اس لئے سلامت روی انھوں نے اسی میں دیکھی کہ ابونصر فارابی، اور ابن سینا کے ان مختار افکار و آراء کے ابطال وتردید ہی پر اکتفا کریں کیونکہ وہ گمراہ راہ پیش روؤں کا تتبع مسلک سمجھے ہوئے ہیں۔

امام صاحب کی نظر میں نقد وتحقیق کے لحاظ سے فلاسفہ اسلام میں انہی دونوں کو زیادہ معتبر حیثیت حاصل تھی۔

کتاب التہافتہ الفلاسفہ کے متعلق چند ملاحظات

امام صاحب نے اپنی کتاب تہافتہ الفلاسفہ میں مندرجہ ذیل بیس مسائل کی بابتہ فلاسفہ کے تناقض اور خبط سے بحث کی ہے یہ وہ بیس مسائل ہیں جن میں سے اگرچند کو مستثنیٰ کردیا جائے تو علوم الہیہ اور طبیعیہ کے ان تمام قدیم وجدید معرکتہ الآراء مسائل کو شامل اور حاوی ہیں جو اسلامی اور غیر اسلامی فرقوں کے درمیان مابہ النزاع بنے ہوئے تھے ان مسائل کی کافی توضیح وتشریح اور اپنے اصول اور خیال کے مطابق بے شمار دلائل اور اعتراضات تفصیلات وتوضیحات سے ان کی تردید وتکذیب کر چکنے کے بعد اپنی اس عجیب وغریب تصنیف کو اس قول پر ختم کیا ہے۔

فان قال قائل قد فصلتم مذاهب هولاء افتقطعون به كفرهم و وجوب القتل لمن يعتقد اعتقادهم قلنا تكفيرهم لابد فى ثلاث مسائل (۱) قدم العالم وقولهم ان الجواهر كلها قديمة (۲) قولهم ان الله تعالى لايحيط علما بالجزئيات الحادثة من الاشخاص (۳) فى انكارهم بعث الاجساد وحشرها فهذه المسائل ثلاث۔ لا تلائم الاسلام بوجه ومعتقدها معتقد كذب الانبياء وانهم ما ذكروه الا على سبيل المصلحته تمثيلا لجماهير الخلق وتفهيما وهذا هو الصريح السوى لم يعتقد احد من فرق المسلمين قائما ماعداء هذه المسائل الثلاث

من تصرفهم في الصفات الالاهية واعتقاد التوحيد فيها فمذهبهم قريب من مذاهب المعتزلة ومذهبهم في تلازم الاسباب الطبيعة هو الذي صرح المعتزلة به في التوحيد وكذالك جميع ما نقلناه عنهم قد نطق به فريق من فرق الاسلام الا هذه الاصول الثلاث فمن يرى تكفير اهل البدع من فرق الاسلام يكفرهم ايضا به ومن يتوقف على التكفير يقتصر على تكفيرهم بهذه المسائل اما نحن فلا نوثر الان الخوض في تكفير اهل البدع وما يصح منه وما لا يصح كيلا يخرج الكلام عن مقصود هذا الكتاب

اس عبارت کا خلاصہ یہ ہے۔ اگر مجھ سے یہ سوال کیا جائے کہ جن آراء و خیالات کو تم نے تفصیلی طور پر بیان کر کے غلط ثابت کیا ہے کیا ان کے کفر کے بھی قائل ہو اور جو ان پر عقیدہ رکھتا ہو اس کو واجب القتل سمجھتے ہو تو ہم کہیں گے کہ تین مسائل ہی صرف ایسے ہیں جن کی وجہ سے ان کی تکفیر پر ہم اپنے کو مجبور پاتے ہیں یعنے (۱) ان کا یہ قول ہے کہ عالم قدیم اور تمام جواہر قدیم ہیں (۲) اللہ تعالیٰ کو جزئیات کا علم نہیں ہے (۳) اور حشر اجساد کا انکار۔ اور جو ان تین مسائل پر عقیدہ رکھتا ہے وہ انبیاء کی تکذیب کرتا ہے۔ ان تین مسائل کے علاوہ اور جو مسائل ہیں ان میں اکثر اہل بدعت فلاسفہ سے ہم رائے ہیں یعنے صفات الٰہیہ کے بارے میں فلاسفہ جو مختلف صفتوں کے مختلف معنے بتلاتے ہیں کوئی نہ کوئی اسلامی فرقہ بھی (مثلاً معتزلہ) ان کا ہم خیال ہے۔ مثلاً اسباب طبعیہ کے تلازم کا مسئلہ اور معتزلہ جو توحید کے قائل ہیں ان میں معناً کوئی فرق نہیں پایا جاتا اس لئے ہم ان وجوہ کی بنا پر ان کو کافر نہیں کہتے۔ اب جو اہل بدعت کی تکفیر کے قائل ہیں وہ ان مسائل کی وجہ سے بھی فلاسفہ کی تکفیر کریں گے اور جو تکفیر پر توقف کرتے ہیں وہ ان مسائل پر بھی فلاسفہ کو کافر کہنے سے گریز کریں گے۔

ایک طالب علم اس حقیقت بدیہی سے دوچار ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ امام صاحب کے اس حد درجہ متواضع اور مبنی بر مسالمت اختتامی قول کو اس ہنگامۂ محشر سے کوئی دور کی نسبت بھی نہیں جس سے انھوں نے اپنی کتاب کی ابتدا کی تھی ابتدائے کتاب میں ایک طالب علم خواہ مخواہ

یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ مصنف نے تہیہ کرلیا ہے کہ کچھ ہو وہ فلسفہ کی زبردست عمارت کو منہدم کرکے سر پر ڈھاکر ہی رہے گا جس کے بعد قد مارفلاسفہ کی تیار کی ہوئی اس تاریخی عمارت کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی۔ جو خدائے حکمت مزدا کی عبادت کے لئے تیار کی گئی تھی۔ اصل یہ ہے کہ قدرت نے امام صاحب میں خطیبانہ تمہید اور دفاع کا ملکہ بدرجہ اتم ودیعت کر رکھا تھا، یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کے مقدمہ میں الفاظ کی عظمت اور فقروں کی چستی و سحر آفرینی اور شوکت اسلوب کا اتنے شاندار طریقہ پر مظاہرہ کیا گیا ہے جو مخالف کے قلوب لرزاں و ترساں کرنے کا ضامن ہو اس کے بعد فلاسفہ سے جدل اور مناقشہ کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے اس میں کوشش یہ کی گئی ہے کہ منطق کے انداز پر ہو۔ موقع موقع پر اس طرح کی مذہبی عبارتوں سے اپنے اقوال کو تقویت دیجائے جن کے انکار سے کفر لازم آتا ہو اسی کے ساتھ قدم قدم پر فلاسفہ کی تحقیر ان پر سب و شتم اور ان کے کفر و ضلالت پر تحسر اور افسوس کا اعلان ہو عوام کو فلسفہ سے بدظن کرنے میں امام صاحب کی کامیابی کی بڑی وجہ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ان کا خطیبانہ طرز استدلال اور ادیبانہ اسلوب بیان ہے لیکن ایک اور اہم وجہ یہ بھی ہوئی کہ انھوں نے فلاسفہ سے مناقشہ کچھ اس رنگ میں کیا ہے گویا کہ وہ خود بھی فلسفی ہیں جن سے فلاسفہ کا کوئی راز پوشیدہ نہیں۔ اس کے باوجود وہ ان کے خلاف اعلان جنگ پر مجبور رہے ہیں تو یقیناً فلاسفہ میں کوئی نقص ہی ہوگا جس کو ان کے وسیع علم و واقفیت نے پالیا ہے یقینا یہ ایک ایسا انداز بیان ہے جو ایک بے لوث باحث کی نگاہ میں امام صاحب جیسے مشرق کے سرتاج مفکر اور محترم و مقبول ہستی کے شایان شان نہیں۔ خطابت و بلاغت کے اس شان و آب و رنگ کے تار و پود اسی ایک عجیب اور دلکش حقیقت کے ہاتھوں بکھیر کر رہ جاتے ہیں کہ جن مسائل کی بناء پر ارسطو سے لے کر ابن سینا تک تمام فلاسفہ کی تکفیر و تردید و تکذیب۔ نقد و تنقید میں امام صاحب نے کتاب کی ابتداء میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا اسی کتاب کے حد درجہ بسیط متواضع اور مسالمہ خاتمہ تک پہنچ کر تکفیر و تردید کے عظیم طومار سے

دست کش ہوتے ہوئے صرف تین ہی مسائل کو معیار کفر و ایمان قرار دینے میں کوئی امر مانع نہ دیکھا۔ اسی چیز نے ابن رشد کو اس خیال کے اعلان پر مجبور کیا کہ اگر ان کے پیش نظر کسی سنجیدہ اصول پر فلاسفہ کی تکفیر و تردید ہوتی تو چاہیئے تھا کہ ان کی توجہ صرف انہی تین مسائل کی حد تک محدود رہتی لیکن اس کے بجائے فلاسفہ کے خلاف اس ہنگامہ محشر کے برپا کرنے کے بجز اس کے اور کیا معنے ہو سکتے ہیں کہ عامۃ المسلمین کی نگاہوں میں اسلام کے ایک تنہا حامی اور مدافع کی حیثیت سے خود کو پیش کیا جائے اور ایک عام ہر دلعزیزی حاصل کی جائے خواہ اس طرح اس مقصد کی قربان گاہ پر فلسفہ اور حکمت ہی کو بھینٹ چڑھانا پڑے اور فلاسفہ اور حکماء کی دل کھول کر تذلیل و تحقیر بھی ہو جائے۔

فلاسفہ کے ما بہ النزاع بیس مسائل

اب ہم شہور بیس مسائل کی ایک اجمالی فہرست پیش کرتے ہیں جن پر امام صاحب نے فلاسفہ سے اختلاف کی بنیاد قائم کی ہے۔ اور انہی پر ان کی معرکۃ الآراء کتاب کے تمام مباحث کا دارومدار تھا۔

(۱) ازلیت عالم کے متعلق فلاسفہ کا مسلک۔

(۲) ابدیت عالم کے متعلق فلاسفہ کا مذہب۔

(۳) فلاسفہ کا یہ قول کہ عالم کا صانع اللہ ہے اور عالم اس کی پیداوار ہے۔

(۴) صانع کے ثابت کرنے میں فلاسفہ کا عجز و قصور۔

(۵) اثنینیت کے محال ثابت کرنے میں فلاسفہ کا عجز و قصور۔

(۶) صفات الٰہی کی نفی اور انکار کے متعلق فلاسفہ کا مذہب۔

(۷) فلاسفہ کا یہ قول کہ اللہ کی ذات کی جنس اور فصل سے تقسیم نہیں کی جا سکتی۔

(۸) فلاسفہ کا یہ قول کہ اللہ ایک بسیط موجود ہے جس کی کوئی ماہیت نہیں۔

(۹) اس امر کی توضیح اور بیان میں فلاسفہ کا عجز و قصور کہ اللہ کا جسم نہیں۔

(۱۰) دہر کا اعتراف اور صانع کا انکار فلاسفہ کے لئے لازم ہے۔
(۱۱) فلاسفہ یہ کہنے سے عاجز ہیں کہ خدا کو اپنی ذات کے علاوہ کسی اور چیز کا بھی علم ہے۔
(۱۲) فلاسفہ یہ کہنے سے بھی عاجز ہیں کہ اس کو خود اپنی ذات کا علم ہے۔
(۱۳) فلاسفہ کا یہ قول کہ خدا جزئیات کو نہیں جانتا۔
(۱۴) فلاسفہ کا یہ قول کہ آسمان ایک حیوان متحرک بالارادہ ہے۔
(۱۵) محرک آسمان کی غرض و غایت کے متعلق فلاسفہ کی تفصیلات۔
(۱۶) فلاسفہ کا یہ قول کہ نفوس سماویہ ان جزئیات کا علم رکھتی ہیں جو اس دنیا میں حادث ہوتے رہتے ہیں۔
(۱۷) خرق عادت کے محال ہونے کے متعلق فلاسفہ کا قول۔
(۱۸) اس امر پر کسی عقلی دلیل کے قائم کرنے سے فلاسفہ کا عجز کہ انسان کا نفس ایک جوہر قائم بنفسہ ہے جو نہ تو جسم ہے اور نہ عرض۔
(۱۹) فلاسفہ کا یہ قول کہ نفوس بشریہ کا فنا ہونا محال ہے۔
(۲۰) فلاسفہ کا حشر اجساد اور اعادۂ معدوم کو محال قرار دینا۔

بجائے خود ان میں سے ہر مسئلہ اپنی تفصیل کے لئے مستقل مقالوں کا محتاج ہے۔ ظاہر ہے کہ صرف ایک مقالہ میں اس کی گنجائش کہاں پیدا ہو سکتی ہے۔ بالفعل ہم اس فہرست پر اکتفا کرتے ہیں اور آخر میں بعض خاص اسلامی معتقدات کی تشریح میں امام صاحب کے جو خاص نظریات ہیں سپرد قلم کرتے ہیں۔

امام صاحب کی کلامی خصوصیات کی نسبت ابن خلدون کی رائے سے مولانا شبلی کا اختلاف۔

اسلامی معتقدات پر امام صاحب نے جس سحر حلال اسلوب بیان اور فلسفیانہ رنگ میں قلم اٹھایا ہے اس نے ابن خلدون جیسے یگانہ روزگار فاضل مورخ کو اس رائے کے اظہار پر

آمادہ کیا تھا کہ فلسفیانہ طرز پر سب سے پہلے امام صاحب ہی نے اس فن کو مرتب کیا۔ ابن خلدون کی اس مؤقر رائے کی صداقت سے علامہ شبلی مرحوم کا محض اس لئے انکار کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا کہ امام صاحب سے پہلے باقلانی اور امام الحرمین وغیرہ نے کلامی مباحث میں بعض بعض فلسفیانہ اصطلاحیں داخل کی تھیں ظاہر ہے کہ ان مباحث میں بعض فلسفی اصطلاحات کا آجانا اور چیز ہے اور فلسفہ کو بطور ایک اصول کے پیش نظر رکھنا ایک بالکل علحدہ چیز۔ اس دوسرے اعتبار سے ہم دیکھتے ہیں کہ امام صاحب سے پہلے اس رنگ میں کسی نے بحث نہیں کی۔ پھر اگر ابن خلدون نے امام صاحب کو اس خاص رنگ کا موجد قرار دیا تو ہمارے خیال میں کوئی غلطی نہیں کی۔

امام صاحب کے متنوع مباحث عقاید سے متعلق بعض متقدمین سے مناقشہ۔

عام اسلامی عقائد کے متعلق امام صاحب کے مباحث ایک تو وہ ہیں جو ان کے عام تصنیفات میں پائے جاتے ہیں اور ہر ایک کے دست رس میں ہیں لیکن کچھ ایسے بھی مباحث ہیں جن کی عام اشاعت کو امام صاحب نے اس لئے ناپسند کیا تھا کہ عوام کی عقل ان کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ امام صاحب کے ان مخصوص افکار و آراء نے بعض علماء کو اس درجہ مبہوت و حیران کیا کہ اس قسم کے بعض تصانیف کو امام صاحب کی طرف منسوب کرنے ہی میں ان کو تامل ہوا چنانچہ محدث ابن الصلاح اور علامہ ابن السبکی صرف اس لئے مضنون بہ علی غیر اہلہ کے امام صاحب کی طرف انتساب کو غلط قرار دیتے ہیں کہ مصنف بعض مستوجب کفر عقائد مثلاً قدامت عالم اور انکار علم جزئیات اور نفی صفات کا قائل ہے۔ لیکن اس دلیل کے سمجھنے سے ہماری عقل کچھ قاصر ہی رہی۔ ہمارا تو یہ خیال ہے کہ اگر ابن الصلاح اور ابن السبکی کے خیالی مستوجبات کفر نے امام صاحب کو مرعوب کردیا ہوتا تو آج تک دنیا کسی اور ہی حجتہ الاسلام کی تلاش میں سرگردان ہوتی۔ لطف یہ ہے کہ جس کتاب کا خود امام صاحب

اپنی مسلمہ تصنیف جواہر القرآن میں تذکرہ فرمائیں اس کی نسبت یہ دعویٰ کہ ان کی نہیں،
وجہ صرف یہ کہ اس میں بعض ایسے مسائل درج ہیں جو کسی کی نظر میں موجب کفر ہیں۔ واقعہ
نفس الامری تو یہ ہے کہ جن مذکورہ بالا مسائل کو موجب کفر قرار دیا گیا ہے ان کا شروع
سے آخر تک کتاب میں کہیں ذکر ہی نہیں۔ محض ذہنی اختراع معلوم ہوتے ہیں۔ اور
بالفرض اگر مذکور ہوتے بھی تو جس حیثیت سے یہ موجب کفر ہیں اس حیثیت سے امام صاحب
کا قائل ہونا یقیناً مستبعد اور غیر معقول ہے اور جس حیثیت سے امام صاحب ان کے
قائل ہوں ان کا موجب کفر ہونا باطل اور محال ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ المضنون
بہ علی غیر اہلہ کے تسمیہ میں امام صاحب نے جو احتیاط ملحوظ رکھی تھی اس کی عظیم قدر و قیمت
کا اندازہ نہ ہو سکتا اگر اس قسم کے لطیفے نہ پیش آتے رہتے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ امام صاحب
کی کلامی خصوصیات کا واقعی اندازہ جب ہی ممکن تھا کہ ان کے کلامی مباحث کا کامل طور پر
جائزہ لیا جاتا۔ لیکن اس مختصر مقالہ میں یہ کوشش یقیناً باعث طوالت ہوگی۔ چند خاص خاص
مسائل عقائد سے متعلق ہی امام صاحب کے نقطۂ نظر اور مخصوص انداز بحث کی توضیح و تشریح
ہی پر ہم یہاں اکتفا کریں گے اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ایک حد تک امام صاحب کے خاص رنگ
کو نمایاں کرنے کے لئے کافی ہوگا۔

روح کے متعلق امام صاحب کے زاویۂ نگاہ کی تشریح اور اس پر تبصرہ۔

المضنون بہ علی غیر اہلہ میں امام صاحب نے روح سے متعلق کافی بحث کی ہے جس سے
پتہ چلتا ہے کہ وہ روح کی جسمانیت کے قائل نہیں ہیں۔ جسم میں اس کی مثال ایسی نہیں ہے
جیسے کہ پانی برتن میں وہ اس کو واحد مثل جزء لایتجزیٰ اور ناقابل تقسیم قرار دیتے ہیں۔
وہ اس کے عرض ہونے کے بھی قائل نہیں یعنے وہ اس کو ایسی چیز نہیں مانتے جو دوسرے
کے ساتھ قائم ہو۔ اور دل و دماغ میں اس طرح گھس گئی ہو جس طرح کالی چیز میں کالا رنگ یا عالم میں

میں علم اس لئے کہ وہ خود کو اور اپنے خالق کو اور معقولات کو پالیتی ہے۔ یہ صفات عرض کی نہیں جوہر کی ہوا کرتی ہیں اس بناء پر روح کو جوہر کہنا چاہیئے عرض نہیں کہا جاسکتا۔ امام صاحب روح کو متحیز بھی نہیں کہتے کیونکہ جو چیز متحیز یعنے جگہ گھیری ہوئی ہوگی وہ قابل تقسیم ہوگی اور روح قابل تقسیم نہیں پھر امام صاحب فرماتے ہیں کہ روح نہ تو انسان کے بدن ہی میں داخل ہے اور نہ اُس سے خارج اور نہ اوس سے متصل ہے اور نہ اس سے جدا ہے کیوں کہ یہ سب باتیں ایسی چیز سے علاقہ رکھتی ہیں جس کا جسم ہو اور متحیز ہو اور روح میں ان سے کوئی بات نہیں ہے پھر فرماتے ہیں کہ وہ کسی جہت میں بھی نہیں ہے اور نہ کسی جگہ میں حلول کئے ہوئی ہے۔ کیوں کہ یہ صفتیں بھی جسم دار چیز سے یا ایسی چیز سے جو دوسری چیز کے ساتھ موجود ہو یعنے عرض ہو علاقہ رکھتی ہیں اور روح نہ تو جسم ہے اور نہ عرض اس مسئلہ میں امام صاحب نے کرمیاو حنبلیہ سے اختلاف کیا ہے جو روح کو جسم مانتے ہیں اور اشاعرہ اور معتزلہ سے بھی مختلف الرائے ہیں اس لئے کہ انھوں نے روح کے لئے جہت تسلیم کی ہے لیکن جن مذکورہ بالا صفات کے ساتھ امام صاحب نے روح کو مانا ہے۔ اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ یہ تو وہی صفات ہیں جن سے واجب تعالیٰ متصف ہے۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ روح بھی خدا کے مانند ہے۔ اس کے جواب میں امام صاحب فرماتے ہیں کہ خدا میں بھی یہ صفات ہیں لیکن یہ اس کی مخصوص صفات نہیں بلکہ اوس کی مخصوص صفت اس کا قیوم ہونا ہے یعنے وہ اپنی ذات سے قائم ہے اور باقی تمام چیزیں اس کی ذات سے قائم ہیں اور وہ آپ ہی آپ موجود ہے اور سب چیزیں آپ ہی آپ موجود نہیں ہیں بلکہ ان کا وجود عارضی ہے اور خدا کا وجود ذاتی۔ لیکن اس جواب کے بعد بھی یہ اعتراض بہر حال قایم رہتا ہے کہ اس تعریف کی بنا پر روح کو قدیم اور غیر مخلوق ماننا پڑے گا۔ اس اعتراض کو دفع کرنے کی امام صاحب نے اس طرح کوشش کی ہے کہ روح کو غیر مخلوق کہنے کے یہ معنے ہیں کہ اس کا اندازہ کمیت سے نہیں ہوسکتا کیوں کہ اس طرح کے اندازہ کے لئے

کسی چیز کا متحیز اور قابل تقسیم ہونا ضروری ہے اور روح نہ تو متحیز ہے اور نہ قابل تقسیم مگر اس کو
مخلوق ہم اس لئے کہتے ہیں کہ وہ پیدا ہوئی ہے اور قدیم نہیں ہے اور اس وقت حادث
ہوتی ہے جبکہ نطفہ میں اس کے قبول کرنے کی استعداد پیدا ہو جائے۔

وجود ابدان سے قبل امام صاحب ارواح بشری کے وجود کو نہیں تسلیم کرتے بلکہ
بعد حدوث ابدان ان کے حدوث کے قائل ہیں جیسے صورت آئینہ میں کیونکہ اگر قبل وجود
ابدان کے موجود ہوں تو دو حال سے خالی نہیں یا تو کل انسانوں کے لئے روح واحد ہوگی
یا کثیر ان دونوں صورتوں کو امام صاحب نے بدلائل باطل ثابت کیا ہے اور اس طرح اس نتیجہ
تک پہونچے ہیں کہ قبل وجود ابدان روح کا کثرت سے موجود ہونا باطل ہے جہاں ایک معترض
نے پوچھا کہ جب ارواح بشری کثرت سے موجود نہیں ہو سکتیں تو انسانوں کے بدن سے
ان کے مرنے پر جدا ہو جانے کے بعد کیوں کر کثرت سے موجود ہو جائینگی اور آپس میں متغائر
بھی ہوں گی۔ اس کا جواب امام صاحب نے یہ دیا کہ بدن کے ساتھ متعلق ہونے کے بعد روح
نے مختلف اوصاف مثلاً علم وجہل اور صفائی اور کدورت اور حسن اخلاق اور اخلاق قبیحہ
حاصل کئے ہیں۔ اسی سبب سے ایک دوسرے سے متغائر ہو گئی ہیں اور ان کی کثرت
سمجھ میں آتی ہے مگر جسموں سے متعلق ہونے سے پہلے اس تغائر کے اسباب موجود نہ تھے
اور اسی لئے ان کا کثیر ہونا باطل تھا۔ لیکن یہ جواب کچھ زیادہ تشفی بخش نہیں معلوم ہوتا کیوں کہ روح
کو ایک جوہر غیر متحیز ماننے اور یہ تسلیم کرنے کے بعد کہ نہ وہ جسم میں داخل ہے نہ اس سے
خارج نہ اس سے ملی ہوئی ہے نہ اس سے جدا ہے بلکہ اس کا تعلق بدن سے صرف ایسا
ہے جیسے کہ صورت کا آئینہ میں تو پھر وہ کس طرح انسان کے افعال سے اخلاق حسن یا اخلاق
قبیح حاصل کر سکتی تھی تاکہ انسانوں کے مرنے کے بعد ان کی روح میں تغائر پیدا ہو،
اور کثرت روحوں کی وجود پذیر ہو۔ علاوہ اس کے امام صاحب نے خود تسلیم
کیا ہے کہ روح اس وقت حادث ہوتی ہے جبکہ نطفہ میں اس کے قبول کرنے کی

استعداد پیدا ہو جائے اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ توالد و تناسل کے مسلسل اور غیر منقطع سلسلہ کے مدنظر آنِ واحد میں بہت سے نطفے روح کے قبول کرنے کی استعداد پیدا کرتے رہتے ہیں اور امام صاحب کے نظریہ کی بنا پر یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ہر ایک کے لئے روح حادث ہو اس طرح روح کا آن واحد میں کثرت سے حادث یعنے موجود ہونا بلا کسب ہی اختلاف کے لازم آتا ہے اور یہ دعویٰ بلا دلیل رہ جاتا ہے کہ قبل وجود ابدان روح کا کثرت سے موجود ہونا باطل ہے امام صاحب کے اس خیال کی تردید میں جب یہ حدیث پیش کی گئی کہ "خلق اللہ تعالیٰ الارواح قبل الاجساد بالفی عام" جس سے حدوث ابدان کے قبل ارواح کا کثرت سے موجود ہونا ثابت ہوتا ہے تو امام صاحب نے اس حدیث کی اس طرح تاویل کو ضروری قرار دیا کہ ارواح سے ارواح ملائکہ مراد ہیں اور اجساد سے اجساد عالم۔

روح کے متعلق اپنے اس مسلک کے بالکل برخلاف امام صاحب نے اپنی کتاب المضنون بہ علی غیر اہلہ میں روح کی تعریف یہ کی ہے کہ "وہ ایک جسم لطیف ہے اخلاط کے بخار سے مرکب اور اس کا منبع دل ہے اور اس میں تمام قوائے نفسانی اور حیوانی دونوں ہیں اور اسی سے قوت حساسہ اور اعضاء کی حرکت حاصل ہوتی ہے" ظاہر ہے کہ اس تعریف میں وہ روح انسانی داخل نہیں ہو سکتی جس کا ذکر امام صاحب نے المضنون بہ علی غیر اہلہ میں کیا ہے۔

امام صاحب کے نزدیک لوح محفوظ اور قلم کی حقیقت۔

لوح سے وہ ایسا وجود مراد لیتے ہیں کہ جو اس قابل ہو کہ جو چیزیں اس پر نقش کرنی چاہئیں اس پر نقش ہو جائیں اور قلم سے مراد ایسے وجود سے ہے جس سے لوح پر جو نقش کرنا چاہئیں اس سے نقش ہو جائے کیونکہ قلم معلومات کی صورتوں کو لوح پر نقش کرنے والی چیز ہے لوح وہ چیز ہے جس پر ان معلومات کی صورتیں نقش ہوتی ہیں اور یہ ضرور نہیں کہ قلم نرسل کا اور لوح لکڑی کی ہو بلکہ یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ان دونوں کے لئے جسم بھی ہو کیونکہ قلم اور لوح کی ماہیت اور حقیقت میں ان کا مجسم ہونا داخل نہیں ہے بالکل ان کی روحانیت ان کی حقیقت ہے اور ان کی صورت ان کی حقیقت سے زائد جس کے کچھ معنی نہیں ہیں

پس کچھ بعید نہیں ہے کہ اللہ کا قلم اور اللہ کی لوح اس کی انگلیوں اور اس کے ہاتھ کے لائق ہو اور یہ سب چیزیں ایسی ہوں جو اس کی ذات کے لائق ہے اور وہ حقیقت جسمیت سے پاک ہو گی، بلکہ وہ سب جواہر روحانی یعنی روحانی ذاتیں ہوں گی بعض تو ان میں سے علم حاصل کرنیوالی ہیں۔ مثل لوح کے اور بعض علم دینے والی ہیں مانند قلم کے۔ "ان اللہ تعالیٰ علم بالقلم"، المضنون به علی غیر اہلہ میں بھی امام صاحب نے لکھا ہے کہ جواہر روحانیہ عقلیہ جن میں تمام موجودات کا نقش ہے شرع میں اسی کو لوح محفوظ سے تعبیر کیا ہے۔ امام صاحب کی اس تقریر سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ لوح و قلم کے ایسے وجود کے جو مجسم ہو قائل نہیں ہیں۔

صراط اور میزان کے متعلق امام صاحب کا مسلک

اپنی دو کتابوں میں امام صاحب نے صراط اور میزان کے متعلق بحث کی ہے جن خیالات کا اظہار اپنی تصنیف "الاقتصاد فی الاعتقاد" میں فرمایا ہے وہ مغائر ہیں ان خیالات سے جن کا اظہار "المضنون به علی غیر اہلہ" میں کیا ہے۔ الاقتصاد میں امام صاحب نے صراط اور میزان کے جسمانی وجود کو تسلیم کیا ہے اس میں صراط کے متعلق وہ فرماتے ہیں کہ یہ حق ہے اس کی تصدیق واجب ہے کیونکہ وہ ممکنات سے ہے اور وہ ایک پل جہنم کے اوپر تمام لوگ اس کو دیکھیں گے جب وہ اس تک پہونچیں گے تو فرشتے اس پر ٹھہرائیں گے تاکہ ان سے سوالات کئے جائیں۔ اون کے نزدیک اس کی صداقت میں شک کرنیوالے دو طرح کے ہی لوگ ہوسکتے ہیں ایک تو وہ جو سرے سے خدا کی قدرت کے منکر ہوں اس کے مقابلہ میں صراط کو ثابت کرنے سے پہلے خدا کو ہر ایک امر پر قادر ہونا ثابت کرنا چاہیئے۔ دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو خدا کی عام قدرت کے تو قائل ہیں لیکن یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی کہ بال سے باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز چیز پر سے کس طرح گذرنا ممکن ہوگا۔ تو ان کے مقابلہ میں کہا جائیگا کہ یہ بات ہوا پر چلنے سے زیادہ عجیب نہیں ہے ہوا جیسی خلخلی چیز پر جب یہ بات ممکن ہے تو صراط خواہ وہ کیسا ہی باریک ہو بہر حال ہوا سے تو زیادہ مضبوط ہے۔ "المضنون به علی غیر اہلہ" میں امام صاحب تحریر

فرماتے ہیں کہ صراحت پر ایمان لانا حق ہے اور یہ جو کہا گیا ہے کہ وہ بال کے مانند ہے تو بال کی باریکی کو بھی اوس سے مناسبت نہیں ہے جس طرح کہ خط مصطلحہ علم ہندسہ کی باریکی میں جو دھوپ اور چھاؤں کے بیچ میں فاصل ہے بال کی باریکی کو کچھ نسبت نہیں ہے۔ صراط کی باریکی خط ہندسہ کی باریکی کے مانند ہے جس میں مطلق عرض نہیں ہوتا اس کے بعد امام صاحب نے صراط سے مراد اخلاق متضادہ میں توسط حقیقی اختیار کرنا لی ہے۔ افراط و تفریط کے جو بیچوں بیچ ہے وہی توسط حقیقی اوس خط کے مانند ہے جو دھوپ اور چھاؤں میں فاصل ہے جس کو نہ دھوپ میں کہا جا سکتا ہے نہ چھاؤں میں اس بناء پر کمال انسانی کا انحصار امام صاحب کی نظر میں فرشتوں کی مشابہت پیدا کرنے میں ہے جن میں انسان کی طرح اخلاق متضادہ نہیں پائے جاتے اور چونکہ انسان ان اوصاف سے بالکلیہ علیحدہ نہیں ہو سکتا اس لئے وہ ایک ایسے طریقہ کے اختیار کرنے کا مکلف کیا گیا ہے جو ان اوصاف سے علیحدہ ہو جانے کے مشابہہ ہو یہی طریقہ توسط حقیقی ہے مثلاً سخاوت توسط حقیقی ہے کنجوسی اور فضول خرچی کے درمیان، یا بہادری توسط ہے تہور اور بزدلی کے درمیان یہی صراط مستقیم وہ توسط حقیقی ہے جو بال سے بھی زیادہ باریک ہے اور جو شخص ان صفات متضادہ کے دونوں سروں سے نہایت درجہ دور ہونا چاہے تو خواہ مخواہ اون دونوں سروں سے بچا بیچ میں ہوگا مثلاً ایک لوہے کے حلقہ کو آگ میں لال کر کے رکھیں اور اس میں ایک چیونٹی کو ڈال دیں تو وہ اوس کی گرمی سے بھاگے گی اور جو جگہ سب سے دور ہوگی وہاں ٹھیرے گی یعنی بجز مرکز کے اوس کو کوئی اور جگہ نہ ملے گی یہی مرکز وسط حقیقی ہے جس کو ہر طرف سے نہایت درجہ کا بُعد ہے اور اس مرکز کا مطلق عرض نہیں ہے اور وہ بال سے بھی زیادہ باریک ہے پھر جب خدا تعالیٰ قیامت میں اس صراط مستقیم کو متمثل کر دے گا تو جو کوئی اس دنیا میں صراط مستقیم پر ہوگا تو صراط آخرت پر بھی سیدھا چلا جائیگا۔
اس تقریر سے صراط کی جسمانیت کا اعتراف نہیں پایا جاتا بلکہ صرف صراط مستقیم کا جو ایک مفہوم ہے اس کا متمثل ہو جانا بیان کیا ہے امام صاحب کے خود اپنے الفاظ یہ ہیں کہ " فاذا امثل اللہ تعالیٰ لعبادہٖ فی یوم القیامۃ ھذا الصراط المستقیم...... الخ اس کی کوئی تشریح امام صاحب نے

نہیں کی ہے کہ یہ تمثل روحانی ہوگا یا جسمانی اور اگر روحانی ہوگا تو اس پر سے گذرنے کے کیا معنی ہوں گے
اسی طرح میزان کے متعلق "الاقتصاد" میں امام صاحب نے لکھا ہے کہ میزان حق ہے اور اس پر تصدیق
واجب ہے اس پر جب یہ اعتراض ہوا کہ اعمال تو عرض ہیں جو فاعل کے ساتھ معدوم ہوگئے معدوم
چیز کے تولنے اور جسم میزان پر ان کے پیدا ہونے اور ان کی خفت و شدت کا اندازہ کرنے کے کیا معنی
تو امام صاحب اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ رسول خدا صلعم سے جب یہ بات پوچھی گئی تو آپ نے
فرمایا کہ اعمال کے لکھے ہوئے صحیفے تولے جائیں گے کراماً کاتبین کے یہ لکھے ہوئے صحیفے مجسم چیز ہیں ان کو
جب میزان میں رکھا جائیگا تو اللہ تعالیٰ ان میں اعمال کے رتبہ کے موافق ہلکا پن یا بھاری پن پیدا
فرمائے گا۔ جب اس کا فائدہ امام صاحب سے پوچھا گیا تو اول امام صاحب نے کہا کہ خدا کے کاموں
میں یہ سوال ہی نہیں ہوسکتا تاہم بتایا کہ یہ کیا کم ہے کہ بندے اپنے اعمال کی مقدار جان جائیں گے
اور اس بات کے اندازہ کرنے کا موقع ملے گا کہ خدا نے ان کے ساتھ عدل کیا ہے یا اپنی مہربانی
سے ان کے گناہ نظر انداز فرما دیئے ہیں۔ اس سے مترشح ہے کہ امام صاحب میزان کے جسمانیت
کے قائل ہیں اس کے برخلاف "المضنون بہ علی غیر اھلہ" میں فرماتے ہیں کہ میزان پر
ایمان لانا واجب ہے جب کہ یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ نفس انسانی جوہر ہے جو اپنے آپ سے
قائم ہے اور جسم کا محتاج نہیں ہے تو وہ خود اس بات کیلئے تیار ہے کہ حقایق امور اور جو تعلق اس کو
جسد سے تھا وہ اس پر منکشف ہوجائے اور جو کچھ اس پر منکشف ہوگا اس کے اعمال کی تاثیر ہوگی بلحاظ
قرب و بعد ذات باری کے اور خدا کی قدرت میں ہے کہ کوئی ایسی راہ نکالے جس سے ایک لحظہ میں
تمام خلق اپنے اعمال کی مقدار اور اس کی تاثیر دریافت کرلے اس کے بعد امام صاحب فرماتے ہیں
کہ میزان حقیقت میں اس چیز کا نام ہے جس سے کسی شئے کی کمی یا زیادتی معلوم ہو پس خدا کو اختیار
ہے کہ اعمال کے اندازہ کے طریقہ کو متمثل کردے جس سے زیادتی اور کمی اعمال کی معلوم ہو اور
اس کی صورت محسوس موجود ہو یا صرف خیال میں تمثل ہو اور خدا کو معلوم ہے کہ وہ اس کی ایسی
صورت پیدا کرے گا جو محسوس ہو یا ایسی کرے گا جو تمثل خیالی ہو۔

ملائکہ جن اور شیاطین کے متعلق امام صاحب کا خیال ۔

المضنون الکبیر میں ان کے متعلق امام صاحب نے فرمایا ہے کہ یہ جواہر ہیں جن کی حقیقتیں مختلف ہیں ان کا اختلاف ایسا ہے جیسا کہ کسی ایک چیز کی مختلف اقسام میں ہوتا ہے بمثلاً قدرت علم اور رنگ آپس میں مختلف ہیں مگر یہ تینوں چیزیں اپنے آپ سے قایم نہیں ہیں بلکہ کسی دوسرے میں ہونے کے محتاج ہیں اسی طرح ملائکہ اور شیاطین اور جن مختلف ہیں مگر خود جوہر ہیں اور اپنے آپ سے قایم ہیں ان کے اختلاف کی حقیقت کے متعلق امام صاحب لکھتے ہیں کہ یہ ہیں تو ایک ہی قسم کے مگر خیر و شر جو ان میں ہے اس سے باہم مختلف ہیں جیسے کہ انسان ناقص اور انسان کامل میں اختلاف پایا جاتا ہے لیکن بعد میں چل کر فرماتے ہیں کہ ان میں قسم ہی کا اختلاف ہے یعنے ایسا اختلاف جیسے گھوڑے اور انسان میں ہے ۔

اس کے بعد امام صاحب نے بحث کی ہے کہ آیا ان جواہر کی صفات میں کسی نقصان کے پیدا ہوئے بغیر ان کی تقسیم ممکن ہے یا نہیں ۔ اور نیز یہ کہ متحیز ہیں یا غیر متحیز ۔ اس کا فیصلہ انہوں نے اس طرح کیا ہے کہ اگر جزء یتجزیٰ کا موجود ہونا محال ہے تو ان کا تقسیم ہونا بھی محال ہے اور اگر جزء یتجزیٰ کا موجود ہونا ممکن ہے تو ان کا متحیز اور غیر منقسم ہونا بھی ممکن ہے امام صاحب محض اس وجہ سے کہ ان کے غیر متحیز اور غیر منقسم ہونے کو ناجائز نہیں قرار دیتے کہ ایسا ہونے سے خدا میں اور ان میں کیا چیز ہوگی جس سے فرق کر سکے اس لئے کہ کسی دو چیزوں میں عینیت اور مماثلت کے لئے صرف یہ کافی نہیں ہے کہ فلاں چیز ان دونوں میں نہیں پائی جاتی ۔ اگرچہ لہ امام صاحب ملائکہ کو غیر محسوس کہتے ہیں لیکن ساتھ ہی اس امکان کے بھی قائل ہیں کہ وہ دکھائی دیں اور یہ ان کے نزدیک دو طرح ممکن ہے یا کوئی صورت میں بن جاویں جیسا کہ خدا نے کہا "فتمثل لها البشر اسویاً" لیکن اس صورت میں امام صاحب نے اس کی توجیہہ نہیں کی کہ صورت اختیار کرنے کی شکل میں ان کا غیر منقسم اور غیر متحیز ہونا کیوں کر باقی رہا دوسری صورت فرشتوں کے دکھائی دینے کی امام صاحب نے یہ بتائی ہے کہ شاید بعض ملائکہ کے لئے ایسا بدن ہو

جو محسوس ہو سکتا ہو اور اس کا محسوس ہونا نورِ نبوت پر موقوف ہو جیسے کہ ہمارا دنیا کی چیزوں کو دیکھنا
سورج کے نور پر موقوف ہے امام صاحب کے خیال میں یہی حال جن و شیاطین کا ہے لیکن امام صاحب
نے جب ان کا بدن خواہ وہ کسی قسم کا ہو تسلیم کر لیا تو پھر ان کے غیر منقسم اور غیر متحیز ہونے کے
معنے سمجھ میں نہیں آتے معلوم ایسا ہوتا ہے اس کے بعد امام صاحب کے خیالات میں ترقی ہوئی
چنانچہ "المضنون بہ علی غیر اھلہ" میں طویل مباحث کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ آسمان مع
اپنے تمام اجزا کے ایک بہت بڑے انسان کے مانند ہے اور انسان کے مانند اس میں نفس
بھی ہے اور اس کے تمام اجزا ایسے ہیں جیسے کہ انسان یا حیوان کے اعضا مختلف اور وہ اپنے
ارادہ سے حرکت کرتا ہے اور اس حرکت کرنے سے اس کی ایک اہم غرض یہ ہے کہ اپنے
سے زیادہ اشرف ایک جوہر کے مشابہ ہونے کا شوق پورا کرے اور اس جوہر کا قدیم حکماء اور
فلاسفہ نے عقل مجرد نام رکھا ہے لیکن شرع کی زبان میں اس کو ملک مقرب کہا جاتا ہے۔
جب کہا جاتا ہے کہ العقول کثیرہ تو مراد اس سے ملائکہ کی کثرت ہوتی ہے پھر ایک جگہ فرماتے
ہیں کہ عقول مجردہ کا کثرت سے ہونا ضروری ہے یہ ہو نہیں سکتا کہ آسمانوں کی تعداد سے کم عقول
مجردہ ہوں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ یہ بات ثابت ہے کہ آسمان متعدد ہیں اور ان کی حرکتیں
بھی مختلف ہیں تو ان آسمانوں کے نفوس وہی ملائکہ سماویہ ہیں کیونکہ اجسام سماوی سے خصوصیت
رکھتے ہیں اور یہی عقول سماویہ ملائکہ مقربین ہیں کیوں کہ وہ مادہ کے علائق سے بری ہیں اور صفات میں
رب الارباب کے قریب ہیں۔ امام صاحب کے ان خیالات سے صاف مترشح ہے کہ
آسمانوں کے فلسفی وجود کے متعلق متقدمین علماء اور حکماء اور فلاسفہ نے جو غلطی کی تھی اس سے
امام صاحب بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ اس کی تائید میں جو دلیل بھی پیش کی جاتی ہے اس کے
بے بنیاد ہونے میں کلام دشوار ہے اور حقیقی مذہب اسلام کو اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔
اس سے قطع نظر امام صاحب کے اس قول کا نتیجہ یہ ہے کہ عقول مجردہ وہی ملائکہ ہیں مگر وہ نہ منقسم
ہو سکتے ہیں نہ متحیز ہیں نہ ہاتھ سے محسوس ہو سکتے ہیں اور نہ آنکھ سے دکھائی دے سکتے ہیں ۔

" المضنون بہ علی غیر اھلہ" میں امام صاحب فرماتے ہیں کہ " جب یہ بات جان لی کہ خدا تعالیٰ کے کام دو طرح پر ہیں ایک تو اس نے بلا واسطہ کئے ہیں اور دوسرے جو اس نے بالواسطہ کئے ہیں اور وسائط بلحاظ مدارج مختلف ہیں " فالوسائط ھم المقربون وعنھم یعبر بالملائکۃ " اس قول کا نتیجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ عالم میں جو اسباب طبعی وقوع حوادث کے ہوتے ہیں انہی اسباب پر ملائکہ کا اطلاق ہوتا ہے۔

حرارت کا ہونا اور بخارات کا جمع ہونا بادلوں کے لانے کے فرشتے ہیں۔ مگر اس میں ایسے اسباب جمع ہوئے جس سے بادل گرجے اور بجلی چمکے مینہ برسے، بادل گرجنے بجلی چمکنے، مینہ برسانے کے فرشتے ہیں۔

امام صاحب کی اس رائے کے مقابلہ میں فرض کیجئے اگر کوئی شخص وجود کی پانچ قسموں میں سے جس کی حکیمانہ تفصیل کا سہرا خود امام صاحب کے سر ہے کسی ایک کی بنا پر ملائکہ سے قوائے مدبر عالم اور قوائے ملکوتی انسانی مراد لے اور شیطان سے قوائے حیوانی نفسانی انسانی مراد لے تو امام صاحب کے اپنے موضوعہ اصول کے مطابق ایسا کرنے میں کوئی شرعی عذر تو لازم نہیں آئے گا۔ اس مقالہ سے مقصود صرف اس قدر تھا کہ کلامی مباحث میں امام صاحب کے مخصوص رنگ کا کسی قدر اندازہ ہو جائے ورنہ ان کے کلامی خصوصیات کے متعلق کسی تفصیل کا انحصار اس نوعیت کے تمام مباحث کا جائزہ لینے پر ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں تاہم اس مختصر سے تبصرہ سے بھی اس امر کا بآسانی پتہ چل سکتا ہے کہ فلسفیانہ اصول کی کسوٹی پر کلامی مسائل کو رکھ کر بحث و مناقشہ کے اعتبار سے امام صاحب نہ صرف اپنے ہم عصروں بلکہ متقدمین متکلمین میں ایک امتیازی شان کے مالک دکھائی دیتے ہیں فقط

مخطوطات کے خزانے

(۲)

از محمد غوث صاحب، ایم اے

(۴)

مرات الصفا

سلطنت آصفیہ اور دکن کی تاریخ کی چھان بین کی ضرورت ابھی کامل طور سے رفع نہیں ہوگئی جو چند کتابیں
طبع ہوئی ہیں وہ عام طور سے متداول ہیں ان سے حالات و واقعات کی جیسے چاہیے ویسے تشریح اور توضیح نہیں ہوتی
تاریخ ظفرہ، تو زک آصفیہ، حدیقۃ العالم، نگارستان آصفی، گلزار آصفیہ، مآثر الامراء، تاریخ رشید الدین خانی، تاریخ خورشید جاہی
اور دوسری مطبوعہ کتابوں سے طالب علموں کی پیاس نہیں بجھتی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ قدیم مخطوطات ڈھونڈھ
ڈھونڈھ کر طبع کرائے جائیں افسوس اس امر کا ہے کہ تاریخ دکن کے مخطوطات طبع کرنے اور اس طرح ملک کی ایک تحقیقی خدمت
انجام دینے کے لئے نہ تو سرکاری علمی اداروں نے کوئی توجہ کی اور نہ کسی غیر سرکاری ادارہ نے اس ضرورت کا احساس کیا۔
کم از کم تاریخ دکن کی ایک ببلوگرافی کی ترتیب پر ہی ملک کے ارباب تاریخ توجہ کریں تو بڑی خدمت ہوگی۔

بہر حال مرات الصفا بھی ایک ایسی کتاب ہے جس سے استغنا نہیں ہو سکتا اس کتاب کے مؤلف محمد علی
حسینی ہیں والد کا نام محمد صادق تھا۔ محمد علی نے مشاہیر وقت کی مصاحبت میں نام و نمود پیدا کیا تھا۔ دکن میں
بود و باش تھی برہان پور وطن تھا اور صوبۂ خاندیس میں جاگیر حاصل تھی نواب صلابت جنگ کے عہد کے زمانہ میں یوان
سلطنت آصفیہ نواب صمصام الدولہ میر عبد الرزاق، شاہنواز خان کے پاس میر منشی کے فرائض انجام دیئے تھے۔
نیز اس زمانہ کے ایک دوسرے امیر میر نجف علیخان، شمشیر جنگ کے پاس بھی خدمت انجام دی تھی۔ مرات الصفا میں
لکھا ہے کہ نواب غازی الدین خاں فیروز جنگ کا اورنگ آباد میں انتقال ہوگیا تو اون کی عطا کردہ سند
کی بنا پر جہار اؤ ہولکر نے صوبۂ خاندیس کا مطالبہ کیا یہ مطالبہ تسلیم کرلیا گیا اس وقت یہ بات بھی قرار پائی

کہ صوبۂ خاندیس کی جاگیریں باقی نہ رہیں گی۔ چنانچہ جن لوگوں سے جاگیریں لے لی گئیں ان میں محمد علی بھی شامل تھے غرض انکے ذاتی حالات کی مزید تلاش ہو سکتی ہے۔

محمد علی حسینی نے شوق تالیف پایا تھا۔ تاریخ سے بھی ذوق تھا۔ تاریخ راحت افزا اور مرآت الصفا ان کی دو تالیفیں ہیں دونوں کتابوں کا موضوع تاریخ ہے دونوں کا تقابل اس وقت پیش نظر نہیں ہے اس کو کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھا جاتا ہے فی الوقت مرآت الصفا کے متعلق مختصر تذکرہ پیش نظر ہے۔

مرات الصفا، مآثر الامراء کے ماخذوں میں شامل ہے لیکن جہاں تک علم ہے مابعد مورخوں نے اس سے کوئی استفادہ نہیں کیا اب جو لوگ تاریخ دکن پر کام کر رہے ہیں انھوں نے بھی غالباً اس ماخذ پر توجہ نہیں کی۔ سراج الدین طالب مرحوم کی کتابوں میں بھی اس کتاب کا کوئی حوالہ مرقوم نہیں ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب کی انگریزی تالیف " نظام الملک آصفجاہ " کے ماخذوں کی فہرست میں بھی اس کتاب کا نام شامل نہیں ہے۔ البتہ ڈاکٹر صاحب موصوف کے بعض حالیہ مضامین میں صاحب مرآت الصفا کی دوسری تالیف راحت افزا کے حوالے موجود ہیں۔ مولوی ظہیر الدین صاحب ام اے نے اپنی تالیف احمد شاہ بھمنی میں اس کا حوالہ دیا ہے۔

مرآت الصفا کی تالیف کا زمانہ نواب صلابت جنگ مرحوم کا عہد ہے خطبہ کتاب میں اس کتاب کو نواب شاہ نواز خاں کے نام سے منسوب کیا گیا ہے لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ گو کتاب اسی وقت تالیف ہوئی لیکن بعد میں۔ مابعد سات آٹھ سال کے مزید حالات کا اس میں اضافہ عمل میں آیا سب کو معلوم ہے کہ نواب شاہ نواز خاں ۱۱۷۱ھ میں شہید ہوئے لیکن مرات الصفا میں واقعات کے بیان کرنے کا تسلسل ۱۱۷۹ھ تک قائم ہے۔

مؤلف نے خطبۂ کتاب میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ اس کتاب کی تالیف سے قبل ایک دوسری کتاب بھی لکھی تھی اس کا موضوع بھی تاریخ تھا حضرت ناصر جنگ شہید کے نام سے اس کو منسوب کیا گیا تھا لیکن کوئی صلہ نہیں ملا اور اس بات کا بھی علم نہیں ہے کہ خود کتاب کیا ہوئی اس تلف شدہ کتاب میں ۱۱۵۳ھ تک کے واقعات قلمبند کئے گئے تھے غرض پہلی کتاب تلف ہو جانے کے بعد مرآت الصفا کی تالیف عمل میں آئی۔

مرأت الصفا ایک ضخیم کتاب ہے اور سترہ سطری مسطر ایک ہزار دس صفحات پر مشتمل تقطیع ۱۰×۷ ہے۔
اس کتاب کا موضوع ممالک مشرق کی تاریخ ہے لیکن در اصل اسکو مولف کے زمانہ کی تاریخ کہنا زیادہ درست ہوگا کتاب کے دو دفتر یا دو حصے ہیں۔ پہلا دفتر کئی ابواب میں، ہر باب فصلوں میں اور فصل ٹکڑوں میں منقسم ہے۔

پہلے دفتر کے مضامین کی تفصیل یوں ہے۔

مقدمہ تاریخ کی تعریف اور تاریخ دانی، پہلا باب خلقت عالم و آدم اور قبل بعثت انبیا، بادشاہان اور حکما، نیز ایران کے حکمرانوں کا احوال، دوسرا باب آنحضرت صلعم اور خلفاء راشدین ضمناً دوسرے کئی صحابہ کا تذکرہ۔ واضح ہو کہ کیا اس باب میں اور کیا آئندہ باب میں حالات بہت اختصار سے درج کئے ہیں۔ تیسرا باب خلفاء بنی امیہ و بنی عباس۔ چوتھا باب صاحبان خروج، پانچواں باب سلاطین عجم، طاہریہ خراسان، صفاریہ سیستان، سامانیہ، سبکتگینیہ، دیالمہ (بنی بویہ) سلجوقیہ ایران، کرمان و روم۔ خوارزم شاہیہ، اسمٰعیلیہ، اتابکیہ فارس، غوریہ خراسان کرت ہرات، مازندران، سلاطین سیستان، سلاطین لار، سلاطین شیروان شاہیہ۔ چھٹا باب سلاطین عرب و حجاز ساتواں باب سلاطین چنگیزیہ، آٹھ فصلوں میں۔ آٹھواں باب شاہان صفویہ، یہ حالات نسبتاً زیادہ تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ نواں باب ملوک عثمانیہ روم، دسواں باب چنگیزیہ توران، گیارہواں باب سلاطین ہندوستان حالات بہت اختصار کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ سلاطین دہلی و آگرہ قبل تیموریہ، بہمنیہ دکن، نظام شاہیہ، عادل شاہیہ، قطب شاہیہ، عماد شاہیہ، بریدیہ بیدر، سلاطین احمد آباد و گجرات، مالوہ، خاندیس، بنگالہ، جون پور، سندھ، ملتان، کشمیر، تبت کوچک ان سب فصلوں میں بادشاہوں اور حکمرانوں کے مختصر حالات اور ضروری سنین بیان کئے ہیں۔

اس کے بعد مزید چار باب اور ہیں ان کی افادیت میں بھی کلام نہیں ہو سکتا۔ ہر باب کے متعلق مختصر توضیح کی جاتی ہے۔

۱۔ علماء، فضلاء، اہل اسلام بیسوں علماء اور اہل فضل و کمال کے حالات قلمبند کئے ہیں اور کوشش کی ہے کہ بالالتزام ہر صاحب تذکرہ کا سنہ وفات درج کرے۔

۲۔ مشائخ کرام اور صوفیہ۔ مقام اور علاقہ کی تخصیص کے ساتھ مثلاً قزوین کے فلاں فلاں مشائخ،

سہروردی کے فلاں فلاں مشائخ، اسی طرح سمرقند کے خوارزم کے، ہندوستان کے مشائخوں کا تذکرہ۔

۳ - شعرائے عرب و عجم، اس باب میں بھی علاقہ کی تخصیص کے ساتھ تذکرہ لکھا ہے۔

۴ - بعض سنین کے اہم غیر معمولی اور دلچسپ واقعات۔

خاتمہ ایک تختہ پر مشتمل ہے جس میں گویا بطور خلاصہ ۶ خانوں میں حکمرانوں کے ضروری حالات واضح کئے ہیں یہ تختہ حسب ذیل ۶ خانوں پر مشتمل ہے۔

(۱) اسماء بادشاہاں۔ (۲) نسد الیشان (۳) دار الملک، (۴) ظہور (۵) انقراض، (۶) مدت سلطنت۔

کتاب کا پہلا دفتر یا پہلا حصہ یہاں ختم ہو جاتا ہے اور دوسرا دفتر شروع ہوتا ہے۔

دوسرا دفتر دو بابوں پر محتوی ہے۔ پہلا باب آل تیمور کے ان حکمرانوں کا تذکرہ جنھوں نے ایران اور توران میں شاہی کی۔ دوسرے باب میں ہندوستان کے تیموری حکمرانوں کے زمانہ کی تاریخ قلبند کی ہے۔ ان دونوں بابوں میں سنہ وار حالات و واقعات بیان کئے ہیں۔

کتاب کا یہ حصہ بھی ایک مستقل کتاب کے طور پر شروع ہوتا ہے۔ تمہید اور ضروری مراتب موجود ہیں۔ اس حصہ کو بھی نواب صمصام الدولہ شاہ نواز خان مرحوم کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔

پہلا باب بہت مختصر ہے۔ ناقل نے غالباً سہواً دوسرے باب کا آغاز نظر انداز کر دیا ہے بہر حال، "ابو المظفر نصیر الدین محمد ہمایون بادشاہ" کی سرخی موجود ہے اور سمجھنا چاہیے کہ اسی سے دوسرا باب شروع ہوتا ہے دوسرے باب کے ابتدائی حصہ میں بھی حالات بہت اختصار کے ساتھ قلمبند کئے ہیں لیکن جیسے جیسے حالات اور واقعات کا زمانہ مؤلف سے قریب ہوتا جاتا ہے بیان میں بسط اور وسعت پیدا ہوتی گئی ہے تا آنکہ ۱۱۶۷ھ پر سلسلہ بیان ختم کر دیا گیا ہے یوں اگر دیکھا جائے تو بیان کی وسعت بہادر شاہ کے زمانہ کے حالات سے شروع کی ہے اور محمد شاہ کے عہد کے امور کو خوب پھیلایا ہے۔ اسی سلسلہ میں حضرت آصف جاہ اول کے حالات بھی آتے ہیں اور مؤلف نے واقعات نہ صرف سلسلہ وار لکھے ہیں بلکہ با ہموار اور اکثر تاریخوں وار، در اصل کتاب کے اس حصہ کو عہد آصفجاہی کی تاریخ کہنا بالکل درست ہے۔

اس کا انعقاد ۲۹ و ۳۰ فروری کو عمل میں آیا۔ تفصیلات اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ مجلہ کی آیندہ اشاعت میں مکمل روئداد اور مقالات وغیرہ شائع ہوں گے۔

اطلاعات نمائش

۱۔ مجلس عاملہ نے اپنے اجلاس منعقدہ ۲۳۔ اسفندار میں مجلس نمائش کے مالیات کے متعلق قواعد منظور کئے ان قواعد کی رُو سے مجلس عاملہ ہر سال ایک فینانس کمیٹی "مالیاتی کمیٹی" کے نام سے مقرر کرے گی اور تاوقتیکہ نئی کمیٹی کی تشکیل نہ ہو جائے سابقہ کمیٹی کام کرتی رہے گی۔ اس کمیٹی میں صدر، نائب صدر، معتمد اور معاون کے علاوہ اور (۵) ارکان ہوں گے ان قواعد کی رُو سے مالیاتی کمیٹی کے اختیارات اور فرائض کا تعین کیا گیا ہے اور رقم کے صرف کرنے کے عام امور تعین کئے گئے ہیں۔

۲۔ حسب سفارش مالیاتی کمیٹی حیدرآباد اسٹیٹ بنک کے ۱۰۱ حصص (۲۰۔۱۳۸) روپے میں خرید کئے گئے۔

۳۔ آیندہ نمائش کے سلسلہ میں ضروری امور پر غور کرنے کے لئے ایک نئی کمیٹی بنائی گئی یہ کمیٹی سابقہ و حالیہ تجربہ کی روشنی میں تجاویز مرتب کر کے پیش کرے گی۔ آیند نمائش کے پیش نامہ کی ترمیم کرے گی۔ اضلاع سے بہ کثرت صناعوں کی شرکت کے وسائل فراہم کرے گی۔ تمام اخراجات پر تفصیلی طور سے غور کر کے یہ رائے پیش کرے گی کہ کن امور میں مزید کفایت ہو سکتی ہے اور بہ اغراض مجلس نمائش کن ابواب میں مزید خرچ کی ضرورت ہے۔

۴۔ اضلاع میں صنعتی نمائشوں کا انعقاد عمل میں آرہا ہے اور ان کی امداد عمل میں لانے سے مجلس نمائش کا مقصد پورا ہوتا ہے لہذا حسب ذیل قواعد منظور کئے گئے۔

(۱) مجلس نمائش ہر سال مناسب رقم اضلاع کی نمائشوں کے انعقاد ان کی امداد اور صناعوں کی حوصلہ افزائی کے لئے منظور کر سکے گی۔

(۲) مجلس نمائش اضلاع کی نمائشوں کے لئے اپنا فرنیچر و سامان بھی بعد اطمینان بہ شرائط مناسب مستعار دے سکے گی۔

(۳) جن مقامات پر نمائشوں کا انعقاد ہو اس کے منتظمین کی جانب سے امداد کی درخواست بلحاظ حالات

بچوں کا طبی معائنہ کیا محترمہ منگر کیا اور محترمہ باقر جنگ نے ڈاکٹر صاحبان موصوف کے ساتھ حسب ذیل بچوں کو انعام کا مستحق قرار دیا ۔

طبقۂ اوّل

(تا ایک سال)

پہلا انعام ۔ احمد سعید خان ولد محمد عثمان خان صاحب

دوسرا انعام سید نعیم اللہ عثمانی ولد سید محمد مرتضیٰ صاحب

تیسرا انعام لچمیا ولد راما سوامی صاحب

زائد انعام لبیہ دریجا بنت گوپتہ راؤ صاحب

" " لیلیٰ بنت شیخ محمد صدیقی صاحب

طبقۂ دوم

(ایک تا دو سال) پہلا انعام ذکیہ بنت قاسم عبدالوحید صاحب

دوسرا انعام نرسنگھ جی ولد شرفن جی صاحب

تیسرا انعام جابر حسین ولد یوسف حسین صاحب

زائد انعام نجمت اللہ خان ولد خواجہ معین الدین خان صاحب

طبقۂ سوم

(دو تا پانچ سال) پہلا انعام منظہر الدین ولد نواب صمد یار جنگ بہادر

دوسرا انعام محمود صدیق ولد غلام محمد صدیقی صاحب

تیسرا انعام صبیحہ شہزادہ بنت ابوبکر خان صاحب خویشگی

زائد انعام سلطان جہاں بنت محمد اسلم صاحب

" " " شجاع الدین ولد شیخ احمد صاحب گیت دار

حکیم نارائن داس روننگ کپ کے احمد سعید خان کے والدین اور راجہ بہادر وینکٹ راما ریڈی روننگ کپ مرکز بہبودی اطفال بیگم بازار اور نواب خواجہ نذیر اللہ خان کپ کے ذکیہ بنت قاسم عبدالوحید صاحب

مستحق قرار پائے۔

مزید انعامات خواجہ حمید احمد صاحب بی، اے (عثمانیہ) معتمد معاشی کمیٹی اور مولوی جلال الدین صاحب کی طرف سے دیئے گئے۔

ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی صدر نمائش مصنوعات ملکی نے بچوں کو تاریخ ۸ فروری انعامات عطا کیے۔

مجلۂ طیلسانیین

حصۂ

معاشیات

شمارۂ روداد پانچویں معاشی کانفرنس و نمائش

دوسری جلد۔ اردی بہشت ۱۳۵۲ف، ربیع الاول ۱۳۶۲ھ، مارچ ۱۹۴۳ء دوسرا شمارہ

مدیر مجلۂ طیلسانیین: محمد غوث ام اے، ال ال بی (عثمانیہ)

فہرست مضامین

صفحہ

ارشاد ملوکانہ

پانچویں نمائش مصنوعات ملکی کے افتتاح کے موقع پر

آج مجھ کو اس نمائش کا افتتاح کرکے مسرت ہوئی یہ نمائش اہل ملک میں پسندیدہ اور ہر دلعزیز ہے اس کی ابتدا سے میں ہر سال اس میں آیا کرتا ہوں۔ لیکن اس سال میں نے بانیاں نمائش کی خواہش پر خود اس کا افتتاح کرنا اس لئے قبول کیا کہ اس سے لوگوں پر ملکی صنعت اور تجارت کی اہمیت ظاہر ہو اور اس کو ترقی اور فروغ دینے کی طرف اہل ملک کی توجہ مائل ہو۔

۲۔ اس نمائش کے بانی جامعہ عثمانیہ کے قدیم طلبہ ہیں انہوں نے ملکی صنعتی ترقی کیلئے جو عملی کام کیا ہے اس سے ان کی ہمت اور حوصلہ کا پتہ ملتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ جامعہ کی تعلیم و تربیت کے بدولت ان میں علمی ذوق و شوق کے علاوہ عملی کام کرنے کی بھی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے جو قابل قدر ہے ضمناً میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حالیہ سیاسی فسادات اور ہنگاموں میں میری جامعہ کے طلبہ نے جو نظم و ضبط قائم رکھا اور موجودہ سیاسی ہلچل میں حصہ لینے سے اجتناب کیا ان کا یہ اچھا رویہ دوسروں کے لئے قابل تقلید ہے۔ چنانچہ اس کے بارے میں ہز اکسلنسی وائسرائے بہادر نے مجھکو مبارکباد کا پیام بھیجا ہے۔

۳۔ آج کل کی جنگ سے مختلف قسم کے اشیاء کی درآمد بند ہو جانے سے ان اشیاء کو خود ملک میں تیار کرنے کی ضرورت داعی ہوئی ہے اور اس طرح لوگوں کو ملکی صنعت کو فروغ دینے کا موقع ملا ہے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس فرصت سے فائدہ اٹھا کر اس بات کی کوشش کریں کہ خود ملک کی صنعت اور پیداوار ہماری اکثر ضرورتوں کو کافی ہو جائے۔ کیا اچھا ہو اگر ہر شخص اس بات کا عزم کرلے کہ وہ اپنے ضروریات زندگی کی چیزیں اپنے ملک کی بنی ہوئی خریدے اور صرف وہ اشیاء جو ملک میں تیار نہیں ہوتیں باہر سے خریدے بلکہ انکے بارے میں بھی یہ فکر کرے کہ کیوں نہیں وہ چیزیں ملک میں بنائی جائیں۔

۴۔ جنگ کی وجہ سے جو بعض صنعتوں کو قائم کرنے کے مواقع حاصل ہو گئے ہیں ان سے میری حکومت بے خبر نہیں ہے بلکہ اس کی کوشش کر رہی ہے کہ اس ملک کے اشیائے خام کو حتی الامکان صنعتوں کے کام میں

لایا جائے تاکہ اس کا مالی فائدہ نہ صرف کارخانوں بلکہ غریب کاشتکاروں کو بھی حاصل ہو جو ان اشیا خام کو پیدا کرتے ہیں نیز ان مزدوروں کو۔ روزی نصیب ہو جو کارخانوں میں کام کرتے ہیں۔

۵۔ ہر ملک کی صنعتی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ جس ملک نے اپنی فرصت اور مواقع سے فائدہ اٹھایا اور بروقت عمل کیا کامیاب رہا جو سوچتا رہا اور عمل میں پیچھے رہا اس سے میدان معیشت میں دوسرا بازی لے گیا۔

۶۔ جامعۂ عثمانیہ سے متعلق ایک زرعی کالج قائم کرنے کی تجویز خود جامعہ کی اسکیم میں داخل ہے لیکن بوجہ مصارف جنگ اس پر عمل نہیں ہو سکا ہے جنگ کے اختتام پر اس پر بعجلت کام ہونا چاہیئے۔

۷۔ مگر صنعتی ترقی محض حکومت ہی کے ذمہ نہیں ہے ملک کے سرمایہ داروں کا خود معاشی مفاد اس میں ہے اور ان کا اخلاقی فرض بھی ہے کہ ملک میں جن اشیا کی کھپت ہوتی ہو ان کے بارے میں معلومات حاصل کریں اور ان اشیا کی تیاری کی اسکیم بنائیں اور حکومت سے سہولتیں اور مشوروں کے طالب ہوں۔ اس طرح ملک میں روزگار کے بڑھانے اور بے روزگاری کو دور کرنے میں ممد و معاون ہوں۔

۸۔ آخر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ گو کہ نمائش اطمینان بخش ہے تاہم جن چیزوں کی نمائش کی جاتی ہے ان کو کافی مقدار میں بازار میں لانے اور ان کی فروخت (اندرون و بیرون ملک) کرنے کا انتظام کافی طور پر نہیں کیا جاتا۔ یہ غرض پوری کرنے کے لئے اگر صناعوں کی ایک انجمن امداد باہمی قائم ہو تو مناسب ہے تاکہ ایک دوسرے کی مدد سے یہ کام انجام پا سکے۔

۹۔ الحاصل انجمن طلبہ قدیم نے جو کام کیا ہے وہ اپنی حد تک اچھا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ انجمن اہل ملک کی مدد سے آیندہ اور زیادہ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرے گی اور اسکی کوشش کرے گی کہ حیدرآباد صنعت و حرفت میں ہندوستان کے کسی حصہ سے پیچھے نہ رہے۔

۱۰۔ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے طلبا نے بھی جو تپاک کر وار یاآئین کا اظہار برٹش انڈیا کے خلفشار کے زمانہ میں کیا تھا، اس کے متعلق ہز اکسلنسی دی وائسرائے بہادر نے جو اظہار پسندیدگی کیا تھا میں نے بہ حیثیت چانسلر یونیورسٹی مذکور یہ پیام بتوسط سر ضیاء الدین احمد طلبا تک پہونچا دیا ہے جو یقیناً ان سب کے لئے موجب حوصلہ افزائی ہوا ہوگا اور جس کی آجکل کے پر آشوب زمانہ میں سخت ضرورت ہے کہ بغیر اس کے امن و امان قائم نہیں رہ سکتا فقط

حضرت اقدس و اعلیٰ سپاس نامہ کا جواب ارشاد فرما رہے ہیں

حضرت اقدس و اعلیٰ پانچویں نمائش مصنوعات ملکی کے افتتاح کے موقعہ پر
از راہ عطوفت شاہانہ اسکوٹ کی سلامی قبول فرما رہے ہیں

حرف آغاز

"معاشیات" کا یہ شمارہ پانچویں معاشی کانفرنس کے خطبات مقالوں اور مباحث نیز مصنوعات مملکت آصفیہ کی پانچویں نمائش کی بعض ضروری تفصیلات پر مشتمل ہے۔ اسی لئے اسکو "شمارہ رُوداد پانچویں معاشی کانفرنس و نمائش" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ نمائش کی افتتاح کے ارشاد ملوکانہ سے اس شمارہ کے اولین صفحات کو زینت دیگئی ہے۔

اس بات کا بہت افسوس ہے کہ کاغذ کی گراں قیمتی کی وجہ سے دوسرے مضامین کے لئے گنجائش کسی طرح نکالی نہیں جاسکی۔ "حیدرآباد کے مسائل معاشیات" اور "موضع دویلی کی معاشی تحقیق" کا سلسلہ بھی اس شمارہ میں قائم نہ رکھا جاسکا۔ اس امر کی وضاحت غیر ضروری ہے کہ اس نوعیت کے مقالوں کو قسط وار طویل عرصہ تک طبع کرتے رہنے سے ان کی افادیت بہت کم ہوجاتی اور بسا اوقات اکثر ناظرین کے پاس اس کا سلسلہ محفوظ نہیں رہ سکتا۔ یہ زیادہ بہتر صورت ہوگی کہ مقالات یک وقت طبع ہوجائیں اسی خیال کے تحت یہ انتظام کیا جارہا ہے کہ "موضع دویلی کی معاشی تحقیق" کا مقالہ آیندہ اشاعت میں بہ تمام وکمال شائع کردیا جائے تاکہ اسکی افادیت کم نہ ہوجائے اور دوسرے مقالوں یا تالیفات کی باری جلد آسکے۔

معاشی کانفرنس کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہونچی تو بعض حلقوں میں نہ معلوم کیوں کچھ کھٹک سی پیدا ہوئی۔ ۱۱؍ جنوری کی اشاعت میں "گولکنڈہ پتریکا" نے ایک علحدہ "پبلیز اکنامک کانفرنس" کی داغ بیل ڈالنے کے لئے زمین ہموار کی۔ اگر ملک میں نئے نئے ادارے قائم ہوتے ہیں تو چشم ما روشن دل ما شاد، لیکن کسی نئے ادارہ کے قیام کے لئے دوسرے ادارہ کو غلط طور سے مورد الزام بنانا نہ صرف مصلحت اندیشی بلکہ اخلاق و مروت کے بھی خلاف ہے۔

گولکنڈہ پتریکا نے معاشی کمیٹی کے خلاف مندرجۂ ذیل امور ظاہر کئے ہیں۔

۱۔ اس کانفرنس پر وہ توجہ مبذول نہیں ہورہی ہے جسکی وہ مستحق ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی طرح یہ کانفرنس بھی عہدہ داروں کے ہاتھ میں ہے۔
۲۔ قائدین اور نیز پبلک اس میں زیادہ حصہ نہیں لے رہے ہیں۔
۳۔ تقریریں ایسی زبانوں میں نہیں ہوئیں جن کو پبلک آسانی سے سمجھ سکتی۔
۴۔ کانفرنس کی کافی تشہیر نہیں کی گئی۔

ان چاروں امور پر اگر غور کیا جائے اور حقیقت معلوم کی جائے تو صاف طور سے واضح ہوجائیگا کہ ہمارے معاصر نے اپنے خیال کی تقویت کیلئے معقول دلیلیں پیش نہیں کی ہیں۔

پہلے تو معاصر موصوف نے یہ شکایت کی ہے کہ اس کانفرنس پر وہ توجہ مبذول نہیں ہورہی ہے جسکی وہ مستحق ہے۔ اس شکایت میں مجلّہ بھی ہم نوا ہے۔ سعدی نے کیا خوب لکھا ہے۔

"این شکم بے ہنر پیچ پیچ　＝＝　صبر ندارد کہ بسازد بہیچ"

لیکن اسکے باوجود یہ حقیقت کس قدر تلخ ہے کہ اس مصیبت کو کم کرنے کے لئے ہم نہ تو عصری اصول معیشت سے واقف ہیں اور نہ اسکو قدیم آزمودہ تدبیر منزل سے پیوند دے سکتے ہیں۔ اپنے مسائل معاش سے اہل ملک کا تغافل روز بروز دوا ہوتا جارہا تھا۔ اسی درد کے درماں کیلئے معاشی کمیٹی قائم کی گئی اور یہ محسوس ہورہا ہے کہ عامۃ الناس اپنی معاشی پستی کا نہ صرف احساس کررہے ہیں بلکہ اس پستی کو دور کرنے کی فکر بھی کررہے ہیں۔ گول کنڈہ پتریکا کا یہ خیال کہ لوگ اس کانفرنس پر اس لئے توجہ نہیں کرتے کہ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی طرح یہ کانفرنس بھی عہدہ داروں کے ہاتھ میں کچھ زیادہ وزنی نہیں ہے۔

عہدہ داروں کے ہاتھ میں کانفرنس ہونے یا نہ ہونے کی بحث تو خیر علیحدہ ہے لیکن اگر بالفرض تسلیم بھی کرلیا جائے کہ یہ کانفرنس عہدہ داروں کے ہاتھ میں ہے تو اس میں قباحت کیا ہے۔ اس مسئلہ پر کچھ صراحت کرنے کی ضرورت ہے۔

برطانوی ہند کے برخلاف حیدرآباد میں حکومت اور رعایا میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں کا مقصد مملکت کی ترقی اور خوشحالی ہے۔ مملکت کے بادشاہ اور ان کی حکومت نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ان کے اغراض رعایا کے اغراض سے جدا نہیں۔

اعلیحضرت بندگان عالی خلد اللہ ملکہ نے جشن سیمیں کے موقع پر رعایا کے سپاسنامہ کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ

"میری بقیہ زندگی اپنی عزیز رعایا کی آسائش کے لئے وقف ہے اور خادم خلق اللہ ہونا میرا سب سے بڑا طرۂ امتیاز ہے اور ازمنۂ گزشتہ سے میرے خانوادہ کا یہ وتیرہ رہا ہے کہ رئیس وقت اپنی رعایا کا دل سے خیر خواہ اور بلا تخصیص قوم و ملت ان کی فلاح و بہبودی کو اپنی زندگی کا بہترین مقصد سمجھنے والا ہوتا ہے۔ میں بھی اپنے اس آبائی نقش قدم پر گامزن ہوں اور اگر میرے زمانہ میں ترقی کی رفتار مقابلتہً کچھ تیز رہی ہے تو یہ بھی خدا کا فضل ہے اور مجھ سے اگر تھوڑی بہت خدمت ملک کی حاصل ہوئی ہے تو اس کا سب سے بہتر صلہ میری رعایا کی قناعت اور خوش حالی ہے"۔

یہ ارشاد ملوکانہ حکومت آصفیہ کے اصول حکمرانی و ملک داری کو جس خوبی سے واضح کرتا ہے وہ اپنی آپ شرح ہے۔ اس مبارک اصول کے پیش نظر مملکت آصفیہ میں ایسے روایات قائم ہوئے جو بلا شبہ قابل رشک ہو سکتے ہیں۔ مملکت آصفیہ میں قومی مفاد کے کاموں کی انجام دہی کے لئے غیر سرکاری اداروں میں شرکت کے لئے ملازمین سرکار پر کبھی کوئی بندش عائد نہیں کی گئی۔ اس وقت ہمیں تاریخ کی ورق گردانی کرنی نہیں ہے خود مبارک دور عثمانی میں بعض رفاہی کاموں کی مثالیں ہمیں ایسی مل جاتی ہیں کہ جنکی تکمیل میں سرکاری ملازموں اور عامۃ الناس نے مشترکہ طور پر جد و جہد کی۔ حکومت بلکہ خود حضرت بندگان عالی خلد اللہ ملکہ نے اپنی صریح منظوری سے اسکو درست قرار دیا۔ اسکی مثال میں ہمیں خود حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی مثال پیش کرنے میں بھی کوئی خوف نہیں ہے۔ اس میں اگر سرکاری ملازمین شریک رہے تو انہوں نے سرکاری علی ترین حکام کی موجودگی میں سرکاری تعلیمی پالیسی پر کھلی اور کھری تنقید میں کبھی پس و پیش نہیں کیا۔ البتہ یہ تنقید تعمیری نقطۂ نظر سے ہوتی تھی اسکے مخلصانہ ہونے میں سرکار نے بھی کوئی شبہ نہیں کیا۔ کانفرنس میں رکاوٹ اسی وقت پیدا ہوئی جب کہ بعض لوگوں نے تنقید کو تنقیص اور تشویش کی صورت دینی شروع کی۔ مختصر یہ کہ اس مملکت کے روایات قدیمہ کے بموجب کبھی راعی اور رعایا میں ایسا فرق نہیں کیا گیا کہ دونوں کے اغراض و مقاصد علحدہ قرار پائیں۔ عہدہ داران سرکار بھی آخر اسی ملک کے باشندے ہیں اس ملک میں

وہ پیدا ہوے اور اسی ملک میں وہ تادم آخر رہینگے۔ انکے اغراض و مقاصد ملک کی عام صلاح و فلاح کے کسی طرح مغائر نہیں ہوسکتے۔ البتہ رائے کا اختلاف، طریقہ کار کا اختلاف اور نقطۂ نظر کا اختلاف ہوسکتا ہے، وہ عام رعایا کو سمجھ سکتے اور عام رعایا ان کو سمجھ سکتی ہے۔ وہ لوگ جو عہدہ داروں اور عام رعایا میں فرق کرتے ہیں ملک کی کچھ اچھی خدمت انجام نہیں دے رہے ہیں۔ یہ جو خیال پیدا ہورہا ہے کہ عہدہ دار عام اداروں سے الگ رہیں۔ یہ خیال چاہے کسی حلقہ میں کیوں نہ پیدا ہو۔ بہت خطرناک ہے اسکی وجہ سے ایسی خرابیاں پیدا ہونے کا احتمال ہے جس سے سود و بہبود ملک کے کاموں میں کھنڈت پیدا ہوجائیگی۔ یہ بحث بعض اور دوسرے نقاط نظر سے اور بھی تفصیل کی محتاج ہے کسی دوسرے وقت اس پر تفصیل سے لکھا جائیگا۔

غرض اگر معاشی کانفرنس سرکاری عہدہ داروں کے ہاتھ میں ہے تو اس میں کوئی خرابی نہیں ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسکے کاروبار میں غیر سرکاری اصحاب کا بھی کافی حصہ ہے اور اسکی تاسیس و ترقی میں انہوں نے بھی بہت گراں قدر حصہ لیا ہے۔

۲۔ دوسری بات یہ بیان کی گئی ہے کہ قائدین اور پبلک اس میں زیادہ حصہ نہیں لے رہے ہیں۔ قائدین سے کیا مراد ہے؟ معاشی کمیٹی کے قواعد کے رو سے کسی پر کوئی بندش نہیں ہے۔ ملک کا ہر باشندہ جسکو اپنے عزیز ملک کی معاشی ترقی سے انس ہے اس میں شریک ہوسکتا ہے۔ اگر ملک کے بعض نام نہاد قائدین اس میں حصہ نہیں لیتے ہیں تو قصور معاشی کانفرنس کا نہیں ہے۔ قصور تو ان قائدوں کا ہی ہے کہ ان کو اپنی قائدی برقرار رکھنے کے لئے چھوٹے چھوٹے کاروبار میں اس قدر الجھ جانا پڑا ہے کہ ملک کے اہم معاشی مسایل پر توجہ کرنے کیلئے ان کے پاس وقت ہی نہیں ہے۔ اگر پبلک زیادہ حصہ نہیں لیتی تو معاشی کانفرنس کا کیا قصور۔ یوں اس نوعیت کی کانفرنسوں میں مشتغل پبلک کے ہزارہا افراد کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اس سے قطع نظر کانفرنس میں قائدین بھی تھے اور عامۃ الناس بھی۔

۳۔ بیان کیا گیا ہے کہ اس کانفرنس میں تقاریر ایسی زبان میں نہیں ہوئیں جنکو عامۃ الناس آسانی سے سمجھ سکیں۔ کانفرنس میں دو تقریروں کے سوا ساری تقریریں اردو میں ہوئیں۔ اردو میں

تقریر نہ ہو تو پھر کس زبان میں ہو۔ اگر اردو کو ... زبان میں تقریر کی جائے تو اس وقت ہی یہ دعویٰ
صحیح ہوگا کہ اس کانفرنس میں تقریریں ایسی زبان میں ہوئیں جنکو عامۃ الناس آسانی سے سمجھ سکیں۔

۴۔ بیان کیا گیا ہے کہ کانفرنس کی نسبت کافی تشہیر نہیں کی گئی۔ اشتہار، پوسٹر، ہورڈنگ
رقعۂ دعوت، ریڈیو، اخبار یہی ذرائع تشہیر کے ہیں اور ان سب سے پورا پورا استفادہ کیا گیا۔ یہ تو نہیں ہو سکتا
کہ منتظمین کانفرنس شہر میں ڈھنڈورہ پیٹتے پھریں۔

گول کنڈہ پتریکا نے آخر میں یہ تجویز پیش کی ہے کہ پبلک کو معاشی کانفرنس میں شریک ہونے کی
دعوت دی جانی چاہیئے اور مختلف جماعتوں کے قائدوں کو بھی مدعو کرنا چاہیئے اگر یہ ممکن نہ ہو تو پیپلز ایجوکیشنل
کانفرنس کی طرح ایک علحدہ پیپلز اکنامک کانفرنس شروع کرنی چاہیئے۔ واضح ہو کہ معاشی کمیٹی میں شریک
ہونے کیلئے کسی پر کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ اس میں ہر محب وطن شریک ہو سکتا ہے اور ملک کی معاشی ترقی میں
اپنے مقدور بھر حصہ لے سکتا ہے۔ اسی طرح معاشی کانفرنس میں عامۃ الناس اور قایدوں کی شرکت کے لئے
تشہیر و دعوت پہلے سے بھی جاری ہے اور آئندہ بھی اس پر پوری طرح عمل کیا جائیگا۔

اتنے سے عذر سے یہ تہیہ کرنا کہ پیپلز ایجوکیشنل کانفرنس کی طرح ایک علحدہ پیپلز اکنامک کانفرنس
شروع کی جائے کچھ امر معقول نہیں ہے۔ پیپلز ایجوکیشنل کانفرنس کس عذر کی بنا پر قائم ہوئی وہ ہمیں معلوم ہے۔
اس کی کچھ وضاحت ضروری ہے تاکہ معلوم ہو کہ کتنی ... باتوں پر لوگ مخالفت کی بنیاد قائم کرلیتے ہیں۔
حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد قائم ہوئی تو اس نے اپنے دائرۂ عمل میں ملک کے سب طبقات کو
جمع کرلیا۔ سرکاری حکام، عمال، اور عامۃ الناس سب اسکے پلیٹ فارم پر جمع ہوئے مسلمان اور ہندو
بلا امتیاز شریک ہوئے۔ اس طرح ملک کی تعلیمی ترقی کے لئے باہمی سعی و کوشش کا ایک مبارک دور شروع ہوا۔
عامۃ الناس کی جانب سے سرکاری تعلیمی کاروبار پر جو ... تنقید ہوتی اس کا جواب خود کانفرنس کے
پلیٹ فارم پر سرکاری حکام کی جانب سے ... غلط فہمیاں دور ہو جاتیں اور باہمی اعتماد کی
فضا پیدا ہوتی۔ ایجوکیشنل کانفرنس کو تعلیمی ... مقاصد میں جو ... حاصل ہوئی اس سے تقویت پاکر کانفرنس کے
مقاصد میں معاشی ترقی کا مقصد بھی ... کانفرنس ... شریک کرلیا گیا اور کانفرنس کا نام

"حیدرآباد ایجوکیشنل اینڈ اکنامک کانفرنس" قرار پایا۔ مقاصد کی توسیع کے بعد کانفرنس کا پہلا اجلاس پربھنی میں منعقد ہوا۔ ضرورت تھی کہ اس ابتدائی موقع پر حزم و احتیاط کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا جاتا اور باہمی اعتماد اور اشتراک عمل کی پہلی فضا برقرار رہتی لیکن بعض ممتاز اصحاب نے اس موقع سے غلط طور پر فائدہ اٹھانا چاہا اور گرم بیانی کی ایسی روایات قائم کرنی چاہیں جنکو کانفرنس سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کانفرنس کا اعتماد زائل ہوگیا اور شبہات پیدا ہوگئے۔ اعتماد حاصل کرنے کیلئے کانفرنس نے جو سعی کی اس میں پورے پانچ برس گزر گئے۔ پانچ برس کے بعد کانفرنس کا اجلاس پھر حیدرآباد میں منعقد ہوا۔ اور ثابت ہوگیا کہ اعتماد حاصل کرنے کیلئے کانفرنس کی سعی پھر کامیاب ہوئی۔ اس تلخ تجربہ کے بعد لازمی تھا کہ کانفرنس حزم و احتیاط پر پہلے سے زیادہ عمل کرے۔ اس جائز احتیاط کو بعض لوگوں نے پسند نہیں کیا۔ اس اثنا میں کانفرنس کے بانی اور پہلے معتمد مولانا محمد مرتضی مرحوم کا انتقال ہوگیا اور کانفرنس کی کارفرمائی دوسرے ہاتھوں میں آئی۔ کانفرنس کے اجلاس کا زمانہ آیا تو بعض اصحاب نے یہ سوال اٹھایا کہ کانفرنس کسی تہوار میں منعقد نہ ہو۔ حالانکہ اب تک کانفرنس کے سلسلہ میں اس قسم کا سوال اٹھایا ہی نہیں گیا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعطیلات میں کانفرنس کے اجلاس منعقد ہوتے رہے تھے۔ کانفرنس کا اجلاس کبھی ہولی کی تعطیل میں ہوا تو کبھی بقرعید کے موقع پر۔ جمعہ کے دن بھی کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا ہے۔ بہر حال جو سوال اٹھایا گیا تھا وہ صرف اسی قدر تھا کہ کانفرنس کا اجلاس ایک خاص تعطیل میں منعقد نہ ہو۔ یہ معمولی سی بات ایسی نہیں تھی کہ باہمی سمجھوتہ سے طے نہ ہو جاتی لیکن اس وقت کے ارباب کانفرنس اور احتجاج کرنے والے دونوں نے ناواجبی شدت اختیار کی۔ ایک فریق نے اسی تعطیل میں جلسہ کرنا چاہا اور دوسرے فریق نے "اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کردیا" کے مصداق "تعلیمی کانفرنس رعایائے سرکار عالی" کے نام سے اپنا ادارہ علحدہ قائم کرلیا۔ اگر اب بھی لوگ علحدہ ادارے قائم کرنے کے لئے چھوٹی چھوٹی باتوں کا عذر پیدا کیا کریں تو ملک کی ترقی معلوم۔

پانچویں معاشی کانفرنس کے متعلق ضروری صراحت اس تمہید سے ہوگی جو معتمد معاشی کمیٹی مولوی خواجہ حمید احمد صاحب بی اے (عثمانیہ) نے لکھی ہے اور اس حرف آغاز کے بعد درج ہے۔

پانچویں معاشی کانفرنس

تمہیدِ روداد

از جناب مولوی خواجہ حمید احمد صاحب بی اے (عثمانیہ) معتمد معاشی کمیٹی

۱۳۵۲ ف

معاشی کمیٹی انجمن طیلسانین عثمانیہ کے زیرِ اہتمام پانچویں معاشی کانفرنس کا انعقاد بتواریخ ار و ۲ اسفندار عمل میں آیا۔ اور بحمد اللہ یہ کانفرنس پوری طرح کامیاب رہی۔ گذشتہ پانچ سال کے دوران میں اس کانفرنس نے بتدریج ترقی حاصل کرکے ملک میں اپنا ایک خاص مقام حاصل کرلیا ہے۔ چار سالہ سرگذشت چوتھی معاشی کانفرنس کی روداد کے ساتھ شایع کردی گئی ہے۔ اس وقت ناظرین کے سامنے پانچویں معاشی کانفرنس کی مختصر کیفیت پیش کرنی مقصود ہے۔ مجلس عاملہ معاشی کمیٹی نے پانچویں معاشی کانفرنس کے انعقاد کے انتظامات کے سلسلہ میں حسب ذیل ارکین کی ایک کمیٹی مقرر کی۔

۱۔ لکشمی نارائن صاحب گپتا ایچ سی ایس صدر معاشی کمیٹی
۲۔ عبدالقیوم صاحب ایچ سی ایس نائب صدر معاشی کمیٹی
۳۔ میر اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر
۴۔ ظہیر الدین احمد صاحب ام اے ایچ سی ایس
۵۔ میر محمود علی صاحب لکچرار سٹی کالج
۶۔ عبدالقادر صاحب بی ایس سی (آنرز) لندن لکچرار جامعہ عثمانیہ
۷۔ خواجہ حمید احمد معتمد کانفرنس

اس کمیٹی نے کافی غور و خوض کے بعد کانفرنس کے انعقاد و انصرام کے متعلق ضروری امور انجام دئیے۔ طے پایا کہ کانفرنس کا افتتاح آنریبل مولوی غلام محمد صاحب صدر المہام فینانس سے کرایا جائے۔ کانفرنس کے دونوں اجلاسوں کی صدارت کیلئے مولوی محمد الیاس برنی صاحب (سابق صدر شعبۂ معاشیات جامعہ عثمانیہ) ناظم سررشتۂ تالیف و ترجمہ جامعۂ عثمانیہ سے درخواست کی گئی۔ لکشمی نارائن صاحب گپتا صدر معاشی کمیٹی کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کے صدر قرار پائے۔

کانفرنس میں مباحث کے لئے حسب ذیل چار موضوعوں کا انتخاب کیا گیا۔

۱۔ حیدرآباد میں محاصل اندازی کا مسلک۔

۲۔ حکومت اور زمانۂ جنگ کے معاشی مسائل

۳۔ کاشتکار اور زمانۂ جنگ کے اثرات

۴۔ حیدرآباد میں صنعتی سرمایہ کا مسئلہ

ملک کے مشہور ماہران فن اور اہل قلم حضرات سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنے گراں قدر خیالات سے مستفید کریں۔ چنانچہ کانفرنس میں جو خطبات اور مقالات پڑھے گئے ان کا مجموعہ اہل ملک کے سامنے پیش کیا جارہا ہے۔ قبل ازیں ملک کے روزانہ ہفتہ وار اخبارات کے ذریعہ کانفرنس کے خطبات کی کافی تشہیر ہو چکی ہے۔ اخبار رہبر دکن، مملکت اور سلطنت نے خاص معاشی نمبر بھی شایع کئے ہیں۔ لیکن مجموعتہً ان سب کو ایک ساتھ شایع کرنا بہ طور ضروری متصور ہوا۔ عوام اور ارباب حکومت نے اس کانفرنس کو کامیاب بنانے میں جو حصہ لیا معاشی کمیٹی اس کی بے حد ممنون ہے۔

کانفرنس کے لئے فضیلت مآب نواب سر محمد احمد سعید خاں بہادر بالقابہ صدر اعظم باب حکومت نے اپنی نوازش سے جو پیام مرحمت فرمایا وہ حسب ذیل ہے۔

”بعض ناگزیر مصروفیات کی بنا پر میں پانچویں معاشی کانفرنس کے اجلاس میں شرکت نہ کر سکا لیکن میں کانفرنس کی کامیابی کا دلی متمنی ہوں اور مجھے توقع ہے کہ اس کانفرنس کے مباحث ملک کی معاشی جد و جہد میں شمع ہدایت کا کام دینگے۔“

اس کانفرنس کے نتیجہ کے طور پر معاشی کمیٹی جو عملی تجاویز اختیار کر رہی ہے ان کی تفصیل کسی اور موقع پر پیش کی جائے گی۔

مطبوعہ انتظامی پریس

پانچویں معاشی کانفرنس

استقبالیہ تقریر

از جناب لکشمی نارائن گپتا صاحب، ایم اے، سی ایس

عالیجناب محترم غلام محمد صاحب و معزز حاضرین!

بحیثیت صدر عثمانیہ معاشی کمیٹی آج میرا یہ خوشگوار فریضہ ہے کہ آپ حضرات کو معاشی کانفرنس کے اس پانچویں سالانہ جلسہ میں خوش آمدید کہوں میں جانتا ہوں کہ اس سالانہ اجلاس کا ہم سب کو انتظار رہتا ہے اسلئے کہ نہ صرف اس سے ماہرین معاشیات کو تبادلہ خیالات کا موقع ملتا ہے بلکہ ان تمام حضرات کو جنہیں اپنے ملک کی معاشی بہبودی عزیز ہے اپنے معلومات میں اضافہ اور خیالات میں صلاح کا موقع ہاتھ آتا ہے۔ عثمانیہ معاشی کمیٹی نوجوان طلبائے جامعہ عثمانیہ و دیگر بہی خواہان ملک کی توجہ اپنے ناچیز طریقہ پر وقت کی اہم ترین ضرورت یعنی ملک کی معاشی ترقی کی جانب منعطف کراتی رہی ہے۔ یہ خوش قسمتی کی بات ہے کہ اپنے اس فریضہ کی انجام دہی میں اس کمیٹی نے اپنے کو تمام مسائل نزاع و تصادم سے محفوظ رکھا ہے جسکا نتیجہ یہ ہے کہ اس کو جہاں ملک کے ہر مکتب خیال سے معاونت حاصل ہے وہاں سرکاری حلقوں کی کامل تائید و سرپرستی بھی میسر ہے۔ چنانچہ چند سررشتہ جات سرکاری نے پوری پوری امداد و اعانت فرمائی ہے۔ اس کے لئے ہم بطور خاص مولوی احمد محی الدین صاحب ناظم سررشتہ صنعت و حرفت کے ممنون احسان ہیں جو ہمیشہ ہمارے مشیر و رہبر رہے ہیں۔ میری یہ قوی امید ہے کہ ان حوصلا فزا حالات کے تحت یہ کانفرنس سال بسال نمایاں ترقی کرے گی اور ان مسائل کے سلجھانے اور حل کرنے میں جن سے ان وسیع ممالک محروسہ کی معاشی فلاح و بہبود وابستہ ہے خضر راہ کا کام کرے گی۔

ہماری معاشی کمیٹی کی نمایاں ترین کارگذاری نمایشی کمیٹی کا قیام ہے جو چند نوجوانوں کی تعال تحسین گرمجوشی

سے متواتر چار سال سے ایک صنعتی نمایش کا ایسے وسیع پیمانہ پر محض رضاکارانہ خدمات کے ذریعہ انتظام کر رہی ہے
نمایش کمیٹی کی کارگذاری کی اس سے بہتر اور کیا قدر افزائی ہوسکتی ہے کہ ہمارے آقائے ولی نعمت اعلیحضرت
خلداللہ ملکہٗ فرمانروائے دکن نے اسکو بنظر استحسان ملاحظہ فرمایا ہے۔ جس کیلئے ہم سب بارگاہ خسروی میں تہِ دل سے
خراج تشکر و احسان پیش کرتے ہیں۔

حضرات! اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے جامعہ کے طیلسانین نے ہر شعبۂ علم میں تحقیق و تجسس کے
ایسے ایسے مراحل طے کئے ہیں اور زندگی کی راہ عمل میں اپنی لیاقت اور قابلیت کا ایسا سکہ بٹھایا ہے کہ بیساختہ
دل سے کلمۂ تحسین و آفرین نکلتا ہے اور ہمیں امید نبدھتی ہے کہ مدنی زندگی کی اہم ترین ضرورت یعنی معاشی
تحقیق و تجسس کی جانب بھی اب یہ ضرور اپنی توجہ معطوف کرینگے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس اہم ضرورت کی تکمیل
کی طرف ابھی دراصل کوئی تشفی بخش قدم نہیں اٹھایا گیا اور معاشی تحقیقات کیلئے ہمارا یہ وسیع ملک بالکل اچھوتا
پڑا ہوا ہے۔ میں اس لئے اپنے جامعہ کے نوجوان طبقہ سے یہ عرض کروں گا کہ اپنے مادر علمی جس کی ترقی و
نیکنامی کا ولولہ ان کے نوجوان دلوں میں جوش زن ہے اور اپنی مادر وطن جس کی بہبودی و خوشحالی کے
وہ ہمیشہ خواہاں ہیں ہر دو کی خدمت کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ وہ معاشی مسائل کی تحقیق اور چھان بین
میں دل و جان سے لگ جائیں کہ اس سے جہاں ذخیرۂ علم میں مفید اضافہ کے باعث اس ادارۂ علمی کی نیکنامی
ہوگی جس نے آپ کو اپنی آغوش میں پرورش کرکے دولت علم سے مالامال کیا ہے۔ وہاں آپ کے برادران
وطن کی زندگی کے اہم ترین گتھیوں کے سلجھنے سے ملک کی عام طور پر بہترین فلاح و بہبود اسی میں مضمر ہے۔

حضرات! اس موقع پر میں ضرور سمجھتا ہوں کہ آپ کی توجہ سررشتۂ اعداد و شمار کے اس کام کیطرف
معطوف کراؤں جو چند سال سے وہ ایسے اعداد و شمار کے فراہم و طبع کرنے کی صورت میں انجام دے رہا ہے
جن سے نہایت مفید معاشی معلومات حاصل ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے گذشتہ اجلاسوں کے
صدر صاحبان اور دیگر مقررین کا بھی ہم پر احسان ہے کہ اُن سے ہمارے معاشی علمی ذخیرہ میں کافی اضافہ
ہوا ہے۔ حیدرآباد معاشی انجمن (Economic Association.) کا بھی ہم پر احسان ہے
جس نے جناب مولوی سید محمد اعظم صاحب و جناب مولوی حبیب الرحمن صاحب کی سرکردگی میں مفید کام

انجام دیا ہے۔ آپ حضرات کو یہ معلوم کرکے مسرت ہوگی کہ یہ معاشی انجمن اب عثمانیہ معاشی کمیٹی میں ضم ہوگئی ہے۔ ہمارے یہاں جناب عبدالرحمن صاحب، نواب احسن یار جنگ بہادر اور مولوی عارف الدین صاحب جیسے اکثر اصحاب موجود ہیں جنھوں نے باوجودیکہ ان کا دائرۂ عمل معاشی نہیں ہے۔ حیدرآباد کی صنعتی ترقی کیلئے بہت جامع اور وسیع مواد فراہم کیا ہے جس سے طلباء معاشیات کافی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

حضرات! میں ہمارے ملک کے معاشی مسائل کی تفصیلات میں جاکر آپ کا زیادہ وقت نہیں لونگا۔ یہ کام میں جناب صدر کے ماہر ہاتھوں کیلئے چھوڑتا ہوں۔ میں صرف عام دستور کے مطابق ان مسائل میں سے چند کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراؤنگا جو اس وقت خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

حضرات! ہمارے تمام معاشی مسائل اسوقت بالواسطہ یا بلاواسطہ موجودہ جنگ عظیم سے متاثر ہیں اس لئے کہ اس جنگ نے ہماری زندگی کے سماجی، سیاسی اور معاشی ہر پہلو کو گھیر رکھا ہے۔ ایسی صورت میں پہلا سوال جو پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ موجودہ تلاطم و پریشانی کی حالت میں حکومت معاشی نقطۂ نظر سے رعایا کی کس حد تک حفاظت و اعانت کرسکتی ہے۔ اس ضمن میں میں اُن بزرگوں سے متفق الرائے نہیں ہوں جو طلب و رسد کے عام قانون کو موجودہ معاشی طوفان کی رہنمائی کے لئے کافی سمجھتے ہیں۔ دور جدید میں حکومت کے فرائض کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا ہے۔ اب اس کے فرائض صرف اس پر ختم نہیں ہوتے کہ ملک کی بیرونی دشمن سے محافظت کیجائے اور ملک میں امن و امان قائم رکھا جائے بلکہ رعایا کی سماجی ضروریات اور معاشی حاجتوں کی تکمیل بھی اس کے فرائض میں داخل ہے یعنی رعایا کی ہمہ جہتی خوشحالی، بہبودی اور ترقی کا انتظام بھی اس پر فرض ہے کوئی حکومت جس قدر ان ہمہ گیر فرائض کی تکمیل میں کامیابی حاصل کرتی ہے اسی قدر اس کو استحکام اور قوت حاصل رہتی ہے۔ جب زمانۂ امن میں حکومتوں کے لئے یہ فرائض ہیں تو ظاہر ہے کہ زمانۂ جنگ میں جبکہ ہر طرف تلاطم بچا ہوا ہے اور زندگی کے ہر پہلو میں پریشانی نمایاں ہے حکومت کے فرائض وسیع تر ہوجاتے ہیں اور جلد حکومت کی امداد سے ایسا ربط اور ہم آہنگی پیدا ہونا محال ہے جس سے رعایا کی ہمہ جہتی ضرورتوں کی موثر اور سریع الاثر تکمیل ہوسکے۔

یہ مقام مسرت و فخر ہے کہ زمانۂ امن میں بھی ہماری حکومت اس جدید نظریہ کے مدنظر کسی سے پیچھے نہیں رہی

ہے۔ گذشتہ (۲۵) سال کے عرصہ میں ہمارے نامدار شہریار دکن اعلیٰحضرت قدر قدرت کے دو فیض برکت میں قومی استعماری کاموں میں ہماری حکومت نے روزافزوں دلچسپی لی۔ اور اب یہ کام خاصے وسیع پیمانہ پر چل رہے ہیں اور اس وقت بھی حکومت حاربۂ اعظم سے پیدا شدہ حالات سے جو فرائض اس پر عائد ہوتے ہیں اُن سے غافل نہیں رہی ہے اب یہ ماہران معاشیات کا کام ہے کہ اپنی ماہرانہ رائے سے حکومت کا ہاتھ بٹائیں۔

جنگ نے معاشی سرگرمیوں کی ضرورت کو شدید کردیا ہے۔ جس کیلئے وسیع موقعے اور امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔ بالخصوص صنعت و حرفت کے میدان میں ضرورت ہے کہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اور محض ہنگامی طور پر نہیں بلکہ مستقل طور پر ایسی صنعتوں کا قیام عمل میں لایا جائے جو ہمارے حالات اور ماحول کیلئے ضروری ہیں اور جن کیلئے ہم ہمیشہ دوسروں کا منہ تاکتے رہے ہیں۔

حضرات! جنگ کی وجہ پیدا شدہ معاشی سرگرمیوں کا ایک قدرتی نتیجہ INFLATION عوام کی قوت خرید میں غیرمعمولی اضافہ ہے۔ لیکن جہاں آجکل دولتمندوں کی دولت میں وافر اضافہ ہو رہا ہے وہاں غریب تباہ ہوتے جارہے ہیں۔ گرانی جو آسمان سے باتیں کر رہی ہے، روزمرہ کی ضرورتوں کے سامان کی بڑھتی ہوئی کمی اور قوت پیداوار کا روزمرہ ضرورت کے اشیاء کی پیدائش کی بجائے دوسری اشیاء پر زیادہ مائل ہونے کی وجہ ایسی گتھیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ جنھیں اگر دانشمندی اور تدبر سے نہ سلجھایا جائے تو رعایا کی معاشی اور سماجی زندگی میں بڑی سراسیمگی پھیلنے کا اندیشہ ہے۔ ایسی صورت میں حکومت کیلئے یہ ضروری ہے کہ قیمتوں کی روک تھام اور کھانے پینے کی چیزوں اور پہننے اوڑھنے کے سامان سب کو مہیا ہونے کی تدابیر کرے۔ ان میں سے اکثر انتظامات سرکار عظمت مدار اور ہماری سرکار ہر دو کر رہے ہیں ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ بہت اہم اور پیچیدہ ہے۔ اس لئے معاشی کمیٹی نے "اثرات جنگ اور فرائض حکومت" پر جو مضامین طلب کئے ہیں امید ہے کہ اُن سے ان مسائل پر کچھ مفید روشنی پڑے گی۔

اس موقع پر مجھکو یہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آپ حضرات کی توجہ اُن تدابیر کی طرف مبذول کراؤں جو ختم جنگ پر ہمارے سماجی اور معاشی بگڑے اور بکھرے ڈھانچہ کو ازسرنو بنانے

سنوارنے میں ہمیں اختیار کرنے پڑینگے۔ ہمارے گذشتہ تلخ تجربات ہمیں بتا رہے ہیں کہ ان تدابیر کی تہ میں ایسے نئے خیالات اور نئے نظریئے ہونے چاہئیں جو ملکی اور قومی تحدیدیں اور تنگ نظری پر نہیں، بلکہ انسانیت کے اعلیٰ نصب العین پر مبنی ہوں اور جن پر عمل کرنے سے ہر ایک کو تکمیل ضروریات آرام و آسائش اور ترقی و نشو نما کے مساوی مواقع حاصل ہوں۔ تحدیدوں کو مٹا کر ہمیں ساری دنیا کو ایک سمجھنا پڑے گا اور اپنے غور و فکر کو ایسی تدبیروں اور کوششوں پر مرکوز کرنا پڑے گا جس سے دنیا بھر کی دولت اور نعمت سے دنیا بھر کے آدمی بلا تفریق رنگ و قوم مذہب و ملت متمتع اور فیضیاب ہو سکیں۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ دنیا میں سیاسی اور معاشی امن استحکام کے ساتھ قائم ہو تو ہم کو خود غرضی کو چاہے ذاتی ہو یا قومی ملکی ہو یا ملی مٹا کر فراخدلی اور وسیع النظری کو جگہ دینا پڑے گا جس میں صرف انسانیت کا خیال اور جذبہ کارفرما ہو۔ ہر ملک کے داخلی انتظام میں بھی اس نئے زاویۂ نظر پر عمل کرنا ہوگا اور ملک کی پوری آمدنی وہاں کے بسنے والوں میں منصفانہ طریقہ سے تقسیم کرنی ہوگی یعنی ہر ایک کو اسکی ضروریات فراہم کی جائینگی اور ہر ایک سے وہ کچھ لیا جائیگا جو وہ دے سکتا ہے۔ اس طرح آمدنی انسان کے سماجی امتیاز و تفخر کی چیز باقی نہ رہے گی۔ پیداوار کے کارخانے اور معاشی قوت کے ذرائع چند افراد کے ہاتھ میں نہ رہنے دئیے جائیں۔ بلکہ عوام کی فلاح و بہبود کے مدنظر ان پر حکومت کا قبضہ رہے اور جیسا کہ (منشور او قیانوس)۔ اٹلانٹک چارٹر میں تجویز ہے۔ ایسا انتظام کرنا پڑے گا کہ کل سماج کی معاشی اور ہر قسم کے احتیاج سے حفاظت ہو۔ برطانیہ جیسے ملک نے بھی جہاں مدتوں سرمایہ گری اور قدامت پسندی کا دور دورہ رہا ہے اور جہاں برسوں سے انیسویں صدی کے لبرل اسکول کے معاشئین نے اپنا سکہ جما رکھا تھا آج یہ تخیل شدت سے کام کر رہا ہے کہ جنگ کے بعد سماجی اور معاشی معاملات کا انتظام بالکل انصاف اور مساوات پر ہو۔ حال حال میں جو بیوریج پلان (Beeveridge Plan.) شائع ہوا ہے اور جس کے چار بنیادی اصول یہ ہیں کہ پوری قوم کے ہر فرد کیلئے کام کی فراہمی گذر اوقات کے لائق اجرت، رفع بیکاری کی ضمانت اور وظیفہ پیرانہ سالی و طبی امداد کا انتظام مہیا کیا جائے اسی نئے مطمح نظر کو ظاہر کرتے ہیں۔ پس ظاہر ہے کہ جنگ کے بعد ان ممالک میں بھی جہاں سرمایہ داری کا دور دورہ ہے جو معاشی نظام قائم ہوگا وہ سوشلزم

یا کمیونزم (اشتراکیت یا اشتمالیت) سے زیادہ مختلف نہ ہوگا سوائے اس کے کہ اس میں ذاتی جائداد کی ملکیت ممنوع نہ ہوگی۔

حضرات! اس موقع پر قدرتاً مجھکو ہمارے موجودہ معاشی نظام کے بے ڈھنگے پن کا خیال آتا ہے۔ یہاں ایک طرف فاقہ کشی اور انتہائی بدحالی میں مبتلا کاشتکار اور بیکار بھیک منگے ہیں تو دوسری طرف ایسے دولت مند بھی ہیں جن کے پاس بے قیاس دولت ہے اور جن کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اپنی دولت کو کس طرح صرف کریں اور جو ہمیشہ اس تلاش میں رہتے ہیں کہ اپنی دولت ایسے کاروبار میں لگائی جائے جس میں زیادہ سے زیادہ منافع حاصل ہو۔ یہاں شہری اور دیہی معاشیات کا سوال بھی پیدا ہوتا ہے۔ صدیوں سے ہم دیہاتوں کی دولت شہروں کو منتقل کرتے رہے ہیں۔ شہر جو خوش حال اور آراستہ نظر آتے ہیں تو دیہاتوں کی دولت پر۔ میرے خیال میں اب وقت آگیا ہے کہ شہر کے لوگ دیہات والوں کی فلاح و بہبود پر روپیہ صرف کریں۔ اگر ہم دیہات والوں کے حق میں اتنا بھی نہ کرسکیں کہ اُن سے اس وقت تک جو کچھ حاصل کیا ہے اُس کا کچھ حصہ ادا کردیں تو میرے خیال میں دیہات سدھار کی باتیں محض فضول اور بے معنی ہیں۔ دیہاتی جن مصائب و مشکلات میں مبتلا ہیں اس کی وجہ ذہنی پستی اس قدر نہیں ہے جس قدر کہ اقتصادی تنگدستی۔ لہٰذا ہم پر واجب ہے کہ دیہات کا ہم پر جو قرضہ ہے اُس کو اس طرح بے باق کریں کہ اُن کو اچھی سڑکیں دیں پینے کیلئے صاف پانی میسر کریں اُن کے حفظان صحت اور علاج معالجہ کا انتظام کریں اُن کی پیداوار اچھی قیمت پر خرید و فروخت کیلئے مارکٹ مہیا کریں اور انھیں اپنے آلات و کھاد وغیرہ کیلئے کچھ سرمایہ فراہم کریں۔ ظاہر ہے کہ ان تمام انتظامات کیلئے روپیہ کی ضرورت ہے اور دولتمندوں کا فرض ہے کہ اس نیک کام میں روپیہ دیں بالخصوص جبکہ جنگ کا اثر موجودہ حالات کے تحت یہ ہوا ہے کہ سرمایہ داروں کی دولت بڑھ گئی ہے لیکن غریب کاشتکار اور بھی پامال اور تباہ حال ہوگئے ہیں۔ ہم نے ماہرین معاشیات سے اس لئے یہ استدعا کی ہے کہ اس اہم مسئلہ پر مختلف عنوانات سے غور کیا جائے۔ ایک تو یہ کہ حیدرآباد میں محاصل کن اصول پر قائم ہوں اور دوسرے یہ کہ کاشتکاروں پر جنگ کے کیا اثرات مترتب ہوئے ہیں۔ میں یہاں پر پھر ایک بار اس طرف اشارہ کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم ابھی ایسی حالت میں ہیں کہ جہاں ہماری معاشی سرگرمیوں میں کافی اضافہ کی ضرورت ہے اور عام طور پر ہماری سماجی زندگی کے معیار کو بھی

بہت کافی ابھارا ہے۔ اس لئے ہم کو اُن تمام طریقوں سے اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت ہے جن سے ہماری معاشی ترقی کی راہ میں رکاوٹ پیدا ہو۔ ہمیں اس غرض کی تکمیل کیلئے تخفیف کی بہ نسبت توسیع پر زیادہ نظر رکھنی ہوگی گو جو لوگ نئے محاصل سے بچنا چاہتے ہیں تخفیف پر زیادہ زور دیتے ہیں۔

حضرات! معاشی ترقی کی گفتگو کے سلسلہ میں سب سے اہم چیز جو قابل توجہ ہے وہ ملک کی صنعتی ترقی و نشو و نما ہے۔ میرے لئے اس وقت یہ زرین موقع حاصل ہے کہ میں آپ حضرات کی توجہ اعلیحضرت ظل سبحانی کی اُس گہری دانشمندی و تدبر و حکمت سے پُر ارشادات ہمایونی کی جانب مبذول کراؤں جو اس سال صنعتی نمائش کے افتتاح کے موقع پر ارشاد فرمائے گئے اور جن میں حضرت بندگان اقدس اعلیٰ نے نہایت روشن اور واضح طریقہ پر صنعتی ترقی و توسیع کی ضرورت اور اہمیت ہمارے ذہن نشین فرمائی تھی۔ جہاں تک کہ حکومت کا تعلق ہے وہ اس ضمن میں اپنا فرض ادا کر رہی ہے اور آیندہ بھی کرے گی۔ لیکن ملک کی صنعتی ترقی زیادہ تر ہمارے سرمایہ داروں ہی کی کوشش و معاونت کی محتاج ہے اور ہمارے آقائے ولی نعمت نے اسی امر کی جانب اشارہ فرمایا ہے۔ حکومت کے متعلق آپ حضرات کو یہ معلوم ہے کہ باوجود اس کے کہ اس کے ہاتھ پر اس وقت اسکیم آبپاشی، ہائیڈرو الکٹرک و کارہائے معدنی جیسے بڑے بڑے کام موجود ہیں جن پر کثیر رقمیں صرف ہو رہی ہیں حکومت سرکار عالی نے بڑے صنعتی کارخانوں میں معتدبہ رقمیں لگا رکھی ہیں اور ملک کے بڑے بڑے صنعتی کاروبار اپنے استحکام و کامیابی کیلئے حکومت کی مالی امداد و اعانت کی رہین منت ہیں اس طرح راستہ صاف کر دینے کے بعد حکومت اب بجا طور پر سرمایہ داروں سے توقع کرتی ہے کہ وہ صنعتی ترقی کی طرف متوجہ ہوں اور ملک کو خوشحال اور فارغ البال بنانے میں اپنا حصہ ادا کریں۔ میرا مدعا یہ ہرگز نہیں کہ حکومت کو اب صنعتی کاروبار میں امداد سے دست کشی کر لینی چاہیئے بلکہ میرا یقین ہے کہ ابھی اس قسم کی امداد کے جاری رکھنے کا کافی موقع ہے۔ ہمارے یہاں قرضہ سرکار عالی کا پروگرام ابھی تک بہت محدود رہا ہے۔ اب جبکہ جنگ کی وجہ سے سرمایہ داروں کو معتدبہ مالی فائدہ ہوا ہے تو موقع ہے کہ حکومت ایک زبردست پروگرام ان غیر متوقعہ آمدنیوں سے استفادہ کا مرتب فرمائے جیسا کہ برطانیہ عظمیٰ اور ممالک متحدہ امریکہ کے ماہرین معاشیات مختلف اسکیمیں تیار کر رہے ہیں کہ رعایا، کی مقدرت پس اندازی سے نہ صرف موجودہ جنگ کے اخراجات کی پابجائی کیلئے بلکہ بعد از جنگ صنعتی

ضرورتوں کی تکمیل کے لئے بھی پوری پوری طرح استفادہ کیا جائے ۔ امریکہ کے ماہرین معاشیات کا حالیہ اسکیم جس میں یہ تجویز ہے کہ بعد از جنگ جس سامان کی ضرورت ہوگی اس کی خریدی کیلئے پیشگی بہ اقساط رقمیں ادا کیجائیں ہمارے غور و مطالعہ کے قابل ہے ۔ اُن ممالک کے تجربوں سے ہم فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور ان کی روشنی میں ایسے وسائل اختیار کرسکتے ہیں جو ہمارے ملک کیلئے ضروری اور مناسب حال ہیں ۔ ان امور کے پیش نظر معاشی کمیٹی نے اس سال صنعتی سرمایہ کے مسئلہ پر بھی مضامین طلب کئے ہیں اور مجھکو امید ہے کہ ہمیں ان مضامین سے بہت مفید اور کارآمد معلومات حاصل ہونگے ۔

حضرات! اب میں آپ کا زیادہ وقت نہ لونگا ۔ میں اب ہمارے آپ کے محترم مہمان آنریبل عالیجناب غلام محمد صاحب سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ کانفرنس کا افتتاح فرمائیں یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ موصوف کی ہستی میں آج ہمیں ایک ایسے ماہر فن معاشیات کا فیض صحبت حاصل ہے جو ماہر مالیات و حکومت کے رکن کی حیثیت سے بھی بے پایاں شہرت کے مالک ہیں ۔ میں اس باب میں مزید کچھ عرض نہ کرونگا مبادا کہ ممدوح کے ساتھ میرے سرکاری اور ذاتی تعلقات کے مدنظر کوئی غلط فہمی کا امکان ہو ۔ بس یہ کہنا کافی ہوگا کہ اس موقع پر ہم کو ممدوح سے بہتر کوئی شخص میسر نہیں آسکتا تھا جو آج کی ہماری گفتگو و غور و خوض میں ہماری صحیح رہنمائی اور حوصلہ افزائی کرتا ۔ ہماری یہ بھی خوش قسمتی ہے کہ آج ہمارے اس اجلاس کی صدارت پر جناب مولوی الیاس برنی صاحب جیسے مشہور و معروف ماہر معاشیات متمکن ہیں ۔ جن سے قدرتی طور پر ہمارے یہ توقعات ہیں کہ موصوف موجودہ معاشی مسائل پر نہایت واضح روشنی ڈالیں گے اور ان کی پیچیدگیوں کو کمال خوبی سے سلجھانے کے تدابیر کا اظہار فرمائینگے ۔

اب میں جناب سے استدعا کرتا ہوں کہ از راہ کرم کانفرنس کا افتتاح فرمائیں ۔

اس تقریر کے ختم ہونے پر جناب آنریبل غلام محمد صاحب نے افتتاحی تقریر انگریزی میں فرمائی بعد میں اس کو جناب ممدوح کے حسب ہدایت اردو میں مرتب کیا گیا یہ اردو ترجمہ دوسرے صفحات پر درج کیا گیا ہے ۔

عالی جناب آنریبل غلام محمد صاحب کی

افتتاحی تقریر

حضرات! معاشی کمیٹی کی پانچویں سالانہ کانفرنس کے افتتاح کے لئے مجھے طلب کرکے آپ کی کمیٹی نے مجھ پر جو احسان کیا ہے میں اس کا بیحد ممنون ہوں اس کے ساتھ اس امر نے کہ اس اجلاس کی صدارت کے لئے آپ نے میرے قدیم استاد سے خواہش کی ہے جن سے علی گڈھ کے ایام تعلیم میں معاشیات کے ابتدائی درس میں نے لئے میری خوشی کو دوبالا کردیا ہے میں کانفرنس کو نہایت اہم ادارہ تصور کرتا ہوں۔ جسے مملکت دکن کی ازسرنو تعمیر میں ایک اہم حصہ ادا کرنا ہے۔ ماہرین معاشیات ماسبق اور خصوصاً ہندستانی معاشیں حقیقتوں سے ہمیشہ دور رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا بے تعلق مطالعہ ان کی رہنمائی اور ان کی آرا جو حقیقی نظم و نسق کے تعلق سے بے نیاز ہو کر ظاہر کی گئیں اس قابل نہ تھیں کہ ان سے معاشی پالیسی کے قیام میں وہ مدد لی جاتی جن کی وہ مستحق تھیں۔ اس لئے میں اس امر کا پرجوش خیر مقدم کرتا ہوں کہ جامعۂ عثمانیہ کے چند نوجوانوں میں اتنی ہمت اور عوام کی خدمت کا اتنا جذبہ موجود ہے۔

خواتین و حضرات! ایک ماہر معاشیات اور خصوصاً وہ فرد جو متعلقات سے بے نیاز ہو۔ اس کا میدان عمل صرف درسی کتابیں ہیں بے تعلق نظریے اس وقت تک کچھ ایسے کارآمد ثابت نہ ہوں گے جس وقت تک کہ ماہر معاشیات ان نظریوں کو اپنی زندگی کے حقایق پر منطبق کرنے کی کوشش نہ کرے۔ انسان کو اس کی زندگی کے اجزا سے بے تعلق نہیں کیا جا سکتا۔ انسان ایک پیچیدہ قسم کا حیوان ہے اس لئے آپ کو اس کے جذبات اور اندرونی تحریکات کا تجزیہ کرنا ضروری ہے۔ انسان کے یہ جذبات اور تحریکات ایک دوسرے پر ردعمل پیدا کرتے ہیں اس لئے آپ جب تک معاشی سوالات کو ان کے تمام سیاسی اور سماجی متعلقات کی روشنی میں حل نہ کریں کسی

نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے۔ اسی لئے میں محسوس کرتا ہوں کہ ماہر معاشیات کو نہ صرف نظم و نسق کی امداد ہی کرنی چاہیے بلکہ اس کی رہنمائی بھی اسے اپنے مقام خلوت سے نکل کر زندگی کے ان تمام حقایق کو دیکھنا چاہیے جن کا صحیح معنے میں صرف وہی تجزیہ کر سکتا ہے اس کے اخذ کردہ نتیجے نظم و نسق کی ہر وقت امداد کے لئے تیار ہونے چاہئیں۔

حضرات! مجھے یقین ہے کہ کوئی شخص بھی جو نظم و نسق کو موجودہ پیچیدگیوں کے باوجود پرانے ناحقیقت آشنا طریقہ سے چلانے کی کوشش کرے گا۔ ناکام رہے گا۔ جو شخص معاشی زندگی کے تمام تعلقات اور عالمگیر اثر رکھنے والے اجزا سے بے اعتنائی برتے گا یا سماج کے مختلف حالات غربت وغیرہ پر گہری نظر نہ رکھے گا اس کا ناکام ہونا بھی یقینی ہے اس لئے میری تجویز ہے کہ اگر آپ کی کانفرنس ایک طالب علم اور ماہر سائنس کے درمیان ایک حقیقی درمیانی کڑی جسے میں ماہر معاشیات اور ماہر نظم و نسق کہہ سکتا ہوں۔ پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو آپ ملک کی ایک نہایت کارآمد خدمت انجام دیں گے۔ میں نے جو تحقیقات کی ہے ان سے معلوم ہوا کہ آپ کا کام ابھی ابتدائی دور میں ہے میں زیادہ تعریفوں کا عادی نہیں اس لئے آپ ناراض نہ ہوں اگر میں کسی قدر ناقدانہ رویہ اختیار کروں۔ اگر آپ صرف ایک چھوٹا سا تماشا اور اس کے ساتھ ہی مصنوعات دکن کی کامیاب نمایش ہی پر اکتفا کرتے ہیں تو مجھے ڈر ہے کہ آپ کا دائرہ عمل بہت محدود ہے آپ کو وسیع تر اور بڑے مسائل پر بھی توجہ کرنی چاہیئے۔ ڈیڑھ کروڑ انسانوں کی آبادی ہزارہا مربع میل کے رقبہ اور آیندہ ترقی کے نہایت وسیع امکانات کی موجودگی میں آپ کو موجودہ مسائل سے کہیں زیادہ بڑے اور کہیں زیادہ پیچیدہ مسائل کا سامنا کرنا ہے۔ آپ کو محض اس ڈر سے پیچھے نہ ہٹنا چاہیے کہ کہیں آپ کسی کے احساسات کو ٹھیس یا کسی کے مفادات کو متاثر نہ کر دیں۔ کاروان علم و ترقی کو آگے بڑھنا چاہیئے آپ وہ لوگ ہیں جن کے ہاتھ حیدرآباد کا معاشی مستقبل ہے اس لئے آپ کی ذمہ داریاں بہت بڑی ہیں۔

حضرات! مجھے ڈر ہے کہ شاید میں ایک عام افتتاحی خطبہ سے ہٹ کر اس کی سرحدوں کو عبور کر رہا ہوں اور یہ وہ مقام ہیں جن پر صدر صاحب کا قبضہ ہونا چاہیئے تھا۔ آپ حضرات مجھے

معاف کریں کہ ایک ماہر معاشیات کی حیثیت سے میں بعض اہم مسائل پر آپ سے گفتگو کئے بغیر نہیں گذر سکتا جن پر میرے خیال میں آپ کو بہت توجہ مبذول کرنی پڑے گی۔

آنریبل صدرالمہام مالیہ نے چار اہم مسائل پر روشنی ڈالی جن میں پہلا مسئلہ قیمتوں پر جنگ کا اثر اور نگرانی قیمت کا ہے آپ نے مشکلات کو پیش کرتے ہوئے بتلایا کہ ان کے نتیجہ کے طور پر ہمارے اہل ملک کے دلوں میں دو جذبے پیدا ہو رہے ہیں۔ ایک جذبہ نفع اندوزی اور دوسرا ڈر۔ افراد میں ایک حصہ ان کا ہے جو ہر انسانی پریشانی سے فائدہ اٹھاتا جاتا ہے اور دوسرا وہ حصہ ہے جو آیندہ کے نامعلوم ڈر سے خائف ہو کر ضروری اشیاء کو ذخیرہ کرنا یا بچانا چاہتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ ہر وہ چیز جو انسانی زندگی کے لئے ضروری اور لازمی ہے اس سے متاثر ہوئی آپ ان مشکلات سے واقف ہیں جو برطانوی ہند میں پیدا ہو چکی اور دکن میں بھی پیدا ہوتی جا رہی ہیں۔ آپ کے معاشین کو چاہیئے کہ ان ہی مشکلات کو پیش نظر رکھیں اور اس کا ایسا حل تلاش کریں جس سے نظم و نسق کو صحیح معنے میں فائدہ پہنچے خفیہ نفع اندوزی شروع ہو چکی ہے ہر چیز پر کڑی نگرانی کی کوشش کی گئی۔ برآمد کو محدود کر دیا گیا لیکن یہ تمام تدابیر اب تک اصلی مسئلہ کو حل کرنے میں ناکامیاب رہیں آپ کو ان کا کھوج لگانے اور ممکنہ حل معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ قیمتوں کی نیم دلانہ نگرانی سے بہتر یہ ہے کہ کوئی نگرانی ہی نہ کی جائے۔ میں اس نقطۂ نظر کی طرف مائل ہوں کہ موجودہ تدابیر نگرانی قیمت کی ناکامی اصل میں یہ ہے کہ اس کے لئے محدود تدابیر اختیار کی گئیں اور موثر اقدام عمل نہ مل سکا آپ کو اس کا خاص طور پر مطالعہ کرنا چاہیئے کہ ہندوستان کے مختلف صوبجات اور ریاستوں میں کیا تدابیر اختیار کی گئیں اور کیا نتائج نکلے ہو سکتا ہے کہ ان کے غور و فکر سے ایک ایسی راہ عمل آجائے جس سے نگرانی کے وہ مابہ الاشتراک اصول قابل العمل ہو سکیں جو تمام انتظامیہ پر بیک وقت جاری ہو سکتے ہوں ایک کل ہند پالیسی کی غیر موجودگی میں انفرادی تدابیر کا کامیاب ہونا ممکن نظر نہیں آتا۔

دوسرا سوال خفیہ نفع اندوزی کا ہے جو اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتی جب تک کہ تدابیر مکمل نہ ہوں اس کے علاوہ راشننگ کا مسئلہ بھی ہے جس پر آپ کو غور کرنا ہے۔

دوسرا اہم مسئلہ مملکت دکن کو ایک صنعتی ملک میں تبدیل کر دینے کا سوال ہے اس کے لئے معاشی خود
مکتفیت لازمۂ ضروری ہے میں نے عوام کی رائے کا اخبارات سے کافی مطالعہ کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں
کہ یہ تصور کر لینا کہ حیدرآباد اپنے باشندوں کی ہر ضرورت کو پورا کر دے گا غلط ہوگا آپ مصنوعی رکاوٹوں
کے ذریعہ بین الاقوامی معاشی اثرات کی رو کو نہیں روک سکتے ہاں اگر معاشی خود مکتفیت سے مراد یہ ہو
کہ قدرت کے ہر دیئے ہوئے خزانہ سے اتنا مکمل فائدہ اٹھایا جائے کہ بیرونی صناعوں کا مقابلہ بھی
ہو سکے اور اپنے اہل ملک کے ضروریات کو کسی معقول معاشی بنیاد پر پورا بھی کیا جا سکے تو البتہ یہ ممکن العمل
نقطۂ نظر ہے اگر ہم نے معاشی خود مکتفیت کے متعلق ہر خاص و عام کے نقطۂ نظر کو صحیح تسلیم کر لیا تو ہم عوام
کی غلط رہنمائی کرنے کے مجرم ہوں گے میں سمجھتا ہوں کہ اس خصوص میں عوام کی تعلیم و تربیت کی
ضرورت ہے اور یہ آپ کی ذمہ داری ہے۔

آپ نے صنعتوں کے اجراء کے متعلق کہا کہ جنگ کے مصنوعی حالات کی بناء پر صنعت میں
جو بڑے بڑے منافع حاصل ہو رہے ہیں۔ اس سے کم فہم افراد کی غلط امیدیں بندھ سکتی ہیں صنعتوں کے
جاری کرنے میں ملک کے قدرتی ذرائع مابعد جنگ کے حالات، مقابلہ کے امکانات اور اشیاء کی
تیاری کے جدید ترین طریقوں کی ضرورت کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ حکومت سرکار عالی صنعتوں کے
اجراء پر غور کر رہی ہے اس سلسلہ میں آپ کی تحقیقات نہایت کامیاب ثابت ہوں گی۔ آپ نے
حکومت کی صنعتی پالیسی پر ماہرانہ تبصرہ فرماتے ہوئے کہا کہ اس کا احتیاط سے تجزیہ کرنا چاہیئے
حکومت کی پالیسی بعض کمپنیوں کی امداد اور بعض کو اجارہ دینے پر محدود رہی ہے۔ ایسی پالیسی کو کب تک
جاری رہنا چاہیئے اور یہ کہاں تک کامیاب ہوگی یہ وہ سوالات ہیں جن پر آپ کی خاص توجہ ہونی چاہیئے
عام طور پر یہ خیال کیا جا رہا ہے کہ حیدرآباد کی کمپنیوں کے حصص حیدرآبادیوں کے ہاتھ میں رہنے چاہئیں میں مشورہ
دوں گا کہ اس نقطۂ نظر کو فوراً تسلیم کرنے میں تامل کیجئے۔ اسلئے کہ مشترکہ سرمایہ کی کمپنیوں کے حصص کی فروخت کسی خاص مقام کیلئے
محدود نہیں ہوتی حال ہی میں حصص کی بڑھی ہوئی قیمت کے پیش نظر حیدرآبادی ساہوکاروں کو منافع کی خاطر اپنے حصص فروخت کر دینے
وقت آچکا ہے کہ ہم گزشتہ تجربوں کی روشنی میں ایک نئی معاشی پالیسی مدون کریں اور ایک بہتر انتظامی اصول کی بنیاد ڈالیں

جس سے کم از کم ہم اپنے شرائط پر بیرونی سرمایہ اور فنی امداد بھی حاصل کر سکیں لیکن جہاں ہم خود اپنی ضرورت پوری کر سکتے ہیں وہاں میں آپ کے خیال کی تائید کرتا ہوں کہ بیرونی امداد طلب نہ کی جائے میری خواہش ہے کہ آپ محسوس کریں کہ ملک میں صنعتوں کے رواج کے مسئلہ کے اس پہلو کے متعلق بہت زیادہ غلط فہمی موجود ہے کہ آپ دکن کے اندرونی حصہ میں بیٹھے بیٹھے ہی کسی بالراست یا بالواسطہ طریقے سے ملک میں بیرونی سرمایہ کی آمد و رفت پر بندش عاید کر سکتے ہیں مقامی سرمایہ سے صنعت رائج کرنے کا خیال ممکن ہے عہد ماضی میں قابل عمل رہا ہو لیکن کیا ان خیالات سے حقیقی ترقی ممکن ہے ؟

اگر بیرونی سرمایہ آپ کی مدد کے لئے آرہا ہو اور اس میں کوئی پیچیدگیاں پیدا نہ ہوتی ہوں تو آپ کے لئے کیا خطرہ ہے موجودہ حالات میں جبکہ سرمایہ ذرائع پیداوار نہایت محدود مقدار میں حاصل ہو سکتے ہیں تو بیحد ضروری ہے کہ کامیاب صنعتی ترقی کے لئے اس مسئلہ پر غور کیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے غور و فکر سے عوام کو بھی اور حکومت کو بھی اچھا فائدہ پہنچیگا ۔

ساتھ ہی دیہی ترقیوں کا مسئلہ سامنے آجاتا ہے آپ جانتے ہوں گے کہ حکومت نے حال ہی میں اس کے لئے ایک فنڈ کا آغاز کیا ہے اور یہ تو حکومت کے ارادوں کی صرف ابتدا ہے اسکی خواہش تو اس پورے مسئلہ کو کامیابی سے حل کر لینے کی ہے لیکن دیہات کا ایک اہم اور بڑا مسئلہ اس کے سامنے ہے میں معاشی کمیٹی کے اراکین سے جن کی توجہ چھوٹے پیمانوں کی صنعتوں نظر فرض نمائشوں اور چند مقالات تک محدود رہتی ہے یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنی توجہ آبادی کی اکثریت کی طرف مبذول کرلیں جو دیہات میں رہتی ہے اگر آپ کی مجلس دیہی حالات کے مطالعہ اور ادن کے مسائل کا ایک کامیاب حل دریافت کر سکے تو آپ حیدرآباد کی ایک صحیح خدمت انجام دے سکیں گے آپ اپنے معاشی سرگرمیوں کو عمارت کے اونچے برج یعنے حیدرآباد تک ہی محدود نہیں رکھ سکتے آپ کو تو عمارت کی بنیاد ہی سے اصلاح کرنی چاہیئے دیہی مسئلہ ایک مشکل مسئلہ ہے جس کا گہری نظر سے صبر آزما مدت تک مطالعہ کرنا پڑے گا۔ جہالت معیار زندگی کی پستی، مواصلات کی خرابی اور مواضعات کے کارکن کی زندگی کے مصائب و مشکلات ہیں جو آپ کی

تحقیقات میں پیش آئیں گی لیکن ان کا مقابلہ کرنا ہوگا اور آپ نے اپنی نگرانی میں تحقیقات کا آغاز کیا تو مجھے یقین ہے کہ آپ کو دیہی ترقی کے مدسے امداد کی توقع رکھنی چاہیئے حکومت کے پیش نظر ایک اور مسئلہ دیہی صنعتوں کی تنظیم کا ہے یہ خود بڑا اور پیچیدہ مسئلہ ہے یہاں خام اشیاء کی کمی فنی اور مادی امداد کی فراہمی کی مشکلات حائل ہیں اس کو امداد باہمی کی بنیادوں پر ہی حل کرنا چاہیئے اگر آپ نے گزشتہ (۴) سال کے دوران میں چین کی دیہی ترقی ممالک متحدہ امریکہ میں تحریک امداد باہمی کی رفتار کا مطالعہ کیا، تو سمجھ سکیں گے کہ دیہات میں تعمیری کام کا وسیع میدان موجود ہے۔

آنریبل صدرالمہام مالیات نے اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں اور شعبوں پر روشنی ڈالتے ہوئے، تنظیم صنعت، خام اشیاء کی فراہمی، سائینسی تحقیقات کی امداد اور تیار شدہ مال کی فروخت کے مختلف اجزاء کو پیش کرتے ہوئے اس کے گہرے مطالعہ پر زور دیا آپ نے کہا کہ معمولی آغاز سے بھی بڑے نتائج پیدا ہوسکتے ہیں جو آگے چل کر کاشتکار کی خوش حالی اور مملکت کی ترقی کا ذریعہ ثابت ہو۔ آپ نے اس بات پر زور دیا کہ معاشیات اور سائنس کے وہ طیلسانین جو گاؤں کے مشکلات پر اپنے جذبۂ خدمت سے غالب آسکیں اور محنت کرنے پر آمادہ ہوں وہ ایک خوش حال دیہی نظام کے بانی کہلائیں گے۔

اب میں آپ کی توجہ مابعد جنگ کی تعمیر پر مبذول کرانا چاہتا ہوں آپ کی حد تک یہ مسئلہ ہندوستان یا کسی یورپی ملک کی بہ نسبت زیادہ سادہ اور آسان ہے آپ کو مابعد جنگ تعمیر جدید پر نہیں بلکہ اس تعمیری کام پر توجہ کرنی چاہیئے جو جنگ سے پہلے ہی آپ کو کر دینا چاہیئے تھا افسوس ہے کہ رقم کے اس قدر سستے ہونے کے دور میں ہمارے پاس وہ فنی امداد اور ضروری مشنری موجود نہیں جو ضروری ہے تاہم اگر ہم نے پہلے ہی سے کچھ اسکیمیں تیار کرلیں جو جنگ کے ختم پر روبہ عمل لائی جا سکتی ہوں تو ہم کچھ مفید کام انجام دے سکیں گے آپ کا مابعد جنگ مسئلہ ان ہی تربیت یافتہ فن کاروں اور میکانی خدمات انجام دینے والے سپاہیوں کے روزگار کا مسئلہ ہے مجھے جو مختصر سا موقع آپ کے مطالعہ کا ملا ہے اس بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ آپ کو برقابی صنعتوں کی ترقی کے اچھے مواقع حاصل ہیں شیشہ سازی، آہنی اور فولادی

صنعتوں میں بھی ترقی کی بڑی گنجایش ہے اور بھی امکانات ہیں جن کا مطالعہ بیحد ضروری ہے آپ کو چاہیئے کہ سب کا اچھی طرح سے مطالعہ اور ٹھوس تجاویز حکومت کے سامنے پیش کریں تاکہ صرف خیالات ہی خیالات نہ ہوں۔

ایک اور مسئلہ جس پر میری خواہش ہے کہ آپ کی کانفرنس غور کرے اب جبکہ رقم سستی ہے حکومت قبل جنگ شرح کی نسبت کم شرح پر قرض حاصل کر سکتی ہے تو کیوں نہ ہم ان کاموں کی طرف توجہ کریں جو اب کئے جا سکتے ہیں میں جانتا ہوں کہ اس کا جواب یہ ہوگا کہ ہمارے پاس مشنری اور ضروری مسالہ موجود نہیں تاہم ہم ان کاموں کی فہرست تیار کر سکتے ہیں جن میں موجودہ گران اشیار کی کم سے کم ضرورت پڑے مثلاً گاؤں کو ملانے والی پکّی نہ سہی نیم پکی یا کچی سڑکیں ایسی عمارت جو سمنٹ یا فولاد کے بغیر تیار ہو سکتی ہوں بہتر ہوگا کہ ان کاموں کا ابتدائی حصہ ابھی مکمل کر لیا جائے۔ جن کا آخری حصہ جنگ کے بعد مکمل ہو سکتا ہے۔ ہمارے ذرائع مواصلات کی بھی استطاعت بڑھانے کے لئے دیہی مواصلات کی تکمیل بے حد ضروری ہے۔

اب میں ایک ایسے موضوع کی طرف آ رہا ہوں جس پر گذشتہ مہینوں کے دوران میں گرماگرم بحثیں ہوتی رہیں یعنے حیدرآباد کا نظام محصول یہ موقع نہیں ہے کہ میں اس متنازعہ بحث میں حصہ لوں میں آپ کو ان مباحث میں لیجانا بھی نہیں چاہتا جو اخبارات میں ہوتے رہے ہیں اور وہ حقیقی نقطۂ نظر پیش نہیں کرتے جو سٹائین دیکھنا چاہتے ہیں موجودہ نظام محصول کی ایک روایاتی بنیاد اور تاریخی پس منظر ہے۔ مسٹر گتیلے نے اپنے خطبہ میں خشو راوقیانوس کا ذکر کیا ہے لیکن ایک اور مکتب خیال ہے جو پرانی روایات کو زیادہ اہمیت دیتا ہے موجودہ یورپ اور امریکہ کے روح رواں جو خیالات اور میلانات ہیں ان کو حیدرآباد کے حقایق پر منطبق کرنا اور آبادی کے بعض حصوں کی گہری طرف داریوں کو ملانا بہت مشکل ہے ایک اور مکتب خیال ہے جو بہ یک وقت نئے خیالات کا احترام بھی کرتا ہے اور ان ہی کے بنیاد پر جو تدابیر اختیار کی جائیں ان کے مخالفت بھی سائنیسی اصولوں پر کام کرنے والوں کے لئے ذہنی مستاری بڑی خطرناک ہے اور کم از کم ان لوگوں کو جو ان مسائل تک واقفیت پسندانہ طریقوں سے

پہنچنا چاہتے ہوں اپنے دماغوں سے یہ مکڑی کے جالے دور کر دینے چاہئیں جن کے بغیر آپ کسی قطعی نتیجہ تک نہ پہنچ سکیں گے۔ مجھے امید ہے کہ آپ طولانی دلائل کی رو میں بہ نہ جائیں گے حکومتوں کو اپنی اسکیموں کے لئے رقم کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ کسی نہ کسی صورت رقم حاصل کر لیتی ہیں حکومت کے عہدہ داروں اور سیاست دانوں کو اپنی پبلک زندگی میں ناکامیاں بھی ہوتی ہیں اور کامیابیاں بھی آپ کو ان سے کسی صورت بھی متاثر نہ ہونا چاہیئے اگر حیدرآباد میں پبلک زندگی کا میاب بنانا ہے اور اگر آپ کو جو ایک عظیم تر حیدرآباد کی تعمیر کے لئے اپنی مساعی صرف کر رہے ہیں نتیجہ خیز اور مفید عمل کا میدان حاصل کرنا ہے تو آپ کو اس امر کی کوشش کرنی چاہیئے کہ فضا صاف ہو تاکہ پبلک سوالات پر معاشی سوالات حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے زیر غور آئیں نہ کہ طرفداری سے ۔ ادکہی سنی پر یقین کر لینے کی فضا میں وہ لوگ جنھیں سرمایہ کا بڑا اقتدار حاصل ہے بڑے سے بڑے منافع حاصل کر لینے کی طلب میں مٹھیاں بند کئے عام فائدہ کے لئے کسی قربانی اور اپنی کسی رعایت کے کھو دینے کے خطرے ڈر ڈر کر ہمیشہ یہی کوشش کریں گے کہ عوام کی بہتری کی ہر تدبیر کو صحیح یا غلط دلائل سے پاش پاش کر دیں معاشین ہونے کی بنا پر آپ دوسرے ممالک کے ایسے ہی حالات سے ناواقف نہیں ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ ساری دنیا میں خود غرض تنگ نظر، اور اندھی سرمایہ داری اپنی جگہ ایک روشن پالیسی کے لئے چھوڑ رہی ہے جس سے ملک کی بہتری اور عام شہری خوشحالی پیدا ہو سکتی ہے ۔ اس لئے آپ کو چاہیئے کہ رائے عامہ کی صحیح رہنمائی کریں تاکہ پہلے حیدرآباد جن کے وسائل صنعت بہت کم ہیں اور جنھیں پہلی مرتبہ صنعتی بے چینی کے حقایق سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے اپنے خیالات اور مساعی کو صحیح اور کامیاب اصولوں پر چلا سکیں ۔ اس امر کو مخصوص کر لینا چاہیئے کہ ٹیکس کے تمام تدابیر کو اب ، مالیہ عامہ کے تمام اقدامات پر سماجی انصاف کے نقطۂ نظر سے پرکھنا چاہیئے ۔ ایک اوسط حیدرآبادی ترقی پسند ہوتا ہے اور آپ کو خوش قسمتی سے وہ بادشاہ ملا ہے جس نے ہمیشہ ترقی کی طرف رہنمائی کی اور ملک کی معاشی خوش حالی و صنعتی ترقی میں گہری دلچسپی لیتا رہا ۔ آپ کو اہل حیدرآباد کی فہم عامہ پر بھروسہ رکھنا چاہیئے کہ وہ کبھی ان قدیمی امور کے روادار صرف اس بنا پر نہیں ہوں گے کہ

چند صدیوں پہلے انہیں سچا تسلیم کر لیا گیا تھا۔ وہ ترقی پسند ہیں اور آگے بڑھنا چاہتے ہیں اور آپ کو وہ
مواد پس منظر مہیا کرنا ہے جس کی بنا پر وہ کوئی انفرادی قدم اٹھائیں۔ ایک رکن حکومت ہونے کی حیثیت
سے میں آپ سے یہ خواہش نہیں کرنا چاہتا کہ آپ حکومت کی کسی خاص پالیسی کی تعریف کریں یا
دوسری پالیسیوں کی تنقید کریں آپ کو چاہیئے کہ ان سب کو چھوڑ کر محض معاشی نقطۂ نظر سے غور
کریں تاکہ اپنے ٹھنڈے دل سے کئے ہوئے فیصلوں سے قوم کو بہترین مشورہ حاصل ہو سکے
مجھے یقین ہے کہ آپ کے یہ مشورے باشندگان ریاست کی اکثریت کے لئے نفع بخش ہوں گے
نہ کہ چند افراد کی حفاظت کے لئے۔

ایک اور مسئلہ جس پر ہم بحث کریں گے وہ کرنسی اور تبادلہ کا مسئلہ ہے میں خوش ہوں کہ
حیدرآباد میں کرنسی کی پوزیشن برطانوی ہند کے مقابلہ میں بہتر ہی ہے اور میرا یہ مطلب نہیں کہ برطانوی
ہند کی پوزیشن خراب ہے یا ناقابل اطمینان بلکہ ہمارے کاغذی سکہ کی حالت پر غور کرتے ہوئے ہم کہہ
سکتے ہیں کہ ہم کسی قدر بہتر حالات میں ہیں کاغذی سکہ کی حد تک اجرائی رقم زیادہ ہو رہی ہے لیکن
اس کی کچھ وجہ یہ بھی ہے کہ گلانے یا ذخیرہ کرنے کی وجہ سے دھاتی سکے کم ہو گئے ہیں۔ اس میں بھی
نفع اندوزی اور ڈر، کے وہی دو محرکات ہیں ہم اس مسئلہ کے عملی حل نکالنے میں مصروف ہیں۔
اہم معاشین کی حیثیت سے آپ لوگ موجودہ میلانات کی بنا پر حکومت کے لئے کارآمد نتیجہ حاصل کر سکیں گے۔

حضرات! میں اسٹیٹ بنک کے متعلق بھی دو باتیں کرنا چاہتا ہوں مجھے توقع ہے کہ دوسرے مسائل پر غور کرتے ہوئے
آپ اس پر بھی غور کریں گے، اسٹیٹ بنک ہمارے آئندہ انتظامات میں کس مقام پر ہو اسٹیٹ بنک کو حکومت کا بنک ہونے اور ہمارے
سکہ قرطاس کے محفوظات کا حامل ہونے کے علاوہ حیدرآباد کا سب سے بڑا تجارتی اور صنعتی بنک بھی بن نکلنا ہے میں خوش ہوں کہ
ابھی تک کے اس قلیل دور میں بھی اس کی ترقی اطمینان بخش رہی ہے اور بنک ۱۲ ماہ قبل کی نسبت بہتر پوزیشن میں ہے عوام اور حکومت کے امداد
اور تعاون سے بنک کو یقیناً حیدرآباد کے کاشتکار اور تاجر کے لئے مفید ثابت ہونا چاہیئے۔

قبل اس کے کہ میں اپنی تقریر کو ختم کروں مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ آپ نے میرا خطبہ بڑے سکون سے سنا اور مجھے امید ہے کہ آپ
ان تمام مسائل پر بہترین طریقہ سے غور و فکر کر سکیں گے جن سے ہم آج دوچار ہیں۔"

خطبۂ صدارت

از جناب مولوی محمد الیاس صاحب برنی

شکریہ

علمی اور مذہبی جلسوں میں تقریر کرنا، اک زمانہ میں چند سال اپنا یہ معمول بہت مقبول رہا لیکن بعض مصروفیتوں کے سبب مدت ہوئی کہ یہ معمول ترک ہو گیا۔ تاہم اس دوران میں فرمایشوں کا سلسلہ جاری رہا۔ عذر خواہی کام نہ آئی اور کنارہ کشی کی شکایت پیدا ہو گئی جب تقریر کی تقصیر کسی صورت معاف نہ ہوئی تو تلافی کسی نہ کسی حد تک ناگزیر ہو گئی۔ چنانچہ انجمن طیلسانین جامعہ عثمانیہ کی معاشی کمیٹی نے اصرار کیا تو میں پہلے کی طرح عذر نہ کر سکا اور کچھ عذر کیا گیا تو وہ قبول نہ ہوا۔ بہر حال تعمیل فرمایش کے واسطے حاضر ہو گیا۔ معاشی کانفرنس ممالک محروسہ سرکار عالی کا یہ پانچواں سالانہ جلسہ ہے۔ اس کانفرنس کی صدارت ممتاز حضرات سے مزین ہوتی رہی ہے اور اس مرتبہ بھی بہتر انتخاب ممکن تھا۔ تاہم امسال (۱۳۵۲ف) عہدہ صدارت جو میرے تفویض ہوا میں قدر افزائی کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

استادی و شاگردی

انجمن کی معاشی کمیٹی میں غالباً معاشیات کے تعلیم یافتہ عثمانیین زیادہ شریک ہیں۔ یوں بھی شاید انھوں نے اپنے قدیم استادکی یاد معاشی کانفرنس کی روداد میں محفوظ کر لینا ضروری سمجھا۔ شاگردوں کی ایسی دوامی محبت بڑی نعمت ہے اور یہ نعمت خلوص کے صلہ میں خوش بختی سے نصیب ہوتی ہے۔ اس خوش بختی نے اس موقع پر جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد سے چمک کر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ تک اپنی جھلک دکھا دی کہ برادر عزیز آنریبل مسٹر غلام محمد (علیگ) صدر المہام فینانس مملکت آصفیہ نے

اس کانفرنس کا افتتاح فرمایا تو اس محبت میں برادر موصوف نے اپنی شاگردی کی یاد تازہ فرمائی ہے اور اپنے حسن خلق سے اس کو درخشاں کر دیا۔

خاص ہستیوں کی فضیلت کا تو کیا کہنا۔ لیکن بالعموم اعلیٰ تعلیم میں اچھے سے اچھے استاد کی بڑی استادی یہ ہے کہ اس کے فیض تربیت سے شاگرد کمال میں بالآخر اس پر سبقت لے جائیں۔ علمی و عملی ترقی کی یہی صورت ہے اور اسی میں استادی کی بھی عظمت ہے اگر کوئی استاد اپنے قابل شاگرد کی فوقیت سے دلگیر ہو تو وہ استادی کے ذوق سے محروم ہے۔ خودستائی مقصود نہیں البتہ شکر الٰہی واجب ہے کہ اپنے برادران عزیز علیگ ہوں یا عثمانین الحمد للہ بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں مثلاً برادر موصوف نے ابتداءً بڑی خوبی سے مسلم یونیورسٹی میں اپنے استاد کی جانشینی فرمائی اور ترقی کرتے کرتے اب وہ ماشاء اللہ حکومت آصفیہ میں مال و دولت کے امین ہیں۔ علی ہذا خدمت عامہ کی زندگی جو انگریزی میں پبلک لائف کہلاتی ہے اس کے مختلف شعبوں میں بھی عثمانین کی سرگرمیاں نمایاں نظر آتی ہیں۔ چنانچہ یہی نمائش مصنوعات ملکی ان کی حوصلہ مندی کی زندہ مثال آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ عثمانین کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ تعلیم و تصنیف کی علمی زندگی میں بھی وہ مادر جامعہ کا نام دور دور تک روشن کر رہے ہیں اور ابھی تو ابتدا ہے تاہم ع

سالے کہ نکوست از بہارش پیداست

پس اس محبت کے تعلق سے جو استادی و شاگردی کی نعمت ہے میری یہی دعا ہے اور دعا کے سوا اپنے ہاتھ میں کیا ہے کہ عثمانیہ برادری اور علیگ برادری کو سب کے ساتھ بارگاہ آصفی کے ظل عاطفت میں ملک و ملت کی خدمت گزاری کی توفیق و عزت بفضلہ تعالیٰ روز افزوں حاصل رہے۔ آمین۔

جلسے اور تقریریں

موتمر، مجلس، بزم، انجمن، سبھا، سوسائٹی، ایسوسی ایشن، کانفرنس، لیگ، کانگریس، ہر عنوان سے ملک میں جلسے منعقد ہوتے ہیں۔ تقریریں ہوتی ہیں، تحریکیں منظور ہوتی ہیں،

خوب رونق اور چہل پہل رہتی ہے جوں جوں تعلیم پھیلے گی بیداری پیدا ہوگی جلسوں کا رجحان بڑھے گا اور یہ رجحان حیات ملی کا مقتضا مانا جاتا ہے۔ چنانچہ ترقی یافتہ ممالک میں جلسوں کا یہ رجحان بہت قوی پایا جاتا ہے لیکن ساتھ ہی اس رجحان میں ایک خطرہ بھی چھپا رہتا ہے۔ وہ یہ کہ اگر قول کی عادت اس درجہ بڑھ جائے کہ قول ہی مشغلہ بن جائے۔ قول ہی قول پر اکتفا کیا جائے اور عمل کی نوبت کم آئے تو جلسوں اور تقریروں کی کثرت دراصل بے عملی کی علامت ہے کہ کام کے کرنے میں زیادہ کلام کی فرصت اور ضرورت نہیں ہوتی۔ ترقی یافتہ ممالک میں کام کی جو رفتار و مقدار ہے اس کے حساب سے کلام کا تناسب کچھ زیادہ نہیں رہتا لیکن ہندوستان جیسے کم کار بلکہ بے کار ملک میں کام کے مقابل کلام کا تناسب بہت بڑھا نظر آتا ہے۔ کلام میں تخفیف تو شاید ممکن اور مناسب نہ ہو لیکن کام میں اضافہ بہر صورت لازم ہے ورنہ دماغ پاشی و شمع خراشی سے دردسر کے سوا کیا حاصل۔

قوت کے مرکز۔

فطرت انسانی کا ایک مشاہدہ ہے وہ یہ کہ جسم میں عمر کی مناسبت سے قوت اپنا مرکز بدلتی ہے۔ مثلاً لڑکپن میں ٹانگیں قوت کا مرکز بنی رہتی ہیں۔ لڑکے خوب دوڑیں لگاتے ہیں نہ تھکتے ہیں جو انوں کو ہراتے ہیں موقع ملے تو دوڑ میں لڑکیاں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہتیں لیکن جوانی میں کمر قوت کا مرکز بن جاتی ہے فی الجملہ کمر کی قوت ہی جوانی کہلاتی ہے۔ اس عمر میں کام کی امنگ آتی ہے۔ ذمہ داری کا بار سہارنے سنبھالنے کی ہمت بڑھ جاتی ہے۔ بالآخر بڑھاپے میں کہتے ہیں ساری قوت کھنچ کر زبان میں آجاتی ہے گویائی بہت بڑھ جاتی ہے۔ زبان قرار کم پاتی ہے چنانچہ بڑے بوڑھوں کی باتیں مشہور ہیں۔ الا ماشاء اللہ اکابر کے ممتاز مستثنیات ہمیشہ سے معروف و مسلم ہیں۔ کمزوری بھی بڑھاپے کی ایک شکل ہے چنانچہ کمزور بھی طول کلام کی طرف مائل رہتے ہیں اور باتوں کو اپنی بے عملی یا بے بسی کا بدل سمجھتے ہیں۔

قوم جو افراد کا مجموعہ ہوتی ہے وہ بھی افراد کی طرح اپنی قوت سے عزیز بدلتی ہے۔ بڑی بڑی سلطنتوں کی تاریخ شاہد ہے کہ بالعموم کوئی قوم ترقی کرتی ہے تو ابتدائے عروج میں وہ دور دراز ممالک تک پھیل جاتی ہے کمال عروج میں وہ اپنے گوناگون سیادت و حکمرانی سے سطوت و شوکت کا سکہ بٹھاتی ہے۔ دنیا بھر کا کام بناتی ہے۔ بڑی بڑی ذمہ داریوں کا بار اٹھاتی ہے۔ زوال و عروج میں قوت عملی سے وہ حکمت عملی پر اتر آتی ہے زیادہ تر باتوں سے کام چلاتی ہے اور اس میں کمال دکھاتی ہے اس طرح وضعداری نبھاتی ہے علیٰ ہذا کمزور قومیں بھی عمل سے معذور یا محروم ہونے کے سبب جلسوں اور تقریروں کی بہت شایق ہوتی ہیں اور موقع ملے تو اسی طرح اپنی دل کی بھڑاس نکال کر تسکین پاتی ہیں۔

ایک ضروری احتیاط

پھر تقریریں کی جائیں تو ان میں ایک امر قابل احتیاط ہے طب کا اصول ہے اور عام تجربہ بھی شاہد ہے کہ کوئی اشتعال انگیز غذا یا دوا استعمال کی جائے تو ابتدا میں ضرور فوری تقویت محسوس ہوتی ہے لیکن اگر وہ اکثر استعمال کی جائے تو طبیعت عادی ہو کر بتدریج اس کی متحمل اور محتاج ہو جاتی ہے نتیجہ یہ کہ بصورت استعمال اس کی تقویت کمتر محسوس ہوتی ہے۔ [illegible] عدم استعمال اس کی احتیاج سخت تر معلوم ہوتی ہے چنانچہ اکثر منشیات اور بعض مقویات و مفرحات کی بالعموم یہی کیفیت ہے کہ استعمال کے بغیر چین نہیں اور جس قدر استعمال کرو کم۔

علیٰ ہذا اشتعال آمیز تقریر کا بھی سامعین پر یہی اثر پڑتا ہے خواہ اشتعال کا نتیجہ حسب منشا و یا خلاف منشا، نیک ہو یا بد، اصلاح ہو یا فساد، خیر ہو یا شر، ایسی تقریریں کبھی کبھی کان میں پڑیں تو رنگ لاتی ہیں، دل میں جوش بڑھاتی ہیں کام کر جاتی ہیں لیکن یہ جوش تقریریں اکثر سنیے تو بے اثر ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ جو خطیب وقت ناوقت فوری ہل چل کے لالچ میں تقریر سے اپنے سامعین کو اکثر جوش دلاتے رہتے ہیں وہ بالآخر پچھتاتے ہیں سامعین میں عادتاً بے حسی اور بدذوقی پیدا ہو جاتی ہے۔ جوش کی تقریر سننے سے ان میں جوش تو کم پیدا ہوتا ہے لیکن

تقریر میں جوش نہ ہو تو وہ اس کو مردہ سمجھتے ہیں۔ خواہ وہ تقریر بجائے خود کتنی ہی معقول اور مفید کیوں نہ ہو وہی صورت ہے جو لوگ نشہ کے عادی ہو جاتے ہیں منشیات کے بغیر اچھی سے اچھی غذا میں لطف کم پاتے ہیں۔ کلام میں بھی عادت اسی طرح پڑ جاتی ہے۔ چنانچہ غالبؔ نے کہا ہے اور خوب کہا ہے۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو ؎ بنتی نہیں ہے ساغر و مینا کہے بغیر

قول و فعل

جلسوں اور تقریروں کے متعلق میں نے جو کچھ عرض کیا اس کا منشا یہ کہ قول و فعل کا باہمی تناسب ملحوظ رہے۔ اصول یہی ہے قول، فعل کا محرک و معین ہوتا ہے فعل کا بدل نہیں ہو سکتا یعنے قول کی محویت میں فعل فراموش نہ ہونا چاہئے۔ لیکن ملک و ملت کی راہ ترقی میں جس عمل کو عمل کہتے ہیں وہ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ خاص کر ترقی کے موجودہ دور میں کارگزاری کا معیار بڑے عزم و اہتمام کا طالب ہے۔ ہمیشہ سے زیادہ آج کارگزاری کے واسطے صفات کی ہمہ گیر جامعیت لابد ہے۔

جسمانی صحت و قوت

کارگزاری کے واسطے سب سے قدیم اور سب سے مقدم شرط جسمانی صحت و قوت ہے۔ روگی، بیمار، کمزور و نحیف انسان زندگی کے معرکوں میں کیا کام آسکتے ہیں۔ بالفرض اگر وہ صاحب علم اور ماہر فن بھی ہوں تو گویا فرسودہ و شکستہ کشتیوں میں سونا لدا ہوا ہے اور ہر دم خوف لگا ہوا ہے کہ پانی کی موجوں میں کہاں تختہ ٹوٹتا ہے اور کہاں کشتی ڈوبتی ہے یوں تو ہر قوم میں کچھ بیمار اور کمزور رہیں لیکن جماعت کثیر کو تندرست اور توانا ہونا ضرور ہے کشمکش حیات میں بقا کی یہ پہلی شرط ہے اور اس کے بغیر کسی ترقی کی توقع رکھنا عبث ہے۔ کچی اینٹوں سے شاندار محل تعمیر نہیں ہو سکتے۔ ترقی یافتہ قوموں میں جسمانی صحت و قوت پر کس قدر علم و دولت صرف کرتے ہیں۔ تندرستی و توانائی کی بدولت محنت اور برداشت کا معیار کس درجہ بلند ہو رہا ہے۔ آنکھوں کے سامنے کارنامے موجود ہیں۔

دماغی تعلیم و تربیت

الحاصل جسم کی صحت وقوت قومی ترقی کی جد و جہد میں سب لوازم سے قدیم اور سب شرائط پر مقدم ہے۔ اس کے بعد دماغی تعلیم و تربیت کا نمبر آتا ہے کہ اس کی بدولت انسان کی کارگزاری میں بے حد اضافہ ہو جاتا ہے یوں تو ہر شعبۂ زندگی پر علم و فن کا جھنڈا لہراتا ہے لیکن تمدن و معاشرت کے نظامات اور صنعت و حرفت کے ایجادات میں علم و فن کے کمالات سب سے زیادہ عظیم الشان نظر آتے ہیں۔ اس اہمیت کے مد نظر بیدار اقوام علوم و فنون کی تعلیم و تربیت پر پانی کی طرح بیدریغ دولت بہاتی ہیں۔ بہ کثرت بڑے بڑے جامعات اور علم و فن کے ادارے کتب خانوں تجربہ خانوں معلموں اور متعلموں سے بھرے پڑے ہیں۔ اور وہاں کی سرگرمیاں قوم کی رگ حیات کی حرکت شمار ہوتی ہیں۔

قلبی تہذیب و اخلاق

لیکن جسمانی صحت وقوت ہو یا دماغی تعلیم و تربیت۔ سب کمالات اکارت بلکہ منبع شرارت ہیں اگر ان پر قلبی تہذیب و اخلاق کی نگرانی نہ ہو۔ مثلاً بڑے بڑے توانا تندرست نوجوان اگر بے قابو ہوں مثل حیوان۔ بڑے بڑے بارسوخ پیشوا جو ہزاروں دلوں پر حکمران ہوں اگر تقوے سے غافل ہوں۔ بڑے بڑے حاذق ڈاکٹر جو قیمتی جانوں کے نگہبان ہوں اگر اخلاقی امانت میں ناقص ہوں۔ بڑے بڑے ماہر انجینئر جو لاکھوں کروڑوں روپیہ صرف کریں اگر رقمی امانت میں فاسد ہوں۔ بڑے بڑے با اختیار حکام جو سیاہ سفید میں دخیل ہوں اگر فرائض منصبی میں قاصر ہوں تو ان کی زیادتی یا کوتاہی سے بڑے بڑے نقصانات پہنچ سکتے ہیں۔ علی ہذا ترقی یافتہ اقوام کو لیجئے جسمانی تقویت اور دماغی تربیت میں کمال حاصل کرکے قلبی تہذیب کو نظر انداز کرنے کا جو لازمی نتیجہ ہو سکتا ہے وہ موجودہ جنگ کی صورت میں ہماری آنکھوں کے سامنے موجود رہے۔

لیکن جو اخلاق موثر و مطلوب ہے وہ قلبی اخلاق ہے یعنے وہ خوش اخلاقی جو دل میں پیدا ہو۔ ورنہ یوں تو اخلاق لسانی بہت عام ہے۔ زبان سے باتیں بنانا کچھ بھی دشوار نہیں ہے لیکن ایسے اخلاق زیادہ کام نہیں دیتے۔ بریں ہمہ جو اخلاق زبان سے اوپر دماغ تک رسائی رکھتا ہے وہ اخلاقیات کہلاتا ہے

اگر وہ دل تک رسائی پیدا کرلے تو تقویت پاکر وہ دینیات بن جاتا ہے۔ دل و دماغ کے حدود گویا دینیات واخلاقیات کے حدود ہیں گرچہ ان حدود کے تعین میں قطعیت ممکن نہیں۔ تاہم امتیاز میں چنداں دشواری نہیں۔ پھر نقوش اخلاقی کی طرح بداخلاقی بھی قلبی ہوسکتی ہے اور وہ بھی اسی طرح قوی الاثر ہوتی ہے بہرحال اخلاق قلبی کے بہت سے شعبے ہیں مثبت و منفی، اور ہر شعبہ اپنے اپنے محل پر قابل توجہ ہے۔ لیکن سرسری حوالے سے زیادہ یہاں بحث کی گنجائش نہیں اور ضرورت بھی نہیں۔

برطانیہ کی مثال

تفاصیل کے قطع نظر قوموں کی جدوجہد کش مکش حیات میں فرض شناسی مستعدی اور استقلال یہ تین اخلاقی صفات بہت درکار ہیں اور بڑے بڑے معرکوں میں نازک موقعوں پر ان صفات کے جوہر کھلتے ہیں چنانچہ موجودہ جنگ کو لیجیئے قوت کی غفلت میں بڑی بڑی کوتاہیوں اور ناکامیوں سے سابقہ پڑا۔ تاہم برطانیویوں کے ان ہی صفات نے برطانیہ عظمیٰ کا دم خم قائم رکھا۔ اور ان کے یہی صفات قومی نصرت وبقا کے ضامن معلوم ہوتے ہیں۔ سچ پوچھیئے تو وزیراعظم مسٹر چرچل کی شخصیت نے قوم میں اثر کی برقی لہر دوڑا کر بحالت سراسیمگی ان صفات کو پیدا کیا اور کام سے لگایا شخصیت کا یہ کارنامہ بھی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ اور یوں بھی پوری جنگ چند شخصیتوں کا جادو معلوم ہوتی ہے

عناصر کارگزاری کی پرداخت

حاصل کلام یہ کہ جسم کی تقویت، دماغ کی تربیت اور قلب کی تہذیب یہ تینوں عناصر انسان کی اعلیٰ کارگزاری کے جزو لاینفک ہیں جسم کی صحت و قوت کا عمل تو پیدائش کے ساتھ ہی شروع ہوجاتا ہے اور آخر دم تک ساتھ رہتا ہے۔ آب و ہوا کا بے شک اثر پڑتا ہے۔ پھر بھی صحت و قوت زیادہ تر انسان کی اپنی کوشش سے تعلق رکھتی ہے اس کی ترقی میں دوسروں کی امداد کم درکار ہوتی ہے قلب کی تہذیب و اخلاق کا بھی یہی حال ہے یہ کسی نہ کسی شخصیت کا فیضان ہوتا ہے جو عقیدت و تقرب سے حاصل ہوسکتا ہے پھر اپنی استعداد اور اپنے عزم پر ترقی کا مدار رہتا ہے۔ چنانچہ حضرت اکبر الہ آبادی مذہبی رنگ میں فرماتے ہیں۔

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا ؎ دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

البتہ دماغ کی تعلیم و تربیت میں بڑے اہتمام کی ضرورت ہے۔ علوم کی تعلیم اور فنون کی مہارت مطلوب ہو تو ابتدائی مکاتب سے لے کر مدارس، کلیہ جات اور جامعات تک جس قدر بھی اہتمام کیا جائے کم ہے۔ ترقی کا اس شعبہ میں خصوصیت سے قوم کی اجتماعی سعی مددگار رہے۔ انفرادی اہتمام تقریبًا لاحاصل ہے۔ چنانچہ ترقی پسند ممالک میں حکومتیں اور ان سے بڑھ کر قوم کے دولت مند مخیر جو بہبودی و خوشنودیٔ عامہ کی قدر و قیمت سے واقف ہیں۔ دل کھول کر تعلیم گاہوں کی امداد کرتے ہیں اور خوب سمجھتے ہیں کہ خود ان کی مرفہ الحالی بھی بالآخر قوم کی تقویت و ترقی پر منحصر ہے۔ ممکن نہیں کہ کسی قوم میں ضعف و زوال نمودار ہو اور متمول طبقے اس کی زد سے محفوظ رہیں۔ بلکہ سچ پوچھئے تو وہی سب سے زیادہ معرض خطر میں رہتے ہیں۔ پس دور اندیشی واجب ہے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ کارگزاری کے تینوں شعبے جو جسم و دماغ اور قلب سے وابستہ ہیں قوم کی ترقی کے واسطے لابد ہیں۔

ترقی کا مرکز

قوم کی گوناگون ترقیات کے منجملہ معاشی ترقی کے مفہوم میں بالعموم خارج پر نظر دوڑتی ہے، مثلاً پہاڑ، دریا، جھیل، میدان، سمندر، ساحل، معدنیات، نباتات، جنگلات، حیوانات، زراعت، صنعت و حرفت، کارخانے، سکہ، نوٹ، بنک، بازار، ریل، جہاز، معاشی زندگی کا یہی نقشہ ذہن میں جمتا ہے۔ لیکن ادنیٰ تامل سے ظاہر ہے کہ دراصل انسانی کوشش ان تمام شعبوں کی روح رواں ہے۔ انسانی کارگزاری کے بغیر سب قدرتی شعبے انسان کی حد تک لاحاصل ہیں اور سب کاروباری شعبے سراسر معدوم۔ پس جب انسان ہی تمام ترقی کا مرکز و منبع ٹھیرا۔ اسی کی کارگزاری پر ترقی کا دار و مدار رہا تو اس کی تقویت و تربیت و تہذیب میں جس قدر اہتمام کیا جائے کم ہے۔ چنانچہ ترقی پسند اقوام کا یہی مسلک ہے اور ہمارے ملک میں بھی یہی اہتمام سب پر مقدم ہے۔

طالب علم کی حیثیت

بچپن، لڑکپن، نوجوانی، انسانی زندگی کا یہ زمانہ سب سے زیادہ نتیجہ خیز ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو اسی

1

اسی زمانہ میں اس کے مستقبل کا نقشہ بن جاتا ہے۔ دل، دماغ، جسم، اسی زمانہ میں نشو و نما پاتے ہیں جو رخ اختیار کرتے ہیں اسی پر بڑھتے چلے جاتے ہیں اور فطری استعداد کے حدود میں جتنا موقع ملے کمال دکھاتے ہیں، پس بچے لڑکے نوجوان بشمول طبقۂ نسوان۔ ہر قوم کا سب سے بیش قدر سرمایہ ہیں۔ ترقی پسند اقوام میں یہ جماعتیں مجموعی طور پر طالب علم کہلاتی ہیں۔ ان کی فلاح و ترقی پر بیدار قومیں بے حد توجہ اور بے حساب دولت صرف کرتی ہیں اور ان ہی کے دم سے بڑے بڑے عروج پاتی ہیں چنانچہ اگر کسی قوم کی بیداری اور دور اندیشی کا اندازہ کرنا ہو تو یہ معلوم کرنا کافی ہے کہ اس قوم میں معاشی اور معاشرتی حالات کے پیش نظر طالب علموں کا کیا تناسب ہے اور طالب علموں کی کیا حیثیت ہے خلاصہ یہ کہ ہر قوم کی گوناگوں عظمتوں کے سنگ بنیاد اس قوم کے طالب علم ہوتے ہیں واضح رہے کہ مضبوط بنیادوں کے بغیر عالیشان عمارتوں کے خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتے۔ البتہ تعلیم گاہوں کو سیاسی سازشوں کی آڑ بنا کر طالب علموں کو شورش کا آلہ کار بنانا خطرناک کوتاہ اندیشی ہے اور ملک کے حق میں دشمنی۔

معاشی کانفرنس

جلسوں اور تقریروں کے ذکر میں قول و فعل کے تناسب پر کارگذاری کے شرائط پر، انسان کی مرکزیت اور طالب علم کی اہمیت پر میں نے متعدد بار کسی قدر اصرار سے توجہ طلب کی بظاہر ممکن ہے کہ یہ بحث کسی حد تک گریز معلوم ہو لیکن فی الحقیقت بہ اعتبارات قومی حیات و تعلق کے لابدی عناصر ہیں اور گرچہ ان کا ذکر کچھ انوکھا نہیں تاہم ان پر جس قدر اصرار و تواتر سے توجہ طلب کی جائے کم ہے خاص کر جب کہ عام طور پر بے توجہی غالب ہو۔

حاصل کلام یہ کہ معاشی کانفرنس کے سالانہ جلسے اور جلسوں میں خطبے، مقالے، تقریریں، تحریکیں یہ سب مراحل بجائے خود طے ہونے ضرور ہیں اس طریق سے ملک میں معاشی بیداری پھیلنے کی توقع ہے لیکن یہ کوشش بحث کے دائرہ میں محصور رہ جائے تو کیا حاصل گویا ع نشستند و گفتند و برخاستند۔ عمل کی بھی نوبت آنی چاہیے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ معاشی امور سے تعلق اور دلچسپی رکھنے والے محکمے اور ادارے بشمول کانفرنس یہ سب مل کر کوئی لائحہ عمل مرتب کریں جو جامعیت کے ساتھ معاشی ترقی کا ضامن ہو، یوں تو

کسی نہ کسی حد تک مختلف طریق پر معاشی اصلاح و ترقی کا یہ کام پہلے سے ملک میں جاری ہے۔ تاہم اگر کسی اتحاد کے تحت تقسیم عمل میں تنظیم ہو جائے تو معاشی ترقی میں بھی جامعیت پیدا ہو جائے۔ معاشی زندگی کے گوناگون شعبے باہمی لزوم اور انحصار سے اس درجہ مربوط ہیں کہ معاشی ترقی میں ہمہ گیری لابد ہے۔ اسی سبب تقسیم عمل میں اتحاد کے ساتھ تنظیم کی ضرورت ہے۔

معاشی تنظیم میں جامعیت

اتحاد کے ساتھ تقسیم عمل کی تنظیم میں اول سرکار عالی کے وہ محکمے ہیں جن کو ملک کی معاشی زندگی سے قریبی تعلق ہے۔ خاص کر سررشتۂ تعلیمات، جامعۂ عثمانیہ، محکمہ جات معدنیات، جنگلات، آبکاری، مالگذاری، امداد باہمی، تعمیرات، آبپاشی، صنعت و حرفت، دارالضرب، طباعت کروڑگیری، ریلوے اور فینانس، دوسرے معاشی نوعیت کے نیم سرکاری ادارے جن کو سرکار عالی کی مالی امداد اور انتظامی نگرانی حاصل اور جن کے سرمایۂ انتظام میں عوام کو بھی شرکت حاصل ہے۔ مثلاً حیدرآباد اسٹیٹ بنک، نظام شگر فیکٹری، سرلو پیپر ملز، عثمان شاہی ملز، اعظم جاہی ملز، تیسرے اور چوتھے بڑے بڑے کارخانے اور کاروبار جو مشترکہ سرمایۂ عامہ سے یا انفرادی سرمایہ خانگی سے قائم ہیں، مثلاً دیوان بہادر رام گوپال ملز، حیدرآباد کیمیکل اینڈ فارماسوٹیکل ورکس یعنی کیمیادی دوا و دوائی کارخانہ حیدرآباد، وزیر سلطان تمباکو کمپنی، گولکنڈہ سگریٹ فیاکٹری، رگھوناتھ مل بنک اور پانچویں متفرق مقامی صنعتیں جو قلیل سرمایوں سے چھوٹے چھوٹے پیمانوں پر جاری ہیں اور اکثر کس مپرسی کی بدولت خستہ حال ہیں لیکن امداد ملنے پر کافی ترقی کر سکتی ہیں، مثلاً چوڑی کی صنعت، بٹن کی صنعت، کمبل اور قالین کی صنعت، ہمرو مشروع کمخواب کی صنعت، ہر مد میں بطور نمونہ چند مثالوں پر اکتفا کیا گیا ورنہ مثالوں کی طویل فہرستیں پیش کرنا یہاں مقصود نہیں۔ مطلب یہ کہ ملک میں بڑے چھوٹے پیمانوں پر کسی نہ کسی نوعیت کی جو معاشی جد و جہد ہر چہار طرف جاری ہے یا جس کے جاری ہونے کا امید افزا قرینہ ہے۔ ان سب کا جائزہ لیا جائے بلکہ ذرائع اور ملک کی ضروریات پر نظر دوڑائی جائے اور سب پہلو پیش نظر رکھ کر متحدہ طور پر بطریق تقسیم عمل جامعیت کے ساتھ معاشی اصلاح و ترقی کا کوئی لائحۂ عمل مرتب کیا جائے۔ جب تک یہ اہتمام نہ ہوگا ملک کو وہ مرفہ الحالی نصیب نہیں ہو سکتی جو دوسرے ممالک کو حاصل ہو چکی ہے اور جس کے

حاصل کرنے کی ملک میں کافی استعداد موجود ہے۔

معدنیات و جنگلات

معاشی اصلاح و ترقی کا لائحۂ عمل یوں تو بہت تفصیل طلب ہے لیکن اجمالی خاکہ مطلوب ہو تو اس میں بعض مدات خاص توجہ کی مستحق ہیں۔ مختصر کیفیت یہ کہ سب سے پہلے معدنیات بڑی دولت ہیں دنیا میں آج ان کی جو قدر و قیمت ہے اظہر من الشمس ہے۔ سچ پوچھیئے تو معاشی ترقی کے لوازم میں انسانی کارگذاری کے بعد ازیں معدنیات ہی کا نمبر ہے جس ملک کو معدنیات حاصل ہیں اس کو بڑی قوت حاصل ہے جو معدنیات بھی ملک میں قدرتاً موجود ہوں۔ کم ازکم ان پر ملک کا قبضہ و تصرف رہنا لازم ہے۔ تھوڑے منافع کے لالچ میں معدنیات دوسروں کے حوالے کر دینا بڑی کمزوری اور کوتہ اندیشی ہے اس سے بہتر ہے کہ موافق حالات نمودار ہونے تک وہ دھرتی ماتا کے آغوش میں محفوظ رہیں۔

علیٰ ہذا قدرتی انعامات میں جنگلات بھی بڑی دولت ہیں اوّل تو موسم اور بارش پر ان کا مفید اثر پڑتا ہے دوسرے ان میں وحشی جانوروں کے سوا پالتو جانور بھی پرورش پاتے ہیں مثلاً بھیڑ بکری گائے بھینس جو خود مجموعۂ دولت ہیں۔ تیسرے ان کی پیداوار بہت کارآمد ہوسکتی ہے خاص کر جو جنس جو عمارت و فرنیچر میں کام آسکے مثلاً ساگوان وغیرہ بہت قیمتی ہوتا ہے علیٰ ہذا بانس بھی بہت خاص پیداوار ہے یوں تو اس کے بہت سے مصرف ہیں لیکن کاغذ کی صنعت نے اس کی قدر و قیمت بہت بڑھا دی ہے۔ چنانچہ سرپو پیپر ملز حال میں کثیر سرمایہ سے بڑے پیمانہ پر بسرپرستی سرکار عالی ضلع آصف آباد میں قائم ہوئی ہیں جہاں قرب و جوار میں بانس کے گھنے جنگل محفوظ ہیں۔ بصورت ضرورت ملک کے دوسرے جنگلوں سے بھی بانس مہیا ہوسکتا ہے۔ مثلاً امرآباد کا بانسواڑہ بھی ایک ذخیرہ ہے اور کاغذ کی صنعت کو جو روز افزوں اہمیت حاصل ہے محتاج بیان نہیں۔ ماحصل کلام یہ کہ معدنیات و جنگلات یہ دونوں محکمے خاص توجہ اور اہتمام کے مستحق ہیں کہ ان کا قوم کی مرفہ الحالی سے قریبی تعلق ہے۔

زراعت

زراعت ملک کا عام پیشہ ہے کاشتکاروں کی آبادی ملک میں سب سے زیادہ ہے کچھ تو اس کے

قدرتی اسباب ہیں اور کچھ معاشی پس ماندگی اس صورت حال کی ذمہ دار ہے۔ بہرحال کاشتکاروں کی خوشحالی کی خوشحالی
کا بڑا جزو ہے۔ کاشتکار مالک زمین نہ ہوں تو بھی زمین پر ان کا قبضہ دیرپا ہونا چاہیئے ورنہ ممکن نہیں کہ زمین کی درستی
میں وہ دل کھول کر کوشش کریں۔ پھر بصورت ضرورت ان کو مناسب شرائط پر رقم قرض ملنی چاہیئے کہ کثرت سود سے
وہ زیر بار نہ ہوں۔ چنانچہ اس غرض سے دیہاتی انجمن امداد باہمی قائم ہو رہی ہیں کہ کاشتکار ساہوکاروں کی
دستبرد سے محفوظ ہو جائیں۔ علیٰ ہذا زمین کا لگان اور زمین کی مالگذاری بھی اتنی نہ بڑھنے پائے کہ کاشتکار مفلس
رہ جائیں کہ بالآخر اس میں لگان اور مالگذاری کا بھی نقصان ہے۔ کاشتکاروں کو تخم منتخب کرنے اور کاشت
کرنے میں مشورہ دیا جائے پیداوار فروخت کرنے میں مدد دی جائے چنانچہ اس غرض سے محکمۂ زراعت قائم ہے
اور مارکٹ آفیسر مقرر ہیں۔ زراعت کی سب سے بڑی ضرورت پانی ہے بارش تو اختیار میں نہیں۔ البتہ دریا،
ندی، ساگر، کنٹے، تالاب، باولیاں ان ذرائع سے مدد مل سکتی ہے اور محکمۂ آبپاشی کا یہی کام ہے۔
پس زراعتی ملک میں آبپاشی کا جس قدر بھی اہتمام ہو سکے کم ہے۔ خوراکی غلوں کے سوا روئی، نیشکر، السی، تمباکو اور
مونگ پھلی کی کاشت بہت امید افزا معلوم ہوتی ہے۔

صنعت وحرفت۔

نباتات وحیوانات کی پیداوار میں قدرتی تصرف زیادہ دخیل رہتا ہے۔ اس کے برعکس صنعت وحرفت
میں انسانی کوشش کا دخل بڑا ہوا ہے۔ ایک سادہ مثال لیجیئے کہ روئی بنولہ سے پیدا ہوتی ہے، اون بھیڑ
سے، ریشم کیڑے سے حاصل ہوتا ہے اور ان کی پیداوار میں کیفیت وکمیت کی ایک حد ہے لیکن صنعت کے
ذریعہ پارچہ بافی میں اتنی ترقی ممکن ہے کہ کپڑا چاندی سونے کے مول فروخت ہو۔ پس علم وفن کے زور سے
مصنوعات میں افادہ بڑھا بڑھا کر زراعتی ممالک کے مقابل صنعتی ممالک بہت زیادہ دولت مند بن جاتے ہیں۔
اور یوں بھی مصنوعات معاشرت وتمدن کی ترقی کا جزو لاینفک ہیں۔ پس ملک کے قدرتی ذرائع اور کاروبار
موقع کے لحاظ سے صنعت وحرفت کا کوئی جامع پروگرام بننا چاہیئے۔ ورنہ یوں منتشر کوششیں خاطرخواہ کامیاب
نہیں ہو سکتیں۔ سب سے مقدم تو صنعت وحرفت کی تعلیم اور مہارت ہے۔ عثمانیہ ٹکنیکل کالج، دارالضرب
سرکار عالی۔ ریلوے ورکشاپ جیسے اداروں میں جدید طرز پر صنعت وحرفت کی تعلیم ومہارت کا تھوڑا بہت

انتظام ہے اسی طرح سررشتہ تعلیم صنعت و حرفت بھی چند سال سے قائم ہے اور اس کی نگرانی میں صنعت و حرفت کے چند مدارس جابجا جاری ہو چکے ہیں جہاں معمولی مقامی صنعتوں کی تعلیم ہوتی ہے کچھ خانگی مدارس بھی کام کر رہے ہیں لیکن ملکی ضروریات کے مدنظر یہ انتظام سراسر ناکافی ہے اور بہت ترقی و توسیع کا طالب ہے ، سررشتۂ تعلیمات اور جامعۂ عثمانیہ کی ادھر خاص توجہ درکار ہے ۔

سرکاری امداد اور مالیہ

ترقی صنعت و حرفت کے لئے ملک میں چھوٹے بڑے ، کارخانے بھی قائم ہونے ضرور ہیں چنانچہ گو رفتار سست ہے تاہم ان کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے ، اور بعض مرکزی کارخانوں کا او پر ذکر آ چکا ہے ، اوّل تو محکمۂ صنعت و حرفت سے ایسے کارخانوں کو مشورے کی مدد مل سکتی ہے دوسرے سرکاری مالیہ سے بھی بطور تشفی اصل معتبر کارخانوں اور کاروباروں کو مالی امداد ملتی رہتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ انتظام یہ کہ سرکار عالی نے حیدرآباد انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ کے نام سے کثیر رقم باقاعدہ مختص کر دی ہے کہ امداد کی جاسکے چنانچہ اس فنڈ کی امداد سے کاروبار میں خاصی جان پڑ گئی ہے اور بہت کچھ ترقی کی توقع ہے لیکن آخر کار سرکار عالی کے مالی ذرائع بھی محدود ہیں اور صدہا مصارف اس کے ذمہ لگے ہوئے ہیں اور ہر طرف اضافوں کے مطالبے بڑھ رہے ہیں ۔ اگر اس سے ملک کی ترقیات میں بیش از بیش مالی امداد بہم پہنچانی مقصود ہو تو متمول طبقوں کو محاصل کے واجبی اضافوں میں عذر نہ ہونا چاہیئے اور ان کی روایتی فیاضی سے امید ہے کہ اضافۂ محاصل کی واجبیت واضح ہو جانے پر کوئی عذر نہ ہو گا ورنہ پھر روز افزوں مصارف کے مدنظر محکمۂ فینانس کو کیمیا کا کوئی نسخہ بتا دیا جائے کہ وہاں تانبے سے سونا بنتا رہے یا اس سے بھی آسان تدبیر یہ کہ کہیں سے پارس پتھر حاصل کر کے محکمۂ فینانس کو دیدیا جائے کہ حسب ضرورت چھو کر سونا بن جائے ورنہ ممکن ہے کہ کیمیا کے سونے میں ایک آنچ کی کسر رہ جائے بہر حال محکمۂ فینانس کی حالت پانی کے ساگر کی ہے جس قدر روپیہ جمع ہو گا اس قدر تقسیم ہو سکے گا ۔ البتہ اصول و قاعدہ سے روپیہ جمع کرنا تقسیم کرنا محکمہ کا کام ہے اور یہ کام بجائے خود ایک بڑا علمی فن ہے ۔

دولت مند طبقوں کی امداد

دولت مند طبقے کئی طرح ملک کی مرفہ الحالی میں مدد دے سکتے ہیں ۔ اوّل تو توقع ہے کہ د

دیگر ممالک کی طرح خوش دلی سے ترقیات ملک کے واسطے واجبی محاصل برداشت کریں گے اگر اپنے اطمینان کی خاطر وہ مصارف میں مشیر رہنا چاہیں تو حال ہی میں مجلس مشاورت کی ابتدا ہو چکی ہے۔ دوسرے بڑی بڑی رقمیں جو ان کے پاس خزانوں میں بیکار پڑی ہوں ان کو کاروبار میں لگائیں اور نگرانی میں شریک رہیں چنانچہ اعلیٰ طبقوں میں کاروبار کی ایسی مثالیں نمودار ہو رہی ہیں اور امید ہے کہ وہ نظیریں قابل تقلید ثابت ہوں گی تیسرے رفاہ عامہ کے کاموں میں بطریق عطیات راست امداد دی جائے مثلاً، مدارس اقامت خانہ، شفاخانہ، یتیم خانہ وغیرہ قائم کئے جائیں کہ خلق خدا ان سے مستفید ہو چنانچہ انسداد گداگری کا جدید قانون و انتظام اسی اصول کی ایک قابل تقلید مثال ہے اگرچہ مقصود بہبودی عامہ کے سوا کچھ نہ ہو پھر بھی قدرتاً خوشنودی عامہ عود کرتی ہے جو اخلاقی اور نفسیاتی اعتبار سے بڑی نعمت ہے ماشاء اللہ مملکت آصفیہ میں ہمدردی اور فیاضی کی روایات ہمیشہ شاندار رہی ہیں اور ان کی شان میں جدید طریق پر مزید ترقی اغلب و ممکن ہے بلکہ پہلے سے جاری ہے

ملکی بنک

کاروبار کی رقمی امداد کے سلسلہ میں ضرور ہے کہ ملک میں کافی بنک مقامی سرمایہ سے قائم ہوں۔ موجودہ صورت یہ ہے کہ بہت سا بیرونی سرمایہ ملک میں منافع کما رہا ہے۔ باہر لیجا رہا ہے اور خود ملک کی بڑی رقمیں باہر کی بنکوں میں بغرض حفاظت جمع ہو کر باہر فائدہ پہنچا رہی ہیں۔ یہ حالت فلاح ملک کے منافی ہے خاص کر اس دور میں جس دور سے اپنا ملک گذر رہا ہے ضرورت ہے کہ اعلیٰ اور متوسط طبقے سب کے اندوختے بنکوں میں جمع ہو کر قلت سرمایہ کی دشواری رفع کریں اور بنکوں کے ذریعہ کاروبار کو مالی امداد ملے۔ یہ سچ ہے کہ بنک چلانا کوئی آسان کام نہیں ہے لیکن جو کام دوسرے ملکوں میں کامیابی سے انجام پا رہے ہیں وہ یہاں کیوں محال سمجھے جائیں۔ رہی سود اور منافع کی بحث جو اہل اسلام سے خاص تعلق رکھتی ہے وہ دراصل زیادہ پیچیدہ نہیں ہے کاروبار کی مالی شرکت میں اگر معاوضہ کی شرح پہلے سے معین نہ کی جائے بلکہ حسب حال کمی و بیشی کے ساتھ نفع و نقصان میں شرکت رہے تو سود کی صورت باقی نہیں رہتی جو کچھ ملتا ہے منافع ہوتا ہے اور منافع ہر طرح جائز ہے بلکہ بلا لحاظ مذہب عملی

تجربہ سے بھی دنیا سود کی مضرت و منافع کی منفعت کی قائل ہو رہی ہے۔

معاشی مباحث

معاشیات خواہ نظری ہو یا عملی کتابوں میں اس کے مباحث فی الجملہ ایک خاص ترتیب سے پیش کئے جاتے ہیں اور وہ ترتیب مباحث کی تقسیم میں عین مانی جاتی ہے مثلاً معاشی جد و جہد کے شعبوں میں اوّل پیدائش دولت، پھر تقسیم دولت پھر مبادلۂ دولت اور پھر آخر میں صرف دولت۔ بالعموم یہی ترتیب ملحوظ رہتی ہے گرچہ اس ترتیب میں چنداں لزوم نہیں ہے۔ مثلاً بعض صرف دولت کا شعبہ مقدم سمجھتے ہیں کہ انسان اس شعبہ سے معاشی زندگی شروع کرتا ہے یعنے پیدا ہوتے ہی صرف دولت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے پیدائش دولت کی نوبت بعد کو آتی ہے اور یہ نوبت یقینی بھی نہیں ہے خدانخواستہ کوئی کم عمری یا نوجوانی میں جلد یا تو ہاتھ ملنے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا اور جو پیدائش دولت میں مصروف ہیں وہاں بھی یہ بحث تصفیہ طلب ہے کہ آیا انسان کھا کر کماتا ہے یا کما کر کھاتا ہے یہ وہی بحث ہے کہ آیا پہلے انڈا پیدا ہوا یا مرغی۔ اس کا تصفیہ جو کچھ بھی ہو سکتا ہے ظاہر ہے بہرحال لزوم نہ ہو تو بھی بالعموم مباحث کی ایک خاص ترتیب درج ہے۔ علی ہذا پیدائش دولت کے تحت عاملین پیدائش میں زمین، محنت، اصل اور نیز تنظیم یا تقسیم۔ دولت کے تحت پیداوار کے حصوں میں لگان اجرت، سود یا منافع اور معاوضۂ تنظیم، یا مبادلۂ دولت کے شعبہ میں قدر و قیمت، زر، بنک، بازار وغیرہ یا صرف دولت کے شعبہ میں ضروریات اور معیار زندگی وغیرہ یہ جملہ مسائل زیر بحث آتے ہیں۔ مزید برآں ایک اعتبار سے مالیات کا شعبہ بھی مندرجۂ بالا تفصیل میں جا بجا شامل رہتا ہے پھر بھی اس سے جداگانہ بحث کی جاتی ہے۔ مباحث کی طویل تفصیل نظر انداز کر کے اجمالی خاکہ پیش کیا گیا تو بھی اس میں تفصیل کافی نظر آتی ہے اور ہر مسئلہ اپنی جگہ اہم اور قابل توجہ معلوم ہوتا ہے۔

خطبات کے حدود

لیکن عام جلسوں کے مواقع پر خطبات میں اگر جامعیت کی خاطر اکثر معاشی مباحث ترتیب کی پابندی سے پیش کئے جائیں خواہ وہ کتنے ہی اختصار سے پیش کئے جائیں خطبہ اگر کتاب نہیں تو کتابوں کا خلاصہ ضرور بن جائیگا پھر معاشی مباحث کے دو پہلو رہ جاتے ہیں ایک نظری دوسرا عملی مثلاً جس طرح کہ ریاضی یا کیمیا یا طبیعیات میں ہے۔ ہو سکتا ہے ایک نظری دوسرا عملی بیان میں اگر نظری پہلو پر اکتفا کیا جائے تو وہ اچھا خاصا درس بن جائیگا۔

نظری پہلو نظرانداز کرکے عملی پہلو پیش کیا جائے تو فنی امور میں مثلاً مسائل قدر و قیمت میں یا مسائل زر و سکہ میں بیان عمدہ نظر آئے حالانکہ ایسے ہی فنی امور سمجھنے کا اشتیاق عام پایا جاتا ہے دونوں پہلوؤں کو یکجا رکھا جائے تو توقع کے مدنظر طوالت حد سے بڑھ جائے یہ مشکل وہاں اور بھی زیادہ پیش آتی ہے جہاں عام طور پر معاشیات کے نظریات سے واقفیت کم ہو اور معاشیاتی عملیات سمجھنے کے اشتیاق زیادہ ہو

جنگ کے اثرات

موجودہ جنگ کے گوناگوں غیر معمولی اثرات نے تمام کاروبار تہ و بالا کرکے معاشی قوانین کا عمل بڑی حد تک معطل کر دیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ معاشی حالات میں معاشی نظریات سے بعد نظر آتا ہے خلاصہ یہ کہ معاشی زندگی مدت سے عدم مداخلت کے اصول و عمل پر بڑی حد تک جاری تھی اور معاشیات کے نظریات بھی بیشتر اس مفروضہ پر مبنی تھے لیکن جنگ کی بدولت مسلک الٹ گیا اور سرکاری مداخلت کی یہ نوبت پہنچی کہ معاشی زندگی کی تقریباً تمام ضروریات منظوری کی محتاج ہوگئیں مداخلت کے عمل سے معاشی زندگی پامال ہوگئی اور معاشیات کے نظریات بھی کتابوں ہی کی [illegible] یادگار معلوم ہونے لگے تاہم توقع ہے کہ یہ صورت حال مدت تک باقی نہ رہ سکے گی اور تباہی عام ہونے سے قبل اصلاح کی صورت نمودار ہوجائے گی۔

معاشی کانفرنس کے مباحث

مندرجہ بالا اعتبارات کے مدنظر میں نے کسی رسمی ترتیب کی پابندی غیر ضروری سمجھ کر اول ان ہی امور پر اصرار کے ساتھ توجہ طلب کی جو امور اساسی یا ضروری ہونے کے سبب اور بعام عدم التفات کے سبب خصوصیت سے توجہ کے طالب ہیں خطبہ میں تفصیل کی طوالت سے ایک تصفیہ یہ بھی نکل آیا کہ بعض اہم مسائل پر جلسہ میں جداگانہ مقالے پڑھے جائیں گے اور ان پر بحث مباحثہ بھی ہوسکے گا اس لئے ان کے متعلق خطبہ میں کسی بیان کی ضرورت باقی نہیں رہی چنانچہ مذکورہ مباحث درج ذیل ہیں۔

(۱) حیدرآباد میں محاصل اندازی کا مسلک

(۲) حکومت اور زمانہ جنگ کے معاشی مسائل

(۳) کاشتکار اور زمانہ جنگ کے اثرات

(۴) حیدرآباد میں صنعتی سرمایہ کا مسئلہ

مندرجہ بالا مباحث کی علمی اور عملی اہمیت محتاج بیان نہیں ہے اور توقع ہے کہ مقالوں سے کافی وضاحت حاصل ہوسکے گی ان کے سوا بعض دیگر معاشی مسائل جو عام توجہ جذب کر رہے ہیں بقدر گنجائش مختصراً ذیل میں پیش ہوں گے۔

منشا یہ کہ موجودہ معاشی حالات کی سرسری تفہیم ہو کر کسی نہ کسی حد تک عام حیرانی رفع ہو جائے

جنگ میں اتلاف دولت

یوں تو دولت صرف کرنے کیلئے ہی پیدا کی جاتی ہے اور صرف کرنے ہی میں لطف آتا ہے گویا اصطلاحی زبان میں افادہ حاصل ہوتا ہے
جو دولت صرف میں نہ آئے اس کے پیدا ہونے سے کیا حاصل لیکن دولت صرف ہونے اور دولت تلف ہونے میں بڑا فرق
ہے مثلاً کھانا کپڑا یہ عام ابتدائی ضروریات ہیں کھانا کھانے میں آئے تو الحمد للہ کپڑا پہننے میں آئے تو الحمد للہ لیکن اگر کھانا جل کر
کوئلہ ہو جائے کپڑا جل کر راکھ ہو جائے تو اس کو کیا کہئے پھر جب دولت صرف میں آتی ہے تو بالعموم وہ پیدائش دولت میں
مدد دیتی ہے چنانچہ دولت میں پیدائش و صرف و صرف پیدائش کا یہ تواتر ہر طرف جاری ہے۔ البتہ اگر تواتر کا رخ جانب
اعلیٰ ہے کہ صرف دولت میں اضافہ ہو اور پیدائش دولت میں اس سے زیادہ اضافہ ہو یہ معاشی ترقی کی صورت ہے،
اور اگر جانب اسفل ہے کہ صرف دولت میں کمی ہو اور پیدائش دولت میں اس سے زیادہ کمی ہو تو یہ معاشی نزول کی صورت ہے،
لیکن جب دولت تلف ہوتی ہے تو نہ وہ صرف دولت کا مقصد پورا کرتی ہے اور نہ وہ پیدائش دولت میں
مدد دیتی ہے بلکہ اس کے برعکس پیدائش دولت میں رکاوٹ اور دشواری پیدا کرتی ہے۔ مثلاً آدمی کھانا کھا کر تازہ دم
ہو کر کام میں لگ جاتا ہے لیکن کھانا جل کر کوئلہ ہو جائے تو بھوکا آدمی کیا کارگذاری دکھائے بلکہ ادھر کھانا جلا تو ادھر
یہ دل جلا ہو گیا۔ بھوکا سو رہا، بھوک میں صبر نہ آسکا تو غصہ آ جائے گا بہر حال کام میں خلل پڑ جائے گا۔ اس
سادہ مثال سے بڑی بڑی پیچیدہ صورتیں واضح ہو سکتی ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ دولت صرف کرنے کی غرض سے پیدا کی جاتی ہے اور صرف کرنے ہی سے دولت پیدا ہوتی
ہے لیکن دولت تلف ہو کر اس تواتر میں خلل ڈالتی ہے معاشی ترقی کا راستہ روکتی ہے اور معاشی تنزل کا راستہ
کھول دیتی ہے۔ چنانچہ جنگ کی غارت گری سے دنیا اس آفت میں مبتلا ہو رہی ہے۔ صدیوں کی دولت
بے حساب دولت بے نظیر دولت دھواں بن کر ہوا میں غائب ہے یا خاک بن کر زمین پر پڑی ہے یا ڈوب کر سمندر
کی تہ میں لاپتہ ہے جہاں پیدائش دولت اور صرف دولت کی بدولت دنیا جنت بنی ہوئی تھی اور بے ساختہ زبان
سے نکلتا ہے۔ اگر فردوس بر روئے زمین است ؎ ہمین است و ہمین است و ہمین است
وہاں اتلاف دولت کی بدولت اب ویرانی دیکھی نہیں جاتی پھر بھی شدت جاری ہے۔ الامان!

کہہ رہا ہے آسمان یہ سب سماں کچھ بھی نہیں ؛ پیش دو لگا ایک گردش میں ایماں کچھ بھی نہیں

اعصاب کا کھیل

غرض کہ جان تلف، مال تلف، پیدائش دولت کے سامان تلف اور تلف کرنے کے نت نئے سامان بڑے سے بڑے پہلنے پر ہر طرف بڑی مستعدی سے تیار ہو رہے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ تباہ کرنے اور تباہ ہونے کے سوا انسان کے واسطے دنیا میں کوئی مشغلہ باقی نہیں رہا، یہ جنگ در اصل جنگ اعصاب ہے تہذیب جدید کا سب سے زیادہ اعصاب پر بار ہے۔ بارے اعصاب گرم ہوتے ہیں اور جب گرم ہوتے ہیں تو تعدی اور تشدد سے زیادہ انسان کوئی مشغلہ پسند نہیں کرتا ہے۔ انتہا پر کشت و خون کی نوبت آتی ہے موقع نہ ہو تو خودکشی پر گذر جاتی ہے بہر حال اعصاب کی گرمی تباہی ضرور لاتی ہے قوم بھی افراد کا مجموعہ ہے جنگ کی شدت اعصاب کا کھیل ہے لیکن فی الفور جوش میں پتہ نہیں چلتا سکون ہونے پر زخموں کی تکلیف شروع ہوتی ہے، درد، بیماری، کمزوری، تیمارداری، یہ مراحل بعد کو سخت گذرتے ہیں پھر بھی صحت کی بات کہاں حاصل ہو سکتی ہے دنیا کی محویت کے ساتھ آخرت بھی یاد رہے تو اعصاب غیر معمولی بار سے محفوظ رہتے ہیں، استغنیٰ، قناعت، عفو، صبر، رضا، ایسے مذہبی اعتبارات اعصاب کو گرمی سے بچاتے ہیں لیکن ساتھ ہی دنیوی جد و جہد بھی اعتدال پر آجاتی ہے چنانچہ اس نتیجے کے سبب دنیا پرست دین و مذہب کو اپنی ترقی کے حق میں ضعف سمجھتے ہیں۔

قلت و ناداری

دولت تلف ہو جانے کا لازمی نتیجہ یہ کہ وہ صرف کے واسطے میسر نہیں آتی اور جو کچھ میسر آتی ہے خریداروں کے حق میں اس کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ الغرض قلت و ناداری کا دور شروع ہو جاتا ہے نوبت یہ کہ نہ تن بھر کپڑا نہ پیٹ بھر روٹی اس مصیبت میں نظم برقرار رکھنے کے لئے طرح طرح کی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں جن میں عام تدبیر آج کل راشن کہلاتی ہے یعنی یہ کہ فی الجملہ سامان کم ہے تو نگرانی لابد ہے کہ کوئی حصہ سے زیادہ نہ لے سکے سب کو مطلوبہ سامان تھوڑا تھوڑا میسر آتا ہے لیکن سامان ہی باقی نہ رہے یا جنگ کے واسطے مختص ہو جائے تو پھر عوام کو کیا میسر آئے۔ بہر حال راشن سے بدنظمی میں ایک نظم نظر آنے لگتا ہے اور اس کے سوا چارہ کار بھی کیا ہے۔

جہاں زراعت جاری رہ سکے کاشتکار کو خاصی آمدنی حاصل ہو سکتی ہے کہ پیداوار کی مانگ ہے اور قیمتیں بڑھی ہوئی ہیں۔ جنگ کی ضرورتوں سے صنعت و حرفت کے کام بھی پھیل رہے ہیں۔ مزدوروں کی اجرتیں

میں بہ شرط گنجایش کم و بیش اضافہ ہو سکتا ہے اور ہو رہا ہے لیکن سرکاری ملازموں کو بالعموم گرانی کا پورا بار برداشت کرنا پڑتا ہے بلکہ الٹا خوف لگا رہتا ہے کہ سرکاری مالیہ میں خدانخواستہ کمی آئے یا جنگی مصارف کا تناسب بڑھ جائے تو کہیں الٹی تخفیف ماہوار کی نوبت نہ آئے تاہم کم تنخواہ ملازمین کو گرانی کا جو تھوڑا بہت الاؤنس ملتا ہے اس سے کچھ نہ کچھ ان کی تسلی ہو جاتی ہے ۔

لیکن شکایت کی کوئی گنجایش نہیں دشواری کے موقعوں پر صبر و تحمل سے ادا ہو سکے تو گرم جوشی سے ایثار کرنا قومی مفاد کے واسطے لازم ہے ۔ البتہ یہ ایثار حصہ رسد عام ہونا شرط ہے چنانچہ ہر قوم اپنی اپنی حیثیت اور ہمت کے موافق اپنے اپنے ملک کے واسطے جانی و مالی ایثار دکھا رہی ہے لیکن وہی ایثار ایثار ہے اور اسی ایثار میں برکت ہے جو جبر و بددلی سے نہیں بلکہ صبر و تحمل سے برداشت کیا جائے اور اگر فطری تعلق سے گرم جوشی پیدا ہو جائے تو پھر کیا کہنا لیکن فطری تعلق کے بغیر یہ صورت ممکن نہیں ۔

تجار و ساہوکار

ایثار کے معاملہ میں تجار و ساہوکار کا سوال پیچیدہ ہے ۔ معمولی حالات میں طلب و رسد کے کسی معاشی قانون کے بموجب اشیا کی قیمتیں بہ رضامندی فریقین قرار پاتی ہیں ۔ چنانچہ قدر و قیمت کے مسائل معاشیات میں خاص علمی اور عملی اہمیت رکھتے ہیں ۔ لیکن جبکہ عدم مداخلت کا مسلک ترک ہو کر معاشی زندگی کے اکثر بلکہ تقریباً تمام شعبوں پر سرکاری مداخلت و نگرانی کا تسلط ہو جائے تو پھر قیمتیں بھی معاشی اصول و قوانین سے آزاد ہو جاتی ہیں جہاں سرکاری حکم سے مقرر رہتی ہیں وہاں طرح طرح سے گریز کی راہ نکالتی ہیں جہاں مقرر نہیں وہاں من مانے اضافے پاتی ہیں جب مال کی قلت ہو اور خریدار بیقرار ہوں تو دکاندار جس قدر بھی قیمت وصول کریں کم ہے ۔ چنانچہ بے قدر گنجایش ہر طرف یہی عمل جاری ہے تاجروں کی عید ہے پیسہ کا مال روپیوں میں اور روپیوں کا مال اشرفیوں میں فروخت ہو رہا ہے عوام زیر بار ہو رہے ہیں ۔ تاجر اپنی اپنی خرید کے حساب سے غیر معمولی نفع کما رہے ہیں ۔ لیکن ایسی نفع اندوزی نہ صرف عام ایثار کے منافی ہے بلکہ مصلحت اندیشی کے بھی خلاف ہے جس زمانہ میں دولت بڑھ رہی ہے اسی زمانہ میں خوشنودی عامہ حاصل رہنا بھی ضروری ہے اور اس کے واسطے ایثار و ہمدردی شرط ہے ۔ تجار اتحاد کر کے کوئی معتدل طریق اختیار کریں تو خریدار و دکاندار سب کے حق میں بہتر ہوگا ۔

رہا بجانب سرکار قیمتیں مقرر ہونے کا سوال تو اس اعتبار سے انسانی ضروریات کی چار قسمیں ہیں، ضروریات حیات، ضروریات کارکردگی، ضروریات راحت، ضروریات عیش و عشرت، ہر ایک کی نوعیت نام سے ظاہر ہے مزید تفصیل کی گنجایش نہیں۔ فطری قانون یہ ہے کہ ضروریات راحت اور ضروریات عیش و عشرت میں ربڑ کی طرح بست و کشاد ہے یعنے قیمت گھٹنے سے ان کی طلب بڑھتی ہے اور قیمت بڑھنے سے طلب گھٹتی ہے اس کے برعکس ضروریات حیات میں نیز ضروریات کارکردگی میں بھی بست و کشاد کم ہے۔ مثلاً پانی، غلہ، نمک، مرچ ایندھن دوا وغیرہ یہ ایسی ضروریات حیات ہیں کہ سستے ہونے پر ان کی طلب میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہو سکتا اور مہنگے ہونے پر بھی ان کی فروخت برابر جاری رہتی ہے گویا بڑی حد تک بلا لحاظ قیمت ان کی طلب مستقل ہے۔ پس رسد، طلب، مقامی حالات سب پیش نظر رکھ کر ایسی ضروریات کی قیمت مقرر کر دینا، رفاہ عامہ کے مد نظر بہت ضروری ہے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ ان کی قیمتیں حد سے تجاوز کر جائیں اور عوام جو ان کی خریدی پر مجبور رہیں حد درجہ زیر بار ہوں چنانچہ ادویہ کی قیمتیں بہت توجہ طلب ہیں دیگر ضروریات کی قیمتیں اول تو خود ہی طلب گھٹنے کے خوف سے کسی نہ کسی حد تک اعتدال پر رہتی ہیں دوسرے بہتر صورت یہ ہے کہ خود تاجر ہی دور اندیشی سے کام لے کر نفع اندوزی میں اعتدال ملحوظ رکھیں اور اپنی ہمدردی و ایثار سے عوام کی خوشنودی ملحوظ رکھیں وہ بھی وقت پر کام آنے والی دولت ہے۔

ساہوکاروں کو تاجروں سے بھی زیادہ عوام کے ساتھ ہمدردی اور ایثار دکھلانے کی ضرورت ہے کہ یہ طبقہ فی الجملہ نقد رقم کا مالک اور محافظ مانا جاتا ہے۔ گو بالعموم قرض دے کر سود سے دولت کماتا ہے تاہم کاروبار میں بھی اس طبقے سے بہت مدد ملتی ہے اور خیر خیرات میں یہ طبقہ بالعموم اچھی فیاضی دکھاتا ہے ملکی ترقی کے واسطے ضروری ہے کہ عوام کے تعلقات اس طبقہ کے ساتھ بھی خوشگوار رہیں یہ تو فرمایش بیجا ہوگی کہ جان بوجھ کر دہ قرضوں میں جو کمی ہے نقصان اٹھائے، پھر بھی معتبر قرض خواہوں کی مجبوریوں سے بیجا فائدہ نہ اٹھانا چاہیے کہ سود ہی سود میں ان کا کام تمام ہو جائے کہ اس سے بدد لی پیدا ہونا یقینی ہے۔ آج کل خردہ اور چلر کا جو قحط پڑا ہوا ہے یہ بھی ساہوکاروں کی تنگ نظری ہے۔ اول تو گلانے میں یا تبادلہ گھٹانے میں چنداں فائدہ نہیں اور بالفرض فائدہ ہو بھی تو وہ رفاہ عامہ کے منافی ہے۔ تھوڑے فائدہ کی لالچ میں

بہت سی ناگواری اپنے ذمہ لینا کوئی اچھا ہو یا نہیں ہے۔

تجارت میں عام طور پر اور روپے پیسے کے لین دین میں خاص طور پر تاجروں اور ساہوکاروں کی بھیڑ چال مشہور ہے اور ترقی یافتہ ممالک میں بھی یہی رجحان موجود ہے۔ جب بھیڑ چال شروع ہوتی ہے تو کسی غور و فکر کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی۔ مثال اتباع کے واسطے کافی سمجھی جاتی ہے۔ جنگ کی افواہوں سے یہ بھیڑ چال بہت عام ہو جاتی ہے یوں تو انسان کو سب ہی دولت عزیز ہے لیکن روپیہ پیسہ کی محبت ہو تو بہت قوی ہوتی ہے۔ جنگ و بدامنی کے زمانہ میں روپیہ ہر طرف سے سمٹ کر اپنے اپنے مقام پر جمع ہونے لگتا ہے لوگوں کو اس کی جدائی خلاف احتیاط معلوم ہوتی ہے اس سبب سے بھی بازار میں روپیہ پیسہ کی قلت ہو جاتی ہے۔ اس کے اور بھی اسباب ہو سکتے ہیں لیکن یہاں تفصیلات کی ضرورت نہیں۔ بہرحال تاجروں اور ساہوکاروں پر بھی دوران جنگ میں زمانہ کی خاص ذمہ داری عاید ہوتی ہے اور ان سے بھی حسب حیثیت ایثار و ہمدردی کی توقع کی جاتی ہے۔

خلاصہ

انسانی زندگی تمام تر گورکھ دھندا ہے جس کا ادراک بہت دشوار ہے اور درمیان کے بیشمار حلقے ایک دوسرے میں داخل ہیں کہ جہاں تک نظر جاتی ہے جال ہی جال نظر آتا ہے پس کسی بحث میں احاطہ کامل البتہ یہ ممکن ہے کہ موقع محل کے لحاظ سے کسی بحث کے چند خاص پہلو اجمال یا تفصیل کے ساتھ بیان ہو جائیں لیکن ساتھ ہی لازم ہے کہ متصلہ نکات نظر انداز ہو جائیں ورنہ سلسلہ لامتناہی کیونکر ختم ہو سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے معاشی نقطۂ نظر سے حالات حاضرہ ایک بہت ہی سادہ اور سرسری عام فہم خاکہ اختصار سے پیش کیا۔ پھر بھی خطبہ شاید زیادہ طویل ہو گیا۔

شکریہ

بہرحال خدا کا شکر ہے کہ اعلیٰ حضرت حکیم السیاست آصف جاہ سابع خلد اللہ ملکہٗ کی حکمرانی میں یہ ملک فتنہ و فساد سے بہت کچھ محفوظ ہے البتہ جنگ کے جو عالمگیر اثرات ہیں حصہ رسدان کو برداشت کرنا ناگزیر ہے اور سلطنت برطانیہ کا یار وفادار دار جو امداد و اعانت کا طریق اختیار فرمائے رعایا ہر بھی مستعدی سے

اس کا اتباع واجب ہے۔ چنانچہ مملکت آصفیہ سے جو امداد ہوتی رہی اور ہو رہی ہے وہ کسی تشریح کی محتاج نہیں ہے، ہمیشہ سے اب تک اس کا اعتراف ہو رہا ہے۔ مملکت کی فلاح و بہبود اور گوناگوں ترقیات کی جو شرط سب سے مقدم ہے وہ مرکز پر استقامت ہے۔ بارگاہ آصفی جو ملک کا واحد مرکز ہے اس کے مرکز کے تحفظ و استحکام میں جس قدر بھی کوشش صرف ہو کم ہے اور بالفرض اگر کوئی تحریک بال برابر بھی اس مرکزیت میں تقسیم و تفریق پیدا کرنے کا رجحان ظاہر کرے تو وہ ملک کے حق میں سراسر سم ہے۔ بارگاہ آصفی کے ظل عاطفت میں خدا کرے ملک دن دونی رات چوگنی ترقی کرے اور یہ دعا سب کے ورد زبان رہے۔ ؎

تا ابد خالق عالم یہ ریاست رکھے ⁂ تجھ کو عثمان بصد اجلال سلامت رکھے

آل و اولاد کو اللہ دے عمر خضری ⁂ ان سے آباد ترا خانۂ دولت رکھے

آمین ثم آمین

تحریک اظہار عقیدت

خطبۂ صدارت کے ختم ہونے پر جناب مولوی میر اکبر علیخاں صاحب نے حسب ذیل تحریک عقیدت پیش کی :-

"مالک محروسہ سرکار عالی کی یہ پانچویں معاشی کانفرنس بہ کمال ادب و احترام اپنے آقائے ولینعمت سلطان العلوم اعلیحضرت بندگان عالی خلد اللہ ملکہ کی بارگاہ میں جذبات عقیدت و وفاداری پیش کرنے کی عزت حاصل کرتی ہے حضرت پیرومرشد مدظلہ العالی کی دوربین نظر نے یہ محسوس فرمایا کہ ملک کی ترقی و خوشحالی کا اصل راز معاشی ترقی میں مضمر ہے۔ اور اس غرض کے لئے نمائش مصنوعات ملکی کے افتتاحیہ خطبۂ عالیہ میں جو ارشادات بالخصوص سرمایہ دار طبقہ کے متعلق فرمائے ہیں اس کے متعلق یہ کانفرنس بہ صد ادب ہدیہ تشکر پیش کرتی اور یقین واثق رکھتی ہے کہ اس شاہانہ رہنمائی و سرپرستی سے معاشی ترقی کے ایسے وسائل بہت جلد مہیا ہو جائیں گے جن سے زمانہ حال کے گوناگوں مشکلات رفع ہو سکیں اور سرزمین دکن زیر سایہ ہمایونی دیگر ترقی یافتہ ممالک کے دوش بدوش بام ترقی پر پہنچ سکے"۔

حاضرین نے اس کو احتراماً استادہ ہو کر منظور کیا۔

رپورٹ معاشی کمیٹی

۱۳۵۱ف کی کارگزاری

(جو مولوی خواجہ حمید احمد صاحب معتمد معاشی کمیٹی نے پانچویں معاشی کانفرنس میں پڑھی)

معاشی کمیٹی حیدرآباد کی تشکیل دراصل انجمن طیلسانین عثمانیہ کی رہین منت ہے لیکن ممالک محروسہ سرکار عالی کی معاشی جدوجہد میں عثمانین کے ساتھ ابنائے ملک کے تعاون عمل نے اس کمیٹی کو تمام ملک کے اجتماعی معاشی مسائل کے مرکزی ادارہ کا درجہ عطا کر دیا ہے جس میں بلا قید مذہب و ملت ملک کے تمام مکاتیب خیال کے افراد تقریباً ۸ سال سے باہم مگر ملک کی مرفہ الحالی اور معاشی ترقی کے لئے کوشاں ہیں۔ چنانچہ اس کمیٹی کے عملی مظاہرے نمائش مصنوعات ملکی کی شکل میں پانچ سال سے اہل ملک سے خراج تحسین حاصل کرتے ہیں۔ اور ان کے ساتھ معاشی کانفرنس اس کی علمی تحقیقات اور فنی تجاویز کی داغ بیل ڈال رہی ہیں یہی وجہ ہے اس کانفرنس کو سرکاری اور غیر سرکاری طبقوں کی پوری امداد حاصل ہے اور محکمہ تحصیل معیشت کی جانب سے مولوی خان فضل محمد خان صاحب کی تحریک کی بنا پر اس کانفرنس کو دو ہزار روپیہ سالانہ کی امداد مل رہی ہے اس وقت معاشی کمیٹی کی سال ۱۳۵۱ فصلی کی کارگذاری کی رپورٹ پیش کی جا رہی ہے دوران سال کے لئے جو مجلس عاملہ تشکیل پائی اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

صدر: مولوی میر اکبر علی خان صاحب بی، اے، ال، ال، بی بارایٹ لا۔

نائب صدر: مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی پروفیسر جامعہ عثمانیہ۔

معتمد: مولوی خواجہ حمید احمد صاحب بی اے

نائب معتمد: مولوی شہاب الدین صاحب ید اللہی

خازن: مادھو راؤ صاحب لوری منیجر حیدرآباد کواپریٹیو بنک

اراکین! مولوی محمد غوث صاحب ۔ مولوی عبدالعلی صاحب ۔ مولوی جمیل احمد صاحب فاروقی، رگھوبیر لال صاحب، راجہ گر دہار صاحب، سید محمد عسکری جعفری صاحب. مولوی صابر علی صاحب ہاشمی مولوی عزالدین صاحب، مولوی محمد علی صاحب موسوی ۔ خواجہ محمد احمد صاحب نائب ناظم آثار قدیمہ،

سال زیر رپورٹ میں جو کام انجام پائے ان کی مختصر کیفیت حسب ذیل عنوانات کے تحت درج ذیل ہے:

۱۔ چوتھی نمائش مصنوعات ملکی کا انعقاد ۲۔ چوتھی معاشی کانفرنس کا انعقاد

۳۔ معاشی سروے کا کام ۴۔ معاشی کتب خانہ کا قیام

۵۔ زرعی کمیٹی کی تشکیل

چوتھی نمائش مصنوعات

حسب فرمان خسروی چوتھی نمائش مصنوعات ملکی کا انعقاد یکم ذیحجہ سنہ ۱۳۶۱ھ سے کیا گیا ہے۔ جو ۲۹ ذیحجہ سنہ ۱۳۶۰ھ تک جاری رہی اس نمائش کا افتتاح عالیجناب کرنل نواب سر محمد احمد سعید خاں بہادر صدر اعظم نے فرمایا اور نواب میر اکبر علیخاں صاحب بار ایٹ لا صدر معاشی کمیٹی و مجلس نمائش نے سپاسنامہ پیش کیا یہ نمائش پہلے تین سالوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ کامیاب رہی۔ چنانچہ اس تقریب میں جو پروانہ خوشنودی شاہانہ سرفراز کیا گیا ہے زیب قرطاس ہے۔

"اس سال بھی میں نے سالانہ نمائش صنعت ملکی باغ عامہ کا بغور مطالعہ کیا اور اس امر سے محظوظ ہوا کہ الحمد للہ ہر سال اس میں بہت ترقی نمایاں ہے جو کہ ایک قابل اطمینان امر ہے اور ملک کیلئے ایک فال نیک ہے! متعلقہ عہدہ داران جو کہ اپنے فرائض کی بجا آوری میں منہمک یا مستعد دکھائی دے رہے ہیں یہ بھی ضرور قابل ستائش ہے کہ بیداری کے آثار چوطرف رونما ہیں اور اگر واقعات کی رفتار یہی رہی تو وہ زمانہ دور نہیں ہے کہ ملک خوش حالی اور ارتقا کے منازل سرعت سے طے کرتے ہوئے کہاں سے کہاں پہونچ جائیگا جس کی تمنا ہر بہی خواہ ریاست کو ہے۔"

بقلم آصف سابع ۲۹۔ ذیحجہ سنہ ۱۳۶۰ ف

حضرت ولی عہد بہادر نے بھی اپنے پیام گرامی سے اراکین کمیٹی کی سعی پیہم کو ممتاز معزز فرمایا ا نمائش میں (۲۰۰) اسٹال قائم ہوئے۔ دو لاکھ سے زائد مال فروخت ہوا تین لاکھ اشخاص نے نمائش دیکھی جس میں بیرونی مشاہیر اور کانفرنس کے اراکین بھی شامل تھے۔ حضرت اقدس اعلیٰ نے دو روز نمائش کا معائنہ فرماکر عثمانیہ کلب اور نمائش گھر کے تعمیر کا حکم محکم صادر فرمایا چونکہ نمائش کا انتظام مجلس نمائش معاشی کمیٹی کے سپرد ہے جس کو تحت قانون کمیٹی ایک انجمن کی شکل میں رجسٹر کیا گیا ہے۔ اس لئے تفصیلی حالات اور حسابات مجلس نمائش کی رپورٹ سے ظاہر ہو سکتے ہیں۔

چوتھی معاشی کانفرنس

چوتھی معاشی کانفرنس کا انعقاد بتاریخ ۱۰-۱۱- اسفندار ۱۳۵۱ف عمل میں آیا۔ اس کانفرنس کے اجلاس اوّل کی صدارت مولوی عبدالرحمن خان صاحب سابق صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ نے فرمائی اور اجلاس دوم کی صدارت مولوی لیاقت اللہ خان صاحب معتمد فینانس نے فرمائی اس کا خطبہ استقبالیہ مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی نائب صدر معاشی کمیٹی نے پڑھا خطبات صدارت کے علاوہ کانفرنس میں جو مقالہ جات پڑھے گئے۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

(۱) تنظیم دیہی کے بعض معاشی پہلو۔ مولوی برہان الدین حسین صاحب مددگار زراعت راکور۔

(۲) ممالک سرکار عالی کے معاشی اور صنعتی مسائل پر ایک سرسری نظر۔ جناب نور داؤد صاحب بی کام منیجر کوآپریٹو انشورنس سوسائٹی

(۳) زرعی قرضہ۔ مولوی ناصر علی صاحب لکچرار معاشیات

(۴) چینی ظروف و چینی کی اشیاء۔ ڈاکٹر محمد حسین صاحب منیجنگ ڈائرکٹر تاج کلے ورکس فیاکٹری

(۵) زرعی مزدوروں سے متعلق چند مسائل۔ مولوی اختر حسین صاحب لکچرار معاشیات جامعہ عثمانیہ

(۶) مملکت آصفیہ کی قدیم و جدید صنعتیں۔ جناب رائے گروچرن صاحب سکسینہ۔

(۷) چند آسان صنعتیں۔ مولوی سالمین بن عمر صاحب۔

(۸) دور آصفی میں ممالک محروسہ سرکار عالی کی معاشی تاریخ۔ مولوی انوار احمد صاحب صدیقی۔

(۹) حیدرآباد دیہی تنظیم کی ترقی۔ مولوی رضی الدین صاحب ایم اے ایل ایس شریک ناظم امداد باہمی

(۱۰) حیدرآباد میں عورتوں کا معاشی استحصال۔ مولوی غلام دستگیر صاحب رشید ایم اے لکچرار نظام کالج۔

(۱۱) حیدرآباد میں قوانین کارخانجات اور ان کا نظم و نسق۔ مولوی عبدالقادر صاحب بی ایس سی پروفیسر معاشیات

(۱۲) حیدرآباد میں بے روزگاری کا حل۔ صابر علی صاحب ہاشمی مددگار معتمد تحقیق معیشت۔

(۱۳) .... جناب رام نرسو صاحب لکچرار معاشیات نظام کالج

(۱۴) .... جناب کیشو آینگار صاحب پروفیسر نظام کالج

(۱۵) .... مولوی محمد بن علی صاحب

(۱۶) حیدرآباد کے چند تجارتی مسائل۔ مولوی حاتم علی صاحب مددگار مارکیٹنگ افسر۔

(۱۷) حیدرآباد میں قومی تنظیم اور معاشی لائحہ عمل کی ضرورت۔ مولوی خواجہ حمید احمد صاحب مددگار اعداد و شمار و معتمد معاشی کمیٹی۔

علاوہ ازیں کانفرنس میں جو تحریکات منظور ہوئیں وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ ممالک محروسہ سرکار عالی کی یہ چوتھی معاشی کانفرنس بارگاہ خسروی میں اپنی غیر متزلزل اور کامل ذی شعاری کا اظہار کرتی ہے ملکی معاشی ترقیات کیلئے جو توجہ شاہانہ مبذول ہے نیز مصنوعات ملکی کی جو سرپرستی آقائے ولی نعمت کی تشریف آوری فرمائی جارہی ہے وہ نہ صرف کارکنان معاشی کمیٹی اور نمائش کمیٹی کیلئے باعث عزت ہے بلکہ ممالک محروسہ سرکار عالی کی صنعتی احیا کی مدد و معاون کرجس کے لئے یہ معاشی کانفرنس بصد ادب اپنے جذبات تشکر و عقیدت پیش کرتی ہے۔

۲۔ یہ کانفرنس اس امر کی ضرورت شدت سے محسوس کرتی ہے کہ حکومت سرکار عالی بہت جلد جامعہ عثمانیہ میں زراعتی کالج کو قایم فرمادے تاکہ زراعتی علم کے معیار میں اضافہ ہوا اور عملی طور پر زراعت کے کاروبار میں مفید نتایج پیدا ہوسکیں۔

۳۔ اس کانفرنس کی رائے میں مجوزہ فیملی پنشن فنڈ کا قیام سرکار عالی کی فیاضانہ روایات پرورشی میں ایک یادگار اضافہ ثابت ہوگا بشرطیکہ اس فنڈ سے ملازمین کے پسماندگان کے سوا خود ملازمین کو مستفید ہونیکا موقع دیا جائے۔

۴۔ اس کانفرنس کی رائے میں حکومت کا مالیہ زیادہ سے زیادہ مستحکم کرنے کے لئے اور تعمیری لائحہ عمل کی تکمیل کے لئے انکم ٹیکس کا نفاذ ضروری ہے۔

۵۔ اس کانفرنس کی نظر میں موجودہ قحط اور جنگ کے لحاظ سے حکومت کا تیزی کے ساتھ درآمد برآمد پر قابو پانے کی کوشش کرنا ضروری ہے۔

۶ - اس کانفرنس کی رائے میں حکومت سرکار عالی کی طرف سے مناسب حال معاشی لائحۂ عمل کی ترتیب و نفاذ جلد از جلد ضروری ہے۔

۷ - معاشی کانفرنس حکومت سرکار عالی کو متوجہ کرتی ہے کہ صنعتی ریسرچ بورڈ میں معاشی کمیٹی کے نمایندہ کو جگہ دی جائے تاکہ معاشیات میں خاص تربیت یافتہ جماعت کا تعاون قائم رہے۔

۸ - اس کانفرنس کی رائے میں اسٹیٹ بنک کے قیام سے ایک اہم معاشی ضرورت پوری ہوئی۔

اس کانفرنس میں ممالک محروسہ سرکار عالی کے ممتاز شخصیتوں کے علاوہ بیرون ممالک محروسہ سرکار عالی کے بھی معزز مہمانوں نے شرکت فرمائی جس میں صوبہ سندھ کے وزراء قابل ذکر ہیں۔

چونکہ چوتھی معاشی کانفرنس کی مکمل روئداد شائع کی جارہی ہے اس لئے کانفرنس کے متعلق مزید تفصیلات، روئداد مذکور سے معلوم کئے جاسکتے ہیں۔

معاشی سروے کا کام

معاشی کمیٹی کے تحت ایک معاشی سروے کمیٹی کی تشکیل عمل میں لائی گئی جس کے لئے حسب ذیل شعبے قائم کئے گئے،

شعبۂ زرعی، شعبۂ معدنی، شعبۂ تجارتی، شعبۂ صنعتی، شعبۂ مالیاتی۔ اس سروے میں جو مواد جمع کیا گیا اور تحریکات محکمۂ سرکار میں پیش ہوئیں ان کی ایک تفصیلی کیفیت ہے۔ اس موقع پر چند نمایاں کاموں کی جانب اشارہ کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

تحریک معاشی سروے کمیٹی برائے قیام کارخانہ موٹر سازی

" " " " برائے قیام کارخانہ ٹوپی سازی

" " " " برائے قیام کارخانہ پنسل سازی

" " " " برائے امداد اعانت صابن سازی و دیا سلائی

معاشی سروے کمیٹی نے اجارہ داری مجلس مصنوعات کے قیام کے اثرات پر غور و خوض کرکے اپنی رائے سے حکومت سرکار عالی کو مطلع کیا۔

انڈین انڈسٹریل ریسرچ بورڈ کے حیدرآباد کے اجلاس کے موقع پر بھی کمیٹی مذکور نے ایک تحریک حکومت سرکار عالی

کی خدمت میں پیش کی جس کے ذریعہ حکومت سے یہ خواہش ظاہر کی کہ اس کے نتائج سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا جائے۔

کتب خانہ

ملک کی بڑھتی ہوئی معاشی ضروریات کا خیال کرتے ہوئے معاشی کمیٹی ایک معاشی کتب خانہ کے قائم کرنے کے لئے کوشاں ہے اور اس سلسلہ میں کمیٹی کی جانب سے نئی کتب کے حصول کی مہم شروع کر دی گئی ہے لیکن معاشی کمیٹی کے مالی وسائل ابھی اس قابل نہیں ہوئے ہیں کہ وہ کسی موزوں عمارات میں اس کا افتتاح کر سکے۔ معاشی کمیٹی کو محکمہ تحصیل معیشت کی جانب سے دو ہزار کی جو امداد مل رہی ہے وہ اس کے دفتری انتظامات اور ذیلی کمیٹیوں کی امداد میں صرف ہو رہی ہے نئی کتب کی خریدی اور کتب خانے کے لئے الماریوں کی خریدی کے لئے کمیٹی کو لازمی طور پر حکومت اور ملک کے علم دوست حضرات کی بلا دریغ مالی امداد کی ضرورت ہے۔

مجلہ معاشیات

کتب خانہ کے ساتھ معاشی کمیٹی کے علمی ارگن یعنے مجلہ معاشیات کے اجرائی کا مسئلہ بھی معاشی کمیٹی کے زیر غور ہے۔

زرعی انجمن

زرعی ترقی کے ضمن میں معاشی کمیٹی کے پیش نظر ایک زرعی کمیٹی کی تشکیل کا سوال بھی ہے جس کے لئے منضبط قواعد ترتیب دیئے جا رہے ہیں۔ توقع ہے کہ سال رواں میں بہت جلد ایک زرعی کمیٹی کا نیام عمل میں آئیگا۔ اور ملک کے زرعی وسائل کا عملی طور پر جائزہ لیا جا سکے گا۔

غرض سال ۱۳۵۱ف میں معاشی کمیٹی کی سرگرمیوں کی ایک مختصر روداد بیان کر دی گئی ہے اور اب ۱۳۵۲ف کے لئے کمیٹی کا پروگرام روبہ عمل ہے جس کے تحت پانچویں نمایش مصنوعات ملکی بحمد اللہ خیر و خوبی سے تکمیل کو پہونچ رہی ہے اور پانچویں معاشی کانفرنس کا آغاز ہو رہا ہے۔ اور ملک کی بہت سی امیدیں اس سے وابستہ ہیں۔

مسئلہ سرمایۂ صنعتی

از جناب نواب احسن یار جنگ بہادر

تمام ہندوستان میں سرمایہ صنعتی کے متعلق عام رجحان بوجہ سالہا سال کی غربت و حکومت کی دست نگری کے یہ رہا کہ سرمایہ داروں نے اپنی قوت بازو و تدبیر پر بھروسہ نہیں کیا اور محض خود غرضی و اندیشہ نقصان کی وجہ سے کمر ہمت نہیں باندھی۔ ہمیشہ اس امید میں رہے کہ حکومت شل اور شعبوں کے صنعتوں کو بھی قائم کرے۔ دنیا میں ہر ایک ملک کی صنعتی ترقی قوم کے مالدار افراد و سرمایہ داروں سے ہوتی ہے نہ کہ محض حکومت کی امداد سے۔

ان ہی خیالات عامہ کی وجہ سے ہماری حکومت نے صنعتی ترقی کے لئے سرمایہ صنعتی یعنی (انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ) ایک کروڑ روپیہ سے قائم کیا۔ اس فنڈ کا اصلی مقصد یہ ہے کہ مختلف صنعتیں جلد از جلد ملک میں قائم ہو جائیں اور فراہمی سرمایہ سے متعلق جو دقتیں بوجہ عام رجحان مذکرہ بالا پیش آتی ہیں ان کا انسداد ہو جائے اور صناعوں کو کافی امداد بطور قرض یا بہ خریدی حصص کمپنی ہو سکے اس سرمایہ صنعتی سے سرکار کا مقصد محض نفع اندوزی نہ ہونا چاہیئے بلکہ مختلف ضروری صنعتوں کا قیام۔ افسوس کہ اس پالیسی پر عمل جیسا کہ ہونا چاہیئے نہیں ہو رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ باوجود ایک کثیر صنعتی فنڈ کے سرمایہ کی کمی محسوس ہو رہی ہے اس میں شک نہیں کہ اس فنڈ کی وجہ سے بہت سے صنعتی کارخانہ اور کمپنیاں قائم ہو گئی ہیں مثال کے طور پر حسب ذیل کارخانے قابل ذکر ہیں

(۱) سمنٹ سازی (۲) شکر سازی (۳) الکحل صنعتی (۴) کاغذ سازی (۵) عثمان شاہی ملز۔ برائے پارچہ سازی (۶) اعظم جاہی ملز برائے پارچہ سازی (۷) سگریٹ سازی (۸) ان کے علاوہ کئی چھوٹی صنعتیں مثلاً بٹن سازی و رنگسازی وغیرہ۔

ان صنعتوں میں حکومت نے کافی سرمایہ بطور خریدی حصص یا قرض لگا دیا ہے یہ صنعتیں اچھی طرح قائم ہو چکی ہیں اور کافی نفع سرکار کو ہو رہا ہے مگر جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے منشائے حکومت نفع اندوزی نہ ہونا چاہیئے

اب یہ مناسب ہے کہ حکومت ان صنعتوں میں سے جو اپنے پیر پر کھڑے ہونے کے قابل ہو گئی ہیں اپنا سرمایہ جو بطور حصص ان کمپنیوں میں لگایا ہے وہ نکال لے اور اپنے حصص جن کی قیمتیں اس وقت کافی بڑھی ہوئی ہیں رفتہ رفتہ فروخت کر دے تاکہ دوسرے جدید ضروری صنعتوں کے لئے سرمایہ اسی فنڈ سے فراہم ہو جائے اور بغیر کسی جدید گنجائش کے صنعتوں کی ترقی میں اضافہ ہوتا رہے اس طریقہ عمل پر حکومت کو فوری توجہ کرنا ضروری ہے ۔

(۲) موجودہ جنگ صنعتی ترقی کے لئے ایک فرشتۂ رحمت ہے عدو شرے برانگیزد کہ خیرے ما در آں باشد۔ فراہمی اشیائے احتیاج کی مشکلات کی وجہ سے عام بیداری ملک میں پیدا ہو گئی ہے اور یہی وقت ہے کہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے دیگر ممالک میں بھی غیر معمولی صنعتی ترقیاں ایسی ہی آفات کے بعد رونما ہوئیں ۔ لہذا یہ نہایت ضروری ہے کہ اس وقت ایک لائحہ عمل بنیادی صنعتوں کے قیام کے لئے فوراً مرتب کیا جائے اور حسب ذیل بنیادی صنعتوں کے اجرائی کی جانب ہمہ تن کوشش کی جائے ۔

۱۔ فراہمی ارزاں قوت برقی بہ ذریعہ آب یا بھاپ ۔ (۲) فولاد آہنی کی تیاری (۳) بنیادی اشیائے کیمیائی تیاری (۴) انجن و آلات صنعتی و زراعتی کی تیاری ۔

(۳) فراہمی ارزاں قوت برقی کی نسبت یہ عرض ہے کہ حکومت نے باوجود معتد بہ مواقع ملک میں ہونے کے ابھی تک کافی توجہ نہیں کی ہے ۔ حکومت میسور کی صنعتی ترقی کا راز فراہمی ارزاں قوت برقی ہے جنگ عظیم کے بعد مملکت کینیڈا میں جو غیر معمولی صنعتی ترقی ہوئی اس کی بھی اصلی وجہ قوت برقی تھی ۔ اسی طرح مملکت اٹلی میں بھی ترقی کا باعث فراہمی قوت برقی ہوا ۔ ہمارے ملک میں بفضلہ تعالیٰ پانچ بڑے بڑے دریا جاری ہیں اور نیز کوئلہ کے معدن موجود ۔ ایسے عمدہ اور کافی وسائل موجود ہوتے ہوئے کوئی چھوٹی چھوٹی تجویز بھی اس وقت تک عمل میں نہیں آئی ۔ یہاں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ باوجود مصائب جنگ میسور نے اس وقت ساڑھے تین کروڑ لاگت کی تجویز کو جاری کر دیا ہے اور امید ہے کہ بدوران جنگ تکمیل کو پہنچ جائے مگر یہاں صرف (۵۰) لاکھ کی ایک چھوٹی سی اسکیم محض جنگ کے عذرات کی وجہ سے جاری نہ ہو سکی ۔

ہمارے ملک میں تخمیناً تین چار لاکھ گھوڑوں کی برقی قوت (یعنی ہارس پاور) بہ ذریعہ آب پیدا ہو سکتی ہے اور نیز ان تجاویز کے تحت تقریباً ۳۰ ۔ ۴۰ لاکھ ایکڑ زراعت تری ممکن ہے ۔

(۴) فولاد و آہن کی تیاری کی نسبت یہ عرض ہے کہ ہمارے ملک میں تاریخ شاہد ہے کہ بہترین فولاد تیار ہوتا تھا اور ایک زمانہ تھا کہ ہماری حکومت توپیں اور فولادی ہتھیار تیار کر کے فرانسیسیوں اور انگریزی افواج کو دیتی تھی اور اب یہ حالت ہے کہ ہم چھوٹے سے چھوٹے فولادی ہتھیار اور آلات کے لئے محتاج اور دوسرے ملکوں کے دست نگر ہیں موجودہ جنگ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جس ملک میں فولاد فراہم نہ ہو سکے اس ملک کی حکومت کسی طرح قائم نہیں رہ سکتی علاوہ اس کے صنعتی ترقی بغیر مقامی فولاد و آہنی پیداوار کے ہرگز ممکن نہیں مگر یہ امر قابل ستایش نہیں کہ حکومت نے اس ضروری صنعت کے متعلق اب تک کافی توجہ نہیں فرمائی حالانکہ ریاست میسور نے باوجود مشکلات کے ایک عرصہ سے اور قبل از قبل اس صنعت کو قائم کیا اور ترقی دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت حکومت اور ملک کو کثیر فائدہ ہو رہا ہے اور صنعتی تعمیر میں سہولتیں مہیا ہیں۔

اضلاع عادل آباد و کریم نگر میں معدن آہنی ہماری مقامی ضروریات کے لئے کافی مقدار میں موجود ہیں اور بہ فضل خدا ان ہی مقامات کے قریب قوت برقابی بھی کافی پیمانہ پر مہیا ہو سکتی ہے نیز کوئلہ کی معدن بھی کچھ بعید فاصلہ پر نہیں ہے اس کے علاوہ ریاست بستر جو صرف گوداوری پار واقع ہے۔ وہ ہمارے کوئلہ کی معدن کتاڈم سے قریب ہے لاکھوں ٹن لوہے کا معدن موجود ہے۔ لہٰذا ضرورت اس کی ہے کہ ہماری حکومت اس بنیادی صنعت کی طرف فوری توجہ مبذول فرمائے۔

(۵) بنیادی اشیائے کیمیائی کی نسبت یہ عرض کرنا ہے کہ کوئی صنعت خواہ چھوٹی ہو یا بڑی بغیر اشیائے کیمیائی کے جاری نہیں ہو سکتی چنانچہ ٹاٹا نے (۵) کروڑ روپیے کے سرمایہ سے ریاست بڑودہ میں ایک وسیع کارخانہ قائم کیا ہے اور ہمارے یہاں ایک کروڑ کے سرمایہ سے ایک کارخانہ موسومہ "حیدرآباد کیمیکل اینڈ فرٹیلائزر لمیٹڈ" بہ مقام بیلم پلی، سرپور ٹانڈور کے قریب قائم کیا جا رہا ہے اور امید ہے کہ جلد بنیادی کیمیائی اشیاء جو اس وقت دوران جنگ میں تیار ہو سکتی ہیں فراہم ہو جائیں۔ اس صنعت میں بھی ریاست میسور اور بڑودہ نے ہماری حکومت سے قبل پیش قدمی کی اور اگر ہم جنگ سے پہلے اس صنعت کو قائم کر لیتے تو اس وقت جو مشکلات فراہمی اشیاء میں درپیش ہو رہی ہیں وہ رفع ہو جاتیں اور کثیر فائدہ ہوتا۔ یہ بھی ظاہر کر دینا مناسب ہے کہ یہ صنعت ترقی زراعت کیلئے بھی نہایت ضروری ہے کیونکہ کیمیاوی کھاد اس صنعت کی بدولت ملک میں ارزاں داموں پر

دستیاب ہو سکے گی۔

(۶) انجن و آلات صنعتی و زراعتی کی تیاری کا مسئلہ تمام ہندوستان کے لئے نہایت اہم ہے جب تک کہ کسی ملک میں مشنری و آلات جو صنعتی کارخانے کے لئے لازمی ہیں تیار نہ ہو سکیں اس کا دوسرے ممالک میں جہاں مشینیں اور آلات تیار ہوتے ہیں مقابلہ کرنا نہایت مشکل ہے چنانچہ جاپان کا راز ترقی یہی ہے کہ وہاں جتنی مشنری و آلات کی صنعتی کارخانوں میں ضرورت لاحق ہے وہ وہیں کے ملک میں تیار ہوتے ہیں تاکہ دوسرے ممالک کا دست نگر نہ رہنا پڑے جیسا کہ ہندوستان اس وقت ہے لہذا اس کی شدید ضرورت ہے کہ ایک ایسا کارخانہ ایسے مقام پر جہاں فولاد و آہن مہیا ہو سکے قائم کیا جائے جس میں ہم تمام کے بڑے بڑے مشین و انجن و آلات وغیرہ ہمارے ہی ملک میں تیار ہو سکیں۔

(۷) آخر میں یہ عرض کرتا ہوں کہ کسی ملک و قوم کی ترقی بغیر توازن زرعی و صنعتی ممکن نہیں اور یہ امر مسلمہ ہے کہ ہمارا ملک حقیقتاً زرعی ہے مگر اس کے معنے یہ نہیں کہ ہم محض فلاحین ہی رہیں اور جب تک کہ زرعی ترقی کے ساتھ ساتھ صنعتی ترقی بھی نہ کی جائے نتیجہ معاشی لحاظ سے ہرگز اچھا برآمد نہیں ہو سکتا۔ موجودہ جنگ میں اس کا ثبوت ظاہر ہو چکا ہے اور جو ملک محض صنعتی ہیں ان کو اس وقت غذا کی فراہمی میں کافی مشکلات لاحق ہو رہی ہیں اور اسی طرح جو ملک محض زراعتی ہیں ان کو بھی متعدد دشواریاں پیش آ رہی ہیں۔ لہذا توازن زرعی و صنعتی ایک حد تک قائم رکھنا فلاح و بہبودی ملک کے لئے نہایت لازمی ہے پس حکومت کو چاہیئے کہ اس اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھے اور نہ صرف زرعی ترقی کے لئے کوشاں رہے بلکہ صنعتی ترقی کے لئے بھی خاص طور سے ذرائع پیدا کرے۔ دنیا میں جو جنگ عظیم جاری ہے اس کی وجہ فطرت حیوانی یعنے بغض و حسد معاشی ہے کیونکہ ہر ایک حیوان اپنی بقائے زندگی کی کوشش میں رہتا ہے اور افسوس ہے کہ باوجود تعلیم و تربیت کے اس وقت انسان جو حقیقتاً حیوان ناطق ہے اپنے فطرتی اصول کی کارفرمائی میں بغیر کسی غور و فکر کے منہمک ہو کر ایک دوسرے کی تباہی میں کوشاں ہے اور صحیح معنوں میں زمرۂ انسانیت سے خارج۔ اس دور حیوانی کا علاج صرف ایک ہی ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ خالق مطلق نے جو اصول اخوت انسانی بہ ذریعہ مذاہب قائم کئے ہیں اس پر گامزن ہو جائے اور اپنے پروردگار کو کسی حالت میں فراموش نہ کرے۔

حیدرآباد میں صنعتی سرمایہ کا مسئلہ

از جناب مولوی خواجہ حمید احمد صاحب بی، اے (عثمانیہ) معتمد معاشی کمیٹی

حیدرآباد میں صنعتی ترقی کی صلاحیتوں اور مواقعوں کے باوجود اطمینان بخش طور پر صنعتی ترقی کا نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں کے صنعتی نظام میں ابھی وہ کاروباری تنظیم پیدا نہیں ہوئی ہے۔ جو صنعتی فروغ کے لئے از بس ضروری ہے اور کاروباری تنظیم کے لئے جہاں منظم آجروں کی ضرورت ہے وہاں صنعتی سرمایہ کا سوال اولین توجہ کا محتاج ہے۔

ہمارے ملک کے صنعتی مسائل کے ضمن میں اب تک جو رپورٹیں سرکاری غیر سرکاری مرتب ہوئیں ان میں صنعتی سرمایہ کی بابتہ بہت کم توجہ کی گئی ہے اور ہمیں کوئی ایسا مواد نہیں ملتا جس سے ہمارے سوالات کا کوئی تشفی بخش جواب مل سکے۔

تقریباً دس سال قبل ایک رپورٹ مولوی احمد محی الدین صاحب موجودہ ناظم تجارت و حرفت نے سرکاری طور پر مرتب کی تھی جس میں ان مسائل کی جانب کچھ مواد ملتا ہے۔ لیکن اس طویل عرصہ میں حالات بالکل بدل گئے ہیں اور ایک نئی رپورٹ کے بغیر مناسب طور پر کوئی عملی اقدام نہیں کیا جا سکتا ہے۔ مذکورۂ بالا امور کی بابتہ اشارۃً ظاہر کرتے ہوئے اس مسئلہ کی بابت صرف چند تجاویز پیش کرنے پر اکتفا کرنا ہوگا۔

ایک سرسری اندازہ کے مطابق ممالک محروسہ سرکار عالی کی بڑے پیمانہ کی صنعتوں میں فی الوقت ۱۰ کروڑ کے قریب سرمایہ مشغول ہے جس میں معتدبہ حصہ سرکار عالی کی امداد پر مشتمل ہے۔ جس کے چند اعداد ناظرین کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔

۶ فی صدی سنگارینی کالریز ڈبنچرز (۵۰۰۰۰) حصص شاہ آباد سمنٹ کمپنی (۱۲،۰۰۰۰۰)، عثمان شاہی ملز ڈبنچرز (۶۰۰۰۰۰) ایجنسی اعظم جاہی وعثمان شاہی ملز (۲۱۰۰۰۰۰) قرضہ اورنگ آباد ملز (۵۰۰۰۰۰) حصص عثمان شاہی ملز (۵۰۰۰۰۰) دکن ماہل لینڈ ہانگ کمپنی (۲۱۳۴۰۰) حیدرآباد اسپننگ ملز ڈبنچرز (۱۵۰۰۰۰) حصص حیدرآباد آئرن اینڈ اسٹیل ورکس لمیٹیڈ (۲۵۰۰۰۰) ڈبنچرز حیدرآباد کاٹن اینڈ

اسٹیل ورکس لمیٹڈ (۳۰،۰۰۰) حصص تمباکو کمپنی (۱۶۰۰۰) حصص اعظم جاہی ملز (۴۰۵۵۶۰۰) دکن ماربل اینڈ مائننگ ڈبنچرز (۲۲۵۰۰) دکن ماربل اینڈ مائننگ قرضہ (۶۹۹۹۹) حصص سرور پیپر ملز (۱۵۰۰۰۰) قرضہ سرور پیپر ملز (۱۵۰۰۰۰) قرضہ بہ اعظم جاہی ملز (۲۴۴۴۴۸) قرضہ عثمان شاہی ملز (۱۶۶۶۷۰) حصص شوگر فیکٹری (۳۶۰۹۵۰) قرضہ بہ شوگر فیکٹری — (۴۰۰،۲۳۳) عملہ برائے پاور الکحل پلانٹ (۶۶۰۸۰۰) حصص دکن گلور ملز (۲۵۰۰۰) چھوٹی صنعت کے لئے جو قرضہ جات دیئے گئے (۴۰۶۹۹۶)

مشترکہ سرمایہ دار کمپنیاں جو قانون کمپنی سرکار عالی کے تحت رجسٹر شدہ ہیں ان کی تعداد اب سو کے قریب ہوگئی ہے اور ان کا سرمایہ مجوزہ کی مقدار ۶ کروڑ کے قریب ہے جس میں سرکاری حصص کے قطع نظر عوام کے حصص کی مقدار تقریباً ۳ کروڑ کے قریب ہوتی ہے۔ بیرونی رجسٹر شدہ کمپنیوں کا سرمایہ اس وقت ممالک محروسہ سرکار عالی میں مشغول ہے اس کے متعلق کوئی صحیح مواد دستیاب نہ ہوسکا لیکن ایک عام تخمینہ کے مطابق بیرونی سرمایہ کی مقدار ۴ کروڑ سے کچھ زائد نہیں معلوم ہوتی۔

مشترکہ سرمایہ دار کمپنیوں کی بابت ہماری قلمرو کا مقابلہ بعض برطانوی ہند کی ریاستوں یا صوبوں کی کمپنیوں سے کیا جانا نامناسب نہ ہوگا جن کے اعداد حسب ذیل ہیں۔

	کمپنیوں کی تعداد	مجوزہ سرمایہ
ممالک محروسہ سرکار عالی	۱۰۰	۶۰۰۰۰۰۰۰
ریاست میسور	۲۰۰	۶۵۰۰۰۰۰۰
ریاست بڑودہ	۹۰	۴۰۰۰۰۰۰۰
ریاست گوالیار	۴۰	۶۰۰۰۰۰۰۰
ریاست اندور	۳۰	۳۰۰۰۰۰۰۰
ریاست ٹراونکور	۵۰۰	۱۲۰۰۰۰۰۰۰
صوبہ بنگال	۵۱۰۰	۳۰۰۰۰۰۰۰۰۰
صوبہ بمبئی	۱۴۰۰	۲۱۰۰۰۰۰۰۰۰

ٹراونکور اور میسور جیسی چھوٹی ریاستوں میں مشترکہ سرمایہ دار کمپنیوں کی تعداد اور ان کے سرمایہ کی مقدار

ہماری قلمرو کے مقابلہ میں اس قدر زاید ہونا ہمارے لئے یقیناً قابل رشک ہے۔

ہماری اس حالت کا مقابلہ صوبہ بنگال سے کیا جائے جو کہ رقبہ کے لحاظ سے ہماری قلمرو کے مماثل ہے تو یہ فرق بہت عبرت کی حد تک واضح ہوتا ہے جہاں ہماری سو کمپنیوں کے مقابل پانچ ہزار سے زائد کمپنیاں ہو جو ہم اور ۷ کروڑ کے سرمایہ کے مقابل ۱۲ ارب سرمایہ مشترکہ کام کر رہا ہو۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہمارے یہاں ابھی کاروباری ذہنیت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ اس سلسلہ میں جہاں عوام کی عدم دلچسپی کی شکایت ہے وہاں ہمارے تجاویز قوانین کی اصلاح و پرسش ہے خصوصاً ممالک محروسۂ سرکار عالی کا قانون کمپنی بطور خاص اصلاح کا طالب ہے کیونکہ یہ قانون تقریباً ۵۰ سال قبل کی ضروریات کا کفیل تھا اور اب حالات بالکل بدل چکے ہیں اور موجودہ ضروریات کے تحت اس میں ترمیمات ضروری ہوگئی ہیں علاوہ ازیں بیرونی کمپنیوں پر بھی کوئی ایسی بندش عاید نہیں کی گئی جن سے ہماری کمپنیاں بغیر کسی مسابقت کے کام کرسکیں اور ان کی وجہ سے ہماری کمپنیوں کے کاروبار کو نفع بخش حالت میں جاری رکھنے میں بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

خانگی طور پر انفرادی سرمایہ سے صرف چند بڑے کارخانے ملک میں کام کر رہے ہیں جن میں روغن کشیدگی دیاسلائی، صابن سازی، و ٹین سازی کے کارخانے قابل ذکر ہیں البتہ جننگ فیکٹری کی کافی تعداد ہے جو انفرادی سرمایہ سے کام کر رہی ہے۔ بر پیمانہ صغیر اور گھریلو صنعتیں اس قدر منتشر حالت میں ہیں کہ ان کے سرمایہ کے متعلق کوئی اطمینان بخش تخمینہ نہیں کیا جاسکتا۔

اب یہ سوال کہ سرمایہ کی موجودہ حالت کہاں تک صنعتی ترقیات کی بڑھتی ہوئی ضروریات کا ساتھ دے سکتی ہے تشریح طلب ہے۔ ہمارے خیال میں اس وقت ملک میں سرکاری امداد کے علاوہ کوئی ایسی صنعتی بنک یا کمپنیاں موجود نہیں ہیں جو موجودہ ضروریات کے تحت کما حقہ تکمیل کرسکیں ملک میں جو ساہوکارہ موجود ہے وہ زراعت اور دیگر پیشوں میں اپنا سرمایہ استعمال کرتے ہوئے اور صنعتی کاروبار میں اس کے مشغول کرنے کی کوئی ضمانت نہیں دیتا۔

سرکاری طور پر جو امداد دی جارہی ہے اس کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے اس سلسلہ میں جو ٹرسٹ فنڈ سرکاری طور پر ایک کروڑ کے سرمایہ سے قایم ہوا تھا اب اس کا سرمایہ ڈھائی کروڑ سے زائد ہوگیا ہے اور باوجود اس کے کہ اس سرمایہ سے ملک کی کئی صنعتوں میں ایک حیات نو پیدا ہوگئی ہے۔ لیکن پھر بھی ملک کی عام ضروریات کا خیال کرتے ہوئے

امداد کی یہ رقم بالکل ناکافی ہے۔

کلیدی صنعتوں کے قیام کے لئے جو کثیر سرمایہ کی ضرورت ہے وہ ایسا سوال ہے جسے ٹرسٹ فنڈ حکومت کے سرکاری خزانے کسی طور پر تن تنہا برداشت نہیں کرسکتے ان اسکیموں کو روبعمل لانے کے لیے ایک خاص مالی نظام کے قیام کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے جس میں حکومت کے ساتھ ملک کے بڑے بڑے سرمایہ داروں کا اشتراک عمل ضروری ہے۔

نیز ایسے کاموں کے لئے بیرونی سرمایہ سے بھی مدد لی جانی ضروری معلوم ہوتی ہے اور بڑی مشترکہ سرمایہ دار کمپنیاں ہی اس کام کو بخوبی انجام دے سکتی ہیں۔

البتہ ان امور کے لیے کافی جانچ پڑتال کرنے کی ضرورت ہوگی اور بیرونی سرمایہ کی حد تک ایسے اصول مقرر کرنے ہوں گے جس سے ملکی مفاد کی پوری حفاظت ہوسکے۔

نیز ٹرسٹ فنڈ کے جن قواعد کے تحت جو قرضہ جات دیئے گئے تھے وہ بھی نظر ثانی کے محتاج ہوگئے ہیں اس موقع پر ہم تفصیلی طور پر ان قواعد پر کوئی تبصرہ نہیں کرسکتے ہیں البتہ چند امور کی بابت اشارہ ضروری سمجھتے ہیں۔ پہلی چیز یہ ہے کہ ٹرسٹ فنڈ سے جو قرضہ دیا جاتا ہے اس پر سود کی شرح تقریباً دس سال قبل ۶ فیصد مقرر کی گئی تھی اس زمانہ کے لحاظ سے یہ شرح حالات ملک کے لئے ممکن ہے کہ مناسب ہو لیکن اس زمانہ میں یہ شرح بازار کے نرخ کا مقابلہ کرتے ہوئے زائد معلوم ہوتی ہے ظاہر ہے کہ صنعتی ترقی کے لئے اس شرح سے کم ہونا ضروری ہے۔ دیگر ممالک کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں جہاں ایسی صورتوں میں ۲ یا ۳ فی صد سے زیادہ شرح مقرر نہیں کی جاتی۔

علاوہ ازیں قرضہ دینے کی صورت میں جائداد کے مکفول کئے جانے کے جو قواعد ٹرسٹ فنڈ کے تحت مقرر ہیں وہ بڑے پیمانہ کی کبیر صنعتوں کے لئے مناسب ہیں لیکن چھوٹی صنعتیں جاری کرنے والے افراد اس سے کما حقہ مستفید نہیں ہوسکتے کیونکہ ان کے پاس اتنی جائداد نہیں ہوتی کہ وہ اس کو مکفول کرسکیں۔ یہ وہ دشواری ہے جس کے لئے ہمیں صنعتی بنکوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ صناع اپنی جائداد کے بجائے اپنا تیار کیا ہوا مال مکفول کرا سکیں چنانچہ صنعتی بنکوں کی ترویج کی ضرورت پر جس قدر زور دیا جائے وہ کم ہے۔

صنعتی بنکوں سے ملک کے صنعتی سرمایہ میں متعدد قسم کی آسانیاں پیدا ہو جائیں گی اور ہم بجا طور پر یہ توقع کر سکتے ہیں کہ ہمارے ملک کے وہ مالدار طبقے جو اپنا مال راست صنعتوں میں داخل کرنے میں تامل کرتے ہیں وہ بنکوں کے ذریعہ کام شروع کر سکتے ہیں اور ہمارے ملک کے بہت سے اندوختے کام میں آسکیں گے ۔

صنعتی بنکوں کے علاوہ چھوٹے کاموں کے لئے انجمن ہائے امداد باہمی کے اصول پر چھوٹی انجمنوں کی تشکیل کی بھی ضرورت ہے جو مقامی طور پر چھوٹے صناعوں کی مدد کر سکے ۔ ہمارے محکمۂ امداد باہمی کے تحت کئی ہزار زرعی انجمنیں قائم ہو گئی ہیں لیکن اب صنعتی سرمایہ کی غرض سے صنعتی قرضے کی انجمنوں کا قیام ازبس ضروری ہے کیوں کہ ان کے ذریعہ مختلف گھریلو صنعتوں کے احیا اور ترقی کی صورت نکل آتی ہے ۔ مثال کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ضلع رائچور میں اگر چند ایسی انجمنیں قائم ہو جائیں تو وہاں نمک کی نکاسی کی جا سکتی ہے اسی طرح دیگر ضلعوں میں بھی کام کیا جا سکتا ہے اس قسم کی ایک بڑی انجمن کی تشکیل کی جانب افتتاح نمائش کی تقریب میں اعلیحضرت قدر قدرت کا ارشاد گرامی موجب رہبری ہے ۔

ہمارے جدید صدر المہام بہادر فینانس سے بھی ہماری یہ توقع بیجا نہ ہو گی کہ ان کے عہد میں ہمارے صنعتی سرمایہ کا انتظام مضبوط اصولوں پر قائم کیا جائے کہ ملک کی صنعتی ترقی میں نہ صرف ممد و معاون ہو گا بلکہ اس کی وجہ سے ہمارا صنعتی مستقبل شاندار بن سکے گا ۔

جیسا کہ قبل ازیں میں بتا چکا ہوں اس مختصر مضمون میں اس مسئلہ پر پوری طرح بحث ناممکن ہے اگر ممکن ہو سکا تو انشاء اللہ عنقریب ایک تفصیلی رپورٹ یا کتاب کی صورت میں اس پر اپنے خیالات کا اظہار کر سکوں گا ۔

اس مقالہ کے ختم ہونے پر اس موضوع کے متعلق عام مباحثہ کی اجازت دی گئی چنانچہ جناب اسد اللہ صاحب مددگار رشتۂ صنعت و حرفت اور جناب مادھو راؤ صاحب انوری مینجر کواپریٹو انشورنس سوسائٹی نے اپنے خیالات ظاہر کئے ۔

صفحات مابعد پر ان اصحاب کی تقریروں کا ماحصل قلمبند کیا گیا ہے ۔

حیدرآباد میں صنعتی سرمایہ کا مسئلہ

از جناب سید اللہ صاحب ناظم رشتہ صنعت و حرفت

جناب صدر و حضرات! مجھے معاشیات سے بہت ہی کم واسطہ رہا ہے ۔ میرے دوست گپتا صاحب نے مجھ سے اچانک فرمایش کی کہ میں بھی کچھ کہوں ۔ ان کے اصرار پر میں یہاں موجود ہوں ۔ گزشتہ آٹھ دس برسوں میں معاشیات کے جن عملی پہلوؤں پر میری نظر پڑتی رہی ہے ان کا اظہار شاید آپ کی دلچسپی کا باعث ہو ۔

ہمارا ملک معاشیات اور صنعت و حرفت کے میدان میں جس قدر پیچھے ہے اس سے آپ واقف ہیں ہمیں ماضیہ میں اس خصوص میں تھوڑی بہت جو کچھ جد و جہد رہی وہ کس قدر ناکافی اور ناقص تھی وہ ہماری موجودہ زبون حالی سے ظاہر ہے یا تو یہ کاوشیں بے اصولی تھیں یا ان میں شدت و قوت آٹے میں نمک کے برابر تھی ۔ اس کی تفصیل کے لئے نہ یہ موقع ہے اور نہ وقت میں گنجائش ہے ۔

ہمارے ملک کا اکثر و بیشتر حصہ زراعتی ہے ، ہمارے کسان ، ہماری کاشتکاری ، ہماری پیداوار پر نظر ڈالئے تو زمانہ حال اور قرون ماضیہ میں بالکل تھوڑا سا فرق نظر آئے گا مشینوں کے استعمال اور کاشت کے جدید اصولوں اور بہتر طریقوں سے اب بھی ہمارا کسان کچھ زیادہ واقف نہیں ۔ ایک طرف تو یہ لکیر کا فقیر ہے اور دوسری طرف ہم بھی شاید لکیر ہی کے فقیر ہے ۔ زمین کے محاصل کو فصول اور پیداوار کے اعتبار سے کسان کی محنت و عرق ریزی اور حقیقی لاگت سے اب بھی کوئی دور کا بھی تعلق نظر نہیں آتا ۔ طلب و رسد کے بدلتے ہوئے حالات کے تحت ہمارے بھولے بھالے کسان کو ہر وقت رہبری کی ضرورت ہے ان ہی وجوہ سے ہمارا کسان لاکھ ایڑی چوٹی کا زور لگائے اس کی سرگرمیاں بار آور نہیں ہوتیں ۔ خاص کر جبکہ اس دور جدید میں حسن عمل اور قوت مسابقت کامیابی کے اصلی راز ہیں ۔ پھر اس تگ و دو اور کش مکش میں ہماری کھیتیاں لہلہاتی نظر نہ آئیں تو کوئی تعجب نہیں ۔ ہمارے ملک میں نہ اشیار روغنی کی کمی ہے اور نہ ریشہ دار پیداوار کی لیکن خام اشیار اور صنعتی پیداوار کی برآمد و درآمد کے اعداد

ہماری بے توجہی اور غفلت کو بے نقاب کئے دیتے ہیں۔ ارنڈی کی کاشت دنیا میں سب سے زیادہ ہمارے ملک میں ہے۔ ولایتی مونگ کی پیداوار کے اعتبار سے ہمارا ملک دنیا میں تیسرے درجہ پر ہے ہمارے ملک کا کثیر رقبہ السی کے زیر کاشت ہے۔ باوجود اس کے ان سے ہمارے ملک میں تیل بہت کم کھینچا جاتا ہے۔ یہہ چیزیں جیسی کی ویسی برآمد کی جاتی ہیں ان پیداواروں سے ہمارے ملک اور اپنائے ملک کو بہت زیادہ فائدہ پہنچ سکتا ہے بشرطیکہ ان کی طرف توجہ کی جائے۔

ہمارے جنگلات کچھ لق ودق میدان نہیں۔ ان سے کافی چوب سینہ نکلتا ہے اور اگر کوشش کی جائے تو اس سے بہتر اور زیادہ مقدار میں چوب سینہ نکل سکے اس کے علاوہ اگر سائنٹفک طریقوں سے لکڑی اور کوئلے کو جھنجوڑا اور نچوڑا جائے تو ان سے کیا کچھ ہاتھ نہ آئے۔ ایسی اشیا جن کے لئے ہم اس وقت دوسرے ممالک کے دست نگر ہیں۔

معدنیات میں کوئلہ، لوہا، تانبا، سیس، سونا، گندھک۔ اور خدا جانے کتنے اور دفینے ہماری سرزمین کی آغوش میں چھپے ہوئے ہیں ان کی تلاش جستجو، پہچان، اور ان سے تمتع حاصل کرنا ہنوز ہماری توجہات کے منتظر ہیں۔

یہہ ظاہر ہے کہ صنعتی ترقیوں کے لئے پہلا قدم اور نہایت اہل مسئلہ سستے داموں پر قوت کا میسر آنا ہے۔ قوت پیدا کرنے کے ذرائع سے قدرت نے اس ملک کو محروم نہیں رکھا ہوا اور پانی موج موج اور دریا دریا یہاں بھی ہیں۔ ان سے استفادہ نہ کرنا سراسر ہمارا قصور ہے۔

مختصر یہہ کہ نہ سامان کی ہمارے ہاں کمی ہے اور سرمایہ کی لیکن ان کو فراہم کرنے اور ان سے ملک کو مالا مال کرنے کے لئے قوی دست وبازو، قابل دماغ اور بلند حوصلوں کی ضرورت ہے اس کمی کے بھی وجوہ ہیں عوام میں صنعت وحرفت کا مذاق جیسا ہونا چاہیئے نہیں ہے۔ یہی حال سرمایہ دار دل کا ہے۔ اس پر طرہ یہہ کہ کسی کو کسی پر اعتماد نہیں۔ جہاں ایسا ناموافق ماحول ہو نہ کسی صنعت کا آغاز ہو سکتا ہے اور نہ کوئی چالو صنعت چالو رہ سکتی ہے۔ جب تک کہ حکومت شریک کار نہ ہو جائے۔ ریاست میسور کی صنعتی ترقیوں کا سب سے بڑا راز یہی ہے۔ اکثر کارخانے

حکومت کے سرمایہ سے اور حکومت کی سرپرستی میں قائم ہوئے اور چل رہے ہیں اس کے علاوہ اور دیگر ریاستوں میں بھی ایسی مثالوں کی کمی نہیں۔ ہماری حکومت نے بھی اسی اصول کو مدنظر رکھ کر کچھ عرصہ قبل صنعت و حرفت میں جان ڈالی کچھ نئے کارخانے قائم ہو گئے جس قدر کارخانے قائم ہیں وہ ہمارے ملک کے امکانات کا لحاظ کرتے عشر عشیر بھی نہیں۔ ابھی عرصہ تک اس کی ضرورت ہے کہ حکومت دامے درمے قدمے صنعتی اداروں کی مدد و معاون رہے۔ اس تدبیر سے عوام کا رجحان صنعتی کاروبار کی طرف بڑھتا جائے گا اور ان کی نظروں میں صنعتی اداروں کی ساکھ قائم ہوتی جائے گی۔ فی الوقت ہمارے ملک میں صنعت و حرفت کی مثال ایک صغیر سن بچے اور وہ بھی کمزور بچے کی سی ہے۔ اس کو کچھ عرصہ تک سہارے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم یہ سمجھ لیں کہ اس بچے کو آیندہ مشکل سے مشکل نشیب و فراز طے کرنے ہیں اس لیے اس کو ابتدا ہی سے سہارے کا عادی نہ بنانا چاہیے تو یہ صحیح نظریہ نہیں۔ ہر بچہ کو سہارے کی ضرورت کچھ عرصہ تک ہوتی ہے۔ جب وہ اپنے پیر پر کھڑا ہو جائے تو سہارے کو الگ کر دیجیے اور وہی سہارا کسی اور صغیر سن بچے کو دیجیے۔ تب تو یہ بچے نہ ٹھوکریں کھائیں گے اور نہ صدمے اٹھائیں گے سرے سے سہارا نہ دینے کا اصول ہمارے ملک کی موجودہ فضا میں میری ناقص رائے میں کوئی صحیح اصول نہیں۔

ایک اور اہم عملی پہلو موجودہ حالات میں جدید کارخانوں کے قیام سے متعلق قابل غور ہے دوران جنگ میں جدید صنعتی کارخانوں کا قیام مشکل سے مشکل تر ہو گیا ہے اشیاء تعمیر از حد گراں ہو گئی ہیں مشینیں اول تو ملتی ہی نہیں اور ملتی بھی ہیں تو بے حد گراں مختصر یہ کہ اس وقت ایک روپیہ کی جگہ چار روپیہ خرچ کرنے پڑتے ہیں پھر ان غیر معمولی گراں مشینوں کو جنگ کے بعد بدلنا الگ ہے گویا کارخانوں کے قیام میں قبل جنگ جو مصارف ہوتے تھے ان سے کئی گنا مصارف اس وقت زیادہ ہوتے ہیں۔ بے شک دوران جنگ میں کارخانوں کے منافع بھی بڑھے ہوئے ہیں لیکن اس منافع سے نہ صرف غیر معمولی ابتدائی مصارف کو برداشت کرنا ہے بلکہ ختم جنگ کے بعد از سر نو نئی مشینوں کو خریدنا بھی ہے اور پھر اتنا سرمایہ پس انداز کرنا ہے کہ ہمارے کارخانے ختم جنگ کے بعد بیرونی بے رحمانہ مسابقت و مقابلہ کی تاب لا سکیں۔ ہماری حکومت ان اہم مسائل اور ان کے اہم نتائج سے بے خبر نہیں پھر بھی ماہرین معاشیات کے مشورے نہایت مفید ہوں گے کہ یہ ناؤ کسی طرح پار لگے۔

حیدرآباد میں صنعتی سرمایہ کا مسئلہ

تقریر

جناب ہوراؤ صاحب انوری

سرمایہ صنعتی کے سلسلہ میں میں صرف اس قدر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ بیرون ممالک وصوبجات کے متعلق جو اعداد پیش کئے گئے ہیں اور ان کا مقابلہ ہمارے یہاں کے اعداد سے کیا گیا ہے۔ اس میں اس قدر تفاوت کی وجہ یہی ہے کہ ہمارے لئے ایک بندرگاہ (Seaport) نہیں ہے۔ آج کل کے کاروباری دنیا میں (Seaport) کی جو اہمیت ہے۔ وہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اکثر بڑی بڑی صنعتیں اور کارخانہ جات انہیں مقامات پر قایم ہوتے ہیں جہاں بحری اور بری ارسالات کے جملہ سہولتیں موجود ہوں۔ سوائے بمبئی۔ مدراس کلکتہ، اور کراچی کے دیگر اندرون ملک کسی مقامات پر جو صنعتی ترقی نظر آرہی ہے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ وہاں کے سرمایہ دار اپنے سرمایہ کے بیشتر حصہ کو صنعتوں میں لگانا زیادہ منفعت بخش سمجھتے ہیں۔ ہمارے یہاں کے جملہ مارکٹوں پر بیرونی تسلط کی یہی وجہ ہے اور اس طرح ہم سرمایہ صنعتی میں اضافہ نہیں کر سکتے۔

اعداد پیش شدہ میں انجمن امداد باہمی کے ذریعہ فراہم کردہ سرمایہ کو شامل کر لیا جانا مناسب ہے، جن کی تعداد اس وقت لگ بھگ دو کروڑ ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا بیشتر حصہ زرعی انجمنوں میں لگا ہوا ہے۔

حکومت نے انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ کو جس مقصد کے تحت قایم کیا تھا وہ اب تک پورا نہیں ہو سکا۔ ابتداء میں ٹرسٹ فنڈ نے چند بڑے بڑے کارخانہ جات میں کثیر سرمایہ کو لگا دیا

جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ٹرسٹ فنڈ اس وقت مقروض ہے - یہ ممکن ہے کہ میں غلطی پر ہوں - اگر میں یہ کہوں کہ حکومت کو بطور خود کاروبار نہیں کرنا چاہیئے - یعنے مستقل طور پر چند صنعتوں میں ٹرسٹ فنڈ کا کثیر سرمایہ بشکل حصص محفوظ کر دینا مناسب نہیں کیوں کہ ایک تو عوام کو ایسے ادارہ جات میں اپنا حصہ لینا ممکن نہیں ہو سکتا - اور دوسرے نئے صنعتوں کو کافی مدد انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ سے نہیں مل سکتی - حکومت کا اصل مقصد ان صنعتوں کو ترقی دینا اور پبلک میں اعتماد پیدا کرنا ہے تو ایسی صنعتیں جب اپنی حالت اطمینان بخش بنا لیتی ہیں تو حکومت کو اپنی مداخلت کم کر دینی چاہیئے - دوسرے الفاظ میں حصص کو پبلک کے لئے کھول دینا چاہیئے - اب اس وقت ایسے حصص کو بازار میں فروخت کرنے سے ٹرسٹ فنڈ اپنی لگائی ہوئی رقم سہ گنا رقم حاصل کر سکتی ہے - جس سے موجودہ قرضہ ادا کرنے کے بعد دوسرے صنعتوں کی کافی مدد ہو سکتی ہے -

اس طرح ملک کے صنعتی سرمایہ میں کئی گنا اضافہ ہو سکتا ہے -

اس تقریر کے ختم ہو جانے پر کانفرنس میں ایک دوسرے موضوع پر کارروائی شروع ہوئی - یہ موضوع " حیدرآباد میں محاصل اندازی کا مسلک " تھا -

اس موضوع پر علاوہ مقالوں کے پر جوش مباحثہ بھی ہوا - مباحثہ میں حصہ لینے والے اصحاب میں جناب پنڈت ام نرسنگراؤ صاحب مدیر رعیت، جناب راجہ لکشمی نواس صاحب گنیر وال اور جناب مولوی حسن الدین صاحب ، بی ، اے ، ال ، ال ، بی (عثمانیہ) مدیر مملکت بھی تھے - سب مقالات اور راجہ لکشمی نواس صاحب گنیر وال کی تقریر کا ماحصل آیندہ صفحات پر ناظرین ملاحظہ فرمائیں گے - لیکن جناب پنڈت نرسنگراؤ صاحب اور جناب مولوی حسن الدین صاحب نے اپنی اپنی تقریر قلم بند کر کے نہیں بھیجی اس لئے افسوس کہ ان کو اس روئداد میں شامل نہ کیا جا سکا

حیدرآباد کیلئے محاصل اندازی کا مسلک

از ڈاکٹر بی، ایم، جے، سوریا نائیڈو صاحب

(ترجمہ)

اصل مقالہ انگریزی میں تھا یہ اس کا آزاد ترجمہ ہے۔

جناب صدر اور دوستو! جب کہ مسٹر اکبر علیخاں نے مجھے مملکت حیدرآباد کیلئے محاصل اندازی کی پالیسی پر تقریر کرنے کے لئے مجبور کیا۔ میں سات دن تک بڑی الجھن میں رہا۔ جب کبھی میں اپنا مقالہ لکھنے بیٹھتا تو (۳۰) صفحوں سے بھی بڑھ جاتا گو میں نے اس کو مختصر کرنے کی ممکنہ کوشش کی۔ ایک مفصل و بسیط مقالہ جو واقعات اور اعداد شمار سے معمور ہو کسی حکومت۔ انجمن یا علمائی کی جماعت کے سامنے بالحسن وجوہ ایک یادداشت کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے لیکن وہ بدقسمتی سے ایک عام کانفرنس کے لئے کسی طرح موزوں نہیں ہو سکتا جس میں (۲۰) منٹ کی تقریر بھی ایک شخص کے لئے سخت تکلیف دہ ہو جاتی ہے علاوہ ازیں ہم یہاں صرف واضح اور عام اصولوں سے بحث کریں گے جن کی رہبری میں ہم ان تدابیر پر غور کریں گے جو ہم پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ایک نئے اصول کو قائم کرنے کے لئے اس کی تفصیلات بیان کرنی ہوتی ہیں اور اس کی وجہ جواز پر بحث کرنی ہوتی ہے جس کے لئے کئی صفحوں کے استدلال کی ضرورت ہے۔ گو کسی اصول کو فنی طور پر منطبق کرنا معمولی بات ہوتی ہے اور اس کی زیادہ اہمیت نہیں ہوتی لیکن اصول کو ایسی مناسب بنیاد پر قائم کرنا پڑتا ہے کہ وہ آیندہ بگڑ کر آمرانہ فرمان یا ناقابل تنسیخ عقیدہ نہ بن جائے۔

قطع نظر اس کے معاشیات ایک سائنس (علم) ہونے کا مدعی ہے اس نے ایک معاشی انجمن کو
سنجیدہ افراد کی ایک ایسی سائنٹفک (علمی) جماعت بننا پڑتا ہے جو انسانی فلاح و بہبود پر اثر انداز
ہونے والے اہم مسائل کے مطالعہ کے لئے اکٹھا ہوتی ہے۔ اس جماعت کے سامنے جو چیز بھی
پیش کی جائے وہ سائنٹفک (علمی) صحت اور تحقیقات پر مبنی ہونی چاہیئے اور اس کی تکمیل اور
پیش کش کے لئے کافی وقت درکار ہوتا ہے ورنہ تقریر ایک جامعہ کے خطبۂ تقسیم اسناد کی سطح پر
اتر آتی ہے جس میں دقیانوسی اور فرسودہ باتیں ہوتی ہیں جن کو ہر دفعہ نیا مسالہ لگا کر پیش کیا جاتا ہے۔
ان قیود اور بندشوں کے باوجود آپ نے مجھے جو عزت بخشی ہے اس کا پورا احساس رکھتے ہوئے
میں اس مقالہ کو انتہائی دلگیری اور بے اطمینانی کے ساتھ پڑھ رہا ہوں اور اس بات کو جانتا ہوں کہ
اس کوشش کر آپ کسی فیصلہ کن نتیجہ پر نہ پہونچ سکیں گے کیوں کہ اس کی بنیادی شرطوں اور دعووں کو
ثابت کرنے کے لئے نہ وقت ہے اور نہ لکھنے کی گنجائش کہنا بہت ہے اور وقت بہت کم ہے۔
لیکن آپ مجھ سے واقف ہیں اور آپ میرے ان تصورات اور تخیلات سے بھی ضرور روشناس
ہوں گے جو میں زندگی اور سائنس کے بارے میں رکھتا ہوں۔ ایک سائنس داں اور ایک طبیب
کی حیثیت سے میں صرف ان واضح اور روشن اصولوں کی تلاش کرتا رہتا ہوں جو زندگی اور ان مظاہر پر
حاوی ہوں جو ہمارے اردگرد موجود ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں نے اپنے مستقبل کی کبھی کوئی فکر نہیں
کی میرے ذاتی منصوبے چند ہی ہیں اور وہ بھی منوجی ہیں میں کسی جماعت یا افراد کا حلقہ بگوش نہیں ہوں
بلکہ صحیح یا غلط طور پر زندگی کے مخصوص اصولوں کے تابع ہوں جن کو میں اس لئے عزیز رکھتا ہوں کہ
میں کہیں خشک مزاج بن کر دنیا اور اس کے لوازم سے نفرت نہ کرنے لگوں۔ میں اپنے اور نہ کسی
فرد یا جماعت کے اغراض پورے کرنا چاہتا ہوں میں کسی شخص یا شخصیت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔
کیوں کہ وہ میرے مسلک کے اعتبار سے کوئی اہمیت نہیں رکھتے میں اس وقت مخصوص بنیادی اصولوں کو
اپنے ضمیر کی روشنی میں اور اپنے مبلغ علم کی حد تک کھول کر بیان کرنا چاہتا ہوں جن کو میں اپنے نزدیک
اس مملکت کے لئے بھی مفید سمجھوں تو عقلمندی سے بعید ہوگا آپ مجھ سے اتفاق نہیں کریں گے۔

اور مجھے بھی اس کی توقع نہیں ہے لیکن مجھے آپ سے اتنی توقع ضرور ہے کہ آپ میرے خلوص اور نیت
عزم صمیم کو ضرور تسلیم کریں گے اگر یہ بھی نہ سہی تو کسی شخص کے نقطۂ نظر سے آگاہ ہونا بعض اوقات مفید ہی ہوتا ہے۔

اصول کی دریافت ان تمام مسائل کو تین نقاط نظر سے جانچا جاسکتا ہے۔ (۱) قانونی نقطۂ نظر (۲) سائنٹفک نقطۂ نظر اور (۳) وہ نقطۂ نظر جو معقولیت یا عقل سلیم سے متعلق ہے۔ میں آخری نقطۂ نظر اختیار کرنا مناسب سمجھتا ہوں کیوں کہ قانون زندگی کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں رکھتا بلکہ یہ صرف مصنوعی پیداوار ہے۔ سائنٹفک نقطۂ نظر۔ نظریوں اور افکار کی بھول بھلیاں میں گم ہوسکتا ہے۔ اور حقائق سے منحرف ہوکر محض رسمی اور رجا معانی بن جاتا ہے اس لئے آخری نقطۂ نظر سب سے بہتر ہے۔
مزید برآں تمام مسائل کو دو طریقوں سے حل کیا جاسکتا ہے۔ پہلا یہ کہ حل عجلت سے معلوم کیا جائے۔ ضرورت اس قدر شدید ہوسکتی ہے کہ کچھ نہ کچھ جلد کیا جانا ضرور ہوتا ہے۔ یہ مرض میں تخفیف پیدا کرنے والا طریقۂ علاج ہے۔ طبیب کو سوچنے کا کوئی موقع نہیں ملتا۔ بسا اوقات ایسی صورت میں پہلے علاج کیا جاتا ہے اور بعد میں سوچا جاتا ہے۔ پیچیدگیوں کو سلجھانے کا کوئی موقع نہیں ملتا۔ طبیب کا اولین مطمح نظر مریض کو بچانا ہوتا ہے وہ مریض کو بچانے کی فکر میں اس قدر جلدی کرتا ہے کہ ممکن ہے کہ اس کو بچانے کے بجائے نیک نیتی سے ہلاک کرڈالے۔ ایسا علاج بیماری سے زیادہ مہلک ہوتا ہے۔
دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مرض کا سکون کے ساتھ تجزیہ کیا جائے اور اپنے وسیع تجربہ کی روشنی میں کسی علاج کا تعین کیا جائے۔ وہ ڈاکٹر بہت اچھا ہوتا ہے۔ جو مذکورۂ بالا دو طرح کے مریضوں کے علاج کے بارے میں رائے قائم کرسکتا ہے۔

معاشیات اور طب میں جو سرکاری طریقۂ کار استعمال کیا جاتا ہے اس کی وجہ سے ایک بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے مثلاً یہ کہ طبیعات کے ریاضیاتی قوانین کو زندگی کے مظاہر پر منطبق کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ غلط اور بالکل غلط ہے۔ انسانی زندگی ریاضی کے قوانین کی تابع نہیں بلکہ قوانین حیاتیات کے تحت ہے۔ اشیاء کی تیاری ریاضی کے قوانین کے تابع ہوسکتی ہے۔ ان کا صرف عامۃ الناس کی انفرادی ضروریات پر منحصر ہوسکتا ہے۔ ریاضی کے قوانین

انسانی سماج کی بناوٹ پر حکم نہیں چلا سکتے۔ قوانین حیاتیات اس ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ انسانی زندگی کا ضروری جز اس کا تاریخی کردار ہے۔ غیر نامیاتی نظام میں اس کی ابتدائی تاریخ غیر اہم ہے۔ اگر کوئی قلم میز سے گر جائے تو یہ کہنا یہ میز پر کس طرح آیا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ غیر جانداروں کا یہی نظام ہے جانداروں میں رجحان کا تصور یا ترتیب زندگی کے تاریخی کردار پر مبنی ہوتی ہے۔ اس لئے میری رائے میں چونکہ معاشری نظام کا تمام تر انحصار زندگی کے تاریخی کردار پہ ہے اس لئے کوئی معقول حل نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہم ان مظاہر کا تاریخی تجزیہ نہ کریں جو ہمارے سامنے موجود ہیں خواہ وہ کچھ ہی ہوں لیکن اگر ان کا تعلق زندگی کے حقائق سے ہے تو ہم کو ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ ہمارے مستقبل کے پودے کے نشوونما ماضی ہی کی آبیاری سے ہوتی ہے انسان اور انسانی اداروں کے بغیر کوئی محصول اندازی نہیں ہو سکتی اور اس لئے کوئی مملکت محصول اندازی کا لزوم نہیں کر سکتی۔

اس کا انطباق طب پر زیادہ ہو سکتا ہے جس نے پارسی لس کی حسب ذیل نصیحت پر کبھی غور نہیں کیا۔

"کوئی علم مکمل نہیں ہو سکتا جب تک اس میں اس کی بنیاد کی وضاحت نہ کی جائے یعنی اس کی ابتدار کو نہ بتایا جائے۔ چونکہ تمام انسانوں کے امراض ان کے جسم میں پیدا ہوتے ہیں اس لئے ان کے امراض کو جاننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ان کی جسم کی تشریح سے واقف ہوں"

پارسی لس کے مشہور پیرو گراوگل نے مندرجہ بالا نصیحت میں حسب ذیل اضافہ کیا۔

"کسی مرض کو سمجھنا یا اوس کا علاج کرنا قطعی ناممکن ہے جب تک کہ کوئی طبیب مرض کے تاریخی طور پر بڑھنے کی تاریخ سے واقف نہ ہو لیکن علم تشخیص الامراض اور علم علاج الامراض کے متعلق تاریخی علم کہاں سے حاصل کیا جائے جبکہ ان علوم کے پاس ان تاریخی معلومات کی کمی موجود ہے جو مرض کے تدریجی طور پر ظاہر ہونے سے متعلق ہیں۔ کسی کلینک (جراحی اور طب کی عملی تعلیم) میں اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اس بارے میں پروفیسر خاموش ہیں"

آخری بات جو نہایت اہم ہے وہ یہ ہے۔

"شدید امراض جس راستہ پر چلتے ہیں وہ گویا جسمانی ساخت کے نقش قدم پر بنا ہوتا ہے"۔
اگر ہم ان اصولوں کو اپنی معاشیات پر منطبق کریں تو ہمیں کیا نتائج حاصل ہوں گے؟ وہ طبیب کس مصرف کا ہے جو ایک کہنہ مرض کی نوعیت کی تشریح نہ کر سکے؟ سرکاری مکتب طب کا کوئی طبیب آج ایسا موجود نہیں ہے جو ایک کہنہ مرض کی نوعیت کو سمجھ سکے چہ جائیکہ اس کا علاج کر سکے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس نے زندگی کی تاریخیت (تاریخی کردار) سے تجاہل برتا۔

معاشی امراض کے ماہر طبیب اسی طرح ہمارے معاشی امراض کے سرکاری اطباء حاذق کسی کہنہ مرض کا علاج کرنے سے قاصر معلوم ہوتے ہیں ہم جانتے ہیں کہ ۱۹۲۹ء سے دنیا میں ایسی معاشی کساد بازاری پھیلی ہوئی ہے جو پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی۔ وقتاً فوقتاً سے آثار ظاہر ہو رہا ہے جس کو سرمایہ داری کا "اترنے چڑھنے والا ابھار" کہا جا سکتا ہے۔ جس کی تشریح مینارڈ کینس اپنے "مقالہ زر" میں کرنے کی کوشش کرتا ہے بالفاظ دیگر یہ ایک کہنہ مرض ہو گیا ہے۔ اس کو ماہرین معاشیات نے معاشی "زلزلہ" اور "شدید معاشی طوفان" سے تعبیر کیا ہے جو اسی طرح آتا جاتا رہتا ہے جس طرح کہ ہیضہ و چیچک کی وبائیں انسانی جسم ڈاکٹروں کی مدد کے بغیر یا ان کی مدد کے باوجود صحت یاب ہو جاتا ہے لیکن "طوفان" اور "زلزلے" ایک دو گھنٹے سے زیادہ نہیں ٹہنے پاتے گو وہ کافی نقصان اور تباہی کا باعث ہوتے ہیں۔ اس مرتبہ کچھ ایسی چیز پیدا ہو گئی ہے جو ایک کہنہ مرض کی طرح ہے۔ کیا یہ ہمارے معاشی نظام کا ناسور ہے؟ کیا یہ کوئی سنسنی چیز ہے یا ہمارے ناقص معاشی جسد کا لازمی نامیاتی نتیجہ ہے؟ نظام سرمایہ داری کے سرکاری طبیبوں نے اس مرض کی حسب ذیل عجیب و غریب تشخیص کی ہے۔

لندن اسکول آف اکنامکس کے پروفیسر رابنس جو مجلس اقوام کے بڑے ماہر اعداد و شمار ہیں اپنی کتاب موسومہ "عظیم کساد بازاری (۱۹۳۴ء)" میں لکھتے ہیں "ایسی نمایاں کساد بازاری کی مثال نہیں ملتی"۔ مجلس اقوام کے "ورلڈ اکنامک سروے" بابتہ ۱۹۳۲-۳۳ء میں بیان کیا گیا ہے۔ "۱۸۶۰ء کے بعد سے کوئی اعداد و شمار ایسے نہیں ملتے جس سے اس امر کا انکشاف ہو کہ خام پیداوار یا مصنوعات میں ایسی تیز یا شدید کساد بازاری رونما ہوئی ہو"

اس ناقص معاشی نظام میں جو کہنہ مرض موجود ہے اس کی سرکاری ماہر معاشیات پروفیسر رابنس نے اپنی کتاب موسومہ "معاشیات کی نوعیت اور اہمیت" میں ان الفاظ میں تشخیص کی ہے " یہ ایک ایسا بچا کچا حصہ ہے جو ہر طرح ناقابل تشریح ہے " واقعی کیا تشخیص ہے اور کیا علاج جب یہ ہو چکا تو انگلو سکسن قوم (یعنے انگریز) کے ماہروں نے ایک غیر ملکی ماہر کی خدمات حاصل کیں ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ ہم باہر سے کسی نایق نہیں بلکہ زیادہ شہرت یافتہ انگریز کو بلاتے ہیں اس غیر ملکی ماہر کا نام حانک تھا اس نے " نظریۂ زر اور تجارت کے دور " اور " قیمت اور پیداوار " پر مقالے لکھے انگریزوں نے اس سے بڑی بڑی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں لیکن اکثر حانک کی عقل کے حدود اس جملہ پر ختم ہو گئے کہ " ایک (معاشی) نازک صورت حال پیداوار کے کم سرمایہ دارانہ طریقوں میں جبوری طور پر بدلنے کا نام ہے " اس طرح فاضل ڈاکٹر نے گاڑی کو اگلے گھوڑے کے آگے رکھ دیا فرض کیجئے کہ ہم معاشی امراض کے ان درباری طبیبوں سے یہ کہیں کہ بندہ پرور۔ کیا اس کہنہ مرض کا سبب آپ کے مریض کے جسم کی ناقص حالت نہیں ہے تو کیا یہ کوئی سرکشی یا گستاخی ہوگی ؟

جناب صدر اور دوستو! آج کل یہی موقف ہے اور میں تاریخی کردار کی اس طرح چھان بین کرنا چاہتا ہوں کہ ابتداء سے ان باتوں کو دیکھوں جو برائیوں کی جڑ ہیں۔ اور اسی جڑ کو ہم اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں چونکہ تاریخ کے تجربہ پر اپنی تحقیقات کے نتائج کو مبنی کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔ اس لئے یہ یاد رکھنا چاہئیے کہ ہم جو نتائج حاصل کریں ان کو ایک سخت منطقی استدلال سے جانچیں۔

محصول اندازی کی آیندہ مجوزہ پالیسی کو ہم کس بنیاد پر رکھیں گے ؟ کیا ہم اپنے موجودہ محصول اندازی کی تاریخی بنیاد کا مطالعہ کریں گے ؟ کیا ہمارے لائحہ عمل کا تعلق صرف فوری مسائل سے ہوگا یا یہ مسائل ایک صحیح اور معقول محصول اندازی کے بنیادی اصول پر حاوی ہوں گے ؟ کیا یہ ایک طویل لائحہ عمل ہوگا۔ اور بالآخر کن اخلاقی اور معاشی بنیادوں پر ہم اس کو ترتیب دیں گے ؟ ہمارے موضوع بحث کا خاکہ یہی ہے ۔

محصول کی تعریف ایک برطانوی درسی کتاب میں "محصول" کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ محصول ایک ایسی رقم ہوتی ہے جو کوئی شخص کسی حکومت کو ادا کرنے پر مجبور ہوتا ہے جو رفاہ عامہ کے لئے سرکاری خدمات کے لئے اخراجات برداشت کرتی ہے اور اس رقم کی ادائی میں انفرادی فائدہ کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا۔ اس تعریف میں ایسی اخلاقی شان نظر آتی ہے کہ وہ قزاقی اور ہلاکت آفرینی کو بھی حق بجانب ٹھہرا سکتی ہے۔ بشرطیکہ آپ اس قاعدہ کو نہ بھولیں کہ "ہم یہ سب کچھ آپ کی فلاح و بہبود کے لئے کر رہے ہیں"۔ رفاہ عامہ کے لئے جو خدمات انجام دی جاتی ہیں وہ دراصل اس بات پر منحصر ہوں گی کہ محصول دہندہ کو "رفاہ عامہ کے لئے خدمات" کا تعین اور مطالبہ کرنے کا کس قدر اختیار حاصل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رفاہ عامہ کی جو خدمات انجام دی جائیں گی وہ ایک طرف حکمران طبقہ کے سماجی شعور اور اخلاقی حالت اور دوسری طرف محکوم طبقہ کے قانونی حقوق اور سیاسی شعور پر منحصر ہوگی تاکہ حاکم اور محکوم طبقوں کے مفادات میں یکسانیت اور مماثلت پیدا کی جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حکومت کی مشنری اور محکوم افراد کے مفادات میں کوئی تصادم نہ ہو وہ بنیادی طور پر متضاد بھی ہو سکتے ہیں۔ درحقیقت محصول ایک طرح کا خراج ہوتا ہے جو محکوم حاکم کو خاص خدمات کی انجام دہی کے لئے ادا کرتا ہے یا محکوم کی توقع ہوتی ہے کہ حاکم ایسے خدمات انجام دیگا یا انجام دینے پر مجبور ہوگا۔ لیکن محصول ایک ایسا خراج بھی ہو سکتا ہے جو محکوم سے ایک غارت گر اور مخالف سماج جماعت کے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے جبراً وصول کیا جائے۔ جیسا کہ قرون وسطیٰ کے یورپ میں ہوتا تھا مثلاً رابرٹ برنیس نے ایک ایسے جاگیردارانہ سماجی نظام کے لئے محاصل عاید کئے تھے جو فرانسیسی نظام کے مثل تھا اور جس کو بعد میں انقلاب فرانس نے مٹا دیا تھا۔ (فرانس میں جاگیرداری نظام کا زوال مصنفہ ہربرٹ) لیکن یہ آج تک ہندوستان کے مختلف حصوں میں موجود ہے۔ معاشی نقطۂ نظر سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کا نظام جاگیردارانہ ہے۔

محاصل اندازی آنریبل جان ایسٹ انڈیا کمپنی کے مسلک کے مطابق اور کیمبرج کی تاریخ ہند کے بموجب

بھی ہو سکتی ہے یعنی یہ کہ "مالگذاری وصول کرنا بلاشبہ حکومت کا اولین مقصد ہے"۔ یہ آخری جملہ کہ "مالگذاری وصول کرنا حکومت کا اولین مقصد ہے" حیدر آباد میں بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ حکومت ہند کی مالیاتی اور محاصل اندازی کی پالیسی گو اس میں وقتاً فوقتاً رد و بدل کیا گیا۔ تاہم اس کے عہد سے اب تک اس اصول پر مبنی ہے۔ اور چونکہ ہم حیدر آباد میں ہمیشہ برطانوی ہند کی نقل کرتے ہیں اور اکثر اوقات اچھی باتوں کی بجائے بری باتوں کی نقل کرتے ہیں اور اس تعلی سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم کو برطانوی ہند کی صف میں برابر کی جگہ مل گئی اور چونکہ ہم نے اپنی مالگذاری اور بندوبست کی پالیسی بھی کسے نظام و تکات پر مرتب کی ہے۔ اس لئے ہمیں اندیشہ ہوتا ہے کہ قدرتاً ہم بھی ان ہی برائیوں کا شکار ہو جائیں گے جو برطانوی ہند میں موجود ہیں اگر اس اصول ہی خراب ہو تو ترمیم و رد و بدل سے کیا حاصل۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کر سکتے ہیں کہ چند برائیوں کو کم کر دیں اور دوسری نمایاں اور سخت ناانصافیوں پر پردہ ڈال دیں۔ صدہا ماہرین معاشیات نے جو وسیع مطالعہ کیا ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ محاصل اندازی کا طریقہ ہندوستان کی زرعی آبادی کی اقتصادی حالت اور فلاح و بہبود کے لئے غیر موزوں اور مضرت رساں ہے۔ اس ضمن میں جو لٹریچر دستیاب ہوتا ہے اس سے اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ زراعت کا پیشہ مالگذاری کے نقطۂ نظر سے اور لگان ناقابل ادائی ہونے سے دشوار سے دشوار تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں معاشیات کو ایک اچھی علامت سمجھا جا سکتا ہے جو بے غرضانہ مقاصد کے تحت نہیں بلکہ محض مجبوری کے تحت دی جاتی ہیں کیوں کہ ہماری محاصل اندازی کی اصل اصول اور بنیاد یہ ہے کہ "مالگذاری وصول کرنا بلاشبہ حکومت کا اولین مقصد ہے"۔ اس لئے میں ضخیم مقالوں کو اور شاہی زرعی کمیشن کی طویل رپورٹوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا ہیں نے ان سب کا مطالعہ کیا ہے اور ان کو جس قدر پڑھتا جاتا ہوں اسی قدر مجھے اس بات کا یقین ہوتا جاتا ہے اور یہ بات میں اپنے پورے احساس ذمہ داری اور پوری سنجیدگی کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ جہاں تک دیہی امور کا تعلق ہے ہمیں اس نظام سے دست بردار ہونا پڑے گا اور اس نظام کو اختیار کرنا پڑے گا جو ہر اخلاقی و معاشی معیار پر

پورا اترتا ہے اور آج بھی اس قابل ہے کہ ہر شخص اور خود ہماری حکومت کا محکمۂ مالگذاری اس کا گہرا مطالعہ
کرے۔ یہ نظام سلطنت مغلیہ کا طریقۂ مالگذاری ہے جو آئین اکبری میں بیان کیا گیا ہے جس کے
ترجمہ کی ایک نقل وارن ھیسٹنگز نے ۱۷۸۳ء میں آنریبل جان ایسٹ انڈیا کمپنی کے آنریبل ناظما
کو ارسال کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "یہ تصنیف خصوصاً اس لئے ایک قیمتی سرمایہ ہے کہ اس میں
سلطنت مغلیہ کا حقیقی دستور شامل ہے جس کو بیان کرنے میں اس کے بانیوں نے اپنی پوری
توجہ صرف کی ہے"۔ جب نارتھ نے ۱۷۷۳ء میں اپنا ریگولیٹنگ ایکٹ اور پٹ نے
۱۷۸۴ء اپنا قانون ہند نافذ کیا جو "ہندوستان کے قوانین اور دستور یعنے ہندستان کے
قدیم قوانین پر مبنی تھا" تو انھوں نے ان الفاظ میں آئین اکبری کے اس قانون کا ذکر کیا تھا۔

اس کے بعد ۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن نے اپنی مالگذاری اراضی کی پالیسی میں بھی
ملک کے قدیم قوانین کی تائید کی تھی مگر کارنوالس نے پٹ کے قوانین ہند بابتہ ۱۷۸۴ء
کی دفعہ (۳۹) کے خلاف علانیہ موجودہ نظام مالگذاری کو نافذ کیا جس نے ہمارے کاشتکار
کو تباہ کر دیا جس سے زیر یا سویر ہماری مالگذاری بھی ختم ہو کر رہ جائے گی ہم جس مالگذاری کی پالیسی کو
اختیار کریں اس کے لئے کچھ اخلاقی جواز ہونا چاہیئے۔ یہ کہنا کہ "مالگذاری وصول کرنا بلاشبہ حکومت
کا اولین مقصد ہے" ہماری پالیسی کی اخلاقی بنیاد نہیں ہو سکتی۔ اور نہ ایک صحیح اور معقول معاشی مسلک
ہے جس کو ہم آیندہ اختیار کر سکتے ہیں۔ بمبئی کے پروفیسر وکیل کہتے ہیں کہ "محکمۂ مالگذاری ہندستانی
کسان کے لئے ایک ہوا ہے"۔ اسی طرح خود مملکت کے لئے کسی مقدس اصول کی ضرورت نہیں صرف
اخلاقی اصول کے اطلاق یا اس کا اطلاق کرنے کی کوشش سے مملکت اپنا صحیح درجہ اور نمایندہ
کردار حاصل کر سکتی ہے۔ ہندستان میں عیسائی قوت کے عروج سے پہلے ہندو اور مسلمان مملکت
کا یہی تصور رکھتے تھے لیکن عیسائی اقتدار کے بعد ہمارا سماجی اور معاشی نظام تباہ ہو کر رہ گیا۔ ہماری
محصول اندازی مملکت کے حسن سماجی شعور کی آئینہ دار ہے اس کا اندازہ ہمیں محصول اندازی کی
نوعیت کے مطالعے سے ہوگا۔ بدقسمتی سے لنگ اپنی کتاب "اصول معاشیات" میں بتلاتا ہے۔

محصول اندازی میں انصاف پسندی کے سوال پر نافذ الوقت سماجی نظام سے قطع نظر کرکے بحث نہیں کی جاسکتی "حکومت کے آلۂ کار اور اس کو چلانے والی جماعتوں میں سماجی شعور موجود نہ ہو تو کیا ہم محصول اندازی کی ایک معقول اور منصفانہ پالیسی اختیار کرسکتے ہیں؟ اور ایک جدید معاشی شعور کیسے پیدا ہوسکتا ہے جب تک کہ انتہائی نشاۃ ثانیہ رونما نہ ہو یعنے ایک نیا اخلاقی فلسفہ جو حکومت کے ذمہ دار افراد کو جن کے ہاتھوں میں معاشی اقتدار ہوتا ہے اس قدر متاثر کردے کہ وہ ایک غفلت شعار قوم کو گہری نیند سے جگا سکیں۔ جو ایک صدی کی احتیاجوں اور کمزوریوں کی وجہ سے بے اعتنائی و بے توجہی کی اس منزل پر پہنچ گئی ہے کہ گویا وہ اپنے زبان حال سے کہہ رہی ہے "زندگی کا خاتمہ موت پر ہی تو پھر اس محنت و کاوش کی کیا ضرورت ہے ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دو" ہم بڑی صفائی کے ساتھ اپنی مجوزہ کفایت شعاری کا ذکر کرتے ہیں یعنے پانچ دس اور پچاس سال کے لئے تجاویز پیش کرتے ہیں گویا ہمارے ہی حکم سے ہر سال ایک محفوظ ارتقا اور پرسکون نشو ونما ہو رہا ہے۔ میں نے ہندستان کے ایک قابل ماہر معاشیات سے دریافت کیا کہ آیا وہ آیندہ دس سال کے حالات کے بارے میں کچھ کہہ سکتے ہیں تو انھوں نے جواب دیا کہ صرف ایک احمق ایسا کرسکتا ہے۔ میری رائے میں جنگ کے بعد تعمیر نو کے متعلق جو گرما گرم بحثیں کی جاتی ہیں وہ محض شیخی کی باتیں اور آرزو مندانہ خیالات ہیں کیوں کہ ہم یہ نہیں جانتے کہ ہماری سماجی اور سیاسی ہیئت ترکیبی کی بنیاد کیا ہوگی لیکن مجھے صرف اس بات کا علم ہے کہ کرۂ ارض ہماری زندگی کا مدار ہے اور ایسی مملکت کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا جو زائد محصول اندازی کی ناعاقبت اندیشانہ اور مہلک پالیسی کے ذریعہ اراضی کو برباد کردے یا اس سے اپنی قوت حیات حاصل کرے جس کے نتیجہ کے طور پر زراعت اور زرعی معاملات غیر منفعت بخش ہوجائیں اور لگان کی ادائی بھی ناممکن ہوتی جائے۔ جیسا کہ آج کل ہندستان میں "دور ابر کی کفایت شعاری" کے اصول کے تحت ہو رہا ہے۔

کسانوں کے قدیم محفوظ ذخائر قریب الختم ہیں۔ ایک تعلقدار نے مجھ سے کہا کہ اگر ایک فصل خراب ہوجائے تو کسان کی حالت قابل رحم ہوجاتی ہے اور سارے مواضعات کے باشندے

ہراساں و پریشان ہو کر خانہ بدوش ہو جاتے ہیں۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ ساری مغربی معاشیات جو آپ کو جامعات میں آپ کے فاضل معاشین پڑھاتے ہیں وہ غیر متبدل خیالات (مثلاً دقیانوسی مارشل سینور کے خیالات) اور یورپ کی صنعتی ترقی کے تجربہ پر مبنی ہے۔ لے دے کر روس کے سوائے کسی جگہ زرعی معاشیات موجود نہیں ہے اس لیے اگر محصول اندازی کی کوئی بنیاد ہو سکتی ہے جو اخلاقی اور حقیقی طور پر انسان کی فلاح بہبود کی بھی بنیاد ہو تو وہ ہمیں ان قدیم قوانین میں ملتی ہے جو رگ وید سے اخذ کئے گئے ہیں اور جو ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے زمانہ میں بھی نہیں بدلے گئے۔ کیوں کہ دونوں حکومتوں (ہندو اور مسلم حکومتوں) نے اخلاقی بنیاد کو اپنی محصول اندازی کی پالیسی کا اساسی اصول قرار دیا تھا جو غیر معمولی طور پر اتنے مماثل اور مشابہ تھے کہ ہمارے نئے فرقہ واری محبان وطن کی اس بکواس کو سن کر کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے نصب العین مختلف ہیں ذہنی تکلیف ہوتی ہے اور ان کی تاریخ سے لاعلمی ظاہر ہوتی ہے میں پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ قدیم اہم قوانین زرعی ہندستان پر منطبق کئے جا سکتے ہیں کیوں کہ ہماری زرعی معاشیات میں گذشتہ ایک ہزار سال سے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔

آپ پوچھیں گے کہ ہندو و مسلم ہندستان کے یہ عظیم الشان قوانین کیا ہیں؟ میں ان کو تفصیل کے ساتھ نہیں بتلا سکتا۔ بلکہ صرف خاص نکات کو جو ان کے مطالعہ سے حاصل ہوئے ہیں بیان کروں گا۔ زمین کسان کی ملکیت ہوتی تھی۔ وہ کسان بھی ہوتا تھا اور زمین کا مالک بھی۔ بادشاہ زمین کا مالک نہیں ہوتا تھا۔ یہ نظریہ کہ "زمین بادشاہ کی ہوتی ہے"، ہندستان میں عیسائی اقتدار کے ساتھ داخل ہوا۔

منو سمرتی میں بیان کیا گیا ہے کہ "وہ زرعی پیداوار کا چھٹا حصہ وصول کر سکتا تھا"

اس کے شارحین کسیاناا اور جے سی کہتے ہیں کہ "راجہ زمین کسی کو نہیں دے سکتا کیوں کہ وہ سب کی مشترکہ ملکیت ہوتی ہے"۔ ساورا اس کی تشریح کرتے ہوئے کہتا ہے "راجہ پیداوار کی ایک مقررہ مقدار حاصل کرنے کا حق رکھتا ہے کیونکہ وہ فصلوں وغیرہ کی حفاظت کرتا ہے لیکن زمین پر اس کا حق نہیں ہوتا"۔ اس ضمن میں منو یہ فیصلہ کن بات کہتا ہے "زمین اس شخص کی ملکیت ہوتی ہے جو اس پر پہلے کاشت کرتا ہے"۔ ہمیں چندر گپت کے عہد میں کوٹلیہ کے قوانین ملتے ہیں۔ جو

۳۰۰ قبل مسیح میں نافذ تھے جن میں راجہ کے مخصوص فرائض میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ ریاست کی جانب سے مویشیوں کے لئے کافی تعداد میں مفت چراگاہیں مہیا کرے ان تمام تشریحات سے چار نکات حاصل ہوتے ہیں جن کو کسانوں کی خوشحالی کی بنیاد سمجھنا چاہیئے۔

(۱) کسان اپنی زمین کا مالک ہے۔ بعد کو قانون نے اس کے لئے یہ قاعدہ مقرر کیا "کہ زمین ناقابل تقسیم ناقابل انتقال اور ناقابل فروخت ہے"

(۲) محصول اندازی جنس کی شکل میں کی جاتی تھی اور وہ حقیقی زرعی پیداوار کے چھٹے حصہ سے زیادہ نہیں ہوتی تھی جنس کی شکل میں محصول عائد کرنے سے دیہی معاشیات پر اہم و مفید اثرات مترتب ہوتے ہیں۔

(۳) راجہ اخراجات وصول کئے بغیر نقصانات کی تلافی کرے۔

(۴) مویشیوں کے لئے کافی تعداد میں چراگاہیں مہیا کرنا ریاست پر لازم ہے۔

اس آخری نکتہ کا ڈاکٹر ذاکر حسین کے اس بیان سے مقابلہ کیجیئے جس میں انھوں نے حکومت کی موجودہ پالیسی اور ہمارے محکمۂ جنگلات کی بیہدی پالیسی کا نقشہ کھینچا ہے۔ اور ہمارے ملک کے کسانوں کی دولت یعنے مویشیوں کی خرابی اور تباہی سے جو خطرناک نتائج برآمد ہوئے ہیں ان کو گنایا ہے کوٹلیا کا قانون تحفظ اور اس سے زیادہ شہنشاہ اکبر کا قانون تحفظ قابل مطالعہ ہے اور بنگال میں مرشد قلی خان نے جو طریقے اختیار کئے تھے وہ بھی اس قابل ہیں کہ ان کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے۔ جب تک میں نے ان کو نہیں پڑھا تھا۔ اپنے آپ کو ایک خون آشام بولشویک سمجھتا تھا لیکن جب کوٹلیا کہتا ہے کہ راجہ تحفظ کے زمانہ میں مالدار افراد سے زیادہ سے زیادہ مالگذاری (کرسنم) وصول کرسکتا ہے اور نہ صرف یہ بلکہ ان کو اپنی جمع کی ہوئی دولت (ومنم) اگلنے پر مجبور کرسکتا ہے اور جب میں اسٹوارٹ کی تاریخ بنگال میں پڑھتا ہوں کہ "مرشد قلی خاں نے ہر قسم کے اجاروں کو ممنوع قرار دیدیا تھا۔ نفع اندوزوں کو سخت سزائیں دی تھیں اور ذخائر کو باہر نکال کر انہیں جبراً بازار میں بھجوایا تھا" تو مجھے

محسوس ہوتا ہے کہ بیلر بولشویزم دراصل نہایت فیض رساں قسم کی حریت پسندی ہے۔ بہرکیف ہیں
ہندو اور مسلم قانون میں یہ نظیر ضرور ملتی ہے کہ جب مالیات میں خسارہ ہو یا اشیائے خوردنی
کی قلت ہو جائے تو مالداروں پر زیادہ سے زیادہ محصول عاید کرکے ان کی دولت کے
انبار کو گھٹایا جا سکتا ہے (اس کو کرسنم کہتے ہیں) ان کو اپنی جمع کی ہوئی دولت اگلنے پر مجبور کیا
جا سکتا ہے (اس کو دمنم کہتے ہیں) جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا ہندوستان میں عیسائی قوت کے
اقتدار سے پہلے آئین اکبری سلطنت مغلیہ کے نظام محصول اندازی کے متعلق ایک مستند
تصنیف ہے اس سے یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ محصول زمین کا کرایہ (مالگذاری) نہیں
ہوتا تھا بلکہ ایک طرح کا "خراج" ہوتا تھا اور یہ کہ وہ حقیقی پیداوار کے تیسرے حصہ سے
زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اگر زمین کو افتادہ رکھنا مقصود ہوتا
تو کوئی محصول عاید نہیں کیا جاتا تھا اور یہ کہ چراگاہوں کی فراہمی حکومت پر لازم ہوتی تھی۔
نیز قحط کے انسدادی تدابیر کو بہترین طریقہ پر منظم کیا جاتا تھا اور حکومت زمین پر اپنا حق
ملکیت نہیں جتاتی تھی۔ درحقیقت اسلامی فتوحات کی امتیازی خصوصیت جس کا مسٹر امیر علی
نے اپنی "تاریخ عرب" میں ذکر کیا ہے یہ تھی کہ عرب فاتح ہمیشہ کسانوں کے لئے زمین حاصل
کرتے تھے۔ اور یہ بالخصوص خلیفہ عمرؓ کی عاقبت اندیشانہ تدبیر کی عظیم الشان کامیابی تھی۔ بعد کے
حکمرانوں میں یہ اعلیٰ وصف مفقود تھا۔ خلیفہ عمرؓ نے اس بات کو بخوبی محسوس کر لیا تھا کہ سلطنت
کا استحکام اور اس کی مادی ترقی کا انحصار زرعی طبقہ کی خوشحالی پر ہوتا ہے۔ امیر علی کی کتاب
پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

غیر زرعی طبقات مختصراً زرعی ہندوستان اور زرعی حیدرآباد کے لئے میں اس پالیسی کا علمبردار
ہوں۔ اس کو کس طرح روبہ عمل لایا جائے اور دور عبوری میں ہمیں کیا عارضی انتظامات کرنا چاہیئے۔
یہ مسائل اس وقت حل کئے جا سکتے ہیں جبکہ ہم بنیادی اصول کو تسلیم کر لیں۔ یہ ایسا مشکل
نہیں ہے جیسا کہ نظر آتا ہے کیوں کہ ہمارا ملک لازمی طور پر ایک زرعی ملک ہے لیکن اس کے ساتھ ہی

ایک پرشور اقلیت بھی موجود ہے یعنے غیر زرعی طبقہ جو اپنے سیاسی شعور اور معاشی قوت کی وجہہ سے کافی طاقتور ہے ان کے لئے ہم محصول اندازی کی کیا پالیسی اختیار کریں گے ؟ یہ ایک آسان سی بات ہے کہ برطانوی مالیات اور مالگذاری کی تاریخ کو لے لیجئے کیا اس تاریخ کے پس منظر میں بجز مصلحت کوشی اور شدید ضرورت کے کوئی فلسفیانہ یا اخلاقی نظریہ موجود ہے آج ہماری ہندوستان میں وہی حالت ہے جو سنہ ۱۸۴۲ء میں پٹ اور ڈسی ٹارٹ کے عہد میں انگلستان کی تھی۔
جب انگلستان میں انکم ٹیکس نافذ کیا گیا تو اسی طرح "قابل نفرت" "شرمناک" "مفرت رساں" اور "خلاف اخلاق" کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ جس طرح کہ آج ہمارے مستقل مفاد رکھنے والی جماعتیں شور مچا رہی ہیں۔ لارڈ جان رسل نے انکم ٹیکس کی ان الفاظ میں مذمت کی ہے "اس (انکم ٹیکس) کا جاری رہنا اس ملک کے لئے ایک مصیبت عظمیٰ ہے" یہاں بھی ہم نے یہی باتیں سنی ہیں۔ انگلستان میں انکم ٹیکس کی زندگی نے کئی رنگ بدلے لیکن آخر کار اس کو ایک ضرورت تسلیم کرلیا گیا۔ کیوں کہ حکومت کے مصارف بڑھ رہے تھے جیسا کہ آج کل ہمارے یہاں ہورہا ہے۔ اخلاقی پہلو سے قطع نظر کرکے انکم ٹیکس کی اہمیت اور افادیت کو گلیڈ اسٹن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے "انکم ٹیکس نے اس مقصد کو پورا کیا یعنے ایک جہلک کش مکش کے زمانہ میں اس (انکم ٹیکس) سے آپ اپنے ملک کی آمدنی میں اتنا اضافہ کرسکے کہ آمدنی ان اخراجات سے بڑھ گئی۔ جو جنگی اور غیر جنگی حکومت کے زمانہ میں عائد ہوتے ہیں (مالیاتی بیانات سنہ ۱۸۵۳ء۔ ۱۸۶۰ - ۱۸۶۳ء)' معاشیات کے ایک پروفیسر ایسے بھی ہیں جو قرض لینے کی تائید کرتے ہیں لیکن اس کے خلاف ایک عمدہ بیان بھی موجود ہے۔
"ایک نیا قرض محض اس لئے لینا کہ پرانے قرض کو ادا کریں۔ نیا اسٹاک اس لئے ارزاں فروخت کرنا کہ پرانے اسٹاک کو گراں قیمت پر خریدیں۔ بڑی شرح سود پر قرض لینا تا کہ کم شرح سود پر لئے ہوئے قرض کو ادا کریں۔"
تشیلی نے قومی قرضوں کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس کو بھی یاد رکھیئے۔ "ایک دوامی

ضمنی لگان (زر پٹہ)، قومی سرمایہ میں روپیہ لگانے والوں کے مفاد کے لئے عوام پر عاید کیا گیا۔ یہ لازمی طور پر ایک ایسا معاہدہ تھا جو حقوق یافتہ جماعتوں نے۔ جو ملک کے حقیقی حکمران ہیں۔ خود اپنے افراد کے لئے کیا تھا۔ بالواسطہ محاصل اس اصول پر مبنی ہوتے ہیں کہ "سانپ مرجائے اور لاٹھی نہ ٹوٹے" اور یہ محض مصلحت کوشی ہے۔ ہر وزیر مالیات کو بعض اوقات زاید مطالبات کی تکمیل کرنی ہوتی ہے اور ایک ایسا قلیل زائد محصول بالواسطہ عائد کرنا اس کے لئے قرین مصلحت ہوتا ہے۔ جس کے خلاف کم از کم سیاسی شعور رکھنے والی جماعتیں صدائے احتجاج بلند نہ کریں اس کو مصلحت کوشی یا حکمت عملی کہا جاتا ہے لیکن غریب ممالک میں جہاں آمدنی کی سطح بہت پست ہوتی ہے اس کے لئے ایک حد مقرر ہے۔ ریاست کا سارے ملک کی دولت کے ایک حصہ پر متصرف ہو جانے اور مزید محصول (جو انکم ٹیکس کے علاوہ مقررہ حد سے زیادہ آمدنی رکھنے والوں پر عاید کیا جاتا ہے) کے متعلق بہت کچھ بحث مباحثہ ہو چکا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ امریکہ کی قومی دولت تقریباً دو فیصد اشخاص کے ہاتھوں میں ہے اور ان پر کم از کم بلاواسطہ محصول عاید کیا جاتا ہے۔ میں آپ سے قطعی طور پر نہیں کہہ سکتا یا صحیح امداد و شمار نہیں پیش کر سکتا کیوں کہ کسی نے اب تک اس کا حساب نہیں لگایا ہے۔ البتہ ہم اتنا بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ حیدرآباد کی قومی دولت کا (۹۵) فیصد تقریباً ایک فیصد افراد کے ہاتھوں میں ہے اور یہ دولت ایسی ہے جس کا سوت اب تک بند ہے۔ معاشری انصاف کے نقطۂ نظر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس جمع شدہ دولت کے سوتے کو کھولنا چاہیئے۔ لیکن یہ ایک امر متناقض ہے آج کل موقف یہ ہے کہ حکومت اور اس کے مصارف ایک ایسی منزل پر پہنچ گئے ہیں کہ حکومت اراضی اور زرعی طبقوں پر عاید کردہ بالواسطہ اور بلاواسطہ محاصل سے جو آمدنی حاصل کرتی ہے ان سے وہ اپنے مصارف کی پابجائی نہیں کر سکتی۔ زمانہ امن میں حکومت کچھ جوڑ توڑ کر کے اور محفوظات سے قرض لے کر مالی خسارہ کو پورا کرتی تھی۔ لیکن اب وہ ایسا نہیں کر سکتی۔ ہم آجکل یہ عجیب غریب منظر دیکھ رہے ہیں کہ خود حکمران طبقہ ضروریات سے مجبور ہو کر مالی خسارہ کو پورا کرنے کے لئے بالواسطہ یا بلاواسطہ محصول عاید کر رہا ہے۔ چونکہ کسانوں کو

محصول اندازی کے لئے قانون سازی کا اختیار نہیں ہوتا اس لئے حکمران طبقہ کو یہ کام خود کرنا پڑتا ہے اور اس کو انجام دینے کے دو طریقے ہیں ایک تصوریت بالارادہ اور دوسرا تصوریت بالجبر۔ میں اس فریب خیال میں نہیں رہ سکتا کہ اس کام کو بالارادہ انجام دیا جائیگا۔ یہ امر یقینی ہے کہ اراضی پر جو محصول اندازی کی جاتی ہے اس کی انتہا ہو چکی ہے اب اس پر محصول اندازی کا مزید بار نہیں ڈالا جا سکتا۔ ایک مرتبہ محکمہ مالگذاری نے بڑے فخر کے ساتھ محکمہ فینانس کو اطلاع دی تھی کہ اس کی (۹۰) فیصد توقعات پوری ہو گئیں"۔ ہاں ٹھیک ہے لیکن یہ توقعات نہایت غیر انسانی طریقوں سے پوری کی گئیں"۔

یہ الفاظ مجھ سے ایک تعلقدار نے کہے جن کے آنکھیں فرط مایوسی سے اشکبار تھیں محصول اندازی اس لئے نہیں ہے کہ موازنہ کے خسارہ کو پورا کیا جائے بلکہ وہ سماجی اصلاح کے لئے بھی ہوتی ہے لیکن زائد محصول اس وقت تک عائد نہیں کرنا چاہیئے جب تک مصارف میں ممکنہ حد تک تخفیف نہ کر لی جائے آمدنی کا بہت کچھ حصہ رس جاتا اور خورد برد ہو جاتا ہے ایسے نا اہل اور بلا ضرورت عہدہ دار بھی ہیں جو کوئی کام نہیں کرتے۔ ان حالات کو بدلنے کا صرف ایک موثر طریقہ ہے۔ یعنے حکمران جماعتیں ایک جدید اخلاقی اور روحانی نظریہ اختیار کریں جو تصوریت بالارادہ ہو یا تصوریت بالجبر۔ اس کا انتخاب وہ خود کریں اس جدید روحانی نظریہ کے بغیر ساری اصلاحات بے سود ہیں۔

ایک طبیب کی حیثیت سے میرا یہ جائز منصب نہیں ہے کہ میں ایسی تجاویز مرتب کروں جن کا تعلق میرے دائرہ عمل سے نہ ہو۔ میرا مقصد حیات یہ ہے کہ ہمارے دیہی باشندگان کے لئے طبی امداد کا ایک نظام ترتیب دوں۔ باوجودیکہ اس سے حوصلہ شکن بے اعتنائی و بے حسی برتی جا رہی ہے لیکن میں گزشتہ سات سالوں سے کسی مدد کے بغیر یہی کر رہا ہوں قبل ازیں ہمارے محکمہ طبابت نے بھی اس کی سخت مخالفت کی۔ یہ محکمہ خود تو اس مسئلہ کو حل نہ کر سکا لیکن دوسروں نے اس کو حل کرنے کی سعی کی تو وہ معترض ہوا۔ اب زمانہ نے کروٹ لی ہے اور گذشتہ چند سالوں کے تخریبی زمانہ کی بہ نسبت جبکہ ہماری عظیم الشان توقعات مایوسی میں بدل رہی تھیں۔ اب زیادہ صاف تازہ اور امید افزا ہوائیں چل رہی ہیں۔

———

حیدرآباد میں محاصل اندازی کا مسلک

از جناب محمد عطاء الرحمن صاحب علوی صدر بزم معاشیات جامعہ عثمانیہ

اس دنیا میں انسانی زندگی جب عالم وجود میں آئی اور ایک خاندان سے قبیلہ کی تشکیل ہوئی پھر قومیں اور نسلیں ترتیب پائیں تو اس کی سماجی شیرازہ بندی اور تمدنی ترقی کے لئے ضروری قرار پایا کہ ہر شخص اجتماعی زندگی کے مفاد کے لئے اور کسب معاش کے انفرادی حقوق کی آزادی اور تحفظ کے لئے اپنی مکسوبہ املاک سے ایک جز اس ادارہ کے اخراجات کے لئے دے جو سماجی ضبط و نظم اور افراد میں ان کی صلاحیتوں کے اعتبار سے ایک طرح کا توازن برقرار رکھے۔ یہ محافظ ادارہ رفتہ رفتہ حکومت کے نام سے موسوم ہوا اور قوم کی اجتماعی زندگی کو درست اور منظم رکھنے کے لئے ہر فرد نے جو قربانی کی اور ایثار دکھایا وہ محاصل کہلائے۔ تاریخ عالم کے ابتدائی دور میں جب تک سکہ رائج نہ ہوا تھا یہ محاصل خدمات اشیاء وغیرہ کی صورت میں ادا کئے جاتے تھے۔ مگر پھر وہ زمانہ آیا جبکہ سکے چلنے اور محاصل کی ادائی گی کا ذریعہ بھی وہی قرار پائے یہاں تک کہ عہد حاضر اقوام کے تمدنی ارتقاء کا ثبوت اس کے جائز اور صحیح محاصل کی زیادتی سے دیا جانے لگا اور جس طرح فضا کی گرمی معلوم کرنے میں مقیاس الحرارت کام دیتا ہے اسی طرح کسی ملک کی حکومت اور تہذیب کا بلند پایہ ہونا اس کے محاصل سے منکشف ہوتا ہے۔ محاصل یہ بتاتے ہیں کہ قوم کی اجتماعی زندگی کو استوار رکھنے اور بہتر بنانے کے لئے اس کے افراد کا جذبہ قربانی کتنا ہے۔

ان محاصل کی نوعیت مختلف نظام ہائے حکومت میں جداگانہ ہے۔ اسلامی نظام میں

عشر، زکواۃ، خمس، جزیہ کے طریقے شامل ہیں۔ ازمنۂ وسطیٰ کے یورپ میں دوسرے امور کی طرح محاصل میں اس قدر ترتیب و تنظیم نہ تھی جتنی کہ آج پائی جاتی ہے اور اکثر شاہان مغرب اجاروں اور عہدوں کی خرید و فروخت پیش کش اور جبری قرضوں کے ذریعہ سے روپیہ کی کمی کو پورا کرتے تھے۔ زمانۂ حال کے متمدن ممالک کی آمدنی کا دار و مدار عام طور پر علاوہ محصول زر آمد و برآمد و محصول چنگی کے فوتی محصول، محاصل آمدنی مکانات و جائداد پر ہوتا ہے۔ ساتھ ہی اکثر مملکتوں میں بعض ایسے کاروبار انجام دیئے جاتے ہیں جن سے حکومت کو خاصہ منافع ہو جاتا ہے مثلاً تار، ڈاک، ٹیلیفون، کاغذ ممہور وغیرہ۔ بعض ممالک میں حکومت ہی کو چند مخصوص اشیاء کے تیار اور فروخت کرنے کا واحد اجارہ ہوتا ہے جیسے فرانس میں سگریٹ دیا سلائی اور ہندستان میں افیون۔ ہمیں یہاں دیکھنا یہ ہے کہ ہماری حکومت آصفیہ مملکت کے کاروبار کی انجام دہی کے لئے حصول آمدنی کے کیا طریقے اختیار کرتی ہے۔ اور موجودہ ذرائع آمدنی حکومت آصفیہ کے کیا ہیں۔

حضرات! آپ یہ خیال نہ فرمائیں کہ میں اعداد و شمار کا ایک لامتناہی سلسلہ یا طویل فہرست پیش کروں گا بلکہ اس کے برعکس حتی الوسع میری کوشش ہوگی کہ یہ ناگوار بار آپ کی سماعت پر نہ پڑے۔ ہماری حکومت کی موجودہ آمدنی (۱۳ر۴۳۴۹ لاکھ) اور خرچ (۱۳۱ء۸۳۴۹) لاکھ ہے۔ آمدنی کی کمی کے باعث یا خرچ کے مدات میں اضافہ کے باعث ہماری حکومت کے خرچ کا موازنہ اس سال آمدنی سے زاید ہے۔ میں یہاں اس کے مختلف اسباب و علل پر بحث نہ کروں گا۔ آگے ممکن ہے کسی مناسب جگہ پر اس کا ذکر آئے۔ منجملہ (۱۳ء۴۳۴۹ لاکھ) آمدنی کے اس میں سب سے بڑی مد تحصیل یا مالگزاری کی ہے۔ اس کے بعد آبکاری کا نمبر آتا ہے اور تیسرے ریل چوتھے کروڑگیری پانچویں کاروباری منافع کا نمبر آتا ہے۔ چھٹے برار کا محصول ساتویں زر کاغذی کی آمدنی آٹھویں اسٹامپ اس کے بعد اور مدات کا نمبر آتا ہے جس میں جنگی جنگلات وغیرہ کی آمدنی شامل ہے۔ اس وقت ہر بہی خواہ مملکت آصفیہ کے پیش نظر سال حال کے موازنہ میں خسارہ ہے اور موجودہ اخراجات میں بڑھتی ہوئی ضروریات شامل ہیں۔ یہاں غیر مناسب نہ ہوگا اگر ایک

سرسری خاکہ پیش کرتے ہوئے آمدنی کے جدید ذرائع معلوم کرنے کے لئے حکومت کے موجودہ محاصل
اندازی کے مسلک پر غور کیا جائے ۔ اس نظریہ میں اگرچہ کہ بہت کچھ اختلاف رہا ہے کہ حکومت کو
آمدنی کے لحاظ سے اخراجات کی مدات کا تعین کرنا چاہیئے یا اخراجات کی بناء پر آمدنی کے ذرائع
تلاش کرنا چاہیئے ۔ اس موضوع کو اس مختصر صحبت میں زیر بحث نہ لاتے ہوئے ثانی الذکر نظریہ کو
اہمیت دوں گا ۔ یعنے ہماری حکومت کو اپنی بڑھتی ہوئی ضروریات کے پیش نظر جدید ذرائع آمدنی
پر نظر ڈالنی چاہیئے ۔ اس لئے معلوم کریں کہ آج کل حکومت کے فرائض اور اخراجات میں کس قدر
اضافہ ہوگیا ہے اور اس میں مزید اضافہ کے کیا امکانات ہیں ۔

حضرات ! اب حکومت کے فرائض میں چونکہ ملک کی حفاظت اور اندرونی تنظیم ہی
نہیں داخل ہے بلکہ ملک کی معاشی فلاح وبہبود کے انتظامات بھی ضروری ہوگئے ہیں ۔ اس لئے
اخراجات میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے ۔ مسٹر ۔ جی ، ڈی ایچ ، کول آکسفورڈ یونیورسٹی کے ریڈر نے
(The Growth of Public Expenditure) کے عنوان پر جو مضمون لکھا ہے
اس سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا کی مختلف حکومتوں کے اخراجات میں اضافہ ہوجانے کی وجہ سے
صرف محاصل میں بمقابلہ سنہ ۱۹۱۳ء کے ۲۹-۱۹۲۸ء میں برطانیہ عظمیٰ کے محاصل میں چار گنا
اضافہ ہوا ۔ اب اس جنگ کے آغاز سے جو غیر معمولی اضافہ ہوا ہے اس کا کوئی حد شمار ہی نہیں ۔ ہندوستان
میں بھی بمقابل ۱۹۱۳ء کے آج بہت ہی کثیر اضافہ ہوا ہے حکومت آصفیہ کے مصارف
میں بھی کافی اضافہ ہوا ہے ۔

سامعین کرام پر واضح ہوا ہوگا کہ دن بدن حکومت کے اخراجات کس طرح بڑھتے
جارہے ہیں اور ہر حکومت لمحہ بہ لمحہ اضافۂ آمدنی کے ادھیڑ بن میں کس طرح مصروف ہے ہمیں
یہاں دیکھنا یہ ہے کہ ہماری حکومت کے مصارف میں جو تدریج اضافہ ہوتا گیا اور اب حالت
اس نوبت پر آگئی کہ آمدنی و خرچ کا توازن بگڑ گیا اور عدم توازن کی کیفیت نمودار ہوگئی ۔ آخر
اس کا حل کیا ہے اور ہماری حکومت کن مدات آمدنی کے ذریعہ اپنے بڑھتے ہوئے اخراجات کا

پابجائی کرے ۔جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا جاچکا ہے ہماری حکومت کے موجودہ ذرائع آمدنی محدود ہیں۔ مثلاً مالگذاری کا موجودہ بار ہی زمیندار اور کاشتکار طبقہ پر کیا کم ہے جو اس میں کسی مزید اضافہ کی گنجائش نکالی جائے ۔ اسی طرح آبکاری جس میں افیون گانجہ اور سیندھی کی آمدنی شامل ہے عموماً مفلوک الحال اور غریب رعایا کی جیب سے نکلی ہوئی آمدنی ہے ۔ لہذا معلوم ہوا کہ اس مد میں بھی حکومت کے بڑھتے ہوئے اخراجات کے پیش نظر کوئی اضافہ نہیں کیا جاسکتا ۔بلکہ اس کے برخلاف حکومت نے ترک مسکرات کی مہم کا آغاز کیا ہے ۔ مالگذاری اور آبکاری کے بعد جس تیسری مد پر ہماری نظر پڑتی ہے وہ ریل کی آمدنی ہے ۔اگرچہ کہ اس میں اضافہ کا امکان ہے مگر کچھ نکلنے کے بعد ۔ ریل کی آمدنی کے بعد کروڑ گیری کی آمدنی اس طرح معین ہوجاتی ہے کہ حکومت ہند کے معاہدات کی رو سے موجودہ محصول در آمد کی انتہائی شرح یعنے پانچ فیصد میں اضافہ نہیں کیا جاسکتا ۔ اسی طرح برار کا محصول ہے اس کی مقدار بھی معین ہے ۔غرض کہ موجودہ مدات آمدنی میں اس نسبت سے کوئی زائد رقم نہیں حاصل کی جاسکتی جس نسبت سے اس وقت حکومت کو مختلف النوع ضروریات کی انجام دہی کے لئے روپیہ درکار ہے ۔

سوال یہ ہے کہ کس طرح حکومت اپنی آمدنی میں اضافہ کرے اس کے جواب کے لئے ہمیں حکومت کے موجودہ محاصل اندازی کے مسالک پر غور کرنا ہوگا کسی مسئلہ کی جانچ پڑتال اس وقت بہتر نتائج کی حامل ہوتی ہے جبکہ اس کو اصول کی کسوٹی پر پرکھا جائے ۔حکومت کے اچھے مالیہ کے لئے نہ صرف توازن محاصل کا لحاظ ضروری ہے بلکہ محاصل بلاواسطہ اور محاصل بالواسطہ میں ایک خاص قسم کا توازن بھی قائم رکھنا ضروری ہے یہاں قطعی طور پر یہ بیان کرنا مشکل ہوگا کہ ان دونوں میں کون سا اصول بہتر ہے ۔ مگر ہر ترقی یافتہ اور اچھی حکومت کے مستحکم مالیہ کی بنیاد ان دونوں محاصل کے ایک خاص توازن پر ہوتی ہے جو حق و انصاف پر مبنی ہو ۔معاشین کی اکثریت اس سے متفق ہے کہ بالواسطہ طرز کے محاصل کا بار زیادہ تر عوام پر پڑتا ہے اور اس سے ان کی اقتصادی حالت بحیثیت مجموعی متاثر ہوتی ہے ۔اس طرز کے محاصل عوام کے ایثار کا ثبوت دیتے ہیں اور محاصل بلاواسطہ کا بار بہت بڑی حد تک صرف طبقۂ امرا اور مالداروں پر ہوتا ہے ۔یہ محاصل خواص کے جذبہ خدمت

اور ایثار کا ثبوت پیش کرتے ہیں جو اپنی خصوصی حیثیت کے باعث منظم حکومت کے ثمرات سے سب سے زیادہ مستفید ہوتے ہیں۔ اب یہاں دیکھنا یہ ہے کہ ہماری حکومت ابد مدت میں ان دونوں محاصل کی کیا صورت حال ہے اور کس حد تک حکومت کا مسلک محاصل اندازی اصول و انصاف پر مبنی ہے۔

اگر محاصل کا ایک مقصد حکومت کے اخراجات کے لئے روپیہ کی فراہمی ہوتا تو دوسرا اہم مقصد باشندگان ملک کے مابین دولت کی تقسیم میں ایک خاص قسم کا توازن رکھنا ہوتا ہے آج عالمی بے چینی اور مختلف النوع معاشی تحریکات کا باعث یہی عدم توازن تقسیم آمدنی ہے۔ اس ضمن میں مزید کچھ عرض کئے بغیر حکومت آصفیہ کے محاصل بلا واسطہ اور بالواسطہ کی تشریح ضروری ہے جیسا کہ ہر معاشی مسائل سے دلچسپی رکھنے والا واقف ہے کہ وہ محصول جس کا بار صرف ادا کرنے والے پر قائم رہے اور دوسرے شخص پر منتقل نہ ہوسکے محصول بلا واسطہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اس کی بہترین مثال محصول آمدنی محصول فوتی اور محصول وراثت ہے۔ اس کے برعکس اگر محصول کا بار ادا کرنے والے پر قائم نہ رہے بلکہ کسی اور شخص پر منتقل کیا جاسکے تو اسے محصول بالواسطہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کی مثال کروڑگیری جنگی اور آبکاری ہے جیسا کہ اوپر اپنی حکومت کے مدات آمدنی کا ذکر کیا گیا ہے یہاں محاصل صرف آبکاری جس میں سیندھی افیون گانجہ شامل ہے اور جنگی جس میں سلائی شکر اور سگریٹ شامل ہے عاید کئے گئے ہیں۔ ان محاصل آبکاری اور جنگی کا شمار محاصل بالواسطہ میں ہے علاوہ ان محاصل کے مملکت حیدرآباد میں کوئی محصول نہیں ہے۔ اگر مالگزاری کو ٹیکس مان لیا جائے جو معاشین کے درمیان بہت ہی مابہ النزاع مسئلہ ہے تو صرف یہ آمدنی راست محاصل یا بلا واسطہ محاصل میں شمار کی جاسکتی ہے۔ اس طرح یہ واضح ہوجاتا ہے کہ ملک میں محاصل اندازی کا مسلک یکطرفہ ہے اور جو بھی محاصل بالواسطہ عائد ہیں ان کا بار زیادہ تر عوام پر ہے اور وہ طبقہ جو ملک کے عوام کے خون پسینہ ایک کی ہوئی دولت سے وقت اور حالات کی مجبوری سے پورا فائدہ اٹھا کر حکومت کے عمدہ نظم و نسق سے مستفید ہوتا ہے حکومت کی کوئی رقمی معاونت نہیں کرتا ہے۔

حکومت مالگذاری اس طبقہ سے وصول کرنا روا رکھ سکتی ہے جس کی آمدنی توکل علی اللہ ہے اور

جیسے مالگذاری اور لگان ادا کرنے کے بعد نہ صرف سیر ہو کر دن کے چوبیس ساعتوں میں کھانا نصیب ہوتا ہے اور نہ تن پوشی کے لئے کافی کپڑا۔ اس ضمن میں ہمارے دردمند کرم کے نباض اور اس مملکت ابد مدت کے تاجدار خسرو دکن حضرت بندگان عالی کے ارشادات جو اخبار صبح دکن مورخہ ۵ آذر ۱۳۴۵ ف میں طبع ہوئے ہیں ملک کے غافل طبقوں کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہیں جو دوسرے مفلوک الحال طبقوں یا افراد کا بہت کم خیال کرتے ہیں یعنی مالگذاری کے آبکاری اور کروڑگیری کا بھی بار ملک کے عوام پر پڑ رہا ہے۔ اور اس کے اثرات کے احساس سے سرمایہ دار طبقہ بالاتر ہے۔ یہ قول کسے ہم یہ تو کہتے نہیں کہ عہدہ داران حکومت میں روایتی مرعوبانہ ذہنیت کا یہ نتیجہ ہے کہ حکومت کے نزدیک محاصل اندازی کے ضمن میں نظر خواص پر شاید اس لئے نہیں پڑتی کہ ان کی دلگیری مقصود نہیں مگر اس الم انگیز منظر سے ہمارا دل بھر آتا ہے جب ان معاشی ٹھیکہ داروں کی ٹھکرائی ہوئی پست حال مفلس گرسنہ و نیم برہنہ اولاد آدم کو سسک سسک کر دم توڑتے دیکھتے ہیں۔ اب آپ حضرات پر یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ ہمارے یہاں محاصل بلاواسطہ اور بالواسطہ میں نہ صرف عدم توازن ہے بلکہ بلاواسطہ محاصل کا بڑی حد تک وجود ہی نہیں ہے اور جو طریقۂ محاصل ہماری حکومت نے رائج کر رکھا ہے اس کا ہدف زیادہ تر غریب رعایا اور عوام ہی ہیں اگر آپ حضرات اجازت دیں تو میں دور حاضر کے چند متمدن ممالک اور ترقی یافتہ قوموں کے یہاں ان دونوں محاصل میں جو تناسب ہے بیان کروں مسٹر کول اپنی کتاب The Intelligent Man's Guide Through World Chaos میں لکھتے ہیں سنہ ۱۹۳۱-۳۲ء میں برطانیہ عظمیٰ کے کل محاصل کا اکاون فیصد صرف حصول آمدنی تھا۔ اور وراثتی محصول نو فیصد اس طرح جملہ محاصل بلاواسطہ کا تناسب ساٹھ فیصد تھا اور بالواسطہ محاصل صرف چالیس فیصد اسی طرح ممالک متحدہ امریکہ میں محاصل بلاواسطہ کا تناسب ۶۸٫۳ فیصد اور بالواسطہ محاصل کا تناسب ۳۱٫۷ ہے برطانوی ہند میں بھی محاصل بلاواسطہ اور بالواسطہ کی نسبت ۴۸٫۵ اور ۵۱٫۵ ہے اب غالباً میرے سابقہ بیان کی حقیقت آپ حضرات پر منکشف ہو گئی ہوگی کہ کس طرح ہمارے یہاں ایک طرف محاصل کی پالیسی پر عمل درآمد ہو رہا ہے اور سرمایہ دار طبقہ محاصل سے آزاد ہے

بجز اس کے کہ خصوصی کمروں کے کرایہ کو آمدنی سے تعبیر کیا جائے۔ محکمۂ بلدیہ کو اب نہ تو محض آمدنی کا محکمہ کہتے ہیں اور نہ صرف خرچ کا محکمہ۔ واقعہ یہ ہے کہ محکمۂ بلدیہ اپنی جگہ ایک حکومت ہے جس کے اختیارات محدود اور جس کے حدود محض مقامی ہوتے ہیں۔ گو یہ سچ ہے کہ بعض شہروں مثلاً بمبئی، کلکتہ کے بلدی محکمہ کا مقابلہ ان کی آمدنی ان کے خرچ کی حد تک بہت سے ریاستوں اور صوبوں سے بآسانی کیا جاسکتا ہے۔ اور حکومت کے ان مقامی اداروں میں ان کی متعلقہ امور کی تکمیل کے لیے نہ صرف مصارف کرنے کی ضرورت ہے بلکہ ان کے لئے مقامی محاصل کے ذریعہ گنجایش بہت فراہم کرلی جاتی ہے۔ کسی محکمۂ بلدیہ کے متعلقہ امور کیا ہیں ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے لیکن ان کی تعداد بہت زیادہ ہے اور ان کی نوعیت بھی قسم قسم کی ہے مختصر یہ کہ ان سے کسی شہر میں رہنے والے کو پوری پوری شہری آسایش فراہم ہوتی ہے لیکن یہ انتظام اس پر مشروط ہے کہ اس محکمۂ بلدیہ کی آمدنی کس قدر ہے اور اس کے محاصل کیا ہیں اور کتنے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جتنی زیادہ آمدنی ہوگی اتنی ہی زیادہ آسائشوں کا انتظام محکمۂ بلدیہ کرسکے گا۔ لیکن ہمارے شہر حیدرآباد کا کچھ عجیب حال ہے یہاں وہ سارے شہری آسائش شہریوں کو حاصل ہیں کہ جو ہندستان کے کسی بھی شہر کے رہنے والوں کو حاصل نہیں ہے اس کے باوجود ہمارا محکمۂ بلدیہ ان میں سے بہت ہی کم آسایشوں کو خود فراہم کرتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی آمدنی کے ذرائع محض چند محاصل ہیں جن سے بہت ہی معمولی مقدار میں رقم جمع ہوتی ہے۔

جناب صدر! محکمۂ بلدیہ حیدرآباد جو چند محاصل وصول کرتا ہے ان میں سے سب سے اول محصول جائداد ہے یہ کہنے کو محصول جائداد ہے مگر صرف مکانات پر وصول کیا جاتا ہے۔ کھلے میدانوں پر وصول نہیں ہوتا اور اس کی شرح سالانہ کرایہ کی مقدار سے دس فیصدی رقم وضع کرلینے کے بعد صرف ساڑھے سات فیصدی ہے یہ آٹھ آنہ کنسر بنسی ٹیکس یعنے محصول خاشاک بر داری سے موسوم ہیں حساب لگایا گیا ہے کہ اس طرح ایک ماہ کے حقیقی یا متوقع کرایہ کا بمشکل دو تہائی حصہ مالکان مکان ادا کرتے ہیں، سرکار عالی کے مکانات پر بھی یہ محصول ادا ہوتا ہے۔

دوسری اور آخری قسم محصول۔ قسم کی سواریوں پر ادا کی جاتی ہے۔ لیکن یہ دیکھا گیا ہے کہ کسی سواری کو چالو رکھنے کے جو سالانہ مصارف ہوتے ہیں اس کا ایک دھا بھی محکمہ بلدیہ کو وصول نہیں ہو رہا ہے۔

جناب صدر! محکمہ بلدیہ حیدرآباد چونکہ کھانے پینے کی اشیاء نیز ایسی اشیاء کی کہ جو مضر صحت ہیں یا خطرناک ہیں تجارت کی اجازت دینے کا قانوناً ذمہ دار ہے لہذا اس طرح کے اجازت ناموں کی اجرائی سے بھی اسے کچھ رقم ملتی ہے لیکن یہ رقم اس لئے زیادہ نہیں ہے کہ یہ فیس محض رسمی طور پر لی جاتی ہے تاکہ اجازت نامہ کی قدر و قیمت ملحوظ رکھی جائے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ قانون بلدیہ حیدرآباد میں ایسے قواعد بنانے کی کارروائی بہت ہی مختصر تھی ان قواعد کی اشاعت عام طور پر کرنے کا کوئی لزوم نہ تھا اور اس طرح ۱۳۴۸ف میں بہت کچھ قواعد بن سکے۔ لیکن حکومت سرکار عالی نے ایک حکم جاری کر کے یہ طریقہ قائم کر دیا کہ ایسے قواعد منظوری سے پہلے منجانب سرکار عالی عام طور پر شائع ہوں اور اس کے بعد ان کی منظوری پر غور کیا جائے بلاشبہ اس طرح رائے عامہ سے مشورہ لینے کی تعمیل ہوئی لیکن اس طرح سے ایسے قواعد کی منظوری بھی تاخیر سے ہونے لگی کہ جس سے بلدیہ کو اپنے اختیارات نگرانی میں خاصی توسیع کے ساتھ کچھ نہ کچھ آمدنی بھی ہو جا رہی تھی۔

جناب صدر! محکمہ بلدیہ حیدرآباد دکن کو اپنی جائداد سے بھی کچھ آمدنی ہے۔ مثلاً اس کی زمینات ہیں جن پر لوگوں نے مکانات بنا لئے ہیں اور اب وہ ان کے استعمال کے معاوضہ میں نزول ادا کرتے ہیں ہمارے محکمہ بلدیہ کے کچھ مارکٹ اور مسلخ بھی ہیں جہاں کے کاروبار کی بابت معاوضہ کے طور پر محکمہ بلدیہ کو کچھ رقم مل جاتی ہے نیز بعض راستوں پر سر راہ جو عارضی دوکانات لگی ہوئی ہیں ان کا بھی کچھ کرایہ وصول ہوتا ہے محکمہ بلدیہ حیدرآباد کو کچھ آمدنی ایسی بھی ملتی ہے جسے معاوضہ محنت کہا جا سکتا ہے اس میں محکمہ آبرسانی بلدہ اور محکمہ صرف خاص کے محاصل وصول کرنے کا معاوضہ شامل ہے۔ جو محاصل کی جملہ رقم کا دسواں حصہ ہوتا ہے۔ نیز حدود بلدہ میں مختلف کاروباریوں کے اشتہارات لگانے کی خدمات کا صلہ بھی شامل ہے۔

جناب صدر! اسی طرح محکمہ بلدیہ حیدرآباد کو پاخانہ خاکروبوں سے (۲-۲ روپیہ فی خاکروب) وصول ہوتے ہیں تاکہ ان کے لائے ہوئے فضلے کو جمع کرکے دوبارہ باہر پھینکا جائے اور بلاشبہ ہمارا محکمہ بلدیہ اس فضلے کو نیز ایسے کچرے کو جو اس کی ہنڈیاں اٹھا رہی ہیں کھاد بنا کر کچھ معمولی رقم جمع کر رہا ہے یا پھر مرے ہوئے جانوروں کے اٹھانے چلنے کا کچھ معاوضہ ملتا ہے اگرچہ بعض اوقات مالکوں کا پتہ نہ چل کر یہ رقم حساب سے خارج کرنی پڑتی ہے۔

۱۳۴۴ھ میں محکمہ بلدیہ حیدرآباد نے مکانات تعمیر کرنے والوں سے مکان کی تعمیر کے اجازت نامے کی اجرائی پر بموجب قانون بلدیہ کی رو سے ہر تعمیر کرنے والے کو حاصل کرنا لازمی ہے کچھ رقم مکان کی حیثیت کے لحاظ سے بطور فیس اجازت نامہ وصول کرنا شروع کیا تھا لیکن اس کو بھی سرکار عالی نے بلا اجازت اور خلاف اختیار قرار دیکر بند کر دیا۔

سرکار عالی سے محکمہ بلدیہ کو سالانہ چار لاکھ روپیہ بھی مل رہا ہے۔ دیکھنے کو تو یہ بہت بڑی رقم ہے لیکن جس چنگی کی وصولی کے عوض یہ روپیہ ادا ہو رہا ہے اس سے کئی گنا زیادہ رقم وصولی کا موقع تھا۔

جناب صدر! اب مجھے اضلاع ملک سرکار عالی کے مقامی ادارات کے وسائل کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے آپ یقین کریں کہ اضلاع کے ایسے ایسے قصبوں میں بھی جہاں کہ آبادی سات ہزار آٹھ ہزار ہے بلدہ کے مقابل نہ صرف گھر پٹی بلکہ روشنی پٹی بھی وصول ہوتی ہے۔ یعنے نہ صرف محصول جائداد بلکہ محصول روشنی بھی وہاں مساوی مقدار میں وصول ہوتا ہے۔ اس طرح وہاں کی آمدنی دوگنی ہو چکی ہے۔ وہاں روشنی کے لئے روشنی پٹی کے آدھے یا تین چوتھائی حصہ کو صرف کرکے بقیہ رقم دوسرے کاموں میں لگائی جاتی ہے۔ البتہ وہاں سرکاری مکانات پر کوئی محصول ادا نہیں ہوتا اور یہ وصول ہونے لگے تو ان مجالس کو بڑی امداد ملنے لگے گی۔ علاوہ گھر پٹی روشنی پٹی کے جس کی شرح سالانہ کرایہ کے ہر روپیہ پر (۳ پائی سے لے کر ۹ پائی تک بلکہ ۱۲ پائی) ہوتی ہے۔ بعض قصبات اور شہر جہاں نل لگائے گئے ہیں نل پٹی بھی وصول کر رہے ہیں

اور اس طرح یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اضلاع کے قصباتی اور شہری بلدہ حیدرآباد کے رہنے والوں کے مقابلہ میں زیادہ بار اٹھا رہے ہیں حالانکہ ان کے مکانات کی مالیت کرایہ کے اعتبار سے اتنی زیادہ نہیں ہے۔ سواریوں پر بھی انھیں ٹیکس وصول ہوتا ہے۔

اضلاع کی مجالس قصبات و بلدیات کو اپنے مارکٹوں اور سلخوں کے سوا اپنے ہاں کی ہفتہ واری بازارات میں دکان لگانے والوں سے کرایہ کے طور پر کچھ رقم مل جاتی ہے۔ حالانکہ محکمۂ بلدیہ حیدرآباد کو جمعرات بازار یا منگل ہاٹ سے کوئی رقم نہیں ملتی۔ سب سے بڑے مسلخ واقع بیگم بازار یا سب سے بڑے مارکٹ (معظم جاہی مارکٹ) کی آمدنی اسے غیر علاقوں کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ وہ حدود صفائی کے کچرے کو بھی کچھ نہ کچھ رقم پر فروخت کر دیتے ہیں ان میں بعض نے فضلہ اور کچرے کو ملا کر کھاد بنانا بھی شروع کیا۔ لیکن ان کی سب سے بڑی آمدنی کا ذریعہ حدود صفائی میں مال اور سامان لے کے داخل ہونے والی وہ گاڑیاں ہیں جو بار برداری چنگی ادا کرتی ہیں۔ اضلاع کے بعض شہروں میں اس بار برداری چنگی کا ہراج سالانہ (۷۵,۰۰۰) روپیہ (۸۰,۰۰۰ روپیہ) پر ہوتا ہے۔ اگر محکمۂ بلدیہ حیدرآباد کو بھی بار برداری چنگی کی وصولی کی اجازت مل جائے تو بآسانی کئی لاکھ روپیہ محکمۂ بلدیہ حیدرآباد کو وصول ہو سکتا ہے۔

واضح رہے کہ یہ آمدنی محکمۂ کروڑگیری کی آمدنی کے سوا ہوگی۔

جناب صدر! اضلاع سرکار عالی کے مجالس قصبات اور بلدیات کو ان کی مجالس ضلع سے بھی اعانت ملتی ہے تاکہ انھیں سہارا ہو اور اپنی ضرورتوں کو پورا کریں ان مجالس ضلع کا اکیلا ذریعہ آمدنی زر مالگزاری کے ہر روپیہ پر ایک آنہ کی وہ زائد رقم ہے جو ہر مالگزار ادا کرتا ہے کسی ضلع میں نالے یا ابھی پلوں سے محروم ہوں اُن کو پار کرانے کے حقوق عبور و مرور کے ہراج سے بھی کچھ رقم جمع ہوتی ہے۔ کونڈواڑہ سے بند سرانہ بھی وصول ہوتا ہے ان مجالس نے آبادی کی توسیع کے لئے زمینات خرید کر ان کے پلاٹ بناتے ہوئے انہیں ہراج کر کے زمینات کی خریدی اور پلاٹ بندی کے وہ مصارف جو توسیع آبادی کے لئے انھوں نے برداشت کئے حاصل کرنے کا سلسلہ بھی شروع کیا ہے بعض اضلاع

میں جہاں مویشی کے بازار ہوتے ہیں مویشی کی فروخت پر جانب قلعدار داخلۂ فروخت اجرا ہوتا ہے۔ اور
اس کی بابت فی داخلہ چار آنہ جمع کرکے مویشی کے آرام کا انتظام کیا جاتا ہے ورنہ مقدمان دیہات یہ رقم بطور
معمول خود جمع کر لیتے تھے ۔

سرکار عالی نے ۱۳۳۳ف میں پانچ لاکھ روپیہ ان مجالس قصبات و بلدیات پر تقسیم کیا ہے ایسی
قصبات میں نلوں کے قیام اور موریوں کی تعمیر کے مصارف تین چوتھائی حصہ کی سرکار عالی سے بھی ادا ہوئی
ہے کہ جن کو سرکار عالی کی مجلس آبرسانی اضلاع نے ان کی اہمیت کے لحاظ سے ان آسائشوں کا مستحق
قرار دیا ان مجالس کو بقیہ چوتھائی رقم بھی بطور قرضہ اس مجلس کی اختیاری گنجائش سے ملتی ہے۔ اور اقساط
میں واپس ہوتی ہے بعض قصبات میں محکمۂ تعمیرات عامہ سرکار عالی نے اپنے ان سڑکوں کو مانع گرد تعمیر
کرکے جو حدود صفائی سے گذرتی ہیں ان مجالس کے رہنے والوں کی آسائش کا اہتمام کیا ہے مگر یہ سب
مصارف سرکار عالی کے ان مصارف کے مقابل میں جو بلدۂ حیدرآباد کی صحت و عافیت نیز آرائش اور
سلامتی کے لئے صرف ہوئے یا ہو رہے ہیں بالکل ہیچ ہیں ۔

۔ یہاں تک آپ کو بلدہ اور اضلاع کے ادارات مقامی کے متعلق تفصیلات
سنائی گئیں آپ مقابلہ کریں اور اندازہ فرمائیں کہ محکمۂ بلدیۂ حیدرآباد اور اضلاع ملک سرکار عالی کے مقامی
نظم و نسق کا وصولی محاصل کی حد تک کیا فرق ہے اور ایک دوسرے کو کن امور کی ضرورت ہے۔
لیکن اس سے پہلے برطانوی ہند کے مختلف شہروں کا جستہ جستہ حال قابل سماعت ہے ۔

جناب صدر! بمبئی مدراس اور کلکتہ وغیرہ میں جائدادوں پر بلا اس فرق کے کہ کیا وہ مکانات
ہیں یا زمینات ان کی حالت پر محصول جائداد وصول کیا جاتا ہے اور اس میں گھر پٹی و روشنی پٹی کچرا پٹی
شریک رہتی ہے ۔ اس لئے ان کی شرح اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ اندازاً ہر مالک مکان اپنے
مکان کے حقیقی یا متوقع سالانہ کرایہ کا چھٹا حصہ ادا کر دیتا ہے دوسرے الفاظ میں کم و بیش دو ماہ کا
کرایہ اپنی محکمۂ بلدیہ کو ادا کرنا اس پر لازمی ہے پھر یہ متزاید طور پر بھی وصول ہوتا ہے یعنے کوئی مکان
مالیت میں ایک خاص رقم سے بڑھا ہوا ہے تو اس پر محصول کی شرح ایک آدھ درجہ زیادہ ہوگی۔

ساتھ ہی وہاں حکومتی مکانات بلا کسی خصوصیت کے محاصل ادا کرتے ہیں اور بہت بڑی رقوم ات تو ریلوے کمپنیاں اور بندر گاہوں کے اداروں سے ہی ملتی ہیں۔

بلدیۂ مدراس میں حدود شہر کے مکانوں کی خرید و فروخت کے رجسٹری کے موقع پر کانئو مہور کی قیمت کا دو فیصد ہی خود رجسٹرار جمع کر کے حکام بلدیہ کے سپرد کر تلہے۔

۔ ان مقامات میں سواریوں پر بھی ٹیکس وصول کیا جاتا ہے اور آپ یقین کریں کہ جس موٹر پر بلدۂ حیدرآباد میں (۲۴ روپیہ سالانہ لیا جاتا ہے اس پر احاطۂ مدراس میں (۲۵ روپیہ کلدار) ہر سہ ماہی پر ادا کر دینا لازم ہے۔ یہاں پر بھی حکومت سرکار عالی نے کچھ اضافہ طے کیا تھا۔ مگر ملک کے موٹر نشین طبقہ کے احتجاج نے اسے ملتوی کر دیا۔ اس خصوص میں ایک روایت بہت پر لطف ہے وہ یہ کہ احتجاج زیادہ تر ہمارے ہاں کے بڑے گھرانے کی ان بیٹیوں نے کیا جو غریب شوہروں سے بیاہی ہوئی تھیں اور جن کے شوہر جہیز میں ملی ہوئی موٹروں کو چار و ناچار اپنی بیگمات کی خاطر چلاتے ہوئے تھے۔ جیسے ہی محاصل میں اضافہ کا چرچا ہوا انھوں نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے اپنی بیگمات کو اطلاع دی کہ اب موٹر رکھنا ان کی بساط سے باہر ہو رہا ہے وغیرہ وغیرہ جس پر بیگمات میدان عمل میں نکل آئیں اور ان کی فریاد نے آخر اضافۂ محصول کو ہی ختم کر دیا۔

۱ برطانوی ہند کے اکثر مجالس محصول روزگار بھی وصول کرتی ہیں۔

کوئی شخص جو حدود صفائی میں سکونت رکھتے ہوئے کسی پیشہ سے اپنا روزگار کما رہا ہو۔ خواہ وہ ملازم سرکار ہو یا ڈاکٹر، وکیل یا تاجر اس کو اپنے روزگار کے وسعت کے لحاظ سے یہ محصول ادا کرنا پڑتا ہے۔

کارآموزان سیول سروس کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ شہنشاہی حکومت ہند کے عائد کیے ہوئے محصول آمدنی سے اپنی کارآموزی میں معاف ہیں مگر محصول روزگار سے انھیں بھی معافی نہیں ہے احاطۂ مدراس کی مجالس ضلع ان سب لوگوں سے جو شہروں اور قصبوں میں سکونت نہیں رکھتے بلکہ مواضعات میں رہتے ہوں یہ محصول روزگار وصول کر لیتے ہیں۔

جناب صدر! برطانوی ہند کے مجالس مقامی نے سینماؤں، تھیٹروں، اور گھوڑ دوڑ کے

احاطوں نیز کھیلوں کے مقابلوں سے بھی جو ان کی حدود میں تفریح کا انتظام کرتے ہیں آمدنی کی سبیل کرلی ہے اور یہ محصول تفریحات کہلاتا ہے اس کا بار تفریح حاصل کرنے والے ناظرین پر ان کی ٹکٹ میں دی ہوئی رقم کے لحاظ سے پڑتا ہے اب تو حکومتوں نے بھی اس میں حصہ بانٹ لیا ہے اور وصولی اپنے ذمہ لے لی ہے یہ رقم اس کے علاوہ ہے جو تفریح گاہوں کے مالکوں سے بشکل محصول جائداد یا فیس اجازت یا معاوضہ تشہیر کے طور پر وصول ہوتا ہے۔ ہمارے محکمۂ بلدیہ میں کئی سال سے یہ امر محض زیر کارروائی رہا ہے۔

کلکتہ، مدراس، بمبئی کی بلدیات کو اپنے مارکٹوں اور مسلخوں سے لاکھوں روپے سالانہ وصول ہوتا ہے حالانکہ ان کا ان مارکٹوں مسلخوں پر صرفہ بہت ہی کم رہا انہوں نے ان کی تعمیر میں افادیت کے پہلو کو زیادہ ملحوظ رکھا۔ خوش منظری کی جانب ان پر توجہ نہیں کی گئی اس کے سوا وہ اپنے جمع کیے ہوئے کچرے سے نشیبی مقامات کو بھر بھر کر ان زمینات کو لاکھوں روپیوں میں فروخت کرتے ہیں۔ ان کے ہاں کا فضلہ انھی کے زیر زمینی نالیوں میں بہ جاتا ہے کو وہ غور کر رہے ہیں کہ کیوں نہ اس غلیظ پانی سے آمدنی حاصل کی جائے۔ مثلاً اس کو زراعت کے لیے دیا جائے۔ یا اس سے گیاس پیدا کرکے موٹروں کے چلانے میں استعمال ہو۔ ساتھ ساتھ ان بلدیات نے توسیع آبادی کے لئے مختلف مقامات میں وسیع رقبے سستے داموں پر حاصل کئے انھیں درست کیا ان کے پلاٹ بنائے وہاں سڑکیں تعمیر کیں اور روشنی کے لئے قنادیل اور برقی تار نصب کئے سستے ذرائع آمد و رفت فراہم کئے کہ جس کے بعد لاکھوں روپیوں کا انھیں نفع ہو رہا ہے اس تعلق میں تو ہمارے اضلاع نے بھی کچھ رقم جمع کی ہے۔ محکمۂ بلدیہ حیدرآباد کی حدود میں آبادی کی توسیع ہر چہار جانب ہوئی۔ مگر اس سے ہمارا محکمۂ بلدیہ زیر بار ہی ہوا ان جدید حصوں میں آسائشوں کی فراہمی کے اخراجات اس کے لئے سوا ہوگئے نفع کا کیا ذکر ہے۔

جناب صدر! علاوہ محاصل کے برطانوی ہند کی بلدیات کو چنگی سے بہت معقول آمدنی ہورہی ہے کبھی صرف چو بینہ پر تو کہیں اناج گھی تیل نمک شکر پر بھی چنگی لی جاتی ہے۔ اور اس میں ریلوے کمپنیاں اور مجالس انتظام بندرگاہ ان سے تعاون عمل کر رہے ہیں۔ اس کے سوا

شہر کے حدود میں داخل ہونے کی فیس شہر کے سب ناکوں پر لینے جانے کا عمل وہاں جاری تھا۔ یہ فیس اگر گاڑیوں اور سواریوں پر عام طور پر لیجاتی ہے تو ان شہروں اور قصبوں میں کہ جہاں مذہبی اجتماعات جاترائوں اور عرسوں کی وجہ زیادہ ہوتے ہیں۔ یہ فیس داخلہ اشخاص پر لی جاتی ہے اور اسے محصول جاتریاں کہا جاتا ہے اس طرح کی فیس داخلہ گرمائی تفریح کے ایسے مقامات میں بھی لی جاتی ہے۔ جہاں کی آب و ہوا صحت بخش اور ٹھنڈی ہوتی ہے اور انکی وصولی میں ریلوے اور بس مقامی ادارات کا ساتھ دیتی ہیں۔ برطانوی ہند میں حکومت کی طرف سے ابتدائی تعلیم، شاہراہوں کی درستی آب رسانی ڈرینج کے لئے عطایا بھی ملتے ہیں حکومتی امکنہ کے محاصل کی ادائی بروقت اور ایک مشت ہوجاتی ہے۔ بلدیہ کے بل کلکٹروں کی طرح ان کو پیروی کی زحمت نہیں ہوتی۔

غرض کہ جناب صدر یہ ہے اس کی تفصیل کہ ہم شہریان بلدۂ حیدرآباد فرخندہ بنیاد کیا کچھ آسائش و آرام کتنے حقیر بدل کی ادائی کے ساتھ حاصل کر رہے ہیں آپ یقین کریں کہ برطانوی ہند کے اکثر احباب اس تفصیل کو سن کر بے ساختہ کہہ اٹھتے تھے کہ پنشن لے کر ہم حیدرآباد میں آبسیں گے۔ کیا یہ امر قابل غور نہیں کہ کب تک ہم اہل حیدرآباد سرکار عالی کے دست نگر رہیں گے تاکہ وہ اپنی محاصل کی رقم سے ہماری آسائش کے سامان نہ صرف تعمیر کرے بلکہ ان کی نگہداشت کا بار بھی اپنے ہی ذمہ لے۔

واقعہ یہ ہے کہ بعض جاگیرات نے اس خصوص میں جو عمل اختیار کیا وہ کتنا ہی غیر معمولی کیوں نہ ہو ضرور توجہ کے قابل ہے۔ وہاں چاکنا پٹی وصول کی جاتی ہے۔ یعنے جاگیر کے کلال خانوں میں چاکنا تیار کر کے فروخت کرنے کا حق ہراج ہوتا ہے۔ باجہ پٹی کے نام سے باجہ بجانے والے رقم ادا کرتے ہیں محترقہ کے عنوان سے جلانے کی لکڑی کے گٹھوں پر معمول وصول ہوتا ہے نکاح پڑھانے کے لئے فی عقد رقم داخل کرنے پر ہی رسم ادا ہو سکتی ہے۔ کمھاروں کو اپنی تیار کردہ صراحیوں کی کچھ تعداد جاگیردار کو دینا لازم ہے۔ دھنگر بھی چند جانور

گذرانتے ہیں تعمیر مکان پر مویشی اور جائداد کی خرید و فروخت پر، مورثوں کی وفات ہوجانے پر وراثت کی منظوری کے لئے بھی نذرانہ گذرانا لازم ہے ساتھ ہی جاگیردار کے ہاں کی تقاریب پر جاگیری رعایا دامے درمے شرکت کرتی ہے۔ میں جاکنا پٹی کو ٹکس تفریحات کے مرادف سمجھتا ہوں باجہ پٹی یا نکاح پڑھانے کی فیس بس تقاریب ہے۔ محترفہ ایک قسم کی چنگی ہے۔ کمہار دھنگر فیس لائیسنس ادا کر رہے ہیں۔ اجازت نامہ تعمیر داخلہ فروخت جائداد و نیز محصول نوتی کے لئے تو متمدن ممالک میں بھی رقوم وصول ہو رہی ہیں۔ اور اجتماعی ضروریات پر صرف ہوتی ہیں بہرطور اس کانفرنس کے مباحث کا جو حاصل انداز کے مسلک سے متعلق ہوں یہ اثر ہونا چاہیئے کہ ملک میں اقسام محاصل اور ان کی نوعیت پر غور و فکر زیادہ سے زیادہ ہونے لگے تاکہ ملک کی ترقی اور سرسبزی کے لئے زیادہ سے زیادہ گنجایش فراہم ہو۔ سچ مچ اب وقت آگیا ہے کہ شہر کے لوگ اولاً اپنے اسباب آسایش خود فراہم کریں اور ان کا انصرام کریں اور اس کے ساتھ ان کو دیہات والوں کی فلاح و بہبود پر بھی روپیہ حکومت کو فراہم کرنا چاہیئے ورنہ دیہات سدھار ہی نہیں ہیں جیون سدھار اور ترقی ملک کی باتیں فضول ہیں۔

مولوی محمد فاروق صاحب کا مقالہ ختم ہونے پر جو مباحث ہوا۔ اس کا تذکرہ گذر چکا ہے جناب لکشمی نواس جی صاحب نے جو تقریر کی اس کا خلاصہ انھوں نے قلمبند کر کے ارسال فرمایا۔ یہہ دوسرے صفحہ پر درج ہے۔

حیدرآباد میں محاصل اندازی کا مسلک

از جناب لکشمی نواس جی صاحب گنیروال

مجھے کانفرنس میں متعدد تقاریر سننے کے بعد خصوصاً مسٹر نرسنگ راؤ ایڈیٹر رعیت کے
اس اظہار خیال کے بعد جس میں انھوں نے موازنہ کے مدات آمدنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
سال حال کے موازنہ میں خسارہ کا ذکر فرمایا ہے۔ میں اس کے متعلق چند امور کی جانب آپ
اصحاب کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جس میں اس امر کے متعلق روشنی ڈالی جائیگی کہ موازنہ میں
خسارہ نہیں ہے اور ساتھ ہی میں اس امر پر بھی تبصرہ کروں گا کہ کیا اس وقت جدید محاصل کے
عاید کرنے کی ضرورت ہے! مندرجہ ذیل اعداد و شمار اس امر کو ظاہر کرتے ہیں کہ موازنہ میں خسارہ
نہیں ہو سکتا :-

۱- مبلغ (۹۵) لاکھ مد متفرقات اور مبلغ ایک کروڑ ساٹھ لاکھ جنگ کی ناگہانی ضروریات
کے لئے محفوظ کئے گئے ہیں۔ جو دوامی نہیں ہیں۔

۲- ۱۳۵۲ف میں بطور واقعی (۸۴) لاکھ کا خسارہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس میں
۱۳۵۱ف کی خرچ شدنی رقومات بھی شریک ہیں۔ مثلاً سرکاری ملازمین کے لئے گرانی الونس
مد میں (۴۸) لاکھ روپیہ جمع کئے گئے ہیں جس میں سال گزشتہ کے (۷) لاکھ بھی شریک ہیں۔

۳- غربا کے لئے کم قیمتوں پر خریدی چاول کے لئے موازنہ مذکور میں ساڑھے آٹھ لاکھ
روپیہ مختص کئے گئے ہیں یہ رقم بطور سرمایہ کاروبار منظور کی گئی ہے۔ لیکن کامل رقم بمد خرچ
درج کی گئی ہے جو غیر صحیح ہے۔

۴ - مد کروڑ گیری میں درآمد و برآمد اشیا میں کمی کا اندازہ کرتے ہوئے (۲۰) لاکھ کی کمی ظاہر کی گئی ہے لیکن قیمتوں میں اضافہ کی وجہ بمقابل سال گذشتہ سال حال تین کروڑ کا زائد مال درآمد و برآمد ہوا اسی تناسب سے محاصل آمدنی میں بھی اضافہ ہوگا۔ کپاس اور مونگ پھلی کی قیمتوں میں اضافہ کی وجہہ توقع رکھنی چاہیئے کہ صرف انہیں اشیاء کے محصول برآمد سے کروڑ گیری کی کمی پوری ہو جائے گی ۔

۵ - آمدنی آبکاری میں جو کمی ظاہر کی گئی ہے وہ بھی درست نہیں ہو سکتی کیوں کہ وصول شدہ اطلاعات سے ظاہر ہے کہ سال حال سررشتہ کی آمدنی میں (۱۰) لاکھ کا اضافہ ہوا ہے کیوں کہ مزدوریوں میں اضافہ کی وجہہ اضافہ آمدنی کی توقع یقین کامل کے ساتھ کی جاتی ہے ۔

۶ - آمدنی ریلوے میں سے (۲۰) لاکھ روپیہ مختص برائے حصہ داران کیا جا کر شریک سواز نہیں کئے گئے ہیں جو درست نہیں ہے یہ رقم بطور سرمایہ خرچ ہوگی اس لئے آمدنی میں شریک نہ کرنا صحیح طریق عمل نہیں ہے ۔

۷ - ایسی صورت میں جبکہ ریلوے ہماری ہے تو اس کی آمد و خرچ کے تفصیلی حسابات عوام کے سامنے پیش ہونا ضروری ہے جہاں تک میرے معلومات ہیں ریلوے کے پاس ایک کروڑ سے زائد رقم محفوظ ہے بدیں ہم ریلوے کے متعلق تفصیلی تبصرہ اس وقت کیا جا سکتا ہے جبکہ کامل امداد و شمار عوام کو مہیا کئے جائیں ۔

۸ - برقی اور ٹیلیفون میں جو نقصان موازنہ میں ظاہر کیا جا رہا ہے اس کو نہایت آسانی کے ساتھ دور کیا جا سکتا ہے اگر حکومت سرکار عالی برطانوی ہند کے مماثل یہاں بھی بہ تعین مدت ابتدائی طور پر ان امور سے متعلق خانگی اشخاص اور کمپنیوں کے ذریعہ اجارہ دے کر رواج دے اور منافعہ کی صورت میں مناسب و واجبی معاوضہ کی ادائی کے بعد سرکار اس کو حاصل کرلے البتہ اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ اس قسم کی کمپنیاں یا اشخاص صارفین سے منفعت ناجائز نہ حاصل کرنے پائیں اس موقع پر میں اس امر کا اظہار بھی ضروری خیال کرتا ہوں کہ مقامی سرمایہ دار

اشخاص نے قدیم رسومات وعطیات کو تبدیل کرنے پر اپنی آمادگی ظاہر کی تھی بشرطیکہ حکومت اپنی عاید کردہ پابندیوں اور احکامات میں مناسب تبدیلی کرے۔ نیز حکومت سرکار عالی کے ملاحظہ میں ایک کمرشیل کالج کھولنے کی درخواست بھی دی گئی تھی۔ باین شرط کہ جامعۂ عثمانیہ کے مقررہ نصاب کی پابندی کی جائے گی۔ اور مجلس انتظامی میں حکومت سرکار عالی کے ایک نمایندہ کو شریک کرنے پر بھی ہم کو کوئی اعتراض نہ ہوگا لیکن تاحال سرکار عالی کی جانب سے کوئی تشفی بخش جواب نہیں ملا۔ ہمارے پاس تعلیم پر جس قدر رقم صرف کی جاتی ہے اس کے مقابلہ میں دیگر دیسی ریاستوں میں باوجود کم رقم خرچ کرنے کے وہاں کا معیار تعلیم ہمارے پاس سے بڑھا ہوا ہے۔

ان تمام امور کے مدنظر اگر حکومت سرکار عالی دیہی سدھار کے لائحہ عمل کو عملی جامہ پہنائے اور مزارعین کے محاصل میں کمی کرے تو ہم دیگر مفادات سے تعلق رکھنے والے طبقات پر محاصل کے عاید کرنے پر اعتراض نہ ہوگا لیکن بلا اظہار پروگرام جدید محاصل کا عاید کرنا حق بجانب نہیں قرار دیا جاسکتا۔

آخر میں جناب صدر کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے مجھے وقت عنایت فرما کر اظہار خیالات کا موقع عنایت فرمایا۔ نیز میں آپ تمام اصحاب کا بھی شکر گذار ہوں کہ نہایت دلچسپی سے آپ نے میری تقریر سنی۔

اس تقریر کے بعد "کاشتکار اور زمانۂ جنگ کے اثرات" کے موضوع پر مقالے سنائے گئے۔ جناب غلام محمد صاحب نائب صدر بزم معاشیات جامعۂ عثمانیہ اور جناب عبداللہ صاحب متعلم، ام، اے نظام کالج نے مقالے سنائے۔ علاوہ ازیں حافظ محمد مستحسن صاحب وکیل اورنگ آباد نے بھی مقالہ بھیجا تھا۔ یہ تینوں مقالے آیندہ صفحات پر درج ہیں۔

کاشتکار اور زمانۂ جنگ کے اثرات

از جناب غلام محمد صاحب بی، اے۔ نائب صدر بزم معاشیات جامعۂ عثمانیہ

جنگ کے اثرات ہمیشہ سے دور رس اور ہمہ گیر رہے ہیں۔ موجودہ جنگ جس نے ایک عالمگیر حیثیت حاصل کرلی ہے نہ صرف ہر گوشۂ ارض کو متاثر کررہی ہے بلکہ زندگی کے ہر شعبہ پر بالراست یا بالواسطہ اس کے اثرات مترتب ہوئے ہیں۔ ہندوستان جو کہ ایک زرعی ملک ہے یہاں کا کاشتکار طبقہ اس کے اثرات سے کیوں کر محفوظ رہ سکتا تھا۔ یہاں ہمیں کل ہند کاشتکار طبقہ سے زیادہ سروکار نہیں بلکہ دیکھنا ہے کہ حیدرآباد کا کاشتکار طبقہ موجودہ جنگ سے کیوں کر متاثر ہورہا ہے۔

ستمبر ۱۹۳۹ء سے اس ہولناک جنگ کی ابتدا ہوئی جوں ہی جنگ چھڑی ہمارے ہاں مختلف اجناس کی قیمتوں میں اضافہ شروع ہوا لیکن ابتداءً یہ اضافہ جنگ کے اثرات کی بنا پر نہیں بلکہ زیادہ تر تخمین یا سٹہ کا نتیجہ تھا۔ دلالوں اور درمیانی افراد (middle man) نے آیندہ صورت حال کے پیش نظر اجناس پر قابو پالیا اور رسد کو طلب کے متوازن ہونے سے باز رکھا یہی وجہ تھی کہ یکایک قیمتیں بڑھنے لگیں۔ ان ابتدائی چند ماہ کو چھوڑتے ہوئے جنگی اثرات کے تحت قیمتیں متواتر بڑھتی گئیں۔ چنانچہ دو تین سال کے عرصہ میں زرعی اجناس کی قیمتوں میں معتدبہ اضافہ ہوا۔ درمیانی قسم کے چاول جو ستمبر ۱۹۳۹ء میں ۶ ار روپیہ پلہ کے حساب سے دستیاب ہوسکتے تھے ستمبر ۱۹۴۲ء میں ان کی قیمت ۲۲ روپیہ پلہ ہوگئی۔ گیہوں جو ۱۹۳۹ء میں ۲۰ روپیہ ۸ ر فی پلہ کے حساب سے حاصل کئے جاسکتے تھے۔ ستمبر ۱۹۴۲ء میں ۲۷ روپیہ ۱۲ ر میں دستیاب ہونے لگے۔ البتہ اس اثنا میں جوار کی قیمت میں اتنا اضافہ نہ ہوا یعنے جس قسم کی جوار جنگ کے آغاز کے وقت ۴ روپیہ کے حساب سے ملتی تھی ستمبر ۱۹۴۲ء میں ۱۲ ار روپیہ ۴ ر کے حساب سے ملنے لگی۔ اسی طرح دیگر اجناس کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہوا۔ قیمتوں میں اضافہ کے اس رجحان کو دیکھ کر یہ سمجھا جانے لگا کہ موجودہ جنگ کاشتکاروں کے

حق میں بہت منفعت بخش ثابت ہو رہی ہے اور کاشتکار کو منافع کمانے کا اچھا موقع ہاتھ آگیا ہے لیکن حقیقی صورت حال معلوم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ جس طرح ہم نے اجناس کی قیمتوں کا مطالعہ کیا اسی طرح کاشتکار کے اخراجات کا بھی اندازہ لگا لیں۔

یقیناً کاشتکار کو بہت فائدہ ملتا اگر صرف قیمتیں بڑھتیں اور اخراجات میں کسی قسم کا اضافہ نہ ہوتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ جہاں اضافۂ قیمت کی وجہ سے کاشتکار کی آمدنی میں اضافہ ہوگیا ہے ساتھ ہی ساتھ بعض مخالف اثرات بھی ہیں جو اس میں کمی کا باعث بن رہے ہیں۔ کاشتکار کے مدات خرچ کی دو حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے:— (۱) مصارف پیدائش۔ (۲) مصارف رہائش

مصارف پیدائش پر نظر ڈالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس میں پہلے کی بہ نسبت کافی زیادتی ہو چکی ہے۔ تخم کی قیمتوں میں اضافہ ہو چکا ہے۔ آلات زراعت میں چمڑے اور لوہے کا استعمال ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر دو کی قیمت کافی بڑھ چکی ہیں مثلاً اگست ۱۹۳۹ء میں چمڑے کی قیمتوں کا اشاری عدد ۶۳ تھا اور فروری ۱۹۴۲ء میں (۸۳) ہوگیا۔ اسی طرح قوت محرکہ یعنی بیلوں کی قیمت میں بھی معتد بہ اضافہ ہو چکا ہے۔ کھاد پہلے کی بہ نسبت گراں ہو چکی ہے چارہ کی قلت محسوس کی جارہی ہے۔ نقل و حمل میں نہ صرف قیمتیں بڑھ گئی ہیں بلکہ شرح نقل و حمل میں بھی اضافہ ہو چکا ہے۔ مصارف پیدائش کی یہ زیادتی لازماً کاشتکار کی آمدنی کا باعث ہو رہی ہے۔

جب ہم اس کے مصارف رہائش پر نظر ڈالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس مد پر بھی کاشتکار کو پہلے سے زیادہ رقم صرف کرنی پڑ رہی ہے اجناس خوردنی کی حد تک ہمارا کاشتکار دوسروں کا دست نگر نہیں البتہ بعض دیگر ضروریات کی چیزیں اُسے خریدنی پڑتی ہیں مثلاً تن ڈھانکنے کے لئے اسے دھوتی اور چادر کی ضرورت ہوتی ہے اور چونکہ جنگلوں میں پیدل پھرنا پڑتا ہے اس لئے چپل کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ اس کی بیوی کے لئے ساڑی خریدنی پڑتی ہے موسم سرما کے اثرات سے بچنے کے لئے کمل بھی خرید لیتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک چیز کی قیمت میں معتد بہ اضافہ ہو چکا ہے۔ ستمبر ۱۹۳۹ء میں دھوتی ۹ آنے، چادر ۸ آنے اور ساڑی ۱۰ آنے فی پونڈ کے حساب سے خریدی جاسکتی تھی لیکن ستمبر ۱۹۴۲ء تک ان کی قیمتیں بڑھ کر علی الترتیب

۱ روپیہ ۲ر ۱ روپیہ ۳ر اور ۱ روپیہ ۵ر فی پونڈ ہو گئی ہیں جو جنگ سے قبل ۱۰، سوا دو روپیہ تک مل جاتی تھی اب تین روپیہ سے کم میں نہیں مل رہی ہے۔ چپل ایک یا سوا روپیہ میں خریدی جا سکتی تھی لیکن اب اسی کے لئے ڈیڑھ پونے دو روپیہ خرچ کرنے پڑ رہے ہیں۔ ان چیزوں کے علاوہ کاشتکار کچھ نمک اور مختلف قسم کے تیل بھی استعمال کرتا ہے۔ جنگ کے آغاز پر نمک ۲ ۱ روپیہ پلہ کے حساب سے دستیاب ہو سکتا تھا اور اب ۳ ۱ روپیہ ۴ ۱ کے حساب سے مل رہا ہے۔ ارنڈی کا تیل، کاشتکار روشنی کے لئے استعمال کرتا اسکی قیمت بھی بڑھ چکی ہے غرض مصارف رہائش کا بار بھی اس کی آمدنی میں کمی پیدا کر رہا ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں یہ کہنا درست نہیں کہ کاشتکار کو بہت منافع مل رہا ہے کاشتکار کو پہلے کی بہ نسبت ضرور منافع مل رہا ہے لیکن اتنا نہیں جتنا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔

شہروں میں جو بڑھی چڑھی قیمتیں ہیں ان کے مدنظر یہ تصور کرنا کہ ان میں اور کاشتکار کی فروخت کی قیمتوں میں جو تفاوت ہے، وہ پورے کا پورا یا اس کا بڑا حصہ کاشتکار کے جیب میں اترتا ہے، ایک مغالطہ ہے اصولاً قیمتوں کے فرق کا بڑا حصہ بطور منافع کے کاشتکار کو ملنا چاہیئے تھا لیکن ہمارے کاشتکار کی لاعلمی اس میں حائل ہو رہی ہے۔ وہ فروخت پیداوار کے پیچیدہ مسائل سے ناآشنا ہے۔ اس کی بے مایہ گی اسے مجبور کرتی ہے کہ پیداوار بیک وقت جس قیمت پر بھی بکے، فروخت کر دے، اس کی انہی کمزوریوں سے درمیانی افراد فائدہ اٹھاتے ہیں اور نہ صرف بازاری نرخ سے بہت ہی ادنٰی داموں پر غلہ حاصل کرتے ہیں بلکہ اوزان اور پیمانے اس قسم کے استعمال کرتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ غلہ حاصل کیا جا سکے۔ غرض طرح طرح سے کاشتکار سے استحصال کیا جاتا ہے۔ چونکہ کاشتکار کو روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے وہ ان تمام چیزوں کی پروا کئے بغیر یک لخت تمام پیداوار فروخت کر دیتا ہے اور اس طرح حقیقی منافع سے محروم رہتا ہے۔

یہی نہیں بلکہ دلال چونکہ بازاری شرح سے واقف ہوتے ہیں اسلئے جب آئندہ قیمتیں بڑھنے کا رجحان پاتے ہیں تو فصل اگانے سے قبل ہی کاشتکار کو پیشگیاں دیتے ہیں اور ارزان ترین قیمت پر تمام پیداوار کی خریدی کا تصفیہ کر لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فصل پختہ ہونے پر بازار میں

قیمت بڑھ جاتی ہے اس سے پورا کا پورا نفع انہی درمیانی افراد کو حاصل ہوتا ہے۔ اور جاہل کاشتکار اس سے محروم رہتا ہے غرض قیمتوں کے تفاوت کا بڑا حصہ درمیانی افراد کو ملتا ہے اور کمتر حصہ بطور منافع کاشتکار کو میسر آتا ہے۔

باوجود ان تمام دھوکا بازیوں کا شکار رہنے کے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ موجودہ حالات کی وجہ سے ہمارے کاشتکار کو کچھ بچت ضرور ہو رہی ہے۔ لیکن بغور دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس بچت سے کاشتکار کو زیادہ فائدہ نہیں ہوتا۔ ادھر کاشتکار کو کچھ آمدنی ہوئی اور ادھر ساہوکار نے اپنا دست شفقت دراز کیا۔ ایسے موقع پر وہ کوشش کرتا ہے کہ نہ صرف کاشتکار کا بقایا اس کا آبائی قرضہ بھی وصول کر لے۔ رسم و روایت کی بنا پر کہیے یا مذہبی رجحانات اور توہمات پر محمول کیجیے۔ ہمارا کاشتکار ان قرضوں کی ادائی اپنا فرض میں تصور کرتا ہے۔ اس طرح ساہوکار کے لئے ایک اچھا موقع ہاتھ آجاتا ہے۔ حالانکہ دستور العمل قرضہ (صوبہ) دفعہ ... کی رو سے کسی ایسے قرضے کے متعلق جو دستور العمل ہذا کے نفاذ سے قبل پایا گیا ہو اور جس کا سود حسب ... اصل سے تجاوز کر گیا ہو تو قرضہ ادا شدہ سمجھا جاسکتی۔ لیکن جاہل کاشتکار اپنی سادگی کی وجہ سے ساہوکار کا شکار بن جاتا ہے اور اس طرح اس کی بچت ساہوکار کے ہاں محفوظ ہونے لگتی ہے۔ ساہوکار اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ موقع کو غنیمت سمجھ کر کاشتکار کو مزید قرض دیتا چلا جاتا ہے کہ مبادا وہ اس کے چنگل سے نکل نہ جائے اور اس کی آمدنی میں کمی ہو۔

بہرحال اگر یہ بھی فرض کر لیں کہ ساہوکار، کاشتکار کی بچت پر دست درازی نہ کرے گا تو بھی یہ بچت کوئی زیادہ مفید ثابت نہیں ہوتی۔ کاشتکار جو صدیوں سے مفلس چلا آرہا ہے جو روپیہ کے صحیح مصرف سے ناآشنا ہے اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اس رقم سے صحیح فائدہ اٹھائے گا ایک دھوکہ ہے۔ اس کے نزدیک اس بچت کا مصرف سوائے شادی بیاہ کے رسومات کے اور کچھ نہیں۔ یہ محض قیاس آرائی نہیں بلکہ اس کا بارہا تجربہ کیا جا چکا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کاشتکار کے ہاں شادی اسی وقت ہوتی ہے جبکہ فصل بک چکی ہے۔ وجہ کیا ہے؟ صرف یہی کہ اس وقت اس کے ہاتھ میں کچھ ٹکے آجاتے ہیں۔ جن کا مصرف وہ اس سے بہتر کچھ نہیں جانتا کہ ان کو رسومات شادی پر صرف کر دے۔ کم پیسے ملتے ہیں تو مجبوراً رسومات میں تخفیف کرنی پڑتی ہے اور اگر جیب زیادہ گرم ہوتا ہے تو رسومات کی

تحمیل کردی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے یہ کہنا کہ وہ بچت کا صحیح استعمال نہ کرے گا نہ صرف قرین قیاس بلکہ مبنی برحقیقت ہے۔ یہ بچت صرف اسی وقت کارآمد ثابت ہوسکتی ہے جب کہ کاشتکار اس کو آیندہ کی سرد بازاری کے خیال سے محفوظ رکھے۔ لیکن ابھی ہمارے معصوم کاشتکار میں اتنا شعور کہاں!

موجودہ عالمگیر جنگ کی وجہ سے زرعی اجناس کی طلب بہت بڑھ گئی ہے۔ کاشتکار جتنا منافع اس وقت کما رہا ہے اس سے کہیں زیادہ کما سکتا اگر حکومت بروقت نگرانی قیمت کی حکمت عملی پر کاربند نہ ہوتی۔ بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ کاشتکار سے کہیں زیادہ درمیانی افراد کو منافع ملتا۔ نگرانی قیمت کی وجہ سے نہ صرف درمیانی طبقہ اور کاشتکار کو حد سے زیادہ منافع حاصل کرنے سے باز رکھا گیا۔ بلکہ صارفین کی پریشانیوں کا بڑی حد تک ازالہ کیا گیا ہے۔ یہ امر مسلم ہے کہ پیدا کرنے والے طبقہ اور صارفین میں توازن ہونا ضروری ہے بصورت دیگر معاشی توازن قائم نہ رہ سکیگا اور ممکن ہے کہ اس صورت میں خود کاشتکار اتنا نفع حاصل نہ کر سکے جتنا توازن کی صورت میں حاصل کر رہا ہے۔

حال ہی میں موجودہ حالات کے پیش نظر "غذ زیادہ اگاؤ" کی مہم کا آغاز کیا گیا ہے۔ اب جبکہ برآمد بند ہو چکی ہے کاشتکار کا خود مفاد اسی میں ہے کہ بجائے تجارتی فصلوں کے اجناس خوردنی کی کاشت کریں۔ صارفین کے نقطۂ نظر سے اس تحریک کی اچھائی اور اہمیت اظہر من الشمس ہے۔ چنانچہ مرہٹواڑی میں جہاں روئی کی کاشت ہوتی تھی اب اجناس خوردنی کی کاشت کی طرف توجہ کی جارہی ہے اور اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۱۳۶۰۰۰ ایکر رقبہ روئی کی کاشت سے نکل کر خوردنی اجناس کی کاشت کے تحت آچکا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے کاشت کار اس میں دلچسپی لے رہے ہیں۔

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ موجودہ حالت میں کاشتکار طبقہ اور کاشت کی کیا اصلاحی تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں؟

اصلاحی تدابیر کئی ہوسکتی ہیں جن پر عمل کرنے کے لئے کافی روپیہ صرف کرنا ہوگا لیکن موجودہ صورت حال کے مدنظر جبکہ ہمارا مالیہ غیر معمولی اخراجات کی وجہ سے زیر بار ہو چکا ہے اس قسم کی تدابیر پیش کرنا یا ان پر عمل کرنے کی کوشش کرنا قرین مصلحت نہیں۔ اس لئے ہم چند ایسی تدابیر پیش کریں گے جن پر کم سے کم روپیہ

صرف ہو اور زیادہ سے زیادہ بہتر نتائج حاصل ہوں ۔

۸ زیادہ غلہ اگانے کی طرف حکومت جو کاشتکاروں کو متوجہ کر رہی ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ کاشتکار کو سرمایہ کی فراہمی میں سہولتیں بہم پہنچائی جائیں ہم نے اوپر تفصیلی طور پر بیان کیا ہے کہ کس طرح کاشتکار کے اخراجات پیدائش میں اضافہ ہو گیا ہے ۔ ایسی صورت کی سرمایہ کی سہولتیں بہم پہنچانا ضروری ہے ورنہ وہ ساہوکار کے استحصال کا شکار ہو جائے گا ۔ حکومت بالواسطہ طور پر انجمن امداد باہمی کے ذریعہ کاشتکاروں کی دستگیری کر سکتی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ غلہ اگایا جا سکے اور طلب و رسد میں توازن پیدا ہو ۔

یہی وقت ہے کاشتکار خود کو انجمن امداد باہمی کے تحت منظم کریں اور اپنے کاروبار کو وسیع اور مستحکم کریں ۔

جس طرح ہماری حکومت نے صارفین کے مفاد کے پیش نظر اجناس خوردنی کی دکانیں قائم کی ہیں اسی طرح کاشتکاروں کے لئے معیاری تخم کی فراہمی کی دکانیں بھی کھولدی جائیں تو بہت مفید ثابت ہوگی یہہ چیز نہ صرف "غلہ زیادہ اگاؤ" کی مہم کو کامیاب بنائے گی ۔ بلکہ بالواسطہ طور پر صارفین کے لئے اور جنگی ضروریات کے لئے مفید ثابت ہوگی ۔

حالات حاضرہ کے پیش نظر مصالحت قرضہ کے بورڈ کا فریضہ ہے کہ وہ اپنا کام پورے انہماک سے انجام دے ۔ کاشتکار اور ساہوکار میں معقول تصفیہ کرائے تاکہ جس صورت حال کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے اس سے کاشتکار محفوظ رہ سکے ۔ نیز قوانین قرضہ جو کاشتکاروں کے لئے مفید ہیں ۔ ان پر سختی سے پابندی کی جائے ۔

جہاں تک کاشتکار کی بچت کا تعلق ہے اس کو محفوظ رکھنے کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انجمنہائے امداد باہمی کے تحت ایک فنڈ قائم کیا جائے جس میں کاشتکار کی یہ بچت محفوظ رہ سکے ۔ محض فنڈ کا قیام کافی نہیں بلکہ انجمنوں کی طرف سے کوشش کی جائے کہ کاشتکار فضول خرچی سے احتراز کریں موجودہ گرم بازاری کے بعد جو سرد بازاری کا دور آنیوالا ہے اس سے ان کو آگاہ کیا جائے اور تلقین کی جائے کہ موجودہ بچت کو اس وقت کے لئے محفوظ رکھیں ۔

ہم نے ابتداءً بتلایا کہ کس طرح موجودہ اضافۂ قیمت کا بڑا حصہ بجائے کاشتکاروں کو ملنے کے درمیانی افراد کی جیب میں اتر رہا ہے۔ اس نقص کو دور کرنے کے لیے حکومت ان افراد کے کاروبار پر سخت نگرانی رکھے تاکہ یہ کاشتکار کی لاعلمی سے زیادہ فائدہ نہ اٹھاسکیں۔

جس طرح گزشتہ جنگ عظیم کے دوران میں اور اس کے بعد انجمنہائے فروخت پیداوار نے اپنی حالت مستحکم کرلی تھی اسی طرح اب بھی ایک زرین موقع ہاتھ آگیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ انجمن ہائے فروخت پیداوار اپنی حالت مستحکم کریں اور کاشتکاروں پر اپنی ساکھ قائم کریں تاکہ خود بخود کاشتکار اپنی پیداوار انہی کے توسط سے فروخت کرائیں جس سے نہ صرف کاشتکار کو زیادہ منافع لے کا بلکہ بازاری طلب کے ساتھ ساتھ اجناس کی رسد مہیا کی جاسکے گی۔ اس طرح صارفین کو بھی یک گونا سکون ہوگا اور اجناس کی قلت محسوس نہ ہوگی۔

اس مقصد کے حصول کے لئے ہر جگہ غلہ کے گوداموں کا قیام ضروری ہے۔ اس قسم کے غلہ کے گودام بعض جگہ موجود ہیں لیکن حالات حاضرہ اس کے مقتضی ہیں کہ ان میں وسعت دیجائے تاکہ ان میں غلہ محفوظ رکھ کر حالات کے اعتبار سے بازار میں لایا جاسکے۔ اس طرز عمل سے درمیانی افراد کا زور بھی ٹوٹ جائے گا اور فروخت پیداوار کا مسئلہ سلجھ جائے گا۔

الحاصل ان تمام حقایق کے پیش نظر کاشتکاروں کے مفاد کے نقطۂ نظر سے کانفرنس کے آگے میری یہ چند تجاویز ہیں:-

(۱) زرعی مالیہ کی سہولتیں دو طریقے سے فراہم کی جائیں۔

(ا) انجمن ہائے امداد باہمی کی وسعت کے ذریعہ (ب) تقاوی قرضوں کی زیادتی کے ذریعہ

(۲) "غلہ اگاؤ" کی مہم کو کامیاب بنانے کے لئے باضابطہ تشہیر کی جائے نیز معیاری تخم آلات زراعت اور کھاد کی تقسیم کا معقول انتظام کیا جائے۔

(۳) محکمۂ فروخت پیداوار کو وسعت دی جائے اور اس کے ذریعہ فروخت پیداوار کے نقائص پر حد بندی کی جائے۔

(۴) انجمن ہائے فروخت پیداوار کو وسعت دیجائے کیونکہ یہی وہ زمانہ ہے جبکہ انجمن کاشتکاروں

کی زیادہ خدمت سے زیادہ انجام دے سکتی ہیں اور مقبول ہو سکتی ہیں۔

(۵) اب جبکہ کاشتکار کو تھوڑی بہت آمدنی ہو رہی ہے سابقہ قرضوں کی ادائی کی طرف توجہ کی جائے۔ مصالحت قرضہ کے بورڈس اس وقت پوری توجہ سے کام کریں اور کاشتکار کو خسارہ سے بچائیں۔

(۶) قوانین قرضہ جات پر سختی سے عمل کیا جائے۔ تاکہ ساہوکار کاشتکاروں سے بیجا فائدہ نہ اٹھاسکیں اور اس طرح کاشتکاروں کی زندگی کسی قدر خوش حال ہو سکے۔

ان تجاویز پر عمل کرنے سے صورت حال کی بڑی حد تک اصلاح ہو سکے گی۔

رہبر نمائش مصنوعات ملکی بابتہ ۱۳۵۱ف

تالیف

مولوی خواجہ جمیل احمد صاحب بی۔ اے (عثمانیہ)

مسٹر ایم وشویشرایا کے۔ سی۔ آئی۔ ای۔ کی رائے کا اقتباس حسب ذیل ہے

" میں نے رہبر نمائش بابتہ ۱۳۵۱ف ۱۹۴۲ء کا خاص دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیا اس میں اعلیٰحضرت حضور نظام کی قلمرو کی چوتھی صنعتی نمائش کی بعض موثر خصوصیات درج ہیں۔

" رہبر مذکور میں نمائش کے مقاصد اس وسیع سلطنت کی معاشی صلاحیتیں نمائش میں سرکار کے مختلف محکموں نے جو دلچسپی لی ہے اور انجمن ملیسانین عثمانیہ کی کاوشیں اجمالی طور پر واضح کی گئی ہیں اس ضمن میں انجمن ملیسانین عثمانیہ نے جو ایک باعزم ادارہ ہے اپنی مساعی سے اس تحریک کی جو رہبری کی وہ عامۃ الناس سے خراج تحسین حاصل کرنے کی مستحق ہے"۔

رعایتی قیمت دو روپیہ سکۂ عثمانیہ ملنے کا پتہ دفتر مجلس نمائش معاشی کمیٹی معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد

کاشتکار اور زمانہ جنگ کے اثرات

۱ ضر

جناب احمد عبد اللہ صاحب مسلم ایم ، اے (نظام کالج)

ایک موقع پر پریذیڈنٹ روزولٹ نے اپنی تقریر کے دوران میں کہا کہ "ہٹلریت کے خلاف جنگ کرنے کے لئے جس طرح آلات حرب اہمیت رکھتے ہیں، اسی طرح غذا بھی ایک اہم حربہ ہے اور آیندہ بھی دنیا میں نظم، خوشحالی اور امن قائم رکھنے کے لئے غذا کا مسئلہ ہی سب سے زیادہ اہم ہوگا،، آنریبل ین آر سرکار نے بھی ایسے ہی ایک سلسلہ میں وضاحت کی ہے کہ "دوزمانہ جنگ میں زراعت کو بہت ہی ضروری کام انجام دینے پڑتے ہیں۔ مثلاً بہمہ مشکلات کے باوجود تمام سیول اور فوجی آبادی کو غذا بہم پہنچانا تاکہ ان کی ہمت گرنے نہ پائے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر فوجیں پیٹ کے بل چلتی ہیں تو قوم کی ہمت کا انحصار غذا کی فراہمی پر ہے جنگ جیتنے کی کوشش کا ایک اہم جزو یہ ہے کہ پیدائش اغذیہ سے متعلق ہمارا انتظام کار یا رویہ بہت ہی جچا تلا ہو،،

ان دو بیانات کے پیش کرنے سے میرا مطلب یہ تھا کہ زراعت اور اس طرح مزارعین کی اہمیت کو ظاہر کردوں۔ اب ہم یہ دیکھیں گے کہ زرعی پیداوار پر جنگ نے کیا اثر کیا۔ یہ معلوم کرنے کے لئے ہمیں زرعی پیداوار کو دو حصوں میں تقسیم کرنا پڑے گا۔ ایک صنعتی اور تجارتی فصلیں اور دو غلہ کی فصلیں پہلی قسم میں، روئی، سن، مونگ پھلی اور دوسری قسم میں تیل کے بیج شامل ہیں ہم ہر ایک پر علحدہ علحدہ غور کریں گے۔

(۱) روئی کی کاشت ہندوستان میں زمانۂ قدیم سے چلی آرہی ہے اور اسکی صنعت بھی کافی قدیم ہے برطانوی دور میں پارچہ بافی کے کارخانہ قائم ہونا شروع ہوئے اور ان کی تعداد بڑی سرعت کے ساتھ بڑھتی گئی یہاں تک کہ ۱۹۳۹ء میں ان کی تعداد ۳۸۹ ہوگئی اور ہماری روئی کی پیداوار کی ایک بڑی مقدار انہی میں صرف ہونے لگی چونکہ ہندوستان کی روئی چھوٹے ریشہ کی ہوتی ہے اسلئے انگلستان میں

اس کی مانگ بالکل کم تھی لیکن جاپان اس کے ایک بڑے حصہ کا خریدار تھا۔ اب جاپان کی مارکٹ کے بند ہوجانے کی وجہ سے اس پر بہت بڑا اثر پڑا ہے گو اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے کارخانوں کی بڑھتی ہوئی ضروریات اس کے ایک حصہ کو صرف میں لا رہی ہیں لیکن پھر بھی ایک بہت بڑا جز رہ جاتا ہے اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس سال کی فصل ۴۰ لاکھ گٹھوں [illegible] پر مشتمل ہوگی جس میں سے ہندوستان کے کارخانوں میں زیادہ سے زیادہ ۲۴ لاکھ کی کھپت ہوسکے گی اور ۵ لاکھ برآمد اور ۱۰ لاکھ [illegible] کی نکاسی گھریلو پارچہ بافی کی صنعتوں کے لئے ہوسکے گی لیکن اس کے باوجود ۲۵ لاکھ [illegible] زائد رہتے ہیں جس کی نکاسی نہ ہونے پر کاشتکاروں کو ایک بڑے نقصان سے دوچار ہونا پڑے گا۔ یہ چیز روئی کے کاشتکاروں کے لئے بہت ہی بے چینی کا باعث بن گئی ہے۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کی صرف دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں ایک تو یہ کہ اس کے لئے کوئی نئی مارکٹ پیدا کی جائے دوسرے یہ کہ روئی کے بجائے اغذیہ کی کاشت کی جائے جس میں سے حکومت دوسرے طریقہ پر زور دے رہی ہے۔

(۲) سن کی فصل ہندوستان کے کل زرعی رقبہ کے ۱½ فیصد حصہ کی پیداوار ہے ابتداً اس کو عام طور پر خام حالت میں برآمد کیا جاتا تھا اور براعظم یورپ کے پچاس فیصد حصہ کا خریدار تھا لیکن اب یہ ساری مارکٹ بالکلیہ بند ہوچکی ہے۔ پہلے جنگی سال میں اس پر زیادہ اثر نہیں پڑا کیونکہ برطانیہ اور امریکہ اس کی ایک بڑی مقدار کے خریدار بن گئے تھے لیکن بتدریج بحری رسائل کی مشکلات نے اس نئی مارکٹ کا بھی خاتمہ کردیا۔ ہم کاشتکاروں کے اس زبردست نقصان کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں فی الحال سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ نقصان برداشت کرلیا جائے لیکن آیندہ انھیں کسی نہ کسی طرح اس کے رقبہ کو محدود کردینا پڑیگا۔

(۳) مونگ پھلی حیدرآباد اور مدراس کے ایک بڑے رقبہ کی پیداوار ہے اور تقریباً اس کی برآمد کا پورا انحصار براعظم یورپ تھا۔ ہر سال ۹ کروڑ روپیہ کی مونگ پھلی ہندوستان سے برآمد کی جاتی تھی لیکن اب جنگ کی وجہ سے اس کا جو بھی حال ہوا ہے سب پر عیاں ہے۔ ان کاشتکاروں کی حالت سب سے زیادہ تشویشناک ہوگئی ہے کیونکہ نہ تو ہندوستان یا کسی اور قریب کے ممالک میں اس کے لئے کسی نئی مارکٹ کا امکان ہے اور نہ ہی اس کو کسی دوسرے مصرف میں لایا جاسکتا ہے سوائے اس کے کہ

مقامی طور پر اس کا تیل نکالا جائے یا اس کی مانگ کو کسی قدر بڑھانے کی کوشش کی جائے اور کوئی چارہ نہیں کسانوں کو چاہیئے کہ فوراً اس کاشت سے ہٹ کر اشیا خوردنی کی کاشت اختیار کریں لیکن پھر بھی جو نقصان ہو چکا ہے اس کی تلافی ناممکن ہے۔

(۴) تیل کے دوسرے بیجوں کی بھی ایک بڑی مقدار برآمد کی جاتی تھی لیکن ان پر مارکٹ کے بند ہونے کے کوئی زیادہ ناخوشگوار اثرات نہیں پڑے کیونکہ اس کی ایک بڑی مقدار ہماری مقامی جنگی ضروریات کو پورا کر رہی ہے۔ ان مختصر اعداد و شمار سے ہم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جنگ نے صنعتی اور تجارتی فصلوں کا کیا حشر کیا اور یہ کہ کاشتکاروں کو کس قدر مالی نقصان برداشت کرنا پڑا ان میں سے جو فصل کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں اور تبدیل کر رہے ہیں ان کے لئے بھی مالی مشکلات رکاوٹیں پیدا کر رہی ہیں جب تک حکومت اُن کی خاطر خواہ امداد نہ کرے اور ضروری ہدایات نہ دے ایک بڑے پیمانہ پر غلہ کی پیداوار بہت مشکل ہے۔ گو حکومت نے اس طرف اقدام کیا ہے لیکن یہ کام اس قدر چھوٹے پیمانے پر ہو رہا ہے کہ عام حالات درست کرنے کے لئے کسی طرح کافی نہیں حکومت کو چاہیئے کہ جن کسانوں نے غلہ کی کاشت شروع کر دی ہے ایک خاص قیمت پر ان کے اجناس کی نکاسی کی ذمہ داری لے لے۔

اب ہم ان کاشتکاروں کا حال معلوم کریں گے جو غلہ کی کاشت کرتے ہیں۔ ہندوستان کی غذا میں چار چیزیں بہت اہمیت رکھتی ہیں، چاول، گیہوں، جوار باجرا، اور چنا اور یہ چاروں ہمارے غلہ کی فصلوں کا ۸۰ فیصدہیں اور ان کی پیداوار علی الترتیب ۲۶۵ لاکھ ۱۰۰ لاکھ ۹۲ لاکھ اور ۵۴½ لاکھ ٹن ہے۔ چاول کی اتنی بڑی پیداوار کے باوجود ہر سال چودہ لاکھ ٹن برما سے درآمد کیا جاتا تھا ظاہر ہے کہ یہ درآمد فی الحال بند ہو چکی ہے۔ گیہوں کی نکاسی صرف ۹۹ لاکھ ٹن تھی اور بقایا برآمد کیا جاتا تھا۔ جوار باجرا اور چنا مقامی طور پر مارکٹ پیدا کر چکے تھے ان کے علاوہ دوسری اشیا خوردنی مثلاً سبزی گڑ شکر دالیں، مٹر، ارہر وغیرہ کی جنگ کی وجہ سے بہت مانگ بڑھ گئی ہے ایک تو یہ کہ حکومت ہند کثیر مقدار میں ان اشیاء کو خرید رہی ہے اور دوسرے قریب کے ممالک سیلون ایران اور مصر وغیرہ کو ان کی برآمد بہت بڑے پیمانہ پر کی جا رہی ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مانگ کی غیر معمولی زیادتی کی وجہ سے بعض اشیاء کی کمی

محسوس ہونے لگی اور تمام کی قیمتوں میں اضافہ ہونے لگا اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا غریب کاشتکار قیمتوں کے اس
اضافہ سے کچھ فائدہ بھی اٹھا سکے یا ان کی حالت بدستور قائم رہی کسان قرض کے بوجھ سے جس قدر بھی دبا ہوا ہے
اس سے کون واقف نہیں اور اسی بوجھ کی وجہ سے وہ ساہوکار کا غلام بن کر رہ گیا ہے اس کو اتنی آزادی تک
باقی نہیں رہی کہ اپنی پیداوار کو مارکٹ کے نرخ پر فروخت کر سکے چنانچہ آج بھی ساہوکار اسی پرانے نرخ پر
خریدی کرتا ہے اور مارکٹ کے حالیہ داموں پر فروخت کرتا ہے گو یہ چیز بعض حالات کے تحت کسان کیلئے
فائدہ مند ثابت ہوتی ہے مثلاً سنہ ۱۹۳۱ء کے زمانہ میں جبکہ قیمتیں بہت گری ہوئی تھیں کسان کو زیادہ
نقصان برداشت نہیں کرنا پڑا لیکن اس زمانہ میں یہ چیز ان کے لئے بہت نقصان دہ ثابت ہو رہی ہے۔
تمام نفع ساہوکاروں کے نذر ہو رہا ہے حکومت اشیاء خوردنی کی قیمتوں کا جو تعین کر رہی ہے وہ گو ہمارے
نقطۂ نظر سے فائدہ مند ہے لیکن کاشتکاروں کا مفاد محفوظ نہیں رکھا گیا تعین قیمت کی ایک اور کمزوری
یہ ہے کہ صرف مارکٹ میں قیمتوں کی نگرانی کی جاتی ہے لیکن ساہوکار کے بیچنے کے نرخ پر کسی قسم کی نگرانی
نہیں رکھی گئی اس سے یہ ہو رہا ہے کہ چھوٹے بیوپاری نقصان میں ہیں کیونکہ وہ بڑھیا داموں میں ساہوکار
سے خریدی کرتے ہیں اور انہیں ایک معین قیمت پر بیچنا پڑتا ہے۔ مجھے ان تفصیلات میں جانے کی ضرورت
نہیں کیونکہ یہ چیز میرے عنوان کے حدود سے باہر ہے ۔

اب ہمیں کسان کی قرضداری کے متعلق غور کرنا ہے کہ جنگ نے اس میں کیا کیا تبدیلیاں پیدا
کی ہیں۔ اس موضوع پر بحث کرنے کے لئے ہمیں ابھی بیان کئے ہوئے حالات کو اچھی طرح ذہن میں رکھنا
چاہیئے چونکہ کسان کی مالی حالت میں کسی قسم کا تغیر نہیں ہوا۔ اس لئے یہ نتیجہ بلا تامل قبول کر لیا جا سکتا ہے
کہ کسان کے لئے قرضداری کے جال سے چھٹکارا پانے کی کوئی سبیل نہیں ہے۔ اس کی قرضداری اتنی
بڑھ چکی ہے کہ جب تک اس کی مالی حالت میں کوئی معتدبہ فرق پیدا نہ ہو قرضداری کا بوجھ سر سے علحدہ
ہونا ایک ناممکن سا امر ہے جنگ بجائے اس کی بہتری کے سامان پیدا کرنے کے اس کو مالی حیثیت
سے اور زیادہ ابتر کرنے کی ذمہ دار ہو رہی ہے۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہوگا کہ کافی، چائے اور
ربر کے کاشتکار اس کے برخلاف بہت فائدہ اٹھا رہے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بہت

منظم حالت میں ہیں اور مارکٹ کے نرخ سے بخوبی واقف ہوتے ہیں لیکن ان کی تعداد اتنی قلیل ہے کہ عام کاشتکاروں کے متعلق کوئی نتیجہ اخذ کرنے میں اثر نہیں رکھتے۔

ایک بڑی مصیبت یہ ہے کہ اعلیٰ قسم کا اناج بونے کیلئے کاشتکاروں کے پاس سرمایہ بالکل مفقود ہے سرمایہ حاصل کرنے کے تمام ذرائع بھی فی الحال تقریباً بند ہیں گو ظاہرا ساہوکارہ (Money market) کی حالت ٹھیک ہے لیکن حکومت جنگی اغراض کے سلسلہ میں اتنا قرض لے رہی ہے کہ دوسروں کے لئے مواقع بہت کم ہیں اس سلسلہ میں بینک رہن اراضیات (Land mortgage Bank) کی جانب سے بھی کوئی خاطر خواہ امداد ملنے کا امکان نہیں ہے ان بنکوں نے کاشتکاروں کو جو بھی سرمایہ بہم پہنچایا وہ صرف ان کا قرضہ کم کرنے کی حد تک تھا نہ کہ ان کے کسی تعمیری کام کے لئے اب تو خود ان بنکوں کے ہاں سرمایہ کی کمی محسوس ہونے لگی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ساہوکار اپنا روپیہ سرکاری بنکوں اور اداروں میں محفوظ کرنا زیادہ بہتر سمجھتے ہیں کیونکہ ان کو (Land mortgage Bank) کی نسبت سرکاری بنکوں کی ضمانت کا زیادہ اطمینان ہے۔

جیسا کہ ہندوستان میں دوسرے ممالک کی نسبت فی ایکڑ پیداوار بہت ہی قلیل ہے اب سخت ضرورت محسوس کی جارہی ہے کہ اس مقدار کو جلد از جلد بڑھانے کی کوشش کی جائے لیکن یہاں بھی سرمایہ کا سوال درپیش ہے جب تک کاشتکار کے ہاں سرمایہ نہ ہو اس کے لئے ایسے اصول جو زیادہ پیداوار نکال سکتے ہیں اختیار کرنا محال ہے۔

یہاں یہ بہتر ہوگا کہ ہم حیدرآباد کے مزارعین کی حالت پر ایک سرسری نظر ڈالیں اور اسی سلسلہ میں یہاں کی زراعت کے متعلق کچھ غور کریں حیدرآباد کے گیہوں اور چاول کی پیداوار یہاں کی ضروریات کے لئے ناکافی ہوتی ہے ہر سال ہمیں بمواڑہ سے چاول اور پنجاب سے گیہوں کی ایک بڑی مقدار درآمد کرنی پڑتی تھی۔ سنہ ۱۳۵۰ف میں ۳۰،۸۳۵۰ پلے چاول اور ۸۱۲۸ پلے گیہوں درآمد کئے گئے لیکن جب سے حکومت پنجاب نے گیہوں کی برآمد کو ممنوع قرار دیا ہے ہمارے ہاں گیہوں کی بہت کمی محسوس ہونے لگی ہے حیدرآباد اس کمی کو پورا کرنے کا بندوبست بآسانی کرسکتا ہے ہمارے ہاں تری کی زمینات نظام آباد اور کپل وغیرہ میں کافی موجود ہیں اور وہاں گیہوں کی کاشت بہت کامیاب ثابت ہوسکتی ہے اس سلسلہ میں ہماری حکومت اقدام کرچکی ہے

اور بہت کامیابی کے امکانات موجود ہیں۔ یہ امر بے حد مسرت کا باعث ہے کہ حکومت نے کاشتکاروں کیلئے جو غلہ کی زراعت شروع کریں۔ ۵۰ فیصدی ٹیکس میں کمی کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے اس سے بہت جلد اجناس کی کمی کی تلافی ہوجائے گی۔

حیدرآبادی کاشتکاروں کے مسائل بلاکم وکاست وہی ہیں جو برطانوی ہند کے ہیں جو حل ان مسائل کا ہے ان کا بھی وہی حل ہے غلہ کی پیداوار بڑھانے کے سلسلہ میں ہماری حکومت دو بڑے اچھے طریقے اختیار کرسکتی ہے وہ یہ کہ زرعی نوآبادیات قائم کی جائیں جس میں ہمارے نوخیز تعلیم یافتہ بے روزگاروں کو پھلنے پھولنے کے بہت وسیع ذرائع مل سکتے ہیں ایک تو وہاں اعلیٰ زندگی کا ماحول پیدا کرسکتے ہیں اور دوسرے اپنی قابلیت سے تعلیمی حالت اور انتظامی امور کو بھی درست کرسکتے ہیں ان نوآبادیات کی کاشت ان لوگوں کے ذمہ کیجاسکتی ہے جو اس وقت دیہاتوں میں کاشتکاری کے علاوہ دوسرے غیر ضروری پیشوں میں مصروف ہیں اس طرح ملک کی پیداوار بھی بڑھے گی اور بیروزگاری بھی ایک حد تک دور ہوجائے گی جیسا کہ برطانوی ہند کے کاشتکاروں کے متعلق بیان کیا جاچکا ہے حیدرآباد کے کاشتکاروں کی قرضداری بھی جنگ سے کسی طرح متاثر نہیں ہوتی اس وقت ضرورت ہے کہ ان کی مالی حالت کی طرف توجہ کی جائے جس طرح حکومت رعایا کی شدید ترین ضروریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسٹیٹ بنک کا قیام عمل میں لائی ہے اور اس کے کاموں میں بجا طور پر سرگرمی دکھارہی ہے اسی طرح ہمیں امید ہے کہ حکومت بہت جلد دوسرے قسم کے بنکوں، (Landmortgage Bank) کی جانب بھی اپنی توجہ منعطف کرے گی تاکہ کسانوں کو اعلیٰ قسم کی فصلیں بونے اور (Intensive cultivation) کرنے کے مواقع حاصل ہوں نہ صرف اسی حد تک بلکہ یہ چیز ہمارے کاشتکاروں کے قرض کے بوجھ کو جو مسٹر بھروچہ کی تحقیق کے مطابق ۶۴ ½ کروڑ ہے ہلکا کرنے میں مدد دے گی۔ کاشتکاروں کی چند اور ضرورتیں ہیں جو میں سمجھتا ہوں کہ حکومت کے زیر غور ہیں اور یقیناً بہت جلد ان پر عمل ہونے والا ہے ایک تو یہ کہ ایسے مواقع بہم پہنچائے جائیں جن سے کاشتکار بالراست اپنی پیداوار مارکٹ میں لاکر فروخت کرسکیں اور جنگ کے ان غیر معمولی حالات سے فائدہ اٹھاسکیں دوسرے یہ کہ کسانوں پر سے ٹیکس کا بوجھ کسی قدر ہلکا کردیا جائے اور اس کی وجہ سے موازنہ میں جو کمی واقع ہوگی

اس کو انکم ٹیکس یا ایسے ٹیکسوں سے جن کا بار مالدار طبقہ پر پڑے پورا کیا جائے۔ تیسرے یہ کہ سائنٹفک طور پر پیمائش کرائی جائے اور زرعی مسئلوں کی تحقیقات کے لئے ایک مستقل محکمہ قائم کیا جائے۔ گو اس سلسلہ میں ہمارے ہاں کافی کام ہو چکا ہے لیکن ضرورت ہے کہ اس کام کو اور زیادہ ترقی دیجائے۔

کاشتکار اور زمانۂ جنگ کے اثرات

از جناب حافظ محمد محسن صاحب وکیل ہائی کورٹ ورنگل آباد

زمانۂ جنگ میں کاشتکار پر جنگ کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں اس کے متعلق امور ذیل خاص توجہ کے محتاج ہیں۔ جنگ کے اثرات کاشت اور کاشتکار کی ضروریات پر بہت تکلیف دہ ہوتے ہیں کاشتکار کی آمدنی کا ذریعہ اس کی پیداوار ہے۔ جس کو وہ اپنی محنت و مشقت سے اپنی زمین سے حاصل کرتا ہے۔

اس کو سب سے پہلے پیداوار حاصل کرنے کے لئے زمین کی درستی اور اپنی تندرستی کی ضرورت ہے۔ زمین کی درستی کے لئے حسب ذیل آلات کشاورزی کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔

ناگر۔ بکھر۔ راھگی۔ کولپا۔ ڈبا۔ کھرپی۔ کودالی۔ کلہاڑی۔ پہاوڑہ پیداوار کے حمل و نقل کے لئے گاڑی۔

آلات کشاورزی لوہے اور لکڑی سے مرکب ہوتے ہیں۔ لکڑی کی بہم رسانی میں تو کوئی دقت زمانۂ جنگ میں نہیں ہوتی۔ البتہ لوہا جو سب سے زیادہ ضروری جز آلات کشاورزی کا ہے اس کی بہم رسانی میں زمانۂ جنگ کے پہلے کے مقابلے میں چوگنا۔ پچگنا۔ خرچ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ سب سے پہلے زمین کی درستی کے لئے ناگر کا استعمال ضروری ہے اس زمانہ میں ناگر لوہے کا استعمال ہوا کرتا ہے۔ جس سے لکڑی کے ناگر کے مقابلے میں دوچند سے زیادہ کام نکلتا ہے جنگ سے پہلے ایک ناگر کی قیمت (۲۳) سے (۲۸) روپیہ تک تھی۔ اسی ناگر کی قیمت اب (۵۰) سے (۶۴) روپیہ تک ہے آب اس ناگر کو تو کاشتکار اگر ایک مرتبہ خرید لے تو پھر پانچ سات سال تک خریدنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن اس کے اجزاء ہر سال گھس کر خراب ہو جاتے ہیں جن کو سالانہ بلکہ اس سے بھی کم مدت میں بدلنے کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ مثلاً ناگر کا پہال اور اس کے کیلے تقریباً ہر سال بلکہ پہال کو تو ایک مہینہ استعمال کے

بعد ملکی زمینوں میں لازمی طور پر بدلنے کی ضرورت ہوا کرتی ہے ۔ جنگ کے زمانہ سے پہلے اس کی قیمت ایک روپیہ چار آنے فی بیال تھی ۔ اب اس کی قیمت تین روپیہ چار آنے سے تین روپیہ بارہ آنے تک ہے ان کیلوں کی قیمت جو بیال کے لئے ہمیشہ ضروری ہوا کرتے ہیں پہلے ایک آنہ سوا آنہ تھی اب اس وقت سات آٹھ آنے ہے ۔ ناگر کا رسنا جو پہلے چار یا پانچ روپے کو ملتا تھا اس وقت پندرہ روپیہ بیس روپیہ اس کی قیمت ہے ۔ ناگر کے بعد زمین کی درستی کے لئے بکھر کا استعمال کیا جاتا ہے اس میں جو لوہا ہوتا ہے اس کو پاس کہتے ہیں ۔ پہلے سات آنے سے دس آنے تک ملتا تھا ۔ اب وہ ڈھائی روپے سے ساڑھے تین روپے تک مل رہا ہے ۔ اسی طرح ایک کھرپی کلہاڑی وغیرہ آلات کشاورزی مذکورالصدر کی یہی حالت ہے ۔ جس کو بخوف طوالت ترک کیا جاتا ہے ۔

دوسری ضرورت اس کو اپنی تندرستی کیلئے سب سے پہلے غلہ کی ہوتی ہے اسکو کاشتکار اگر خدانخواستہ فصلیں خراب ہوں تو آسانی سے مہیا کر لیتا ہے مگر غلہ کے ساتھ ترکاری بھاجی کی بھی ضرورت ہوتی ہے جس کی قیمت بھی اس کو چوگنی پچگنی ادا کرنی پڑتی ہے مثلاً مرچ ، نمک ، تیل ، گڑ ، وغیرہ یہ سب چیزیں متعاقباً بہت گراں ہیں ۔ اسکے بعد کپڑے کی ضرورت ہے کپڑا ایک مرد کاشتکار کو سال میں بیس ہاتھ دھوتی کے لئے دو دھوتی جس کو وہ بطور کرتے کے استعمال کرتا ہے ۔ ایک پگڑی ایک کمبل ایک جوتا ۔ اس کی عورت کے لئے دو ساڑیاں یا چار چولیوں کی ضرورت ایک سال میں ہوا کرتی ہے ۔ بیس ہاتھ دھوتی کے لئے کپڑے کی قیمت پہلے (۳-۴) روپیہ ہوا کرتی تھی ۔ وہ اب (۱۰) روپیہ سے زیادہ میں مہیا ہوتی ہے اسی طرح ساڑی جو پہلے ڈھائی روپیہ میں روپیہ میں ملتی تھی وہ اب سات آٹھ روپیوں سے کم نہیں ملتی ۔ جوتا جو پہلے ایک روپیہ بارہ آنے میں ملتا تھا ۔ اب اس کی قیمت چار سے پانچ تک ہے ۔ یہ وہ چیزیں ہیں جس کے بغیر ایک کاشتکار کی زندگی محال ہے ۔ جس کو وہ متعاقباً اتنی زیادہ قیمت ادا کر کے مہیا کرتا ہے ۔ اسی کے ساتھ اس کو پینے کے لئے تمباکو اور کاڑی کی ضرورت ہوتی ہے جن کی قیمتیں بھی بہت زیادہ ہیں ۔ اس زمانہ میں بجائے ۔

ارنڈی کے تیل کے گیاس کے تیل کا استعمال ہوا کرتا ہے۔ اس لئے کہ وہ کلڑی اور لکڑی کے مقابلہ میں زیادہ سستا اور آسانی سے بہم پہنچایا تھا۔ مگر اب اس کی صرف قیمت ہی بہت زیادہ نہیں بلکہ اس کا ملنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔

گرانی کی زیادہ قیمت وہ کس طرح پورا کرے وہ اپنی ضروریات خوردنی میں اگر کمی کرتا ہے تو اس کی صحت پر اثر پڑتا ہے اور کمزور ہو جاتا ہے جس کی وجہ مشقت میں بھی لازمی طور پر کمی ہوگی اور اب مشقت میں کمی ہوگی تو لازمی طور پر زمین کی پیداوار میں بھی کمی ہوگی۔ اس طرح اس کی دولت کی کمی اور عدم دستیابی آلات کشاورزی اس کی تباہی کا باعث ہو رہے ہیں۔ اور اس کی تباہی کا اثر عام طور پر ضروریات جنگ پر بالواسطہ پڑ رہا ہے۔ ہماری سرکار دولت مدار کو سب سے پہلے اس کی ضروریات کے پورا کرنے پر توجہ کرنی چاہیئے۔

تیسری ضرورت کاشتکار کو آلات کشاورزی کے استعمال کے لئے مویشی کی ہوا کرتی ہے۔ مویشی یعنے بیل سابق کے مقابلے میں دو چند سے زیادہ قیمت پر مل رہے ہیں۔ یعنے جو بیل کی جوڑی کاشت کے کام کرنے کے قابل پچاس روپیہ میں مل سکتی تھی انہیں بیلوں کی اب قیمت سو روپیہ سے کم نہیں ہے۔ مویشی کو سنبھالنے کے لئے چارہ اور سرکی یا کھلی کی ضرورت ہے۔ اس زمانے میں چارے کی قلت ہے اور سرکی جو پانچ روپیہ میں فی پلہ ملا کرتی تھی اب وہ بارہ روپیہ اور کھلی پہلے پانچ روپیہ فی پلہ ملتی تھی وہ اب تیرا روپیہ فی پلہ مل رہی ہے۔ سرکی اور کھلی کی قیمت کی زیادتی برآمد زیادہ ہونے سے ہوگئی ہے۔ اور اس کا اثر بیلوں کی تندرستی پر پڑ رہا ہے اور جس طرح سے کاشتکار کی تن درستی میں کمی کا اثر فوری طور پر پیداوار پر پڑتا ہے اسی طرح بیلوں کی کمزوری کا اثر بھی فوری طور پر پیداوار پر پڑتا ہے۔ اور پیداوار کی کمی کا لازمی نتیجہ کاشتکار کی تباہی کا باعث ہوا کرتا ہے۔ اس زمانہ میں فیصدی پچہتر سے زیادہ کاشتکار ایسے ہیں جو اپنی سال بھر کی پیداوار سے سال بھر کیلئے ضروریات کاشت اور قوت لایموت مہیا کرتے ہیں اور پچیس سے کم کاشتکار ایسے ہیں جو اپنی سال بھر کی پیداوار سے سال بھر کی ضروریات پوری کرکے کچھ بچا سکتے ہیں جو اپنی اور اپنے عیال و اطفال کی دکھ بیماری شادی غمی کے اخراجات پورے کرسکتے ہیں۔

اب دوسرا سوال کاشتکار کی اجناس خوردنی اور کپاس و اشیاء روغن دار کی قیمتوں کے اضافہ سے فائدہ یا نقصان کا ہے ۔ سال حال منجملہ پیداوار اور خریف کی کپاس کی قیمت سال گذشتہ کی قیمت کے مقابلے میں دوچند سے کچھ زیادہ ہے لیکن پیداوار نصف سے بھی کچھ کم ہوئی ہے اس طرح کوئی خاص دولت کاشتکار کے پاس کپاس سے نہیں آئی ۔ اب خریف میں مونگ پھلی کی پیداوار بھی آٹھ آنے سے زائد نہیں ہے اگرچہ اس کی قیمت بھی سال گذشتہ کے مقابلہ میں دوچند کے قریب ہے اس کے علاوہ اشیاء خوردنی میں باجری اور تور اور مونگ وغیرہ ہے باجری کی پیداوار مرہٹواڑی میں دس آنے بارہ آنے سے کسی طرح زیادہ نہیں ہے ۔ اور قیمت سال گذشتہ کے مقابلے میں سوا آنے سے زیادہ نہیں ہے ۔ اس کے بعد تور کا نمبر ہے ۔ تور کی قیمت سال گذشتہ کے مقابلے میں اس نسبت سے گئی ہے ۔ مگر پیداوار کسی طرح آٹھ آنے سے زیادہ نہیں ہے ۔ اسی طرح تلی کی پیداوار بھی ہے جس سے کاشتکاروں کو خاص منفعت یا بہت حاصل نہیں ہوتی ۔ اس کی پیداوار بھی آٹھ آنے سے زائد نہیں ہے ۔ اگرچہ قیمت سال گذشتہ کے مقابلے میں کسی قدر زیادہ ہے غرض اس اضافۂ قیمت سے اس سال کاشتکار کی دولت میں اضافہ نہیں ہوا ۔ بلکہ اس کو اپنی لازمی و لابدی ضروریات مہیا کرنے میں ہر طرح خسارہ ہوا ۔

اشیاء خوردنی کی کاشت کے لئے ہماری سرکار نے کاشتکاروں کی ترغیب و تحریص اور منفعت پہونچانے کے لئے احکام جاری کئے ہیں کہ جو کاشتکار سال گذشتہ کی کپاس کے مقابلے میں اشیاء خوردنی کی کاشت زیادہ کرے تو اس کی اشیاء خوردنی کی کاشت کی مالگذاری کم کی گئی ہے لیکن یہ ایک ایسا عمل ہے جس سے فائدہ حاصل کرنا کاشتکار کے اختیار میں نہیں ہے بلکہ ان لوگوں کے اختیار میں ہے جو تختہ بنانے والے اور رپورٹ کرنے والے ہیں ۔ یعنے پٹواری صاحبان ۔ پٹواریوں کو صرف اپنی منفعت کا خیال رہتا ہے ۔ اگرچہ ان کی منفعت سے کاشتکار کا کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو ۔ اس لئے اس حکم میں تبدیلی کی فوری ضرورت ہے ۔ اشیاء خوردنی کے مقابلے میں اشیاء روغن دار کی قیمتیں زیادہ ہوتی ہیں اور اس کی وجہ سے

نقد روپیہ کاشتکار کے ہاتھ میں آتا ہے۔ اس سلسلہ ان کی تخم ریزی پر مجبور ہے۔ اور بعض موسم اور بعض قسم زمین کی ایسی ہوتی ہے کہ جو بجائے اشیا خوردنی کے اشیاء روغن دار کے لئے زیادہ مناسب ہوا کرتی ہے۔ اور اسی قوت نمو کو برقرار رکھنے کے لئے تخم ریزی میں جنس کی تبدیلی کی بھی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کی قوت نمو کم ہو کر زائل ہو جاتی ہے۔

زمین کی قوت نمو کو زیادہ کرنے کے لئے کھاد کی ضرورت بھی لازمی طور پر ہوا کرتی ہے۔ جس کو کاشتکار عموماً جانوروں کے گوبر سے بہم پہنچاتے ہیں۔ اور جب چارے کی کمی یا گرانی ہو تو وہ اپنی ضرورت کاشت سے زیادہ جانور مثلاً گائے بھینس وغیرہ نہیں رکھتا۔ اور اس کی وجہ سے اس کے نہ رکھنے سے کھاد مہیا نہیں ہوسکتی اور عدم دستیابی کھاد سے کمی پیداوار کی کمی ہوا کرتی ہے یہ اثرات موجودہ جنگ کے راست کاشتکار پر پڑ رہے ہیں۔

اس سے قبل کی جنگ میں کاشتکاروں کو اپنی پیداوار کی زیادہ قیمت آنے کی وجہ سے دولت جمع کرنے کا موقع ملا تھا۔ کیونکہ سابقہ جنگ کے زمانہ میں پیداوار کاشت کی قیمت بہت زیادہ ہوگئی تھی اور دیگر ضروری اشیا کاشت کی قیمتوں میں اضافہ نہیں ہوا تھا۔

گرانی نرخ اشیاء کے سلسلہ میں اگر حسب ذیل امور جاری کئے جائیں تو میری ناقص رائے میں کاشتکاروں کو فوائد حاصل ہوسکتے ہیں۔

آلات کشاورزی کا ایک اسٹور قائم کیا جائے ہر ہر تعلقہ میں ایک اسٹور قائم کیا جائے جہاں سے بہت ہی کم کرایہ پر ہر کاشتکار کو آلات دیئے جائیں۔

اچھے بیل فراہم کرنے کے لئے کاشتکاروں کو قرض دیا جائے۔

دیگر ضروریات کاشت مثلاً نیدائی اور کھرپی وغیرہ کے لئے کاشتکاروں کو ہر وقت بقدر ضرورت قرض دیا جائے۔ مگر جو طریقہ کاشتکاروں کو بذریعہ تقاوی قرض دینے کا رائج ہے وہ مناسب نہیں ہے۔ کیوں کہ اس طریقہ سے کاشتکاروں کو قرض حاصل کرنے میں ان کی ضرورت کے وقت روپیہ میسر نہیں آتا ہے اس کے لئے دیہی بنکنگ کا طریقہ

رائج کیا جانا چاہیئے ۔ نوری طور پر کاشتکاروں کی ضرورت کا کپڑا کم داموں میں ان کو مہیا کرنا چاہیئے تاکہ اُن کی تن پوشی ہو ۔

گودام کا طریقہ رائج کرنا چاہیئے جس میں ایک سال تک کاشتکار کا غلہ محفوظ رہے اس کو سال کی کفالت پر مال کی قیمت سے کم روپیہ میسر آنے کا انتظام کیا جائے تاکہ کاشتکار اپنے مال کو کم قیمت پر بیچنے پر مجبور نہ ہو ۔

مالگذاری کی ادائی بجائے اسفندار او خورداد کے اسفندار فہروردی ، اردی بہشت خورداد تک کی جائے ۔ (اور ان چار مہینوں میں جو کاشتکار جتنی رقم لائے اتنی ہی وصول کرنا چاہیئے) اشیاء خوردنی کی تخم ریزی کے متعلق جو رعایت سرکار نے رکھی ہے اس میں اس طرح ترمیم کرنی چاہیئے جو کاشتکار اپنی زمین میں اشیاء خوردنی کی کاشت کرے گا اس قدر زمین کے محاصل میں بہ حساب فی روپیہ چار آنہ کمی کی جائے گی ۔

جس طرح بیوپاریوں کو پرمٹ دے کر ملک سرکار عالی سے علاقہ انگریزی میں برآمد کرنے کی اجازت دی جارہی ہے اسی طرح کاشتکاروں کو اپنی پیداوار برآمد کرنے کی بھی اجازت ملنی چاہیئے ۔

ان امور پر اگر فوری توجہ کی جائے تو ممکن ہے کہ دوران جنگ میں قیمتوں کے اضافہ سے کاشتکاروں کو کافی منفعت حاصل ہو سکے فقط

معاشی کتب خانہ

معاشی کمیٹی کی جانب سے ایک معاشی کتب خانہ قائم کیا گیا ہے ۔ یہ کتب خانہ حیدرآباد میں اپنی نوعیت کا اکیلا ادارہ ہے ۔ عامۃ الناس بھی اس کتب خانہ سے استفادہ کرسکیں گے
ہمدرد اصحاب کتب خانہ میں اضافہ کتب وغیرہ پر توجہ فرمائیں تو
باعث شکریہ ہوگا ۔

حکومت اور زمانۂ جنگ کے معاشی مسائل

از جناب احمد عبدالعزیز صاحب ایم اے لکچرار معاشیات گلبرگہ کالج

آج کل حکومت حیدرآباد کو زمانۂ جنگ کے معاشی مسائل سے فراہمی اور تقسیم اجناس خوردنی کے مسئلہ کو حل کرنے کی سخت ضرورت پیش آرہی ہے جس کی وجہ سے حکومت سرکار عالی نے ایک باقاعدہ نگرانی نرخ اشیار کا علحدہ محکمہ قائم کردیا ہے جو اپنے فرائض کو حکمہ حدتک خوش اسلوبی سے انجام دینے کی سعی میں مصروف نظر آتا ہے مگر یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ اجناس خوردنی کی فراہمی اور تقسیم کے انتظامات ابھی وہ اطمینان بخش صورت اختیار نہ کرسکے کہ جن کی بنا پر رعایائے سرکار عالی سکون کی زندگی بسر کرنے کے قابل ہوسکے۔ مہذب اور متمدن ممالک میں جو جنگ کی آگ کی لپیٹ میں آچکے ہیں ایسی موثر تدابیر فراہمی و تقسیم غلہ کے متعلق اختیار کی گئی ہیں کہ جن کی وجہ سے ہر امیر و غریب شخص کچھ نہ کچھ قوت لایموت حاصل کرہی لیتا ہے ۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مساعی جنگ میں مناسب حصہ لینا جب حکومت سرکار عالی نے اپنا مسلک قرار دیا ہے تو مساعی جنگ کو صحت بخش اصول پر جاری رکھنے کے لئے سب سے زیادہ موثر تدبیر کون سی ہوسکتی ہے ؟ ہمارے خیال میں یہ حالات موجودہ سب سے زیادہ موثر تدبیر غلہ کی فراہمی اور معترہ قیمت پر اس کی مناسب تقسیم بھی ہے ، آج کل حکومت سرکار عالی نگرانی نرخ اشیار کی حکمت عملی پر عمل کررہی ہے لیکن حالات جنگ اس سے زیادہ آگے قدم بڑھانے کے مقتضی ہیں، عام طور سے نگرانی نرخ اشیار کا یہ مفہوم سمجھا جاتا ہے کہ صرف اشیار خوردنی کے نرخ کی نگرانی کی جائے اور اس سے زیادہ تجارتی معاملات میں مداخلت نہ کی جائے مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ خیال بالکل مضحکہ خیز ہے کیوں کہ محض نگرانی نرخ سے ۰۰

اصلی مقصد حاصل نہیں ہو سکتا جس کو حکومت رعایا میں امن و امان برقرار رکھنے کے لئے حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اشیائے مایحتاج کی فراہمی کے علاوہ ان کی مناسب تقسیم اور پھر مقررہ قیمت پر ان کی فروخت ہی وقت کا سب سے زیادہ قابل توجہ مسئلہ ہے، نگرانی نرخ اشیاء کا مطلب صرف قیمتوں کی نگرانی نہیں بلکہ ان کی مناسب فراہمی اور بخوبی تقسیم کا انتظام بھی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ایک مرکزی نظام کے قیام کی ضرورت ہے جس کو عام طور سے محکمہ ماکولات کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ابھی تک یہ محکمہ حکومت سرکار عالی کے جانب سے قائم تو نہ ہو سکا، البتہ بطور بدل محکمہ نگرانی نرخ اشیاء کا قیام عمل میں آیا ہے۔ جو اپنا کام بہر حال انجام دے رہا ہے واضح رہے کہ مسائل ماکولات کو حل کرنے کے لئے ایک باقاعدہ محکمہ ماکولات کا قیام ہی نہایت مناسب ہوگا۔ خود انگلستان میں اور حال ہی میں حکومت ہند نے محکمہ ماکولات کے قیام کی منظوری دیدی ہے۔ اب تک مسائل اشیائے قوتی کو حل کرنے کی جو منتشر کوشش کی گئی وہ بالکل ضروریات ملک کے لحاظ سے ناکافی ثابت ہوئی کیونکہ ان تمام تدابیر کو بیک وقت اختیار کرنے کی مستقل کوشش نہیں کی گئی جو فراہمی و تقسیم غلہ کے لئے ضروری تھیں اب ذیل میں وہ تمام تدابیر تفصیل سے بیان کی جاتی ہیں جو فراہمی و تقسیم غلہ کے مسائل کے حل کے لئے ضروری ہیں۔

اوّل فراہمی غلہ کا جہاں تک تعلق ہے کاشتکاروں کو بجائے صنعتی پیداواروں کے قوتی پیداوار کی کاشت کی زیادہ سے زیادہ ترغیب دی جائے اور حکیمیاتی اصول پر کاشت کے لئے مناسب کھاد کے استعمال کے طریقے منجانب محکمہ زراعت عمل میں لائے جائیں۔ کاشتکار کو مالی امداد اس طریقے پر دیجائے کہ امداد کا مقصد فوت نہ ہونے پائے مثلاً یہ کہ محکمہ زراعت کے ناظروں کی نگرانی میں تقاوی قرضوں کی تقسیم عمل میں آئے اور ایسے کھیتوں کی روزانہ نگرانی کی جائے جن کی فصل کو سرکاری امداد دی گئی ہے۔ آبپاشی کی سہولتوں کی فراہمی بھی اس سلسلہ میں ضرور قابل ذکر ہے جہاں جہاں آبپاشی کی جائے وہاں حیوانات زرعی کے چارہ کی فراہمی اور ان کے امراض متعدی کے بروقت علاج و انسداد کی جانب بطور خاص توجہ کی جائے۔ "زیادہ غلہ اگاؤ" کی مہم صرف ایسی ہی صورت میں کامیاب ہو سکتی ہے جبکہ کاشتکار کے ساتھ مخلصانہ اشتراک عمل کیا جائے اس کے بعد پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے،

کہ فصل تیار ہونے کے بعد کیا کاشتکار کو ساہوکار کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے یا حکومت خود فصل خریدے؟ ہمارے خیال میں اگر حکومت سرکار عالی مثل ممالک متحدہ امریکہ کی حکومت کے مقررہ قیمت پر راست کاشتکار سے غلہ خرید لینے کی مستحسن کوشش کرے تو فراہمی غلہ کا مسئلہ ایک مرکزی نظام محکمۂ ماکولات سرکار عالی کی نگرانی کے تحت صحت بخش اصولوں پر حل ہو سکے گا اور غریب کاشتکار ساہوکار کی نفع اندوزی کا بری طرح شکار نہ ہوگا۔ حال ہی میں حکومت ہند نے فراہمی گیہوں کے لئے ایک کمشنر کا تقرر کر کے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ جملہ پنجاب کی تیار ہونے والی گیہوں کی فصل کو خود خریدے گی اور محکمہ ماکولات حکومت ہند کے زیر نگرانی گیہوں کی فراہمی و تقسیم کا مسئلہ حل کیا جائے گا یہ واقعہ ہے کہ درمیانی تاجر اور غلہ فروش کمپنیوں کے گماشتے من مانی قیمت پر کاشتکار سے غلہ خریدتے ہیں اور معقول قیمت پر اس کو فروخت کرتے ہیں اس نازک صورت حال کا مناسب انسداد نہایت ضروری ہے ورنہ "زیادہ غلہ اُگاؤ" کی مہم کا کوئی خاطر خواہ مقصد حاصل نہ ہوگا۔

دوم غلہ کی فراہمی کے سلسلہ میں سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ملک کے قوتی اشیاء کے ذخائر کے صحیح اعداد و شمار حاصل کئے جائیں یعنے اس امر کا پتہ چلایا جائے کہ کس تعلقہ یا ضلع یا صوبہ میں کتنے ہزار یا کتنے لاکھ انسان کس قسم کے غلہ کی کاشت کرتے ہیں اور اس غلہ کی فصل کی کیا سالانہ مقدار ہوتی ہے اور اس علاقہ میں بسنے والے باشندے خود کس قسم کی غذا کے عادی ہیں اور سالانہ مقدار پیداوار کو آبادی کے تعداد پر تقسیم کیا جائے تو کتنا غلہ کم یا زیادہ ہو سکتا ہے۔ زیادہ غلہ کسی قریبی تعلقہ یا ضلع میں منتقل کیا جاتا ہے یا بطور ذخیرہ کاشتکار مناسب قیمت کے حاصل ہونے تک جمع رکھتا ہے۔ الغرض ان مذکورہ بالا مسائل کا بہترین حل ضرور دریافت کرنا چاہئے۔ جب تک غلہ کے ذخیروں کے صحیح اعداد و شمار دریافت نہ کئے جائیں، فراہمی غلہ اور تقسیم غلہ کی کوشش کبھی بھی سرسبز نہ ہو سکے گی۔ اس سلسلہ میں اس امر کا اظہار بھی بیجا نہ ہوگا کہ سرکاری طور پر اس امر کا سختی سے اعلان کر دیا جائے کہ اگر کوئی ساہوکار یا کاشتکار غلہ کے ذخیروں کو پوشیدہ رکھے اور ان کی صحیح مقدار سے حکومت کو مطلع نہ کرے تو ایسے دشمنان ملک و ملت شخص کو اس جرم کی پاداش میں چھ ماہ کی سزائے قید دی جائے گی۔ اس کے

علاوہ محکمۂ کوتوالی کی جانب سے جو بھی محکمہ مقرر ہو اس کو اس امر کی ہدایت کیجائے کہ وہ عوام میں ایسے خیالات کی نشر و اشاعت کرے کہ جن کی بنا پر لوگوں میں جنگ کے مصائب اور پریشانیوں کا مقابلہ کرنے کی اخلاقی قوت پیدا ہوجائے خصوصاً غلہ فروش ساہوکار طبقے کو ناجائز نفع اندوزی سے پرہیز کرنے کی اس لئے ترغیب دی جائے کہ ملک میں امن و امان قائم رہ سکے اور مفلس، نادار اور بھوکے لوگ لوٹ مار اور ڈکیتی کے جرائم کا ارتکاب نہ کرسکیں، یہ بالکل ظاہر بات ہے کہ بھوکا آدمی قیام امن و امان کے حق میں بے حد خطرناک ہوتا ہے اور ایک بھوکے آدمی کے ہمسائے میں کبھی ایک للدار ساہوکار امن اور آسودگی کی زندگی بسر نہیں کرسکتا کیونکہ یہ بہت ممکن ہے کہ بھوک سے تنگ آکر ایک غریب آدمی ایک خودغرض ساہوکار یا مہاجن کے غلہ گودام کو دن دہاڑے لوٹ لے۔ اور اس طرح امن و امان میں خلل پیدا کرے۔ یہ واقعہ ہے کہ ریاست سرکار عالی کے اکثر مقامات پر لوٹ مار اور ہنگاموں کے جو واقعات پیش آئے ہیں وہ زیادہ تر غلہ کے ذخیروں پر حملوں کی صورت میں ظاہر ہوئے ہیں اس لئے ملک کے امن و امان کو بحال رکھنے کی شدید ضرورت کے مدنظر نہ صرف غلوں کے ذخیروں کے صحیح اعداد و شمار حاصل کئے جائیں بلکہ ذخیرہ پوشیدہ رکھنے والوں کے خلاف موثر تدابیر بھی اختیار کی جائیں۔

سوم ذرائع رسل و رسائل میں سہولت پیدا کرنے کا غلہ کی فراہمی سے بہت ہی گہرا تعلق ہے۔ اس خصوص میں محکمۂ ریلوے کے تعاون عمل کی شدید ضرورت ہے یہ بالکل ظاہر ہے کہ لاکھوں ٹن غلہ بعجلت تمام ایک مقام سے دوسرے مقام تک صرف اسی صورت میں منتقل ہوسکتا ہے جبکہ ریلوے واگنوں کے غلہ کی منتقلی کے لئے بر وقت فراہمی عمل میں آسکے۔ اس موقع پر اس امر کا اظہار بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ محکمۂ ریلوے کی ناگزیر خدمات حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلے غلے کی صحیح مقدار سے ریلوے بورڈ کو واقف کرایا جائے وہ اس طرح کہ اگر ایک تعلقے کے مستقر سے دوسرے تعلقے کے مستقر یا ضلع کے مستقر یا صوبہ کے مستقر پر تیزی سے منتقل کیا جانا ضروری ہے تو فوراً مقدار غلہ کے علاوہ کس وقت کس مقام پر کون سا غلہ منتقل کیا جائے۔ الغرض اس قسم کی

صراحت کی بھی سخت ضرورت ہے ۔ یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ غلہ منتقل کرنے کے کم از کم پندرہ روز پیشتر ریلوے حکام کو واگنوں کی فراہمی کے متعلق منجانب عہدہ داران محکمۂ ماکولات مطلع کردیا جائے تاکہ ہر کام اطمینان اور سہولت کے ساتھ انجام پائے ۔

چہارم غلے کی فراہمی کے سلسلہ میں یہ بات بھی بہت زیادہ غور طلب ہے کہ جب ملک کے قوتی ذخائر کے صحیح اعداد وشمار حاصل کرلئے جائیں اور ملک کے باشندوں کی سالانہ قوتی پیداواروں کے مقداروں کے صرف کا صحیح اندازہ معلوم کرلیا جائے تو اس وقت زائد غلہ بیرون ملک روانہ کرنے کے مسئلہ پر غور کیا جاسکتا ہے چونکہ حکومت سرکارعالی بیں ابھی جملہ قوتی پیداواروں کے صحیح اعداد وشمار کا پورا پتہ چل نہ سکا اور بہت ممکن ہے کہ پورا پتہ ملنے تک کافی عرصہ درکار ہو، اس لئے ہمارے خیال میں یہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یک لخت بحالت موجودہ بیرون ملک غلے کی برآمد کو فوراً روک دیا جائے ۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بعض حکام ضلع کی ناعاقبت اندیشی کی بدولت کثیر مقدار میں غلہ ایک ضلع سے دوسرے ضلع میں پہونچکر وہاں سے سرحدی جاگیراتی علاقوں کے حکام کی چشم پوشی کی وجہ سے بیرون ریاست سرکارعالی غلے کی کثیر مقدار منتقل ہوگئی اور اس طرح سرکارعالی کے اکثر اضلاع میں قحط غلہ کی صورت پیدا ہوگئی جس کا نتیجہ غلہ فروش دکانوں کی لوٹ مار کی صورت میں ظاہر ہوا لہذا اب ضرورت اس امر کی ہے کہ آیندہ لوٹ مار کے ناخوشگوار واقعات کے مناسب سد باب کے لئے فی الحال ہر قسم کے غلے کی برآمد کو ممنوع قرار دیا جائے اور اگر ہمسایہ صوبوں کی امداد بوجہ قحط غلہ ضروری سمجھی جائے تو بطور انسانی ہمدردی ایسا ہی غلہ برآمد کیا جائے جس کی مقدار علاقہ سرکارعالی میں ضرورت سے زیادہ ہو اور جس کے برآمد کرنے سے خود رعایا سرکارعالی کو فاقہ کشی کی زندگی بسر کرنا نہ پڑے ۔

پنجم فراہمی غلہ کے سلسلہ میں مقررہ قیمتوں پر نگرانی بھی نہایت ضروری ہے ۔ اگر مناسب قیمت پر غلہ خریدنے کی نگرانی کی جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر شخص مقررہ قیمت پر اپنی ضرورت کے لحاظ سے غلہ خرید سکے گا اور خود حکومت کو فراہم شدہ غلے کی فروخت کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے گی جس طرح مساعی جنگ میں حکومت سرکارعالی نے دل کھول کر لاکھوں کروڑوں روپیوں کی امداد کر کے حصہ لے رہی ہے

اسی طرح مساعی جنگ کو کامیابی سے جاری رکھنے کی خاطر غلے کو خود خرید کر بلدہ حیدرآباد میں ایک مرکزی گودام تقسیم غلہ قائم کرے اور اگر یہ ناممکن ہو تو کم از کم ہر مستقر تعلقہ، مستقر ضلع، مستقر صوبہ پر ضرور اس علاقہ میں پیدا ہونے والے غلہ کے گودام قائم کئے جائیں اور اس طرح مقامی ضروریات فراہمی و تقسیم غلہ کی خوشگوار طریقہ پر تکمیل کی جائے اگر موثر نگرانی اشیاء کے نرخ پر قائم کرنا ضروری ہے تو بغیر غلہ کے ذخائر کے ایک مرکزی نظام کے قیام کے یہ تخیل عملی صورت اختیار نہ کر سکے گا۔ الغرض یہی وہ تجاویز ہیں جن پر خلوص دل کے ساتھ عمل کیا جائے تو فراہمی غلہ کا دشوار مسئلہ آسانی کے ساتھ حل ہو سکے گا۔

جہاں تک غلہ کی مناسب تقسیم کا تعلق ہے اس امر کا اظہار نامناسب نہ ہوگا کہ سب سے پہلے اس خصوص میں ذرائع حمل و نقل کی امکانی سہولتیں پیدا کی جائیں جیسا کہ اس سے پیشتر کہا جا چکا ہے کہ صحیح اعداد و شمار مقدار غلہ کی فراہمی کے بعد حمل و نقل کی امکانی سہولتوں کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ حالیہ واقعات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ محض غلہ کا پیدا کرنا کافی نہیں ہے بلکہ اس سے زیادہ غلہ کی مناسب تقسیم نہایت ضروری ہے۔ صوبہ جات متحدہ آگرہ و اودھ اور صوبہ پنجاب میں غلہ کثیر مقدار میں بطور ذخیرہ موجود ہے لیکن جنگ کی وجہ سے حمل و نقل کی دشواریاں غلہ کی نامناسب تقسیم میں بہت مزاحمت پیدا کر رہی ہیں اس لئے اس خصوص میں سب سے زیادہ محکمہ ریلوے کے تعاون عمل کی سخت ضرورت ہے جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے بھوکی پبلک امداد جنگ کے کاروبار کی انجام دہی میں کوئی مناسب اور طمانیت آفریں حصہ نہیں لے سکتی اس لئے کم از کم مساعی جنگ کو کامیاب منزل تک پہونچانے کی خاطر نہ صرف فوجی ضروریات کے تحت نالوازمات کی متعلقی محاذ جنگ کو کشوری ضروریات فراہمی ما کو لات پر ترجیح نہ دیجائیں بلکہ حکمراناکولات کے تحت ایک ایسا مرکزی نظام فراہمی و تقسیم غلہ قائم کیا جائے جو نہ صرف فوجی بلکہ کشوری ضروریات اجناس خوردنی کا مناسب لحاظ رکھے اور جو نہ صرف میدان جنگ میں لڑنے والوں کی ضروریات خوراک کا لحاظ نہ رہے بلکہ لڑنے والوں کی مدد کرنے والے دیہات کے کاشتکار اور شہروں میں فوجی کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں اور ماہرین انصرام جنگ کی شکم سیری کی احتیاجات کا لحاظ مناسب کرے یہ بالکل ایک بدیہی بات ہے کہ دشمن سے کہیں

زیادہ بھوکی رعایا رجنگ کی کامیابی کے معاملہ میں خطرناک ہوتی ہے۔ لہٰذا جنگ کو کامیابی سے ختم کرنے کی شدید ضرورت کے مدنظر فراہمی اشیائے ماکولات سے کہیں زیادہ تقسیم اشیائے ماکولات کا مسئلہ اہمیت اختیار کرتا جارہا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ غلہ کی مناسب تقسیم کے مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کیا جائے برائے نام غلہ کی قیمتوں پر نگرانی پر بات کی جائے اور اجناس خوردنی پر صد فی صد نگرانی قائم کی جائے تقسیم غلہ کی موجودہ مشکلات کے مناسب حل اور خاطر خواہ انسداد کے لئے ذیل میں تین تدابیر بیان کی جاتی ہیں جن پر اگر پرخلوص طریقے سے عمل کیا جائے تو تقسیم کی مشکلات یقیناً رفع ہوجائیں گی۔

اوّل کل ہند نظام تقسیم غلہ کے اصول پر کل حیدرآباد نظام تقسیم غلہ کے قیام کی سخت ضرورت ہے اور یہ نظام محکمۂ ماکولات کے تحت قائم کیا جاسکتا ہے اس نظام کے قیام سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ نہ صرف شہری ضروریات بلکہ دیہی ضروریات اشیائے ماکولات کا بھی کافی لحاظ رکھا جاسکے گا اب تک تو ایسا ہوتا آیا ہے کہ حکومت سرکار عالی نے زیادہ تر بلدۂ حیدرآباد اور متعلقہ صوبہ جات ریاست سرکار عالی کی حد تک فراہمی و تقسیم غلہ کے انتظامات کی جانب اپنی توجہ مبذول کی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہ دیہات جو غلہ کی پیداوار کا مرکز سمجھے جاتے تھے اب غلہ کی مقدار کی کمی کو بری طرح محسوس کر رہے ہیں اور پریشان حال بھوکی آبادی بتدریج شہروں کی جانب منتقل ہوتی جارہی ہے حالانکہ شہری آبادی دیہی آبادی کے مقابل میں بے حد میں نہیں ہے پس یہ کسی طرح قرین انصاف تصور نہیں کیا جاسکتا کہ قلیل شہری آبادی کے خاطر کثیر دیہی آبادی کے اجناس خوردنی کی سربراہی میں لیت و لعل سے کام لیا جائے۔

دوم کسی مخصوص فوتی پیداوار کی فراہمی اور تقسیم کے جملہ مدارج کی سہولت بخش تنظیم کافی تصور نہیں کی جاسکتی بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسے تمام اجناس خوردنی کی فراہمی پر موثر نگرانی اور تقسیم کے انتظامات کی موجودگی ضروری ہے جن کے استعمال کے مختلف اضلاع سرکار عالی میں بسنے والے عوام سالہا سال سے عادی ہوچکے ہیں اس خصوص میں اس امر کا اظہار بھی نامناسب نہ ہوگا کہ عوام کو ترغیب دی جائے کہ وہ اشیائے ماکولات کی مناسب پیداوار کے اصول کی دقتوں کے مدنظر

بطور بدل بجائے شکر کے گڑ کا اور بجائے جوار کے باجرہ کا استعمال شروع کر دیں اور اسی طرح بجائے گرنی میں صاف کئے ہوئے چاول کے ہاتھ سے کوٹے ہوئے چاول کو ترجیح دیں ۔

سوم طلب ورسد کے مسائل حل کرنے والے افراد میں کامل ہم آہنگی اور تعاون عمل کی شدید ضرورت ہے ۔ اور یہہ بات محض کانفرنسوں کے انعقاد سے حاصل نہیں ہوسکتی ۔ اس کے لئے ہمدردی ایثار اور جوش عمل کی فراوانی کی سخت ضرورت ہے ۔ تقسیم اشیائے خوردنی کا مسئلہ ایک موثر نگرانی کا طالب ہے اس لئے محکمۂ ماکولات کے تحت ایک مرکزی تقسیم غلہ مجلس کے قیام کی بلدہ میں سخت ضرورت ہے جس کے اراکین میں نہ صرف محکمۂ ماکولات کی وزارت کے ذمہ دار ارکان ہوں بلکہ جاگیرات صرفخاص سمستان ، اور پائیگاہوں کے نمایندے بھی ہوں اس مرکزی مجلس غلہ کے اراکین میں ایوان تجارت حیدرآباد کا ایک نمایندہ بھی ہو اور محکمۂ ریلوے کا ایک ماہر حمل ونقل عہدہ دار بھی ہو اور اس مرکزی مجلس تقسیم ماکولات کا یہہ فرض ہوگا کہ وہ روز آنہ جنگ کی وجہ سے تغیر پذیر حالات کا بغور مطالعہ کرتی رہے ۔ اور تقسیم ماکولات کی پیچیدگیوں کو رفع کرنے کے لئے کم از کم ہر ماہ دو مرتبہ اپنا اجلاس منعقد کرتی رہے ۔ واضح رہے کہ صدر مجلس تقسیم ماکولات کا ہر وہ رکن جو اپنے اپنے صوبہ یا ضلع کی نمایندگی کرنے کے قابل ہو اور دیگر یہہ کہ ہر وہ رکن جو سمستان ، مجلس جاگیرداران اور پائیگاہوں کی طرف نمایندگی کرتا ہو اس کا بھی یہہ فرض ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے متعلقہ علاقہ کی ذیلی مجلس تقسیم ماکولات سے باقاعدہ ربط قائم رکھے اور اپنے ضلع یا صوبہ یا جاگیراتی سمستانی یا پائیگاہی علاقہ کے مسائل تقسیم ماکولات کی دقتوں یا سہولتوں سے بخوبی واقف ہو کر اپنے سنجیدہ خیالات کو بطور مشورات مرکزی مجلس ماکولات بلدہ کے اجلاس میں وقتاً فوقتاً پیش کرتا رہے اسی طرح ہر تعلقہ یا تعلقہ واری مجلس فراہمی و تقسیم اشیائے خوردنی قائم کی جائے پھر مجلس ماکولات تعلقہ کا نمائندہ ہر تعلقہ ضلع کی مجلس ماکولات میں اپنے اپنے تعلقہ کے مسائل ماکولات کو وضاحت کے ساتھ پیش کرے اور مجلس ضلع میں کل ضلع بھر کے تعلقہ جات کے مسائل فراہمی و تقسیم غلہ کے متعلق کافی غور و خوض کیا جائے اسی طرح ہر مستقر صوبہ پر اس صوبہ کے جملہ اضلاع کے مجالس ماکولات کے نمایندے کم از کم مہینے میں دو مرتبہ زیر صدارت صوبہ دار وقت مجلس ماکولات صوبہ کے

اجلاس میں شرکت کریں اور اپنے اپنے ضلع کے مشکلات فراہمی غلہ کو وضاحت کے ساتھ پیش کریں۔ تیسرے ہر
صوبہ کا ایک ذمہ دار نمائندہ صوبہ جاتی مشکلات فراہمی و تقسیم غلہ کو صدر مجلس ماکولات مستقر بلدہ میں بوقت انعقاد اجلاس پیش کرے۔
الغرض اس طرح ایک مربوط اور مستحکم نظام ماکولات کے قیام سے وزارت ماکولات سرکار عالی کو ملک محروسہ کے ماکولاتی مسائل سے
بہترین طریقے سے واقف ہونے کا موقع ملتا رہے گا۔ جس طرح ہر ضلع اور تعلقہ میں مجالس مدارج جنگ قائم کی گئی ہیں اور ان
مجالس کے ارکان میں وکیل، تاجر اور مالکان کارخانہ جات مختلف اور سرمایہ دار ساہوکار رہا کرتے ہیں اسی طرح مجلس ماکولات تعلقہ و ضلع
کے ارکان میں ساہوکار زمیندار اور صاحب حیثیت پیٹھ دار کاشتکار رعایا کے علاوہ عہدہ داران مال ضرور شامل ہوں
جب تک ایسا مکمل نظام اشیائے ماکولات کی تنظیم کے لئے قائم نہ ہو اس وقت تک صوبجات یا حیدرآباد میں بیٹھ کر کوئی وزارت
ماکولات اپنے فرائض مفوضہ کو صحیح طریقہ پر انجام نہیں دے سکتی۔ ہمارے خیال میں حسب ذیل قوتی اور غیر قوتی اشیاء کی قیمتوں
پر سرکاری نگرانی فوراً قائم کرنا ضروری ہے، خصوصاً مذکورہ ذیل قوتی پیداواروں کی برآمد اگر ختم جنگ تک ممنوع قرار دیجائے
تو نہایت مناسب ہوگا تاکہ ریاست سرکار عالی کی رعایا اپنی ضروریات زندگی کی فراہمی میں غیر معمولی مشکلات سے
نجات حاصل کر سکے۔ گیہوں، جوار، چاول، شکر، باریک دانے والا غلہ جیسے باجرا، مونگ، چنا، تور، مسور، گھی، گڑ، تل
مونگ پھلی، کرڈی کے تخم، کاغذ، کپاس، کاتیں، دیا سلائی، صابن، انڈے، خستہ شدہ سوتی پارچہ یا ارزاں معیاری پارچہ،
ہیزم سوختنی، کوئلہ زغالی، آج کل اضافہ اجرت مزدوروں کا مسئلہ بیحد اہمیت اختیار کرتا جارہا ہے۔ اس مسئلہ کو حل کرنیکی
واحد صورت یہ ہے کہ اشیائے ماکولات کی فراہمی اور تقسیم میں سہولت پیدا کی جائے۔ غلہ کی قیمت مقرر کردی جائے
اور ناجائز نفع اندوزی کی مناسب روک تھام کی جائے۔ ان تدابیر کے اختیار کرنے سے یقین ہے کہ صنعتی مزدوروں
کی بے چینی جو گرانی کی وجہ سے بڑھتی جارہی ہے بہت بڑی حد تک گھٹ جائیگی۔ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ اجرتوں کی کمی
زیادتی کا معیار غلہ کی ارزانی و گرانی ہے۔ اگر غلہ ارزاں رہا تو کم اجرت پر کام کرنے کے لئے مزدور تیار ہوجاتا ہے
لیکن اگر غلہ گراں ہوجائے تو مزدور زیادہ اجرت کا طلبگار ہوتا ہے اور جب مزدور کے اضافہ اجرت کے مطالبہ
کو مسترد کیا جاتا ہے تو ہڑتالوں کی صورت پیش آتی ہے۔ بہر حال اضافہ قیمت پیداوار کی مناسب روک تھام کیلئے غلے کی قیمت
کا مقرر کردیا جانا نہایت ضروری ہے اس سے نہ صرف کاشتکار کو مناسب فائدہ حاصل ہوگا بلکہ ساہوکار بھی
ناجائز نفع اندوزی کی جرات نہ کر سکیگا کیونکہ مقررہ قیمت پر اگر خود حکومت کاشتکار کا غلہ اس کے کھیت ہی پر خریدنے

تیار ہوجائے اور کھاد کی فراہمی تقاوی رقم کی امداد اور آبپاشی کی سہولتیں مہیا کردیجائیں تو یقین ہے کہ زیادہ غلہ اگاؤ
کی مہم کامیاب طریقہ پر جاری کی جاسکتی ہے۔ صحیح اعداد وشمار ذخائر غلہ کی فراہمی کے ساتھ ہی ساتھ محکمۂ ریلوے کے
اشتراک عمل سے غلہ کی کثیر مقدار ایک مقام سے دوسرے مقام تک بہ آسانی منتقل کی جاسکتی ہے راتب بندی
یعنی راشننگ کا طریقہ بھی اشیائے خوردنی کی مناسب تقسیم کے سلسلہ میں نہایت مفید اور موثر ثابت ہوا ہے۔ مگر شرط
یہ ہے کہ جب کسی قوتی پیداوار پر راتب بندی کا قانون جاری کیا جائے تو اس پیداوار کی فراہمی اور تقسیم میں ممکنہ سہولتیں
پیدا کرنا نہایت ہی ضروری ہوگا۔ اس سلسلہ میں اس امر کا اظہار بیجا نہ ہوگا کہ زیر نگرانی سرکار غلہ کی ارزاں فروشی کی دکانات
کا قیام بھی نہایت مفید ثابت ہوا ہے حکومت بمبئی نے اس خصوص میں نہایت ہی مستحسن اقدام کیا ہے جیسے
غریب شہری آبادی کی سہولت کے لئے مقررہ قیمت پر شہر کے مختلف محلوں میں سرکاری دکانیں قائم کی گئی ہیں
جہاں مقررہ قیمت پر غلہ فروخت کیا جاتا ہے اور اس طرح غلہ فروش ساہوکار طبقہ کو ناجائز نفع اندوزی سے
روک دیا گیا۔ بہرحال یہ ایک امر مسلمہ ہے کہ جنگ کے زمانے میں گرانی کی وجہ عوام کے جذبات ہر وقت مشتعل
رہتے ہیں اس لئے گرانی کے مسائل کو حل کرنے کی سخت ضرورت ہے اور اس خصوص میں اشیائے خوردنی و ضروریات
حیات کی فراہمی اور مقررہ قیمتوں پر ان کی تقسیم و فروخت کا طریقہ عمل ہی جنگ کو کامیاب منزل تک پہنچانے
کا بہترین حل ثابت ہوگا نیز حکومت سرکار عالی کا فرض اولین یہ بات ہونی چاہیئے کہ مسائل ماکولات
کو منحیث اصول پر حل کرنے کے لئے وزارت ماکولات کا قیام عمل میں لائے جس کے تحت فراہمی و تقسیم اشیائے
خوردنی و دیگر ضروریات حیات کی سربراہی کے صحت بخش انتظامات کامل ہو۔ اس خصوص میں کسی قسم کی نامناسب
تاخیر کو گوارا نہ کیا جائے۔

ہماری بارگاہ رب العزت میں یہی دعا ہے کہ :۔ رعایائے سلطنت آصفیہ آقائے ولی نعمت
اعلیحضرت بندگان عالی کے زیر سایہ اس ہولناک عالمگیر جنگ کے پرآشوب دور میں امن وامان کی
زندگی بسر کرے!

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد!

صدر معاشی کانفرنس کی اختتامی تقریر

از جناب مولوی محمد الیاس برنی صاحب

پانچویں معاشی کانفرنس میں جو مقالے پڑھے گئے اور تقریریں کی گئیں ان پر تبصرہ کرتے ہوئے دوسرے اجلاس کے اختتام پر صدر جلسہ مولوی محمد الیاس برنی صاحب نے جو تقریر فرمائی اس کو مختصر نویس حسبِ تہ جستہ قلمبند کر سکے چنانچہ اس کا مختصر خلاصہ بعض خاص عنوانات کے متعلق ذیل میں درج ہے ۔

معاشی مباحث کے جلسوں میں عام شرکت کا ذکر کرتے ہوئے فاضل صدر نے فرمایا کہ :-

عمرانی زندگی کے جو دیگر شعبے ہیں مثلاً قانونی ۔ یا سیاسی ۔ ان شعبوں سے صرف خاص خاص موقعوں پر خاص خاص افراد یا طبقوں کو راست سابقہ پڑتا ہے ۔ لیکن عمرانی زندگی کا معاشی شعبہ سب سے زیادہ عام ہے ۔ امیر غریب ، بوڑھے بچے ، عالم ، جاہل ، سب کو اس شعبہ سے ہر وقت راست سابقہ رہتا ہے اور یہ سابقہ عادت میں داخل ہو جانے کے سبب کسی خاص توجہ کا محتاج اور مستحق نہیں سمجھا جاتا ۔

واضح ہو کہ جسمانی زندگی کی تین حالتیں ہیں ایک اوسط حالت جو صحت کہلاتی ہے اور دو انتہائی حالتیں ہیں ایک بیماری یا کمزوری دوسری ورزش و تندرستی ، اوسط حالت یعنے صحت کا علم عام ہوتا ہے اور عام ہونا چاہیے البتہ انتہائی حالتوں کا علم خاص طبقوں تک محدود رہتا ہے ۔ چنانچہ بیماری اور کمزوری اور ورزش و تندرستی کا علم طبی کالجوں ، طبیبوں ، ڈاکٹروں ، ورزشی اداروں ، اور فن ورزش کے ماہروں ، سے تعلق رکھتا ہے ۔ شفاخانوں دواخانوں ، ورزش گاہوں ، اور بازی گاہوں میں ان علوم کا عمل نظر آتا ہے ۔ عام لوگوں کو یہ علوم حاصل نہیں رہتے ۔ البتہ وہ اہل علم کے مشوروں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اٹھاتے ہیں ۔ یہی حال معاشی زندگی کا بھی ہے یعنے اوسط حالت عام مرفہ الحالی ہے ۔

اور انتہائی حالتیں دو ہیں۔ پراگندہ ناداری، یا کثیر سرمایہ داری، عام طبقوں میں معاشی بیداری پھیلانے کے واسطے عام مرفہ الحالی کے عام اصول عام فہم پیرایہ میں پیش کرنا مفید مطلب ہو سکتا ہے۔ خاص کر ابتدائی مراحل میں جبکہ معاشی ناواقفیت عام ہو یہ طریق ناگزیر ہے۔ رہیں باقی دو حالتیں یعنے پراگندہ ناداری، اور کثیر سرمایہ داری، یہ مباحث علمی اور عملی جہت سے دقیق اور دشوار ہونے کے سبب معاشی واقفیت کے طالب ہیں۔ یوں دل بہلانے کی دوسری بات ہے، ورنہ ان مباحث کی تعلیم و تفہیم معاشیات کے معلمین اور متعلمین کا حصہ ہے یہ سچ ہے کہ تینوں حالتیں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ پھر بھی ان کی تفہیم میں تفریق کی گنجایش ہے

مفروضات اور ان کی دقتیں ۔ یہ امر محتاج بیان نہیں کہ معاشیات کے نظریات مفروضات پر مبنی رہتے ہیں۔ مفروضات جس حد تک غائب ہوں عملی اعتبار سے نظریات اس حد تک بے اصل رہ جاتے ہیں۔ اس ہی سبب سے بعض صورتوں میں نظریات اور عملیات میں نمایاں بعد نظر آتا ہے جو باعث حیرانی ہو جاتا ہے۔ موجودہ معاشی نظریات تمام تر مغربی ممالک میں مغربی غور و فکر سے صورت پذیر ہوے ہیں اور اس ہی مناسبت سے ان میں مفروضات مضمر ہیں۔ یہ لازم نہیں کہ وہ مفروضات مشرقی ممالک میں بھی اسی درجہ اصلیت رکھتے ہوں ممکن ہے کہ یہاں دوسرے مفروضات زیادہ قرین حقیقت ہوں اور ان مفروضات کی بناء پر نظریات بھی کم و بیش مختلف شکل اختیار کریں۔ بہرحال مفروضات کے تعلق سے نظریات میں لازمی اضافیت رہتی ہے۔ لیکن عام طور پر مفروضات نامعلوم یا نظر انداز ہونے کے سبب نظریات کے بے محل انطباق کی توقع اور کوشش کی جاتی ہے جس سے لامحالہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ پھر نظریات کے ساتھ عملیات کو لیجیے تو ان میں وہی تعلق قائم ہے جو اصول کو علاج الامراض سے تعلق حاصل ہے۔ بہرحال درمیانی اجتہاد کی ضرورت ہے۔ مزید برآن ہندوستان کی معاشیات عملی میں سیاسیات کی آمیزش معمول سے بڑھی رہتی ہے اور فنی نظر کے بغیر اس آمیزش کا پتہ چلنا دشوار ہے۔ اس لئے معاشیات کے عملی وسائل کا سلجھاؤ خاص بصیرت کا طالب رہتا ہے۔

ورنہ مفروضات کی اصلیت اور سیاسیات کی آمیزش کا علم و اندازہ نہ ہونے کے سبب معاشی مباحث
اور مشوروں میں خاصی الجھن پڑ جاتی ہے ۔ خاص کر جبکہ ناواقفیت کے ماحول میں ان کی اشاعت ہو۔
حاصل کلام یہ کہ اگر معاشی اصول و مسائل سے عام دلچسپی اور واقفیت پیدا کرنی مقصود ہو کہ
ملک میں معاشی بیداری پھیلے تو فن کے دقیق اور پیچیدہ مسائل سطحی رنگ میں پیش کرنا چنداں مفید مطلب
نہیں ہوتا کہ اس سے ناواقفوں میں یا تو نافہمی کی مایوسی پیدا ہوتی ہے یا کم فہمی کی مرعوبیت یا بہر خوش
فہمی کا مغالطہ پھیلتا ہے ۔ بہر حال استفادہ کی گنجائش کم رہتی ہے اس کے برعکس معاشیات کے
عام اصول جو عام مرفہ الحالی سے تعلق رکھتے ہوں عام فہم پیرائے میں عام واقفیت کے واسطے
شائع ہوتے رہتے ہیں تو معاشی بیداری کی علمی اور عملی رفتار میں ترقی کی امید ہو سکتی ہے ۔ ترقی کے ساتھ
ساتھ البتہ ممکن اور ضرور ہے کہ مباحث میں نسبتاً وسعت اور رفعت پیدا ہو ۔ بہر حال مباحث
کی تعمیم میں ذہنیت اور واقفیت کا تناسب ملحوظ رکھنا لازم ہے ۔

محاصل بالواسطہ اور بلاواسطہ محاصل اندازی کے سرکاری مسلک پر جو خصوصیت سے
بحث کی گئی اس میں چند علمی اعتبارات قابل توجہ ہیں محاصل عائد کرنا، وصول کرنا، اور صرف کرنا
یہ جملہ امور فن مالیات میں داخل ہیں اور مالیات کا فن معاشیات میں خاص اہمیت رکھتا ہے اس
فن کے ماہر کم دستیاب ہوتے ہیں ۔ تفاسیر تو بہت طویل ہیں مختصر یہ کہ محصول اندازی میں چند اصول
معیار شمار ہوتے ہیں ۔ بالخصوص یہ کہ محصول پیدائش دولت میں مانع اور مزاحم نہ ہو یا یہ کہ وصول
کرنے میں محصول کا کوئی قابل لحاظ حصہ ضائع نہ ہو ۔ اور مصارف بھی کم لاحق ہوں ۔ پھر محصول اندازی
کے دو طریق ہیں ۔ بالواسطہ یا بلاواسطہ بصورت اوّل جس طبقے پر محصول عاید کرتے ہیں اس سے
راست وصول نہیں کرتے ۔ بلکہ دوسروں کے توسط سے وصول کرتے ہیں ۔ بصورت دوم لینا بلاواسطہ
راست عمل میں آتی ہے کن کن صورتوں میں کون سا طریق موزوں و مناسب ہے ۔ بجائے خود یہ بھی
ایک اہم سوال ہے ۔ پھر یہ اطمینان کرلینا بھی ضرور ہے کہ کہیں خلاف منشا بالواسطہ محصول
عدم منتقلی کے سبب بلاواسطہ محصول کی شکل نہ اختیار کرے یا اس کے برعکس بلاواسطہ منتقلی کے

سبب بالواسطہ بن جائے کہ ہر دو صورت میں نا دانستہ طور پر ان طبقوں سے محصول وصول ہونے لگے گا جن سے وصول کرنا مقصود نہیں۔ اور وہ طبقے محصول کے بار سے بچے رہیں گے جن سے وصول کرنا مطلوب ہے۔ محصول میں منتقلی اور عدم منتقلی کی یہہ خاصیت اصطلاحات تقدیہ محصول کہلاتی ہے اور اس خاصیت کا عملی مشاہدہ کرنے میں دور بینی اور باریک بینی کی ضرورت پڑتی ہے ۔

محصول اندازی کا مسلمہ مسلک یہہ ہے کہ ملک کے مختلف طبقوں پر حسب حیثیت بار عائد ہونا چاہیئے۔ دولت مندوں پر زیادہ۔ متوسطوں پر کم اور غریبوں پر بہت کم۔ لیکن اگر آمدنی کے حساب سے یک شرح محصول عاید کیا جائے۔ مثلاً دو فیصد یا چار فیصد وغیرہ تو گرچہ بظاہر اس میں مساوات نظر آتی ہے۔ تاہم جو لوگ قانون تقلیل افادہ اور قدر زر کے مسئلہ سے واقف ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اس نمایشی مساوات میں کس درجہ عدم مساوات مخفی ہے ۔ اس ہی سبب محصول آمدنی میں خاص طور پر محصول متناسبہ کے بجائے محصول متزائدہ کا طریقہ رائج ہے۔ یعنے آمدنی زیادہ ہونے کی صورت میں شرح محصول میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ مثلاً ہزار کی آمدنی تک دو فی صد اس کے بعد پانچ ہزار تک چار فیصد اس کے بعد دس ہزار تک پانچ فیصد وقس علیٰ ہذا ۔ اس اجمال سے زیادہ تفصیل کی یہاں گنجایش نہیں ۔

مصارف کا مسئلہ پھر محاصل عاید کرنے اور وصول کرنے کے ساتھ محاصل صرف کرنے کا مسئلہ بھی کچھ کم اہم نہیں ہے ۔ تو فیر آمدنی سے کیا حاصل اگر صرف آمدنی میں باقاعدگی نہ ہو۔ بڑی سے بڑی رقم اسراف اور فضولیات میں تلف ہوسکتی ہے کہ ملک کو قابل لحاظ فائدہ نہ پہونچے۔ گویا کہ کسی ساگر کا پانی اس طرح بہا دیا جائے کہ اس سے زراعت کی آبپاشی نہ ہوا اور آبادی کی آب رسانی نہ ہو۔ المختصر تحصیل محاصل کا مقصد ہی صرف محاصل ہے اور اس کی باقاعدگی کا معیار یہ ہے کہ ملک کو زیادہ سے زیادہ امداد ملے۔ فائدہ پہونچے اور ظاہر ہے کہ جب تک رفاہ عامہ کی شکلیں پیدا نہ ہوں یہ معیار پورا نہیں ہوسکتا مثلاً پوری مملکت میں دارالسلطنت کا آراستہ و پیراستہ ہوجانا کافی نہیں بلکہ قصبات و دیہات کو بھی زندگی کی واجبی سہولتیں اور راحتیں میسر آنی چاہئیں کہ آبادی کا بڑا حصہ وہیں مقیم ہے اور وہاں سے محاصل کا بڑا حصہ وصول ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے دیہات سدھار اور قصبات سدھار کی تحریکیں بہت ہمدردی اور امداد کی مستحق ہیں۔

کاشتکاروں پر ہمدردی کی جو بارش ہر طرف ہو رہی ہے وہ بڑی حد تک حق بجانب ہے لیکن اس بارش کے بادلوں میں سیاسیات کی بجلیاں بھی روپوش ہیں۔ جو کبھی کبھی چمک کر کڑک سناتی ہیں۔ آیا حکومت زمین کی مالک ہے یا زمیندار مالک ہیں یا کاشتکار مالک ہونا چاہیئے۔ ملکیت کی یہ بحث تاریخی، سیاسی اور معاشی اعتبار سے اتنی سہل اور سادہ نہیں ہے جتنی کہ کاشتکاروں کی حمایت میں تعصب سے پیش کی جاتی ہے۔ بہر حال اگر زمین پر کسی کو حق ملکیت حاصل ہو سکتا ہے تو ملک میں قومی مرکز ہونے کی حیثیت سے حکومت سب سے زیادہ اس امانت کی مستحق ہے۔ تاہم کاشتکار کا تعلق بھی زمین کے ساتھ مستحکم رہنا ضرور ہے اور اس کی عملی صورت یہ ہے کہ کاشتکار مالک زمین نہ ہو تو بھی اوس کا زرعی زمین پر قبضہ دیرپا ہونا چاہیئے۔ اگر اس کو زمین سے جلد سے جلد بے دخل کیا جائے یا قبضہ کے معاملہ میں مذبذب رکھا جائے تو زراعت کی ترقی نہ صرف معاشی بلکہ نفسیاتی اعتبار سے بھی دشوار ہے۔ بہر حال قبضہ کے معاملہ میں کاشتکار کو مطمئن رکھنا ناگزیر ہے۔

رہا لگان اور مالگذاری کا سوال اس سے کاشتکار کی تباہ حالی جس درجہ منسوب کی جاتی ہے اس میں ممکن ہے کہ مبالغہ ہو لیکن اصلیت بھی ضرور ہے۔ اور حالات حاضرہ کے مدنظر ترقی زراعت کے خاطر اس میں تخفیف کی ضرورت عام طور پر مسلم ہے۔ تاہم کاشتکار کی تباہ حالی میں زمیندار یا سرکار کو جو الزام دیا جاتا ہے تو ساہوکار کی دست برد بھی کچھ کم قابل انسداد نہیں ہے۔ کاشتکاروں کو اعلیٰ شرح سود پر قرض دینا اور ادنیٰ نرخ پر ان سے زرعی پیداوار خریدنا گاؤں گاؤں ساہوکاروں کا یہی کاروبار ہے اور خستہ حال دیہات اور قصبات میں ساہوکاروں کی خوش حالی گویا اون کے کاروبار کا عملی نتیجہ آنکھوں کے سامنے موجود ہے پس اگر واقعی کاشتکار کی ہمدردانہ امداد مقصود ہے تو ساہوکار سے بآسانی ابتداء ہو سکتی ہے۔ اور ہونی چاہیئے البتہ زمیندار اور سرکار کی شرکت بھی ضرور ہے۔

زمانہ کا تقاضا زمانہ کی جو افتاد ہے اس کا تقاضا یہی معلوم ہوتا ہے کہ معمولی حالتوں میں جو غیر معمولی تفاوت پیدا ہو گیا ہے وہ بڑی حد تک رفع ہو کر کم و بیش مساوات کی شکل پیدا ہو۔ خیر یہ تو ایک بڑا سوال ہے۔ تحصول اندازی کی حد تک یہ امر مسلم ہے کہ دولت مند طبقوں کو ملک کی

روزافزوں ضروریات کے مدنظر محاصل کا واجبی بار حوصلہ مندی سے برداشت کرنا ملک کے اور خود ان کے حق میں ہر طرح بہتر ہے اور ان کی رعایتی فیاضی اور بہی خواہی سے ایسے ہی ایثار کی توقع ہے۔ رہا نگرانی مصارف میں شرکت کا سوال مشاورتی مجالس کے ذریعہ اس طریق کی ابتدا ہو چکی ہے ترقی کے ساتھ توسیع ممکن ہوگی۔ لیکن نمایندگی جس پر بجا طور سے اس قدر زور دیا جاتا ہے اس ہی صورت میں مفید ہو سکتی ہے جبکہ نمایندوں کا علمی اور خاص کر اعلیٰ معیار بلند ہو ورنہ اسی قدر بے پیدا ہونی ممکن ہے۔ چنانچہ ملک میں جا بجا اس کے تجربے بھی ہو چکے ہیں۔

ایک نمایندگی پر کیا موقوف ہے۔ ملک اور قوم کی ترقی کے سب شعبے جن میں معاشی زندگی کا شعبہ بھی شامل ہے کارگزار انسانوں سے متعلق ہیں۔ کارگزار انسانوں سے مفلس ملک لامال ہو گئے اور کارگزاری غائب ہوئی تو بڑی بڑی قدرتی ذخیرہ بھی ہاتھ سے نکل گئیں۔ دہی جسمانی صحت دماغی تربیت اور تعلیمی تہذیب انسانی کارگزاری کے عناصر ہیں۔ ہر قوم میں طالب علم کارگزاری کا سرمایہ ہیں۔ قبل از قبل ان کو سیاسیات میں گھسیٹ کر تلف کرنا ملک کے حق میں بڑا ظلم ہے۔ اور اس ہی وجہ سے تعلیم گاہوں پر نگرانی کی ضرورت بڑھ گئی ہے کہ وہ ایسے مضر اثرات سے محفوظ رہیں اور طلباء تکمیل پا کر نکلیں تو ملک اور قوم کی خدمت وقت پر خوبی سے انجام دیں۔

بہرحال صحیح طریق پر ملک میں معاشی بیداری پھیلانے کی ضرورت ہے اور بیداری کے ساتھ معاشی زندگی میں اصلاح اور ترقی بھی شروع ہو جانی چاہیئے کہ حصول مقصد کے واسطے قول و فعل کا اتحاد لازم ہے۔

اس سلسلہ میں فاضل صدر نے مقالوں کے دیگر معاشی مباحث پر بھی تنقیدی روشنی ڈالی اور تقریباً ایک گھنٹہ تبصرہ ہونے کے بعد معاشی کانفرنس کا آخری جلسہ بخیر و خوبی برخاست ہوا۔

نمائش مصنوعات ممالک آصفیہ

پیامات

ہر ہائینس شہزادی درِ شہوار دردانہ بیگم صاحبہ تنہا پرنسس آف برار

نمائش مصنوعات ممالک آصفیہ کے ملاحظہ سے میں بہت محظوظ ہوئی۔ نمائش کا ایک علمی ادارہ کے زیر اہتمام منعقد ہونا اور جامعۂ عثمانیہ کے فرزندوں کا اس کے انتظام اور ترقی کے لئے کوشاں ہونا ذات شاہانہ کی اس سرپرستی کا ثمرہ ہے جس کے بدولت ملک شاہ راہ ترقی کی منازل طے کر رہا ہے۔

ممالک آصفیہ کے معدنی ذخائر صنعتی وسائل اور فنون لطیفہ پر کامل توجہ کئے بغیر نہ قدیم صنعتوں کا احیا ممکن ہے اور نہ جدید صنعتیں قایم ہوسکتی ہیں۔

میری تمنا ہے کہ انجمن طیلسانین عثمانیہ کی کوششیں بار آور ہوں اور صنعتی ترقی کی توقعات شاہ جم جاہ کے سایۂ عاطفت میں پوری ہوں"۔

ہز ہائی نس حضرت والاشان ولی عہد بہادر دولت آصفیہ

"ممالک محروسہ کے بعض اضلاع سے نمائش کے لئے مصنوعات آنے میں حالات حاضرہ کی مشکلات حائل رہیں لیکن ان کے باوجود اس سال بھی نمائش کا کامیابی کے ساتھ منعقد ہونا اور صوبۂ برار کی مصنوعات کا نمائش میں شریک ہونا صنعتی اور معاشی ترقی کے جذبہ اور اس کے ہمہ جہتی ترقی کا بیّن ثبوت ہے جو اس عہد مسعود کا طغرائے امتیاز ہے۔ توجہات شاہانہ ہی تمام برکتوں کا سرچشمہ ہیں۔

مجھے امید ہے کہ حکومت سرکار عالی کے سررشتوں کے تعاون سے صنعتی اور معاشی ترقی کیلئے نوجوانان ملک کی کوششیں ضرور کامیاب ہوں گی"۔

حضرت والاشان جنرل شہزادہ نواب معظم جاہ بہادر

" صنعتی ترقی معاشی برتری کا زینہ ہے اور معاشی برتری سے قومی فلاح کے دروازے کھلتے ہیں اس مسلمہ نظریہ کی رُو سے آج وہی ممالک خوش حال ہیں جنھوں نے اپنی صنعتوں کو آگے بڑھایا۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارا ملک خارجی اسباب کی بنا پر اب تک صنعتی ملک نہیں بن سکا۔ لیکن ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس میں خود ہماری غفلت پسندی کو بھی دخل ہے۔ موجودہ حالات میں زندگی کے تقاضے بدل رہے ہیں اور ایک عالمگیر کشمکش کا صحیح احساس یہ واضح کر رہا ہے کہ ہم بغیر صنعتی ترقی کے دوسرے ممالک کی صف میں کھڑے نہیں ہوسکتے اور اس ضرورت کو محسوس کئے بغیر اپنا قومی وقار قائم نہیں رکھ سکتے۔

میں ان سرگرم عمل نوجوانوں کو مستحق مبارک باد سمجھتا ہوں جنھوں نے ملکی صنعت کی ترقی کیلئے نمائش جیسے مفید ترقی کار کی بناء ڈالی۔ اس طرح تمام ملک کی صنعتیں ایک جگہ جمع ہوسکتی ہیں اور بیک نظر ہم اپنی صنعتی رفتار کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ اس سال کی نمائش کا معائنہ میرے لئے گذشتہ سالوں کے مقابلہ میں زیادہ مسرت بخش تھا۔ نمائش کی تنظیم اشیاء کی ترتیب اور دوسرے انتظامات سے کارکنوں کی خوش سلیقگی کا پتہ چلتا تھا۔ لیکن یہ نمائش بھی ترقی کا کمال نہیں کہی جاسکتی اس میں بہت کچھ اضافے ممکن ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آیندہ سالوں میں اس طرف توجہ کی جائے گی۔

ملک میں بہت سی صنعتیں ایسی ہیں جو بڑی حد تک کس مپرسی اور گمنامی کے اندھیرے میں پڑی ہوئی ہیں۔ اورنگ آباد، ورنگل، بیدر، پٹن، سدی پیٹھ اور کپل وغیرہ اس قسم کی صنعتوں کے مراکز ہیں، ارباب نمائش کا فرض ہے کہ ان کی ترقی کے راستے پیدا کریں بین الاقوامی کشمکش نے حمل و نقل کے ذرائع کو بُری طرح متاثر کیا ہے اور ہر ملک خود ملتفی بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس ہنگامہ میں ہماری قدیم دستکاریوں کا زندہ ہونا بھی ممکن ہے

میں تمام باشندگان ملک عموماً نوجوانان دکن سے خصوصاً یہ توقع رکھتا ہوں کہ وہ اس سلسلہ میں استقلال اور عالی ہمتی کے ساتھ آگے بڑھتے رہیں گے اور ملک کی صنعتی ترقی کو معراج کمال

پر پہونچا کر معاشی برتری حاصل کریں گے ۔

حضرت صاحبزادہ نواب بسالت جاہ بہادر

اس عہد ہمایونی میں جبکہ ملک ترقی کے ہر زینہ پر گامزن ہے ہمارا پیدا ہونا ہی باعث افتخار ہے ۔ ہر ملک کی ارتقاء کا انحصار اس کی معاشیات و اقتصادیات پر ہے اور ان کا دار و مدار ملکی صنائع پر ۔ حکیم السیاست کی دوربین نظروں نے اس حقیقت کو محسوس فرمایا اور جن الفاظ میں حضرت اقدس و اعلیٰ نے اس مسئلہ پر تبصرہ فرمایا ہے وہ ہر ایک کے لئے نقش کالحجر کا کام دیں گے ۔ میری ذاتی رائے بھی یہی ہے کہ عوام کو بالخصوص تعلیم یافتہ گروہ کو چاہیئے کہ اس جانب توجہ کرے اور مجھے یہ دیکھ کر نہایت مسرت ہوئی کہ یہ گروہ اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے اس کام کا بیڑا اٹھایا ہے اور عوام کے لئے مصنوعات ملکی کی نسبت کافی معلومات مہیا کر دیئے ہیں ۔ مجھے توقع ہے کہ ان کے یہ مساعی ضرور بار آور ہوں ۔

سپاس نامہ

بہ پیشگاہ اعلیٰحضرت بندگان عالی حکیم ایشیا سلطان العلوم حضور پُرنور شہریار حیدرآباد و برار خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ

بعد از آستان بوسی ——— مودبانہ عرض ہے

آج کا دن ہم جاں نثاران موروثی کے لئے باعث صد عزو افتخار ہے کہ اعلیٰحضرت بندگان عالی بہ نفس نفیس قدم رنجہ فرما کر اس نمائش کا افتتاح فرما رہے ہیں اور ہم جاں نثاروں کی ناچیز سعی کو شرف قبولیت بخش رہے ہیں۔ اس عزت اور سعادت کے لئے ہم جاں نثاران موروثی حضور والا کی خدمت فیضدرجت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتے ہیں۔

"کلاہ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید ٭ کہ سایہ بر سرش افگند چوں تو سلطانے"

یوں تو ہر سال سرکار والا تبار نمائش میں تشریف فرما ہو کر بانیان و کارکنان نمائش اور صناعان مملکت کی ہمت افزائی فرمایا کرتے ہیں لیکن اس مرتبہ حضور پرنور کے رسم افتتاح ادا فرمانے سے اس نمائش کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہو رہا ہے۔ ہم جان نثاروں کو یقین ہے کہ اعلیٰحضرت بندگان عالی کی شاہانہ سرپرستی نہ صرف اس نمائش کی کامیابی کی ضامن ہے بلکہ مملکت آصفیہ کی صنعتوں اور حرفتوں کی ترقی کی کوششوں میں نئی روح پھونک رہی ہے۔

اس مبارک موقع پر نہایت ادب کے ساتھ نمائش اور اس کے بانیوں اور کارکنوں کے متعلق چند امور گوش گذار مبارک کرنے کی اجازت چاہی جاتی ہے۔

اعلیحضرت بندگان عالی نے تخت نشینی کے بعد جب ملک کی فلاح و بہبود اور ترقی کے ذرائع تلاش کئے تو حضرت سلطان العلوم کی نظر حکمت شناس نے وقت کی سب سے زیادہ اہم ضرورت کو فوراً پہچان لیا اور علم و فن کے ایک حقیقی مربی کی حیثیت سے جامعہ عثمانیہ کے قیام کا فرمان صادر فرمایا۔ مبارک دور عثمانی کا یہ ایسا عظیم الشان کارنامہ ہے جو اس سلطنت ابد مدت کی تاریخ میں سونے کے حروف سے لکھا جائیگا۔
اس جامعہ کے قیام سے قبل ملک کے اکثر افراد کے لئے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا تقریباً محال تھا۔ اوّل تو اہل ملک کو بیرونی جامعات کا دست نگر رہنا پڑتا تھا اور حیدرآباد جیسی عظیم مملکت کے لئے شایاں نہیں تھا کہ یہاں کے باشندے اپنی تعلیم کے لئے غیروں کے محتاج رہیں۔ سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ ایک غیر زبان میں تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے طالب علموں کو خود علم و فن کی دقتوں کے علاوہ زبان کی دشواریوں سے بھی سابقہ پڑتا تھا اور اکثر طلبا اعلیٰ ترین مدارج پر پہنچنے سے محروم رہ جاتے تھے ۔
تشنگان علم کی یہ تمام دقتیں اعلیحضرت بندگان عالی کی ایک جنبش قلم سے رفع ہوگئیں شاہ ذیجاہ نے دوررس اور نکتہ بیں نظر سے کام لے کر نہ صرف جامعہ عثمانیہ کے قیام کا فرمان نافذ فرمایا بلکہ اپنی زبان اُردو کو ذریعۂ تعلیم مقرر فرما کر ہندستان کے نظام تعلیم میں ایک خوش آیند انقلاب پیدا کر دیا جس کی صحت کو رفتہ رفتہ تمام ماہران فن تعلیم اور بزرگان قوم تسلیم کرنے پر مجبور ہوگئے۔ چنانچہ اب اکثر جامعات اعلیٰ حضرت کی پیروی میں اپنی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی طرف مائل ہیں ۔
اپنی زبان میں تعلیم پانے کی وجہ سے جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل طلبا نے علوم وفنون میں کما حقہ مہارت حاصل کی اور ملک میں تصنیف و تالیف اور تحقیق و ایجاد کا دور آغاز کیا۔ چنانچہ خداوندکریم کے فضل اور اعلیٰ حضرت کے اقبال سے حیدرآباد کا نام اب دنیائے علم و فن میں بھی عزت و احترام کے ساتھ لیا جانے لگا ہے ۔

جامعہ عثمانیہ کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آستانہ جہاں پناہی کے جاں نثاروں کا نصب العین لازماً یہ ہوا کہ ملک و مالک کی خدمت کو اپنا شعار بنائیں۔ اس جذبہ کے تحت جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل طلبہ نے کوئی دس سال قبل "انجمن ملیسانین عثمانیہ" کے نام سے ایک مرکز قائم کیا تاکہ منظم طور پر ملک و مالک کی خدمت کما حقہٗ انجام دے سکیں۔ ملک کی ہمہ جہتی ترقی میں سعی و کوشش کی خاطر اور تقسیم کار کے آزمودہ اصول پر انجمن نے اپنی تنظیم سے مختلف ذیلی کمیٹیاں بنائیں جن میں جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل طلبا کے علاوہ ملک کے دوسرے کارکن حضرات کا تعاون اور اشتراک عمل بھی حاصل کیا گیا۔

انہی کمیٹیوں میں سے ایک معاشی کمیٹی ہے جس کے قیام کا اصلی مقصد مملکت آصفیہ کی معاشی ترقی میں جد و جہد ہے۔ اس سلسلہ میں انجمن کی ہمت افزائی اعلیٰ حضرت بندگان عالی کی اس بصیرت افروز تقریر سے ہوئی تھی جو گھریلو صنعتوں کے مرکز کا افتتاح فرماتے ہوئے ارشاد فرمائی گئی تھی۔ غرض آج سے پانچ سال قبل معاشی کمیٹی کا قیام عمل میں آیا اور دوسرے ہی سال چند نوجوان اور گمنام عثمانین نے کل مملکت آصفیہ کی مصنوعات کی نمائش کے انعقاد کا بیڑا اٹھایا۔ اگرچہ آغاز کار نہایت حقیر سرمایہ سے کیا گیا تھا لیکن ان نوجوانوں نے اس قدر مستعدی، سرگرمی اور خلوص کے ساتھ کام کیا کہ بحمد اللہ پہلی نمائش ہی کامیاب رہی۔ اس کامیابی سے ہمت پاکر معاشی کمیٹی نے مجلس نمائش کے نام سے ایک علحدہ جماعت قائم کی اور باضابطہ طور پر اس کی رجسٹری کر دی تاکہ حسابات اور دوسرے کاروبار کے متعلق تحت احکام قانون باقاعدگی حاصل ہو جائے۔

خدا کا شکر ہے کہ یہ نمائش سال بہ سال ترقی کرتی گئی۔ چنانچہ اگر پہلے سال تقریباً ایک سو اسٹال قائم ہوئے تھے، ایک لاکھ روپیوں کی مالیت کا سامان فروخت ہوا تھا

اور پچاس ہزار اشخاص نے نمائش دیکھی تھی تو گذشتہ سال چوتھی نمائش میں تین سو اسٹال قائم ہوئے دو لاکھ سے زیادہ مالیت کا سامان فروخت ہوا اور تین لاکھ افراد نے نمائش دیکھی اعلیٰحضرت بندگان عالی کی شاہانہ سرپرستی اور خسروانہ الطاف ونوازشات اس ترقی میں بے حد ممد ومعاون ہوئے اور آج یہ نمائش بام ترقی کی چوٹی پر ہے کہ جہاں پناہ بنفس نفیس اس کا افتتاح فرما رہے ہیں۔

اس نمائش کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اگرچہ اس کا انعقاد بالکلیہ ایک پبلک ادارہ یعنے مجلس نمائش معاشی کمیٹی (انجمن طیلسانین عثمانیہ) کے زیر اہتمام ہوتا ہے لیکن اس کی کارکردگی اور افادیت کے مدنظر اس میں سرکاری محکمہ جات اور سرکاری عہدہ دار کامل طور پر تعاون اور اشتراک عمل کرتے ہیں اور انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ وغیرہ سے مالی امداد بھی ملتی ہے جس کا اعتراف تہ دل سے کیا جاتا ہے۔

مجلس نمائش کی اس جد وجہد کے باعث مملکت آصفیہ کی معاشی ترقی کے امکانات زیادہ سے زیادہ نمایاں ہوتے جا رہے ہیں اور بفضل الٰہی وہ دن دور نہیں کہ حضرت بندگانعالی کی رہبری میں یہ سلطنت ابد مدت معیشت وثروت کی ہر شاخ میں ترقی کے امکانی بلند مدارج تک پہنچ جائے۔

اعلیٰحضرت حکیم السیاست پر یہ امر بخوبی روشن ہے کہ اب دنیا میں سائنس اور میکانیت کا دور دورہ ہے اور قوموں کی ترقی صنعت وحرفت کے فروغ پر منحصر ہے اس بنا پر ضروری ہے کہ اہالیان ملک کثیر تعداد میں صنعت وحرفت کی طرف متوجہ ہوں اور کوشش کی جائے کہ تمام چھوٹی اور بڑی مشینیں حتی الامکان یہیں تیار ہوں۔ جنگ کی وجہ سے ضروریات زندگی مثلاً ادویہ، اغذیہ، اور ملبوسات کی دستیابی میں جو شکلیں پیش آرہی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود ممالک محروسہ میں ان

اشیاء کی فراہمی اور تیاری کی مہم پوری سرگرمی اور ہمت کے ساتھ آگے بڑھائی جائے۔ خدا کے فضل سے مملکت آصفیہ کی وسعت، ہندوستان میں اس کا محل وقوع اور اس کے وسائل و ذرائع کی بہتات ان اسکیموں کو ممکن العمل بنا دیتی ہے۔

اعلیحضرت بندگان عالی کی دور اندیشی اور تدبیر صاحب کی بدولت انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ اور سررشتۂ تعلیم صنعت و حرفت قائم ہیں، ملک میں کئی ایک صنعتیں پیدا ہو چکی ہیں اور مختلف کارخانے کھل رہے ہیں۔ اگر ان سررشتوں کا لائحۂ عمل بہ تمام و کمال جلد از جلد بروئے کار آجائے تو ترقی کی نئی صورتیں پیدا ہو جائیں گی اور ملک میں نئی صنعتوں کا جال پھیل جائے گا۔ اک ایک طرف تو ملک اپنی ضرورت کی اشیا خود مہیا کر سکے اور اس کی دولت ثروت میں اضافہ ہوا اور دوسری طرف ملک کے اہل فن اور اہل ہنر طبقہ کے لئے روزگار کے نئے میدان ہاتھ آئیں۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے جامعۂ عثمانیہ سے کام لیا جا سکتا ہے۔ جو دور ہمایونی کا سب سے زیادہ اہم اور عظیم الشان کارنامہ ہے۔ اگر جامعۂ عثمانیہ میں مختلف عملی سائنسوں اور زراعت و صنعت و حرفت کے مختلف شعبوں کا قیام عمل میں آئے تو یقین ہے کہ ملک صنعتی میدان میں بھی ترقی کے زینے سرعت کے ساتھ طے کرنے لگے گا۔

گذشتہ نمائشوں میں حضور والا ملاحظہ فرما چکے ہیں اور اس نمائش میں بھی ملاحظہ فرمائیں گے کہ اہل ملک میں صناعی اور کاریگری، ایجاد اور تحقیق کی کیا کیا صلاحیتیں موجود ہیں۔ جو باضابطہ تعلیم و تربیت سے اور زیادہ اجاگر ہو سکتی ہیں۔ جس کے بعد ملک کی مصنوعات نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بیرون ہند بھی اپنے لئے ایک اہم مقام حاصل کر سکتی ہیں۔ اس امر کے مد نظر اگر رائے ہمایونی کا یہ تقاضا ہو کہ قومی تعمیر کے تمام سررشتے باہمی اشتراک عمل اور سوچ بچار کے بعد مملکت آصفیہ کے جملہ وسائل اور ذرائع سے کام لینے کے لئے ایک باضابطہ لائحہ عمل مرتب کریں تو

توقع ہے کہ بندگانعالی کی مملکت میں خوش حالی اور آسودگی کا عہد زریں آغاز ہوگا۔

اس موقع پر یہ معروضہ کرنے کی جرأت کی جاتی ہے کہ مجلس نمائش کے ذرائع آمدنی محدود ہیں وہ صناعوں سے کرایہ اور دوسرے مصارف کی بابت بہت کم رقم وصول کرتی ہے اور نمائش کا انتظام بالکل رضاکارانہ طور پر انجام پاتا ہے لیکن کاروبار کی وسعت اب اس بات کی متقاضی ہے کہ مفلوک الحال صناعوں اور اہل حرفہ سے مال خریدنے اور پھر فروخت کرنے کا وسیع پیمانہ پر انتظام کیا جائے۔ ان کی امداد و اعانت کا بند و بست کاروباری نقطۂ نظر سے ہو۔ مجلس نمائش کے دفتر کا مستقل انتظام رضاکارانہ اصول کے تحت قلیل معاوضہ کے ساتھ قابل افراد کی نگرانی میں کیا جائے۔ نمائش گاہ کسی موزوں مقام پر مستقل طور سے تعمیر پائے جہاں وقت بوقت توسیع اور اضافہ کی گنجائش ہو جہاں مجلس نمائش کا دفتر بھی موجود رہے۔ جس کے ساتھ ایک معاشی کتب خانہ اور میوزیم بھی ہو اور جہاں ایسے ذرائع بھی مہیا ہوں کہ اصحاب ذوق اعلیٰ تحقیقاتی کام سہولت اور اطمینان کے ساتھ انجام دے سکیں۔

اعلیٰ حضرت بندگانعالی کے فیض کرم کی بدولت عثمانین نے ملک کی ہر جہتی خدمت کی صلاحیت کا کافی ثبوت پیش کیا ہے۔ آقائے ولی نعمت سے کامل وفاداری اور دامن دولت سے وابستگی کی بنا پر جاں نثاران موروثی کی تمنا ہے کہ بہتر سے بہتر خدمت گذاری کے مواقع حاصل کریں۔ عثمانین کی یہ تمنا ادنیٰ توجہ شاہانہ سے پوری ہوسکتی ہے۔

اب دُعا معروضہ ہے کہ اس نمائش کا افتتاح فرما کر سرفراز اور کامران فرمایا جائے۔ زیادہ حد ادب۔

الٰہی آفتاب عمر و اقبال و اَمانا تابان و درخشان باد

معروضہ ۔ فدوی جان نثار موروثی۔ رضی الدین صدیقی صدر مجلس نمائش معاشی کمیٹی (انجمن طیلسانین عثمانیہ)

یکم ذی الحجۃ الحرام ۱۳۶۱ھ

نمایش مصنوعات ممالک آصفیہ میں ورود خسروی

از جناب شرف الدین صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) معتمد مجلس نمایش

"قدم حضور کے آئے میرے نصیب کھلے" کے مصداق نمایش مصنوعات ممالک آصفیہ گزشتہ چار سال سے موکب ہمایونی کی قدم رنجہ فرمائی سے سرفراز ہو رہی ہے اور نمایش کی رونق ہر مرتبہ کی تشریف فرمائی کے بعد دوبالا ہوتی رہی۔ اس سال اعلیحضرت سلطان العلوم مدظلہ العالی نے اولاً نمایش کا افتتاح فرما کر کارکنان نمایش کو سرفراز فرمایا۔ اس کے بعد ۲۹۔ ذی الحجہ ۱۳۶۱ھ کو نمایش کا ڈھائی گھنٹہ تفصیل سے معائنہ فرمایا۔ ذیل میں ان دونوں مواقع کی روئداد قلمبند کی جاتی ہے۔

افتتاح نمایش یکم ذی الحجہ ۱۳۶۱ھ کو صبح سے باغ عامہ کی مسجد کے سامنے شامیانوں میں ممالک آصفیہ کے تمام عمائدین امرائے عظام اراکین باب حکومت اور عالیجناب صدر اعظم بہادر رونق افروزی شاہانہ کے منتظر اور اراکین مجلس نمایش خوش و خرم اپنے مالک مجازی کی تشریف فرمائی کا اہتمام کر رہے تھے۔

حضرت شہزادہ والاشان ولی عہد بہادر، حضرت دردانہ در شہوار بیگم صاحبہ اور صاحبزادہ نواب سالار جاہ بہادر کی تشریف آوری ہی تمام حاضرین کی شادمانی کا موجب ہوئی۔ ٹھیک دس بجے حضرت اقدس و اعلیٰ شاہی لباس میں ملبوس تشریف فرما ہوئے۔ سری چترگپت رودرس نے بیانڈ کا ترنم شروع کیا اور سلامی دی۔ سرور افزا موسم صبح کا وقت، سکوت و اطمینان کا سمان، سادگی اور شاہانہ کرم و التفات سب مسرت اور خوشی کا ایک ایسا عالم پیدا کر رہے تھے کہ جس نے افتتاح نمایش کی اہمیت کو دوبالا کر دیا۔ شاید ہی کوئی غیر سرکاری تقریب کا اس طور پر افتتاح ہوا ہو۔ سلامی ادا ہونے کے بعد سر اکبر حیدری صاحب سابق صدر مجلس نمایش نے ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی صدر نمایش اور دیگر اراکین و عہدہ داران نمایش کو پیش فرمایا۔ حضور پرنور شہ نشین پر رونق افروز ہوئے تو ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی نے ادب و احترام کے ساتھ سپاسنامہ پڑھا۔ یہ سپاسنامہ ڈاکٹر صاحب نے جہاز کی وضع کے نقروی کاسکٹ میں پیش کیا۔ جواب شاہانہ سے سرفراز فرمانے کے لئے ارادۂ ہمایونی ہونے پر تمام حاضرین بہ کمال ادب کھڑے ہو گئے۔

حضرت اقدس و اعلیٰ پنجویں نمائش کا افتتاح فرما رہے ہیں

حضرت اقدس و علی ٹنس کلب میں

جواب شاہانہ کے ختم ہونے کے بعد موکب ہمایونی نمایش صنوعات کی طرف متوجہ ہوئی ٹیلر کرنی
(چمن) کی جانب سے تیار شدہ کمان پر زرد فیتہ بندھا ہوا تھا اسے اس نقرئی قینچی سے جو نائب صدر اور
معتمد مجلس نمایش نے پیش کی تھی بسم اللہ کہتے ہوئے کتر دیا اور اس کے ساتھ ہی افواج باقاعدہ اور
بے اسکوٹس کے بیانڈ نے سلامی ادا کی۔ روشن چوکی اور نوبت نے بھی اپنا فرض ادا کیا۔ یہ وہ سماں تھا
کہ ایسے مواقع آتے ہیں۔ اس کے بعد نمایش کلب کی طرف سواری شاہانہ متوجہ ہوئی اور یہ حکم ہوا کہ
۲۰ ذی الحجہ کو نمایش کے تفصیلی معائنہ کے لئے مکرر رونق افروزی ہوگی۔ نمایش کلب تک پہونچتے ہوئے
راستہ میں جو اسٹال تھے ان پر نظر عاطفت مبذول رہی۔ احاطہ تفریحات اور سبزہ زار کے پاس علی الترتیب
بے آر۔ پی کے رضاکاروں اور کشافوں نے سلامی دی۔ نمایش کلب میں تشریف فرما ہونے کے بعد فرمانوازش
سے عہدہ داران و اراکین مجلس کو بھی شرف نشین پر استادہ ہونے کی اجازت سرفراز ہوئی۔ حضرت اقدس و اعلیٰ
نے یہ یاد فرمایا کہ سال گزشتہ یہاں چار نوشی فرمائی گئی تھی اور نمایش کلب کی تعمیر کا حکم دیا گیا تھا۔ چائے نوشی
کے بعد مراجعت عمل میں آئی۔ حضرت اقدس و اعلیٰ کی مراجعت کے بعد حضرت شہزادہ برار اور معزز اراکین
اب حکومت نمایش کی طرف بہ غرض معائنہ متوجہ ہوئے۔

۲۹ - ذی الحجہ کی تشریف آوری

۲۹ - ذی الحجہ کو صبح گیارہ بجے حضرت اقدس و اعلیٰ بہ غرض معائنہ
رونق افروز ہوئے۔ صدر مجلس نمایش ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی عہدہ داروں اور اراکین مجلس
عاملہ مجلس مشاورت کے ساتھ استقبال کے لئے منتظر تھے۔ اسٹاف شاہی حاضر تھا۔ سواری شاہانہ
کی رونق افروزی پر کشافہ نے سلامی دی جس کو قبول فرمانے کے بعد سواری شاہانہ سیدھے اسٹالوں کے احاطہ میں
داخل ہوئی۔ بٹن کے کارخانوں میں بھارت بٹن فیاکٹری محمدیہ بٹن فیاکٹری، پرکاش بٹن فیاکٹری کا ملاحظہ
فرماتے ہوئے بسواری شاہانہ جوہریوں کی دکانیں جیسے موتی لال، بیس ایسے جبین کے طرف گذری۔ ریلوے
اسٹال پر سرکار کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ ریلوے نے یہاں کے صناعوں کے سامان لانے لے جانے
کے لئے احاطہ نمایش میں ہی پارسل آفس قائم کر دی ہے۔ نشر صنعت و حرفت کے اس اسٹال کی طرف
بھی نظر قدر شناس مبذول ہوئی جس میں اس ریاست سے جو سامان جنگ کے لئے فراہم ہو رہا ہے

نمایاں تھا۔ اس کے بعد تاجران زیورات۔ یم، چندولعل، محمد چاند، زینت گولڈ میوفیکچرنگ کمپنی اور حاجی شیخ بلے، شیخ جہانگیر اور راگھولو انجلو کی قائم کردہ چوڑیوں کے اسٹال ملاحظہ فرمائے گئے۔ مرکزی کمیٹی معاشی کمیٹی پر توقف فرمایا گیا۔ یہاں عبدالرؤف صاحب جو منتظم اور نگران تھے انھوں نے حضور عالی میں یہ عرض کیا کہ یہ اسٹال ان صناعوں کے لئے جو علیحدہ اسٹال قائم نہ کرسکتے تھے نیز غریب بیواؤں اور خواتین کی گھریلو صنعتوں کو نمایاں کرنے کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ یہاں نیلکنٹھ آرٹسٹ کی تیار کردہ شاہان آصفی کی شبیہیں پسند فرمائی گئیں۔ اور فرمایا گیا کہ بہت ہی مشابہ ہیں۔ اس کے متعلق عبدالرؤف صاحب نے یہ گزارش کی کہ نواب عزیز یار جنگ بہادر نے ان شبیہوں کو دارالحکومت برار کے لئے پسند کیا ہے۔ اس کے بعد وہ گھڑیال ملاحظہ ہوئی کہ جس میں ریت ایک گھڑی سے دوسری گھڑی میں خالی ہونے پر گھنٹے بجتے ہیں اور وقت معلوم ہوتا ہے۔ اس کو ملاحظہ فرماتے ہوئے ارشاد ہوا کہ یہ قدیم زمانہ کا طریقہ ہے۔ اس گھڑیال کو گلبرگہ کے ایک غریب طالب علم احمد علی نے بنایا تھا۔ عبدالکریم کا کارچوبی سامان ملاحظہ ہوا۔ اور علاقۂ برار کے اسٹال پر توقف فرمایا گیا۔ یہاں خواجہ محمد احمد صاحب صدر برار اسوسی ایشن نے یہ گزارش کی کہ پیوستہ سال کے ارشاد شاہانہ کے مطابق پہلی مرتبہ اس سال برار کی جملہ مصنوعات ایک جاجمع کی گئی ہیں۔ اس کے بعد ریشمی پارچوں، جیوٹی ٹکسٹائل ملز، نارائن داس ماکوڑ کی قوربافی اور اورنگ آبادی ہمرو کی دکانوں میں شیر سلک فیاکٹری، ہمرو کمخواب فیاکٹری، اورنگ آباد سلک ملز اور، بی، ڈبلیو ملز، ایم، یس ملز، جی تاراچند کے کمپل کے اسٹال پر سے گذرتے ہوئے یم قیصر کی دوکان پر عورتیں چوٹیوں کے ساتھ جو پھوندنے لگاتی ہیں ان کے استعمال کی بابتہ دریافت فرمایا گیا۔ اور ارشاد ہوا کہ نئے نئے فیشن نکل رہے ہیں۔ سلک میوزیم پر توقف فرمایا گیا۔ جہاں مالکہ اسٹال نے آداب بجا لانے کی عزت حاصل کی۔ وہاں کے توروں کو دیکھ کر یہ ارشاد ہوا کہ یہ توریں اب زیادہ چوڑی ہونے لگی ہیں۔ پھر مدرسہ فیض النسواں کا اسٹال ملاحظہ فرماتے ہوئے بلوزا میوزیم کے بلوز ملاحظہ کئے گئے۔ یوسفی معا لجہ گلبرگہ کی دوکان کے بعد گلبہار کمپنی کی سجاوٹ پسند کی گئی۔ اسلامیہ اگربتی ورکس یہ امر حضور اقدس و اعلیٰ کے علم میں لایا گیا کہ پہلے ملک سرکار عالی میں اگربتی میسور سے آتی تھی اور اب یہ ملک ہی

یہاں بھی ہے۔ بلکہ باہر بھی جاتی ہے۔ محمد عبد الغنی عطر ساز گلبرگہ اور انجمن اسلامیہ تیماپور کی مصنوعات کو پسندیدہ نگاہوں سے ملاحظہ فرمایا گیا۔ نیشنل سوپ فیاکٹری اور ٹائیگر سوپ فیاکٹری پر سے گذرتے ہوئے یتیم خانہ انیس الغربا کے بنائے ہوئے صوفہ سٹ پسندیدہ نگاہوں سے ملاحظہ ہوئے۔ عام طور پر صوفوں کی جو قیمت ہے اس کو دریافت فرمایا گیا اور یہ صوفے جس قیمت پر فروخت ہوتے ہیں اس کی تفصیل بھی دریافت فرمائی گئی۔ اس کی نکاسی کے متعلق بھی معلومات حاصل فرمائی گئیں۔ یہاں سے گودہ نو گلاس فیاکٹری۔ دکن ہیاٹ ورک۔ ہومیال اینڈ سنس ہیئر شفیع ، فیشن ہوز ، مدرسہ عثمانیہ صنعت حرفت نامپلی کے اسٹال پر نظر عالی متوجہ رہی۔ جان محمد گیتی ساز کی لیتیاں اور سرو دے اسٹک ملاحظہ فرمائی گئیں۔ اس کے بعد انجمن خادم المسلمین کے تیار کردہ فرنیچر وغیرہ بھی ملاحظہ ہوئے۔ اس مقام پر نشرگاہ مصنوعات ملکی سے " تا ابد خالق عالم یہ ریاست رکھے ، تجھ کو عثماں بصد اجلال سلامت رکھے" کا ہر دلنواز نغمہ جو عبد الرؤف صاحب عثمانیہ نے ریکارڈ میں سنایا ہے نشر کیا گیا۔ اس کو تمام و کمال سماعت فرمایا گیا۔ نشرگاہ نمایش مصنوعات ملکی کے متعلق گذارشات کی گئیں۔ نظم کو جس خوبی سے ریکارڈ کیا گیا ہے اس کی ازراہ عطوفت شاہانہ داد دی گئی۔

اس کے بعد سیول سرجیکل ورکس کی مصنوعات کے متعلق دریافت فرمانے پر یہ گذارشات کی گئیں کہ یہ چیزیں مستفور اور زخمیوں کی مرہم پٹی کے لئے کام آرہی ہیں۔ کارخانہ گلزار دکن کی جدید تیار شدہ بیدری مصنوعات یکے بعد دیگرے ملاحظہ میں آئیں۔ مالک دوکان نے اعلیحضرت کی خدمت میں ظروف کی کشتیاں گذرانی۔ اس کے بعد کارخانہ تاج دکن کی طرف بھی قدوم شاہانہ متوجہ ہوئے۔ اس کے بعد آلوین میٹل ورکس میں نزول اجلال شاہانہ ہوا جہاں خان بہادر احمد علاء الدین صاحب نے کارخانہ کے تیار کردہ اشیاء مثلاً چھری کانٹے، تجوریاں، اسلحہ رکھنے کی الماریاں، پلنگ اور قفل ملاحظہ میں پیش کئے۔ ان کی قیمتوں کی بابت بھی دریافت عمل میں لائی گئی۔ اس کے بعد بطور خاص ڈبو نا فرنیچر ورکس کی جانب عزیمت شاہانہ ہوئی۔ اور یہاں کے بنائے ہوئے فرنیچر میں جدید رجحانات کا جو لحاظ رکھا گیا ہے اس کو پسند فرمایا گیا۔ واپسی پر محکمۂ اعداد و شمار کے اسٹال پر توقف فرمایا گیا جہاں مولوی مظہر حسین صاحب ناظم اعداد و شمار

حاضر تھے۔ خواجہ حمید احمد صاحب بی، اے (عثمانیہ) مددگار ناظم امداد و شمار نے دور عثمانی کی صنعتی اور تعلیماتی ترقی کے چارٹ نیز ملک سرکار عالی کے بارانی نقشے کو ذات شاہانہ کے روبرو واضح کیا۔ یہاں سے سررشتۂ طب کے قائم کردہ ہنگامی ٹیڑ نانے کو جو اس سال جدید طور پر قائم ہے۔ ملاحظہ فرماتے ہوئے آرٹ گیالری میں ذات شاہانہ رونق افروز ہوئی۔ تصاویر کا معائنہ فرمایا گیا اور یہ رائے ظاہر فرمائی کہ ابھی بہت کچھ ترقی ہوئی ہے اور ہمارا چترنگور کے ذخیرہ کا تذکرہ کیا گیا۔ بی بی زینت صاحبزادی نواب حسن نواز جنگ بہادر کمشنر دلر نواب معظم جاہ بہادر کی تیار کی ہوئی تصویر بھی ملاحظہ کی گئی۔ جو سال حال کی بہترین تصویر قرار دی گئی تھی۔ یہاں سے آرایش اضلاع و آرایش بلدہ کے اسٹالس پر نگاہ عطوفت مبذول فرماتے ہوئے گورنمنٹ کالج آف فزیکل ایجوکیشن کے اسٹال کی طرف رخ فرمایا گیا۔ مسٹر ویبر دستار اور بکلوس میں حاضر تھے۔ انھوں نے تفصیل سے صحت و تندرستی قائم رکھنے کے طریقے واضح کئے جو ان کی درس گاہ میں ملحوظ رکھے جاتے ہیں۔ اس کے بعد سرکاری محکموں کے قائم کردہ اسٹال دیکھے گئے۔ سررشتۂ ٹکنیکات پر ڈاکٹر داس اور رحیم اللہ صاحب مہتمم ٹکنیکات حاضر تھے۔ انھوں نے یہ واضح کیا کہ ذات شاہانہ کی توجہ فرمائی سے یہ سررشتہ بہت جلد سرکار کی رعایا کی خدمت کے قابل ہو جائے گا۔ اس کے بعد ترقیات نظام ساگر پر محمد فاروق صاحب دوم تعلقدار نے یہ عرض کرنے کی عزت حاصل کی کہ نظام ساگر سات کروڑ کے صرفہ سے تعمیر ہو کر نظام آباد سے قحط کو دور کر چکا ہے۔ وہاں اب سالانہ ۲۲ لاکھ روپے مالگزاری کا اضافہ ہوا ہے۔ سوا لاکھ ایکڑ سے زائد خشک زمینات تری میں مبدل ہو گئے ہیں۔ جدید صنعتیں قائم ہوئی ہیں۔ مثلاً صنعت شکر سازی اور کارخانۂ الکحل۔ حضرت اقدس و اعلیٰ نے اس کو سماعت فرما کر اپنی رعایا نوازی کا اظہار فرمایا۔ یہاں سے سررشتۂ آبکاری کے اسٹال پر قاضی زین العابدین صاحب ناظم آبکاری کو شرف تکلم عطا ہوا۔ دیگر سرکاری سررشتوں یعنی سررشتۂ تاریخ، معالجۂ حیوانات، صحت عامہ، بندوبست، جنگلات، معدنیات، زرعی اشاعت، دارالترجمہ، طباعت، مجلۂ عثمانیہ، اور بلدیہ بھی ملاحظہ فرمائے گئے۔ سررشتۂ حفظان صحت پر میاں محمد صدیق صاحب ملیریا افسر، سررشتۂ بندوبست پر مسٹر جہانگیر جی جہتیار،

ناظم بندوبست ۔ دارالترجمہ پر مولوی الیاس برنی صاحب اور دارالطبع پر مسٹر ملیے، اور عبدالقیوم صاحب مددگار ناظم حاضر تھے۔ اسٹال بلدیہ پر پریم جی لس جی صاحب نائب صدر مجلس بلدیہ حاضر تھے۔ دارالطبع کے اسٹال پر مسٹر ملیے نے اسٹال پر اسی وقت کی طبع کردہ ایک غزل شاہانہ پیش کرنے کی عزت حاصل کی۔ اسی احاطہ میں کشافان سرکار عالی نے اس مناسبت سے کہ یہاں سرکاری سررشتوں کے اسٹالس قائم تھے سلامی ادا کی جس کو قبول فرمایا گیا۔ وہاں سے شکر فیاکٹری کا اسٹال ملاحظہ ہوا جہاں پر الکحل نیز سر لور پر کا کاغذ بھی موجود تھا۔ یہاں سے مولوی سجاد مرزا صاحب کا ایجاد کردہ جدید عبادی اردو ٹائپ دیکھا کاغذ ساز سید اسمٰعیل اینڈ سنس کے اسٹال پر قدوم شاہانہ کا گذر ہوا۔ تجویبیہ کارخانہ جلد سازی اور حمیدیہ کارخانہ جلد سازی کے کام کو ملاحظہ فرمایا گیا۔ کیمیکل اینڈ فارماسوٹیکل کمپنی کی تیار کردہ ادویات جسے مسرس عبدالرزاق نے قائم کیا ہے، ملاحظہ ہوئیں۔ پھر ترک مسکرات مشیر عالم دائرکٹری دکن اسکول چاک فیاکٹری نیز پارچہ بافی کے کارخانہ جات حیدرآباد اسپنیگ ویونیگ ملز، اورنگ آباد ملز۔ اعظم جاہی ملز عثمان شاہی ملز، رام گوپال ملز کا ملاحظہ عمل میں آیا۔ سررشتۂ اے، آر، پی کے کمان پیر علی رضا صاحب کنٹرولر کا سلام قبول فرمایا گیا۔ روز بسکٹ، چاشنی کمپنی، اور دکن اسٹور کے ملاحظہ کے بعد سرکار کی خدمت میں تلجا بائی سنگاریڈی والی کا ذکر کیا گیا کہ کس طرح سال بہ سال اس کا سامان بڑھتی ہوئی مقدار میں فروخت کے لئے آرہا ہے۔ محمود حسین مشتاق حسین جوہری، ین کے جوہری اور جینتی لعل کے تیار کردہ زیورات کے متعلق عرض کیا گیا۔ کہ یہاں حالات حاضرہ کے لحاظ سے معمولی چاندی کے زیورات نمائش کے لئے رکھے گئے ہیں، پی، وی لنگم کے ہاتھی دانت کے سامان پر نظر غائر ڈالی گئی اور محمد نیاز علی کی بنائی ہوئی چھڑیاں خاص التفات کی موجب ہوئیں۔ میاچ ورکس، دکن بشوز فیاکٹری، محمد جیلانی اینڈ سنس، کونگنٹہ سگریٹ اور وہاں کے متصلہ اسٹالس یعنے دشمن پایوریا منجن۔ دستی صنعتی گرانڈ اسٹور ہمارا اسٹال، دکن آچار کمپنی، ریاض اسلام فیاکٹری، دیسی مٹی کے کھلونے، دکن فروٹ ورکس، دکن ٹائز فیاکٹری، ٹلائے امپوریم ملاحظہ ہوئے۔ احاطۂ تفریحات کے سامنے سید محمد ہادی صاحب ناظم بائے اسکوٹس کشافوں کے دو رویہ صفوں کے ساتھ استادہ تھے سلام قبول فرمایا گیا۔ جاگیرات کے اسٹالس

میں راجہ دہرم کرن بہادر، مصنوعات مسلم پارچہ بافندگان اللہ شریف، اسٹیٹ بہادر یار جنگ بہادر اسٹیٹ ہوم ہمستان، حیدر ہمستان گڈوال، اقبال احمد صاحب علوی کے اسٹالس پر نظر شاہانہ مبذول ہوئی۔ اس کے بعد افواج باقاعدہ کے اس اسٹال پر قدوم شاہانہ متوجہ ہوئے جہاں مختلف زمانہ کی عسکری تدریجی ترقی واضح کی گئی ہے۔ یہاں سے حضرت شہزادہ برار کے شکار خانہ میں ذات شاہانہ رونق افروز ہوئی۔ یہاں سرکار کی اطلاع میں لایا گیا کہ یہ اسٹال نمایش میں سب سے زیادہ شوق سے دیکھا گیا اس شکار خانہ سے مراجعت پر سامنے سبزہ زار پر سررشتہ اے، آر، پی کی طرف سے آگ بجھانے کے جو مظاہرے ہو رہے تھے وہ ملاحظہ فرمائے گئے۔ یہاں پر سرکار کی خدمت میں یہ عرض کیا گیا کہ اس سررشتہ نے بہت ہی قلیل مدت میں بڑے کام کر لیے ہیں۔ اور جو کچھ سامان اس نے فراہم کیا ہے اس میں سے بہت زیادہ ایسا ہے جو بعد جنگ آگ بجھانے اور سفری دواخانہ کے طور پر استعمال ہو سکتا ہے۔ یہ امر بھی سرکار والا تبار پر واضح ہوا کہ اس سررشتہ نے بہت بڑی تعداد میں اہل ملک کو شہری حفاظت کی ترتیب دے دی ہے۔ یہاں سے مرکزی مدرسہ فنون لطیفہ نیز دیگر مدارس تعلیم صنعت و حرفت کے اسٹال کی طرف قدوم شاہانہ متوجہ ہوئے۔ یہاں ایک تصویر شاہانہ کی نقاب کشائی فرمائی گئی۔ اور ایک بخطی پروانہ مرکزی مدرسہ فنون لطیفہ کو سرفراز ہوا۔ اس مدرسہ کے طلبہ نے جو تصویریں اور دیگر مصنوعات تیار کی ہیں، نیز یہاں سینگ سے جو چیزیں بنائی جاتی ہیں ان پر بھی نظر التفات مبذول ہوئی۔ اس اسٹال کی تشریف بری کے وقت حضرت اقدس و اعلیٰ نے آٹو موبیل گیاس پلانٹ کی موٹر کے متعلق بھی دریافت فرمایا۔ اس کے بعد سواری شاہانہ نمایش کلب کی طرف متوجہ ہوئی۔ میر اکبر علی انصاحب جو شروع سے نمایش کی تفصیلات گوش گذار فرما رہے تھے یہ گذارش کی کہ اس جانب مختلف صناع اور اداروں آرٹسٹ کار خانہ قلم سازی، مٹی کے کھلونے، قدیم اسلحہ، مدرسہ کورہ کنگ، زرعی تحقیق، اعظم ویونگ ورکس، گھریلو صنعتیں، ابراہیم علی قلی پٹن، کھادی و دیا عثمانیہ ٹکنیکل ٹریننگ اسکیم بورڈ آف ٹکنیشن، کشیدہ زرگری کریم نگر، مدرسہ صنعتی خیریت آباد، مصنوعات دیہاتی شیر آباد حسین خان فرخ نگر نے عملی مظاہروں کا انتظام کیا ہے۔ نمایش کلب میں تشریف بری رونق افروزی کے بعد صاحبزادگان بلند اقبال کو بھی جو ہمراہ تھے یاد فرمایا گیا۔ اور چائے نوشی فرمائی گئی۔ اس موقع پر

حضرت اقدس و اعلیٰ نے نمایش کلب کی تعمیر کا تذکرہ فرمایا۔ جس کے متعلق گزشتہ مرتبہ حکم فرمایا گیا تھا۔ نیز یہ ارشاد ہوا کہ شکار خانہ حضرت دی عہد بہادر اس قابل ہے کہ اسے رعایا کے اشتیاق اور ان میں شوق شکار اور شوق ورزش جسمانی پیدا کرنے کے لئے مستقل عمارت میں جو بود جنگ تعمیر ہوگی۔ معائنہ عام کے لئے کھول دیا جائے۔

اس کے بعد یہ بھی ارشاد ہوا کہ حضرت والا شان شہزادہ برار اپنے جد امجد حضرت غفران مکان کی طرح شکار کے شوقین ہیں۔ ساتھ ہی حضرت اقدس اعلیٰ نے یہ ارشاد فرمایا کہ خود بدولت کا شکار کے متعلق یہ رجحان ہے کہ اگر کوئی شیر یا جانور مردم آزار ہو تو اس کے شکار کئے جانے کا ضرور انتظام ہونا چاہیئے کہ نوع انسانی آزار و اذیت سے بچے لیکن ان مردم خواروں کو چھوڑ کر بقیہ جانوروں کو اپنے حال پر آزاد رہنے دینا چاہیئے۔ اس کے بعد ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی صدر مجلس نمایش و اراکین مجلس نمایش معاشی کمیٹی و مجلس مشاورت نیز ممبران کلب اور مالکان اسٹالس اور عہدہ داران سررشتہ جات نے یکے بعد دیگرے نذرین پیش کیں۔ اس کے بعد سواری شاہانہ ٹھیک ۲ گھنٹے کے بعد مراجعت فرما ہوئی۔ نواب زین یار جنگ بہادر کو حکم ہوا کہ شام میں مختلف مصنوعات جو پسند فرمائی گئی ہیں کنگ کوٹھی مبارک لیتے آئیں۔

اس مختصر سے مضمون میں شاہانہ توجہ و التفات کا کماحقہ تذکرہ نہیں ہوسکتا جو مصنوعات کی نسبت مرکوز خاطر والا ہے۔ حضرت بندگان عالی کا بنفس نفیس نمایش کا افتتاح فرمانا، اس موقع پر سپاس نامہ قبول فرمانا اور کمال نوازش و ذرہ نوازی جواب شاہانہ ارشاد فرمانا۔ نیز نمایش کے تفصیلی معائنہ کے لئے دوبارہ تشریف آوری کی زحمت فرمانا ساتھ ہی کلمات استحسان ہمت افزائی ظاہر فرمانا ایسے امور ہیں کہ نہ صرف کارکنان نمایش کے لئے پشت ہا پشت تک سرمایہ فخر و مباہات رہیں گے بلکہ مملکت آصفیہ کی صنعتی ترقی میں چار چاند لگائیں گے۔

دعا ہے کہ سایہ ہمایونی دیرگاہ سلامت باکرامت رہے۔ آمین فقط

نمایش مصنوعات مملکت آصفیہ

رودادِ انعامات و اسنادات

از جناب مولوی شرف الدین صاحب، بی، اے (عثمانیہ) معتمد مجلس نمایش

خدا کا شکر ہے کہ مملکت آصفیہ کے مصنوعات کی پانچویں نمایش بخیر و خوبی اور کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچ گئی حقیقت یہ ہے کہ اعلیحضرت بندگان عالی متعالی مدظلہم العالی کی شاہانہ توجہات کی ہی ساری نمایش مظہر رہے۔ مبارک عہد عثمانی میں مملکت نے ترقی کے جو مراتب طے کئے ہیں وہ ہر نمایش دیکھنے والے پر بخوبی ظاہر ہیں۔ کارکنان نمایش کیا اور ان کی بساط کیا پیشگاہ خسروی میں توجہات ملوکانہ کے متعلق کوئی اظہار تشکر بھی چھوٹا منہ بڑی بات کے مصداق ہے۔

ہز ہائنس شہزادۂ والا شان ولی عہد بہادر اور ہر ہائی نس پرنسس آف برار نے بھی جو کرم گستری فرمائی اس کے لئے ساری نمایش مرہون مکارم ہوئی۔ نمایش کے افتتاح کے وقت تشریف آوری نیز نمایش کے معائنہ کے لئے دوبارہ رونق افروزی، پیام بہت افزا کا مرحمت ہونا اور پھر ۲۹ بہمن ۱۳۵۲ف کے جلسۂ تقسیم انعامات و اسنادات کی صدارت کی زحمت گوارا فرمانا اس کے علاوہ فوج کا اسٹال قائم کرنے اور فوج کے مظاہرات کے لئے حکم صادر فرمانا اور سب سے بڑھ کر اپنے خاص ثمرو فیض سے اہل نمایش کو مستفید فرمانا۔ غرض ایک کرم کے بعد دوسرے کرم سے نمایش کو اور اہل نمایش کو نوازا گیا۔

اسی طرح حضرت والا شان شاہزادہ نواب معظم جاہ بہادر اور شہزادی صاحبہ نیلوفر فرحت بیگم کی توجہات کی بھی نمایش ممنون ہے باغ عام جیسے مقام کا نمایش کے لئے حاصل ہونا حضرت والا شان معظم جاہ بہادر کی توجہ اور التفات کی بدولت ہے کارکنان نمایش اس احسان کو کبھی نہیں بھول سکتے۔

حضرت شہزادۂ نواب بسالت جاہ بہادر اور صاحبزادی صاحبہ نفیس النسا بیگم نے بھی اپنے کرم سے نمایش میں تشریف آوری اور پیام روانہ فرمانے کی زحمت گوارا فرمائی اور جس دلچسپی کا اظہار فرمایا اس سے

کارکنوں اور صناعوں کی ہمت افزائی ہوئی ۔

نمائش میں نہ صرف ایسی اشیاء پیش ہوئیں جن کو خود اہل ملک نے بنایا تھا بلکہ ملک کے سامان خام سے ہر قسم کی مصنوعات تیار کرنے کے عملی مظاہروں کا بھی انتظام کیا گیا ۔

عملی اعتبار سے نمائش گویا سات شعبوں پر مشتمل تھی ۔

(۱) تیار شدہ مصنوعات (۲) سرکاری محکموں کی ترقیات اور افادیت (۳) مرکزی اسٹال مصنوعات ملکی

(۴) فنون لطیفہ (۵) جاگیرات (۶) مظاہرات (۷) معصوم ودلکش تفریحات ۔

۱۔ تیار شدہ مصنوعات کے ضمن میں مملکت آصفیہ کی ہر قدیم وجدید صنعت نمائش میں دیکھی جاسکتی تھی ۔ تیار شدہ مصنوعات کے ضمن میں صنعتوں کو (۳۸) ذیلی نوعیتوں میں تقسیم کیا گیا تھا ان میں (۲۷) نوعیتوں کی صنعتیں پیش ہوئیں ۔ اس سلسلہ میں سرپور کا کاغذ بھی مرتبہ نمائش میں پیش ہوا ۔ اردو کا جدید بنیادی ٹائپ بھی عام طور سے پہلی مرتبہ نمائش میں دیکھا گیا ۔ برار اسوسی ایشن کی کوشش سے مصنوعات علاقہ برار کا پہلی دفعہ نمائش میں داخلہ ہوا ۔ سرجیکل ڈریسنگ ورکس ، حیدرآباد کیمیکل اینڈ فارماسوٹیکل ورکس ، حیدرآباد میاچ اسوسی ایشن ، انجمن ہائے اسلامیہ تیرتی ، آلوین میٹل ورکس ، دکن ہاسٹ ورکس کے جدید کارخانوں نے نمائش میں پہلی دفعہ حرکت کی ۔

اس شعبہ میں طلائی تمغوں کے جو مستحق قرار پائے وہ یہ ہیں ۔

(۱) سنگھار کا سامان یوسفی مصالحہ گلبرگہ (۲) روغنیات گلبھار کمپنی

(۳) صابون سازی نیشنل سوپ فیاکٹری (۴) ادویہ سازی سرجیکل ڈریسنگ ورکس

(۵) ادویہ سازی حیدرآباد کیمیکل اینڈ فارماسوٹیکل ورکس (۶) شکرسازی نظام شگر فیاکٹری

(۷) دیاسلائی حیدرآباد میاچ اسوسی ایشن (۸) سگریٹ سازی ۔ حیدرآباد دکن سگریٹ فیاکٹری

(۹) بسکٹ سازی ۔ روز بسکٹ ورکس (۱۰) مربہ و آچار سازی ۔ جاشنی کمپنی

(۱۱) پارچہ بافی جیوبلی ٹکسٹائل ملز (۱۲) پارچہ بافی ۔ بستر سلک فیاکٹری

(۱۳) پارچہ بافی اورنگ آباد ہمرو فیاکٹری ۔ (۱۴) پارچہ بافی ۔ اورنگ آباد سلک ملز

(۱۵) پارچہ بافی ۔ بی ، ڈبلیو ملز
(۱۶) پارچہ بافی ، یم ، یس ، ملز
(۱۷) پارچہ بافی ۔ دیوان بہادر رام گوپال ملز
(۱۸) پارچہ بافی ۔ عثمان شاہی ملز
(۱۹) پارچہ بافی ۔ اعظم جاہی ملز ۔
(۲۰) پارچہ بافی اورنگ آباد ملز
(۲۱) پارچہ بافی ۔ حیدرآباد اسپننگ اینڈ ویونگ کمپنی
(۲۲) گنڈیاں سازی ۔ محمدیہ بٹن فیاکٹری
(۲۳) صنعت بیدری ۔ گلزار دکن
(۲۴) آہنی سامان آلوین میٹل ورکس
(۲۵) آہنی سامان ۔ یل ، جی ، ہوسبال اینڈ سنس
(۲۶) طباعت اردو جدید بنیادی ٹائپ
(۲۷) مصنوعات برار ۔ برار اسوسی ایشن
(۲۸) مصنوعات یتیم خانۂ انیس الغربا
(۲۹) مصنوعات یتیم خانۂ انجمن خادم المسلمین
(۳۰) جلد سازی ۔ مجبوبیہ کارخانہ جلد سازی
(۳۱) نجاری ۔ ڈابو نار کمپنی
(۳۲) خطاطی ۔ اعظم پن کمپنی ۔
(۳۳) کاغذ سازی ۔ سرپور پیپر ملز ۔
(۳۴) چوڑی سازی ۔ حاجی شیخ بلے
(۳۵) کارچوب محمد اینڈ عبدالکریم ۔

بیدری تمغوں کے مستحقوں کی تفصیل حسب ذیل ہے ۔

(۱) سنگھار کا سامان ۔ اسلامیہ اگربتی ورکس
(۲) سنگھار کا سامان ۔ محمد عبدالغنی گلبرگہ ۔
(۳) صابون سازی ۔ نانگر سوپ فیاکٹری
(۴) کمبل سازی ۔ جے ۔ تاراچند
(۵) کلاہ سازی ۔ دکن ہاٹ ورکس
(۶) گنڈیاں سازی ۔ بھارت بٹن فیاکٹری
(۷) صنعت بیدری ۔ تاج دکن
(۸) گیتی سازی ۔ شیخ احمد جان محمد ۔
(۹) شیشہ سازی ۔ کوہ نور گلاس فیاکٹری
(۱۰) ادارت ۔ مجلۂ عثمانیہ
(۱۱) صفائی ۔ سررشتۂ بلدیہ
(۱۲) چرم سازی ۔ دکن شوز فیاکٹری
(۱۳) چرم سازی ۔ محمد جیلانی اینڈ سنس
(۱۴) مٹی کی صنعتیں ۔ ریاض اسلام فیاکٹری
(۱۵) جلد سازی ۔ حمیدیہ کارخانہ جلد سازی
(۱۶) کاغذ سازی محمد اسمٰعیل اینڈ سنس
(۱۷) چوڑی سازی ۔ شیخ جہانگیر
(۱۸) زیورات ۔ محمد چاند ۔

(۱۹) زیورات ۔ محمود حسین مشتاق حسین ۔

نقروی تمغوں کے مستحق حسب ذیل اسٹال قرار دیئے گئے ۔

(۱) پرکاش ہٹن فیاکٹری　(۲) یس ، جے ، موتی لعل　(۳) یس ، اے حسین
(۴) یم ، چند و لعل　(۵) زینت کمپنی　(۶) راگھولو انجلو
(۷) یم قیصر　(۸) سلک میوزیم　(۹) بلبزا میوریم
(۱۰) منجن شفیع　(۱۱) فیشن ہوز　(۱۲) مدرسۂ تحتانیہ صنعت و حرفت نامپلی
(۱۳) دکن اسٹور　(۱۴) آلجا بائی　(۱۵) کرمیہ ورکس
(۱۶) ین کے جوہری　(۱۷) یم جیٹھی لعل　(۱۸) پی ، وی لنگم
(۱۹) محمد لیاقت علی　(۲۰) خوشبو گھر　(۲۱) یم ، یس ، ما اندرویدیہ
(۲۲) گرانڈ اسٹور　(۲۳) سردار سنگھ　(۲۴) ٹائے امپوریم
(۲۵) یس ، اقبال احمد علوی　(۲۶) دکن پن ہولڈر کمپنی　(۲۷) دکن فریٹ ورکس
(۲۸) زسملو ۔ کارخانہ کھلونا سازی　(۲۹) محمد بیر خان　(۳۰) محمد خاں
(۳۱) محمد لعل خاں　(۳۲) محمود خاں　(۳۳) حیدرآباد ٹائر کمپنی
(۳۴) محمد مصطفےٰ خاں　(۳۵) ایرین ہولڈر کمپنی　(۳۶) ہری رام مانک لعل
(۳۷) کارخانہ نفیس کھلونا سازی　(۳۸) میر معین الدین علی　(۳۹) محمد حسین ۔ کارخانہ قدیم صنعتی اسلحہ
(۴۰) محمد یوسف خاں　(۴۱) دکن اسکول چاک فیاکٹری　(۴۲) صدر انجمن ترک مسکرات

۲ ۔ نمایش کا دوسرا شعبہ سرکاری سررشتوں کی ترقیات اور افادیت کو نمایاں کرتا تھا۔ ہر سال نئے نئے سررشتے نمایش کے ذریعہ اپنے مفید اور سودمند کام سے عامۃ الناس کو واقف ہونے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ سال حال ۱۴ سرکاری سررشتوں نے نمایش کے ساتھ تعاون عمل کیا اور اپنے اسٹال قائم کئے۔

مندرجۂ ذیل سررشتہ جات نے پہلی مرتبہ اپنے اسٹال قائم کئے

(۱) سررشتۂ افواج باقاعدہ سرکار عالی　(۲) حیدرآباد بوائے اسکوٹس

(۳) مدرسہ وسطانیہ مشقی (عثمانیہ ٹریننگ کالج) (۴) بورڈ آف امپلائمنٹ فار ٹیکنیشن
(۵) سررشتہ تحفظ حملہ ہوائی (۶) سررشتہ سمکیات
(۷) ترقیات نظام ساگر (۸) سررشتۂ ٹپہ

اس شعبہ میں طلائی تمغہ کے مستحق حسب ذیل اسٹال قرار دیئے گئے۔

(۱) گراف۔ سررشتۂ اعداد و شمار (۲) منتخبہ مصنوعات۔ فروخت گاہ مصنوعات ملکی
(۳) کشانی مظاہرات حیدرآباد بوائے اسکوٹس (۴) منتخبہ مصنوعات۔ سررشتۂ تعلیم صنعت و حرفت
(۵) مصوری مرکزی مدرسہ فنون لطیفہ (۶) مشتری حیدرآباد ٹکنیکل ٹریننگ اسکیم
(۷) مظاہرات مرکزی تعلیم مصنوعات دیہاتی (۸) فوجی مظاہرات۔ افواج باقاعدہ سرکار عالی
(۹) مظاہرات تحفظ حملہ ہوائی سررشتہ اے آر پی (۱۰) طباعت سررشتہ دارالطبع
(۱۱) تالیف و ترجمہ سررشتۂ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ (۱۲) جنگلات کی پیداوار۔ سررشتۂ جنگلات
(۱۳) زراعت۔ سررشتۂ زرعی اشاعت (۱۴) پیمائش و بندوبست۔ سررشتۂ بندوبست سرکار عالی
(۱۵) ٹپہ رسانی سررشتۂ ٹپہ (۱۶) قدیم مصنوعات۔ عجائب خانہ سرکار عالی
(۱۷) مظاہرۂ پیداوار۔ ترقیات نظام ساگر

بیدری تمغوں کا مستحق حسب ذیل اسٹالوں کو قرار دیا گیا۔

(۱) نقل و حمل سررشتۂ ریلوے۔ (۲) ابری سازی مدرسۂ وسطانیہ مشقی
(۳) پرورش سمکیات۔ سررشتۂ سمکیات سرکار عالی (۴) صحت عامہ۔ سررشتۂ طبابت و صحت عامہ
(۵) آبکاری۔ سررشتۂ آبکاری (۶) علاج حیوانات۔ سررشتۂ علاج حیوانات
(۷) آرائش اضلاع سررشتہ ٹاؤن پلاننگ اضلاع لوکل فنڈ (۸) مظاہرۂ صحت جسمانی۔ گورنمنٹ کالج آف فزیکل ایجوکیشن
(۹) آرائش۔ سررشتہ آرائش بلدہ سرکار عالی

نقرئی تمغوں کا مستحق حسب ذیل اسٹالوں کو قرار دیا گیا۔

(۱) شعبہ باغبانی۔ سررشتۂ زراعت (۲) مدرسہ لوئر کرنگنگ۔

(۳) بورڈ آف اسپلامنٹ فارٹیکنیشن (۴) سررشتۂ معدنیات (۵) سررشتۂ ڈریج ۔

اس موقع پر اس بات کا بھی بہ تشکر اظہار کیا جاتا ہے کہ سررشتۂ افواج باقاعدہ حیدرآباد بوائے اسکوٹس اور سررشتۂ تحفظ حملہ ہوائی کی مختلف سروسیوں نے اپنے مظاہرات سے نمایش میں چہل پہل پیدا کرنے میں بڑی کامیابی حاصل کی ۔

۳ ۔ نمایش کا تیسرا شعبہ مرکزی اسٹال مصنوعات ملکی تھا۔ اس میں خواتین اور ان صناعوں کا سامان رکھنے کے لئے جو علحدہ اسٹال حاصل نہ کرسکتے ہوں ایک عام اسٹال قائم کیا جاتا ہے۔ اس شعبہ میں (۳۶) خواتین و اصحاب نے اپنی اشیاء داخل کیں ۔ اس شعبہ میں زنانہ دستکاری و مصوری اور دیگر مصنوعات پر حسب ذیل افراد کو اسناد تقسیم کئے گئے ۔

(۱) مسز تقی الدین (۲) بی کے آہنگار (۳) محبوب فاطمہ
(۴) مس مؤیدالدین حسن (۵) واصف النساء بیگم (۶) مسز یم شمس الدین
(۷) مسز صلاح الدین (۸) امیرالنساء بیگم (۹) لطیف النساء بیگم
(۱۰) انجیا کماری (۱۱) عسکری بیگم (۱۲) بشیر سلطانہ
(۱۳) جیندریش کماری (۱۴) اسمارٹ انجینئرنگ ورکس (۱۵) احمد علی گلبرگہ
(۱۶) نیاک سنگھ تھا آرٹسٹ (۱۷) احمد علی خانصاحب آرٹسٹ ۔

۴ ۔ نمائش کا چوتھا شعبہ فنون لطیفہ پر مشتمل تھا جس میں مصوری، نقاشی، عکاسی اور خطاطی جیسے فنون کے متعلق اہل ملک کی محنت و ذہانت کے نمونے فراہم کئے گئے ۔ اس شعبہ میں (۱۵۸) افراد نے اپنی اشیاء داخل کیں۔ انعامات کی تفصیل حسب ذیل ہے ۔

مضمون	نام آرٹسٹ	انعام
(۱) بلاک اینڈ وہائٹ ہیڈ اسٹڈی	سید محمد مسلم	پہلا انعام
لینڈ اسکیپ (۲) خلدآباد کا منظر	وٹھل راؤ	پہلا انعام

کبوتر خانہ	گوبند سوامی	دوسرا انعام
(۳) اسٹل لائف	میر محمد باقر	
اسٹل لائف		پہلا انعام
(۴) ماڈلنگ موسم گرما	راج کمار	دوسرا انعام
پنہارن	اننا کر	پہلا انعام
بُڈّھ	گنگا رام	دوسرا انعام
(۵) کمپوزیشن		
فصل	زینت حسن نواز جنگ	پہلا انعام
پوجا	لکشمی بائی	دوسرا انعام
(۶) فوٹوگرافی		
دریائے مانیر	زیب بیگم	پہلا انعام
میرا پونچھ	دہرم پوری	دوسرا انعام
(۷) پوسٹر		
جائن آئی، اے ایف	بی، وی پنواری	پہلا انعام

۵ ۔ نمائش کا پانچواں شعبہ جاگیرات پر مشتمل تھا ۔ سات جاگیرات نے اپنے علاحدہ علاحدہ اسٹال قائم کئے ۔ ادارہ مصنوعات پارچہ مسلم بافندگاں انجمن مصنوعات پارچہ مسلم بافندگان انجمن مصنوعات دستی پارچہ بافی نے پہلی دفعہ نمائش میں شرکت کی ۔ مجلس جاگیر داران کی توجہ سے اس قدر اسٹال شرکت کرسکے ۔ مزید جاگیرات کو توجہ کی ضرورت ہے

۶ ۔ نمائش کے چھٹے شعبہ میں اس امر کا اہتمام کیا گیا تھا کہ مملکت کے خام اشیاء سے مصنوعات تیار کرنے کے مختلف طریقوں سے اہل ملک کو روشناس کیا جائے ۔ یہ شعبہ عام دلچسپی کا مرکز ہوتا ہے توقع ہے کہ رفتہ رفتہ اس شعبہ کے کام کی بدولت ملک میں نئی نئی صنعتیں وجود میں آئیں گی ۔

دیہوجودہ صنعتیں اور زیادہ ترقی پائیں گی اس شعبہ میں (۳۶) اسٹال قائم ہوئے ان میں سررشتہ جات سرکاری کا انجمن ہائے امدادِ باہمی اور عام صناع اپنے اپنے کام کا مظاہرہ کرتے تھے ۔ اس شعبہ میں سرکاری رشتہ جات کو جدا کرکے انعامات کے استحقاق کی تفصیل یہ ہے

طلائی تمغہ

(۱) مشنری صدیقی موٹر ورکس (۲) روغنیات ۔ اقبال کمپنی

(۳) خطاطی ۔ اعظم پن کمپنی (۴) گیاسس پلانٹ ۔ سید محبوب علی صاحب

نقرئی تمغہ :۔ (۱) کھادی ودیالیہ (۲) نیو الکٹرک ورکس

نقرئی تمغہ :۔ (۱) محمد عبدالرحمن (۲) شیخ اسماعیل (۳) ابراہیم علی تقی (۴) اعظم یونائیٹڈ کمپنی

(۵) کلیہ اناث (۶) اسپرے پرنٹنگ

۶ ۔ نمائش کا چھٹا شعبہ تفریحات سے متعلق تھا ۔ اس موقع پر اس بات کا اظہار نامناسب نہیں کہ تفریحات نمائش کا اصلی مقصد نہیں رہتا ہے ۔ ان کی غرض بس اس قدر ہے کہ نمائش میں آنے والے بکثرت افراد کی تفریح و دلبستگی کا بھی کچھ نہ کچھ سامان ہوجائے ۔ اس شعبہ میں (۲۷) اسٹال قائم ہوئے اس شعبہ میں کسی اسٹال کو مستحق سند قرار نہیں دیا جاتا ۔

سال حال فینسی ڈریس شو کا مظاہرہ بھی کیا گیا ۔ اس میں جس لباس پر انعام دیا گیا ۔ اس کی تفصیل درج ذیل ہے ۔

(۱) خضر محمد خاں ۔ نقیب نمائش (۲) بہاؤ الدین حسن (نیال) ستھرا دھرا جیوتانہ

(۳) محمد علی خاں ۔ مارواڑی (۴) خمری بیگم ۔ مارواڑنی

(۵) حلیمہ بیگم ۔ حجالی (۶) سید محی الدین ۔ پنڈت

(۷) اختری بیگم چینی (۸) اکبری بیگم ۔ صفائی والی

(۹) خواجہ فریدالدین ۔ چاؤکش (۱۰) واجد سلطان ۔ قاضی

نمائش اطفال کے انعامات کے لئے عثمانیہ بلدی جماعت کو ایک صد روپیہ کی امداد دی گئی ۔

بہرحال نمائش میں (۲۰۷) اسٹال قائم ہوئے اگر جگہ کی تنگی مانع نہ ہوتی تو اس تعداد میں تناہی اضافہ بالکل ممکن ہوتا۔ اکثر صناع اور سررشتہ جات مزید اسٹالوں کے متقاضی تھے لیکن کارکنان نمائش کی مجبوریاں بالکل ظاہر تھیں۔

سررشتۂ صنعت و حرفت نے نقد انعامات کے لئے مبلغ (۶۰۵) چھ سو پانچ روپے مرحمت فرمائے۔ اس کا شکریہ بھی ضروری ہے۔ علاوہ ازیں انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ سے نمائش کے عام فنڈ میں آٹھ ہزار روپیہ کا عطیہ منظور ہوا۔ بہرحال نمائش سرکاری و غیر سرکاری تعاون و عمل کا ایک حقیقی مظاہرہ ہے۔ اور اس کی کامیابی میں جو ہاتھ بٹایا جاتا ہے۔ اس کا دلی شکریہ ادا کیا جاتا ہے سررشتۂ صنعت و حرفت کی نقد رقم حسب ذیل صناعوں اور اداره جات کو تقسیم کی گئی۔

(۱) ہمارا اسٹال ..... ۲۵ عـہ	(۲) اعظم وبونگ ورکس ..... عـہ
(۳) محمد ابراہیم علی قلعی پٹن ..... عـہ	(۴) حسین خاں فرخ نگر .... عـہ
(۵) دکن ہائیٹ ورکس ... عہ	(۶) شیخ احمد جان محمد گیتی ساز بیڑ..... عـہ
(۷) انجمن ہائے اسلامیہ سیرتی .. عہ	(۸) نیو الکٹرک ورکس .... عہ
(۹) مدرسۂ فیض النسواں صنعت و حرفت ... عہ	(۱۰) احمد علی گھڑی ساز گلبرگہ ..... عـہ
(۱۱) کھادی ودیالیہ ...... عـہ	(۱۲) عزیز احمد بدایلی .... عـہ
(۱۳) ٹام ٹام کمپنی .... عہ	(۱۴) صدیق موٹر ورکس .... مار
(۱۵) ایڈڈ انڈسٹریل اردو اسکول ار عـہ	(۱۶) تکارام کھام گاؤں برار .... عـہ

صناعوں میں تقسیم کرنے کے لئے جن اصحاب و خواتین سے تمغہ جات اور کپ وصول ہوئے ان کی تفصیل نہایت مخلصانہ شکریہ کے ساتھ درج ذیل ہے

	اسمائے معطی صاحبان	صراحت عطایا	معطی لہ
۱	ہز ہائی نس حضرت والا شان ولی عہد نواب اعظم جاہ بہادر	طلائی تمغہ	سید محبوب علی صاحب - آٹو موبائیل گیاس پلانٹ

۲ ۔	حضرت والاشان نواب اعظم جاہ بہادر	طلائی تمغہ	سکھ دیو پرشاد صاحب آٹوموبائل گیاس پلانٹ
۳ ۔	حضرت والاشان نواب اعظم جاہ بہادر	طلائی تمغہ	غلام جیلانی صاحب آرٹسٹ
۴ ۔	حضرت شہزادی دُرشہوار دردانہ بیگم صاحبہ	طلائی تمغہ	لیلیٰ بیگم حسن نواز جنگ
۵ ۔	ہز اکسلنسی نواب احمد سعید خان صاحب بہادر صدر اعظم باب حکومت	طلائی تمغہ	محمد ابراہیم صاحب آرٹسٹ
۶ ۔	ہز اکسلنسی نواب سر احمد سعید خان صاحب بہادر صدر اعظم باب حکومت	طلائی تمغہ	عبد الغفور صاحب علی تلی پٹن
۷ ۔	نواب عقیل جنگ بہادر نائب صدر اعظم	طلائی تمغہ	صدیق موٹر ورکس
۸ ۔	نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام تعلیمات	طلائی تمغہ	غیاث الدین صاحب آرٹسٹ
۹ ۔	راجہ دہرم کرن بہادر صدر المہام تعمیرات	کپ	ڈبونار فرنیچر ورکس
۱۰ ۔	مولوی سید عبد العزیز صاحب صدر المہام عدالت	طلائی تمغہ	مس زیبا گنگولی
۱۱ ۔	نواب ظہیر یار جنگ بہادر امیر پائیگاہ	طلائی تمغہ	سمتان امرچنتہ
۱۲ ۔	نواب کمال یار جنگ بہادر	طلائی تمغہ	اسٹیٹ راجہ دہرم کرن بہادر آصف جاہی
۱۳ ۔	رانی گجرا بائی والیہ اسٹیٹ بوم		لال گری جاگیر نواب بہادر یار جنگ بہادر
۱۴ ۔	رانی صاحبہ راجہ دہرم کرن بہادر	نقروی تمغہ	ادارہ مصنوعات مسلم پارچہ بافندگان لنہ شرلیف
۱۵ ۔	" " " " "	" "	انجمن مصنوعات دستی پارچہ بافی السنہ شریف
۱۶ ۔	" " " " "	کپ	دیوی شیاکماری اسٹیٹ امرچنتہ
۱۷ ۔	" " " " "	" "	خورشید بیگم (اسٹال مرکز مصنوعات ملکی)
۱۸ ۔	" " " " "	" "	دہرم کرن انڈسٹریل گرلز اسکول
۱۹ ۔	نواب میر اکبر علیخاں صاحب بیرسٹر	طلائی تمغہ	سرپور پیپر ملز
۲۰ ۔	" " " " "	نقروی تمغہ	او شدھی شاڑا ابرار

۲۱۔ نواب غوث یار جنگ بہادر — کپ — اسٹیٹ بھوم

۲۲۔ نواب دوست محمد خاں صاحب جاگیردار — طلائی تمغہ — ہمرو کمخواب فیاکٹری اورنگ آباد

۲۳۔ نواب اکبر یار جنگ بہادر — کپ — کارخانہ گلزار دکن بیدر

۲۴۔ 〃 〃 〃 〃 〃 — 〃 — کارخانہ تاج دکن بیدر

۲۵۔ نواب داؤد جنگ بہادر — طلائی تمغہ — حیدرآباد کیمیکل اینڈ فارماسیوٹیکل ورکس

۲۶۔ حکیم نارائن داس صاحب ڈیلے ان بید — کپ — سررشتۂ افواج باقاعدہ سرکار عالی

۲۷۔ 〃 〃 〃 〃 〃 — 〃 — سررشتہ اے، آر، پی سرکار عالی

۲۸۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 — نقرئی تمغہ — عبدالقادر عطر ساز برار

۲۹۔ سید محمد ہادی صاحب ناظم بوائے اسکوٹس — کپ — گورنمنٹ کالج آف فزیکل ایجوکیشن

۳۰۔ پریم جی لعل جی صاحب نائب صدر مجلس بلدیہ و مجلس نمائش — 〃 — گوکل داس صاحب کنٹراکٹر

۳۱۔ راجہ گرو داس صاحب جاگیردار — 〃 — اردو ایڈ یڈ انڈسٹریل اسکول دارادہ برار

۳۲۔ نواب مہدی نواز جنگ بہادر — طلائی تمغہ — مس لیلا ہارڈیکر

۳۳۔ نواب بہادر یار جنگ بہادر — بیدری تمغہ — انجمن ہائی اسکول کھام گاؤں برار

۳۴۔ 〃 〃 〃 〃 〃 — 〃 — اردو ایڈ یڈ انڈسٹریل اسکول دارادہ برار

۳۵۔ غلام علی محمدی صاحب ناظم صنعت و حرفت — ۲۰ روپیہ — اردو ایڈیڈ انڈسٹریل اسکول دارادہ برار

وظیفہ یاب

۳۶۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 — نقرئی تمغہ — لکشمی آئل ملز اکولہ

۳۷۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 — 〃 — دی ودھربا ملز ایلچ پور

۳۸۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 — 〃 — دی مہتا ملز اکولہ

۳۹۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 — ۱۰ روپیہ — محمد شجاعت شطرنجی ساز برار

۴۰۔ خواجہ محمد احمد صاحب مددگار آثار قدیمہ — بیدری تمغہ — محمد علاؤالدین جمال برار

۴۱ -	خواجہ محمد احمد صاحب مددگار آثار قدیمہ	نقروئی تمغہ	آر جی کہاٹو، آرٹسٹ
۴۲	" " " " " "	" "	نارمل اسکول امرادتی
۴۳ -	ڈی، دی، لبسواکر	زیورات	کملانی بلستے امرادتی
۴۴ -	خواجہ حمید احمد صاحب مددگار راعد اشماک	نقروئی تمغہ	پرائمری اسکول کارنجہ
۴۵ -	محمد عبدالعلی صاحب نائب معتمد مجلس نمایش	کپ	میر محمود علی صاحب فنیم موحد نظام ینٹ
۴۶ -	حاجی شیخ بابے صاحب	" "	گلبھار سیرا آئیل کمپنی
۴۷ -	" " " " " "	کپ	مرزا محمود الحسن صاحب مہتمم نشر گاہ نمایش
۴۸ -	مسٹر مدن گوپال	" "	کماری اشیا دیوی مرکزی اسٹال
۴۹ -	فصیح الدین احمد صاحب معتمد وار المطالعہ ناسپلی	" "	تجربیہ کارخانہ جلد سازی
۵۰ -	رائے بہادر سری کشن سکھدیو مالیانی	نقروئی تمغہ	آٹوموبائل لیاسس پلانٹ
۵۱	خان بہادر احمد علاؤ الدین صاحب	۱۰۰ ایمد	ونکٹ کشتیا زرگر ۲۵ روپیہ
			ناکوڑ نارائن توربا ۲۵ روپیہ
			بیدہ کوروکنک ۵۰ روپیہ
۵۲	مولوی محبوب علی صاحب سابق ناظم لاسکی	کپ	گوکل داس الکٹرک کنٹراکٹر
۵۳ -	مجلس نمایش سماشی کمیٹی	کپ	حیدرآباد بلیے اسکوائٹس
۵۴	" " " " " "	کپ	خلیل اللہ صاحب آرٹسٹ
۵۵	" " " " " "	کپ	سری جیت گپتہ رہ ورکس
۵۶	" " " " " "	کپ	شیخ حسین منتظم دفتر مجلس نمایش
۵۷ -	" " " " " "	کپ	قاضی آصف الدین محاسب دفتر مجلس نمایش
۵۸	" " " " " "	سگریٹ کیس نقروئی	آغا خلیل الرحمن صاحب صدر امین کوتوالی بلدہ
۵۹ -	" " " " " "	نقروئی ڈبیہ	امین صاحب کوتوالی بلدہ

۲۰ - مجلس نمائش سماشی کمیٹی سکریٹ اکیل نقری محمد نعیم الحق صاحب امین بلدیہ

۲۱ - " " " " " " " نقروی انعام محمد سعید صاحب امین بلدیہ

۲۲ " " " " " " " " " " ذکٹ جاری صاحب اورسیر بلدیہ

۲۳ - " " " " " " " " " " ذکٹ گوپال نائیڈو صاحب اورسیر بلدیہ

ان کے علاوہ رضا کاروں کو مجلس نمائش کی جانب سے ۸ نقروی تمغہ جات عطا کئے گئے - مزدوران بلدیہ حیدرآباد - جوانان سررشتہ کوتوالی اور مالیان باغ عامہ کو پانچ سو روپیہ سے زائد کے پارچہ جات تقسیم کئے گئے -

اس بات کا اظہار بھی بے محل نہیں ہے کہ نمائش میں بیرون بلدہ کے صناع بھی اپنے اسٹال قائم کرتے ہیں - لیکن موجودہ زمانہ کی گوناگوں مشکلات کی وجہ سے اضلاع سے صناعوں کی خاطر خواہ تعداد نمائش میں شریک نہیں ہو سکتی - بہرحال اس جانب توجہ کی جارہی ہے کہ بلدہ حیدرآباد کے علاوہ اضلاع میں بھی صنعتی نمائشوں کا انعقاد عمل میں لایا جائے ، اور چونکہ بعض مقامات میں عرس اور جاتراؤں کے مواقع پر نمائشوں کا انعقاد بھی عمل میں آرہا ہے - اس لئے وہاں کی نمائشوں کی امداد کی جارہی ہے - چنانچہ گزشتہ دو سال سے پربھنی کی نمائش میں ایک ایک سو روپے کی امداد دی جارہی ہے - اور صنعتی و زرعی نمائش ضلع نلگنڈہ کو بھی ایک سو روپے کی امداد دی گئی اور یہ رقم ان صناعوں میں تقسیم ہو جو مقامی ہوں اور جو بلدہ کی نمائش میں شرکت کا وعدہ کریں - امداد نمائش ہائے اضلاع سرکار عالی کے ذیلی قواعد مجلس نمائش سے منظور ہو چکے ہیں -

رضاکارانہ اصول پر نمائش منعقد کرنے کا خیال اب اس قدر مستحکم ہو گیا ہے کہ چند سال پہلے اس کا خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا - نمائش کی جیسی بڑی تنظیم میں کسی نہ کسی خامی کا رہنا ضروری ہے - توقع ہے کہ رفتہ رفتہ خامیاں دور ہو جائیں گی اور حقیقی تنظیم اور خوش اسلوبی جلد قائم ہو جائے گی -

یہ بات بہت مشکل ہے کہ کارکنان نمائش میں سے ہر ایک کے کام کا تفصیلی تذکرہ کیا جا سکے حقیقت یہ ہے کہ ان کے کام کا کوئی صلہ نہیں ہو سکتا - رسمی شکریہ سے ان کا کام بالاتر ہے -

شبانہ روز محنت برداشت کرنا اپنے خانگی ضرورتوں کو ایک بڑے عرصہ کے لئے بالائے طاق رکھ دینا۔ اٹھتے بیٹھتے نمایش کے دہن میں لگے رہنا، شکایتوں کو سننا، مشکلات سے نہ گھبرانا اور نمایش کی کامیابی کو اپنی ذاتی کامیابی سمجھنا تعریف اور شکریہ سے بالاتر ہے۔ بیسیوں دماغ اور بیسیوں ہاتھ نمایش کی کامیابی کے لئے دن رات مصروف رہتے ہیں۔ خدا کرے کہ خدمت ملک کا یہ جذبہ اور رضاکارانہ کام کا یہ ذوق و شوق سب برادروں میں اور زیادہ مستحکم ہوتا جائے اور بڑے سے بڑا کام ان سے انجام پائے۔ فقط

انجمن طیلسانیین عثمانیہ کی مطبوعات

۱۔ عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی کے متولیان ریاست عادل شاہی دور تولیت کی مبسوط اور محققانہ تاریخ۔ مولفہ سید علی محسن صاحب ایم، اے (عثمانیہ) قیمت بارہ آنے ۱۲/

۲۔ سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی مفصل محققانہ اور مستند تاریخ۔

مولفہ ظہیر الدین صاحب ایم، اے (عثمانیہ) قیمت عہ

۳۔ امام غزالی کے کلامی خصوصیات۔

از محمد غوث صاحب (محبوب نگری) ایم اے قیمت عہ

۴۔ موضع دوپلی کی معاشی تحقیق۔

از محمد ناصر علی صاحب، ایم اے (عثمانیہ) زیر طبع

ارکین انجمن اور خریداران مجلہ طیلسانیین عثمانیہ سے نصف قیمت کتب فروشوں کے ساتھ خاص عایت بغرض سہولت کتابیں تبادلہ میں بھی دیجاتی ہیں!

ملنے کے پتے { (۱)۔ دفتر مجلہ طیلسانیین (انجمن طیلسانیین عثمانیہ) حیدرآباد دکن نظام شاہی روڈ
(۲)، مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن!

آموں کی نمائش

زیر سرپرستی مجلس نمائش معاشی کمیٹی (انجمن طیلسانین عثمانیہ)

من ابتدائے ۳ر امرداد ۵۲ف لغایتہ ۵ر امرداد ۵۲ف

بمقام

باغ عام بلدہ حیدرآباد

صدر انتظامی کمیٹی

پروفیسر سعید الدین صدر شعبۂ نباتیات جامعہ عثمانیہ

تفصیلی قواعد حسب ذیل پتہ سے طلب فرمائے جائیں فقط

محمد نجم الدین بی۔اے

اعزازی معتمد

دفتر انجمن طیلسانین عثمانیہ

معظم بلڈنگ

روبروئے معظم جاہی مارکٹ

ٹیلیفون نمبر ۲۵۵۳

انجمن طیلسانین عثمانیہ حیدرآباد دکن کا ماہی ترجمان

مجلۂ طیلسانین

ساتویں جلد ۔ امرداد ۱۳۵۲ف ۔ جولائی ۱۹۴۳ء ۔ جمادی الثانی ۱۳۶۲ھ ۔ تیسرا شمارہ

مدیر:۔ محمد غوث ایم۔اے ال ال بی (عثمانیہ)   مہتمم:۔ محمد عبدالعلی بی ایس سی ال ال بی (عثمانیہ)

معاون مدیر:۔ اکبر علی ناصری بی۔اے (عثمانیہ)

فہرست مضامین

عرض حال

مولوی محمد یوسف الدین مرحوم بی۔اے مہتمم کتب خانۂ جامعۂ عثمانیہ کے انتقال کی وجہ سے عثمانیہ برادری کا جو نقصان ہوا اس پر صبر کے سوا اور کیا چارہ ہے۔ مرحوم جامعۂ عثمانیہ کی اس جماعت میں شامل تھے جس نے سب سے اول طیلساں حاصل کیا طیلسان حاصل کرتے ہی ان کا انتخاب کتب خانہ کی مہتممی پر عمل میں لایا گیا اور ٹریننگ کے لئے لاہور بھیجے گئے۔ واپسی کے بعد سے تقریباً ۲۰ سال گزرے کہ کتب خانہ تھا اور وہ تھے۔ جامعہ کے کتب خانہ کو اس درجہ پر پہونچانے میں ان کی سرگرمی کو بھی بڑا دخل تھا۔ ان کے جیسا خلیق وملنسار، ہنس مکھ اور زندہ دل صحت مند اور توانا آدمی دق کا شکار ہوکر یوں آناً فاناً دنیا سے اٹھ گیا۔ انتقال سے چند ہفتے قبل دواخانہ میں ملاقات ہوئی تھی گو ضعف ونقاہت نے غلبہ پالیا تھا لیکن کتب خانہ کی ادھیڑ بن میں ہی تھے۔ اپنے کام کی فکر دامن گیر تھی اور یہ خواہش کہ ان سے اور زیادہ خدمت سرانجام پائے۔ مرنے والا تو خیر دنیاوی تفکرات و آلام سے نجات پا جاتا ہے لیکن دوستوں کو پس ماندوں کی بےبسی اور بےکسی بہت تڑپاتی ہے۔ خدا کرے مرحوم کی کم سن اولاد کی کفالت اور بسر برد کا کوئی ایسا انتظام ہوجائے کہ یتیمی کے پرمشقت ماہ وسال اطمینان اور دلجمعی سے گزر جائیں۔

ترتیب مجلّہ

۱۔ مجلّہ کو اپنے مشکلات سے، ابھی کامل طور پر رہائی نصیب نہیں ہوئی ہے لیکن خدا کا احسان ہے کہ خدمت گذاری کا سامان ہورہا ہے۔

۲ مجلّہ کی اس اشاعت میں نظموں کا بھی جزو شریک ہے۔ مجلّہ میں ابتدا سے ہی اچھی نظمیں شائع ہوتی رہی ہیں۔ اب جو سلسلہ شروع ہوا ہے توقع ہے کہ وہ جاری رہیگا اور مجلّہ میں ایسی نظمیں شائع ہونگی جو دلوں کو گرماتی اور آگے بڑھنے کی ہمت دلاتی ہیں۔

۳۔ اس شمارے میں امتحان ام۔اے کیلئے لکھا ہوا ایک اور مقالہ بہ تمام وکمال شائع ہورہا ہے۔ اس مقالہ کا موضوع "دربار اودھ کا اثر اردو شاعری پر" ہے۔ اسکے مولف مولوی محمد اعظم خان صاحب ام۔اے لکچرار

جامعۂ عثمانیہ ہیں۔ ادبیات کے سلسلہ میں اس سے قبل ایک مقالہ جس کا موضوع "اردو ادب پر ہندوؤں کا اثر" تھا
اور جس کے مولف مولوی سید حسنین صاحب زیبا ایم اے (عثمانیہ) تھے، شائع کیا گیا تھا۔ ادبی حلقوں میں اس کا
اچھا اثر پیدا ہوا تھا۔ توقع ہے کہ اب یہ نیا مقالہ بھی علمی حلقوں میں اپنا ایک مقام حاصل کریگا۔

۴۔ "موضع دوپلی کی معاشی تحقیق" کے موضوع پر ... علی صاحب ایم اے لکچرار جامعۂ عثمانیہ نے
جو مقالہ ایک عرصے سے قسط وار شائع ہو رہا تھا وہ بھی مجلہ کی اس اشاعت کے ضمیمہ جات میں بہ تمام و کمال
شائع کر دیا گیا ہے۔ اس مقالہ کی طباعت ایک بڑے عرصے تک ہوتی تھی اسلئے ممکن ہے کہ بعض حضرات کے پاس
اسکے اوراق مکمل طور سے موجود نہ ہوں۔ شائقین اس مقالہ کو مکمل صورت میں رعایتی قیمت پر حاصل کر سکتے ہیں

۵۔ مجلہ کی آئندہ اشاعت کو گزشتہ کا فہرست جلسہ طیلسانین عثمانیہ کے مقالات وخطبات اور
دیگر تفصیلات کے لئے مختص کر دیا گیا ہے۔

فکر و نظر

جنگ کے اختتام کے بعد ہر ملک کے حالات پر جو تغیر واقع ہوگا اسکو زیادہ سے زیادہ مفید بنانے
ہر جگہ غور و خوض ہو رہا ہے۔ خیال یہ کیا جا رہا ہے کہ تغیر بہت ہی نمایاں ہوگا اور زندگی و معاشرت کا کوئی پہلو اس سے
بچ نہ سکیگا۔ نیز حکومت کی مشنری اور نظم و نسق کا نظام بھی بدل جائیگا۔ اس سلسلہ میں اس امر پر بھی غور ہو رہا ہے کہ
نظم و نسق کو چلانے والوں کو آئندہ کس قسم کے سانچہ میں ڈھالا جائے۔ انگلستان کے ارباب فکر بھی اس بارے میں
غور کر رہے ہیں چنانچہ (New States man and nation) نے اپنی ایک حالیہ اشاعت میں
انگلستان کی "سول سروس" کے متعلق یہ خیالات ظاہر کئے ہیں کہ:۔

۱۔ اگر برطانوی سلطنت کو ترقی پذیر رجحانات کے ساتھ چلانا پیش نظر ہے۔ اگر برطانیہ کے معاشرہ کو
نئے سانچہ میں ڈھالنا مقصود ہے اور اگر برطانوی دولت عامہ کے دوسرے ممالک کے تعلقات کے سلسلہ میں نیا دور
شروع کرنے کا منشاء ہے تو سول سروس کے لئے بھرتی، تربیت اور تنظیم کے بالکل نئے طریقے اختیار کرنے ضروری ہیں۔

۲۔ سول سروس کے موجودہ ارکان اور بالخصوص وہ ارکان جو بالاتر خدمات پر مامور ہیں۔ بلند خیالی سے
خالی ہیں۔ ان اصحاب میں معاشرہ کی نئی تنظیم و سلطنت کو نئے سانچہ میں ڈھالنے کے لئے نہ تو کوئی جوش ہے نہ سرگرمی۔

ملک کی روایات میں کسی تبدیلی کا خیال ان لوگوں میں خوف و ہراس پیدا کر دیتا ہے اور کسی تبدیلی کیلئے کوئی تجویز پیش کی جاتی ہے تو اس کو سرد مہری کے ساتھ رد کر دیا جاتا ہے۔

۴- نتیجہ یہ ہوا ہے کہ نو آبادیات اور ماتحت ممالک کے معاملات میں بلکہ خود برطانیۂ عظمیٰ کے قومی معاملات میں نہ کوئی جدید پردازی کا اظہار ہوتا ہے اور نہ کوئی تعمیری پالیسی اختیار کی جاتی ہے۔ تعمیر مکانات، انشورنس، ٹاؤن پلاننگ وغیرہ سے جو سلوک روا رکھا گیا ہے ان سب امور میں سول سروس کے ارکان نے نہ تو جوش کا اور نہ تعمیری قابلیت کا اظہار کیا۔

۱- سول سروس کیلئے بھرتی اور تربیت کے اصول آج بھی وہی ہیں جو ایک صدی قبل تھے جن کو ہم خیالوں نے قرار دیئے تھے۔

۵- اب دنیا بدل چکی ہے اور حکومت کے فرائض اور مشاغل قرار دینے میں ایک انقلاب عظیم ہو چکا ہے۔ لیکن سول سروس کیلئے قدیم اصولوں پر ہی عمل پیرائی جاری ہے۔

کلکتہ کی جامعہ کے سرکاری ترجمان کلکتہ ریویو نے اپنی اشاعت بابتہ ماہ جون ۱۹۴۳ء میں اسکے متعلق یہ اظہار خیال کیا ہے کہ خود ہندوستان کی سول سروس کے متعلق بھی اس رپورٹ کی روشنی میں غور کرنے کی ضرورت ہے تاکہ حکومت کو اپنے نئے فرائض اور مشاغل میں ناکامی کا سامنا نہ ہو۔

حیدرآباد کے تعلق سے اس مسئلہ پر غور و خوض کرنے کے لئے نہ معلوم ہمارے جدید سررشتۂ اصلاحات بعد جنگ کو کوئی ہدایت دی گئی ہے یا نہیں۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ حیدرآباد کے وہ افراد جو آئندہ حکومت کی کرسیوں کو زینت دینگے سب سے اول خود حضرت بندگانعالی متعالی مدظلہ العالی کی متابعت میں "خادم خلق اللہ" ہوں۔

اعلیٰحضرت بندگانعالی مدظلہ العالی نے اپنی سلور جوبلی کے موقع پر جو پیام مسرت فرجام اپنی عزیز رعایا کیلئے صادر فرمایا تھا اس میں حضرت نے خود بدولت کو "ساعی خدمت خلق اللہ" قرار دیا تھا۔ خود پیام کے متن میں یہ ارشاد سراپا رشاد ہوا تھا کہ

"میں مخلوق خدا کی خدمت کما حقہ ادا کر کے اپنے بعد اپنے ملک و خاندان کیلئے ایسی یادگار چھوڑ جاؤں جو کہ میری آئندہ آنیوالی نسلوں کیلئے باعث صد فخر و نازش و قابل تقلید بن سکے"۔

جشن سیمیں کے ہی موقع پر رعایا کے سپاس نامہ کے جواب میں یہ ارشاد گہر ریز ہوا تھا کہ

"خادم خلق اللہ ہونا میرا سب سے بڑا طرۂ امتیاز ہے"

جامعۂ عثمانیہ کے دارالمطالعہ میں جو شبیہ مبارک آویزاں ہے اس پر حضرت آصف سابع نے اپنے قلم

صداقت رقم سے "خادم قوم وملت" تحریر فرمایا ہے۔

حیدرآباد کے موجودہ اور آئندہ عہدہ داروں کیلئے بھی زندگی کا ماٹو اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے۔ یوں مشرق میں شروع سے ہی یہی روایات ہیں کہ "سید القوم خادمھم" اگر مغرب اور وہ ممالک جو مغرب کی تتبع کرنا چاہتے ہیں امن وچین کے متلاشی ہیں تو ان کیلئے مشرق کے روایات اخلاق وسیاست میں ابھی بہت سے گر تلاش کرنے ہیں۔

مجلّہ کی گذشتہ اشاعت میں انسداد گداگری کے متعلق اظہار خیال کیا گیا تھا۔ یہ توقع تھی کہ معاشرہ سے اس مرض کے ازالہ کے لئے گرم جوشی کا اظہار ہوگا اور آنریبل مولوی سید عبدالعزیز صاحب کی سعی ایک وقت مشکور ہوکر پھر رائیگاں نہ جائیگی لیکن بہت ہی افسوس ہے کہ دو ایک سال کے دوران میں سعی وکوشش کے جو مراحل طے کئے گئے ہ گلدستۂ طاق نسیاں ہوتے جارہے ہیں۔ اگر اہل حیدرآبادیوں ہر دوڑنے والے کے ساتھ کچھ دور دوڑ کر تھک جائیں ور ایسے تھکیں کہ پھر منزل مقصود کا پتہ بھی نہ چلے تو ترقی کے زیادہ مشکل اور پُرخطر مراحل کیوں کر طے ہونگے۔

انسداد گداگری کے قانون کے ذریعہ یہ توقع قائم کی گئی تھی کہ حیدرآباد کی بلدیہ اس بار کو برداشت ریگی اور اپنی تنظیم کے ذریعہ گداگری کے ناسور کو دور کر دیگی۔ لیکن "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ" ب تو یہ خطرہ ہے کہ گذشتہ ۹ سال کے دوران میں خود بلدیۂ حیدرآباد سے جو آرزوئیں وابستہ ، گئی تھیں وہ بھی "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ" کی مصداق ہوتی جارہی ہیں بلدیہ میں جو خلفشار یدا ہوا ہے وہ سب اہل ملک کی آنکھیں کھولنے کا باعث ہونا چاہیئے اہل ملک غور کریں کہ آیا ان میں عصری ومی اداروں کو چلانے کی کوئی قابلیت نہیں ہے؟ کیا ان میں اتنی صلاحیت بھی نہیں ہے کہ بلدیۂ حیدرآباد کے رود عام انتخابات کی مہم ہی سر کرسکیں؟ بحالیکہ جنوبی آفریقہ میں مقننہ کے عام انتخابات بخیر وخوبی وبخوش اسلوبی عمل میں ۓ ہیں اور آسٹریلیا میں انکی تیاری ہو رہی ہے۔ حیدرآباد کے ہر اس شخص کو جو عامۃ الناس کی خدمت کا سودا رکھتا ہے بلدیہ کے ۂ اور واقعات پر بہت ٹھنڈے دل اور حزم واحتیاط سے غور کرنا چاہیئے۔ اگر آج بلدیہ ناکام ہوجائے تو کل مقننہ کی ییابی کی کیا ضمانت ہے؟ بلدیہ کے تجربہ سے ہی اس نوعیت کے عمومی اداروں کی کامیابی یا ناکامی کا حقیقی معیار قائم ہوگا۔

دربار اودھ کا اثر لکھنو کی شاعری پر

از

محمد اعظم خاں، ام۔ اے (عثمانیہ)

تعارف

مجلس علمیہ انجمن طیلسانین عثمانیہ اس غرض سے قائم ہے کہ عام طور پر تعلیم یافتگان جامعۂ عثمانیہ اور بالخصوص طیلسانین کے علمی و ادبی کارناموں کو منظر عام پر لائے اور اس طرح اردو زبان کی خدمت انجام دے اور اردو میں اعلیٰ علمی کتابیں فراہم کرے۔

اس مقصد کے حصول کے لئے فی الحال یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ ام۔اے۔ اور ام۔ایس۔سی کے لئے مختلف موضوعات پر جو مقالے جامعۂ عثمانیہ کے بعد طیلسان طلبہ سے لکھائے جاتے ہیں اور جن کو خود جامعۂ عثمانیہ اور بیرونی جامعات کے اساتذہ بہ حیثیت ممتحن تنقیدی نظر سے دیکھ کر منظور کرتے ہیں۔ ان کو انجمن کے ترجمان مجلۂ طیلسانین میں طبع کرنے کے علاوہ کتابی صورت میں بھی شایع کیا جائے۔ توقع ہے کہ ان مقالوں کی اشاعت سے صحیح معنوں میں علم و ادب کی خدمت انجام پائے گی۔

زیر نظر مقالہ اپنے موضوع کے متعلق معلومات میں اضافہ کا باعث ہوگا۔

اس مقالہ کے مؤلف مولوی محمد اعظم خاں صاحب ہیں۔ سنہ ۱۳۴۲ف میں موصوف جامعۂ عثمانیہ کے امتحان ام۔اے۔ میں اول رہے۔ فقط

محمد غوث

مدیر مجلۂ طیلسانین

دربار اودھ کا اثر لکھنؤ کی شاعری پر

فہرست ابواب

دربار اودھ کا اثر لکھنو کی شاعری پر

تمہید

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ شاعری نام ہے جذبات و محسوسات کی ترجمانی کا تو خود بخود یہ لازم آتا ہے کہ ہر قوم کی شاعری کو اس کے ماحول کا تابع ہونا چاہیے۔ کیونکہ ماحول ہی وہ عظیم الشان درس گاہ ہے جہاں قلب انسانی کے صفحۂ سادہ پر جذبات و محسوسات کے نقوش ثبت ہوتے ہیں۔ یہ ماحول کوئی مجرد شئے نہیں بلکہ مجموعہ ہے ان جغرافی۔ تاریخی۔ سیاسی۔ عمرانی۔ معاشی اور مذہبی حالات کا جو ہر ملک میں مختلف ہوتے ہیں اور جن کے اثر سے ایک ملک کے باشندوں کے طبعی خصوصیات دوسرے ملک کے باشندوں سے بالکل نہیں ملتے، اسی لئے ان کی شاعری میں بھی باہم فرق عظیم ہوتا ہے۔ پس کسی قوم یا اس قوم کے کسی خاص عہد کی شاعری کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے ان حالات سے واقف ہونا نہایت ضروری ہے۔ جس میں اس نے نشو و نما پائی ہو۔

اردو شاعری پیدا وار ہے مسلمانوں کے دور انحطاط کی جبکہ وہ اپنے اگلے فضائل و محاسن ہند کی "غارتگر اقوام" اور "اکال الامم" خاک کو سونپ چکے تھے۔ اسلام کی ابتدائی جمہوریت و آزادی یہاں آکر مطلق العنان حکومت اور غلامانہ فطرت سے بدل گئی تھی۔ قرون اولی کی سادگی کی جگہ تکلف و نمائش۔ جرأت و ہمت کی جگہ بزدلی و نسوانیت اور محنت و جفاکشی کی جگہ عیش پرستی و تن آسانی نے لے لی تھی۔ مغل سلاطین کے اقبال کا ستارہ گہنا رہا تھا اور ان کی سیاست کی بساط الٹ چکی تھی۔ چنانچہ ان حالات کا عکس لازمی طور پر اردو شاعری کے آئینہ میں بھی جلوہ گر ہوا۔ پس اردو شاعری پر قلم اٹھانے والے کے لئے لازم ہوا کہ ان تمام تاریخی، جغرافی، معاشرتی اور مذہبی حالات سے بحث کرے۔ لیکن چونکہ یہ مختصر سا مضمون اس بارگراں کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ

اسے اردو شاعری کے کسی ایک دور تک محدود کر دیا جائے چنانچہ لکھنؤ کی شاعری کو اس مقالہ کا موضوع قرار دیا گیا اور چونکہ لکھنؤ کی شاعری شروع سے آخر تک دربار اودھ سے وابستہ رہی اس لئے اس میں یہہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس درباری تعلق سے لکھنؤ کی شاعری پر کیا اثرات مترتب ہوئے۔ دربار اودھ ۱۷۳۲ء میں برہان الملک سے شروع ہو کر ۱۸۵۶ء میں واجد علی شاہ پر ختم ہو گیا اس لئے غدر کے بعد کی شاعری ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

شعراء کی دربار سے وابستگی اور اس کے نتائج کے متعلق مولانا حالی مقدمہ شعر و شاعری میں تحریر فرماتے ہیں کہ "قومی سلطنتوں میں جہاں بادشاہ حاکم علی الاطلاق نہیں ہوتا ایسی قدردانیوں سے شاعری بے انتہا ترقی پاتی ہے۔ شاعر جب تک تمام قوم میں مقبول نہیں ٹہرجاتا سلطنت سے اس کی تقویت اور امداد نہیں ہوتی اور قوم میں وہی شاعر مقبول ہوسکتا ہے جو شاعری کے فرائض بغیر امید و بیم کے نہایت آزادی کے ساتھ ادا کرتا ہے نہ اس کو سلطنت کی دستگیری کی کچھ پروا ہے اور نہ بادشاہ کے مواخذہ کا کچھ خوف ہے۔ لیکن خود مختار سلطنتوں میں شاعر کو ہر حال میں دربار کی رضاجوئی کا لحاظ رکھنا اور آزادی سے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے سچے جوش اور ولولے جن کے بغیر شعر کو ایک قالب بے روح سمجھنا چاہیئے سب رفتہ رفتہ خاک میں مل جاتے ہیں نہ وہ اپنے دل کی امنگ سے کسی کی مدح کرسکتا ہے نہ سچے جوش سے کسی کی ہجو لکھ سکتا ہے۔"

بدقسمتی سے لکھنؤ کی شاعری میں دربار اودھ کے تعلق کی وجہ سے وہ تمام خصوصیات بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں جن کا مولانا حالی نے مندرجہ صدر اقتباس میں ذکر فرمایا ہے اس لئے اگر اس دور کی شاعری پر تبصرہ کرتے وقت ہمارا قلم ان زبون اثرات کے دکھانے پر مجبور ہو جائے جو درباری تعلق کی وجہ سے اس پر مترتب ہوئے تو امید ہے کہ ہمیں معذور رکھا جائے گا۔

۲۔ سلطنت مغلیہ کا زوال

مغل بادشاہوں کا اقبال و اقتدار اور دربار دہلی کی شان و شوکت اورنگ زیب عالمگیرؒ کے ساتھ ۱۷۰۷ء میں ختم ہو گئی۔ اس اقبال مند بادشاہ کی وفات کے بعد غدر ۱۸۵۷ء تک اگرچہ پورے

ڈیڑھ سو سال ان کے خاندان میں حکومت رہی اور بارہ سلاطین انہیں کی نسل سے تخت نشین ہوئے لیکن عالمگیرؒ کے انتقال کے ساتھ ہی آل تیمور کے نیّر اقبال میں گھن لگنا شروع ہوا اور ایک ربع صدی کے اندر یہ صدیوں کی عظیم الشان سلطنت پارہ پارہ ہوگئی سطوت وجبروت شاہی بغاوتوں اور خانہ جنگیوں سے نظم و نسقِ سلطنت سازشوں اور بدعنوانیوں سے اور ملک کا امن و اماں غارتگری اور کشت و خون سے بدل گیا۔ وہ سلطنت جس کے حدود کشمیر سے راس کماری اور گجرات سے بنگال تک پھیلے ہوئے تھے دیکھتے دیکھتے دہلی کی چار دیواری تک محدود ہوگئی۔ دہلی جو ایک عظیم الشان سلطنت کا پایۂ تخت ایک قدیم تہذیب کا گہوارہ بے قیاس زر وجواہر کا معدن اور بے شمار علماء و کملاء کا مخزن تھی اب بیرونی حملہ آوروں اور ملکی باغیوں کی جولان گاہ بن گئی۔ ایک طرف مرہٹے راجپوت اور سکھ اس پر دھاوے کر رہے تھے تو دوسری طرف ایران و افغانستان کے حملہ آور اس کی ساری دولت سمیٹ سمیٹ کر باہر لے جا رہے تھے خاندان شاہی کے مختلف ارکان تخت و تاج کے لئے باہم دست و گریباں تھے تو ہر صوبہ کا حاکم اپنی خود مختاری کی تدبیریں کر رہا تھا۔ ان ہی تدبیر کرنے والوں میں ایک برہان الملک سعادت خاں تھے جنھوں نے اس سلطنت کی بنیاد ڈالی جس کی بدولت ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا اور جہاں کی شعر و شاعری ہمارے اس مقالہ کا موضوع اصلی ہے۔

۳۔ برہان الملک ۔ بانی سلطنت اودھ

(سنہ ۱۷۳۲ء ۔ سنہ ۱۷۳۹ء)

عین اس زمانہ میں جب کہ عالمگیرؒ کا وصال ہوا (سنہ ۱۷۰۷ء) نیشاپور سے میر محمد نصیر نام ایک شیعہ بزرگ اپنے بڑے بیٹے میر محمد باقر کے ساتھ تلاش معاش میں ہندوستان آئے اور عظیم آباد (پٹنہ) میں سکونت اختیار کی۔ لیکن وہاں دو سال نہ رہنے پائے تھے کہ انتقال کر گئے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے چھوٹے بیٹے میر محمد امین سعادت خاں بھی ہندوستان آئے اور اپنے بھائی محمد باقر کے ساتھ دہلی کا رخ کیا۔ یہ زمانہ حضرت اورنگ زیبؒ کے جانشین شہزادہ محمد معظم بہادر شاہ اول کا تھا

خوش قسمتی سے محمد امین کی رسائی دربار میں ہوگئی اور شہزادوں کی جاگیر کا اجارہ مل گیا۔ یہ خدمت انھوں نے اس حسن و خوبی سے انجام دی کہ منصبداران شاہی میں شامل کر لئے گئے اور برہان الملک بہادر جنگ کا خطاب پایا۔ اس کے بعد انھیں مختلف کام تفویض ہوئے اور انھوں نے ان سب کو بڑی قابلیت کے ساتھ انجام دیا۔ آخر ان خدمات کے صلہ میں ۱۷۳۲ء میں اودھ کے صوبہ دار مقرر ہوئے۔

اس زمانہ میں صوبۂ اودھ کا مستقر لکھنؤ تھا جہاں شیخ زادوں کی حکومت تھی۔ یہ شیخ زادے شیخ عبدالرحیم نام ایک بزرگ کی نسل سے تھے جنھیں اکبر اعظم کے عہد میں یہاں موروثی جاگیر عطا ہوئی تھی۔ اس آبائی اثر سے فائدہ اٹھا کر یہ لوگ ایسے خیرہ و سرکش ہو گئے تھے کہ کسی صوبہ دار کو جو دربار دہلی سے مقرر کیا جاتا خاطر میں نہ لاتے بلکہ خود شہنشاہ کے احکام کی بھی پروا نہ کرتے ان کی ان سرتابیوں سے تنگ آکر محمد شاہ نے (جو اس زمانہ میں تخت دہلی پر متمکن تھے) برہان الملک کو یہاں کا صوبہ دار مقرر کیا کیوں کہ اس سے قبل وہ کئی مہمیں ایسی سر کر چکے تھے جو دوسروں کے بس کی نہ تھیں۔ چنانچہ بادشاہ کا یہ انتخاب بھی کامیاب ثابت ہوا۔ برہان الملک نے اس حکمت عملی سے لکھنؤ پر قبضہ کیا کہ کشت و خون کی نوبت ہی نہ آئی۔ اور رفتہ رفتہ شیخ زادوں کی قوت بالکل ٹوٹ گئی۔ اب برہان الملک نے صوبۂ اودھ کا مستقر فیض آباد کو قرار دیا جو دریائے گھاگرا کے کنارہ پر ایک چھوٹی سی قدیم آبادی تھی۔ اس کا نام جنگلہ مٹ ہو رہا ہوا اور یہیں قلعہ برج اور سپاہیوں کے مکانات تعمیر ہونے لگے جب اسے شاہی کیمپ کی حیثیت حاصل ہوئی تو اکثر امرا نے بھی یہیں مکانات اور باغات بنوانے شروع کئے اور رفتہ رفتہ یہ ایک چھوٹا سا شہر بن گیا لیکن برہان الملک کے زمانہ میں اسے زیادہ رونق اس لئے حاصل نہ ہو سکی کہ ان کی تمام تر توجہ لشکر کی اصلاح اور فوجوں کی ترتیب و تنظیم کی طرف تھی اور وہ شہر کی آرائش پر اپنا وقت صرف نہیں کر سکتے تھے۔

غرض برہان الملک انہی سپاہیانہ مشاغل میں مصروف تھے کہ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا اور یہ دربار دہلی سے کمک کے لئے طلب کئے گئے اور اسی سال دہلی میں پیوند خاک ہو گئے۔

برہان الملک کے زمانہ میں لکھنؤ اور فیض آباد جن باکمالوں کا مرکز رہا وہ اکثر و بیشتر اہل سیف تھے۔ اہل قلم کی اس پر آشوب فضا میں نہ ضرورت تھی نہ قدر۔ شعرائے دہلی نے اودھ کو اپنا ملجا و ماوا بہت بعد کو بنایا اور ان ہی کے ہاتھوں اس سرزمین میں شاعری کی داغ بیل پڑی جس کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔

برہان الملک کی وفات تک خود دہلی میں اردو شاعری بالکل ابتدائی حالت میں تھی کیوں کہ دربار کی زبان فارسی تھی اور عام طور پر لوگ تمام علمی ضرورتوں کے لئے فارسی ہی استعمال کرتے تھے۔ اردو میں شعر کہنا اہل دہلی اوس وقت تک اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے اور اوسے ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ جب تک کہ ولی اورنگ آبادی نے ۱۷۲۲ء میں دہلی کا دوسرا سفر نہ کیا۔[۱] اس سفر میں جب ولی اپنا دیوان ساتھ لائے، مشاعروں میں اپنا اردو کلام سنایا اور عام طور پر لوگوں کو دکھایا تو لوگوں کو معلوم ہوا کہ اردو زبان بھی شعر و شاعری کے قابل ہے۔ یہ نکتہ ہمیشہ پیش نظر رہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ولی دکنی جو شاعری دکن سے لائے تھے وہ دہلی میں مقبول نہیں ہوئی۔ ان کی وہ شاعری مقبول ہوئی جو انھوں نے حضرت شاہ گلشن رح کی اس ہدایت کی پابندی میں اختیار کی کہ تغزل میں فارسی تغزل کا رنگ بجائے ہندی تغزل کے داخل کرنا چاہیئے۔ اس طرح ولی دلی کے فیض یافتہ بھی تھے اور فیض رساں بھی۔ چنانچہ خود کہتے ہیں:۔

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین ٭ جا کہو کوئی محمد شاہ سون

اس کے بعد دہلی والوں کو بھی اردو میں شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا اور وہاں کے کئی شاعروں نے اس کی طرف توجہ کی جن میں قابل ذکر آبرو، ناجی، یکرنگ، مضمون اور احسن ہیں۔ برہان الملک کی وفات تک یہ سب بقید حیات تھے اور دہلی میں ان کے اس نئے کلام کی بڑی قدر ہو رہی تھی۔ محمد شاہ کا عہد حکومت تھا (۱۷۱۹ء - ۱۷۴۸ء) جو اپنی رنگ رلیوں اور بیفکریوں کی بدولت

---

[۱] ملاحظہ ہو تاریخ ادب اردو مصنفہ پروفیسر گریہم بیلی صفحہ ۲۹ و ۴۰

ہندوستان کی تاریخ میں "رنگیلے" کے لقب سے مشہور ہیں۔ ان کا عہد حکومت عیش پرستی میں ایسا ہی مشہور رہے جیسا کہ ان کے مورث اعلیٰ حضرت اورنگ زیب کا سادگی نیک نفسی اور تقدس میں۔ ظاہر ہے کہ عاشقانہ شاعری اور غزل گوئی کے لئے اس سے زیادہ مساعد فضا اور کون سی ہو سکتی تھی۔ اس لئے ایسے بے فکر بادشاہ کے زیر سایہ دہلی کے تمام شعرا راحت و آرام کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اور شعر و سخن کے نشہ میں مدہوش تھے کہ یکایک نادر کے قیامت خیز حملہ نے راعی و رعایا سب کو خواب غفلت سے چونکا دیا اور جس کا جہاں سینگ سمایا بھاگ کھڑا ہوا۔

۴۔ صفدر جنگ (۱۷۳۹ء۔ ۱۷۵۲ء)

دربار اودھ دربار دہلی کا جانشین بنتا ہے۔

نادر شاہ کا حملہ (۱۷۳۹ء) اور دہلی کا قتل عام تاریخ ہند کے اون المناک واقعات میں سے ہے، جس نے عملی طور پر سلطنت مغلیہ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ گل کر دیا۔ اور اس کے دارالسلطنت پر ایسی تباہی نازل کی جس سے وہ پھر نہ پنپ سکا۔ سیکڑوں گھر بے چراغ ہو گئے ہزاروں باشندے بے خانماں پھرنے لگے اور بڑے بڑے باکمال ترک وطن کر کے کسی ایسی جگہ جانے کے آرزومند ہوئے جہاں وہ اطمینان سے دم لے سکیں۔ یہ مامن ان کے لئے قدرت نے اودھ کی سرزمین میں مہیا کر دیا۔

برہان الملک کی وفات پر ان کے بھانجے اور داماد ابوالمنصور خاں صفدر جنگ نے نادر کو دو کروڑ روپیہ کا پیش کش کر کے دربار دہلی سے اپنے آپ کو اودھ کا صوبہ دار مقرر کرا لیا۔ عله اور مزے سے حکومت کرنے لگے۔ ان کے زمانہ میں صوبہ کا مستقر جو "جنگلہ" کہلاتا تھا اب فیض آباد کے نام سے مشہور ہوا اور اس کی رونق دن بدن بڑھنے لگی۔ یہاں تک کہ برہان الملک کے زمانہ کی چھوٹی سی بستی چند ہی سال میں ایک بڑا بارونق شہر ہو گیا اور صوبۂ اودھ کا صدر مقام قرار پایا جہاں

عله۔ ملاحظہ ہو تاریخ اودھ جلد اول صفحہ (۵۶) مصنفہ مولوی نجم الغنی صاحب رام پوری۔

فوجوں کے کیمپ۔ امرا و رؤسا کے عالیشان محل۔ پر فضا باغ اور بارونق بازار قائم ہو گئے۔ برہان الملک کے حسن انتظام کی وجہ سے صوبہ کے نظم و نسق اور خزانہ کی حالت بھی بہت اچھی تھی۔

تواریخ سے پتہ چلتا ہے کہ جب صفدر جنگ اپنے خسر کے جانشین ہوئے ہیں تو صوبہ اودھ کا رقبہ تیئس ہزار نو سو تیس میل اور آمدنی ایک کروڑ سات لاکھ تھی۔ اس کے علاوہ خزانہ میں نو کروڑ روپیہ نقد جمع تھا۔ [1] اس خوش حالی کے ساتھ اودھ کے مرکز توجہہ بننے کا ایک اور سبب یہ ہوا کہ ۱۷۴۵ء میں صفدر جنگ نے اپنے ولی عہد نواب شجاع الدولہ کی شادی موتمن الدولہ محمد اسحٰق خان کی لڑکی امت الزہرا بیگم سے کی جنھیں محمد شاہ نے اپنی منہ بولی بیٹی بنایا تھا۔ محمد اسحٰق خاں دہلی میں دیوانی خالصہ کی خدمت پر مامور تھے اور بادشاہ کے مقربین خاص میں شمار ہوتے تھے۔

امت الزہرا بیگم جو بعد میں بہو بیگم کہلائیں اپنے وطن سے بڑی محبت رکھتی تھیں۔ ان کے بھائی نواب سالار جنگ اور نواب مرزا علی خاں بھی (جو اپنی بہن کے ساتھ فیض آباد میں آ بسے تھے) اہل دہلی کی امانت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے تھے۔ تیسری کشش اودھ میں اس کے قرب کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی۔ یعنے دہلی سے جتنا قریب اودھ تھا اتنا کوئی اور ایسا مقام نہ تھا۔ جہاں دہلی کے خانماں برباد جا کر پناہ گزین ہو سکتے اور چونکہ اوس زمانہ میں آمد و رفت کی وہ سہولتیں موجود نہ تھیں جو آج ہیں اس لئے اودھ کی سرزمین دہلی والوں کو بہت غنیمت معلوم ہوتی تھی۔ اودھ کی چوتھی خصوصیت یہہ تھی کہ خوش حالی اور فارغ البالی کے سبب وہاں علوم و فنون اور شعر و سخن کا چرچا روز بروز بڑھ رہا تھا اور اہل کمال کی قدر دانی خوب ہو رہی تھی۔ ان وجوہ سے اودھ میں دہلی کا جانشین بننے کی قدرتی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ دہلی جتنی اجڑتی گئی۔ اودھ اتنا ہی بستا گیا اور وہاں کے علوم و فنون تہذیب و تمدن اور شعر و شاعری کی بساط بتدریج یہاں منتقل ہوتی گئی۔

---

[1] ملاحظہ ہو۔ قیصر التواریخ صفحہ (۳۹ و ۴۲ و ۴۳)

شجاع الدولہ کا عہد (۱۷۵۴ء - ۱۷۷۵ء)

اودھ میں شاعری کی ابتداء

جس زمانہ میں شجاع الدولہ اودھ میں مسند نشین ہوئے۔ تخت دہلی پر محمد شاہ کے بیٹے احمد شاہ متمکن تھے (۱۷۴۸ء - ۱۷۵۴ء) لیکن عنان حکومت ہاتھ میں لیتے ہی وہ اہل دربار کی سازشوں میں پھنس گئے اور پورے چھ سال بھی حکومت نہ کرنے پائے تھے کہ بعض امرا نے انھیں اندھا کرکے شہزادۂ معظم کے ایک پوتے کو عالمگیر ثانی کے لقب سے برائے نام تخت پر بٹھا دیا اور خود حکمراں ہو گئے اس طوائف الملوکی کی خبر افغانستان پہنچی تو نادر شاہ کے جانشین احمد شاہ ابدالی نے پھر ہندوستان پر لشکر کشی کی اور ابھی دہلی نادر کی تاخت و تاراج سے سنبھلنے نہ پائی تھی کہ اسے دوبارہ اچھی طرح لوٹا۔ اس بدنظمی کے سیلاب میں بڑے بڑے مستقل مزاجوں کے قدم ڈگمگا گئے اور جو باکمال اب تک دہلی سے نکلنے کا نام نہ لیتے تھے اب سراسیمہ ہو کر اودھ کا رخ کرنے لگے جہاں شجاع الدولہ حکمراں تھے ان ترک وطن کرنے والوں میں چند شاعر بھی تھے جن میں آرزو، فغان، ضاحک، سوز، ضیا اور سودا قابل ذکر ہیں۔ آرزو کے متعلق شمس العلماء مولوی محمد حسین صاحب آزاد لکھتے ہیں کہ :-

"خان آرزو کو زبان اردو پر وہی دعوی پہنچتا ہے جو کہ ارسطو کو فلسفۂ منطق پر ہے جب تک کہ کل منطقی ارسطو کے عیال کہلائیں گے تب تک اہل اردو خان آرزو کے عیال کہلاتے رہیں گے ..... خان آرزو وہی شخص ہیں جن کے دامن تربیت سے ایسے فرزند پرورش پا کر اٹھے جو زبان اردو کے اصلاح دینے والے کہلائے .... یعنی مرزا جان جاناں، مرزا رفیع، میر تقی، خواجہ میر درد وغیرہ"

شجاع الدولہ کے ماموں نواب سالار جنگ نے انھیں دہلی سے بلوایا اور بڑی تعظیم و تکریم سے اپنے پاس رکھا۔ سرزمین اودھ میں شاعری کا بیج انہی کا بویا ہوا ہے لیکن اوس نامساعد فضا کے باعث جس کی تفصیل آگے آئے گی اس کی نشوونما نہ ہو سکی اور خود خان آرزو شجاع الدولہ کی مسند نشینی کے چار سال بعد یعنی ۱۷۵۶ء میں رحلت کر گئے۔

ضاحک۔ اپنے بیٹے حسن کے ساتھ شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد آئے۔ خود نواب سالار جنگ کے

دامن دولت سے وابستہ ہو گئے۔ اور بیٹے کو سالار جنگ کے صاحبزادہ مرزا نوازش علی خان کی مصاحبت پر مامور کرا دیا۔ آخر عمر تک یہیں رہے اور آصف الدولہ کے عہد میں انتقال کیا۔ ان کا نہ تو آج کلام ملتا ہے اور نہ یہ اپنے دور کے شعرا میں کوئی خاص درجہ رکھتے ہیں۔ ان کی شہرت یا تو ان ہجووں کی وجہ سے ہوئی جو سودا نے ان کی شان میں کہی تھیں یا ان کے بیٹے میر حسن کی وجہ سے ہوئی۔ جن کی مثنوی بے نظیر بر صغیر اردو زبان میں بہت مشہور رہی ہے۔ سودا اس وقت فیض آباد آئے جب شجاع الدولہ کا عہد ختم ہو رہا تھا۔ یعنی ۱۷۷۳ء میں۔ اس طرح ان کے بمشکل دو برس شجاع الدولہ کے عہد میں کٹے اور زیادہ تر زمانہ آصف الدولہ کے دور حکومت میں بسر ہوا اس لئے ان کا شمار در حقیقت عہد آصف الدولہ کے شعرا میں ہونا چاہیئے نہ کہ عہد شجاع الدولہ کے۔ اس وجہ سے ہم ان کا تفصیلی ذکر آئندہ باب میں کریں گے۔ اب اس عہد کے تین شاعر یعنے سوز، ضیا اور فغاں رہ گئے۔ ان میں سے کوئی بھی فیض آباد میں مستقل طور پر سکونت پذیر نہ ہوا اور سب چند روز یہاں رہ کر کہیں نہ کہیں چلے گئے تذکرہ نویسوں نے اس کے مختلف وجوہ لکھے ہیں۔ اور فی الواقع یہ بہت غور طلب اور بڑا دلچسپ مسئلہ ہے کہ اودھ کی بساط ادب نے ان اساتذہ سخن کو جو اپنے زمانہ کے مسلم الثبوت باکمال مانے جاتے تھے۔ سر آنکھوں پر کیوں نہ بٹھایا اور کیوں ان کی ایسی ناقدری کی کہ وہ باہر جانے پر مجبور ہو گئے۔

عام طور پر اس کے جو وجوہ بیان کئے جاتے ہیں وہ چنداں قابل قبول نہیں مثلاً اشرف علی خان فغاں جو شعرائے دہلی میں نامور گذرے ہیں۔ فیض آباد میں چند روز رہ کر پٹنہ چلے گئے تھے۔ اس کی وجہ مولوی محمد حسین آزاد یہ لکھتے ہیں کہ شجاع الدولہ کے ہاتھ سے اتفاقاً ایک روز ان کا کپڑا جل گیا تھا جس سے وہ ناراض ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ ایسی معمولی بات اودھ جیسے دامن کو چھوڑ کر پٹنہ کا دور دراز سفر اختیار کرنے کی محرک کسی طرح نہیں ہو سکتی۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ ایک دل برداشتہ آدمی کے لئے یہ بہانہ بن جائے لیکن اصلی سبب فغاں، سوز اور ضیا جیسے شعرا کی ناقدری کا یہ ہے کہ شجاع الدولہ کا عہد شعر و سخن کے لئے سخت ناسازگار واقع ہوا تھا۔ شاعری اور اس میں بھی خصوصیت کے ساتھ عاشقانہ شاعری کے لئے ضرورت ہے ایسی فضا کی جہاں سکون و اطمینان، مال و دولت اور عیش و عشرت ہو۔

اس کے برخلاف شجاع الدولہ کا عہد ہندوستان کی تاریخ میں انتہائی پر آشوب زمانہ تھا۔ ایک طرف دہلی کی عظیم الشان سلطنت اپنی آخری سانسیں لے رہی تھی۔ دوسری طرف انگریزی تسلط ہندوستان کے طول و عرض میں روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ تیسری طرف مرہٹے سارے ملک میں ایک ہنگامہ برپا کر رہے تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمانوں کا نام ہند کی سرزمین سے مٹا دیں۔ چوتھی طرف افغانی حملہ آور رہ رہ کر سرکشی کر رہے تھے۔ ان حالات میں شجاع الدولہ جیسے جنگجو فرماں روا کو (جو اسم بامسمیٰ تھا) اس کی کہاں فرصت تھی کہ وہ عیش و عشرت کی محفلوں یا شعر و سخن کی مجلسوں میں اپنا وقت گذارتا۔ اس نے عنان حکومت ہاتھ میں لیتے ہی فوجوں کی اصلاح و تنظیم شروع کر دی اور جتنے اہم معرکہ اس کے عہد میں ہوئے۔ ان میں سے اکثر میں حصہ لیا۔ ۱۷۶۱ء میں جب احمد شاہ ابدالی مرہٹوں کی روز افزوں قوت توڑنے کے لئے پانی پت کے میدان میں صف آرا ہوا تو شجاع الدولہ بھی اسی کے ساتھ شریک ہوئے اور پانی پت کی وہ مشہور تیسری لڑائی ہوئی جس نے ہمیشہ کے لئے مرہٹوں کی قوت کا خاتمہ کر دیا۔

اس کے تین سال بعد ۱۷۶۴ء میں میر محمد قاسم ناظم بنگالہ اور انگریزوں کے درمیان بکسر میں معرکہ کارزار گرم ہوا تو شجاع الدولہ انگریزوں کے مقابلہ میں محمد قاسم کے ساتھ شریک ہوئے جس میں انھیں شکست ہوئی اور پچاس لاکھ روپے تاوان دینا پڑا۔ اس کے علاوہ انگریزوں سے ایک معاہدہ کرنا پڑا جس کی رو سے انگریز رزیڈنٹ دربار اودھ میں مقرر ہوا اور کانپور و فرخ آباد میں انگریزی چھاؤنیاں قائم کی گئیں ان چھاونیوں کے چوبیس لاکھ روپیے سالانہ اخراجات بھی نواب ہی کے ذمہ لگائے گئے۔

۱۷۷۴ء میں شجاع الدولہ نے روھیلکھنڈ پر چڑھائی کی اور انگریزی فوج کی مدد سے سارے ملک کو ایسا تباہ و برباد کیا کہ اس کی دردناک داستان آج تک زبان زد عام ہے۔ غرض شجاع الدولہ کی ساری عمر انہی فوجی مہمات میں گذری اور انھیں ان علمی مشاغل کی طرف توجہ کرنے کی مہلت نہ ملی جو امن و اطمینان کے زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

یہی سبب تھا کہ جو اہل قلم اس عہد میں دہلی سے آئے ان کی کما حقہ قدر نہ ہوسکی اور میر حسن بھی جو آخر عمر تک اودھ میں رہے صرف سالار جنگ کی فیاضیوں کے سہارے جیا کئے اور ان کی حوصلہ افزائی میں شجاع الدولہ کا بہت ہی کم حصہ رہا۔ باوجودیکہ خان آرزو جیسے باکمال شاعر اور ان کے تلامذہ نے اودھ کی سرزمین میں شاعری کا بیج بویا تھا لیکن ناموافق فضا کی وجہ سے اس زمانہ میں اس کی نشو و نما پوری طرح نہ ہوسکی اور اصلی فروغ اسے اسی وقت حاصل ہوا جب شجاع الدولہ کے جانشین آصف الدولہ کے فیض کی گنگا نے اس کی آبیاری کی۔ اس طرح یہہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شجاع الدولہ کے عہد میں اردو شاعری درباری اثرات سے بالکل متاثر نہیں ہوئی تھی۔ حکمران وقت اور اہل دربار کے سپاہیانہ مشاغل کی جھلک بھی اس دور کی شاعری میں نہیں پائی جاتی۔ اس لئے کہ یہہ ایسے قدر دانوں کے سایہ عاطفت میں پلی جو اس زمانہ کی سیاسی الجھنوں سے دور اطمینان و فراغت اور لطف و مسرت کی زندگی گذار رہے تھے۔ جس طرح اودھ کی ادبی تاریخ میں شجاع الدولہ کا کہیں ذکر نہیں ملتا اسی طرح اس کی سیاسی تاریخ میں سالار جنگ اور مرزا علی خان کا نام نہیں دکھائی دیتا اسی وجہ سے اس عہد کی شاعری رزم کی بجائے بزم کی آئینہ دار ہے یعنے شجاع الدولہ کی بجائے سالار جنگ کی یادگار ہے۔

۴۔ آصف الدولہ کا عہد۔ (۱۷۷۵ء۔ ۱۷۹۷ء)

سودا۔ میر و سوز کا دور۔

۱۷۶۵ء کے عہد نامہ کے بعد سے انگریز اودھ کی فوجی سرگرمیوں پر سخت نگرانی رکھنے لگے تھے۔ اور یہہ شجاع الدولہ ہی کا حق تھا کہ وہ اس جکڑ بند کے باوجود آخر وقت تک اپنی فوجی طاقت برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئے لیکن آصف الدولہ باپ کی طرح سپاہی منش نہ تھے اس لئے انگریزوں نے نہایت آسانی سے انھیں اپنے ڈھب پر لگالیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں دربار کا رنگ بالکل بدل گیا۔ جو روپیہ برہان الملک اور شجاع الدولہ کے عہد میں قلعوں کی تعمیر و ترمیم پر صرف ہوتا تھا آصف الدولہ کے زمانہ میں شہر کی آرائش و زیبائش پر صرف ہونے لگا

اور جو وقت پہلے فوجوں کی اصلاح و تنظیم میں صرف ہوتا تھا۔ اب عیش و عشرت کے جلسوں کی نذر ہونے لگا۔ اس صورت حال نے اودھ کی سیاسی پوزیشن کو خواہ کتنا ہی کمزور کر دیا ہو لیکن دربار کی ظاہری رونق کو بے انتہا ترقی دیدی۔ اب دربار اودھ کی حالت اس مسرف کی ہو رہی تھی جو اندر سے تو کھوکھلا ہو لیکن اس کی ظاہری شان و شوکت لوگوں کے لئے مقناطیسی کشش رکھتی ہو ان ہی فضول خرچیوں کی وجہ سے چند ہی سال میں آصف الدولہ اور ان کی بیدار مغز ماں بہو بیگم میں سخت ناچاقی ہوگئی اور ۱۷۷۵ء میں پایہ تخت فیض آباد سے لکھنؤ منتقل کر دیا گیا تاکہ ماں کی مداخلت کے بغیر بادشاہ آزادی کے ساتھ اپنے مرغوب طبع مشاغل میں منہمک رہ سکے آصف الدولہ کو اگرچہ ان تمام مشاغل سے دلچسپی تھی جو شاہان دہلی کی تباہی کا باعث ہوئے تھے لیکن شاعری سے انھیں جتنا شغف تھا اتنا کسی اور چیز سے نہ تھا وہ آصف تخلص کرتے تھے اور بڑے پُرگو شاعر تھے جس کی یادگار آج بھی ایک ضخیم دیوان کی صورت میں باقی ہے۔ جب خود بادشاہ کے ذوق کا یہ حال ہو تو پھر شعراء کی قدردانی کا کیا عالم ہوگا۔ اب لکھنؤ دہلی کی تہذیب و تمدن اور علم و فضل کے ساتھ وہاں کے عیش و عشرت اور شعر و سخن کا بھی پورا پورا جانشین بن گیا اور دہلی کے کئی مشہور شاعر لکھنؤ میں جمع ہوگئے۔ جن میں قابل ذکر سودا (۱۷۱۳ء - ۱۷۸۱ء) میر (۱۷۲۴ء - ۱۸۱۰ء) سوز (۱۷۲۰ء - ۱۷۹۸ء) اور مصحفی (۱۷۵۰ء - ۱۸۲۴ء) ہیں۔

مرزا رفیع سودا۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا ۱۷۷۳ء میں یعنی آصف الدولہ کی تخت نشینی سے دو سال پہلے فیض آباد آئے اور جب آٹھ سال بعد صوبہ کا مستقر لکھنؤ منتقل ہوا تو یہ بھی یہیں آ گئے لیکن قضا بھی ان کے ساتھ ہی پہنچی اور پہلا ہی سال پیوند خاک ہوگئے۔ اس طرح ان کے کل چھ سال عہد آصف الدولہ میں گذرے۔ ان کی وفات کے دو سال بعد ان کے مشہور مد مقابل میر محمد تقی میر ۱۷۸۳ء میں لکھنؤ آئے اور ستائیس سال رہ کر یہیں وفات پائی۔ میر کے سات سال بعد ۱۷۹۰ء میں شیخ غلام ہمدانی مصحفی آئے اور چونتیس سال رہ کر قضا کی۔ مصحفی کے سات سال بعد یعنی ۱۷۹۷ء میں سید محمد میر سوز جو اس سے قبل اودھ سے نامراد مرشد آباد گئے تھے

آصف الدولہ کے فیض کا شہرہ سن کر پھر یہاں آئے اور اس مرتبہ قسمت کی رسائی سے آصف الدولہ کے استاد ہو گئے۔ لیکن ایک ہی سال بعد وفات پائی۔

ان کے علاوہ اس عہد کے اور بھی کئی شعرا کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن نہ تو ان کے مفصل حالات معلوم ہوتے ہیں نہ ان کا کلام دستیاب ہوتا ہے اس لئے یہ اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کہ دربار کے رنگ نے ان کے کلام پر کیا اثر ڈالا۔ اس طرح مرزا فاخر مکین۔ سرب سنگھ دیوانہ۔ شیخ بقاء اللہ خاں بقا اور مرزا جعفر علی حسرت وغیرہ کے نام اگرچہ اکثر لئے جاتے ہیں لیکن ان کے حالات اس قدر تاریکی میں ہیں کہ سنہ وفات تک کا پتہ نہیں چلتا۔

آصف الدولہ کی فیاضیوں نے صرف ان شعراہی کو نہیں کھینچ بلوایا بلکہ خود شہزادگان دہلی ان کی داد و دہش کا شہرہ سن کر لکھنو کا رخ کرنے لگے اور اپنا آبائی وطن چھوڑ کر یہیں سکونت اختیار کر لی۔ چونکہ یہ شہزادے آگے چل کر دربار اودھ کا ایک جزو بن گئے اور ان کے اطوار کا بڑا اثر لکھنو کی شاعری پر پڑا اس لئے مختصراً ان کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ ۱۷۸۴ء میں مرزا جوان بخت جو دہلی کے بادشاہ وقت یعنی شاہ عالم ثانی (۱۷۵۹ء-۱۸۰۶ء) کے ولی عہد تھے۔ اپنے باپ کی پراگندہ سلطنت کو اسی پر چھوڑ کر نہایت بے سرو سامانی کے ساتھ لکھنو پہنچے آصف الدولہ نے کمال اعزاز و احترام کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ تین لاکھ روپیہ کا نقد و جنس نذر گزرانا اور پچیس ہزار روپیہ ماہوار مقرر کیے۔ شہزادہ والاتبار اب یہاں عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے لگے۔ اور مرغ بازی پتنگ بازی ناچ رنگ اور شعر و سخن کی مجلسوں میں آصف الدولہ کے ہم پیالہ و ہم نوالہ رہنے لگے۔ شومئی قسمت سے درباری ارباب نشاط میں جگیہ نام ایک طوائف تھی جس پر شہزادہ کا دل آگیا اور انھوں نے اسے اپنے حرم میں داخل کرنا چاہا۔ اتفاق سے وہ خود آصف الدولہ کی منظور نظر تھی اس لئے وہ اس پر راضی نہ ہوئے۔ مگر شہزادہ کو اس کی ایسی لو لگی تھی کہ وارن ہسٹنگز گورنر جنرل کے ذریعہ سے جو اس زمانہ میں لکھنو آئے ہوئے تھے سفارش کرائی اور آصف الدولہ کو مجبوراً ماننا پڑا۔ اس طرح شہزادہ کو جگیہ تو مل گئی مگر لکھنو چھوڑنا پڑا کیوں کہ آصف الدولہ ان سے ناراض ہو گئے۔ اور انھیں مجبوراً بنارس میں

قیام کرنا پڑا۔[1] سنہ ۱۸۰۷ء میں ان کے دوسرے بھائی مرزا سلیمان شکوہ وارد لکھنؤ ہوئے آصف الدولہ بڑے بھائی کا رنگ دیکھ چکے تھے اس لئے ان کے استقبال میں پس و پیش اور شہزادہ کو کئی مہینے لکھنؤ سے باہر ٹھیرنا پڑا۔ آخر لارڈ کارنوالس گورنر جنرل کی سفارش سے نو انہیں قیام لکھنؤ کی اجازت دی اور چھ ہزار روپیہ ماہانہ مقرر کیا۔ یہ عرصہ دراز تک لکھنؤ میں ر لیکن نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں ان کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی قضیہ نامرضیہ پیش آیا جس سلسلہ میں یہ لکھنؤ سے چلے گئے اور سنہ ۱۸۳۷ء میں بہ مقام اکبرآباد وفات پائی۔

شہزادہ سلیمان شکوہ لکھنؤ کی تاریخ ادب میں بہ طور خاص قابل ذکر ہیں اس لئے کہ شاعر تھے اور شعرائے دہلی کی بڑی سرپرستی کرتے تھے، لکھنؤ آنے کے بعد ان کا دردولت عرصہ تک کئی مشہور شعرا کا مرکز رہا ہے۔ انشا، مصحفی، رنگین، جرأت سب ان کے خوان نعمت خوشہ چین تھے اور ان ہی کے تقرب اور استادی کے سلسلہ میں وہ نزاع پیدا ہوئی جس نے مصحفی کو مدمقابل بنا کر لکھنؤ کی شاعری میں ایک مزید افسوس ناک باب کا اضافہ کیا۔ مولوی محمد حسین آزاد ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ "عام اہل دہلی کے علاوہ شعرا کا مجمع دونوں وقت ان کے رہتا تھا۔ سودا، میر ضاحک، میر سوز وغیرہ کا ورق زمانہ الٹ چکا تھا۔ مصحفی، جرأت، مرزا قتیل وغیرہ شاعروں اور شعر فہموں کے جلسے رہتے تھے۔ جو محفل ایسے گلشن فصاحت کے گل سے سجائی جائے وہاں کی رنگینیاں کیا کچھ ہوں گی۔ جی چاہتا تھا کہ ان کی باتوں سے گلزار کھلا دو اکثر پھول ایسے خش کانٹوں میں الجھے ہوئے ہیں کہ کاغذ کے پرزے ہوئے جاتے ہیں۔ اس لئے صفحہ پھیلاتے ہوئے ڈر لگتا ہے"[2] چند سال بعد ان کے چھوٹے بھائی مرزا اسکندر شکوہ بھی لکھنؤ آگئے۔ آصف الدولہ نے دو ہزار ماہوار ان کی بھی مقرر کر دی اس طرح دہلی کے تمام منتشر اجزا لکھنؤ م ہونے لگے اور اس عیش و عشرت، نمایش و تکلف بے فکری و بیکاری، مفت خوری و بے ح درباداری و راحت طلبی کی بنیاد پڑی جس نے آخرکار شاعری کے ساتھ سلطنت کو بھی ڈبو یا۔

ایسے دربار کے جو اثرات اس دور کی شاعری پر مترتب ہوئے ان کا اندازہ کرتے وقت

[1] قیصر التواریخ جلد اول صفحہ ۱۱۰ و ۱۱۱ [2] آب حیات صفحہ ( )

چند امور کا بطور خاص لحاظ رکھنا چاہیئے۔

پہلے تو یہ کہ عہد آصف الدولہ میں جو شعرا دہلی سے آئے وہ سن رسیدہ ہو چکے تھے، ان کا ایک خاص رنگ مستحکم ہو گیا تھا، ان کی تخلیقی قوت جواب دے چکی تھی۔ ان کی جوانی کی امنگیں اور شاعری کے ولولے سرد پڑ گئے تھے سودا جب لکھنؤ آئے تو ان کی عمر ۶۸ سال کی تھی۔ میر کی ۶۰ سال۔ سوز کی ۶۴ سال اور مصحفی کی ۴۰ سال۔ اس طرح بجز آخر الذکر کے، وہ سب عمر طبعی کو پہنچ چکے تھے ظاہر ہے کہ ایسے پختہ طبعوں پر کوئی نیا رنگ آسانی سے نہیں چڑھ سکتا۔

دوسرے یہ کہ یہ لوگ اپنے عہد کے ممتاز ترین شعرا اور مسلم الثبوت اساتذہ مانے جاتے تھے اس لئے وہ اس شاہی تقرب کی خاطر کوئی نیا رنگ اختیار کرنے پر چنداں مجبور نہ تھے۔

تیسرے یہ کہ ان کے کلام کا وہ حصہ جو لکھنؤ میں مرتب ہوا پوری طرح متعین نہیں کیا جا سکتا اور بجز ان چند نظموں کے جن میں مخصوص خاص حوالے ہیں باقی کلام کے مواد کے متعلق کوئی قطعی رائے نہیں قائم کی جا سکتی۔ ایسے حوالے صرف نظموں یا مثنویوں میں ملتے ہیں۔ غزلیات میں (جس پر ان کے کلام کا بیشتر حصہ مشتمل ہے) ان کا پتہ نہیں چلتا۔ ان سب باتوں کو پیش نظر رکھنے کے باوجود بھی یہ کہنا بیجا نہیں کہ دربار اودھ کے اس رنگ کا ان شعرا پر کچھ نہ کچھ مضر اثر ضرور پڑا مثلاً میر کے سے نازک الکلام اور سرتاج شعرا کو دیکھیئے کہ لکھنؤ میں آکر ان کی فکر سخن کیسے ادنیٰ اور معمولی مضامین پر اتر آتی ہے کبھی تو وہ آصف الدولہ کے ہولی کھیلنے کا ذکر کرتے ہیں تو کبھی ان کے شکار کرنے کا۔ کہیں مرغبازی پر مثنوی لکھتے ہیں تو کہیں خبردار، بلی اور بکری پر۔ ایک قطعہ میں آصف الدولہ کے گھوڑے کی تعریف کرتے ہیں تو دوسرے میں کسی خواجہ سرا کی ہجو۔ پس جب ہم ان کی ایسی پست و رکیک شاعری کا اس بلند رتبہ کلام سے مقابلہ کرتے ہیں جس میں بقول خود میر ؎

جہاں سے دیکھیئے ایک شعر شور انگیز نکلے ہے　　قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہر جا میرے دیوان میں

تو ہمیں مولانا آزردہ کے اس قول سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ "پستش نہایت پست و بلندش نہایت بلند" اور اس باہمی فرق کو ماحول کے اختلاف پر محمول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔

کم و بیش یہی حال سودا کا ہے۔ سودا نے اپنی اہاجی میں جور کاکت داخل کی وہ ناگفتہ بہ ہے پھر بیران کے کلام میں کوئی اضافی چیز نہیں بلکہ ان کے کلیات میں ایسا ہی مستقل درجہ رکھتی ہے جیسا کہ ان کی زندگی کا ایک مستقل جزو تھی۔

ان ہجویات کے متعلق یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ تمام تر سرزمین اودھ ہی کی پیداوار ہے لیکن اس میں شبہہ نہیں کہ اگران کی مدت قیام کا لحاظ رکھا جائے تو بے شک اودھ کا پلہ بھاری رہے گا کیوں کہ سودا کی وہ گل افشانی جو غلام حسین ضاحک، مرزا فاخر مکین، بقار اللہ خاں بقا۔ مکند رام فدوی وغیرہ کی شان میں ہوئی زیادہ تر یہیں کی یادگار رہے۔ دربار اودھ کے اثر سے تو ایک طبع رسا کی بجلی ایک اور افق پر بھی چمکی تھی جو اس سے بالکل مختلف ہے اور جس کا مختصر ذکر بیاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ آصف الدولہ کے مورث اعلیٰ میر محمد نصیر مذہب امامیہ سے تعلق رکھتے تھے اس لئے ان کی اولاد میں جتنے فرمانروا گزرے وہ سب اسی مذہب کے پیرو رہے لیکن پہلے تین حکمران ایسی سخت سیاسی کش کش میں گرفتار تھے کہ انھیں مذہبی معاملات میں کسی طرح کی دلچسپی لینے کا موقع نہیں ملا آصف الدولہ کے زمانہ میں جب انگریزی مداخلت کی بدولت اودھ کی سیاسی جد وجہد کا خاتمہ ہو گیا تو یہ مذہبی عصبیت بھی رنگ لانے لگی چنانچہ آصف الدولہ کے مشہور وزیر سرفراز الدولہ مرزا حسن رضا خاں پہلے پہل شیعیت کی شاہی سرپرستی کا باعث ہوئے اور سلطنت میں مجتہد العصر کا عہدہ قائم کرایا جس پر علامہ سید دلدار علی کا تقرر ہوا۔ اس کے بعد ۷ لاکھ روپے اور گراں بہا تحائف شاہ ابنداد کو بھیجے گئے تاکہ ذریعے فرات سے نجف اشرف تک ایک نہر جاری کی جائے اور دس لاکھ کے صرف سے لکھنؤ میں ایک امام باڑہ تیار کرایا گیا جو دس سال کے عرصہ میں ۱۷۸۵ء میں تکمیل کو پہنچا۔ غرض یہ کہ اسی زمانہ میں وہ مذہبی جانب داری شروع ہوئی جس نے آگے چل کر ایک مستقل تحریک کی صورت اختیار کر لی۔
دربار اودھ کے اس رجحان نے شمالی ہند میں پہلے پہل ادب صنف سخن کا اضافہ کیا جو اگرچہ دکن میں سالہا سال سے رائج تھی لیکن شمال کی شاعری میں اب تک اس کا مستقل وجود نہ پایا جاتا تھا یعنی مرثیہ گوئی تھی

سودا کے علاوہ اور بھی کئی شعرا نے طبع آزمائی کی بلکہ کئی ایسی ترمیمیں بھی کیں جو نہایت اہم ثابت
اور بعض شعرائے مابعد نے مستقل طور پر اختیار کرلیا مثلاً یہ کہ اس وقت تک مرثیے مربع ہوا کرتے
وا نے اسے مسدس بنایا۔ پہلے مرثیے محض ایک طرح کا بین ہوتے تھے۔ سودا نے ان میں ادبی شان
غرض اس زمانہ میں مرثیہ میں جو کچھ ترقی ہوئی وہ دربار اودھ ہی کے اثر سے ہوئی اور سودا کے اختراعات
ت بھی مذہبی رجحان تھا۔

مصحفی اودھ میں سینتیس[٢] سال رہے جس میں صرف سات سال آصف الدولہ کے عہد کے تھے باقی
دیگر فرماں رواؤں کے عہد کے۔ اس کے علاوہ ان کے اصل معرکے سید انشاء کے ساتھ رہے
ت علی خاں کے عہد میں لکھنؤ آئے تھے اور ان ہی کے دربار سے تعلق رکھتے تھے۔ اس طرح مصحفی کا
سعادت علی خاں کے شعرا میں ہونا چاہیئے۔ چنانچہ ہم ان ہی کے دور میں ان کا تفصیلی ذکر کریں گے۔
ہ گئے میر سوز۔ سوز کا لکھنؤ میں کل قیام دو تین سال سے زیادہ نہیں رہا۔ ظاہر ہے کہ اتنی قلیل مدت
ب کہنہ مشق شاعر پر کسی طرح کا کوئی اثر نہیں پڑسکتا اس لئے میر سوز کا شمار لکھنؤی شعرا میں کرنا صحیح نہیں
کے شاگرد نواب آصف الدولہ کا کلام اس زمانہ کی سوسائٹی کا بہترین مرقع اور اس عہد کے دربا
یادگار کہلایا جاسکتا ہے۔ اس لئے کہ نہ صرف ان کا خمیر خاک اودھ سے تھا۔ بلکہ دربار اور دربار کا
بارت تھا ان ہی کی ذات سے۔ اون کا دیوان اگرچہ طبع نہیں ہوا اور نہ عام طور پر دستیاب ہوتا ہے
ش قسمتی سے اس کا ایک قلمی نسخہ جو خود ان ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا بیان کیا جاتا ہے کتب خانہ آصفیہ
جود ہے جس کی بدولت ہماری نگاہوں کے سامنے اس زمانہ کا مذاق اور دربار کی حالت اس طرح
جاتی ہے کہ اودھ کی کوئی بڑی سے بڑی تاریخ بھی اوسے اس طرح نمایاں نہیں کرسکتی۔

اس کلیات میں غزلیں، قصائد، مثنویاں، مخمس، رباعیاں، غرض تمام اصناف سخن موجود ہیں۔
رسمی حمد و نعت اور منقبت کے بعد ایک مثنوی وزیر علی خاں کی شادی کے بیان میں ہے جو ان
عہد تھے اور جن کی شادی ۱۷۹۴ء میں بڑے تزک و احتشام سے اشرف علی خاں کی لڑکی کے
ہوئی تھی۔ اس شادی میں تیس لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا اور اس میں ایسے ایسے تکلفات کئے گئے تھے

کہ ہندوستان کی تاریخ میں اس کی نظیر کم ملے گی۔ اس کے تفصیلی واقعات آصف الدولہ نے اس ہجی مثنوی میں بیان کئے ہیں اس کے بعد دو ایک مثنویاں مختلف موضوع پر ہیں لیکن اوس دربار کی عیش و عشرت نے شاعری پر جو اثر ڈالا اس کا اصلی اندازہ اون ہجو، قصیدہ، مثنوی اور مخمسوں سے ہوتا ہے جو مختلف لوگوں کے متعلق لکھے گئے ہیں۔

زبان کے اعتبار سے آصف الدولہ کا کلام اپنے ہمعصروں میں بہت صاف و شستہ ہے اور یہہ معلوم ہوتا ہے کہ لکھنو کی تراش خراش سے زبان کی جو ہیئت آگے چل کر قائم ہوئی اس کی بنیاد اسی زمانہ سے پڑنی شروع ہوگئی تھی۔ اس کے ساتھ طرز ادا میں تعقید اور عربی و فارسی الفاظ کی وہ کثرت جو آخر زمانہ میں لکھنو کے خصوصیات میں داخل ہوگئی تھی ان کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ البتہ رعایت لفظی اور مراعاۃ النظیر جس میں لکھنو کی شاعری بہت بدنام ہے۔ اس کی جھلک آصف الدولہ کے کلام میں بھی پائی جاتی ہے۔

(۷) سعادت علی خاں کا عہد (۱۷۹۸ء۔ ۱۸۱۴ء)
انشا، مصحفی، جرات اور رنگین کا دور۔

آصف الدولہ کے انتقال پر ان کے ولی عہد مرزا وزیر علی خاں تخت نشیں ہوئے لیکن یہہ اس قدر نا اہل تھے کہ چھ مہینہ بھی سلطنت نہ چلا سکے۔ آخر کار سرکار انگریزی نے مداخلت کرکے انھیں معزول کر دیا اور ان کی جگہ آصف الدولہ کے بھائی سعادت علی خاں کو تخت نشین کیا۔ سعادت علیخاں نہایت لائق تجربہ کار اور صاحب تدبیر فرمانروا تھے اور اوس فضول خرچی سے کوسوں دور تھے جس نے آصف الدولہ کے عہد میں اودھ کا خزانہ خالی کر دیا تھا۔ جس وقت یہ تخت نشین ہوئے تو اپنا ذاتی جمع کیا ہوا چھ لاکھ روپیہ خزانہ میں داخل کیا اور اس خوبی سے انتظام سلطنت کیا کہ مرتے وقت سترہ کروڑ روپیہ چھوڑ گئے۔ حالانکہ ان کے زمانہ میں آدھا ملک انگریزوں کو دیدیا گیا تھا جس کی وجہ یہہ تھی کہ شجاع الدولہ کے عہد میں جو چھاؤنیاں فرخ آباد اور کانپور میں قائم کی گئی تھیں ان کے سالانہ اخراجات آصف الدولہ کی فضول خرچیوں کے سبب سے نہ ادا ہو سکے اور اتنا بقایا ہو گیا کہ

سعادت علی خاں کو انگریزوں کے روز افزوں مطالبات سے نجات حاصل کرنے کے لئے اودھ کا آدھا علاقہ ان کے حوالہ کرنا پڑا اس طرح صرف آدھا ملک اودھ ان کے قبضہ میں رہ گیا لیکن سعادت علیخاں کے حسن انتظام اور کفایت شعاری نے بڑی حد تک آصف الدولہ کے اسراف کی تلافی کر دی اور سلطنت کے مالیہ کو تباہی سے بچا لیا۔

اپنی ان سیاسی اور انتظامی مصروفیات کے باعث سعادت علی خاں شعر و شاعری کی طرف زیادہ توجہ نہ کر سکے اور ان کے دربار میں سید انشا کے سوا (جن کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا) اور کسی شاعر کا گذر نہ ہوا لیکن اس کی تلافی ان شہزادگان دہلی کے ذوق سخن نے کر دی جن کا ذکر گذشتہ اوراق میں ہو چکا ہے۔ اب لکھنؤ میں شاعری کا مرکز ان ہی شہزادوں خصوصاً مرزا سلیمان شکوہ کا دربار قرار پایا جہاں ہر وقت شعر و سخن کی محفلیں گرم رہتیں اور دہلی کا جو شاعر لکھنؤ پہنچتا یہیں آکر دم لیتا۔ اس طرح مصحفی (سنہ ۱۷۵۰ء - سنہ ۱۸۲۴ء) انشا المتوفی (۱۸۱۷ء) رنگین (۱۷۵۶ء - ۱۸۳۴ء)، جرات (سنہ ۱۸۱۰ء) سب نے ان ہی کے در کو اپنا ملجا و ماوا بنایا اور انشا کے سوا اور سب آخر وقت تک اسی سرکار کے متوسل رہے۔ ان کا تفصیلی ذکر اوپر گذر چکا ہے۔ لکھنؤ میں رہ کر ان کی اخلاقی حالت اور بدتر ہو گئی تھی۔ ریاست سے انھیں بیش قرار ماہوار ملتی تھی اور دن بھر سوائے بے فکری اور عیش و عشرت کے کوئی کام نہ تھا شاعری کا شوق یہ دہلی سے ساتھ لائے تھے اور سلیمان تخلص کرتے تھے آصف الدولہ کے عہد میں جب مصحفی لکھنؤ آئے تو ان ہی کے ہاں رہے اور انشا کے آنے تک ان کی اصلاح سخن کی خدمت انجام دیا کئے لیکن جب انشا و نے ادہر کا رخ کیا تو ان کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اس لئے کہ ایک تو یہ بوڑھے ہو چکے تھے دوسرے قدرتاً ان کے کلام میں وہ شوخی اور انداز میں وہ بانکپن نہ تھا جس میں انشا اور ان کا کلام ڈوبا ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ رنگین مزاج شہزادوں کو اوس چلبلے جوان کے مقابلہ میں اس خشک بڈھے کا کلام کیا خاک پسند آتا نتیجہ یہ ہوا کہ سلیمان شکوہ کا منصب استادی انشا نے مصحفی سے چھین لیا اور ان کی تنخواہ پچیس سے صرف پانچ رہ گئی۔ یہ بات مصحفی کو بہت ناگوار گزری اور باہم چوٹیں ہونے لگیں۔ شہزادوں نے مشغلہ بیکاری سمجھ کر اس پر اور ہیزم کشی کی پھر تو انشا اور مصحفی کے طرفداروں کی دو

جماعتیں بن گئیں اور سارے شہر میں وہ دھما چوکڑی مچی اور شاعری کی ایسی مٹی خراب ہوئی کہ بقول آزاد "شائستگی نے کبھی آنکھیں بند کر لیں اور کبھی کانوں میں انگلیاں دے لیں" مگر انشا زیادہ عرصے تک مرزا سلیمان شکوہ کے توسل پر قانع نہیں رہے اور ان کی طبع رسا نے سعادت علی خاں کے سے خشک مزاج فرماں روا کے پاس بھی رسائی پیدا کر ہی لی۔ علامہ تفضل حسین خان جو نواب سعادت علی خان کے دست راست تھے اس تعارف کا ذریعہ بنے اور چند ہی روز میں انشا نے نواب کے مزاج میں ایسا درخور پیدا کر لیا کہ خود خان علامہ کو ان کے اس تقرب پر رشک آنے لگا۔ دربار کے اثرات اور ماحول کا رنگ بڑے سے بڑے شاعر کو کس قدر ذلیل اور اس کے فطری جوہر کو کس طرح برباد کر سکتا ہے اس کی بہترین مثال سید انشا کی ذات اور ان کا کلام ہے۔

انشا کے خاندانی حالات کا ذکر کرتے ہوئے آزاد لکھتے ہیں کہ "ان کے خاندان کی خوبیوں اور گھر کے چال چلن کو دلی اور لکھنؤ کے شرفا سب مانتے تھے ادنیٰ نمونہ یہ ہے کہ ان کے ہاں عورتوں کی پوشاک گھر میں دھوتے تھے یا جلا دیتے تھے۔ دھوبی کو نہ دیتے تھے کہ نامحرم کے ہاتھ میں عورتوں کا لباس نہ جائے۔"

لیکن ان ہی انشا کے خاندان کی چند سال کے درباری تعلق سے یہ حالت ہوگئی کہ تاریخ اودھ کا مصنف ان کی صاحبزادی کے متعلق بعض ناقابل ذکر باتیں لکھتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ (صفحہ ۱ جلد چہارم تاریخ اودھ مصنفہ نجم الغنی رامپوری)

یہی حال انشا کے فضل و کمال کا ہوا۔ اگر آپ ان کی "دریائے لطافت" پڑھیں اور اس کے بعد ان کا کلام دیکھیں تو حیرت ہوگی کہ ایسی ہمہ گیر قابلیت کا مصنف اور رابطہ دار الکلام استاد آیندہ نسلوں کے لئے شاعری کی جو میراث چھوڑتا ہے اس کا عام رنگ کس قدر پست ہے۔

مولوی محمد حسین آزاد انشا کے کلام پر تنقید کرتے ہوئے کیا خوب فرماتے ہیں۔

"لوگ کہتے ہیں کہ سید انشا کا کلام رندانہ ہے اور جو اس منزل میں بہرا ہے نہ بقدر نمک ہے بلکہ غذا کی مقدار سے بڑھی ہوئی ہے یہ بات بھی درست ہے مگر اس کا سبب یہ ہے

کہ وقت حاکم جابر ہے اور پسند عام اس کا واضع قانون ہے۔ اوس وقت شاہ و امراسے لے کر گدا و غربا تک ان ہی باتوں سے خوش ہوتے تھے اور قدر دانی یہ کہ ادنٰی ادنٰی نظموں پر وہ کچھ دیتے تھے جو آج کل کے مصنفوں کی کتابوں پر نصیب نہیں ہوتا۔ سید انشا اگر یہ نہ کرتے تو کیا کرتے۔ پیٹ کو کاٹ کر کہاں پھینک دیتے .... یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے ان رستوں میں قدم کیوں رکھا جو ایسے کیچڑ میں والن آلودہ ہوئے لیکن شہرستان تجارب کی سیر کرنے والے جانتے ہیں کہ جب رواج عام کا راجہ ہولی کھیلتا ہے تو بڑے بڑے معقول وضعدار اشخاص اوس کی چھینٹیں فخر سمجھ کر سر و دستار پر لیتے ہیں۔ بس وہ اور اون کے معاصر ملک چھوڑ کر کہاں نکل جاتے یہیں رہنا تھا اور ان ہی لوگوں سے لے کر گذران کرنی تھی۔ ان ہی چاہیتے چاہنے والوں کی فرمائشیں ہوتی تھیں جو نہ دھری جاتی تھیں نہ اُٹھائی جاتی تھیں اور وہ کچھ وہ چھوٹے لوگ نہ تھے کہ سمجھانے سے سمجھ جائیں یا ٹالے سے ٹل جائیں۔ کبھی شاہ عالم بادشاہ دہلی تھے۔ کبھی مرزا سلیمان شکوہ تھے کبھی سعادت علی خاں والی اودھ۔ چنانچہ اکثر غزلیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی عالم میں سعادت علی خاں کی زبان سے ایک مصرع نکل گیا۔ اس کی غزل کا پورا کرنا ان کا کام تھا۔ ایک دفعہ کسی شخص کی پگڑی بے ڈھنگی بندھی تھی۔ سعادت علی خاں نے کہا۔ ع "پگڑی تو نہیں ہے یہ فرانسیس کی ٹوپی" تمام غزل دیکھو ان کی غزلوں میں۔ سعادت علی خاں نواڑے میں لیٹے ہوئے۔ میر انشاء اللہ خاں کی گود میں سر دھرا ہوا۔ سرور کے عالم میں دریا کی سیر کرتے چلے جاتے تھے۔ لب دریا ایک حویلی پر لکھا دیکھا۔ "حویلی علی نقی خان بہادر کی" کہا کہ "انشا دیکھو۔ کسی نے تاریخ کہی مگر نظم نہ کر سکا۔ بھئی تم نے دیکھا۔ بہت خوب مادہ ہے۔ اسے رباعی کر دو۔" اسی وقت عرض کی۔

نہ عربی نہ فارسی نہ ترکی | نہ سم کی نہ تال کی نہ سُر کی
یہ تاریخ کہی ہے کسی لڑکی | حویلی علی نقی خان بہادر کی

تائید اس کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ جب شاہ نصیر دہلوی لکھنؤ میں گئے اور نہیں ہائے سنگلاخ میں گلزار لگا کر مشاعروں کو رونق دی تو سید انشا سے بھی ملے....... اور کہا کہ "دھیمی

میر انشاء اللہ خاں میں فقط تمہارے خیال سے یہاں آیا ہوں ورنہ لکھنؤ میں میرا کون بیٹھا تھا جس کے
اس وقت رات زیادہ گئی تھی۔ میر انشاء اللہ خاں نے کہا کہ " شاہ صاحب یہاں
کا عالم کچھ اور ہے کیا کہوں لوگ جانتے ہیں کہ میں شاعری کر کے نوکری بجا لاتا ہوں مگر میں خود نہیں
کہ کیا کر رہا ہوں دیکھیے صبح کا گیا گیا شام کو آیا تھا۔ کمر کھول رہا تھا جو چوبدار آیا کہ جناب عالی پھر یاد
میں گیا تو دیکھتا کیا ہوں کہ کوٹھے پر فرش ہے چاندنی رات ہے۔ پیچھے دار چھپر کھٹ میں آپ
ہیں پھولوں کا گہنا سامنے دھرا ہے۔ ایک گھڑا ہاتھ میں ہے۔ ادھر سے اچھالتے ہیں ادھر پاؤں
سے چھپر کھٹ آگے بڑھتا جاتا ہے۔ میں نے سلام کیا۔ حکم ہوا کہ " انشا کوئی شعر تو پڑھو" اب فرما
حالت میں کہ اپنا ہی قافیہ تنگ ہو شعر کیا خاک یاد آئے۔ خیر اس وقت یہی سمجھ میں آیا وہیں کہہ کر پڑھ

لگا چھپر کھٹ میں چار پہیے اچھالا تو نے ہوے کے گھڑا

تو موج دریا سے چاندنی میں وہ ایسا چلتا ہے جیسے بجرا

یہی مطلع سن کر خوش ہو گئے .... غرض اس معاملہ میں بے تاب کا قول لکھ رکھنے
قابل ہے کہ " سید انشا کے فضل و کمال کو شاعری نے کھویا۔ اور شاعری کو سعادت علی خاں
مصاحبت نے ڈبویا" [1]

اس دور کے باقی شعرا بھی کسی طرح اپنے ان ہمعصروں سے پیچھے نہ رہے اور مذاق عام کا پو
دیا۔ چنانچہ ان کے کلام سے بھی دربار اور ماحول کا رنگ بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔

سعادت یار خاں رنگین اگرچہ اصل میں دہلی کے باشندے تھے اور بسلسلہ تجارت لکھنؤ آ
تھے لیکن وہ اتنے بار لکھنؤ آئے اور ان کی عمر کا اتنا بڑا حصہ یہاں کٹا کہ انھیں لکھنوی شعرا میں شمار کر
بیجا نہ ہوگا۔ انشا کی ان سے خوب گاڑھی چھنتی تھی اور یہ مرزا سلیمان شکوہ کی بساط سخن کے بڑے
مہروں میں شمار ہوتے تھے اس لحاظ سے ان کا کلام اس زمانہ کے لکھنوی مذاق کا بہترین مرقع کہا جا
ہے۔ ان کا نام اردو زبان کی شاعری میں اس نئی طرز سخن کی بدولت زندہ ہے جو انھوں نے ریختہ
جواب میں " ریختی " کی ایجاد کی تھی۔ اور جو اس زمانہ میں بہت مقبول ہوئی اس طرز کا مقصد

[1] ۔ آب حیات صفحہ (۲۶۴)

کہ ٹھیٹھ عورتوں کی زبان میں عریاں او فحش خیالات ادا کئے جائیں جو خواہ صنف نازک کے حسیات لطیف کی صحیح ترجمانی نہ کریں لیکن اس عہد کی ہوس پرستی اور بگڑے مذاق کے لئے سرمایہ تسلی بن گئیں عورتوں کی زبان سے ان کے جذبات و احساسات ادا کرنے کا خیال فی الواقع نہایت پسندیدہ تھا اور اگر اس میں شائستگی اور حسن مذاق سے کام لیا جاتا تو غزل کی صنف میں ایک بڑے لطیف و دلکش عنصر کا اضافہ ہو جاتا کیونکہ اردو شاعری اب تک نسائی جذبات کی ان پاکیزہ اور پوشیدہ گہرائیوں سے بالکل ناآشنا ہے جس کی مثالیں ہندی شاعری میں بکثرت پائی جاتی ہیں لیکن رنگین اور ان کے ہم عصر شاعروں کا ریختی کی ایجاد سے یہ منشا ہی نہ تھا بلکہ ریختی پیدا ہوئی تھی درحقیقت اس فحاشی اور نسوانیت کی جس میں اس عہد کا لکھنؤ محسوس طور پر مبتلا ہو ناشروع ہو گیا تھا اور جس نے آگے چل کر سب اردو شاعری کے نام سے وہ مضحکہ خیز اور شرمناک صورتیں اختیار کیں جن کا ذکر اپنے اپنے موقع پر کیا جائے گا ۔ مولانا شرر اس زمانہ کی اخلاقی حالت کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ :

" لکھنؤ میں شجاع الدولہ کے زمانہ میں رنڈیوں سے تعلقات پیدا کرنے کی جو بنیاد پڑی تو روز بروز بڑھتی ہی گئی ۔ امیروں کی وضع میں داخل ہو گیا کہ اپنا شوق پورا کرنے یا اپنی شان دکھلانے کے لئے کسی نہ کسی بازاری حسن فروش سے ضرور تعلق رکھتے تھے ۔ حکیم مہدی سا قابل و ہوشیار اور مہذب و شائستہ شخص جو وزیر اعظم کے رتبہ تک پہنچ گیا تھا اس کی ترقی کی بنیاد پیارو نام ایک رنڈی سے پڑی ...... ان بے اعتدالیوں کا ایک ادنیٰ کرشمہ یہ تھا کہ لکھنؤ میں مشہور تھا کہ جب تک انسان کو رنڈیوں کی صحبت نہ نصیب ہو آدمی نہیں بنتا ۔

آخر لوگوں کی اخلاقی حالت بگڑ گئی اور ہمارے زمانہ تک لکھنؤ میں بعض ایسی رنڈیاں موجود تھیں جن کے گھر میں علانیہ اور بے باکی سے چلا جانا اور ان کی صحبت میں رہنا معیوب نہ سمجھا جاتا تھا ۔"[۱]

اس دور کی شاعری پر تنقید کرتے ہوئے ریختی کے متعلق مولوی محمد حسین آزاد فرماتے ہیں کہ :—

" اس دور میں میاں رنگین سب سے نئے گلدستے بنا کر لائے اور اہل جلسہ کے سامنے سجائے یعنی ریختہ میں ریختی نکالی ۔ ہم ضرور کہتے کہ ہندوستان کی عاشقانہ شاعری نے اپنی اصل پر رجوع کی ۔

[۱] ۔ مشرقی تمدن کا آخری نمونہ صفحہ ( )

لیکن چونکہ پہلے کلام کی بنیاد اصل پر تھی اور اس کی بنیاد نقط یاروں کے ہنسنے ہنسانے پر ہے اس لئے سوائے تمسخر کے اور کچھ نہیں کہہ سکتے ۔ بلکہ اگر لکھنو کے قیصر باغ اور وہاں کے معاملات کی تحریری دیوان رنگین اور دیوان انشا کو کہیں تو کچھ بدگمانی یا تہمت میں داخل نہیں اگرچہ اصل ایجاد میاں رنگین کا ہے مگر سید انشا نے بھی ان سے کچھ زیادہ ہی گھڑ کر دکھایا ہے ۔ ؎۱

(۸) غازی الدین حیدر (۱۸۱۴ء - ۱۸۲۷ء) و نصیر الدین حیدر کا عہد (۱۸۲۷ء - ۱۸۳۷ء)

آتش و ناسخ کا دور ۔

سعادت علی خاں کے عہد تک فرماں روایان اودھ نواب وزیر کہلاتے تھے ۔ اور برائے نام شاہان دہلی کے نائب سمجھے جاتے تھے ۔ جس وقت غازی الدین حیدر اودھ میں تخت نشین ہوئے تو دہلی میں شاہ عالم کے بیٹے اکبر شاہ ثانی حکمران تھے ۔ ان کی مارکوئیس آف ولزلی سے جو اس زمانہ میں ہندوستان کے وائسرائے تھے ۔ کچھ ان بن ہوگئی ایک تو یوں ہی انگریزوں کی یہ پالیسی تھی کہ جہاں تک ہوسکے دربار دہلی کا اعزاز و اثر گھٹایا جائے اور اس پر جو یہ ذاتی مخالفت ہوئی تو وائسرائے نے غازی الدین حیدر کو "بادشاہ" کا لقب اختیار کرنے اور اپنی سلطنت کا علحدہ سکہ چلانے کا مشورہ دیا بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بورڈ آف ڈائرکٹرس سے اس کی منظوری بھی منگوا دی ۔

غازی الدین حیدر اس تجویز سے بہت خوش ہوئے ۔ کئی لاکھ روپے رزیڈنٹ وغیرہ کو اس کے صلے میں دیئے اور دو کروڑ کے صرفہ سے اپنے لئے تخت و تاج اور مرصع چتر تیار کرایا ۔ (۱۸۱۹ء) میں بڑے تزک و احتشام سے یہ رسم ادا ہوئی ۔ بے دریغ روپیہ صرف ہوا ۔ اب فرمانروایان اودھ بجائے نواب وزیر کے بادشاہ کہلانے لگے اور دربار دہلی کی برائے نام نیابت سے آزاد ہوکر خود مختاری کا اعلان کیا ۔

یہ خود مختاری اگرچہ سیاسی نقطہ نظر سے کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی ۔ کیوں کہ فرماں روایان اودھ بجز ایک نام کے اور کسی طرح شاہان دہلی کے ماتحت نہیں تھے لیکن اس سے اہل لکھنو کی

؎۱ ۔ آب حیات صفحہ (۲۱۴)

ذہنیت میں بہت بڑا انقلاب ہو گیا۔ اب تک لکھنؤ گو سیاسی اعتبار سے انگریزوں کے زیر اثر تھا۔ لیکن ذہنی اعتبار سے بالکلیہ دربار دہلی کا حلقہ بگوش تھا۔ دہلی میں عظیم الشان سلطنت اگرچہ اب باقی نہیں رہی تھی لیکن وہاں کی معاشرت۔ وہاں کا تمدن۔ وہاں کی زبان۔ وہاں کے رسم و رواج غرض وہاں کی ہر چیز اہل لکھنؤ کے لئے ایک نمونہ تھی۔ غازی الدین حیدر کے اعلان خود مختاری کے بعد پہلے پہل لکھنؤ کو یہ احساس ہوا کہ وہ اپنا ایک مستقل وجود رکھتا ہے اور اسے معاملات زندگی میں دوسروں کے اتباع کی کوئی ضرورت نہیں۔

اب قدرتاً یہاں کے لوگوں کو یہ خواہش ہوئی کہ اپنے امتیازی خصوصیات پیدا کئے جائیں اور جس طرح سیاسی اعتبار سے بادشاہ دہلی سے آزادی حاصل کر لی ہے۔ اسی طرح اور حیثیتوں سے بھی آزاد ہو جائیں چنانچہ لکھنؤ کی معاشرت۔ تمدن۔ زبان۔ لباس غرض ہر چیز بدلنی شروع ہو گئی۔ اور زندگی کے ہر شعبہ میں تقلید کی جگہ اجتہاد کا زور ہوا۔ دہلی کے ڈھیلے ڈھالے انگرکھے اور جامے کی جگہ اب چست چکن اور خوشنما شلوکے پہنے جانے لگے۔ ترکی ٹوپی کی جگہ چوگوشیہ ٹوپیاں۔ پنج گوشیہ اور مندیل سے بدل گئیں۔ بڑے بڑے گھیروں والے پائنچوں کے پائجامے کے بجائے ایک نئی قسم عرض کے پائنچوں کا پاجامہ ایجاد ہوا۔ سلیم شاہی جوتوں کے بجائے ایک نئی قسم کے جوتے بنے۔ حقوں کی شکل بدل گئی۔ ٹپاریوں کی جگہ پاندان۔ اور آفتابہ کی جگہ لوٹے رائج ہوئے۔ غرض معاشرتی تصرفات ہر چیز پر اثر کرنے لگی اور اہل لکھنؤ کو دہلی والوں کے مقابلہ میں اپنی ان ایجادوں پر فخر و ناز ہونے لگا۔ مرزا رجب علی بیگ سرور اپنی مشہور کتاب فسانہ عجائب میں (جو غازی الدین حیدر کے عہد میں ۱۲۴۰ھ میں لکھی گئی ہے) اس زمانہ کے لکھنؤ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ اس کے ہر لفظ سے تفاخر و تبختر کی بو آتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک دہلی کیا وہ سارے جہاں میں لکھنؤ کی رونق اور سج دھج کا کہیں جواب نہ پاتے تھے۔ اس میں انھوں نے اپنے عہد کے تمام ارباب ہنر اور ان کے کمالات کا ذکر کیا ہے حتیٰ کہ حلوائیوں، نان بائیوں، عطر فروشوں، تنبولیوں، نائیوں تک کا حال فخریہ انداز میں بیان کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ ایسے معمولی پیشہ وروں کو اتنی اہمیت دیں وہ بادشاہ، امرا کو کس طرح

چھوڑ سکتے تھے کیوں کہ اس زمانہ میں شعر کہنا بقول شرر وضعداری بن گیا تھا۔ لیکن اب تک لکھنؤ میں شعر وسخن کا بازار صرف شعرائے دہلی کے دم سے گرم تھا۔ اب اہل لکھنؤ نے چاہا کہ ان کے ملک کے اہل باکمالوں کی طرح شاعری بھی خاص وہیں کے ہوں چنانچہ آتش (المتوفی ۱۸۴۷ء) اور ناسخ (المتوفی ۱۸۳۸ء) نے اس کمی کو بھی پورا کر دیا اور شعرائے دہلی کے علی الرغم اپنا ایک علحدہ اسکول قایم کیا۔ لیکن اس سے یہہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ وہاں شاعری صرف ان ہی کی ذات تک محدود تھی نہیں بلکہ یہہ لکھنؤ کی زندگی کا ایک جزو لاینفک بن گئی۔ اور ہر کس و ناکس کے لئے لباس پہننے اور کھانا کھانے کی طرح شعر کہنا بھی ضروری ہو گیا۔

لوگ عام طور پر یہہ سمجھنے لگے کہ شاعر ہونے کے لئے فطری مناسبت اور شاعرانہ مذاق کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ جس طرح ہندوستان میں اور پیشے باپ سے بیٹے اور استاد سے شاگرد پر منتقل ہوتے رہتے ہیں اسی طرح شاعری بھی ایک پیشہ ہے جو صرف فنی نکات کے حاصل کر لینے سے خود بخود حاصل ہو جاتا ہے۔ انتہا یہ کہ جن لوگوں کو ان فنی نکات پر عبور حاصل کرنے کی فرصت نہ تھی ان کے لئے بھی شاعر کہلانا اور مشاعروں میں غزلیں پڑھنا ضروری ہو گیا تھا۔ جس کی کیفیت مولوی محمد حسین آزاد مصحفی کے ذکر میں اس طرح بیان کرتے ہیں :-

"سن رسیدہ لوگوں کی زبانی سنا گیا کہ دو تین تختیاں پاس دھری رہتی تھیں جب مشاعرہ قریب ہوتا تو ان پر اور مختلف کاغذوں پر طرح مشاعرہ پر شعر لکھنے شروع کرتے تھے اور برابر لکھے جاتے تھے لکھنؤ شہر تھا عین مشاعرہ کے دن لوگ آتے اور ۸ ر سے ایک روپیہ تک اور جہاں تک کسی کا شوق مدد کرتا وہ دیتا۔ یہہ اس میں سے ۹ - ۱۱ - ۲۱ شعر کی غزل نکال کر حوالہ کر دیتے اور ان کے نام کا مقطع کر دیتے تھے" [۱]

اس دور کی شاعری کو تباہ کرنے میں ان مشاعروں کی کثرت کو بھی بڑا دخل ہے۔ کیونکہ زیادہ تر غزلیں ان ہی مشاعروں کے لئے لکھی جاتیں جن میں چن چن کر سنگلاخ زمینیں رکھی جاتیں اور شعراء ان ہی میں اپنے اشہب قلم کی جولانیاں دکھانے پر مجبور ہوتے اس کا نتیجہ یہہ ہوا کہ شاعروں کی فکر سخن تمام تر الفاظ

[۱] آب حیات صفحہ (۱۹۳)

بگڑ ہوگئی اور مطالب جو اصل شاعری ہیں ایک ضمنی اور اضافی شے بن کر رہ گئے۔ مثلاً ایک شاعرہ کے لئے جو مصرعہ طرح دیا گیا تھا اس کا قافیہ تھا (ہزار) اور ردیف تھی (درخت) ناسخ نے (جو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ پہلوان بھی تھے) اس زمین میں جو غزل کہی اس کا ایک شعر یہ ہے۔

نو نے مکدر ہائے کیوں نہ کریں　　باغ عالم میں اخستنجا ر درخت

(۱) الغرض اس صورت حال کا اثر یہ ہوا کہ اس دور کی شاعری بالکل سپاٹ ہوکر رہ گئی۔ جیسے جس طرح ایک چمار چمڑا لے کر بیٹھتا ہے اور مقررہ سانچوں پر لگاکر ایک جوتی گانٹھ لیتا ہے یا ایک حلوائی مقررہ مقدار میں دودھ شکر گھی وغیرہ ملاکر مٹھائی بنا لیتا ہے اسی طرح اس دور کا شاعر چند مقررہ الفاظ محاورات ترکیبیں تشبیہیں لے کر بیٹھتا ہے اور ان ہی کو الٹ پھیر کر ایک ایسا شعر تیار کر دیتا ہے جو ہر طرح کی شاعرانہ لطافتوں سے معرا ہوتا ہے اس میں نہ تو درد و اثر پایا جاتا ہے نہ بلندی اور رفعت نہ شوخی و بانکپن کا پتہ ہوتا ہے نہ جدت و حسن کا مذاق۔

انشاء۔ رنگین اور جرأت کی شاعری خواہ کیسی ہی فحش و عریاں سہی لیکن اس زندگی کے آثار اور جذبات کے نشانات خواہ وہ گندے ہی کیوں نہ ہوں ملتے ہیں۔ اس کے برخلاف آتش و ناسخ کے عہد کی شاعری اس قدر بے کیف بے مزہ پھیکی اور مردہ ہے کہ میرے خیال میں اس پر شاعری کا پورا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ مثال کے لئے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

ناسخ

دے دو پٹہ تو اپنا ململ کا　　ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا

شکم صاف کے قریب ہے لمر　　یا ہے مخمل پہ خواب مخمل کا

کیا کسی گل کی سواری ہے　　نکہت گل دھواں ہے مشعل کا

آتش رخ سے آنکھ سنکتے ہیں　　کیا نستاں میں کام منقل کا

لکھوں ناسخ جو وصف چشم سیاہ
ہو سیاہی بھی طور کا جل کا

آتش

نہ کہا یا مختصر کچھ بھی جو اپنے سے قناعت کے	پھنسے جو حلق میں میں وہ نوالہ کیا کرتا
منزل گہ رب مجھے اے آسماں دار کا ہے	مردم بیمار کو نقل مکان درکار ہے
رتبہ رکھتے ہیں ترے ابروئے خمدار بلند	طاق کعبہ سے ہیں یہ طاق خوش آثار بلند
اے جو رلپٹے سیب ذقن کا نہ حال پوچھ	جنت کا میوہ مغز سے ہے پوست تک لذیذ
تمہارے روبرو جھپکا رخ شمس و قمر دیکھا	وہ نان بے نمک پایا یہ شیر بے شکر دیکھا
اس طفل بد جبین نے جو رکھی کلاہ کج	پیر فلک نے پھینکدی دستار آفتاب
مصحف رخ کی تلاوت ہے نہایت مشکل	اس میں لے قاری زیر و زبر و پیش نہیں

ناسخ

ناک رگڑنے ہیں تیری بیوی کی نہ اس بنا پر	بدر منقش کے سلیمان کی ہے خاتم ناک میں
رنگ لالہ میں اگر ہے تو نہیں نام کو بو	یاسمن میں ترے بدن سے سی بو نگاہ نہیں

(۲) اس دور کی شاعری کی دوسری خصوصیت اسکی سخافت و ابتذال ہے اور سبب اس کا یہ ہے کہ شاہدان بازاری سے تعلقات کی وہ گرم بازاری جس کا ذکر گزشتہ دور میں ہو چکا ہے اس عہد میں اور ترقی کر گئی تھی۔

ایسے ہی ناگفتہ بہ حالات عہد غازی الدین کے بھی ہیں جب بادشاہوں کا یہ حال ہو تو عوام کا کیا پوچھنا غرض "الناس علیٰ دین ملوکہم" کے مصداق سارے شہر میں یہ وبا شدت سے پھیل گئی تھی اور اس کا لازمی اقتضا یہ تھا کہ اس کا پرتو اس دور کی شاعری پر پڑے چنانچہ آتش و ناسخ کے تمام دیوان اس ابتذال اور سوقیت کی مثالوں سے بھرے پڑے ہیں۔

(۳) تیسری خصوصیت اس دور کی شاعری کی نسوانی متعلقات کا ذکر اور انداز بیان کا زنانہ پن ہے اور اس کا سبب وہ نسوانیت ہے جو بتدریج اہل لکھنؤ میں سرایت کر رہی تھی اور جو آگے چل کر واجد علی شاہ کی ضرب المثل زنانہ مزاجی اور جان صاحب کی ریختی پر منتج ہوئی جو وہ اس وقت ہمارے

زیر بحث ہے اس کے نسائی میلانات کا اعتراف مولانا عبد الحلیم شرر ایک موقع پر ان الفاظ میں کرتے ہیں:-

"اور چونکہ اب سپہگری و جنگجوی کی بہت ہی کم ضرورت باقی تھی، عیش پرستی اور عورتوں کی صحبت بڑھتی جاتی تھی اس لئے مردوں پر عورتوں کی وضع کا اثر پڑنے لگا۔ جو اعتدال سے باہر ہو گیا اور جس قسم کی زینت اور آرائش عورتوں کے لئے موزوں ہے مردوں نے اپنی وضع اور لباس میں اختیار کرنا شروع کی۔ خصوصاً اس زمانہ سے جبکہ یہاں کے حکمرانوں نے اپنے لئے نواب کا لفظ چھوڑ کے بادشاہ کا لفظ اختیار کیا۔ نیشاپوری اور سالار جنگی خاندان کے لوگ جو معتد بہ وثیقہ اور پنشنیں پاتے تھے بالکل خانہ نشین کر دیئے گئے تو ان کو عورتوں کی صحبت کے سوا کسی کی صحبت ہی نصیب نہ ہوتی تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ ان کے وضع و لباس ہی میں زنانہ پن نہیں پیدا ہوا بلکہ ان کی زبان بھی عورتوں کی سی ہو گئی اور چونکہ وہی شہر کے رئیس اور وضعدار تصور کئے جاتے لہٰذا اکثر عوام نے بھی ان ہی کی پیروی شروع کر دی اور بخلاف دیگر مقامات کے رئیسوں کے یہاں لکھنؤ میں یہ عام وضع ہو گئی کہ سر پہ مانگ۔ اس پر سامنے کی کامدار ٹوپی کانوں تک۔ بال جن کی کنگھی کرنے میں ماتھے پر دونوں جانب پٹیاں جمائی جاتیں۔ منہ میں پان ہونٹوں پر لاکھا۔ پٹکے میں تین تین کمر توئیوں کا چست انگرکھا کہ نیچے گلبدن کا پیٹی کھینچا ہوا گھٹنا۔ ہاتھوں میں مہندی پاؤں میں ماٹ بانی بینے کا مدار بوٹ۔ جاڑوں میں انگرکھے کی جگہ نیلے زرد یا سبز و سرخ اطلس یا گرنٹ کا روئی کا ڈگلا۔"

پس یہ اسی روز افزوں نسوانیت کا اثر تھا کہ لکھنوی شعرا کے کلام میں نسوانی متعلقات کا ذکر بکثرت آنے لگا یہاں تک کہ یہ اس دور کی ایک نمایاں خصوصیت بن گئی۔ ورنہ متقدمین کے کلام میں محرم، انگیا دوپٹہ۔ کرتی۔ آرسی۔ مسی وغیرہ کا ذکر شاذ ہی کہیں ہو تو ہو۔ اس کے برخلاف آتش و ناسخ اور ان کے تلامذہ کے ہاں جا بجا ایسی مثالیں ملتی ہیں جن میں نہایت رکیک اور عامیانہ طریقہ پر یہ نسوانی متعلقات بیان کئے گئے ہیں۔

(۴) اس دور کی چوتھی خصوصیت اس کی زبان ہے۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ یہ عہد ایجاد و تنقر کا تھا۔ اور اس کی وجہ اودھ کے دربار میں ایک برائے نام تبدیلی تھی۔ شاعری کے میدان میں تصرف کا

یہ سارا زور زبان پر صرف ہوگیا۔ چنانچہ جس تحریک اصلاح نے "انگرکھے" کو "چپکن"، "چوگوشیا" کو "مندیل"، "آفتابہ" کو "لوٹے" اور "پٹاریوں" کو "پاندان" کی صورت میں تبدیل کر دیا تھا انھیں اثرات نے "دنپٹ" کو "بہت" سے "نپٹ" کو "الگ" سے "آگو" کو "آگے" سے اور "لاگا" کو "لگا" سے بدل دیا۔

ان تصرفات زبان کی فہرست اتنی طویل ہے کہ یہ بجائے خود ایک مستقل عنوان ہو سکتا ہے لیکن ہمیں یہاں ان تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں صرف اتنا بتا دینا ہے کہ تصرف زبان کی اس تحریک نے پہلے پہل اردو شاعری کی زبان کو بڑا فائدہ پہنچایا اور بہت سے ثقیل اور مکروہ الفاظ کو سبک اور شیریں سے بدل دیا۔ مثال کے لئے آپ میر و سودا یا انشا و مصحفی کے کسی شعر کا ناسخ و آتش کے کسی شعر سے مقابلہ کریں تو زبان کی صفائی کا یہ فرق بخوبی ظاہر ہو جائے گا لیکن اہل لکھنؤ کا یہ جذبہ اصلاح و تصرف بڑھتے بڑھتے جنون کی حد تک پہنچ گیا اور نفاست و نزاکت کا خبط ہر شعبۂ زندگی میں وبال جان ثابت ہونے لگا۔ مثلاً دہلی کی چوگوشیا ٹوپی بجائے خود بھدی تھی لکھنؤ میں آکر پہلے گول قبہ نما ٹوپی ہوئی پھر پنج گوشیا ہوئی پھر مندیل ہوئی چپ زردوزی ہوئی اور اس کی ساخت اور وضع میں اتنے تکلفات و اہتمامات ہونے لگے اور اس کے بنانے قالب پر چڑھانے کشیدہ کرنے چننے اور سر پر رکھنے کے ایسے پیچیدہ قاعدے مقرر ہوئے کہ وہ ٹوپی نہ ہوئی بلائے جان ہوئی۔ یہی حال شاعری کی زبان کا ہوا۔ تصرف زبان کی یہ تحریک ابتدا میں صرف اس حد تک تھی کہ شعرائے دہلی کے کلام میں ہندی کے جو بیہودہ بھدے، اور ناملائم الفاظ ہوں وہ عربی اور فارسی کے شیریں۔ عام فہم اور خوش آیند الفاظ سے بدل دیئے جائیں لیکن آخر کار اس مقصد میں اتنا غلو ہوا کہ شاعری صرف الفاظ کا ایک گورکھ دھندا بن کر رہ گئی اور ہندی کے عام و سادہ الفاظ بھی عربی و فارسی کے مغلق الفاظ سے بدلنے لگے۔ صرف یہی نہیں بلکہ شاعری عبارت ہوگئی، صنائع بدائع سے۔ الفاظ کی موشگافیوں کا نام نازک خیالی رکھا گیا اور رعایت لفظی شعر کا جزو لاینفک قرار پائی اس رعایت لفظی کا خیال بڑھتے بڑھتے دور ما بعد میں جنون کی حد تک پہنچ گیا۔ جس پر معانی اور مطالب سب قربان کر دیئے گئے اس کی مثالیں ہم آیندہ دور میں پیش کریں گے۔ لیکن یہاں اتنا واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس کی ابتدا آتش و ناسخ ہی سے ہوئی جس کا

نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا کلام سوز و گداز اور کیف و اثر سے معرا ہوگیا اور اس دور کی شاعری ایسی بے لطف اور جامد ہوگئی جیسے کہ الگزنڈر پوپ کے عہد میں انگلستان کی شاعری ہوگئی تھی۔

(۹) محمد علی شاہ کا عہد (۱۸۳۷ء - ۱۸۴۲ء)

تلامذہ آتش و ناسخ کا دور۔

غازی حیدر نے سعادت علی خاں کا جمع کیا ہوا سرمایہ گو کہ نہایت بیدردی سے اڑایا پھر بھی اسے ختم نہ کرسکے اور مرتے وقت چھ کروڑ خزانہ میں چھوڑ گئے جسے ان کے جانشین نصیر الدین حیدر نے ختم کیا اس طرح جب محمد علی شاہ نے زمام حکومت ہاتھ میں لی تو خزانہ شاہی میں جھاڑو پھری ہوئی تھی۔ ہر طرف عیش پرستی اور بیکاری کا دور دورہ تھا نسوانیت غالب ہو رہی تھی ہمت و جرأت رخصت ہوچکی تھی اور ریاست کا نظم و نسق اس قدر بگڑ چکا تھا کہ سلطنت چند روز کی مہمان معلوم ہوتی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ اسی بدنظمی نے محمد علی شاہ کو تخت دلایا۔ ورنہ نصیر الدین حیدر کی اولاد موجود تھی اور اس کے ہوتے محمد علی شاہ کو جو سعادت علی خاں کے بیٹے یعنی نصیر الدین حیدر کے چچا ہوتے تھے تخت سلطنت پر کوئی دعوی نہ پہنچتا تھا لیکن چونکہ نصیر الدین حیدر کے بیٹے مرزا مہدی عرف منا جان نااہل ہونے کے ساتھ نوجوان بھی تھے اس لئے انگریزوں نے ان کا تخت نشین ہونا پسند نہیں کیا اور سمجھے کہ جس طرح ان کے پیشرو عالم شباب کی وجہ سے لہو و لعب میں پھنس گئے تھے یہ بھی انھیں کے نقش قدم پر چلیں گے۔ اس کے برخلاف محمد علی شاہ کہن سال تجربہ کار اور نہایت بیدار مغز تھے اس لئے وہی بادشاہ بنائے گئے اور فی الواقع انھوں نے اپنے آپ کو اس کا اہل بھی ثابت کیا۔ ان کے باقی ماندہ ایام زندگی سلطنت کی فلاح و بہبود کی فکروں میں کٹے اور انہیں کے حسن انتظام کی بدولت سلطنت دو پشتوں تک قائم رہی ورنہ اسی زمانہ میں ختم ہو جاتی۔ سب سے پہلے انھوں نے اون فضول خرچیوں اور عیش پرستیوں کا سد باب کیا جس میں ان کے پیشرو مبتلا تھے جو نااہل اور خود غرض عہدہ دار سلطنت کو نقصان پہنچا رہے تھے سب الگ کئے گئے جن جن کے ذمے سابقہ مطالبات ثابت ہوئے اون سے ان رقوم کی بازیابی کرائی گئی اس طرح کئی کروڑ روپیہ

جو سابقہ عمال نے ہضم کیا تھا خزانہ میں جمع ہوا۔ فوجی اور سول ملازمین کی تنخواہیں جو برسوں سے چڑھی ہوئی نہیں ادا کی گئیں۔ روشن الدولہ جو اس وقت وزیر اعظم تھے اپنی بددیانتی اور نااہلی کے سبب برطرف ہوئے اور ان کی جگہ شرف الدولہ عہدہ وزارت پر مامور کئے گئے اس حسن انتخاب نے محمد علی شاہ کے حسن تدبیر کے ساتھ مل کر سونے پر سہاگے کا کام کیا اور ریاست کی سالانہ آمدنی ڈیڑھ کروڑ تک پہنچ گئی جو نہ اوس سے قبل کبھی ہوئی تھی اور نہ اوس کے بعد کبھی ہوئی۔ تمام ارباب نشاط اور خواصین جو دربار کا جزو لاینفک بن گئی تھیں یک قلم موقوف ہوئیں اور سینکڑوں غیر ضروری کارخانے تخفیف کر دیئے گئے۔

غرض ریاست کا نظم و نسق جو بالکل درہم برہم ہو چکا تھا از سر نو درست کیا گیا اور اس ڈوبتی ناؤ کو بچانے کی ممکنہ کوشش کی گئی لیکن بگڑی ہوئی سلطنت کا بنانا اور راسخ عادتوں کا بدلنا کوئی آسان کام نہیں اسی لئے محمد علی شاہ کے عہد میں لکھنؤ کی زندگی کا ہر شعبہ ایک کشمکش میں پھنسا ہوا تھا اور دربار و عوام پر دو متضاد اثرات کارفرما تھے۔ ایک طرف گذشتہ عیش و عشرت بے فکری و بیکاری تن آسانی و لہو و لعب لوگوں کے خمیر میں داخل ہو چکے تھے تو دوسری طرف برسر اقتدار حکومت ان کو محنت و مشقت کا عادی بنانا اور علوم و فنون کا شوق دلانا چاہتی تھی یہہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ آج سے ایک صدی قبل جبکہ ہندوستان کے والیان ریاست علوم جدیدہ کے نام سے بھی واقف نہ تھے۔ محمد علی شاہ نے اوسی لکھنؤ میں جہاں ان کے پیشرو عمر بھر زلف و کمر اور گل و بلبل کے راگ الاپا کئے ایسے مفید و کارآمد علوم و فنون کا سلسلہ قائم کیا تھا جو اگر زمانہ کی دست برد سے بچ جاتا تو آج اس بادشاہ کو علمی دنیا میں بقائے دوام کی خلعت بخشتا۔ "بزم سحر" کے نام سے ایک کتاب خود میری نظر سے گذری جو ۱۸۴۲ء میں بمقام لکھنؤ چھپی تھی اور جو سائنس کی ایک انگریزی کتاب سے ترجمہ کی گئی تھی جس کا نام تھا۔

A treatise on The objects, Advantages and pleasure of Science.

اس کتاب کے مترجم میر الحسنی نام کوئی صاحب دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ یہہ ترجمہ اوس علمی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جو محمد علی شاہ کے حکم سے قائم ہوا تھا۔

غرض محمد علی شاہ کی اس روشن خیالی سے دربار اودھ کے قدیم روایات اور طرز عمل کو جو صدمہ

پہنچا اور سلطنت کے مختلف شعبوں میں جو روعمل پیدا ہوگیا اوس سے وہاں کے شعر وسخن کا میدان بھی نہ بچ سکا اور ایک ہی زمانہ میں شاعری کے دو ایسے دور قائم ہوئے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف بلکہ متضاد تھے۔ ایک محمد علی شاہ کے پیشروؤں کی عیش پسندی و تن آسانی نمائش و تکلف لہو و لعب اور فسق و فجور کا ثمرہ تھا تو دوسرا ان کے اور ان کے جانشین امجد علی شاہ کی سادہ معاشرت، مذہبی تقدس اور علمی قدر دانی کا نتیجہ لکھنؤ کی شاعری کے اس مبارک دور کے لئے اگرچہ محمد علی شاہ ہی کے عہد میں زمین ہموار کی گئی اور تخم ریزی بھی اسی عہد میں ہوئی لیکن اس کے ثمرات زیادہ تر امجد علی شاہ کے زمانہ میں ظاہر ہوئے اور اوس کے نشو و نما میں بھی ان کا بہت بڑا حصہ رہا اس لئے ہم اس کا تفصیلی ذکر ان ہی کے عہد میں کریں گے۔ یہاں ایک سرسری نظر ادس اول الذکر دور پر ڈالتے ہیں جو تلامیذ آتش و ناسخ کا دور کہلاتا ہے اس دور کو اگرچہ شاہی سرپرستی بالکل حاصل نہیں ہوئی لیکن اس کے باوجود اس میں شاعروں کی ایسی کثرت تھی کہ ان کا حصر و شمار ممکن نہیں کیوں کہ گذشتہ مسند نشینوں کے زہریلے اثرات سے مذاق عام اس قدر بگڑ چکا تھا کہ اون کی بدولت سب یہ شعرا حکومت کی اعانت سے بے نیاز ہوگئے تھے۔ ان میں بعض آتش کے شاگرد تھے اور بعض ناسخ کے اور اس لحاظ سے ان دونوں کے دو علحدہ اسکول قائم ہوگئے تھے لیکن اس برائے نام اختلاف کے باوجود ان کی شاعری اپنی خصوصیات کے لحاظ سے بالکل ایک سی ہے جیسے ان کے اساتذہ کی صدائے بازگشت کہنا بیجا نہ ہوگا۔ اس میں وہی گذشتہ دور کے سے سوقیانہ خیالات۔ بے کیف مضامین، نسوانی متعلقات کا ذکر اور رنگین ماحول کا اثر صاف نمایاں ہے اور یہ اثر اس عہد کے تمام شعرا میں اس قدر مشترک ہے کہ ان کی انفرادی خصوصیات اگر کچھ ہیں بھی تو اس عام رنگ میں بالکل دب گئے ہیں۔ البتہ دو خصوصیتیں اس عہد کی مابہ الامتیاز ہیں۔ ایک زبان کی سلاست دوسرے صنائع لفظی کا التزام۔ زبان کی سلاست کو اوس رجحان کا ردعمل کہنا چاہیئے جو آتش و ناسخ کو عربی اور فارسی عنصر کی طرف ہوگیا تھا۔ یہ زبان اپنی صفائی و سلاست کے لحاظ سے اس عہد کے بڑے کارنامے میں شمار ہونے کے لایق ہے جو اس کے بعد سے آج تک لکھنوی شاعری کا طغرائے امتیاز بنی رہی۔

لیکن صنائع لفظی خصوصاً مراعاۃ النظیر کے التزام نے زبان کی ساری خوبیوں پر پانی پھیر دیا اور اس کے لطف و روانی کو خاک میں ملا دیا۔ اس دور میں رعایت لفظی کا التزام لطف و چاشنی کی حد سے گذر کے خبط و جنون کے درجہ پر پہنچ گیا تھا جس کی قربان گاہ پر مطالب و معانی سب شہید کر دیئے گئے اور شاعری کو ایک مقفیٰ ضلع جگت بنا کر رکھدیا اس رعایت لفظی کی مثالیں اگرچہ آتش و ناسخ کے ہاں بھی ملتی ہیں لیکن اس قدر نہیں جتنی کہ اس دور میں۔ اس دور کے شعرا کے نزدیک تو شاعری گویا عبارت تھی اسی رعایت لفظی سے۔

اگرچہ امانت لکھنوی اس بارے میں بہت بدنام ہے لیکن تحقیق کی جائے تو اس دور کا ہر شاعر کم و بیش اس مرض میں مبتلا نظر آئے گا۔

رند (۱۷۹۷ء - ۱۸۵۷ء) وزیر (المتوفی ۱۸۵۴ء) صبا (۱۷۶۳ء - ۱۸۵۴ء)۔
برق (المتوفی ۱۸۵۷ء) اسیر (۱۸۰۰ء - ۱۸۸۱ء) امانت (۱۸۱۵ء - ۱۸۵۸ء)
خلیل (المتوفی ۱۸۶۱ء) بحر (۱۸۱۰ء - ۱۸۹۲ء) سحر (؟)
رشک (۱۷۹۹ء - ۱۸۶۷ء) جو اس عہد کے قابل ذکر شعرا ہیں ان سب کا کلام اس صنعت سے اس قدر معمور ہے اور ان کی ساری فکر سخن اسی ایک چیز پر اس طرح مرتکز ہو گئی ہے کہ ان کے کلام کا باہم امتیاز کرنا مشکل ہو گیا۔ مثال کے لئے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

رند:۔ ثابت ہوا جو کشتۂ چشم سیاہ یار / آہو مرے مزار کے سبزہ کو چر گئے
" روکر کہا جو میں نے کہ مرتا تمہاری جان / ہنسکر دیا جواب کہ پھر کیوں نہ مر گئے
" کوٹھے پہ جب چمک کے وہ زہرہ جبیں چڑھا / شمس و قمر نظر سے ہمارے اتر گئے
" میلہ تھا چاند گنج میں سورج گہن کا آج / تم کس لئے نہ غیرت شمس و قمر گئے
" سورج مکھی کے پھول کا عالم ہے آنکھ کا / یہ بھی تمہارے ساتھ پھرا تم جدھر گئے
خلیل:۔ کیا دکھاؤں دل پر داغ سیہ چشموں کو / سہم جائیں گے جو چیتے کو ہرن دیکھیں گے
" اپنی آنکھوں سے خط رخ کی حفاظت کیجئے / چر ہی جائیں گے جو سبزہ کو ہرن دیکھیں گے
وزیر:۔ رنگ کندن سا تمہارا ہے عجب کیا ہے اگر / طوطی سبزہ خط سونے کی چڑیا ہو جائے

وزیر۔ چومتا ہوں لب شیریں وہ خفا ہوتا ہے ÷ کیا شکر رنجی جاناں میں مزہ ہوتا ہے

" صورت ماہ نو آتا ہے جبینے پیچھے ÷ ابھی باتوں سے تو انگشت نما ہوتا ہے

" لگا مضمون ہاتھ اوس کان کے بالے کی مچھلی کا ÷ یہ ہم نے چشمۂ خورشید سے مچھلی نکالی ہے

" لڑائی جو لپٹ اوس جنگجو سے ہونے والی ہے ÷ کنارہ گلبدن کے پائجامے نے نکالا ہے

صبا۔ ملتا ہے گل رخوں سے وہ امروز کس لئے ÷ ہر پھول میں مٹھاس ہے زنبور کس لئے

" ای شہسوارا ن سوار ہو یہ نہ پوچھو لو ÷ اڑ جائے گا اک روز ہوا دار تمہارا

" بے تکلف اس سے ہو کر کیوں نہ ہو لپٹا نہ ہم ÷ توڑ کر پیرہن ہوتا ہے بہت بیاز و ش

" عمر بھر دل نہ مرا یار کے گھر سے اٹھا ÷ بیٹھا دیوار کے نیچے جو میں در سے اٹھا

بحر۔ اے بحر نہ ہے عارض محبوب کا یہ سہر ÷ شبہ نہ ہے جسے ان کا جلی یہ نگر سکا

" خوشبو میں کیا ہیں داغ محبت کے ابھی ÷ سر ہے کہ دوش پر ہے تو ارا گلاب کا

سحر۔ طائر روح کو دانہ پہ لگایا تو آتل ÷ دل پہ ہم نے تری نیند وتل کا چہرہ کھایا

" مسکراکر وصل میں جب نہ انت پیسے یار نے ÷ موج خندہ بن گئی زنجیر موتی چور کی

رشک مرغ دل کو توڑے گی بلی اگر دروازے کی ÷ رخنہ تن کو کترے گا چوہا تمہارا ناک کا

---

(۱۰) امجد علی شاہ کا عہد۔ (۱۸۴۲ء۔ ۱۸۴۷ء)

انیس و دبیر کا دور۔

جس طرح چنگیز و ہلاکو کے نام تاریخ عالم میں ظلم و ستم کے مترادف ہوگئے ہیں اسی طرح امجد علی شاہ کا نام تاریخ اودھ میں تعصب ملی کا مترادف ہوگیا ہے۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ سلاطین اودھ فرقہ امامیہ سے تعلق رکھتے تھے اور برہان الملک سے لیکر واجد علی شاہ تک تمام فرمانروا بلا کسی استثنا کے اسی مسلک کے پابند رہے۔ مگر ابتدا میں یہہ مذہبی اثر صرف سلاطین کی ذات تک محدود رہا۔ اور امور مملکت یا عامۃ الناس پر کسی طرح موثر نہیں ہوا لیکن رفتہ رفتہ اس نے ایک باقاعدہ تحریک کی صورت اختیار کرلی

جس سے اودھ کی سیاست، معاشرت، ادب اور شاعری پر گہرے اثرات مترتب ہوئے۔ ہم اوپر کہیں بیان کر چکے ہیں کہ اس کی ابتدا آصف الدولہ کے عہد سے ہوئی تھی جن کے اس مذہبی میلان نے شمال میں مرثیہ نگاری کی بنیاد ڈالی اور اوس عہد کے کئی شعرا نے اس صنف میں طبع آزمائی کی جن میں سودا، میر، ضاحک، میر حسن، اور مسکین قابل ذکر ہیں لیکن بجز ایک سودا کے ان میں سے اور کسی نے اس صنف میں خاص شہرت نہیں حاصل کی اور نہ ان کا کلام آج دستیاب ہوتا ہے۔

غرض یہ کہ شاہان اودھ کے شیعی میلانات کے جہاں یہ معاشرتی ثمرات ظاہر ہوئے۔ وہاں ادبی ثمرات خلیق و ضمیر کے سے مرثیہ گو پیدا ہوئے جنھوں نے اس صنف میں بہت کچھ اصلاح و ترمیم کی اور ان اصول و قواعد کی بنیاد ڈالی جن پر انیس و دبیر نے ایک عظیم الشان عمارت کھڑی کر دی۔ اس بارہ میں ضمیر بطور خاص قابل ذکر ہیں جنھوں نے مرثیہ میں حسب ذیل جدتیں کیں۔

(۱) رزمیہ لکھا۔ (۲) سراپا ایجاد کیا۔ (۳) گھوڑے تلوار اور اسلحہ جنگ کے الگ الگ ذکر لکھے (۴) واقعہ نگاری کی بنیاد ڈالی اور جزئی واقعات کو بہ تفصیل بیان کیا۔ (۵) کلام میں زور بندش اور چستی پیدا کی اور جو غلط الفاظ مرثیوں میں مستعمل تھے وہ ترک کر دیئے۔ پہلے مرثیہ سوز کے لہجے میں پڑھے جاتے تھے ضمیر نے تحت لفظ پڑھنے کی بنا ڈالی۔

نصیر الدین حیدر کے بعد جب محمد علی شاہ تخت نشین ہوئے تو انھوں نے اگرچہ اپنے پیشرووں کے بعض رسوم موقوف کر دیئے لیکن شیعی میلانات کا ظہور ان کے زمانہ میں بھی ہوتا رہا۔ چنانچہ انھوں نے عزاداری کے لئے وہ مشہور عمارت تیار کرائی جو حسین آباد کے نام سے اب تک لکھنؤ میں موجود ہے اس کے علاوہ انھوں نے اپنے عہد کے غزل گو شعرا کے علی الرغم مرثیہ گو شعرا کی سرپرستی کی جس کی بدولت اوس ذوق سخن کی نشو و نما ہوئی۔ جس نے انیس و دبیر کے مقابلہ میں وزیر و اسیر کا رنگ پھیکا کر دیا۔ محمد علی شاہ کی ڈالی ہوئی داغ بیل امجد علی شاہ کے عہد میں اور مستحکم ہو گئی۔

غرض شاہان اودھ کا یہ مذہبی تعصب اقلیم سخن میں ایک ایسی قلمرو کا اضافہ کر گیا جس پر نہ صرف دبستان لکھنؤ کا بلکہ پوری اردو شاعری جس قدر فخر و ناز کرے بجا ہے۔ اگر کسی کو سلاطین اودھ کی شیعیت کا ایک

مرئی اور بحر فانی مطلوب ہو تو وہ لکھنوی شاعری کے اس سدا بہار گلستان کی سیر کرے جو بظاہر صرف شعرا کی جگر کاویوں کا رہین منت معلوم ہوتا ہے لیکن در اصل شاہان اودھ کے دریائے کرم نے اس کی آبیاری میں اوس سے کم حصہ نہیں لیا تھا کہ انیس و دبیر کے خون جگر نے دیا تھا۔ "الناس علیٰ دین ملوکھم" کے مصداق اس شاہی میلان کی وجہ سے لکھنؤ میں شیعیت کا چرچا روز بروز بڑھتا گیا یہاں تک کہ مرثیے، مجلسیں، تعزیے، اور امام باڑے اہل لکھنؤ کی زندگی کا جزو لاینفک بن گئے۔

ان درباری اور معاشرتی حالات کا لازمی اقتضا یہ تھا کہ صنف مرثیہ گوئی روز افزوں ترقی کرتے کرتے اوج کمال پر پہنچ جائے اور دربار و عوام کا جوش قدر دانی۔ انیس (۱۸۰۲ء - ۱۸۷۴ء) و دبیر (۱۸۰۳ء - ۱۸۷۵ء) سے باکمال مرثیہ گو پیدا کرے۔

صنف مرثیہ کی اردو شاعری میں کیا خصوصیت ہے اور مرثیہ نگاروں میں انیس و دبیر کو کیوں اس قدر مقبولیت ہے۔ اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھی جاچکی ہیں یہاں ہمیں اس دور کی اہمیت واضح کرنے کیلئے صرف اس قدر بتانا ضروری ہے کہ مرثیہ کے فروغ سے پہلے اردو شاعری کا میدان اپنی غیر معمولی وسعتوں اور گوناگوں صلاحیتوں کے باوجود نہایت تنگ کردیا گیا تھا۔ غزل جھوٹی عاشقی، پامال مضامین، مقررہ تشبیہوں اور رسمی تلمیحوں کے لئے مخصوص ہوچکی تھی اور جو کوئی اس میں طبع آزمائی کرتا وہ اسی محدود دائرے میں اپنے اشہب قلم کی جولانیاں دکھانے پر مجبور تھا جس کی مثالیں گذشتہ اوراق میں بکثرت ہماری نظر سے گزر چکی ہیں۔

قصائد ایسے کذب و افترا کے لئے وقف ہوچکے تھے جس کے متعلق مولانا حالی فرماتے ہیں:-

مجسم ہو ان کا اگر جھوٹ سارا ؛ بنے ہند میں اس سے اور ایک ہمالہ
ہمالہ سے ہو جس کی چوٹی دو بالا

مثنوی جو بہترین اصناف سخن میں شمار ہونے کے لائق ہے اردو زبان میں ایسے تغافل کا شکار ہوئی کہ معدودے چند کے سوا پہلے تو کسی نے اس کی طرف توجہ ہی نہ کی اور جنھوں نے توجہ کی بھی انھوں نے اسے وہی حسن و عشق کے فرسودہ قصوں کا آلہ بنا دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایسی اہم صنف جس میں زندگی کے ہر شعبہ سے بحث کی جاسکتی تھی

اور وسیع سے وسیع مضامین نہایت خوبی کے ساتھ ادا کئے جا سکتے تھے۔ نہایت مہمل و بے سر و پا افسانوں کا مجموعہ بن کر رہ گئی۔

اردو زبان کی مشہور ترین مثنویاں جن کی فصاحت زبان اور سلاست بیان پر آج ہم سر دھنتے ہیں کیا ہیں۔ ایسے مہملات کا مجموعہ ہیں جن کے مضامین محض خلاف عقل و خلاف فطرت ہونے کے ساتھ ساتھ دیگر ایسے موضوع پر مشتمل ہیں جسے سنتے سنتے ہمارے کان بہرے ہو گئے اور جو گھن کی طرح ہمارے شجر اخلاق و جوانمردی کو کھائے جاتا ہے۔

ایسی مسموم و محدود فضا میں سانس لیتے لیتے اردو شاعری جاں بلب ہو گئی تھی اور کسی ایسے موضوع کی شدید ضرورت تھی جو اپنی گرمی اور رنگینی سے اس نیم جاں میں نئی روح پھونکے۔ یہ رنگینی خیال اور گرمئ جذبات اسے شہدائے کربلا کے خون سے حاصل ہوئی جس نے حسن و عشق کے پامال مضمون کے بجائے عزم و ثبات، صبر و رضا، ایثار و شہادت، اور صداقت و شجاعت کو مرثیہ کا موضوع بنا کر اردو شاعری کو بقائے دوام کا خلعت بخشا۔ اردو شاعری میں مرثیہ نگاری کو وہی رتبہ حاصل ہے جو دنیا کی اور شائستہ زبانوں میں رزمیہ شاعری (Epic) کو، اردو زبان میں رزمیہ شاعری کوئی علٰحدہ و مستقل وجود نہیں رکھتی بلکہ مرثیہ نگاری ہی میں رزمیہ شاعری کے تمام لوازم داخل ہو گئے ہیں۔ لیکن اس تعریف میں وہ مرثیے شامل نہیں جو شمال میں اردو شاعری کے آغاز سے تقریباً ایک صدی قبل قطب شاہی فرمانرواؤں کے دور سے دکن میں لکھے گئے تھے۔ یہ مرثیے دراصل ایک طرح کا بین تھے جن کا مقصد حصول ثواب کے لئے شہدائے کربلا کی یاد تازہ کرنا ہوتا تھا۔ اس کے بعد جب شمالی ہند اور اودھ کے اثر سے شمال میں مرثیہ کا رواج ہوا تو پہلے سودا اور ان کے بعد ضمیر نے اس میں کئی قابل لحاظ ترمیمیں کیں جن کا ذکر اوپر گذر چکا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان میں مرثیوں کو رزمیہ شاعری کا درجہ جن محترم ہستیوں کی بدولت حاصل ہوا وہ انیس و دبیر ہیں۔ انیس و دبیر کی انفرادی خصوصیات کا ذکر اور ان کا باہمی تقابل و توازن اگرچہ اردو شاعری کے نہایت اہم اور معرکۃ الآراء مباحث سے ہے لیکن ہمیں یہاں ان تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ مولانا شبلی نے موازنۂ انیس و دبیر میں

انیس کی جو فوقیت دبیر پر حاصل ہے اسے موجودہ اہل الرائے اور اصحاب تنقید پوری طرح تسلیم کرنے لگے ہیں لیکن اس کے باوجود دبیر نے صنف مرثیہ کی ترقی میں جو نمایاں حصہ لیا اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہی دو بلند مرتبہ ہستیاں ہیں جن کے سر مرثیوں کو درجۂ کمال پر پہونچانے کا سہرا ہے انھوں نے اپنے کلام میں جذبات انسانی کی نفسیاتی تحلیل کی، واقعات کی چلتی پھرتی تصویریں نگاہوں کے سامنے پیش کیں مناظر قدرت کے دلفریب نقشے بنا کر کھڑے کئے اخلاقی و روحانی تعلیم دی اور معرکہ کارزار کی ایسی جیتی جاگتی تصویریں صفحۂ قرطاس پر اتاریں جن کا جواب اردو شاعری میں کیا دنیا کی کسی اور زبان میں بھی کم ملے گا۔ پروفیسر گراہم بیلی نے اپنی تاریخ ادب اردو میں اردو مرثیہ نگاری پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس کو واقعہ کربلا سے مختص کر دینے کے باعث یہ میدان بہت محدود ہو گیا۔ بلاشبہ ان کا یہ اعتراض بڑی حد تک صحیح ہے لیکن اس سلسلہ میں دو امور قابل لحاظ ہیں پہلے تو یہ کہ اردو مرثیوں کا محور یعنی واقعہ کربلا تاریخ عالم کے ان عظیم الشان واقعات سے ہے جو تاریخی اعتبار سے بالکل صحیح ہی نہیں بلکہ اپنی خاص نوعیت کے لحاظ سے دنیا کے یادگار واقعات میں شمار ہونے کے لایق ہے کیونکہ اس میں اگر ایک طرف انسان اپنی فطرت کی بلند ترین سطح پر نظر آتا ہے تو دوسری طرف پستی کے اس انتہائی نقطہ تک پہنچ جاتا ہے جس کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ "کالانعام بل ھم اضل" پس اگر کسی قوم نے اپنی شاعری کی ایک خاص صنف کو ایسے عظیم الشان واقعہ کی تفصیلات و جزئیات کے لئے مختص کر لیا تو میرے خیال میں وہ چنداں قابل اعتراض نہیں کیوں کہ معرکۂ کربلا صرف حسینؑ و یزید کے درمیان کوئی جنگ نہیں بلکہ نیکی و بدی اور حق و باطل کے درمیان ایک جنگ تھی۔ اس لئے جو شاعر اس موضوع کو اپنی فکر سخن کے لئے انتخاب کرتے ہیں وہ دراصل ایک مثال کے ذریعہ ایک عالمگیر حقیقت پر روشنی ڈالتے ہیں اور دو ایسی متضاد شخصیتوں سے ہم کو روشناس کراتے ہیں جنھیں آتش پرستوں کی اصطلاح میں یزدان و اہرمن کہنا بیجا نہ ہوگا۔

دوسری بات اس سلسلہ میں یہ ہے کہ واقعۂ کربلا کے نام سے مسلمان شاعر کے مذہبی جذبات کو تحریک ہوتی ہے اور غیر محسوس طور پر اس کے قلم میں وہ زور وہ روانی، درد و اثر، اور جوش و خروش

پیدا ہو جاتا ہے جو رباب ہستی کے صرف مذہبی تار چھیڑنے سے پیدا ہو سکتا ہے اور جس کے بغیر شاعری بالعموم اور مرثیہ نگاری بالخصوص بے کیف و اثر ہوتی ہے۔ لیکن اگر کسی شاعر کے جذبات رنج و الم کسی اور واقعہ سے بھی اسی طرح ہیجان میں آ سکتے ہیں تو اس کے لئے کوئی امر مانع نہیں کہ وہ اسی واقعہ کو اپنے مرثیہ کا موضوع قرار دے۔ انیس و دبیر نے جس فضا میں نشو و نما پائی وہ ماتم حسینؑ کی صداؤں سے معمور تھی جہاں اس واقعہ پر آنسو بہانا نہ صرف داخل ثواب سمجھا جاتا تھا بلکہ دنیا کے اور تمام رنج و الم اس ایک غم کے سامنے ہیچ تھے۔ ایسی فضا میں ظاہر ہے کہ جس طرح یہ موضوع ان کے قلم کو اکسا سکتا تھا کسی اور سے ممکن نہ تھا چنانچہ اسی کی تاثیر تھی کہ انیس، خصوصاً اور دوسرے مرثیہ گو عموماً ان تمام عیوب سے پاک رہے جن میں ان کے ہمعصر غزل گو شعرا آخر زمانے تک مبتلا تھے۔

ان کے کلام میں نہ تو ابتذال ہے نہ فحاشی ہے نہ جمود و بے کیفی ہے اور نہ الفاظ کی بازیگری۔

زبان کی صفائی، بیان کی سلاست، روزمرہ کا استعمال اور مراعاۃ النظیر کا التزام ان کے یہاں بھی پایا جاتا ہے لیکن نہ اس طرح کہ الفاظ کی قربان گاہ پر معانی کو بھینٹ چڑھا دیا جائے بلکہ اس طرح کہ حسن بیان کے ذریعہ حسن خیال کو تقویت پہنچائی جائے۔ مثال کے لئے آپ انیس کے کلام کا اس دور کے کسی غزل گو شاعر کے کلام سے مقابلہ کیجئے تو لطف بیان کا یہ فرق بخوبی ظاہر ہو جائے گا مثلاً رند کہتے ہیں۔

میلہ تھا چاند گنج میں سورج گہن کا آج   تم کس لئے نہ غیرت شمس و قمر گئے

چونکہ معشوق کو عموماً چاند اور سورج سے تشبیہ دی جاتی ہے اس لئے شاعر نے پہلے تو ایک ایسے محلہ کا انتخاب کیا جو چاند گنج کہلاتا تھا۔ پھر وہاں ایک ایسی تقریب نکالی جس میں سورج کا نام آگیا۔ جب چاند اور سورج دونوں جمع ہو گئے تو مصرعہ ثانی میں معشوق کو غیرت شمس و قمر سے خطاب کر کے مراعاۃ النظیر کا حق ادا کر دیا لیکن اس کا کچھ خیال نہ کیا کہ شعر کا مطلب کیا ہوا اور اس میں کیا شاعرانہ لطافت پیدا ہوئی اس کے برخلاف انیس کا کوئی شعر ایسا لیجئے جس میں انھوں نے رعایت لفظی کا التزام کیا ہے مثلاً ان کا ایک مصرعہ ہے۔ ع

اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں یا ع قطرہ کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں

ان مصرعوں میں رنگ و آب صرف پھول اور قطرہ کی مناسبت سے استعمال ہوئے ہیں ورنہ ان کے بجائے اور لفظ مل سکتے تھے لیکن ملاحظہ فرمایئے کہ ان الفاظ نے لطف معنی کو غارت کرنے کے بجائے اس میں کیسی جان ڈالدی ہے ۔

پھر اس حسن زبان کے ساتھ مضمون کے اعتبار سے بھی اس عہد کے مرثیہ گو شعرا غزل گو شعرا سے بدرجہا بہتر ہیں ۔ وہ ان کی طرح سے صرف ایک عشق ہی کا راگ نہیں الاپتے بلکہ جرأت و صداقت ۔ غیظ و غضب ، نفرت و عداوت ، ایثار و ہمدردی ، ہیبت و خود غرضی غرض قلب انسانی میں جتنے جذبات موجزن ہو سکتے ہیں ان سب کی تصویریں ایسے موثر انداز میں پیش کرتے ہیں کہ ہزار پند و نصیحت سے زیادہ دل میں گھر کرتی ہیں ۔

مناظر قدرت کے ایسے دلکش نظارے دکھاتے ہیں کہ گویا گھر بیٹھے کوہ و دریا کی سیر کراتے ہیں ۔ معرکہ کارزار کی گرمیاں روبہ مزاجوں کو مشتعل کر دیں اور اہل بیت کی جوانمردیاں رستم و اسفندیار کو منفعل کر دیں ۔ ہجو و مدح ، پند و نصیحت ، اخلاق و سیرت ، رزم و بزم غرض یہ کہ شاعری کے جتنے موضوع ہو سکتے تھے سب کو انیس و دبیر نے ایک مرثیہ میں جمع کر دیا اور اردو شاعری کی "جوئے کم آب" کو بحر بیکراں بنا کر چھوڑا ۔

(۱۱) واجد علی شاہ کا عہد (۱۸۴۷ء - ۱۸۵۶ء)

برق و اسیر کا دور

جس طرح امجد علی شاہ کا نام تاریخ اودھ میں تعصب ملی کا مرادف ہے ۔ اسی طرح واجد علی شاہ کا نام عیش و عشرت کا ۔ اون کی بادشاہت کا زمانہ تو بہت مختصر ہے لیکن یہ پیدا اوسی وقت ہو چکے تھے جبکہ ان کے دادا محمد علی شاہ تخت سلطنت پر متمکن تھے اور اون کے والد امجد علی شاہ خود ولیعہد تھے اس طرح ان کا نہ صرف عہد حکومت بلکہ عہد زندگی لہو و لعب اور عیش و عشرت کی ایک مستقل داستان ہے ۔ یہ داستان اتنی طویل اس قدر شرمناک اور ایسی ناگفتہ بہ ہے کہ اس پر جہاں تک پردہ پڑا رہے بہتر ہے ۔

صرف اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ شعر و سخن بھی اس بادشاہ کی زندگی کا ایسا ہی جزو لاینفک تھا جیسا کہ تعیش نفس پرستی۔ ان کا تخلص اختر تھا۔ در حقیقت یہ ہے کہ سلاست زبان کے اعتبار سے ان کا کلام نہ صرف تمام سلاطین اودھ میں ممتاز ہے بلکہ اردو زبان کے اکثر بلند پایہ شعرا سے ٹکر کھاتا ہے لیکن مضمون کے اعتبار سے یہ ایک آئینہ ہے جس میں ان کی زندگی کے تمام کارنامے روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ آئینہ کوئی چھوٹا سا نہیں کہ جس میں صرف صورت ہی نظر آئے بلکہ یہ ایک قد آدم آئینہ ہے جس میں پورا سراپا دکھائی دیتا ہے کیوں کہ واجد علی شاہ بڑے پر گو شاعر تھے اور علاوہ چھ دواوین کے کئی مثنویاں اور مرثیے اور مختلف تصانیف نظم و نثر اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ان میں سے مرثیوں اور مذہبی تصانیف سے قطع نظر کر لی جائے تو باقی کلام ان ہی خصوصیات سے لبریز نظر آتا ہے جو ان کے پیشرو غزل گو شعرا کا طرۂ امتیاز رہی تھیں یعنی فحاشی، عریانی۔ ابتذال، صنائع لفظی کا التزام اور رعایت لفظی کا جنون۔ یہی حال ان کے عہد کے اور شعرا کا ہے جن میں قابل ذکر برق و اسیر، تلق، امانت، یاور، شرف، بہار، ذکی، درخشان، اختر وغیرہ ہیں لیکن ان سب کا ایک رنگ ہے، ان سب کے مشترک خصوصیات ہیں مثال کے لئے صرف دو شعر یہاں نقل کر دیتا ہوں۔

بہار:۔ نہ دل ہے مرا اور نہ وہ نازنین ہے　　کئی دن سے پہلو میں کوئی نہیں ہے۔
یاور:۔ بند قبا کو کھینچ کے اتنا نہ باندھیئے　　رکیئے نہ گھونٹ گھونٹ کے جوش شباب کو۔

اس عہد کے دو شعرا بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ایک جان صاحب دوسرے امانت۔

جان صاحب اس لئے کہ وہ نسوانیت جو اس عہد کا طغرائے امتیاز تھی اور جو واجد علی شاہ کے نام کے ساتھ توام ہوگئی ہے۔ جان صاحب کی ریختی کی صورت میں ظاہر ہوئی تھی جسے وہ زنانہ لباس پہنکر اور بالکل عورتوں کے انداز میں پڑھا کرتے تھے۔

امانت اس لئے کہ انھوں نے اندر سبھا کے نام سے اردو زبان کا پہلا ڈرامہ لکھا ہے۔ جسے واجد علی شاہ اور ان کی نازنین محلات نے مل کر اسٹیج کیا تھا۔ اس طرح واجد علی شاہ کی عیاش پرستی نے اگرچہ سلطنت کھو دی مگر صنف ڈرامہ کا بیج اردو شاعری میں بو دیا جو آج کل خوب ترقی پر ہے اور جسے

عہد حاضر کے نقاد بڑی اہمیت دے رہے ہیں لیکن زمانہ ہی چل کر ثابت کرے گا کہ یہ صنف اردو شاعری کو کیا نیفض پہنچاتی ہے جس کی ایجاد کا سہرا امجد علی شاہ کے سر تھا۔

خاتمہ

دربار اودھ کم و بیش ایک سو سال قائم رہا۔ اس مدت میں لکھنؤ کی شاعری نے جو کچھ ترقی کی وہ زیادہ تر اسی دربار کی زیر سرپرستی کی اس لئے اس میں وہ تمام خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں جو شخصی حکومت کے اثر سے پیدا ہو سکتی ہیں شاعری کا چرچا جس قدر زیادہ ہوتا گیا اور شعرا کی تعداد جتنی بڑھتی گئی اتنا ہی نوعیت کے لحاظ سے اس میں تنزل ہوتا گیا۔ یہاں کے شعراء نے گو ان تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی جو دہلی سے ان کو ورثہ میں ملے تھے بلکہ ان میں ڈرامہ اور مرثیہ کی دو اہم صنفوں کا اضافہ بھی کیا لیکن آخر الذکر کے سوا مضمون کے اعتبار سے کسی صنف میں دبستان دہلی سے بازی نہ لیجا سکے اور جو جدتیں کیں وہ ایسی گندہ تھیں جن سے اردو شاعری کو بجائے فائدہ کے نقصان پہونچا۔ لیکن ایک صنف مرثیہ میں ان کے کمال نے ان کے دامن سے ان کی شاعری کے تمام داغوں کو دھو دیا اور اردو شاعری میں لکھنؤ کے نام کو زندہ جاوید بنا دیا۔ زبان کے اعتبار سے لکھنؤ کی شاعری کا جو رنگ آتش و ناسخ کے عہد میں قائم ہوا تھا وہ بتدریج بدلتا گیا۔ عربی اور فارسی کا عنصر رفتہ رفتہ گھٹ گیا۔ اور رعایت لفظی کی بلا گو ان کے تلامذہ کے دور میں بھی مسلط رہی لیکن اس کے بعد اس میں بھی کمی ہونے لگی یہاں تک کہ اس نے اعتدال اور سلامت روی کی چال اختیار کر لی جو اب تک باقی ہے۔ اس طرح آج بھی لکھنؤ کی زبان ہندوستان کے طول و عرض میں ایک معیاری زبان کا کام دے رہی ہے۔
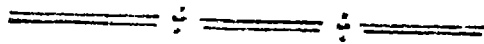
═══ ÷ ═══ ÷ ═══

انجمن طیلسانین عثمانیہ کی مطبوعات

۱۔ عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی کے متعلیاں ریاست عادل شاہی دور تولیت کی بسیط اور محققانہ تاریخ مولفہ سید علی محسن صاحب ایم اے (عثمانیہ)

قیمت عہ ر

۲۔ سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی مفصل محققانہ اور مستند تاریخ۔

مولفہ ظہیر الدین صاحب، ایم، اے (عثمانیہ) قیمت عہ ر

۳۔ امام غزالی کے اخلاقی خصوصیات۔

مولفہ محمد غوث صاحب (محبوب نگری) ایم اے (عثمانیہ) قیمت عہ

۴۔ موضع زویلی کی معاشی تحقیق۔

مولفہ محمد ناصر علی صاحب، ایم اے (عثمانیہ) قیمت عہ

۵۔ دربار اودھ کا اثر لکھنو کی شاعری پر۔

مولفہ محمد اعظم خاں صاحب، ایم اے (عثمانیہ) قیمت عہ ر

اراکین انجمن اور خریداران مجلہ طیلسانین عثمانیہ سے نصف قیمت کتب فروشوں کے ساتھ تمام رعایت بغرض سہولت کتابیں قسط وار بھی دیجاتی ہیں۔

ملنے کے پتے

(۱) دفتر مجلہ طیلسانین و انجمن طیلسانین عثمانیہ حیدرآباد دکن نظام شاہی روڈ

(۲) مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

ماخذہائے قانون

از جناب مولوی فاضل ڈاکٹر میر سیادت علیخان صاحب

آسٹن ۔ لکچر ۲۸ ۔ سامنڈ باب ۶ ۔ ہالسینڈ باب ۵ ۔ پالاک فرسٹ بک ۔ باب ۲ ۔
کرکوناف کتاب چہارم ۔ آلن پوری کتاب ۔

ماخذہائے قانون بہت ہی مبہم لفظ ہے ۔ اور ذیل کے مختلف معنون میں استعمال کیا گیا ہے ۔

(۱) **صوری ماخذ کے معنوں میں** ۔ صوری ماخذ سے مراد مملکت کی طاقت اور مرضی یا ارادہ ہے جس کی وجہ سے قانون کو اس کی جبری قوت حاصل ہوتی ہے ۔ بالفاظ دیگر قانون کا صوری ماخذ مملکت یا اس کی طاقت اور ارادہ ہوتا ہے ۔ صوری ماخذ کے برخلاف مادی ماخذ ہوتے ہیں اور ان سے مراد وہ مواد ہے جن سے قانون بنتا ہے ۔ یعنے اس میں وہ تمام مواد شامل ہے جس کو استعمال کرکے مملکت قانون وضع کرتی ہے ۔

(۲) **مادی ماخذ** مادی ماخذ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ۔ قانونی اور تاریخی ۔ قانونی ماخذ سے مراد وہ ماخذ ہیں جن کو مملکت بطور قانون تسلیم کرتی ہے اور تاریخی ماخذ وہ ہیں جو گو ان اصولوں کے جن سے قانون بنتا اور جن پر قانون مشمول ہوتا ہے ۔ فی الواقع مواد ہوتے ہیں لیکن جن کو مملکت اس طرح پر تسلیم نہیں کرتی ہے مثلاً جب عدالت کسی اصول کو اپنے کسی فیصلہ میں قرار دے تو یہ ہوسکتا ہے اور ہوتا ہے کہ یہ اصول کسی کسی بڑے مصنف مثلاً فرانسیسی مقنن پورٹیے (Portier) کی تصنیف میں پایا جائے ، اور پورٹیے نے بھی اس کو ممکن ہے کہ جسٹینین کے مجموعہ ہائے قوانین سے لیا ہو ۔ تو پورٹیے یا جسٹینین کے تصانیف اس قانونی اصول کے تاریخی ماخذ ہوئے اور خود نظیر اس کی قانونی ماخذ ہوئی ۔ یہ تصانیف محض تاریخی ماخذ اس لئے ہوئے کہ مملکت میں ان تصانیف اور ان کے اصولوں کو بطور قانون تسلیم نہیں کیا جاتا ہے ۔ برخلاف

اس کے نظیر قانونی ماخذ اس لئے ہے کہ مملکت نے یہ قرار دیدیا ہے کہ نظائر کی وقعت قانون کی ہے
اور سامنڈ کے نزدیک ماخذ صوری اور ماخذ قانونی میں فرق یہ ہو کہ ماخذ قانونی میں مملکت ایک قاعدہ مقرر کردیتی ہے جس کے مطابق
ہونے کے بعد کوئی اصول قانون بن جاتا ہے مثلاً ہر مملکت میں یہ قاعدہ مقرر ہے کہ جو اصول عدالتوں میں
فیصلہ پائیں وہ بطور نظائر قانون کی وقعت رکھیں۔ ماخذ صوری کے لئے کسی ایسے قاعدہ کی ضرورت
نہیں۔ کیونکہ ماخذ صوری تو مملکت کی قوت ارادہ ہی کا دوسرا نام ہے۔

سامنڈ قانونی اور تاریخی ماخذ کے فرق کو بہت اہم اور ضروری سمجھتے ہیں لیکن اس پر اعتراض یہ کیا
جاتا ہے کہ وہ بحث مصنوعی اور غیر ضروری ہے۔ اگر ہم سوچیں تو اس کا مطلب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ
بعض ماخذ با قوت مملکت (Authouritative) اور بعض بلا قوت مملکت Unauthouritative
ہیں یعنے بعض ماخذ ایسے ہیں جن کے پیچھے مملکت کی قوت ہوتی ہے اور بعض ایسے جن کے پیچھے یہ قوت
نہیں ہوتی ہے۔ اور صاف اور غیر مبہم الفاظ میں اس کے معنے صرف یہ ہیں کہ بعض ماخذ۔ ماخذ ہیں۔
اور بعض ماخذ، ماخذ نہیں۔

(۳) آسٹن کے نزدیک مملکت یا مقتدر اعلیٰ ہی قانون کا واحد ماخذ ہے۔ یعنے مقتدر اعلیٰ ہی تمام
قوانین کا واحد سرچشمہ ہے اسی سے تمام قوانین نکلتے ہیں اسی طرح پر سوائے قوانین موضوعہ کے رواج۔ نظائر تصنیفات
وغیرہ آسٹن کے نزدیک راست نہیں بلکہ قوانین کے کسوٹی ماخذ ہوتے ہیں۔ اسی طرح تاریخی اسکول کے اساتذہ کے
نزدیک (Volkgeist) ہی تمام قوانین کا واحد ماخذ ہیں۔ (Volkgeist) سے
عوام کا وہ خاص ملکہ مراد ہے جس کی وجہ سے عوام قانون بناتے ہیں۔ اس ملکہ کا خاص اظہار رواجی قانون کے
ذریعہ ہوتا ہے گو قانون موضوعہ۔ نظائر اور تصنیفات کے ذریعہ سے بھی اس کا اظہار ہوتا ہے۔ ماخذ کے ان دونوں
تعریفوں پر اعتراض یہ ہے کہ ان میں یہ لفظ بہت ہی محدود معنوں میں لیا جاتا ہے۔

(۴) ہالینڈ آسٹن کی نقادانہ پیروی کرتے ہیں۔ اس لئے ان کے نزدیک بھی قانون کا واحد ماخذ صرف
مملکت یا مقتدر اعلیٰ ہی ہے لیکن انھوں نے بھی مثل سامنڈ کے گو سامنڈ کے الفاظ میں نہیں قانون کے
بہت سے مادی ماخذ مانے ہیں۔ مثلاً مذہب۔ قانونی تصانیف وغیرہ کو بھی وہ ماخذ کہتے ہیں اور ان کے

نزدیک رواج قانون کا ماخذ بعید ہے ۔

بات یہ ہے کہ صحیح معنے میں ماخذ سے مراد ایک معین ذریعہ ہے جس کی وجہ سے قانون ایک معین معلوم اور جبری قاعدہ عمل کی صورت اختیار کرلیتا ہے اور ماخذہائے قوانین تمام وہ معین ذرائع ہیں جن کی وجہ سے قواعد عمل معین یکساں اور جبری صورت اختیار کرکے قانونی وقعت حاصل کرتے ہیں اور صحیح تو یہ ہے کہ قانون کو یہ معین یکساں اور جبری صورت ذیل کے ذرائع سے حاصل ہوتی ہے ۔

(۱) رواج سے (۲) عدالتی عمل سے یعنے نظایر اور نصفت سے اور (۳) قانون سازی سے ۔
اس لئے ہم پہلے رواج سے پھر نظایر اور نصفت سے اور آخر میں قانون سازی سے مختصر بحث کریں گے ۔

تعریف ۔ رواج سے مراد وہ قواعد عمل ہوتے ہیں جن کو عوام خود اپنے برتاؤ سے اور ان پر عمل کرنے سے بناتے ہیں اور جن کا وجود اور عام مقبولیت بھی عوام کے برتاؤ اور اس پر عمل کرنے سے ثابت کی جاتی ہے ۔ اور بلا شبہہ رواج ہی قانون سازی کی قدیم ترین قسم ہے ۔

تحلیلی اساتذہ یہہ اساتذہ رواج کی بحث کو تین عنوانوں پر غور کرکے ختم کر دیتے ہیں ۔ یعنے (۱) رواج کے طریق نشو و نما پر (۲) اس امر پر کہ رواج کب بطور قانون تسلیم کیا جاتا ہے اور (۳) ان شرائط پر جن پر اترنے کے بعد وہ ثابت قرار دیا جاتا ہے ۔

تحلیلی اساتذہ چونکہ صرف قانونی تصورات کے مفہوم کو بذریعہ تحلیل و تجزیہ متعین کرتے ہیں ۔ اس لئے وہ مثل دیگر قانونی تصورات کے رواج پر بھی عمرانی اور تاریخی نقطہ نظر سے غور نہیں کرتے ہیں یعنے مثلاً وہ (۱) ماہیت رواج (۲) رواج کی وسعت (۳) اس کی ابتدار ۔ پر تاریخی اور عمرانی نقطۂ نظر سے غور کرتے ہیں اور نہ (۴) رواج کی تعبیر اور اس کے اطلاق پر ۔ یعنے تعبیر کنندوں اور فقیہوں کے رواج پر اثر سے متعلق غور کرتے ہیں ۔ یہ کام تاریخی اساتذہ انجام دیتے ہیں ۔ ہم پہلے تحلیلی اساتذہ کی رائے کا خلاصہ درج کریں گے ۔ اور اس کے بعد رواج سے متعلق تاریخی اساتذہ کے مباحث کا ذکر کریں گے ۔

بقول ہالینڈ رواج سے متعلق اہم سوال دو ہیں (۱) طریق نشو و نما (۲) یہہ کہ رواج کب قانون

بن جاتا ہے۔ طریق نشو ونما کے متعلق غالباً یہ خیال صحیح ہے کہ یکساں برتاؤ کے یہ قواعد عمل کچھ تو سہولت، کچھ اتفاق اور کچھ مذہبی اور دوسری قسم کے توہمات کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً کسی گاؤں والوں کے کسی ایک ہی راہ ہی پر غور کیجئے کہ اس کی ابتدا کیونکر ہوئی ہوگی۔ کوئی ایک شخص پہلے اس راستہ پر کسی سہولت کی وجہ سے چلا ہوگا اور دوسرے ہم وطنوں میں اس راستہ پر چلنے کی وجہ ممکن ہے کہ محض اتفاق یا فال کا وہم ہو اس کے بعد اگر دوسرے اشخاص بھی اس راستہ پر چلیں اور پگڈنڈی پڑ جانے کی وجہ ان کا اس راستہ پر چلنا قرین قیاس ہوجاتا ہے تو اس راستہ پر چلنے کا رواج پیدا ہوجاتا ہے۔ انسان کی طفولیت میں ہر عادتی طرز عمل یا برتاؤ میں مرور زمانہ سے تقدس پیدا ہوجاتا ہے اور اس سے انحراف کو سخت برا اور ناپسند کیا جاتا ہے۔ اس طرح اگرچہ کوئی مملکت یا مقتدر اعلیٰ ان کو وضع نہیں کرتا ہے۔ بجائے قانون کے یہی قواعد عمل ہوتے ہیں۔ عام طور پر ان کی اطاعت اور تائید کی جاتی ہے اور ان کا نفاذ رائے عامہ ہی سے ہوتا ہے۔ قیام مملکت کے بعد ایک اور تہدید یعنی مملکت کی قوت اور جبری اطاعت کی تہدید کا اضافہ ہوتا ہے۔ نیز قیام مملکت کے بعد بھی عرصہ تک رواج ہی قانون یا اس کا اکثر حصہ رہتا ہے اور پہلے پہلے مکتوبی اور موضوعہ قانون رواج ہی کی نقل اور اسی پر مبنی ہوتا ہے اور اب بھی ہر ملک میں رواج بطور قانون کے پایا جاتا ہے۔ گو اس کی وسعت و اہمیت بہ نسبت قانون موضوعہ اور نظایر کے کم ہوگئی ہے۔

انگلستان میں رواج کامن لا (قانون عمومی) یا رواج مملکت کے نام سے مشہور رہا اور ہے۔ ظاہر ہے کہ رواج کے نشو ونما کے دوران میں ججوں یا ان کے پیشروؤں میر پنچوں وغیرہ کا رواج پر کافی اثر ہوتا ہے۔ سر ہنری سمنر مین نے اپنے مطالعہ میں اس اثر کو اتنا گہرا پایا ہے کہ ان کی رائے میں جج ہی رواج کو بناتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس رائے میں بہت مبالغہ ہے کیونکہ رواج کی ابتداء عوام سے ہوتی ہے۔ دوران نشو ونما میں جج ضرور اپنا اثر اور خاصہ اثر اس پر ڈالتے ہیں اور نیز بہت سے رواجی امور کی ایک طرح پر ابتداء بھی ان ہی سے ہوتی ہے۔ مثلاً یہ رواج کہ غیر منقولہ جائداد بذریعہ دستاویز منتقل کی جائے اس کی عبارت یہ ہو۔ انتقال کے وقت ان رسومات وضوابط کی پابندی کی جائے وغیرہ۔

مملکت کے پوری طرح استحکام سے قائم ہو جانے کی بعد کیا ہر رواج یہ ثابت کر دیئے جانے پر کہ اس پر عمل ہوتا آیا ہے مملکت کے لئے قابل تسلیم ہو جاتا ہے ؟ نہیں ۔ مملکت عملدرآمد کے ثبوت کے بعد ہی معقولیت وغیرہ کے متعدد شرائط کے بعد اس کو تسلیم کرتی ہے لیکن ان شرائط پر اترنے کے بعد مملکت ججوں کے ذریعہ رواج کو عام طور پر بطور قانون تسلیم کرتی ہے ۔ اور نہ صرف تاریخ تسلیم یعنے فیصلہ عدالت کی تاریخ سے بلکہ اس سے قبل سے بھی یعنے فیصلہ سے عدالت یہ تسلیم کرتی ہے کہ تاریخ فیصلہ سے قبل بھی رواج قانون رہا ہے اور اسی اساس پر فریقین کے درمیان احکام صادر اور فصل خصومات کرتی ہے ۔ اس طرح پر آسٹن کا یہ نظریہ صحیح نہیں رواج جب تک کہ عدالتوں میں ثابت اور تسلیم نہیں کیا جائے قانون نہیں کیونکہ کچھ تو رواج کی قدامت کی وجہ سے اور کچھ اس واقعہ کی وجہ سے کہ رواج کے بھروسہ پر افعال کئے جاتے اور ذمہ داریاں وجود میں آتی ہیں اور اس بھروسہ کو پورا کرنا چاہیئے مملکت نے ایک اصول بنا دیا ہے کہ تمام رواج جو معقولیت وغیرہ کے متعدد لیکن معین شرائط پر اترے قانون ہے ۔ اسی طرح جس طرح عدالتوں نے (اور اسی وجہ سے مملکت نے بھی) ہر صورت کے لئے قانون ان کے پاس موجود نہ ہونے کی وجہ سے یہ اصول بھی قرار دے دیئے ہیں کہ اصول ہائے نصفت پر عمل کیا جائے گا ۔ یا یہ اصول کہ نظایر قابل پابندی ہوں گے عدالتوں یا مملکت کے اس اصول کی وجہ سے رواج قانون ہے اور تاریخ فیصلہ سے قبل بھی قانون تھا ۔ ہالینڈ کہتے ہیں اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کسی قانون موضوعہ کے کسی دفعہ کی ۔ عدالت میں اس دفعہ کے تحت کوئی مقدمہ آنے سے قبل بھی یہ دفعہ قانون ہے لیکن عدالت کے فیصلے کے بعد ہی اس کے معنے معین واضح اور پوری طرح معلوم ہوتے ہیں ۔ اس طرح پر رواج قانون نہ صرف قدامت کی وجہ سے ہے بلکہ عدالتوں یا مملکت کے اس اصول کی وجہ سے کہ وہ تمام رواج قانون ہیں جو متعدد اور معین شرائط پر اتریں اور اسی وجہ سے سامنڈ کہتے ہیں کہ رواج قانون کے مادی ماخذ ہیں صوری ماخذ نہیں ۔ صرف مادی ماخذ اس لئے کہ ان کو قانون بننے کے لئے مملکت کی قوت اور ارادے کی مذکورہ بالا اصول کے تحت ضرورت ہوتی ہے ۔

(۳) اب ہمیں ان شرائط کا ذکر کرنا چاہیئے جن پر اترنے کے بعد رواج کو عدالتیں تسلیم کر لیتی ہیں

ثابت سمجھتی ہیں۔ بقول آمن ان شرائط کا مقصد صرف رواج کے وجود کی شہادت بہم پہنچانا ہوتا ہے۔ اگر رواج ثابت ہو تو عدالتیں اس کو بطور قانون تسلیم کرتی ہیں وہ قانون تاریخ تسلیم سے پہلے بھی ہوتا ہے۔ اور اس کا وجود ثابت ہونے پر وہ قانون صرف تاریخ تسلیم ہی سے نہیں بلکہ اس سے قبل سے بھی قانون مانا جاتا ہے اور وہ قانون محض عدالتوں کے تسلیم کرنے کی وجہ سے نہیں ہوتا ہے۔ البتہ عدالتیں کسی ایسے رواج کو اس کے ثابت ہو جانے کے بعد بھی قانون تسلیم نہیں کرتی ہیں جو کسی قانون موضوعہ کے خلاف ہو یا جس سے کسی قانون عمومی کے کسی بنیادی اصول کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔ ان دو استثناؤں کے ساتھ اگر رواج ثابت ہو تو وہ اپنی ذاتی وقعت کے لحاظ سے قانون ہے۔

(۱) Immemorial autiquity) یادسے باہر قدامت یہ شرط مقامی رواجات سے متعلق ہے عام رواجات سے نہیں اور نہ تجارتی رواجات سے انگریزی قانون میں رچرڈ اول کے زمانہ کو یعنی ۱۱۸۹ء کو یاد سے باہر زمانہ مانا جاتا ہے یعنے اصولاً رواج کو اس زمانہ سے قبل کا ہونا ضروری ہے۔ گو عملاً بہت کم زمانہ کی شہادت بالعموم کافی سمجھی جاتی ہے۔

(۲) (Continuity) تسلسل یعنے رواج پر برابر عمل ہوتا رہنا ضروری ہے مسلسل عمل ثابت ہونے کے بعد ہی عدالتیں رواج کو ثابت سمجھتی ہیں۔

(۳) (Legality) یعنے قانون موضوعہ اور قانون عمومی (کامن لا) سے مطابقت مقدمہ پیری بنام بارنٹ (Perry V. Barnet) میں اسٹاک اکسچینج کے رواج کی روسے بنک کے حصوں کی رجسٹری ضروری نہیں تھی۔ لیکن قانون لیمان (Leeman's Act.) کی روسے ایسی رجسٹری ضروری تھی۔ عدالت نے رواج کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اسی طرح قانون بیمہ بحری، Marine Insurance Act کی روسے بیمہ اسباب۔ کے جواز کے لئے اشیاء میں بیمہ کے قابل کچھ نہ کچھ حصہ ضروری ہے۔ رواجی طور پر (P. P.I. Contracts) بھی کئے جاتے ہیں یعنے "ایسے بیمے بھی کئے جاتے ہیں جن میں سوائے بیمہ کی پالیسی کے اشیاء میں کچھ حصہ بیمہ کروانے والے کا نہیں ہوتا ہے" عدالتوں نے ایسے معاہدوں کو گو وہ رواج پر مبنی ہوں تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔

(۴) اسی طرح رواج پر عمل (nec vi, nec clam, nec precario.) ہونا چاہیئے۔ یعنے "عمل بغیر ظلم اور زبردستی کے علانیہ اور بغیر کسی شخص کی اجازت کے ہونا چاہیئے"۔

(۵) Opinio necessitatis یعنے ضروری ہے کہ رواج پر عمل کرنے والے اس کو لازمی اور واجب العمل سمجھیں کہ اختیاری مثلاً بابا کشن نے مثال دی ہے کہ اگر کسی پل کو کسی زمیندار کا نمائندہ اپنی خوشی سے کبھی بنا دیا کرتا تھا۔ اور کبھی نہیں تو اس سے رواج ثابت نہیں ہوگا۔

(۶) معقولیت (Reasonableness) جب کوئی رواج ثابت ہوجاتا ہے تو اس کو غیر معقول ثابت کرنے کا بار ثبوت اس فریق پر ہوتا ہے جو اس کو غیر معقول کہتا ہے۔ اور رواج کی معقولیت کا معیار یہ ہے کہ وہ عقل و انصاف کے اس طور پر خلاف نہ ہونا چاہیئے کہ اس کی بطور قانون تعمیل کرانے میں اس سے زیادہ ہرج ہوگا جتنا کہ ان امیدوں اور ان افعال کو الٹ دینے سے جو اس کے جاری رہنے کی امید پر کئے گئے ہوں۔

رواج کو تسلیم کرنیکے وجوہات ۔ سامنڈ نے دو بتلائے ہیں (۱) ایک تو یہ کہ رواج کو قوم صداقت و انصاف اور افادۂ عام کا حامل سمجھتی ہے اسی وجہ سے رواجی اصول نہ صرف محفوظ ترین ہوتے ہیں بلکہ ان کے پیچھے طویل عمل کی سند اور اقتدار بھی ہوتا ہے۔ نیز یہ کہ (۲) کسی رواج کے عرصہ دراز سے موجود ہونے سے لوگوں کو یہ توقع ہوجاتی ہے کہ وہ آئندہ بھی جاری رہے گا اور اسی کے بھروسہ پر معاملے کئے جاتے ہیں اور روزمرہ کی کاروائیاں وجود میں آتی ہیں اور انصاف کا مقتضا یہ ہے کہ بالعموم اس بھروسہ کو پورا کرنا چاہئیے۔

تاریخی اساتذہ ماہیت رواج ۔ بقول آلن معاشرہ کے محض وجود۔ افراد کے محض تعدد سے رواج پیدا ہوتا ہے۔ جس کی پابندی سے مجموعۂ افراد کا کوئی فرد گریز نہیں کرسکتا۔

"The mere existence of a society, the mere plurality of individuals, gives rise to customs from which no single member of the totality can completely divorce himself."

پابندی کی تحدید بعض رواجات میں خوف نفرت یا ملامت ہی میں ہوتی ہے۔ اور بعض زدو تشر

رواجات میں یعنے قانونی رواجات میں یعنے ایسے رواجات میں جن سے قانونی تعلقات کو متاثر کرنا مقصود ہوتا ہے اس سے بڑھ کر تقدید ہوتی ہے۔ مثلاً اگر آپ اپنے سر کے بال نہ کٹائیں تو آپ کی تکلیف اور معصروں کی ہنسی کے سوائے کوئی اور تقدید نہیں ہوتی لیکن اگر اسٹاک کی منتقی کے وقت آپ دستخط مہرا ور حوالگی کو بے ضروری ضابطہ پسندی تصور کریں تو کوئی انتقال مال واقع ہی نہیں ہوگا اور آپ نقصان اٹھائیں گے۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ رواج عوام کے عمل سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ بھی ملحوظ رکھیے کہ اکثر رواجات اپنی ماہیت میں غیر نزاعی ہوتے ہیں یعنے وہ حقوق کے تنازع کی وجہ سے "میں" اور "تو" کے جھگڑے کی وجہ سے نہیں پیدا ہوتے ہیں بلکہ وہ معاشرہ اور افراد معاشرہ کی سہولت اور معاشری ضرورت کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں بقول وینوگراڈ آف

"تنازع کی وجہ سے رواجی قواعد عمل نہیں پیدا ہوتے ہیں بلکہ وہ روزمرہ کے اعمال سے یعنے باہمی میل جول معاشری مصالحت پسندی و رواداری اور معاشری تعاون سے پیدا ہوتے ہیں۔ نہ وراثت۔ نہ جائداد نہ قبضہ نہ معاہدہ یا ان کے متعلق قواعد قانون سازی یا تنازع باہمی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ وراثت یا اس سے متعلق قواعد کی ابتدا منتظم خاندان کی وفات پر خاندان سے متعلق انتظامات کرنے کی ضرورت کی وجہ سے ہوئی۔ جائداد کی ابتدا ر قبضہ سے ہوئی خود قبضہ بطور امر واقعی کسی شئے کو روک رکھنے سے شروع ہوا۔ اور معاہدہ کے شروعات مبادلہ کے رواجات ہوئے ابتدائی قسم کے معاشروں میں حقوق سے متعلق جو تنازع ہوتے تھے۔ وہ غیر نزاعی رواجات کے اطلاق ہی کے متعلق ہوتے تھے۔"

تاریخی علم اصول قانون (H. J.) جلد ا صفحہ ۳۶۸)

"It is not conflicts that initiates rules of legal observance, but the practices of everyday directed by the give-and-take considerations of reosonable intercourse and social co-operation. Neither succession, nor property, nor contract started from direct legislation or from direct conflict. Succession has

its root in the necessary arrangements of the house-hold on the death of the manager, property began with occupation, possession is reducible to de facto detention, the origins of barter go back to the customs of barter, disputes as to rights in primitive society are pre-eminently disputes as to the application of non litiguous customs."

اس طرح پر ظاہر ہے کہ رواج کی ابتدار باہمی سمجھوتہ سے نہ کہ تنازع کی وجہہ سے ہوئی۔ اسی طرح جس طرح معاشرہ کی ابتدار انسانی فطرت کے مل جل کے رہنے کے اقتضا سے نہ کہ حالت نزاع یا باہمی جھگڑوں کی وجہہ سے ہوئی۔

وسعت رواج۔ ابتدائی قسم کے معاشروں ہی میں رواج کی یہہ حالت نہیں تھی۔ اب بھی بہت سے جدید قوانین کی ابتدا سمجھنے رواج کا علم ضروری ہوتا ہے انگریزی "کامن لا" یعنے قانون عمومی میں رواج کا بہت دخل ہے مثلاً قانون مجموعی کا وہ حصہ جو خاندان سے متعلق قانون پر مبنی ہے۔ ایک ہی بیوی کرنے کا قانون رواج ہی پر مبنی ہے۔ اسی طرح انگریزوں میں بیوی جو شوہر کے خاندان کا نام اختیار کرلیتی ہے یہہ بھی رواج ہی کی وجہ سے ہے۔ اسی طرح اختیار پدری یا باپ کا اپنے گھر کا مالک اور اپنے خاندان میں بادشاہ اور حکمران ہونا، حقوق ولایت بچوں کی نگرانی اور ان کی تربیت تعلیم وغیرہ سب رواج ہی پر مبنی ہیں۔ غیر صحیح النسب بچے پر ماں کا اختیار بھی رواج ہی کی وجہ سے ہے حقیقت تو یہہ ہے کہ باوجود آسٹن کے اس قول کے کہ قانون حکم مملکت ہے انگریزی قانون میں نہایت ہی بنیادی امور میں بہت کم احکام ہیں اور انگریزی قانون میں بہت سے امور تسلیم کرلئے گئے ہیں یعنے رواج میں ان کے موجود ہونے کی وجہہ سے قانون موضوعہ میں ان کی صراحت نہیں کی گئی ہے مثلاً حملہ۔ ازالہ حیثیت عرفی حبس بیجا۔ یا غفلت کی تعریف بقول آلن قانون موضوعہ میں نہیں کی گئی ہے۔ نہ صرف جج ہی بلکہ پارلیمنٹ بھی اس مفروضہ پر چلتی ہے کہ قانون موجود ہے یعنے رواج میں موجود ہے چنانچہ قانون میں دوسرا سب سے بڑا جرم یعنے قتل عمد کی تک تعریف قانون موضوعہ

میں نہیں ہے۔ اسی طرح قانون دستوری کو "قانون اور رواج دستور" کہا جاتا ہے لیکن اس قانون میں قانون سے زیادہ رواجات ہیں۔ پارلیمانی نظام کا سنگ بنیاد یعنے کابینہ کے ذریعہ حکومت کا طریقہ رواج ہی پر مبنی اور رواجات ہی سے نشو نما پایا ہے اور اب ہمارے آنکھوں کے سامنے اس میں رواجات ہی کے ذریعہ سے تغیر ہو رہا ہے۔ صدر کابینہ جو انگریزی مملکت میں سب سے زیادہ اہم اور ذمہ دار شخص ہوتا ہے قانون موضوعہ میں اس سے متعلق ۱۹۳۷ء کے بعد ہی کوئی کافی صراحت نہیں ہے۔ قانون دستوری میں ہم ایک قدم بھی بغیر پارلمنٹ کے عمل کو دریافت کئے نہیں بڑھا سکتے اور پارلیمنٹ کے عمل سے متعلق کوئی صریح قوانین وضع نہیں ہیں۔ اس طرح پر یہہ واقعی رواجات یا طریقے پارلمنٹ کے مطلق العنان اقتدار اعلیٰ کو کافی حد تک محدود کرتے ہیں۔ رواجات کا یہہ اثر دوسرے نظام ہائے قوانین میں بھی ہے۔ ہندوستان ہی کو لیجئے یہہ معلوم بات ہے کہ ہندوستان کے رواجی قانون کی واقفیت ہی نے مین (Maine) کو قانون کے نشو ونما سے متعلق تحقیقات شروع کرائی۔ اور بقول آلن ہندوستان میں قانون موضوعہ کا اقتدار ایک جدید چیز ہے۔ ورنہ یہاں کے قانون کا اکثر حصہ رواجات ہی پر مبنی تھا جس میں کچھ ترمیم آریائی اور برہمنی اثرات سے ہوئی تھی۔

اوپر کے سطروں میں رواج کی ماہیت اور وسعت بیان کی گئی۔ کہ انسان معاشری ہستی ہونے کی وجہ سے اپنے ہم جنسوں سے مل کے رہتا ہے۔ اور محض انسانوں کے مل کے رہنے کی وجہ سے رواج پیدا ہوتا ہے اور وہ قابل پابندی ہوتا ہے اکثر رواجات غیر نزاعی ہوتے ہیں۔ افراد معاشرہ کی ضرورت اور سہولت وغیرہ پر مبنی ہوتے ہیں۔ ابتدائی معاشروں میں یہی قانون ہوتے تھے۔ موجودہ جدید معاشروں میں بھی حال حال تک یہی قانون تھے اور ایک حد تک اب بھی ہیں۔ مثل دیگر قوانین کے انگریزی قانون میں بھی رواجات کو کافی دخل تھا اور گو اب قانون سازی اور نظائر کی وجہ سے رواجات کا اثر اور وسعت نسبتاً کم ہو گئی ہے تاہم اب بھی مثلاً دستوری قانون کے دائرہ میں ان کا کافی اثر ہے۔

رواج کی ابتداء ۔ علم اصول قانون میں باستثنائے جماعت متحدہ یا سند یافتہ کی شخصیت کے مسئلہ کے شاید ہی کوئی اور مسئلہ رواج کی ابتداء کے مسئلہ کے مانند مورد بحث رہا ہو۔ وجہہ یہہ ہے اس کے

ابتدائی معاشری مظاہر سے متعلق ہونے کی وجہ سے شہادت کم ملتی ہے۔ و نیز اس کی محرک قوتیں فرد اور معاشرہ کی نفسیاتی امور سے متعلق ہونے کی وجہ سے بڑی حد تک غیر یقینی ہوتی ہیں۔

قانون روما میں بھی رواج کی ابتدا سے متعلق کوئی متوافق اور جامع نظریہ نہیں ملتا۔ اس قانون میں ابتدا سے مجموعہ قوانین نافذ ہو جانے اور پیپیٹر وغیرہ فقیہوں کے اثرات کی وجہ سے رواج کو ایک ثانوی درجہ دیا گیا ہے۔ تاہم مجموعہ جسٹینین میں بھی ہر جگہ رواج کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ مثل پریٹر کے بنائے ہوئے قانون نصفت (Jus honorarium) کے رواج مکتوبی یا موضوعہ قانون کا بھی متمم مانا جاتا ہے۔ اور جہاں قانون موضوعہ ساکت ہو تو رواج خود قانون تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور اس کے جواز کے لئے کسی اقتدار کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ ایک استثنائی شکل میں تو رواج کو قانون روما میں غیر معمولی اہمیت اور اقتدار دیا گیا ہے۔ یعنے اگر قانون موضوعہ پر عمل نہ ہو تو اس عمل نہ ہونے کی وجہ سے قانون موضوعہ منسوخ متصور ہوتا تھا۔

اس طرح پر قانون روما میں بھی رواج ماخذ قانون تھا اور غالباً کوئی رومن فقیہہ بھی مثل آسٹن کے اس کے قانون تسلیم کئے جانے کے لئے یہہ ضروری نہیں سمجھتا تھا کہ ایک معین مقتدر اعلیٰ اس کو تسلیم کرے۔ تاہم ماخذہائے قوانین میں رواج کو قانون روما میں ایک ثانوی درجہ مجموعہ ہائے قوانین کے نفاذ اور شاہنشاہوں کے اقتدار کی وجہہ سے دیا گیا تھا۔ حال حال ہی میں ماخذہائے قانون میں رواج کی اعلیٰ اہمیت تسلیم کیگئی ہے۔ اور یہہ تاریخی مذہب کے اساتذہ کی وجہہ سے۔

اس اسکول یا مذہب کے نزدیک قانون حالات کی پیداوار ہے ہر قوم میں اس قوم کے قانونی ملکہ کی وجہہ سے پیدا ہوتا ہے۔ رواج از خود قانون ہے۔ بغیر قومی ضرورت کے وہ پیدا نہیں ہوتا۔ اور قومی خصوصیات کا وہ مظہر ہوتا ہے۔ ساوینی کے ان خیالات کو پخٹہ (Puchta) نے اور آگے بڑھایا۔ اس کے نزدیک رواج نہ صرف از خود قانون ہے اور اس کے جواز کے لئے کسی اقتدار کی ضرورت نہیں ہے بلکہ وہ تمام صحیح قانون سازی کے لئے شرط مقدم بھی ہے۔ رواج کی اساس قوم کا اجتماعی قانونی شعور اور ایقان ہے۔ اور وہی قانون سازی مفید ہوگی جو اس شعور و ایقان پر جس حد تک

وہ رواج میں ظاہر ہوا ہو مبنی ہو۔

"تاریخی اسکول کی قانون سازی سے خصوصاً جبکہ وہ مجموعۂ قانون کی شکل میں ہو بدگمانی اسی نقطۂ نظر کی وجہہ سے تھی۔"

الحاصل یہہ اسکول ابتدا (Volkgeist) سے کرتا ہے۔ اس لفظ کی کوئی تشریح نہیں کرتا بلکہ کہتا ہے کہ اس کو فی الواقع بطور ایک قدرتی مظاہر کے تسلیم کر لینا چاہیئے۔ یہہ ایک عمرانی واقعہ ہے اسی کے متعدد مظاہر میں قانون بھی ایک مظہر ہے۔ یہہ قوم کا ایک خاصہ ہے جو عملی تعلقات میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور اس (geist) یا خاصہ ملک کا وہ حصہ جو قانونی تعلقات میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس کو (Rechtsuberzeugung) یا قانونی ملک کہتے ہیں۔ اس خاصہ میں قانونی تعلقات میں خیر و شر کا شعور بھی داخل ہے۔ تمام قوانین چاہے انہیں جج اطلاق دیں یا مقننہ رائج بنائے اس قانونی ملک کے موافق ہونے چاہیں۔ ورنہ یہہ غلط اور برے ہونگے اور لازماً ناکام ہو جائیں گے۔ ہر ترقی یافتہ نظام قانونی کی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ اس قانون کو اطلاق دے جو قانون رہا ہے۔ جو قانون ہے اور جو قانون ہوگا۔ مصنوعی ایجادات صرف اس وقت جایز ہیں جب معاشرہ میں نئے ضرورتیں پیدا ہوں۔ یہہ صحیح ہے کہ قانون کے اطلاق دینے ججوں کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ان کا کام صرف قانون کو اطلاق دینا ہے۔ اس میں اضافہ کرنا نہیں ہے رواج ایک قاعدۂ عمل ہے۔ جج اور قانون کی تعبیر کرنے والوں کا کام منطقی فیصلے کرنا ہے۔ نہ کہ قواعد عمل بنانا۔ رواج کی ابتدا، اور اس کا جواز ذاتی اس کے اطلاق سے ایک علحدہ امر ہے۔ اور ان دونوں امور کو علحدہ رکھنا چاہیئے اور اس وقت بھی جبکہ جج قانون یا رواج کے معنوں سے متعلق نزاعات میں اپنی رائے دیتے ہیں تو وہ بحیثیت عوام کے نمایندوں کے دیتے ہیں۔ اور جتنی یہ رائے (Volkgeist) کے مطابق ہوتی ہے۔ اتنی ہی یہہ مفید اور منصفانہ ہوتی ہے۔

ساوینی کی تعلیم کا یہہ مختصر اور صحیح خلاصہ ہے۔ اس کا عمرانی رنگ ظاہر ہے۔ اگر ساوینی استاد ان ارتقا کے پہلے استاد ارتقا تھا تو وہ اہل عمرانیات کے پہلے عمرانی بھی تھا۔ لیکن اس کے نظریہ کے مشکلات

خصوصاً حجوں سے متعلق حصہ کی حد تک بہت سے ہیں۔ اور یہہ نظر یہ بابا ترمیم کے قبول نہیں کیا جا سکتا۔

(۱) ایک اعتراض یہہ ہے کہ بہت سے رواجات ایسے بھی ہیں۔ جو اپنی صداقت یا ضرورت یا سہولت عامہ کے لئے کسی "عام ایقان" پر مبنی نہیں ہیں۔ مثلاً غلامی ہی کو لیجئے۔ جو دنیائے قدیم میں ایک عالمگیر رسم تھی۔ ارسطو اگر اس کی حمایت کرتا ہے تو صرف انسانوں کی فطری عدم مساوات کی وجہہ سے۔ ورنہ عام طور پر وہ اس کا موافق نہیں سمجھا جا سکتا۔ عیسائیت کو بھی اس کے جواز پر شبہہ رہا ہے قانون قدرت کی رو سے اس کو صحیح نہیں تصور کیا گیا اور قانون اجانب ۔ قانون قدرت کا انطباق صرف غلامی کی وجہہ نا مکمل سمجھا گیا تھا۔ بہرحال غلامی کو قوم یا بنی نوع انسان کے عام ایقان پر مبنی کہنا کیسے درست ہو سکتا ہے جبکہ قوم یا بنی نوع انسان کا اکثر حصہ دنیائے قدیم میں غلام تھا۔ دراصل غلامی کا رواج ایک اقلیت یعنی حکمران جماعت کی سہولت پر مبنی تھا یہی حال جاگیری رواجات کا تھا ان کو عام طور پر عوام کی مرضی پر مبنی کہنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کیونکہ عوام کا اکثر حصہ امراء کا ماتحت تھا۔

(۲) یہہ بھی ہے کہ خود قومیت کا تصور حال کا ہے۔ ازمنہ وسطی میں اقوام کی تقسیم بلحاظ مذہب تھی نہ کہ بلحاظ قومیت اور اس زمانہ میں بہت سے رواجات تاجران جو پیدا ہو گئے وہ کسی ایک قوم کے عام ایقان کے مظاہر نہیں کہے جا سکتے۔ تجارتی اور دوسرے بہت سے ہمہ قومی رواجات کی موجودگی میں قومی عام ایقان (Volkgeist) کے تصور کے معنے بہت کم رہ جاتے ہیں۔ اس تصور میں فتوحات جملہ یا صلح کے ذریعہ سے فتوحات اور ان طریقوں سے رواجات کے پیدا ہو جانے کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے قانون بہت کم نجیب الطرفین ہوتا ہے۔ اور کسی بھی قانونی ادارہ کو قومی کہنا خطرناک ہے۔

(۳) (Volkgeist) یعنے قومی عام ایقان کہنے سے نفسیاتی اور غیر مادی امور کی بحث پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن کیا انسانی معاشروں کی طفولیت میں جبکہ رواج قائم ہوئے غیر مادی اور نفسیاتی امور پر زور دینا بہت کچھ فرض کر لینا نہیں ہے۔ ان دنوں تو زور مادی امور پر زیادہ دیا جاتا تھا اور تجربات پر کم۔ پہلے پتھر کو خدا سمجھ لیا جاتا تھا۔ رواج عمل ہے ہر ذی روح کے عمل کے دو پہلو ہوتے ہیں ایک ذہنی اور دوسرا خارجی۔ ذہنی پہلو جذبات اور تمناؤں پر مبنی ہوتا ہے اور خارجی پہلو عمل پر۔ عام ایقان پہ

دینے سے تاریخی اسکول کے اساتذہ ذہنی پہلو پر زور دیتے ہیں اور معاشرہ کی طفولیت میں ذہنی امور پر زور دینا صحیح نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اساوینی اور بخٹہ کے شاگرد اس کو ترک کر دیتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ قانون سے متعلق عام ایقان اگر کچھ تھا تو وہ ایک شعور کی حالت ذہنی تھا بہ نسبت فرضی پر مبنی کوئی خیال تھا۔ ساوینی کے بعد گیرک (Gierke) نے انسانوں کے ہر مجموعہ کو ایک شخصیہ بنا دیا ہے۔ یعنے ہر انسانی مجموعہ ایک شخص ہوتا ہے اور گیرک (Gierke) زیادہ تر زور عمل کے ذہنی پہلو پر نہیں بلکہ خارجی یا عملی پہلو پر دیتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے دیتے ہیں جو اوپر بیان ہوئی یعنے یہ کہ انسانوں کی طفولیت میں انسانوں کی نظر مادی امور پر رہتی تھی غیر مادی امور پر نہیں۔ مثلاً ملکیت کا مجرد تصور نہیں تھا بلکہ ملکیت کے لئے لٹ یا برچھا۔ یا زراعی زمین کا ڈھیلا حاصل کرنا ہی ملکیت حاصل کرنا سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے عوام کی اجتماعی زندگی میں ایقان کی تلاش کرتے وقت ہم کو رواج میں عمل (Practice) کے حصہ کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیئے۔ معاشرہ کی طفولیت میں عمل یا مشق یا متواتر عمل کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ اور رواج مادی مثالوں سے نشو نما پاتا ہے۔ رفتہ رفتہ عام تصورات مجرد حیثیت سے سمجھے جانے لگتے ہیں اور عام ایقان اور اس پر عمل دونوں کا اثر ہونے لگتا ہے۔ یعنے کوئی رواج اس وقت تک ظہور پذیر نہیں ہوتا جب تک اس کی کوئی وجہ یا اس میں کوئی سہولت نہ ہو۔

لیکن ہم کو یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ عمل سے بھی ایقان پیدا ہوتا ہے۔ بہت سے ایسے رواجات ہیں جو کسی شعوری ایقان پر مبنی نہیں ہوتے۔ یہ قوموں کا بھی تجربہ ہو سکتا ہے اور افراد کا بھی مثلاً جب کسی مقام سے یہ نہ معلوم ہو کہ منزل مقصود کا راستہ دو راستوں میں سے کون سا ہے تو آپ کس اصول پر ایک راستہ اختیار کرتے ہیں۔ یا جب ایک ہی قسم کے اشیاء میں مثلاً گنجفہ کے پتوں اور روپیوں کے نوٹس ایک ہی قسم کے قلموں۔ سوئیوں میں سے کسی ایک کو لینا ہوتا ہے تو آپ کس بناء پر انتخاب کرتے ہیں۔ یہاں کوئی خاص ترجیح کی وجہ نہیں ہوئی ہے اور آپ ایک راستہ یا ایک پتہ یونہی اختیار کرتے اور لے لیتے ہیں۔ یہی بہت سے رواجات کے نشو نما میں بھی واقع ہوتا ہے مثلاً

ہر ایک پر ہمیشہ سیدھے ہاتھ سے چلنے یا بائیں ہاتھ سے چلنے کے رواج میں کونسا عام اتفاق ہمارے فرما سکتے ہیں مگر ہر ملک کا علیحدہ علیحدہ طریقہ ہے۔ انگلستان میں ایک تو فرانس میں ایک۔ اسی طرح یوروپین کیوں سیدھے جانب سے لکھنے لگے اور مشرقی اقوام بائیں طرف سے۔ کوئی نہ کوئی ایک طریقہ اختیار کر لینا ضروری ہو جاتا ہے۔ لیکن ملحوظ رکھیے جب یہ اختیار کر لیا جائے تو پھر یہ مقرر و متعین ہو جاتا ہے۔ اس کے متعین ہونے میں علاوہ عادت کے نقل کے خاصہ کا بھی دخل ہے۔ اگر ہم بے لوثی سے اپنے روزمرہ کے افعال پر نظر ڈالیں تو ظاہر ہوگا کہ ہمارے بہت زیادہ افعال نقل پر اور بہت کم افعال عقل پر مبنی ہیں۔ چاہے ہم اس کو تسلیم کرنا پسند نہ کریں۔ اس میں سہولت بھی ہے اور اگر اصول کا سوال نہ ہو تو یہ عقلمندی بھی ہے۔ کیونکہ اس کے مطابق عمل کرنے میں نہ عمل کرنے سے کم تکلیف ہے۔

(۴) **رواج کی تعبیر اور اس کا اطلاق**۔ چونکہ بعض رواجات سے قانونی تعلقات بھی متاثر ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ فقیہوں اور عدالتوں کے زیر تنقیح آتے ہیں اس لئے رواجی قانون اور ججوں یا فقیہوں کے درمیانی تعلق کے متعلق دو نظریہ قابل غور ہیں۔

(۱) پہلا نظریہ تاریخی اسکول کے اساتذہ کا ہے۔ اور اس خصوص میں یہ اساتذہ اس مشکل میں ہیں کہ وہ یہ خوب جانتے ہیں کہ نظام ہائے قوانین اور اسی لئے رواج کے نشو نما میں ماہرین کی تعبیر کا اہم حصہ رہا ہے اتنا اہم کہ بادی النظر میں ماہرین واضعین نظر آتے ہیں۔ لیکن ماہرین کو واضعین سمجھنے سے عوام کے ملکہ قانون سازی پر کاری ضرب لگتی ہے۔ ساوینی اس کی یہ توضیح کرتے ہیں کہ "گو ابتدا میں قانون کو تمام قوم سمجھتی تھی اور وہی بناتی تھی لیکن زندگی کے گوناگون تعلقات کی وجہ سے وہ اپنی تفصیلات میں اس قدر نشو نما پا جاتا ہے کہ عوام اس کو سمجھ نہیں سکتے ہیں اس لئے ماہرین قانون کی ایک جماعت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ جماعت عوام ہی کی ایک جزو اور اس دائرہ قانون میں عوام کی نمایندہ ہوتی ہے"۔ یہ جماعت نہ صرف نظریہ قانون کی تھذیب اور اس کو ترقی دیتی ہے۔ بلکہ اس کو اطلاق بھی دیتی ہے۔ دونوں کاموں میں اس کا فرض ہے کہ موجودہ قانون کی جو قوم کے رواجات سے بنا ہے توضیح کرے اس کا یہ فرض نہیں ہے کہ اس میں اپنا کچھ اضافہ کرے۔ قانون کو ترقی تو

قوم ہی دیگی۔ فقیہہ کا کام یہہ ہے کہ اس ترقی کے دائرہ کے اندر ہی رہ کر تعبیر کرے"

یہہ نظریہ قابل اعتراض ہے کہ جب کوئی جج مثلاً حکم نامہ احضار شخص جاری کرتا ہے اور یہہ کہہ کر جاری کرتا ہے کہ انگریزی قانون کا یہہ بہت ہی بنیادی اور قدیم اصول ہے کہ حبس بیجا سے ہر شخص آزاد رکھا جائے تو یہہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک ایسے اصول کو بیان کر رہا ہے جو تمام برطانویوں کے ایقان میں موجود ہے لیکن جب وہ قانون اراضی کے کسی اصطلاحی اور سخت پیچیدہ امر کا فیصلہ کرتا ہے تو یہہ کہنا کہ یہہ بھی قوم کے ایقان میں داخل ہے صحیح نہیں ہے۔ حقیقت یہہ ہے کہ یہہ امر قوم کی سمجھ سے کوسوں دور ہوتا ہے اس طرح پر قانونی پیچیدہ مسائل میں یہ کہنا کہ جو جج کے ذہن میں ہوتا ہے وہ عوام کے ذہن میں بھی ہوتا ہے یا زبان فقیہہ بانِ خلق ہے صحیح نہیں ہے۔ قانونی تاریخ کے مبتدی پر بھی یہہ امر روشن ہو کہ تعبیر کنندوں یا فقیہوں کا اثر قانون پر کتنا گہرا رہا ہے۔

رومن فقہا ہی کو لیجئے۔ انھوں نے قانون روما کی شکل میں جریدہ عالم پر ایک لافانی یادگار چھوڑی ہے جو نہ جدید ہے نہ قدیم بلکہ ہر زماں اور مکان میں اس کے اصول اتنے بے مثال ہیں۔ کہ ان سے ثابت ہے کہ ذہن کے لافانی ہونے کے سامنے مادہ کا لافانی ہونا کوئی شیئے نہیں ہے فراموش نہ کیجئے کہ یہہ رومن فقیہہ نہ حکمران تھے نہ اوتار نہ قانون ساز اور نہ ان کی یاد باقی رکھنے کوئی اہم واقعات عوام کے دلوں میں جاگزین ہوگئے تھے۔ تاہم یہہ واقعہ ہے کہ ان سخت محنت کرنے والے عہدہ داروں اور فقیہوں کا اثر یورپ کے قانونی اداروں سے ان دو ہزار سالوں میں کبھی کلیتہً زائل نہیں ہوا ہے۔ جب تیسری صدی عیسوی میں آخری فقیہہ الپین نے اپنا کام ختم کیا تو روما میں زوال آغاز اور جاگزین ہو چکا تھا۔ اور چوتھی اور پانچویں صدی میں سلطنت روما میں سخت ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ اس زمانے میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان فقیہوں کی یہہ سب محنت رائیگاں گئی لیکن جسٹنین کے ہاتھوں یہہ پھر زندہ ہوئے۔ اور دنیا کا عظیم ترین (یہہ نہ سہی تو عظیم ترین مجموعوں میں سے ایک) مجموعہ قانون ایسے فقیہوں کے تصانیف سے بنایا گیا جو دو تین چار یا پانچ صدی پہلے مر چکے تھے۔ لیکن یہہ احیا بھی بظاہر دیرپا ثابت نہیں ہوا۔ پھر پانچ صدیوں تک یورپ پر تاریکی چھا گئی۔ عہد قدیم کے ان فقیہوں کی شمع محض ایک چراغ ہو گئی جس میں نہ روشنی رہی نہ گرمی۔ اس کے بعد پروونس

لمبارڈی۔ راوینا اور بولونہ میں دوسرا احیا ہوا۔ ایسا کہ یورپ کا کوئی ملک حتیٰ کہ انگلستان بھی جہاں اس کا اثر نسبتاً کم رہا ہے۔ اس کے اثر سے بے نیاز نہیں رہا۔ انگریزی ازمنہ وسطیٰ کا قانون بولونہ کا رہین منت ہے۔ نہ صرف براکٹن ہی نے یہاں سے تحصیل علم کیا تھا۔ بلکہ انگریزی جسٹینین یعنے ایڈورڈ اول نے یہاں سے ایک مشہور قانونی (Fransiscus Son of Accursius) کو لایا تھا اور اس کو عہدۂ جلیلہ پر سرفراز کیا تھا۔ براکٹن نے نہ صرف ازمنہ وسطیٰ کے قانون پر ایک اہم کتاب لکھی ہے بلکہ نظایر کے نظام کی بنیاد بھی اسی نے ڈالی ہے۔ لٹل ٹن نے بھی انگریزی قانون ارضی کی افراتفری میں ایک نظام قائم کیا ہے۔ لٹل ٹن کے متعلق کاک نے کہا ہے اور صحیح کہا ہے کہ "انھوں نے اپنی بہترین تصانیف اور کام سے جو وہ دوسروں سے سیکھے تھے عصر ہائے مابعد کے تمام پروفیسروں کو قانون سکھایا ہے" خود کاک بھی قانون کی شاہراہ پر ایک سنگ تختی ہے جو بے ڈول ہی سہی لیکن ایسی ہے کہ اس کی رہنمائی سے مفر نہیں۔ انگریزی قانون میں ان کی انتھک محنت اور دقت نظر کا بہت اثر رہا ہے اور کامن لا اور منصب عدالت کا نصب العین جو انگریزی نظام عدل گستری کی اساس ہے انہیں کا قائم کردہ ہے اٹھارویں صدی میں بلاکسٹن گو اپنے عظیم پیشروؤں کے مانند عظیم شخصیت کے حامل نہیں تھے لیکن شروحات لکھ کے انھوں نے قانونی تعلیم کی خدمت ایسے زمانہ میں کی جبکہ قانونی تعلیم گویا تھی ہی نہیں۔ ان کے شروحات کی ہر دلعزیزی قانونی تاریخ میں بے مثال ہے اور آج تک بھی انگریزی قانون میں ان سے اچھی کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔

فقیہوں کے اثر اور طاقت کی یہ چند جدید مثالیں ہیں ان کو عصری قانون سازی بھی مٹا نہیں سکی ہے ان کو کس حد تک "عوام کا نمائندہ" کہا جا سکتا ہے۔ یوں تو ہر غیر معمولی شخص اور ہر بیوقوف بھی اپنے زمانہ کی پیداوار ہوتا ہے اور البین کے لئے قانون روما میں سے غلامی کو خارج کرنا اتنا ہی ناممکن تھا جتنا کہ لٹلٹن کے لئے قانونی ارضی میں جسبری کو لازمی کرنا۔ اسی لئے اگر رومن کو قانون کا خاص ملکہ یا خداداد قابلیت (genius) نہیں ہوتی تو عہد قدیم کے رومن فقیہہ قانون روما کو اس کی موجودہ شکل نہیں دے سکتے۔ تاہم یہ تسلیم کرنا انفرادی فقہا کے اثر اور تخلیقی کارناموں کو نظر انداز کرنے کے

مترادف نہیں ہے۔ یہہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ قانون روما صرف حالات یا صرف دونوں ہی کا بنایا ہوا ہے۔ ان کا بنایا ہوا نہیں ہے۔

کیا رواج کو محض فقہا یا جج بناتے ہیں - یہہ متعابلہ علم اصول قانون کے بعض علما کی رائے ہے مثلاً مین نے اپنی کتاب (Ancient law) میں یہی قرار دیا ہے۔ اور جی اچ گرے نے اپنی کتاب[1] کے صفحہ (۲۹۷) میں یہہ حیرت انگیز جملہ لکھ دیا ہے کہ "غالباً قانونی تاریخ کی ہر منزل میں ججوں کے وضع کردہ قواعد سے رواج پیدا ہوا ہے نہ کہ رواج سے ججوں کے قواعد" اور فرانسیسی جورسٹ "میر" نے بھی اپنی کتاب[2] میں جج اول ای کو رواجی قانون کی قوت محرکہ کہا ہے اور ان کی رائے میں بیرونی عدالتی قواعد عمل کم و بیش سرعت کے ساتھ عدالتی رہنمائی کے مطابق ہو جاتے ہیں۔ پروفیسر ایہرلخ (E. Ehrlich) نے ایک درمیانی راہ اختیار کی ہے انھوں نے اس مسئلہ پر عمرانی نقطۂ نظر سے غور کر کے ججوں کے رواج پر اثر کو ست اہمیت دی ہے وہ یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ روما میں کم از کم شاہنشاہوں کے زمانہ تک رومن رواج سے مطلب ججوں کا وضع کردہ قانون Juristen-recht سمجھتے تھے۔ یہی نظام قانون میں جج آتا ہے رواج بغیر ججوں کے دخل کے قانون نہیں بنتا۔ لیکن وہ یہہ بھی کہتے ہیں اس کا یہہ مطلب نہیں ہے کہ جج نئے رواج بناتے ہیں نہ اس کا یہہ مطلب ہے کہ جج رواج کے نشو و نما پر اثر نہیں ڈالتے ہیں تاریخی اساتذہ کی بنیادی غلطی ان کی رائے میں یہہ ہے کہ انھوں نے ان قانونی قواعد عمل میں جو عدالتوں میں اطلاق دیئے جاتے ہیں اور ان قانونی تعلقات میں جو معاشرہ میں موجود ہوتے ہیں۔ فرق نہیں کیا ہے۔ یہہ دونوں علحدہ علحدہ چیزیں ہیں۔ اول الذکر مصنوعی اور عقل و منطق کی پیداوار ہیں موخر الذکر خود رو اور پیدائشی مثلاً خاندان و جائداد سے متعلق قانون یا معاہدہ سے متعلق قانون فقیہہ کے وظائف دو ہوتے ہیں ایک تو یہہ کہ اس کو مطالعہ اور ہمدردی سے یہہ دریافت کرنا چاہیئے کہ قوم میں قانونی ایقان کی کون سی لہریں موجود ہیں یعنی قوم میں کون کون سے قانونی تعلقات یا ان کو منضبط کرنے والے قواعد عمل موجود ہیں۔ اور پھر اس کے بعد معاشرہ میں جو قانونی تعلقات موجود ہوتے ہیں ان کے لئے عام اصول وضع کرنے چاہئیں یعنی ان قانونی تعلقات کو عام اصولوں کے تحت لانا چاہیئے۔ موخر الذکر وظیفہ

La function du Droit civil compare-[2] Nature & sources of law-[1]

ایک فنی کام ہے۔ جو عام ایقان اور عام شعور سے علیحدہ چیز ہے۔ اور ساوینی نے چونکہ یہ فرق نہیں کیا ہے اسی لئے وہ ججوں کے فنی کام کو قوم کے عام ایقان سے مخلوط کرتے ہیں۔

قانونی اداروں کے نشو نما میں ان دو گونہ اثرات کی مثال انگریزی قانون عمومی سے بھی دی جا سکتی ہے۔ بلاکسٹن اور ان سے پہلے اور ان کے بعد بھی بہت سے اساتذہ بنیادی قانونی اصولوں کو عہد قدیم سے قوم کے دل میں جاگزین اور اس کی خصوصیت بتاتے ہیں۔ اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ قانون عمومی میں رواج کے اجزا بہت پائے جاتے ہیں لیکن ساتھ ہی آج کل یہ بھی قانونی مورخوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ "رواج مملکت" بڑی حد تک "رواج عدالت" نہ کہ "رواج قوم" رہا ہے حتی کہ انگریزی قانون کے اصول کلات نسبت کے متعلق بھی اب تحقیق ہو چکا ہے کہ بارھویں صدی تک یہ عام رواج نہیں تھا ججوں نے اس کو پسند کیا۔ اور انہیں کے اثر سے تیرہویں صدی سے یہ عام رواج ہو گیا ہے۔

الحاصل یہ حقیقت ہے کہ رواجی قانون اور ججوں اور فقیہوں کی تعبیر کا ایک دوسرے پر عمل اور ردعمل ہوتا ہے اور رواج کے نشو و نما میں ججوں اور فقیہوں کے وضع قواعد کے کسی ایسے زمانہ کا خیال کرنا بھی ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ جس سے پہلے قانونی تعلقات کے وجود کو اور قانونی شعور و ایقان کو تصور نہ کیا جائے یہ قانونی ایقان یا شعور ممکن ہے کہ غیر متعین مبہم اور غیر اصولی ہو جب تک کہ ماہرانہ علم و فن اس کو تہذیب و ترتیب نہ دے۔ یہ قانونی ایقان و شعور تمام رواجی قانون کی اولین قوت محرکہ (Primum mobile) ہوتی ہے۔ میں نے علم اصول قانون میں ایک قابل ذکر اضافہ ابتدائی معاشروں میں رواجی قانون کے مکتوبی ہو جانے کے اثرات کی وضاحت کر کے کیا ہے۔ لیکن یقیناً انھوں نے جامعان و شارعان قانون کے تخلیقی اور وضعی فرائض یا وظائف میں مبالغہ سے کام لیا ہے۔ شارع کے لفظ سے بھی مغالطہ ہو سکتا ہے۔ شارع قانون اتنا واضع نہیں کرتے تھے جتنا کہ یہ قانون معلوم کرتے تھے۔ یعنی یہ کوئی نئے قواعد نہیں بناتے تھے بلکہ خاص مہارت اور دانشمندی سے ان اصولوں کو اطلاق دیتے تھے۔ جو معاشرتی تبدیلیوں سے معاشری ضروریات سہولت حس انصاف یا محض نقل کی وجہ سے پیدا ہو چکے تھے۔ وینو گراڈوف تاریخی علم اصول قانون صفحہ (۳۶۳) پر لکھتے ہیں کہ۔

"صاف طور پر معاشری رواجات کی ابتدا کسی مجلس یا عدالت سے نہیں ہوئی ہے۔ یہ آہستہ آہستہ گھروں اور خاندانوں کے روزمرہ کے تعلقات سے پیدا ہوتے ہیں، جج بعد میں جبکہ رواج قایم اور ان پر عمل ہوتا تھا پردۂ ظہور میں آئے ہیں۔ اور عام پسندیدگی کی تہدید میں عدالتی اور ماہرانہ توضیح اور توضیح لی تہدید کا اضافہ کرتے ہیں۔"

"Social customs themselves obviously did not take their origin from an assembly or tribunal. They grewup by gradual process in the house-holds and daily relations of the clans, and the magistrates only came in at a later stage, when the custom was already in operation, and added to the sanction of general recognition, the express formulation of Judicial and express authourity"

اس طرح اب بھی ساوینی کے نظریہ میں عصر جدید کے طلبا قانون کے لئے اہم سبق ہے کہ قوم کا بنایا ہوا ایک قانون ہوتا ہے اور اس کی ابتدا عمرانی واقعات کی وجہ سے ہوتی ہے مصنوعی واقعات سے نہیں ہوتی یعنے مثلاً کسی معین مقتدر اعلیٰ کے احکام سے نہیں ہوتی اس بنیادی قانون کے نشو و نما میں فقیہوں اور ججوں کی تعبیر کا ایک اہم اور لازمی حصہ ہوتا ہے۔ اور یہ حصہ زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ جیسے جیسے قانون ترقی کرتا اور اس کے اصول و اشکال معین ہوتے جاتے ہیں۔ اہرنگ کی تاریخی اسکول کی اہم تنقید صحیح معلوم ہوتی ہے یعنے ضروری ہے کہ ان تعلقات میں جو معاشرہ یا قوم میں عمرانی اسباب کی بنا پر قائم ہو جاتے ہیں اور ان قواعد عمل میں جو جج اور فقیہہ بناتے ہیں فرق کیا جائے۔ "تعبیر کے عمل پیہم سے رواج پر بہت تبدیلیاں ہو جاتی ہیں۔ بعض وقت اتنی کہ رواج باقی ہی نہیں رہتا۔" لیکن جج یا فقیہہ کو ہمیشہ ایسے اعمال سے سابقہ ہوتا ہے جو اولی واقعی معاشری تعلقات سے پیدا ہوتے ہیں۔"

'But always the jurist or the magistrate has to deal with

practices springing in the first instance from actual social relation-ships."

لفظ کے صحیح معنے میں جج یا فقیہہ رواج بناتے یا پیدا نہیں کرتے ہیں۔ اس سے آسٹن کے اس نظریہ کی غلطی ظاہر ہوگی کہ رواج اس وقت تک قانون نہیں ہے جب تک عدالتوں میں اس کو تسلیم نہ کیا جائے۔ حقیقت بالکل ہی اس کی ضد ہے۔ رواج اولین اور اہم ترین قانون ہے۔ لیکن منطق اور تعبیر کے اس پر استعمال کئے جانے سے اس میں تبدیلیاں واقع ہوجاتی ہیں۔ بعض وقت وہ بڑی حد تک بدل جاتا ہے اور بعض وقت وہ قابل عمل نہیں رہتا ہے۔

یہ ہیں رواج سے متعلق تاریخی اساتذہ کے مباحث۔ ان کا خلاصہ یہ ہوگا کہ تاریخی اساتذہ رواج کو اولین اور اہم ترین قانون سمجھتے ہیں۔ موجودہ قانون میں بھی اس کی وسعت کو تسلیم کرتے ہیں۔ رواج کی ماہیت سے متعلق ان کا بیان یہ ہے کہ معاشرہ کے محض وجود۔ افراد کے محض تعدد ہی سے یہ پیدا ہوتا ہے۔ اور اس کی ابتداء کو وہ قوم کے قانونی ملکہ سے منسوب کرتے ہیں۔ اس ملکہ کی وجہ سے قوم اپنی ضرورت، سہولت، اور اتفاق سے قواعد عمل بناتی ہے۔ عادت اور نقل کے فطرت انسان کے خواص کی وجہ سے ان پر عمل ہونے لگتا ہے اور مرور زمانہ سے ان میں تقدس پیدا ہوجاتا ہے۔ اور ہر عادتی عمل سے انحراف کو برا سمجھا جاتا ہے۔ اس نقطۂ نظر پر تنقید یہ کی گئی ہے کہ گو وہ اپنی حد تک صحیح ہو لیکن کسی ایک قوم کی حد تک اس کو محدود کرنا صحیح نہیں ہے۔ خارجی اثرات تجارتی یا عالمی رواجات کا اس میں پورا لحاظ نہیں ہے۔ بالعموم قانونی ادارے خالص قومی نہیں ہوتے عالمی ہوتے ہیں۔ رواج ایک انسانی ادارہ ہے۔ اسی لئے عالمی ہے۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ گو قواعد عمل یا رواج کی ابتداء معاشری تعلقات کی بناء پر قوم میں ہو۔ لیکن فقیہہ اور جج ان کو تہذیب اور اصولی شکل دیتے ہیں۔ اور اس فنی کام سے بھی بہت سے قواعد عمل وضع ہوتے ہیں۔ جو قوم کے قانونی ملکہ کے پیداوار نہیں ہوتے ہیں بلکہ عقل و منطق کے نتیجے ہوتے ہیں۔ فقیہوں کا کام یہہ بھی رہا ہے کہ قواعد عمل کو اصولی شکل دیکر ایک نظام میں مدون کریں۔ اور اس نظام کو متوافق متوازن اور عوام کی ضرورتوں کے موافق بنائیں۔

آخر میں رواج سے متعلق مباحث کو ختم کرنے سے پہلے ملحوظ رکھئے کہ ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ

آخر انسانوں میں رواج یا قانون کا اولین تصور پیدا ہی کیسے ہوا۔ اس کا ایک جواب یہہ دیا گیا ہے کہ وہ انسا
لئے طبعی یا پیدائشی ہے سوال یہہ ہے کہ کیا قانون کے کل مضامین طبعی ہیں؟ انسان کی طفولیت اور قانونی
کی وسعت پر نظر کرتے ہوئے یہہ خیال بداہتہً غلط ہو جاتا ہے۔ یہہ ہو سکتا ہے کہ صرف قانونی قواعد کا ضرور
کا شعور بلحاظ ان کے مضامین کے طبعی ہو۔ یہہ خیال اگر صحیح ہے تو پھر شروع ہی سے انسانی شعور میں قانون کا
تصور اس کی عام شکل میں مماثل تصورات مثلاً اخلاق مذہب وغیرہ سے صاف طور پر علحدہ پایا جانا چاہئے
لیکن حقیقت بالکل اس کے خلاف ہے انسانوں کی طفولیت میں قانون کا تصور ایک مادی شکل میں
پایا جاتا ہے۔ قانون کا عام تصور جو اس کے تمام مادی اجزا پر حاوی ہو نسبتاً بہت بعد پیدا ہوا ہے
ان پڑھ آدمی صرف متعدد علحدہ علحدہ قوانین یا قواعد عمل سے واقف ہوتا ہے۔ اس کا ذہن قانون
کے عام تصور سے روشناس نہیں ہوتا۔ اسی طرح قانون اور مذہب یا اخلاقیات میں فرق بہت
بعد میں کیا جانے لگا۔ ابتدائے معاشرت میں قانونی اخلاق اور مذہب سب ایک ہی سمجھے جاتے تھے
اس لئے اس نقطہ نظر سے قانون کے تصور کو طبعی نہیں کہہ سکتے۔

قانون کا تصور طبعی ہی نہیں، تو پھر یہ انسانوں میں پیدا کیسے ہوا۔ اس کا جواب یہہ دیا گیا ہے کہ
وہ معاشرہ کی طفولیت میں غیر شعوری طور پر انسانوں میں پیدا ہوا ہے۔ تصور قانون کا مواد یا مضمون
غیر شعوری طور پر فراہم ہوا ہے۔ قانونی قواعد عمل غیر شعوری طور پر قائم ہوئے ہیں۔ مرضی سے یا ارادی
طور پر نہیں قایم ہوئے ہیں۔

ان قضیوں کو سمجھنے شعوری عمل کی ابتدا سمجھنا ہوگا۔ نفسیات جدید میں شعوری ارادہ
(Consoious wills) کو پیدائشی نہیں مانا جاتا ہے۔ چنانچہ (Bain) نے اپنی کتاب[1]
میں ارادہ کے واقعہ کی توجیہہ نفسیات قانون تلازم Law of association سے کی ہے۔ بین
کی رائے میں ارادہ انسان کے لئے طبعی نہیں ہے۔ انسان کی طفولیت میں وہ انسانی ذہن کا خاصہ
نہیں ہے وہ نفسیاتی ترقی کی ایک پیداوار ہے انسان کی طفولیت میں انسان غیر شعوری طور پر عمل کرتا تھا
کیونکہ اس کی عضویت کی خود رو حرکت اس کو عمل پر مجبور کرتی تھی۔ عضویت کی یہ حرکت اس اعصابی

[1] "The Emotions and the wills."

قوت کی وجہ سے ہوتی ہے۔ جو ہمارے جسموں میں زندگی کی وجہ سے پیدا اور جمع ہوتی ہیں جنین کی رحم میں حرکت کی یہی وجہ ہے بچے اچھلتے کودتے روتے اور دوڑتے اسی وجہ سے ہیں اور ہم بھی ایک تھکا دینے والی بیکاری کے بعد بلا وجہ اور بے سوچے سمجھے کام اسی لئے کرنے لگتے ہیں لیکن تمام افعال جو ہم غیر شعوری طور پر کرتے ہیں شعور میں دو تصور چھوڑتے ہیں۔ ایک تصور تو عمل کا ہوتا ہے۔ اور دوسرا عمل کے نتایج کا کہ وہ پسندیدہ ہیں یا غیر پسندیدہ۔ تجربہ جتنے زیادہ مرتبہ کیا جاتا ہے اتنا ہی ہمارے ذہن میں ان دو تصورات کی یاد اور خیال یعنے تلازم (Association) پختہ ہوتا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ جب ہم عمل کو یاد کرتے ہیں تو اس کا بساتھی تصور یعنے پسندیدہ یا غیر پسندیدہ نتایج کا تصور بھی یاد آجاتا ہے۔ اور اس طرح پر ہم عمل کو اچھا یا برا، مطلوب یا قابل اجتناب سمجھنے لگتے ہیں۔ ان دو تصورات کا تلازم جتنا زیادہ قوی ہوگا ہمارے خواہشات بھی اتنے ہی معین و مستقل ہوں گے اور ان کا تلازم جتنا کمزور ہوگا خواہشات بھی اتنے ہی کمزور رہوں گے۔ لیکن عمل یا اس کے نتایج کی یاد سے جب شعوری طور پر خواہش پیدا بھی ہو تو یہ عمل کے لئے کافی نہیں ہے بہت سی خواہشات پورے نہیں ہوتے بہت سے ارمان نہیں نکلتے ہم ان کے لئے کوشش اور عمل نہیں کرتے۔ عمل کرنے کے لئے اعصاب میں قوت جمع ہونی چاہیئے۔ اعصابی نظام کی حالت کے لحاظ سے کہ وہ کمزور ہے یا قوی خواہشات جامہ عمل پہنتی ہیں۔ یا حرف آرزو ہی بن کے رہ جاتے ہیں۔

اسٹن تھل[1] نے زبان کی ابتداء کی توجیہہ بھی اسی طرح کی ہے۔ جذبات سے متاثر ہو کر آدمی غیر ارادی طور پر آوازیں کرتا ہے۔ جن سے اس پر اور اس کے ہم نوع پر ایک اثر ہوتا ہے۔ دوبارہ اعید ہوتی میں آہستہ آہستہ اس آواز کے تصور اور اس سے جو اثر پیدا ہوا اس میں تلازم زیادہ گہرا ہوتا جاتا ہے۔ تلازم کی وجہ سے اس اثر کے تصور سے آواز کا تصور ذہن میں پیدا ہوتا ہے اور اگر اثر پسندیدہ ہو تو آواز شعوری طور پر نکالی جاتی ہے۔ اس تلازم کی وجہ سے غیر ارادی آوازیں شعوری طور پر بولے ہوئے الفاظ میں بدل جاتی ہیں۔ اس اثر کا تصور آواز سے مل کر لفظ کے معنے بن جاتے ہیں۔

[1] Steinthal(Abrissder sprach wissenschaft).

بقول کرکونا وٹ قانون کی ابتداء کی بھی اسی طرح توجیہہ کی جا سکتی ہے ۔

معاشرہ کی طفولیت میں حالات یکساں اور تعلقات سیدھے سادھے ہوتے ہیں ۔ اسی لئے اس سے افراد لازماً یکساں طریقہ پر رہتے ہیں اور انسان اپنے بنی نوع اور اپنے آبا و اجداد کی طرح عمل کرتا ہے ۔ کیونکہ افعال یا اعمال کا شعوری تصور بہت ہی کمزور ہوتا ہے ۔ تجربہ سے حاصل شدہ تصورات بہت ہی تھوڑے ہوتے ہیں ۔ اور گھڑی گھڑی ان ہی کا اعادہ ہوتا ہے نقل کا رجحان بھی نہایت قوی ہوتا ہے ان وجوہات سے معاشرہ کی طفولیت میں انسان بالکل اپنے بنی نوع اور اپنے آبا و اجداد کی طرح عمل کرتا ہے اسی لئے ہر شخص کو یقین ہو جاتا ہے کہ انھیں حالات میں ہر شخص اسی طرح عمل کرے گا ۔ وہ عادی غیر تبدل عمل کی توقع کرنے لگتا ہے ۔ اس پر بھروسہ کرتا ہے اور اپنے معاملات کو بھی اسی توقع کے لحاظ سے ترتیب دیتا ہے اگر کبھی اس کے خلاف توقع کوئی فعل ہوتا ہے ۔ یعنے کوئی شخص اس کے ساتھ اس کے اس توقع کے مطابق عمل نہیں کرتا ہے تو اسے بے اطمینانی ہوتی اور غصہ آتا ہے ۔ وہ اپنے توقعات کو درہم برہم کرنے والے کو برا بھلا کہتا اور اس سے بدلہ لینے کی کوشش کرتا ہے ۔ ایسے تصادم جتنے زیادہ مرتبہ ہوں ۔ اتنا ہی رواج کے مقررہ عمل سے انحراف کے تصور اور انحراف سے نقصان اٹھانے والے شخص کے برا بھلا کہنے ، غصہ اور بدلہ لینے کے تصور میں تلازم پیدا ہو جاتا ہے اور اس طرح پر رواجات پر عمل جو پہلے جبلی اور غیر شعوری ہوتا ہے ۔ ایک شعوری تصور میں متبدل اور قائم ہو جاتا ہے اور بالآخر رواج پر عمل صرف عادت اور غیر شعوری میلان ہی کی وجہ سے نہیں ہوتا ہے بلکہ ان ناپسندیدہ نتائج کے تصور سے بھی جو رواج سے انحراف کرنے سے پیدا ہوتے ہیں ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رواج کے واجب العمل جبری ہونے کا تصور پیدا ہو جاتا ہے ۔ اور رواج پر عمل باوجود اس سے انحراف میں کوئی مفاد یا فائدہ یا انحراف کا کوئی رجحان ہونے کے اس لئے کیا جاتا ہے کہ انحراف کے ناخوشگوار نتائج سے بچا جائے ضرورت یعنے لزوم یا واجب التعمیل ہونے کے تصور (opinio necessitatis) کے ظہور سے ایک ایک سیدھی سادی عادت جس پر جبلی اور غیر شعوری طور پر عمل ہوتا تھا قانونی رواج میں بدل جاتی ہے جس پر شعوری طور پر عمل ہوتا ہے اور جو واجب التعمیل تصور کی جاتی ہے یہی رواج قانونی قواعد عمل کی ابتدائی شکل

ہے اور قانون کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ بعض قواعد عمل (primitive from) غیر شعوری طور پر عمل کیا جاتا اور ان کو واجب التعمیل یا جبری تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ ابتدائی قانونی قواعد عمل یا ان کا مواد یا مضمون شعوری طور پر قائم نہیں ہوتا ہے بلکہ غیر شعوری طور پر قدیم رواجات سے قائم ہوتا ہے۔

قانون کی ابتدا کی اس توجیہہ سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ کیوں انسان کی طفولیت میں قانون کو انسان کی مرضی سے آزاد حکم تصور کیا جاتا تھا۔ اور کیوں اس کے لئے ایک آسمانی ماخذ کی تلاش ہوتی تھی۔ انسانی شعور قانون کو غیر شعوری طور پر قائم شدہ رواجات کی وجہ سے قائم اور مقرر پاتا ہے[۱]۔ اور چونکہ انسان ان رواجات کی ابتدا کی قدرتی توجیہہ نہیں کرسکا۔ اس لئے بقول کرکوناف وہ قانون کو ایک آسمانی ادارہ سمجھنے لگا۔ اور اس طرح پر قانون انسان کی نظروں میں ایک معروضی نظام ہے جو انسانی ارادہ سے آزاد انسانی مرضی کا کوئی دخل نہیں ہے اور انسان کے آزادانہ انتخاب کا اس میں دخل نہیں ہے۔

قدیم رواجات کو جبری سمجھتے ہوئے انسان ان کے ابتدائی شکل اور مواد یا مضمون میں کوئی فرق نہیں کرتا ہے وہ ان کی شکل اور مواد دونوں پر عمل کو قطعی طور پر واجب التعمیل سمجھتا ہے۔ اسی لئے قانون کی ترقی کے ابتدائی منازل میں حد سے زیادہ اور نہایت سخت ضابطہ پسندی rigid formalism ہوتی ہے۔

اور اگر بلحاظ ان کے مضمون کے قدیم رواجات جبری یعنے واجب التعمیل سمجھے گئے۔ تو اسی سے ابتدائی معاشرہ میں اخلاق۔ مذہب اور سہولت پر مبنی قواعد عمل میں پورے پورے خلط ملط کی توجیہہ ہوتی ہے۔ رواج کے مباحث میں تاریخی اساتذہ کی دقت نظر اوپر کے ایک سرسری خاکہ سے ظاہر ہوگی۔ مقابلہ کے لئے تحلیلی اساتذہ کے سطحی مباحث مضمون کے ابتدا میں علحدہ لکھے گئے۔ دونوں مذاہب کے مضمون سمجھانے کا فرق ان مباحث سے واضح ہوگا۔ تاریخی اساتذہ تاریخ سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور مضمون کی تہہ تک جاتے ہیں تو تحلیلی اساتذہ صرف حدود کے مفہوم متعین کرتے ہیں۔ اور تاریخ سے بے اعتنائی کرتے ہیں۔

[۱] Human Consciousness finds law alreay established and set up as the result of customs unconsciously established."

عدالتی عمل ۔ (الف) نظیر ۔

اس عنوان کے تحت ہم پہلے (۱) نظایر کی تعریف کریں گے پھر (۲) نظایر اور رواج میں مشابہت اور فرق کو ظاہر کریں گے ۔ اس کے بعد (۳) استقراری و اصلی نظایر کو بیان کرینگے پھر (۴) نظایر کے تعمیری ہونے اور تنسیخی نہ ہونے کا ذکر آئے گا پھر (۵) وقعت نظایر کا ذکر کیا جائے گا اور آخر میں (۶) نظام نظایر کے حسن و قبح پر ایک نظر ڈالی جائے گی ۔

تعریف :۔ نظایر ماخذ قانون ہیں اور اس لئے ہیں کہ ان کے ذریعہ کوئی قاعدہ عمل یکساں معلوم اور جبری قاعدہ عمل کی یعنے قانون کی صورت اختیار کرتا ہے ۔

رواج و نظایر کا مقابلہ ۔ رواج اور نظایر میں مشابہت تو یہ ہے کہ مثل رواج کے نظایر بھی واقعات پر مبنی اور بالعموم انھیں تک محدود ہوتے ہیں ۔ اور مثل رواج کے نظایر سے متعلق عام تصور یہی ہے کہ وہ کسی موجودہ جبری اصول ہی کو اطلاق دیتی ہیں ۔ اس کے برخلاف رواج اور نظایر میں فرق یہ ہے کہ نظیر ایک شعوری فعل ہوتی ہے ۔ اس کے برخلاف رواج ہم دیکھ چکے ہیں کہ ایک غیر شعوری عادت ہوتی ہے ۔ یہ عادت یا عادتی عمل یا برتاؤ قانون یا قانونی قاعدہ عمل اس وقت بن جاتا ہے جبکہ اس کے جبری ہونے کا شعور پیدا ہوتا ہے ۔ رواج کے ایک غیر شعوری عادتی عمل ہونے کی وجہ سے اس کا مواد یا مضمون غیر شعوری طور ہی پر مہیا ہوتا ہے ۔ یعنے عادتی عمل سے مہیا ہوتا ہے قانونی شعور جس سے ایک سیدھا سادھا عادتی عمل قانونی عمل رواج یا قانونی قاعدہ عمل بن جاتا ہے اس قاعدہ عمل کا مضمون عادتی عمل یا عادتی اعمال میں موجود پاتا ہے ۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ برخلاف رواج کے نظایر ایک خاص قانونی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں یعنے احکام اور فیصلہ جات کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں ۔ اور اسی لئے تحریری ہوتے ہیں ۔ رواج بالعموم غیر تحریری ہوتے ہیں شعوری فعل ہونے اور خاص قانونی شکل (Form) کے حامل ہونے میں نظایر ۔ قانون سازی (Legislation) سے مشابہ ہوتے ہیں ۔

استقراری و اصلی نظائر ۔ بقول ہالینڈ قانون کے اس ماخذ کی ماہیت کے متعلق دو نظریے ہیں ایک تو یہہ کہ جج نظائر یعنے فیصلوں کے ذریعہ سے نیا قانون نہیں بناتے ہیں بلکہ وہ صرف موجودہ قانون کی تشریح وضاحت تعین ۔ اعلان اور استقرار کرتے ہیں ۔ یہہ قدیم انگریزی نظریہ ہے ۔ بلاکسٹن کی یہہ رائے تھی اور ججوں میں لارڈ ہیل اور لارڈ ایشر سے لیکر حال حال کے جج مثلاً لارڈ جسٹس اسکرٹن بھی یہی کہتے آئے ہیں ۔ اور سامنڈ اس نظریہ کو نظائر کے متعلق استقراری نظریہ کہتے ہیں ۔ اس نظریہ کی بنتھم نے ہنسی اڑائی ہے وہ کہتے ہیں کہ عملاً جج قانون بناتے ہیں لیکن تسلیم نہیں کرتے ۔ اور اصولاً انہیں قانون نہیں بنانا چاہیئے ۔ بلکہ موجودہ قوانین کی تعبیر و اطلاق تک اپنے فرائیض کو محدود رکھنا چاہیئے ۔ آسٹن بھی بنتھم سے اس امر میں متفق ہیں کہ جج بہت کچھہ قانون سازی کرتے ہیں لیکن کہتے ہیں کہ کو اس اصول پر جائز رکھنا چاہیئے کہ وہ مقتدر اعلی کے نائیبوں کی حیثیت سے قانون سازی کرتے ہیں ۔ اور صحیح بات یہی ہے کہ جج قانون بناتے ہیں کیونکہ ان کے روبرو ایسے بھی نئے حالات آتے ہیں جن کے تصفیہ کے لئے پہلے سے کوئی قانون نہیں ہوتا ۔
ان امور کا فیصلہ کرنے سے جج نیا قانون بناتے ہیں ۔ اور یہی نہیں بلکہ موجودہ قوانین کو بھی جج ایک حد تک متغیر الحال معاشری ضرورتوں کے مطابق رکھنے اور نصفتانہ اصول پر عمل کرنے کے لئے اپنی تعبیر کے ذریعہ سے بدل دیتے ہیں ۔ بغرض بقول سامنڈ عدالت چانسری میں یا اب اسی عدالت کے اختیارات جو ججوں کو حاصل ہیں ۔ ان کا لحاظ کرتے ہوئے ۔ نظریہ استقرار کی غلطی توبین اور بدیہی ثابت ہوتی ہے ۔ کیونکہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ایکوئٹی یا نصفت کے اصول موجودہ قانون یعنے رواج یا قانون موضوعہ پر مبنی ہوتے ہیں یہہ اصول تو یکے بعد دیگرے جو چانسلر مقرر ہوتے تھے ان کے عدالتی فیصلوں یعنے نظائر ہی سے وضع ہوتے تھے اس طرح پر ظاہر ہے کہ نظائر یا تو استقراری (Declaratory) ہوتے ہیں یا اصلی (Original) استقراری نظیر میں کسی موجودہ قانون کو اطلاق دیا جاتا ہے اور اصلی نظیر میں کوئی نیا قانون وضع ہوتا ہے ۔
لیکن جج جو قانون بناتے ہیں ۔ جیسا کہ آلن نے اپنی کتاب کے صفحات ۱۰۷ تا ۱۷۷ میں بتایا ہے

ایک قانونی معنی ہی میں بناتے ہیں۔ ان کا اہم کام تعبیر قانون ہے۔ وہ تعبیر کرتے ہوئے نیا قانون ان صورتوں کے لئے بناتے ہیں جو قانون کے عام الفاظ کے تحت نہیں آتی ہیں۔ یا جن پر اب تک کوئی قانون نہیں ہوتا ہے مثلاً کسی قانون میں لفظ مویشی (Cattle) استعمال ہوا ہو۔ تو پہلی دفعہ یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا گھوڑا بھی اس میں داخل ہے۔ ججوں کی تعبیر سے گھوڑا بھی اس میں داخل ہو سکتا ہے اور اس حد تک فیصلہ کے بعد یہ نیا قانون ہو جاتا ہے۔ یا یہ کہ سنہ ۱۹۲۰ء تک یہ سوال عدالت میں نہیں آیا تھا کہ آیا کوئی شخص اپنی بلی کے ہمسایہ کے کبوتر کھا جانے پر ذمہ دار قرار دیا جاسکتا ہے۔[1] نہ سنہ ۱۹۲۶ء تک یہ سوال کہ آیا آپ کے کمپونڈ کا درخت شاہراہ پر بغیر آپ کی کسی غفلت کے گر کر اور ایک راستہ چلنے والے کو ضرر پہونچائے تو کیا آپ ذمہ دار ٹھہرائے جاسکتے ہیں۔[2]

ایسی صورتوں میں عدالتیں اپنی قرار دادوں سے قانون بناتی ہیں۔ لیکن ملحوظ رکھیے کہ وہ ان امور میں بھی جو تصفیہ کرتی ہیں، وہ گو عقل سے کرتی ہیں۔ لیکن بقول لارڈ کک یہ عقل راستہ والے کی عقل نہیں ہوتی۔ بلکہ قانونی ماہروں کی عقل ہوتی ہے۔ جو دوسرے اصول ہائے قانون اور انصاف سے مزین ہوتی ہے۔ جج کی پوری کوشش قانون کی دریافت پر منحصر ہوتی ہے۔ قانون کے بنانے پر نہیں۔ اسی لئے وہ ماضی اور حال کے مواد ہی سے کام کرتا ہے۔ برخلاف اس کے مقننہ بالکل نئے مواد سے کام کرتی ہے۔ کوئی جج بحیثیت جج کے مثلاً متفرق مزدوروں کے معاوضہ کے دلانے سے متعلق قانون نہیں بنا سکتا۔ نہ قوم کی صحت کے لئے بیمہ کے قواعد وضع کر سکتا ہے نہ حق رائے دہی دے سکتا یا موسم گرما کا وقت مقرر کر سکتا ہے۔ وغیرہ۔ مقننہ یہ سب کچھ کر سکتی ہے۔ اس طرح پر جج موجودہ مواد سے کام لیتے ہیں۔ فی الجملہ اسی کے اندر رہتے ہیں۔ اس کے برخلاف مقننہ بالکل ہی نئے مواد سے کام لیتی ہے۔ وہ قانون سازی کرتی ہے اور جج قانون کی تعبیر کرتے ہیں۔

مقننہ اور ججوں کے "قانون سازی" کے دائروں پر غور کیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ یہ بالکل علٰحدہ

[1] ہارٹ بنام ہارمان۔ سنہ ۱۹۱۹ء ۔ ۲ کنگس بنچ (۴۷۵)

[2] نوبل بنام ہیریسان سنہ ۱۹۲۶ء ۔ ۲ کنگس بنچ (۳۳۲)

علیٰحدہ ہوتے ہیں قانون کے اس حصہ میں جو فرد کے فرد سے تعلقات پر مبنی ہے یعنے قانون خاص کے دائرہ میں مقننہ بہت کم دخل دیتی ہے اور دخل دیتی بھی ہے تو ججوں کے بنائے ہوے اصولوں کو ملحوظ رکھ کے۔ مثلاً اس کی توقع کم ہے کہ مقننہ یہ قانون بنائے کہ معاہدہ کے لئے بدل ضروری نہیں ہوگا۔ یا یہ کہ ملزم کو جب تک کہ وہ مجرم نہ قرار پائے معصوم نہ تصور کیا جائے۔ یا یہ کہ مداخلت بیجا صرف ارادہ کے ثبوت کے بعد ہی ضرر تصور کیا جائے۔ یا یہ کہ توہین زبانی بنفسہ قابل نالش ہوگی۔ مقننہ زیادہ تر فرد اور مملکت کے درمیانی معاملات یعنے قانون عام کے دائرہ میں قانون سازی کرتی ہے اور فرد اور فرد کے تعلقات کے دائرہ کو ججوں کے لئے بالعموم چھوڑ دیتی ہے۔

نظائر تعمیری ہوتے ہیں تنسیخی نہیں ۔ ابھی ہم اس نظریہ کی غلطی دیکھ چکے ہیں۔ کہ تمام نظائر استقراری ہوتے ہیں یعنے موجودہ قانون کا استقرار وضاحت تعین اور اعلان کرتے ہیں اور ہم نے دیکھا ہے کہ نظائر قانون بناتے بھی ہیں۔ نظائر کے ذریعہ سے قانون سازی کے متعلق ملحوظ رکھیئے کہ ان کے ذریعہ سے نیا قانون ضرور بنتا ہے۔ لیکن نظائر میں یہ قوت نہیں ہوتی کہ وہ موجودہ قانون کو بدل کر یا منسوخ کرکے اس کے بجائے کوئی نیا قانون وضع کریں۔ یعنے نظائر ان امور پر قانون بناتے ہیں جن پر کوئی قانون نہ ہو۔ لیکن اگر کسی امر پر قانون موجود ہو تو وہ اس کو منسوخ کرکے نیا قانون اوس کی بجائے نہیں بنا سکتے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ نظائر کے ذریعہ سے قانون سازی یا خود نظائر تعمیری ہوتے ہیں تنسیخی نہیں ہوتے۔ لیکن اس اصول کے متعلق دو امور ملحوظ رکھیئے (۱) جب کوئی عدالت بالادست کسی ماتحت عدالت کی نظیر پر عمل نہیں کرتی یا اس کو برقرار نہیں رکھتی ہے تو اس کا فعل عملاً منسوخی کے برابر ہے لیکن قانوناً نہیں کیونکہ کسی نظیر کو برقرار نہ رکھنے کے معنے یہ ہیں کہ قرار یہ دیا جاتا ہے کہ وہ کبھی قانون تھی ہی نہیں اس لئے برقرار نہ رکھنے والی نظیر کا اثر استقراری ہوتا ہے اور تاریخ فیصلہ سے نہیں بلکہ اس سے پہلے سے نافذ ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے کوئی قانون موضوعہ جب کبھی وہ منسوخ ہوتا ہے۔ تو منسوخ کرنے والے قانون موضوعہ کا اثر تاریخ تنسیخ سے ہوتا ہے۔ اس سے پہلے نہیں ہوتا۔ کیونکہ سمجھا جاتا ہے کہ منسوخ شدہ قانون موضوعہ تاریخ تنسیخ تک قانون تھا۔ اور

تاریخ تنسیخ کے بعد بھی ان معاملات پر جو تاریخ تنسیخ سے پہلے کئے جائیں قابل اطلاق ہوتا ہے
(۲) نیز گو یہہ صحیح ہے کہ جب کوئی قانون موجود ہو تو ججوں کو اسی کو اطلاق دینا چاہیئے
نہیں چاہیئے ۔ مگر فرض کیجئے کہ بے خبری نادانستگی یا عمداً بھی اگر جج کسی موجودہ قانون کو بدل کر نئا
ذریعہ سے کوئی نیا قانون وضع کردے تو بمجرائے اصول کہ جس امر کو نہیں کیا جانا چاہیئے تھا
کیا جائے تو کئے جانے کے بعد وہ صحیح ہوجاتا ہے" یہہ قانون یا نظیر درست قانون ہوتی ہے
دارالامراء اگر کوئی غلط قانون بنا دے تو اس کے واجب التعمیل ہونے میں شبہہ کی گنجایش نہیں ۔
وقعت نظایر :۔ نظایر کی وقعت کے متعلق بھی دو نظریے ہیں۔ بر یوروپ میں ز
مفید سہی لیکن عدالتوں پر قابل پابندی نہیں ہوتے ہیں۔ وہاں اصول یہہ ہے کہ عدالتوں کا
ہر درجہ کی عدالتوں کا فریضہ یہ ہے کہ انصاف کرے ۔ اسی لئے ان کو انصاف کرنے کے
آزاد رہنا چاہیئے۔ بر یوروپ کے ممالک کو یہہ نظریہ قانون روما سے ورثتاً ملا ہے ۔جہاں جر
ایک فرمان کے ۔ وسے بالآخر نظایر واجب التعمیل نہیں رہے ۔ پرشیا اور اسٹریا کے مجم
قوانین میں نظایر کے عدالتوں پر واجب التعمیل نہ ہونے کا صریح حکم موجود ہے ۔ فرانس اطالیہ
بلجیم کے مجموعہائے قوانین میں گو صریح حکم موجود نہیں لیکن عمل یہی ہے کہ عدالتوں کے لئے نظا
اور سبق آموز ہیں لیکن قابل پابندی اور واجب التعمیل نہیں ۔ اس کے برخلاف انگریزی اور امریکا
کا اصول ہے کہ ان ممالک کے نظایر ان ممالک کی عدالتوں پر قابل پابندی اور واجب التعمیل ہ
انگریزی قانون میں اس اصول پر ۱۸۳۳ء یا ۱۸۶۲ء سے عمل ہے ۔ اگر کسی امر پر کوئی صاف ن
ہو تو چاہے وہ جج اس کو پسند کریں یا نہ کریں اس پر عمل کرنا ان کے لئے ضروری ہے اس تاریخ
قبل انگریزی قانون میں بھی گو نظایر کو عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا لیکن وہ واجب التعمیل نہ
اور اصول یہہ تھا کہ ججوں کو جو صحیح اصول قانون ہو اسی پر عمل کرنا چاہیئے ۔ اس تاریخ کے بعد سے
صرف انگریزی نظایر انگریزی عدالتوں پر واجب التعمیل ہیں بلکہ کافی وضاحت کے ساتھ عدالتوں
تعیم کردی گئی ہے چنانچہ دارالامراء کے فیصلے انگلستان کی تمام دوسری عدالتوں اور خود دارالامراء پر واجب التعمیل ہیں اور گو دارالامراء کا کوئی
غلط بھی ہو جائے ۔

Sic fer non delictactum valet ۔

تب بھی اصولاً دارالامراء کو اسکی پابندی لازمی ہے۔ کیونکہ بقول ایک فاضل جج[1] کے "قانون کا معین ہونا اس سے کہیں بہتر ہے کہ جج اس کی اصلاح کریں"۔ غلط قانون پر عمل کرنا اتنا مضر نہیں جتنا کہ قانون کا غیر معین ہونا" اور قانون کی غلطی کی اصلاح پارلیمنٹ کے ذریعہ ہوسکتی ہے۔ عملاً دارالامراء نے بعض صورتوں میں اپنے فیصلوں کی پابندی نہیں کی ہے۔ کیونکہ اصول یہ ہے کہ صرف بنار فیصلہ قابل پابندی ہے اور کسی ایک مقدمہ کے بنار فیصلہ کو معین کرنے میں انھوں نے بہت ہوشیاری دکھائی ہے۔ پریوی کونسل کے فیصلہ اصولاً انگریزی عدالتوں پر واجب التعمیل نہیں ہیں لیکن عملاً ان پر اکثر صورتوں میں عمل کیا جاتا ہے۔ عدالت مرافعہ کے فیصلے تمام ماتحت عدالتوں پر واجب التعمیل ہیں۔ اور رجحان یہ ہے کہ خود اس کے فیصلے اس پر واجب التعمیل ہوں۔ عدالت مرافعہ کے اجلاس کاملہ کے فیصلے تو غیر کاملہ اجلاس پر قابل پابندی ہیں۔

انگریزی اور امریکی نظام قانون کے متعلق جہاں نظائر واجب التعمیل ہیں اور اس پر اچھی طرح عمل کرنے کے لئے عدالتوں میں فرق مراتب ہیں حسب ذیل اصول قابل لحاظ ہیں۔

(۱) فیصلہ چاہئے عدالت بالادست کا ہو یا عدالت ماتحت کا اگر متعلق ہو تو احتیاط سے غور کئے جانے کے قابل ہے۔

(۲) عدالت بالادست کا فیصلہ واجب التعمیل ہے لیکن صرف بنار فیصلہ (ratio decidendi) کی حد تک اور (Obiter dicta) اقوال عدالتی یعنے بنا فیصلہ سے غیر متعلق باتیں جو فیصلہ میں عدالتیں کہتی ہیں۔ واجب التعمیل نہیں ہیں۔ اس اصول کی وجہ سے نظائر کی پابندی کچھ کم کی جاتی ہے۔ کیونکہ کسی نظیر کا بنار فیصلہ کیا ہے اس کا تصفیہ خود جج کرتے ہیں اور اگر کوئی نظیر مقدمہ مابعد پر بالکل چسپاں نہ ہو تو عدالتیں بنا فیصلہ کا فرق کرکے اس پر عمل نہیں کرتے ہیں۔ اس طرح پالک کا یہ کہنا پوری حد تک صحیح نہیں ہے کہ یہ نظام اتنی ہی میکانکی یکسانیت کے ساتھ عمل کرتا ہے۔ جتنی کہ قوانین قدرت میں پائی جاتی ہے خصوصاً قانون تارٹ میں نظائر کے بنا فیصلوں کے تعین میں

[1] لارڈ ایلڈن۔ بمقدمہ گلاچ بنام شڈلن۔

بہت سے فرق کئے گئے ہیں مثلاً بارہ تیرہ سال قبل چیف جسٹس ہورٹ نے ایک مقدمہ میں کہا۔ کہ امدادی غفلت کے نظائر کی بنا فیصلہ یہ رہی ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ غلطی کس کی تھی Who was to blame لیکن کورٹ آف اپیل نے اس کو ماننے سے انکار کیا ہے۔

(۳) قدامت کی وجہ سے نظیر کی وقعت کم ہونا ضروری نہیں بلکہ اس میں اضافہ ہو سکتا ہے سوائے اس کے کہ اس کے فیصل ہونے کے بعد سے قانون میں تبدیلی ہوئی ہو۔

(۴) اس کے برخلاف یہ امر مسلمہ ہے کہ قانون معاشری حالات کی تبدیلی کے ساتھ بدلتا رہتا ہے اور اسی لئے بہت ہی قدیم نظائر عصر جدید کے حالات میں قابل اطلاق نہیں رہتے۔ اسی لئے ان کا حوالہ کم دیا جاتا ہے۔ نظائر کی تشبیہ مثل جج کے شراب سے دی جاتی ہے۔ یہ امتداد زمانہ سے اچھے ہوتے جاتے ہیں یعنی ایک حد تک جس کے بعد ان میں وہ بات نہیں رہتی[a] بیکن نے کہا ہے کہ بہترین نظائر وہ ہیں جو نہ بہت قدیم ہوں نہ جدید۔

(۵) نظائر کی رپورٹس کے متعلق کوئی باضابطہ اصول نہیں ہیں۔ انگریزی عدالتیں ہر قابل اعتبار رپورٹ پر عمل کرتی ہیں۔ اخباروں سے بھی نظائر عدالتوں میں پیش کئے گئے ہیں۔ اگر رپورٹس کی روایت میں شک ہو تو آخری صورت میں عدالت کے سجلات (ریکارڈس) دیکھے جاتے ہیں۔

اس طرح ضمن (۱) کے تفریق سے نظائر کی دو اقسمیں ہوئیں یعنی یا تو وہ واجب التعمیل (authouritative) ہوتے ہیں۔ یا ترغیبی (Presuasive) سابقہ میں ان کے متعلق تھوڑی مزید تفصیل ہے۔ انگریزی قانون میں ترغیبی نظائر میں بیرونی ممالک کے فیصلے خصوصاً امریکی فیصلے سلطنت برطانیہ کے دوسرے حصوں مثلاً ایرستان کی اعلیٰ عدالتوں کے فیصلے پریوی کونسل کے فیصلے اور انگریزی فیصلوں کے اقوال عدالتی شامل سمجھے جاتے ہیں۔ واجب التعمیل نظائر کی پھر دو قسمیں ہیں۔

(۱) جو قطعی طور پر واجب التعمیل ہوں اور (۲) جو مشروط طور پر۔ پہلے میں انگریزی ہر عدالت بالادست

a

"Precedents may be compared to wine which improves with age; up to a certain point, and then begins to go off."

کے فیصلے ہر انگریزی ماتحت عدالت پر اور دارالامرا کے فیصلے خود ان پر قطعی طور پر واجب التعمیل ہیں اور ہر عدالت ماتحت کے فیصلے ہر عدالت بالادست میں و نیز ہر عدالت کے فیصلے اس کو مساوی درجہ کی عدالت میں مشروط طور پر واجب التعمیل ہیں یعنے بالادست عدالت یا مساوی درجہ کی عدالت. ماتحت یا مساوی درجہ کی عدالت کے فیصلہ پر بالعموم عمل کرے گی لیکن اگر یہ صاف طور پر خلاف قانون یا صاف طور پر خلاف عقل ہو تو اس پر عمل نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ یہ یا تو برقرار نہیں رکھا جائے گا یا اس پر عمل کرنے سے انکار کیا جائے گا۔ دونوں صورتوں میں برقرار نہ رکھنے یا پابندی کرنے سے انکار کرتے ہوئے ان عدالتوں کو یہ اصول بھی ملحوظ رکھنا لازم ہے کہ یعنے غلط فیصلہ کافی عرصہ تک شائع ہو چکا ہو تو اس کو قانون کی وقعت حاصل ہو جاتی ہے[1] کیونکہ قانون کا معین ہونا اس کے صحیح ہونے سے زیادہ اہم ہے۔

ملحوظ رہے کہ ان اپنی کتاب کے صفحات ۱۵۰ تا ۱۵۹ میں سامنڈ کی متذکرہ صدر تقسیم پر کہ نظائر یا تو واجب التعمیل ہیں یا ترغیبی تنقید کرتے ہوئے یہ دکھلاتے ہیں کہ ان میں فرق دراصل درجہ کا ہے نوع کا نہیں ہے۔ وہ سر جارج جسل کے الفاظ میں کہتے ہیں کہ نظائر کا اصل فائدہ کسی اصول کا قرار دینا ہے جس پر کسی بعد کے مقدمہ میں عمل کیا جا سکے۔ و نیز یہ کہ یہ اصول صحیح ہو نہ یعنے صحیح قانون کا حامل ہونا چاہیے ایسے اصول کے قرار دینے میں عدالتیں ہر ممکن ذرائع سے مدد لیتی ہیں۔ ملک غیر کے مصنفوں سے بھی۔ اور قانون کے بعض حصوں میں ملک غیر کے فیصلوں سے بھی۔ چنانچہ پوتھیلے کی تصانیف سے دارالامرا تک نے بھی مدد لی ہے۔ اور اس مصنف کا ذکر بلاکسٹن جیسے عظیم الشان جج نے تعظیم سے کیا ہے اور متعدد مقدمات میں سے اگر صرف ابتدائی مقدمہ کوگز بنام برنارڈ[2] ہی کو دیکھا جائے تو ڈائجسٹ سے استناد کا حال ظاہر ہو جائے گا۔ قانونی اصولوں کی ترقی میں جج اور فقہا کے اثر کو رواج کی بحث میں کچھ ظاہر کیا گیا ہے۔ نظائر پر غور کرنے سے یہ اثر کم نمایاں نظر آئے گا بعصر جدید میں خاص قانون بین الاقوام کے نظائر زیادہ تر فقہا کی تصانیف ہی سے بنے ہیں۔ اور اس میں دوسرے ممالک کے فقہا اور عدالتی فیصلوں کا بھی کافی حصہ رہا ہے۔ اسی طرح قانون ارضی (Real Property)

(۱) "Commununis error facit Jus' - (۲) ۱۷۰۳ء لارڈ ریمنڈ رپورٹس جلد ۲ صفحہ ۹۰۹)

سب بڑا اور اہم حصہ ان فقہا کے عمل پر مبنی ہے جو فن انتقال جائداد میں مہارت رکھتے تھے اور یہی حال
قانون امارت بحریہ (Admiralty Law) کا ہے جس کے متعلق لارڈ ایکن مقدمہ
(Susque-hanna 1905 P. 199) میں کہتے ہیں کہ اس قانون کا یہی عملی طور پر بیان باقی ہے
جو کسی اچھی کتاب کے لکھے جانے پر پورا ہوگا پس بات یہ ہوئی کہ انگریزی قانون میں جہاں کوئی مجموعہ قانون
نہیں ہے۔ جج خاص سے عام تک جاتے ہیں یعنے واقعات سے اصول قرار دیتے ہیں۔ اس لئے
جیسا کہ جبل نے کہا ہے۔ نظائر کا سارا مقصد اصولوں کا قرار دینا ہی ہوتا ہے۔ اور ان اصولوں کے
قرار دینے میں وہ تمام ممکن ذرائع سے اگر وہ متعلق ہوں مدد لیتے ہیں۔ ملک غیر کے قوانین کے اصولوں اور
مصنفوں سے بھی مدد لی جاتی ہے اور عقل سلیم۔ اخلاقیات اور معاشری افادیت اور مصلحت عامہ کو
بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا ہے۔ دیکھا یہ جاتا ہے کہ جو اصول وضع ہو وہ معقول و منطقی۔ قائل کر دینے والا
اور قانون کے دوسرے اصولوں سے متوافق اور صحیح قانون کا حامل ہو۔

وجوب نظائر کے وجوہات۔ نظائر کا عمل اس پر موقوف ہے کہ قانون قیاس کرتا ہے کہ عدالتی فیصلے
صحیح ہوتے ہیں۔ اور چونکہ وہ سوچ سمجھ کر اہم موقع پر دیئے جاتے ہیں وہ غالباً صحیح بھی ہوتے ہیں۔
لیکن بالفرض اگر وہ صحیح نہ ہوں۔ تب بھی قانون امور فیصل شدہ کی دوبارہ سماعت نہیں کرتا کیونکہ اصول
یہ ہے کہ خلائق کا فائدہ اس میں ہے کہ نالشا نالشی کم ہو۔ ان ہی اصولوں پر عمل کرنے سے قانون نظائر
یا فیصلہ جات عدالت میں یکسانیت حاصل ہوتی ہے اور اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ آیندہ کے لئے
ججوں کی خود اختیاری رائیں خارج ہو جاتی ہیں اور یہی سوالات اگر آیندہ پیش آتے ہیں تو ضروری ہو
جاتا ہے کہ ان کا جواب ان ہی فیصلہ جات کے مطابق دیا جائے۔ پس سوالات جو آیندہ پیش آئیں گے
یا تو سوالات قانونی ہوں گے یا واقعاتی یعنے یا تو ایسے ہوں گے جن کے متعلق پہلے سے کوئی اصول قانون
موجود ہے یا ایسے کہ ان کے متعلق پہلے سے کوئی اصول قانون موجود نہیں ہے۔ پہلی صورت میں قانون کے
موجودہ اصول کا اطلاق دیا جائے گا اور جس فیصلہ میں یہ اطلاق دیا جائے گا وہ فیصلہ یا نظیر استقراری
ہوگی اور اسکی دوسری صورت میں جبکہ سوال واقعاتی کی صورت میں عدالتیں نیا قانون وضع کریں گی۔ اور یہ نظیر اصلی ہوگی۔ اور یہ سوال

واقعاتی آیندہ کے لئے سوال قانونی ہو جائے گا مثلاً جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ فرض کیجئے کہ کسی قانون موضوعہ میں "مویشی" کا مبہم لفظ استعمال کیا گیا ہو اور پہلی دفعہ یہ سوال پیش ہو کہ آیا اس میں گھوڑے بھی داخل ہیں یا نہیں تو عدالتیں اس سوال واقعاتی کا جواب ہاں یا نہیں میں دینے میں کسی قانون کے پابند نہیں ہیں۔ فرض کیجئے کہ انھوں نے فہم سلیم اور تعبیری مہارت سے کام لے کر ایک فیصلہ ہاں یا نہیں میں کر دیا تو آیندہ جب کبھی یہ سوال پیدا ہوگا اس کا جواب اسی طرح دینا ہوگا اور یہ سوال سوال قانونی تصور کیا جائیگا۔ اس طرح پر قانون نظایر کی ترقی سے ججوں کی خود اختیاری رائیں محدود ہوتی جاتی ہیں۔ جج اپنے پاؤں کے لئے خود آپ زنجیریں وضع کرتے جاتے ہیں۔

ملحوظ رکھیئے کہ عدالتوں میں جو سوال پیش ہوتے ہیں وہ تمام ایسے نہیں ہوتے ہیں کہ ان کا جواب کسی اصول کی بناء پر دیا جاسکے۔ بعض ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا جواب صرف خاص موقع اسی مقدمہ تک محدود ہوتا ہے اور بعض ایسے کہ ان کے جواب سے عام اصول قائم ہوسکتا ہے۔ مثلاً کسی مقدمہ میں سوال ہوسکتا ہے کہ آیا مدعی علیہ نے کوئی حملہ کیا یا نہیں اس کے تصفیہ سے کوئی عام اصول وضع نہیں ہوسکتا۔ اور وہ لازماً ہمیشہ سوال واقعاتی ہی رہتا ہے۔ برخلاف اس کے عدالت میں یہ بھی سوال ہوسکتا ہے کہ آیا مدعی علیہ نے جو حملہ کیا وہ فریب یا غفلت کی حد تک پہنچا ہے۔ اس کے جواب میں بالکل ممکن ہے کہ کوئی اصول قانون وضع کیا جاسکے۔ اور جو اصول وضع ہوگا وہ اصلی نظیر کے ذریعے آیندہ کے لئے سوال قانونی سمجھا جائے گا۔ اس طرح پر ظاہر ہوا کہ نظیر سے مراد ایسا عدالتی فیصلہ ہوتا ہے جو کسی اصول پر مبنی ہو۔ نظیر کے اسی اصول کو بنائے فیصلہ کہتے ہیں۔ اور فریقین مقدمہ کے علاوہ سارے دوسرے اشخاص کے لئے اسی کو قانونی وقعت حاصل ہوتی ہے۔

یہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ تمام سوال واقعاتی کا تصفیہ جیوری اور تمام سوالات قانونی کا فیصلہ جج کرتا ہے لیکن ہم دیکھ چکے ہیں۔ اصلی نظایر ایسے سوالات واقعاتی کے جواب ہوتے ہیں جن کی وجہ سے یہ سوالات واقعاتی آیندہ کے لئے سوالات قانونی بنا دیئے جاتے ہیں تو کیا اصلی نظایر کے وضع کرنے والے جج اور جیوری دونوں ہوتے ہیں۔ لیکن جیوری کوئی نظیر وضع نہیں کر سکتی۔ اس لئے واقعہ

یہہ ہے کہ گو سارے سوالات قانونی کا فیصلہ جج کرتے ہیں لیکن سارے سوالات واقعاتی کا فیصلہ جج جیوری کو ایسے سوالات اتفاقی کا فیصلہ کرنے نہیں دیتے ان پر یہہ سوالات نہیں چھوڑتے ہیں کہ فیصلہ سے وہ کسی اصول کو وضع کر سکتے اسی لئے جیوری صرف ایسے سوالات واقعاتی کا فیصلہ کرتی ہے جن کا جواب خاص موقع مقدمہ تک محدود رہتا ہے اور ان کے جواب سے کوئی عام اصول وضع نہیں ہوتا ۔

اب ہمیں نظایر کے مذکورۂ بالا انگریزی نظام کے حسن و قبح کو جانچنا چاہیئے ۔ اس پر د اعتراض تو یہہ ہے کہ یہہ نظام بے ترتیبی سے بغیر کسی سائنٹفک اصول کے ترقی کرتا ہے ترقی مقدمہ بازی کے اتفاق پر موقوف ہوتی ہے یہہ اعتراض صحیح ہے ۔ خصوصاً آج کل جبکہ بہت امور کے متعلق فیصلے درکار ہیں لیکن یہہ امور عدالتوں تک احتیاجات کی وجہ سے نہیں جاتے

(۲) حجم بہت ہو جاتا ہے ۔ اس اعتراض میں مبالغہ معلوم ہوتا ہے ۔ انگریزی قانون کے نظایر پر مشتمل ہے ۔ انگریز اساتذہ کی رائے میں نظایر کی پانچ سو جلدیں کافی ہیں ۔

(۳) عدالتوں میں متعلقہ نظایر کے پیش کئے جانے کا یقین نہیں ۔ اور بے ضروری نظایر ہ زیادہ پیش کئے جاتے ہیں چنانچہ حال کے ایک مقدمہ میں اسکرٹن جسٹس نے جل کر کہا ہے کہ قابل عدالت کو نظایر کے تحت دفنا دیا ہے ۔ در مقدمہ ۔ ان ری مین ۱۹۲۸ء چانسری (میں رومر جسٹس نے قرار دیا ہے کہ ایک مقدمہ میں دارالامراء کے سامنے ایک بہت ہی متعلق نظیر پیش

(۴) منتقم کہتے ہیں کہ غلط فیصلے کے شائع ہو جانے پر اس کو قانون کی بقعت دینے سے بہ غلط قانون پر عمل ہوتا ہے لیکن نظایر کے محض نظایر ہونے کی وجہ سے واجب التعمیل ہونے کے باوجود غیر معقول اور سخت قانون کی مقدار بہت کم ہے ۔ اس لئے آلن کہتے ہیں کہ اس اعتراض یہہ تو نظایر کے معایب ہوئے ۔ اب بقول ائے " عیب می جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو " کہ نظایر کے محاسن میں ذیل کی باتیں داخل ہیں ۔

(۱) چونکہ انگریزی فیصلے مسلسل بیان کی شکل میں یعنے (Descriptive) ہو قانون وضاحت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے اس لئے انگریزی قانون میں قانونی اصولوں کو مسلسل

ہوئی ہے اور ایک اچھا مجموعہ اصولوں کا تیار ہو گیا ہے۔ مثلاً مقدمہ یورن بنام کین۔ میں دارالامرا نے (   ) کے سینکڑوں سالہ قانون پر تبصرہ کیا نظائر میں درجہ بدرجہ ترقی اور تبدیلی کو دکھایا اور اس کے اکثر حصہ کو منسوخ کر دیا۔ اسی لئے فیصلے سبق آموز اور بلند معیار کے ہوتے ہیں۔

(۲) اس نظام میں ججوں کو بہت قابل ہونا پڑتا ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ انگلستان میں مسلسل بہت قابل جج ہوئے ہیں۔ یہ نظام اچھے ججوں کو پیدا کرتا ہے اور اچھے جج اس نظام کو اوراچھا بناتے ہیں۔ قابلیت ظاہر کرنے اور شہرت اور نیک نامی حاصل کرنے کے موقع اس نظام میں بہت ہوتے ہیں مثلاً لارڈ بلاکرن یا لارڈ مانسفیلڈ کی شہرت اور قابلیت کو دیکھئے۔ یورپ میں چونکہ فیصلے مسلسل بیان کی شکل میں نہیں ہوتے اور نہ نظائر واجب التعمیل ہوتے ہیں۔ یہ تمام امور ممکن نہیں ہیں۔

(۳) اس نظام میں جج پادشاہ کے نمائندہ ہوتے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا افسر لارڈ چانسلر پادشاہ کے ضمیر کا محافظ ہوتا ہے۔ ان امور سے عوام پر اور خود ججوں پر بہت مفید نفسانی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

(۴) نظائر کی جگہ صرف قانون موضوعہ ہی ہو سکتا ہے۔ قانون موضوعہ میں بڑی حد تک زور الفاظ پر دیا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف نظائر میں زور الفاظ پر نہیں بلکہ واقعات پر دیا جاتا ہے کیونکہ واقعات ہی کی بنا پر ان کا وجود ہوتا ہے۔ قانون موضوعہ میں قانون چونکہ (عام الفاظ میں ہونے کی وجہ سے تمام واقعات پر حاوی نہیں ہوتا بلکہ بعض واقعات کی حد تک) واقعات کے پیش آنے کے قبل بنایا جاتا ہے۔ اس لئے (بعض وقت) بعض قانون موضوعہ کے نتایج بالکل امید کے خلاف ہوتے ہیں مثلاً پالک کہتے ہیں۔ کہ (St. of Uses) کی پابندی اس حد تک نہیں کی گئی اور قانون انتقال جائداد کا ایک بڑا حصہ اس کے خلاف ورزی کے قواعد پر مشمول ہے۔ اسی طرح قانون فریب (St. of Frand) سے فریب کا انسداد تو اتنا نہیں ہوا جتنا کہ فریب دہی سے زیادہ مواقع پیدا ہوئے۔ نظائر میں چونکہ واقعات کے لئے قانون بنایا جاتا ہے یہ امر ممکن ہے کہ قانون کی واقعات اور زمانہ کی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ ترقی ممکن ہے۔ غرض انگریزی نظام کے اچھی طرح عمل کرنے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ اور یورپ

میں بھی رجحان اسی کو اختیار کر لینے کا ہے ۔

(ب) نصفت ۔

نصفت ماخذ قانون ہے اور اس لئے ہے کہ اس کے ذریعہ قانون میں یکساں معلوم اور جبری قاعدہ عمل کی صورت اختیار کرتا ہے ۔ قانون چونکہ لازمی طور پر عام اور کلیوں کی شکل میں ہوتا ہے ۔ اسی لئے چاہے کتنی ہی ہوشیاری سے قانون بنایا جائے بہت سی جزی صورتیں اس عام قاعدہ سے چھوٹ جاتی ہیں اور امور انسانی ایسے گونا گوں ہیں کہ وقتاً فوقتاً یہ جزی صورتیں تصفیہ کے لئے عدالت میں پیش ہوتی ہیں اب اگر قانون کے عام اور کلی قاعدہ پر عمل کیا جاتا ہے تو ان جزی صورتوں میں ناانصافی ہوتا ہے ۔ ایسی ہی صورت حال کے لحاظ سے کہا گیا ہے کہ (Summum Jus Summum injuria) سے ہوتا ہے یعنے "قانون پر سختی سے عمل کرنے سے سخت ناانصافی ہوتی ہے" اور قانون کا اہم اور اصلی مقصد دادرسی اور عدل گستری فوت ہوجاتا ہے اسی لئے ہر نظام قانون میں عدالتوں کو ایسی صورتوں میں انصاف کرنے کا اختیار تمیزی دیا جاتا ہے اور دیا جانا چاہیے ۔ یونانی نظام قانون میں بھی اس کا لحاظ تھا ۔ اور افلاطون کا قول ہے کہ قانون کے عام اصول یا کلیوں پر اگر خاص یا جزی حالات کے لحاظ بغیر عمل کیا جائے تو یہ کلیئے مثل ایک "ضدی اور جاہل خود سر" کے ہوجاتے ہیں اور اسی لئے سمجھ کے ساتھ عدل گستری کے لئے نصفت کی ہر نظام قانون میں ضرورت ہے اور اسی لئے یہ اعتراض صحیح نہیں ہے کہ "اگر قانون خود انصاف جیسا کہ اس کو ہونا چاہیئے تو انصاف کرنے کسی مزید دستور یعنے نصفت کی کیا ضرورت ہے ۔ اور قانون کے اقتدار اور اس کے انفرادی اشکال میں تخفیف کے درمیان توافق کیسے ممکن ہے"؟ کیونکہ نصفت کے ذریعہ سے خاص صورتوں میں جو انصاف کی ضرورت ہوتی ہے وہ قانون کی عمومیت کی وجہ سے ہوتی ہے اور یہ انصاف قانون کی اسپرٹ ہی میں کیا جاتا ہے یعنے اسی طرح جس طرح قانون خود کرتا اگر یہ خاص یا جزی شکل بھی اس کے پیش نظر ہوتی ۔ اسی لئے ہی تو کہا جاتا ہے کہ نصفت قانون کے نقش قدم پر چلتی ہے ۔

(Equity Follows the Law.)

اس طرح پر نصفت قانون کے اصول کا وہ مجموعہ ہوا جو کسی ملک کی عدالتوں یا ایک خاص

عدالت نے قانون کے عام اصولوں کی جزی اور استثنائی صورتوں میں انصاف کرنے کی کوشش سے وضع کیا ہے اسی لئے نصفت کے متعلق صحیح طور پر کہا گیا ہے کہ وہ اصل قانون کی تکمیل کرتا ہے (مین، یا یہ کہ وہ متروح قانون پر ایک شرح " (gloss) ہوتی ہے۔ (میٹ لانڈ، ان مقولوں کا مطلب یہ ہے کہ عدالتوں کا فرض ہے کہ قانون پر عمل کریں لیکن اگر اس پر سختی سے عمل کرنے سے ناانصافی ہوتی ہے تو جہاں تک ہوسکے قانون کی پابندی کرتے ہوئے قانون کے اصل مقصد پر عمل کرے یعنے یہ کہ انصاف کرے۔

انگریزی اور رومی نظام ہائے قانون کے نشو ونما میں نصفت کا بہت گہرا اثر ہے۔ چنانچہ قانون روما میں پریٹر نے نصفت کے اصولوں پر عمل کرکے قانون نصفت (Jus honorarium) کا ایک ایسا مجموعہ قانون تیار کردیا جو اہمیت میں (Jus Civile) قانون ملک سے کم نہیں بلکہ بہت بڑھ کر تھا خصوصاً معاہدہ وصیت، قبضہ وملکیت اور وراثت کے قانون میں پریٹر کے نصفتاً اصول پر بنائے ہوئے قوانین سے قانون روما میں لچک اور بدلتے ہوئے تمدن کے ضروریات کو پورا کرنے کا سامان مہیا ہوگیا۔ اسی طرح انگریزی قانون میں لارڈ چانسلر کی نصفت یا ایکوئٹی سے قانون متعلق اراضی (Real property) قانون متعلق چارہ کار (Remedies) اور معاہدے اور ٹارٹس میں بیش بہا اضافے ہوئے اس طرح نصفت سے نہ صرف قانون ملک کی تنگی دور ہوئی بلکہ ایک حد تک نئے نئے اصول بھی تمدنی ضروریات کے لحاظ سے قانون ملک میں داخل ہوئے۔

انگریزی قانون میں نصفت کے اصولوں کا خلاصہ سر ٹامس مور (More) نے ذیل کی بیت میں کیا ہے۔ جن کو مع ان کی توضیحات کے ذیل میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے :-

These three give place in Court of Conscience
Fraud accidents and things of confidence

یعنے عدالت بالفاظ دیگر عدالت نصفت میں۔ فریب، اتفاق اور اعتمادی امور کا لحاظ کیا جاتا ہے۔

(۱) اعتمادی امور میں سب سے اہم امانتیں ہیں جو اب بھی چانسلری اختیار سماعت کا عظیم ترین جزو ہیں۔ اسی طرح حق انفکاک رہن اور ضامن اور اصل مخذ ... کے درمیان جس کے لئے ضمانت دی جاتی ہے۔

دیز شرکاء کے درمیان دوجنبہ نصفانہ وجوبات کا نفاذ۔ یا اوصیا اور مہتمان ترکہ پر سختی سے ضمیر کے
مطابق عمل کرنے کی یک جنبہ ذمہ داری کا نفاذ۔ اور اسی طرح اتلاف (Conversion) ۔
مشترکہ۔ انتقال حقوق نالش (assignment of Chose of actions) اور اختیار تقرر بذ
وصیت (power of appointment) کے قانونی اصول سب اعتمادی امور کا ا
کرکے عدالت نصفت نے وضع کئے ہیں۔

(۲) فریب۔ اس میں ایسے خلاف ضمیر افعال آتے ہیں۔ جو قانون عمومی کے فریب کے تح
نہیں آتے تھے مثلاً داب ناجائز۔

(۳) اتفاق۔ غلطی کا نظریہ نصفت کے اسی اصول پر مبنی ہے اور اسی کے ضمیمہ بطور تصحیح ا
تنسیخ دستاویزات کا نظریہ بھی۔

(۴) "صحیح منشاء پر عمل" خصوصاً جبکہ منشاء ناقص یا مبہم طریقہ پر ظاہر کیا گیا ہے۔ مثلاً وصیتوں ا
تملیک ناموں کی تعبیر میں ان صورتوں میں الفاظ کے پیچھے حقیقی ارادہ اور منشاء کو دریافت کیا جاتا ا
اس پر عمل کیا جاتا ہے۔ اسلامی فقہانے بھی یہہ جو اصول قرار دیا ہے کہ "العبرۃ فی العقود
للمقاصد والمعانی لا للالفاظ والمبانی۔ یعنے معاملات میں اعتبار منشاء کا ہے نہ کہ الفاظ یا تعبیرات
کا وہ بھی اسی نصفتانہ اصول پر مبنی ہے۔

(۵) ولایت۔ یعنے ان لوگوں کی جو خاص حالات کی وجہہ سے حفاظت کے محتاج ہوتے ہیں
مثلاً نابالغ۔ منکوحہ عورتیں ملاح۔ مدیون۔ مجنون۔ غربا۔ یہاں اصول انتہائی انسانیت ہوتا ہے۔ اس کا
ایک اور دائرہ علاوہ اوقاف کی حفاظت۔ کے منکوحہ عورتوں کی جایداد کو وہ بوسوں اور لاتوں "
("Kicks & kisses") سے بچانا ہی رہا ہے۔ اور اسی کو ڈایسی نے انتہائی انسانیت کا
اصول کہا ہے۔

(۶) چارہ کار۔ یعنے قانون عمومی کے چارہ کار کے علاوہ چارہ کار۔ دادرسی خاص۔ اعادہ حالت
سابق۔ سابق میں معائنہ دستاویزات۔ حکمنامہ جات امتناعی حکمی اور امتناعی بھی۔ ان چارہ کاروں کے اضافے

قانون عمومی میں ضروری اہم اور منصفانہ چارہ کاروں کا اضافہ ہوا۔

ان تمام شعبوں میں اختیار سماعت اس اصول پر مبنی تھا کہ چانسلر راست خاطی کی ضمیر سے مخاطب ہوتا ہے۔ اس لئے شخص کے ذریعہ سے عمل کرتا ہے۔ (Acts in personam) اور حکمنامہ حاضری بہ تہدید قید (Sub-poena) کے ذریعہ سے خاطی کو طلب کیا جاتا تھا۔ بالفاظ دیگر اختیار سماعت بلا قید حدود ارضی ہوتا تھا۔

(۳) قانون سازی یا وضع قوانین۔

اس موضوع پر ہم پہلے (۱) قانون سازی کے معنے بیان کریں گے اور نظائر سے اس کا مقابلہ کریں گے۔ پھر اس کے بعد (۲) قانون سازی کے اقسام کی صراحت کریں گے پھر۔ (۳) تعبیر قوانین کے اصول اور آخر میں (۴) مجموعہ قوانین کے متعلق مختصر طور پر بحث کریں گے۔

(۱) یوں تو وسیع تر معنوں میں قانون سازی (Legislation) سے مراد کسی نئے قانون کا کسی بھی طریقہ سے مثلاً بذریعہ نظیر یا منصفی اصول کے بنانے۔ یا مقتدر اعلی کی ہر مرضی کے اظہار سے مثلاً کسی مملکت کے الحاق کے اعلان سے ہوتی ہے لیکن محدود اور صحیح معنی میں قانون سازی سے مراد کسی مقتدر اعلیٰ شخص یا جماعت کا اپنی مرضی اور ارادہ سے کسی نئے قانون کا بنانا ہوتا ہے۔

قانون بنانے کے طریقوں میں قانون سازی سب سے جدید اور سب سے اہم طریقہ ہے۔ آج کل رجحان یہ ہے کہ تمام قوانین قانون سازی ہی کے ذریعہ سے وضع کئے جائیں لیکن مملکت کی مضبوطی سے قیام سے پہلے ایسا نہیں تھا اس وقت مملکت کا کام قانون بنانا نہیں تھا بلکہ اطلاق دینا تھا۔ قانون رواج کے ذریعہ سے بنتے تھے۔ یا قانون کو الٰہی ماخذ سے منسوب کیا جاتا تھا۔ بادشاہوں کے ہاتھ میں قانون سازی کے اختیارات آنا اس امر کی دلیل ہے کہ سیاسی اور قانونی امور میں بہت کچھ ترقی ہوئی اور مملکت مضبوطی سے قائم ہوگئی۔ مغرب کے اساتذہ کی رائے ہے کہ جب تک قانون کو مذہب سے علحدہ نہ کیا گیا انسانی ضرورتوں کے مطابق قوانین کو بدلنے اور قانونی اصولوں کو ترقی دینے کی گنجائش کم رہی۔ اس طرح پر آج کل اکثر قوانین قانون سازی کے ذریعہ سے بنائے جاتے ہیں تاہم ہمیں بھولنا نہیں چاہیئے کہ عدالتی عمل

کے ذریعہ سے قانون سازی بھی جاری ہے اور اکثر جدید مملکتوں میں قانون سازی کا دائرہ عمل زیادہ تر قانون عام یعنے فرد اور مملکت کے تعلقات کے دائرہ عمل سے متعلق رہا ہے اور اصلی قانون یعنے قانون خاص کے اہم ابواب میں مثلاً جرائم افعال ناجائز وغیرہ کے متعلق اصول عدالتوں ہی میں طے ہو رہے ہیں اس واقعہ سے قانون کی ماہیت کی اصح حقیقت پر روشنی پڑے گی کہ قانون دراصل کوئی ایک مقننہ راہی نہیں بناتا۔ بلکہ قانون چونکہ ایک نشو ونما اور ارتقا ہے اس لئے اس کو عوام بناتے ہیں اور فقہا اور عدالتی تعبیر کے ذریعہ سے اس کے اصول مستنبط اور منضبط اور مہذب ہوتے ہیں۔

قانون سازی اور قانون نظائر کا مقابلہ سبق آموز ہوگا۔ اور اس مقابلہ سے ظاہر ہوگا کہ قانون سازی کو قانون نظائر پر چند فوقیتیں حاصل ہیں۔ اور اس نقطۂ نظر سے قانون سازی کی پہلی خوبی اس کی تنسیخی قوت ہے ۔ قانون سازی کے ذریعہ سے جس طرح سے نئے قوانین بنائے جاتے ہیں اسی طرح منسوخ بھی کئے جا سکتے ہیں۔ اس طرح بیکار اور انسانی ضرورتوں کے غیر موافق قوانین کو منسوخ کرکے قانونی اصولوں کو ترقی اور قانون میں اصلاح کیجا سکتی ہے وگرنہ قوانین پتھر کی لکیر ہی رہتے۔ اور ان میں کوئی تغیر و تبدل ممکن نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے نظائر کے متعلق تم دیکھتے ہیں کہ وہ تعمیری ہوتے ہیں تنسیخی نہیں ہوتے یعنے ان کے ذریعہ سے نیا قانون وضع ہوسکتا ہے لیکن موجودہ قانون منسوخ نہیں ہوسکتا کیونکہ جب کوئی قانون موجود ہوتا ہے عدالتوں کا فرض ہوجاتا ہے کہ اسی کو اطلاق دیں۔ (۲) قانون سازی کی دوسری خوبی یہ ہے اس میں تقسیم عمل کے مفید اصول پر عمل ہوتا ہے اگر مقننہ صرف قانون وضع کرے اور عدلیہ صرف اس کو اطلاق دے تو یہ امر فی الجملہ وضع قوانین اور اطلاق قوانین دونوں کے لئے مفید ہوتا ہے (۳) قانون موضوعہ کی تیسری خوبی یہ ہے کہ اطلاق سے پہلے قانون کا اعلان ہوجانا جو عین انصاف ہے برخلاف اس کے قانون نظائر میں اطلاق سے پہلے قانون وضع نہیں ہوتا ہے بلکہ اطلاق دیتے وقت ہی قانون وضع ہوتا ہے وہ بعد از واقعہ قانون سازی ہوتی ہے جس کی بنتھم نے بڑی ہنسی اڑائی ہے۔ (۴) قانون موضوعہ میں وضع قوانین مقدموں کے پیش آنے کے اتفاق پر موقوف نہیں رہتی۔ اسی لئے قانونی اصولوں کی ترقی منتظم اور معین طریقہ پر ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے نظائر کے ذریعہ سے قانون سازی اس وقت تک نہیں ہوسکتی۔ جب تک مقدمہ پیش نہیں آتے۔ اسی لئے قانون سازی غیر منتظم اور غیر یقینی طریقہ پر ہوتی ہے۔ قانون موضوعہ کی آخری (۵) خوبی

یہ کہ اس میں قانونی اصول اچھی شکل میں پیش کئے جاسکتے ہیں انہیں مجرد اصولوں میں بیان کیا جاسکتا ہے برخلاف اس کے نظائر میں
قانونی اصول واقعات کے انبار میں مخلوط ہوتے ہیں قانون موضوعہ اسی لئے مختصر صاف ہوتا ہے اور اس تک آسانی سے
دسترس ہوجاتی ہے نظائر کے تختے کے تختے صفحوں کے صفحے الٹیں قانونی اصول دستیاب نہیں ہوتے ۔ اسی لئے قانون موضوعہ کی مثال
اگر زر نقد یا اشرفی کی ہے تو نظائر کی اس سونے کی جو کان میں ہوتا ہے اور اس کے چند ماشے سیروں مٹی میں ملے ہوئے ہوتے ہیں
لیکن اس ظاہری خوبی سے قانون موضوعہ میں ایک بڑی معنے کی خرابی بھی ہے یعنے قانون موضوعہ میں زور الفاظ پر ہوجاتا ہے۔
ان کے معنے کا لحاظ نہیں رہتا ہے برخلاف اس کے نظائر میں سارا زور معنے پر ہوتا ہے۔ الفاظ پر نہیں ہے۔ اسی وجہ سے برخلاف قانون
موضوعہ کی تنگی اور سختی کے قانون نظائر لچک دار اور واقعات کے مطابق ہوتا ہے۔

(۲) قانون سازی یا وضع قوانین کی دو قسمیں ہیں۔

(الف) اعلیٰ قانون سازی یا وضع قوانین ۔ جو مملکت کے مقتدر اعلیٰ شخص یا جماعت کا کام ہوتا ہے
اور اسی وجہ سے مملکت کی کوئی دوسری قانون ساز جماعت اس کو منسوخ یا تبدیل نہیں کرسکتی مثلاً انگریزی شہنشاہی پارلیمان
کی قانون سازی اعلیٰ قانون سازی ہے۔

(ب) ماتحت قانون سازی یا وضع قوانین ۔ مملکت کے مقتدر اعلیٰ شخص یا جماعت کے سوا دوسری جماعتوں
کا کام ہوتا ہے۔ یہ قانون سازی اپنے وجود صحت اور جواز کیلئے مقتدر اعلیٰ کی اجازت اور منظوری پر موقوف ہوتی ہے۔ اور
ان جماعتوں میں مملکت کی خود جماعت عاملہ و عدلیہ و بلدیہ اور تخصیصی مثلاً جامعات اور ریلوے کمپنیاں داخل ہیں نیز انگلستان کی
نو آبادیاں مثلاً کنیڈا یا اسٹریلیا کی مقننہ جات کی قانون سازی بھی ماتحت قانون سازی حال حال تک تھی۔
ماتحت قانون سازی کا حصہ آجکل کی مملکتوں میں روزافزوں زیادہ ہوتا جارہا ہے۔ جرمن اور فرانسیسی اساتذہ کے
اس کے متعلق نظریوں کی وجہ سے آجکل اس موضوع پر بہت سی بحثیں پیدا ہوگئی ہیں خصوصاً (Leon Dugiut)
کا نظریہ (Federal Syndicalism) قابل غور ہے۔ اس نظریہ کی رو سے مملکت کے قانون سازی کے اجارہ پر
اعتراض کیا جاتا ہے لیکن بہت سی بحث کے بعد آن نے اس کو تسلیم نہیں کیا ہے کیونکہ ایک مرکزی منضبط کرنیوالی قوت کا ہونا ضروری ہے
لیکن ساتھ ہی افراد اور مملکت کے تعلقات کی نظر ثانی فرد کو زیادہ حقوق دیکر یعنے ماتحت قانون سازی کے دائرہ کو وسیع کرکے کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔
چونکہ قوانین موضوعہ میں زور الفاظ پر دیا جاتا ہے اسلئے برخلاف رواجی قانون نظائر کے قانون موضوعہ میں تعبیر کے یعنے منشاء مقننہ کے دریافت کرنیکی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

(۳) تعبیر قوانین کا پہلا اصول یہ ہو کہ قانون موضوعہ کے الفاظ کے تعبیر نحوی اور لفظی ہونی چاہیئے یعنے الفاظ کے نحوی معنے لینے چاہیئے اور الفاظ کے معنے لیتے وقت متن کا جن میں یہ الفاظ واقع ہوں لحاظ رکھنا چاہیئے۔ دوسرا اصول یہ ہو کہ اگر الفاظ کے معنے صاف ہیں تو پھر عدالتوں کو اس امر میں دخل دینے کی قطعاً ضرورت نہیں کہ مقننہ کا منشا دیہہ ہوسکتا تھا جو ظاہر نہیں کیا گیا نہ انہیں کسی ایکٹ کی پارلیمانی یا شرعی تاریخ یا اسکے وضع ہوتے وقت کے ان حالات کا جن کا ذکر ایکٹ میں نہ ہو لحاظ کرنا چاہیئے لیکن تیسرا اصول ہو کہ عدالتوں کو کسی ایکٹ کی عام پالیسی کا لحاظ بھی کرنا چاہیئے اور اس کے لئے (ہیڈن) کے مقدمہ میں قرار دیا گیا ہے کہ انہیں دیکھنا چاہیئے کہ ایکٹ کے نفاذ کے وقت کامن لا کیا تھا۔ کامن لا میں کیا ترمیم کی گئی اس ترمیم کی نوعیت کیا تھی اور ترمیم کرنے کی وجہ کیا تھی تعبیر قوانین کا چوتھا اصول یہ ہو کہ جبکہ ایکٹ کے الفاظ سے مطلب صاف طور پر نہیں نکلتا ہو تو ایکٹ کے الفاظ کو قطعی تصور کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ مقننہ کے منشا کو دوسری شہادتوں سے دریافت کیا جاسکتا ہے مثلاً الف جب ایکٹ کے الفاظ کے معنے ایسے خلاف عقل ہوں کہ بداہتہ مقننہ کا منشا وہ نہیں ہوسکتا تھا جو اس کے ان الفاظ سے نکلتا ہو مثلاً کتابت کی کوئی صریح غلطی یا کوئی غلط اشارہ (ب) جبکہ ایکٹ کے الفاظ کی غلطی منطقی طور پر ظاہر ہو یعنے جبکہ ان سے کوئی ٹھیک یا مسلسل کامل معنے ظاہر نہ ہوں مثلاً ابہام کی صورت میں یعنے جب کہ ایکٹ کے الفاظ سے دو یا دو سے زیادہ مطلب نکلتے ہوں یا ۲۔ تناقص کی شکل میں یعنے جبکہ ایکٹ کے مختلف حصے ایک دوسرے کے نقیض ہونے کی وجہ سے باہمی اہمیت کو گھٹاتے ہوں۔

(۴) مجموعہ قوانین (Codes) سے مراد تمام قانون کو جہاں تک ہوسکے قانون موضوعہ کی شکل میں بدلنا ہے۔ وضاحت اور سہولت مجموعہ قوانین کی بڑی خوبیاں ہیں اسی لئے آج کل اس طریقہ کو اہم سمجھنے کا عام رجحان ہے لیکن ختمیت یا (Finality) اسکی خوبی نہیں اسلئے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ اس کے بعد نظائر کی ضرورت نہیں رہے گی مجموعہ قانون نپولین میں مثل ابن عدیم کے نسا نو ہر اصول کے مارٹس پر ایک سطر ہے[1] لیکن نظائر کی متعدد موٹی موٹی جلدیں اس کی شرح پر تیار ہو گئی ہیں۔ فرانس، پرشیا، ہالینڈ وغیرہ ممالک کے تجربہ سے جہاں مجموعہ بنائے گئے تھے ظاہر ہے کہ ان کے بعد بھی تعبیر، ججوں، وکلا اور خود ترمیم کی ضرورت ہوتی گئی جسٹینین نے اپنی کوڈ کو آخری سمجھا تھا لیکن در ۱۸۳ء میں پہلا نکلا کیونکہ پرشیا کا مجموعہ قانون بنایا گیا اور اب جرمنی میں ایک کمیشن کا تقرر ہوا ہے جس نے ۱۳ جلدیں رپورٹ کی تیار کی ہیں مختصر قانون نظائر اس وقت بھی نشونما پاتا رہیگا جبکہ تمام قوانین مجموعوں کی شکل میں آجائیں گے کیونکہ بہتر سے بہتر مجموعہ میں بھی نازک نازک ابہام یا خفی تناقص اقسام کے سہو پائے جائیں گے جن کو نظائر یعنے عدالتی عمل کے ذریعہ سلجھایا جائے گا۔

[1] الفصول ... ال - (وضع کے لئے چارہ کار رہو گا)

انسان کا انسان سے شکوہ

از جناب محمد امیر صاحب، بی اے، بی ٹی

دانائیاں ہی بن گئیں نادانیاں تری
اے کافرِ خرد! تری حکمت کو کیا ہوا

کیوں گر گیا ہے آج مقامِ بلند سے؟
اے نائبِ خدا! تری سطوت کو کیا ہوا

کیوں نشترِ ہوس کو رگِ جاں سے چھیڑ ہے؟
اے آدمِ شقی! تیری غیرت کو کیا ہوا

کیوں بجھ رہی ہے پھونک سے تیری یہ کائنات؟
ناداں! تیرے فرضِ خلافت کو کیا ہوا

ذرّوں میں تیرے کچھ نہ رہا نورِ بندگی
اے خاک! تیرے عہدِ محبت کو کیا ہوا

آئینہ

از جناب صمد رضوی صاحب (ساز)

مرحبا مردہ زمین کے اے جوان ہمت غلام　　تجھ سے قایم ہے کہن سالی کا فسو[illegible]
موت جیسی نیند کے آرام میں سویا ہوا　　کاررواں زندگی کی گرد میں کھویا[illegible]
بک چکی تیری نظر او رلٹ چکا تیرا خیال　　تجھ میں اپنا کچھ نہیں ہے اے شہید مست جا[illegible]

غور سے سن اقتضائے وقت کی آواز کو
دیکھ آنکھیں کھول کر انجام کو آغاز کو

ختم دور جبر و استبداد ہونا چاہیئے　　مفلسوں فاقہ زدوں کو شاد ہونا چا[illegible]
جنت شداد کو برباد ہونا چاہیئے　　نعمتوں کو عام اور آزاد ہونا چاہ[illegible]

ایک برتر زیست کی تعمیر کا سامان کر
اس جہنم زار کی تخریب کا پیمان کر

توڑ دے اس عہد کا ہر ایک قصر زرنگار
عقل جس کا دیوتا اور حکمت پروردگار

جس کی ہر آواز حیوانی خباثت کی پکار
جس کی آزادی ہوس رانی کا زندہ شاہکار

جس کی فکر و کشمکش روٹی کے ٹکڑوں میں نثار
جس کی پیشانی، سیاسی مکر و فن سے داغدار

جس نے سمجھا ہے شکم سیری کو معراجِ حیات
ساغر و مینا میں جس نے غرق کر دی کائنات

پست حیوانوں کی فطرت بخشدی انسان کو
دے کے قدرے خیر ارزاں کر دیا عصیان کو

عہدِ حاضر کے جوان، پروردۂ صد اضطراب
صرف نعروں سے نہیں ہوتا ہے کوئی انقلاب

سطح بین نظریں شراب و حسن میں الجھی ہوئی
ذہنیت ذوقِ غلامی سے اِدھر سلجھی ہوئی

دیکھ!! تیری موت کا ساماں کر رہی ہے تلاش
اے سگِ دنیا وہ اٹھتی اب تری قدروں کی لاش

عہدِ حاضر جاں بلب ہے آپنے جوش میں!!
ایک طوفاں پل رہا ہے وقت کی آغوش میں!!

تاریخی کاغذات کے ذخیرے

(۳)

نواب غازی الدین خاں فیروز جنگ ثانی کے عنایت نامے

از محمد غوث ام اے، ال ال بی

کتب خانہ سعیدیہ کے ذخیرۂ کاغذات میں تین مکاتیب ایسے محفوظ ہیں جو نواب غازی الدین خاں فیروز جنگ ثانی نے نواب محمد علیخاں والاجاہ، نواب کرناٹک کے نام ارسال فرمائے تھے۔ یہ تینوں مکاتیب شائع کئے جاتے ہیں۔

امیر الامراء غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ حضرت آصف جاہ مرحوم مغفور کے بڑے فرزند تھے۔ ان کا اصلی نام میر محمد پناہ تھا۔ کم سنی ہی سے محمد شاہ کے دربار میں تقرب حاصل تھا۔ دربار کے ماحول میں ہی نشو و نما پائی ابتداء میں بخشی گری احدیاں کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ سنہ ۱۱۵۳ھ میں جبکہ حضرت آصف جاہ میر بخشی (امیر الامرائی) کے عہدہ پر سرفراز ہو کر دکن آئے تو اس عہدہ کی نیابت غازی الدین خاں کو حاصل ہوئی حضرت آصف جاہ کے انتقال کے تین سال بعد میر بخشی کے عہدہ پر خود غازی خاں کا تقرر عمل میں آیا۔

حضرت ناصر جنگ کی شہادت کے بعد غازی الدین خاں کو حکومت دکن کی خواہش ہوئی۔ اعیان حکومت ابتداء میں اس پر رضامند نہیں ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ شاہ درانی کی دہلی میں آمد آمد کا شہرہ تھا اور ان کے ایلچی قلندر خاں دہلی میں وارد ہوئے تھے۔ بادشاہ کے اشارے سے صفدر جنگ جو اس وقت صوبہ اودھ و الہ آباد میں احمد خاں بنگش کے مقابلہ میں ملہار راؤ ہولکر کے ساتھ کامیاب ہوئے تھے۔ ملہار راؤ ہولکر کو زرکثیر کے وعدہ سے اپنے ہمراہ لے کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے لیکن ان کے آنے سے قبل ہی بادشاہ نے شاہ درانی کے مطالبات تسلیم کر لئے۔ اور قلندر خاں

رخصت ہوئے۔ صفدر جنگ بادشاہ کی خدمت میں پہونچ کر حیران ہوئے کہ اب ہولکر کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔

اس دوران میں دکن سے راجہ رگھوناتھ داس کے مارے جانے کی خبر آئی اور یہ اطلاعیں بھی پہونچیں کہ دکن کی فوج میں ہرج ومرج پیدا ہوگیا ہے۔ نیز یہ کہ فرنگیوں (فرانسیسیوں) نے غلبہ حاصل کرلیا ہے تو ان امو کو معلوم کرکے احمد شاہ نے ابوالمنصور خاں صفدر جنگ کے اتفاق رائے اور خود غازی الدین خاں کی رضامندی سے ان کو ۳ رجب ۱۱۶۵ھ کو صوبہ داری دکن کی خلعت عطا فرمائی۔ اس موقع پر نواب غازی الدین خاں نے ملہار راؤ ہولکر سے اتحاد پیدا کیا۔ اور اس سے یہ وعدہ کیا کہ صوبۂ خاندیس اس کو تنخواہ میں عطا کیا جائیگا۔ ہولکر نے یہ شرط قائم کی کہ صوبۂ خاندیس میں جن عہدہ داروں کو جاگیر حاصل ہے اس پر ان کو آیندہ حق حاصل نہ رہے گا اور زمانۂ عالمگیری میں اور دوسرے بادشاہوں کے زمانہ میں صوبۂ خاندیس سے جن لوگوں کو روزینہ مقرر ہوا تھا خواہ وہ آل تمغا کیوں نہ ہو موقوف کردیا جائیگا۔ نواب غازی الدینخاں نے ہولکر کی یہ شرط منظور کرلی۔ اور اپنی دستخط سے صوبہ خاندیس کی سند عطا کردی۔ غرض نواب غازی الدین خاں ہولکر کی اعانت کے بھروسہ پر برسات کے موسم میں مالوا کے راستہ سے دکن کی جانب روانہ ہوئے۔

اکبرآباد پر پہونچ کر نواب محمد علی خاں والاجاہ کے نام جو عنایت نامہ صادر فرمایا۔ وہ حسب ذیل ہے

(۴)

خان شہامت و نبالت دستگاہا!

سابق کہ عزیمت دکن بعمل آمدہ بود بسبب این کہ بعضے ارکان حضور پر نور از متوجہ شدن نواب صاحب وزیر الممالک بہادر بہ سمت افاغنہ بنگشی و برآمدن این جانب بعزم دکن عرصہ را خالی دیدہ ہنگامہ آرا شدند وخیالات فاسد بخاطر راہ دادند و جناب قدس والا بدریافت این معنی باصرار تمام برائے اطفائے این نائرہ فساد طلب حضور نمودند و خلعت میر بخشی گری عنایت فرمودند نظر بحق نمک رسیدن بحضور انور و ہمیندے بودن این جا ضرور شد۔ ندین ولا کہ افاغنہ بنگشی مطیع و منقاد شدند و ابدالی کہ بہ لاہور رسیدہ بود اطاعت حکم والا نمودہ معاودت بوطن خود کرد۔ نواب وزیر الممالک بہادر بہ بسطوت و صولت تمام بحضور انور

لہ نواب صفدر جنگ

رسیدند و باین جانب و نواب موصوف ربط محبت و دوستی ہا بہ کمال صدق و صفا موکد بعہود و مواثیق
[illegible] ہم پیوستہ و عوالی و معالی پناہاں راؤ ملہار جی و راؤ جیاپا جی راؤ بدل متحد و متفق شدند و بجمیع وجوہ [illegible]
کارہائے حضور دل جمعی حاصل گردید بتاریخ سیوم رجب خلعت استقلال و رخصت دکن از پیش گاہ فضل
[illegible] مرحمت شد۔ فردائے آن بحول و قوۃ داخل خیمہ شدیم۔ و منزل بمنزل عازم سمت مقصود ایم
عوالی پناہاں راؤ ملہار راؤ و جیاجی راؤ لوازم کمال دوستی و سعی در حصول رخصت بتقدیم رسانیدہ با جمعیت
کثیر ہمراہ اند و امارت و ایالت مرتبت راؤ پنڈت پردہان باقتضائے فرط محبت و یگانگت و یکجہتی
[illegible] صفا در جمیع امور رفیق اند با این طرف اکبرآباد بعنایت ایزدی رسیدہ شد انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب بان
[illegible] جمعیت افزائے دوستان صادق و احبائے موافق بعمل می آید۔ مراتب وثوق اتحاد
[illegible] رسیدگی و توجہات خاص کہ حضرت علیہ الرحمۃ برآن موالات دستگاہ داشتند
بوجہ احسن [illegible] خاطر است و بر محبت و دوستی ہائے آن شہامت پناہ کمال اعتماد و یقین۔ می باید کہ
بخاطر جمع و استقلال بودہ باستمالت و دل جوئی سرداران و رفقائے قدیم و تربیت یافتہ ہائے حضرت علیہ الرحمہ
پردازند کہ این جانب محض بنا بر پاس خاطر و جمعیت افزائی دوستان متوجہ شدہ ایم۔ حالا بفضل الٰہی وقت جلوہ
[illegible] شاہد مدعائے احباء و ترقیات ہمہ صد تا است خاطر مشتاق مشتاق دانستہ بہ ملاقات ہا زود مسرور
باید ساخت تا حصول این مامول بہ تحریر مکاتیب نشاط افزا باید بود۔" (بیاض خاص)

اس مکتوب کے لفافہ پر امیر الامراء بہادر نظام الملک ۱۱۶۴ھ کی مہر ثبت ہے اور دفتر والا جاہی
میں یہ شرح لکھی گئی ہے کہ "در بست و چہارم شہر ذی قعدہ ۱۱۶۵ھ در منزل وندواسی ورود نمود۔"

اس مکتوب کا مطلب یہ ہے کہ میں نے پہلے بھی دکن آنے کا ارادہ کیا تھا لیکن اس زمانہ میں
وزیر الممالک (صفدر جنگ) افاغنہ بنگش کی جانب گئے ہوئے تھے اور میرے دکن جانے کے
عزم کا اظہار ہوا تو بعض لوگوں نے فساد مچایا۔ بادشاہ نے فساد کے رفع کرنے کے لئے مجھے طلب فرمایا
اور میر بخشی کے عہدہ پر مامور فرمایا حق نمک کے خیال سے چند دن بادشاہ کی خدمت میں حاضر رہنا ضروری تصور
ہوا۔ اس اثناء میں افاغنہ بنگش مطیع ہو گئے۔ احمد شاہ ابدالی لاہور سے واپس ہو گئے۔ وزیر الممالک

بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔ نواب موصوف اور مجھ میں محبت و دوستی کا ربط قائم ہوگیا۔ ملہار راو (ہولکر) اور جی اپا (سندھیا) سے بھی اتحاد قائم ہوا ہے۔ جب کو مجھے بادشاہ نے دکن کی صوبہ داری پر مامور کیا اور دکن جانے کی اجازت دی میں روانہ ہوچکا ہوں۔ ملہار راؤ اور جی آپا اپنی فوج کے ساتھ ... پنڈت پر وہاں سے یگانگت پیدا ہوچکی ہے۔ اس وقت ہم اکبرآباد ... میں ... (... الا جاہ) کی محبت و دوستی پر اعتماد حاصل ہے۔ جلد ملاقات کریں ... جاری رکھیں۔

غرض نواب غازی الدین خاں دریائے نربدا پر پہونچے تو پھر ایک مختصر عنایت نامہ صادر فرمایا جو حسب ذیل ہے۔

(۵)

ہو

شہامت و بسالت پناہا اخلاص و موالات دستگاہا

مراتب محبت و دولت خواہی و بہادری ہائے آن شہامت و بسالت پناہ مکرر بعرض رسیدہ باعث مزید خوشوقتی ہا گردیدہ۔ الحال کہ بفضل الٰہی کنار نربدا رسیدہ شدہ انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب بہ خجستہ بنیاد می رسیم آن اخلاص و موالات دستگاہ بجمیع وجوہ مطمین بودہ باستقلال بکارہائے متعلقہ مستعد سرگرم باشند و بتقدیم لوازم دولت خواہی پردازند کہ متمم ثمرات و نتیج ترقیات خواہد بود۔ دیگر ...

اس مکتوب کے لفافہ پر "امیر الامراء بہادر نظام الملک ۱۱۶۳ء کی مہر ثبت ہے۔ اور دفتر والاجاہی میں یہ شرح لکھی گئی ہے کہ "بست و چہارم ذی قعدہ سنہ ۱۱۶۵ھ در منزل ... رسید و اسی ورود نمود"۔

اس مکتوب کا مطلب یہ ہے کہ نربدا پر ہم پہونچ چکے ہیں اور جلد اورنگ آباد پہونچ جائیں گے۔

نواب غازی الدین خاں کی آمد آمد کی خبر پھیلی تو نواب صلابت جنگ کے لشکر میں انتشار سا پیدا ہوا۔ ہر عہدہ دار اپنی فکر کرنے لگا۔ اس زمانہ میں نواب صلابت جنگ کی فوج افاغنہ سے مصروف پیکار تھی لیکن اب صلح ہوگئی۔ اب قرار یہ پایا کہ کرنول کا قلعہ افاغنہ کو دے دیا جائے اور ان کو اپنا رفیق بناکے نواب غازی الدین خاں سے مقابلہ کیا جائے۔ چنانچہ منور خاں کے نام سند قلعۂ کرنول عطا ہوئی۔ اس سے قبل قلعۂ کرنول مظفر خاں گارڈی کے قبضہ میں تھا۔ اب گویا ان کو بے دخل کر دیا گیا۔ مظفر خاں جا کر بالاجی راؤ سے

مل گئے۔ غرض جیسے جیسے نواب غازی الدین خان دکن سے قریب ہوتے گئے نواب صلابت جنگ کی فوج میں سراسیمگی بڑھنے لگی لیکن مقابلہ بھی ٹھان لیا گیا۔ جس نے ۲۰ ہزار گارڈیوں ، ۲ ہزار فرنگیوں اور ۲ ہزار سواروں کے ساتھ یہ ارادہ کیا کہ دریائے نربدا پر پہونچکر جنگ کرے۔

غرض نواب غازی الدین خاں دکن میں آئے تو پہلے برہان پور میں قیام کیا اور وہاں اپنا کافی اثر قائم کرلیا۔ اس زمانہ میں مندرجہ ذیل عنایت نامہ صادر فرمایا۔

(۶)

خان شہامت وبسالت پناہا اخلاص وموالات دستگاہا

وثوق اتحاد ونیک اندیشی ودولت خواہی وصداقت ویکجہتی آن شہامت وبسالت دستگاہ بوجہ حسن منقش خاطر است وتردوات وبہادریہائے کہ درین ولا از ان شہامت وبسالت دستگاہ در تنبیہ وتادیب چندا[1] ے شقی بظہور رسید مفصل ومشروحا پیرایہ ایضاح یافتہ باعث کمال خوش وقتی وانبساط شد۔ این کار از تو آید ومردان چنین کنند۔ خاطر را بہمہ جہات جمع داشتہ برتعلقات وخدمات متعلقہ مستقل بودہ بتقدیم لوازم یکجہتی باید پرداخت الحال کہ بحول وقوۃ الہی عبور نربدا کردہ شد وعنقریب بہ خجستہ بنیاد[2] رسیدہ می شود وقت آن است کہ مزید اقتدار وجمعیت جمیع دوستان صادق ودولت خواہان واثق خصوص آن شہامت وعوالی پناہ کہ محبت صمیم با ما دارند جلوہ نمائے عرصہ ظہور شود۔ شنیدہ شد کہ جمعیتے شایستہ از فرنگیان انگریز ہمراہ آن شہامت وبسالت دستگاہ است حالا کہ بفضل ایزدی آن شہامت وبسالت دستگاہ را دل جمعی از کارہائے انجا دست دادہ وچندا کہ مصدر ہنگامہ وفساد بود بسزا رسید لہذا قلمی می گردد کہ فرنگیان مذکور را استمال وامیدوار ساختہ نزد ما باید فرستاد۔ بعد فراغ از کارہائے این جا اگر آن شہامت وبسالت دستگاہ درخواست خواہند نمود فرستادہ خواہد شد از انجا کہ راستی ودرستی ویکجہتی آن شہامت وبسالت دستگاہ بدرجہ اتم مرتسم خاطر گشتہ است لہذا از راہ کمال اعتماد این معنے بقلم آمدہ خاطر را مشتاق وخواہان ملاقات خود تصور نمودہ بہ ترقیم احوال حرمال نشاط افزا دمسرت پیرا باید بود۔" شرح دستخط خاص:۔

[1] ۔ نواب حسین دوست خان چندا صاحب۔ [2] ۔ اورنگ آباد

محالهٔ طیلسانا نویس

"........... این خدمات ووفائے پچنین اوقات ثمرات عظیم دارد و بفضل الٰہی وقت ظہور آن قریب رسیدہ" (بعض خاص)

اس مکتوب کا یہ مطلب ہے کہ مکتوب الیہ کے اتحاد اور نیک اندیشی پر پورا بھروسہ ہے۔ چندا صاحب کی تنبیہہ میں جو کوشش عمل میں لائی گئی اس سے خوش وقتی حاصل ہوئی "این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند" اب ہم نربدا عبور کر چکے اور بہت جلد اورنگ آباد پہونچ جائیں گے۔ اب ضرورت ہے کہ سب دوستان صادق پوری کوشش عمل میں لائیں۔ سننے میں آیا ہے کہ آپ کے پاس انگریزوں کی کوئی بہتر فوج ہے۔ اب جبکہ چندا صاحب اپنی سزا کو پہنچ چکے اور آپ کو دلجمعی حاصل ہو چکی انگریزوں کی فوج کو ہمارے پاس بھیجدیں۔ کام ختم ہو جائے تو آپ کی درخواست پر پھر ان کو واپس بھیجدیا جائے گا۔ خدمات اور وفاداری سے آپ کو بڑے ثمرات حاصل ہوں گے۔

بہرحال نواب غازی الدین خان اورنگ آباد پہونچ گئے۔

محمد علی الحسینی نے اپنی کتاب تاریخ راحت افزا میں لکھا ہے کہ غازی الدین خاں کی جانب سے نواب صلابت جنگ کو یہ پیغام بھیجا گیا کہ ہم دونوں بھائی ہیں۔ جنگ کرنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ میں صرف ملک کے بند و بست کے لئے آیا ہوں۔ اگر چاہو تو میری نیابت میں تم دکن میں رہو۔ یہاں انتظام قائم کرکے پھر ہندوستان چلا جاؤں گا۔

محمد علی الحسینی نے اپنی دوسری کتاب مرات الصفا میں تصریح کی ہے کہ نواب غازی الدین خاں جب تک زندہ رہے برابر اس فکر و تدبیر میں رہے کہ صلابت جنگ ملاقات کے لئے آجائیں تاکہ بندوبست زیادہ بہتر طریقہ سے ہو سکے۔

غرض نواب غازی الدین خاں اورنگ آباد میں صرف ۱۱ روز رہ کے مرگ مفاجات سے عالم جاودانی کی جانب رہ سپار ہوئے۔ ماثر الامرا نے تاریخ مظفری کے حوالہ سے یہ لکھا ہے کہ اصل میں زہر دے دیا گیا۔ تاریخ راحت افزا میں لکھا ہے کہ "بعضے گویند کہ نواب فیروز جنگ را بعضے زخدمہ محل نواب صلابت جنگ مسموم نمودند"

غرض نواب صلابت جنگ کے دہلی سے روانہ ہونے اور مرگ مفاجات تک جو جو امور پیش آئے اور جن کی تفصیل تاریخ راحت افزا اور مرات الصفا میں قلم بند کی گئی ہے ایک عبرت کا درس ہیں۔ عہد و مواثیق کی شکست، پاس نمک نہ رکھنا، سازشیں اور مکر و فریب غرض ہماری کمزوریوں سے اغیار فائدہ اٹھا رہے تھے۔

اوپر ابوالمنصور خاں کا نام آیا ہے ان کا مختصر تذکرہ بے محل نہیں۔

ابوالمنصور خاں کا خطاب صفدر جنگ تھا۔ میرزا مقیم نام تھا۔ سیادت خاں کے بیٹے تھے محمد شاہ کے عہد میں صوبہ اودھ کا نظم و نسق ان کے سپرد ہوا۔ بعد میں صوبہ الہ آباد بھی ان کے تفویض کیا گیا۔ احمد شاہ کے دور میں حضرت آصف جاہ کے انتقال پر صفدر جنگ کو وزارت پر مامور کیا گیا۔ احمد خاں بنگش سے اختلاف پیدا ہوا تو باہمی جنگ و جدال کی نوبت آئی اور احمد خاں نے صفدر جنگ کو شکست [illegible] د ۱۱۶۳ھ میں احمد خاں نے بعد میں صوبۂ اودھ اور صوبۂ الہ آباد میں غارت گری شروع کی۔ اس کے سد باب کے لئے صفدر جنگ نے ملہار راؤ ہولکر اور جی اپا سندھیا کے تعاون سے افاغنہ پر یورش کی۔ اور اس مرتبہ انھوں نے افاغنہ کو شکست دی۔

احمد خاں بنگش جن کا ابھی اوپر تذکرہ ہوا۔ افاغنہ سے تھے اور محمد خاں قایم جنگ صوبہ دار مالوا کے بیٹے تھے۔

معاصرین کے صفحے

ہندوستان کے سماجی حالات میں انقلاب، چاہے خوشگوار ہو یا ناخوشگوار پیدا ہو رہا ہے۔ ایک طرف حیدر آبادی عمائدین اپنے خاموش عمل سے اس انقلاب کی رہنمائی کر رہے ہیں اور دوسری طرف حیدر آبادی قائدین اپنے بلند آہنگ اقوال سے اس انقلاب کو روکنا چاہتے ہیں۔ اس کا ایک بہت ہی دلچسپ مرقع لاہور کے نسوانی ہفتہ وار اخبار تہذیب النسواں کی ۳۱ مارچ ۱۹۴۳ء کی اشاعت میں نذر سجاد حیدر صاحبہ نے کھینچا ہے اور خوب کھینچا ہے۔ اس قسم کے حالات اور واقعات اس اسلوب بیان میں خبر رساں اداروں کے بیانات میں کیوں آنے چاہئے ہیں۔ ہمارے تو وہی تصور کریں جو خود انقلابی ہو۔ حیدر آبادی عمائدین اور قائدوں کے متعلق وہ کہتی ہے مجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا کیا کہے۔ ناظرین مجلہ بھی اس سادہ لیکن اثر پیدا کرنے والے بیان کی باریکیوں پر غور کریں۔ نذر سجاد حیدر صاحبہ لکھتی ہیں:۔

"۱۳ فروری کو اسٹریچی ہال مسلم یونیورسٹی میں تقسیم اسناد کا جلسہ تھا۔ میں اپنی بھاوج بیگم ابراہیم خاں اور بھانجی قمر جبین، عزیزہ سعیدہ فاذ حسین کو ہمراہ لیتی وہاں پہنچی۔

اسٹریچی ہال میں قدم رکھ کر خدا کی شان نظر آتی ہے اور اب سے بیس سال قبل کا زمانہ یاد آجاتا ہے۔ اللہ اللہ! یہ وہی مقام ہے اور ویسا ہی اجلاس۔ بلکہ اس وقت اس اجلاس کی صدر ایک بیگم صاحبہ خاتون ہوا کرتی تھیں اور آج سب مرد ہی مرد ہیں۔ مگر یونیورسٹی کے حاکم کے حکم ملکہ تنگ ... ہم کو ہال میں برقع پہن کر بھی قدم رکھنے کی اجازت نہ ملتی تھی یہاں تک کہ اوپر گیلریوں میں پردے اور چلمنیں لگوا کر بھی ہمیں وہاں بیٹھنے کی اجازت نہ تھی اور آج وہی یونیورسٹی کا حاکم ہے کہ رفتار زمانہ سے مجبور اور بے بس ہے۔ اس وقت اس قدر ہمت نہیں ہے کہ ہم لوگوں کو بے نقاب ہال میں آنے سے روک سکے۔ جس وقت ہم لوگ وہاں پہنچے اسٹریچی ہال سیکڑوں مردوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک پروفیسر ہمارے

آگے آگے راستہ بتاتے ہوئے ہمیں اندر لے گئے۔ اور سب سے پہلی قطار میں اسی حاکم دارالعلوم کے بالکل سامنے بٹھا دیا۔ میں دل میں سوچ رہی تھی کہ اس رنگ برنگی چمکیلی ساڑیوں کو اپنے مقابل میں بے نقاب دیکھ کر اُس قدامت پسند و تنگ نظر بزرگ کے دل پر کیا گذر رہی ہوگی۔

میں نے بیس سال قبل بھی جبکہ میرے شوہر مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے اور مرحومہ بیگم صاحبہ بھوپال چانسلر تھیں بڑی کوشش سے اور مخالفانہ کارروائیوں کے علی الرغم پس پردہ چلمنوں میں سے بہت سی خواتین کے ساتھ یہ مجمع دیکھ ہی لیا تھا۔ اور اب تو آزادی ہے۔ خدا جنت نصیب کرے سر شاہ سلیمان مرحوم کو جن کے عہد حکومت میں اس بے کس و بے بس مظلوم فرقہ کو یہ حق حاصل ہو گیا کہ وہ بھی اپنے قومی جلسوں میں شریک ہو سکے۔ میرے برابر والی کرسی پر عزیزہ ممتاز جہاں بیگم پرنسپل مسلم گرلز کالج علی گڈھ رونق افروز تھیں۔ اور پہلی قطار میں مسلم کالج کی گریجویٹ طالبات۔

جب ام اے کی ڈگری دی جانے لگی تو عزیزہ ممتاز جہاں اٹھیں اور ان کے پیچھے دوسری لڑکیاں! کتنا دلکش اور قابل قدر نظارہ تھا! پھر اسی طرح بی اے اور بی ٹی کی ڈگریاں لینے والیاں اپنے پرنسپل کے پیچھے پیچھے گئیں۔ صرف یہ دیکھنے کے لئے دو سال سے اس موقع پر میں علی گڈھ جا رہی تھی۔ اس مجمع میں علاوہ خواتین علی گڈھ کے چند باہر کی بیگمات بھی نظر آئیں۔ جو زنانہ جلسے کے لئے دور دور سے تشریف لائی تھیں۔

پھر تین بجے ہم مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے پہلے اجلاس میں اسٹریچی ہال آگئیں۔ اس کانفرنس میں میری اس آزادی کے ساتھ پہلی شرکت تھی۔ ۲۰ تا ۲۵ سال قبل اس کانفرنس کے ساتھ ہماری زنانہ نمائش بھی ہوا کرتی تھی۔ اور تعلیم نسواں سیکشن کا اجلاس بھی۔ نمائش دیکھنے کے لئے میں کئی بار گئی تھی لیکن کانفرنس اور اپنے سیکشن کے جلسوں میں ہمارا گذر ناممکن تھا۔ پردہ کے شدید انتظامات کے ساتھ خواتین کو صرف زنانہ دستکاری کی نمائش دکھا دی جاتی تھی۔ مگر اس سال مردانہ کانفرنس اور تعلیم نسواں کے سیکشن کی کارروائیاں مخلوط تھیں۔ اور اسی چیز کی کشش نے مجھے لکھنؤ سے کھینچ لیا تھا۔ چھ بجے شام تک کانفرنس کا پہلا اجلاس ختم ہوا اور سب خواتین ایٹ ہوم میں گئیں۔

اوہ! میں ایک ضروری بات لکھنا بھول ہی گئی۔ نواب ظہیر یار جنگ صدر کانفرنس مع اپنی بیگم صاحبہ کے

ہال میں تشریف لائے اور کرسی صدارت کے برابر ہی بیگم ظہیر یار جنگ بھی رونق افروز ہوگئیں۔ گو اسکی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اور اگر حاکم یونیورسٹی اور محترم سکریٹری مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا بس چلتا تو وہ ایسی بدعت ہرگز نہ ہونے دیتے جس وقت ان کی کمل حکمرانی و خود مختاری کا زمانہ تھا اس وقت ہم تڑپ تڑپ کر رہ جاتی تھیں۔ اور اس اجلاس میں بھی بانقاب جانے کی اجازت نہ ملتی تھی جس کی صدر سرکار عالیہ بھوپال ہوا کرتی تھیں۔ آج سیکڑوں خواتین اسلام اس بڑے مجمع میں بے نقاب شریک تھیں اور ایک نوجوان صدر کانفرنس کی نو عمر بیگم صاحبہ بھی بانئ روزی رونق افروز ہیں۔

دوسرے روز دن کے دس بجے تعلیم نسواں سیکشن کا اجلاس تھا۔ پردہ نشین خواتین کے لئے اسٹیج ہی ہال ہی کی چقوں اور کپڑوں سے پردہ گاہ بنائی گئی تھی۔ ہال کے باقی حصوں میں مردوں کا مجمع تھا کرسی صدارت بھی باہر مردانہ میں ہی رکھی گئی تھی۔ یہ دیکھ کر ہم کو بے انتہا حیرت ہوئی۔ پردہ کانفرنس! صدر ایک محترم خاتون! اور تمام کارروائی پردے سے باہر! زنانہ جلسہ اور مردوں کو اس میں تقریر کرنیکی اجازت! کارکن کمیٹی کے ممبر ہوں یا پردہ کے اندر! اور صدر جلسہ اور قمر جہاں بیگم پردہ سے باہر! یہ طریق کار ہماری سمجھ میں تو نہ آیا۔ زنانہ کمیٹی کی منتظمہ سے حکم ملا کہ پردہ میں بیٹھنا سب کو لازمی ہے۔ میں نے کہا صدارت کی کرسی پردہ کے اندر منگوائیے۔ جب پردہ کا نفرنس ہے تو صدر کا بھی اندر ہونا لازمی ہے۔ معلوم ہوا کہ کانفرنس کے بانی مردوں نے اس کی اجازت نہیں دی کہ بیچاری پردہ نشین خواتین اپنی صدر بیگم ظہیر یار جنگ کو آنکھوں سے دیکھ سکیں۔ اور کارروائی ان کے آگے ہو۔ ہم سے تو ایسا نہ ہوسکا کہ سب کام پردہ کے باہر ہو رہا ہے اور ہم آنکھیں بند کئے اندر بیٹھی رہیں۔ چنانچہ میں مع چند خواتین کے چلمنوں سے باہر کی کرسیوں پر آبیٹھی۔ مجھے یہ دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی کہ میری روشن خیال بہن سیدہ رضویہ خاتون سیاہ برقع میں نقاب ڈالے میرے قریب آبیٹھی۔ یہ عجیب کانفرنس تھی! پس پردہ بھی اور بے پردہ بھی۔ صدر جلسہ بیگم ظہیر یار جنگ باہر چند اور خواتین بھی باہر! اور کچھ بیبیاں اندر! بہت مناسب کیا بہن رضویہ نے کہ باہر بھی آگئیں اور پردہ بھی نہ اٹھایا۔ یہ ہے زمانہ کا زبردست اثر کہ حامیان پردہ سب کچھ دیکھ رہے تھے اور ان کا کچھ بس نہ چلتا تھا۔

چاہیئے تو یہ تھا کہ محترمہ سکریٹری صاحبہ ایجوکیشنل کانفرنس حتی الامکان فراخدلی سے کام لے کر کرسی صدارت پردہ کے اندر رکھوا دیتیں۔ پھر کوئی بی بی پردہ سے باہر آنے کی ہمت نہ کرسکتی۔ مگر زمانہ بدل چکا ہے۔ اندر کا کام اندر ہوا اور باہر کا باہر۔ جب کسی اندرونی خاتون کو تقریر کرنی ہوتی تو مائیکروفون چق کے باہر کی طرف لگا دیا جاتا تھا۔ غالباً وہ بی بی اپنا منہ بلکہ ہونٹ چلمن کی تیلیوں پر مائیکروفون کے برابر رکھ دیتی ہونگی اور پھر کوئی مرد مقرر کو اٹھتے تو مائیکروفون وہاں لاکر رکھدیا جاتا تھا۔ نرالے انداز کی کارروائی دیکھی۔

اس وقت حیدرآباد کے ایک [illegible] نے ایک فاضلانہ اور پر زور تقریر کی جس میں ابتدائے اسلام سے دور جدید تک کی خواتین اسلام کی خوب خوب تعریفیں کیں اور ان کے کارنامے بیان کئے جن کو سن کر ہم سب خوش ہو رہی تھیں۔ مگر آخر میں اکبر مرحوم کا شعر۔

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

پڑھ کر کہا کہ میری ماؤ بہنو اور بیٹیو! شمع انجمن نہ بنو چراغ خانہ ہی بنی رہو۔ یہ ہدایت فرماکر انھوں نے اپنی تقریر ختم کردی۔

اس "شمع انجمن" کے لفظ پر اندر اور باہر کی خواتین کے جذبات مشتعل ہوگئے اور مخالفانہ تقریریں ہونے لگیں سب سے پہلے ہمارے ہمدرد نسواں محترم بزرگ شیخ عبداللہ صاحب بانی مسلم گرلز کالج علی گڈھ نے تقریر کی۔ پھر بیگم آزاد رسول نے بہت معقول جواب دیا۔ حیرت ہے کہ اس حالت میں جب حیدرآباد کی ایک عالی رتبہ خاتون اس مجمع عام میں زنانہ جلسہ کی صدارت کر رہی ہو۔ بہادر یار جنگ آج کل کی خواتین کو شمع انجمن کہیں! بغرض کہ بہت دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔"

ضروری اطلاع

معزز ارکان انجمن و خریدار صاحبان مجلہ کی توجہ منعطف کرائی جاتی ہے کہ نقل مقام یا تبادلہ کی صورت میں براہ کرم دفتر انجمن کو اپنے صحیح پتہ سے مطلع فرمائیں

تنقید و تبصرہ

(۱) مضامین محمد علی (حصۂ دوم)

یہ کتاب مولانا محمد علی کے اون مضامین کا مجموعہ ہے جو ہمدرد میں شایع ہوتے رہے ہیں۔ بہ لحاظ زمانہ ان مضامین کا تعلق سنہ ۱۹۲۵ء سے لے کر سنہ ۱۹۲۹ء سے ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جبکہ سنہ ۱۹۲۱ء کے نان کوآپریشن اور تحریک خلافت کا ردعمل ہندوستانیوں پر ہو رہا تھا۔ ہندو مسلمانوں کے اتحاد کو نظر لگ چکی تھی اور مولانا محمد علی، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں صاحب جیسے اتحاد کے حامی اور جو کانگریس کے صدر بھی رہ چکے تھے کانگریس سے بیزار ہو چکے تھے اس کی کیا وجہ تھی اگر تلاش کرنا ہو تو اس کتاب کی ورق گردانی سے بہت کچھ مدد ملے گی۔ مسلم لیگ کی آج کل جو روش ہے اوس کی داغ بیل اوسی زمانہ میں پڑ رہی تھی۔ اس میں کانگریس کا ہندو مہاسبھا کا اور لیگ کا کس قدر قصور ہے اس پر اظہار کئے بغیر ہم کہہ سکتے ہیں کہ واقعات کے ایک پہلو کی تصویر ان مضامین سے ضرور واضح ہو جاتی ہے۔ اور یہ مضامین ایسے شخص کے نہیں ہیں جو پہلے سے کانگریس کا مخالف رہا ہو۔ بلکہ یہ کانگریس کے سابق صدر کے خیالات ہیں اس لئے زیادہ قابل توجہ ہیں اور مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں کے لئے قابل توجہ ہیں۔ اور ان مضامین کے مطالعہ سے انھیں یہ نتیجہ نکالنے میں آسانی ہوگی کہ آج مسلم لیگ کانگریس سے کیوں برسر جنگ ہے۔ کتاب کا وہ حصہ توجہ کو زیادہ جذب کرتا ہے جہاں مسٹر جناح کا ذکر آتا ہے اور مسٹر جناح کے اس وقت کے خیالات کا علم ہوتا ہے لیکن کتاب کا سب سے زیادہ دلچسپ حصہ وہ ہے جس میں ڈاکٹر اقبال مرحوم سے متعلق مضامین درج ہیں۔ مضامین سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد علی کو علامہ اقبال سے بے حد عقیدت تھی اور وہ خود لکھتے ہیں کہ اونھوں نے اسلام مولویوں سے نہیں بلکہ علامۂ اقبال سے سیکھا تھا لیکن نان کوآپریشن کے سلسلہ میں مولانا محمد علی علیگڈھ کالج کو بند کر دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اسلامیہ کالج پشاور کو بند کرانے میں کامیاب نہیں ہوتے جس کے سکریٹری علامۂ اقبال تھے۔ اس کے بعد مولانا محمد علی علامہ اقبال کو کونسل میں بیٹھا ہوا دیکھتے ہیں جبکہ خود مولانا پکے نوچینجر تھے اور سوراج پارٹی کے مسلک کے بالکل خلاف تھے جو سی، آر، داس اور پنڈت موتی لال نہرو

کے ہاتھوں میں تھی۔ علامہ اقبال کے اس طرز عمل سے مولانا کو بہت تکلیف ہوتی ہے اور انھیں تعجب ہوتا ہے کہ ہندی ترانہ، نیا شوالہ، اور شمع و شاعر کا مصنف آزادی کی تحریک سے کیوں بے تعلقی کا اظہار کر رہا ہے۔ وہ شاعر اقبال سے خود اوسی کے اشعار کے حوالے سے اون کا واسطہ دے دے کر دریافت کرتے ہیں کہ آخر یہ کیا ہے اور کیوں ہے۔ لیکن ہمیں نہیں معلوم کہ اگر مولانا محمد علی آج زندہ ہوتے تو اون کے خیالات کیا ہوتے اور ڈاکٹر اقبال سے متعلق ان مضامین کے متعلق وہ کیا رائے رکھتے۔ بہرحال کتاب کافی دلچسپ ہے۔ تقریباً (۴۰۰) صفحات کی مجلد کتاب ہے۔ کاغذ لکھائی چھپائی عمدہ ہے اور مکتبہ جامعہ دہلی سے طبع ہوئی ہے۔ اس گرانی کے زمانہ میں قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ بہت کم ہے۔ ہم مطالعہ کی سفارش کرتے ہیں

ک۔ ا

(۲) تاریخ عطیات آصفی

تالیف مولوی نصیرالدین صاحب ہاشمی

عطیات آصفی یہ نہایت مفید اور مختصر کتاب ہے اور بقول مولوی عبدالباسط خان صاحب سابق رکن کمیٹی عطیات "ہاشمی صاحب کی ملازمت کا آغاز دفتر دیوانی و مال سے ہوا اور بجز تین سال کے ان کی پوری ملازمت کا زمانہ دفتر دیوانی و مال ہی میں بسر ہوا ہے۔ اسی لحاظ سے اون کو دفتر موصوف کے داخلوں اور کاغذات پر پورا عبور ہے۔ اون کی زیر نظر کتاب سررشتہ عطیات اور دفتر دیوانی و مال کے کاروبار اور داخلوں کے متعلق قیمتی معلومات اور صحیح رہبری کا کام دے سکتی ہے اونھوں نے نہایت محنت اور تحقیق سے نہ صرف پراگندہ اور منتشر معلومات کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ بلکہ جدید معلومات اور تحقیقات سے مملو بیش قیمت مصالحہ فراہم کر دیا ہے۔ جو معاشداران اور وکلاء کے لئے واقعی کارآمد ہوگا" ہماری رائے میں کتاب معاشداران اور وکلاء کے علاوہ حیدرآباد کی عطایا سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بھی اچھی مطالعہ کی چیز ہے۔ تقریباً سوا سو صفحہ کی کتاب اور کتابت و طباعت اچھی ہے۔ قیمت دو روپیہ ہے۔ (ک۔ ا)

(۳) قرآنی دعائیں

مولفہ محمد فاروق بی، اے، (عثمانیہ)، ایچ، سی، ایس (۲۲) صفحے چھوٹی تقطیع نفیس لکھائی چھپائی۔ کتب خانہ سعیدیہ ترپ بازار حیدرآباد سے ملے گی۔ قیمت درج نہیں۔ بارہ آنے یا ایک روپیہ ہونی چاہیئے۔

اس مختصر رسالہ میں مولف نے ان تمام دعاؤں کو یکجا کر دیا ہے جو قرآن مجید میں مختلف سوروں اور آیتوں میں ہیں۔ ان کی تعداد (۰۰ ۱) ہوئی ہے۔ اولاً اعراب لگا ہوا عربی متن پھر ترجمہ اور آخر میں مختصر توضیح ہے۔

کتاب میں ترتیب تو وہی ہے جو خود قرآن مجید میں ان دعاؤں کی ہے لیکن علمی ضرورت سے دو فہرستیں دیکر تلاش آسان کر دی گئی ہے۔ پہلی فہرست میں ہر دعا کا موضوع یا عنوان بلحاظ ترتیب طباعت دیا گیا ہے اور دوسری فہرست جو اشاریہ ہے، ان موضوعوں کو حروف تہجی پر مرتب کرنے پر مشتمل ہے۔ مثلاً علم، اولاد، رزق دشمن سے نجات وغیرہ۔

یہ کتاب سفر و حضر کی بڑی اچھی مونس و رفیق ہے۔ م ۔ ح ۔ ل

(۴) آسان حدیث

مولفہ محمد شعیب حنفی رکن مجلس علماء بھوپال۔ غالباً مولف سے ملے گی ۔ فی حصہ (۱ پائی) آنہ

مولف نے چھوٹی چھوٹی، اخلاقی اور کارآمد حدیثوں کا ترجمہ خاص کر بچوں کے لئے شایع کرنا شروع کیا ہے۔ ہر حصے میں کم و بیش تیس چالیس حدیثیں ہوتی ہیں جو چھوٹی تقطیع کے ایک جز پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اب تک ہمیں چار حصے وصول ہوئے ہیں۔ زیادہ تعداد میں خرید کر تعقیم کرنا اور خاص کر بچوں کو انعام میں دینا مفید ہوگا۔

احادیث کے ترجمہ کے بعد عام فہم مطلب بھی چند الفاظ میں شامل کر دینے سے اس کا افادہ بڑھ گیا ہے۔

اگر محترم مولف ہر حدیث کے بعد اس کا حوالہ بھی دیدیں کہ کس کتاب سے لی گئی ہے تو مناسب ہوگا۔ ماخذ اگرچہ کنز العمال ہے، لیکن کنز العمال میں بھی ہر حدیث کا حوالہ ہوتا ہے کہ کس کتاب سے لی گئی ہے۔

مذہبی لٹریچر کی اخلاق سازی کے لئے اتنی کثیر ضرورت ہے کہ اس طرح کے کاموں میں مزید اضافے بھی ہو سکتے ہیں۔ اگر ہر حصے میں صرف ایک ایک موضوع ہی کی حدیثیں کسی ترتیب سے جمع کی جائیں اور جلی ترخط میں چھاپی جائیں تو نوعمر بھی پڑھ سکتے ہیں اور یہ انھیں کے لئے لکھی جا رہی ہیں۔ م ۔ ح ۔ ل

(۵) شیطان کا انتقام

از جلال الدین صاحب اشک۔ قیمت ۸ر

یہ مختصر سی کتاب بقول مصنف "دور حاضر کے علمی، اخلاقی اور سیاسی رجحانات پر ایک طنز اور تند اور تلخ تبصرہ" ہے

عہد حاضر میں جو تخریبی قوتیں سارے عالم میں کارفرما ہیں ان سے ہر سوچنے والا دل و دماغ ضرور کچھ نہ کچھ متاثر ہو رہا ہے۔ زیر نظر کتاب میں اسی عالمگیر ہیجان کو ایک تمثیلی افسانے کی صورت میں پیش کیا گیا ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ کس طرح شر کی قوتیں خیر پر غالب آ رہی ہیں اور کس طرح شیطان اپنے ازلی دشمن آدم کی اولاد سے اپنی رسوائی کا انتقام لے رہا ہے اس قصہ میں شیطان خود انسان کے ہاتھوں انسان کی تباہی کے سامان بہم پہنچاتا ہے اور مختلف علوم و فنون مثلاً سائنس، طب، ادب، فلسفہ، تاریخ، وغیرہ کا غلط استعمال کرا کے نسل آدم کے دماغوں کو زہر آلود کرتا ہے تاکہ انسانی آبادی کی ذہنیت ہمیشہ کے لئے مسموم ہو جائے اور قتل و غارت کے موجودہ ہنگاموں سے جو لوگ بچیں وہ آیندہ نسلوں میں ایسا بیج بوئیں جس کے اثرات سے نسل آدم کبھی پنپ نہ سکے۔ اپنا یہ مقصد شیطان اپنے ذریات کے ذریعہ اس طرح پورا کراتا ہے کہ انسان نام نہاد ترقی کے دھوکہ میں پڑ کر تباہی کے غار میں گرتا چلا جائے۔ بقول اکبر الہ آبادی ؎

شیطان نے ترکیب تنزل یہ نکالی　　٭　　کہ تم انھیں شوق ترقی کا دلا دو

افسانہ دلچسپ اور پر اثر ہے اور اس کی زبان صاف و سلیس کتابت و طباعت عمدہ ہے اور کاغذ اس گرانی کے باوجود اعلیٰ قسم کا استعمال کیا گیا ہے۔ ل۔ ن۔

(۶)　　میسور میں اردو

چھوٹی سائز حجم (۹۶ صفحات مولف مولوی محمد سعید عبدالخالق صاحب (عثمانیہ)

ناشر درس گاہ اردو معظم بلڈنگ متصل معظم جاہی مارکٹ۔ حیدرآباد دکن قیمت (۹ ر)

نصیر الدین صاحب ہاشمی کی تالیف "دکن میں اردو" ایک کتاب آفرین کتاب ثابت ہوئی۔ اس کے شائع ہونے کے بعد "پنجاب میں اردو" اردوئے قدیم مغل اور اردو، یوپی میں اردو، وغیرہ کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ زیر بحث کتاب میسور کے متعلق ہے۔ اس کے مؤلف جامعہ عثمانیہ کے ایک متعلم عبدالخالق صاحب ہیں۔

ہاشمی صاحب نے اپنی کتاب "مدراس میں اردو" میں جو دکن میں اردو کے دوسرے حصے کے طور پر شائع ہوئی ہے۔ میسور کی اردو کا مختصر تذکرہ کیا ہے لیکن میسور اور بنگلور میں اردو زبان کی جو خدمت ہوئی اور

ہو رہی ہے اس کے لحاظ سے ضرورت تھی کہ تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا جاتا۔ عبدالخالق صاحب نے اس کو بڑی حد تک مکمل کیا ہے۔

"میسور میں اردو" پانچ ابواب پر مشتمل ہے جن کی صراحت حسب ذیل ہے۔ پہلے باب میں دولت خداداد (حیدر علی اور ٹیپو سلطان) کے ماقبل کا تذکرہ ہے اس میں دو کتابوں کا ذکر ہے۔ دوسرا باب حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے عہد سے متعلق ہے اس باب میں انیس شعراء اور نثاروں کا تذکرہ ہے اور نمونہ کلام دیا گیا ہے۔ تیسرا باب میسور کے موجودہ راج کے متعلق ہے۔ اس میں تیس شعراء اور نثرنگاروں کا تعارف کرایا گیا ہے۔ چوتھا باب عصر حاضر کے خواتین سے متعلق ہے اس میں پندرہ خواتین کا تعارف کرایا گیا ہے۔ جو اردو کی خدمت میں مشغول ہیں اسی باب میں ایسی انجمنوں کا تذکرہ بھی ہے۔ جو اردو کی خدمت انجام دیتی ہیں پانچوں باب اخبارات اور رسائل سے متعلق ہے اس میں قدیم اور جدید (۳۷) اخبارات اور رسائل کا نام گنایا گیا ہے۔

مؤلف صاحب نے یہ کتاب اپنے میسور اور بنگلور کے سفر کے بعد لکھی ہے اور وہاں کے علم دوست اصحاب سے استفادہ بھی کیا ہے۔

اس کتاب سے واضح ہوتا ہے کہ میسور اور بنگلور نے اردو کی کس طرح خدمت انجام دی ہے۔ اور کس طرح اردو زبان ہندوستان کی عالمگیر زبان ہونے کا دعویٰ کرسکتی ہے۔

چونکہ عبدالخالق صاحب کی طالب علمی کی کوشش ہے اس لئے اس میں بہت کچھ اضافے کی گنجائش ہے توقع ہے کہ خود آگے چل کر مؤلف صاحب اس کو مفصل طور پر مرتب کر دیں گے۔ بہرحال ہم اب بھی یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے قابل قدر ہے۔ ص

جامعاتی معلومات

مندرجہ ذیل معلومات اور اطلاعیں ہر جامعہ کی تازہ رپورٹ سے ماخوذ ہیں۔ ہندوستان کی اکثر جامعات نے براہ کرم یہ انتظام کیا ہے کہ ان کی رپورٹ اور دوسری رویدادیں وغیرہ بالالتزام مجلہ کو ارسال ہوا کریں۔

کلکتہ کی جامعہ سے حال میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے والوں میں عطاء الحکیم صاحب ام اے بھی ہیں۔ ان کے مقالہ کا موضوع "اہل عرب اور ریاضیات" تھا۔

ٹراونکور کی جامعہ کے تحت جن موضوعات پر جامعہ کے مختلف شعبوں میں تحقیقاتی کام ہو رہا ہے ان کے منجملہ چند حسب ذیل ہیں۔

(۱) نمک بنانے کے تجربے نیز ساتھ ہی اس امر کی تحقیق کہ نمک کے حصول کے بعد جو قلمزا مائع حاصل ہوتا ہے اس سے چپسیم، پوٹاسم کے نمک، میگنیشیم کلورائڈ، برومین وغیرہ تیار کئے جائیں۔ (۲) احتراقی تیل اور دوسرے ذیلی روغنیات تیار کرنا۔ (۳) مونازائیٹ سے میسوتھوریم اور تھوریم کے مرکبات کا حصول (۴) ناریل کے خول سے چارکول کی تیاری۔ (۵) لیمن گراس آئیل اور وغیرہ کے سلسلہ میں تحقیق (۶) دیسی ادویہ پر کیمیائی اصولوں کو منطبق کرنا۔ (۷) کتابوں پر کیڑوں کے حملہ کا سدباب۔ (۸) سمندری گھاس سے ائیوڈین کی تیاری۔ (۹) دھان اور سنے شکر پر تجربے۔ (۱۰) پانی کے نلوں میں پیدا ہونے والی خرابیوں کا انسداد۔ (۱۱) مختلف اضلاع کی مٹی کا تجزیہ تاکہ جو ضروری اجزا کم مقدار میں پائے جائیں ان کے مضر اثرات کا سدباب۔ (۱۲) ٹراونکور میں پیدا ہونے والے چاول کی مختلف انواع کی غذائی اہمیت کی تحقیق (۱۳) ٹراونکور کی زمینوں میں حل پذیر کھاد کے

انجذاب کے متعلق ابتدائی تحقیقات۔ (۱۴) ناریل کے پتوں میں پیدا شدہ کیڑوں کا انسداد۔ (۱۵) الائچی پر تحقیقات۔ (۱۶) چاول کو خراب کرنے والے کیڑوں پر تحقیقات۔ (۱۷) ٹائیفائڈ کے ٹیکے [illegible] (۱۸) مانع ہیضہ ٹیکہ۔ (۱۹) غذائیت پر تحقیق۔ (۲۰) چوہوں کے پسوؤں کا معائنہ۔ (۲۱) جراثیم سے ٹائیفائڈ کے جرثوموں کو الگ کرنے پر جراثیم کا مضر اثر۔ (۲۲) رسوبی تعاملات میں ملکاؤ کا اثر۔ (۲۳) [illegible] کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا اور اس کا ذخیرہ کرنا۔ (۲۴) شارک مچھلی کا تیل۔

ڈھاکہ کی جامعہ کے اہتمام سے بنگال کی ایک مفصل تاریخ تین جلدوں میں زیر طباعت ہے۔

اناملی کی جامعہ ٹامل زبان میں مختلف فنون کی کتابیں شائع کر رہی ہے چنانچہ ۱۹۴۲ء میں طبیعیات جلد دوم، کیمیا جلد دوم، اور حاشیات شائع ہوئیں۔ اس جامعہ نے ارادہ کیا ہے کہ ٹامل گیتوں کا [illegible] جلدوں میں شائع کرے۔ چنانچہ پہلی چار جلدیں زیر طبع ہیں۔ یہ جامعہ اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالوں کی طباعت کا بھی [illegible] ہے۔ تنجاور کے ناٹکوں پر ایک کتاب شائع ہوئی ہے اور ٹرچی کی تاریخ پر ایک کتاب زیر طبع ہے۔

کلکتہ کی جامعہ نے اپنے سائنس کالج کو ایک تحقیقاتی ادارہ کے طور پر مزید ترقی دینے کی تجاویز پیش کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی ہے۔

کلکتہ کی جامعہ کے زیر غور یہ امر ہے کہ جامعہ کے ساتھ فن تعمیر کی ایک درس گاہ قائم کی جائے۔

۱۹۴۱-۴۲ء کے دوران میں آگرہ کی جامعہ میں مندرجہ ذیل امور کا انتظام عمل میں آیا۔

۱۔ شعبہ طب کا قیام اور آگرہ کے میڈیکل کالج کا الحاق جامعہ سے۔ حکومت نے باوجود مالی مشکلات کے عمارت اور ساز و سامان کے لئے بڑی اعانت کی۔ جامعہ کے زیر اہتمام ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کا پہلا امتحان [illegible]

۴۔ ٹریننگ کالج کا بمقام اجمیر افتتاح ہوا اور اس کا الحاق جامعہ سے عمل میں آیا۔ راجپوتانہ سنٹرل اور گوالیار کے بورڈ آف ہائی اسکول اینڈ انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن کی جانب سے یہ کالج کھولا گیا ہے۔ اور جنگ کی مشکلات کے باوجود بورڈ نے بڑی کشادہ دلی سے اس کالج کے انتظامات میں رقم صرف کی۔ جامعہ نے اپنے ہاں بی، ٹی ڈگری کا انتظام منظور کیا

ڈھاکہ کی جامعہ نے فن حرب کو بی، اے۔ بی، ایس، سی اور ڈ کے امتحانوں میں مضمون اختیاری کے طور پر جاری کیا۔ الہ آباد کی جامعہ میں بھی فن حرب کی تعلیم کا انتظام ہے چنانچہ ۵ طلبہ اس فن کی تحصیل میں مصروف ہیں۔

بنارس ہندو یونیورسٹی میں سنسکرت کالج کی عمارت کا سنگ بنیاد سر ایس رادھا کرشنن وائس چانسلر نے رکھا۔ اس عمارت کی تعمیر کے لئے سیٹھ بی، ڈی برلا نے ایک لاکھ روپیہ کا عطیہ دیا۔ برلا خاندان کے افراد نے اس جامعہ کو اس کے قیام سے اب تک دس لاکھ روپیہ کا عطیہ دیا ہے۔

اناملی کی جامعہ نے حسب ذیل عطیات حاصل کئے۔

۱۔ مہاراجہ ٹراونکور۔ ایک لاکھ روپے۔ مہاراجہ کو کانوکیشن ایڈریس پڑھنے کے لئے مدعو کیا گیا تھا۔
۲۔ کاسی مٹ کے سوامی ۱۲۔ ہزار روپیہ۔ بعض سالانہ انعامات کے لئے۔ ۳۔ حکومت مدراس سے اس کی سالانہ امداد ایک لاکھ نو ہزار روپیہ ہیں۔ مزید ۱۲۔ ہزار روپیہ سالانہ کا اضافہ تاکہ وائس چانسلر کی تنخواہ میں اضافہ کیا جائے۔ ۴۔ راجہ اناملی ۹ ہزار روپیہ۔ مہاراجہ ٹراونکور کی آمد کی خوشی میں۔

آنریبل مسٹر ونسنٹ ماسی (کناڈا) نے ہندوستان سے اپنی ہمدردی کے اظہار میں سالانہ ۲ ہزار ڈالر کا ایک وظیفہ ایک ایسے ہندوستانی طالب علم کے لئے مقرر کیا جو ٹورونٹو کی جامعہ میں مابعد طیلسانی تعلیم حاصل کرے۔

الہ آباد کی جامعہ میں طلباء کی تعداد ۲۳-۱۹۲۲ء میں صرف ۲۴۰ تھی۔ اس کے بعد ہر سال اضافہ ہوتا گیا

تاآنکہ ۴۲-۱۹۴۱ء میں طلبہ کی تعداد ۲۸۴۱ ہوگئی۔ خواتین کی تعداد ۱۴۸ تھی۔ تحقیقاتی کام کرنے والے طلبہ کی تعداد ۶۴ تھی۔ ۶ طلبہ نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

بمبئی کی جامعہ سے ملحقہ کلیات میں طلبہ کی تعداد مارچ ۱۹۴۲ء کے اختتام پر ۲۴۸۱۴ تھی۔ ۱۹۳۷ء میں طلبہ کی تعداد ۱۵ ہزار ۵ سو ۷۵ تھی۔ گویا اس پانچ سال کے دوران میں ۹۲۳۹ طلبہ کا اضافہ ہوا۔

آگرہ کی جامعہ سے ملحقہ کلیات میں ستمبر ۱۹۴۱ء کو ۵۱۱۴ طالب علم زیر تعلیم تھے۔

۴۲-۱۹۴۱ء میں ڈھاکہ کی جامعہ میں طلبہ کی تعداد ۱۴۰۸ تھی۔ انامَلائی کی جامعہ میں ۴۳-۱۹۴۲ء میں ۵۲۴ طلبہ کا داخلہ عمل میں آیا۔ زیر تعلیم طلبہ کی تعداد ۱۰۰۴ تھی۔ ٹراونکور کی جامعہ میں طلبہ کی تعداد ۴۱-۱۹۴۰ء میں ۳۶۱۱ تھی۔ اس سے پہلے یہ تعداد ۳۴۰۱ تھی۔

بمبئی کی جامعہ کے امتحانات بابتہ ۴۲-۱۹۴۱ء میں طلبہ کی کل تعداد ۴۰ ہزار ۳ سو ۶۰ تھی۔ مقابلہ کے ذریعہ جو امتحانات لئے جاتے ہیں ان کے طلبہ کی تعداد اس کے علاوہ ۹ تھی۔ میٹرک کے امتحان میں ۹۵۷۵ طلبہ شریک ہوئے اور ۱۵ ہزار ۳ سو ۳۱۔ امیدوار یا فی صدی ۶۰.۹ ... ۵۲۴۶ امیدوار کامیاب ہوئے۔ انٹرمیڈیٹ (فنون) کے امتحان میں ۹۱۴۱ طلبہ شریک ہوئے جن میں سے ۴۸۱۳ یا فی صدی ۵۲.۶۰ طلبہ کامیاب ہوئے۔ انٹرمیڈیٹ (سائنس) کے امتحان میں ۳۵۲۶ طلبہ شریک ہوئے اور ۱۷۹۷ یا فی صدی ۵۰.۹۶ طلبہ کامیاب ہوئے۔ بی۔ اے میں ۲۱۰۲ طلبہ شریک امتحان ہوئے۔ ان میں سے ۱۰۹۸ یا فی صدی ۵۲.۲۴ طلبہ کامیاب ہوئے۔ بی۔ ایس۔ سی کے امتحان میں ۷۵۸ طلبہ شریک اور ۳۴۲ یا فی صدی ۴۵.۱۴ کامیاب ہوئے۔ ایم۔ اے میں ۳۰۶ طلبہ شریک اور ۲۱۰ کامیاب۔ ایم۔ ایس۔ سی بذریعہ مقالہ میں ۳۸ طلبہ شریک اور ۳۷ کامیاب ہوئے۔ ایم۔ ایس۔ سی بذریعہ پرچہ جات میں ۱۸ طالب علم شریک ہوئے۔ ۱۵ کامیاب ہوئے۔

ڈی۔ایس سی کے امتحان میں ایک طالب علم شریک اور کامیاب ہوا۔ پی۔ایچ۔ڈی کے امتحان میں ۴۳ طالب علم شریک اور ۳۳ کامیاب ہوئے۔ ال۔ال۔بی۔ ابتدائی میں ۱۹۸ شریک اور ۷۸۲ کامیاب ہوئے (فی صدی ۸۶٫۳۸) ال۔ال۔بی۔ آخری میں ۳۵۴ شریک اور ۲۰۶ کامیاب ہوئے۔ (فی صدی ۵۸٫۲)۔ ال۔ال۔ایم میں ۱۱ شریک اور ۶ کامیاب ہوئے۔

سنہ ۴۲-۱۹۴۱ء میں آگرہ کی جامعہ کے امتحانات میں مجموعی طور سے ۷۸۰۴ طلبہ شریک ہوئے۔ امتحانات کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

امتحان	شریک	کامیاب	فی صد
بی۔اے	۱۲۱۱	۷۵۵	۶۳٫۳
ایم۔اے ابتدائی	۲۵۰	۲۰۷	۸۲٫۸۰
ایم۔اے آخری	۱۸۹	۱۱۵	۶۱٫۸۲
بی۔ایس سی	۲۹۳	۱۹۳	۶۵٫۸
ایم۔ایس سی ابتدائی	۵۳	۴۴	۸۳٫۰۱
ایم۔ایس سی آخری	۳۷	۳۶	۹۷٫۲۹
ال۔ال۔بی۔ ابتدائی	۴۷۱	۲۴۹	۵۶٫۴
ال۔ال۔بی۔ آخری	۳۶۲	۲۷۴	۷۵٫۶

ڈھاکہ کی جامعہ کے نتائج بابتہ سنہ ۴۲-۱۹۴۱ء کی صراحت حسب ذیل ہے۔

ایم۔اے پہلا حصہ	۷۴٫۲	ایم۔ایس سی پہلا حصہ	۶۶٫۲
ایم۔اے دوسرا حصہ الف	۸۴٫۷	ایم۔اے دوسرا حصہ ب	صد فی صد
ایم۔ایس سی دوسرا حصہ	۹۱٫۵	بی۔ایس سی زراعت	۸۶٫۴

بی، اے آنرز آخری	۶۶٫۶۷	بی، اے	۴۹٫۴
بی، ایس، سی آنرز آخری	۶۰٫۰	بی، ایس سی۔	۸۴ فی صد
بی، ال، ابتدائی	۷۰ فی صد	بی، ال آخری	صد فی صد

ٹراونکور کی جامعہ کے امتحانات بابتہ مارچ سنہ ۱۹۳۴ء میں کلیات جامعہ سے جو طلبہ شریک ہوئے ان کے نتائج کا حال حسب ذیل ہے۔

امتحان	شریک	کامیاب	فی صد
انٹرمیڈیٹ	۲۸۸	۱۴۳	۴۹٫۶۵
بی، اے	۵۸	۲۵	۵۰
بی، ایس، سی	۱۳۳	۷۰	۵۲٫۶۳
بی، ایس، سی آنرز	۸	۸	۱۰۰
بی، اے آنرز	۱۵	۱۵	۱۰۰
ام، اے	۲	۲	۱۰۰
ال، ال، بی	۸۰	۶۵	۸۱٫۲۵
بی، ال	۴۶	۳۵	۷۶٫۰۸

انا ملی کی جامعہ کے جو امتحانات مارچ سنہ ۱۹۲۸ء میں ہوئے تھے۔ اس کے نتائج سے [illegible] کا نتیجہ ۶۲٫۳۵ تھا۔ بی، اے اور بی، ایس، سی کے امتحان کے کسی مضمون میں نتیجہ ۶۵ فی صد سے کم نہیں ہے۔ بی، اے آنرز کے ہر مضمون میں نتیجہ صد فی صد رہا۔

الہ آباد کی جامعہ کے کتب خانہ میں ایک لاکھ ۲ ہزار ایک سو ۵۹ کتابیں مخزون ہیں۔ ٹراونکور کی جامعہ

ملحقہ کتب خانوں میں کتابوں کی تعداد ۲۰۹ ہزار ایک سو ۲۵ ہے۔ اور انامَلی کی جامعہ کے کتب خانہ میں ۶۲ ہزار ۷ سو ۲۱۔

بمبئی کی جامعہ کے دارالمطالعہ میں ۳۰۲ مجلّے اور رسالے آتے ہیں۔ الہ آباد کی جامعہ میں ۲۷۷۔ انامَلی کی جامعہ ۲۲۵ مجلّے اور رسالے خریدتی ہے۔ اس کے مجلے کے تبادلہ میں اور عطیہ کے طور پر مزید ۸۳ مجلّے وصول ہوتے ہیں۔

الہ آباد کی جامعہ کا متوازی خرچ سنہ ۱۹۴۱-۴۲ء میں ۱۱ لاکھ ۵۸ ہزار روپے تھا۔ بمبئی کی جامعہ کے اخراجات ۱۵ لاکھ ۳۶ ہزار ۹ سو ۵۵ روپے۔ انامَلی کی جامعہ پر سنہ ۱۹۴۲ء میں ۵ لاکھ ۷۰ ہزار ۴ سو روپے خرچ ہوئے۔

آگرہ کی جامعہ نے اپنے ہاں امتحان کے پرچوں کے تبصرہ کے طریقہ کو منسوخ کر دیا ہے۔

ٹراونکور کی جامعہ میں دیسی ورزش کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔

ڈھاکہ کی جامعہ میں صدر و میر شعبہ قانون کی جگہ خالی ہونے پر ہنگامی طور پر ایک بڑے عرصہ کے لئے مسٹر پی سی گھوش (وکیل سرکار) کو اس خدمت پر مامور کیا۔ موصوف نے ان خدمات کا کوئی معاوضہ حاصل نہیں کیا۔

انجمن طیلسانین عثمانیہ اور اسکی ملحقہ جماعتوں کی اطلاعات

اطلاعات انجمن

اس دوران میں انجمن نے عام سرکاری تعطیلات پر غور کیا۔ اس خصوص میں کابینہ کے پیش نظر جو یادداشت تھی وہ حسب ہدایت کابینہ مجلہ میں شائع کی جاتی ہے جو حسب ذیل ہے۔

مملکت آصفیہ اور عام تعطیلات

سنہ ۱۲۸۲ھ (۱۲۷۴ ف) سے پہلے جمعہ کے دن کے علاوہ ۱۲ یوم کی تعطیل کا حکم تھا۔ ان ۱۲ یوم کی تعطیلات کے منجملہ صرف محرم میں تین روز ۵، ۹ اور ۱۰ تاریخ کو اور ۱۷ رجب کو بلالحاظ قوم و مذہب عام تعطیل ہوا کرتی تھی گویا جمعہ کے علاوہ صرف ۴ یوم کی تعطیل سال بھر میں ہوا کرتی تھی۔ باقی تعطیلات یا تو مسلمانوں سے مختص تھے یا ہندوؤں سے مسلمانوں کے لئے تعطیل کے دن حسب ذیل تھے۔

۱۴ شعبان، ایک یوم اور ۱، ۲ و ۳ شوال تین یوم، ۱۲ ربیع الاول، ایک یوم، ۱۰ و ۱۱ و ۱۲ ذیحجہ تین یوم

ہندوں کے لئے تعطیل کے دن یہ تھے۔

شیوراتری ایک یوم، ہولی۔ دو یوم، اوگادی، ایک یوم۔ راکھی پونم۔ ایک یوم جنم اشٹمی ایک یوم۔ دسہرہ، ۲ یوم۔ دیوالی، ایک یوم۔

بعدازاں آہستہ آہستہ تعطیلات میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان کی تفصیلات طویل ہیں۔ البتہ جمعہ کا معاوضہ ملنے کا جو طریقہ جاری ہوا اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ رجب سنہ ۱۲۸۸ھ (۱۲۸۰ ف) میں لد ہ مولی کا عرس جمعہ کے دن واقع ہو گیا اس کا معاوضہ دوسرے دن دیا گیا۔ بعدازاں خاص خاص تعطیلات میں مدارالمہام کے حکم سے معاوضہ ملتا تھا مقامی تعطیلات میں پہلی تعطیل عرس گلبرگہ کی ملنے لگی اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ سنہ ۱۲۹۱ھ (۱۲۹۴ ف) میں ریلیے سے جاری ہوئی۔ نواب مکرم الدولہ صدرالمہام مالگزاری کی تحریک سے ۵ یوم کی تعطیل اضلاع صوبہ گلبرگہ، میدک، بیدر و عثمان آباد کو دی گئی۔

تعطیلات کا یہی نظام جاری رہا۔ یعنے چند عام تعطیلات۔ چند تعطیلات مخصوص بہ اہل اسلام اور چند تعطیلات مخصوص بہ ہنود۔ ایک مقامی تعطیل۔

۱۲۹۸ھ میں مولوی مشتاق حسین وقارالملک نے نواب سرآسمانجاہ صدرالمہام عدالت کی صوابدید سے صدرالمہام کی خدمت میں یہ عرض کیا کہ

محکمہ عدالت کی تعطیلات کا جو طریقہ اس وقت جاری ہے۔ وہ اصلاح طلب ہے۔ کیونکہ اس کی تعیین نا مکمل ہے قریب قریب ہے اس وجہ سے اکثر مواقع پر اس کی تعمیل نہیں ہوتی اور بعض خاص مواقع پر دقتیں پیش آتی ہیں۔ اس لئے اصلاحات ذیل ضروری ہیں۔

۱۔ تعطیلات کے ساتھ قید اہل اسلام اور ہنود جو لگی ہوئی ہے اوٹھ جانی چاہیئے اور عام تعطیلات سب فرقوں کے لئے عام کر دی جائیں کیونکہ اکثر ایسا ہوا کرتا ہے کہ ناظم مسلمان ہے تو بعض عملہ ہنود ہے۔ اگر مدعی ہنود سے ہے تو مدعا علیہ مسلمان ہے بعض وکلا اگر مسلمان ہیں تو بعض ہنود بھی ہیں۔ گواہوں کی تعداد ہر فرقہ سے ہوا کرتی ہے۔

نواب وقارالملک مرحوم نے اپنی یادداشت کے ذریعہ بعض تعطیلات کے اضافہ کی تحریک کی مسلمانوں کی بھی اور ہندوؤں کی بھی۔

مسلمانوں کے حسب ذیل تعطیلات کی سفارش کی۔

تعطیلات عیدالفطر تین یوم کے بجائے پانچ یوم۔ شب برات دو یوم کے بجائے تین یوم شب قدر کیلئے ایک یوم

ہندوؤں کے حسب ذیل تعطیلات کی سفارش کی۔

گنیش چوتھ ایک یوم۔ انت چتور دشی ایک یوم۔ بسنت ایک یوم۔

نیز یہ تحریک بھی کی کہ تعطیل عیدین کے درمیان جمعہ واقع ہو جائے تو اس کا معاوضہ ملنا چاہیئے۔ نیز یہ بھی کہ سورج گہن اور چاند گہن کی تعطیل بھی ہونی چاہیئے۔

دوسرے صدرالمہاموں کی رائے لے کر نواب مختارالملک نے جمعہ کے معاوضہ کے سوا مولوی مشتاق حسین کی سب تجویزیں منظور کریں۔

معلوم ہوتا ہے کہ اسی وقت تعطیلات کی کثرت کا احساس ہوا۔ چنانچہ ۱۳۰۲ھ میں نواب عماد السلطنت

مدارالمہام کے حکم سے شب برات عید الفطر اور عید الضحیٰ سے ایک ایک روز گھٹا دیا گیا لیکن مزید تعطیلات کا سلسلہ کچھ نہ کچھ جاری رہا تعطیلات مختص بہ مقام میں اورنگ آباد کے صوبہ کے لئے حضرت زرزری بخش کے عرس کیلئے تین روز کی تعطیل منظور ہوئی۔ سالگرہ قیصر ہند کی تعطیل بھی مقرر ہوئی اور تعطیلات مختص بہ عیسائیاں کا قاعدہ بھی جاری ہوا۔

بہرحال سنہ ۱۳۰۷ھ مطابق ۱۲۹۹ف میں جو تعطیلات جاری تھے وہ حسب ذیل ہیں۔

عشرہ محرم - ۸ یوم - ۵ - سے ۱۲ تک - آخری چہار شنبہ ۱ یوم - روز ولادت پیغمبر اسلام - ۱ یوم ۱۲ ربیع الاول سالگرہ اعلیٰحضرت ۱ یوم - ۶ ربیع الثانی - روز وفات شیخ عبدالقادرؒ - ۱ یوم ۱۱ ربیع الثانی - شب برات ۲ یوم ۱۳ و ۱۴ شعبان - لیلۃ القدر - ۱ یوم - ۲۷ رمضان - عید الفطر - ۴ یوم یکم تا ۴ شوال - عید الضحیٰ ۴ یوم ۹ ذی الحجہ سے ۱۲ تک - اوگادی ۱ یوم - راکھی پونم - ۱ یوم - جنم اشٹمی ۱ یوم - گنیش چوتھ ۱ یوم - اننت چتردشی ۱ یوم - دسہرہ - ۲ یوم - دیوالی - ۱ یوم - بسنت ۱ یوم - شیوراتری - ۱ یوم - ہولی - ۲ یوم - سالگرہ قیصرہ ہند - ۱ یوم

میزان (۳۹ یوم)

اس زمانہ میں یہ قاعدہ قائم ہوگیا کہ جو کسی عام تعطیل کے درمیان واقع ہوجائے تو اس کا معاوضہ ختم تعطیل کے دوسرے روز ملیگا۔ ان کے علاوہ سورج گہن اور چاند گرہن کی تعطیل بھی مقرر تھی۔

اعراس کے لئے تعطیلات مختص بہ مقام صرف حسب ذیل مقرر تھے۔

عرس حضرت زرزری بخش　۳ یوم - صوبہ غربی۔

" " جمال بہار　۲ یوم بلدہ و بھونگیر

" " خواجہ معین الدینؒ　۱ یوم بلدہ

" کوہ مولیٰ　۲ یوم بلدہ بھونگیر وغیرہ

" " خواجہ بندہ نوازؒ　" ۴ یوم گلبرگہ وغیرہ

تعطیلات مختص بہ اقوام کی تفصیل حسب ذیل تھی

عیسائیوں کے لئے

کرسمس ۸ یوم - ایش وڈنس ڈے ایک یوم - گڈ فرائی ڈے ایک یوم۔

پارسیوں کے لئے - عید نوروز - ایک یوم

مولوی صفی الدین نے اپنی تالیف "پنجاہ سالہ جنتری" میں (جس سے یہ مواد ماخوذ ہے) لکھا ہے کہ "وہ اس وقت دفتر پولیٹکل میں تقلیل تعطیلات کا مسئلہ زیر غور ہے۔ بعض عہدہ دار اس سے موافق ہیں اور بعض مخالف۔"

معلوم ہوتا ہے کہ اس غور و خوض کا کچھ مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ کیونکہ بیس، اکیس برس کے بعد سنہ ۱۳۲۰ف میں جو تعطیلات مقرر تھے ان میں اور سنہ ۱۲۹۹ف کی تعطیلات میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ اضافہ ہی ہوا ہے کمی بہت کم۔ جو فرق ہے وہ یہ ہے۔

آخری چہارشنبہ کی تعطیل حذف ہوگئی۔ دیوالی میں ایک یوم کا اضافہ ہوا۔ عید الضحیٰ میں ایک یوم کا اضافہ ہوا۔ شب قدر میں تین دن کا اضافہ ہوا۔

اس طرح سابقہ تعطیلات میں ایک دن کم کرکے ۵ یوم کا اضافہ ہوا اس طرح سنہ ۱۳۲۰ف میں جمعہ کے علاوہ تعطیلات کی تعداد ۳۴ یوم قرار پائی۔ تعطیلات مختص بہ مقام میں بھی اضافہ ہوا۔ البتہ تعطیلات مختص بہ اقوام میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔

سنہ ۱۳۲۰ف سے تعطیلات میں مسلسل اضافہ ہوتا گیا چنانچہ اس وقت جمعہ کے علاوہ جو عام تعطیلات سنہ ۱۳۵۲ف کے لئے مقرر ہیں ان کی تعداد ۵۰ یوم ہے ان میں ۱۲ یوم جمعہ کے دن واقع ہوئے ہیں۔ اس دوران میں تعطیلات مقامی میں بھی بکثرت اضافہ عمل میں آیا ہے۔ سنہ ۱۳۲۰ف میں صرف ۵ مقامات پر تعطیل مختص بہ مقام ہوتی تھی تو اب (۲۱) مقامات پر تعطیل ہوتی ہے۔ یہ تعطیل آدھے دن سے لے کر تین دن تک ہوتی ہے۔

تعطیلات مختص بہ اقوام میں بھی اضافہ ہوا ہے پہلے یہ تعطیلات صرف عیسائیوں اور پارسیوں کی حد تک ہوا کرتے تھے۔ اب دوسروں کے لئے بھی ایک ایک دو دو یوم کی تعطیل مقرر ہوگئی ہے۔

فی الوقت سال بھر میں آٹھ دن ایسے ہیں کہ دفتر صدر محاسبی صبح کا ہوتا ہے۔ دوسرے دفاتر اپنے معمولی وقت پر کھلتے اور بند ہوتے ہیں۔ اس عمل درآمد سے مشکلات پیدا ہوا کرتے ہیں۔

بہرحال ملازم سرکار کے لئے ۸۰ دن عام تعطیل کے مقرر ہیں اسکے علاوہ۔

۵۲ دن سال بھر کے یوم جمعہ کے ہیں۔

۱۵۔ دن رخصت اتفاقی کے۔

۳۰۔ دن رخصت خاص کے۔

اس طرح ایک ملازم سرکاری ۱۷۷ یا دوسرے الفاظ میں ۵ ماہ ۲۷ یوم چھٹی منایا کرتا ہے۔ اگر ان ۱۷۷ دن میں سے ۲۲ ایام وہ نکال دیئے جائیں جو دوسری تعطیلوں میں ضم ہوگئے ہیں تو جب بھی (۱۵۵) دن یا ۵ ماہ ۵ ایوم تعطیل کے ہیں۔

سال گزشتہ کے جلسہ تقسیم انعامات میں عثمانیہ ٹریننگ کالج کے صدر نے اپنی رپورٹ میں یہ بھی کہا کہ "ہماری بے موقع تعلیم کش تعطیلات کے درحقیقت یہ معنی ہیں کہ کم و بیش ۱۵۰ ایام کار میں سے کچھ کرنا پڑتا ہے۔ زمانہ کے حالات اس تیزی سے کروٹ بدل رہے ہیں کہ ہمارے ہاں کی تعطیلات کا مسئلہ دن بدن اہم ہوتا جاتا ہے۔"

اس کے جواب میں صدر اعظم بہادر نے ارشاد فرمایا کہ

"میں خود اسے محسوس کر رہا ہوں کہ ہمارے ہاں تعطیلات سب جگہ سے زیادہ ہوتی ہیں۔ یہ مسئلہ نہ صرف حکومت سرکار عالی کے زیر غور ہے بلکہ یہاں کی پبلک کی بھی توجہ کا محتاج ہے کہ وہ اس اقتصادی تقابل کے زمانہ میں اپنے ملک کے سال میں کتنے روز کام کرنے کے لئے رکھنا چاہتے ہیں۔"

اطلاعات مجلس نمائش

(۱) نمائش مصنوعات مملکت آصفیہ کی تنظیم میں مزید خوش اسلوبی پیدا کرنے کی غرض سے اس کے شرائط شرکت میں چند ترمیمات جلسہ عام نے منظور کئے تھے۔ اب دفتر رجسٹرار کمپنی ہائے سرمایہ مشترکہ سے ان کی توثیق ہوچکی ہے۔ آیندہ سے مجلس نمائش کا جملہ کاروبار یکم شہریور سے شروع ہوگا۔ اور آخر امرداد پر ختم ہوگا۔ اس سے قبل یکم آذر سے سال کا آغاز ہوتا تھا اور یکم ذی الحجہ تک نمائش کے انتظامات کے لئے بہت ہی کم وقت ملتا تھا مجلس نمائش کا موازنہ چار پانچ ہزار سے تجاوز کر کے اب چالیس پچاس ہزار روپے تک پہونچ گیا ہے اس لئے

آیندہ سے موازنہ کی منظوری جلسہ عام سے ہوا کرے گی نمائش کا طریقہ کار اور مبشن نامہ بھی جلسہ عام منظور کرے گا۔

اس کے علاوہ مجلس عاملہ کے ارکان کی تعداد میں پندرہ کی حد تک اضافہ کر دیا گیا ہے جس میں سے ایک رکن ایسا ہوگا جو صنعتی یا تجارتی مفادات کا نمایندہ ہو۔ ایک رکن محکمہ صنعت و حرفت سرکار عالی نامزد کرے گا تین ارکان کو مجلس عاملہ معاشی کمیٹی نامزد کرے گی۔ اس سے قبل مجلس نمائش کے ارکان کی تعداد ایک تھی جو مکمل ہو چکی تھی۔ مرحمہ دستور اشتراکیت کے لحاظ سے ارکان کی تعداد ایک سو پچاس قرار دی گئی ہے۔

(۲) مجلس نمائش کی مالیاتی کمیٹی کے تصفیہ کے بموجب روڈ ٹرانسپورٹ ڈپارٹمنٹ سرکار عالی کے مرکزی جنگی فنڈ میں ایک ہزار دو سو پینتالیس روپیہ بارہ آنہ ایک پائی کی امداد دی گئی۔ سال حال شعبہ تفریحات کا کام سال ہائے گذشتہ کے مقابلہ میں بہتر رہا۔ آمدنی بھی اس سال زیادہ ہوئی اور اس شعبہ کو خود مکتفی بنانے کی کوشش کی گئی۔ اس اصول کے پیش نظر تفریحات کمیٹی نے سررشتہ ریلوے سے اشتراک عمل کر کے معاہدہ کے ذریعہ تفریحات کے مختلف سامان فراہم کئے اور اپنی آمدنی کا حصہ رسدی جنگی فنڈ میں عطیہ دیا۔

(۳) نلگنڈہ کی نمائش مصنوعات میں مجلس نمائش کے توسط سے بلدہ حیدرآباد کے چند صناعوں نے حصہ لیا۔ خواجہ حمید احمد صاحب معتمد معاشی کمیٹی اور شرف الدین صاحب معتمد مجلس نمائش نے بھی نمائش میں شرکت کی جو انعامات کمیٹی کے ارکان مقرر کئے گئے تھے۔

(۴) مجلس نمائش کے سالانہ انتخابات کے نتائج حسب ذیل رہے۔

صدر:۔ احمد محی الدین صاحب بی، اے (کنٹب)، ناظم سررشتہ تجارت و حرفت

نائب صدر:۔ رائے گردھر داس صاحب بی، اے، ال ال، بی، (عثمانیہ) جاگیردار

معتمد:۔ شرف الدین صاحب بی، اے (عثمانیہ)، مدرگار کیمیسٹ نیم اے، آر، پی

نائب معتمد:۔ محمد عبدالعلی صاحب۔ بی، ایس، سی، ال، ال، بی (عثمانیہ) وکیل ہائیکورٹ

خازن:۔ میر محمود علی صاحب ایم، اے (عثمانیہ) لکچرار جامعہ عثمانیہ

ارا کین:۔ (۱) میر اکبر علی خاں صاحب۔ بیرسٹر

(۲) خان صاحب عابد صاحب۔ کنسو مر انجینئر سررشتہ برقی

(۳) محمد غوث صاحب ام۔اے، ال ال بی (عثمانیہ)

(۴) رائے شنکرجی صاحب بی۔اے، ال ال بی (عثمانیہ) مددگار امیر محکمۂ بلدیہ

(۵) برہان الدین حسین صاحب بی۔اے، جی۔ مہتمم مزرعہ حمایت ساگر

نمایندگان معاشی کمیٹی

(۱) ظہیر الدین احمد صاحب ایم۔اے۔سی۔ایس شریک معتمد فینانس

(۲) ایل۔این گپتا صاحب ایم۔سی۔ایس۔ ملٹری اڈوائزر

(۳) خواجہ حمید احمد صاحب بی۔اے (عثمانیہ) مددگار ناظم اعداد و شمار

نمایندہ سر رشتہ تجارت و حرفت۔

بی۔کے بھگوان صاحب انڈسٹریل انجینئر سر رشتہ تجارت و حرفت

صدر سال ماسبق

ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی

عثمانیہ بلدی جماعت

اس دوران میں جماعت ہذا کے مجلس عاملہ کے تین جلسے منعقد ہوئے۔ جن میں بلدی امور کے متعلق غور و خوض کیا گیا اور حلقہ واری تنظیم کے متعلق عملی اقدام شروع کیا گیا ہے۔ مولوی غلام مصطفےٰ صاحب تنقداری پر اور مولوی حبیب اللہ صاحب فاروقی کا منصفی پر تبادلہ ہوا ونیز دو ایک ارکان کی عدم مصروفیت کی وجہ سے اختتام سال تک کے لئے حسب ذیل جدید اصحاب کا انتخاب کیا گیا۔

(۱) مولوی محمد غوث صاحب ایم۔اے۔ال ال۔بی (عثمانیہ) (۲) مولوی خواجہ حمید احمد صاحب بی۔اے (عثمانیہ)

(۳) مولوی شرف الدین صاحب بی۔اے (عثمانیہ) (۴) مولوی عبدالعلی صاحب بی۔ایس۔سی ال ال۔بی (عثمانیہ) معتمد

اب جبکہ نواب ڈاکٹر ناظر یار جنگ بہادر صدر جماعت اپنے طویل دورہ سے واپس آچکے ہیں۔ توقع ہے کہ جماعت بلدی امور میں شہریوں کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرے گی۔

چھٹی نمایش مصنوعات ممالک آصفیہ

بابتہ ۱۳۵۳ف

بمقام باغ عام بلدہ حیدرآباد

یکم ذیحجہ ۱۳۶۲ھ تا ۲۹ ذیحجہ ۱۳۶۲ھ

مطابق

۲۵ دے ۱۳۵۳ف تا ۲۴ بہمن ۱۳۵۳ف

مطابق

۳۰ نومبر ۱۹۴۳ء تا ۲۸ دسمبر ۱۹۴۳ء

زیر اہتمام

مجلس نمایش معاشی کمیٹی حیدرآباد (انجمن طیلسانین عثمانیہ)

تفصیلات اعزازی معتمد مجلس نمایش معظم بلڈنگ سے

حاصل کئے جاسکتے ہیں!

ٹیلیفون نمبر ۲۵۵۳

مجلّۂ طیلسانیین

حصّہ

معاشیات

دوسری جلد۔ امرداد ۱۳۵۲ف۔ جولائی ۱۹۴۲ء جمادی الثانی ۱۳۶۲ھ تیسرا شمارہ

مدیر مجلّۂ طیلسانیین: محمد غوث ایم اے۔ ال ال بی (عثمانیہ)

فہرست مضامین

حرفِ آغاز

مجلس نمائش نے اپنی رضاکارانہ جد و جہد سے ملک کے طول و عرض میں جو نام نیک حاصل کیا ہے وہ سب خدمت گزاروں کے لئے باعثِ ہمت ہے۔ کام کرنے اور آگے بڑھنے کے لئے جو میدان ہے اسکی وسعت کا کوئی اندازہ نہیں ہوسکتا۔ بہرحال کسی نہ کسی وقت کچھ نہ کچھ کام نیا ہو ہی جاتا ہے۔

مجلس نمائش کی سرپرستی میں چند سرگرم نوجوانوں کی جماعت نے امرداد ۱۳۵۲ف کے پہلے ہفتہ میں پہلی مرتبہ آموں کی نمائش کے انعقاد کا بیڑا اٹھایا۔ پہلی کوشش میں جو کامیابی حاصل ہوئی وہ مستحق مبارکباد ہے۔

آموں کی نمائش کیوں ہونی چاہیئے؟ اس کا جواب مولوی مسعود علی صاحب محوی کی اس تقریر سے مل جاتا ہے جو صاحب موصوف نے نشر گاہ حیدرآباد سے نشر فرمائی اور اخبار مملکت کی اشاعت مورخہ ۲۷ امرداد ۱۳۵۲ف میں شائع ہوئی۔

ہمارے ملک نے اپنی صنعت، اپنی تجارت اور اپنی زراعت کے قدیم شاندار کارنامے بھلا بیٹھے ہیں۔ فلاحت میں بھی ہمارا ملک ایک زمانہ میں ترقی یافتہ تھا۔ دولت آباد، اورنگ آباد اور بیدر اپنے میووں کیلئے بھی مشہور تھے۔ انگور، انجیر اور امرود مشہور تھے۔ مولوی بشیر الدین مرحوم نے لکھا ہے کہ اورنگ آباد میں جو انجیر ہوتا تھا اتنا بڑا اور شاداب انجیر شاید کہیں اور ہوتا ہو۔ لیکن اب حیدرآباد کے بازاروں میں باہر کا میوہ غالب ہے اور سالانہ پچاس لاکھ روپے کا میوہ باہر سے آتا ہے۔ خود آم جس کے لئے ہمارے ملک کی سرزمین اور آب و ہوا بالکل موافق ہے زیادہ تر باہر سے آرہا ہے۔ مندرجہ ذیل کیفیت سے جو نمائش میں پیش کی گئی تھی حقیقت حال روشن ہوگی۔

"مقطعہ کوٹیال تعلقہ سدی پیٹ بلدۂ حیدرآباد سے ۳۰ میل پر واقع ہے۔ اس مقطعہ کی امرائی تقریباً ایک صدی سے موجود ہے۔ یہاں پر ۲۰، ۲۵ اقسام کے قلمی درخت موجود ہیں۔ ان میں سے بعض درختوں کی عمر اس وقت ۸۰ سال سے بھی زاید ہے۔ چالیس سال قبل یہاں کی امرائی حیدرآباد کی مشہور امرائیوں میں شامل تھی۔ ملغوبہ آم ایک سیر سے زیادہ وزنی ہوتا تھا۔ دوسرے آموں کا بھی یہی حال تھا۔ اس وقت بھی بلدہ حیدرآباد و

اطراف بلدہ میں تجارتی نقطۂ نظر سے مقطعۂ کوٹیال کے مماثل گنتی کے چند ہی باغ ہیں جہاں فصل اچھی ہونے کی صورت میں ساٹھ ستر بنڈی آم ایک ہی باغ سے حاصل ہوتا ہو۔

اضلاع راج مندری اور بجواڑہ سے ریل اور موٹر لاریوں کے ذریعہ جب سے کہ یہاں آموں کی برآمد ہونے لگی ہے تجارتی نقطۂ نظر سے حیدرآباد کے شہری پیوندی آم کی قدر گھٹنے لگی۔ چنانچہ ۲۰ سال قبل مقطعۂ کوٹیال سے آئی ہوئی ایک بنڈی آم کی قیمت ما فی ۱۵ سے ۲۰ تک وصول ہوتی تھی لیکن اب اوسطاً فی ۵ سے زیادہ رقم وصول نہیں ہوتی۔ ملغوبہ آم فی روپیہ دو سیر کے نرخ سے فروخت ہوتا تھا لیکن بیرونی آم کی برآمد کی وجہ سے پیوندی آم اب تخمی آموں کی قیمت پر فروخت ہوتا ہے۔

پٹرول راشننگ اور واگنوں کی قلت کے باعث اس سال بیرونی آم کی برآمد دس فی صدی سے زاید نہیں ہوئی اس کے طفیل میں ملکی آم اچھی قیمت سے فروخت ہوا"

اس حالت کو جاری رہنے دیا جائے تو اس سے بہت نقصان ہوگا۔ اس کے سد باب کیلئے نمایش کے ذریعہ تشویق و ترغیب کا سامان مناسب و برمحل ثابت ہوا۔

مملکت آصفیہ میں جو صنعتی کارخانے اور دوسرے معاشی ادارے موجود ہیں ان کے حالات سے عام طور پر بہت کم لوگ واقف ہیں۔ ان کے حالات معلوم ہوں تو دوسروں کو ہمت اور ترغیب ہوگی۔ حیدرآباد میں بیٹھ کر اس عظیم الشان حرکت و برکت کا کوئی حقیقی اندازہ نہیں ہوسکتا جو سرپور کے کارخانۂ کاغذسازی، تانڈور کے کوئلہ کے معدن اور اعظم جاہی ملز وغیرہ میں نمایاں اور روشن ہے۔

مجلہ کی ادارت نے ارادہ کیا ہے کہ مملکت آصفیہ کے معاشی اداروں کے معائنہ کا انتظام کیا جائے اور ضروری حالات مجلہ کے صفحات پر پیش کئے جائیں۔ چنانچہ کچھ عرصہ قبل کارخانۂ کاغذسازی، کوئلہ کی معدن اور اعظم جاہی ملز، ادارۂ قالین بافی، اور ورنگل کے مصنوعات محبس کا معائنہ مجلہ کے کارکنوں اور معاشی کمیٹی کے دو ایک ارکان نے کیا۔

ان کارخانوں اور معدن کو دیکھنے سے ملک کے وسایل ثروت و دولت کا تھوڑا بہت حقیقی اندازہ ہوا۔ یہ بات ثابت ہوئی کہ کسی کام میں انسان کامیابی حاصل کرنے کا ارادہ کرلے تو پھر ہر مشکل

خود کامیابی کا پیش خیمہ ہو جاتی ہے۔ حیدرآباد کنسٹرکشن کمپنی نے حیدرآباد کی صنعتی دنیا میں جو انقلاب پیدا کر دیا ہے وہ ہر طرح خوش آئند اور ہمت افزا ہے۔ ہر محب وطن کی یہ دلی اور مخلصانہ خواہش ہے کہ اس کمپنی کے ذریعہ حیدرآباد میں اور ایسے بیسیوں کارخانے قایم ہوں اور ہر طرف جوش و سرگرمی کا ویسا ہی مظاہرہ ہو جس کا ایک سرور انگیز نمونہ کارخانۂ کاغذ سازی اور اسکی نو آبادی میں نظر افروز ہوتا ہے۔ مجلہ کی آیندہ اشاعت سے ان کارخانوں اور اداروں کے حالات کا سلسلہ شروع کیا جائیگا۔

"موضع دو پلّی کی معاشی تحقیق" کے موضوع پر محمد ناصر علی صاحب ام اے لکچرار جامعۂ عثمانیہ کا جو مقالہ ایک عرصہ سے قسط وار شائع ہو رہا تھا وہ اس اشاعت میں بہ تمام و کمال شائع کر دیا گیا ہے جو ناظرین اس کا مکمل متن حاصل کرنا چاہیں وہ رعایتی قیمت سے حاصل کر سکینگے۔

واضح ہو کہ اس مقالہ کے ساتھ بعض ضمیمے بھی شامل ہیں جن میں موضع کے مختلف افراد کے بیانات درج ہیں یا دوسری ایسی تفصیلات ہیں جو عام ناظرین کے لئے زیادہ دلچسپی کا باعث نہیں ہو سکتیں۔ کاغذ کی گرانی کے باعث یہ ضمیمے ترک کر دیے گئے ہیں جو اصحاب ان امور سے واقف ہونا چاہیں وہ اصل مقالہ سے جو انجمن کے کتب خانہ میں محفوظ کیا گیا ہے استفادہ کر سکتے ہیں۔

معاشی کتب خانہ

معاشی کمیٹی کی جانب سے ایک معاشی کتب خانہ قائم کیا گیا ہے۔ یہ کتب خانہ حیدرآباد میں اپنی نوعیت کا اکیلا ادارہ ہے۔ عامۃ الناس بھی اس کتب خانہ سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

ہمدرد اصحاب کتب خانہ میں اضافۂ کتب وغیرہ پر توجہ فرمائیں تو

باعث تشکر ہوگا

مسائل معاشیات حیدرآباد

از جناب مولوی حافظ محمد مظہر صاحب اعزازی معتمد حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس

(سلسلہ شمارہ ۱ جلد ۷)

ریلوے بورڈ

ریلوے سے متعلق امور میں ایک مسئلہ ریلوے بورڈ کا بھی ہے۔ اسکی تشکیل کے متعلق چند گزشتہ حقائق کا اظہار ضروری ہے۔ برطانوی ہند کی سرکاری ریلوے اور نیز دوسرے علاقوں کی ریلوے پر نگرانی رکھنے اور رہبری کرنے کی غرض سے حکومت ہند میں ریلوے کاروبار کا اصول یہ ہے کہ ویسرائے کی کونسل میں ایک رکن کو سررشتہ حمل ونقل کا قلمدان حاصل رہتا ہے۔ اسکے تحت ایک ریلوے بورڈ ہوتا ہے جسکے تین چار ارکان ہوتے ہیں۔ اس بورڈ کا ایک صدر ہوتا ہے۔ یہ ریلوے بورڈ گویا معتمدی اور صدر نظامت کے فرائض انجام دیتا ہے۔ رکن سررشتہ حمل ونقل اس بورڈ کی صدارت نہیں کرتا۔ وہ نہ دوسری ریلوے کمپنیوں میں آفیشل ڈائرکٹر کی حیثیت سے شریک ہوتا ہے۔ ریلوے بورڈ کا جو کچھ فیصلہ ہوتا ہے وہ رکن سررشتہ حمل ونقل کے پاس پیش ہوتا اور اسکے اختیاری امور اسکے حکم سے اور اسکے اختیارات سے متجاوز امور ویسرائے یا کونسل کے سامنے لائے جاتے ہیں۔ اہم تر امور خود وزیر ہند کے تصفیہ کے لئے پیش ہوتے ہیں۔ جس زمانہ میں انگلش کمپنیاں ہندوستان میں ریلوے کاروبار چلاتی تھیں اس وقت انگلستان میں ایک خاص عہدہ دار آفیشل ڈائرکٹر کے طور پر ان کمپنیوں میں کام کرنے کے لئے رہتا تھا اور وہ وقتاً فوقتاً وزیر ہند اور حکومت ہند سے احکام حاصل کرتا تھا۔

ہماری ریلوے کمپنی جب انگلستان میں قائم ہوئی تھی تو اولاً یہہ ہوا تھا کہ ایک انگریز سرکار عالی کے آفیشل ریلوے ڈائرکٹر کمپنی کے بورڈ کے لئے نامزد کئے گئے اولاً نواب فتح نواز جنگ مرحوم پھر

شمس العلما مولوی سید علی بلگرامی ...... ریلوے اور معدنیات کے سررشتوں کے بھی معتمد تھے اور ڈائرکٹر مالکیپنی بھی صاحب موصوف ملازمت سرکاری سے سبکدوش ہوئے تو سررشتہ ہائے ریلوے و معدنیات سرجارج کیسن واکر کے سپرد ہوئے، سرجارج اولاً معتمد فینانس تھے بعد میں معین المہام فینانس ہوئے بعد میں ....

سر اکبر حیدری کو سرجارج کی ماتحتی میں معتمد فینانس مقرر کیا گیا۔ لیکن ریلوے کا صیغہ ان سے متعلق نہیں کیا گیا۔ کاغذات بلاوساطت معتمد فینانس ایک یورشین مددگار کے ذریعہ راست سرجارج کے پاس پیش ہوتے رہے۔ بظاہر یہ خیال قایم ہوتا ہے کہ سرجارج واکر یہ نہیں چاہتے تھے کہ ریلوے کے متعلقہ مسائل سے کسی ویسی اعلی عہدہ دار کو سابقہ رہے سرجارج نے اپنی آفیشل ڈائرکٹری کی حیثیت بھی قائم رکھی مگر جب وظیفہ لیکر انگلستان چلے گئے تو سرڈیوڈ بار وظیفہ یاب رزیڈنٹ نے اس عہدہ کی خواہش کی مگر سرجارج واکر نے یہ عہدہ اپنے لئے حاصل کرلیا بعد اس کے بعد ....

سر رجنالڈ گلانسی معین المہام فینانس اور ریلوے ہوئے لیکن انہوں نے بھی نواب فخر یار جنگ بہادر وغیرہ معتمدین فینانس سے ریلوے کا کام نہیں لیا۔ وہ بھی بلاوساطت معتمد، ریلوے کا کام خود کرلیا کرتے تھے۔

سر اکبر حیدری صدرالمہام فینانس قرار پائے تو انھوں نے بھی نواب فخر یار جنگ بہادر کا تعلق عرصہ تک معتمدی ریلوے کے کام سے نہ رکھا۔ سرجارج واکر کا انتقال ہوگیا تو سر چارلس بیلی جو حیدرآباد کے رزیڈنٹ اور بہار کے لفٹننٹ گورنری سے سبکدوش ہوگئے تھے۔ سرکار عالی کے ریلوے آفیشل ڈائرکٹر کی خواہش کی۔ دوسروں نے بھی اسکی خواہش کی لیکن سر اکبر حیدری کے مصالح اس بات کے متقاضی تھے کہ یہ حیثیت وہ خود اپنے لئے حاصل کرلیں اور باوجود اس امر کے کہ ہندوستان میں رہکر ڈائرکٹری کا کام انگلستان میں کرنا دشوار سمجھا گیا۔ سر اکبر حیدری ریلوے آفیشل ڈائرکٹر بھی ہوگئے اس دوران میں ریلوے کا انفکاک ہوگیا اور اگر حکومت ہند کے طریقہ پر کام چلایا جاتا تو نہ کوئی اعتراض ہوسکتا تھا نہ کوئی دشواری عاید ہوتی۔ صدرالمہام ریلوے کو صدرالمہام ہی رہنا چاہیئے تھا۔ سیر لانڈ جونس کو

چند روز کے لئے ریلوے بورڈ کا صدر بنایا جاسکتا تھا۔ ارکان میں نواب فخر یار جنگ بہادر کو شامل کیا جاسکتا تھا۔ اور حکومت ہند کے سررشتۂ ریلوے کے کسی بڑے عہدہ دار کو چند سال کے لئے مستعار لیکر دوسرا رکن بنایا جاسکتا تھا۔ اُس زمانہ میں محمد عبدالعزیز صاحب زندہ تھے جو میسور ریلوے کے ایجنٹ تھے اور حکومت ہند کے سررشتہ ریلوے میں مستقل عہدہ کے حامل تھے۔ وہ لئے جاسکتے تھے۔ اس انتظام سے کام عمدگی سے چل سکتا تھا۔ انگلستان میں کسی ذمہ دار وظیفہ یاب سول سرونٹ کو خریدی سامان وغیرہ کے لئے ایجنٹ مقرر کیا جاسکتا تھا۔ اسکے بجائے سر اکبر حیدری نے حیدرآباد میں رہکر انگلستان میں کام کرنے والے ریلوے بورڈ کی صدارت بھی اپنے ذمہ بحیثیت صدرالمہام فینانس و ریلوے منظور کرالی اور یہ تصفیہ کرایا کہ سرکار عالی کے ریلوے بورڈ کے ارکان مقیم انگلستان ہر سال کچھ مدت کیلئے سرکاری صرفہ سے حیدرآباد آکر کام کریں۔ دراصل ریلوے بورڈ کے حقیقی کارفرما مسٹر لائڈ جونس ہی تھے نواب فخر یار جنگ بہادر کو اب بطور کسی عملہ کے ریلوے کی معتمدی بھی عطا کی گئی اور دوسو پچاس روپے الونس بقایا کے ساتھ دلایا گیا۔

رونڈٹیبل کانفرنس کے سلسلہ میں جب سر اکبر حیدری انگلستان گئے تو صدرالمہامی فینانس پر کسی کو منصرم نہ کرنے کی یہ توجیہ ہوئی تھی کہ سرکار عالی کے ریلوے بورڈ کے ضابطہ کی رو سے صدرالمہام فینانس ریلوے بورڈ کے صدر تھے اور انگلستان کے قیام کے زمانہ میں وہ ریلوے بورڈ کا کچھ کام کرینگے۔ سر اکبر حیدری صدر اعظم ہوئے تو ریلوے اور معدنیات کی صدرالمہامی کے فرائض اپنے ذمہ ہی رکھے۔ اور معتمد فینانس بلا واسطہ صدرالمہام فینانس ریلوے اور معدنیات کے کاغذات صدر اعظم کے ملاحظہ میں پیش کرتے رہے۔ سر اکبر حیدری نے بعض دوسرے سررشتے بھی براہ راست اپنی نگرانی میں ہی رکھے تاکہ حقیقی اقتدار ان کے ہاتھ میں ہی رہے۔ لیکن یہ زمانہ ان کے قویٰ کے انحطاط کا تھا اور اب یہ کوئی راز نہیں ہے کہ ریلوے کے سررشتہ میں سارے مالہٗ و ماعلیہ میں مسٹر لائڈ جونس اور دوسرے مقامی اعلیٰ عہدہ دار ہی حقیقی طور پر حاوی رہے۔ سر اکبر حیدری کا ذاتی اثر کبھی کبھی کسی تقرر وغیرہ کے سلسلہ میں ظاہر ہوا کرتا تھا۔

سر اکبر حیدری نے اپنی صدر المہامی فینانس و ریلوے کے زمانہ میں ریلوے جو رسد ملکش سرکار عالی کو حاصل ہیں، حدود سرکار عالی میں جی آئی پی ریلوے کی جو لائن ہے اسکی خریدی نیز سرکار عالی کے دیگر حقوق کے متعلق یادداشتیں مرتب کرائیں لیکن عملی کارروائی اور معاملات کو روبراہ کرنے کے بارے میں سست رفتار بن گئے۔

سر اکبر حیدری کے آخری زمانہ صدارت عظمیٰ میں حضرت بندگان عالی کی تدبیر صائب اور حکمت عملی کی بدولت ریلوے بورڈ کا مستقر حیدرآباد میں ہی قرار پانے کی نسبت تصفیہ ہوگیا اور اب جدید بورڈ تشکیل پا چکا ہے۔ اسکی تشکیل اور اختیارات میں حکومت برطانی ہند کے سررشتۂ ریلوے اور ریلوے بورڈ کی مماثلت پیش نظر رہتی تو نظم و نسق کا اعلیٰ معیار قائم ہو جاتا۔

ریلوے کی توسیع

ریلوے پر سرکاری ملکیت حاصل ہوجانے اور اپنا ریلوے بورڈ قائم ہو جانے کے بعد اہم مسئلہ ریلوے کی توسیع کا تھا۔ تجاویز تو بہت پیش ہوئے اور پیمایش بھی بہت سے راستوں کی ہوئی مگر گزشتہ ۱۱ سال میں جدید ریلوے لائن کی تعمیر صرف (۱۰۶) میل کی ہوئی۔ مدکھیڑ عادل آباد کی لائن پر کام ایسے وقت میں شروع ہوا کہ جنگ شروع ہوگئی اور کام ملتوی کر دیا گیا اور صرفہ بڑی حد تک ضائع ہوگیا۔

جس طرح فی الحال دنیا کو ہوائی جہاز سمندری جہازوں سے مستغنی نہیں کر سکتے ہیں۔ اسی طرح موٹر لاریاں ریل سے بے نیاز نہیں کر سکتے۔ ہمارے ملک کے ۸۳ ہزار مربع میل کے رقبہ میں صرف ۱۳۰۰ میل کی ریلوے کسی طرح کافی نہیں ہے۔ ہر ضلع ہر ڈویژن بلکہ ہر تحصیل کے مستقر اور ہر ۱۰ ہزار آبادی والے قصبہ کو ریل سے متمتع کرنا حکومت کے نظم و نسق اور تمام ملک کے کاروباری مصالح کے لئے ضروری ہے۔

ریلوے کی تعمیر جس طرح مفید ثابت ہوئی اور کسی حقیقی نقصان سے سرکاری ریلوں کو سابقہ نہیں رہا ہے اسکی توضیح اس مضمون کی گزشتہ قسط میں ہو چکی ہے۔ بہرحال ریلوے کی توسیع کی مخالفت کچھ وزنی نہیں ہے۔ ریل سے جو فوائد حاصل ہیں اسکو اور زیادہ واضح کرنے کے لئے اعداد و شمار بہترین ذریعہ ہو سکتے ہیں۔ ذیل میں بعض اعداد پیش کئے جاتے ہیں۔

سنہ ۱۳۳۰ف میں ریلوے لائن کا طول ۱۲۲۸ میل تھا۔ جملہ مصارف سرمایہ ۱۴ کروڑ ۹۰ لاکھ ہوئے جملہ آمدنی ۲ کروڑ ۸ لاکھ روپے ہوی۔ مصارف کی مقدار ایک کروڑ ایک لاکھ روپے تھی خالص منافع ایک کروڑ ۳۶ لاکھ روپے ہوا۔ ملازمین ریلوے کی تعداد ۱۵۹۰۲ تھی۔ مسافرین ایک کروڑ ۱۹ لاکھ سے زیادہ اور مال کی مقدار ۱۶ لاکھ ۸۰ ہزار ٹن تھی۔

حالیہ اعداد یہ ہیں۔ ریلوے لائن ۱۳۴۴ میل۔ سرمایۂ سرکار بر ریلوے ۱۶ کروڑ روپے۔ جملہ آمدنی ۳ کروڑ دس لاکھ روپے۔ اخراجات ایک کروڑ ۶۰ لاکھ روپے خالص منافع ایک کروڑ ۵۰ لاکھ روپے۔ مستقل ملازموں کی تعداد ۱۷ ہزار۔ مسافروں کی تعداد ۲ کروڑ ۲۰ لاکھ۔ مال کی مقدار ۳۰ لاکھ ٹن یہ اعداد عالیجناب صدر اعظم بہادر نے جدید ریلوے بورڈ کے افتتاح کے موقع پر بیان فرمائے۔ کیا اسکے بعد بھی کوئی صاحب ریلوے کی توسیع سے اختلاف کر سکتے ہیں؟

کمپنی کے کاروبار کو سرکار عالی نے حاصل کر لیا تو ۱۲ سو میل کی لائن سپرد کی۔ ہمیں اس قسم کا ایک پروگرام بنانے میں کوئی ناقابل حل مشکل درپیش نہیں تھی کہ ہر سال ایک سو میل جدید ریلوے لائن کی توسیع ۸ سال تک ہوتی رہے تا آنکہ مجموعۃً ۲ ہزار میل ریلوے لائن ممالک آصفیہ میں قائم ہو جائے۔ ریلوے کی تعمیر پر اوسطاً حقیقی خرچہ، کفایت سے کام لیا جائے، تو فی میل ۷۰ ہزار سے زیادہ نہیں ہوتا۔

یہ فرض کیا جاتا ہے کہ اس طرح پروگرام مرتب کرنے کے بعد سنہ ۳۲ء سنہ ۴۲ء تک ۱۲ سو میل کی تکمیل ہو جاتی اور چونکہ ہم ریلوے پٹریاں اور آہنی سامان پہلے ہی خرید چکے ہوتے اس لئے ہمارے پاس دو سو میل تک زاید اسٹاک سنہ ۴۴ء تک کام کے لیے مہیا رہتا اور اسکی وجہ سے سنہ ۴۲ء تک جملہ ڈھائی ہزار میل کی تکمیل ہم کر چکے ہوتے پھر جنگ کی وجہ سے کام روک دیا جاتا۔

اس بارہ سال کی مدت میں سالانہ ۷۰ لاکھ روپے اس طرح مہیا کئے جاتے کہ ۳۵ لاکھ روپے سالانہ کا سرمایہ سرکار کی سلک اور ریلوے کے منافع سے بچایا جاتا اور ہندوستان کی حکومت کے پرامیسری نوٹوں کی خریدی کے بجائے اسکو ریل کی تعمیر پر صرف کیا جاتا۔ باقی ۳۵ لاکھ روپے رعایا ملک سے قرضہ لیکر حاصل کیا جاتا۔

اس طرح جو سرمایہ ریلوے کی تعمیر پر لگایا جاتا اس پر اقل درجہ خود پرامیسری نوٹوں کا منافع فی صدی تین روپے آٹھ آنے ضرور حاصل ہو جاتا۔ جو حکومت ۱۵ کروڑ روپے کلدار ریلوے پر لگا چکی ہے اسکے لئے مزید ۴½ کروڑ روپے کی فراہمی ۱۲ سال میں دشوار نہیں تھی۔

ہوسکتا تھا کہ یہ لائنیں اس طرح قایم کی جاتیں کہ ان سے جی آئی پی اور ام ایس ام ریلوے سے نرخ کے معاہدہ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا اور ملک کے زرخیز اور شاداب علاقے ریل سے متمتع ہوجاتے۔ ہوسکتا تھا کہ یہ ریلوے لائنیں حسب ذیل ہوتیں۔

۱۔ مدکھیڑ سے عادل آباد تک۔ ۲۔ پداپلی سے کاماریڈی یا نظام آباد تک براہ کریم نگر۔ ۳۔ اکناپیٹ یا مرزاپلی سے براہ میدک و سداسیوپیٹ شنکرپلی تک۔ ۴۔ پرلی سے براہ بیڑ اورنگ آباد تک۔ ۵۔ بھونگیر یا حیدرآباد سے نلگنڈہ تک۔ ۶۔ گدوال سے کپل تک، ۷ بودھن سے نظام ساگر اور ناندیڑ کے اندرونی حصوں تک۔

اس کا نتیجہ کیا ہوتا؟ ۔ ۱۔ سرمایہ کا بڑا حصہ ملک میں ہی صرف ہوتا جس کی وجہ سے کاروبار میں وسعت پیدا ہوتی اور دوسرے فوائد حاصل ہوتے۔ ۲۔ مزید ۱۵ ہزار افراد کو ریلوے کی ملازمت ملنے سے ملک میں خوشحالی پیدا ہوتی ۳۔ لائن پر ہزاروں مزدور اور بیسیوں گتہ داروں کو کام مہیا ہوتا ہے پتھر، لکڑی اور چونہ فراہم کرنے میں مزید ہزاروں افراد مصروف رہتے۔ ۵۔ عام تجارتی کاروبار کو فروغ ہوتا ۶۔ انتظامی ضروریات کی تکمیل ہوتی۔ ۷۔ سررشتہ کروڑگیری اور سررشتہ ٹپہ کے کام میں وسعت حاصل ہوتی ۸۔ ریلوے کی تاربرقی اور ٹیلیفون کا سلسلہ وسعت پاجاتا اور وہ خود آمدنی اور کاروبار کی وسعت کا ذریعہ ثابت ہوتا۔ (۹) جس قدر رقم عامۃ الناس سے لیکر ریلوے کو وسعت دینے میں لگائی جاتی اس کا منافع انکو ملتا اور اس طرح بیرون ملک سرمایہ کا تحفظ کرنے کے بجائے خود ملک میں ہی سرمایہ محفوظ ہوجاتا۔

سررشتۂ ریلوے کے لئے یہ ممکن تھا کہ اس ۱۲ سالہ توسیع ریلوے کو کامیاب بنانے کے لئے اس غرض کو ظاہر کرکے کہ اسکو رولنگ اسٹاک کی ضرورت ہوگی مزید دو ڈھائی کروڑ کے سرمایہ سے ریلوے ورکشاپ کو اس پیمانہ پر وسعت دی جاتی کہ نہ صرف ریل کی مسافر گاڑیاں مال کے ڈبے بلکہ موٹر بسیں موٹر لاریاں اور

موٹر کاریں بھی ضرورت کے مطابق مہیا ہو جاتیں۔ اسکے نتائج کس قدر زرین ہوتے! ملک کے ذرائع معشیت کس قدر وسعت پا جاتے! کس قدر بے روزگار افراد کام پر لگ جاتے! مگر افسوس ہم نے پورے ۱۲ سال ضائع کر دیئے۔ باتیں اور تقریریں کرتے رہے کہ یہ کر سکتے ہیں اور یہ کرنا چاہیئے۔

اس موقع پر پھر اس بحث کا جواب نامناسب نہیں کہ جو بعض افراد پیدا کرتے ہیں کہ ہماری معاشی ترقی میں اعلیٰ شہنشاہی پالسی مزاحم ہو جاتی ہے۔

کوئی شبہ نہیں کہ انگلستان کے بعض باشندے ذاتی طور پر ہندوستان کی صنعتی ترقی کو فطرتاً پسند نہیں کرینگے۔ ان کا نقطۂ خیال یہ ہوگا کہ ہندوستان اشیائے خام بہم پہونچانے والا ملک رہے اور انگلستان صنعتی ملک رہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ برطانوی ہند کے بعض اعلیٰ حکام یہ امر پسند کریں کہ دیسی ریاستوں کے نظم ونسق اور ہر قسم کے کاروبار کا معیار برطانوی ہند سے گھٹا ہوا رہے لیکن اس کے باوجود اقتضائے زمانہ کے مدنظر ترقی اور کاروبار میں وسعت دینے کی خواہش عزم راسخ اور صحیح استدلال کے ساتھ ظاہر کی جائے تو حکومت ہند کی مفاہمت، بالآخر حاصل کر لینا کوئی دشوار امر نہیں ہے۔

حکومت ہند کی ابتدا سے یہ پالسی رہی ہے کہ سارے ہندوستان میں ریلوے لائینوں کی ممکنہ توسیع میں تامل نہ کیا جائے چنانچہ ۹۰ سال کے عرصہ میں ہندوستان بھر میں ۴۵ ہزار میل ریلوے کو پھیلایا گیا۔ آخر خود ممالک محروسہ سرکار عالی میں ۱۲۰۰ سو میل لائن تعمیر ہوئی۔ اگر اس زمانہ کے صدر المہام فینانس اور ریلوے جو حکومت ہند سے دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔ اصرار کرتے اور صحیح استدلال پیش کرتے کہ سرکار عالی اپنے ملک میں ریلوے کو رعایا کی کاروباری اور معاشی ضرورتوں کیلئے وسعت دینا چاہتی ہے تو انکار کی کوئی وجہ نہیں تھی۔

یہ امر ممکن تھا کہ ضروریات ریلوے میں انگلستان کے مال کو ترجیح دیجاتی تھی کاموں اور نظم ونسق کے لئے انگلستانی افراد کے خدمات حاصل کئے جاتے۔ ہم سایہ برطانوی ریلوں سے غیر ضروری اور خلاف مصلحت مقابلہ نہ کیا جاتا تا ان حالات میں حکومت ہند خواہ مخواہ کیوں مزاحم ہوتی۔

اس سلسلہ میں یہ خیال آرائی کی جاسکتی ہے کہ جب دوسرے مقامات پر موٹر سازی کے کارخانہ کیلئے

اجازت نہیں ہے تو حیدرآباد کو کیوں کر کامیابی ہو سکتی تھی۔ اس کے بارے میں یہ واضح کیا جا سکتا ہے کہ ریل کی مسافر گاڑیوں، مال کے ڈبوں اور موٹر سازی کے کارخانہ کے قیام کی اجازت ہمیں حاصل ہو جاتی اگر تعاون کی اسپرٹ میں سرکار عالی کی جانب سے صدر المہام فینانس حکمت علی سے یہ اظہار کرتے کہ حکومت سرکار عالی کی قطعی پالیسی ہے کہ ایسا کاروبار سررشتہ ریلوے سرکار عالی کے ورکشاپ کے جزو کے طور پر ریلوے کی ضرورت رفع کرنے قائم کیا جائے اور اس میں کسی منافع کی گنجائش یا تاجرین تجارت کا سوال پیدا نہ کیا جائے گا۔ حکومت ہند نے واضح کر دیا ہے کہ میسور کے کارخانہ موٹر سازی میں نفس کارخانہ سے اختلاف نہ تھا صرف منافع پر معین گنجائش کے اصول اختلاف کیا گیا تھا۔ نیز جب حکومت ہند ٹاٹا کو آہنی اشیاء کا کارخانہ جمشید نگر میں اور وال چند کو احاق پٹن میں جہاز سازی کے کارخانے کے قیام کی اجازت ممکنہ مراعات اور سہولتوں کے ساتھ دیتی ہے، کوچین کی حکومت کو ایک عظیم الشان جہازی گودی کی تعمیر کرنے میں اعانت و مشورت دیتی ہے۔ حکومت میسور کو بھی آہنی سامان کے کارخانہ کے قیام میں سہولت بہم پہونچاتی ہے تو سراکبر حیدری بھی ناکامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ جب گزشتہ جنگ کے موقع پر مملکت آصفیہ میں کرنسی نوٹوں کی اجرائی اور سرکار عالی کے مالیہ کی عظیم ترین اسکیم تدبر کے ساتھ کامیابی سے رائج ہو گئی اور بڑے بڑے خدمات پر اہل ملک کو مامور ہونے کا موقع مل گیا تو ہمت اور تدبر سے ریل کی توسیع اور موٹر کاروں و ریل کے گاڑیوں کے ایک بڑے کارخانہ کا قیام بالکل ممکن تھا لیکن ہمت کہاں تھی تدبر کہاں تھا۔ ہم لوگ محض اپنے سایہ سے ڈرتے رہے۔ ملک کے اعلیٰ حکام کا وقت محض جزئیات میں صرف ہوتا تھا۔ اپنے متوسلین کو ملازمت دلانا، تنخواہوں میں اضافہ اجرائی ماہوار، گریڈ اور بقایا کی منظوری، مکان کی خریدی، مکان کرایہ پر لینا یہی امور پیش نظر رہتے تھے۔ ریل کا جال تمام ملک میں پھیلانے اور ریل کی ضروریات ملک میں ہی فراہم کرنے کی بارہ سالہ بڑی فرصت ضائع کر دی گئی۔

معدنیات

اس خطبۂ صدارت میں بعض معدنی مسائل کا بھی تذکرہ ہے۔ قبل اس کے کہ اس بارے میں

کوئی تنقید کی جائے یہ ظاہر کرنا برمحل ہوگا کہ معدنیات ملک سے کام لینے کی ضرورت کا احساس نواب مختار الملک مرحوم نے بروقت کر لیا تھا اور مرزا مہدی خاں کو کب کو معدنیات کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلستان روانہ کیا تھا۔ موصوف نواب مختار الملک کے آخری زمانہ میں واپس آئے اور نواب صاحب مرزا صاحب سے کام نہ لے سکے۔ بعد میں بجائے اسکے کہ سررشتۂ معدنیات قائم کرکے ان پر مرزا مہدی خاں کا تقرر کیا جاتا، ان سے اولا مردم شماری اور پھر گزیٹر کی ترتیب کا کام لیا گیا اور کام ختم ہونے کے بعد گھر بیٹھے ماہانہ ۳۵۰ روپیہ ماہوار حاصل کرتے رہے۔ ملک کو ان کے اصلی معلومات فن سے مستفید کرنے کے لئے کوئی توجہ نہیں کی گئی۔

غرض اس خطبۂ صدارت میں یہ کہا گیا ہے کہ

"حیدرآباد میں سوائے کوئلہ اور سونے کی کانوں کے کوئی بڑی کانیں نہیں ہیں"

لیکن آگے چل کر یہ بھی کہا گیا ہے کہ

"یہ صحیح ہے کہ مملکت حیدرآباد میں ہر قسم کی معدنی اشیا اور دیگر اشیائے خام پائی جاتی ہیں"

بیان کے اس تضاد کے باوجود اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ملک میں صرف کوئلہ اور سونے کی کانیں ہیں تو یہ خود ملک کے لئے بڑی دولت ہے۔ ہندوستان کے بہت سے حصے اس دولت سے محروم ہیں۔ بمبئی کے علاقہ میں نہ سونا ہے نہ کوئلہ ہے۔ اسی طرح مدراس کی حالت ہے۔ میسور میں بھی کوئلہ نہیں ہے دنیا میں برقابی کے بغیر بھی علی العموم کوئلہ سے کام لیا جاتا ہے۔ میسور میں آبشار سے برقابی قوت ارزاں طور سے حاصل ہوگئی ہے مگر وہاں بجز اسکے کہ لوہے کے کارخانے اور سونے کی کان میں کام لیا جائے یا روشنی کے اغراض میں مدد لی جائے یا معمولی کارخانے چلائے جائیں کوئی اور صورت نہیں ہے نہ تو ملک کا رقبہ وسیع ہے اور نہ زرعی پیداوار اس قدر ہے کہ اس سے کام لیا جائے۔

مملکت آصفیہ میں لوہا کمیاب ہونے اور زیادہ مقدار میں نہ ہونے کا اظہار پہلی مرتبہ اسی خطبۂ صدارت سے ہوا ہے ورنہ اب تک جس قدر رپورٹیں سرکاری اور غیر سرکاری طور پر شائع ہوئی ہیں سب میں متعدد

اضلاع میں کافی مقدار میں بہتر قسم کے لوہے کی موجودگی کا حال درج ہے۔ اس سلسلہ میں جو سوالات پیدا ہوتے ہیں وہ یہ ہیں۔ ۱۔ آیا مکمل تحقیقات ہوچکی ہے ۲۔ آیا لوہے کے استفادہ کا قطعاً کوئی امکان نہیں ہے۔ ۳۔ ایا بعض قطعات ابھی تحقیقات کے لئے کھلے ہوئے ہیں؟ ان سوالات پر اس نوٹ سے روشنی پڑسکیگی جو سررشتۂ صنعت وحرفت کی جانب سے دفتر معلومات عامہ نے چند ماہ قبل شائع کیا تھا۔

اس سے قطع نظر سررشتۂ معدنیات کا کام اب تک یہ رہا ہے کہ خود تحقیقاتی کام انجام نہ دے اور دوسروں کی درخواست کا منتظر رہے۔ یہ طریقہ کار ممکن ہے کہ برطانیہ جیسے ممالک میں سودمند ہو جہاں وافر قومی سرمایہ ہر وقت کام کی تلاش میں رہتا ہے۔ اس لئے حکومت کو خود توجہ کی ضرورت پیش نہیں آتی یہ پالیسی برطانوی ہند میں بھی اس لئے اختیار کی گئی ہے کہ وہاں بھی بڑے بڑے انگریز سرمایہ دار سرمایہ لگانے پر آمادہ ہوجاتے تھے۔ اور اب گجراتی اور مارواڑی وغیرہ اس کے لئے آمادہ ہوگئے ہیں۔ ہمارے ملک میں یہ پالسی قطعاً مفید نہیں ہوسکتی۔ ہمارے ملک کے سرمایہ دار باہمت اور باخبر نہیں ہیں۔ وہ امید امید میں اپنا روپیہ اور محنت صرف نہیں کرتے۔ سررشتۂ معدنیات کے طریقۂ عمل سے انگریز اور بیرونی سرمایہ دار فائدہ پیدا کرسکے۔ معدنیات کے اجارے بیرونی سرمایہ داروں کو دینا کسی طرح مفید نہیں ہے۔ اسکے یہ معنی ہیں کہ معدنی دولت کو لٹا دیا جائے۔ سرفضل بھائی کو بھی معدنیات کے چند اجارے دیئے گئے تھے مگر انہوں نے جس طرح دوسری کمپنیوں کو یا خود سرکار کو معاوضہ لے کر دست برداری اختیار کرلی وہ نہایت ہی افسوسناک ہے۔ اس فرم کی وجہ سے ملک کے معاشی کاروبار میں نقصان پیدا ہوا۔ اس فرم نے ملک کی دولت تلف کرنے میں اور سرمایہ لگانے والوں میں بے اعتمادی پیدا کرنے میں بڑا حصہ لیا۔ غرض سررشتۂ معدنیات کے طریقہ کار میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔

سررشتۂ معدنیات کو چاہیئے کہ مملکت آصفیہ کے معدنیات سے استفادہ کے لئے ابتدائی تحقیقات خود کرائے۔ سررشتۂ کو فنی نقطۂ نظر سے یہ کام اپنے ہاتھ میں لینے میں کوئی مشکل اس وجہ سے بھی نہیں ہوسکتی کہ اب سررشتہ کی نظامت پر ایک ماہر فن مامور ہیں اور ان کی ماتحتی میں متعدد اہل فن

موجود ہیں اگر ضرورت ہو تو مزید ماہران فن کی ماموری میں کوئی دقت نہیں ہے ۔ بہر حال جب معدنی تحقیقات مکمل ہو جائے تو سررشتۂ معدنیات کو چاہیئے کہ استفادۂ معدنیات کی ذمہ داری اہل ملک کے سپرد کرنے کی کوشش عمل میں لائے ۔ تحقیقات سے معدن کا وجود ثابت ہو جائے تو پھر خود بخود ملک کے سرمایہ داروں کو سرمایہ لگانے کی ترغیب ہوگی ۔

انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ سے امداد ہو سکتی ہے ۔ گزشتہ ۲۱ ، ۲۲ سال قبل ہی سر اکبر حیدری کی رہنمائی میں سررشتۂ معدنیات اس خصوص میں کوشش عمل میں لاتا تو نتائج درخشاں رہتے ۔ اب بھی موقع ہے کہ طریقۂ کار میں تبدیلی عمل میں لائی جائے ۔

ابھی حال میں ایک غیر ملکی فرم کو سونے کی تلاش کے لئے کام سپرد کیا گیا ۔ اس کام کے لئے سرمایہ سرکار عالی نے فراہم کیا ۔ لاکھوں روپے سرکار عالی نے خرچ کئے لیکن اسکے باوجود قرار پایا تھا کہ فائدہ ہو تو اس میں یہ غیر ملکی فرم بھی شریک رہے گی اگر نقصان ہو تو اس کو سرکار عالی برداشت کریگی جہاں تک معلوم ہے اس تلاش میں کامیابی نہیں ہوئی اور کام بند کر دیا گیا ۔ سرکار کے کئی لاکھ روپے صرف ہو گئے ۔

اس امر کی کوشش بھی عمل میں نہیں آئی کہ طبقات الارض اور معدنیات کی تعلیم اور عملی تربیت کے لئے ملک میں ایک درسگاہ قائم کی جائے تاکہ معدنوں میں کام کرنے کے لئے اہل ملک دستیاب ہو سکیں ہمارے ملک کے لئے ایک معدنی تعلیم گاہ ہر طرح ضروری اور مناسب ہے ۔

پارچہ بافی

جناب مولوی لیاقت اللہ خاں صاحب نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا ہے اور بجا ارشاد فرمایا ہے کہ

" محض خام اشیا کی موجودگی کسی کارخانۂ صنعت کے قیام کے لئے کافی نہیں ہے اولاً خام اشیا کا اتنی مقدار میں ہونا ضروری ہے کہ ایک کارخانہ کے تجارتی اصول پہ چلانے کے لئے جس اقل مقدار کی ضرورت ہے وہ موجود ہو ۔ دوم یہ کہ تیار شدہ

اشیا کی لاگت اس قیمت سے نہ بڑھے جس قیمت پر بیرون ملک کی تیار شدہ اشیا
یہاں آکر فروخت ہوتی ہوں۔ اگر ان دو شرطوں میں سے کوئی ایک شرط بھی پوری نہ ہو
تو سمجھنا چاہیئے کہ ایسی صنعت نفع آور طریقہ پر ملک میں قائم نہیں ہوسکتی"۔

ان دونوں اصولوں کو ذہن میں رکھکر بیان کیا جا سکتا ہے کہ مملکت آصفیہ میں روئی، چوب روغن دار، چمڑا، صابون، ادویات اور رنگ سازی کے لئے خام اشیا اسی مقدار میں مہیا ہوسکتی ہیں جس مقدار میں کہ ضروری ہو۔ یہ اشیا ملک میں اسقدر وافر مقدار میں موجود ہیں کہ بیرون ملک کے کارخانوں کے لئے ان کو خریدا جاتا ہے۔ جب مانچسٹر، جاپان اور بمبئی کے لئے یہ ممکن ہے کہ روئی ہمارے ملک میں خریدے اور باہر لے جاکر پارچہ اور سوت بنا کر خود ہمارے ملک میں فروخت کے لئے بھجوائے تو ایسی صورت میں خود ہمارے ملک میں سوت اور پارچہ کیوں تیار نہیں ہوسکتا۔

۵۵ سال قبل مملکت آصفیہ میں پارچہ بافی کی تین گرنیاں کھل چکی تھیں۔ اسکے بعد ۲۵ سال تک بجز اسکے کہ نہایت کثرت سے روئی صاف کرنے اور گٹھے باندھنے کے کارخانے کھولے گئے اور خام روئی باہر لے جانے کے لئے ہر قسم کی آسانی پیدا کی گئی، کوئی کوشش، چھوٹے پیمانہ پر ہی سہی، پارچہ بافی کے کارخانوں کے قیام کے لئے نہیں کی گئی۔ اسکے بعد بھی صرف ۳ گرنیاں پارچہ بافی کی کھولی گئیں۔ ہمارے ملک کے ایک بہت بڑے مہاجن کا کاروبار شولاپور میں پارچہ بافی کا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ وہ خود اپنے ملک میں اس قسم کے کاروبار نہیں چلاتے۔ اسکے اسباب کا پتہ لگانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

صورت حال یہ ہے کہ لنکا شائر بمبئی اور احمد آباد، ہر ایک کو روئی کی ضرورت ہے۔ جاپان کو بھی ضرورت ہوتی تھی۔ ان سب کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے بمبئی کے تاجران کپاس نے مملکت آصفیہ میں روئی کی خریداری کا بڑا انتظام کر رکھا ہے۔ اور اب ہمارے ملک کے تاجر جس طرح ہوسکے روئی فروخت کرنے میں اپنی ساری توانائی صرف کر دیتے ہیں۔

پارچہ بافی کے گرنیوں کے قائم کرنے میں ہمتیں جو متوجہ نہیں ہوتی ہیں اسکی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے کام کے لئے کافی سرمایہ کے علاوہ، کاروباری مہارت بھی ضروری ہے اور اسی کا اہل ملک پر

فقدان ہے۔ بمبئی کے کارخانہ داروں کا عموماً طریقۂ عمل یہ ہے کہ جس قدر رقم کی ضرورت ہوتی ہے اس سے
کم رقم بطور حصص (شیرز) مہیا کی جاتی ہے۔ اسکے بعد بطور ڈبنچر کم منافع پر کچھ رقم بطور قرض
حاصل کی جاتی ہے اور جلد ادا کردی جاتی ہے تاکہ اصل حصہ داروں کو زیادہ منافع ملے۔ اس کے ساتھ
یہ بھی عمل ہے کہ مینیجنگ ایجنٹ کو منافع کا بہت بڑا حصہ لازماً ملا کرتا ہے۔ مینیجنگ ایجنٹوں کا
یہ بھی عمل ہے کہ عمارت کی تیاری، اور مشنری کی بہم رسانی، روئی کی خریدی اور پارچہ کی فروخت میں
اپنے عزیز اور دوست کاروباری اصحاب کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ اصل حصہ داروں اور مزدوروں کے
افادہ کا خیال کم رکھتے ہیں۔ مصارف میں بھی کفایت کا خیال نہیں رکھتے۔ ان سب امور سے قطع نظر
مینیجنگ ڈائرکٹروں کے امیرانہ مصارف ہوتے ہیں۔ بعض کو گھوڑ دوڑ اور سٹہ کا شوق ہوتا ہے
اور دوسرے تجارتی کاروبار میں نقصان ہوتا ہے تو اسکی سلامتی کے لئے اپنے کارخانوں کو ناجائز
استفادہ کا ذریعہ بناتے ہیں۔

حیدر باد میں پارچہ بافی کی جو گرنیاں قائم ہوئیں اسکے ڈائرکٹروں نے کارخانوں کی ضرورتوں کے
مطابق سرمایہ جمع نہیں کیا اور کام کی تکمیل کے لئے جو رقم بطور قرض لی گئی اس کا کافی سود اصل آمدنی پر
عاید ہونا شروع ہوا۔ نیز مینیجنگ ایجنٹ کے معاوضہ کی شرح گراں تر تھی۔ ان اسباب کی بنا پر ابتدائی
حصہ داروں کو کوئی منافع ہی نہیں ملتا تھا۔ اس صورت حال نے مزید کارخانوں کے قائم کرنے کے ولولہ کو
سرد کردیا۔ جنہوں نے حصص خریدے انہوں نے کم قیمت پر فروخت کردیئے۔

مسٹر ڈنلاپ اور مسٹر ویکفیلڈ کے زمانہ میں سررشتۂ مال کے تحت نہ صرف کروڑگیری کا
سررشتہ ہی تھا بلکہ تجارت و حرفت کی کامل ذمہ داری بھی اس زمانہ میں تمام تر توجہ اسی جانب مبذول
کی گئی کہ روئی کو حیدرآباد سے باہر بھیجنے کے لئے ہی سہولتیں بہم پہونچائی جائیں۔ اسی زمانہ میں ہی
روئی صاف کرنے اور گٹھے باندھنے کے کارخانے قائم کئے گئے۔ ہر قسم کی سہولتیں ان کے لئے فراہم کی گئیں
حقیقت میں جس قدر ضرورت تھی اس سے بہت زیادہ ایسے کارخانے قائم کرائے گئے۔
اس وقت کسی نے خیال نہیں کیا کہ اس قدر کارخانے زاید از ضرورت ہیں۔ اور آج کل بیکار صرف شدہ

سرمایہ پر کافی منافع نہ مل سکیگا۔ اولاً کارخانوں نے شرح اجرت میں ایک دوسرے سے مقابلہ کیا اور اس طرح کیا کہ سب گھاٹے میں رہے۔ آخر سب نے اتفاق کیا کہ ہر سال باری باری سے چند کارخانے روئی کے موسم میں کام کریں اور باقی بند رہیں۔ اور جو کچھ منافع ملے سب ملکر تقسیم کرلیں۔ چنانچہ سیلو میں اس قسم کے ۱۳ کارخانے ہیں، لیکن ہر سال صرف تین کارخانے کام کرتے اور باقی بند رہتے ہیں۔

جیسا کہ ابھی ظاہر کیا جا چکا ہے حیدرآباد گلبرگہ اور نگ آباد میں پارچہ بافی کے کارخانے تقریباً ۶۰ سال قبل قائم ہو چکے تھے۔ اگر اس وقت ذمہ داران نظم و نسق اور دوسرے کاروباری لوگ اور سرمایہ دار اصحاب یہ تخیل قائم کرتے کہ جب تین کارخانے قائم ہو چکے ہیں اور برٹش انڈیا میں ہر سال کارخانے کھلتے جاتے ہیں تو یہ ناممکن نہیں کہ اس قسم کے کارخانے ملک کے دوسرے حصوں میں بھی قائم کئے جائیں۔ صحیح کاروباری طریقہ، ایمانداری اور جملہ امور کی پیش بینی کے بعد اچھے کاردان اور ماہران فن منتظموں کو فراہم کیا جاتا اور اس زمانہ کے حکام سررشتۂ مال چاہتے تو جو سرمایہ روئی صاف کرنے اور گٹھے باندھنے کے کارخانوں میں لگایا گیا اس سے پارچہ بافی کے کارخانے قائم کرا سکتے تھے اور ہمارے ملک میں مثل احمد آباد اور بمبئی کے دولت کے دریا بہا سکتے تھے۔ بالآخر سر علی امام کو خیال آیا کہ کچھ تو حالت بدلے۔ مگر بدقسمتی سے انہوں نے سر فضل بہائی کریم بھائی پر اعتماد کیا جو نیم دیوالیہ ہو چکے تھے۔ ان کے مقدمات سے ملک کی صنعتی ترقی کی امیدیں سراب ثابت ہو گئیں۔ تاہم اب ملک میں ۶ پارچہ کے کارخانے کافی وسعت کے ساتھ موجود ہیں۔

حبوب روغن دار

کپاس کی جو حالت ہے وہی حالت حبوب روغن دار کی ہے۔ یہ حبوب سالانہ پانچ چھے کروڑ کی مالیت میں ملک سے باہر جاتے ہیں اور خام روغن جو بمبئی میں صاف ہونے کے لئے جاتا ہے اسکی مالیت تیس چالیس لاکھ سالانہ کی ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں ان حبوب کے روغنوں کی درآمد کافی مقدار میں ہوتی ہے۔ سالانہ تیس چالیس لاکھ سے کم اسکی مالیت نہ ہوتی ہوگی۔ مملکت آصفیہ کی ارنڈی، مونگ پھلی، السی اور بنولہ وغیرہ کی جو شہرت ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ لیکن بعض جگہ

روغن کشی کی معمولی گرنیاں قائم ہیں مگر اس روغن کو مقطر اور صاف کرنے کا خیال کبھی نہیں کیا گیا۔ جس طرح روئی کو بنولہ نکال کر اور گھٹے باندھ کر بمبئی وغیرہ کو روانہ کردیا جاتا ہے کہ مصارف میں کمی ہو اسی طرح حبوب کو مصارف کی کمی کے لحاظ سے روغن کی صورت میں بمبئی وغیرہ کو روانہ کردیا جاتا ہے تاکہ صاف ہوکر یا تو پھر خود ہمارے ملک میں آئے یا دوسرے ملکوں میں فروخت کیا جائے۔

یادگیر میں روغن کشی کا کارخانہ قائم کیا گیا مگر اسکو فروغ نہ ہوسکا۔ رائے گیر میں بھی معمولی کارخانہ قائم ہوا اور وہ کچھ کامیاب حالت میں نہیں ہے۔

پارچہ بافی کے سلسلہ میں جو امور واضح کئے گئے وہی امور حبوب روغن دار کے سلسلہ میں بھی بیان کئے جاسکتے ہیں۔ حیدرآباد کے علاقہ میں بمبئی اور مدراس کے تاجروں کے ایجنٹ پھیلے ہوئے ہیں اور اپنے کاروبار کے فروغ کے خاطر یہاں روغن تیار کرنے کی حرفت جاری کرنا پسند نہیں کرتے۔ ملک کے کاروباری اور سرمایہ دار اصحاب ہمت نہیں کرتے کہ سب ملکر اپنی حرفت جاری کردیں۔

چمڑا

حیدرآباد سے سالانہ ۴۰،۵۴ لاکھ روپے کی مالیت کا چمڑا باہر جاتا اور ۴۱،۱۵ لاکھ روپے کی مالیت کی چرمی چیزیں باہر سے آتی ہیں۔ تاجران مدراس کے کارندے ممالک محروسہ کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں تاکہ چمڑا اور ہڈ صاف کرنے اور رنگنے کے اشیا خرید کر بیرون ملک روانہ کردیں۔ اگرچہ ملک میں معمولی طور پر دباغت چرم اور چرمی اشیا تیار کرنے کی کوشش ہوتی ہے اور وہ حوصلہ افزا ہے مگر کسی کو اب تک ہمت نہیں ہوئی کہ اس قسم کے کاروبار کو بڑے پیمانہ پر شروع کرے۔

صابون وغیرہ

ممالک محروسہ میں سالانہ دس لاکھ روپیہ کا صابون اور مغربی عطریات وغیرہ درآمد ہوتے ہیں۔ میسور میں صابن سازی کامیاب ہوچکی ہے۔ نیز ٹاٹا کمپنی نے "حمام سوپ" وغیرہ بنانے میں شہرت حاصل کی ہے۔ ہندوستان میں دوسرے کارخانے بھی قائم ہیں۔ اسن لائٹ صابن کا کارخانہ

ہندوستان میں منتقل کردیا گیا ہے مگر ہمارے ملک کی بدقسمتی ہے کہ صابن سازی کا سرکاری کاروبار دو مرتبہ بھی چلکر بند ہوگیا پہلی مرتبہ دو ایسے اصحاب کی خدمات حاصل کی گئیں جن کو صابون سازی میں مہارت تھی۔ ایک صاحب تو چند دن کی ملازمت کے بعد غالباً مستعفی ہو کر میسور چلے گئے۔ دوسرے صاحب عرصہ کی ملازمت کے بعد جب کہ ان کو ذمہ دار عہدہ دار سررشتۂ صنعت و حرفت کی حیثیت میں کام کرنے کا بڑا موقع ملا، حال میں وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس ناکام شدہ کاروبار کی مشنری کو خرید کر ذاتی کاروبار کی صورت میں اسکو چلانا چاہتے ہیں اور اب حال میں اسکو ایک کاروبار سرمایہ مشترکہ کی صورت دی ہے۔

ادویات

مملکت آصفیہ میں سالانہ ۱۵ لاکھ روپے کے ادویہ طب مغرب برآمد ہوتے ہیں بنگال میں چند ہی سال کی مدت میں سر پی سی رائے نے ایک عظیم الشان کارخانہ قائم کردیا۔ بڑودہ میں بھی اس قسم کا کارخانہ کامیابی سے چل رہا ہے۔

حیدرآباد میں پچاس سال قبل سرکار عالی کے میڈیکل اسٹور میں بعض طبی مرکبات کو تیار کیا جاتا تھا مگر کچھ عرصہ کے بعد اسکو مسدود کردیا گیا۔ نواب تلاوت جنگ بہادر معین المہام طبابت نے اس بارے میں توجہ کی تھی۔ بعد میں ڈاکٹر لنکا سٹر ناظم طبابت نے کچھ خیال کیا مگر پھر وہ بھی خاموش ہوگئے۔

راقم الحروف نے حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس میں ایک تحریک اس نوعیت کی پیش کی کہ ملک میں ایسا کاروبار سرکار عالی کو قائم فرمانا چاہیے۔ اور وہ منظور ہوئی۔ بعد میں جب یہ تحریک معتمدی متعلقہ میں کارروائی کے لئے آئی تو گو بعض یوروپین جامعات کی ڈگری رکھنے والے مددگاروں نے اختلاف کیا کہ ہمارے ملک میں صحیح اوزان اور برٹش فارماکوپیا کے صحیح اصول پر ادویہ سازی نہ ہوسکیگی۔ لیکن اسوقت کے معتمد سررشتۂ طبابت نواب نذیر جنگ مرحوم نے اس تحریک کے مالہ و ماعلیہ معلوم کرنے کے بعد یہ رائے ظاہر کی کہ اگر ہم اپنے ملک کی ترقی کے لئے موانعات دور کرنے کا عزم نہ کریں تو پھر ترقی کس طرح ہوسکیگی۔ انہوں نے ناظم طبابت کو لکھا کہ اس بارے میں ایک مکمل اسکیم پیش کریں

اس وقت کرنل بابا جیون سنگھ ناظم طبابت تھے۔ کرنل جیون سنگھ سرکار عالی کے اُن چند بہترین عہدہ داروں میں تھے جنکے خدمات اس ملک میں مستعار لئے گئے۔ کرنل جیون سنگھ فوراً کلکتہ کو گئے اور وہاں بنگال کیمیکل ورکس کے معائنہ اور سر پی سی رائے کی مشورت سے ایک عملی اسکیم پیش کردی۔ یہ اسکیم حسب قاعدہ سررشتۂ فینانس میں بھیجی گئی وہاں معتمد و صدرالمہام دونوں نے مددگار رکن معتمد فوج کی رائے سے اتفاق کیا۔ لیکن نواب نذیر جنگ مرحوم نے اپنی تحریک کو قوت سے آگے بڑھایا اور بالآخر سرکار عالی نے اسکیم منظور فرمالی۔ اس اثنا میں معتمدی فوج اور نظامت طبابت پر نئے اصحاب مامور ہوئے۔ کرنل نارمن واکر کو اس اسکیم میں کوئی دلچسپی نظر نہ آئی۔ چونکہ سررشتۂ فینانس پہلے ہی سے اختلاف ظاہر کر چکا تھا اس لئے اس اسکیم کو محافظ خانہ کی الماریوں میں محفوظ کردینے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔

اگر یہ کام نو دس سال قبل شروع ہوجاتا تو اب تک بہترین نتائج پیدا ہو چکے ہوتے اور اب جو محتاجی ادویات کے نہ ملنے سے ملک کو ہو رہی ہے وہ نہ ہوتی۔ حال حال میں سید عبدالرزاق صاحب نے یہ کاروبار شروع کیا ہے۔ گو حالات جنگ کے اعتبار سے کامیابی ... ت ... [illegible] ... آئے تاہم حالات امید افزا ہیں۔

متذکرۂ بالا اشیا کی طرح ممالک محروسہ میں دیگر خام اشیا اتنی مقدار میں موجود ہیں کہ متعدد کارخانے تجارتی اصول پر چل سکتے ہیں اور جو چیزیں تیار ہونگی انکی لاگت بیرون ملک سے آنے والی چیزوں کے مقابلہ میں بڑھ نہ سکیگی۔

فرض کیا جاسکتا ہے کہ اس ۶ سال کے عرصہ میں کم از کم ۳۶ کروڑ کے مشترکہ سرمایہ سے پارچہ بافی روغن سازی و دیگر صنعتی کاروبار کو فروغ دینا ناممکن نہیں تھا۔ یہ امر درست ہے کہ ۳۶ کروڑ کی مجموعی رقم بہت زیادہ ہے اور یہ کہ اس ملک کی مجموعی سرمایہ داری اور کاروباری مالیت خود فی الوقت اسقدر نہیں ہے لیکن یہ بات مسلمات میں سے ہے کہ جیسے جیسے کاروبار بڑھتا جاتا ہے تمول اور معاشی توانائی بڑھتی جاتی ہے ۶۰ سال میں بتدریج ایسے کارخانے کھلنا اور اسقدر سرمایہ مہیا ہوجانا بالکل ممکن تھا۔

__زراعت__ اس خطبۂ صدارت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ

"حکومت سرکار عالی نے حال ہی میں سررشتۂ زراعت کی تقسیم شعبۂ تحقیق اور شعبۂ اشاعت میں
کر دی ہے تاکہ ہمارے ہاں کی زرعی پیداواروں کی اقسام کو ترقی دینے اور مختلف قسم کی
کھاد کے طریقوں اور اچھے بیج کے فراہم کرنے سے متعلق تجربات کئے جائیں اور انکی تشہیر
گاؤں گاؤں کی جائے"

واضح ہو کہ ہمارے ملک کی زراعتی پیداوار کو امریکہ اور یورپ وغیرہ کی طرح بلند معیار پر لانے، تجربے کرنے اور ان سے زراعت پیشہ افراد کو واقف کرنے کی ضرورت کا احساس نواب مختار الملک مرحوم نے ۶۰ سال قبل کر لیا تھا۔ انہوں نے نواب عماد الملک کے چھوٹے بھائی سید محمد بلگرامی مرحوم کو یورپ میں زراعت کی تعلیم سرکاری مصارف سے دلائی۔ ان کے واپس آنے کے بعد بالکل ممکن تھا اسی وقت سررشتۂ زراعت قائم کر دیا جاتا مگر اس وقت کے کارفرمایوں کو سررشتۂ زراعت کا قیام پسند نہ آیا حالانکہ برٹش انڈیا میں اس وقت یہ سررشتہ قائم ہو چکا تھا۔ سید محمد صاحب مرحوم سررشتۂ انعام میں ڈپٹی کمشنر بنائے گئے۔ بعد ازآں سررشتۂ مال میں ان کو عمل داری اور اول تعلقداری کے خدمات پر مامور کیا گیا۔ ان کا کوئی تعلق زراعتی مسائل سے کبھی نہیں رکھا گیا۔

نواب آسماں جاہ مرحوم کی مدار المہامی میں سررشتۂ زراعت و تجارت و حرفت قائم ہوا اور اسکی نظامت کیلئے سید محمد حسین مرحوم برٹش انڈیا سے طلب کئے گئے۔ نگران کی ماتحتی میں سید محمد بلگرامی مرحوم اور مرزا مہدی خاں کوکب کو دے کر کام لینے کا کبھی خیال نہیں کیا گیا۔ اس زمانہ میں پارٹی فیلنگ کا جو زور شور تھا اس میں ایسے مفید ملک اور بہر کسی کو غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ دو تین سال کے بعد ایسی حالت میں جب کہ فی الجملہ کام چلنے لگا تھا، ناظم سررشتہ کا انتقال ہو جاتا اور سر آسماں جاہ کی وزارت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اس سررشتہ کو تخفیف کر کے اس کے فرائض مجلس مالگزاری کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں حالات کی مدد سے قیاس قائم کیا جائے تو یہ نظر آتا ہے کہ اس وقت کے ذمہ داران فینانس نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی مرحوم وغیرہ کا مطمح نظر یہ تھا کہ کوئی بلند نظری کا کام نہ ہو۔

ذمہ دار مال مسٹر ڈنلاپ آنجہانی کا تخیل بظاہر یہ تھا کہ مملکت آصفیہ کو برٹش انڈیا کے مقابلہ میں

پست رکھا جائے اور اشیائے خام فراہم کرنے والا ملک ہمارا ملک رہے اسکے بعد بھی اگرچہ کہ برٹش انڈیا میں سررشتۂ زراعت نے کافی ترقی کر لی تھی مگر حیدرآباد میں ایسے کسی سررشتہ کے قیام میں مسٹر ڈنلاپ اور سر جارج کیس واکر نے تجاہل عارفانہ کیا اور نواب حامد یار جنگ مرحوم اور خواجہ عبدالرشید مرحوم جیسے افراد سے بھی جو انگلستان سے اعلیٰ زراعتی تعلیم حاصل کرکے آئے تھے کوئی کام نہیں لیا گیا۔
آخر کار دور عثمانی میں ہی یہ سررشتہ قائم ہوا اسکی نظامت پر مسٹر جان کینی مامور ہوئے۔ یہ صاحب کس حد تک فن زراعت سے واقف تھے اور برٹش انڈیا کے کسی صوبہ میں اس کام کا تجربہ حاصل کیا تھا یا نہیں اس کا کوئی علم نہیں ہے۔ اسکے بعد بالآخر نظامت زراعت پر مولوی مظہر حسین صاحب مامور ہوئے جو فن زراعت کی اعلیٰ تعلیم و تربیت حاصل کر چکے تھے۔ ابتدا میں گو ان کو کام کرنے کا موقع نہیں دیا گیا بریں ہم انہوں نے مشکلات کو رفع کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ خودداری اور عزت نفس کے ساتھ کام آغاز کرتے ہیں کہ اس اثنا میں مسٹر کالنس صدر ناظم و معتمد تجارت و حرفت و زراعت ہوتے ہیں انہوں نے مظہر حسین صاحب کے ساتھ کام کرنا پسند نہیں کیا۔ مسٹر کالنس کی استدعا منظور ہوگئی اور اس امر پر کوئی غور نہیں کیا گیا کہ ایک ناظم سررشتہ کیوں اپنی جگہ سے ہٹا دیا جائے۔ نظامت زراعت پر برٹش انڈیا کے ایک نان گزیٹیڈ ملازم کو جو مستعار لیا گیا تھا ترقی دے دی گئی حالانکہ خود سرکار عالی کے علاقہ میں کسی نان گزیٹیڈ ملازم کو گزیٹیڈ اور اعلیٰ خدمت ملنا دشوار تر ہوگیا ہے اور عمال کو عہدوں پر ترقی دینے کے محترم صدرالمہام زراعت سر رچرڈ ٹرینچ اور سر تھیوڈر ٹاسکر بڑی حد تک مخالف تھے۔
غرض سررشتہ زراعت کی دو شعبوں میں تقسیم کسی اصول پر مبنی نہیں ہے۔ برٹش انڈیا میں کسی صوبہ میں سررشتۂ زراعت یوں دو حصوں میں تقسیم نہیں کر دیا گیا ہے بمبئی میں تجربہ کیا گیا لیکن ناکام ثابت ہوا اور دو شعبے جو الگ قائم کئے گئے تھے ملا دیئے گئے۔
سررشتۂ زراعت کے قیام کے بعد سے اس سررشتہ نے لانبے ریشے کی کپاس کو ترقی دینے میں ہی اپنی توانائی بڑی حد تک صرف کی۔ ارنڈی کی فصل کو کیڑوں سے بچانے، چاول کی اچھی قسموں کو ترقی دینے اور پنجابی عمدہ چاول اور بیرونی گیہوں سے حیدرآباد کو بے نیاز کرنے اور میووں کی پیداوار ممالک محروسہ میں

بافراط ہونے کے لئے بظاہر کوئی اہم و نمایاں کام انجام نہیں دیا گیا۔ بحالیکہ باہر سے ملک میں سالانہ پچاس لاکھ روپے کا میوہ آتا ہے۔ اور چاول و گیہوں کی بھی بڑی حد تک ضرورت ہوتی ہے۔

آبپاشی

نواب علی نواز جنگ بہادر کے ایک بلند پایہ مہندس ہونے کی نسبت سخت سے سخت مخالف کو بھی کلام نہیں ہوسکتا۔ ان کی عملی قابلیت اور سررشتۂ تعمیرات میں ان کا کارنامہ دنیا نہیں تو کم از کم ہندوستان کی نگاہوں میں موجود ہے ان کے تعمیری کاموں سے عام طور پر نظم و نسق اور معاشی کاروبار کو کس قدر سہولت اور کس قدر ترقی میسر ہوئی وہ بھی سب کو معلوم ہے۔ عام طور سے سب لوگ واقف ہیں کہ نواب صاحب موصوف نے آبپاشی، سڑکوں، پلوں، برقی قوت، اور ٹیلیفون کے لئے بہت سی اسکیمیں بنا دی تھیں۔ گو یہ اسکیمیں صرفۂ کثیر کی طالب تھیں لیکن آمدنی اور منافع کا بھی یقین دلاتی تھیں۔

سب اہل ملک اس بات سے آگاہ ہیں کہ کسی سال بارش میں کمی ہو جائے تو کیا کیا زحمتیں پیدا ہوتی ہیں۔ جس رقبہ میں تنگبھدرا اور کرشنا کی ندیاں بہتی ہیں خود وہاں پر بھی رعایا پانی کے ایک ایک قطرہ کے لئے تڑپ تڑپ کر رہ جاتی ہے۔ لیکن سررشتۂ تعمیرات کی ہر کوشش میں سررشتۂ فینانس مانع اور مزاحم ہوگیا۔ نواب علی نواز جنگ بہادر کی آبپاشی کی اسکیمیں فنی نقطۂ نظر سے چند ان اہم اعتراضوں کی مورد نہیں ہیں بلکہ رعایا کی سیرابی اور خوشحالی کے لئے ہر طرح ممد و معاون ہیں۔ یہ ملک کی بدقسمتی تھی کہ ۱۵، ۲۰ سال قبل سررشتۂ تعمیرات اور سررشتۂ فینانس میں اختلافات پیدا ہوئے اور بالآخر مخالفت کی نوبت آگئی۔ سررشتۂ فینانس نے سررشتۂ تعمیرات پر عملاً یہ ظاہر کردیا کہ اسکو زیادہ رقم نہیں دی جاسکتی، اسکی اسکیموں پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ جو رقم دی بھی جائے گی اس میں جامعۂ عثمانیہ اور دیگر عمارات پر اولاً سررشتۂ فینانس یا دوسرے الفاظ میں سر اکبر حیدری کے منشا کے مطابق رقم صرف کی جانی لازم ہے۔

سررشتۂ فینانس عرصۂ دراز سے یہ تسلیم کرتا آیا ہے کہ آبپاشی وغیرہ کے بڑے بڑے کاموں میں قرضہ لیکر کارہائے سرمایہ کے طور پر رقم صرف ہوسکتی ہے۔ مگر اس کے باوجود اس نے آمادگی ظاہر نہیں کی کہ

قرضہ کے ذریعہ آبپاشی برقابی کی اسکیمیں چلائی جائیں۔ یوں سررشتۂ فینانس کی مرضی ہو تو وہ بڑے بڑے قرضے لیتاہے اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ لیا ہوا قرضہ حقیقتاً کس کام میں صرف ہوا۔ قحط فنڈ کے لئے ہمارا سررشتۂ فینانس ہر سال ایک کافی رقم آمدنی سے علحدہ کرتا ہے اور اس مد کی اب بھی ایک بہت بڑی رقم برٹش پرامیسری نوٹوں کی صورت میں محفوظ ہے اسکی یا عام سرمایہ جات سرکار عالی کی کفالت پر اس فنڈ سے آبپاشی کے بڑے کاموں کے لئے رقم بآسانی مہیا کی جاسکتی تھی۔

ذمہ داران فینانس کے لئے یہ امر بالکل آسان تھا کہ ۱۳۳۰ف سے جبکہ نظام ساگر کا کام تقریباً مکمل ہو رہا تھا سالانہ ایک کروڑ روپے سررشتۂ آبپاشی، ٹیلیفون اور برقیات کو ۱۲ سال تک یعنی ۱۳۴۹ف تک دیا جاتا اور شرط یہ لگائی جاتی کہ ہر ہر پراجکٹ کی تکمیل کے بعد چار روپے فی صد منافع اور سنکنگ فنڈ کے لئے مناسب رقم سررشتہ متعلقہ ادا کرے۔ اس ۱۲ کروڑ کے صرفہ سے کس قدر زرین نتائج پیدا ہوسکتے تھے! اس ۱۵ سال کی مدت میں آبپاشی، برقابی اور ٹیلیفون کے کام اس قدر کامیاب ہوجاتے کہ منافع ادا کرنے کے قابل ہوجاتے۔ نظام ساگر سے ملک کی سیرابی، مزارعین کی خوشحالی اور عام کاروبار کی ترقی جو کچھ ہوئی اس کا تصور وہ افراد کرسکتے ہیں جنہوں نے ضلع نظام آباد اور نظام ساگر کی خوشحالی کو دیکھا ہے۔ اس مقالہ میں مختلف مقامات پر یہ قیاس آرائی کی گئی ہے کہ ۱۲ کروڑ روپے ریلوے پر ۱۲ کروڑ روپے آبپاشی برقابی ٹیلیفون وغیرہ کی اسکیموں پر اور ۳۶ کروڑ روپے کارخانوں وغیرہ کے قیام میں لگانا ممکن تھا۔ درحقیقت اس قدر سرمایہ کی فراہمی ناممکنات سے نہیں تھی۔ جب ہماری حکومت کا مالیہ ۶ سال میں دگنا بلکہ ڈھائی گنا بڑھ گیا ہے۔ ریلوے کا ۱۶ کروڑ روپے کا سرمایہ اب ڈیڑھ کروڑ روپے سالانہ کے خالص منافع کا ذریعہ ہوگیا ہے تو ۶ سال کی مدت میں مزید اوسطاً سالانہ ایک کروڑ روپے لگانا رعایا اور سرکار کے مشترکہ تعاون اور تشارک کی صورت میں بالکل ممکن تھا۔

سرمایہ

اس خطبہ میں آگے چلکر کہا گیا ہے کہ

"محض حکومت کی کوششیں کافی نہیں ہیں تاوقتیکہ مختلف طبقات ملک بھی اپنے اپنے

دائرۂ عمل کو حالات وقت کے مطابق نہ کرلیں - سرمایہ دار طبقہ کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ
وہ ملک میں صنعتی کارخانے محدود ذمہ داریوں کی کمپنیوں کی شکل میں فوراً قایم کریں -
حالیہ تلخ تجربہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے سرمایہ دار ایک جمود کے عالم میں ہیں - نظام شوگر فیکٹری
اور کارخانہ کاغذ سازی میں اس طبقہ نے کوئی قابل لحاظ حصہ نہیں لیا اگر حکومت کیجانب سے
حصص نہ خریدے جاتے تو یہ کارخانے عالم وجود میں نہ آتے - معاشی کمیٹی کے پروگرام میں اگر
ملکی سرمایہ داروں کے ذریعہ چھوٹے بڑے کارخانوں کے قیام کی جدوجہد بھی شامل کی جائے
تو مناسب ہوگا ۔"

ہمارے ملک کے سرمایہ داروں کے جمود کے عالم میں رہنے کا جو تلخ تجربہ ہوا ہے اسکی بنیادی وجہ کیا ہے ؟ - دنیا کے اور ممالک کی طرح مملکت آصفیہ کے نہ صرف سرمایہ دار بلکہ ملازمین سرکار اور خوش باش لوگ بھی کسی نفع آور کام میں اپنا سرمایہ اور بچت لگانے کے لئے بالکلیہ آمادہ ہیں - حیدرآباد کے اکثر افراد یہاں کوئی ذریعہ نہ ہونے سے برٹش انڈیا میں سرمایہ لگاتے ہیں - برٹش انڈیا کے پوسٹ آفسوں میں روپیہ رکھاتے ہیں - برٹش پرامیسری نوٹس خریدتے ہیں - برٹش بنکوں میں اپنی رقم محفوظ رکھتے ہیں - جب سرکار عالی کے ٹپہ خانوں میں سیونگس بنک قائم ہوئے تو لوگوں نے اس ذریعہ سے کامل استفادہ کیا - چنانچہ اب رقم امانتی کی مقدار ایک کروڑ روپے سے متجاوز ہو چکی ہے - سرکار عالی نے پرامیسری نوٹس جاری فرمائے تو لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ اپنا سرمایہ لگا دیا -

دنیا کا عام قاعدہ ہے کہ کسی کاروبار میں سرمایہ اسی وقت لگایا جا سکتا ہے جب کہ اطمینان ہوتا ہے کہ کاروبار معتبر اور محفوظ ہیں - چنانچہ خود برطانیہ میں جہاں کروڑوں پونڈ کا سرمایہ نفع آور کاروبار کی تلاش میں رہتا ہے کبھی تو فوراً مہیا ہو جاتا ہے اور کبھی کوششوں کے بعد بھی ناکامی ہوتی ہے -

حیدرآباد کی رعایا بھی نفع آور کاروبار میں سرمایہ لگانے کے لئے کافی اطمینان اور معتبری کی خواہاں ہے - اس نے سرکار عالی کو ابتدا میں قیام ریلوے کے لئے لاکھوں روپے دئیے - جب ریلوے کو انگلستان میں کمپنی کے سپرد کرنے کی گفت و شنید آغاز ہوئی تو امراء اور ساہوکار اس بات کے لئے

کھڑے ہوگئے تھے کہ کمپنی قائم نہ کی جائے اور ان سے روپیہ بقدر ضرورت مل سکتا ہے۔ خاندان ہائے راجہ نرسنگ گیر، راجہ شیولال موتی لال، راجہ چیتر بھوج داس، راجہ بھگوان داس، راجہ صاحبان ونپرتی، گدوال اور جٹپل نواب سیف نواز جنگ بہادر کے رقوم لاکھوں کی مقدار میں برٹش انڈیا میں لگے ہوئے ہیں۔ خاندان چینائی کا بھی بڑا سرمایہ باہر لگا ہوا ہے۔ نواب داؤد جنگ بہادر بھی کاروبار میں رقم لگاتے ہیں۔ سردار دلیر الملک مرحوم، کمال خاں مرحوم اور غالب الملک مرحوم کی بھی لاکھوں کی جائداد بمبئی وغیرہ میں تھی۔ اسی طرح اوروں کے بھی نام لئے جاسکتے ہیں۔ جناب نواب سالار جنگ بہادر بھی کافی سرمایہ کاروبار میں لگاتے ہیں۔ اس تفصیل سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ صحیح طریقہ پر سرمایہ لگانے میں حیدرآباد کے سرمایہ داروں نے کبھی انکار نہیں کیا۔

بدقسمتی سے مشکل یہ آن پڑی ہے کہ حیدرآباد میں صنعتی کاروبار میں روپیہ لگانے کا تجربہ اکثر تلخ ثابت ہوا۔ اول اول حیدرآباد میں گلبرگہ اور اورنگ آباد میں پارچہ بافی کی مشترکہ سرمایہ اور محدود ذمہ داری کی ۳ کمپنیاں قائم ہوئیں۔ اور ابتدائی اصل سرمایہ لگانے والوں کو مینیجنگ ایجنٹوں کے عمل کی وجہ سے سال ہا سال تک کوئی منافع حاصل نہیں ہوا۔ دکن مائننگ کمپنی کے متعلق سردار دلیر الملک کے طرز عمل نے لندن تک ایک غلغلہ پیدا کیا۔ سید عبدالرزاق کمپنی کا کارخانہ شکرسازی جو نواب سر وقار الامراء کی وزارت کے زمانہ میں قائم ہوا تھا سررشتۂ مال کی عدم ہمدردی اور بیرون ملک کے سخت مقابلہ کی وجہ سے ناکام رہا۔ شاہ آباد سمنٹ کمپنی کو کئی سال تک منافع نہیں ملا اور جیسے ہی منافع کا زمانہ قریب آیا واقف حال افراد نے کم قیمت یا اصل مقدار پر حصص اصلی حصہ داروں کو ناواقف رکھکر خرید لئے۔ یادگیر کے کارخانہ تیل اور عثمان شاہی ملز کے حالات طشت از بام ہیں۔ ان حالات میں حیدرآباد کے سرمایہ دار اصحاب سرمایہ لگانے میں احتیاط کرتے ہیں۔ یوں خود شاہ آباد سمنٹ کمپنی اور عثمان شاہی ملز میں سرمایہ لگانے میں ملک میں ہر طرف جوش اور سرگرمی کا اظہار ہوا تھا۔ بہرحال واقعات زمانۂ گزشتہ میں خواہ کچھ بھی رہے ہوں ملک کا سرمایہ دار طبقہ کا یہ فرض ضرور ہے کہ صنعتی کارخانے محدود ذمہ داری کے کمپنیوں کی صورت میں فوراً قائم کرلے۔

مگر سرمایہ دار اصحاب کس طرح یہ فرض ادا کریں؟ یہی مشکل ہے جو اولاً حل ہونا چاہیئے۔ یورپ اور امریکہ میں جہاں سرمایہ وافر اور کاروباری مہارت و بلند حوصلگی کی کمی نہیں ہے حکومت اپنے کو کاروبار سے علحدہ رکھتی اور کام کو سرمایہ داروں اور کاروباری لوگوں پر منحصر کر دیتی ہے۔ مگر اب سرمایہ داری کے ردعمل کے طور پر روس میں صنعتی کاروبار حکومت کے فرائض میں شامل کر لئے جاتے ہیں روس و جرمنی میں سرکاری سرپرستی اور ذمہ داری کو معاشی کاروبار کی حد تک بھی وسعت دیگئی۔ جاپان میں سرمایہ داروں کے ساتھ سرکاری رہنمائی اور تعاون کا عمل اختیار کیا گیا۔ ہندوستان میں حکومت برطانیہ کے اصول پر معاشی کاروبار کو کاروباری لوگوں پر چھوڑ دیا گیا۔ اس اصول پر سرکار عالی بھی عرصہ تک کاربند رہی مگر پھر یہ طریقۂ عمل اختیار کیا گیا کہ سرکاری سلک کا کچھ حصہ نفع آور کاروبار میں بھی لگایا جائے اسی اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے برٹش انڈیا کی بعض کمپنیوں میں حصص یا ڈبنچرز لیے گئے۔ نیز خود ممالکت کی ریلوے اور معدنیات اور دوسری کاروباری کمپنیوں میں رقم لگائی گئی۔ اور بالآخر انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ قائم کیا گیا۔ اس فنڈ نے عثمان شاہی ملز کی مینجنگ ایجنسی قبول کی ہے۔ اور سمنٹ، شکر، کاغذ وغیرہ کے کاروبار میں شرکت کی گئی جب یہاں تک قدم بڑھایا گیا ہے تو قدم کیا اور آگے نہیں بڑھ سکتے ہیں؟

حسب ذیل چند امور پر توجہ کی جائے تو ملک میں سرمایہ حاصل ہونے میں جو موانعات ہیں وہ دور ہو جائینگے۔

۱۔ مشترکہ سرمایہ کی کاروباری کمپنیوں میں یہ طریقہ رائج ہو گیا ہے کہ مینجنگ ایجنسی کو منافع میں بہت بڑا حصہ دیا جائے اور مینجنگ ایجنٹ حاکم مطلق قرار پاجاتا ہے۔ ہر قسم کی رقومات پر اسکو لامتناہی اقتدار حاصل ہو جاتا ہے۔ تعمیر، خرید آلات، اور اشیائے خام کی فراہمی میں وہ سرپرستی کرتا ہے۔ ضرورت ہے اس اقتدار مطلق میں مناسب حد بندی عمل میں لائی جائے اور اس نوعیت کاروبار کے متعلق جو ضوابط اور قواعد ہیں ان میں قانوناً مناسب نظر ثانی عمل میں لائی جائے۔ اگر ایسا ہو تو عثمان شاہی ملز میں گھاٹا نہ آتا

۲۔ یہ انتظام کیا جائے کہ عموماً حصص چھوٹی مقدار مثلاً سو روپے کے رکھے جائیں اور چونکہ اعلان قیام کمپنی، طلب سرمایہ اور افتتاح کاروبار میں کافی زمانہ گزرتا ہے اس لیے حصص کی رقم

ویڑھ دو سال کی مدت میں دس دس کے حساب سے ماہانہ یا دو دو ماہ پر وصول کرنے کا قاعدہ قرار دیا جائے اسکی وجہ سے عام طور پر ملازم پیشہ اور کم معاش لوگوں کو خریدی حصص کی ترغیب ہو جائیگی وہ نہ صرف سرمایہ دار بلکہ دوسرے عام لوگوں میں قومی مشترکہ سرمایہ فراہم کرنے کا جذبہ پیدا ہو جائیگا یہی جذبہ پیدا ہوا تھا جب کہ شاہ آباد سمنٹ کمپنی اور عثمان شاہی ملز کے حصص فروخت ہوئے تھے۔

۳۔ منیجنگ ایجنٹ کے معاوضہ کی شرح میں غور کرنے کی ضرورت ہے۔ بطور مثال کہا جا سکتا ہے کہ اسوسی ایٹڈ سمنٹ کمپنی کے منیجنگ ایجنٹ کے معاوضہ کی سالانہ مقدار سات آٹھ لاکھ روپیہ کلدار ہے حالانکہ گورنر جنرل کی سالانہ تنخواہ ڈھائی لاکھ روپیہ ہے اور یہ تنخواہ ساری سلطنت برطانیہ میں سب سے بڑی تنخواہ ہے اسی طرح مملکت آصفیہ میں شکر کا عقد اور تعمیری کاروبار کی جو کمپنی ہے اسکے منیجنگ ایجنٹ کا معاوضہ تینچ [illegible] کاروبار میں کم و بیش [illegible] لاکھ روپے سالانہ ہوگا حالانکہ مملکت کے صدر اعظم کا سالانہ مشاہرہ ۶۰ ہزار روپے کلدار ہے اور صدر المہاموں کو ۴۲ ہزار روپے سالانہ سے زیادہ تنخواہیں نہیں دی جاتی یہی حال ممالک محروسہ سرکار عالی کے پارچہ بافی کی گرنیوں کے انتظام کا ہے۔ اسکے علاوہ اسٹاف کی تعداد اور ماہوار وغیرہ میں بھی اسراف نہ ہونے کی نگرانی رکھنی چاہیئے۔

۴۔ فی الحال انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ کو ہی مفید اور نفع آور کاروبار آغاز کرنا ہر طرح کامیاب ہونے کا یقین دلاتا ہے۔ یہ امر مناسب ہوگا کہ انڈسٹریل ٹرسٹ کسی بلند پایہ تجربہ کار ماہر کاروبار کے خدمات بطور مشیر اور ڈائرکٹر ان چیف حاصل کرے جسکے سپرد کاروبار کے تفصیلات کئے جاسکتے ہیں۔

۵۔ انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ کے ٹرسٹیوں اور ذمہ داروں کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ وہ ملک کے امراء، تجار، مہاجن، سرمایہ داروں، کاروباری لوگوں اور ماہران سائنس، ماہران معاشیات اور معاشی اداروں سے تعلقات رکھیں اور جیسے ہی کسی کاروبار کے آغاز کا تہیہ ہو ان سے مشورت لینا اور سرمایہ لگانے پر آمادہ کرنا ضروری ہے۔

۶۔ بالعموم ایسے کاروبار اختیار کئے جائیں جو برٹش انڈیا میں کامیاب ثابت ہو چکے ہوں اور جن کو اس ملک میں خام اشیا کی بکثرت اور وافر موجودگی کی وجہ سے بآسانی جاری کیا جا سکتا ہے۔

مستقبل

معاشی کاروبار کی ترقی کے امکانات کے ساتھ ہی یہ خیال افسردگی پیدا کردیتا ہے کہ جنگ کی وجہ سے جب مشنری مل نہیں سکتی اور ساری توانائیاں کامیاب انصرام جنگ پر لگی ہوئی ہیں تو ہم بے بس افراد کیا کرسکتے ہیں

اخبارات کا مطالعہ کرنے والوں سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ جہاں فریقین جنگ کے دفاتر اور سررشتے جنگی اہتمام میں پوری شدت اور انہماک کے ساتھ مصروف ہیں وہاں ہر فریق کے ملک میں چند باخبر اور تجربہ کار افراد مابعد جنگ کے معاشی پروگرام کی ترتیب میں مصروف ہیں۔ ہم بھی اس فرصت میں چند باخبر افراد کو بعد از جنگ معاشی پروگرام مرتب کرنے میں مشغول کر دے سکتے ہیں۔

اس کے ساتھ اہل بصیرت کے غور کیلئے یہ واقعہ اپنے حال پر قائم ہے کہ کسی جگہ بھی مشنری کا وجود بہ یک وقت طلسمات کی طرح قائم نہ ہوا۔ بتدریج ان کی ایجاد ہوتی گئی۔ مثلاً پارچہ بافی کے دستی چرخے اور کرگھے چل رہے تھے۔ ان کے بجائے برق و بخار کی مدد سے کاروبار بڑے پیمانہ پر چلانے کا طریقہ بتدریج ترقی پاتا گیا۔ اور بتدریج ان کے آلات و اوزار بنائے گئے۔ یہی حال دوسری ہر صنعت کا ہے۔

ہم یہ تصور کرسکتے ہیں کہ مشین کے ذریعہ برق و بخار کی طاقت سے پارچہ بافی کی دریافت ہم نے آج ہی کی ہے یا یہ کہ موٹر کار کی پہلی مشین ہم نے آج ہی تیار کی ہے اور پھر ہم اسکے سلسلہ میں وہی کوشش اسی طریقہ سے آغاز کریں جو پارچہ بافی کی پہلی مشین کے موجد اور پہلی موٹر کار کی اختراع کے بعد اسی کی مشینوں کو بنانے کے لئے یورپ اور امریکہ میں عمل میں آئی تھی۔ آج نہیں تو دیر میں سہی ہماری کوشش کامیاب ہوسکتی ہے۔

مشکلات کو حل کرنے کے سلسلہ میں ایک مثال درج کی جاتی ہے۔ یہ داستان پہلے بیان ہوچکی ہے کہ کس طرح ملک میں روئی صاف کرنے اور گٹھے باندھنے کے کارخانے بلا ضرورت ہوئے اور یہ کہ اکثر کارخانے سال بھر بند پڑے رہتے ہیں۔ سیلو میں ایک ایسے بند کارخانہ کے متعلق ایک صاحب ہمت کو خیال آیا کہ اسکی مشنری سے برقی روشنی اور برقی طاقت مہیا کرنے کا کام نکالا جائے۔

چند ضروری ترمیمات اور چند ضروری آلات کی فراہمی کے بعد اب اس کارخانے سے سیلو کے چھوٹے سے قصبہ میں برقی قوت بآسانی پیدا کی جارہی ہے اور ساری بستی میں تقسیم ہو رہی ہے۔ اس طرح ایک بے کار کارخانہ کارآمد ہوگیا۔ چند ماہران فن اس امر کی رپورٹ پیش کرنے کے لیے مامور ہوسکتے ہیں کہ ان میکا کارخانوں کو کس حد تک فی الحال صنعتی کاروبار کے لئے کام میں لایا جاسکتا ہے۔ اور اگر مزید مشنری کی ضرورت ہو تو اسکے فراہم ہونے کی کیا سبیل ہے۔ آخر کاغذ کے کارخانے کی مشنری جنگ کے زمانہ میں ہی آئی سویڈن سے روس ہوکر اور وہاں سے عراق اور خلیج فارس کے راستہ کچھ مشنری آخر آہی گئی۔ صرف ہمت اور کسی کام کو انجام پر پہونچانے کا ولولہ ضروری ہے۔

اوین میٹل ورکس کا خام مال جمشید پور سے آتا ہے اور زمانہ جنگ میں ہی کارخانہ کھل گیا۔ (باقی آیندہ)

صنعتی ممالک کے چند معاشی مسایل

از جناب حافظ تقی الدین صاحب معتمد بزم معاشیات جامعۂ عثمانیہ

موجودہ دور تاریخ انسانی میں اس حیثیت سے بھی بے نظیر ہے کہ دُنیا نے جدال و قتال کا ایسا ہنگامہ آج تک نہیں دیکھا جیسا کہ آج کل کُل عالم میں برپا ہے۔ جنگ کے ہیبتناک شعلوں کی لپیٹ نے ساری دُنیا کو ہم آغوش کرلیا ہے بلاشبہ کوئی دن ایسا نہیں گذرتا جب اس وسیع عالمی محاذ کے کسی نہ کسی حصہ پر ہزاروں بلکہ لاکھوں انسانوں کی بھینٹ جنگی دیوتا کو نہ چڑھائی جاتی ہو۔ یہ جنگ دراصل اس انتشار کا خارجی مظہر ہے جو اس وقت متمدن دنیا میں جاری ہے۔ انسانی تمدن کا ہر شعبہ چاہے وہ معاشی ہو یا سیاسی، قومی ہو یا بین الاقوامی، اس میں کوئی ہم آہنگی نہیں ہے۔ ان ساری دہشت ناکیوں کا حقیقی سبب وہ چند معاشی مسائل ہیں جو ترقی یافتہ ممالک میں خطرناک حد تک اہمیت حاصل کر چکے ہیں۔

ان معاشی مسائل کو ہم افلاس، بیروزگاری، سرمایہ اور محنت کی جنگ، معاشی بحران سامراجی جلب منفعت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

ان مسائل کی ماہیت کو سمجھنے کیلئے سب سے پہلے اس معاشی ڈھانچہ کو سمجھ لینا ضروری ہے جو کسی صنعتی ملک میں اسوقت موجود ہے۔ ان صنعتی ممالک میں سرمایہ دارانہ طریق پیدائش و صرف رائج ہے اس نظام میں ذرائع پیدائش پر صرف ایک طبقہ کا قبضہ ہوتا ہے۔ ساری معاشی مشنری خواہ وہ پیدائش ہو کہ صرف یا تقسیم خانگی افراد کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ اور دوسرا طبقہ جو کثیر تعداد میں موجود ہوتا ہے اپنی محنت کو "جنس" کی طرح بیچکر روزگار کماتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی تعریف انگلستان کے مشہور و معروف، ماہر معاشیات کول کے الفاظ میں یوں کی جاسکتی ہے "سرمایہ داری وہ ترقی یافتہ نظام پیدائش دولت ہے جو منافع اندوزی کیلئے ذرائع پیدائش کی خانگی ملکیت پر مبنی ہوتا ہے" چونکہ مٹھی بھر سرمایہ داروں کی

تعداد ملک کے تمام ذرائع پیدائش کی مالک ہوتی ہے اور ملک کی زیادہ سے زیادہ آبادی مزدور کی حیثیت سے اپنا گذارہ کرتی ہے تاکہ برا بھلا انکا اور انکے اہل وعیال کا گذارا ہو سکے۔ اس لئے ملک کی مادی خوشحالی میں ناہمواری اور ضروریات زندگی کی تکمیل میں عدم توازن کا پایا جانا ضروری ہے۔ سرمایہ دار طبقہ محنت نہ کرتے ہوئے بھی عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ اور مزدور طبقہ جو مظلوم طبقہ ہوتا ہے سرمایہ دار طبقہ کے لئے زیادہ سے زیادہ سامان تعیش پیدا کرتے ہوئے بھی اپنی ضروریات زندگی کیلئے محتاج ہوتا ہے اور اپنی آمدنی میں اضافہ کی خاطر اپنے کم سن بچوں اور عورتوں کو محنت کرانے پر مجبور ہوتا ہے اس مجبوری کی وجہ سے ملک کی آبادی کے بڑے حصہ میں معاشرتی اور خاندانی زندگی میں کئی نقائص پیدا ہو چکے ہیں یہ تقابلی مطالعہ ہمیں اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ دولت کی تقسیم میں عدم توازن شدت سے جاری ہے اس عدم توازن نے ایک چھوٹی سی تعداد کو خوشحال اور بڑی تعداد کو مصیبت زدہ اور دکھی بنا دیا ہے۔ اب یہ بہانہ تو نہیں تراشا جاسکتا کہ دولت زیادہ نہیں پیدا کی جاسکتی اور کثیر آبادی کی ضروریات کو پورا بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس قسم کا سبب اور نقص جاگیرداری نظام میں موجود تھا۔ دولت کے پیدائش کے طریقے اور آلات پہلے اتنے ترقی یافتہ نہیں تھے جسقدر کہ آج ہیں۔ چھوٹے پیمانہ کی صنعتیں رائج تھیں صنعتی انقلاب نے دنیا کی ہر جہتی زندگی میں تبدیلی پیدا کر دی "چھوٹے پیمانہ کی پیدائش کی جگہ" "بڑے پیمانہ کی پیدائش" نے لے لی ہے۔

مشینوں کی ایجادات نے پیدائش دولت کی تحدیدات کو یکسر مٹا دیا ہے۔ اگر دولت کی پیدائش کے ساتھ تقسیم دولت کو معاشی نظم کے ماتحت لایا جائے تو اس قسم کے نقائص کا نام ونشان باقی نہ رہے گا اور افلاس کا مسئلہ جو آج سوائے ایک ملک کے ساری دنیا میں پریشان کن ثابت ہورہا ہے اس کا بھی خاتمہ ہو جائیگا۔

اس زمانہ میں تو افلاس کا تعلق دولت کی قلت سے نہیں بلکہ اسکی افراط سے وابستہ ہے چنانچہ ہزاروں ٹن گیہوں اس لئے برباد کیا جاتا یا تہہ آب کر دیا جاتا تھا کہ زائد پیداوار کے سبب تجارتی نفع اندازی متاثر نہ ہو اور بازاری قیمتیں گرنے نہ پائیں آج دنیا کی دوسو کروڑ سے زیادہ آبادی

نکبت کی حالت میں اپنے زندگی کے دن پورے کر رہی ہے۔ اسکے برخلاف بعض ممالک میں دولت کے چشمے اُبل رہے ہیں ہر چہارم آدمیوں میں ایک موٹر نظر آتی ہے اسکے برخلاف بعض ممالک میں روزانہ آمدنی کافی کس اوسط ۲؍ آنے سے زیادہ نہیں ہے۔ بعض وقعۃً زاید پیداوار کی کھپت کے سلسلہ میں جنگ بھی ضروری ہو جاتی ہے" سرمایہ دارانہ طریق پیدائش کا مقصد صرف نہیں ہوتا بلکہ نفع اندوزی ہوتا ہے۔ حالانکہ پیدائش کا مقصد ہی صرف ہے۔ معاشی نظم کے نہ ہونے کی وجہ سے ضروریات زندگی سے زیادہ سامان تعیش کی طرف توجہ دی جاتی ہے کیونکہ سامان تعیش کے پیدا کرنے میں نفع اندوزی کے مقصد میں کامیابی ہوتی ہے۔

ہر صنعتی ملک میں آبادی دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ ایک سرمایہ دار دوسرا مزدور اور معاشی زندگی میں سرمایہ دار اور مزدور کی جنگ جاری ہے ایک کا معیار رہائش بلند ترین اور دوسرے کا اسی نسبت سے پست ترین ہوتا ہے کیونکہ سرمایہ داری نظام کا انحصار منافع پر ہوتا ہے اور منافع اجرتی محنت کا نتیجہ ہوتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کی استواری کاروبار کی آزادی سے قائم ہے۔ جسکی وجہ سے دولت کی پیدائش کسی نظم کے بغیر ہوئی ہے۔ جسکی وجہ سے زاید پیداوار کی زیادتی ہوتی ہے یہ دولت اپنے ملک میں نہیں کھپ سکتی۔ کیونکہ ملک کی آبادی کی ایک کثیر تعداد کا معیار رہائش پست ہوتا ہے۔ ان کی قوت خرید کم ہوتی ہے۔ اس لئے سرمایہ دار ممالک کے لئے ضروری ہے کہ مال کی نکاسی کیلئے کہیں باہر بازار پیدا کریں تمام کرۂ ارض کے سرمایہ داروں کو اپنی پیداوار کیلئے ایک برابر بڑھتے رہنے والے بازار کی ضرورت ہوتی ہے قدیم اور مروج صنعتیں برباد کی جا چکی ہیں اور جو باقی ہیں وہ برباد کی جا رہی ہیں۔ ان کی جگہ جدید صنعتیں رائج کی جا رہی ہیں یہ صنعتیں نہ صرف اپنے ملک کی خام پیداوار کام میں لاتی ہیں بلکہ دور دراز ممالک کی خام پیداوار بھی چاہتی ہیں۔ اور پیدا آوری کی کثرت کے سبب اشیا کی کھپت ان کے ہی علاقہ میں نہیں بلکہ دنیا کے گوشہ گوشہ میں ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اسی نوبت پر صنعتی ممالک لوٹ کھسوٹ شروع کر دیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں نو آبادیات بنائی جاتی ہیں آزاد ممالک کو غلام بنایا جاتا ہے۔ اور کئی آزاد

قوتیں برباد کردی جاتی ہیں تاکہ اپنے مال کی زیادہ سے زیادہ کھپت ہو سکے۔ اس سطح پر ملک کے سرمایہ دار اسی کوشش میں رہتے ہیں۔ ان میں مقابلہ کا شروع ہونا ناگزیر ہو جاتا ہے اب اندرون ملک مقابلہ بڑی حد تک کم ہو گیا ہے اور اجارہ داری نے جنم لیا ہے لیکن اب بین الاقوامی مقابلہ شروع ہو گیا ہے۔ بیرونی ممالک مقابلہ میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے کئی طریقے اختیار کرتے ہیں۔ ایک عام طور سے زیادہ عمل میں آنے والا طریقہ (DUMPING) کا ہے۔ اس تدبیر سے کسی صنعتی ملک کا مال اندرون ملک تو مہنگے داموں فروخت ہوتا ہے لیکن بیرونی بازاروں میں مقابلہ میں کامیابی کے حصول کی خاطر ارزاں داموں پر فروخت ہوتا ہے۔ بیرونی بازاروں میں سامان تجارت کی ارزانی ہی وہ ذریعہ ہے جسکے زور سے سرکش قوتوں کو بھی اطاعت پر مجبور کیا جاتا ہے۔ بیرونی بازاروں کے حصول کے باوجود ملک کی معاشی ابتری ویسی ہی رہتی ہے۔ کیونکہ بیرونی ممالک سے فائدہ حاصل کرنے والا سرمایہ دار طبقہ مٹھی بھر ہوتا ہے اور ملک کے مزدوروں کے مسائل لاینحل ہی رہتے ہیں ان سرمایہ دارانہ ممالک کو اب دو قسم کی مخالفانہ جد و جہد سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ ایک تو نوآبادیوں اور مقبوضہ ممالک کی جنگ آزادی اور دوسرے خود آزاد ممالک کے مزدوروں کی جد و جہد۔ مزدوروں نے اجتماعی قوت کا احساس کر لیا ہے۔ چنانچہ وہ اب منافع کے دعویدار ہو رہے ہیں۔ کم سے کم کام کے گھنٹوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔ مختلف قسم کے آسایشوں کی مانگ کی جاتی ہے۔ سرمایہ اور محنت کا یہ تصادم اسوقت تک جاری رہیگا جب تک کہ مزدوروں کو ان کا پورا پورا حق نہ مل جائے اور سرمایہ داری کا خاتمہ نہ ہو جائے۔ مزدوروں کی جد و جہد ہڑتالوں کی صورت میں نمودار ہوتی ہے اور بے چینی پیدا ہوتی ہے لیکن اس بے چینی میں اس وقت اور بھی اضافہ ہوتا ہے جبکہ چند چند سال کے وقفہ سے معاشی کساد بازاری آتی ہے سرمایہ دار معاشی کساد بازاری کے مقابلہ کیلئے مزدوروں کی اجرت گھٹا دیتے ہیں کارخانے بند کر دیتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں طبقاتی منافرت میں اور بھی شدت پیدا کر دیتے ہیں اور دوسری طرف بیرونی بازاروں کے حصول کیلئے صنعتی ممالک میں جو مقابلہ پیدا ہوتا ہے وہ اکثر دفعہ جنگ کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور ہر چند سالوں کے بعد نوع انسانی کو جنگ کی ہولناکیوں میں مبتلا ہونا پڑتا ہے۔

سرمایہ داری جب ترقی کر کے سامراجی منزل پر پہنچ جاتی ہے تو دو قسم کے معاشی تضاد پیدا ہوتے ہیں۔ ایک تو اندرون ملک اور دوسرے بیرون ملک۔ اندرون ملک اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ مزدور اپنے حقوق حاصل کرنے کیلئے مزدور سبھاؤں اور ٹریڈ یونین کے ذریعہ سیاسی قوت حاصل کرنا چاہتے ہیں چنانچہ اب دیکھا جاتا ہے کہ ہر ملک کی سیاسی جماعتوں میں ایک مزدور جماعت بھی ہوتی ہے روس میں ان کی کوشش بار آور ہو چکی ہیں۔

اکثر ممالک بیرونی مقابلہ سے بچنے کیلئے آپس میں نفع حاصل کرنے کے معاہدے کر لیتے ہیں اندرون ملک کے تنازعوں کو جو آجر اور مزدور کے باہمی جھگڑوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں کم کرنے کیلئے سرمایہ دار مزدوروں کی اجرت میں برائے نام اضافہ کرتے ہیں۔ اوقات کار میں تخفیف یا کمی کرتے ہیں ہزاروں مزدوروں میں سے صرف چند سو کیلئے مکانات بنائے جاتے ہیں۔ اور حکومتیں قوانین وضع کر کے اسکی تلافی کرنے کی سعی کرتی ہیں لیکن ان جزوی تبدیلیوں سے بڑی کمزوریاں کسطرح کم ہو سکتی ہیں کیونکہ مذکورہ بالا تبدیلیوں کے باوجود محنت کا استحصال باقی رہتا ہے۔

بیرون ملک کے مقابلہ سے جو تنازعات کاریاں جنگ کی شکل میں نمودار ہوتی ہیں۔ انکو کم کرنے کیلئے اور امن کے قیام کیلئے مجلس اقوام کی بنیاد ڈالی گئی لیکن اسکی کوششیں کارگر نہیں ہوئیں۔

غرض یہ تدابیر بنیادی نقائص کو دور نہ کر سکے ان امور سے تو اندرون ملک کے معاشی حالات پر تو پردہ ڈالا جا سکتا ہے لیکن یہ نابود ہونے نہیں پاتے۔

جب تک سرمایہ دارانہ نظام کے یہ تضاد باقی ہیں دنیا آزادی مساوات اور حقوق کے سنہرے الفاظ کو شرمندۂ معنیٰ نہیں دیکھ سکتی۔

غرض اکثر جماعتیں فی الحال سرمایہ دار طبقہ سے برسرِ جنگ ہیں لیکن ان میں مزدور پیشہ جماعت ہی حقیقی انقلابی جماعت ہے۔

رہا ادنیٰ اور متوسط طبقہ جس میں چھوٹے چھوٹے دستکار اور سرمایہ دار شریک ہیں یہ اس لئے اس جد و جہد میں شریک ہے کہ وہ متوسط طبقے کے رکن ہونے کی وجہ سے اپنی حیثیت برقرار

رکھ سکیں یہ جماعتیں قدامت پسند ہوا کرتی ہیں۔

ویسے بھی سرمایہ دارانہ نظام معیشت اپنی کمزوریوں کی وجہ سے زندگی کے آخری مراحل طے کر رہا ہے۔ جن ممالک میں اسکو پارلیمانی جمہوریت میں پناہ نہ مل سکی وہاں اس نے فسطائیت اور قومی اشتراکیت کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اس میں معاشی نظام بالکلیہ سرمایہ دارانہ طریق پر استوار نہیں کیا جاتا اس میں خانگی ملکیت کو تو برقرار رکھا جاتا ہے لیکن معاشی قانون اور نظم حکومت کی نگرانی میں ہوتا ہے۔ اشیاء پر نگرانی اور قیمتوں پر قابو حاصل کر لیا جاتا ہے یہاں مزدور اپنی تنظیم نہیں کر سکتے۔

موجودہ جنگ ان ہی نقائص کا مظاہرہ ہے اگر فسطائیت کو فتح ہوئی تو پھر سرمایہ دارانہ نظام اپنی پوری قباحتوں کے ساتھ دنیا میں موجود رہیگا۔ اور اگر اتحادین کو فتح ہوئی تو اس نظام کا زوال لازمی ہے کیونکہ اتحادین میں روس اور چین جیسے ترقی پسند ممالک اور امریکہ و برطانیہ کے ترقی پسند عوام مقبوضہ ممالک کے عوام کے ہمدردیوں کے ساتھ شریک ہیں۔

روس نے معاشی سود و بہبود کا ایک اچھا نمونہ پیش کیا ہے۔ جہاں سرمایہ دارانہ نظام کے سارے نقائص مفقود ہیں۔ یہاں دولت کی پیدائش کا مقصد صرف ہے یہاں نہ تو آجر و مزدور کے تنازع ہیں نہ تقسیم دولت کی عدم مساوات نہ تو مقابلہ کی برائیاں ہیں اور نہ سامراجی لوٹ کھسوٹ کی حرص۔ یہاں وہ سارے مسائل ناپید ہیں جن سے انسانیت میں افلاس، بیروزگاری اور معاشی بحران اور سامراجی لوٹ کھسوٹ کی مصیبتیں پیدا ہوتی ہیں۔

بعض ممالک میں جن میں روس بھی شریک ہے "معاشی خود کفالت" کی حکمت عملی باوجود مخالفتوں کے مسلمہ ہو چکی ہے۔ چنانچہ جرمنی نے اپنے "چار سالہ لائحہ عمل" کے ذریعہ اور روس نے "پنج سالہ لائحہ عمل" کے ذریعہ کوشش کی کہ قومی ضرورتوں کے حد تک اپنے ملک کو کسی دوسرے ملک کا محتاج نہ رہنے دیا جائے۔ معاشی نظم کو بے ترتیبی سے چلانے کے بجائے منظم کر دیا جائے اور تجارت و صنعت کی حد تک آزاد مسابقت کی جگہ تامین اور حفاظت کا اصول رائج کیا جائے۔ اس حکمت عملی سے بعض وقعہ جنگ کا خطرہ لاحق ہوتا ہے

غرض تمدن انسانی میں انتشار پیدا ہے۔ لیکن روس کی مثال نے دنیا کو دو راہے پر پہنچا دیا ہے۔ ایک تو تباہی اور بربادی کا دوسرا آزادی اور خوشحالی کا۔ اب انسانیت کو کسی ایک راستہ پر چلنا ہوگا۔

بلاشبہ مزدوروں کا میلان تو آزادی اور خوشحالی کے راستہ کی طرف ہوگا لیکن ان کے برخلاف مٹھی بھر سرمایہ داروں کا میلان جلب منفعت کی طرف رہنمائی کریگا۔ لیکن جسطرح اقتداری نظام نے جاگیردارانہ نظام کو اور جاگیردارانہ نظام نے سرمایہ دارانہ نظام کو ابھارا اسی طرح سرمایہ دارانہ نظام کو ایک ایسے نظام کیلئے جگہ خالی کرنی ہوگی جنمیں سرمایہ داری کی ساری قباحتیں نابود ہوں۔

غرض انسانیت کو ساری معاشی قباحتوں سے بچانے کیلئے زندگی اور تمدن کے شعبہ میں ایک جدید نظم کی ضرورت ہے جس میں قومی حدود کے اندر اپنے مسائل کو نہ سلجھایا جائے بلکہ ایک بین الاقوامی خیال اور انسانیت کی خاطر سوچ بچار کیا جائے۔

کاشتکار اور مچھلیاں

از جناب محمد رحیم اللہ صاحب ام ایس سی مہتمم سررشتہ مسکیات

اس مختصر مضمون میں اس بات کو بتانے کی کوشش کیگئی ہے کہ کسطرح کسان مچھلیوں کی صحیح اصول پر پرورش کر کے خود مستفید ہو سکتے اور ملک کو ایک عمدہ غذا کی فراہمی میں مدد دیسکتے ہیں۔

کاشتکاروں کا تعلق مچھلیوں سے بالکل قریبی ہے اسلئے کہ وہ کھیتی باڑی کے ساتھ ساتھ آسانی سے اُنہیں پال سکتے ہیں خصوصاً ایسے اضلاع میں جہاں پانی کی افراط ہے۔ نظام آباد اور میدک میں نظام ساگر اور پوچارم کی نہروں کی وجہ سے پانی آسانی کے ساتھ ملتا ہے۔ چاول کی کاشت اکثر دوسرے اضلاع میں بھی ہوتی ہے۔ کھیتوں میں پانی کئی مہینوں تک جمع رہتا ہے اور اُسکے بعد خارج کردیا جاتا ہے ذرا سی محنت اور توجہ سے کھیتوں کے ایسے حصوں میں جو سب سے نیچے ہوں چند گڑھے بنا دیئے جاسکتے ہیں جہاں بیکار پانی جمع ہوتا رہے۔ اس پانی میں مرل کے بچے چھوڑ دیئے جائیں اور اس بات کا خیال رہے کہ پانی کے پودے اور چند بیلیں بھی پانی میں موجود رہیں تو سال کے ختم تک کافی مقدار میں مچھلی دستیاب ہوسکیگی۔ یہ مچھلی کسان اپنی غذا کے طور پر استعمال کرسکتے ہیں اسکی شدید ضرورت ہے کہ کسانوں کو مچھلی یا اسی قسم کی کوئی غذا وقتاً فوقتاً ملتی رہے۔ وجہ یہ ہے کہ ان غریبوں کی غذا جوار۔ پیاز اور معمولی چٹنی ہوتی ہے جسمیں چند غذائی اجزاء زیادہ تر موجود نہیں ہوتے۔ اگر کوئی حیوانی غذا بھی اُنکو کبھی کبھی ملتی رہے تو تندرستی کے لئے زیادہ بہتر ہوگا۔

مرل یا دوسری مچھلیوں کو پکاتے وقت اس بات کا خیال رکھا جائے کہ اُنکے جگر کو نکال کر باہر نہ پھینکدیں بلکہ پتہ کو جو گہرے نیلے رنگ کا ہوتا ہے علیحدہ کر کے جگر کو مچھلی کے ساتھ ہی پکائیں۔ جگر میں تیل ہوتا ہے جسکے اندر حیاتین الف کی کافی مقدار رہتی ہے اور خود مچھلی کے جسم میں حیاتین ح موجود ہے اسطرح دو اہم غذائی اجزاء تھوڑی سی مچھلی کھانے سے حاصل ہوسکتے ہیں۔

مرل مچھلی ہمارے ملک میں ہر جگہ پائی جاتی ہے اور اگر اسے ملک کی دولت کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ یہ آسانی کے ساتھ پالی جاسکتی ہے اور اسکی افزائش بھی اسلئے مشکل نہیں کہ یہ ہر کنٹہ یا گڑھے میں انڈے دیتی ہے۔ اسکے بچے اپریل اور ستمبر یا اکتوبر سال کے دو موسموں میں نکلتے ہیں اور آسانی کے ساتھ خریدے جاسکتے ہیں یا اگر کسان تھوڑی سی جستجو کریں تو خود بھی کنٹوں اور تالابوں سے جمع کرسکتے ہیں اسلئے کہ مرل ہمیشہ کم پانی میں کنٹوں کے کنارے گھانس کو جمع کرکے گھر بناتی اور اسمیں انڈے دیتی ہے۔ باروری کے بعد ان میں سے بچے نکلتے اور گھر میں اسوقت تک رہتے ہیں جبتک کہ وہ اپنی غذا آسانی کے ساتھ فراہم کرنے کے قابل نہ ہوں۔ تھوڑی مدت تک مادہ بچوں کی حفاظت کرتی اور بچوں کے ساتھ ساتھ رہتی ہے۔ گاؤں میں مچھلی پکڑنے والے اور دوسرے لوگ اس بات سے بخوبی واقف ہیں اور اس سے فائدہ بھی اٹھاتے ہیں۔ پھوں مرل کے بچے سرخ رنگ کے اور کالی مرل کے سرخی مایل سیاہ ہوتے ہیں۔ ڈھوک کے بچے سیاہ ہوتے ہیں۔

علاوہ مرل کے دوسری مچھلیاں بھی آسانی کے ساتھ پالی جاسکتی ہیں مثلاً سنگھی اور معروف ان مچھلیوں کے گوشت میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ چربی کم ہونے کی وجہ سے یہ آسانی کے ساتھ ہضم ہوجاتا ہے اور ایک خاص قسم کا غذائی جزو موجود ہوتا ہے جسکو لائیسن کہتے ہیں اسکی وجہ سے کمزور اور مریض بہت جلد طاقت حاصل کرتے ہیں۔

جن کھیتوں میں نہر سے پانی آتا ہے اُن میں پانی کے ساتھ ساتھ مچھلی کے بچے بھی آتے ہیں اگر گڑھے بناکر زاید پانی کو محفوظ کرلیا جائے تو یہ بچے بڑے ہوکر آمدنی کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ رُدہو کے بچے نہر کے پانی میں بکثرت ملتے ہیں۔ ایک دوسری مچھلی ہے جسکو کتلا کہتے ہیں یہ گاؤں میں بوچی کے نام سے مشہور ہے۔ مانجرا ندی میں بکثرت ملتی ہے اگر اس مچھلی کے بچے جمع کرکے ایسے کنٹوں میں ڈال دئیے جائیں تو سال بھر میں تقریباً ایک فٹ تک بڑھ جائینگے۔

یہ امر اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب پانی کھیتوں میں داخل ہوتا ہے تو جگہ جگہ ٹوکری نما پھندے لگا دئیے جاتے ہیں جنمیں بکثرت مچھلی کے بچے پھنس جاتے ہیں اور اس طرح وہ لاکھوں کی تعداد میں

برباد ہوتے ہیں۔ اگر ان کو بڑھنے دیا جائے تو یہ تھوڑے عرصہ میں بڑے ہوکر زیادہ فائدہ مند ہونگے۔ ایسی ایک مچھلی ایک چھوٹے خاندان کیلئے کافی ہوگی۔ کسانوں کی لاعلمی یا ان کے افلاس کی وجہ ہے کہ وہ ہر اُس چیز کو غنیمت سمجھتے ہیں جو انہیں فوراً ملجائے۔ اس بات کو واضح کردینا ضروری ہے کہ بچوں کو پکڑکر برباد کرنا نقصان رساں ہے اور تھوڑے عرصہ تک صبر کرنے سے زیادہ فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔

صرف ایک مثال کے ذریعہ یہ بات صاف ہوجائیگی۔ اگر مرل کے بچے ایک ہزار کی تعداد میں چھوڑے جائیں تو خریدی میں صرف پانچ روپے صرف ہونگے۔ سال بھر کے بعد ان کو پکڑکر فروخت کریں تو کم از کم ڈھائی سو روپیہ حاصل ہوسکتے ہیں۔ اسی طرح کھلا اور رُوہو مچھلی سے بھی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

اس وقت یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ کسانوں کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ مچھلی کے بچے جمع کریں۔ اسکے لئے حکومت کی معمولی توجہ سے انتظام ہوسکتا ہے اور وہ اسطرح کہ جس جگہ یہ بچے بکثرت دستیاب ہوتے ہیں وہاں سے پکڑکر کاشتکاروں کو سستے داموں دئیے جائیں یا اگر کچھ سرکاری امداد مل سکے تو شروع میں مفت بھی دئیے جائیں۔ موزوں مقامات پر "فشس فارم" یا ایسے کنٹے بنائے جائیں جہاں مختلف قسم کی مچھلیوں کے بچے جمع کئے جاسکیں اور ہر وقت ضرورتمند اشخاص کو فراہم کئے جاسکیں۔

اس کام کو اگر بڑے پیمانہ پر کیا جائے تو زاید از ضرورت مچھلیاں فروخت بھی کیجاسکتی ہیں یا کوشش کیجارہی ہے کہ ہر ضلع کے تعلقوں میں مچھلی والوں کی انجمنیں بنائی جائیں جو مقامی مارکٹ کو مچھلیوں کی حد تک اپنے ہاتھ میں رکھیں اور زاید مقدار کو باہر بھیجنے کی کوشش کریں۔ حیدرآباد شہر میں ایسی ایک انجمن بن چکی ہے جو زاید مچھلیوں کو خرید کر فروخت کا انتظام کریگی اور اسطرح کسانوں کی آمدنی میں بغیر کسی زیادہ محنت کے اضافہ ہوسکیگا۔

اب یہ سوال بھی پیدا ہوگا کہ جب پانی جگہ جگہ بھرا رہیگا تو لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مچھر زیادہ تعداد میں

پیدا ہونے لگیں گے۔ قدرت نے ایسی مچھلیاں پیدا کی ہیں جو مچھر کے بچوں کو کھا کر پانی کو صاف کر دیتی ہیں۔ یہ پرکلیاں ہیں۔ ان کے علاوہ گیمبوسیہ ایک چھوٹی مچھلی ہے جسکو اگر کافی تعداد میں پانی میں چھوڑ دیا جائے تو ملیریا کا انسداد ایک حد تک کر سکتی ہیں۔ پانی جب خشک ہوگا تو یہ گڑھوں میں جمع ہوجائینگی اور جب پانی آئیگا تو پھیل کر پھر اپنا مفید کام شروع کر دینگی۔ اسطرح بغیر کسی زائد خرچ کے یہ مشکل بھی آسان ہوسکتی ہے۔

باؤلیوں کیلئے ایسی دوسری قسم کی مچھلیاں فراہم کیجا سکتی ہیں جو آسانی کے ساتھ اپنی افزائش کر سکیں۔ یہ اُسی وقت زیادہ تعداد میں مہیا ہوسکینگی جبکہ اضلاع میں "فش فارم" تیار ہوں اور کافی تعداد میں انکی افزائش کرکے بچے تقسیم کرنے کیلئے جمع ہوسکیں۔ مرل عام طور پر باؤلیوں میں افزائش نہیں کرتی اور اس کا زیادہ دن تک زندہ رکھنا بھی مشکل ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ مرل جب باؤلیوں میں چھوڑی جاتی ہے تو تھوڑے عرصہ کے بعد اس کا سر بڑا اور جسم پتلا ہونے لگتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو غذا کافی نہیں ملتی۔ رفتہ رفتہ یہ مرجاتی اور باؤلیاں خالی ہوجاتی ہیں۔ اسکی غذا مینڈک، مینڈک کے بچے اور چھوٹی مچھلیوں پر مشتمل ہے جنکی فراہمی ہر وقت ممکن نہیں۔ باؤلیوں کے لئے ایسی مچھلیوں کا انتخاب ہونا چاہیئے جنکی غذا آسانی کے ساتھ فراہم ہوسکے اور یہ اپنی افزائش بھی کر سکیں ایسی ایک مچھلی ایٹروپلس ہے جسکو پیتل کس بھی کہتے ہیں یہ نباتات خوار ہے اور تیل کی کھلی پر بھی پالی جاسکتی ہے۔ اسمیں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ نمکین پانی میں بھی رہ سکتی ہے جہاں دوسری مچھلیاں آسانی کے ساتھ نہیں رکھی جاسکتیں

مچھلیوں کی کھاد بھی بنائی جاسکتی ہے لیکن یہ اُسوقت ہی ممکن ہے جبکہ کافی مقدار میں چھوٹی مچھلیاں مل سکیں۔ یہ کھاد پھل کے درختوں کیلئے نہایت کارآمد ہے۔ زائد مچھلی کو آسانی کے ساتھ سکھا کر بعد میں بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

غرض مچھلیوں کی پرورش کسان کے لئے نہ صرف اچھی غذا ہی فراہم کر سکتی ہے بلکہ آمدنی کا ذریعہ بن سکتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ایسی بیماریاں مثلاً ملیریا اور نارو کا بھی انسداد کر سکتی ہے جو گاؤں والوں اور حکومت کے لئے ایک اہم مسئلہ بنی ہوئی ہیں۔

تنقید و تبصرہ

ہماری ریلیں اور سڑکیں

مصنفہ ڈاکٹر جعفر حسن صاحب۔ ریڈر شعبۂ عمرانیات جامعۂ عثمانیہ۔ شایع کردہ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی سنہ ۱۹۴۱ع۔ حجم ۱۲۸ صفحات۔ قیمت عہ۔ لکھائی چھپائی بہترین۔

اٹھارویں صدی عیسوی انجنیری اور سائنٹفک ذہانت کے لحاظ سے امتیازی شان رکھتی ہے۔ اس دور میں ہمیں اکثر موجد ایسے ملتے ہیں جن کی ابتداء معمولی کاریگر سے ہوئی لیکن آگے چل کر مختلف کلوں کی ایجاد کا باعث بنے۔ بھاپ کی قوت کے اثرات انقلابی ثابت ہوئے۔ آب و ہوا، موسمی تبدیلیاں اور دوسرے جغرافیائی حالات سے متاثر ہوئے بغیر اس کے ذریعہ مختلف کام لینے کا امکان پیدا ہوگیا۔ کارخانوں کو چلانے اور تجارتی اشیاء کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہونچانے کے لئے اس کا استعمال ضروری ہوگیا۔ اس کے ذریعہ نقل و حمل میں بھی ترقی حاصل ہوئی۔ نوآبادیات سے خام پیداوار فراہم کرنے میں سہولت ہوگئی اور یوروپی مصنوعات کی کھپت ان نوآبادیات میں خوب ہونے لگی بہرحال سیاست اور معشیت پر بھاپ کی قوت کی حکمرانی انیسویں صدی عیسوی کے ختم تک ظاہر ہوگئی تھی۔

ان حالات کے تحت ہندوستان میں بھی ریل جاری کرنے کا خیال سب سے پہلے منچسٹر کے انگریز تاجروں کو ہوا چنانچہ انہوں نے بعض انجنیروں اور کاروباری واقفیت رکھنے والوں کو اس غرض سے ہندوستان روانہ کیا کہ وہ اندرون ملک ریلوں کی تعمیر اس کی افادیت اور کاروباری نقطۂ نظر سے اپنی رائے پیش کریں۔ چند سال بعد ہندوستان میں ریلوں اور اس کے ساتھ جدید سڑکوں کی تعمیر سے عمرانی اور معاشی تغیرات رونما ہونے لگے۔ چنانچہ زیر تبصرہ کتاب میں ان ہی تغیرات و حالات سے بحث کی گئی ہے۔

حیدرآباد میں تعلیم یافتہ اشخاص کی تعداد میں خاصہ اضافہ ہوگیا ہے لیکن ابھی تک ہمارے مصنف اور انشاپرداز ادب لطیف افسانوں یا شعر شاعری پر قلم اٹھاتے ہیں اور زندگی کے اہم اور روزمرہ کے مسائل

بہت کم روشنی ڈالی جاتی ہے۔ ڈاکٹر جعفر حسن صاحب نے ہندوستان کے ذرائع نقل پذیری پر تبصرہ کرکے بہت بڑی ضرورت کو پورا کیا اور راستہ بنایا ہے اس سے معاشیات اور عمرانیات میں ایک نیا اور ترقی پذیر اردو ادب پیدا ہو سکیگا۔

اس کتاب میں سب سے پہلے باب میں سڑکوں کی تاریخی سرگزشت اور تدریجی ترقی بیان کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ انسانی زندگی کے بالکل ابتدائی دور میں وہ پیدل آتا جاتا اور سامان اپنے سر پر اٹھا کر لاتا لیجاتا تھا۔ اسکے بعد بار برداری کیلئے جانوروں کو استعمال کرنا شروع کیا پھر ٹھیلے بنے اور ٹھیلوں کے بعد چھکڑے۔ جیسے جیسے چھکڑوں کا رواج بڑھتا گیا راستے کشادہ ہوئے۔ تہذیب و تمدن میں انسان نے ترقی کی۔ بڑی بڑی ریاستیں وجود میں آئیں اور ان ریاستوں نے یا تو اپنے نظم و نسق کی سہولت کیلئے یا خدمت خلق کے جذبہ کے تحت سڑکیں بنائیں۔ اس کتاب میں مہاراجہ اشوک کے زمانہ سے سڑکوں کی تعمیر کی تاریخی سرگذشت اجمالی طور سے بیان کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں ابن بطوطہ اور البیرونی وغیرہ سیاحوں نے ہندوستان کی سڑکوں اور راستوں کے جو حالات قلمبند کئے ہیں اسکی کچھ تفصیل بیان کی جاتی تو کتاب کی خوبی میں مزید اضافہ ہو جاتا نیز تلاش سے تاریخ کی فارسی کتابوں سے بھی بہت کچھ مواد ملتا۔ اول تو تاریخ کا قدیم سلسلہ بیان کرنا ہی نہیں تھا لیکن جب اس پر قلم اٹھایا گیا تو انصاف کا حق ادا کرنا تھا۔

دوسرے باب میں ہندوستان کی "آب راہیں" پر بحث کیگئی ہے۔ علمی کتابوں میں جذبات کا اظہار نامناسب ہے معاشیات کی کتابوں میں حالات، واقعات اور اعداد و شمار اس ترتیب و اسلوب سے بیان کر دینا کافی ہے کہ جس کے پڑھنے والا خود بخود گذشتہ زمانہ کی یاد تازہ کرلے، عبرت حاصل کرے یا جوش عمل پیدا کرے۔ حالات اور واقعات اور اعداد و شمار سے بڑھکر صرف الفاظ سے جوش عمل پیدا کرنا ہو تو مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان میں صنعت جہاز سازی جس ترقی پذیر حالت میں تھی اس کے حالات مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کی کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" سے بھی معلوم ہو سکتے ہیں اور دوسرے ماخذ بھی ہیں۔ سیٹھ وال چند ہیرا چند کی توجہ سے قدیم جہاز رانی اور جہاز سازی کا جو مواد مہیا ہو گیا ہے اس سے استفادہ کرنا ہر اس شخص کے لئے ضروری ہے جو اس موضوع پر قلم اٹھائے۔ قابل مصنف نے ان امور کو یہ کہکر بالکل ہی نظر انداز فرما دیا ہے کہ عام کتابوں میں ہماری قدیم جہاز رانی اور جہاز سازی کے متعلق کچھ نہیں لکھا ہے سیٹھ وال چند نے اپنی تقریر میں جو وائزیگ میں جہاز سازی کے کارخانے کے افتتاح کے موقع پر کی تھی۔ یہ کہا تھا کہ انگلستانی بحریہ تک کیلئے جہاز ہندوستان میں

ہندوستانی کاریگر تیار کرتے تھے پھر یہ زوال کا زمانہ تھا۔ عروج کے وقت کیا حالت ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب تلاش اور جستجو فرماتے تو کیا یہ باب اور پہلا باب یوں تشنہ اور جذبات کے اظہار کا ذریعہ ہو کر نہ رہ جاتے نیز بالخصوص دوسرے باب میں بلا حوالہ دیئے جو قیاسات قائم کرلئے ہیں وہ بہت کچھ تحقیق کے محتاج ہیں۔ اسی باب میں ہندوستان میں بانی کے راستوں کی موجودہ حالت بیان کی گئی ہے اور امیدیں وابستہ کی گئی ہیں کہ ہندوستان میں صنعت جہاز رانی کو ترقی ہوگی۔ درمندولوں میں قوت عمل پیدا ہوگی اور ہندوستان کی جدید اصلاح و تجدید میں اس صنعت کو اس کی اہمیت کے شایان شان جگہ دینے کی کوشش عمل میں آئے گی۔

کتاب کے ابتدائی ابواب میں مولانا حالی اور شاعر اسمٰعیل کے اشعار سے بھی اس کتاب کو زینت دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ حالانکہ ڈاکٹر صاحب موصوف ہمیشہ نصیحت کیا کرتے ہیں کہ معاشیات یا عمرانیات سائنٹفک علوم ہیں ان میں شعر و شاعری نہ ہونا چاہیئے اور علمی شان تو یہی ہے کہ مبالغہ آمیز باتوں سے گریز کیا جائے اور حقیقت حال بلا کم و کاست لکھ دی جائے۔

زیر نظر کتاب کے تیسرے باب میں ریل کی ایجاد رواج اور ترقی پر بحث کی گئی ہے اور اس امر پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ یورپ اور امریکہ میں ریلوں کے جاری کرنے میں کن کن دقتوں اور مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔

چوتھے باب میں ہندوستان میں ریلوں کی سرگذشت اور موجودہ حالت و کیفیت ۳۹-۱۹۳۸ء تک تحریر کی گئی ہے لیکن ساری بحث سرسری ہے اور ایک بات سے دوسری بات اس طرح پیدا کی گئی ہے کہ بیان میں تسلسل قائم نہیں کہا جاسکتا ہے۔

پانچویں باب میں ہمارے ہوائی راستوں پر روشنی ڈالی گئی ہے لیکن یہ باب بہت ہی مختصر اور زیادہ تر ہوائی جہاز کی ایجاد کی تاریخ اور دوسرے ملکوں کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس باب کے آخر میں حسرت کے ساتھ یہ صحیح کہا گیا ہے کہ "جس طرح چھکڑے اور بہلیاں ہماری ہیں اس طرح نہ تو طیارے ہمارے ہیں نہ ریلیں ہماری ہیں ملک اور نام ہمارا ہے کام اور فائدہ غیروں کا ہے"!!

چھٹے باب میں جدید ذرائع حمل و نقل کی اہمیت کے ساتھ ساتھ سیاسی استحکام و سیاسی تنظیم قومیت، بین قومیت اور بین صوبہ واریت پر عمرانیاتی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے۔

ساتویں باب میں جدید ذرائع نقل پذیری پر معاشی نقطۂ نظر سے غور کیا گیا ہے اور امور ذیل پر

روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۱) قومی اور بین الاقوامی تجارت کا فروغ (۲) خود اکتفائی کا خاتمہ (۳) صنعتی ملکوں کا فرق (۴) گھریلو صنعتوں کی تباہی (۵) کاشت اور دولت پیدا کرنے کے مقصد میں تغیر (۶) مسئلہ آبادی کی نوعیت میں تغیر (۷) قحط کی نوعیت میں تغیر۔ یہی اہم اور اساسی معاشی امور ہیں ان پر تبصرہ گو مختصر ہے مگر مفید ہے۔

آخری باب میں ریلوں کا تاریک پہلو دکھلایا گیا ہے کہ ہندوستان کیلئے ریلیں سرتاپا نعمت نہیں ہیں ان سے نقصانات بھی ہوئے ہیں مثلاً صنعتوں کی تباہی، قحطوں کی وسعت، گرانی اور دوامی نیم فاقہ کشی وغیرہ۔ بہرحال ریلیں ہندوستان کے لئے فائدوں اور مصیبتوں کا سرچشمہ ثابت ہوئیں۔

کتاب کے آخر میں شماریات نقل پذیری یعنی آمدورفت اور نقل وحمل کے بارے میں بعض دلچسپ اور سبق آموز اعداد وشمار دیئے گئے ہیں۔ ضمیمے میں سن وار جدید ذرائع نقل پذیری کی تاریخی سرگذشت (۱۷۰۷ء سے ۱۹۴۱ء) دلچسپ ہے۔

"ہماری ریلیں اور سڑکیں" ایک بڑا موضوع ہے۔ یہ چھوٹی سی کتاب معاشیات سے دلچسپی رکھنے والے اردو داں طبقہ کو مطمئن کرنے کے بجائے اور تشنہ کر دیتی ہے۔ کتاب میں مملکت آصفیہ کی ریلوں اور سڑکوں کے متعلق صرف چند اشارے کئے گئے ہیں۔ حالانکہ اس کی سخت ضرورت ہے کہ ہمارے مفکر اور ادیب اپنے ملک کی معاشیات پر قلم اٹھائیں۔ پھر جب کہ کتاب کی اشاعت بھی مملکت آصفیہ میں سرکاری سررشتوں کی سرپرستی سے ہوگی اور نیز جبکہ جامعہ عثمانیہ کی جانب سے سالانہ پچاس ہزار روپے سے انجمن ترقی اُردو کی امداد ہوتی ہے۔ زیر نظر کتاب میں حیدرآباد سے متعلق صرف حسب ذیل حوالے ہیں۔

(۱) گوداوری اور کرشنا جنوب کی ندیاں جہازرانی کیلئے بالکل ناموزوں ہیں۔

(۲) نظام اسٹیٹ ریلوے کا انتظام ریاست حیدرآباد کے تحت ہے۔

(۳) ۱۹۳۰ء میں بمبئی سے حیدرآباد، حیدرآباد سے مدراس آنے جانے کیلئے ہوائی جہاز کا باقاعدہ انتظام ہوگیا۔

(۴) ریاست حیدرآباد کے علاقہ مرہٹواڑی میں روئی کی کاشت بھی بہت بڑھ گئی۔

(۵) ہندوستان میں بالعموم اور حیدرآباد میں بالخصوص ترکی ٹوپی کا استعمال مسلمان بڑے شوق سے

کرتے ہیں۔ اکثر اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ یہ ٹوپیاں ترکی میں تیار ہوں اور ترکی ٹوپی خریدنے سے وہ بالواسطہ ترکی کو فائدہ پہنچا رہے ہیں۔

(۶) ریاست حیدرآباد ۸۲ ہزار چھ سو ۹۸ مربع میل ہے جس میں ۱۳۶۰ میل کی ریلیں اور آٹھ ہزار میل کی سڑکیں ہیں۔

(۷) حیدرآباد میں پچاس میل کی جدید وضع کی بے گرد کی سڑکیں موجود ہیں۔

توقع ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں مملکت آصفیہ کی ریلوں اور سڑکوں کے باب کا ضرور اضافہ کردیا جائیگا قابل مصنف نے اپنے مطالب کو واضح کرنے میں بہت کوشش کی ہے اور علمی اصطلاحات سے گریز کرکے مطالب کو عام فہم دلچسپ اور سبق آموز بنانے کی بھی کوشش کی ہے اگرچہ کہ بعض جگہ الفاظ غیر مانوس آگئے ہیں مثلاً منجھلی سڑک، آب راہیں، بند باندھنا وغیرہ یا بعض الفاظ دوسرے مفہوم میں استعمال ہوئے ہیں مثلاً بیرو کار۔ اپنے سیاق کے لحاظ سے صرف "بیرو" کافی تھا۔ بعض جگہ اردو کے بجائے انگریزی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں مثلاً دریائے سندھ کے بجائے انڈس اور صوبۂ متحدہ کے بجائے یو۔پی جو تھوڑی زحمت سے دور کئے جاسکتے تھے۔

مجموعی لحاظ سے کتاب کا مطالعہ نہ صرف مفید بلکہ اردو دان طبقہ کے لئے بہت ضروری ہے اس سے انہیں اس کا بھی اندازہ ہو جائے گا کہ علمی مطالب کے اظہار کی اردو زبان میں کسقدر گنجائش موجود ہے۔

چند اور امور کی وضاحت بھی نامناسب نہیں۔

(۱) الفاظ اور اشیاء کے نام ایسے استعمال ہونے چاہئیں جو کل ہندوستان میں بولے اور سمجھے جاتے ہوں یا اگر کسی خاص صوبہ کے الفاظ استعمال ہوں تو اس کے ساتھ دوسرے صوبہ میں استعمال ہونے والے الفاظ بھی لکھ دیئے جائیں مثلاً جہاں ٹھیلے، بہلیاں اور چھکڑے کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہاں ٹانگہ، جھٹکا، شکرام، کھاچر وغیرہ الفاظ کا استعمال بھی ضروری تھا۔

(۲) متن کتاب میں حوالے اسقدر کم ہیں کہ اس سے اس شخص کی رہبری نہیں ہو سکتی جو کسی خاص پہلو پر مزید مطالعہ کرنا چاہے

(۳) کتاب کے آخر میں حوالے کے لئے جن کتابوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اس پر صرف "ریلوے ادب" کا اطلاق ہوتا ہے خود سڑکوں کے متعلق بھی سوا ایک آدھ کتاب کے کسی اور کتاب کا حوالہ نہیں ہے نیز آب راہوں، جہاز سازی، ہوائی راستوں، تار برقی اور لاسلکی پر بھی کسی کتاب کا حوالہ نہیں ہے۔ متن کتاب میں حاشیہ پر جن کتابوں کا جو حوالہ ہے اس کو آخر میں بھی دہرا دیا جاتا تو مناسب ہوتا۔ نقطہ

س ش

تجویزیں اور مشورے

زرعی انجمن کے قیام کی تجاویز

"معاشی کمیٹی انجمن طیلسانیین عثمانیہ کی ایک ذیلی کمیٹی کا قیام اس غرض سے عمل میں لایا گیا ہے کہ معاشی کمیٹی کے تحت ایک ایسی زرعی انجمن کے قیام کے امکانات معلوم کئے جائیں جو ملک کے تعلیم یافتہ حضرات کی عملی زرعی جد و جہد کا مرکز بن سکے۔ اس سلسلہ میں ملک کے بعض ارباب فکر کی جو آراء حاصل ہوئی ہیں ان میں بعض آراء کی اشاعت اس غرض سے کی جا رہی ہے کہ دوسرے اہل ملک سے مزید تجاویز حاصل ہوں چنانچہ مولوی سید یوسف علی صاحب معتمد محکمۂ تجارت و حرفت اور مولوی عبدالعزیز صاحب مہتمم عبدالرزاق کمپنی کے مکتوب شائع کئے جاتے ہیں"

۱۔ مولوی سید یوسف علی صاحب کا مکتوب :۔

"یہ کہنے میں کسی کو کچھ بھی تامل نہیں ہو سکتا کہ پڑھے لکھے لوگوں کی ایک ایسی انجمن کے قیام کی ضرورت ناگزیر ہے جو زراعت کی طرف عملی توجہ کے ذریعہ ملک کے نوجوانوں کے سامنے ایک اچھا نمونہ پیش کر سکے۔ اور میں ایسی انجمن میں شریک ہونے ہر وقت تیار ہوں۔

اس سے مجھے پورا اتفاق ہے کہ ابتداء چھوٹے پیمانہ پر اور حیدرآباد کے آس پاس کے رقبہ میں ہونی چاہیئے۔ اور دوسرا قدم اس وقت اٹھانا چاہیئے جب کہ پہلے تجربہ میں خاصی کامیابی کا یقین حاصل ہو جائے۔ اس کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ انجمن چند نوجوانوں کے لئے حمایت ساگر کے زرعی فارم پر یا کسی اور جگہ عملی تعلیم کی سہولتیں بہم پہنچائے۔ حمایت ساگر کے زرعی فارم پر غالباً ہر سال کاشتکاروں کے لڑکوں کو زراعت کے ترقی یافتہ طریقوں سے اور نئی ایجادات کے استعمال سے واقف کرایا جاتا ہے۔ سرکاری طور پر انجمن اپنے لوگوں کے لئے بھی شاید بغیر کسی دشواری کے انتظام کر سکیگی۔

کسی اور جگہ سے میرا منشاء۔ مثال کے طور پر۔ نظام آباد اور اورنگ آباد جیسے مقامات ہیں

نظام آباد میں نیشکر کی کاشت کے سوائے دوسرے اجناس کی کاشت بھی ایک جماعت کر رہی ہے۔ جس کے کاروبار کی نگرانی نواب نور اللہ صاحب والا جاہی فرما رہے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ انجمن اپنے کچھ منتخب نوجوانوں کو ان کے پاس چند دن کام کرنے کے لئے بھیج سکے۔ اورنگ آباد اور دوسرے مرہٹواڑی کے علاقوں میں اچھے میوؤں اور ترکاریوں کی کاشت بعض جگہ بڑے پیمانوں پر ہو رہی ہے۔ پچھلے محرم کی چھٹیوں میں مجھے خلد آباد سے کوئی تین میل پر "قلندر آباد" موضع میں جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہاں ایک شریف خاندان کے دو نوجوانوں نے سنترے اور موسمبی کے باغ لگائے ہیں اور چند ہی سال میں اتنی ترقی کی ہے کہ اسکو مثال کے طور پر ہر تعلیم یافتہ نوجوان کے سامنے جو ملازمت کی مصیبت کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہو پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس باغ سے اس سال کوئی سولہ ہزار کے منافع کی اُمید کی جا رہی ہے۔ ان نوجوانوں نے نہ صرف ذاتی محنت اور توجہ سے خاصا فائدہ کمانے کے امکانات کی ایک قابل رشک مثال ملک کے سامنے پیش کی ہے۔ بلکہ انہوں نے اپنے موضع کو مرکز قرار دیکر آس پاس کے مواضع میں دیہات سدھار اور بالغوں کی تعلیم کی بھی اچھی کوشش کی ہے۔ میں نے ان سے اس مسئلہ پر گفتگو کی کہ آیا وہ اور بھی لوگوں کو اگر وہ ان کے پاس بھیجے جائیں تو اپنے کام کی عملی تفصیلات سے واقف کرا سکیں گے یا کیا۔ انہوں نے بڑی خوشی سے اس پر آمادگی ظاہر کی۔ مگر ان کا خیال یہ تھا کہ ہر موسم کے کاروبار کی جزئیات سے واقف ہونے کی غرض سے یہ بہت مناسب ہوگا کہ تعلیم ایک سال کی رکھی جائے۔ دوسری تفصیلات کے عرض کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے۔ جو کچھ میں واضح کرنا چاہتا ہوں وہ صرف اس قدر ہے کہ انجمن کے تمام کام کرنے والے پڑھے لکھے ملک کے نوجوان ہوں اور ان کے لئے عملی تعلیم حاصل کرنے کے مواقع بہم پہونچائے جائیں۔

اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہوئے یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری ہے کہ "زمینات" دور دراز یا متعدد مقامات پر حاصل کرنے سے زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ ایک ہی جگہ ایک بڑا رقبہ پہلے حاصل کیا جائے اس سے صرفہ کی کفایت اور نگرانی میں سہولت ہوگی۔ اس کے برخلاف اگر "زمینات" دور ہوں یا وہ منتشر مقامات پر ہوں یا چھوٹے چھوٹے رقبہ کی ہوں تو دلچسپی کے سوا کامیابی کے امکانات بھی بہت کم ہو جائینگے۔ باقی باتوں پر اگر کوئی کمیٹی طلب کی جائے تو بات چیت ہو سکتی ہے۔ لیکن شاید یہاں اس بات کی طرف اشارہ کر دینا مناسب

نہ ہوگا۔ کہ اگر انجمن " زینات" حاصل کرنے کی غرض سے ہمارے ملک کے روشن خیال بڑے جاگیرداروں صاحبوں کی طرف رجوع کرے تو اسکو یقیناً مناسب مراعاتیں مل سکیں گی۔ مثال کے طور پر اگر پائیگاھوں اور سمستانوں کے علاقوں سے۔ نواب سالار جنگ بہادر سے یا نواب کمال یار جنگ بہادر۔ نواب دوست محمد خاں بہادر یا راجہ ترمبک راج صاحب جیسے حضرات سے معاملہ کو رجوع کیا جائے تو اس ضمن میں پوری ہمدردی اور امکانی مراعتوں کے حصول کی امید کی جاسکتی ہے۔

میں اس جواب میں تھوڑی سی تفصیل سے اسوجہ سے کام لے رہا ہوں کہ خدمات عامہ کے تعلق سے حیدرآباد کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بیروزگاری کے مسئلہ پر غور کرنے کا مجھے تھوڑا بہت موقع ملا ہے۔ اور اسی سلسلہ میں میں نے اس لٹریچر کا بھی مطالعہ کیا ہے جو اسبارے میں برطانوی ہند کے صوبوں سے مجھے مل سکا صوبہ متحدہ میں سپرو کمیٹی نے تعلیم یافتہ بیروزگاری کے مسائل اور ان کے حل کرنے کے طریقوں پر کافی روشنی ڈالی ہے مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس صوبہ میں یا برطانوی ہند کے کسی اور صوبہ میں مسئلہ کے مختلف اور پیچیدہ پہلوؤں کا کوئی ایسا عملی حل پیش نہیں کیا گیا ہے جو پوری طرح مستقبل سے متعلق اطمینان دلا سکے۔ حیدرآباد اسبارے میں زیادہ تر نفسیاتی وجوہات۔ مثلاً چھوٹی خدمات پسندی غلط روایتوں اور گمراہ کن تصورحیات کی وجہ مستقبل کے اندیشوں سے خالی نظر نہیں آتا۔

آبادی بڑھ رہی ہے۔ خدمات عامہ میں بھرتی کے امکانات کم ہو رہے ہیں اور جنگ کی وجہ سے جو معاشی مسائل پیدا ہو رہے ہیں یا جنگ کے بعد جنکا سامنا ہوگا وہ اتنے مہیب ہیں کہ ان پر فوری توجہ وقت کی سب سے زیادہ شدید ضرورت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جنگ نے ایک حد تک روزگار کے فراہم کرنے میں مدد دی ہے۔ لیکن اس کے ختم ہونے پر ردعمل بہت برا ہوگا۔ اسکے سوا بعض صنعتوں میں یا پیداوار کے کارخانوں میں ملک کے نوجوانوں کی جو کھپت اس وقت ہو سکتی ہے۔ اسکی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ایک مستقل صورت اختیار کرے گی۔ اسکی ایک بڑی وجہ جو ظاہر ہے وہ یہ ہے کہ آئندہ حکومتوں کی صنعتی معاشی (FISCAL) پالیسی کیا ہوگی اور اس کا اثر ہندوستان پر اور ہندوستان کا ایک حصہ ہونے کی وجہ سے حیدرآباد پر کیا پڑیگا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ رہی تجارتی کمپنیاں یا بڑے پیمانہ پر بیوپار کی انفرادی کوششیں

ان کے بارے میں بھی موجودہ حالات میں کامیابی کی کوئی صحیح پیش قیاسی کرنا آسان نہیں ہے۔ اس وجہ سے کہ جنگ کے بعد کی دنیا کیسی ہوگی۔ کرنسی۔ تبادلہ۔ حمل و نقل کے ذرائع کی کیا صورتیں ہوں گی۔ اور دنیا کے مختلف حصوں کے درمیان سیاسی تعلقات جن پر ایک حد تک تجارت کا دار و مدار ہوتا ہے، کیسے ہوں گے۔ یہ کہنا بھی دشوار ہے۔ ان حالات میں جو چیز لے دے کر بھروسہ کے قابل ہوسکتی ہے وہ زراعت اور صرف زراعت ہے جو ممالک جنگ میں شریک ہیں یا بالواسطہ یا بلاواسطہ اس سے متاثر ہیں وہ سب یہ رجحان رکھتے ہیں کہ آنیوالی دنیا میں ہر سیاسی اکائی کو کھانے پینے کی ضرورتوں کی حد تک خود مکتفی ہونے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ بعض صورتوں میں ایسی کوشش پیداوار کے فطری ذرائع کو ملحوظ رکھتے ہوئے شاید ہر جگہ آسان نہ ہوگی لیکن اگر ایسا ہو بھی جائے تو تب بھی حیدرآباد کو زرعی ترقی کی کوششوں میں پست ہمت ہونے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی اور خصوصاً جبکہ آپکی کمیٹی معاشی نقطۂ نظر سے ملک کی ایک ایسی پیمائش کرسکے جو مختلف اجناس۔ ملک کی ضرورتوں اور ان اجناس کی پیدائش کے رقبوں اور انکے امکانات پر مشتمل ہو۔ اور اس ضمن میں ممالک محروسہ کے ان رقبوں کی دریافت کی جائے جو (CULTIVABLE WAST LANDS) کہلائی جاسکتی ہیں۔

"زمینات" کے حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ انجمن کو یہ چاہیئے کہ وہ دوسرے متعلقہ کاروبار کیلئے بھی مختلف شاخیں قائم کرے۔ مثال کے طور پر ایک ایسی انجمن جو کھاد۔ زراعتی آلات۔ تخم اور مویشی وغیرہ کی بڑے پیمانہ اور سستی قیمتوں پر سپلائی کرسکے۔ دوسری ایک ایسی انجمن جو اتحادی اصول پر پیداوار کو خریدی اور فائدہ کے ساتھ اسکی نکاسی یا فروخت کا انتظام کرسکے تیسری ایک ایسی انجمن جو خالص بنک کاری کے فرائض انجام دے۔

یہ چند باتیں میں مختصر طور پر اس وجہ سے لکھ رہا ہوں کہ آپ کی انجمن ان پر ابھی سے غور و فکر کرنا شروع کردے۔ معاشی کمیٹی کو اور طیلسانین کی انجمن کو ملکی مصنوعات کی نمائش میں جو کامیابی ہوئی ہے اس سے یہ اُمید ضرور ہوسکتی ہے کہ اس کام کو بھی جسکے پیچھے ملک کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ہمتیں کام کرنے کیلئے آمادہ معلوم ہوتی ہیں کامیابی کے ساتھ چلایا جاسکے گا۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ نمائش سے کہیں زیادہ یہ کام مشکل ہے اور اس کے فوائد بھی نسبتاً دور رس ہیں۔ مجھے اس کا یقین ہے کہ حکومت کے محکموں نے جس طرح نمائش کے

کاروبار میں تعاون فرمایا ہے۔ اسی طرح وہ اس انجمن کے کاروبار میں ضرور ہاتھ بٹائینگے۔ میری ساری اچھی
تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

۲۔ مولوی عبدالعزیز صاحب کا مکتوب۔

حیدرآباد کے قرب وجوار میں امداد باہمی کے اصول پر کاشتکاری کی سخت ضرورت ہے۔ لیکن
بجائے جنس غلہ کے کمپنی ہذا کی رائے میں اولاً ترکاریوں کی کاشت اور مقامی موجودہ باغات کی طرف توجہ
ہونی چاہیئے کہ حیدرآباد وسکندرآباد کی وسیع آبادی کے لحاظ سے یہ اسکیم اس قسم کی کاشت کے لئے زیادہ
موزوں اور امید افزا ہے۔ فواید اور تاثرات کے لحاظ سے میوہ جات کے بعد ترکاریوں کا دوسرا درجہ تسلیم
کیا گیا ہے۔ اور ترکاریوں کا استعمال بقاء صحت کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے اعلیٰ نظام اور نئے طریقوں سے
کاشت کی ہوئی ترکاریاں اگر کافی مقدار میں ملنے لگیں تو اچھے قسم کی ترکاریاں بھی سستے دام سے ہم رست
ہوسکینگی۔ علاوہ ازیں یہ اسکیم صحت عامہ اور مالیہ کے لحاظ سے بھی سودمند متصور ہوسکتا ہے۔

ف ۔ اگر میوہ جات کے درخت لگائے جائیں تو اس کے نتائج بہت عرصہ کے بعد برآمد ہوتے ہیں۔ با
حیدرآباد اور اس کے نواح میں بکثرت باغات موجود ہیں جو بے توجہی کی وجہ برباد ہورہے ہیں۔ ان باغات
ایسے درخت اب بھی موجود ہیں جنکی پرورش بڑی محنت اور مصارف سے ہوئی ہے۔ انہی درختوں کی جا
اصول پر دیکھ بھال کی جائے اور ساتھ ہی میوؤں کے نئے درختوں کے بوئے جانے کا انتظام کیا جائے تو بہت تھوڑے
دنوں میں بہترین ملکی میوہ جات مل سکینگے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ ان باغات کو کسی نہ کسی طریقہ پر حاصل کر لیا جائے

ف ۔ ترکاریوں کی کاشت اچھے اور نفع بخش طریقہ سے ہونی چاہیئے جو ترکاریاں اس وقت بازار میں ملتی
ان میں خصوصاً پھلوں۔ گڈوں اور پھلیوں کے قسم کی ترکاریوں کی شکل جسامت رنگ اور خوشنمائی میں یکسا
نہیں ہوتی ہے۔ اگر جدید اصول کے بموجب اعلیٰ پیمانہ اور خوش نظمی کے ساتھ اسکی کاشت کا انتظام کیا جائے تو
وہ سب مقاصد حاصل ہوسکتے ہیں۔ جن کی اس اسکیم سے توقع کی جاسکتی ہے۔

اس اسکیم کی کامیابی موسمی موافقت۔ کم از کم مصارف اور زیادہ سے زیادہ کاشت اور خوش انتظامی
لیکن باوجود اسکے عملی قدم ضرور اٹھانا چاہیئے۔ کام مستقل اور نفع بخش ہو اور اس سے ملک کے کاشتکاروں کی رہنمائی ہو

تنظیم دیہی کے مسائل پر تحقیقات اور سروے کی ایک اسکیم

معاشی کمیٹی کی مجلس عاملہ نے تنظیم دیہی کے مسائل پر تحقیقات اور سروے کی ایک اسکیم مرتب کرکے سرکار عالی کی خدمت میں پیش کی ہے یہ اسکیم مولوی خواجہ حمید احمد صاحب بی اے (عثمانیہ) معتمد معاشی کمیٹی کے ایما پر ذیل میں شائع کی جاتی ہے:-

ممالک محروسہ سرکار عالی میں ایک بڑے پیمانہ پر تنظیم دیہی کے کام کی انجام دہی کے لئے سرکار عالی خاص شغف سے سعی فرما رہی ہے۔ اس غرض کے لئے ایک جداگانہ معتمدی کے ساتھ ایک مجلس تنظیم دیہی کا قیام عمل میں آیا ہے جو گذشتہ دو تین سال سے بہت مفید کام انجام دے رہی ہے۔ سال حال کے موازنہ میں مبلغ تین لاکھ روپیہ کی ایک رقم تنظیم دیہی کے سرمایہ کے آغاز کے لئے رکھی گئی ہے جو توقع ہے کہ اس کام کے لئے بنیاد کا کام دے گی اور آیندہ اس مسئلہ کی جانب سرکار عالی اور پبلک دونوں کی روز افزوں توجہ کا باعث ہوگی۔ معاشی کمیٹی حیدرآباد نے اس اقدام کا خیر مقدم کیا۔ اور قومی تعمیر کے اس کام میں تعاون کے لئے اپنی آرزو کا اظہار کیا ہے۔ ایک علمی جماعت ہونے کی حیثیت سے معاشی کمیٹی چند مثالی مواضع کے معاشی حالات کا جائزہ (معاشی سروے) اس موضوع پر موجودہ تمام مواد کی فراہمی نیز دیگر تحقیقاتی کاموں کا (جو تنظیم دیہی کی مختلف تدابیر کے عملی طور پر اختیار کرنے میں مفید ہوں) انتظام کرکے دیہی تنظیم کے لئے ایک واضح اور نہایت منظم و مرتب اسکیم کی ترتیب میں حکومت کی مدد کر سکتی ہے۔ اس غرض کے لئے ذیل میں بالاختصار ایک اسکیم کا خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ معاشی سروے۔ کمیٹی چند مثالی مواضع مثلاً چھ مواضع کے (جن میں سے دو تلنگانہ کے دو مرہٹواڑی کے ایک کرناٹک کا اور ایک جاگیری یا سمستان کے علاقہ کا ہو) معاشی حالات کے جائزہ (معاشی سروے) کا انتظام کرے گی۔ ارادہ یہ ہے کہ معاشیات کے ایسے مابعد طیلسانی متعلمین کو جو خدمت خلق کا جذبہ رکھتے ہوں اور ان مواضع میں قیام کی طرف راغب ہوں ان مواضع میں کم از کم چھ ماہ کی مدت کے لئے ٹھہرایا جائے اور یہ اصحاب تمام مقامی مسائل مثلاً مواضع کے مختلف طبقہ جات یعنی زمیندار کاشتکار شکمیدار زرعی مزدور ساہوکار

وغیرہ کی معاشی حیثیت فی کس آمدنی اور قرض کی مقدار اخراجات زراعت اور پیداوار آلات کشاورزی کھاد اور مویشی کے متعلق صورت حال اگر کوئی ضمنی صنعتیں موجود ہوں تو ان سے متعلق مسائل صفائی صحت عامہ اور مارکٹنگ کی سہولتوں ذرائع آب اور حمل و نقل کے مقامی مسائل کا مطالعہ کریں۔ یہ متعلمین ایک مرکزی کمیٹی کے زیر ہدایت کام کرینگے جو چھ ماہرین پر مشتمل ہو گی جس کی تفصیلات آئندہ فقرہ میں درج ہیں۔ ان متعلمین کو مبلغ ۵۰؎ روپیہ یا ایک سو روپیہ ماہانہ کا وظیفہ دینا ہوگا محکمۂ مالگذاری سے استدعا کی جائیگی کہ متعلقہ مواضع کے پٹیل پٹواریوں کے نام احکام جاری کئے جائیں کہ وہ ضروری مواد کی فراہمی اور مقامی موسمی مسائل کے مطالعہ میں ان متعلمین کی اعانت کریں۔

۲۔ تنظیم دیہی کا کام تقریباً تمام ہندوستان میں سرکاری اور غیر سرکاری ذرائع سے انجام پارہا ہے لیکن یہ سب منتشر اور ایک دوسرے سے بے تعلق ہیں۔ یہ چیز بہت کارآمد ہوگی کہ مختلف مراکز میں مختلف ذرائع سے جو کام انجام پایا ہے اس کا مطالعہ کیا جائے اور اسے ایک جگہ جمع کیا جائے۔ یہ معلومات باقاعدہ پلاننگ کے لئے بہت مفید مواد کا کام دینگی اس غرض کے لئے تجویز یہ ہے کہ تین کارکنوں کو جو معاشیات کے متعلم بھی ہوں گے منتخب صوبہ جات مثلاً ایک کو پنجاب اور بنگال اور دوسرے کو مدراس اور میسور روانہ کیا جائے کہ وہ وہاں ترقی دیہات کے اس کام کا مطالعہ کریں جو سرکاری ذرائع سے انجام پایا ہے۔ تیسرے متعلم کو اس کام کے مطالعہ کے لئے روانہ کیا جائے جو غیر سرکاری اداروں مثلاً سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی آل انڈیا ویلیج انڈسٹریز اسوسی ایشن اور ینگ من کرسچین اسوسی ایشن وغیرہ نے انجام دیا ہے متعلمین کو خاص ان مراکز پر جہاں کام ہورہا ہے جاکر تمام معلومات براہ راست جمع کرنا ہوگا۔ ہر متعلم کو تین ماہ کی مدت کے لئے مبلغ (۵۰؎) روپیہ سے ایک سو تک کا وظیفہ اور انٹر یا دوسرے درجہ کا جس میں سہولت ہو سفر خرچ دینا ہوگا۔ جن اشخاص کا انتخاب کیا جائے ان میں خدمت خلق کا جذبہ ہونا چاہیئے۔

۳۔ دیہاتی آبادی کے لئے ضمنی صنعتوں کی جو اہمیت ہے اس پر جتنا بھی زور دیا جائے کم ہے تاہم گو اس موضوع پر نظری طور پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ لیکن بعض منتخب دیہی صنعتوں سے متعلق عملی مواد یعنی اخراجات پیداوار آلات خام اشیاء اور مارکٹنگ کے متعلق مواد جمع کرنے کے لئے اب تک بہت کم کام ہوا ہے۔ آل انڈیا

ویلیج ایسوسی ایشن نے اس سلسلہ میں کچھ کام کیا ہے لیکن یہ بہت محدود نوعیت کا ہے یہ مناسب ہوگا کہ ایسی دو تین صنعتوں کو جو بالقوہ ہمارے مقامی حالات کے اعتبار سے مفید ہوں منتخب کرلیا جائے مثلاً ہاتھ سے سوت کاتنا۔ بافندگی۔ مرغیوں وغیرہ کی پرورش۔ ٹوکری سازی اور بوریا بافی اور ان صنعتوں کے لئے تمام ضروری مواد جمع کیا جائے یہ کام بہت اختصاصی نوعیت کا ہوگا اور تین سے چار تک متعلمین میں سے ایک ایک صنعت ایک ایک کے سپرد کرکے ان سے خواہش کی جاسکتی ہے کہ ان سے متعلقہ معاشی اور فنی مسائل کا مطالعہ کریں۔ اگر وہ اس صنعت کے لئے جو ان کے سپرد کی گئی تھی کوئی مبسوط اسکیم تیار کرسکیں تو پھر سرکار عالی اسے ترقی دینے اور اپنے سررشتہ جات انتظامی کے توسط سے دیہاتی آبادی میں اس کی اشاعت کے لئے سعی فرماسکتے ہیں۔ اس کام کے لئے جن متعلمین کا انتخاب عمل میں آئے انہیں تین چار ماہ تک تقریباً ایک سو روپیہ ماہانہ کا وظیفہ اور ضروری تجربات کی غرض سے خام اشیاء اور آلات وغیرہ پر خرچ کے لئے ضروری رقم دینی ہوگی۔

۴۔ مجوزہ صدر نہج پر کام کی رہنمائی کے لئے ایک مرکزی کمیٹی رکھنا ضروری ہوگا یہ کمیٹی معاشی کمیٹی میں سے تین چار اراکین اور چند ماہرین مثلاً معاشیات کے دو تین پروفیسروں اور سررشتہ ہائے سرکار عالی مثلاً زراعت مارکٹنگ، امداد باہمی اور صنعت و حرفت وغیرہ کے دو تین عہدہ داروں پر مشتمل ہوگی یہ ضروری ہوگا کہ ہمہ وقتی متعلمین کی خدمات حاصل کی جائیں جو مختلف مراکز سے وصول شدہ رپورٹوں کا مطالعہ کرکے اس کا تجزیہ اور نوعیت واری تقسیم کریں اور اُسے ربط دے کر ترتیب کا کام انجام دیں تاکہ مرکزی کمیٹی پیشکار کا میں پیش کرنے کی غرض سے ایک مبسوط رپورٹ مرتب کرسکے کمیٹی کو ایک ہمہ وقتی ٹائپسٹ اہلکار ایک چپراسی اور صادر متفرق کے لئے ایک قلیل رقم کی ضرورت ہوگی۔

۵۔ معاشی کمیٹی کے سامنے انجمن امداد باہمی تنظیم دیہی کے آغاز کرنے کی بھی ایک اسکیم ہے جس کا ایک خاکہ منسلک ہے۔ یہ انجمن ایک نوع کا تجربہ بہم پہنچانے میں معاون ثابت ہوگی جس سے مرکزی کمیٹی مفید معلومات جمع کرنے کے قابل ہوسکے گی۔ کام کے آغاز کرنے کے لئے انجمن کو مبلغ (ا ضمانہ۱۵) روپیہ سے (۱۔۔۔۔) روپیہ تک کی ایک چھوٹی سی رقم کا عطیہ دیا جانا ہوگا۔ مدعا یہ ہے کہ آخر کار انجمن کو بالکل خود مکتفی بنا دیا جائے۔

۶۔ معاشی کمیٹی کو مسائل تنظیم دیہی سے متعلق تمام ممکن الحصول کتابیں جمع کرنا اور اس موضوع پر جہاں تک

ممکن ہو مکمل ترین کتب خانہ رکھنا پڑیگا تا کہ جو متعلم متذکرہ صدر مسائل پر کام کر رہے ہیں وہ بلا معاوضہ اس سے استفادہ کرسکیں۔

مجوزہ اسکیم کے اخراجات کے تخمینہ کا ایک تختہ منسلک ہے۔

تخمینۂ اخراجات

۱۔ سروے

چھ وظائف بحساب مبلغ (۷۵) روپیہ ماہانہ کے لئے جملہ [illegible]

صادر متفرق اور سفر خرچ بحساب (۲۰۰) سو فی متعلم جملہ ۱۲۰۰

میزان [illegible]

۲۔ تین وظائف بحساب مبلغ ایک سو روپیہ چار ماہ کے لئے جملہ ۱۲۰۰

سفر خرچ بحساب مبلغ دو سو فی کس جملہ ۶۰۰

صادر متفرق جملہ ۲۰۰

میزان ۲۰۰۰

دیہی صنعتیں

۳۔ تین وظائف بحساب مبلغ ایک سو روپیہ فی کس چار ماہ کیلئے جملہ ۱۲۰۰

خام اشیاء آلات وغیرہ جملہ ۱۸۰۰

میزان [illegible]

۴۔ امداد برائے انجمن امداد باہمی تنظیم دیہی جملہ ۲۰

۵۔ دو متعلم بحساب مبلغ (۱۰۰) ماہانہ چھ ماہ کیلئے جملہ ۱۲۰۰

ٹائپسٹ اہلکار بحساب پچاس ماہانہ چھ ماہ کیلئے جملہ ۳۰۰

صادر متفرق جملہ ۶۰۰

میزان ۲۱۰۰

۶۔ کتب

جملہ ۲۰۰۰

صدر میزان ۱۵۰۰۰

تجاویز برائے قیام انجمن تنظیم دیہی

مجوزہ معاشی کمیٹی انجمن طیلسانئین عثمانیہ

معاشی کمیٹی انجمن طیلسانئین نے ایک سب کمیٹی قائم کی تھی کہ وہ بلدہ حیدرآباد سے اندرون پانچ میل کسی موضع میں ایک مرکز تنظیم دیہی کے قیام کیلئے تجاویز پیش کرے اس قسم کی انجمن کے قیام سے انجمن طیلسانئین کا منشا دیہات کی تنظیم و تعمیر جدید ہے جس میں دیہی صنعتوں کا احیاء حوصلہ افزائی اور ترقی دیہی آبادی کی جسمانی و اخلاقی ترقی شامل ہے۔ یہ کام امداد باہمی کے طور پر کیا جائے۔

سب کمیٹی کے فرائض۔

۱۔ مواضع میں کام کے لئے ایک خاکہ تیار کرنا۔ ۲۔ ترقی دیہات کے لئے ایک پنجسالہ تعمیری اسکیم پیش کرنا۔

۳۔ ایک موضع کا انتخاب کرنا جو حسب ذیل شرایط پر پورا اترتا ہو۔

الف۔ موضع کی آبادی معمولاً ایک ہزار سے زاید نہو ورنہ اس کا سنبھالنا ممکن نہوگا۔ اور اس پر پورا تعلیمی اثر اور قابو نہ رہے گا۔ **ب**۔ اس میں ایک سرکاری مدرسہ ہونا چاہئیے۔ **ج**۔ موضع میں خواندہ اشخاص کی ایک کافی تعداد ہونی چاہئیے۔ **د**۔ موضع سڑک سے پانچ سے دس میل تک فاصلہ پر ہونا چاہئیے

ھ۔ موضع میں ایک انجمن امداد باہمی موجود ہونا چاہئیے۔

۴۔ معاشی کمیٹی کی تجویز ہے کہ ایک انجمن تنظیم دیہی کے قیام سے کام کا آغاز کیا جائے۔ اس انجمن میں موضع کے تمام ارکان کو شامل ہونا چاہئیے ہر رکن سالانہ چندہ دینا ہوگا جس کی مقدار ایک آنہ سے ایک روپیہ تک ہوگی البتہ مزدور چندہ سے مستثنیٰ ہونگے اور انہیں سال میں ایک یا دو روز مفت کام کرنا ہوگا۔

۵۔ موضع کے تمام خاندانوں کی ہمت افزائی کی جانی چاہئیے کہ وہ اصلاح کے کام میں حصہ لیں جو امداد باہمی کے اصول پر کیا جائے گا۔

۶۔ عہدہ داران دیہی اور مدرسین جو بحیثیت عہدہ دار انجمن کے ارکان ہونگے بہت کچھ تعلیمی اثر ڈال سکینگے

۷۔ انجمن فوراً مصرحۂ ذیل کام انجام دینا شروع کریگی یا موضع کی شدید ضرورتوں پر توجہ منعطف کریگی۔

الف۔ صنعتیں۔ ب۔ زراعت۔ ج۔ صفائی۔ د۔ غذا۔

الف۔ صنعتیں۔ ۱۔ موضع کے صنعتی حالات کا جائزہ (سروے) ۲۔ جو خام اشیاء مقامی طور پر دستیاب ہو سکتی ہوں ان کا جائزہ (سروے) ۳۔ دیہاتیوں کی غذا اور اشیاء استعمال سے متعلقہ صنعتوں کا قیام مثلاً دھان صاف کرنا گیہوں اور اناج پیسنا تیل نکالنا، گڑ بنانا۔ ۴۔ بعض گھریلو صنعتیں مثلاً چرخا کاتنا۔ پارچہ بافی، چاندی اور سونے کے نقش کا کام قالین اور کمل بافی جوتہ سازی وغیرہ۔

ب۔ زراعت۔ ۱۔ بیج اور کھاد کی فراہمی۔ ۲۔ سادہ مشین کی قسم کے آلات ہل وغیرہ حاصل کرنا جو زراعت کیلئے کارآمد ہوں۔ ۳۔ سررشتۂ زراعت کے عہدہ داروں کو مدعو کرنا کہ دیہاتیوں کو مشورہ دیں۔ ۴۔ پیداوار کی فروخت کیلئے مارکٹنگ کی سہولتوں کا انتظام کرنا۔ ۵۔ زرعی مظاہرہ کی پارٹیوں کی تنظیم کرنا۔ ۶۔ دیہاتیوں کے اوقات فرصت کی مقبولیت اور ان کی قابلیت پیداوار میں اضافہ کی غرض سے ضمنی زرعی صنعتوں جیسے شیر خانوں، مرغی خانوں وغیرہ کی ترقی۔

ج۔ صفائی۔ ۱۔ بیت الخلا (پاخانوں کی ترویج) ۲۔ خاکروبی۔ ۳۔ الف۔ سڑکوں مکانات اور نالیوں کی ترقی اور مرمت۔ ب۔ گڑھے بھرنا باؤلیوں اور تالابوں کی صفائی، آب نوشیدنی کی بہم رسانی۔ ج۔ لاشوں کو معاشی طریقہ پر ٹھکانے لگانا۔

د۔ غذا (۱) کھانے کی چیزوں کی غذائی قیمتوں کے متعلق معلومات بہم پہونچانا جیسے ماہرین سے حاصل کر کے دیہاتیوں میں شائع کیا جائے۔ (۲) دیہاتیوں کی استطاعت کے مطابق ان کی ذاتی اصلاح کے لئے تجاویز پیش کرنا۔

۸۔ انجمن تنظیم دیہی۔ لکچروں، کتابچوں، خاکوں اور پوسٹروں کے ذریعہ امداد باہمی اصلاح معشیت صفائی اور دیہی حفظان صحت کے متعلق پروپگنڈے کا کام انجام دے گی۔ کچھ عرصہ بعد جب وقت سازگار ہو تو ایک ریڈ پوسٹ لگانے کی بھی تجویز ہے۔

۹۔ انجمن تنظیم دیہی ایک انجمن کفایت شعاری و پس اندازی بھی قایم کریگی۔

۱۰۔ یہ ایک (آیورویدیا یونانی) دواخانہ بھی قائم کریگی اور عورتوں کی امداد کے لئے دائیوں کی

ٹریننگ بھی کریگی۔

۱۱۔ معاشی کمیٹی کی تجویز یہ ہے کہ اندرون پنج سال حسب ذیل ادارہ جات قائم کرکے اپنے دائرۂ عمل کو وسعت دے۔

الف۔ ایک متعدد المقاصد انجمن اتحاد باہمی۔ **ب**۔ کوآپریٹیو مارکٹنگ سوسائٹی۔ **ج**۔ ذخیرہ ہائے اناج بر اصول اتحاد باہمی۔ **د**۔ اتحاد باہمی کے مزرعے پٹہ کی بنیادوں پر۔ **ہ**۔ مرکز افزائش نسل۔ **و**۔ لڑکوں کو دیہی صنعتوں کی ٹریننگ دینے اور دیہی صنعتوں کی ترقی کے لئے ایک انسٹی ٹیوٹ۔ **ز**۔ مدارس شبینہ تعلیم بالغان اور تحریک خواندگی۔ **ح**۔ اصلاح معشیت و اصلاح مزرعہ جات۔

۱۲۔ کمیٹی کی تجویز ہے کہ بلدہ کے نواح کے دیگر مواضع تک بھی اپنے دائرۂ عمل کو وسعت دے۔

۱۳۔ متذکرہ صدر اسکیم اور اس میں جو مالی بار عاید ہوگا خاص طور پر زیر تحقیقات ہے (اگر تمام کام انجام دیئے جائیں تو متوقعہ اخراجات مبلغ (کلدار [illegible]) سے (کلدار [illegible]) سالانہ تک ہونگے۔

۱۴۔ رقم کی سربراہی کی حسب ذیل صورتیں ہوسکتی ہیں۔

الف۔ اراکین کا چندہ۔ **ب**۔ آمدنی لوکل فنڈ۔ **ج**۔ سرکاری امداد۔ **د**۔ پہلے پانچ سال جو منافع غیر تقسیم شدہ ہے۔ **ہ**۔ سرمایہ مشغولہ اور انجمن کفایت شعاری کے خریدی شسترں کی امانتی رقوم دیہی سرمایہ اور انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ کے غیر سودی قرضے۔

۱۵۔ سرکار عالی سے استدعا کی جائیگی کہ جملہ سررشتہ ہائے سرکاری کو احکام جاری فرمائیں کہ وہ اس اسکیم کی کامیاب پیش رفت میں ہمدردانہ طور پر ہاتھ بٹائیں۔

موجودہ غذائی صورت حال کے متعلق معاشی کمیٹی کی یادداشت

(قرارداد ہائے منظورہ در جلسۂ عاملہ منعقدہ ۱۹ ارخورداد ۱۳۵۲ ف)

موجودہ پریشان کن غذائی صورت حال کی اصلاح کے سلسلہ میں معاشی کمیٹی نے حسب ذیل قراردادیں منظور کی ہیں۔

۱۔ کافی مقدار میں فراہمی اغذیہ کے لئے اولین شرط یہ ہے کہ اجناس خوردنی کی زیادہ سے زیادہ کاشت کیجائے۔ فی الوقت ممالک محروسہ سرکار عالی میں اجناس کے رقبہ کی جس رفتار سے ترقی ہو رہی ہے وہ اطمینان بخش نہیں معلوم ہوتی خصوصاً چاول اور گیہوں کا رقبہ مقامی ضروریات کے لحاظ سے بہت ناکافی ہے۔ چنانچہ حکومت کی جانب سے مخصوص رقبہ جات کا تعین کر کے ان اجناس کی کاشت میں فوری طور پر اضافہ کیا جانا مناسب ہوگا۔

۲۔ زیادہ اجناس کیلئے اور بالخصوص چاول کی کاشت کے واسطے زیادہ ذرائع آبپاشی کی ضرورت ہے۔ ممالک محروسہ سرکار عالی میں فی الوقت تری کا جو رقبہ ہے اوس کا تناسب بہت کم ہے۔ بڑے تالابوں اور ساگروں کی تعمیر سے اگر چیکہ ایسے رقبہ جات میں اضافہ ہو رہا ہے لیکن اب جدید تالابوں کی تعمیر میں کافی عرصہ درکار ہوگا۔ لہذا فوری طور پر موجودہ ضروریات کی تکمیل کے لئے مختلف رقبوں میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں باؤلیات و کنویں وغیرہ کھدایا جانا اور شکستہ تالابوں کی مرمت کے لئے فوری امداد بہت کار آمد ہوگی۔ اس کام کیلئے جتنی بھی رقم صرف کی جائیگی اس سے ملک کی زرعی پیداوار کی صورت میں کافی معاوضہ حاصل ہوگا۔ اور قلت اغذیہ کی شکایت بڑی حد تک رفع ہو جائیگی اور چونکہ موجودہ قیمتوں کے اضافہ کا بھی ان کاموں پر اثر نہیں پڑتا اس لئے دوران جنگ میں بھی اس کی فوری انجام دہی کی جانب کوشش کیجا سکتی ہے۔

۳۔ مستقل طور پر اغذیہ کی پیداوار اور اس کی فراہمی اور تقسیم کے مسائل حل کئے جانے کے لئے ایک مشاورتی مجلس (فوڈ کونسل FOOD COUNCIL) کے قیام کی ضرورت ملک میں محسوس کی جارہی ہے جو سرکاری اور غیر سرکاری اداروں پر مشتمل ہو۔ ایسی مجلس کے قیام کی صورت میں معاشی کمیٹی اس امر کا اظہار ضروری سمجھتی ہے کہ وہ اپنے نمایندوں کے ذریعہ مجلس مذکور کے کاموں میں کما حقہ تعاون کرنے کیلئے آمادہ ہے۔

۴۔ اجناس خوردنی کی فروخت دکانوں پر نگرانی کے لئے معاشی کمیٹی کی جانب سے بھی بعض ارکین رضاکارانہ طور پر کام کرنے تیار ہیں۔ اگر سر رشتۂ متعلقہ معاشی کمیٹی کی اس پیش کش سے استفادہ کرنا چاہے تو ایسے رضاکار ارکین کے نام روانہ کئے جائینگے۔

۵۔ موجودہ حالات کے تحت اور بلدہ حیدرآباد کے جغرافی خصوصیات کے لحاظ سے تمام اجناس خوردنی کیلئے راتب بندی کا عمل قرین مصلحت نہیں معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کا قوی احتمال ہے کہ بلاک مارکٹ (BLACK MARKET) اس کے نفاذ کے بعد خوب زور پکڑیگی۔ البتہ ان اجناس کی حد تک جن کا رسد کا دارو مدار زیادہ تر بیرون ملک کی درآمد پر ہے اور جو اجناس فی الوقت بہت کم مقدار میں دستیاب ہو رہے ہیں۔ ان کی تقسیم کے لئے راتب بندی ضروری ہے لیکن مناسب طور پر ایسی تقسیم عمل میں لانے کیلئے بہتر صورت یہ ہوگی کہ راتب بندی کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی جائے۔ جس میں مختلف اداروں اور طبقات کی جانب سے نمایندگی ہو۔ اس کے لئے معاشی کمیٹی بھی ممکنہ تعاون کرنے کے لئے تیار ہے۔

۶۔ موجودہ گرانی کے اثرات ایسے تنخواہ یاب یا اُجرت یاب طبقوں پر بہت زیادہ پڑ رہے ہیں جن کی آمدنی کے ذرایع محدود ہیں اور انکی آمدنی ہیں اس شرح سے اضافہ نہیں ہو رہا ہے جس شرح سے اشیا کی قیمتیں بڑھ رہی ہیں۔ چنانچہ اس کا تدارک مناسب شرح کے ساتھ تنخواہوں اور اجرتوں میں اضافہ سے کیا جاسکتا ہے جہاں ادنی درجہ سرکاری ملازمین کو گرانی الونس دیا جارہا ہے۔ اوس میں مزید اضافہ کی ضرورت ہے اور متوسط طبقہ کے سرکاری ملازمین بھی چونکہ گرانی سے بہت متاثر ہو رہے ہیں ان کو بھی گرانی الونس دیا جانا مناسب ہوگا۔ علاوہ ازیں غیر سرکاری ملازمین اور خصوصاً کارخانوں کے مزدور، زرعی مزدور، اور خانگی ملازمین وغیرہ کی اجرتوں میں بھی فوری اضافہ کے لئے کارخانہ داروں اور دیگر کاروباری طبقوں کو ہر طرح پابند کرنیکی ضرورت ہے۔

۷۔ تنخواہوں اور اجرتوں کے اضافہ کے ساتھ افراط زر یا محصول آمدنی کا سوال درپیش ہوتا ہے چنانچہ اس سلسلہ میں آمدنی کے ذرایع بڑھانے کی ضرورت ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ممالک محروسہ سرکار عالی میں محاصل کا بار زیادہ آمدنی رکھنے والے طبقوں پر ابتک بہت ہی کم ہے اور خصوصاً فی الوقت کارخانہ دار، گتہ دار، تجار و ساہوکار طبقے جس کثرت سے نفع اندوزی کر رہے ہیں۔ اس کے تدارک کے لئے انکم ٹیکس کا

فوری رائج کرنا معاشی کمیٹی کی رائے میں از بس ضروری ہے۔ انکم ٹیکس کے علاوہ دیگر ایسے ٹیکسوں عاید کرنے کی بھی ضرورت محسوس ہو رہی ہے جن سے ملک کا معاشی توازن برقرار رہ سکے۔

۸۔ معاشی کمیٹی کی رائے میں اندرون ممالک محروسہ سرکار عالی اشیاء خوردنی کے نقل و حمل میں کم سے کم موانعات ہونے چاہئیں تاکہ ملک کے تمام حصوں کی رعایا یکساں طور پر اجناس خوردنی حاصل کرسکے۔ اس لئے ریلوے کے جانب سے نقل و حمل کی زیادہ سے زیادہ سہولتیں بہم پہونچائی جانی چاہئیں۔ اور کافی تعداد ریلوے واگنوں کے مہیا کئے جانے کی ضرورت ہے۔

علاوہ ازیں ملک کی مقامی سواریوں مثلاً بنڈی۔ بیل۔ گاڑیوں کی بروقت فراہمی کیلئے ملک میں ایک تنظیم قایم کرنے کی ضرورت ہے جن سے ملک کے ایسے حصوں میں جہاں ریلوے لائین نہیں ہے بہ آسانی نقل و حمل کی جاسکے۔

اس سلسلہ میں مقامی عہدہ داروں سے بھی یہ توقع بے جا نہ ہوگی کہ وہ مقامی ضروریات کے بعد جو غلہ بچ رہے اسکو دیگر اضلاع کی رعایا کیلئے روانہ کرنے میں ممکنہ امداد سے دریغ نہ کرینگے۔

۹۔ ناجائز طور پر اجناس کے جو ذخیرے جمع کئے جارہے ہیں۔ ان سے ملک کی غذائی صورت حال بہت نازک ہورہی ہے۔ جہاں ایسے ذخیرے جمع کرنے کے مرتکب تجار اور بیوپاری ہورہے ہیں وہاں انفرادی طور پر بعض افراد بھی اپنی ضروریات سے بہت زیادہ غلہ فراہم کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ ذخائر کی نشان دہی کیلئے حکومت کی جانب سے جو احکام صادر ہوئے ہیں ان میں خود بہت رعایت برتی گئی ہے۔ تاہم ان احکام کی بڑی سختی کے ساتھ پابندی کرائی جانے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں ارکین معاشی کمیٹی بھی اس امر کی رضاکارانہ کوشش کرنے مستعد ہیں کہ ایسے ناجائز ذخائر کا پتہ معلوم کرکے ان کی اطلاع متعلقہ ارباب حکومت کو دیں۔ آخر میں معاشی کمیٹی اہل ملک سے یہ توقع کرتی ہے کہ وہ بھی فرداً فرداً ایسے ناجائز ذخائر کی موجودگی کا صحیح صحیح پتہ دینگے معاشی کمیٹی کی رائے میں آیندہ ضرورت ہو تو فاضل اجناس کے ذخائر کو حکومت حاصل کرے اور ان کی مناسب قیمتوں پر منصفانہ تقسیم کا انتظام کرے۔ فقط

آموں کی نمائش: رپورٹ

زیر سرپرستی مجلس نمائش معاشی کمیٹی انجمن طیلسانیین عثمانیہ آموں کی ایک نمائش بمقام پبلک گارڈن (باغ عامہ) بلدۂ حیدرآباد بتواریخ ۳ تا ۵ امرداد ۱۳۵۲ف منعقد ہوئی۔ اس نمائش کا مقصد یہ تھا کہ ممالک آصفیہ میں آموں کے پھل اور درخت کی واخت و پرداخت کا شوق پیدا کیا جائے۔ اور آموں سے مختلف کار آمد مرکبات تیار کرنے کی ترغیب دی جائے۔ اس غرض سے ایک مجلس عاملہ بصدارت جناب پروفیسر محمد سعید الدین صاحب صدر شعبۂ نباتیات جامعۂ عثمانیہ ترتیب دی گئی۔ اس کے معتمد نجم الدین بی۔ اے عثمانیہ اور ارکین جناب تشنکر پلے صاحب بی۔ اے ماہر فواکہات سرکار عالی۔ مولوی محمد غوث صاحب ایم۔ اے یل یل بی (عثمانیہ) رائے شنکرجی صاحب بی۔ اے یل یل بی (عثمانیہ) مولوی شرف الدین صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) مہندراج صاحب ایم۔ یس۔ سی (عثمانیہ) مولوی خواجہ حمید احمد صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) مولوی عبدالوحید صاحب ایم یس۔ سی عثمانیہ۔ محمد عبدالسلام صاحب ایم یس۔ سی عثمانیہ۔ محمد عبدالعلی صاحب بی۔ یس۔ سی۔ یل یل۔ بی عثمانیہ تھے۔ ایک مجلس مشاورت بھی ترتیب دی گئی تھی۔ جس کے ارکین حسب ذیل تھے۔

۱۔ عالیجناب نواب میر اکبر علیخاں صاحب بیرسٹرایٹ لا۔ ۲۔ ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی ۳۔ نواب میر احمد علی خاں صاحب۔ ۴۔ یل۔ ین گپتا صاحب یچ سی۔ ایس۔ ۵۔ نواب دوست محمد خاں صاحب جاگیردار ۶۔ مولوی مظہر حسین صاحب ناظم اعداد شمار سرکار عالی۔ ۷۔ رائے صاحب کالیداس سہانی صاحب ناظم زراعت تحقیقات۔ ۸۔ رائے مہندر بہادر صاحب ناظم زرعی اشاعت سرکار عالی۔ ۹۔ ڈاکٹر ہاشم امیر علیخاں صاحب چیف مارکٹنگ آفیسر ۱۰۔ محمد علی صاحب۔ ۱۱۔ محمد حسن خاں صاحب نمائندگان تجار فواکہات۔

بتاریخ ۳ امرداد ۱۳۵۲ف بوقت ساڑھے چار ساعت شام نواب خسرو جنگ بہادر معز رکن باب حکومت سرکار عالی نے نمائش کا افتتاح فرمایا۔ افتتاح کی درخواست کرنے سے پہلے پروفیسر محمد سعید الدین صاحب نے ایک پر از معلومات تقریر فرمائی۔ جس میں نہ صرف حیدرآباد میں آم کی کاشت کے ماضی و مستقبل پر گہری نظر

ڈالی بلکہ آم کے درخت پر علم نباتات کی روشنی میں بحث کی اس کی تاریخ اسکی کاشت افزایش کے طریقے آم کے اقسام وغیرہ پر تفصیلی روشنی ڈالی نواب صاحب موصوف نے اس کے بعد مختصر مگر جامع تقریر کی۔

"میری آنکھوں میں آموں کی رنگینیاں گھوم رہی ہیں۔ اور میری زبان کو دعوت لطافت دے رہی ہیں۔ جس قدر جلد ہو سکے میں آم کے سربہ مہر گلاس کو پینا چاہتا ہوں۔ آموں سے متعلق میں غالب کے عقیدہ کا بالکل ہم نوا ہوں۔ اور بڑی مسرت کیساتھ اس نمائش کی افتتاح کرتا ہوں"

جب نواب صاحب ممدوح افتتاح کی رسم ادا کرتے ہوئے ریشمی فیتہ کو قطع فرما رہے تھے تو کیولری بیانڈ سلامی ادا کر رہا تھا۔ اعلیٰ عہدہ داران سرکاری و معززین شہر و طیلسانئین عثمانیہ تقریباً پانسو کی تعداد میں مدعو تھے۔ ان کے علاوہ تین دن تک تقریباً ایک ہزار شایقین نے نمائش کا معائنہ کیا۔ عام خیال یہ تھا کہ یہ پہلی نمائش جس قلیل سرمایہ کے ساتھ جس طرح کامیاب ہوئی وہ بہت ہمت افزا ہے۔ اموں کی جتنی قسمیں نمائش میں دیکھنے میں آئیں۔ اس کا بازاروں میں بہت کم وجود رہتا ہے۔

کل بتیس (۳۲) مشہور قسموں مثلاً الفن۔ گوا۔ ملغوبہ۔ بے نشان۔ وغیرہ وغیرہ کے علاوہ چھہ۔ بارہ۔ وچوبیس قسم کے پیوندی آموں کے مجموعاً چھ قسم کے تخمی آموں کے مجموعہ و نیز نمائش میں بہترین قسم کے تخمی آم۔ اچار چٹنی۔ مربے۔ جلّی۔ شربت وکھا وغیرہ کے مقابلے کا اعلان ہوا تھا۔ ان ہی اشیاء کے فروخت کے لئے اسٹال قائم کرنے کی بھی اجازت تھی۔ نمائش کے افتتاح سے قبل مولوی مظہر حسین صاحب ناظم اعداد و شمار پروفیسر محمد سعید الدین صاحب صدر شعبۂ نباتیات جامعہ عثمانیہ۔ شنکر پلے صاحب ماہر فواکہات سرکار عالی اور مجاہد علی صاحب عاقل مہتمم باغ عامہ نے انعامات کا تصفیہ کیا۔ انعامات پانے والے اشیاء پر درجہ واری انعامات کا لیبل چسپاں کر دیا گیا۔ اکتالیس مقابلہ کنندوں نے نمائش میں حصہ لیا۔ آموں اور مرکبات کے فروخت کے بھی دو اسٹال قائم ہوئے۔ شعبہ فواکہات سررشتۂ زراعت تحقیقات سرکار عالی نے آم کی سروے کے سلسلہ میں مختلف باغات سے جو آم جمع کئے اور ان کے رنگین نقوش تیار کئے ہیں ان کا مظاہرہ کیا۔ سررشتۂ اعداد و شمار کی جانب سے ریاست حیدرآباد کا ایک نقشہ پیش کیا گیا تھا۔ جس میں مختلف اضلاع میں تخمی و پیوندی آموں کی کس قدر رقبہ پر کاشت کی جاتی ہے اس کو نمایاں کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ آموں کی پیداوار

درآمد وغیرہ کے اعداد بھی پیش کئے گئے تھے تصاویر کے ذریعہ مارکٹنگ کے طریقوں وغیرہ سے متعلق معلومات بہم پہنچائی گئیں۔ نہ صرف بلدہ و اطراف بلدہ کے باغات سے آم نمائش میں لائے گئے تھے بلکہ اورنگ آباد رائچور۔ میدک۔ ورنگل۔ کریمنگر۔ نلگنڈہ سے بھی نمائندگی ہوئی۔

اعلان کردہ (۳۲) مشہور قسموں کے علاوہ دیگر (۵۵) قسم کے نمونے پیش کئے گئے تھے۔ ان میں قابلِ ذکر باغات خسروی کے خاص آموں کے نادر نمونے تھے جو خاص طور پر خاصہ مبارک کیلئے مخصوص سمجھے جاتے ہیں مثلاً شربت گھڑی پاشاہ پسند حضور پسند۔ گلقند۔ مصری ملائی۔ دردانہ بہشت۔ لال موتیا۔ تخمی۔ واصو تخمی ماشاء اللہ۔ سبحان اللہ۔ بتاشہ وغیرہ وغیرہ۔ ان ہی میں سے سب سے وزنی آم دودیہ ملغوبہ تھا۔ جس کو پکنے اور بڑنے کیلئے ابھی مہینہ ڈیڑھ مہینہ درکار تھا۔ مگر اس کا وزن ابھی سے تقریباً دو ڈھائی سیر سے زیادہ تھا۔ ان آموں کی شیرینی و خوشبو وغیرہ کا کیا ذکر ہو سکتا ہے۔ ان کے علاوہ دیگر اشخاص کے پاس سے جو نمونے حاصل ہوئے ان میں قابل ذکر ثمر بہشت۔ خسرو پسند۔ سیب۔ ہملیٹ۔ ٹیبز۔ کالاپہاڑ۔ مرشد آباد ہیں۔ ثمر بہشت نہایت شیریں پھل تھا۔ جو منیجر صاحب عنبر پیٹھ کالونی نے روانہ کیا تھا۔ نواب سالار جنگ بہادر کے علاقہ کا ایک آم موسوم بہ سیب بالکل اسم بامسمٰی شکل و رنگ میں بالکل سیب کے مشابہ تھا جسامت کے لحاظ سے قابلِ ذکر ہملیٹ و ٹیبز تھے۔ جن کا وزن ڈھائی سیر کے قریب تھا۔ راجہ دھرم کرن بہادر کے پاس کا ایک آم کالاپہاڑ اگرچہ بظاہر سوک گیا اور سوکڑ گیا تھا مگر مزا میں کچھ خرابی پیدا نہ ہوئی تھی۔ مرشد آباد اپنی سرخ رنگت کیلئے بہت پسند کیا گیا۔

درجہ اول کے کل (۳۲) انعام۔ درجہ دوم کے کل (۲۷) انعام۔ درجہ خاص کے (۵) انعامات دیئے گئے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ باغات علاقہ صرفخاص مبارک (۱۲) انعام ۲۔ باغات علاقہ نواب سالار جنگ بہادر (۲) انعام ۳۔ باغات علاقہ راجہ دھرم کرن بہادر (۹) انعام۔ ۴۔ قادر باغ نزد فتح نگر داخلہ کنندہ مولوی محمد یوسف الدین صاحب یم۔ اے (عثمانیہ) (۸) انعام۔ ۵۔ باغات علاقہ مقطعہ کوٹیال و حلیم نگر واقع سدی پیٹھ ضلع میدک۔ داخل کنندہ مولوی عز الدین محمد صاحب (۷) انعامات۔ ۶۔ مولوی برہان الدین صاحب (۶) انعامات۔ ۷۔ مولوی عبدالعزیز صاحب

فرزند عبدالجلیل صاحب مددگار معتمد فوج (۲) انعامات۔ ۸۔ باغات علاقہ واحد نگر داخل کنندہ نواب میر احمد علی خاں صاحب جاگیردار (۱) انعام۔ ۹۔ مولوی اکبر بیگ صاحب انجنیر وظیفہ یاب (۲) انعامات ۱۰۔ ہنگل وینکٹ راما ریڈی صاحب (۲) انعامات۔ ۱۱۔ یل۔ سی۔ آنند صاحب (۲) انعامات ۱۲۔ منیجر صاحب عنبر پیٹھ کالونی (۲) انعامات۔ ۱۳۔ کریم اللہ صاحب (۱) انعام۔ ۱۴۔ شیورام صاحب پشاوری (۱) انعام ۱۵۔ الگیر ریڈی صاحب سری نواس ریڈی صاحب (۱) انعام۔ ۱۶۔ خالدہ بیگم (۱) انعام۔ ۱۷۔ شعبۂ فواکہات سررشتۂ زراعت تحقیقات سرکار عالی (۱) انعام ۱۸۔ باغ گلزار اولیا ورنگل (۱) انعام۔ ۱۹۔ سیّد محمد یونس صاحب انجنیر (۱) انعام۔ ۲۰۔ شرف الدین صاحب (۱) انعام۔

حسب ذیل اصحاب نے انعامات بشکل رقومات کپ وتحفہ عطا فرمانے روانہ فرمائے جنکو شکریہ کیساتھ قبول کیا گیا۔
۱۔ نواب سر صدر اعظم بہادر باب حکومت سرکار عالی۔ ۲۔ نواب غازی یار جنگ بہادر رکن عدالت العالیہ وظیفہ یاب۔ ۳۔ پروفیسر محمد سعید الدین صاحب۔ ۴۔ محمد غوث صاحب یم۔ اے یل یل بی۔ ۵۔ مولوی عبدالوحید صاحب یم یس سی۔ ۶۔ نواب اکبر یار جنگ بہادر رکن عدالت العالیہ وظیفہ یاب۔ ۷۔ مولوی شرف الدین صاحب بی اے (عثمانیہ) ۸۔ مولوی محمد عبدالعلی صاحب بی یس سی۔ یل یل بی۔ و نیز حسب ذیل اصحاب نے انعامات روانہ فرمانے کا وعدہ فرمایا ہے۔ ۱۔ نواب مہدی نواز جنگ بہادر معتمد کمرشیل کارپوریشن۔ ۲۔ راجہ بہادر وینکٹ راما ریڈی صاحب او۔ بی۔ ای کوتوال بلدہ وظیفہ یاب۔ ۳۔ نواب حسین جنگ بہادر معتمد اسٹیٹ نواب کمال یار جنگ بہادر

آخر میں ہم ان سب حضرات کا شکریہ ادا کرے بغیر نہیں رہ سکتے جنہوں نے مختلف قسم سے نمایش کو کامیاب بنانے میں حصہ لیا۔ سرکاری سررشتوں میں سررشتۂ اعداد وشمار وشعبۂ فواکہات سررشتۂ زراعت تحقیقات۔ خاص طور پر قابل ذکر ہیں کہ انہوں نے نمایش میں علمی حصہ لیا سررشتۂ آرایش بلدہ ومحکمۂ سیاسیات وفراش خانہ سرکار عالی نے بلدیۂ باغ عامہ ومحکمۂ فوج نے عمارت اور فرنیچر استعمال کیلئے عطا کیا اور صفائی وآرایش میں مدد دی۔ اور خود مجلس نمایش معاشی کمیٹی نے مالی امداد کرکے نمایش کو کامیاب بنانے میں ہاتھ بٹایا۔ آخر میں نواب خسرو جنگ بہادر معزز رکن باب حکومت مولوی مظہر حسین صاحب پروفیسر سعید الدین صاحب شنکر پلے صاحب مجاہد علی صاحب عاقل محمد علی صاحب موسوی کے علاوہ تمام ارکین مجلس عاملہ ومشاورت نمایش آئندہ قابل تشکر ہیں فقط

نجم الدین اعزازی معتمد نمایش آئندہ

۸	سندھ	۱۳
۹	تعلقہ بورسیڈ (واقع گجرات[1])	۲۱٫۵
۱۰	موضع اٹیگام (واقع گجرات[2])	۲۷٫۵
۱۱	موضع پنٹہ (واقع حیدرآباد دکن[3])	۳۲٫۶
۱۲	موضع پن گنٹہ (واقع حیدرآباد دکن[4])	۴۳٫۲
۱۳	موضع پھل مامڑی (واقع حیدرآباد دکن)	۱۴٫۵
۱۴	موضع دوپلی (موضع زیر بحث)	۱۵

مندرجہ بالا اعداد کے دیکھنے سے واضح ہے کہ زیر بحث موضع میں بھی برما، آسام اور پنجاب وغیرہ کی طرح غیر مقروض خاندانوں کا اوسط نسبتاً بہت کم ہے۔ ذیل میں فی کس اوسط قرض کے تقابلی اعداد دیئے گئے ہیں۔

نام مقام	اوسط قرضہ فی کس		نام مقام	اوسط قرضہ فی کس	
	حالی	کلدار		حالی	کلدار
پنجاب	۶۶٫۱۲	۵۷	مارواڑ	۵۱٫۰۴	۴۴
صوبجات متحدہ	۲۹	۲۵	تعلقہ بورسیڈ	۱۲۵٫۲۸	۱۰۸
بھار واڑیسہ	۴۷٫۵۶	۴۱	موضع اٹیگام	۴۹٫۸۸	۴۳
صوبجات متوسط	۲۶٫۶۸	۲۳	موضع پنٹہ	۲۳	۱۹٫۸۲
برما	۴۲٫۹۲	۳۷	موضع پن گنٹہ	۴۲	۳۶٫۲
آسام	۲۷٫۸۴	۲۴	موضع پھل مامڑی	۵۱	۴۳٫۹۶
شمال مشرقی سرحدی صوبہ	۵۱٫۰۴	۴۴	موضع دوپلی	۳۵	۳۰٫۱۷

[1] یہ اعداد مسٹر ایم۔ ڈی ڈارلنگ کی کتاب ہندوستانی زرعی قرض کے صفحہ ۲۳۴ سے لئے گئے ہیں۔ [2] ان اعداد کو مسٹر جی سی مکنیار صفحہ (۲۳۸) دیئے ہوئے اعداد کی مدد سے ہم نے فیصد نکالا ہے۔ [3] "موضع پنٹہ" کی معاشی تحقیق" از محمد ناصر علی صاحب صفحہ ۲۵ [4] "موضع پن گنٹہ کی معاشی تحقیق" از شیخ علی مجلہ عثمانیہ جلد ۱۱ صفحہ ۵۰ [5] موضع پھل مامڑی کی معاشی تحقیق از احمد خاں (مضمون غیر مطبوعہ) نوٹ۔ ۱۱۶ حالی مساوی ہے ۱۰۰ کلدار روپیوں کے۔

مندرجہ بالا اعداد سے واضح ہے کہ صوبہ جات متحدہ صوبہ جات متوسط اور آسام کی طرح موضع دوپلی میں بھی قرض کا اوسط کم ہے۔ مسٹر بھروچہ زائد معتمد مال نے ۱۳۴۵ف (م اکٹوبر ۳۶-۱۹۳۵ء) میں حیدرآباد کے ۳۱۲ مواضعات میں زرعی قرضہ جات کی تحقیق کی (واضح رہے کہ صاحب موصوف کی تحقیق صرف زمیندار جماعتوں تک محدود تھی۔) اور اپنی رپورٹ ۱۳۴۶ف (م اکٹوبر ۳۷-۱۹۳۶ء) میں شائع کی۔ اس رپورٹ میں فی کس قرض کا بار ۳۰ روپیہ حالی بتلایا گیا ہے جو کہ ۸۶ء ۲۵ روپیے کلدار کے مساوی ہے۔ موضع زیر بحث میں فی کس قرض کا بار مسٹر بھروچہ کے اعداد سے ۶۶ء۱۶ فیصد بڑھا ہوا ہے۔ لیکن اسکے باوجود یہ کہا جاسکتا ہے کہ موضع ہذا میں قرض کا بار کچھ زیادہ نہیں۔

۳۔ قرض کی ماہیت قرض کی تقسیم اور بار قرض کی تشریح کے بعد اب ہم اپنی توجہ ایک دوسرے دلچسپ عنوان یعنی ماہیت قرض کی طرف مبذول کرتے ہیں۔ اس عنوان کے تحت ہم یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ مجموعی قرض میں سے (۱) سودی قرض کسقدر ہے اور غیر سودی کسقدر (۲) اسی طرح کفالتی قرضہ کتنا ہے اور غیر کفالتی کتنا (۳) جنسی قرضہ کسقدر ہے اور غیر جنسی کسقدر (۴) ذاتی۔ آبائی اور مخلوط قرضوں کی کیا مقدار ہے۔ ذیل میں ان امور کی سلسلہ وار تشریح کیجاتی ہے۔

(۱) سودی اور غیر سودی قرض —— واضح رہے کہ غیر سودی قرض سے ہماری مراد قرض حسنہ ہے۔ اس قسم کے قرض کی مقدار بہت ہی قلیل ہے۔ ۴۰۸۲۵ روپیوں میں سے غیر سودی قرض کی مقدار صرف ۵۲۵ ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ مجموعی قرض کا لحاظ کرتے ہوئے غیر سودی قرض ۳ء۱ فی صد ہے۔ باقی ۴۰۳۰۰ روپیے یا ۷ء۹۸ فیصد قرض سودی ہے۔

غیر سودی قرض عموماً عزیز و اقارب ایک دوسرے سے حاصل کرتے ہیں۔ ان قرضوں کی مقدار بالعموم ۵ - ۱۰ - ۱۵ - ۲۰ اور ۲۵ روپیوں سے زاید نہیں ہوتی۔ بعض مرتبہ ساہوکار بھی معتبر آسامیوں کو (جنسے ان کے دوستانہ تعلقات ہیں) ایک قلیل عرصہ کیلئے غیر سودی قرض دیتے ہیں۔

(۲) کفالتی اور غیر کفالتی قرض —— جسطرح غیر سودی قرض کی مقدار بہت محدود ہے اس طرح کفالتی قرض بھی بہت ہی قلیل ہے۔ ۴۰۸۲۵ روپیوں میں سے ۳۹۲۳۵ روپیہ غیر کفالتی قرضہ ہے

اور ۱۵۹۰ روپیہ کفالتی قرض ہے۔

۱۵۹۰ روپیوں میں سے ۱۳۵۲ روپیے جائداد غیر منقولہ مثلاً زمین اور مکانات کی کفالت پر حاصل کئے گئے ہیں۔ باقی ۲۳۸ روپیہ قرض اشیاء منقولہ (مثلاً سونے چاندی کی چیزیں) کی کفالت پر لیا گیا ہے۔

واضح رہے کہ مجموعی قرض کا لحاظ کرتے ہوئے کفالتی قرضہ ۹ر۱ فیصد ہے اور غیر کفالتی قرض ۹۸٫۱ فیصد ہے۔ کسانوں کیلئے یہ چیز بہت ہی باعث سہولت ہے کہ انہیں غیر کفالتی قرضہ بآسانی ملجاتا ہے شہروں میں ہم دیکھتے ہیں کہ چھوٹی چھوٹی رقومات بھی عموماً بغیر کفالت کے قرض نہیں دیجاتیں۔ خصوصاً بنیئے تو بغیر کفالت قرض ہی نہیں دیتے۔ اگر دیہاتوں میں بھی یہی کیفیت ہوتی تو زراعتی کاروبار کا چلنا محال تھا۔

دیہاتی چونکہ عموماً دیانت دار ہوتے ہیں لہذا انہیں غیر کفالتی قرضہ بآسانی ملجاتا ہے۔ چنانچہ ایک ساہوکار نے ہم پر اس کا اظہار بھی کیا ہے کہ اوسکو دیہاتوں کی جائداد سے کہیں زیادہ انکی زبان کا لحاظ ہوتا ہے۔ ساہوکار چونکہ ہر دیہاتی سے شخصی طور پر بخوبی واقف رہتے ہیں اس لئے غیر کفالتی قرض کے دینے میں پس و پیش نہیں کیا جاتا۔ ساہوکاروں کو اس امر کا یقین ہوتا ہے کہ اونکا قرضہ ڈوبیگا نہیں۔ آج نہیں تو کل۔ باپ سے نہیں تو بیٹے سے ضرور وصول ہو جائیگا۔

(۳) جنسی ورقمی قرض ـــــ رقمی قرض سے ہماری مراد وہ قرض ہے جو بشکل زر دیا جائے جنسی قرض وہ ہے جو جنس کی شکل میں دیا جائے۔ موضع زیر بحث میں ہر دو قسم کے قرض مروج ہیں۔

جنسی قرضے عام طور پر خوراک اور تخم ریزی کے لئے حاصل کئے جاتے ہیں مگر یہ بالعموم قلیل المقدار ہوتے ہیں۔ ۴۰۸۲۵ روپیوں میں سے رقمی قرضہ ۴۰۱۷۳ روپیہ ہے۔ جنسی قرض کی مقدار (تقریباً ۹ کھنڈی)[۵۳] ۶۵۲ روپیے کے ہم مقدار ہے۔ مجموعی قرض کے تناسب سے جنسی قرضہ ۱٫۶ فیصد ہے اور غیر جنسی یعنی رقمی قرض ۹۸٫۴ فیصد ہے۔

(۴) ذاتی آبائی اور مخلوط قرضے ـــــ ذاتی قرضوں میں ان قرضوں کو شامل کیا گیا ہے جسکو

---

۵۲ ۔ دوسرے ضمیمے میں صفحہ ۱۸۳ اسکے متعلق ایک بیان موجود ہے۔

۵۳ ۔ ایک کھنڈی ۲۰ من کی ہوتی ہے۔ اور ایک من ۱۶ پائیلی کا۔ ایک پائیلی ۴ سیر کے مساوی ہوتی ہے۔

کسی شخص موجودنے بذاتہ حاصل کیا ہو۔ آبائی قرضوں سے وہ قرضے مراد ہیں جو کسی شخص موجود کو ورثے میں ملے ہوں۔ بعض افراد کے قرضے اس نوعیت کے ہیں کہ انہیں نہ تو کلیتاً آبائی قرض کہا جا سکتا ہے۔ اور نہ ذاتی۔ لہٰذا اس قسم کے قرضوں کو مخلوط قرضوں کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ ذیل کے جدول میں ذاتی۔ آبائی اور مخلوط قرضوں کی تفصیل دی گئی ہے۔

نوعیت قرضہ جات	قرضہ جات		فی صد بلحاظ	
	تعداد	رقم	مجموعی تعداد	مجموعی رقم
ذاتی قرضے	۶۰۶	۳۰۹۱۸	۸۱	۷۶
آبائی قرضے	۱۲۰	۶۹۹۲	۱۶	۱۷
مخلوط قرضے	۲۲	۲۹۱۵	۳	۷
جملہ	۷۴۸	۴۰۸۲۵	۱۰۰	۱۰۰

مندرجہ بالا اعداد سے واضح ہے کہ جملہ قرضوں کی تعداد (جنکو ہر آسامی نے مختلف ساہوکاروں سے حاصل کیا ہے) ۷۴۸ ہے۔ ۷۴۸ قرضوں میں سے ۶۰۶ یا ۸۱ فی صد قرضے ذاتی ہیں۔ ۱۲۰ یا ۱۶ فیصد آبائی ۲۲ یا تقریباً ۳ فیصد مخلوط ہیں۔ اسی طرح رقم کا لحاظ کرتے ہوئے ۴۰۸۲۵ روپیوں میں سے ۳۰۹۱۸ یا ۷۶ فیصد روپیہ ذاتی قرض سے متعلق ہے۔ ۶۹۹۲ یا ۱۷ فیصد قرض آبائی ہے۔ ۲۹۱۵ یا ۷ فیصد مخلوط ہے۔

اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ مخلوط قرض (۲۹۱۵) میں بھی ۱۶ فیصد قرضہ آبائی ہے تو اس مفروضہ کی بنا پر ۴۰۸۲۵ روپیوں میں سے ذاتی قرض کی مقدار ۳۱۳۸۴ رہتی ہے اور آبائی قرض ۹۴۴۱ روپیہ رہتا ہے۔ اس طرح مجموعی قرض کا لحاظ کرتے ہوئے ذاتی قرض کی مقدار ۷۷ فیصد اور آبائی قرض کی ۲۳ فیصد ہے۔ بالفاظ دیگر ذاتی اور آبائی قرض کا باہمی تناسب تقریباً ۷ اور ۲ رہتا ہے۔ اس نتیجہ کو دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اگر مجموعی قرض ۹ روپیہ ہے تو اسمیں ذاتی قرضہ ۷ روپیہ اور آبائی ۲ روپیہ ہے۔ مانا کہ ذاتی قرض کے مقابل آبائی قرض کی مقدار بہت کم ہے لیکن یہی قلیل مقدار کسان کی مصیبتوں میں اور زیادتی کر دیتی ہے

واضح رہے کہ ۲۱۱ مقروض خاندانوں میں سے ۱۴۸ یا تقریباً ۷۱ فیصد خاندان ایسے ہیں جن کے مجموعی قرض میں آبائی قرض کا کچھ نہ کچھ جزو شامل ہے۔ صرف ۶۳ یا ۲۹ فیصد خاندان ایسے ہیں جن کے مجموعی قرض میں آبائی قرض کا کوئی جزو شریک نہیں۔ جب کہ ۷۱ فیصد خاندانوں کو قرض کا کچھ نہ کچھ جزو بطور ورثے کے ملا ہے تو ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ موضع زیر بحث کے کسانوں کی اکثریت بھی مقروض پیدا ہوتی مقروض زندگی بسر کرتی اور مقروض فوت ہوتی ہے

۴۔ قرض کی خصوصیات موضع ہذا میں قرضہ جات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ عموماً ایک سے زاید ساہوکاروں سے حاصل کئے جاتے ہیں۔ بہت کم قرضے ایسے ہیں جو صرف ایک ساہوکار سے حاصل کئے گئے ہیں۔ ذیل کے اعداد سے ہمارے اس بیان کی وضاحت ہوتی ہے۔

قرضے	تعداد	فیصد
وہ قرضے جو صرف ایک ساہوکار سے حاصل کئے گئے ہیں۔	۴۹	۲۳
وہ قرضے جو دو ساہوکاروں سے حاصل کئے گئے ہیں	۳۲	
" ۳ " "	۵۱	
" ۴ " "	۲۲	
" ۵ " "	۱۷	
" ۶ " "	۱۳	۷۷
" ۷ " "	۸	
" ۸ " "	۶	
" ۹ " "	۶	
" ۱۰ " "	۴	
" ۱۱ " "	۳	
جملہ	۲۱۱	۱۰۰

سابقہ صفحہ کے اعداد سے ظاہر ہے کہ جملہ ۲۱۱ قرضوں میں سے صرف ۴۹ یا ۲۳ فیصد قرضے ایک ساہوکار سے حاصل کئے گئے ہیں۔ باقی ۱۶۲ یا ۷۷ فیصد قرضے دو تا بارہ مختلف ساہوکاروں سے حاصل کئے گئے ہیں۔

واضح رہے کہ کسان کی مقروضیت کا آغاز ایک ساہوکار سے ہوتا ہے۔ ابتداً منہ مانگی رقم قرض ملتی رہتی ہے اور سود و اصل کا مطالبہ بھی شدت کے ساتھ کیا جاتا ہے لیکن کچھ مدت بعد جب کہ قرض کی مقدار بڑھ جاتی ہے تو ساہوکار کا طرزِ عمل بالکل بدل جاتا ہے۔ اور اب وہ جدید قرض دینے کی بجائے واجب الوصول اصل و سود کا سختی سے مطالبہ کرتا ہے لہذا کسان دوسرے ساہوکار سے تھوڑی بہت رقم حاصل کرکے قدیم ساہوکار کے قرض کا ایک حصہ بے باق کرتا ہے۔ لیکن اسی اثناء میں کسان کو بیل کی خریدی یا کسی دوسرے اہم کام کے لئے مزید قرضے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے نتیجہ یہ کہ وہ تیسرے ساہوکار کے ہاں جاتا ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے چنانچہ ہماری تحقیق کے مطابق ۳ خاندان گیارہ مختلف ساہوکاروں کے مقروض ہیں۔

قرضہ جات[1] کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ زیادہ تر قلیل المقدار (مثلاً ۵-۱۰-۱۵-۲۰ اور ۲۵) ہوتے ہیں۔ چونکہ اکثر کسانوں کا مجموعی قرض متعدد اجزاء پر مشتمل ہوتا ہے لہذا ۲۱۱ مقروض خاندانوں کے مجموعی قرضہ جات (۲۱۱) میں ۸۴۷ چھوٹے چھوٹے قرضے شامل ہیں جو کہ ۱ تا ۱۲ مختلف ساہوکاروں سے حاصل کئے گئے ہیں۔ ذیل کے اعداد میں بتلایا گیا ہے کہ بلحاظ مقدار ان قرضوں کی کیا نوعیت ہے۔

نوعیت قرضہ جات	تعداد	فیصد
وہ قرضے جن کی مقدار ۱۰ روپیہ سے کم ہے۔	۱۴۹	
وہ قرضے جن کی مقدار ۱۰ اور ۱۵ روپیہ کے درمیان ہے	۲۵۱	٦۰
〃 〃 ۱۵ 〃 ۲۵ 〃	۵۱	
〃 〃 ۲۵ 〃 ۵۰ 〃	۹۹	

---

[1] پچھلے صفحہ پر قرض سے مراد کسی شخص کا مجموعی قرض ہے۔ اس صفحہ پر قرض سے ہماری مراد کسی شخص کا مجموعی قرضہ

وہ قرضے جن کی مقدار ۵۰ اور ۱۰۰ روپیہ کے درمیان ہے۔	۱۰۳	۲۷
,, ,, ۱۰۰ ,, ۲۰۰ ,,	۷۰	
,, ,, ۲۰۰ ,, ۳۰۰ ,,	۱۲	۱۳
,, ,, ۳۰۰ ,, ۴۰۰ ,,	۸	
,, ,, ۴۰۰ ,, ۵۰۰ ,,	۵	
جملہ....................................	۷۴۸	۱۰۰

مندرجہ بالا اعداد سے واضح ہے کہ ۷۴۸ قرضوں میں سے ۶۰ فیصد قرضوں کی مقدار ۲۵ روپیوں سے کم ہے۔ ۲۵ اور ۱۰۰ روپیوں کے درمیانی قرضے ۲۷ فیصد ہیں۔ صرف ۱۳ فیصد قرضے ۱۰۰ اور ۵۰۰ روپیہ کے درمیانی ہیں۔

جب کبھی کسان کو بڑی رقم (مثلاً ۱۰۰ تا ۵۰۰) کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ اس رقم کو مختلف ساہوکاروں سے حاصل کرتا ہے۔ ساہوکار بڑی رقمیں بہت کم قرض دیتے ہیں البتہ چھوٹی چھوٹی رقموں میں اصل و سود جمع کر کے بڑی رقموں کے مساوی کر دیتے ہیں۔

قرضہ جات کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ جب وہ ایک مرتبہ حاصل کئے جائیں تو پھر ان کے لین دین کا سلسلہ مدتوں چلتا رہتا ہے۔ چنانچہ ۷۴۸ کھاتوں کا مدت وار تجزیہ حسب ذیل ہے۔

	تعداد کھاتے	فیصد
وہ کھاتے جنہیں قایم ہو کر ابھی ایک سال مکمل نہیں ہوا۔	۸۰	۱۱
وہ کھاتے جو ایک اور ۵ سال کے درمیان قائم کئے گئے ہیں۔	۲۳۰	۳۱
,, ۵ ,, ۱۰ ,, ,,	۱۸۹	۲۵
,, ۱۰ ,, ۱۵ ,, ,,	۱۱۵	۱۵
,, ۱۵ ,, ۲۰ ,, ,,	۸۳	۱۱
,, ۲۰ ,, ۲۵ ,, ,,	۴۱	۶
,, ۲۵ ,, ۵۰ ,, ,,	۱۰	۱
جملہ....................................	۷۴۸	۱۰۰

تقریباً ہر کسان کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ وہ جس قدر قرض لیتا ہے اُوس کا تین چار گنا سود (ایک طویل مدت میں) ادا کرتا ہے۔ دوران تحقیق میں ہمیں متعدد مثالیں ایسے کسانوں کی ملتی ہیں جنہوں نے آٹھ ایک سال قبل صرف ایک مرتبہ قرض لیا تھا اور اب تک (جسقدر ممکن ہوسکے) صرف سود ہی ادا کرتے چلے آرہے ہیں۔ خصوصاً متفرق چھوٹے چھوٹے قرضوں (مثلاً ۵-۱۰-۱۵-۲۰-۲۵) میں یہ چیز بہت عام ہے۔ مثال کے طور پر ہم مسمی نانیا کو پیش کرسکتے ہیں۔ اس نے آج سے ۸ سال قبل ایک ساہوکار سے (۳۰ تولے اشیاء چاندی کی کفالت پر) دس روپیہ قرض حاصل کئے۔ اور وعدہ کیا کہ ہر ماہ دس روپیوں پر چار آنے سود ادا کریگا۔ مسمی مذکور کا بیان ہے کہ وہ حسب وعدہ ۸ سال سے مقررہ سود برابر ادا کر رہا ہے۔ جسکے متعلق ساہوکار کو بھی اعتراف ہے۔ گذشتہ ۸ سال میں اسامی نے سالانہ تین روپے (جس کی فیصد شرح ۳۰ رہتی ہے) کے حساب سے ۲۴ روپیہ بطور سود ادا کئے جو کہ حاصل کردہ اصل (۱۰ روپے) سے ۱۴۰ فیصد زیادہ ہے۔ سود کے ضمن میں اسمیں شک نہیں کہ اسقدر زاید رقم ادا کیجا چکی ہے لیکن ابھی تک ادائے اصل کی نوبت نہیں آئی۔ مزید برآں اشیائے کفالت بھی ساہوکار کے ہاں موجود ہیں۔ اچھوت خاندانوں میں اس قسم کی کئی مثالیں موجود ہیں۔

نویں فصل - زرعی مقروضیت

(بہ سلسلہ سابق)

قرض کی تقسیم - بارِ قرض - ماہیت قرض - اور خصوصیات قرض کے حالات معلوم کرنے کے بعد اب ہم یہ دریافت کرینگے کہ موضع زیرِ بحث میں قرض حاصل کرنے کے کیا ذرائع ہیں - قرض کی وجوہات کیا ہیں - اور کن شرحوں پر قرض حاصل کیا جاتا ہے -

۱- قرض حاصل کرنے کے ذرائع مزارعین کے بیان کے مطابق ذرائع قرض کو ۲ طرح پر تقسیم کیا جاسکتا ہے (الف) سرکاری ذرائع قرض اور (ب) خانگی ذرائع قرض - ذیل میں ہم ان ہر دو ذرائع کی جدا جدا تشریح کرتے ہوئے آخر میں یہ بتلائینگے کہ قرض کا سب سے اہم ذریعہ کیا ہے -

(الف) سرکاری ذرائع قرض —— واضح رہے کہ حکومت دو طرح پر قرض دیتی ہے - (۱) براہ راست اور (۲) بالواسطہ. براہ راست تقاوی کے ذریعہ اور بالواسطہ انجمن امداد باہمی کے توسط سے قرض دیا جاتا ہے -

(۱) تقاوی —— موضع ہذا میں رقم تقاوی کی تقسیم سب سے پہلے سنہ ۱۳۴۰ف (م اکٹوبر ۳۱-۱۹۳۰ء) میں ہوئی - جملہ رقم ۲۵۵ روپے تھی جو کہ ۱۲ اشخاص کو دی گئی - سنہ ۱۳۴۳ف (م اکٹوبر ۳۴-۱۹۳۳ء) میں صرف ۷۵ روپیہ ایک شخص کو دیئے گئے - تین سال بعد یعنی سنہ ۱۳۴۶ف (م اکٹوبر ۳۷-۱۹۳۶ء) میں ۳۷۰ روپیہ ۱۱ مختلف اسامیوں کو دیئے گئے - سنہ ۱۳۴۷ف (م اکٹوبر ۳۸-۱۹۳۷ء) میں بھی رقم بہ ضمن تقاوی آسامیوں سے واجب الوصول تھی - مجموعی قرض (۳۰۸۲۵) کا لحاظ کرتے ہوئے تقاوی کا قرضہ تقریباً ۹ رفیصد ہے -

(۲) انجمن امداد باہمی —— سرکاری ذرائع قرض کا دوسرا ذریعہ انجمن امداد باہمی ہے - اس موضع میں انجمن کا قیام سنہ ۱۳۳۴ف (م اکٹوبر ۲۵-۱۹۲۴ء) میں ہوا - جملہ ۱۹ دیہاتوں نے اس کی

شرکت قبول کی۔ ۱۰۹۰ روپے صدر بنک سے حاصل کئے گئے اور ان کی تقسیم اراکین کے مابین ہوئی۔ ذاتی سرمایہ کی مقدار بتدریج بڑھتی گئی چنانچہ اب انجمن کلیتہً "ذاتی سرمایہ سے" کام کررہی ہے۔ اس وقت اراکین کی تعداد ۲۵ ہے گویا قیام انجمن کے بعد سے اراکین کی تعداد میں ۲۴ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ سال حال اراکین کے ذمے ۱۱۲۶ روپے واجب الوصول ہیں اسطرح اوسط قرضہ فی رکن ۴۵.۰۴ روپے ہے۔ مجموعی قرض کا لحاظ کرتے ہوئے انجمن کا قرض ۲.۸ فیصد ہے۔

بحیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ سرکاری ذرائع قرض سے ۱۴۹۶ روپے حاصل کئے گئے ہیں جو کہ جملہ قرض (۴۰۸۲۵) کا ۳.۷ فیصد ہے۔

(ب) خانگی ذرائع قرض ——— خانگی یا غیر سرکاری ذرائع قرض سے ہماری مراد ساہوکار ہیں موضع زیر بحث میں جملہ ۲۲ ساہوکار ہیں[۱] جن میں سے ۳ مسلمان اور ۱۹ ہندو ہیں۔ بالفاظ دیگر ۱۴ فیصد مسلمان اور ۸۶ فیصد ہندو ساہوکار ہیں۔ ساہوکاروں کی ایک دوسری تقسیم ۲ طرح پر کیجا سکتی ہے۔ مقامی اور غیر مقامی جملہ ۲۲ ساہوکاروں میں سے صرف ۷ یا تقریباً ۳۲ فیصد مقامی ساہوکار ہیں۔ باقی ۱۵ یا ۶۸ فیصد غیر مقامی ہیں۔ غیر مقامی ساہوکار اس میں شک نہیں کہ مقامی ساہوکاروں کے مقابل دو گنے سے زاید ہیں لیکن اسکے باوجود انکا دیا ہوا قرض (۹۵۰۶) مجموعی قرض کا لحاظ کرتے ہوئے صرف ۲۳ فیصد ہے۔ مقامی ساہوکار گو تعداد میں کم ہیں لیکن ۷۲ فیصد قرض (۲۹۲۹۸) انہیں سے متعلق تھے۔ [illegible] مقامی اور غیر مقامی ساہوکاروں کی شخصی واقفیت ہے۔ مقامی ساہوکار چونکہ ہر دیہاتی کو اچھی طرح جانتے ہیں لہذا حالات کے مدنظر ہر شخص کو اس کی حیثیت کے موافق قرض دیا جاتا ہے۔ برعکس اسکے غیر مقامی ساہوکار صرف انہیں آسامیوں کو قرض دیتے ہیں جن سے وہ بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ وصولات کی دقتیں بھی غیر مقامی ساہوکاروں کو زیادہ قرض دینے سے روکتی ہیں۔

یہ ایک ضمنی بحث تھی کہ کونسے ساہوکار (مقامی یا غیر مقامی) زیادہ قرض دیتے ہیں۔ ساہوکار

---

[۱] مقالہ کے ساتھ جو دوسرا ضمیمہ شامل ہے اسمیں جملہ ساہوکاروں کی فہرست دی گئی ہے۔

خواہ وہ مقامی ہوں یا غیر مقامی زرعی مالیات میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس اہمیت کا اندازہ حسب ذیل اعداد سے ہوسکتا ہے۔

ذرائع قرض	مقدار رقم		فی صد	
الف۔ وہ قرض جو سرکاری ذرائع سے حاصل کیا گیا ہے۔				
(۱) تقاوی	۳۷۰	۱۴۹۶	۰٫۹	۳٫۷
(۲) انجمن امداد باہمی	۱۱۲۶		۲٫۸	
ب۔ وہ قرض جو خانگی ذرائع سے حاصل کیا گیا ہے۔				
(۱) جو مقامی ساہوکاروں سے لیا گیا ہے۔	۲۹۲۹۸	۳۹۳۲۹	۷۲	۹۶٫۳
(۲) جو غیر مقامی ساہوکاروں سے لیا گیا ہے۔	۹۵۰۶		۲۳	
(۳) جو عزیز و اقارب سے لیا گیا ہے۔	۵۲۵		۱٫۳	
جملہ	۴۰۸۲۵		۱۰۰	

مندرجۂ با[illegible] قرض (۴۰۸۲۵) کا لحاظ کرتے ہوئے ۳٫۷ فیصد قرض سرکاری [illegible] صد قرض خانگی ذرائع سے۔ خانگی ذرائع قرض میں صرف ۱٫۳ فیصد [illegible] عز[illegible] سے بہ [illegible] لیا گیا ہے۔ اور باقی ۹۵ فیصد قرض مقامی و غیر مقامی ساہوکاروں سے متع[illegible]ہے۔ ان حالات کے تحت ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ ساہوکاری زرعی مالیات کی روح رواں ہیں۔

۲۔ قرض کے وجوہ ذرائع قرض کی تشریح کے بعد اب ہم یہ دریافت کرینگے کہ موضع زیر بحث میں کن مختلف وجوہات کیلئے قرض لیا جاتا ہے۔ ہمارے جمع کردہ اعداد کے مطابق وجوہ قرض کو ۱۱ مختلف مدات کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ۱۔ شادی بیاہ ۲۔ تعمیر مکانات ۳۔ سابقہ قرضوں کی ادائی ۴۔ قرضہ بوجوہات نامعلوم ۵۔ خریدی بیل وغیرہ ۶۔ لاگوڑ (اخراجات کاشت کو مقامی زبان میں لاگوڑ کہا جاتا ہے) ۷۔ تجارت وغیرہ ۸۔ مالگزاری کی ادائی ۹۔ موت مٹی ۱۰۔ خوراک و لباس ۱۱۔ عقاید کی بجا آوری۔ ذیل کے

اعداد میں اس امر کی صراحت کیگئی ہے کہ ۴۰۸۲۵ روپیوں میں کسقدر قرض مذکورہ بالا وجوہات کی بنا پر لیا گیا ہے۔

نشان	قرضہ بوجہ	مقدار قرض	فی صد
۱	شادی بیاہ	۹۰۲۳	۲۲
۲	تعمیر مکانات	۶۶۶۰	۱۶
۳	سابقہ قرض کی ادائی	۴۶۹۰	۱۱
۴	نامعلوم	۴۱۶۱	۱۱ تقریباً
۵	خریدی بیل وغیرہ	۴۰۵۲	۱۰
۶	لاگوڑ (اخراجات کاشت)	۳۵۲۷	۹
۷	تجارت وغیرہ	۳۳۴۰	۸
۸	مالگذاری	۲۷۱۱	۷
۹	موت مٹی	۱۳۱۰	۳
۱۰	خوراک ولباس	۰۰۰۶	۲
۱۱	عقاید کی پابجائی		۱
جملہ	....		۱۰۰

(۱) شادی بیاہ۔ موضع زیر بحث میں شادیاں نہ صرف قبل بت کیجاتی ہیں بلکہ قرض لے کر کیجاتی ہیں۔ سالگذشتہ کوئی ۱۴ شادیاں کی گئیں[۵] جنمیں سے ایک شادی بلاحصول قرض کیگئی ورنہ باقی تمام شادیوں میں کچھ نہ کچھ قرض ضرور لیا گیا۔ فی نفسہ شادی کے اخراجات بہت زیادہ نہیں ہوتے۔ لیکن جس شرح پہ قرضے لئے جاتے ہیں وہ بہت تباہ کن (آئندہ عنوان میں ہم شرح قرض کا مفصل حال بیان کرینگے) ہوتی ہے۔ زاید شرح سود اور قرض کی رقم بتدریج جمع ہوکر ایک کی بجائے چار ہو جاتی ہے اور غریبوں کیلئے وبال جان ثابت ہوتی ہے۔ شادی بیاہ کے موجودہ قرض (۹۰۲۳) میں نہ معلوم جمع شدہ سود کا کسقدر جزو شامل ہے!

---

[۵] ضمیمہ میں ان افراد کی فہرست دیگئی ہے جنہوں نے سالگذشتہ شادیاں کیں

(۲) تعمیر مکانات۔ شادی بیاہ سے قبل تقریباً ہر دیہاتی کی یہ فکر ہوتی ہے کہ حتی الامکان اپنے مکان کی حالت ٹھیک کرے۔ جو افراد کہ جھونپڑیوں میں رہتے ہیں انکی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ایک کمرے والا سفال پوش مکان بنایا جائے اسیطرح وہ افراد جو ایک کمرے والے مکانات میں رہتے ہیں اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ مکان کو نسبتاً وسیع کیا جائے۔ اس رجحان کا نتیجہ یہ ہے کہ گذشتہ ۱۰ سال کے عرصے میں اکثر جھونپڑیاں ایک کمرے والے مکانات میں تبدیل ہوگئی ہیں اور بعض ایک کمرے والے مکانات وسیع تر کر دئیے گئے ہیں۔ حالات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دیہاتیوں کو تعمیر مکان کا بہت شوق ہے۔ اس شوق کی تکمیل بذریعہ قرض کی جاتی ہے۔ اور قرض کا سلسلہ مدتوں چلتا رہتا ہے۔ ہم اس بات پر معترض نہیں کہ مکانات کیوں تعمیر کئے جاتے ہیں۔ ہمارا اعتراض اس امر پر ہے کہ ان مکانات کی تعمیر اعلیٰ شرح سود پر قرض حاصل کرکے کیجاتی ہے۔ اس اعلیٰ شرح کی وجہ سے دیہاتیوں کو مدتوں پریشانی اٹھانی پڑتی ہے۔

(۳) سابقہ قرضوں کی ادائی۔ پیچھے یہ بتایا جاچکا ہے کہ ۲۱۱ مقروض خاندانوں میں سے ۷۷ فی صد افراد دو تا بارہ مختلف ساہوکاروں کے مقروض ہیں۔ ان کی آمدنیاں چونکہ محدود ہوتی ہیں لہذا ہر ساہوکار کے مطالبات کو ذاتی آمدنی سے پو[illegible]تا ہے کہ ایک ساہوکار سے قرض لیکر دوسرے کو اور بعض مرتبہ تیسرے [illegible]کی وجہ سے اس میں شک نہیں کہ ساہوکاروں کی ادائیگی ہوتی رہتی ہے۔ [illegible]ریج بڑھتا جاتا ہے۔ فرق صرف اسقدر ہوتا ہے کہ قرض کی رقم ایک کھاتے سے دوسر[illegible]ے میں منتقل ہوجاتی ہے۔

(۴) قرضہ بوجوہات نامعلوم۔ اکثر قرضے اس نوعیت کے تھے کہ جنکے متعلق یہ نہیں معلوم کیا جاسکا کہ وہ کن اغراض کے تحت حاصل کئے گئے تھے۔ لہذا ایسے تمام قرضوں کو "قرضجات بوجوہ نامعلوم" میں شامل کیا گیا ہے۔

(۵) خریدی بیل و بھینسے۔ کسانوں کو خریدی بیل و بھینسے وغیرہ کے لئے آئے دن قرض کی ضرورت لاحق ہوتی ہے چنانچہ مجموعی قرض کا لحاظ کرتے ہوئے ۱۰ فیصد قرض اسی احتیاج سے متعلق ہے۔ بیل یا بھینسے کے فوت ہونے پر کسان اسبات پر مجبور ہوتا ہے کہ دوسرا جانور خریدے ورنہ زراعتی کاروبار نہیں چل سکتے۔

(۶) لاگوڑ (اخراجات کاشت)۔ اخراجات کاشت مثلاً مینڈہ بندی، باڑ لگائی، کلپائی وغیرہ کیلئے

قلیل المقدار قرضے (مثلاً ۵ - ۱۰ - ۱۵) حاصل کئے جاتے ہیں۔ کٹائی فصل کے لئے بھی قرض حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ قرضے عام طور پر چھوٹے ساہوکاروں سے لئے جاتے ہیں۔

(۷) تجارت وغیرہ۔ تجارتی قرضے بیشتر جلاہوں۔ دھنگروں۔ گولیوں اور دھوبیوں سے متعلق ہیں بعض جلاھے نہ صرف کپڑا بنتے ہیں بلکہ گرنی کے بنے ہوئے کپڑوں کی تجارت بھی کرتے ہیں جس کے لئے قرض لیا جاتا ہے۔ دھنگر بکروں کی تجارت کیلئے قرض لیتے ہیں۔ گولیوں کو پھلوں کی تجارت اور مختلف قسم کے کنوّں کے لئے قرض درکار ہوتا ہے۔ دھوبی دھان کا بیوپار کرتے ہیں۔ مزید برآں گدھے خرید کر حمل ونقل کا کام انجام دیتے ہیں۔ تجارتی قرضے جوکہ مجموعی قرض کا لحاظ کرتے ہوئے ۸ فیصد ہیں کلیتہً پیداوار قرار دئیے جاسکتے ہیں۔

(۸) مالگذاری۔ جب کہ فصلیں خراب ہوجاتی ہیں تو قیمت پیداوار سے اخراجات کاشت اور مالگذاری بھی نہیں وصول ہوسکتی۔ لہذا مالگذاری کی ادائی بذریعہ قرض کیجاتی ہے۔ ایسے موقعوں پر جب کہ فصلیں خراب ہوجاتی ہیں حکومت کی جانب سے ایک مناسب رقم معاف بھی کیجاتی ہے تاکہ رعایا پریشان نہونے پائے۔

(۹) موت مٹی۔ ہمارے دیہاتیوں کی بے سروسامانی کا اندازہ اس سے بھی ہوسکتا ہے کہ اونہیں پیدائش سے لیکر موت تک تقریباً تمام کاروبار کے لئے [illegible] اور اس سے متعلقہ امور کی تکمیل سے متعلق قرض ۱۳۱۰ روپیہ یا تقریباً ۳ فیصد

(۱۰) خوراک ولباس۔ اکثر کسان خوراک [illegible] ھان ساہوکار [illegible] قرض لئے جاتے ہیں اور کپڑا جولاہوں سے۔ مجموعی قرض کے تناسب سے صرف ۲ فیصد خوراک و لباس سے متعلق ہے۔

(۱۱) عقاید کی بیجائی۔ دیہاتیوں کے عقاید بھی ایک حد تک ان کی مقروضیت کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ جب کبھی کوئی شخص بخار وغیرہ میں مبتلا ہو تو "فال" کے ذریعہ بیماری کا سبب معلوم کیا جاتا ہے۔ کسی شخص کے مکان میں اگر کوئی فوت ہوجائے اور اس کے بعد دوسرا شخص بیمار ہو تو سمجھا جاتا ہے کہ اس شخص پر فوت شدہ شخص نے اثر کرلیا ہے۔ اس اثر کو دور کرنے کیلئے فوت شدہ شخص کے نام پر بکرا ذبح کیا جاتا ہے[۱]۔ اگر کسی شخص کی بیماری دوا سے کم نہو تو نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ مریض پر شیطان کا اثر ہوگیا ہے[۲]۔ اس اثر سے نجات

[۱و۲] ضمیمہ میں اسکے متعلق بیانات شامل کئے گئے ہیں۔

پانے کے لئے شیطان کے نام پر بکرے کی قربانی دیجاتی ہے۔ موضع ہذا کے دیہاتیوں کا یہ اعتقاد ہے کہ شیطانی اثرات نہ صرف انسانوں بلکہ جانوروں پر بھی ہوتے ہیں۔ اگر بیل یا بھینسے یکایک بیمار ہوجائیں تو خیال کیا جاتا ہے کہ جانور پر شیطان کا اثر ہے۔ لہذا شیطان کو منانے کے لئے اُسکے نام پر بکرے کا ذبح کیا جانا لازمی قرار دیا جاتا ہے مزید برآں ان کا یہ بھی اعتقاد ہے کہ فصل کی کٹائی سے قبل یا کٹائی کے بعد نیا پانی سے پہلے میشمی (دیوی کا نام) کے نام پر بکرا ذبح کرنے سے غلے کی مقدار میں زیادتی ہوجاتی ہے۔ واضح رہے کہ بکروں کی قربانی عموماً بذریعہ قرض کی جاتی ہے۔ چنانچہ ۵۲۵ روپیہ یا ایک فیصد قرض انہی قربانیوں وغیرہ سے متعلق ہے۔ ہماری تحقیق کے مطابق سالگذشتہ ایک سال کے عرصے میں ۲۴۶ مکانات میں سے ۴۳ یا تقریباً ۱۹ فیصد مکانات میں شیطانوں وغیرہ کے نام پر بکرے ذبح کئے گئے[۱]۔ نہ صرف اینڑہ بلکہ پڑھے لکھے افراد بھی انہی عقاید کے تابع (خواہ کسی وجہ سے کیوں نہو) نظر آتے ہیں۔

۳۔ قرض کی شرحین

وجوہ قرض کی تشریح کے بعد اب ہم اپنی توجہ شروح قرض کی طرف مبذول کرینگے۔ موضع زیر بحث میں ۳ قسم کی شرحیں (الف۔ خالص رقمی شرح (ب) خالص جنسی شرح (ج) مخلوط شرح مروج ہیں۔ [illegible] ۱۔ ادارِیہ [illegible] فہرست [illegible] میں سے (جو کہ موضع کا جملہ قرض ہے) ۵۲۵ یا ۱،۳ فیصد [illegible] بجا دیہ [illegible] ہے۔ ذیل کے اعداد میں اس امر کی وضاحت کیگئی ہے کہ [illegible] شرحوں سے متعلق ہے۔ بلحاظ مجموعی قرض ان رقومات کا

	رقم جو قرض دی گئی	فیصد
(الف) خالص رقمی شرح پر	۱۲۷۰۰	۳۳،۶
(ب) خالص جنسی شرح پر	۴۰۹۰	۱۰
(ج) مخلوط شرح پر	۲۲۵۱۰	۵۶،۱
جملہ	۴۰۳۰۰	۹۸،۷

[۱] ضمیمہ دوم میں یہ بیانات شامل ہیں اور ان تمام افراد کی فہرست دیگئی ہے جنہوں نے سالگذشتہ شیطانوں وغیرہ کے نام پر بکرے ذبح کئے۔

مندرجہ صدر اعداد سے واضح ہو رہا ہے کہ ۴۳۰.۰۰ یا ۹۸.۷۷ فیصد قرض میں سے ۳۷.۰۰ یا ۴۲.۲۱ فیصد قرض خالص رقمی شرح پر حاصل کیا گیا ہے۔ ۴.۹۰ یا ۱۰ فیصد قرضہ خالص جنسی شرح سے متعلق ہے ۔ باقی ۵۱.۰ ۲۲ یا ۵۵.۱ فیصد قرضہ مخلوط شرح پر حاصل کیا گیا ہے۔ شروحات کے اس تجزیہ کے بعد اب ہم یہ دریافت کرینگے کہ متذکرہ ہر سہ شروحات کے تحت کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ کسقدر سود وصول کیا جاتا ہے۔

(الف) خالص رقمی شرح [۱] اور مقدار سود ــــ خالص رقمی شرح کے تحت کم سے کم ۶ اور زیادہ سے زیادہ ۳۶ فیصد سالانہ سود وصول کیا جاتا ہے۔ صرف تقاوی کے قرضے ۶ فیصد سالانہ کے حساب سے دیے جاتے ہیں انجمن امداد باہمی سے ۹ روپیہ ۶ آنے فیصد کی شرح سے قرض ملتا ہے۔ ساہوکار کم سے کم بارہ اور زیادہ سے زیادہ ۳۶ فیصد سالانہ کی شرح سے سود وصول کرتے ہیں [۲]۔

(ب) خالص جنسی شرح اور مقدار سود ــــ جنسی شرح سود وصول کرنے کے مختلف طریقے ہیں۔ جنسی شرح سود وصول کرنے کا پہلا طریقہ یہ ہے کہ اگر ابتدائے فصل پر ایک روپیہ قرض دیا جائے تو طرفین کی قرار داد کے مطابق فصل کے اختتام پر ۱ تا ۲ پائیلی دھان بطور سود وصول کئے جاسکتے ہیں [۳]۔ ایک پائیلی دھان کی قیمت ۳ آنے ۶ پائی سے لیکر ۳ آنے ۹ پائی [illegible] اور اس [illegible] آنے سے لیکر ۷ آنے ۶ پائی ہوگی۔ جبکہ ایک روپیہ پر ایک فصل (اوسطاً بشکل زر) لیا جائے تو فیصد سالانہ شرح ۴۵، ۴۳ [illegible] قرض دہی کے اس طریق کو "بیچل" کہا جاتا ہے۔

جنسی شرح سود وصول کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اگر ابتدائے فصل پر ایک من دھان دیے جائیں اختتام فصل پر سوا من سے لیکر ڈیڑھ من تک وصول کئے جاتے ہیں۔ گویا ایک من پر ایک فصل کیلئے پاؤ من سے [illegible]

---

[۱] خالص رقمی شرح سے مراد وہ شرح ہے جو کلیتہً بشکل زر وصول کیجائے۔ [۲] ضمیمہ دوم میں یہ بیانات شامل ہ[یں] ساہوکاروں نے اعتراف کیا ہے کہ وہ کم سے کم خالص رقمی شرح ۱۲ فیصد اور زیادہ سے زیادہ ۳۶ فیصد وصول کرتے [ہیں]

[۳] دوسرے ضمیمہ میں یہ بیانات شامل ہیں۔ ساہوکاروں کو اعتراف ہے کہ وہ فی روپیہ ہر فصل پر ۱ تا ۲ پائیلی دھ[ان] وصول کرتے ہیں .... آسامیوں نے بیان کیا ہے کہ وہ اس شرح پر قرض لیتے ہیں۔

آدہ من تک سود وصول کیا جاتا ہے۔ جسکی فیصد شرح مختلف نرخوں کا لحاظ کرتے ہوئے (بشکل زر) ۵۰ فیصد سے لیکر ۱۰۰ فیصد تک رہا کرتی ہے۔

جنسی شرح سود وصول کرنے کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ابتدائے فصل پر اگر ۲ روپیہ قرض دئیے جائیں تو آسامی سے وعدہ لیا جاتا ہے کہ وہ اختتام فصل (اوسطاً ۶ ماہ) پر ایک من دھان دے[۵۱]۔ ایک من دھان کا نرخ ۳ روپیہ ۸ آنے سے لیکر ۳ روپے ۱۲ آنے تک رہا کرتا ہے۔ جبکہ ساہوکار اوسطاً ۶ ماہ قبل ۲ روپے قرض دے کر ۳ روپیہ ۸ آنے تا ۳ روپیہ بارہ آنے کا مال وصول کرے تو اسکے یہ معنی ہوئے کہ وہ ۲ روپیوں پر ۶ ماہ میں ایک روپیہ آٹھ آنے تا ایک روپیہ ۱۲ آنے سود (بشکل زر) وصول کر رہا ہے۔ جسکی فیصد سالانہ شرح ۱۵۰ روپیوں سے لیکر ۱۷۵ روپیہ تک رہا کرتی ہے۔ مقامی زبان میں قرض دہی کے اس طریق کو "لاونی" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

جنسی شرح سود وصول کرنے کا چوتھا طریقہ (جسکو ہم لاونی وپچل کے نام سے موسوم کرسکتے ہیں) یہ ہے کہ ساہوکار آسامی کو کچھ روپیہ قرض دینے کے بعد اس سے وعدہ لیتا ہے کہ قرض دئیے ہوئے روپیوں میں سے نصف روپیوں کا مال ایک مقررہ نرخ (جو کہ بازار سے عموماً ۴۵ تا ۵۰ فیصد کم ہوتا ہے) سے فروخت کرے [illegible] نرخ رہے کہ ایک پائیلی ۴ سیر کے مساوی ہوتی ہے۔) وہاں ادا کرے [illegible] پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس نے ایک ساہوکار سے ۱۴ روپیہ [illegible] لیا ہے نصف روپیوں، یعنی سات روپے کے دھان [illegible] روپیہ [illegible] حساب [illegible] روپیہ جبکہ بازار میں دھان کا نرخ ۳ روپیہ آٹھ آنے سے لیکر ۳ روپیہ ۱۲ آنے تک رہا کرتا ہے) اور باقی ۷ روپیوں پر فی فصل ایک پائیلی دھان ادا کریگا[۵۲]۔

اس قرارداد کے مطابق آسامی کا فریضہ ہے کہ وہ ۷ روپیوں میں ساڑھے تین من دھان فروخت کرے جنکی بازاری قیمت حسب حالات ۱۲ روپے ۴ آنے سے لیکر ۱۳ روپیہ ۸ آنے ہوتی ہے اور فی روپیہ ایک پائیلی کے حساب سے ۷ روپیوں پر ۷ پائیلی دھان دے۔۔ پائیلی دھان کی قیمت حسب حالات ایک روپیہ آٹھ آنے چھ پائی ہے

[۵۱] .... ساہوکاروں نے بیان کیا ہے کہ وہ قرض دیکر کن معاہدات کے تحت مال خریدتے ہیں ......

[۵۲] ...... آسامی کے بیان کی تصدیق ہمنے ساہوکار سے بھی کی ہے ....

لے کر ایکروپیہ ۱۰ آنے ۳ پائی تک رہا کرتی ہے۔ اسطرح ساہوکار کو ۱۲ روپیوں پر ایک فصل (اوسطاً ۶ ماہ) میں ۶ روپیہ ۱۲ آنے ۶ پائی سے لیکر ۸ روپیہ ۲ آنے ۳ پائی تک سود (بشکل زر) ملتا ہے جسکی فیصد سالانہ شرح سود ۹۶/۸ سے لیکر ۱۳۶/۱۱ رہا کرتی ہے۔

ان حالات کے تحت جنسی شرح سود کے متعلق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ (بشکل زر) کم سے کم ۴۵ و ۴۳ اور زیادہ سے زیادہ ۱۷۵ فیصد سالانہ رہا کرتی ہے۔

(ج) مخلوط شرح اور مقدار سود — خالص رقمی اور خالص جنسی شرحوں کی تشریح کے بعد اب ہم مخلوط شرح کے حالات دریافت کرینگے۔ مخلوط شرح سے ہماری مراد وہ شرح ہے جسکا ایک حصہ بشکل زر حاصل کیا جائے اور دوسرا بشکل جنس اس طریق کے تحت اگر ایک ساہوکار کسی آسامی کو ۱۰۰ روپیے قرض دے تو وہ اس سے وعدہ لیتا ہے کہ قرض دی ہوئی رقم کی نصف مقدار پر بشرح مقررہ رقمی سود ادا کرے۔ باقی نصف رقم کا مال بہ نرخ مقررہ فروخت کرے رقمی شرح سود کم سے کم ایک فیصد اور زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ فیصد ماہانہ وصول کیجاتی ہے۔ مال کم سے کم ۲۰ اور زیادہ سے زیادہ ۵۰ فیصد تخفیف کے ساتھ خریدا جاتا ہے۔ ہم نے حساب لگایا ہے کہ موضع زیر بحث میں مخلوط شرح (کلیتہً بشکل زر) کم سے کم ۳۱ فیصد اور زیادہ سے زیادہ ۱۰ فیصد سالانہ رہا کرتی ہے۔

بحیثیت مجموعی (مذکورہ ہر سہ قسم کی شروح [illegible] اور اس سے آنے سے [illegible]

ہے کہ کم سے کم شرح سود ۶ فیصد اور زیادہ سے زیا[illegible]

مسلۂ قرض داری کے بغور مطالعہ کے بعد [illegible] جہاں ساہوکار [illegible]

اور توجہ طلب مسئلہ شروحات قرض کا ہے۔ جنکی غیر معمولی زیادتی کی وجہ سے اگر ایک طرف اہل [illegible] زر ہوتے جاتے ہیں تو دوسری طرف ساہوکاروں کا تموّل بڑھتا جاتا ہے۔ اعلی شرح سود کی وجہ سے مزارعین کی آمدنی قابل لحاظ طور پر گھٹ جاتی ہے۔ تخفیف آمدنی کا براہ راست اثر انکے معیار زندگی پر پڑتا ہے۔

۵۔ دوسرے ضمیمہ میں یہ بیان درج ہے جسمیں ساہوکار نے بیان دیا ہے کہ ابتداءً اسنے تقریباً ایک ہزار روپیے کے سرمایہ سے لین دین و تجارت کا کاروبار شروع کیا لیکن اب اسکی جائداد ۲۰ - ۲۵ ہزار ہے۔

نوٹ: تقریباً تمام ساہوکاروں کی ترقی کا یہی حال ہے۔

دسویں فصل اصلاحی تدابیر

دوسری فصل میں بتلایا گیا ہے کہ موضع زیر بحث کے باشندوں کا معیار زندگی بحیثیت مجموعی ادنیٰ اور معمولی ہے۔ اسی فصل کے آخری پارے میں ادنیٰ معیار زندگی کی سب سے اہم اور بنیادی وجہ ادنیٰ آمدنی قرار دی گئی ہے مزید برآں ادنیٰ آمدنی کے تین اہم وجوہ بتلائے گئے ہیں۔

(۱) اضافہ آبادی اور ذرائع معاش کی غیر متناسب رفتار ترقی۔ (۲) پیشوں کا فقدان اور زراعت پر ضرورت سے زیادہ بار۔ (۳) نظام زراعت کے گوناگوں نقائص۔ مثلاً زرعی عوامل پیدائش کی غیر متناسب حالت [illegible] ہائے لین دین کے گوناگوں نقائص۔

[illegible] غیر اصولی طریقہ ہائے کاشت کی وجہ سے اگر ایک طرف [illegible] طرف پیداوار فی ایکڑ بھی ادنیٰ اور معمولی ہوتی ہے [illegible] ادارہ [illegible] غرض نسبتاً [illegible] کے معمولی ہونے کی وجہ سے آمدنی میں بھی نسبتاً تخفیف ہو جاتی ہے ناقص طریقہ ہائے فروخت کی بنا پر آمدنی میں مزید تخفیف ہوئی ہے۔ ناقص طریقہ ہائے لین دین اور اعلیٰ شرح سود کی بدولت آمدنی میں اور بھی تخفیف ہو جاتی ہے۔ ادنیٰ اور معمولی آمدنی کا براہ راست اثر باشندوں کے معیار زندگی پر پڑتا ہے نتیجہ یہ کہ ادنیٰ آمدنی کی وجہ سے معیار زندگی بھی ادنیٰ اور معمولی ہو جاتا ہے۔

ان تمام حالات کی تشریح کے بعد ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ باشندگان موضع ہٰذا کے موجودہ معیار زندگی کو کیوں کر بلند کیا جا سکتا ہے۔

معیار زندگی کو بلند کرنے کی سب سے اہم تدبیر (علاوہ دیگر امور کے) یہ ہے کہ آمدنیوں میں اضافہ کیا جائے

آمدنی میں اضافہ کے لئے حسب ذیل (الف) بالواسطہ اور (ب) بلاواسطہ تدابیر اختیار کئے جانے چاہئیں۔

(الف) بالواسطہ تدابیر

(۱) تخفیف آبادی ـــ آبادی کے قدیم اعداد کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ موضع زیربحث ۱۳۲۳ف (م اکتوبر ۱۹۱۳-۱۴ء) ہی میں کثیر الآباد ہوگیا تھا۔ جب کہ اسکی آبادی ۱۰۳۲ تھی۔ کیونکہ ۱۳۲۳ف (م اکتوبر ۱۹۱۳-۱۴ء) میں جب آبادی اس نقطہ پر پہنچ گئی تو کثرت آبادی اور ذرائع خوراک کی قلت کی و مابعد سالوں میں، مالتھس کے ذکر کردہ مثبت موانعات (مثلاً ہیضہ چیچک۔ طاعون اور قحط وغیرہ) کی بدولت مسلسل تخفیف شروع ہوئی چنانچہ ۱۳۲۳ف (م اکتوبر ۱۹۱۳-۱۴ء) تا ۱۳۲۹ف (م اکتوبر ۱۹۱۹-۲۰ء) سات سالوں میں بحیثیت مجموعی ۱۲۵ نفوس فوت ہوئے۔ جبکہ انہی سات سالوں میں صرف ۵۴ نفو پیدا ہوئے۔ مزید برآں ۱۳۲۷ف (م اکتوبر ۱۹۱۷-۱۸ء) اور ۱۳۲۸ف (م اکتوبر ۱۹۱۸-۱۹ء) کی سالیوں میں اکثر خاندان تلاش معاش کی خاطر دیگر مقامات کو منتقل ہوئے ان حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۳۲۹ف (م اکتوبر ۱۹۱۹-۲۰ء) کے اختتام پر جملہ آبادی صرف ۸۰۷ رہ گئی۔ گویا سات سال کے عرصہ میں بحیثیت ۲۴۵ نفوس کی تخفیف ہوگئی۔ لیکن ۱۳۳۰ف (م اکتوبر ۱۹۲۰-۲۱ء) ... اور اس سے آگے ۱۳۳۵ف (م اکتوبر ۱۹۲۵-۲۶ء) میں آبادی ۹۲۲

زائل ہوجانے کی بدولت وہ افراد جو تلاش معاش کی ... جان ساہو ... ہونا شروع ہوئے۔ ۱۳۳۵ف (م اکتوبر ۱۹۲۵-۲۶ء) کے بعد سے فوراً کثیر ... شروع ... میں آبادی ۱۰۵۴ تک پہنچ گئی۔ موجودہ آبادی ۱۳۲۳ف (م اکتوبر ۱۹۱۳-۱۴ء) کی آبادی کے مقا فی صد زیادہ ہے۔ آبادی میں مناسب تخفیف یا ذرائع معاش میں مناسب اضافہ نہ کیا جائے تو امکان ہے کہ مالتھس کے ذکر کردہ مثبت موانعات (مثلاً ہیضہ چیچک۔ طاعون اور قحط وغیرہ) آبادی میں تخفیف ہوگی۔ موضع ہذا میں کثرت آبادی کا اندازہ اس امر سے بھی ہوسکتا ہے کہ یہاں ۱۰۶۳ نفوس پرورش پا رہے ہیں حالانکہ ماہرین نے تخمینہ[1] کیا ہے کہ اگر زراعت سے بہتر سے بہتر استفا

---

[1] م معاشیات ہند مصنفہ جتھار اینڈ بیری ایڈیشن ۱۹۳۳ء صفحہ (۴۰)

اس کے ذریعہ فی مربع میل ۲۵۰ نفوس ایک معقول معیار آرام پر زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

ان حالات کے تحت بہتر اور مناسب یہی ہے کہ موضع زیر بحث کے باشندوں کے معیار زندگی کو بلند کرنے اور آئندہ کیلئے مثبت موانعات کے عملدرآمد کو روکنے کے لئے آبادی میں تخفیف کی جائے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ آبادی میں تخفیف کی جائے تو اس کے ساتھ ہی دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ پہلا یہ کہ آبادی میں کسقدر تخفیف کی جانی چاہیئے۔ دوسرے یہ کہ یہ تخفیف کیونکر کی جا سکتی ہے۔

پہلے سوال کا جواب بہت ہی دقت طلب ہے۔ کسی مقام کی متوازن آبادی کے متعلق کوئی قطعی رائے نہیں قائم کی جا سکتی۔ بالفاظ دیگر قطعی طور پر یہ نہیں بتلایا جا سکتا کہ اگر کسی مقام کی آبادی اسقدر رہے تو وسائل معاش اسقدر ہونے چاہئیں۔ تاہم تخمینہ کے ذریعہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ موضع زیر بحث کی متوازن آبادی ۷۸۰ ہونی چاہیئے (اس تخمینہ کا قطعیت کے ساتھ صحیح ہونا ضروری نہیں) کیونکہ سنہ ۱۳۲۳ ف (م اکتوبر سنہ ۱۹۱۳ء) کے بعد گوناگوں مثبت موانعات کی بدولت آبادی گھٹتے گھٹتے ۷۸۰ ہوگئی۔ اگر آبادی میں تخفیف کی مزید گنجائش ہوتی تو [illegible]ات آبادی کو ۷۸۰ سے بھی زیادہ گھٹا دیتے لیکن اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ آبادی [illegible] [illegible] ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ موضع زیر بحث کے [illegible] معیار آرام پر پرورش کرنے کی گنجائش ہے بلکہ اس [illegible]دی کے مضر اثرات سے لاعلمی کا نتیجہ ہے[5]۔ اگر ہم [illegible] فرض [illegible] ۲۵۰ نفوس فی مربع میل ایک معقول معیار آرام پر زندگی بسر کر سکتے ہیں تو موضع کی جملہ زراعت پیشہ آبادی ۸۱۳ ہونی چاہیئے۔ جیسا کہ ہم اس سے قبل کہہ چکے ہیں کہ متوازن آبادی کو قطعی طور پر نہیں بتلایا جا سکتا۔ محض تخمینے اگر ایک طرف صحت سے کسقدر قریب ہوتے ہیں تو دوسری طرف اسکا بھی امکان ہوتا ہے کہ وہ صحت سے بہت دور ہوں۔ اس مجبوری کے تحت ہم موضع زیر بحث کی کوئی متوازن آبادی قطعیت کے ساتھ نہیں بتلا سکتے تاہم حالات حاضرہ کا لحاظ کرتے ہوئے اتنا ضرور کہینگے کہ موجودہ آبادی [illegible]

ا۔ ادارایہ

ا۔ عرض بلد

---

[5]۔ اس قانون کی لاعلمی یا علم ہونے کے باوجود اس کی جانب سے لاپرواہی کی بنا پر ذرائع معاش کی تحدید کے باوجود آبادی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ ایک حد معینہ کے بعد مثبت موانعات اثر پذیر ہو کر آبادی کو قابل لحاظ حد تک گھٹا دیتے ہیں۔

اعداد میں اس امر کی صراحت کیگئی ہے کہ ۴۰۸۲۵ روپیوں میں کسقدر قرض مذکورہ بالا وجوہات کی بنا پر لیا گیا ہے۔

نشان	قرضہ بوجہ	مقدار قرض	فی صد
۱	شادی بیاہ	۹۰۲۳	۲۲
۲	تعمیر مکانات	۶۶۶۰	۱۶
۳	سابقہ قرض کی ادائی	۴۶۹۰	۱۱
۴	نامعلوم	۴۱۶۱	تقریباً ۱۱
۵	خریدی بیل وغیرہ	۴۰۵۲	۱۰
۶	لاگوڑ (اخراجات کاشت)	۳۵۱۷	۹
۷	تجارت وغیرہ	۳۳۴۰	۸
۸	مالگزاری	۲۷۱۱	۷
۹	موت مٹی	۱۳۱۰	۳
۱۰	خوراک ولباس	۰۰۶	۲
۱۱	عقاید کی پابجائی		۱
جملہ	....		۱۰۰

(۱) شادی بیاہ ۔موضع زیر بحث میں شادیاں نہ صرف بہت کیجاتی ہیں بلکہ قرض لے کر کیجاتی ہیں۔سالگذشتہ کوئی ۱۳ شادیاں کی گئیں[1] جنمیں سے ایک شادی بلاحصول قرض کیگئی ورنہ باقی تمام شادیوں میں کچھ نہ کچھ قرض ضرور لیا گیا۔فی نفسہ شادی کے اخراجات بہت زیادہ نہیں ہوتے ۔لیکن جس شرح پر (آئندہ عنوان میں ہم شرح قرض کا مفصل حال بیان کرینگے) قرضے لئے جاتے ہیں وہ بہت تباہ کن ہوتی ہے۔زاید شرح سود اور قرض کی رقم بتدریج جمع ہوکر ایک کی بجائے چار ہوجاتی ہے اور غریبوں کیلئے وبال جان ثابت ہوتی ہے۔شادی بیاہ کے موجودہ قرض (۹۰۲۳) میں نہ معلوم جمع شدہ سود کا کسقدر جزو شامل ہے!

[1] ۔ضمیمہ میں ان افراد کی فہرست دیگئی ہے جنہوں نے سالگذشتہ شادیاں کیں

(۲) تعمیر مکانات۔ شادی بیاہ سے قبل تقریباً ہر دیہاتی کی یہ فکر ہوتی ہے کہ حتی الامکان اپنے مکان کی حالت ٹھیک کرے۔ جو افراد کہ جھونپڑیوں میں رہتے ہیں انکی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ایک کمرے والا اسفال پوش مکان بنایا جائے اسیطرح وہ افراد جو ایک کمرے والے مکانات میں رہتے ہیں اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ مکان کو نسبتاً وسیع کیا جائے۔ اس رجحان کا نتیجہ یہ ہے کہ گذشتہ ۱۰ سال کے عرصے میں اکثر جھونپڑیاں ایک کمرے والے مکانات میں تبدیل ہوگئی ہیں اور بعض ایک کمرے والے مکانات وسیع تر کر دئیے گئے ہیں۔ حالات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دیہاتیوں کو تعمیر مکان کا بہت شوق ہے۔ اس شوق کی تکمیل بذریعہ قرض کی جاتی ہے۔ اور قرض کا سلسلہ مدتوں چلتا رہتا ہے۔ ہم اس بات پر معترض نہیں کہ مکانات کیوں تعمیر کئے جاتے ہیں۔ ہمارا اعتراض اس امر پر ہے کہ ان مکانات کی تعمیر اعلیٰ شرح سود پر قرض حاصل کر کے کیجاتی ہے۔ اس اعلیٰ شرح کی وجہ سے دیہاتیوں کو مدتوں پریشانی اٹھانی پڑتی ہے۔

(۳) سابقہ قرضوں کی ادائی۔ پیچھے یہ بتایا جاچکا ہے کہ ۲۱۱ مقروض خاندانوں میں سے ۷۷ فی صد افراد دو تا بارہ مختلف ساہوکاروں کے مقروض ہیں۔ ان کی آمدنیاں چونکہ محدود ہوتی ہیں لہذا ہر ساہوکار کے مطالبات کو ذاتی آمدنی سے پو[illegible] ہے کہ ایک ساہوکار سے قرض لیکر دوسرے کو اور بعض مرتبہ تیسرے [illegible] کی وجہ سے اس میں شک نہیں کہ ساہوکاروں کی ادائگی ہوتی رہتی ہے یہ [illegible] ریج بڑھتا جاتا ہے۔ فرق صرف اسقدر ہوتا ہے کہ قرض کی رقم ایک کھاتے سے دوسر[illegible]ے پر منتقل ہوجاتی ہے۔

(۴) قرضہ بوجوہات نامعلوم۔ اکثر قرضے اس نوعیت کے تھے کہ جنکے متعلق یہ نہیں معلوم کیا جاسکا کہ وہ کن اغراض کے تحت حاصل کئے گئے تھے۔ لہذا ایسے تمام قرضوں کو "قرضجات بوجوہ نامعلوم" میں شامل کیا گیا ہے۔

(۵) خریدی بیل و بھینسے۔ کسانوں کو خریدی بیل و بھینسے وغیرہ کے لئے آئے دن قرض کی ضرورت لاحق ہوتی ہے چنانچہ مجموعی قرض کا لحاظ کرتے ہوئے ۱۰ فیصد قرض اسی احتیاج سے متعلق ہے۔ بیل یا بھینسے کے فوت ہونے پر کسان اسبات پر مجبور رہتا ہے کہ دوسرا جانور خریدے ورنہ زراعتی کاروبار نہیں چل سکتے۔

(۶) لاگوڑ (اخراجات کاشت)۔ اخراجات کاشت مثلاً مینڈہ بندی باڑ لگائی، کلچائی وغیرہ کیلئے

قلیل المقدار قرضے (مثلاً ۵ - ۱۰ - ۱۵) حاصل کئے جاتے ہیں۔ کٹائی فصل کے لئے بھی قرض حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ قرضے عام طور پر چھوٹے چھوٹے ساہوکاروں سے لئے جاتے ہیں۔

(۷) تجارت وغیرہ۔ تجارتی قرضے بیشتر جلاہوں۔ دھنگروں۔ گولیوں اور دھوبیوں سے متعلق ہیں بعض جلاہے نہ صرف کپڑا بنتے ہیں بلکہ گرنی کے بنے ہوئے کپڑوں کی تجارت بھی کرتے ہیں جس کے لئے قرض لیا جاتا ہے۔ دھنگر بکروں کی تجارت کیلئے قرض لیتے ہیں۔ گولیوں کو پھلوں کی تجارت اور مختلف قسم کے کنوں کے لئے قرض درکار ہوتا ہے۔ دھوبی دھان کا بیوپار کرتے ہیں۔ مزید برآں گدھے خرید کر حمل ونقل کا کام انجام دیتے ہیں۔ تجارتی قرضے جو کہ مجموعی قرض کا لحاظ کرتے ہوئے ۸ فیصد ہیں کلیتہً پیداوار قرار دیئے جاسکتے ہیں۔

(۸) مالگذاری۔ جب کہ فصلیں خراب ہوجاتی ہیں تو قیمت پیداوار سے اخراجات کاشت اور مالگذاری بھی نہیں وصول ہوسکتی۔ لہٰذا مالگذاری کی ادائی بذریعہ قرض کیجاتی ہے۔ ایسے موقعوں پر جب کہ فصلیں خراب ہوجاتی ہیں حکومت کی جانب سے ایک مناسب رقم معاف بھی کیجاتی ہے تاکہ رعایا پریشان نہونے پائے۔

(۹) موت مٹی۔ ہمارے دیہاتیوں کی بے سروسامانی کا اندازہ اس سے بھی ہوسکتا ہے کہ انہیں پیدائش سے لیکر موت تک تقریباً تمام کاروبار کے لئے [illegible] اور اس سے متعلقہ امور کی تکمیل سے متعلق قرض ۱۳۱۰ روپیہ یا تقریباً ۳ فیصد

(۱۰) خوراک ولباس۔ اکثر کسان خوراک [illegible] دھان ساہوکار [illegible] قرض لئے جاتے ہیں اور کپڑا جولاہوں سے مجموعی قرض کے تناسب سے صرف [illegible] فیصد خوراک ولباس سے متعلق ہے۔

(۱۱) عقاید کی بیجائی۔ دیہاتیوں کے عقاید بھی ایک حد تک ان کی مقروضیت کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ جب کبھی کوئی شخص بخار وغیرہ میں مبتلا ہو تو "فال" کے ذریعہ بیماری کا سبب معلوم کیا جاتا ہے کسی شخص کے مکان میں اگر کوئی فوت ہوجائے اور اس کے بعد دوسرا شخص بیمار ہو تو سمجھا جاتا ہے کہ اس شخص پر فوت شدہ شخص نے اثر کرلیا ہے۔ اس اثر کو دور کرنے کیلئے فوت شدہ شخص کے نام پر بکرا ذبح کیا جاتا ہے[1]۔ اگر کسی شخص کی بیماری دوا سے کم نہو تو نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ مریض پر شیطان کا اثر ہوگیا ہے[2]۔ اس اثر سے نجات

(۱و۲) ضمیمہ میں اسکے متعلق بیانات شامل کئے گئے ہیں۔

پانے کے لئے شیطان کے نام پر بکرے کی قربانی دیجاتی ہے۔ موضع ہذا کے دیہاتیوں کا یہ اعتقاد ہے کہ شیطانی اثرات نہ صرف انسانوں بلکہ جانوروں پر بھی ہوتے ہیں۔ اگر بیل یا بھینسے یکایک بیمار ہوجائیں تو خیال کیا جاتا ہے جانور پر شیطان کا اثر ہے۔ لہذا شیطان کو منانے کے لئے اسکے نام پر بکرے کا ذبح کیا جانا لازمی قرار دیا جاتا ہے مزید برآں ان کا یہ بھی اعتقاد ہے کہ فصل کی کٹائی سے قبل یا کٹائی کے بعد نیا پانی سے پہلے میٹھی (دیوی کا نام) کے نام پر بکرا ذبح کرنے سے غلے کی مقدار میں زیادتی ہوجاتی ہے۔ واضح رہے کہ بکروں کی قربانی عموماً بذریعہ قرض کی جاتی ہے۔ چنانچہ ۵۲۵ روپیہ یا ایک فیصد قرض انہی قربانیوں وغیرہ سے متعلق ہے۔ ہماری تحقیق کے مطابق سالگذشتہ ایک سال کے عرصے میں ۲۲۶ مکانات میں سے ۴۳ یا تقریباً ۱۹ فیصد مکانات میں شیطانوں وغیرہ کے نام پر بکرے ذبح کئے گئے۔[۱] نہ صرف ان پڑھ بلکہ پڑھے لکھے افراد بھی انہی عقاید کے تابع (خواہ کسی وجہ سے کیوں نہو) نظر آتے ہیں۔

۳۔ قرض کی شرحیں وجوہ قرض کی تشریح کے بعد اب ہم اپنی توجہ شروح قرض کی طرف مبذول کرینگے۔ موضع زیر بحث میں ۳ قسم کی شرحیں (الف۔ خالص رقمی شرح (ب) خالص جنسی شرح (ج) مخلوط شرح مروج ہیں۔ [illegible] فہرست [illegible] میں سے (جو کہ موضع کا جملہ قرض ہے) ۲۵ھ یا ۱۳ فیصد [illegible] ہے۔ ذیل کے اعداد میں اس امر کی وضاحت کیگئی ہے کہ [illegible] ۳ شرحوں سے متعلق ہے۔ بلحاظ مجموعی قرض ان رقومات کا [illegible] ادا [illegible] [illegible] دیعرض ہے۔

	رقم جو قرض دی گئی	فیصد
(الف) خالص رقمی شرح پر	۱۳۷۰۰	۳۳٫۶
(ب) خالص جنسی شرح پر	۴۰۹۰	۱۰
(ج) مخلوط شرح پر	۲۲۵۱۰	۵۵٫۱
جملہ	۴۰۳۰۰	۹۸٫۷

---

[۱] ضمیمہ دوم میں یہ بیانات شامل ہیں اور ان تمام افراد کی فہرست دیگئی ہے۔ جنھوں نے سالگذشتہ شیطانوں وغیرہ کے نام پر بکرے ذبح کئے۔

مندرجہ صدر اعداد سے واضح ہو رہا ہے کہ ۳۰.۴ یا ۹۸،۷ فیصد قرض میں سے ۳۷.۰۰ یا ۴۲،۲ فیصد قرض خالص رقمی شرح پر حاصل کیا گیا ہے۔ ۹.۰۴ یا ۱۰ فیصد قرضہ خالص جنسی شرح سے متعلق ہے۔ باقی ۵۱۰ ۲۲ یا ۱ر ۵۵ فیصد قرضہ مخلوط شرح پر حاصل کیا گیا ہے۔ شروحات کے اس تجزیہ کے بعد اب ہم یہ دریافت کرینگے کہ متذکرہ ہر شروحات کے تحت کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ کسقدر سود وصول کیا جاتا ہے۔

(الف) خالص رقمی شرح[1] اور مقدار سود — خالص رقمی شرح کے تحت کم سے کم ۶ اور زیادہ سے زیادہ ۳۶ فیصد سالانہ سود وصول کیا جاتا ہے۔ صرف تقاوی کے قرضے ۶ فیصد سالانہ کے حساب سے دئیے جاتے ہیں انجمن امداد باہمی سے ۹ روپیہ ۶ آنے فیصد کی شرح سے قرض ملتا ہے۔ ساہوکار کم سے کم بارہ اور زیادہ سے زیادہ ۳۶ فیصد سالانہ کی شرح سے سود وصول کرتے ہیں[2]

(ب) خالص جنسی شرح اور مقدار سود — جنسی شرح سود وصول کرنے کے مختلف طریقے ہیں۔

جنسی شرح سود وصول کرنے کا پہلا طریقہ یہ ہے کہ اگر ابتدائے فصل پر ایک روپیہ قرض دیا جائے تو طرفین کی قرار داد کے مطابق فصل کے اختتام پر ۱ تا ۲ پائیلی دھان بطور سود وصول کئے جاسکتے ہیں[3]۔ ایک پائیلی دھان کی قیمت ۳ آنے ۶ پائی سے لیکر ۳ آنے ۹ پائی ... ۶ ... اور اس ... آنے سے لیکر ۷ آنے ۶ پائی ہوگی۔ جبکہ ایک روپیہ پر ایک فصل (اوسطاً بشکل زر) لیا جائے تو فیصد سالانہ شرح ۴۵، ۴۳ ... دھان ساہو ... قرض دہی کے اس طریق کو "بیچل" کہا جاتا ہے۔

جنسی شرح سود وصول کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اگر ابتدائے فصل پر ایک من دھان دئیے جائیں تو اختتام فصل پر سوا من سے لیکر ڈیڑھ من تک وصول کئے جاتے ہیں۔ گویا ایک من پر ایک فصل کیلئے پاؤ من سے لیکر

---

[1]۔ خالص رقمی شرح سے مراد وہ شرح ہے جو کلیتہً بشکل زر وصول کیجائے۔ [2]۔ ضمیمہ دوم میں یہ بیانات شامل ہیں۔ ساہوکاروں نے اعتراف کیا ہے کہ وہ کم سے کم خالص رقمی شرح ۱۲ فیصد اور زیادہ سے زیادہ ۳۶ فیصد وصول کرتے ہیں۔

[3]۔ دوسرے ضمیمہ میں یہ بیانات شامل ہیں۔ ساہوکاروں کو اعتراف ہے کہ وہ فی روپیہ ہر فصل پر ۱ تا ۲ پائیلی دھان وصول کرتے ہیں ...... آسامیوں نے بیان کیا ہے کہ وہ اس شرح پر قرض لیتے ہیں۔

آدہ من تک سود وصول کیا جاتا ہے۔ جسکی فیصد شرح مختلف نرخوں کا لحاظ کرتے ہوئے (بشکل زر) ۵۰ فیصد سے لیکر ۱۰۰ فیصد تک ۔ ہا کرتی ہے۔

جنسی شرح سود وصول کرنے کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ابتدائے فصل پر اگر ۲ روپیہ قرض دئیے جائیں تو آسامی سے وعدہ لیا جاتا ہے کہ وہ اختتام فصل (اوسطاً ۶ ماہ) پر ایک من دھان دے۔[1] ایک من دھان کا نرخ ۳ روپیہ ۸ آنے سے لیکر ۳ روپے ۱۲ آنے تک رہا کرتا ہے۔ جبکہ ساہوکار اوسطاً ۶ ماہ قبل ۲ روپے قرض دے کر ۳ روپیہ ۸ آنے تا ۳ روپیہ بارہ آنے کا مال وصول کرے تو اسکے یہ معنی ہوئے کہ وہ ۲ روپیوں پر ۶ ماہ میں ایک روپیہ آٹھ آنے تا ایک روپیہ ۱۲ آنے سود (بشکل زر) وصول کر رہا ہے۔ جسکی فیصد سالانہ شرح ۱۵۰ روپیوں سے لیکر ۱۷۵ روپیہ تک رہا کرتی ہے۔ مقامی زبان میں قرض دہی کے اس طریق کو "لاونی" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

جنسی شرح سود وصول کرنے کا چوتھا طریقہ (جسکو ہم لاونی و پچل کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں) یہ ہے کہ ساہوکار آسامی کو کچھ روپیہ قرض دینے کے بعد اس سے وعدہ لیتا ہے کہ قرض دئیے ہوئے روپیوں میں سے نصف روپیوں کا مال ایک مقررہ نرخ (جو کہ بازار سے عموماً ۴۵ تا ۵۰ فیصد کم ہوتا ہے) سے فروخت کرے [illegible] نرخ رہے کہ ایک پائیلی ۴ سیر کے مساوی ہوتی ہے۔) دھان ادا کرے [illegible] پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس نے ایک ساہوکار سے ۱۴ روپیہ [illegible] میں سے نصف روپیوں، یعنی سات روپے کے دھان [illegible] ا۔ ادا رہیہ [illegible] روپیہ [illegible] حساب [illegible] جبکہ بازار میں دھان کا نرخ ۳ روپیہ آٹھ آنے سے لیکر ۳ روپیہ ۱۲ آنے تک رہا کرتا ہے) اور باقی ۷ روپیوں پر فی فصل ایک پائیلی دھان ادا کریگا۔[2]

اس قرارداد کے مطابق آسامی کا فریضہ ہے کہ وہ ۷ روپیوں میں ساڑھے تین من دھان فروخت کرے جنکی بازاری قیمت حسب حالات ۱۲ روپے ۴ آنے سے لیکر ۱۳ روپیہ ۸ آنے ہوتی ہے اور فی روپیہ ایک پائیلی کے حساب سے ۷ روپیوں پر ۷ پائیلی دھان دے۔ پائیلی دھان کی قیمت حسب حالات ایک روپیہ آٹھ آنے چھ پائی سے

---

[1] ساہوکاروں نے بیان کیا ہے کہ وہ قرض دیکر کن معاہدات کے تحت مال خریدتے ہیں۔

[2] آسامی کے بیان کی تصدیق ہمنے ساہوکار سے بھی کی ہے۔

لے کر ایک روپیہ ۱۰ آنے ۳ پائی تک رہا کرتی ہے۔ اسطرح ساہوکار کو ۱۲ روپیوں پر ایک فصل (اوسطاً ۶ ماہ) میں ۲ روپیہ ۱۲ آنے ۶ پائی سے لیکر ۸ روپیہ ۳ آنے ۳ پائی تک سود (بشکل زر) ملتا ہے جسکی فیصد سالانہ شرح سود ۹۷/۸ سے لیکر ۱۳۶/۳ رہا کرتی ہے۔

ان حالات کے تحت جنسی شرح سود کے متعلق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ (بشکل زر) کم سے کم ۴۵ و ۴۳ اور زیادہ سے زیادہ ۱۷۵ فیصد سالانہ رہا کرتی ہے۔

(ج) مخلوط شرح اور مقدار سود ـــ خالص رقمی اور خالص جنسی شرحوں کی تشریح کے بعد اب ہم مخلوط شرح کے حالات دریافت کرینگے۔ مخلوط شرح سے ہماری مراد وہ شرح ہے جسکا ایک حصہ بشکل زر حاصل کیا جائے اور دوسرا بشکل جنس اس طریق کے تحت اگر ایک ساہوکار کسی آسامی کو ۱۰۰ روپیہ قرض دے تو وہ اس سے وعدہ لیتا ہے کہ قرض دی ہوئی رقم کی نصف مقدار پر بشرح مقررہ رقمی سود ادا کرے۔ باقی نصف رقم کا مال بہ نرخ مقررہ فروخت کرے رقمی شرح سود کم سے کم ایک فیصد اور زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ فیصد ماہانہ وصول کیجاتی ہے۔ مال کم سے کم ۲۰ اور زیادہ سے زیادہ ۵۰ فیصد تخفیف کے ساتھ خریدا جاتا ہے۔ ہم نے حساب لگایا ہے کہ موضع زیر بحث میں مخلوط شرح (کلیتہً بشکل زر) کم سے کم ۳۱ فیصد اور زیادہ سے زیادہ ۱۱۰ فیصد سالانہ رہا کرتی ہے۔

بحیثیت مجموعی (مذکورہ ہر سہ قسم کی شرحوں [illegible] ۱۰۰۶ [illegible] اور اس [illegible] آنے میں یہ [illegible] ہے کہ کم سے کم شرح سود ۶ فیصد اور زیادہ سے زیا[illegible]

مسلۂ قرض داری کے بغور مطالعہ کے بعد ہم [illegible] حان ساہوکار [illegible] اور توجہ طلب مسئلہ شرح حات قرض کا ہے۔ جنکی غیر معمولی زیادتی کی وجہ سے ایک طرف [illegible] ہوتے جاتے ہیں تو دوسری طرف ساہوکاروں کا تموّل بڑھتا جاتا ہے۔ اعلی شرح سود کی وجہ سے مزارعین کی آمدنی قابل لحاظ طور پر گھٹ جاتی ہے۔ تخفیف آمدنی کا براہ راست اثر انکے معیار زندگی پر پڑتا ہے۔

---

۵ - دوسرے ضمیمہ میں یہ بیان درج ہے جسمیں ساہوکار نے بیان دیا ہے کہ ابتداءً اسنے تقریباً ایک ہزار روپیے کے سرمایہ سے لین دین و تجارت کا کاروبار شروع کیا لیکن اب اسکی جائداد ۲۰ - ۲۵ ہزار ہے۔

نوٹ: ـــ تقریباً تمام ساہوکاروں کی ترقی کا یہی حال ہے۔

دسویں فصل اصلاحی تدابیر

دوسری فصل میں بتلایا گیا ہے کہ موضع زیر بحث کے باشندوں کا معیار زندگی بحیثیت مجموعی ادنیٰ اور معمولی ہے۔ اسی فصل کے آخری پارے میں ادنیٰ معیار زندگی کی سب سے اہم اور بنیادی وجہ ادنیٰ آمدنی قرار دی گئی ہے مزید برآں ادنیٰ آمدنی کے تین اہم وجوہ بتلائے گئے ہیں۔

(۱) اضافہ آبادی اور ذرائع معاش کی غیر متناسب رفتار ترقی۔ (۲) پیشوں کا فقدان اور زراعت پر [illegible]ضرورت بار۔ (۳) نظام زراعت کے گوناگوں نقائص۔ مثلاً زرعی عوامل پیدائش کی غیر متناسب حالت [illegible] ہائے لین دین کے گوناگوں نقائص۔

[illegible]ر غیر اصولی طریقہ ہائے کاشت کی وجہ سے اگر ایک طرف [illegible] طرف پیداوار فی ایکڑ بھی ادنیٰ اور معمولی ہوتی ہے [illegible] کے معمولی ہونے کی وجہ سے آمدنی میں بھی نسبتاً تخفیف ہو جاتی ہے [illegible] ناقص طریقہ ہائے فروخت [illegible] کی بناء پر آمدنی میں مزید تخفیف ہوئی ہے۔ ناقص طریقہ ہائے لین دین اور اعلیٰ شرح سود کی بدولت آمدنی میں اور بھی تخفیف ہو جاتی ہے۔ ادنیٰ اور معمولی آمدنی کا براہ راست اثر باشندوں کے معیار زندگی پر پڑتا ہے نتیجہ یہ کہ ادنیٰ آمدنی کی وجہ سے معیار زندگی بھی ادنیٰ اور معمولی ہو جاتا ہے۔

ان تمام حالات کی تشریح کے بعد ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ باشندگان موضع ہٰذا کے موجودہ معیار زندگی کو کیوں کر بلند کیا جا سکتا ہے۔

معیار زندگی کو بلند کرنے کی سب سے اہم تدبیر (علاوہ دیگر امور کے) یہ ہے کہ آمدنیوں میں اضافہ کیا جائے

آمدنی میں اضافہ کے لئے حسب ذیل (الف) بالواسطہ اور (ب) بلاواسطہ تدابیر اختیار کئے جانے چاہئیں۔

(الف) بالواسطہ تدابیر ـــــ

(۱) تخفیف آبادی ـــــ آبادی کے قدیم اعداد کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ موضع زیر بحث ۱۳۲۳ف (م اکتوبر ۱۹۱۳-۱۴ء) ہی میں کثیر الآباد ہوگیا تھا جب کہ اسکی آبادی ۱۰۳۲ تھی۔ کیونکہ ۱۳۲۳ف (م اکتوبر ۱۹۱۳-۱۴ء) میں جب آبادی اس نقطہ پر پہنچ گئی تو کثرت آبادی اور ذرائع خوراک کی قلت کی وجہ سے مابعد سالوں میں ماتھس کے ذکر کردہ مثبت موانعات (مثلاً ہیضہ۔ چیچک۔ طاعون اور قحط وغیرہ) کی بدولت مسلسل تخفیف شروع ہوئی چنانچہ ۱۳۲۳ف (م اکتوبر ۱۹۱۳-۱۴ء) تا ۱۳۲۹ف (م اکتوبر ۱۹۱۹-۲۰ء) کے سات سالوں میں بحیثیت مجموعی ۲۵۱ نفوس فوت ہوئے۔ جبکہ انہی سات سالوں میں صرف ۵۴ نفوس پیدا ہوئے۔ مزید برآں ۱۳۲۷ف (م اکتوبر ۱۹۱۷-۱۸ء) اور ۱۳۲۸ف (م اکتوبر ۱۹۱۸-۱۹ء) کی قحط سالیوں میں اکثر خاندان تلاش معاش کی خاطر دیگر مقامات کو منتقل ہوئے ان حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۳۲۹ف (م اکتوبر ۱۹۱۹-۲۰ء) کے اختتام پر جملہ آبادی صرف ۸۰۷ رہ گئی۔ گویا سات سال کے عرصہ میں جملہ ۲۴۵ نفوس کی تخفیف ہوگئی۔ لیکن ۱۳۳۰ف (م اکتوبر ۱۹۲۰-۲۱ء) [illegible] اور اس کے بعد سے آبادی میں اضافہ ہونا شروع ہوا ۱۳۳۵ف (م اکتوبر ۱۹۲۵-۲۶ء) میں آبادی ۹۲۲ [illegible] زائل ہوجانے کی بدولت وہ افراد جو تلاش معاش کی [illegible] ہوا ہونا شروع ہوئے ۱۳۳۵ف (م اکتوبر ۱۹۲۵-۲۶ء) کے بعد [illegible] ہونا شروع [illegible] میں آبادی ۱۰۵۴ تک پہنچ گئی۔ موجودہ آبادی ۱۳۲۳ف (م اکتوبر ۱۹۱۳-۱۴ء) کی آبادی کے مقابل ۱۱٫۸۲ فی صد زیادہ ہے۔ آبادی میں مناسب تخفیف یا ذرائع معاش میں مناسب اضافہ نہ کیا جائے تو پھر اس بات کا امکان ہے کہ ماتھس کے ذکر کردہ مثبت موانعات (مثلاً ہیضہ چیچک۔ طاعون اور قحط وغیرہ) کے ذریعہ آبادی میں تخفیف ہوگی۔ موضع ہذا میں کثرت آبادی کا اندازہ اس امر سے بھی ہوسکتا ہے کہ یہاں فی مربع میل ۳۶۱ نفوس پرورش پارہے ہیں حالانکہ ماہرین نے تخمینہ[۱] کیا ہے کہ اگر زراعت سے بہتر سے بہتر استفادہ کیا جائے تو

---

[۱] ـ م معاشیات ہند مصنفہ جتھار اینڈ بیری ایڈیشن ۱۹۳۳ء صفحہ (۴۰)

اس کے ذریعہ فی مربع میل ۲۵.۰ نفوس ایک معقول معیار آرام پر زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

ان حالات کے تحت بہتر اور مناسب یہی ہے کہ موضع زیر بحث کے باشندوں کے معیار زندگی کو بلند کرنے اور آئندہ کیلئے مثبت موانعات کے عملدرآمد کو روکنے کے لئے آبادی میں تخفیف کی جائے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ آبادی میں تخفیف کی جائے تو اس کے ساتھ ہی دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ پہلا یہ کہ آبادی میں کسقدر تخفیف کی جانی چاہیئے۔ دوسرے یہ کہ یہ تخفیف کیونکر کی جا سکتی ہے۔

پہلے سوال کا جواب بہت ہی وقت طلب ہے۔ کسی مقام کی متوازن آبادی کے متعلق کوئی قطعی رائے نہیں قائم کی جا سکتی۔ بالفاظ دیگر قطعی طور پر یہ نہیں بتلایا جا سکتا کہ اگر کسی مقام کی آبادی اسقدر ہے تو وسایل معاش اسقدر ہونے چاہئیں۔ تاہم تخمینہ کے ذریعہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ موضع زیر بحث کی متوازن آبادی ۷۸۰ ہونی چاہیئے (اس تخمینہ کا قطعیت کے ساتھ صحیح ہونا ضروری نہیں) کیونکہ ۱۳۲۳ف (م اکتوبر ۱۹۱۳ء) کے بعد * گوناگوں مثبت موانعات کی بدولت آبادی گھٹتے گھٹتے ۷۸۰ ہوگئی۔ اگر آبادی میں تخفیف کی مزید گنجایش ہوتی تو موانعات آبادی کو ۷۸۰ سے بھی زیادہ گھٹا دیتے لیکن۔ اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ آبادی میں [illegible] بہت [illegible] ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ موضع زیر بحث کے [illegible] معیار آرام پر پرورش کرنے کی گنجایش ہے بلکہ اس [illegible] دی کے مضر اثرات سے لاعلمی کا نتیجہ ہے[5]۔ اگر ہم [illegible] ۲۵.۰ نفوس فی مربع میل ایک معقول معیار آرام پر زندگی بسر کر سکتے ہیں تو موضع کی جملہ زراعت پیشہ آبادی ۸۱۴ ہونی چاہیئے۔ جیسا کہ ہم اس سے قبل کہہ چکے ہیں متوازن آبادی کو قطعی طور پر نہیں بتلایا جا سکتا۔ محض تخمینے اگر ایک طرف صحت سے کسقدر قریب ہوتے ہیں تو دوسری طرف اسکا بھی امکان ہوتا ہے کہ وہ صحت سے بہت دور ہوں۔ اس مجبوری کے تحت ہم موضع زیر بحث کی کوئی متوازن آبادی قطعیت کے ساتھ نہیں بتلا سکتے تاہم حالات حاضرہ کا لحاظ کرتے ہوئے اتنا ضرور کہینگے کہ موجودہ آبادی [illegible]

[illegible] ۱۔ ادارایہ

[illegible] ۲۔ عرض بعث [illegible]

---

[5] - اس قانون کی لاعلمی یا علم ہونے کے باوجود اس کی جانب سے لاپرواہی کی بناء پر ذرائع معاش کی تحدید کے باوجود آبادی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ ایک حد معینہ کے بعد مثبت موانعات اثر پذیر ہو کر آبادی کو قابل لحاظ طور پر گھٹا دیتے ہیں۔

ایک مناسب اور موزوں تخفیف ہونی چاہیئے۔

جب ہم یہ رائے قائم کر لیتے ہیں کہ موجودہ آبادی میں ایک موزوں و مناسب تخفیف کیجانی چاہیئے تو پھر ہم دوسرے سوال سے دوچار ہوتے ہیں یعنی یہ کہ یہ تخفیف کیونکر کیجا سکتی ہے۔ اس تخفیف کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو یہ کہ موجودہ نفوس میں سے ایک قابل لحاظ نفوس کی تعداد کو ہلاک کر دیا جائے (اگر ہم نہ کریں تو قحط اور وبائیں اس کام کو پورا کرتی ہیں) یا یہ کہ اونہیں ایک ایسے مقام پر منتقل کیا جائے جہاں کافی ذرائع معاش موجود ہیں۔ جہاں تک کہ پہلی تدبیر کا تعلق ہے موجودہ حالات کے تحت وہ قطعاً ناممکن ہے البتہ دوسری تدبیر پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ ریاست کے ایسے مقامات میں جو غیر آباد ہیں موضع ہذا کے قابل لحاظ افراد کو (مختلف تحریصات سے اور سہولتیں بہم پہنچا کر) وہاں منتقل کرنا چاہیئے۔ جہانتک کہ آئندہ پیدائشوں کا تعلق ہے اُن پر سختی سے تحدید کیجانی چاہیئے بچپن کی شادیاں قطعی طور پر ممنوع قرار دیجائیں۔ جب تک کہ اس قسم کی سختی نہ کیجائے اعلیٰ شرح پیدائش کی تحدید دقت طلب امر ہے۔ مانا کہ اس ممانعت کی وجہ سے لازمی طور پر عام بے چینی (خصوصاً دیہاتیوں میں) پیدا ہوگی لیکن موزوں و مناسب تدابیر کے ذریعہ ایک مدت معینہ میں اس کو کلیتہً رفع کیا جا سکتا ہے

آبادی کو روکنے کیلئے نہ صرف اس امر کی ضرورت [illegible] اور اس [illegible]

ذریعہ افراد کو سمجھایا جائے کہ وہ اس وقت تک

معیار آرام پر پرورش کرنے کے قابل نہ ہوں۔ ہمار [illegible]

دیر سے کر سکتے ہیں لیکن جنسی جذبات پر بہت عرصہ تک قابو [illegible]

جسکی بدولت دیر سے شادیاں کرنے کا مقصد فوت ہو جائیگا۔ اعتراض ایک حد تک درست ہے۔ اگر جذبات پر قابو نہیں رکھا جا سکے تو ہماری قطعی رائے یہ ہے کہ شادیوں کے بعد ضبط تولید کے ذرائع اختیار کئے جائیں۔ نہ صرف موضع زیر بحث بلکہ تمام ہندوستان کیلئے ہماری قطعی رائے ہے کہ اگر ہم موجودہ معیار زندگی کو بلند کرنا چاہیں تو ہمارے لئے نہ صرف یہ ضروری ہے کہ موجودہ ذرائع سے بہتر سے بہتر استفادہ کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ دولت پیدا کیجائے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ آبادی کے بڑھتے ہوئے رجحان کو نہایت سختی کے ساتھ اُسوقت تک روکا جائے جبتک کہ ہم یہ محسوس نہ کرلیں کہ آبادی کی تحدید کی وجہ سے ہمیں کوئی حقیقی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

(۲) صنعتی ترقی ——— آمدنیوں میں اضافہ کرنے اور معیار زندگی کو بلند کرنے کیلئے تحدید آبادی کے ساتھ ساتھ ضرورت اس امر کی ہے کہ مختلف پیشوں کے مابین توازن قایم کیا جائے۔ قیام توازن کے لئے صنعتی ترقی (خواہ وہ کسی قسم کی ہو) ضروری ہے محض موضع زیر بحث کو لیکر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس میں صنعت پیشہ آبادی اسقدر ہونی چاہیئے اور زراعت پیشہ اسقدر۔ صنعتی ترقی کا مسئلہ کل ریاست سے متعلق ہے۔ ریاست کے ایک حصہ میں صنعتی ترقی کا اثر دوسرے حصہ پر پڑیگا۔ دوسرے حصہ میں ترقی کا اثر تیسرے حصہ پر پڑیگا اور بحیثیت مجموعی تمام ملک کے پیشوں کا لحاظ کرتے ہوئے ایک قسم کا توازن قائم ہوسکے گا۔ فی الوقت اگر موضع دوپلی پر بحث کیجارہی ہے تو اسکے یہ معنی نہیں کہ ہم موضع دوپلی کو ایک خودکفیل معاشی اکائی فرض کررہے ہیں۔

(۳) تعلیمی ترقی ——— دیہاتیوں کی لاعلمی انکے لئے گوناگوں مصیبتوں کا باعث بنی ہوئی ہے آئے دن اونہیں اپنی لاعلمی کی وجہ سے مختلف قسم کے مالی نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں۔ مثلاً دیہاتی چونکہ ...یا لہذا اونہیں جب کبھی دفتر وغیرہ سے متعلق کوئی کام پڑتا ہے (خواہ وہ کام کسقدر معمولی کیوں نہو) ...کرنا پڑتا ہے۔ فروخت پیداوار کی حدتک دلال اونکی لاعلمی و جہالت سے ...کی بدولت جا وبیجا طور پر اونکا استحصال کرتے ہیں ...صد پر سود ادا کر رہے ہیں۔ انہیں یہ بھی نہیں معلوم ...لیا یہ چیز اونکی لاعلمی کیوجہ سے نہیں کہ وہ بغیر سوچے سمجھے ...بدولت انہیں نقصان عظیم اٹھانا پڑتا ہے۔ چونکہ یہ لوگ قانون سے ناواقف ہوتے ہیں لہذا جا وبیجا طور پر آبائی قرضوں کی ادائی کرتے رہتے ہیں جسکی وجہ سے ان کی آمدنی کا کافی حصہ مستقل طور پر منہا ہوتا رہتا ہے۔ اپنی لاعلمی ہی کی بدولت وہ نہ تو اخراجات کاشت کا حساب رکھ سکتے ہیں اور نہ یہ معلوم کرسکتے ہیں کہ کس جنس کی کاشت میں انہیں نسبتاً زیادہ منافع مل سکتا ہے۔ دیگر مجبوریوں کے علاوہ اپنی لاعلمی و جہالت کی بدولت گوبر کا بری طرح استعمال کرتے ہیں۔ قلت کھاد کا اثر پیداوار پر پڑتا ہے۔ اوقی پیداوار کی وجہ سے آمدنی میں تخفیف ہوتی ہے۔ مزارعین کی حالت کو سدھارنے اور انہیں متذکرہ مختلف مالی نقصانات سے بچانے کیلئے تعلیم کا دیا جانا ضروری ہے تعلیم کا بالواسطہ اثر مزارعین کی بیداری پر پڑتا ہے۔ بیداری کی وجہ سے

مذکرہ نقصانات سے بڑی حد تک سبکدوشی حاصل کیجا سکتی ہے۔ اگر دیہاتی تعلیم یافتہ اور ہوشیار ہوں تو دیہی تنظیم
متعلق ہر قسم کی تحریک بآسانی کامیاب ہوسکتی ہے۔

جب ہم تعلیم کی اہمیت وضرورت کو محسوس کرتے ہیں تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس قسم کی تعلیم
دیجانی چاہیئے۔ موجودہ حالات کا لحاظ کرتے ہوئے نہ صرف مناسب وموزوں فنی تعلیم کا انتظام کیا جائے بلکہ
حرفتی تعلیم بھی نہایت اہم وضروری ہے خصوصاً زراعت کی تعلیم ازبس ضروری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے
کسان محنتی وجفاکش ہوتے ہیں لیکن زراعت سے متعلق انکے جسقدر معلومات ہیں وہ نہایت ہی قدیم ہیں۔ موجو
زمانہ اسکا مقتضی نہیں کہ انہی معلومات پر اکتفا کیا جائے۔ فی زمانہ حالات بالکل بدل گئے ہیں۔ زمینات
گھٹتی ہوئی زرخیزی کا مسئلہ بہت ہی اہم ہوگیا ہے۔ کسانوں کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ کس زمین کی کیا خاصیت
ہوتی ہے (مانا کہ بعض تجربہ کار کسانوں کو اسکا علم ہوتا ہے لیکن سب کسان زمین کی خاصیت کو نہیں جان سکتے) کس قسم
جنس کے لئے کس نوعیت کی کھاد کس مقدار میں دیجانی چاہیئے۔ مزید برآں انہیں جانوروں اور فصلوں پیدا
بیماریوں کی خاصیت اور انکا علاج بھی معلوم ہونا چاہیئے لیکن کسان [illegible] اور اس آلے سے بچا
علاج ومعالجہ سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ فصلوں اور جانوروں [illegible]
نہیں جانتے۔ زراعتی تعلیم میں کسانوں کو مذکورہ [illegible]
کیا جاسکتا ہے۔ جہاں تک کہ باغبانی کا تعلق [illegible]
باغبانی کیلئے مالی مشکلات سدراہ ہوتے ہیں لیکن اگر انہیں [illegible] تو وہ [illegible]
کسان کامیاب باغبانی کرنے کے قابل نہیں جبتک کہ انہیں باضابطہ تعلیم نہ دیجائے۔ باغبانی کے ذریعہ
قابل لحاظ تعداد معقول آمدنی کے ساتھ اپنی پرورش کرسکتی ہے۔ اگر "ڈیری فارمنگ" کی تعلیم کا انتظام
اور عوام کو اس کی ترغیب دیجائے تو اس صنعت میں بھی قابل لحاظ افراد کی کھپت ہوسکتی ہے۔ بہر طور ز
اس نوعیت کی ہونی چاہیئے جو تمام اجزائے زراعت پر حاوی ہو۔

جہاں تک کہ عام تعلیم کا تعلق ہے وہ کم از کم اس معیار کی ہونی چاہیئے کہ جسکی بدولت دیہ
طور پر پڑھ لکھ سکیں۔ اور معمولی قسم کی سرکاری مراسلت بھی کرسکیں۔ علاوہ ازیں انہیں اتنی قابلیت

ہونی چاہیئے کہ وہ مختلف اخبارات ورسائل کو پڑھ کر اپنے پیشہ سے متعلق ضروری اور مفید معلومات حاصل کر سکیں ہماری قطعی رائے یہ ہے کہ جبتک لاعلم دیہاتیوں کی تعلیم کا باضابطہ اور موثر انتظام نہ کیا جائے دیہی اصلاح سے متعلق خاطرخواہ نتائج نہیں برآمد ہوسکتے۔ تقریباً ہر دیہات میں ایک مدرسے کا قیام ضروری ہے۔ مدرسین کی تعداد کا مدار دیہات کی وسعت پر ہوگا۔ اسمیں شک نہیں کہ ہر دیہات میں ایک مدرسہ قائم کرنے کی وجہ سے تعلیمی اخراجات بہت بڑھ جائینگے لیکن ان اخراجات کے بار کو بار نہ تصور کیا جائے۔ علاوہ ازیں معمر اشخاص اور ایسے لڑکوں کی تعلیم کیلئے جنہیں دن میں فرصت نہیں ملتی تعلیم شبینہ کا انتظام کیا جائے۔ جبتک ایسا نہ ہو عمومیت تعلیم کا مدعا سرعت کے ساتھ پورا نہیں ہوسکتا۔

واضح رہے کہ مذکورہ بالا بالواسطہ تدابیر کے علاوہ مزارعین کی آمدنیوں کو بڑھانے بالفاظ دیگر انکے معیار زندگی کو بلند کرنے کیلئے حسب ذیل بلاواسطہ تدابیر کا بھی اختیار کیا جانا ضروری ہے۔

) بلاواسطہ تدابیر ———

تقسیم و انتشار اراضی کی اصلاح ——— زراعت کو نفع بخش بنانے کے لئے زمینات کی تقسیم اور [illegible] کے اس نقص کی وجہ سے نہ صرف موضع زیر بحث بلکہ [illegible] ہے۔ ہماری رائے میں تقسیم و انتشار اراضی کے مسئلہ کو [illegible] حالات مناسب و موزوں صنعتوں کو ترقی دیجائے [illegible] غلط ہے کہ ہر قسم کی صنعت کارخانہ ہی سے متعلق ہونی چاہیئے) پیشوں کی زیادتی کہ [illegible] بالواسطہ طور پر زراعت پر پڑیگا۔ اور لوگ زراعت اختیار کرنے کے لئے ایسے مجبور نہ ہونگے جیسے کہ اب ہیں۔ گویا صنعتی ترقی کی وجہ سے زراعت کا موجودہ بار کم ہوگا اور تقسیم اراضی کی سابقہ شدت برقرار نہ رہے گی۔ تحدید آبادی کا بالواسطہ اثر بھی تقسیم اراضیات کی شدت کو کم کریگا۔ کیونکہ پیشوں کے فقدان کے ساتھ ساتھ جس سرعت سے آبادی میں اضافہ ہوگا (اشتراک خاندان کے زوال کی بدولت اسی سرعت کے ساتھ اراضیات کی تقسیم در تقسیم عمل میں آئیگی اور تقسیم اراضیات کے ساتھ انتشار کی کیفیت بھی بڑھتی جائیگی۔ لہذا تقسیم و انتشار اراضیات کی شدت کو روکنے کیلئے نہ صرف یہ ضروری ہے کہ ملک کے

طول وعرض میں مناسب حال اور موزوں صنعتوں کو ترقی دیجائے بلکہ اسکے لئے آبادی کی تحدید بھی ضروری[1] ہے۔ مزید برآں موثر پروپگنڈے کے ذریعہ مزارعین کو تقسیم و انتشار اراضیات کے حقیقی نقصانات سے واقف کرایا جائے اور انہیں اس امر کی ترغیب دیجائے کہ بزرگ خاندان کی وفات پر ہر ہر قطعۂ اراضی میں سے جداجدا حصص کرنے کی بجائے جہانتک ہوسکے اراضی کی اس طور پر تقسیم کریں کہ اسکی بدولت کم سے کم قطعات ہونے پائیں موجودہ انتشار کو کم کرنے کے لئے کسانوں کو الحاق یا اتصال اراضیات کی ترغیب دیجائے۔ چنانچہ یہ تحریک پنجاب اور صوبجات متوسط میں قابل لحاظ طور پر کامیاب ثابت ہو چکی ہے۔ پنجاب میں اس تحریک کی کامیابی کا ایک اہم سبب یہ بتلایا جاتا ہے کہ بلحاظ زرخیزی وہاں کی زمینات تقریباً یکساں ہیں۔ اسمیں شک نہیں کہ الحاق یا اتصال اراضیات میں اختلاف زرخیزی کی وجہ سے بہت رکاوٹ پیدا ہوتی ہے لیکن اس دقت کو بھی رفع کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ رفع کرنے کی کوشش کیجائے۔ فرض کیجئے دو کسان اپنی اراضی کے ایک قطعہ کا تبادلہ کرنا چاہتے ہیں لیکن دقت یہ ہے کہ ایک کسان کا قطعہ ۲ ایکر ہے اور دوسرے کا ڈیڑھ ایکر علاوہ ازیں مالذکر قطعہ نسبتاً نصلوں) پیدا آخرالذکر نسبتاً زیادہ زرخیز۔ اگر فریقین حالات کو اچھی طرح سمجھ لیں تو [illegible] ڈیڑھ ایکر اراضی سے (جو نسبتاً زیادہ زرخیز ہے) [illegible] اور اس آئے میں یہ بھی یہ محسوس کریں کہ اس قسم کے مبادلہ میں ان کا نقصان [illegible] کسان ایسے بھی ملینگے جو بہرحال (خواہ مبادلہ [illegible] حاصل ہو یا نہ [illegible] اس قسم کے کسانوں کو قانوناً مجبور کیا جانا چاہیئے۔ جو افراد [illegible] [illegible] ان سے رجسٹری کا معاوضہ لیا جائے بلکہ ملکیت کا اندراج طرفین کے نام پر بلا کسی فیس کیا جائے۔ اگر فیس رجسٹری لیجائے تو یہ چیز طرفین کے حق میں بار ثابت ہوگی۔ نہ صرف یہ بلکہ اتصال اراضیات میں رکاوٹ کا باعث بنے گی۔ اتصال اراضی کا کام اگر موثر طریق پر جاری رکھا جائے تو فی الوقت قابل لحاظ اراضیات یکجا ہو سکتی ہیں جبکہ

---

[1] مختلف نقاط نظر سے ہندوستان کی موجودہ آبادی میں تحدید کی سخت ضرورت ہے اگر کمزور اور نہایت ادنیٰ کارگذار آبادی میں دن بدن اضافہ ہوتا جائے تو حالات بد سے بدتر ہوتے جائینگے۔ ہمارے لئے اضافۂ آبادی کا مسئلہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا برعکس اسکے افراد کی کارکردگی کو بہتر بنانے کا مسئلہ بہت اہم ہے۔

ہم نے تقسیم و انتشار اراضیات کے گوناگوں نقائص کو چند باسمجھ اور تجربہ کار کسانوں کے سامنے بیان کیا اور اتصال اراضیات کی تحریک پیش کی تو تقریباً تمام کسانوں نے اس سے اتفاق کیا بشرطیکہ اس کی وجہ سے طرفین کا کوئی حقیقی نقصان نہو۔ کسانوں کو تقسیم و انتشار اراضی کے نقصانات سے بچانے کے لئے ایک طرف تو سرگرم طریق پر اتصال اراضیات کی ترغیب دیجانی چاہیئے اور دوسری طرف "مشترک کاشت" کی ترغیب بھی نہایت ضروری ہے۔ حالات کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اشتراک خاندان کا طریق ہندوستان کے مختلف حصص میں دن بدن کم زور ہوتا جا رہا ہے۔ موضع زیر بحث میں بھی بہت کم خاندان اس طریق پر عمل پیرا ہیں۔ سالہائے ماسبق میں ہندوستانی خاندان (بالخصوص ہندو) بالعموم مشترک طور پر دولت پیدا کرتے اور مشترک طور پر صرف کرتے تھے لیکن اب واقعات بالکل برعکس نظر آرہے [illegible] وجوہات کی بناء پر بزرگ خاندان کی وفات پر تقریباً ہر وارث یہ چاہتا ہے کہ اپنا گھر بار علیحدہ کرے۔ اس رجحان کی وجہ سے بھی تقسیم و انتشار اراضیات کا مسئلہ اہم تر ہوتا جا رہا ہے۔ فی زمانہ [illegible] ندان کا طریق غیر مفید ثابت ہو رہا ہے تو تقسیم و انتشار اراضیات کو حل کرنے کے لئے کم از کم مشترک [illegible] ک کاشت کا طریق موضع زیر بحث کیلئے کوئی نیا طریق نہیں۔ کیونکہ [illegible] کرتے ہیں۔ لیکن کاشت کی حد تک مشترک [illegible] ت لاحق ہوتے ہیں) بالعموم مشترکہ طور پر کیجاتی ہے کہ [illegible] اس سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ ان حالات کے تحت [illegible] کے گوناگوں فواید سے آگاہ کیا جائے اور موثر طور پر انہیں اس کی ترغیب دیجا[illegible]ے تو کوئی وجہ نہیں جو یہ تحریک کامیاب ہوتی نظر نہ آئے۔ مختصر یہ کہ صنعتی ترقی تجدید آبادی۔ اتصال اراضیات اور مشترک کاشت کی ترغیب کے ذریعہ تقسیم و انتشار اراضی کی موجودہ نوعیت کو قابل لحاظ طور پر کم کیا جا سکتا ہے۔ جسکی بدولت مزارعین کے مصارف کاشت میں تخفیف ہوگی بالفاظ دیگر انکی آمدنیوں میں اضافہ ہوسکے گا۔

(۲) زرعی اصل کی اصلاح ـــــ واضح رہے کہ زرعی اصل میں مویشی۔ آلات زراعت مصنوعی ذرائع آبپاشی۔ کھاد اور تخم کو شامل کیا گیا ہے۔ مزارعین کی آمدنیاں نہ صرف اراضیات کی تقسیم

انتشار کی وجہ سے کم ہوتی ہیں بلکہ زرعی اصل کے گوناگوں نقائص کا بھی کمی آمدنی پر نمایاں اثر پڑتا ہے۔

مویشی ـــ مویشیوں کی حد تک سب سے اہم مسئلہ انکی کارکردگی کا ہے۔ مویشیوں کی ادنیٰ کارکردگی کی وجہ سے غیر محسوس طریقہ پر مصارف کاشت بڑھ جاتے ہیں۔ مصارف کاشت کی زیادتی کا اثر آمدنیوں پر پڑتا ہے۔ لہذا آمدنیوں میں اضافہ کی خاطر نہ صرف تقسیم و انتشار اراضی کی اصلاح ضروری ہے بلکہ مویشیوں کی کارکردگی کو بہتر بنانے کا مسئلہ بھی اسقدر اہم ہے۔ مویشیوں کی کارکردگی کو بہتر بنانے کیلئے حسب ذیل تدابیر اختیار کئے جانے چاہئیں۔

الف۔ مویشیوں کی تعداد میں تخفیف۔

ب۔ مویشیوں کے رکھ رکھاؤ اور چارہ کا بہتر انتظام

ج۔ نسل کشی کا انتظام

د۔ علاج حیوانات کا معقول و بروقت انتظام۔

الف۔ موضع زیر بحث میں انسانی آبادی [illegible] جانوروں کی [illegible]

اگر ہم ہر دو مسائل کا تقابلی مطالعہ کریں تو ہم اس [illegible] ذرائع معاش محدود ہیں تو دوسری طرف آبادی میں [illegible] (خواہ وہ انسانوں کی ہو یا جانوروں کی) کا اثر قلت [illegible] کارکردگی متاثر ہوگی۔ ۱۳۳۸ف (م اکٹوبر ۲۹ ۱۹۲۸ء) [illegible] جانوروں کی تعداد ۱۲۳۱ تھی لیکن اب ۱۶۹۲ ہوگئی ہے۔ اس اضافہ کے ساتھ ساتھ چاہیئے تھا کہ فی سو جا[illegible] رقبہ گاران میں بھی زیادتی ہوتی لیکن اسمیں تخفیف نظر آتی ہے۔ ۱۳۳۸ف (م اکٹوبر ۲۹ ۱۹۲۸ء) میں فی سو جانور اوسط رقبہ گاران ۳۱٫۶۷ ایکر تھا لیکن اب ۲۳٫۰۵ ایکر ہوگیا ہے۔ موضع زیر بحث میں جانوروں [illegible] کثرت کا اندازہ اس سے بھی ہوسکتا ہے کہ یہاں پر فی سو ایکر کاشت شدہ اراضی کیلئے بحیثیت مجموعی ۹[illegible] زرعی و غیر زرعی جانور ہیں۔ حالانکہ شاہی زرعی کمیشن نے بتلایا ہے کہ برٹش انڈیا میں فی سو کاشت شدہ بحیثیت مجموعی (۲۷+۶۷) ۹۴ جانور ہیں۔ کمیشن کی رائے میں یہ تعداد زیادہ ہے۔ لیکن موضع زیر بحث

فی سو ایکڑ کاشت شدہ رقبہ کیلئے جانوروں کی تعداد ۹۱ سے بھی بہت زاید یعنی تقریباً ۱۴۹ ہے۔ ان حالات کے تحت موضع ہذا کے جانوروں کی آبادی کے متعلق ہم یہ رائے قائم کر سکتے ہیں کہ وہ کثیر الاباد ہے جانوروں کیلئے قلت خوراک کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ خوراک کی مسلسل کمی اور کثرت کار کی بدولت خصوصاً زراعتی جانوروں (جو زراعت میں براہ راست مدد دیتے ہیں) کی حالت ناگفتہ بہ نظر آتی ہے۔ لہذا ان کی کارکردگی کو بہتر بنانے کیلئے ضرورت اس امر کی ہے کہ انکی تعداد میں تخفیف کیجائے۔ پانچویں فصل میں ہم بتا چکے ہیں کہ جملہ زرعی جانوروں کا لحاظ کرتے ہوئے ۴ء۸ فیصد جانور زیادتی عمر وغیرہ کی وجہ سے بالکل از کار رفتہ ہو گئے ہیں ان جانوروں کو قصابیوں کے ہاتھ فروخت کر دیا جانا چاہیئے۔ مزید برآں اسی فصل میں یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ جملہ زرعی جانوروں کا لحاظ کرتے ہوئے [illegible] ...نوز کارگذار ہیں۔ ۶۰ء۳ فی صد کارگزار جانوروں میں سے صرف ۲ء۸ فیصد ...ری ہیں اور باقی ۲ ۵ فی صد غیر معیاری جانور ہیں۔ ۵۲ فیصد جانوروں میں سے ۲۴ء۳ فیصد ...کارکردگی مقابلتاً خراب اور ۲۷ء۷ فیصد کی بہت ہی خراب ہے۔ ہر کسان کی یہ کوشش ہونی ...وں کی بجائے ۲ اچھے جانور رکھے۔ کیونکہ ۲ اچھے جانور اسی قدر ...چنانچہ پانچویں فصل میں ہم نے بتلایا ہے کہ معیاری بیلوں کی ...ائی کر سکتی ہے۔ حالانکہ ادنیٰ قسم کے بیلوں کی ایک جوڑ ...لیتی ہے۔ ان حالات کے تحت اگر کسان معیاری بیلوں کے ...وں کی تعداد میں (جو کہ مجموعی زرعی جانوروں کی تعداد کا لحاظ کرتے ہوئے ۹ء۱۲ فیصد ہیں) ۵۰ فیصد تخفیف کی گنجائش ہے۔ ٹھیک اسی طور پر معیاری قسم کے بھینسے رکھنے کی وجہ سے ادنیٰ قسم کے بھینسوں کی تعداد میں ۵۰ فیصد تخفیف ہو سکتی ہے۔ اگر درجہ دوم کے بیلوں اور بھینسوں کی حالت کو ٹھیک کیا جائے تو جانوروں کی تعداد میں تخفیف کی مزید گنجائش نکل آتی ہے۔

جہانتک کہ موضع زیر بحث کی گائیوں اور بھینسوں کا تعلق ہے ان کی حالت بہت ہی ناگفتہ بہ ہے چنانچہ ہم نے پانچویں فصل میں درجہ اوّل و دوم اور سوم قسم کی گائیوں اور بھینسوں کی کارکردگی کا حال تفصیل کے ساتھ بتلایا ہے۔ جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قوت تولید اور خصوصاً دودھ دینے کی صلاحیت ...

فہرست مضامین

۱۔ اداریہ

۲۔ عرض حال

لحاظ کرتے ہوئے موضع ہذا کی گائیوں اور بھینسوں کی حالت بہت ہی خراب ہے۔ یہ بات کسقدر قابل افسوس ہے کہ یہاں کی بہتر سے بہتر گائے روزانہ سوا سیر اور بہتر سے بہتر بھینس روزانہ ڈھائی سیر سے زاید دودھ نہیں دے سکتی واضح رہے کہ اس قسم کے گائیوں اور بھینسوں کی تعداد بہت ہی محدود ہے۔ دوم اور سوم قسم کی گائیں اور بھینسیں تعداد میں بہت زیادہ ہیں دوم قسم کی گائے روزانہ ڈھائی پاؤ اور سوم قسم کی گائے روزانہ پاؤ سیر سے زاید دودھ نہیں دے سکتی۔ اسیطرح دوم قسم کی بھینس روزانہ پونے دوسیر اور سوم قسم کی بھینس روزانہ سوا سیر سے زاید دودھ نہیں دے سکتی۔ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کی ادنیٰ کارکردگی والی گائیوں اور بھینسوں کو ایک کثیر تعداد میں جمع رکھنے سے بجائے فائدے کے نقصان ہوگا۔ کیونکہ ادنیٰ قسم کی گائیوں اور بھینسوں کی یہ تعداد چارہ کے ذرائع پر ایک قسم کا بار ثابت ہوگی۔ انکی تعداد کی زیادتی کی وجہ سے [illegible] قیمت [illegible] مدد دینے والے جانور یعنی بھینسے اور بیلوں کیلئے قلت چارہ کا مسئلہ بہت ہی اہم ہوجائیگا [illegible] خوراک کی [illegible] جسکو ہمارے کسان حقیقی طور پر محسوس نہیں کرتے) اگر ایک طرف بیلوں اور بھینسوں کی حالت خراب ہوتی نہ ہو) پید[illegible] طرف گائیوں اور بھینسوں کی حالت بد سے بدتر ہوگی۔ لہذا بہتر ہو [illegible] چارہ [illegible] بھینسوں کی تعداد میں بھی تخفیف کیجائے۔ ۲ خرا[illegible] اور اس [illegible] آنے سے [illegible] اور ایک اچھی بھینس رکھی جائے تو انکی تعداد میں بھی [illegible] گائیوں اور بھینسوں کی تعداد میں ممکنہ تخفیف کیجا[illegible] [illegible] جانوروں کو اچھی غذا مل سکے گی اور وہ عمدگی کے ساتھ اپنا [illegible]

(ب) دیکھ ریکھاؤ اور چارہ کا بہتر انتظام ـــــ مویشیوں کی کا[illegible]لی کو بہتر بنانے کے لئے ایک طرف تو ان کی تعداد میں نمایاں تخفیف کی جانی چاہیئے اور دوسری طرف چارہ کے موجودہ ذرائع سے بہتر سے بہتر استفادہ کیا جائے۔ چنانچہ شاہی زرعی کمیشن نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے اور ہمیں کمیشن کی اس رائے سے پورا اتفاق ہے کیونکہ ان دو صورتوں کے علاوہ تیسری مفید شکل نظر نہیں آتی۔

چارہ کے موجودہ ذرائع سے بہتر استفادہ کرنے کا ایک طریق یہ ہے کہ موسم بارش میں جبکہ چارہ کی کثرت ہوتی ہے اسکا ذخیرہ کیا جائے۔ ذخیرہ کے لئے سیلاج کا طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔ بشکل سیلاج چارہ کا

ذخیرہ کرنے کی ترکیب یہ ہے کہ زمین میں ۱۰ فیٹ لانبا۔ ۸ فیٹ چوڑا اور ۸ فیٹ گہرا گڑہا کھود دیا جائے
اس گڑھے کو چارہ سے بھر کر مٹی سے ڈھانک دیا جائے۔ سیلاج کا جمع کیا ہوا چارہ خصوصاً دودھ دینے والے
جانوروں کے لئے بہت مفید ثابت ہوا ہے۔

دھان اور جوار کی فصلوں سے جو چارہ حاصل ہوتا ہے اسکو احتیاط کے ساتھ زیر سایہ رکھا جائے لیکن
موضع ہذا میں قلت جگہ کی وجہ سے چارہ کو زیر سا گری کی شکل میں رکھا جاتا ہے۔ موسم گرما میں ان گریوں کو بعض مرتبہ
آگ لگ جاتی ہے جسکی بدولت کسانوں کو بہت ہی پریشانی اٹھانی پڑتی ہے۔ مزید برآں بارش کے موسم میں چارہ کی
گری بھیگ بھیگ کر چارہ سڑ جاتا ہے۔ بارش کی وجہ سے ہر سال چارہ کی قابل لحاظ مقدار خراب ہوتی رہتی ہے
آگ اور پانی سے چارہ کا [illegible] اس کی کافی مقدار بچ سکتی ہے۔

[illegible] یہ بھی دیکھ [illegible] جانوروں کے آگے چارہ ڈالا جاتا ہے تو وہ اسکی قابل لحاظ مقدار کو
[illegible] دیتے ہیں۔ چارہ ڈالنے کا انتظام اس طور پر کیا جائے کہ مویشی چارہ کو خراب نہ کر سکیں۔
[illegible] طور پر یوں ہی ڈالدی جاتی ہے جسکی وجہ سے اگر ایک طرف مویشیوں کو
بہت [illegible] طرح نہیں کھا سکتے۔ لہذا کرابی (جسکی موضع ہذا [illegible]
[illegible] کتر کر ڈالا جائے تو نہ صرف مویشیوں کو کھانے [illegible]
[illegible] پائیگی۔

[illegible] ادارِیہ

[illegible] عرض حال

[illegible] ان کا مناسب انتظام بھی ضروری ہے۔ فی الوقت [illegible]
کوئی تنظیم نہیں۔ جسے جا [illegible] ادھر چاہیں چر سکتے ہیں نتیجہ یہ کہ بہت سی گھاس محض روندنے میں خراب ہو جاتی ہے
ضرورت اس امر کی ہے کہ [illegible] ان کے باضابطہ قطعات کئے جائیں اور باری باری چند یوم کے عرصے سے دیہات کے
جملہ جانور ایک ایک قطعہ پر چرائے جائیں۔ اس ترکیب کی وجہ سے چارہ غیر ضروری طور پر خراب نہونے پائیگا حصول
چارہ کی ایک اور صورت یہ ہے کہ مزارعین کو چارہ کی ارزاں فصلیں اگانے کی ترغیب دیجائے مگر اس بارے میں
سب سے اہم مالی دقت پیش آتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ جن اراضیات پر چارہ کی فصل اگائی جائے اونیز حصول
آبپاشی معاف کیا جائے۔ موضع زیر بحث میں اگر یہ سہولت بہم پہونچائی جائے تو ہمیں توقع ہے کہ کسانوں کی

ایک قابلِ لحاظ تعداد چارہ کی فصلیں اگانے پر راضی ہوگی۔

(ب) جانوروں کے رکھ رکھاؤ کا باضابطہ انتظام — مویشیوں کی کارکردگی کو بہتر بنانے کیلئے نہ صرف چارہ کا بہتر انتظام کیا جانا چاہیئے بلکہ مویشیوں کے رکھ رکھاؤ کا باضابطہ انتظام بھی ضروری ہے۔ جانوروں کے کوٹھے (وہ مقام جہاں کہ جانوروں کو باندھا جاتا ہے) نہ صرف بند ہوتے ہیں بلکہ غلیظ بھی۔ خصوصاً موسم باراں میں نکاسی آب کا باضابطہ انتظام نہ ہونے کی وجہ سے انکی حالت خراب رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ غلاظت کی وجہ سے کوٹھے بھی متعلق ہونگے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ کوٹھوں کو ہمیشہ خشک اور صاف رکھا جائے اور ہوا کے داخل ہونے کے لئے باضابطہ روشندان رکھے جائیں۔ جانوروں کو عام طور پر بری طرح کوٹھے میں بھر دیا جاتا ہے۔ خصوصاً گائیوں کے ساتھ یہ طرزِ عمل بہت عام ہے۔ قلت جگہ اور جانوروں کے [illegible] غیر محسوس طریق پر جانوروں کی صحت متاثر ہوتی ہے۔ خصوصاً اُس زمانہ میں جبکہ کوئی متعدی بیماری پھیلے [illegible] بہت جلد متاثر ہوجاتے ہیں۔ اکثر کوٹھے محض برائے نام ہوتے ہیں۔ انمیں نہ صرف بارش کا پانی نیچے اترتا ہے بلکہ (فصل ب) پیدا ہونے میں جانور اوس سے بھی بچ نہیں سکتے۔ لہذا جانوروں کی صحت اور کارکردگی [illegible] نہ صرف اچھی غذا دیجانی چاہیئے بلکہ اونکی رہائش کا [illegible] اور اس [illegible]

(ج) نسل کشی کا باضابطہ انتظام — [illegible] تعداد میں تخفیف کیجانی چاہیئے اور چارہ کے ذرائع سے [illegible] باضابطہ انتظام بھی ضروری ہے۔ فی الوقت ہمارے کسان اس [illegible] نسل کشی کا کوئی تخیل ہی نہیں گائے ران میں اچھے اور برے جانور یکساں طور پر [illegible] جاتے ہیں۔ لہذا اچھی گائیوں اور خراب بیل۔ خراب گائیوں اور اچھے بیلوں کے اختلاط کی وجہ سے اچھی نسل پیدا ہونے نہیں پاتی۔ اکثر مرتبہ خراب گائیوں اور خراب بیلوں کا اختلاط بھی ہوا کرتا ہے۔ اس اختلاط کی وجہ سے جس نوعیت کی نسل پیدا ہوگی وہ پوشیدہ نہیں۔ بیلوں اور گائیوں کو گائے ران میں یکساتھ چھوڑ دینے کی وجہ سے اکثر مرتبہ غیر پختہ گائیوں (ان گائیوں سے ایسی گائیں مراد ہیں جنمیں بچہ دینے کی قابلیت بطور اتم پیدا نہیں ہوئی) کا اختلاط ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ بچہ کمزور پیدا ہوتا ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ گائیوں اور بیلوں کے

چرنے کا علٰحدہ علٰحدہ انتظام کیا جائے۔ اس انتظام کی وجہ سے اسمیں شک نہیں کہ تھوڑی بہت دقت اٹھانی پڑیگی لیکن اسکا بہت ہی مفید اثر مترتب ہوگا۔ سرکاری مزرعہ جات پر عمدہ قسم کے بیل زیادہ تعداد میں رکھے جائیں اور موثر پروپگنڈے کے ذریعہ مزارعین کو ایک طرف تو عمدہ قسم کی گائیں رکھنے کی ترغیب دیجائے اور دوسری طرف انہیں عمدہ اختلاط کے حقیقی فوائد سے آگاہ کیا جائے۔ بہرطور مویشیوں کی کارکردگی کو بہتر بنانے کیلئے عمدہ غذا کے علاوہ نسل کشی کا معقول انتظام نہایت ضروری ہے۔

(۸) علاج حیوانات ـــــــ جس طرح کسان آئے دن متعدد بیماریوں کا شکار ہوتے رہتے ہیں اسیطرح انکے مویشی بھی مختلف امراض میں مبتلا رہتے ہیں جنمیں سے بہت کم بیماریوں کا علاج کسانوں کو اچھی طرح معلوم ہوتا ہے۔ بعض متعدی بیماریوں [illegible] ۔بی [illegible] وبا ہوجاتے ہیں اور سمجھنے لگتے ہیں کہ چونکہ دوا کی وجہ سے بیماری [illegible] کا اثر ہوگیا ہے۔ اس اثر کو دور کرنے کیلئے شیطان کے نام پر بکرا ذبح [illegible] موضع میں مقیم تھا دیہات کے تقریباً تمام جانور گالی کی بیماری میں مبتلا تھے۔ اسس [illegible] آغاز ہوچکا تھا کہ بحیثیت مجموعی تمام دیہات سے چندہ کرکے [illegible] ممکن ہے کہ ابتک اس تحریک کو عملی جامہ پہنا [illegible] پروپگنڈے کے ذریعہ انکی توہم پرستی کو دور کیا جائے [illegible] نظام آباد (جو موضع زیربحث سے تقریباً ۹ میل ہے) میں [illegible] اس سے خاطر خواہ طور پر مستفید ہوتے نظر نہیں آتے۔

امراض مویشیان کا معقول بندوبست [illegible] علاج نہ صرف اسلئے ضروری ہے کہ اس کی بدولت جانوروں کی کارکردگی ٹھیک ہوسکتی ہے بلکہ اموات مویشیان میں تخفیف کی وجہ سے کسانوں کا قرض بھی بہت کچھ ہلکا ہوسکتا ہے کیونکہ کسانوں کو جانور بالعموم اسوقت خریدنا پڑتا ہے جبکہ وہ فوت ہوجاتے ہیں۔

آلات زراعت ـــــــ جدید اور مناسب حال آلات کے استعمال کا مسئلہ بھی ایسا ہی اہم ہے جیسا کہ مویشیوں کی کارکردگی کا مسئلہ۔ مزارعین کی موجودہ پست معاشی حالت کا لحاظ کرتے ہوئے عام طور پر قدیم آلات کے

۱- ادارہ [illegible]

۱- عرض حال [illegible]

۱- مویشیوں کے مختلف امراض اس کا تذکرہ ہوچکا ہے۔

استعمال ہی کو مناسب خیال کیا جاتا ہے۔ مالی وقت کا سوال اسمیں شک نہیں کہ بہت اہم ہے لیکن اگر ہم اپنی زراعت کو
بہتر بنانا چاہیں اور فی ایکڑ پیداوار کے اوسط کو بڑھانا چاہیں تو ماہرین کی رائے کے مطابق اس نوعیت کے آلات استعمال
کئے جائیں کہ جنکی بدولت ہل چلائی اور تخم ریزی وغیرہ کا کام بہتر سے بہتر طریق پر ہو سکے۔ ہمارا یہ خیال نہیں کہ قدیم آلات
چونکہ قدیم ہیں لہذا وہ برے ہیں۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ قدیم آلات ہی میں اس قسم کی تبدیلی کرنی چاہیئے کہ جسکی بدولت
اگر وہ ایک طرف نسبتاً کم قیمت میں دستیاب ہو سکیں تو دوسری طرف اپنے مفوضہ کام کو بہتر سے بہتر طریق پر انجام دیں
اس قسم کے آلات کی فراہمی اور اس سے متعلقہ تحقیق محکمۂ زراعت کا کام ہونا چاہیئے۔ مانا کہ ہمارے ہاں کے تجرباتی
مزرعہ جات پر تحقیق اور تجربوں کا کام نہایت عمدہ طریق پر ہو رہا ہے لیکن جہانتک کہ پروپگنڈے کا تعلق ہے یہ
مزرعے بہت ہی قابل تنقید ہیں۔ اس میں شک نہیں [illegible] اضلاع [illegible] وقت [illegible] دورہ پر ہر سال نمائش
ہوتی ہے لیکن اس نمائش کا کام بالکل نمائشی ہوتا ہے جس سے کسان کو [illegible] اور مناسب حال
آلات کی ترویج کیلئے موثر پروپگنڈے کو کام میں لایا جائے۔ اور مختلف سہولتیں محکمہ [illegible] (اقساط) پیدا
کسانوں کو اس بات کی ترغیب دیجانی چاہیئے کہ وہ جدید آلات [illegible]
حیثیت سے خریدا جاتا ہے خواہ جدید آلات [illegible] اور اس [illegible]
مصنوعی ذرائع آب پاشی ——
اہم موجود ہیں لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے [illegible]
خیال ہے کہ چونکہ خشک اراضیات کے مقابل تر اراضیات [illegible]
مقابل تر اراضیات کی کاشت میں بہت کم منافع ملتا ہے لیکن ہم نے بتلایا ہے [illegible] اراضیات کے مقابل تر اراضیات
کاشت میں قلیل منافع کے وجوہ کچھ اور ہی ہیں .... ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اگر تر اراضیات کی
کاشت مناسب اصول پر کیجائے تو اسمیں خشک اراضیات کی کاشت سے کہیں زیادہ منافع کی گنجائش ہے چونکہ
کسان تر زمینات سے عموماً بدظن نظر آتے ہیں لہذا موضع کی تر اراضیات کا ایک قابل لحاظ حصہ خارج از کاشت
پڑا ہوا ہے۔ جسکی بناء پر حکومت کو متوقعہ رقم مالگزاری (۱۹۳۷ء) سے ۱۰۲۵۰ روپے کم مالگذاری وصول ہو رہی ہے
اگر زراعتی تعلیم کا باضابطہ انتظام ہو جائے اور کسان مناسب اصول پر تر اراضیات کی کاشت کرنے لگیں تو

اونہیں قابل لحاظ منافع ملنے لگے گا۔ موجودہ خارج از کاشت اراضیات زیر کاشت آجائینگی۔ اوسط رقبہ فی کاشت کار بڑھے گا اور حکومت کو بھی معقول آمدنی ہوگی جس سے فلاحِ عامہ کے بہت سے تعمیری کام کئے جاسکینگے۔

کھاد — اس سے قبل ہم نے کھاد کی طلب و رسد پر روشنی ڈالتے ہوئے بتلایا ہے کہ ۱۳۴۶ ف (م اکٹوبر ۲۸ ۱۹۳۷ء) کے جملہ کاشت شدہ رقبے سے عمدہ پیداوار حاصل کرنے کیلئے جسقدر کھاد درکار تھی اس سے ۴۴٫۵ فیصد کم کھاد دستیاب ہوئی اگر وہ اراضیات جو فی الوقت خارج از کاشت ہیں زیر کاشت آجائیں تو کھاد کی قلت میں مزید اضافہ ہوجائیگا نہ صرف موضع زیر بحث بلکہ تمام ہندستان کیلئے قلت کھاد کا مسئلہ دن بدن اہم تر ہوتا جارہا ہے اس مسئلہ کو حل کرنیکی سب سے بہتر اور کارگر تدبیر یہ ہے کہ ایک طرف تو کھاد کے قدرتی ذرائع سے پورا پورا استفادہ کیا جائے اور دوسری [illegible] ایل ال۔ بی (عثمانیہ) کھادوں کی ترویج عمل میں لائی جائے۔

کھا[illegible] [illegible] استفادہ کرنے کیلئے ضرورت اس امر کی ہے کہ گوبر کی جملہ پیداوار کو [illegible] ہم نے اندازہ لگایا ہے کہ مکانات کے لیپنے چھڑکنے اور بطور ایندھن استعمال [illegible] جاتا ہے۔ اگر اس گوبر کو محفوظ رکھا جائے اور اسکو [illegible] دیا [illegible] جائے تو [illegible] فہرست مضامین بالفاظ دیگر اگر گوبر کو مکانات کے لیپنے۔ چھڑکنے [illegible] کاشت کیلئے استعمال کی جائے تو کھاد کی قلت

اور [illegible]

۱۔ ادارہ یہ

۱۔ عرض حال

[illegible] گوبر کے استعمال کو یک لخت ترک کردیں۔ البتہ موثر پروپگنڈے کے ذریعہ یہ بیب مجز [illegible] ریج رفع ہوسکتی ہے۔ موضع ہذا کے قرب وجوار میں اکثر و بیشتر جنگل ہیں خصوصاً موسرہ کا جنگل بہت وسیع ہے [illegible] سے لکڑی باسانی فراہم کیجاسکتی ہے ہمنے اندازہ لگایا ہے کہ اگر ایک خاندان گوبر جلانے کی بجائے لکڑی استعمال کرے تو سالانہ ۱۲ روپیہ کی کفایت کرسکتا ہے۔

گوبر سے پورے پورے طور پر استفادہ کرنے کے بعد کھاد کی جو قلت (۲۴٫۵) فیصد ہوتی ہے اسکو پورا کرنے کیلئے جانوروں کا پیشاب جمع کیا جائے جو کہ نائٹروجن حاصل کرنے کا اہم ذریعہ ہے۔ اگر مویشیوں کے

---

۱۵ موضع بیٹہ کی معاشی تحقیق از محمد ناصر علی صاحب صفحہ ۱۹۔

پیشاب کرنے کی جگہ پر گڑھے کردیئے جائیں تو پیشاب بآسانی جمع ہوسکتا ہے۔ یا یہ کہ پیشاب کو خراب گھاس
جذب کرلیا جاسکتا ہے۔ اگر یہ نہ ہوسکے تو پیشاب کی مٹی ایک مناسب موقعہ سے بدل دی جائے۔ یہ امر واقعہ
دیہات میں مویشیوں کا پیشاب کلیتاً رائیگاں جاتا ہے اگر اسکو محفوظ کرلیا جائے تو اس سے نائٹروجن کی کا
حاصل کیجا سکتی ہے۔ ماہرین کی تحقیق کی بنا پر ہندوستانی زمینات میں عام طور پر نائٹروجن کم مقدار میں پائی جاتی ہے
کھاد کی مزید کمی کو پورا کرنے کیلئے انہیں ہڈی کی کھاد تیار کرنے کو نسبتاً آسان طریقے بتلائے جائیں
ایک تو مردہ جانوروں کی ہڈی اطراف واکناف میں مفت ملجاتی ہے دوسرے یہ کہ ہڈی کی کھاد چاولوں کی کا
(جو کہ موضع کی سب سے اہم پیداوار ہے) بہت مفید ہے۔ علاوہ ازیں انہیں بتلایا جائے کہ چاولوں کے چھلکے
(جو کہ مقدار کثیر مفت میں ملتے ہیں) کیونکر کھاد تیار کرنے کیلئے [illegible] انہیں [illegible] کی کاشت کیلئے کافی
ثابت ہوئی ہے مزارعین کو اسکی بھی ہدایت دیجائے کہ گنے کے [illegible]
استعمال کئے جائیں۔ ان چھلکوں میں نائٹروجن کی کافی مقدار موجود ہوتی ہے [illegible] بلکہ [illegible]) پید
[illegible] فضلے کا [illegible] بالکل رائیگاں جاتا ہے) ڈھیروں میں جمع کرکے [illegible] جدید [illegible]
عمل کرنے کے بعد کھاد کی کمی بڑی حد تک پوری [illegible]
[illegible] اور اس سے [illegible] آنے سے بچایا [illegible]
کیونکہ مسٹر پاکسن کے قول کے مطابق "روئے زمین [illegible]
موجود ہو جیسے کہ ہندوستان میں موجود ہے۔۔۔
حاصل نہ ہوگا [illegible]
تخم ــــ عمدہ پیداوار حاصل کرنے کیلئے [illegible]
سب سے اہم پیداوار چاول ہے لیکن چاولوں کی کاشت کیلئے جس قسم کے تخم استعمال کئے جاتے ہیں وہ بہت
ادنیٰ معمولی ہوتے ہیں۔ سالہا سال سے صرف ایک ہی قسم کے تخم کی کاشت کیجارہی ہے۔ اگر اعلیٰ نسل کے دھانوں کی
عمدہ قسم کے دھان کاشت کئے جائیں تو کسانوں کو عمدہ قیمت وصول ہوسکتی ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ دیہا

سلہ۔ موضع زیر بحث کی زمینات میں بھی بحیثیت مجموعی نائٹروجن کی مقدار کم ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ڈاکٹر
کیمسٹ صدر مرز. عو حمایت ساگر کی ہدایات کے موافق موضع دوپلی سے مٹی کے نمونے لائے گئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب
مہربانی سے ان نمونوں کا طبعی اور کیمیائی تجزیہ کیا۔ بعض وجوہ کی بنا پر تجزیہ کے نتائج بہت دیر بعد وصول ہوئے
حقیقی استفادہ نہیں لیا جاسکا تاہم معلومات کی خاطر اس تجزیہ کے اعداد ضمیمہ دوم میں دیئے گئے۔ سلہ۔ رہنما ہند مصنفہ مسٹر پاکسن

اسکا کوئی خیال ہی نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ماحول کا لحاظ کرتے ہوئے محکمہ زراعت کی جانب سے عمدہ قسم کے تخم کی تشہیر کا کام موثر طریقہ پر جاری رکھا جائے۔ بعض کسانوں کو عمدہ قسم کے تخم مفت دیئے جائیں اور بعض مستطیع کسانوں سے رعایتی قیمت وصول کیجائے۔ ابتداً مختلف سہولتوں کے ذریعہ کسانوں کی توجہ عمدہ تخم کے استعمال کی طرف مبذول کرائی جائے۔ جب وہ انکے فوائد سے آگاہ ہوجائینگے تو اس وقت عمدہ تخم کا استعمال عام ہوجائیگا۔

فصلوں اور انکی بیماریوں کا سدباب ——— انسانوں اور جانوروں کی طرح فصلوں کو بھی آئے دن مختلف قسم کی بیماریاں ہوتی رہتی ہیں۔ مزارعین کا بیان ہے کہ نہر نظام ساگر کی اجرائی کے بعد سے "کا ما روگم" "بردی روگم" اور "اگکیا روگم" بہت عام ہوگئے ہیں۔ کاما روگم کی وجہ سے وہاں کے پودے میں ایک قسم کا چھوٹا پودا اگ آتا ہے یہ پودا فصل کو ... اے ال ال۔ بی (تخمانیہ) وجہ سے دھان سفید ہوکر خراب ہوجاتا ہے۔ اگکیا روگم کی بدولت ... یوں کی وجہ سے کسانوں کو بہت نقصان پہنچ رہا ہے۔ کسانوں کا بیان ہے ... حکومت کے جانب سے ——— کے علاج کی طرف کوئی توجہ نہیں کیگئی۔

مبذول کرے اور ... وعصا

بہ سبت مصائب کی وجہ سے زمینات ہر وقت مرطوب رہنے لگی ہیں
... شت ہوگئی ہیں مختلف بیماریوں کی وجہ سے پیداوار کا
... آمدنیوں کو بڑھانے کی خاطر فصل کی بیماریوں کا

ا۔ ادارہ

سدبا ... ا۔ عرض حال

فروخت پیداوار ——— کسان اپنی لاعلمی اور دیگر مجبوریوں کی بدولت جہاں اور امور میں نقصان اٹھاتے ہیں وہاں فروخت پیداوار کے تحت بھی انہیں کافی خسارہ اٹھانا پڑتا ہے۔ ساہوکار انکی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاکر غلہ کی خرید میں غیر معمولی نفع کماتے ہیں۔ مزارعین کی آمدنیاں اگر ایک طرف ادنی پیداوار (جسکے مختلف وجوہ بیان کئے گئے ہیں) کی وجہ سے کم ہوجاتی ہیں تو دوسری طرف ناقص طریقہ ہائے فروخت کی بدولت بھی انکی آمدنیوں کا قابل لحاظ حصہ مارا جاتا ہے۔ موضع زیر بحث کی پیداوار کا بہت بڑا حصہ "لاونی" کے تحت فروخت ہوتا ہے۔ چنانچہ ساتویں فصل میں ہم بتا چکے ہیں کہ اس طریق کے تحت پیداوار فروخت کرنیکی وجہ سے کسانوں کو کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ

کسقدر نقصان اوٹھانا پڑتا ہے۔

مزارعین کو نقصان سے بچانے بالفاظ دیگر انکی آمدنیوں میں اضافہ کرنے کی خاطر ضرورت اس امر کی ہے کہ پیداوار کی فروخت کا مناسب انتظام کیا جائے۔ لاؤنی کے تحت مال خریدنے کے طریق کو قطعاً ممنوع قرار دیا جائے۔ ساہوکاروں کو اس امر کا پابند کیا جائے کہ وہ قرض دیکر مقررہ رقمی سود (جسکا آگے ذکر کیا جائے گا) وصول کریں۔ اگر قرضہ بشکل جنس دیا گیا ہے تو اسپر مقررہ رقمی شرح کا لحاظ کرتے ہوئے سود وصول کیا جائے۔ مقامی انجمن امداد باہمی کے تحت فروخت غلہ کا ایک گودام قایم کیا جائے اس گودام سے اراکین کو دو قسم کے فوائد حاصل ہونگے۔ پہلا یہ کہ انہیں رفع احتیاجات (مثلاً ادائی مالگذاری وغیرہ) کیلئے بروقت رقم مل سکے گی دوسرے یہ کہ کچھ عرصے تک غلے کا ذخیرہ کرنے کے بعد اسکو فروخت کیا جائیگا تو قیمت بھی اچھی وصول ہوگی سرکاری پیمانوں کے علاوہ دیگر قسم کے بڑے پیمانوں سے ... انہیں ... قت ... کیا جائے۔

ناندیڑ۔ سیلو۔ عمری۔ جالنہ اور لاتور وغیرہ کی طرح ... کا قیام عمل میں لایا جائے۔ کمیٹی کے قیام کی بدولت ... تاجرین کی ... آڑتی اور بعض غیر ضروری ... محکمہ ... پید ... بالکل رائیگاں ... فروخت کے ...

کسانوں کی آمدنی ... طور پر کم ہوتی رہتی ... اور اس آنے سے ...

آمدنیوں میں اضافہ کیا جارہا ہے۔ آمدنیوں میں اضافے ...

قرضہ جات سے متعلق سب سے اہم مسئلہ ...

حال ساہوکار ...

زیادہ سے زیادہ ۷٫۵ فیصد سالانہ شرح سود وصول کیجا ... شک نہیں کہ کفالتی قرض پر زیادہ سے زیادہ ۹ فیصد سالانہ سود سادہ اور غیر کفالتی ... زیادہ سے زیادہ ۱۲ فیصد سود سادہ مقرر کیا گیا ہے لیکن اسپر عمل ہوتا نظر نہیں آتا۔ اسی قانون کی رو سے ساہوکاروں ... ہے یہ ضروری قرار ... وہ لائسنس خریدیں لیکن موضع زیر بحث میں ایک بھی ساہوکار ایسا نہیں جسکے پاس سرکاری لیسنس ہو۔ اس دستور العمل کا ... کرتے ہوئے ساہوکار اسکے بھی پابند قرار دئیے گئے ہیں کہ وہ اپنے آسامیوں کو مرتبہ نمونوں کے موافق حساب کتاب ... قانون اسمیں شک نہیں کہ بہت مفید ہے۔ لیکن سوال اسکے عمل اور عدم عمل کا ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ ساہوکار اسکا پابند بنایا جائے ساہوکار اسوقت تک پابند نہ ہونگے جب تک ان پر نگرانی نہ رکھی جائے۔

نویں فصل میں ہم معلوم کرائے ہیں کہ مزارعین کے قرضہ جات کے دو اہم مدات شادی بیاہ اور تعمیر مکان ہیں
کیونکہ مجموعی قرض کا لحاظ کرتے ہوئے ۲۲ فیصدی قرض شادی بیاہ سے متعلق ہے اور ۱۶ فیصد تعمیر مکانات سے مزارعین کو
سمجھایا جائے کہ بچپن کی شادی کی وجہ سے انہیں قبل از وقت زیر بار ہونا پڑتا ہے چونکہ شادی کا قرضہ کلیتہً غیر پیداوار
ہوتا ہے اور چونکہ اسکی شرح بھی بہت زیادہ ہوتی ہے لہذا اسکی ادائی کا سلسلہ مدتوں چلتا رہتا ہے اور آمدنیوں میں
مستقل کمی ہوتی رہتی ہے اگر شادیاں بر وقت کی جائیں تو قرض کے بیجا بار میں بہت کچھ تخفیف ہو سکتی ہے۔ بہتر ہوگا کہ
انجمن امداد باہمی سے شادی بیاہ اور تعمیر مکان کیلئے طویل المدت کفالتی قرضے دیئے جائیں۔ قرض دہی کرتے وقت
اس امر کا تعین کر دیا جائے کہ یہ قرضہ اسقدر مدت میں وصول ہونا چاہیئے اس مدت کا سود و اقساط کی ادائی کا
لحاظ کرتے ہوئے اصل میں جمع کا ... ایم اے ایل ایل۔ بی (عثمانیہ) ... کو ایک جا کر کے اسکی قسط بندی کر دینی چاہیئے۔ تعمیر
مکانات کا ...
... انتظام کیا جائے اس طریق کی بدولت اراکین کو نہ صرف ادائی
... ہو سکے گی۔

... فیصد ... بات
فہرست مضامین ... دوسری طرف اسکے لئے عام بیداری کی ضرورت ہے
... بچنے کی ترغیب دی جائے انہیں سمجھایا جائے کہ
... ہے۔ اور اس سے حتی المکان بچنے کی کوشش کیجائے۔
... قدیم قرضہ جات کے تصفیے کئے جائیں۔ ان قرضوں کی تحقیق

۱۔ ادارایہ

۱۔ عرض حال

اور تصفیوں کیلئے ایک کمیٹی بہ مجوزہ ... ل میں لایا جائے۔ اس کمیٹی میں محکمۂ تنظیم دیہی (جسکی ہم آئندہ سفارش کرینگے) کا
ایک عہدہ دار ہوگا اس عہدہ دار کے علاوہ دیہات کے دو دیانت دار افراد بھی شریک ہونگے۔ کمیٹی کا فریضہ ہوگا کہ
افراد کے قدیم قرضہ جات کی تحقیق کرے اور انکے مابین ایک مناسب تصفیہ کرے۔ ہمارے خیال میں قدیم قرضہ جات کے
تصفیوں کا کام بہت ہی کامیاب ثابت ہوگا کیونکہ اس قسم کے تصفیوں کیلئے نہ صرف قرضدار بلکہ ساہوکار بھی راضی
نظر آتے ہیں۔ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان تصفیوں کی وجہ سے طرفین کا فائدہ ہوگا۔[۵] چنانچہ ہم نے فریقین کے

---

[۵] ضمیمۂ دوم میں یہ بیانات نمبر ۱۷۔ ۱۸۔ ۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱۔ ۲۲۔ ۲۳۔ ۲۴۔ اور ۲۵ درج کئے گئے ہیں۔

اس رجحان کے دیکھتے ہوئے اپنے قیام کے دوران میں کوئی نو ساہوکاروں اور ۱۳ آسامیوں کے مابین قدیم قرضہ جا
تصفیہ کیا گیا ہے (۱)۔ تصفیہ سے قبل آسامی سے یہ دریافت کیا جاتا تھا کہ اس نے کب اور کسقدر قرض کس شرح پر حاصل کیا تھا
بعد اصل یا سود کی ادائی کیونکر اور کسقدر عمل میں آئی مقروض کے بیان کی تصدیق ساہوکار سے اور ساہوکار کے بیان کی
مقروض سے کی جاتی تھی اختلاف بیان کی صورت میں کوئی ایک درمیانی راستہ بتلایا جاتا تھا جبکہ فریقین کی رضامن
تصفیہ قطعی قرار پاتا تو مقروض کیجانب سے ایک کاغذ ساہوکار کو لکھوا دیا جاتا اور ساہوکار کیجانب سے ایک کاغذ مقروض

بہرطور مزارعین کے معیار زندگی کو بلند کرنے کی سب سے کارگر تدبیر یہ ہے کہ انکی آمدنیوں میں اضا
کیا جائے۔ آمدنیوں میں خاطرخواہ اضافہ اسوقت تک نہیں کیا جاسکتا جبتک متذکرہ بالواسطہ اور بلاواسطہ تدابیر کیساتھ اغ
ہمیں قوی توقع ہے کہ اگر آبادی میں تخفیف [illegible] ترقی دیجائے۔ عام اور
معقول انتظام کیا جائے۔ زرعی زمینوں زرعی اصل۔ طریقہ [illegible]
اصلاح کیجائے [illegible] مزارعین کی آمدنی [illegible] اضافہ ہوگا [illegible] محکمہ [illegible] (پھلوں) پیدا
[illegible]

ظاہر ہے کہ مجوزہ اصلاحی کاموں کی [illegible]
اور اس آنے سے [illegible]
اپنے بجٹ میں اسطور پر تبدیلی کرے کہ جسکی بدولت
کیونکہ دیہی فلاح اور دیہی خوشحالی ریاست
عام ساہوکار [illegible]
دیہی تنظیم کیلئے ضرورت اس امر کی ہے کہ اس نے
[illegible]
موسوم ہوگا۔ تنظیم دیہی کا انفرادی کام عہدہ داران مال سے بھی لیا جاسکتا ہے مگر زیادہ سے زیادہ یہ تحر
کامیاب نہ ہوسکے گی جیسی کہ ایک مستقل ادارہ کی جدوجہد کی بدولت ہوسکتی ہے عہدہ داران مال کیلئے ا
کچھ کم نہیں۔ ان مصروفیات کے باوجود ان سے اس امر کی توقع رکھنا کہ وہ مصالحت قرضہ کے کار
دیہی اٹھان سے متعلق بھی دیگر قسم کی جدوجہد کریں کچھ زیادہ مفید نہیں معلوم ہوتا البتہ محکمہ تنظیم دیہی کے عہ
عہدہ داران مال اعزازی طور پر شریک رہکر جسقدر ممکن ہوسکے امداد دے سکتے ہیں محکمہ تنظیم دیہی ذاتی جدوجہد اور
زراعت محکمہ صنعت و حرفت اور محکمہ انجمن امداد باہمی کے تعاون سے دیہی فلاح اور دیہی خوشحالی کیلئے ہر قسم کا مفید ک

---

(۱)۔ ضمیمہ میں ان ساہوکاروں اور آسامیوں کی فہرست دیجئی ہے جنکے مابین قدیم قرضہ جات کے تصفیے کئے گئے۔

انجمن طیلسانین عثمانیہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی ترجمان

مجلۂ طیلسانین

ساتویں جلد ۔ آبان ۱۳۵۲ف ۔ اکتوبر ۱۹۴۳ء ۔ شوال ۱۳۶۲ھ ۔ چوتھا شمارہ
مدیر :۔ محمد غوث ام ۔ اے ۔ ال ال ۔ بی (عثمانیہ) مہتمم :۔ محمد عبدالعلی بی ۔ ایس سی ال ال بی (عثمانیہ)

فہرست مضامین

عرض حال

گزشتہ شمارے میں اس امر کا اظہار کیا گیا تھا کہ عثمانیہ برادری اپنے ایک سینیئر برادر مولوی محمد یوسف الدین مرحوم کے انتقال پر ماتم گسار ہے۔ کسے خبر تھی کہ مجلے کے اس شمارے کا صفحۂ ابتدائی بھی ماتم و اشک باری کے لیے وقف کرنا پڑے گا۔

شعبۂ دینیات جامعۂ عثمانیہ کے سب سے پہلے طیلسانی مولوی عبد الغفار صاحب صدیقی بھی عین جوانی میں چل بسے۔ ان سے ملتے جلنے والے بظاہر ان پر کسی بیماری کا کوئی اثر نہیں دیکھتے تھے، لیکن معلوم ہوا کہ ان کے جگر کا فساد عرصے سے چلا آرہا تھا۔ اولاً پڑھنے لکھنے میں علاج معالجے پر توجہ نہیں کی، پھر درس و تدریس کے دل فریب مشغلے میں اس قدر منہمک ہوئے کہ گویا خود فراموشی پیدا کرلی۔ اسی خود فراموشی میں آخر کار جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ بیماری کے سخت اور نازک ہونے کا ان کو اس وقت علم ہوا جب کہ دواخانے میں نسخہ تجویز کرانے کے لیے گئے۔ بیماری اس قدر نازک ہو چکی تھی کہ اطبانے ان کو دواخانے ہی میں روک لیا۔

مرحوم شعبۂ دینیات کے پہلے ام۔ اے بھی تھے جس زمانے میں امتحان ام۔ اے میں کامیاب ہوئے اس وقت جامعہ کے مختلف شعبوں میں خود طلبائے جامعہ کے ذمے درس و تدریس کے فرائض سپرد ہونے لگے تھے، اس لحاظ سے ان کے ام۔ اے کامیاب ہونے کے بعد یہ بجا توقع تھی کہ وہ بھی شعبۂ دینیات میں مامور ہوں گے۔ چنانچہ پندرہ برس وہ اپنے مادرِ علمی کی خدمت میں ذوق و شوق سے منہمک رہے۔ اور علالت سے جب تک مجبور اور فریش نہیں ہو گئے اپنے فرائض کی بجا آوری میں سرمو تجاوز نہیں کیا۔

ان کی خلیق اور ملنسار طبیعت، ان کی خاموش خدمت گزاری اور ان کے ذوقِ علم کو ان کے دوست اور شاگرد مدت العمر یاد کرتے رہیں گے۔

ہم ابھی یوسف الدین اور عبدالقادر کے لیے ہی ماتم کناں تھے کہ اپنی برادری کا ایک اور روشن ستارہ بھی غروب ہوگیا۔ احمد عبدالمجید صاحب رضوی بی۔ اے نے جامعہ کے کھیل کے میدانوں میں بڑی نام آوری پیدا کی تھی۔ ہر کھیل میں ان کی طبیعت پوری جولانی دکھاتی تھی۔ ساتھ ہی ذہن و دماغ کی قوتوں سے بھی بہرۂ وافر حاصل کیا تھا۔ اخلاق و محبت کے زیور سے بھی قدرت نے ان کو آراستہ کیا تھا۔ طیلسان حاصل کر کے سررشتۂ مال میں تحصیلداری کے انتخاب میں بازی لے گئے تھے۔ اب حال میں اے۔ آر۔ پی کے سررشتے میں منتقل ہوئے۔ اس جدید سررشتے کی ذمہ داریاں بہت اور نازک تھیں۔ بریں ہم مرحوم اپنی خداداد طبیعت کے جوہر ابھی دکھانے بھی نہیں پائے تھے کہ پیامِ اجل آگیا۔

اس طرح عثمانیہ برادری کے ارکانِ گرامی اپنے وقتِ مقررہ پر چل چلاؤ کی صدا پر لبیک کہہ کر ابدی سکون و اطمینان حاصل کرتے جا رہے ہیں۔ اس قافلے کا سلسلہ یوں ہی باقی رہے گا۔ لیکن زندگی کا تقاضا یہ ہے کہ اس قسم کی آزمائشوں اور ابتلا میں سب اپنے لیے اس دنیا میں بھی سکون و اطمینان اور راضی بہ رضا رہنے کی ہی دعا مانگا کریں۔

مجلے کی اس اشاعت پر نئی ادارت اور نئے انتظام پر گویا ایک سال گزر گیا۔ اس دوران میں نہ صرف چھٹی جلد کے دو شمارے مجموعتہً بلکہ ساتویں جلد کے چاروں شمارے علحدہ علحدہ شایع ہوگئے۔ مجلہ آہستہ آہستہ اپنی مشکلوں کا حل تلاش کرتا جا رہا ہے۔ موجودہ نہایت ہی غیر معمولی حالات میں ایک خالص علمی مجلے کا تسلسل کے ساتھ جاری رہنا ہی بہت غنیمت ہے۔ مجلے کو اور زیادہ معیاری بنانا ناظرین اور معاونین کی اعانت پر منحصر ہے۔ کوشش کی جائے گی کہ آیندہ سال مجلہ ظاہری اور معنوی دونوں اعتبار سے اور زیادہ ترقی حاصل کرے۔

ترتیبِ مجلہ

مجلے کی گزشتہ اشاعت میں اس امر کا اظہار کیا گیا تھا کہ "مجلے کی آیندہ اشاعت کو

گزشتہ کانفرنس طیلسانین عثمانیہ کے مقالات وخطبات اور دیگر تفصیلات کے لیے مختص کر دیا گیا ہے۔ ادارت کی جانب سے پوری کوشش کی گئی کہ سب مقالے اور ضروری رویدادیں وقت پر مہیا ہو جائیں۔ لیکن پوری پوری کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ جو مقالے فراہم ہوسکے وہ اس اشاعت میں شریک کر دیے گئے ہیں۔ خطبات، اخبارات میں شایع ہو چکے تھے، ان کو پھر مجلے میں شایع کرنا، کاغذ کی اس نایابی کے زمانے میں کچھ زیادہ مناسب متصور نہ ہوا۔ ضروری رویدادوں کے وصول ہونے کے لیے بھی بہت انتظار کیا گیا، وہ بھی آخر تک وصول نہ ہوئیں۔ اب ان رویدادوں کے شایع کرنے کا وقت گزر گیا ہے۔ البتہ تقریریں قلم بند کرکے اور دوسرے مقالے بعد نظرِ ثانی بھیجے جائیں تو ان کی اشاعت کے لیے کوشش کی جائے گی۔

۲۔ کانفرنس کے موقع پر عثمانیین کی تالیفوں وغیرہ کی نمائش کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ اس موقع پر مولفوں کی جو ابجد واری فہرست ان کی تالیفوں کی صراحت کے ساتھ مرتب کی گئی وہ مجلے کی اس اشاعت میں شایع کی جا رہی ہے۔ اس فہرست کی تکمیل میں امید ہے کہ سب اصحاب اپنی اعانت سے دریغ نہ فرمائیں گے۔

فکر و نظر

حیدرآباد کا حلقۂ ملازمت اپنے دام میں ملک کے بیسیوں قابل ترین دماغوں کو اسیر کیے ہوئے ہے، اور یہ آرزو رہتی ہے کہ جو شخص اس دام سے نکل آئے وہ اگر ابھی توانا ہے تو خدمتِ قوم میں بھی کچھ وقت گزارے۔ ہمارے ملک میں وظیفہ یابی کے بعد عموماً پھر بازماموری کے لیے ہی دوڑ دھوپ شروع ہو جاتی ہے۔ ہمارے ملک سے قطع نظر دوسرے ممالک میں وظیفہ یابی کے بعد حوصلہ مند لوگ جس قسم کے مشاغل اختیار کرتے ہیں ان کو مسٹر سی راج گوپال چاری نے اپنی ایک تالیف میں یوں بیان کیا ہے:-

"میں اپنے لیے باعث فخر سمجھتا ہوں کہ میں نے کرنل میڈک کی شامِ زندگی کا منظر دیکھا۔ وہ علمی تحقیقات کے کام اس مستعدی سے کر رہے ہیں جیسے کوئی بیس برس کا نوجوان۔ اس کے علاوہ بھی انھیں بہت سی چیزوں سے دلچسپی ہے، اور ان میں منہمک رہتے ہیں۔ وہ باغبانی کے فن میں مہارت رکھتے ہیں، اور ان کا ایک خوبصورت باغ ہے جس میں طرح طرح کے پھلوں اور پھولوں کے درخت ہیں، اور وہ ان پر مختلف قسم کے تجربے کیا کرتے ہیں۔ انھیں دودھ دہی تیار کرنے کا بھی شوق ہے اور اس تحقیقات کے ضمن میں کہ گائے کو دق ہونے کے کیا اسباب ہیں، انھوں نے گھانس کی قسموں پر، جو گائے کھاتی ہے، عجیب و غریب تجربے کئے ہیں۔ انھوں نے ان جراثیم کے متعلق بہت دن تک مسلسل تجربہ کیا جس سے بہتر بن مکھن پیدا ہوسکتا ہے اور اس میں انھیں کامیابی ہوئی مگر یہ معلوم ہوا کہ اس میں خرچ زیادہ ہوتا ہے۔ اپنے گھر بار کے لیے خود پٹرول سے گیس تیار کر رہے ہیں، اور ہر وقت کام میں محو رہتے ہیں۔

کرنل میڈک زیادہ مُسن نہیں بلکہ اور کم سن معلوم ہوتے تھے، کیونکہ اب وہ نوکری کے جھمیلے سے آزاد ہیں اور جن کاموں کا شوق ہے انھیں انجام دے سکتے ہیں۔"

واضح ہو کہ کرنل میڈک پونا کے وہ سرجن تھے جنھوں نے گاندھی جی پر ایک بہت ہی کامیاب عمل جراحی کیا تھا۔ مسٹر سی راج گوپال چاری نے جو حالات بیان کئے ہیں وہ رونڈ ٹیبل کانفرنس کے زمانے کے ہیں۔

اس ملک میں کتنے لوگ ایسے ہیں جو وظیفہ لینے کے بعد کرنل میڈک کی طرح اس قدر مفید مشاغل میں اپنا وقت صرف کرتے ہوں۔ اگرچند قابل اور توانا وظیفہ یاب وظیفہ یابی کے بعد قومی خدمت کے میدان میں قدم رکھیں تو کام کے لیے جو میدان ہے اس کی وسعت کا کوئی اندازہ نہیں ہوسکتا۔

قانون تجاذب اور سیرت سازی

از جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب استاذ فلسفہ جامعہ عثمانیہ

بدمی کنی و نیک طمع می داری　　　　ہم بد باشد سزائے بدکرداری

با آں کہ خداوند کریم است و رحیم　　　گندم ندہد بار چو جو می کاری

(رومی)

قانون تجاذب (Law of Attraction) ذہنی یا روحانی زندگی کا ایک ضروری کلی اور عالمگیر قانون ہے نہ اس کی ضد قابل تصور ہے اور نہ اس کا کوئی استثنا رہے! کون شبہہ کرسکتا ہے کہ جن طبائع میں مماثلت پائی جاتی ہے وہ ایک انجذابی قوت کے زیر اثر ایک دوسرے پر غیر شعوری طور پر مائل ہوتی ہیں! اسی لئے تو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ کسی شخص کی سیرت کا صحیح اندازہ کرنا ہو تو دیکھو اس کی صحبت کیسی ہے قانون کی صداقت کا تو ہر کوئی قائل ہے لیکن ہمیں یہاں اس کے بعض تضمنات کو ذرا کھول کر بیان کرنا ہے

"ہمہ شد ارکہ را ہ خود بخود گم نہ کنی"!

فکر کی دنیا میں اس قانون کی سرگرمی پر غور کرو! ایجابی اور نیک خیالات مماثل خیالات کو اپنی طرف جذب کرتے ہیں! اور ان کے درمیان اتصال یا وابستگی ہوتی ہے، اسی طرح بد سلبی اور شر انگیز افکار باہم وابستہ ہوتے ہیں، ایک دوسرے کو پیدا کرتے ہیں! اپنی طرف کھینچتے ہیں، قوت پہنچاتے ہیں۔ تمہارے ذہن میں ایک خیال آتا ہے، اب اس کو تھوڑی دیر روکے رکھو، اس پر تخیل کی تعمیری قوتوں کو مرکوز کرو، مماثل خیالات کا خطور شروع ہوجائیگا، رفتہ رفتہ ان میں زیادتی ہوتی جائے گی اور بالآخر ان کا ہجوم ہونے لگے گا اور تمہارے ذہن کی فضا ان سے مملو ہوجائے گی! جن لوگوں نے اپنے ذہن کی تربیت میں کوشش کی ہے اور اپنے افکار و خیالات پر قابو پیدا کرلیا ہے وہ اس قانون کو تعمیری طریقہ سے استعمال کرتے ہیں اور دنیا سے اپنی قوت فکری کا لوہا منوا لیتے ہیں!

دیکھو مصنف کسی خاص موضوع پر قلم اٹھانا چاہتا ہے! ایک مرکزی خیال اس کے قلب پر چھایا ہوا ہے دو رات دن اسی میں غرق ہوتا ہے، سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے اس کا ذہن اسی میں مصروف ہوتا ہے، ناگہاں

افکار و تصورات کا تسلسل شروع ہو جاتا ہے ۔ اور نامعلوم و ناقابل علم منبع سے خیالات کا چشمہ ابلنے لگتا ہے اور جب تک یہ حالت نہ ہو مصنف لکھنے کی کوشش نہیں کرتا !

اسی طرح مقرر اپنی تقریر کی تیاری کے لئے اپنے موضوع پر ذہن کی سرچ لائٹ ڈالتا ہے ، انہماک کے ساتھ اس پر غور کرتا ہے ۔ قانون تجاذب کا غیر مرئی عمل مماثل تصورات کا ذخیرہ بہت جلد فراہم کر دیتا ہے ان میں ترتیب بھی پیدا ہو جاتی ہے ۔ اور نظام بھی یہ سب مبدء نامعلوم سے پیدا ہوتے ہیں اور مقرر کا ذہن ان کا قیام گاہ ہوتا ہے ! یاد رکھو کہ مفکر تصورات کا خالق نہیں حامل ہوتا ہے وہ تصورات کو پیدا نہیں کرتا وہ محض قانون کی پیروی کرتا ہے اور نتیجے کے طور پر اس کو خیالات و افکار کا تحفہ عطا کیا جاتا ہے ! یہ عطا ہر شخص کی استعداد کے مطابق ہوتی ہے ۔

قانون کے تفہم و تعبیر سے واقف ہونے کے بعد حصول مسرت اور تزکیۂ نفس یا سیرت سازی کی خاطر اس کا استعمال کرو ۔ اس کی توضیح میں ضخیم کتابیں لکھی جا سکتی ہیں لیکن ہم دو ایک مثالوں پر یہاں اکتفا کریں گے ۔ فرض کرو کہ بیماری کا وہم تمہارے دل میں پیدا ہوا ۔ اب بجائے اس کے کہ تم اس کو قبول کر لو اور اس کے متعلق فکر کرنے لگو اور ذہن کو مماثل وسوسوں اور وہموں کا آماج گاہ بنا لو تمہیں چاہیئے کہ اس وہم کی نفی کرو اور وہ اس طرح کہ منبع علم کی طرف فوراً متوجہ ہو جاؤ یعنے حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرو اور آہستگی سے لیکن پورے اعتماد و اذعان کے ساتھ کہو :-

حَصَّنْتُ نفسی بالحی القیوم الذی لا یموت ابداً و دفعت عنہا السوء بالف الف لاحول ولاقوۃ الا باللہ ۔ [1]

یا یوں کہو میں حق تعالیٰ کی حفاظت میں ہوں اور تمام بیماریوں اور آفتوں سے محفوظ و مامون ہوں ان الفاظ کو بیکار کہنے کی ضرورت نہیں محض ذہنی طور پر یہ کہے جا سکتے ہیں جو شخص اس طرح سلبی خیالات کو ذہن میں اترنے اور اپنی جگہ بنانے سے روکتا ہے ، اور قانون تجاذب کو اجازت نہیں دیتا کہ اپنے عمل سے ان سلبی فاسد اور تباہ کن تصورات کی تعداد میں اضافہ کرے اور قلب کو خوف و ہراس سے بھر دے بلکہ اس کے برخلاف ایجابی حقیقت کی

[1] میں نے اپنے نفس کو محفوظ کیا اس ذات پاک کی مدد سے جو حی اور قیوم ہے اور جو کبھی نہیں مرتی اور اپنے نفس سے برائی کو دور کیا دس لاکھ لاحول ولاقوۃ سے ۔ یہ حدیث کے الفاظ ہیں ضروری نہیں کہ ان ہی کا استعمال کیا جائے ۔ ان کے بجائے کوئی اور موزوں الفاظ استعمال کئے جا سکتے

جانب متوجہ ہو جاتا ہے اور وہاں سے ایجابی اور قوت بخش تصورات کو اخذ کرتا ہے جو قانون تجاذب کے عمل سے ہر آن زیادہ ہوتے جاتے ہیں۔ ہر دم نئی طاقت حاصل کرتے جاتے ہیں، قلب کو قوی کرتے ہیں، سیرت کی تعمیر کرتے ہیں اور وفور قوت کی وجہ سے عمل میں نمایاں ہوتے ہیں، صحت کو درست کرتے ہیں، ماحول کو خوشگوار طریقے سے بدل دیتے ہیں، موافق مرام نتائج پیدا کرتے ہیں اور اس طرح قسمت ہی کو بدل دیتے ہیں! یاد رکھو بیماری کی اصل علت ذہنی ہوتی ہے کیونکہ اگر ہم جراثیم کے نظریے کو بھی مان لیں تو بھی یہ مانی ہوئی بات ہے کہ جراثیم کا اثر اس قلب پر نہیں ہوتا جو ایجابی (Positive) ہوتا ہے یعنی جو خود کو سلبی خیالات کا بازیگاہ نہیں بناتا، جو ہر دم وساوس اور ہواجس کی نفی کرتا ہے اور ان کی بجائے ایجابی اور حیات بخش اور نیک خیالات کا اثبات کرتا رہتا ہے اور ان کے مبدء یعنی اپنی حقیقت کو کسی آن فراموش نہیں کرتا۔ ایسا قلب قوت کا مرکز ہوتا ہے توانائی کا مبدء ہوتا ہے، ایسا قلب بیماری کا آسانی کے ساتھ شکار کیسے ہو سکتا ہے؟ بیماری طبیعت کی کمزوری سے پیدا ہوتی ہے۔ طبیعت اگر قوی ہو تو سرے سے بیماری کا وجود ہی ناممکن ہے، یہ کوئی ایجابی چیز نہیں بلکہ سلبی صفت ہے، قدرت کا تقاضا ہی عجز نہ، قوت کا نہ ہونا ہی بیماری ہے، سلبی خیالات، منفی افکار قوت کو سلب کرتے ہیں، قلب کو کمزور کرتے ہیں، اعضاء کو مضمحل کرتے ہیں، اعصاب میں تناؤ پیدا کرتے ہیں اور اسی لئے ان کو ایجابی و ثبوتی تصورات سے بدل دیا جانا چاہیے۔ ایجابی افکار کا مبدء ارحق تعالے ہیں، جوں ہی ہم نے ان کی طرف اپنا رخ کیا گویا ہم ظلمت سے نکل کر روشنی میں آ گئے اب روشنی کی کرنیں آہستہ آہستہ ہمارے جسم میں داخل ہوتی ہیں، ان سے مردہ اعصاب جاگ اٹھتے ہیں، مضمحل اعضا میں توانائی آتی ہے۔ قلب و جگر تازہ دم ہو جاتے ہیں، کھوئی ہوئی صحت پوری قوت کے ساتھ عود کر آتی ہے! صحت کے حصول کے لئے اور اس کے قیام و بقائے واسطے اس قطعی و حتمی نسخے کو یاد رکھو اور ہمیشہ اس کو استعمال کرتے رہو!

قانون تجاذب کے استعمال کی ایک اور مثال پر غور کرو۔ تم پر کسی نے زیادتی کی ہے، تمہارے ساتھ غیر منصفانہ برتاؤ کیا گیا ہے، تمہیں غصہ آتا ہے، رنج ہوتا ہے، اضطراب ہوتا ہے اور تم اس نقصان پر ذہن کی ساری قوتوں مرکوز کر دیتے ہو، نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ سب سے پہلے "مماثل" خیالات کا ہجوم قلب پر

ہونے لگتا ہے، یہ تاریک اندوہ خیز، زہریلے خیالات جو قانون تجاذب کے عمل سے پیدا ہو رہے ہیں اپنے منحوس سایہ سے تمہاری ذہنیت کو مسموم کر دیتے ہیں تمہاری مسرت فنا ہو چلتی ہے۔ تمہاری صحت ٹوٹنے لگتی ہے اور ممکن ہے کہ بالآخر تمہارا دماغ بھی متاثر ہو جائے اور اس میں فتور آنے لگے۔ آتش انتقام کا سوختہ فاتر دماغ اگر انتقام پر اتر آئے تو اس کے نتائج اور اثرات عموماً مسرت و طمانیت قلب کے لئے مفید نہیں ثابت ہوتے۔

مرغ پر ناز رستہ چوں پر آں شود
لقمۂ ہر گربۂ دراں شود　　(معنوی)

اب اگر تم "دَعْ اَذٰهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ" (پ ۲۲ ع ۲) پر عمل کرتے ہوئے اس کو معاف کئے دیتے ہو اور اپنے خیالات کی رو کو بدل دیتے ہو سلبی خیالات کی بجائے ایجابی افکار کے قبول کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہو تو تمہیں ان تمام شر انگیز و فتنہ خیز نتائج سے نجات مل جاتی ہے اور اب تجاذب کا قانون تمام اچھی چیزوں کے رخ کو تمہاری طرف پھیر دیتا ہے۔ اب تم کو حقیقی معنی میں حریت نصیب ہوتی ہے طمانیت حاصل ہوتی ہے مسرت میسر ہوتی ہے۔ کیونکہ تم نے سینہ کو کینہ سے پاک کیا، غصہ سے پاک کیا ان منفی جذبات کے دور ہو جانے سے تمہارے قلب سے ظلمت دور ہوئی، نور کا دخول ہوا اور تمہاری ہستی کا ہر ذرہ اس نور سے جگمگا اٹھا۔ اسی لئے تو کسی عارف نے کہا ہے:-

عالم تمام یک گل بے خار می شود
دل را از کینہ گر مصفا کند کسے

ہر فعل کا اثر، ہر حرکت کا رد عمل، ہر علت کا معلول قطعی ہوتا ہے، یہ قانون کلی اور ضروری ہے، اب کینہ و غصہ کے جذبات کا لازمی و جبری نتیجہ غم و حزن کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح عفو و احسان، رحمت و کرم، صبر و شکر کا قطعی و ضروری نتیجہ مسرت و طمانیت، توافق و الفت، فلاح وغیرہ کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ علیت کے اس کلی اور عالمگیر اور جو ہی لزومی قانون پر یقین ہو جائے تو اَحْسَنَ اِلٰى مَنْ اٰمَنَّا، والے حکم پر عمل کرتے ہوئے ہمیں کوئی تکلف نہیں ہوتا اور ہم اپنے اس عقیدہ کا اظہار کسی شاعر نامعلوم کے ان بیتوں میں یوں کرتے ہیں۔

[illegible]

ہر کسے در راہ من خارے نہد من گل نہم!
او سزائے خار یابد من جزائے گل برم!

یہ سن کر اور مان کر بھی تم ذرا جھلا کر کہتے ہو کہ یہ میرے بس کی بات ہے، میں بہر حال بشر ہوں اور فطرۃً مائل بہ شر، ہوں، فطرۃً ”ظلوم“ ہوں، ”جہول“ ہوں ظلمت و جہل میری ماہیت میں داخل ہیں۔ ان صفات مذمیمہ کو مجھ سے دور کیسے کیا جا سکتا ہے۔ ان کی وجہ سے آفت و مصیبت میں مبتلا ہوتا رہتا ہوں لیکن سچ پوچھو تو حال یہ ہے :-

پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے! (غالب)

تم ایک حد تک ٹھیک کہتے ہو آؤ ہم تمھیں ایک نفسیاتی طریقہ بتلائیں جس کے استعمال سے تمہیں غایت کے حصول میں آسانی ہوگی۔

جس شخص سے تمہیں نقصان پہونچا ہے اور جس کے خیال سے تمہارے بدن میں شورش ہوتی ہے اور جس کو معاف کرنا تم ممکن نہیں سمجھتے اس کو معاف کرنے کے لئے تمہیں چاہیئے کہ کچھ دن اس صداقت پر غور کرو۔

وما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم ولیعفو عن کثیر۔ (پ ۲۵ ع ۵) اور تم کو جو کچھ مصیبت پہونچتی ہے تو وہ تمہارے ہی ہاتھوں کے کئے ہوئے کاموں سے ہے اور بہت سے تو اللہ درگزر ہی کر دیتا ہے

نیز انما ھی اعمالکم ترد علیکم (الحدیث) یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جو تم پر لوٹائے جاتے ہیں۔

ذرا سوچو اس میں تمہارا کوئی دشمن نہیں سوائے تمہارے نفس کے یہ سب کچھ اسی کا کمایا ہوا ہے اور اسی کا تقاضا ”یداک کسبتا و فوک نفخ“[1] دوسرے کو اپنے افعال کا ذمہ دار قرار دینا تمہارے عقل کی کجی اور جذبات کی خامی کی دلیل ہے! جوں جوں تم اس صداقت پر غور کرتے جاؤ گے تم پر واقعات کھلتے جائیں گے اور ہر آفت، ہر مصیبت کی علت تم اپنی کسی حماقت کو پاؤ گے! اگر سلسلۂ تفکر کو چند روز جاری رکھو گے تو حقیقت اس قدر مبرہن ہو جائے گی کہ بے اختیار چیخ اٹھو گے کہ غلطی میری ہی تھی کسی دوسرے کی نہیں اور حق تعالی کے طرف ظلم کی نسبت تو کسی طرح نہیں کی جا سکتی۔ اِنَّ اللّٰہ لیس بظلّام للعبید[2]:

[1] تیرے ہاتھوں نے کمایا ہے اور تیرے ہی منہ نے پھونکا ہے۔ [2] بیشک اللہ تعالی اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔

ہر چہ ہست از قامت ناسازیٔ اندام ماست
ورنہ تشریف تو بر بالائے کس کوتاہ نیست

اس اصول کی صداقت کے وجدان میں کھل جانے کے بعد تم اپنے دشمن کو بھی معاف کرنے کے قابل ہو جاؤ گے۔

اگر تم جذباتی انسان ہو عقل سے کافی حصہ تمہیں نہیں ملا ہے اور مذکورہ بالا اصول تمہاری سمجھ میں کسی طرح نہیں آتا تو تمہیں دوسرا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔

جس شخص کو تمہیں معاف کرنا ہے اس کی شبیہ اپنے تخیل کے مدد سے اپنی نظر وں کے سامنے لاؤ اور اب اس کو مخاطب کر کے کہو :—

"میں تمہیں (نام شخص) حسبۃ للہ پوری طرح معاف کرتا ہوں، دعا کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ تمہیں اپنی نعمتوں سے سرفراز کریں اور تمہیں نورانی کر دیں، آمین۔"

اگر تم یہ عمل چند روز مسلسل خلوص دل کے ساتھ کرتے رہو تو کچھ دن بعد تمہیں یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ تمہارے لئے اُس شخص کو معاف کر دینا زیادہ مشکل تو نہیں۔ اپنے اس مجاہدہ سے اگر تم نے حسن خلق حاصل کر لیا کہ خلق کی طرف سے جفا کے باوجود ان سے وفا کی۔ رحمت و شفقت کو اپنا شعار بنا یا اور ان کے لئے بخشش و عفو کی دعا کی۔ تو اب حقیقی مسرت، طمانیت، سکون، ہر دلعزیزی، محبت وہ انعامات ہیں جو حق تعالیٰ کی جانب سے تم کو عطا کئے جائیں گے اور وہ تمہیں بطریق اجتباء اپنی جانب کھینچ لیں گے۔

راہ بسیار است مردم را بسوئے حق ولے
راہ نزدیکش دل مردم بدست آوردن است (صائب)

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ، لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُوْنَ۔

(پ ۲۳، ع ۲)

لہ بیشک یہی ہے بڑی مراد ملنی، ایسی چیز ہی کے واسطے چاہئے محنت کریں محنت کرنے والے۔

حسن کا ادبی پہلو

از جناب محمد عبدالقیوم خان صاحب باقی۔ ایم۔ اے (عثمانیہ) لکچرار ادبیات اردو جامعہ عثمانیہ

حقیقت کے تین رخ

حقیقت کا جلوہ انسان نے تین زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ایک صداقت، دوسرے خیر اور تیسرے حسن۔ یہ تین روپ گویا فطرت اور زندگی کی تموری ہے۔ صداقت کا تعلق منطق، خیر کا تعلق اخلاقیات اور حسن کا تعلق جمالیات سے ہے۔ ہمیں آج کی صحبت میں یہ معلوم کرنا ہے کہ حسن کی فطرت اور ماہیت کیا ہے! اور ادب میں اس کی تخلیق کس طرح ہوتی ہے؟

لیکن اس سے پہلے ایک امر کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے، وہ یہ کہ لفظ حسن کے ساتھ جو ہماری دلچسپیاں وابستہ رہتی ہیں، اسکی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہم اس کے ساتھ اپنے حسن جذبات کو بھی شامل کر دیتے ہیں جیسے کہ جوش کی شاعری میں۔ یہ لیکن اصولی تحقیق میں حسین مخلوقات کی حیثیت اصل شمار کی جاتی ہے۔ بعض مفکرین مثلاً لیسنگ اور ہوگارتھ نے محض جمالیاتی نقطۂ نظر سے حسن انسانی کو سراہا ہے لیکن یہ بحث طلب مسئلہ ہے۔

حسن ایک غزال وحشی ہے

حسن کی حیثیت عجیب ہے۔ جب سے انسانی شعور پیدا ہوا ہے اس وقت سے حسن انسان کے ساتھ ہے، اس کے اندر ہے، باہر ہے، اوپر ہے گرد و پیش ہے۔ اس کے اعمال کے ساتھ ترقی کرتا ہے اور اس کے ساتھ عروج و زوال کی منزلیں طے کرتا ہے لیکن ایسی قریبی شئے کے متعلق ہم ابھی تک یہ نہیں جانتے کہ یہ ہے کیا؟ ہمارے اعمال کی دنیا اس سے معمور ہے لیکن علم کی دنیا اس سے خالی نظر آتی ہے۔
چنانچہ ایک شاعر نے [illegible] کہا تھا۔

پردہ داری کا [illegible] نہ ہوتا آشکار سب جانتے ہیں کہ صورت آج تک دیکھی نہیں

حسن ہمیشہ سے انسان کے ساتھ رہا۔ لیکن جب کبھی اسے کمند خیال میں اسیر کرنے کی کوشش کی گئی، یہہ اس سے گریز کرتا رہا۔ مصر، بابل، نینوا، شام کی تہذیب و تمدن میں حسن اپنی نمایاں حیثیت رکھتا ہے لیکن ان اقوام میں سے کسی نے یہ دریافت کرنے کی کوشش نہیں کی کہ حسن کیا ہے؟ اس کا آغاز ان یونانی مفکرین نے کیا جنھیں دنیا آج تک افلاطون اور ارسطو کے نام سے یاد کرتی ہے۔ اس وقت سے آج تک یعنے تقریباً دو ہزار سال سے انسان اس حسن گریزاں کو اسیر کرنے میں کوشاں ہے۔ جن علوم نے اس کا بیڑا اٹھایا ہے۔ وہ چار ہیں، ایک فلسفہ، دوسرے نفسیات، تیسرے علم تشریح ([illegible]) اور چوتھے (سائنس) لیکن حسن کا تعاقب کرنے میں انسان کی حیثیت تین قسم کی ہے۔ (۱) ناظر حسن (۲) ناقد حسن (۳) خالق حسن، ہماری آج کی صحبت زیادہ تر انسان کی تیسری حیثیت خالق حسن، یعنے حسن کار سے ہوگی لیکن اس سے پہلے نقاد بن کر حسن کے فلسفے کے متعلق چند مسائل سمجھنے ضروری ہیں۔

حسن داخلی ہے یا خارجی؟

حسن کے متعلق ہمیں سب سے پہلے اس سوال کا جواب معلوم کرنا چاہیئے کہ آیا حسن کائنات کے جملہ مظاہر اور اعیان میں ایک صفت بن کر پہلے سے موجود ہے (جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے) یا اس کا پہچاننا اور اس سے لطف اٹھانا انسان کے داخلی احساسات پر مبنی ہے۔ لیکن اس مشکل سوال کا جواب اس وقت تک نہیں دیا جاسکتا جب تک ہم دنیا کے بعض اہم مفکرین سے خود نہ پوچھ لیں کہ وہ حسن کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں میں یہ چاہتا ہوں کہ معلمین اوّل یعنے افلاطون اور ارسطو اور فلاطینوس کے بنیادی نظریوں کا ذکر کردوں، اور پھر دو جرمن مفکرین، کانٹ اور ہارٹمن کے خیالات کی شرح کروں۔

افلاطون کا نظریۂ حسن

یہہ کہنا ایک حد تک درست ہے کہ انسان فطرتاً افلاطونی ہوتا ہے یا ارسطوی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان یا تو تصوری ہوتا ہے یا حقیقت پرست۔ افلاطون کا حسن کے متعلق نظریہ یہہ ہے کہ حسن تصوری ہے اور پہلے سے موجود ہے۔ وجود کائنات سے ماورا حسن ایک تمثال (Idea) ہے وہ ایک نور مطلق کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب وہ موجودات میں داخل ہوتا ہے تو اس کا نور تاریک تر

ہوتا جاتا ہے، اس لئے وہ کائنات کو حسن ازل کا پرتو اور سایہ قرار دیتا ہے۔ جب حسن کار فطرت کی تقلید کرتا اور اپنے آرٹ کی بنیاد فطرت پرستی پر رکھتا ہے تو اس کا آرٹ سایہ کا سایہ عکس کا عکس بن جاتا ہے (فیدریس) میں اس نے بڑی خوبی سے کہا ہے کہ حسن مطلق ماورائے احساس کا ایک جوہر ہے جب دل اس کا سامنا کرتا ہے تو اس میں ایک ترنگ سی آجاتی ہے حسن کا یہ ذہنی نظارہ اسے اتنا خالص اور لطیف بنا دیتا ہے کہ نظارہ حسن بن جاتا ہے غیر حسی حیثیت سے حسن کا شعور وجدانی ہے ایسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے اپنے وجود سے ماقبل کی زندگی میں حسن کو دیکھا ہے اور اس وقت اس کا جلوہ ہمارے احساس کے شیشوں سے چھن کر ایسا آرہا ہے جیسے آفتاب کی شعاع تاریک شیشوں میں سے گذرتی ہے یہ عبارت اور نمود کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہے (پروفیسر نائٹ نے مکالمات افلاطون میں حسن کے متعدد اور عمیق خیالات سے ایک جامع تصور حسب ذیل پیدا کیا ہے۔ اور بکھرے ہوئے موتیوں کو سمیٹ کر اس طرح کی مالا تیار کی ہے۔ "پروفیسر نائٹ"

"ہر شئے میں دو امور کا اتصال ہے۔ ایک جسمی متشکل اور دوسرا اور خیال جو اس کے اندر ہوتا ہے اور اس سانچے میں مقید بنتا ہے۔ قالب انفرادی اور ٹھوس ہوتا ہے۔ خیال (Idea) عام اور غیر مادی۔ قالب مرئی ہوتا ہے اور جلد گذر جاتا ہے۔ خیال غیر مرئی ہوتا ہے۔ اور مکمل ہو۔ پست تر کا یہ کام ہے کہ بالاتر کی طرف لے جائے۔

جس طرح فلسفے کا اہم منصب یہ ہے کہ وہ مظاہر سے اعیان کی طرف لے جائے اسی طرح اس خاص معاملے میں واقعہ ہے کہ ایک خاص عالمگیر اور کامل اصل یعنی حسن کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ حسن نہ جلی ہو سکتا ہے نہ خفی بلکہ یہ ہمیشہ ہے اور ہمیشہ تھا اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ ہر شئے کے قلب میں (کائنات کے ہر شئے میں) موجود ہے۔"

حسن اور ارسطو

افلاطون کے برعکس ارسطو کا فلسفہ تعمیم پر نہیں بلکہ تجزیہ پر مبنی ہے۔ وہ [illegible] سے تصور کی طرف

جاتا ہے۔ اس لئے اس نے موجودات اور حقائق کا تجزیہ کرنے اور ان سے نتائج اخذ کرنے میں عمر گذار دی۔ اس نے افلاطون کی طرح حسن کو ایک حسن مطلق فرض نہیں کیا۔ اس کے نزدیک حسن کا تصور اس وقت تک پیدا ہی نہیں ہوتا جب تک کہ موجودات کے ساتھ اس کے انسانی تعلق پر غور نہ کیا جائے۔ لیکن جب حسن اضافی ہے، تو اس کے یہ معنے نہیں کہ وہ کارآمد مفید یا اخلاقی بھی ہے حسن کو ایک عالم سکون اور خاموش زندگی میں محسوس کیا جا سکتا ہے حسن کا جذبہ خواہش کا جذبہ نہیں ہے۔ بلکہ غور و فکر کا جذبہ ہے۔ اس نے ان خارجی اشیاء کی صفات جو حسن رکھتی ہیں (تنظیم (Order) اور توازن (Symmetry) قرار دی آخر میں اس نے اپنا ایک مشہور نظریہ پیش کیا کہ حسن بہر حیثیت "Means between the extremes" ہے جامع الفاظ بعد کو شیلر کی ذرو بنیادوں اور کائنات کے اتحاد عقل و ارادہ کی بنیاد بن گئے۔ "خیر الامور اوسطہا" میں اخلاقی تصور ہے لیکن ارسطو کے نزدیک حسن کے تصور کی بنیاد بھی یہی ہے

فلاطینوس (شہر اسکندریہ کا مفکر ہے۔ ۲۰۵ - ۲۷۰ ء)

"حسن مادی اشیاء میں موجود نہیں ہے، بلکہ ان ازلی خیالات میں پایا جاتا ہے جو مادی اشکال میں اکمل حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ یہ حسن ظاہری آنکھوں سے نہیں۔ بلکہ "چشم باطن" سے دیکھا جاتا ہے۔ کائنات میں لامحدود یا ازل۔ حواس یا عقلیت کے ذریعہ نہیں پہچانا جاتا، بلکہ وجدان کے ذریعہ وہ ہمارے اندر اپنا وجود محسوس کراتا اور ہمارے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔" ( )

وہ صاف کہتا ہے:۔ "حسن وہ ہے جو تناسب و تنظیم میں نہیں، بلکہ ہماری فطرت کے ہم آہنگ ہو جائے۔ بدصورت وہ ہے جو اس کی ضد بن کر ہماری فطرت سے دور ہو جائے۔ حسین اشیاء ہماری روح کے ساتھ جو موانست ہے وہ اس کا مبداء ( ) ہے۔ جو دونوں کو پیدا کرتا ہے جس میں وہ قالب (Formed) بن جاتا ہے۔ بدصورت وہ ہے جو غیر قالبی (Uniformed) ہو۔ حسن ایک ازلی خیال ہے جو مادہ میں چمکتا رہتا ہے مادہ اس وقت

حسین بن جاتا ہے جب وہ خیال سے منور ہو جاتے ۔ حسن نہ صرف مرئی اور سماعی اشیاء ہی میں نہیں بلکہ ہمارے اعمال، مناصب، عادتوں، اداروں، اقدار اور علوم میں بھی نظر آتا ہے ۔ لہ

حسن کے متعلق ان تین معلمین اول کے نظریے اس لئے پیش کئے گئے کہ آئندہ حسن کے متعلق جو فلسفیانہ تحقیقات ہوئیں وہ انھیں بنیادوں پر ہوئیں ۔ سائنس یعنی طبعیات، کیمیا، نفسیات، علم الانسان نے اس میں نئے باب کھولے ۔ ہمارے ان معلمین اول نے حسن کے غزال رعنا کو کمند خیال میں گرفتار کیا ہے تو ہمیں اس کی تین حیثیتیں نظر آتی ہیں ۔

خلاصہ

(۱) حسن ایک خیال مطلق ہے جو ماورائے وجود ہے اور کائنات میں منعکس ہے ۔

(۲) حسن ایک حقیقت ہے اور کائنات کے ساتھ اضافی تعلق میں محسوس کیا جاتا ہے ۔

(۳) جس کی دو صفتیں تنظیم اور تناسب ہیں ۔

Beauty is thus the eternal word or reason of the Universe dimly shadowed forth by symbols in matter. Objects are ugly when they are devoid of the word. They are beautiful when they are filled with it; And the soul of the artist if susceptible to beauty drinks in it and becomes filled with the word of the Universe"

The eye could never have beheld the sun had it not become sunlike. The mind could never have perceived the beautiful had it not first become beautiful itself"

(۳) حسن ایک عقلیت ایک نقطہ ہے جو کائنات میں مثال بن کر اور صرف وجدان کے ذریعے پہچانا جاتا ہے!

ایک طویل نہیں وقفہ کے بعد اٹھارویں صدی میں حسن پر داخلی حیثیت سے فکر کی گئی۔ اس کا آغاز جرمن مفکر بام گارٹن (۱۷۶۲ء - ۱۷۱۴ء) سے ہوا۔ لیکن ہم اپنے مقصد کی حد تک اٹھارویں صدی سے بیسویں صدی کے مفکرین کے نظریوں میں سے صرف دو پر بحث کریں گے۔ ایک امانوئیل کانٹ جس کے متعلق ہیگل نے کہا تھا کہ حسن کے متعلق سب سے پہلا معقول لفظ اسی کا ہے۔ دوسرے ہارٹمن۔

امانیول کانٹ

کانٹ کا فلسفہ حسن بہت نازک اور پیچیدہ ہے۔ تاہم اسے واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ کانٹ نے پہلے یہ بتایا کہ انسانی دماغ کی تین صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ (۱) ملکۂ علم (۲) ملکۂ غم و مسرت (۳) ملکۂ ارادہ۔ اس نے اپنی تین مشہور کتابوں میں ان تینوں کی علحدہ علحدہ وضاحت کی۔ وہ کہتا ہے کہ ملکۂ علم کو اپنی عقلیت محض کی تنقید میں سمجھایا۔ ملکۂ ارادہ کو عملی عقلیت کی تنقید میں واضح کیا لیکن غم و مسرت کے لئے اسے بہت الجھن رہی۔ بالآخر اس کی تکمیل (تنقید تصدیق) کے ذریعہ ہوئی۔ جو اس کی تیسری اہم کتاب ہے۔ حسن کے متعلق اس آخری کتاب میں نہ صرف تکملہ ملتا ہے۔ بلکہ اس کی دو پہلی کتابوں کے نظام فکر کا اتحاد بھی پایا جاتا ہے۔

کانٹ کا استدلال یہ ہے کہ حسن کا احساس درحقیقت ایک درمیانی احساس ہے جو عقلیہ اور ارادے کے اتحاد عمل سے پیدا ہوتا ہے۔ صاف الفاظ میں کانٹ کے تصور حسن کی بنیادی نظریہ یہ۔

"We can feel what we can niether know nor will"

اس اُصول رسالت وصلاحت ا سے امر

حسن کے غزال رعنا کا شکار کیا جب ہم عقلیت کے ذریعے مظاہر اور اعیان کی دنیا سے ماورائی دنیا میں نفوذ نہیں کر سکتے اور جب ارادے کی توانائی صرف ہمارے اندر گھٹ کے رہ جاتی اور داخل رہتی ہے، تو ایسی اشتہار کا احساس ہوتا ہے ہم ... اندر ایک قسم کی ہم آہنگی پیدا کر سکتے

یہ درمیانی خلا اور احساس ہم آہنگی حسن کا احساس ہے۔ بہر وہ سمجھاتا ہے کہ ہم حسن کا شعور چار طریقوں سے کرتے ہیں۔

(۱) کسی شئے کو حسین کہہ کر ہم اپنی ایک مسرت سے واقف ہوتے اور اس کا شعور پیدا کرتے ہیں لیکن یہ مسرت "بے غرض" ہوتی ہے۔

(۲) پھر ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس احساس کو دوسروں تک پہنچانا چاہیئے۔ ہم اس شئے کے متعلق اپنے احساسات کو عالمگیر بنانا چاہتے ہیں اور اس لئے بنانا چاہتے ہیں کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ سارے انسان ہماری طرح ایک ہی فطرت رکھتے اور ہمارے ہم خیال ہو سکتے ہیں۔

(۳) جب ہم کسی شئے کو حسین کہتے ہیں تو گویا ہم اسی شیئے کے ساتھ اپنے ذاتی تعلق کو ظاہر کرتے ہیں۔ مگر اس تعلق کی کوئی وجہ قرار نہیں دے سکتے۔

(۴) حسین اشیاء ہمیں اس لئے حسین نظر نہیں آتیں کہ ان میں کمال ہے، یا وہ ہمیں اکساتی ہیں، بلکہ وہ ہماری صلاحیتوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر کام کرتی ہیں۔

پھر اس سوال کا جواب دینا بھی ضروری ہے کہ ہم حسن کے متعلق اپنے خیالات کو عالمگیر کیوں بناتے ہیں وہ کہتا ہے کہ انسان اپنی طرح ساری فطرت میں ایک عقلیت محسوس کرتا ہے، وہ اس عقلیت سے فائدہ اٹھا کر دوسروں کو اپنے احساسات حسن سے لطف اندوز کرتا ہے۔

کروچے نے کانٹ کے (. . . . . تعریفات کی وضاحت خوب کی ہے جو حسب ذیل ہیں۔

(۱) وہ حسین ہے جو ہمیں بغیر کسی غرض کے خوش کرے۔

(۲) وہ حسین ہے جو ہمیں بغیر کسی تصور کے خوش کرے۔

دونوں (Sensationists) "جذبات پرستوں" کے خلاف پیش کی گئیں۔ اب دو Intellectualists) "عقل پرستوں" کے متعلق ہیں۔

(۳) وہ حسن ہے جو آخریت اور سمجھے کا قالب اختیار تو کرے لیکن کسی انجام کی نمائندگی

نہ کرے یعنی حسن میں کمال ہوتا ہے لیکن کمال منتہی کو نہیں پہنچا۔

(۴) وہ حسین ہے جو عالمگیر مسرت کی شئے ہے۔

ہارمن

ہارمن نے حسن کے تصور کو بڑی ذہانت اور ایمانیت کے ساتھ سمجھایا ہے ( ) یہ گویا ایک قسم کا مغربی اشراقی ہے۔ اس نے ہیگل کے "مطلق اور شوپنہار کی مشیت" کو ملا کر اپنا نظریہ پیش کیا۔ جیسے (........) "نظریۂ بیخودی" کہتے ہیں۔ اس نے سب سے پہلے حسن کے متعلق غور کرنے والوں کے مختلف اصولوں اور نظریات کی تنقید کی۔ اس نے (........ عقل پرستوں (Intellectualists) وجدان پرستوں (........) جذبات پرستوں (........) اشکال پرستوں (........) وغیرہ پر نظر ثانی کی اور یہ سمجھایا کہ ان سب میں تھوڑی تھوڑی صحت موجود ہے۔ اور ضرورت ہے کہ ان نیم صداقتوں سے حسن کے متعلق ایک اجتماعی تصور پیدا کیا جائے۔

وہ کہتا ہے جب تک حسن کسی مادی شے میں (........) حلول نہیں کرتا اور تجسیم نہیں پاتا۔ اس وقت تک حسن کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس نتائج میں اصول یہ ہے کہ :- (........) خیالی کو نیم شعوری طریقے سے (........ حقیقی) بنایا جاتا ہے اور (........) (غیر مادی) کو (........) مادی) میں مقید کیا جاتا ہے۔ جب تک ایسا نہ ہو حسن کا ادراک ناممکن ہے۔ حسن کا انکشاف اور حسن کی تخلیق دونوں غیر شعوری طریقوں سے ہوتی ہے۔ عمیق النظری اور واضح نگاہی سے غیر شعوریت کو نقصان پہنچتا ہے اور حسن غائب ہو جاتا ہے۔

پھر وہ حسن پر دو طریقوں سے غور کرتا ہے۔ ایک حسن کا تصور اور اس کا انسان اور فطرت کے تین مقام۔ دوسرے فطرت، تاریخ اور آرٹ میں اس حسن کا انکشاف۔ وہ آرٹ کے متعلق اس انتہا پسندی کو مٹا دینا چاہتا ہے کہ آرٹ مکمل داخلی ہے یا مکمل خارجی۔ وہ کہتا ہے کہ آرٹ کا یہ عمل خارجی طور پر حقیقت ہوتا ہے لیکن اس کا داخلی اثر حسن کہلاتا ہے۔

حسن ایک چمک ہے۔ (Schine)

آخری اور اہم بحث یہ ہے کہ حسن ایک قسم کا "شائین" یعنے چمک ہے۔ یہ چمک نہ دل میں موجود ہے اور نہ خارجی اشیاء میں۔ خارجی اشیاء تو محض اس چمک کو دعوت دیتے ہیں اور آرٹ کے ذریعے یہ چمک عام انسانوں کے مشاہدہ میں اس وقت آتی ہے جبکہ وہ حسن کارانہ اعمال کے ذریعے پیش کی جاتی ہے۔ وہ مختلف قسم کی "چمک" کا ذکر کرتا ہے آنکھ کی چمک، کان کی چمک، تخئیل کی چمک آواز کی چمک، لے کی چمک، تصور کی چمک، اور کہتا ہے کہ اسی چمک میں حسن رہتا ہے۔ یہ چمک حقیقی ہے نہ تخئیلی۔ نہ وہ منظر ہے نہ تصور۔ اگر کسی تصویر کو دیکھیں تو ساری تصویر ایک شئے ہوگی۔ اور "چمک" اس کا نفس اور ذہنی پہلو۔ یہ تصویر کا سانچہ نہیں بلکہ اس کی روح ہے۔

اس مختصر پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے۔ ہم اپنے پہلے سوال کی طرف لوٹتے ہیں کہ حسن آیا کسی شئے کی حقیقت ہے۔ جو اس میں پہلے سے موجود رہتی ہے یا وہ صرف ہمارے احساس یا مشاہدے اور ذوق پر منحصر ہے۔ جدید علیفے نے اس کا کوئی قطعی جواب نہیں دیا ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی اتفاق رائے اس امر پر ہے اور مفکرین کی تحقیقات اسی تصور پر مبنی معلوم ہوتی ہیں کہ حسن خارجی نہیں اور نہ کسی خاص شئے کی صفت ہے بلکہ وہ ہے، جسے ہیوم نے صاف طور پر سمجھا دیا۔

ہیوم

"Beauty is no quality in things themselves it exists merely in the mind which contemplates them."

"حسن اشیائے محض کی خاص صفت نہیں۔ وہ اس دماغ میں موجود رہتا ہے جو ان پر غور و فکر کرتا ہے"۔

ہیوم نے حسن اور فطرت انسانی کے اس ربط کے متعلق جو نظریہ قائم کیا ہے وہ جدید مفکرین کے لئے نشان راہ کا کام دیتا ہے۔ جدید مفکرین مثلاً، اسپنسر، گروز، بالڈوین، کروچے، راجرز، ہربرٹ ریڈ، سالمن سبھوں نے اسی نظریے کی بنیاد پر حسن کی نفسیاتی تشریح کی ہے۔ اس کا اچھا ثبوت ہمیں ادب میں مل سکتا ہے۔ چونکہ ادب کا تعلق داخلی احساسات سے ہے اور حسن بھی داخلی نوعیت رکھتا ہے اس لئے مناسب ہوگا کہ ہم حسن کے اس پہلو پر جدید فلسفے کے نفسیات کے نقطۂ نظر

سے غور کریں کیونکہ نفسیات ہی کے ذریعے حسن کی بنیاد انسانی دل و دماغ کا عمل اور تجربہ ہے۔ ہم یہ معلوم کرسکتے ہیں کہ ادب میں حسن کسے کہتے ہیں، یہ کس طرح پیدا ہوتا ہے اور اس کا اثر اور ماہیت کیا ہے؟

مفکرین نے نفسیاتی نقطۂ نظر سے حسن کے متعلق مختلف نظریے قائم کئے ہیں۔ ان میں اہم اور بڑی حد تک مکمل اور معقول مسئلہ حسن (پیقر) کے الفاظ میں یہ ہے۔

ادب اور حسن

"اب حسن کی ماہیت یہ ہے۔ وہ کسی انجام تک پہنچنے کا ذریعہ ہے اور واسطہ۔ واسطہ یہ ہے۔ حرکتی، بصری، سماعی اور دیگر تخیئلی میدانوں میں ہیجان اور تحریک کا امکان۔ انجام کیا ہے؟ انجام ایک ساعت تکمیل ہے۔ ایک ایسا تجربہ حاصل کرنا ہے جو اپنی فطرت میں مکمل ہو۔ ایک ایسی موافق تحریک جو سکون کے ساتھ کی جائے۔ حسن جس طرح فلاطینس نے کہا، کاملیت نہیں کسی شے کا حسن یہ ہے کہ وہ ساعت تکمیل پیدا کرسکے۔ اس ساعت کا تجربہ یعنے تحریک اور سکون کا اتحاد، جمالیاتی تجربے کا جزو ترکیبی ہے۔"

ادب میں حسن کی دو خصوصیات

اصطلاحوں سے ہٹ کر اس تعریف سے حسن کی جو خصوصیات معلوم ہوتی ہیں وہ دو ہیں۔

(۱) حسن انسان کے اندر ایک تحریک اور ہیجان پیدا کرتا اور اس کا ردعمل یعنے نتیجہ سکون اور تفکر ہوتا ہے۔

(۲) حسن ایک اندرونی تجربہ کا نام جس میں ہم یہ محسوس کریں کہ وہ اپنی حد تک مکمل اور اطمینان بخش ہے۔

گویا تحریک[۱]، سکون[۲] اور کمال[۳] یہ حسن کے تین نفسیاتی رخ ہیں۔

آیئے اب انھیں بنیادوں پر ادب میں حسن کی ماہیت پر غور کریں۔

سب سے پہلے ہمیں اپنے پہلے بیان کی ہوئی بات میں سے ایک کا تعین کر لینا ضروری ہے۔

دو یہ ہی کہ حسن سے وابستہ ہونیکی انسانی حیثیتیں تین ہوتی ہیں۔ (۱) ناظر حسن (۲) ناقد حسن (۳) خالق حسن
ادب میں حسن کار زیادہ تر خالق حسن ہوتا ہے اور اس نظریے کی تشریح کرتا ہے کہ "حسن کار نہ صرف
حسن فطرت کی تقلید کرتا ہے، بلکہ حسن پر اضافہ بھی کرتا ہے"۔ جس طرح اقبال نے کہا ہے۔

عشق ما اندر جہاں ہنگامہ ہا تعمیر کرد ورنہ این شہر خموشاں ہیچ غوغائے نداشت

اس کے ساتھ یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ ادب ایک (Temporal art) ہے
یعنی یہ نظری نہیں بلکہ جذباتی ہے اور اس حسن کی چند صفات حسب ذیل ہیں۔

ادب میں حسن کی عام صفات

(۱) ادب کا حسن عورت کے حسن کی طرح بدیہی اور نظری نہیں بلکہ داخلی اور حسی ہے۔

(۲) اس میں جس طرح کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے "جنت نگاہ" اور "فردوس گوش" کی تفریحی لطافت ہی نہیں ہوتیں، بلکہ اس میں معلومات آفرین مقصد بھی ہوتا ہے۔

(۳) ادب برائے ادب کے معنے صرف یہ ہیں کہ ادب اپنے مقصد سے آگاہ ہو لیکن ادب کا حسن عام آزاد اور ہمہ گیر ہوتا ہے۔

(۴) ادب کے حسن میں گفتگو کی صفت بہت زیادہ ہے کیونکہ اس میں الفاظ کا استعمال ہے جو نہ صرف جذبات انسانی کے ترجمان ہوتے ہیں بلکہ اس کے خیالات، شعور اور معنی آفرینی کی متکلم تصویر بھی۔

(۵) ادب کے حسن میں مصوری، موسیقی، بت تراشی، رقص اور تعمیر کے عناصر شامل رہتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ ادب میں حسن کی ایک واضح تشریح و تعریف کیا ہو سکتی ہے حسن کا کام یہ ہے کہ وہ احساسات کے ذریعے انسان میں ایک طلسمی اثر پیدا کرے اور ایک ساعت تکمیل کا جلوہ دکھائے۔ اس لیے ایک مفکر ادب میں حسن کی تعریف اس طرح کرتا ہے۔

"Literature has "all thoughts all passions all delights"— the the treasury of life — to play with" to weave a spell for the whole man. Beauty in literature is the power to enchant man through the mind and heart, across the dialect of life into a moment of perfection."

"ادب میں" جملہ تخیلات، جملہ جذبات اور جملہ مسرتیں ہوتی ہیں جو زندگی کا خزانہ ہیں۔ انہیں ادب تصرف میں لاتا۔ اور سارے انسانوں کے لئے ایک طلسمی دنیا تیار کرتا ہے۔ ادب میں حسن اس قوت کو کہتے ہیں جو انسان کو محاورۂ حیات کے ذریعے ایک سا تھ تکمیل پر لے آتی اور اسے مسرور کرتی ہے۔"

حسن خارجی ہو یا نہ ہو انسان کا قاعدہ ہے کہ وہ اپنے تصور کو مجسم بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ جملہ احساسات کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی وحدت عمل سے اپنے سامنے ایک تصویر کھڑی کریں جس کو انسان اکثر نسوانیت کے روپ میں دیکھتا ہے اور شاعر یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ حسن ایک صفت الٰہی ہے جس طرح رسکن نے صاف کہدیا۔" تو گینڈ اور جیکو بسا وا کیا میں فطرت اور اللہ میاں کو (The Great Feminine the Great She کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ایسی ہی تصویر ایک شاعر کی پیش کردہ ہے۔ سنیئے۔ وہ "غمزۂ حسن" کے عنوان سے یہ بتایا ہے کہ حسن فطرت اور زندگی کس طرح عمل کرتا ہے۔

غمزۂ حسن

دکھاکے پھر غمزہ میرے دل کو عطا کیا اضطراب تو نے
چلا کے پھر صرصر تمنا، الٹ دیا فرش خواب تو نے

کبھی جو پھولوں کی انجمن میں الٹ دیا ہے نقاب تو نے
تو جام شبنم کو بھر دیا ہے، انڈیل کر آفتاب تو نے

اٹھی ہیں فطرت کے دل میں کیا کیا ترے سبب سے بہار امنگیں
چمن کی افسردہ پتیوں کو سنگھائی بوئے شباب تو نے

فدا ہوں میں تیری شوخیوں پر، نہ کیوں کرا ے حسن غمزہ پرور
کہ تیری عظمت کے آشیاں پر گرائی برق عتاب تو نے

وہ گل جو تنگئ حسن کے چمن میں اٗ ڑا سا ہے بو رنگ کے رنگ انکا
دیا ہے کھول اے نسیم غیرت یہ کس کے منہ کا نقاب تو نے

ازل کے دن دست نازنین سے، جو تونے چھیڑا یہ ساز ہستی
کیا ہے چاک اپنی انگلیوں سے، خموشیوں کا حجاب، تونے
کرن حقیقت کی تلملائی کہ چھٹ گئے پردۂ نظر کو
غبار حسن مجاز کا جب اٹھا چھینکا نقاب تو نے
(افکار سلیم)

الفاظ اور زبان حسن کے ترجمان ہیں۔

ادب میں حسن پیدا کرنے کا واسطہ عام طور پر الفاظ کو سمجھا جاتا ہے۔ الفاظ دراصل ایک حرکت ایک عمل ایک علامت، اور ایک واسطہ ہے انسانی خیال اور جذبات کی طرف اشارہ کرنے کے لفظ میں معنی ہوتے ہیں، لیکن لفظ عین معنی نہیں ہوتا عقل ادراک شعور، سوچنے سمجھنے سے دیکھنے سننے کی صلاحیت انسان میں پہلے سے موجود ہوتی ہے۔ زبان کا کام یہ ہے کہ وہ انسان کی اس فطری صلاحیت کو اکسانے کھیلنے اسے مدد دے اور اس میں اگر کمی ہو تو اس کو پورا کرے۔ زبان اور لفظ کا سرچشمہ خیال ہے۔ اسی لئے ادب کا حسن ان خیالات میں پایا جاتا ہے، جو کسی واسطے کے ذریعے الفاظ کے قالب میں قید کئے جاتے اور ہمارے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔ Thought in words is the matter of literature

بعض الفاظ جو (onamatopoetic) ہوتے ہیں اور اپنے اندر صوتی حسن، یعنے ترنم، اور قوت اظہار رکھتے ہیں، وہ ادب کے ذریعے انسان میں ایک ہمدردانہ استغراقی کیف پیدا کرتے ہیں اور یہی حسن ہے۔

مثلاً انیس کی یہ نظم پڑھنے والوں کے دل میں استغراقی ہمدردی پیدا کرتی ہے۔ یہ الفاظ کے ذریعے صبح کے حسن کی آئینہ پردار ہے۔

صبح کا سماں

طے کر چکا جو منزل شب کاروان صبح — ہونے لگا افق سے ہویدا نشان صبح
گردوں سے کوچ کرنے لگا اختران صبح — ہر سو ہوئی بلند صدائے اذان صبح

پنہاں نظر سے روئے شب تار ہو گیا
عالم تمام مطلع انوار ہو گیا

یوں گلشن فلک پہ ستارے ہوئے نہاں | چن لے چمن سے پھولوں کو جس طرح باغباں
آئی بہار میں گل مہتاب پر خزاں | مرجھا کے رہ گئے ثمر و شاخ کہکشاں

دکھلائے طور، باد سحر نے سموم کے
پژمردہ ہو کے رہ گئے غنچے نجوم کے

وہ سرخی شفق کی ادھر چرخ پہ بہار | وہ بار در درخت وہ صحرا وہ سبزہ زار
شبنم کے وہ گلوں پہ گہر ہائے آبدار | پھولوں سے سب بھرا ہوا دامان کوہسار

نافے کھلے ہوئے، وہ گلوں کی شمیم کے
آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

اس نظم میں صرف صبح کا تصور ہے بلکہ اسے پیش کرنے کی ایک صوتی اور لفظی خوبی بھی ہے۔

ایک لفظ سے جان پڑ جاتی ہے۔

ادب میں حسن صرف الفاظ کے مجموعے سے پیدا نہیں ہوتا بعض وقت مجرد لفظ اس قدر فوراً جان پیدا کی جاتی ہے، سر والٹر رالے نے اپنے عالمانہ مضمون میں (Essay on style) میں لفظ کی اہمیت اس طرح جتائی ہے:

"الفاظ میں تھوڑی سی اصطلاحیت اور عام زبان ہونے کی حیثیت سے تھوڑی سی قدامت کا رنگ ہوتا ہے، ادیب بعض وقت لفظ کے جسم پر یہ پیرہن اتار دیتا ہے تو اس میں حسن آجاتا ہے"

اسلوب

الفاظ کے مجموعی استعمال سے جو خوبی پیدا ہوتی ہے اسے اسلوب (style) کہتے ہیں۔ پیٹر نے اسلوب کے متعلق خوب کہا ہے۔

"اچھی تحریر کے جملہ ضوابط ایک قسم کی وحدت اور اتحاد دل و دماغ کے عمل کو پیش کرتے ہیں اس عمل میں لفظ کو اس وحدت کا روح رواں بنایا جاتا ہے"

بہ قبول اسپنسر۔ ( ) "اسلوب" توجہ کی معاشیات" یا کفایت ہے۔

یہاں ہمیں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حسن جب ادب میں داخل ہوتا ہے تو اس کی جھلک وحدت عمل، اور دل و دماغ کی زبان کے ساتھ کامل ہم آہنگی اور اتحاد میں نظر آتی ہے اعلیٰ ادب کو جانچنے کا یہ عمدہ اصول ہے۔

یہاں تک زبان اور لفظ پر بحث کی گئی۔ اور یہ واضح کرنے کے لئے کی گئی کہ زبان اور لفظ دونوں مل کر کس طرح "dialect of life" "محاورۂ حیات" بن جاتے ہیں۔ اسی محاورۂ حیات میں احساس حیات بھی ہے۔ ادب کے ذریعے ایک دل دوسرے سے ملتا ہے اور ایک دل کے واقعات دوسرے تک منتقل ہوتے ہیں۔

جب احساس حیات ہوتا ہے تو اسی کے ذریعے ہم اپنا حسن کی سنہری ساعتوں میں داخل ہوتے ہیں۔ "احساس حیات" ایک جامع اصطلاح ہے یہ کہہ دینا آسان ہے کہ احساس حیات" سے ہم حسن کی سرحد میں داخل ہوتے ہیں۔ یا حسن احساس حیات میں پایا جاتا ہے۔ ہم مختصراً یہ بتائیں گے کہ نفسیاتی نقطۂ نظر سے احساس حیات کے معنے کیا متعین ہو سکتے ہیں؟

احساس حیات کے نفسیاتی مفہوم

دیکھیئے حیات کے حجلہ تجربے، جذبات، خیالات، رجحانات اور ہیجانات علم و عمل کا ایک طوفان ہوا کرتے ہیں۔ ہم میں حقیقت کا احساس اس وقت تک پیدا نہیں ہوتا جب تک ہم اس میں مداخلت نہ کریں، ان میں عملی کوئی حصہ نہ لیں۔ بعض اوقات زندگی کی واردات اتنی استمراری ہوتی ہیں۔ کہ ہم ان کے متعلق اپنے ردعمل کو بھول جاتے ہیں، اور اسی کا نام ہے:۔

تقدیر جو دکھائے سو ناچار دیکھنا

نہ ہم انھیں بدل سکتے ہیں، نہ ان میں مداخلت کر سکتے ہیں، اس لئے وہ ہمارے لئے حقیقی نہیں ہوتے ادب میں اس قسم کی عدم مداخلت ہوتی ہے۔ اور انسان ہر تجربۂ حیات میں صرف ایک (خیال) دیکھتا ہے جس طرح ہیگل نے کہا تھا جملہ آرٹ میں ایک (خیال) کارفرما ہونا چاہیئے۔ ادب ہمیں اسی (خیال) کی روشنی دکھاتا ہے۔ اس خیال میں تاثیر اور جذبے کی آمیزش ضروری ہوتی ہے، اگر ایسی تاثیر جیسے ہماری مداخلت اور عمل سے پیدا ہو۔ اس لئے یہ کہنا غلط نہیں کہ ادب کا احساس حیات ایک "فریب حیات"

ایک خیال، ایک تمثال، ایک تصور ہے۔ ادب میں حسن یہی ہے کہ اس فریب حیات کو پیدا کرنے میں وہ کامیاب ہو جائے۔ دیکھو آزاد نے اپنی پاکیزہ نثر میں تمثیلی طریقے پر کس طرح احساس حیات پیدا کیا ہے۔ واقعہ انشاء کا ہے لیکن اس میں انسان شاعرانہ زندگی کی عظمت محسوس کرتا ہے۔

"میں لکھنؤ گیا، شام ہوئی تو معلوم ہوا کہ قریب ہی مشاعرہ ہوتا ہے۔ کھانا کھا کر میں بھی جلسے میں پہنچا، ابھی دو تین سو آدمی آئے تھے۔ لوگ بیٹھے باتیں کرتے تھے، حقے پی رہے تھے۔ میں بھی بیٹھا ہوں، دیکھتا ہوں کہ ایک شخص میاں کچلی روئی دار مرزئی پہنے، سر پر ایک میلا سا پھٹیا، گٹھا یا دل میں گلے میں پکیوں حقہ پلانے والے کا توبڑا ڈالے ایک گڑگڑا کا حقہ ہاتھ میں لئے آیا۔ اور سلام علیکم کہہ کے بیٹھ گیا۔ کسی کسی نے اس سے مزاج پرسی بھی کی۔ اس نے اپنے توبڑے میں ہاتھ ڈال کے تمباکو نکالا اور اپنی چلم پر سلفا جما کر کہا کہ بھئی ذرا سی آگ ہو تو اس پر رکھ دینا۔ اسی وقت آوازیں بلند ہوئیں، اور گرگڑا کی شکل، جو ان سے لوگ تواضع کرنے لگے۔ وہ بدماغ ہو کر بولا کہ صاحب ہمیں ہمارے حال پر رہنے دو نہیں تو ہم جاتے ہیں۔ سب نے اس کی بات تسلیم اور تعمیل کی۔ دم بھر کے بعد پھر بولا کیوں صاحب ابھی مشاعرہ شروع نہیں ہوا۔ لوگوں نے کہا جناب لوگ جمع ہوتے جاتے ہیں۔ سب آجائیں تو شروع ہو۔ وہ بولا کہ صاحب ہم تو اپنی غزل پڑھ دیتے ہیں۔ یہ کہہ کر توبڑے میں سے ایک کاغذ نکالا اور غزل پڑھنی شروع کر دی۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں ۔ بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی ۔ تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر ۔ غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی مے خوار بیٹھے ہیں

بسان نقش پائے رہروان کوئے تمنا میں ۔ نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کہیں لاچار بیٹھے ہیں

یہ اپنی چال ہے، افتادگی سے اب کے پہروں میں ۔ نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں

کہاں صبر و تحمل آہ ننگ و نام کیا شے ہے ۔ یہاں رو پیٹ کر ان سب کو ہم یکبار بیٹھے ہیں

نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو ۔ جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے **انشاؔ** ۔ غنیمت ہے کہ ہم صحبت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

وہ تو غزل پڑھ کاغذ پھینک سلام علیک کہہ کر چلے گئے۔ مگر زمین و آسمان میں سناٹا ہو گیا اور دیر تک دلوں پر ایک عالم رہا۔

اسی قسم کا ایک واقعہ طباطبائی مرحوم نے اپنے مضمون "مٹیا برج کے سیر سپاٹے" میں لکھا تھا کہ مشاعرے کے وقت پردے کے پیچھے سے ایک چیخ کی آواز سنائی دی تھی۔ اسی طرح میر کی آواز سنو

دم صبح بزم خوش جہاں، شب غم سے کم نہ تھی مہرباں
کہ چراغ تھا سو تو دود تھا، جو پتنگ تھا سو غبار تھا

دل خستہ جو لہو ہو گیا تو بھلا ہوا کہ کہاں تلک
کبھی سوز سینہ سے داغ تھا کبھی درد غم سے فگار تھا

دل مضطرب سے گزر گئی شب وصل اپنی ہی فکر میں
نہ دماغ تھا، نہ فراغ تھا، نہ شکیب تھا، نہ قرار تھا

یہ تمہاری ان دنوں دوستاں، مژہ جس کے غم میں ہے خونچکاں
وہی آفت دل عاشقاں کسو وقت ہم سے بھی یار تھا

نہیں تازہ دل کی شکستگی، یہی درد تھا، یہی خستگی!
اسے جب سے ذوق شکار تھا اسے زخم سے سروکار تھا

کبھو جائے گی جو ادھر صبا، تو یہ کہیو اس سے کہ بے وفا
مگر ایک میر شکستہ پا، ترے باغ تازہ میں خار تھا

ادب میں اس قسم کی حسن آفرینی کی تصویر ایک مفکر نے خوب کھینچی ہے۔

No syllable in the slow unfolding of exquisite cadences but is supremely placed from the first page to the last, as note calls to note thought calls to thought and feeling to feeling and the last word is an answer to the first of the inevitable procession.

وہ کوئی حرف ایسا نہیں جو ترنم کے دلکش بہاؤ کو بتدریج پیدا کرنے کے لئے صفحہ اول سے آخر تک اعلیٰ ترین مقام پر نہ رکھا گیا ہو، جیسے ایک سُر سے دوسرا سُر پیدا ہوتا ہے، ایک خیال سے دوسرے خیال کی رہنمائی ہوتی ہے، تاثر سے تاثیر کا پتہ ملتا ہے۔ اسی طرح اس جلوس خیالی کا آخری لفظ پہلے لفظ کے ربط و اتحاد کا علمبردار ہوتا ہے۔

وحدت اور سکون

قالب اور سانچے کی وحدت کافی نہیں ہے۔ اس کے لئے احساس حیات کی ہم آہنگی اور وحدت ضروری ہے جسے "Repose of centrality" کہتے ہیں، یہی حسن ہے اور اس میں حیات کامل کے معنی اور احساس پوشیدہ ہیں۔ احساس حیات میں اگر صرف ایک قسم کی توانائی ہو کافی نہیں۔ اس کے ساتھ تعمیم حیات بھی ہونی چاہیئے۔ "Stevenson" نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور کہتا ہے:-

"واقعہ یہ ہے کہ جب کوئی کتاب کسی خاص اثر کے تحت لکھی جاتی ہے، یا ایسے دل کی پیداوار ہوتی ہے جو سر آلتشہ نشہ رکھتا ہو۔ اس وقت ہماری ہستی کے جملہ اسباب گویا ایک آہنی گرفت میں آجاتے ہیں، اور اس طرح آتے ہیں کہ بالفرض اگر کتاب کا مواد معمولی اور کمزور بھی ہو تو اس سے کوئی نہ کوئی صداقت اور حسن کا استقرار ضرور کیا جا سکتا ہے۔"

خلاصہ

ہم نے ابتدا سے حسن کے ادبی پہلو پر جو روشنی ڈالی، اس میں یہ بتایا کہ ادب میں حسن کی تین صفتیں ہوتی ہیں۔

(۱) ہیجان اور سکون کی ہم آہنگی۔

(۲) تفکر بس احساس تکمیل ۔

(۳) ان دونوں کا مجموعی اثر وحدت ۔

یہ بتا دیا گیا کہ ہیجان اور سکون کی ہم آہنگی احساس حیات میں اس طرح ہوتی ہے کہ ہم جملہ واردات حیات میں ایک تخئیلی حیثیت سے مداخلت کرتے ہیں، اور تخئیل اور تصور، زندگی کو ایک مرکزیت کی طرف لاتے ہیں، اور اس میں سکون پیدا کرتا ہے۔ یہی حسن ہے۔

احساس تکمیل کی چند صفتیں۔

اب ہمیں زندگی کے احساس تکمیل کے متعلق کچھ کہہ کے مضمون ختم کرنا ہے۔ مفکریں نے اس احساس تکمیل کی چند صفتیں جو بتائی ہیں۔ وہ یہ ہیں۔

(۱) ہم اپنی ہستی کی سرحدوں کو چھو آتے ہیں۔

(۲) دنیا پر من حیث الکل غور کرتے ہیں۔

(۳) ایک ساعت تکمیل سے گذر کر نشاے حیات میں خیر حسن اور حق پاتے ہیں۔

(۴) ہم خیال حیات کو پکڑ لیتے اپنے اندر جگہ دیتے اور اسے اپنی عمیق ترین احساسات اور خواہشات کے موافق پاتے ہیں۔

(۵) ہم اس دنیا سے دنیائے تجربات میں پہنچ جاتے ہیں۔

(۶) ہمارے خیالات اور اعمال حسنہ کی شرائط ہمیں متاثر کرتی ہیں۔

ان سب کا گویا ایک حلقہ ہوتا ہے جو زندگی کو گھیر لیتا ہے، اور اس حلقے میں ہم سکون اور تفکر پاتے ہیں جس ادب میں اتنی وسعت اور مرکزیت ہو وہ گویا احساس تکمیل کا محرک ہے، بجائے خود کامل ہے، اور حسن اسکی کاملیت اور تخلیق احساس میں نظر آتا ہے۔

فطرت اور زندگی۔

ادب اور زندگی کا یہ احساس تکمیل چند اور حیثیتیں بھی رکھتا ہے مثلاً زندگی اور فطرت کے ساتھ یکساں تعلق۔ پہلے زندگی کا ایک "تصور مستقبل" کے عنوان سے شاعر کی زبانی سنیے جس میں فطرت اور زندگی کو ہم آہنگ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

زمانہ آنے والا دور سے آنکھیں دکھاتا ہے	دل ہمت نشیمن دیکھتا ہے مسکراتا ہے
نظر آتے ہیں خون آشام جب آثار منزل کے	جری انگڑائیاں لیتا ہے نڈر دل تھرتھراتا ہے
کوئی آسان ہے زنجیر چھونا باب مقصد کی	مسافر راستہ بھر موت سے زور آزماتا ہے
زمانہ ٹوکتا رہتا ہے بڑھ جاتے ہیں دل والے	صبا منہ زوریاں کرتی ہے غنچہ کھلکھلاتا ہے

سمجھتا ہے اسے اپنا مقدر صاحب ہمت
جبین آسمان پر جو ستارہ جگمگاتا ہے

مجاہد خود الٹتا ہے ورق تاریخ عالم کا
لگا کر مہر اپنے خون کی خود سکراتا ہے
(انجم)

یا جگر نے ــــــــ زندگی اور فطرت میں انسان باوجود بے کیفیوں کے ایک عالم محسوس کرتا ہے۔

بے کیف دل ہے اور جیے جا رہا ہوں میں
خالی ہے شیشہ اور پیے جا رہا ہوں میں

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کیے جا رہا ہوں میں

فطرت کا احساس اور حسن ۔

زندگی کی اس مصالحانہ روش کی طرف توجہ دلانا حسن ہے لیکن جس طرح پہلے کہا گیا ہم انشا، میر اور جگر کی زندگی کو بہر حال اپنی زندگی نہیں سمجھ سکتے۔ اس میں ایک خیال دیکھتے ہیں جس کے ساتھ ہمیں ہمدردی ہوتی ہے اس لئے تخیل رد ہو جاتی ہیں اور احساس حسن بن جاتا ہے ۔ زندگی کے ساتھ ساتھ حسن کار فطرت پر نظر ڈالتا ہے اس لئے نظر ڈالتا ہے کہ اس میں زندگی کا احساس ہے کانٹ ، اسی آگے میں چلتا تھا کہ فطرت میں اسے عقلیت اور ارادے کا ایک قوی عمل نظر آتا تھا ۔ اس نے اس عمل کو انسان کے ساتھ ملانے کی کوشش کی اور تصدیق اپنے احساس حسن کے ذریعے وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوا جوش کے ابتدائی دور کی نظمیں فطرت اور زندگی کے احساس کا بہت ہی عمدہ نمونہ پیش ہیں مثلاً دیکھتے ہیں۔

کھٹک کیوں دل میں ہو چلی پھر چٹکتی کلیو ذرا ٹھہرو
ہوائے گلشن کی نرم رو میں یہ کس کی آواز آ رہی ہے

ٹیگور نے Whispering footsteps کے نام سے اسی خیال کی ایک پاکیزہ نظم لکھی ہے ۔ فطرت میں کسی کی آواز سننا گویا اس میں احساس حیات پیدا کرنا ہے۔

حسن فطرت (Responsive) اسی صورت میں ہو سکتا ہے جبکہ ہم اس میں زندگی کا احساس پیدا کریں اور اس کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائیں ۔ جوش کی اس ہم آہنگی کا ایک رنگ دیکھئے

خامشی وحشت پہ جس وقت کہ چھا جاتی ہے
عمر بھر جو نہ سنی ہو وہ صدا آتی ہے

جھاڑیوں کو جو ہلاتے ہیں ہوا کے جھونکے	دل شبنم کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے
مجھ سے کرتے ہیں گھنے باغ کے سناٹے باتیں	ایسی باتیں کہ مری جان پہ بن جاتی ہے

اردو غزل پر یہ الزام ہے کہ اس میں ریزہ خیالی کا عنصر بہت نمایاں ہے۔ ہر چیز شکستہ ہے لیکن بعض اساتذہ کی غزلیں جو ایک ہی کیفیت کی پیداوار ہوتی ہیں، وہ اپنی رنگ شکستگی میں بھی، ہیجان و سکون، تنوع اور وحدت، تجزیہ اور تخمیں کا حسن رکھتی ہیں مثلاً غالب کی ایک غزل ہے جو بظاہر ایک رنگ کی آئینہ دار نہیں لیکن غور و فکر سے اس میں یکرنگی محسوس کی جاتی ہے۔ اس کا پہلے ایک مرقع سن لیجیے۔

بزم ناز ہے، ایک طرف ریشمی پردوں، خوبصورت ساز و سامان سے سجی ہوی خلوت دوسری طرف صحن چمن، اس میں بہار کے جلوے۔ آئینہ کے سامنے معشوق بیٹھا سرمہ لگا رہا ہے۔ ایک طرف ساز رکھے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف جام و سبو کی محفل سجی ہے۔ کونے میں عاشق زرد رنگ، چھپا اداس بیٹھا ہوا ہے معشوق اس کی طرف نہیں دیکھتا۔ کبھی کبھی لوگ اس خلوت کی طرف سے گذر جاتے ہیں۔ عاشق انھیں اپنے خزاں زدہ چہرے کی رنگ شکستگی دیکھنے کی دعوت دیتا ہے۔ دل ساز بجنے کی فرمایش کرتا ہے آواز آتی ہے کہ سننے والے کے لیے پھول، کلی، پردے، مینا، ہر چیز میں صدائے نغمہ موجود ہے۔ پھر بزم مئی میں جوش آتا ہے۔ آخر میں معشوق اُٹھ کر چلا جاتا ہے، اور عاشق پر ہجر کی گھڑیاں نازل ہو جاتی ہے۔ اب غالب کی زبان سے سنئے

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا	یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا
رنگ شکستہ صبح بہار نظارہ ہے	یہ وقت ہے شگفتن گلہائے ناز کا
تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز	میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا
صرفہ ہے ضبط آہ میں، میرا و گرنہ میں	طعمہ ہوں ایک ہی نفس جاں گداز کا
یاں بس کہ جوش بادہ سے شیشے اچھل رہے	ہر گوشہ بساط ہے سر شیشہ باز کا
کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز	ناخن پہ قرض اس گرہ نیم باز کا
تاراج کاوش غم ہجراں ہوا اسد	سینہ کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

ادب اور حسن کے متعلق ایک نقاد کی رائے جو جامع حیثیت رکھتی ہے ۔ غور کے قابل ہے ۔

"نظم و نثر اور ناول سب میں اپنی اپنی خاص خوبیاں ہوتی ہیں ۔ یہ خاص موقع اور محل سے پیدا ہوتی ہیں جن سے انھیں دوچار ہونا پڑتا ہے ۔ لیکن یہ سب مل کر بحیثیت ادب ایک خاص قوت کے چند عناصر پیدا کرتے ہیں ۔ یہ خاص قوت کیا ہے ۔ یہ حیات کا ایک کامل تجربہ پوری کاملیت اور وضاحت کے ساتھ پیش کرتا ہے اور حیات کے مفہوم حقیقی کے ساتھ وابستہ ہو کر وحدت اور خود تجملی ، ایسے قالب میں پیدا کرتا ہے جو ہمارے ذہنی اعمال کو ہیجان اور سکون کی ایک ساعت تکمیل عطا کر سکے "

اقبال کی نظم ارتقا میں ادب و حسن کی یہ ساعت مکمل نظر آتی ہے ۔ ملاحظہ ہو ۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز
سرشت اس کی ہے مشکل کشی جفا طلبی

سکوت شام سے تا نغمۂ سحر گاہی
ہزار مرحلہ ہائے فغان نیم شبی

کشاکش زم و گرما تپ تراش و خراش
ز خاک تیرہ دروں تا بہ شیشۂ حلبی

مقام بست و شکست و فشار و سوز و کشید
میان قطرۂ نیسان و آتش عنبی

اسی کشاکش پیہم سے زندہ ہیں اقوام
یہی ہے راز و تب و تاب ملت عربی

مغاں کہ دانۂ انگور آب می سازند
ستارہ می شکنند ، آفتاب می سازند

شکسپیر نے سچ کہا تھا کہ " شاعر کی آنکھ ایک دیوانہ وار گردش میں زمین سے آسمان ، اور آسمان سے زمین پر نظر ڈالتی ہے " ۔ اسی قسم کے خیال کو حضرت اقبال نے ظاہر کیا ، جو ادب میں حسن کے جوہر دکھاتا ہے ۔۔

می شود پردۂ چشمم پر کاہے گاہے
دیدہ ام ہر دو جہاں را بہ نگاہے گاہے

متنبی کا درسِ حیات

از جناب ڈاکٹر محمد عبدالمعید خاں صاحب یم اے (عثمانیہ) پی ایچ ڈی - ڈی لٹ

علی العموم ہر زمانہ کا ہیرو اپنے ماحول کا ساز گار ہوا کرتا ہے مگر چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں قدرت نے کوفہ کے اسٹیج پر ایک ایسے ہیرو کو پیش کیا ہے جس کی ساری عمر اپنے ماحول کی بندشوں کے توڑنے ہی میں صرف ہوتی رہی۔ یہ ہیرو عربی ادب کا مشہور و معروف شاعر ابوطیب متنبی ہے۔ قدرت نے ہمیشہ یہ چاہا کہ اس کو شاعر بنائے اور متنبی نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ وہ اپنے تدبر اور حکمرانی کے جوہر دکھائے۔ اس کی زندگی حقیقت میں ایک سبق آموز مطالعہ قدرت ہے۔ اس کے دیوان کو ذرا گہری نظر سے پڑھیئے تو معلوم ہوتا ہے کہ گویا شاعر اپنی زندگی کے ہر مرحلہ پر قدرت اور انسانی طاقتوں کے مابین ایک ایک کش مکش کا دلفریب منظر پیش کر رہا ہے۔ اس مختصر مضمون میں یہ تو ممکن نہیں ہے کہ متنبی کی زندگی کے ہر پہلو پر بحث کی جائے۔ ہم یہاں اس فطری شاعر کے صرف اس درس حیات یا تجربات زندگی کا ذکر کریں گے جو اس کے بنانے یا بگاڑنے میں کارفرما تھے۔

تیسری صدی اور اوائل چوتھی صدی ہجری "تاریخ اسلامی" کا ایک عجیب انقلابی ہنگامہ خیز زمانہ تھا۔ اسی زمانہ میں بابک خرمی کی شورشیں برپا ہوئیں جس نے مامون اور معتصم کے عہد میں تخت خلافت کی جڑیں کھوکلی کر دی تھیں۔ ابھی یہ شورشیں ختم بھی نہیں ہوئی تھیں کہ زنگیوں کی فتنہ انگیزیاں شروع ہوئیں ان سے چھٹکارا نہ ہوا تھا کہ عراق میں قرامطہ کی ہنگامہ آرائیاں ہونے لگیں۔ ان شورشوں کا اصلی سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف علم اور مختلف فلسفیانہ خیالات کی اشاعت ہو رہی تھی تو دوسری طرف ایک خاص طبقہ میں مال کثرت سے جمع ہو گیا تھا۔ بالفاظ دیگر دولت مندوں اور تنگ دستوں میں ایک قسم کا تنازع پیدا ہو گیا تھا کبھی یہ شورشیں مذہب کے خلاف نمایاں ہوتیں اور مذہبی جبر و قیود سے آزاد ہونا چاہتیں اور کبھی عجمی یا رومی فلسفہ کے تاثرات کا نتیجہ ہوتیں اور غریبوں اور مفلسوں کے لئے مدد

---

* بوجہ قلت وقت اس مضمون کو صرف ایک نقطہ نظر سے لکھا گیا ہے کہ متنبی کے متعلق جو جدید تحقیقات عربی زبان میں ہوئی ہیں ان سے اردو دانوں کو روشناس کرایا جائے۔

انصاف کی طلبگار بن جاتی تھیں۔ ادھر یہ فسادات اجتماعی زندگی میں انتشار پیدا کر رہے تھے اور ادھر طوائف الملوکی کی وبا پھیل کر خلافت کو روز بروز کمزور بنا رہی تھی۔ اس طوفانی زمانے میں ابو طیب احمد حسین بن عبدالصمد معروف بہ متبنی (۳۰۳ ہجری) میں پیدا ہوتا ہے اس کے نسب میں مختلف روایتیں بیان کی جاتی ہیں۔ کوئی اس کو سقہ کا بچہ بتاتا ہے کوئی اس کو علوی خاندان سے منسوب کرتا ہے۔ بہر حال خود متبنی کو اپنی فطری صلاحیتوں کا یہ احساس ہے کہ وہ اپنی ہستی کو اپنے خاندان بلکہ قوم کے لئے مایۂ ناز سمجھتا ہے۔ متبنی کہتا ہے۔

لا بقومی شرفت بل شرفوا بی — وبنفسی فخرت لا بجدودی

ترجمہ:۔ "میں نے اپنی قوم کے سبب شرف حاصل نہیں کیا بلکہ میری قوم میرے سبب بزرگ و برتر ہو گئی۔ میں فخر کرتا ہوں تو اپنی ذات پر نہ کہ اپنے بزرگوں پر۔"

اس میں شک نہیں کہ متبنی فطرتاً ذہین، حساس، بلند حوصلہ اور عالی ہمت تھا۔ اور اس کی خودداری خود پرستی کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ کوفہ کی علمی فضا نے علوم و فنون سے بھی اس کو آشنا کر دیا تھا۔ کم سنی ہی سے شام کے بدویوں کے ساتھ بھی اس کو رہنا پڑا تھا۔ غالباً یہیں اس نے جرأت اور ہمت اور جنگ و جدال کی خوبیوں کے درس حاصل کئے تھے اس کو بچپن ہی سے شعر سے لگاؤ تھا۔ مکتب کے زمانہ سے اس کی شعر و شاعری کے چرچے ہونے لگے تھے ابھی اس نونہال کی عمر نو برس کی بھی نہیں ہوئی تھی کہ قرامطہ کوفہ پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ اور لوٹ کھسوٹ مچا دیتے ہیں۔ جب یہ بارہ برس کا ہوتا ہے تو قرامطہ دوبارہ کوفہ میں داخل ہو جاتے ہیں اور پھر وہی فساد برپا نظر آتا ہے۔

۳۱۲ھ ہجری میں قرامطہ مکہ پر بھی غارتگری کر دیتے ہیں اور عرب کی مقدس زمین میں بھی اپنی ناپاک بدعنوانیوں سے باز نہیں رہتے۔ ایسے حالات میں ناگزیر ہے کہ متبنی جیسا حساس انسان قرامطہ کی برسر اقتدار حکام کے خلاف عدل و انصاف کی چیخ و پکار سے متاثر نہ ہوتا۔ بہت ممکن ہے کہ حکام اور امراء کو طبقہ قرامطی سمجھ کر کوفہ میں اس کا رہنا دشوار کر دیا ہو۔ لیکن ایک جدید محقق کا خیال ہے کہ یہ علوی نسب کا تھا۔ مگر علوی سربرآوردہ لوگ اس ہونہار نوجوان سے جھکتے تھے اور اس کے علوی ہونے کے اعلان کو پسند نہ کرتے تھے۔ بہر حال کوفہ میں اس انقلابی شاعر کے حاسدوں اور مخالفین کا

ایک گروہ ضرور پیدا ہو گیا تھا۔ اور وہ اس کے قبیلے کو اور اس کو نقصان پہنچانے پر تلا ہوا تھا جب اس کی خونخواری کو ٹھیس لگنے لگی تو یہ یتیم پسر اپنے عزیز وطن اور محبوب وادی کو چھوڑ کر شام روانہ ہوا۔ کوفہ سے بغداد و موصل نصیبین، راس العین، دمشق، حلب، لاذقیہ اور انطاکیہ سے ہوتا ہوا حمص پہنچا۔ جہاں علویوں کی خفیہ سازشیں سرگرم عمل تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ متنبی اسی صحرا نوردی میں اپنے علوی النسب ہونے کا پرچار کر رہا تھا۔ اور اکثر یہ کہتے ہیں کہ اسی زمانہ میں اس نے اپنے نبوت کا اعلان کیا جس کی پاداش میں اس کو قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ ایک اور نظریہ یہ بھی ہے کہ اس نے نبوت کا دعوی نہیں کیا بلکہ علم بغاوت بلند کرنے کی سزا میں امیر ابن طغج کے عامل نے اس کو قید کر دیا تھا۔ خواہ اس نے خود نبی ہونے کا دعوی کیا ہو یا اس کے دشمنوں نے حکام اور امراء کو اس کے خلاف بھڑکانے کے لئے اس کو نبی کے جیسا بنا دیا ہو۔ بہر حال یہی وہ زمانہ ہے جس میں ابوطیب کو اپنی شخصیت اپنی خداداد قوتوں سے واقفیت حاصل ہوتی ہے ساری دنیا کی وسعتوں کو وہ اپنی ذات کے آئینہ میں دیکھنے لگتا ہے۔ اس زمانہ کی شاعری میں اس کے احساس خودی کی تکوین نظر آتی ہے۔ عہد طفلی میں متنبی کے دماغ نے جو سب سے گہرے نقوش لئے وہ امیروں کی امارت کے مقابلہ میں غریبوں کی تنگدستی کے مناظر تھے۔ اولاد اشراف کے ساتھ وہ کوفہ کے مدرسہ میں پڑھتا تو تھا مگر یہ غیور لڑکا اپنی اور ساتھیوں کی زندگی میں ایک ذلت آمیز فرق دیکھتا ہوگا۔ جب ہی تو وہ کہتا ہے ۔

أذم انا سا و محصولی علی غنم   وذكر جود و محصولی علی الكلم

"میں دخوشحال، لوگوں کو دیکھتا ہوں تو میری آمدنی کا دارومدار بھیڑوں اور بکریوں پر نظر آتا ہے اور جود و سخا کے قصے سنتا ہوں تو میری زندگی چند اشعار کی کمائی پہ منحصر معلوم ہوتی ہے"۔

یہ غریب اور امیر کا فرق صرف شاعری وجدان تک محدود نہیں رہتا بلکہ متنبی کے دماغ میں ایک عقیدہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اس کو امراء اور حکام کے خلاف نبرد آزمائی کے لئے اس حد تک تیار کر دیتا ہے کہ وہ کہتا ہے :-

الی کم ذا التخلف و التوانی   و کم هذا التمادی فی التمادی

والا تمت تحت السیوف مکرما　　تمت وتقاسوا للذل غیر مکرم

فثب واثقا باللہ وثبۃ ماجد　　یری الموت فی الہیجا جنی النحل فی فم

"تو کب تک آخر احرام باندھنے والوں یعنے مفلسوں کے لباس میں رہے گا اور کب تک یہ مصیبت اور بدبختی کی زندگی بسر کرے گا اور اگر تیغوں کے سایہ میں عزت کے ساتھ لڑتا ہوا مرنا نہیں چاہتا تو ذلت اور بے حرمتی کی زندگی میں مبتلا رہ (اور اک نہ اک دن) مرنا تو ہے ہی۔ بہتر تو یہ ہے کہ اللہ پر بھروسہ کر اور اس مرد میدان کی طرح کارزار زندگی میں اتر آ جو مرنے کو ایسا سمجھے جیسے منہ میں شہد"

ان خیالات کے ساتھ ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ ابوطیب نے اپنی صلاحیتوں کا بھی اندازہ کر لیا تھا وہ کہتا ہے:-

این فضلی اذا قنعت من الدھر　　بعیش معجل التنکید

"میرا جوہر ذاتی کہاں رہے گا۔ اگر میں ایسی زندگی پر قناعت کر لوں۔ جو بہت جلد غم و آلام کا شکار ہونے والی ہے"

ایک اور جگہ کہتا ہے۔

لیس التعلل بالآمال من اربی　　ولا القناعۃ بالاقلال من شیمی

ولا اظن بنات الدھر تترکنی　　حتی تسد علیھا طرقھا ھممی

"امیدوں کے دم دلاسوں میں آنا میرا کام ہے اور نہ تنگدستی پر قانع ہو جانا میری خصلت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ حوادث روزگار میرا پیچھا نہ چھوڑیں گی جب تک میری بلند ہمتیں ان کے (حملے) کی راہیں نہ بند کر دیں"

اور پھر اپنی شجاعت کی جوشیلی تصویر کھینچتے ہوئے کہتا ہے۔

ذرانی والفلاۃ بلا دلیل　　ووجھی والھجیر بلا لثام

فکلمنی حسامی ثم ذکرت وداعی اللہ والقنا النھبی و الفرس فعلی

"مجھ کو میری تلوار کو میرے گھوڑے اور لچکتے ہوئے نیزے کو (میدان میں) چھوڑ کر میری بہادری کے جوہر دیکھ کہ ہم سب مل کر کس طرح ایک ہو جاتے ہیں۔ اور ساری دنیا کا مقابلہ کرتے ہیں"

ہمارے شاعر کی اس سے بھی تشفی نہیں ہوتی وہ اس سے بھی آگے بڑھ کر کہتا ہے۔

ولو برز الزمان الی شخصا لخضب شعر مفرقہ حسامی

(ترجمہ) اگر زمانہ مجسم شخص بن کر میرے سامنے آجائے تو دیکھ لو کہ میری شمشیر اس کے سر کے بال کو خون سے رنگ دے گی۔"

اس سے ظاہر ہے کہ اس نوجوان کے یہ جذبات اور یہ نوخیز انگیں نہ صرف امراء اور حکام کو بلکہ متوسط طبقہ کے حاسد مزاجوں کو بھی اس کا دشمن بنا دیا ہوگا۔ ان حاسدوں کی شرارتیں متنبی کی نظر سے نہ چوک سکتی تھیں۔ اور نہ چوکیں۔ چنانچہ کہتا ہے۔ کہ:۔

ما مقامی بارض نخلۃ الا کمقام المسیح بین الیہود

میری اقامت سرزمین نخلہ میں ایسی ہے جیسی حضرت عیسیٰ کی اقامت یہودیوں میں۔

مطلب یہ ہے کہ جیسے یہودی حضرت مسیح کے دشمن تھے ایسے ہی قریہ مذکور کے باشندے میرے دشمن ہیں۔ اسی طرح ایک اور جگہ کہتا ہے۔

انا فی امۃ تدارکھا اللہ غریب کصالح فی ثمود

"میں اپنی قوم میں (خدا اس کی اصلاح کرے) ایسا ہی اجنبی یا بے یار و مددگار ہوں جیسے حضرت صالح قوم ثمود میں۔"

یہاں متنبی نے اپنے آپ کو مشہور انبیاء حضرت صالح اور حضرت عیسیٰ کے مماثل قرار دیا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہی اشعار اس کے متنبی کہلائے جانے کے باعث ہوئے اور اس بلبل شیریں مقال کی انہیں بلند پروازیوں نے اس کو جال میں پھنسایا اور قفس میں قید رکھا۔ مگر متنبی جو حوادث روزگار کو ٹھکرانا اور دنیا کو مجسم شخص بنا کر خاک اور خون میں نہلا سکتا تھا وہ بھلا حمص کے قید خانے کو کیا خاطر میں لاتا۔ قید خانے سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

کن ایھا السجن کیف شئت فقد وطنت للموت نفس معترف

لو کان سکنای فیک منقصۃ لم یکن الدر ساکن الصدف

" اے قید خانہ تو تکلیف و شدت میں ایسا ہی رہ جیسا تو چاہتا ہے۔ تجھ میں رہنے میں مجھ سے تخفیف تکالیف

کی درخواست نہیں کرتا۔ کیونکہ میں نے آپ کو خوگر موت بنا لیا ہے۔ اے قید خانے اگر میرا قیام تجھ میں میرے نقصان و عیب کا سبب ہوتا تو موتی با این ہمہ قدر سیپ جیسی بے قدر چیز میں نہ رہتا۔

یہ سب اس کی بہادری استقلال اور اولوالعزمی کے مظاہر تھے۔ مگر متنبی انسانی شکل میں از سر تا پا ایک قوت متحرکہ تھا۔ اس کے دماغ کی جولانیاں، بخارات کی طرح بند نہیں کی جاسکتی ہیں اس کو کسی نہ کسی طرح قید خانے سے چھٹکارا حاصل کرنا ہی پڑا۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے نصیبو کے مُبرے ستارے ہمیشہ حصول مقصد میں آڑے آتے رہے مگر ان مصائب اور دشت نوردی نے اس کو اپنی دنیا اور دنیا والوں سے قریب تر کر دیا اب اس کی نظر دنیوی معاملات میں ایک دور سے بیٹھے ہوے دیکھنے والے فلسفی کی نظر نہ تھی بلکہ ایک گرگ باران دیدہ کی بصیرت حاصل تھی۔ کوفہ میں اخلاق حسنہ کا قحط، کمینوں میں دولت مندی، شریفوں میں تباہی، حکام کا ظلم و ستم، بغداد میں خلیفہ کا عجمیوں کے ہاتھوں کٹ پتلی بنا رہنا۔ باب خلافت پر موالی ترکی دیلمیوں کا شور و شغب، شام میں علویوں اور فاطمیوں کے خلیفہ وقت کے خلاف سازشیں غرض عرب کی بربادی اور عجمیوں کا اقتدار یہ وہ کریہہ منظر اس کی آنکھوں نے دیکھے تھے کہ متنبی جیسے غیور حساس اور آزاد طبیعت میں ناممکن تھا کہ وہ عجمیوں کے خلاف انتقامی جذبہ نہ پیدا کرتے اسی حالت کا نقشہ متنبی اپنی زبان میں یوں کھینچتا ہے۔

حولی بکل مکان منہم خلق تخطئ اذا جئت فی استفہامہا بمن

میرے گرد ایسے گروہ ہیں کہ اگر تو یہ کون انسان ہیں پوچھے تو تو غلطی کرتا ہے۔ کیونکہ یہ بہائم ہیں۔

وانما الناس بالملوک وما تفلح عرب ملوکہا عجم

کسی قوم کی رفعت ان کے بادشاہوں سے ہوتی ہے دگر، ان عربوں کو کیا فلاح نصیب ہو سکتی ہے جن کے بادشاہ عجمی ہیں۔

بکل ارض وطئتہا امم ترعی بعبد کانہا غنم

ہر اس زمین میں جہاں میں نے قدم رکھا ہے ایسی اقوام کو دیکھا ہے جن کو ایک غلام بکریوں کی طرح چراتا ہے۔ اور پھر کہتا ہے۔

ودھرنا سہ ناس صغار وان کانت لھم جثث ضخام

میرا زمانہ ایسا ہے کہ اس کے آدمی کم ہمت اور حقیر القدر ہیں اگرچہ ان کے بدن بڑے موٹے تازے ہیں۔

ارانب غیر انھم ملوک مفتحۃ عیونھم نیام

"بجز اس کے کہ وہ بادشاہ ہیں وہ بالکل خرگوشوں کے مانند ہیں مثل خرگوش کے ان کی آنکھیں بظاہر کھلی ہوئی ہیں اور حقیقت میں وہ سو رہے ہیں"

یہ دور متنبی کی زندگی کا وہ زمانہ ہے جس میں اس کو اپنی ذات سے بڑھ کر اپنی قوم کا خیال پیدا ہو گیا ہے۔ اب گویا اس کا احساس خودی فرد سے گذر کر ایک اجتماع افراد پر حاوی ہو گیا ہے۔ اس کے تخیلات، عالم عربی کی ایک تصویر بنا رہے تھے اس کی آنکھیں مدگستری اور عربی اقتدار کے عروج کی شدت سے منتظر تھیں۔ اب وہ رزق کا اس قدر متلاشی نہ تھا جس قدر اس کی اپنی خاص زبان میں "مجد" یعنے بزرگی عظمت بلند مرتبہ یا اقتدار و حکومت کا جویا تھا۔ چنانچہ ابو العشائر علی بن الحسین بن حمدان کی مدح کرتے ہوئے کہتا ہے :-

فسرت الیک فی طلب المعالی وسار سوای فی طلب المعاش

میں تیرے پاس بلندامور حاصل کرنے آیا ہوں اور میرے سوا دوسرے رزق کی طلب میں تیرے پاس پہنچے ہیں

ایک اور موقع پر کہتا ہے :-

فمالی وللدنیا طلابی نجومھا ومسعای منھا فی شدوق الاراقم

مجھ کو دنیا سے کیا واسطہ میرا مطلوب تو اس کے ستارے یعنے اس کی بلندیاں ہیں۔ اور میری جستجو اس کے حصول کے لئے ایسی ہے جیسے اژدھا کے منہ سے بچ کر نکلنا۔

معلوم ہوتا ہے کہ متنبی کو اپنے مطلوب کی اہمیت اور اس کے حصول میں پیش آنے والی دشواریوں کا بھی کافی احساس تھا۔ اس شعور کی تصویر وہ یوں کھینچتا ہے۔

ومن یبغی ما ابغی من المجد والعلی تساوالمحای عندلا والمقاتل

اور جو شخص اس شرف و بلند نامی کا طالب ہو جو میں چاہتا ہوں تو اس کے نزدیک زندگی اور مرگ دونوں برابر ہیں

اس سے ظاہر ہے کہ متنبی کے مقصد کا حصول اس کے نزدیک موت و حیات کا مسئلہ تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ آخر عربی ممالک میں عجمی کیوں اس قدر قوت و اقتدار کے مالک بن بیٹھے ہیں۔ اس کی نظروں میں صرف ایک چیز آتی تھی وہ یہ کہ مرکز خلافت کمزور ہو چکا ہے سارے مرکزی عہدوں پر عجمی قبضہ جما چکے ہیں اس سے نجات حاصل کرنے کا اس کے تجربات زندگی نے اس کو طریقہ بھی سکھا دیا تھا۔ اور وہ طریقہ اس کی فلسفیانہ نظروں میں یوں تھا۔

الا لیست الحاجات الا نفوسکم ولیس لنا الا السیوف وسائل

خبردار رہو کہ ہمارے مقاصد سوائے تمہارے نفوس کو نشانہ بنانے کے اور کچھ نہیں اور اس غرض کے لئے سوائے ہماری شمشیروں کے اور وسیلے نہیں ۔ اس مسلک کی مدافعت وہ یوں کرتا ہے ۔

من الحلم ان تستعمل الجهل دونه اذا اتسعت فی الحلم طرق المظالم

جس وقت حلم کے سبب ظلم کی راہیں کشادہ ہو جائیں اس وقت یہ بھی علم میں داخل ہے کہ اس سے مقابلہ کے لئے تو بھی جہالت برتے ۔

ومن عرف الایام معرفتی بها وبالناس روی رمحه غیر راحم

اور جو شخص زمانہ کو ایسا جانے جیسا میں اس کو اور لوگوں کو جانتا ہوں تو بیرحمانہ اپنے نیزہ کو ان کے خون میں سیراب کریگا ۔ اس شاعر کا یہ خیال محض نظریہ نہیں تھا بلکہ اس کے حصول کی اس نے بڑی بڑی کوشش کیں ۔ بغداد، شام، مصر، شیراز، غرض دنیا کی خاک چھان ڈالی ۔ عرب حکام اور امراء کو عجمیوں کے مقابلہ میں اس نے طرح طرح سے سراہا ۔ ان کی شجاعت، اور جنگ و جدل کی صلاحیتوں کو ابھارنے میں مختلف پیرایے اختیار کئے ۔ علی بن احمد بن عامر انطاکی کی مدح کرتے ہوئے کہتا ہے ۔

ذر النفس تاخذ وسعها قبل بینها فمفترق جاران دارهما العمر

ولا تحسبن المجد زقا وقینة فما المجد الا السیف والفتکة البکر

وتضریب اعناق الملوک وان تری لک الهبوات السود والعسکر المجر

وترکک فی الدنیا دویا کانما تداول سمع المرء انمله العشر

تو اپنی طبیعت کو اس کے حال پر چھوڑ دے تاکہ موت سے پہلے بقدر استطاعت وہ اپنی تمنا و سعت حاصل کرلے کیونکہ نفس (روح) و جسم دو ایسے ہمسایے ہیں جن کا گھر عمر ہے اور وہ ایک نہ ایک روز ایک دوسرے سے جدا ہونے والے ہیں مطلب یہ ہے کہ جو چیز حاصل ہوسکے جلد حاصل کرلے ۔ اور یہ سمجھ لے کہ میخواری اور گانے والی کا راگ سن لینا ہی بڑی بلندی اور عظمت ہے ۔ بلکہ بلندی و عظمت نام ہے تلوار سے نئی نئی فتوحات حاصل کرنے کا اور شاہان خود سری و گردن زدنی کا اور یہ کہ تیرے لشکر عظیم کا غبار سیاہ آسمانوں پر اڑتا ہے ۔ اور تیری بلند نامی کا آوازہ ایسا گونجے کہ انسان کانوں میں انگلیاں رکھ لے ۔

یہ تھا متنبی کا نصب العین ۔ اس کے حصول میں اس پر مصیبتوں کی گھٹائیں چھائیں ۔ حکام امراء اور ان کے درباریوں نے اس پر حسد بغض و رقابت کی بجلیاں گرائیں ۔ مگر اس حقیقت تنشاش شاعر نے دنیا کے غم و اندوہ پر ہنسا کیا ۔ انسان تھا مصیبتوں پر مایوس بھی ہوا مگر اس کا عزم متزلزل ہوا نہ اس کے پائے استقلال میں لغزش ہوئی ۔ اس نے حوادث روزگار کا جس خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا ہے ملاحظہ کیجیے کہتا ہے ۔

فالموت اعذر لی والصبر اجمل بی والبر اوسع والدنیا لمن غلبا

مطلب یہ ہے اگر میں طلب رفعت و عظمت میں قتل کیا جاؤں تو موت میری عذر خواہی کو کھڑی ہو جائے گی اور صبر مجھ جیسے بہادر ہی کو زیبا ہے (گھبرانا بزدلوں کا کام ہے) اور جنگل و میدان میرے لئے میرے گھر سے زیادہ وسیع ہیں اور دنیا اور اس کی دولت اس کے لئے ہے جو لڑے اور غالب آوے نہ اس کے لئے جو گھر میں سوتا پڑا رہے ۔ اس معنے و مطلب کے اشعار اس کے دیوان میں کثرت پائے جاتے ہیں ۔ مختصر یہ کہ متنبی ان جذبات اور ان تدابیر کو دل و دماغ میں بٹھائے ہوئے سیف الدولہ حمدانی کے دربار میں داخل ہوتا ہے ۔ اس کو اس عربی امیر سے بڑی بڑی امیدیں لگی ہوئی تھیں جس طرح متنبی عجمی اقتدار کو گھڑی بھر نہیں دیکھ سکتا سیف الدولہ بھی عربوں کو عجمی شکنجے سے نجات دلانے کے لئے بے چین رہتا ہے ۔ متنبی کی طرح سیف الدولہ بھی علوی اور فاطمی سازشوں کا سخت مخالف اور عرب کے طرفدار عباسی یا علوی خلفاء کا حامی نظر آتا ہے سب سے بڑھ کر یہ کہ

اس بدوی شاعر کی عزیز ترین چیز یعنے شجاعت اور علم وعساکر رکھنے کا شوق وطاقت یہ بھی سیف الدولہ میں بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں۔ ان مشترکہ خصائص نے متنبی کو سیف الدولہ کا اور سیف الدولہ کو متنبی کا دلدادہ بنا دیا تھا۔ ایک پیغمبر شعر وسخن تو دوسرا بادشاہ ملک وملت دونوں کے امتزاج نے متنبی کے بحر جذبات میں جو تلاطم پیدا کر دیا ہوگا وہ ذیل کے اشعار سے ظاہر ہے۔

لقد سل سیف اللہ دولہ المجد معلما	فلا المجد مخفیہ ولا الضرب ثالمہ
لہ عسکرا خیل وطیر اذا رمی	بھا عسکرا لم یبق الا جماجمہ
اجلتھا من کل باغ ثیابہ	وموطئھا من کل باغ ملاغمہ

کہتا ہے خود مجد وشرف نے حکومت کی تلوار (یعنے سیف الدولہ) کو نمایاں طور پر صاف میان سے باہر کھینچ لیا ہے۔ اب نہ مجد وخود اس کو میان کے اندر چھپا سکتا ہے۔ (یعنے قتل اعداء سے روک سکتا ہے) اور نہ تلوار اس کو کوئی نقصان پہنچا سکتی ہے۔ ممدوح کے دو لشکر ہیں ایک تو سواروں کا اور دوسرا پرندوں کا (جو مقتول دشمنوں کا گوشت کھانے کے لئے اس کے ساتھ ہمیشہ رہتا ہے) جب ان لشکروں کو کسی لشکر پر پھینک مارتا ہے تو صرف ان کی کھوپریاں باقی رہ جاتی ہیں اور کچھ نہیں بچتا۔ ممدوح کے گھوڑوں کی جھولیں ہر سرکش کے کپڑے ہیں اور ان گھوڑوں کی روندنے کی جگہ ہر باغی کے چہرے۔

اور جب سیف الدولہ نے انطاکیہ سے کوچ کا ارادہ کر لیا تو اس کی مدح کرتے ہوئے کہتا ہے

این ازمعت ایہذا الھمام	نحن نبت الربی وانت الغمام
فی سبیل العلا قتالک والسلم	وھذا المقام والاجذام
لیت انا اذا ارتحلت لک الخیل	وانا اذا نزلت الخیام

اے اولوالعزم بادشاہ ہمارے پاس سے کہاں جانے کا قصد رکھتا ہے کیونکہ ہم مانند گھانس کے ہیں اور تو ابر کے ہے۔ یعنے ہماری بقا کا دارومدار تجھ پر ہے۔ اور تیری جنگ تیری صلح اور تیرا قیام اور تیر روی سب کچھ بلند کے لئے ہے۔ کاش جب تو کوچ کرتا تو ہم تیرے گھوڑے ہوتے اور جب تو فروکش ہوتا تو ہم تیرے خیمے بن جاتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے عربی اشعار میں جو جذبات پنہاں ہیں ان کا اظہار کسی اور زبان میں

ناقابل ترجمہ ہے مگر ابوطیب کا دل سیف الدولہ کی جس قدر محبت سے مملو تھا وہ ان اشعار مذکورہ سے صاف عیاں ہو جاتا ہے ۔ اور جن اسباب کی بنا پر یہ سیاسی شاعر اس امیر عرب سے خلوص رکھتا تھا۔ اس کی شہادت حسب ذیل شعر سے ملتی ہے ۔ وہ استفہامیہ لہجے میں دریافت کرتا ہے ۔

اما للخلافۃ من مشفق علی سیف دولتہا الفاصل

کیا حمایت خلافت کے لئے اس کی دولت کی شمشیر (یعنی سیف الدولہ) کا کوئی ہمدرد یا ساتھی نہیں کہ اس کو تنہا کثرت جدال و قتال سے روکے کیونکہ اگر اس کو کوئی صدمہ پہنچ جائے گا تو خلافت بے شمشیر ضعیف ہو جائے گی۔ مگر متنبی کو سوائے سیف الدولہ کے عربی اقتدار و خلافت عربیہ کی مدافعت کرنے والی ہستی نظر بھی نہیں آتی تھی۔ اس کو اس امیر عرب سے یہ خطرہ لگا ہوا تھا کہ کہیں وہ رومیوں کے قلع قمع کرنے میں اتنا نہ لگ جائے کہ عجمیوں کو نظر انداز کر دے ۔ چنانچہ کہتا ہے ۔

انت طول الحیاۃ للروم غاز فمتی الوعد ان یکون القفول

وسوی الروم خلف ظہرک روم فعلی ای جانبیک تمیل

تو عمر بھر رومیوں سے لڑتا رہے گا تو آخر واپسی کا کب خیال ہے۔ علاوہ رومیوں کے تیرے پشت رومیوں کے جیسے اور بھی تو دشمن ہیں ۔ آخر ان کی طرف کب رخ کرے گا ؟

پہلے شعر کے دوسرے مصرعے میں ایک لفظ (الوعد) واقع ہوا ہے ۔ اس سے ایک محقق نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ سیف الدولہ نے متنبی سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ شام سے رومیوں کو نکال باہر کرنے کے بعد عربی حکومت کو عجمی پنجہ سے نجات دلائے گا۔ اور یہی سبب تھا کہ جس کی بنا پر متنبی نے سیف الدولہ کے پاس ایک رسوخ اور تقرب حاصل کر لیا تھا۔ مگر اس تقرب کو درباری کینہ ور کہاں دیکھ سکتے تھے انھوں نے آتش حسد کو ہر طرف بھڑکانا شروع کیا ۔ اس آگ لگانے میں خود سیف الدولہ کے عزیز و اقارب بھی شریک ہو گئے ۔ ابو فراس جیسا امیر شاعر اور ابن خالویہ جیسا جید عالم لغت نے بھی متنبی کو سیف الدولہ کی نظروں سے گرانا شروع کیا۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ متنبی سیف الدولہ کی مدح میں قصیدہ پڑھتے ہوئے جب ان ابیات پہنچا ۔

انا الذی نظر الاعمی الی ادبی و اسمعت کلماتی من به صمم

الخیل واللیل والبیداء تعرفنی والسیف والرمح والقرطاس والقلم

"میں وہ شخص ہوں کہ اندھے نے بھی میرے ادب ولیاقت کو دیکھ لیا اور بہرے نے بھی میرے اشعار سن لئے۔ اندھیری راتیں خشک جنگل اور گھوڑے مجھ کو بخوبی جانتے ہیں اور تلوار اور نیزے کے ضرب اور کاغذ و قلم میری قدر خوب پہچانتے ہیں۔"

بھلا ابو فراس جیسے موقع شناس سے کہاں رہا جاتا فوراً کہدیا کہ شجاعت فصاحت حکومت و سخاوت سب کچھ فخر تجھ ہی میں ہیں تو پھر امیر کے لئے کیا باقی رکھا ہے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے کہ سیف الدولہ کی موجودگی میں متنبی اور ابن خالویہ میں کسی لغوی مسئلے پر جھگڑا ہو گیا متنبی نے حقارت آمیز لہجے میں کہدیا۔ خاموش ہو۔ تو آخر عجمی ہی تو ہے تجھکو بھلا عربی زبان سے کیا واسطہ اس پہ ابن خالویہ نے اپنی جیب سے کنجیوں کا جھیلا نکالا اور اپنے مخاطب کے منہ پہ دے مارا۔ لیکن اس موقع پر سیف الدولہ نے متنبی کی کوئی امداد نہ کی۔ اب کیا تھا ابوطیب کی خود دار طبیعت ایک عجمی کے ہاتھوں اس ذلت کو کیسے برداشت کر سکتی۔ بالآخر حاسدوں کی ان سازشوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ متنبی کو سیف الدولہ کا دربار چھوڑنا پڑا لیکن اس امیر کا ساتھ چھٹنے کا غم متنبی کو عمر بھر رہا۔ کیوں کہ وہ سیف الدولہ کو صرف عربوں کا امیر ہی نہیں بلکہ ان کا سیاسی قائد سپہ سالار اعظم عربی خلافت کا یکتا و تنہا محافظ سمجھتا تھا۔ یہ ساری خصوصیات ایک واحد امیر میں کہاں جمع ہو سکتی تھیں۔ ایسی ناگزیر صورت میں متنبی کی نظریں اب اس امیر عرب سے اٹھ کر خود اس کی ذات میں مرتکز ہو گئیں۔ اب وہ خود کو ان ساری صفتوں کا حامل سمجھتا تھا جو سیف الدولہ کی ذات میں تھیں صرف اس قدر کمی تھی کہ متنبی کے پاس دولت و حکومت نہ تھی۔ اب وہ دولت و حکومت کا خواہاں ہوا مگر اپنی ذاتی اغراض کے لئے نہیں۔ چنانچہ کہتا ہے۔

وما حاجتی فی عسجد استفیده ولکنها فی مفخر استجده

"میری خواہش زر ذاتی منفعت کے لئے نہیں ہے بلکہ اس عظمت رفتہ کے حاصل کرنے کے لئے ہے جس کی میں تجدید کرنا چاہتا ہوں۔"

اس کے حاصل کرنے اس باکمال شاعر نے یہ تدبیر سوچی تھی کہ وہ خود کسی اقلیم عربی کا خود مختار حاکم بنا دیا جائے۔ اسی تجویز میں وہ کافور اخشیدی والی مصر کے دربار میں پہنچا۔ اس کی مدح میں بڑے بڑے قصیدے لکھے۔ اس کی سخاوت، بہادری اور عقلمندی کی تعریفیں کیں۔ اس کی کنیت ابو المسک کو مدح وثنا کی خوشبو سے تعبیر کیا۔ اس کے سیاہ اور چکیلے رنگ کو بھی رشک شمس وقمر ٹھیرایا۔ مختصر یہ کہ اس کو اپنی آخری امیدوں کا سہارا سمجھا۔ چنانچہ کہتا ہے۔

یا رجاء العیون فی کل ارض	لم یکن غیر ان اراک رجائی

فارم بی حیث شئت منی خالی	اسد القلب آدمی الرواء

و فؤادی من الملوک وان کا	ن لسانی یری من الشعراء

"اے زمین والوں کے آنکھوں کی امید مجھکو سوائے تیرے دیکھنے کے کوئی امید نہیں رہی ہے۔ مجھ کو مشکل سے مشکل کام میں آزماکر دیکھ کہ میں آدمی کی صورت میں شیر دل واقع ہوا ہوں۔ اور میرا دل شاہانہ ہے اگرچہ میری زبان شاعرانہ۔"

بعض کا خیال ہے کہ کافور نے متنبی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کو کسی اقلیم کا حاکم بنائے گا۔ مگر ایک مدت تک جب یہ وعدہ پورا نہ کیا گیا تو اس نے اسی کی طرف ذیل کے شعر سے توجہ دلائی۔

اذا لم تنط بی ضیعة او ولایة	فجودک یکسونی وشغلک یسلب

"جب تک تو مجھ کو کسی قریہ یا ملک کی حکومت کو میرے حوالہ نہ کرے گا تیری بخشش میرا تن تو ڈھانک دیگی مگر تیری خدمت گزاری تیرا دیا لیا سب کچھ چھین لے گی۔"

غالباً متبنی کو اس کا بھی علم ہوا تھا کہ کافور اس شاعر کی انتظامی قابلیت پر بھروسہ نہیں رکھتا تھا اسی شک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے۔

فلن فی اصطناعی محسنا کمجرب	یبن لک تقریب الجواد وشده

اذا کنت فی شک من السیف فابله	فاما تنفیه واما تعده

مجھ پر احسان کرنے میں ایک آزمائشی محسن بن کر دیکھ تاکہ تجھ پر ایک عمدہ گھوڑے کی چال اور اس کے

حملے کی قوت ظاہر ہو جائے جب تجھ کو تلوار کی خوبی اور تیزی میں شک ہو تو اس کا امتحان کر یا تو وہ بیکار نکلے گی اور تو اس کو پھینک دیگا ۔ یا عمدہ کاٹ کرے گی تو اس کو لڑائی کے لئے تیار کرے گا ۔"

بہرحال متنبی کی یہ ساری تدبیریں بیکار ہو گئیں ۔ کافور ٹس سے مس نہ ہوا ۔ وہ اس نبی بن جانے والے اور دنیا پر چھا جانے کی آرزو رکھنے والے شاعر سے خطرہ محسوس کرتا تھا ۔ متنبی کی دوربین نظروں نے کافور کے اس بدلتے ہوئے مزاج کو جب تاڑ لیا تو اس نے مصر سے بھی رخت سفر باندھا ۔ کافور سے مایوس ہو کر اس کی ہجو میں قصیدے لکھے اب اسی کافور کی نسبت جو کبھی اس کی امیدوں کا آماجگاہ تھا کہتا ہے ۔

اکلما اغتال عبد السوء سیدہ ۔ او خانہ ۔ فلہ فی مصر تمہید

صار الخصی امام الآبقین بہا ۔ فالحر مستعبد والعبد معبود

کیا عجیب بات ہے کہ جب کبھی بد طینت غلام اپنے آقا کو ناگاہ قتل کر دیتا ہے اور اس کی خیانت کرتا ہے تو مصر میں اس کے آرام و آسایش کے سامان مہیا کئے جاتے ہیں ۔ یعنے ایسے غلام کو مصریوں نے اپنا سردار بنا لیا ہے ۔ جب ایک خصی اور غلاموں کا پیشوا مصریوں کا سردار ہو گیا تو اب وہاں آزاد شریف ، ذلیل اور غلام واجب الاطاعت ہے ۔

یہی نہیں بلکہ وہ حبشی کافور جس کی کیفیت مشک کی طرح ہوا کو معطر کر دیتی تھی ۔ اور جس کی سیاہ فام رنگت رشک شمس و قمر بنی ہوئی تھی اسی کو اب ہمارا شاعر بطور تمسخر ابو البیضاء یعنے اس سیاہ فام کو سپید رنگ والوں کا باپ پکارتا ہے ۔ اور کہتا ہے ۔

واسود مشفرہ نصفہ ۔ یقال لہ ۔ انت بدر الدجی

اور وہ کالا کہ جس کا ایک ہونٹ آدھا ہے ۔ ایسے کے لئے کہا جاتا ہے ۔ تو چاند کا ٹکڑا ہے

مختصر یہ کہ جب سے کافور سے بھی اس کو مایوسی ہوئی تو اب دنیا متنبی کی نظروں میں تاریک تھی اس میں شک نہیں کہ مصر سے چلے جانے کے بعد اس نے ابن العمید اور پھر شیراز پہنچکر عضد الدولہ بن بویہ الدیلمی کی مدح سرائی بھی کی ۔ مگر ان قصائد میں اس کے سیاسی نصب العین کے حصول کے لئے وہ

پرانا اضطراب اور بے چینی نظر نہیں آتی۔ مگر متنبی کا سیاسی مسلک اس کی انقلابی ذہنیت اسکا جوش اور بہادری اب دنیا سے پوشیدہ نہیں رہی تھی۔ علوی، فاطمی اور کافور کے کارندے اور خود متنبی کے حاسد رقیب اس سیاس کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی فکر میں مدت سے لگے ہوئے تھے۔ بالآخر شیراز سے واپسی پر ورا قول میں دشمنوں نے اس کو گھیرا اور اس کے بیٹے اس کے غلام سمیت اسکو ۳۵۴ھ میں قتل کر دیا۔ متنبی کی زندگی کا یہ وہ زمانہ تھا جس میں اس نے نئے تجربے چھوڑ کر اپنے درس حیات کا جائزہ لینا شروع کیا تھا۔ اس کی ناکامیوں نے اس کو یہ سبق پڑھایا تھا۔

لحی اللہ ذی الدنیا مناخا لراکب فکل بعید الھم فیھا معذب

"اس دنیا پر جو مسافر کی تھوڑی دیر کے لئے ایک فرودگاہ ہے۔ خدا لعنت کرے کہ اس میں ہر بلند ہمت کو عذاب دیا جاتا ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ نا امیدیاں اور زمانے کا شکوہ و شکایت سیف الدولہ کے ساتھ رہنے کے زمانے میں بھی اس سے ظاہر ہوئے۔ جیسا کہ کہتا ہے:۔

فذی الدار اخون من مومس واخدع من کفة الحابل
تفانی الرجال علی حبھا وما یحصلون علی طائل

"یہ دنیا زن فاحشہ سے بھی زیادہ بے وفا ہے۔ اور ایک صیاد کے جال سے بھی زیادہ فریب دینے والی ہے۔ لوگ اس کی محبت میں مر مٹے اور ان کو اس کی محبت سے کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوا۔"

مگر اس وقت مصیبتوں نے اس کی اولوالعزمی کو مہمیز لگایا اور آفتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرنے پر مجبور کیا۔ اس کے نزدیک مرنے یا مارڈالے جانے میں کوئی فرق نہیں رہا تھا۔ کہتا ہے۔

اذا ما تاملت الزمان وصرفه تیقنت ان الموت ضرب من القتل

جب تو زمانہ اور اس کے حوادث کو دیکھے گا تو یقین کرے گا کہ موت ایک قتل کی قسم ہے۔

یہ بھی غالب کی طرح رنج کا اس قدر خوگر ہو گیا تھا کہ اس کی ساری مشکلیں آسان ہو گئی تھیں۔ اسی مطلب کو وہ بیان کرتا ہے۔

وهان فما ابالی بالرزایا لانی ما انتفعت بأن أبالی

مصیبتوں کے تیر لگنے مجھ کو آسان ہوگئے ہیں۔ اب مصیبتوں کی پرواہ نہیں کرتا کیوں کہ ان کی فکر کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اور پھر کہتا ہے۔

قلهون الصبر عندی کل نازلة ولین العزم حد المرکب الخشن

میرے صبر نے میری ہر مصیبت آسان کر دی۔ اور میری ہمت نے سفر میں سخت سے سخت سواری کو نرم کر دیا ہے۔

لیکن مصر سے واپسی پر اس کی کوئی امید بر آنے کی صورت نظر نہ آتی تھی اس کو بڑا خیال تھا کہ اس کی شعر و سخن پر قدرت اس کا زور قلم دنیائے عرب میں ایک انقلاب پیدا کر دیگا۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ اس کی ساری تدبیریں بے سود ہوگئیں۔ بالآخر اس کو یہ کہنا پڑا۔

حتی رجعت ـ واقلامی قوائل لی المجد للسیف لیس المجد للقلم

میں ناکام اپنے وطن کو واپس آیا اور میں کہنے لگا کہ شرف و مجد بذریعہ شمشیر حاصل ہوتی ہے نہ بواسطے قلم کے۔

معلوم ہوتا ہے کہ متنبی اپنے عمر کے اس آخری زمانہ میں بہت زیادہ قنوطیت پسند ہوگیا تھا اس کی مسلسل ناکامیاں سیف الدولہ جیسے امیر عرب سے فراق۔ دولت و حکومت کے حصول میں ناکامی۔ سیاسی نصب العین میں تدبیروں کا اثر مندرہ تقدیر نہ ہونا غرض ان سب مایوسیوں نے اس کے دل میں زمانے کے خلاف انتقامی جذبات پیدا کر دیئے ممکن ہے کہ آپ اور خود میں بھی متنبی نے درس حیات سے جو نتائج اخذ کئے ہیں اس سے متفق نہ ہوں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس شاعر نے ادب عربی میں عربیت قوت، جوش، بہادری، اور اولوالعزمی کے ایسے لازوال شہ پارے چھوڑے ہیں جو مٹائے نہیں مٹائے جا سکتے حقیقت یہ ہے کہ متنبی کے احساسات یا اس کا درس حیات اس کا ایک ایک شعر ہے اور ہر ایک شعر اس کے زمانے کی حقیقی تصویر ہے اپنے نوجوان احباب سے یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ آپ متنبی کی طرح جنگجو سپاہی بنیں مگر شاید یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر آپ کو اولوالعزمی، بہادری اور صبر و استقلال کے سبق بھی پڑھنے ہیں تو اس بلند ہمت فصیح و بلیغ شاعر کا کلام اسکی زبان میں ضرور پڑھیئے جس کی عملی زندگی اس کے اس شعر کی صحیح تعبیر تھی۔ کہتا ہے۔

اذا غامرت فی شرف مروم ولا تقنع بما دون النجوم

جب تو نے بلند و اعلیٰ مقصد کے حصول کا ارادہ کر لیا تو پھر ستاروں سے ورے قناعت نہ کر۔

بہمنی دربار

از جناب عبدالمجید صاحب صدیقی استاذ تاریخ (جامعہ عثمانیہ)

بہمنی سلطنت کی تاسیس جو چودھویں صدی کے وسط میں عمل میں آئی تاریخ دکن کا ایک بہت دلکش باب ہے۔ اس سلطنت کے بست وکشاد میں زندگی کی بڑی جنبشیں پنہاں تھیں۔ اس سلطنت نے اپنی ڈیڑھ سو سالہ دور میں دکن کی حیات قومی کی بڑی بڑی گتھیاں سلجھائیں۔ سیاست و تمدن کے بڑے تجربے کئے اور دکنی قومیت کی صحیح معنوں میں تعمیر کی۔ اس سلطنت کے حامل "امیران صدہ" تھے جو شمال سے دکن میں وارد ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ شمالی تمدن کا بڑا سرمایہ آیا تھا۔ جو سلطنت بہمنی کی تعمیر میں لگایا گیا۔ جس وقت ان واردوں کے قافلے بند صاحل اور نربدا کی گھاٹیوں کو عبور کرکے بالاگھاٹ کی شاداب وادیوں میں اترنے لگے تو ان کو ہر قدم پر نئی فضائیں ملنے لگیں۔ ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے سکون قلب کے ساتھ زندگی کی نئی لہر دوڑانے لگے پہاڑیوں کی گودی میں جو ندیاں بہتی ہیں ان کا شفاف پانی کبھی سرسبز چوٹیوں سے جھرتا اور کبھی شاداب درختوں کی جھرمٹ سے گذرتا ہوا انسانی تخیل کی اس قدر گدگداتا ہے کہ دیکھنے والے بے چین ہو جاتے ہیں اور فطرت شناس قلوب رقص و وجد کے ساتھ جھومنے لگتے ہیں۔ دکن میں کئی ہستیاں ایسی بھی گذری ہیں جو اس دیوتائے فطرت کے سامنے اپنا چڑھاوا چڑھانے کے لئے دریاؤں کے کنارے بیٹھ گئیں اور اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ انھیں وادیوں میں دکھنی تمدن کے پرانے خزانے ملتے ہیں اور ان قومی رہنماؤں کی بھولی ہوئی صدائیں سنائی دیتی ہیں جو کبھی تعمیر ملت کے لئے بلند ہوئی تھیں۔ غرض دکن کا خطہ تمام ہندوستان میں اپنی جغرافی اور تمدنی دلفریبیوں کا بہت بڑا مخزن ہے۔ اسی ماحول میں شمال کے نو واردوں کو غور و فکر کا بہت بڑا سامان ملا۔ جب ان واردوں نے دکن کی دریاؤں کے کنارے اپنی گٹھڑیاں کھولیں اور اپنا متاع تمدن بکھیرا تو قدیم و جدید تمدن کا بڑا دلکش امتزاج ہونے لگا۔ چند ہی روز کے اندر ان تمدنوں کا ایک خوشگوار

مرتب تیار ہوگیا جس سے بالآخر سلطنت بہمنی کی تعمیر عمل میں آئی ۔

سلطنت بہمنی قرون وسطیٰ کی سلطنت تھی جس میں بادشاہ کی ذات اور اس کے دربار کو بہت اہمیت حاصل تھی کیونکہ اس زمانے کا بادشاہ اور اس کا دربار تمام افراد مملکت کا نقطۂ جاذبہ ہوتا تھا جہاں تمام مملکت کی سیاسی شعائیں جمع ہوتی تھیں ۔ اصل بات یہ ہے کہ اس زمانے میں عوام میں سیاسی شعور بالکل نہ تھا جس میں آج ہم سانس لینے کے عادی ہیں ۔ جب سیاسی شعور نہ ہو اور افراد کو اپنی سیاسی ذمہ داریاں اور فرائض نہ معلوم ہوں تو خود اعتمادی کیونکر پیدا ہوسکتی ہے ۔ حالات یہ تھے کہ افراد اپنے کو مملکت کے بے دست و پا اجزا سمجھتے تھے اور ان کی بقا مملکت کی سرپرستی پر منحصر تھی ۔ اسی وجہ سے ان کی نظر بادشاہ اور اس کے دربار پر پڑتی تھی اور ان کی زندگی بادشاہ کی زندگی کے ساتھ وابستہ تھی ۔ جب کبھی بادشاہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا تو ملک کے تمام گوشوں میں بے چینی پھیل جاتی تھی ۔ مغل تاریخ کا واقعہ ہے کہ علالت کی وجہ سے شاہجہاں بادشاہ چند روز جھروکہ درشن میں نہیں آئے تو تمام ہندوستان میں کہرام مچنے لگا اور لوگ طرح طرح کی تاویلیں کرنے لگے ۔ شہنشاہ کا دستور یہ تھا کہ ہر روز صبح کو فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد تسبیح پڑھتے ہوئے جھروکہ درشن میں بیٹھ جاتے تھے ۔ اور دریا کے نیچے سے ان کی رعایا ڈنڈوت کرتے ہوئے گذرتی تھی اور درشنیوں کے دل بھر جاتے تھے ۔ سچ تو یہ ہے کہ قرون وسطیٰ میں مملکت کی تعمیر اور اس کا قیام اس خاموش اطاعت پر مبنی تھا جس کو انیسویں صدی کے مفکر جیری بینتھم اور جان آسٹن عادتی اطاعت کہتے ہیں یعنی لوگ نہایت خاموشی کے ساتھ اپنے کو حکومت کے فیصلے کے سپرد کر دیتے تھے کہ " امور مملکت خویش خسرواں دانند " یہ حقیقت پوری طور پر نہیں تو بڑی حد تک زمانہ حال پر بھی صادق آتی ہے آج بھی کوئی فرد اپنی مملکت سے جدا ہوکر زندہ نہیں رہ سکتا ۔ کچھ اسی وجہ سے بادشاہ اور اس کا دربار اہل ملک کی امیدوں کا آخری مرجع اور قومی تمناؤں کی آخری منزل سمجھی جاتی تھی ۔ میدان جنگ میں سپاہی اس وقت تک بے جگری سے لڑتے تھے جب تک ان کے بادشاہ کا نظر افروز نظارہ ہمت بڑھاتا تھا ۔ ہندوستان کے بادشاہ اور راجہ عماری میں بیٹھ کر اپنی رونمائی کرتے اور جب بادشاہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا تو فوراً صفیں ٹوٹنے لگتیں ۔ ہندوستان کی

تاریخ میں ایسے بہتر سے واقعات ملتے ہیں کہ جب کبھی بادشاہ عماری سے اتر گئے اور نظروں سے غائب ہو گئے تو میدان جنگ میں بھگڈر مچ گئی اور بڑے بڑے سورما بھی میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔

اسی وجہ سے ہندوستان ہمیشہ بادشاہ اور دربار کی تزئین بہت ضروری سمجھی گئی کیونکہ ہندوستانی دل و دماغ بہت بادشاہ پرست ہیں جس قدر شاہی تزئین سلطنت کے طول و عرض میں ضیا پاشی کرتی رہی اسی قدر ہندوستان میں جذبات وفاداری ابھرے اور ملک کے ہر گوشے سے اطاعت و انقیاد کی والہانہ صدائیں بلند ہونے لگیں۔ برخلاف اس کے جب دربار خاموش ہو گئے تو رعایا کی گرمئ ہنگامہ بھی ختم ہو گئی چنانچہ ہندوستان میں جو سلطنتیں قائم ہوئیں وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں رہیں۔ ہر سلطنت نے اپنے سیاسی بست و کشاد میں دربار کی تزئین کو پہلے جگہ دی۔ کیوں کہ ہندوستان میں حکومت کو موثر بنانے کا یہی ایک آلۂ کار تھا۔ پٹھان بادشاہوں کے دور میں جو تقریباً دو سو سال ہندوستان میں جاری تھا دربار کی زیب و زینت پر بہت زور دیا گیا۔ بادشاہ شاندار لباس زیب تن کرتے تھے۔ دربار کے ایوان بڑے تزک و احتشام سے آراستہ کئے جاتے تھے۔ زریں تخت بچھائے جاتے تھے اور بادشاہ کے جلوس بھی بڑے اہتمام سے کئے جاتے تھے اگرچہ سترھویں صدی میں مغل شہنشاہوں نے اپنے دربار کے سجانے میں کمال کر دیا تھا۔ لیکن پٹھان بادشاہوں نے بھی اس سے چشم پوشی نہیں کی۔ غیاث الدین بلبن نے جو خاندان غلامان کا جلیل القدر فرمانروا تھا سب سے پہلے بڑے اہتمام کے ساتھ شاہی دربار کی تزئین کی تھی۔ دربار کے لئے ایک بہت بڑا محل بنایا گیا۔ جو لال محل کہلاتا تھا۔ اس میں تخت بچھایا جاتا تھا اور سامنے چاروں طرف امراء و وزراء جمع ہوتے تھے۔ آداب دربار کا پورا لحاظ ہوتا تھا اور خاموشی ہوتی تھی۔ بادشاہ پوری متانت کے ساتھ تخت پر بیٹھتے تھے۔ اور حاضرین دربار بادشاہ کے ہر اشارے پر اپنا سر تسلیم خم کر دیتے تھے۔ دربار کے باہر سوار و ہاتھی کھڑے ہوتے تھے اور اس کا دور دور تک رعب بیٹھتا تھا۔

جب ۱۳۴۷ء میں بہمنی سلطنت کی دکن میں داغ بیل ڈالی گئی تو اس سلطنت کے معماروں نے اپنی رعایا کے صحیح جذبات کا پورا اندازہ لگایا۔ سلطنت کی تشکیل میں بادشاہ کی ذات اور دربار کی

شان وشوکت کو سب سے پہلے جگہ دی گئی۔ دربار کو بڑے سلیقے سے سجایا گیا تاکہ رعایا اس سے متاثر ہو اور دل سے اطاعت کرے۔ شمال کی طرح دکن میں رعایا کی شاہ پرست آنکھیں جس چیز کو پہلے ٹٹولتی تھیں وہ شاہی طمطراق ہے جس کو انگلستان کے دستوری مورخ بیجہٹ نے مملکت کا ڈرامائی عنصر کہا ہے۔ اگر دربار کی شان وشوکت نہ ہو تو دیکھنے والوں کی آنکھیں مایوسی کے ساتھ پلٹ جاتی تھیں اور ان میں جذبۂ وفا شعاری نہیں ابھرتا تھا۔ خود دکن کے قدیم راجگان بھی درباروں کو بلند آہنگ بنانے کے عادی تھے۔ ان کے تخت وتاج خوب جگمگاتے تھے۔ واتاپی، منکھیڑ اور کلیانی کے شاہی درباروں کے افسانے ابھی دکن میں زندہ تھے۔ دیوگری اور ورنگل کو بھی لوگ نہیں بھولے تھے۔ جس سرزمین میں تاج وتخت کی یہ روایتیں گھومتی ہوں وہاں سیدھا سادہ خاموش دربار بے اثر ہو کر رہ جاتا اور نومفتوح رعایا کبھی اپنے بادشاہ کی گرویدہ نہ ہوتی۔

سلاطین بہمنی کا سب سے پہلا دربار اس وقت منعقد ہوا جب امیران صدہ سلطان محمد تغلق کی فوجوں کے سامنے کشاکش زیست میں کامیاب ہو گئے۔ دولت آباد کی دیواروں کے سامنے سلطان محمد تغلق کی شکست اس بات کا اعلان تھا کہ اب دکن امیران صدہ کے ہاتھوں میں خود مختار ہے جس کو دہلی کی مرکزیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جب یہ آزادی حاصل ہو گئی تو پھر امیران صدہ نے اس نوخیز سلطنت میں جو ان کی مبارک کوششوں کا پھل تھا سیاسی تنظیم پیدا کرنے کی کوشش کی۔ پہلے انھوں نے اپنے ایک برگزیدہ امیر صدہ ظفر خاں کو اپنا بادشاہ بنایا اور اس کے جلوس شاہی کی تیاریاں ہونے لگیں کیونکہ بادشاہ اور اس کا دربار سلطنت کا نفس ناطقہ تھا۔ اگر اس کی جگہ معین ہو جائے تو سلطنت کے تمام اعضائے سیاسی خود بخود اپنی جگہ کر لیتے ہیں اور ملک میں ہر طرف روح دوڑ جاتی ہے۔ چنانچہ دکن کے مورخ کہتے ہیں کہ ۷۴۸ھ میں جمعہ کے دن ۲۴۔ ربیع الاول کو قلعہ دولت آباد کی مبارک شاہی مسجد میں یہ مبارک دربار سجایا گیا۔ یہ سلطنت بہمنی کا سب سے پہلا اور عہد آفرین دربار ہے جو ایک قدیم مسجد میں منعقد ہوا تھا۔ گو اس میں وہ شان وشوکت نہ تھی جو شاہی درباروں میں ہونی چاہیئے۔ لیکن اس کے دور رس نتائج کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ تاریخ کا ایک مہتم بالشان اجتماع تھا جس میں ایک متمدن سلطنت کی بنیاد رکھی گئی

اہل دکن کی حیات سیاسی کو منظم کیا۔ دکن کی مشترک قومیت کی تشکیل کی گئی جس میں تمام قومیتیں جمع ہوئیں اور بلا امتیاز قوم و ملت تمام اہل دکن کے قوائے ذہنی اور اخلاقی کی تربیت کا سامان جمع کیا گیا۔ یہ ایک دلفریب سماں تھا کہ تمام امیران صدہ اپنے نئے بادشاہ کی تخت نشینی کے لئے مسجد میں جمع ہوئے، مسجد میں قیمتی قالینوں کا فرش کیا گیا اور جگہ جگہ خوش رنگ مسندیں بچھائی گئی تھیں۔ اس مجمع میں جہاں سپاہی اور عالم دونوں جمع تھے حضرت شیخ سراج جنیدی بھی آگئے جو اس کارروان کے متاع گراں بہا تھے یہ اس زمانے کے بہت بڑے صوفی ہیں جن کا سلطنت بہمنی کی تعمیر میں بہت بڑا ہاتھ ہے۔ شیخ نے اپنے ہاتھ سے ظفر خان کے سر پر پگڑی باندھی اور کمر میں تلوار آویزاں کر کے اس کو مسجد کے ممبر پر بٹھایا جو سلطنت بہمنی کا پہلا تخت تھا یہ ظفر خاں کی بادشاہی کا اعلان تھا جو علاؤالدین حسن بہمنی شاہ کے لقب سے دکن کا بادشاہ ہوا۔ اس کے بعد شیخ نے ایک سبق آموز خطبہ سے حاضرین دربار کو مخاطب کیا۔ اس میں سلطنت کی ضرورت بتائی کہ انسانوں کے سیاسی اجتماع اور سیاسی تنظیم کی کیا ضرورت ہے اور اس کا کیا نصب العین ہونا چاہیئے انصاف و رعایا پروری پر روشنی ڈالی کہ ہر بادشاہ اپنی رعایا کے فلاح و بہبود کا خدا کے سامنے جوابدہ ہے پھر اس نئی سلطنت کی بقا کے لئے دروں دل سے دعا کی جس میں تمام حاضرین اپنے صمیم قلب کے ساتھ شریک تھے۔ اس کے بعد حاضرین دربار نے بادشاہ کے سامنے پورے خلوص و مسرت کے ساتھ نذریں پیش کیں۔ مورخ کہتے ہیں کہ حاضرین دربار اس قدر خوش تھے کہ جب دربار برخاست ہوا تو سب اچھلتے کودتے ہوئے اپنے گھروں کو واپس ہوئے۔ اس عہد کے مورخ اور شاعر مولانا عصامی جس نے اس دربار کی نشست و برخاست اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی ان الفاظ میں نقشہ کھینچا ہے۔

در آں ساعت خوب و فرخندہ روز ۔۔۔ بہ فرمان داور دو دراں فروز
یکے تخت زریں ہمیا راستند ۔۔۔ سراں را درآں بارگاہ خواستند
چہ تختے کہ افلاک را سایہ کرد ۔۔۔ زمین را سراسر پر از مایہ کرد
درآمد برآں تخت گوہر نگار ۔۔۔ یکے شاہ دیں پرور و دوں شکار

اصل میں شاہی دربار پوری شان و شوکت کے ساتھ اس وقت منعقد ہونے لگے جبکہ

کو چھوڑ کر گلبرگہ کو پایہ تخت بنایا گیا۔ علاء الدین حسن بہمنی شاہ نے اپنی مرکزی حکومت بہت جلد دولت آباد سے گلبرگہ میں منتقل کر دی کیونکہ یہ جگہ دکن کا مرکز نقل ہونے کی وجہ سے زیادہ موزوں تھی اور یہاں جنوب کی سلطنت بیجانگر سے باخبر رہنے کے اچھے مواقع تھے جو ایک طاقتور ہمسایہ سلطنت تھی۔ گلبرگہ میں قلعے کی تعمیر کے ساتھ محل بنائے گئے اور اس میں دربار کا انتظام ہوا۔ علاء الدین بہمن شاہ کو دربار کی آرائش کا بہت خیال تھا۔ ایک بہت بڑے دالان میں دربار منعقد ہونے لگا اور بادشاہ کی نشست کے لئے چاندی کا ایک بہت بڑا تخت بنایا جس پر کئی من چاندی صرف ہوئی تھی۔ اس تخت سے دربار کے ضروری لوازم پورے ہوئے اور دربار کی رونق بہت بڑھ گئی۔ بادشاہ اس تخت پر بیٹھتے تھے اور امراء و وزراء ادب کے ساتھ کھڑے ہو جاتے تھے۔ کبھی سیف الدین غوری کو جو وزیر اعظم ہونے کی وجہ سے ایک ذی عزت شخصیت تھی بیٹھنے کی اجازت ہو جاتی تھی۔ فرشتہ کہتا ہے کہ علاء الدین حسن بہمنی شاہ ہر روز دربار منعقد کرتا تھا اور اسکے اوقات مقرر تھے۔ اس دربار میں احکام جاری ہوتے سیاسی امور پر غور ہوتا تھا اور رعایا کے احوال پوچھے جاتے تھے۔

لیکن بہمنی دربار کی اصل تزئین جو ہندوستان کی تاریخ میں مشہور رہے وہ علاء الدین کے جانشین محمد شاہ اول کے عہد میں پیدا ہوئی، جو ۱۳۵۸ء میں تخت نشین ہوا۔ محمد شاہ خاندان بہمنی کا وہ جلیل القدر بادشاہ ہے جس میں تدبر، مہارت حرب، اور قانون دستور سازی کے تمام محاسن جمع تھے سچ پوچھو تو اسی فرماں روائے سلطنت بہمنی کا حقیقی نقشہ بنایا تھا۔ مرکزی اور مقامی حکومتوں کی تشکیل کی گئی۔ تمام اعضائے سیاسی معین کئے۔ وزراء کے فرائض کی پوری وضاحت کی۔ لیکن جس انتظام میں زیادہ اہتمام کیا گیا وہ شاہی دربار ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محمد شاہ میں شاہی شان شوکت رعب داب کے لوازم کی صحیح پہچان تھی۔ وہ جانتا تھا کہ بادشاہ اور اس کا دربار جو سلطنت کا نقش اعلی ہوتا ہے کس طرح سجایا جائے۔ اس کے علاوہ اس میں ایک بلند پایہ ذوق حسن کاری بھی جمع تھا۔ دربار کی تزئین میں اس نے جس شگفتہ ذوق سے کام لیا تھا اس زمانے کی تاریخ میں اس کی کہیں مثال نہیں ملتی۔ اس دربار میں ایسے شاہی لوازم جمع کئے گئے جس کا اس زمانے میں بہت سوں کو اندازہ نہیں تھا۔

اس میں شاہی رعب و داب کے علاوہ ایک حسن کارانہ ذوق کی تشفی بھی ہوتی تھی۔ آج بھی کچھ ان کے پر لطف دربار کی وجہ سے یاد کئے جاتے ہیں اور پہچانے جاتے ہیں۔

تخت نشین ہوتے ہی محمد شاہ نے دربار کو آراستہ کرنا شروع کیا۔ بعد اس کے قواعد بنائے۔ ایوان شاہی میں نہایت دیدہ زیب ریشمی و اونی قالین بچھائے جاتے تھے۔ ایوان شاہی کی دیواروں پر ریشمی پردے آویزاں کئے جاتے تھے اور بیچ میں جہاں شاہی تخت رکھا جاتا تھا مخمل و زربفت کے شامیانے کھڑے کئے جاتے۔ شامیانے کے نیچے شاہی تخت ہوتا تھا۔ ایک شاہی چتر بھی بنایا گیا تھا جس میں بہت تکلفات تھے۔ اس کے قبہ پر جواہر لگائے گئے تھے۔ جو بہت جگمگاتے تھے اور مورخ فرشتہ کہتا ہے کہ اس کے قبہ پر ہما کی شکل کا ایک پرند بٹھایا گیا تھا جس کے سر پر ایک بہت بڑا قیمتی یاقوت نصب تھا۔ یہ چتر بھی دربار میں رہتا تھا اور جب بادشاہ باہر جاتے تھے ان کے سر پر بلند کیا جاتا تھا۔ دربار کے انتظام کے لئے بعض عہدہ دار مقرر تھے جو تواجیاں اور یساولان کہلاتے تھے۔ تواجیوں کا یہ کام تھا کہ دربار میں لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے۔ اور تمام حاضرین دربار لوگوں کے منصب اور رتبے کے مطابق جگہ دی جاتی تھی اور ہر شخص دربار میں خاموشی کے ساتھ کھڑا ہو جاتا تھا۔ بڑے عہدہ دار و وزراء سامنے کھڑے ہوتے تھے اور دوسرے پیچھے ہوتے تھے۔ دربار کے صحن میں دو سو اسلحہ دار اور ایوان کے باہر چار ہزار سپاہی کھڑے ہوتے تھے جس کو خاصہ خیل کہتے ہیں۔ جب بادشاہ دربار میں آتے تھے تو نوبت بجتی تھی اور حاضرین دربار میں ادب سے کھڑے ہو جاتے تھے۔

جمعہ کے علاوہ ہر روز صبح کو دس بجے کے قریب دربار منعقد ہوتا تھا۔ پہلے حاضرین دربار جمع ہو جاتے تھے اور بادشاہ محل سے باہر آتے تھے۔ محمد شاہ کا دستور یہ تھا کہ پہلے وہ تخت کے سامنے سر جھکاتے تھے کیونکہ یہ علاء الدین حسن شاہ کا تخت تھا اور پھر ادب سے بیٹھ جاتے تھے۔ اور امور سلطنت کی نگہداشت شروع ہو جاتی۔ نذریں دی جاتی تھیں۔ فرامین جاری ہوتے تھے اور نئے عہدہ دار اور منصب داروں کو شاہی معائنہ کے لئے پیش کیا جاتا تھا۔ شاہی لوازم کی جگمگاہٹ کے ساتھ حاضرین دربار کی ترتیب ایک بہت ہی دلکش منظر پیش کرتی تھی۔ تخت کے سامنے حاضرین کو آگے

پیچھے تمام قطاریں ہوتی تھیں اور شاہی متانت کا سماں بندھ جاتا تھا۔ دربار میں کسی کو بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ وزرا رعہدہ داروں کے علاوہ شاہی خاندان کے افراد بھی دربار میں کھڑے ہوتے تھے۔ علاء الدین بہمن شاہ کے عہد میں کبھی سیف الدین غوری کو جو جلیل القدر وزیر اعظم تھا بیٹھنے کی اجازت دی گئی۔ محمد شاہ کے عہد میں بھی وہ کبھی بیٹھ گیا لیکن محمد شاہ کو اس کا بیٹھنا اچھا نہیں معلوم ہوا۔ اور اس وزیر باتدبیر نے بادشاہ کے تیور پہچان کر خود کنارہ کشی کی۔ اور آپ بھی دوسروں کی طرح کھڑا ہو گیا۔ حالانکہ ایک جلیل القدر عہدہ پر فائز ہونے کی وجہ سے سلطنت میں اس کی بڑی عزت تھی اور محمد شاہ نے اس کی بیٹی سے شادی بھی کی تھی۔ دربار ظہر کی نماز تک جاری رہتا تھا۔ اور جب نماز کی اذان سنائی دیتی تو دربار برخاست ہو جاتا تھا۔

محمد شاہ کے دربار کی حقیقی رونق اس کے مشہور تخت کی وجہ سے ہے۔ جو تخت فیروزہ کے نام سے موسوم ہے۔ پہلے پہل محمد شاہ چاندی کے تخت پر جلوس کرتے رہے، جو ان کے باپ کے عہد میں تیار ہوا تھا۔ لیکن اول تو اس تخت میں وہ آب و تاب نہ تھی جو ایک شاہی تخت میں ہونا چاہیئے۔ اور یہ محمد شاہ کا حسن کارانہ ذوق کا جواب نہ تھا۔ دوسرے بادشاہ اس کو ایک مقدس چیز سمجھ کر احترام کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے انھوں نے اپنی نشست کے لئے ایک علیحدہ تخت بنایا جو بہمنی تاریخ کی ایک خاص چیز ہے۔ اس تخت کی بہت بڑی تفصیل ہے۔ مورخ فرشتہ نے اس تخت کی تاریخ و تفصیل بتائی ہے اگرچہ اس مورخ نے یہ تخت دیکھا نہیں تھا کیونکہ سولھویں صدی میں جبکہ اس مورخ نے اپنی مشہور تاریخ لکھی ہے اس تخت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ لیکن فرشتہ کہتا ہے کہ اس نے اس خاندان کے لوگوں سے اس کے حالات دریافت کئے جو اس تخت کے محافظ تھے اگر اس کی اصلیت دیکھی جائے تو یہ تخت محمد شاہ کو تلنگانے کے ایک راجہ سے تحفے میں ملا تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ محمد شاہ نے ۱۳۶۳ء میں تلنگانے پر حملہ کیا تھا کیونکہ یہاں اکثر علاقے فتح نہیں ہوئے تھے تلنگانہ کے راجہ نے صلح کر لی اور محمد شاہ کو خوش کرنے کے لئے ایک تخت نذر کیا جس کی ساخت اور رونق بہت دلکش تھی اور محمد شاہ نے اس کو بہت پسند کیا اور اپنی نشست کے لئے استعمال کیا۔

یہ ایک لکڑی کا تخت تھا جس پر فیروزہ رنگ کی میناکاری تھی۔ اس کے تختے اور پایے حسب ضرورت الگ ہو جاتے تھے۔ اور دربار کے وقت ان کو جوڑ کر قایم کر دیا جاتا تھا۔ لیکن محمد شاہ نے اپنے بلند پایہ ذوق سے اس میں بہت اضافہ کئے۔ اس میں سونے کی میناکاری کی گئی۔ اور جگہ جگہ قیمتی رنگا رنگ جواہر نصب کئے گئے ان اضافوں سے یہ تخت اس قدر جگمگاتا تھا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں چکا چوند ہو جاتی تھیں۔ گو سونے اور جواہر سے اس کا اصل رنگ فیروزہ چھپ گیا تھا۔ لیکن اس کو تخت فیروزہ ہی بولتے تھے۔ اور سونے اور جواہر کی وجہ سے وہ بیش قیمت سمجھا جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس زمانے کے جوہریوں نے اس کی قیمت کا اندازہ اس وقت ایک کروڑ روپے کیا تھا۔ دربار کے بعد یہ تخت اٹھا کر محفوظ کر دیا جاتا تھا۔ اور اس کی حفاظت کے لیے کئی لوگ مقرر تھے۔ یہ ہندیوں کا مشہور تخت فیروزہ ہے جس کے اب تک دکن میں افسانے مشہور رہیں۔ اور اس زمانے میں لوگ دور دور سے دیکھنے کے لیے آتے تھے۔ جس وقت محمد شاہ کے ذوق کے مطابق یہ تخت تیار ہو گیا تو اس کی مسرت میں ایک خاص دربار منعقد کیا گیا تھا۔ اور کئی روز جشن ہوئے۔ اور جب بادشاہ نے اس تخت پہ جلوس کیا تو شاعروں نے ان الفاظ میں گیت گائے۔

بر اورنگ فیروزہ بنشست شاد   بہ مجلس طرب رانی داد و داد
نشستند گرداں بہ گرد سریر   بہ شادی بزرگان روشن ضمیر

تاریخی کاغذات کے ذخیرے

(۴)

نواب عماد الملک میر شہاب الدین خاں کے عنایت نامے

از جناب محمد غوث صاحب، ام، اے، ال، ال بی

کتب خانۂ سعیدیہ کے ذخیرۂ کاغذات میں چار مکاتیب ایسے شامل ہیں جو نواب عماد الملک میر شہاب الدین خاں نے نواب محمد علیخاں والاجاہ نواب کرناٹک کے نام ارسال کئے تھے۔ یہ چاروں مکاتیب مجلہ کی اس اشاعت میں شائع کئے جاتے ہیں۔

نواب عماد الملک میر شہاب الدین خاں حضرت آصف جاہ اوّل کے پوتے اور امیر الامرا غازی الدین خاں فیروز جنگ کے بیٹے تھے۔

بادشاہ گر نواب عماد الملک کا نام تاریخ ہند کے ایک ایسے پرآشوب دور کو یاد دلاتا ہے جب کہ مغلیہ سطوت اور شوکت ایک فسانہ بنتی جارہی تھی عماد الملک کا نام تاریخ میں جرارت اور ہمت کے ساتھ سوء تدبیری اور عیر آل اندیشی کے لئے یادگار رہے گا۔ اپنی حفاظت اور اپنے آپ کو ممتاز اور سر بلند کرنے کا جذبہ اگر تدبیر و دانش کے ساتھ کارفرما ہوتا تو نہ صرف سلطنت اور حکومت کے استحکام کا ذریعہ ہوتا بلکہ ذاتی رفعت و عظمت کا بھی موجب ہوتا۔

بہر حال جب نواب غازی الدین خاں فیروز جنگ ۱۱۶۵ھ میں دکن کے انتظام پر امور ہوکر جانب اورنگ آباد روانہ ہوئے تو اپنے اصلی عہدۂ امیر الامرائی یا میر بخشی گری پر عماد الملک کو نائب بنا کر احمد شاہ کی پیشگاہ میں متعین کیا۔ اور ابو المنصور خاں صفدر جنگ وزیر سے موالات پیدا کرادی۔ دکن سے غازی الدین خاں کے انتقال کی خبر آئی تو صفدر جنگ اور عماد الملک میں باہم اس قدر تعلق جول ہوا کہ عماد الملک نے خود اپنے والد کا عہدۂ امیر الامرائی حاصل کرلیا۔ باپ کا خطاب بھی حاصل ہوا[1]

[1] والاجاہی دفتر میں عماد الملک کے مکتوب کی ایک نقل جو لکھی گئی ہے اس پر یہ خطاب یوں بیان کیا گیا ہے ... نواب بخشی الممالک عماد نظام الملک شہاب الدین خاں بہادر فتح جنگ سپہ سالار۔

اس کے بعد جب بادشاہ کے پاس عماد الملک کو بڑا اعتبار حاصل ہو گیا تو صفدر جنگ سے ان بن ہو گئی۔ اس ان بن کی بنا پر عماد الملک نے اپنے ماموں خانخاناں سے مل کر قلعہ پر دھاوا کر کے مرتضیٰ خاں کو جو صفدر جنگ کی نیابت میں چار سو آدمیوں کے ساتھ میر آتشی کے عہدہ کے کاروبار انجام دیتے تھے۔ قلعہ سے باہر کر دیا۔ اس واقعہ کے دوسرے روز صفدر جنگ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ کوشش کی کہ میر آتشی کی خدمت پھر حاصل ہو جائے لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ حکم ہوا کہ دوسری کوئی خدمت طلب کیجائے۔ صفدر جنگ نے میر بخشی گری کے عہدہ پر عماد الملک کے بجائے سادات خاں ذوالفقار جنگ کو مامور کرا دیا۔ بہر حال یہ قصے چل رہے تھے اور جب بادشاہ صفدر جنگ سے بدل ہو گئے تو عماد الملک نے یہ چاہا کہ صفدر جنگ کو نیچا دکھایا جائے۔ دونوں میں جنگ وجدل کی نوبت آگئی۔ اس جنگ کے زمانہ میں عماد الملک نے ملہار راؤ ہولکر کو مالوہ سے اور جے آپا کو ناگور سے کمک کے لئے طلب کیا۔ صفدر جنگ نے سورج مل جاٹ سے امداد چاہی۔ اس زمانہ میں عماد الملک نے جو مکتوب محمد علی خاں والاجاہ کو تحریر کیا وہ حسب ذیل ہے۔

(۷)

ہو

خان شہامت وبسالت مرتبت اخلاص وموالات نشان۔

دو قطعہ خط محبت نمط یکے مرقوم نوزدہم جمادی الاولیٰ دوم تحریر بیست ودوم شہر مذکور در عین انتظار رسید و نشاط افزا گردید از خلوص محبت و دولت خواہی و حصول سرور موفور بہ تعلق یافتن خدمت میر بخشی گری وغیرہ خدمات معدودہ کہ مرقوم بود باقتضائے کمال خیر اندیشی و اتحاد دلی ست۔ چرا این ہمہ خوش وقتی آں شہامت وبسالت مرتبت ر ونداد کہ از سر پشت شریک دولت و رفیق در ہمہ وقت اند و ترقیات باعث ترقیات رفقائے دولت خواہ و ذریعہ استعلائے مدارج خیر اندیشاں بلا اشتباہ است در باب منصب و خطاب و پالکی جھالر دار کہ نوشتہ اند ہمہ معروض جناب مقدس معلیٰ گشتہ منظور شد۔ دولت خواہی ہا کہ در وقت حضرت مغفرت منزلت ازاں اخلاص وموالات نشان بتقدیم رسیدہ و استقامت و ثباتے کہ الحال ازاں موالات نشان بر صراط مستقیم خلوص محبت دارند بوجہ احسن مرتسم نقش خاطر است۔ یگی ہمت مصروف بریں کہ در ازائے این حسن خدمت

و صداقت و وفا مراعاتے بعمل آید کہ آن اخلاص و موالات نشان خوش وقت شوند و ثروت و
اقتدارے کہ تمنا دارند زیادہ از آن حاصل نمایند۔ پاس امرے کہ بزرگان فرمودہ باشند ہمہ منظور بلکہ
مافوق آن مرکوز خاطر است در باب فرمان والاشان و خلعت وغیرہ عطیات برائے آن شہامت و لیاقت
مرتبت بحضور انور معروض داشتہ شدہ لیکن بہ سبب ہنگامہ کہ درین روزہا رو دادہ و مجلس بر کاغذ
علیحدہ بقلم آمدہ بالفعل نوشتہ نشدہ انشاء اللہ تعالیٰ متعاقب می رسند ۔ رسند . . . .
سرناتک و ترچناپلی وغیرہ نیز خواہد رسید بعض مقدمات بوکیل آن شہامت و عوالی مرتبت گفتہ شد۔
خواہد نوشت ۔ جواب آن زود باید نوشت ۔ مراتب کارطلبی و فدویت مردم فرنگ انگریز بسیار
شنیدہ شدہ است ۔ اگر جماعت ما ازین مردم کہ در فن خود ممتاز باشند مستعد شدہ بہ نویسند
باعث کمال امتنان و مسرت آن شہامت و عوالی مرتبت است "

سرحد تنخواہ خاص :۔ ان موالات نشان بخاطر جمع بکارہائے متعلقہ سرحد خود و تقدیم لوازم دولت خواہی
سرگرم و مستعد باشند انشاء اللہ تعالیٰ انچہ باعث رفاہ و بہبود شما خواہد بود بعمل خواہد آمد۔ (سیف خاص)

اس مکتوب میں یہ درج ہے کہ "ہنگامہ کہ درین روزہا رو دادہ و مجلس بر کاغذ علیحدہ بقلم آمدہ" یہ
یادداشت ذیل میں نقل کی جاتی ہے :-

"در ابتدا صفدر جنگ و این جانب را ربط بدرجۂ اتم بود وقتے کہ ایام نکبت و ادبارش نزدیک
رسید خواست با حضرت بادشاہ جہاں پناہ کہ ولی نعمت و ظل اللہ اند مصدر حرکات ناشائستہ شود۔
ما از اطلاع این معنی خواستیم کہ او متنبہ شدہ از ارتکاب حرکات نالائقہ باز ماند از آن جا کہ
چون تیرہ شود مرد را روزگار ہمہ آن کند کش نباید بکار ۔ ہر چند فہمانیدم نشنید و بعزم جمعیت موفور باتفاق سورج مل جاٹ
بد ذات کہ فی مابین دار الخلافہ و مستقر الخلافہ مصدر بغی و فساد است و از زمان بادشاہان سلف سرہم بود
و بادشاہزادہ ہائے عالی مقدار معہ راجہائے ہندوستان مثل مہاراجہ جے سنگھ وغیرہ بر و تعین شدہ اند
و استیصال این ریشۂ فساد از قوہ بفعل نیامدہ بے ادبانہ پیش آمد و این جانب بمقتضائے پاس حق نمک و نظر بر نام
بزرگان متحمل این ہمہ حرکات ناشائستہ نشدہ مذکور شدہ با وصف این کہ ہمہ ارکان سلطنت بعضے

از راہ جبن و بعضے از سخافت عقل و بعضے از راہ نمک حرامی با مخالف سلطنت سازش داشتند.
متوکلاً علی اللہ المستعان با جمیعے کہ داشتیم بہ تنبیہ و تادیب او کہ بالکل سوار دم نخوت و پندار
می زد مستعد شدیم۔ بحول و قوۃ ایزدی و امداد ارواح طیبہ صفدر جنگ۔ باعث تنبیہ ہائے واقعی یافتہ
از سواد شہر دارالخلافہ ہزیمت ہا خوردہ آوارہ دشت ادبار گردیدہ و ما متوجہ تعاقب آنہا ہستیم انشاءاللہ
تعالیٰ عنقریب قتیل یا اسیر می شود و عرصۂ سلطنت از خس و خاشاک پاک شدہ گلشن ہمیشہ بہار امن و
امان می گردد بفضل الٰہی وقت جلوہ افروزی مقاصد دولت خواہان صادق الاعتقاد است۔ آن شہامت
و بسالت مرتبت بہمہ وجوہ خاطر جمع دارند و امیدوار ترقیات روز افزون باشند۔"

اس مکتوب کے لفافہ پر جو مہر ثبت ہے وہ یہ ہے "نظام الملک آصفجاہ بہادر ۱۱۶۶ھ" لفافہ
کے کونے پر "سراج الدولہ" مرقوم ہے جو نواب والاجاہ کا ابتدائی خطاب تھا۔ اس لفافہ پر دفتر والاجاہی
میں یہ شرح کی گئی ہے کہ "دہم ربیع الاول سنہ ۱۱۶۷ھ ورود نمود"

اس مکتوب کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا خط جو بعد انتقال [illegible] وصول ہوا۔ بخشی گری عہدہ حاصل ہونے پر جو خوشی ظاہر کی گئی ہے وہ
خیر اندیشی و دلی اتحاد کے باعث ہے۔ آپ تو تین پشتوں سے رفیق ہیں۔ ہماری ترقی ہمارے رفیقوں
کی ترقی ہے۔ منصب خطاب اور جھالر دار پالکی عطا ہونے کی نسبت آپ نے جو لکھا تھا اس کو بادشاہ
کی خدمت میں عرض کر دیا گیا۔ بادشاہ نے اس کو منظور کر لیا۔ حضرت غفران منزل (نواب غازی الدین خان)
کے زمانہ میں آپ نے جو اخلاص ظاہر کیا اور اب بھی محبت میں جو استقامت ہے وہ دل نقش ہے۔ اس
حسن خدمت اور صداقت کا ایسا معاوضہ عمل میں آئے گا کہ آپ بھی خوش وقت ہوں گے۔ جس ثروت
و اقتدار کی آرزو ہے اس سے زیادہ حاصل ہوگا۔ بزرگوں نے جو بات کہی ہے اس کا پاس رہیگا۔ آپکے
لئے فرمان صادر ہونے اور خلعت وغیرہ مرحمت ہونے کی نسبت بادشاہ کی خدمت میں عرض کر دیا گیا
ہے لیکن ان دنوں یہاں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ اس کی روئداد ایک علحدہ کاغذ پر درج کی گئی ہے۔
اس کی وجہ سے تعمیل نہ ہو سکی۔ عنقریب تعمیل ہوگی۔ اور کرناٹک ترچناپلی وغیرہ کی سند بھی بھیجی جائیگی
بعض امور آپکے کہنے سنے پر چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ وہ آپ کو مطلع کریگا۔ اس کا جواب جلد ارسال کیا جائے۔

انگریزوں کی قدومیت اور کارپردازی کی شہرت بہت سننے میں آئی ہے۔ اگر ان لوگوں کی کسی جماعت کو جو اپنے فن میں ممتاز ہوں یہاں بھیجیں تو باعث خوشنودی ہوگا۔

عماد الملک نے مکتوب کے آخر میں اپنے ہاتھ سے جو عبارت لکھی ہے اس کا یہ مطلب ہے کہ مکتوب الیہ، نواب والاجاہ خاطر جمعی سے اپنے کاروبار انجام دیتے رہیں جو امور ان کے لئے باعث بہبودی ہوں گے۔ وہ عمل میں لائے جائیں گے۔

مکتوب کے ساتھ جو یادداشت منسلک ہے اور جو اوپر نقل کی جاچکی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ابتدا میں صفدر جنگ اور مجھ میں بہت ربط تھا لیکن جب ان کی نکبت کا زمانہ آیا تو انھوں نے یہ چاہا کہ بادشاہ کے ساتھ حرکات ناشایستہ عمل میں لائیں۔ مجھے اس کی اطلاع ہوئی تو میں چاہتا تھا کہ صفدر جنگ متنبہ ہوکر اپنی گستاخی سے باز رہ جائیں۔ ہر چند ان کو سمجھایا گیا انھوں نے نہ مانا۔ اور بڑی فوج کے غرور میں سورج مل جاٹ کو ساتھ لے کر بے ادبی کردی۔ حق نمک کے خیال سے بنیز بزرگوں کے نام کی خاطر مجھے یہ باتیں گوارا نہیں ہوئیں، ارکان سلطنت میں چند تو نامردی سے، چند اپنی عقل کی کمی سے اور بعض نمک حرامی سے، صفدر جنگ سے سازش کرتے رہے۔ خدا پر بھروسہ کرکے جو فوج بھی میرے پاس موجود تھی اس کی مدد سے میں نے مقابلہ ٹھان لیا۔ مخالف لاکھ سوار جمع کر لئے تھے۔ خدا کی مدد سے صفدر جنگ اور جاٹ شکست کھاکر بھاگ کھڑے ہیں ان کا تعاقب کر رہا ہوں۔ کچھ دنوں میں مخالف یا توقتل ہوجائیگا یا قید کر لیا جائیگا۔

ذیل میں جو مکتوب نقل کیا جاتا ہے نہ تو اس پر کوئی تاریخ مرقوم ہے اور نہ لفافہ پر کوئی اندراج لیکن اپنے مطالب کے لحاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکتوب بھی اسی ابتدائی زمانہ کا ہے۔

(۸)

ہو

خان شہامت و بسالت دستگاہ، اخلاص و موالات نشان من۔

خط محبت نمط متضمن تبیین مراتب خلوص و وثوق و خیر اندیشی با عنایت ناجات حضرت اعلیٰ

والغفران کہ مشتمل بر ہزاران ہزار تفضل و عنایات بود رسید۔ مراتب الطاف و افضال آن جناب را محقق و ذہن نشین گردانید۔ چون ما را پیروی جناب بزرگان خصوص حضرت جد امجد و حضرت علیہ الرحمۃ والغفران ہمیشہ منظور و ترقیات و رتبہ افزائی دوستان صادق الاخلاص ملحوظ و مرکوز است تفضل و اشفاقے کہ از جناب حضرت مغفرت منزلت مبذول شدہ بود حالا بفضل الٰہی زیادہ از ان بمنصۂ شہود جلوہ نما خواہد شد و ترقیات دلخواہ خواہید نمود۔ چون از مدت ہا کارہائے ہندوستان ابتر و ہر طرف آتش فساد شعلہ آور است لہذا تنبیہ و تادیب سرکشان بدنہاد و تصفیہ این ملک از خار فساد بر ذمہ ما لازم آمدہ بحول و قوت الٰہی سلطنت رونق تازہ می یابد و استیصال ریشۂ فساد چنانچہ دل می خواہد بعمل می آید۔ اصلوب ہمہ مطالب موقوف بر تبدیل زر پیش کش و ارسال است ہر چند زود برسد بجا و باعث حصول مدعا است۔ برائے خطاب قطب الملک کہ نوشتہ اند این خطاب عبداللہ خان بود و خان مذکور نیک نام نیست بنا بر آن مناسب ندیدیم کہ بہادران صادق و دوستان موافق بچنین خطاب مخاطب شوند۔ بجائے آن خطاب عمدۃ الملک تجویز نمودہ شدہ است و منصب و غیرہ و جاگیر کہ از محال وطن درخواست نمودہ اند متعاقب بدستخط اقدس رسانیدہ فرستادہ می شود۔ بہ جمیع وجوہ خاطر جمع دارند۔ انشاء اللہ تعالیٰ رعایت ہا کہ در مخیلۂ خیال آن موالات نشان نیست جلوہ نمائے ظہور خواہد شد۔ خاطر را مشتاق دانستہ نویسان احوال باشند" (علامت دستخط)

شرح دستخط خاص: "ما را زیادہ از حضرت انار اللہ برہانہ پاس قدامت و حقوق خدمت ملحوظ و منظور است انشاء اللہ تعالیٰ آنچہ رتبہ افزائے و ازدیاد جمعیت و علو مدارج است زیادہ از سابق بعمل می آید۔ خاطر جمع دارند"

لفافہ پر جو مہر ثبت ہے اس میں صرف "وزیر الممالک آصفجاہ نظام" پڑھا جاتا ہے۔ باقی الفاظ محو ہو گئے ہیں۔ ایک دوسرے خط پر یہ مہر ثبت ہے جس میں "وزیر الممالک آصفجاہ نظام الملک بہادر سپہ سالار" صاف صاف پڑھا جاتا ہے۔ ممکن ہے پہلے خط پر بھی یہی مہر ثبت ہو۔ لفافہ پر یہ شرح ہے کہ "جواب نوشتہ شد"

اس مکتوب کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا خط وصول ہوا۔ اس کے ساتھ حضرت علیہ الرحمۃ (نواب غازی الدین خاں) کے خطوط بھی وصول ہوئے (غالباً مکتوب الیہ نواب محمد علی خاں کے موسومہ۔ شاید نقلیں بھیجی ہوں گی) ان خطوط سے واضح ہوا کہ مرحوم کی مہربانی کس قدر آپکے شامل حال تھی۔ مجھے بزرگوں خصوصاً جد امجد (حضرت آصف جاہ) اور حضرت علیہ الرحمتہ (والد۔ غازی الدین خاں) کی پیروی مطلوب ہے۔ دوستوں کی ترقی ہمیشہ پیش نظر رہے گی۔ مدت سے ہندوستان کے کاروبار ابتر ہو چکے ہیں۔ ہر طرف فسا برپا ہے سرکشوں کی تادیب ضرور ہے۔ یہ کام میں نے اپنے ذمہ لیا ہے ان شاء اللہ سلطنت کو نئی رونق حاصل ہوگی۔ تمام ارادوں کی تکمیل پیشکش کے وصول ہونے پر منحصر ہے جس قدر جلد یہ وصول ہو بہتر ہوگا۔ آپنے خواہش کی ہے کہ قطب الملک کا خطاب آپ کو عطا کیا جائے۔ یہ خطاب عبداللہ خاں[1] کو حاصل تھا جو نیک نام نہیں ... دوستوں کے لئے یہ خطاب مناسب نہیں۔ اس کے بجائے عمدۃ الملک کا خطاب تجویز کیا گیا ہے۔ آپ نے اپنے وطن (گوپامو) میں بھی جاگیر کی خواہش ظاہر کی ہے۔ اس بابت میں عنقریب شاہی دستخط کے بعد فرمان نافذ ہوگا۔

غرض صفدر جنگ اور عماد الملک کی جنگ چھ مہینے جاری رہی اور قبل اس کے کہ ملہار راؤ اور جے آپا مدد کو آئیں، صلح ہو گئی لیکن عماد الملک نے ان مرہٹہ سرداروں کے ساتھ سورج مل جاٹ سے مقابلہ کا قصد کیا اور بھرت پور کی جانب یہ تینوں متحد ہو کر روانہ ہوے۔ اس کا قصہ دراز ہے درمیان میں ہولکر نے ساتھ چھوڑ دیا۔ عماد الملک نے بھرت پور کا محاصرہ اٹھا دیا اور دار السلطنت چلے آئے اور یہاں پھر ہولکر کے زور اور صمصام الدولہ میر آتش وغیرہ سے سمجھوتہ کر کے وزارت خود حاصل کر لی۔ عہدۂ امیر الامرائی صمصام الدولہ کو دیدیا گیا۔ وزارت حاصل کر کے دوسرے روز عماد الملک نے احمد شاہ بادشاہ کو ان کی والدہ کے ساتھ قید کر دیا۔ اور عزیز الدین عالمگیر ثانی کو یکشنبہ ۱۰ شعبان ۱۱۶۷ھ کو تخت نشین کیا۔

---

[1] سید حسن علی جن کا خطاب سید عبداللہ خاں بہادر دیار وفادار ظفر جنگ تھا۔ اعظم سادات بارہہ ... محمد فرخ سیر بادشاہ کے وزیر اعظم تھے آصفجاہ سے ان کا اختلاف مشہور ہے ... صفحہ ۱۵۴۔ اور مآثر الامراء جلد سوم صفحہ ۱۳۰ تا صفحہ ۱۴۰

دوسرے ہفتہ میں احمد شاہ اور ان کی والدہ بحالت قید اندھے کر دیئے گئے غرض یہ باتیں بہت طویل ہیں۔

اس زمانہ کے قریب عمادالملک نے جو مکتوب لکھا وہ یہ ہے۔

(۹)

خان شہامت و عوالی پناہ اخلاص و موالات دستگاہ عزیز القدر من۔

بمکاتبت محبت افزا و عرضداشت آن موالات نشان معرفت وکیل رسید و آنچہ بشہامت و عوالی نشان راجہ کیشو راؤ نوشتہ بودند بمطالعہ در آمد۔ انشاء اللہ تعالیٰ جمیع مطالب صورت پذیر می گردد بکار خود مستقل بودہ بارسال نوشتہ جات باید پرداخت جوہر شجاعت و بہادری آن موالات نشان از تنبیہ و تادیب مفاسد مکرر بامتحان رسیدہ از روئے اخبار مفصلاً و مشروحاً معلوم شدہ باعث مزید تفضل و عنایت جناب اقدس و کمال خوشنودی ما گردیدہ او سبحانہ دوستان دولت خواہ را مظفر و منصور و اعدا را منکوب و مقہور دارد۔ ما از کار طلبی و جرارت و بہادری و اخلاص و وثوق آن شہامت و عوالی نشان بسیار محظوظ دائم و قوت بازوئے خود می دانیم ما را متوجہ حال دانسته متواتر نویسان احوال باید بود خطے کہ بشہامت پناہ راجہ کیشو راؤ نوشتہ بودند مکرر بغور مطالعہ در آمد از نوشتہ راجہ مشار الیہ توجہ ما معلوم خواہد شد"

شرح بخط خاص "آن عزیز القدر را رفیق دلسوز و بہادر و قوت بازو می دانیم و برائے ترقیات سعی موفورہ مبذول داریم مطالب و مدعائے آن موالات نشان جلوہ نمائے ظہور می شود"

لفافہ پر لکھا ہے کہ "سراج الدولہ بہادر شہامت جنگ ۱۰ محرم سنہ احد" دفتر والا جاہی میں لفافہ پر یہ شرح لکھی گئی ہے کہ ۱۹ ربیع الاول ۱۱۶۸ھ ورود نمود۔ جواب نوشتہ شد"

اس مکتوب کا مطلب یہ ہے کہ وکیل کے توسط سے خطوط وصول ہوئے اور عرضداشت بھی پہنچی نیز راجہ کیشو راؤ کو جو مطالب لکھے وہ بھی معلوم ہوئے۔ آپ کے سب مطالب پورے ہوں گے۔ اپنے کاروبار میں مصروف رہیں۔ آپ کے جوہر شجاعت کا مکرر امتحان ہو چکا ہے۔ بادشاہ کی اور ہمار مزید خوشنودی کا باعث ہوا۔ خدا آپ کو فتح مند رکھے ہم آپ کو قوت بازو سمجھتے ہیں۔ راجہ کیشو راؤ آپ کو خط لکھیں تو اس سے ہماری توجہ کا حال معلوم ہوگا۔

شرح دستخط خاص کا مطلب یہ ہے کہ آپ جیسے عزیز کو رفیق اور قوت بازو سمجھتا ہوں۔ آپ کی ترقی کے لئے ساعی ہوں۔ آپ کا مدعا پورا ہوگا۔

غرض نواب عماد الملک اپنی ہر کوشش میں ناکام ہوئے۔ خود بھی تباہ حال ہوگئے اور سلطنت بھی کمزور ہوگئی۔ احمد شاہ ابدالی سے مقابلہ کی قوت نہیں رہی۔ پہلے سورج مل جاٹ کے پاس پناہ لی۔ پھر فرخ آباد میں احمد خاں بنگش کے پاس مقیم ہوکر سنہ ۱۱۸۰ھ میں دکن آئے مرہٹوں نے بسر اوقات کے لئے مالوہ میں چند دیہات سپرد کئے چونکہ بادشاہ سے اطمینان نہیں تھا۔ اس لئے سورت میں انگریزوں سے مل ملاکر وقت گزارتے تھے۔ مآثر الامرا میں لکھا ہے کہ:۔

”درین ولا سوار جہاز شدہ عازم بیت اللہ گردید“

نہ معلوم حجاز سے واپس آئے یا نہیں حقیقی تاریخ روانگی کا علم نہ ہوسکا۔ البتہ سنہ ۱۱۹۰ھ میں غوثی نواب والاجاہ کو ایک خط جو لکھا وہ محفوظ ہے۔ وہ یہ ہے:۔

ہو المستعان (۱۰)

امارت و ایالت منزلت حشمت و شوکت مرتبت رکن السلطنۃ العظمیٰ عضد الخلافۃ الکبریٰ برادر سامی المکان عزیز القدر سلمہ اللہ تعالیٰ۔

برخوردار منعم الدولہ سید محمد خان بہادر راتزد آن امارت مرتبت روانہ نمودہ شد۔ مذکورات زبانی ایشان مفصل بدریافت خواہد رسید۔ ازانجا کہ قرابت قریب این جانب اند ہر قدر سلوک کہ نسبت باتیان بعمل می آرند بجا و تحسن و موجب خوشی ہا خواہد بود۔ ہمیشہ باطلاع خیریت ہا مسرور باید داشت۔“

لفافہ پر مہر ”وزیر الممالک آصف جاہ نظام الملک بہادر سپہ سالار“ ثبت ہے۔

دفتر والاجاہی میں یہ شرح لکھی گئی ہے کہ ”خط نواب غازی الدین خاں بہادر ۲ امر ذی قعدہ سنہ ۱۱۹۰ھ معہ سید محمد خاں رسیدہ“۔

اس خط کا مطلب یہ ہے کہ منعم الدولہ سید محمد خاں بہادر آپ کے پاس آتے ہیں۔ ان کے ساتھ مناسب سلوک کیا جائے۔

اس خط کی ظاہری ہیئت سے صاف ظاہر ہے کہ اقتدار و اختیار ہاتھ سے نکل چکا ہے

صاحب مآثر الامراء نے صراحت کی ہے کہ

"با حفظ کلام الہی و تحصیل علوم و مشق خط را درست ساختہ و جوہر ہمت و شجاعت را باہم بر آمیختہ شعر می گوید"

یہ حالات مآثر الامراء جلد ۲ صفحات ۲۴۸ تا ۲۵۵ سے ماخوذ ہیں۔

انجمن طیلسانین عثمانیہ کی مطبوعات

۱۔ علی ابراہیم عادل شاہ ثانی کے متولیاں، ریاست عادل شاہی دور تولیت کی بسیط اور محققانہ تاریخ مولفہ سید علی محسن صاحب ایم اے (عثمانیہ)۔ قیمت (عہ)

۲۔ سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی مفصل محققانہ اور مستند تاریخ۔ مولفہ ظہیر الدین صاحب ایم اے (عثمانیہ) قیمت (۱عہ)

۳۔ امام غزالی کی کلامی خصوصیات مولفہ محمد غوث صاحب (خیبر نگری) ایم اے (عثمانیہ) قیمت (۱عہ)

۴۔ موضع ودیار کی معاشی تحقیق۔ مولفہ محمد ناصر علی صاحب ایم اے (عثمانیہ) قیمت (عـہ)

۵۔ دربار اودھ کا اثر لکھنؤ کی شاعری پر۔ مولفہ محمد اعظم خان صاحب (عثمانیہ) قیمت (عہ)

اراکین انجمن اور خریداران مجلہ طیلسانین عثمانیہ سے نصف قیمت

کتب فروشوں کے ساتھ خاص رعایت بغرض سہولت کتابیں

تبادلہ میں بھی دی جاتی ہیں

ملنے کے پتے

(۱) دفتر مجلہ طیلسانین و انجمن طیلسانین عثمانیہ حیدرآباد دکن نظام شاہی روڈ

(۲) مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

معاصروں کے صفحے

۱۔ نواب ناصر جنگ شہید اور نواب مظفر جنگ مرحوم۔

مدراس سے ایک چہار ماہی مجلہ "جرنل آف انڈین ہسٹری" کے نام سے مشہور مورخ دیوان بہادر یس کرشنا سوامی اینگار کی ادارت میں شایع ہوتا ہے۔ اس کی اشاعت بابتہ ماہ اپریل سنہ ۱۹۴۳ء میں ڈاکٹر راگھوان ام۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کا ایک مضمون "ناصر جنگ بمقابلہ مظفر جنگ" کے عنوان سے شایع ہوا ہے اس مضمون کی تلخیص نامناسب نہیں۔

مضمون نگار نے واضح کیا ہے کہ نواب ناصر جنگ اور نواب مظفر جنگ دونوں کی باہمی آویزش کو تاریخی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن اس آویزش کے متعلق کافی مواد مہیا نہیں ہے اس آویزش کی پوری تفصیلات سے عام طور سے لاعلمی پھیلی ہوئی ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر راگھوان نے انندا رنگا پلے کے حالات زندگی پر سنسکرت میں لکھی ہوئی ایک نظم کی مدد سے اس باہمی آویزش کے اصلی سبب کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نظم کو ان دنوں ڈاکٹر راگھوان مرتب کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر راگھوان نے دعوی کیا ہے کہ باہمی آویزش کا یہ سبب کسی فارسی ماخذ میں متعین نہیں کیا گیا ہے۔ تزک والاجاہی کے انگریزی ترجمہ کے متعلقہ حصہ کا خلاصہ درج کر کے یہ وضاحت کی گئی ہے کہ اس بیان سے وجہ نزاع کا کوئی علم حاصل نہیں ہوتا سوا اس کے کہ نزاع پیدا ہونے کے بعد جو واقعات ظاہر ہوئے ان کی صراحت ہوتی ہے۔

انگریز مورخوں مثلاً آرم گریبل، برگس، اور فریزر کے بیانات کو نقل کر کے مضمون نگار نے وضاحت کی ہے کہ ان بیانات سے اصلی وجہ نزاع کا علم نہیں ہوتا۔ ان مورخوں نے صرف یہ لکھا ہے کہ آصف جاہ کے انتقال پر ناصر جنگ اور مظفر جنگ ہر ایک نے اس بات کو شہرت دی کہ ان

لئے ہی آصف جاہ نے وصیت کی ہے۔

ڈاکٹر راگھوان نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ مملکت دکن حاصل کرنے کی خواہش خود وجہ نزاع بن سکتی ہے لیکن یہ اصلی اور حقیقی سبب نہیں تھا۔ اصلی سبب دونوں کے ابتدائی روابط اور باہمی تعلقات میں پنہاں ہے۔

بعد ازاں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ ۱۷۴۱ء میں آصفجاہ جب دہلی سے دکن واپس آئے تو ناصر جنگ کو اپنا مخالف پایا۔ ناصر جنگ نے گفت و شنید سے مخالفت چھوڑ دی اور فقیری گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ لیکن فتح یاب خاں نے بیٹے کو باپ کے خلاف ابھارا اور جس وقت آصفجاہ اورنگ آباد میں مقیم تھے فتح یاب خاں نے مولہیر کے قلعہ پر قبضہ کرلیا۔ یہ قلعہ اس وقت متوسل خاں کی تحویل میں تھا۔ متوسل خاں آصف جاہ کے داماد اور مظفر جنگ کے والد تھے۔

مولہیر کے قلعہ پر قبضہ کرکے فتح یاب خاں نے ناصر جنگ کو جنگ پر آمادہ کرلیا۔ میدان جنگ میں متوسل خاں اپنی تیر سے ناصر جنگ کو نشانہ بنانا چاہتے تھے لیکن مظفر جنگ جو ایک ہی ہاتھی پر اپنے والد کے ساتھ موجود تھے اپنے والد کا ہاتھ پکڑ لیا اور ماموں کی جان بچا دی لیکن یہ بھی ایک عجیب ماجرا ہے کہ ایک مرتبہ یہی جان بچانے والا دوسرے وقت جان ستانی کا ذریعہ ہو جاتا ہے۔

بعد ازاں ڈاکٹر راگھوان نے یہ صراحت کی ہے کہ موجودہ ماخذوں کی رو سے اس سے زیادہ کوئی اطلاع حاصل نہیں ہوتی سوا اس کے کہ یہ قیاس قائم کیا جائے کہ ناصر جنگ اس لڑائی کی وجہ سے متوسل خاں سے عناد رکھتے ہوں اور آصف جاہ نے ناصر جنگ کی اس بے ادبی کی وجہ سے تو اس سے کچھ زیادہ لطف وعنایت کا برتاؤ کیا ہو۔ آصف جاہ نے مظفر جنگ کو بیجاپور اور ادھونی کی صوبہ داری کس وقت اور کن حالات میں عطا کی اس کے متعلق ڈاکٹر راگھوان نے لکھا ہے کہ انھیں کوئی اطلاع نہیں ہے۔ نیز اس واقعہ کے بعد متوسل خاں کے دوسرے حالات اور سرگرمیوں کے متعلق بھی معلومات حاصل نہیں ہیں۔

البتہ ایک سنسکرت شاعر کی نظم سے کچھ حوالہ ملتا ہے۔ اس نظم کا موضوع یا نام "آنندا رنگا کا پوسر کالی داسا" ہے۔ یہ نظم شاعر نے اپنے ممدوح انندا رنگا پلے کے حالات اور توصیف

میں لکھی ہے ۔ انند ارنگا پلے پانڈی چری کے دوبہاشی تھے ۔ انھوں نے اپنے زمانہ کے حالات ایک ڈائری میں قلم بند کئے ہیں جس کا انگریزی ترجمہ مدراس سے کئی جلدوں میں شائع ہو چکا ہے غرض اس نظم کے چھٹے باب میں اس وقت کے سیاسی حالات کا بھی تذکرہ آگیا ہے بہ سبیل تذکرہ مظفر جنگ کے حالات بھی واضح کئے ہیں اور مظفر جنگ کو مخاطب کر کے یہ لکھا ہے کہ ناصر جنگ کو آپ کے ماموں تھے لیکن آپکے والد کے بے رحم قاتل بھی تھے ۔

ڈاکٹر راگھوان نے لکھا ہے کہ بد قسمتی سے اس سنسکرت نظم میں واقعہ کی مزید تفصیلات بیان نہیں کی ہیں لیکن انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس نظم سے ہمیں پہلی مرتبہ اس امر کا علم ہوا کہ ناصر جنگ نے اپنے بہنوئی متوسل خاں کو مروا دیا تھا ۔ ناصر جنگ کو متوسل خاں سے عداوت پیدا ہو چکی تھی اس لئے ان کا فعل قدرتی سمجھا جانا چاہیئے ۔ باپ کے مارے جانے پر مظفر جنگ لامحالہ ماموں سے برگشتہ ہو گئے اور بدلہ لینے کے لئے موقع کی تلاش میں رہے ۔ اور جب موقع ملا بدلہ لے لیا ۔

---

(۲) کرناٹک کی تاریخ (۱۷۴۹ء تا ۱۷۵۵ء) کے متعلق چند کاغذات

اس مجلہ کے شمارہ ۳ ، ۴ جلد ۲ میں "چند فرامین بادشاہان دہلی موسومہ روسائے دکن وغیرہ" کے عنوان سے کتب خانۂ سعیدیہ کے ایک مخطوطہ کو متعارف کیا گیا ہے ۔ اس مخطوطہ کے متعلق ظاہر کیا گیا تھا کہ :-

"اس مجموعہ میں ایسے مکاتیب فراہم کئے گئے ہیں جن کے اصل نظر سے اوجھل نہ معلوم کہاں مخزون ہیں ...... اس مجموعہ کے مکاتیب کا بڑا حصہ تاریخ مملکت آصفیہ سے متعلق ہے اور اس زمانہ سے متعلق کہ جس کے واقعات وحالات پر تاریکی چھائی ہوئی ہے ۔"

غرض یہ بات واضح کی گئی تھی کہ اس مجموعہ میں ایسے مکاتیب بھی شامل ہیں جو نواب ناصر جنگ شہید کی پیشگاہ سے نواب محمد علی خاں والاجاہ نواب کرناٹک کے نام اس وقت صادر ہوئے جبکہ حضرت شہید جانب کرناٹک نواب مظفر جنگ کے مقابلہ کے لئے راہ سپار تھے ۔ نیز دوسرے

جو مکاتیب و فرامین شامل ہیں وہ بھی اسی زمانے کے حالات پر محتوی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے متعدد مجموعے اس زمانہ میں نہ صرف مرتب ہوئے بلکہ ان کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا گیا۔ مکاتیب کے ایک ایسے انگریزی ترجمہ کا حال ذیل میں واضح کیا جاتا ہے۔

اسلامک کلچر کی اشاعت بابتہ جنوری ۱۹۴۳ء میں ڈاکٹر اے۔ جی۔ پاوار کا ایک مضمون کرناٹک کی تاریخ (۱۷۴۹ء تا ۱۷۵۵ء) سے متعلق کاغذات کے موضوع پر شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں مضمون نگار نے برٹش میوزیم کے ایک مخطوطہ کو متعارف کیا ہے۔ اس مخطوطہ کو فہرست نگار نے سرکاری ہندوستانی مراسلت کے طور سے نمایاں کیا ہے۔ اس مخطوطہ میں دوسرے کاغذات کے علاوہ چند خطوط ایسے بھی شامل ہیں جن سے ۱۷۴۹ء اور زمانہ مابعد کے تاریخی حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ مضمون نگار نے صراحت کی ہے کہ یہ اصلی خطوط نہیں ہیں بلکہ اصلی خطوط کا انگریزی ترجمہ۔ ترجمہ میں مترجم سے غلطیاں ضرور سرزد ہوئی ہیں۔ لیکن کوئی شبہ نہیں کہ خود مترجم اور مخطوطہ کے مالک کو ان خطوط کی اہمیت کا علم تھا۔

یہ خطوط زیادہ تر محمد علی خاں والاجاہ نواب ارکاٹ کے موسومہ ہیں یا انھوں نے دوسروں کو لکھے ہیں۔

مضمون نگار نے واضح کیا ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا کے مطبوعات سے جو رکارڈ آفس نے شائع کئے اور نیز پانڈیچری کی ہسٹاریکل سوسائٹی کے مطبوعات سے بہت کچھ نئے معلومات حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن اس زمانہ کی باہمی مراسلت سے اصلی کاغذات دستیاب نہیں ہوتے۔[۱] مضمون نگار نے یہ ضرورت جتائی ہے کہ اس زمانہ کی مراسلت کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر فراہم کرنا چاہیئے۔

اس تمہید کے بعد خطوط کا انگریزی ترجمہ نقل کیا گیا ہے۔ اور ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ ناصر جنگ کا خط موسومہ محمد علی خان والاجاہ ۔ ۲۰۔ رمضان ۱۱۶۱ھ ۔[۲]

---

[۱] کتب خانہ سعیدیہ حیدرآباد میں ایسے کچھ کاغذات ضرور موجود ہیں۔

[۲] یہ مضمون نگار نے صراحت کی ہے کہ یہ سنہ دراصل ۱۱۶۳ھ ہونا چاہیئے۔ جہر کن نے غلطی کی ہوگی۔

محمد علی خاں والاجاہ کے والد نواب انورالدین خان کے آمبور میں مارے جانے کے بعد یہ عنایت نامہ صادر ہوا۔ اس امر پر افسوس کہ نواب انورالدین خان نے مقابلہ میں جلدی کی۔ شاہ نواز خاں اور عبدالغنی خاں کے مدد کے لئے آنے کا انتظار نہیں کیا۔ دلاسا اور صبر کی تلقین۔

۲۔ عنایت نامہ ناصر جنگ کی جانب سے محمد علی خاں والاجاہ کے نام۔

خطوط پہونچنے کا تذکرہ اور خود کے جلد تر کرناٹک آنے کی اطلاع۔

۳۔ عنایت نامہ ناصر جنگ کی جانب سے محمد علی خان والاجاہ کے نام۔

دریائے تنگبھدرا پر پہونچنے کی اطلاع[۱] اور مرارراؤ، مانوجی اور جسونت سے ملنے کے انتظار کا تذکرہ۔

۴۔ ناصر جنگ کا عنایت نامہ جو دو بیٹے کے نام صادر ہوا۔ نواب مظفر جنگ کی تائید واعانت پر تہدید

۵۔ ناصر جنگ کا خط محمد علی خاں والاجاہ کے نام۔ والکنڈہ کے قلعہ کی تسخیر پر مسرت کا اظہار اور دہلی کو نوازشات کیلئے سفارش کا تذکرہ۔ (۶) احمد شاہ کا فرمان بنام محمد علی خاں والاجاہ۔ نواب غازی الدین خاں فیروز جنگ کو صوبہ دار دکن مقرر کرنے کا تذکرہ اور اعانت کا حکم۔ (۷) محمد علی خاں والاجاہ کا خط پرتاب سنگھ تنجاور کے راجہ کے نام۔ امداد واعانت کی استدعا۔ (۸) عالمگیر ثانی کا فرمان محمد علی خاں والاجاہ کے نام۔ نواب محمد علی خان کو ارکاٹ اور ترچناپلی کی دیوانی اور فوجداری عطا ہونے کا حکم۔ (۹) نواب غازی الدین خاں فیروز جنگ ثالث (عماد الملک) کا خط محمد علیخاں والاجاہ کے نام مورخہ ۲۰۔ ذیقعدہ سنہ ۱ جلوس خود کو وزارت حاصل ہونے اور محمد علی خاں کے نام شاہی فرمان حاصل کرنے کا تذکرہ۔ (۱۰) نواب صلابت جنگ کا خط موسومہ محمد علی خاں مورخہ ۱۴۔ ذیقعدہ سنہ ۱۱۶۸ھ کا جس میں اپنی مہربانی اور لطف کا اظہار کیا ہے۔ (۱۱) نواب محمد علی خان کا خط اپنے والد کے دیوان اسد خاں کے نام۔ اپنی کامیابی اور انگریزوں سے تائید واعانت حاصل ہونے کا حال۔

---

[۱] دریائے تنگبھدرا پر نواب ناصر جنگ کس تاریخ کو پہنچے۔ اس کے متعلق مضمون نگار نے بہت قیاس آرائی کی ہے کیونکہ خط میں تاریخ درج نہیں۔ کتب خانۂ سعیدیہ میں راجہ تنجاور کے موسومہ خطوط جو موجود ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نواب ناصر جنگ نے ۹ محرم سنہ ۱۱۶۳ھ کو دریائے کرشنا اور ۱۶۔ محرم سنہ ۱۱۶۳ھ کو دریائے تنگبھدرا عبور کیا۔

یہ خطوط رسالۂ معارف اعظم گڈھ جلد ۱۳ نمبر ۶ میں شایع کر دیئے گئے ہیں۔

جامعاتی معلومات

مندرجۂ ذیل معلومات اور اطلاعیں ہر جامعہ کی رپورٹ یا دوسری مطبوعات سے ماخوذ ہیں۔ ہندوستان کی اکثر جامعات نے براہ کرم یہ انتظام کیا ہے کہ ان کی رپورٹ اور دوسری رویدادیں وغیرہ بالالتزام مجلّہ کے دفتر پر وصول ہوا کریں۔

لکھنؤ کی جامعہ کے شعبۂ تاریخ کے استاذ ڈاکٹر ایس۔ کے بانرجی نے ہمایوں پر تحقیقات کے سلسلہ میں لندن کی جامعہ سے ڈی، لٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔

حکومت ہند نے لکھنؤ کی جامعہ کو ۱۰۰۰ اس غرض سے عطیہ دئے ہیں کہ ڈاکٹر ڈی، ان موجم دار کی تالیف جس کا موضوع انسانیاتی جائزہ (سروے) ہے، شائع کی جائے۔

انڈین ریسرچ فنڈ اسوسئشن نے لکھنؤ کی جامعہ کے ایک طبی طیلسانی کو ماہانہ ماہ ۵۰ کا وظیفہ دو سال کے لئے بعض ادویات کے خواص کی تحقیقات کے لئے عطا کیا ہے۔

صوبجات متحدہ کی حکومت نے ڈاکٹر کے، ان یہال پروفیسر حیوانیات کے لئے باغراض ریسرچ ایک مددگار کا تقرر منظور کیا ہے۔

ڈاکٹر آر، کے کرجی لکھنؤ کی جامعہ کے پروفیسر تاریخ نے چندر گپت موریہ پر ایک ضخیم کتاب تالیف کی ہے جو عنقریب شائع ہوگی۔ انھوں نے ایک اور تالیف کتبات اشوک پر مرتب کرلی ہے۔

راد ہا کمال کرجی پروفیسر معاشیات جامعۂ لکھنؤ کی ایک تالیف جس کا موضوع معاشیات آبادی ہے لانگ من گرین کمپنی نے شائع کی ہے۔

ڈاکٹر ان، ان، سن گپتا پروفیسر فلسفہ جامعۂ لکھنؤ کی ایک تالیف جس کا موضوع ذہنی ترقی

اور زوال ہے کتابستان الہ آباد نے شائع کی ہے۔

۱۹۴۲ء میں لکھنو کی جامعہ میں شعبۂ فنون کے پانچ طلبہ نے پی۔ ایچ ڈی کے امتحان کے لئے اپنے مقالے پیش کئے جو سب منظور ہو گئے۔ ان مقالوں کے موضوع حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ گاندھی جی کا فلسفۂ سیاسیات۔ ۲۔ شمالی ہند میں زراعتی مزدوروں کے حالات۔ ۳۔ افیون، ہندوستان اور مجلس اقوام۔ ۴۔ صوبہ جاتی خود اختیاری اور صوبہ جات متحدہ میں اس کا عمل۔ ۵۔ شمالی ہند کے اقوام جرائم پیشہ کے معاشرتی اور معاشی حالات۔

۱۹۴۲ء میں لکھنو کی جامعہ میں شعبۂ سائنس کے دو طلبہ نے پی۔ ایچ ڈی کے امتحان کے لئے اپنے مقالے پیش کئے۔ یہ دونوں مقالے منظور ہو گئے۔ ان دونوں مقالوں کے موضوع یہ تھے:۔

۱۔ محلولوں میں ضیا کیمیائی تعاملات۔ ۲۔ ضیا کیمیائی مظہر اپنے اثر کے بعد۔

۲۔ Stingray Trygon کی تشریح۔

کلکتہ کی جامعہ نے حال میں سنسکرت کے ادب کے سلسلے میں دو نئے کام شروع کئے ہیں ۱۔ کالی داس کی تالیفات میں سنسکرت اور پراکرت الفاظ کا توافق۔

۲۔ ہندوستان کے فلسفہ کی اصطلاحات کی ترتیب بطور ایک لغت کے۔ یہ کام سنسکرت اور پالی کے شعبوں کی مدد اور تعاون سے انجام پائے گا۔ اولاً یہ کام خود سنسکرت میں انجام پائے گا۔ بعد ازاں انگریزی میں ترجمہ ہوگا۔ اس تالیف کی سات جلدیں ہوں گی۔ ایک جلد کے بعد دوسری جلد شائع ہوگی۔ دوسری جامعات کے صاحبانِ علم سے بھی اس کام میں مدد لی جائے گی۔

ٹراونکور کی جامعہ سے ملحق ایک تحقیقاتی ادارہ "ٹراونکور سنٹرل ریسرچ انسٹیوٹ" کے نام سے قایم ہے۔ اس ادارہ کے توسط سے ایسے امور کی تحقیقات عمل میں لائی جاتی ہے جو ٹراونکور کی صنعتی اور زراعتی ترقی کے لئے مفید ہیں۔ جو امور زیرِ تحقیقات ہیں ان کی

تفصیل مجلہ کے گزشتہ شمارے میں بیان کی جاچکی ہے۔ حالیہ رپورٹ سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ تحقیقاتی مراحل کامیابی کے ساتھ طے ہو رہے ہیں۔ اور جو نتائج ظاہر ہوئے ہیں ان کو مقامی زراعتی اور صنعتی کاروبار میں کامیابی کے ساتھ اختیار کیا جا رہا ہے۔

ٹراونکور کی جامعہ کے شعبۂ سائنس میں ۱۱ طالب علم پی۔ ایچ ڈی کے امتحان کی تیاری کر رہے ہیں۔ ان میں سے ۳ طالب علم ٹراونکور کی معدنیات پر ۲ طالب علم۔ طبی جڑی بوٹیوں اور ۲ طالب علم نباتاتی مسائل پر مصروفِ تحقیقات ہیں۔ شعبۂ فنون میں ۶ طالب علم پی۔ ایچ ڈی کیلئے کام کر رہے ہیں۔ ان کے تحقیقات کے موضوع سب ٹراونکور سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ یہ ہیں:-

۱۔ کرالا کی تاریخ۔ ۲۔ ٹراونکور کی مالیاتی ترقی ۱۸۱۶ء سے۔ ۳۔ ٹراونکور میں تجارت اور صنعت کی ترقی۔ ۴۔ کرالا کے فنونِ لطیفہ اور ادب۔ ۵۔ ٹراونکور کے مسائل حمل و نقل۔ ۶۔ ٹراونکور کی تجارت خارجہ۔

علی گڈھ کی مسلم یونیورسٹی نے عربی میں پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری پہلی مرتبہ یس ایم یوسف کو عطا کی۔ ان کے مقالہ کا موضوع ابو مہلب کے سوانح حیات تھا۔

اسی یونیورسٹی کے شعبۂ حیوانیات میں ٹینشکر کے روگ پر تحقیقات جاری ہے۔

کلکتہ کی جامعہ نے اپنے ملحقہ کلیات کو اپنے کام میں ترقی کی اجازت دینے کا سلسلہ برابر جاری رکھا ہے۔ ابھی حال میں اس نے متعدد کلیات کو نئی جماعتوں کے قیام کی اجازت دی ہے چند حسب ذیل ہیں:-

۱۔ وکٹوریہ انسٹیٹیوشن کلکتہ کو بنگالی میں بی۔ اے آنرز کی جماعت کے لئے۔ ۲۔ لیڈی برابورن کالج کو عربی، فارسی، تاریخ، سیاسیات اور معاشیات میں بی۔ اے آنرز کی جماعتوں کے لئے اور جغرافیہ میں بی۔ اے پاس کی جماعت کے لئے۔ ۳۔ کرشنا نگر کالج کو سیاسیات میں بی۔ اے آنرز کی جماعت کے لئے۔

مرکزی مقننہ میں ابھی حال ہی دہلی کی جامعہ کے قانون میں متعدد دوررس ترمیمات عمل میں آئی ہیں۔ چنانچہ آیندہ بی۔ اے کی ڈگری کے لئے بجائے دو سال کے تین سال کی مدت کا نصاب مقرر ہوگا۔ انٹرمیڈیٹ کا امتحان موقوف کردیا جائے گا۔ البتہ فوقانی تعلیم ایک سال کا مزید اضافہ کیا جائے گا۔ دوسری اہم ترمیم یہ ہے کہ آیندہ وائس چانسلر تنخواہ یاب مقرر کیا جائے گا۔

لکھنؤ کی جامعہ کی جانب سے شعبۂ تاریخ کے ام۔ اے کے طلبہ کے لئے ایک تعلیمی سیاحت کا انتظام کیا جاتا ہے، اس کے مصارف کے سلسلہ میں جامعہ کی جانب سے سات سو روپے منظور کئے جاتے ہیں۔

ٹراونکور کی جامعہ میں کلیۂ فنون اور کلیۂ سائنس دونوں کا انضمام عمل میں آیا ہے۔ اور نئے کلیہ کا نام "ہز ہائنس دی مہاراجہ یونیورسٹی کالج" قرار دیا گیا ہے۔

ٹراونکور کی کلیات میں داخلہ کے لئے طلبہ کے لئے یہ امر لازم قرار دیا گیا ہے کہ اپنی درخواستوں کے ساتھ طبی معاینہ کا صداقت نامہ بھی پیش کریں۔

ٹراونکور کی جامعہ میں مختلف علوم وفنون کی اصطلاحات ملیالم زبان میں وضع کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ چنانچہ نباتیات کے اصطلاحات کا مجموعہ طباعت کے لئے تیار ہوگیا ہے۔ حیوانیات، عمرانیات اور تعلیم کے اصطلاحات کے سلسلہ میں کام جاری ہے۔

ٹراونکور کی جامعہ نے اپنے شعبۂ طبیعیات وکیمیا کی عمارتیں مکمل کرلی ہیں۔

سنہ ۱۹۴۴ئ میں علی گڈھ کی مسلم یونیورسٹی کو دس ہزار یا اس سے زیادہ عطیات جو وصول ہوئے اس کی تفصیل یہ ہے:۔ اعلیحضرت خسرو دکن مدظلہ العالی نے یونیورسٹی کی جنگی کوششوں کے لئے پندرہ ہزار روپے کی امداد یکمشت عطا فرمائی، نیز دس ہزار روپے ماہوار سالانہ طور سے منظور فرمائے۔ سر سید عبدالرؤف نے ایک دارالاقامہ کی تعمیر کے لئے پچاس ہزار روپے عطا کئے۔ اور عبداللہ یوسف علی صاحب نے بھی دارالاقامہ کی تعمیر

۱۴ ہزار روپے عطا کئے۔ نواب صاحب رام پور نے انجینیرنگ کالج کے لئے تین ہزار چھ سو روپے کی متواتی امداد منظور کی ہے۔ نواب ظہیر یار جنگ بہادر امیر پائیگاہ نے ۸ وظائف فی وظیفہ پندرہ روپے کے حساب سے عطا کئے ہیں۔

ٹراونکور کی جامعہ کے تعلق سے ایک ادارہ "ٹراونکور یونیورسٹی مسلم وقف کمیٹی" کے نام سے قایم کیا گیا ہے۔ اس نے ۲۸ ہزار روپے کی رقم اس غرض سے وقف کرنے کا ارادہ کیا ہے کہ اس سے جامعہ میں اسلامیات کے متعلق درس وتدریس کا شوق دلایا جائے۔

لکھنو کی جامعہ میں قانونی کتب کی خریدی کے لئے ۸۰۰ روپے کے عطیات حاصل ہوئے جسٹس باجپائی نے ال ، ال ایم کے امتحان کی ممتحنی کے معاوضہ کی رقم ۸۵ روپے اس مد میں ادا کی۔

علی گڈہ کی جامعہ میں سنہ ۱۹۴۲ء کے دوران میں ۲۳۸۴ طلبہ شریک تھے۔ ان کے من جملہ پی ، ایچ ڈی کی جماعت میں ۲۶ طلبہ شریک تھے۔

لکھنو کی جامعہ میں سنہ ۱۹۴۲ء کے دوران میں ۲۴۹۱ طلبہ شریک تھے۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں ۲۵۰۰ طلبہ شریک تھے اس طرح ۹ طلبا کی کمی ہوئی۔

ٹراونکور کی جامعہ میں سنہ ۱۹۴۱-۴۲ء کے دوران میں ۳۸۳۶ طلبہ شریک تھے، ان کے من جملہ ۶۷۵ خواتین ہیں۔ سالِ ماقبل میں طلبہ کی تعداد ۳۶۱۱ تھی۔

کلکتہ کی جامعہ کے امتحان میٹرک بابتہ سنہ ۱۹۴۳ء میں جو طلبہ شریک ہوئے ان کی تعداد ۳۸ ہزار ۳ سو ۶۲ تھی۔ جو طلبہ کامیاب ہوئے ان کی تعداد ۲۲ ہزار ۷ سو ۴۷ ہے۔ ۸۴۱۲ طلبہ درجۂ اول میں کامیاب ہوئے۔ ۶۴۹۴ طلبہ درجۂ دوم میں کامیاب ہوئے۔ باقی درجۂ سوم میں۔ کامیابی کا اوسط ۵۹،۴ فی صد رہا۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں یہ تناسب ۶۲،۵ فی صد تھا۔

ٹراونکور کی جامعہ کے امتحانات بابتہ سنہ ۱۹۴۲ء کے نتائج کا حال حسب ذیل ہے:۔

امتحان	شریک	کامیاب	فی صد	امتحان	شریک	کامیاب	فی صد
انٹر	۹۷۵	۴۲۵	۴۳.۶	بی اے حصۂ اول	۲۲۲	۱۳۸	۶۲،۱
بی اے حصۂ دوم	۱۹۱	۱۶۲	۸۴.۸	بی اے حصۂ سوم	۱۸۷	۱۳۷	۷۳،۳

امتحان	شریک	کامیاب	فی صد	امتحان	شریک	کامیاب	فی صد
بی، ایس سی حصہ اول	۳۰۳	۱۸۰	۵۹٫۴	بی، ایس سی حصہ دوم	۲۵۲	۲۱۹	۶۸٫۴
بی، ایس سی حصہ سوم	۲۷۵	۱۸۸	۶۸٫۴	بی، اے آنرز	۲۱	۲۰	۹۵٫۲
بی، ایس سی آنرز	۶	۶	۱۰۰٫۰	ام، اے	۸	۷	۸۷٫۵
ام، ایس سی	۲	۲	۱۰۰٫۰	بی، ال ابتدائی	۱۲۵	۷۸	۶۲٫۴
بی، ال آخری	۷۴	۴۲	۵۶٫۸	ال، ٹی	۹۹	۷۸	۷۸٫۸

لکھنو کی جامعہ کے امتحانات بابتہ سنہ ۱۹۴۲ء کے نتائج کا حال حسب ذیل ہے :-

امتحان	شریک	کامیاب	امتحان	شریک	کامیاب
بی، اے	۳۳۳	۲۳۵	بی، اے آنرز	۹۲	۸۴
ام، اے	۲۱۰	۲۰۸	ام، ایس سی حصہ دوم	۴۹	۴۰
ام، ایس سی حصہ اول	۵۶	۴۹	بی، ایس سی	۹۱	۵۹
بی، ایس سی آنرز	۷	۵			

علی گڈہ کی مسلم یونیورسٹی کے امتحانات بابتہ سنہ ۱۹۴۲ء کے نتائج کا حال یہ ہے :-

امتحان	شریک	کامیاب	تناسب فی صدی	امتحان	شریک	کامیاب	تناسب فی صدی
ام، اے آخری	۱۳۹	۱۲۷	۹۱٫۴	ام، ایس سی آخری	۲۳	۲۳	۱۰۰٫۰
ام، اے ابتدائی	۱۸۹	۱۵۱	۸۰٫۰	ام، ایس سی ابتدائی	۲۵	۲۷	۷۷٫۱
بی، اے آنرز	۹	۸	۸۸٫۹	بی، اے	۲۶۲	۱۹۹	۷۶٫۰
بی، ایس سی	۷۱	۵۳	۷۴٫۶	انٹرمیڈیٹ فنون	۲۴۲	۱۲۴	۶۷٫۸
انٹرمیڈیٹ سائنس	۲۱۳	۱۳۱	۵۶٫۷	ہائی اسکول	۴۱۳	۲۵۱	۶۰٫۸
بی، ٹی	۸۱	۸۰	۹۸٫۸	ال، ال بی ابتدائی	۱۸۸	۱۱۶	۶۱٫۷
ال، ال بی آخری	۱۲۵	۱۱۴	۹۱٫۲	پی ایچ ڈی	۲	۲	۱۰۰٫۰

انجمن طیلسانین عثمانیہ اور اس کے ملحقہ اداروں کی اطلاعات

عثمانین کی تالیفیں اور تراجم

از جناب شرف الدین صاحب بی اے (عثمانیہ)

معتمد مجلس نمائش

انجمن طیلسانین عثمانیہ کے یوم تاسیس کی جو تقریب شہریور ۲۵ ۱۳۵۴ ف کو منائی گئی۔ اس کے موقع پر انجمن طیلسانین عثمانیہ، معاشی کمیٹی اور مجلس نمائش کے کتب خانوں سے عام استفادہ کا انتظام کیا گیا کتب خانے کے ساتھ ایک مطالعہ گھر بھی کھولا گیا جس میں وہ تمام اخبارات و رسائل بھی رکھے جاتے ہیں جو مجلہ طیلسانین کے تبادلہ میں وصول ہوتے ہیں ۔

کتب خانوں کی مختلف فہرستیں زیر ترتیب ہیں عثمانین کے تالیفوں کی بھی ایک فہرست ترتیب پا رہی ہے ۔

واضح ہو کہ ۱۳۴۳ ف میں طیلسانین عثمانیہ کی پہلی کانفرنس جو منعقد ہوئی اسکے موقع پر کانفرنس کے ساتھ عثمانین کے تالیفوں کی بھی ایک نمائش منعقد کی گئی تھی۔ بعد میں بھی کانفرنس کے موقع پر ہی یہ نمائش متعدد مرتبہ منعقد ہوئی۔ ۱۳۵۳ ف کی کانفرنس کے موقع پر بھی جو بسویں کانفرنس تھی یہ نمائش منعقد ہوئی۔ ہر نمائش کے موقع پر کچھ نہ کچھ نئی کتابیں انجمن کے کتب خانہ میں جمع ہو گئیں۔ یہ فہرست انہیں تالیفوں کی ہے جو کتب خانہ انجمن میں محفوظ ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ کتب خانے میں عثمانین کی تالیفوں کا معتد بہ حصہ ابھی فراہم ہونا ہے اس فہرست میں جن برادروں کی تالیفیں شامل نہیں ہیں وہ کتب خانے میں محفوظ نہیں ہیں تو توقع ہے کہ مولفوں کی توجہ سے باقی کتابیں بھی جلد وصول ہو جائیں گی تا کہ فرزندان جامعہ عثمانیہ کی تلمی کاوشیں ایک مرکز پر جمع رہیں اور ان سے ہر ضرورت مند بآسانی مستفید ہو سکے اور ضروری فہرستیں مکمل حالت میں مختلف

ضرورتوں کے معیار ہیں۔

جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے طیلسانین عثمانیہ کی پہلی کانفرنس میں "جامعۂ عثمانیہ کے فرزندوں کی اردو خدمات" کے عنوان سے ایک مضمون پڑھا تھا۔ اس مضمون میں ضمیمہ کے طور پر دو فہرستیں بھی شامل کی گئی تھیں۔

یہ فہرستیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ عثمانین کے اردو خدمات کی مضمون وار تفصیلی فہرست۔

۲۔ ان عثمانین کی فہرست جنہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ اردو کی خدمت کی۔

یہ فہرستیں بھی اب نظرثانی کی محتاج ہو گئی ہیں۔ آیندہ اشاعتوں میں ان کو بعد نظرثانی شائع کیا جاسکے گا۔ یہ فہرست جو شائع کی جارہی ہے اس میں حروف تہجی کے اعتبار سے عثمانین کے نام درج کئے گئے ہیں اور ہر نام کے مقابل ان کی تالیفوں کا اندراج کیا گیا ہے۔ کتاب کے نام سے خود فن کا اندازہ ہو جائے گا لیکن جیسا کہ اوپر تذکرہ کیا گیا ہے۔ فن وار فہرستیں متعاقب شائع کی جائیں گی۔

یہاں اس قدر اشارہ نامناسب نہیں کہ اس فہرست میں ۲۸۱ عثمانین کے نام شریک ہیں۔ حالانکہ ڈاکٹر زور اپنے مضمون میں صرف (۱۰۹) عثمانین کے نام شمار کرائے تھے۔ اس طرح گویا (۱۷۲) جدید ناموں کا اضافہ ہوا ہے۔ یقیناً اس میں اور بھی مزید اضافہ ہو سکتا ہے۔ جو نام متروک ہو گئے ہیں ان کا اضافہ اطلاع ملنے پر آیندہ ہوگا۔

واضح ہو کہ تالیفوں میں خطبے اور ایسے مقالے بھی شریک کر لئے گئے ہیں۔ جو کتابی صورت میں کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ ممکن ہے کہ دو چار ایسے اصحاب کے نام بھی لاعلمی سے درج ہو گئے ہوں جو جامعہ عثمانیہ کے فیض تعلیم سے استفادہ نہ کئے ہوں۔ اس فہرست میں جن تالیفوں کے ساتھ غیر مطبوعہ لکھا گیا ہے۔ وہ ایم اے کے مقالے ہیں۔ اور کتب خانۂ انجمن میں بخیر موجود۔

فہرست

(الف)

(ب)

۱۶۔ باقر فریدی، محمد
(۲۲) موضع بون پلی کی معاشی تحقیق (غیر مطبوعہ)

۱۷۔ باقر خاں، مرزا
(۲۳) نظام ساگر کی معاشی اہمیت (غیر مطبوعہ)

۱۸۔ بدرالدین خاں شکیب
(۲۴) نظر کے دھوکے (۲۵) یورپ کے تاثرات

۱۹۔ برکت علی، شیخ
(۲۶) ابتدائی ریاضی حصہ اول (۲۷) ابتدائی ریاضی حصہ دوم (۲۸) سکونیات اعلیٰ۔
(۲۹) علم ہندسہ مستوی۔ (۳۰) ہندسۂ مخروطی
(۳۱ و ۳۲) جبر و مقابلہ حصہ اول و دوم

۲۰۔ بل بیر پرشاد بھٹناگر
(۳۳) جگ بست اور ان کا کلام (غیر مطبوعہ)

۲۱۔ بنکٹ پرشاد۔
(۳۴) حیدرآباد دکن اور ہندو مسلم زندگی

۲۲۔ بھارت چند، کھنہ
(۳۵) سلطان فیروز شاہ تغلق (غیر مطبوعہ)

(پ)

۲۳۔ پال راؤ، کے، وی
(۳۶) تانا شاہ کی حکومت میں مادنا کا حصہ (غیر مطبوعہ)

۲۴۔ پٹواری، وی، ین،
(۳۷) ہندسۂ تحلیلی (۳۸) ہندسۂ مخروطات
(۳۹) تفرقی احصاء (۴۰) علم مثلث مستوی

(ت)

۲۵۔ تسنیم ربانی
(۴۱) ظفر (بہادر شاہ) اور ان کا کلام (غیر مطبوعہ)

۲۶۔ تقی ہاشمی، سید محمد
(۴۲) موضع نیکنڈہ کی معاشی تحقیق (غیر مطبوعہ)

(ج)

۲۷۔ جعفر حسن، سید
(۴۳) زرعی افلاس ہند۔ (۴۴) ہماری ریلیں اور سڑکیں۔

۲۸۔ جلال الدین، محمد، اشک
(۴۵) سلک گوہر یعنی شیطان کا انتقام

۲۹۔ جہاں بانو بیگم
(۴۶) رفتار خیال (۴۷) محمد حسین آزاد
(۴۸) ولی کا فن شاعری (۴۹) عرب اور عربستان۔

(چ)

۳۰۔ چترویدی، نارائن داس
(۵۰) عہد معاونت اور اس کے اثرات (غیر مطبوعہ)

۳۱۔ چوبے، بی، ین

(۵۱) سوال وجواب امتحان ایل ایل بی۔

(۵۲) قانون ضمانت۔ (۵۳) شرح قانون آبکاری

(ح)

۳۲۔ حبیب احمد فاروقی،

(۵۴) لاسلکی نشر (۵۵) حل پرچہ جات ریاضی۔

(۵۶) تجرباتی تعلیم۔ (۵۷) بیگاری بابو۔

۳۳۔ حسن الدین، میر

(۵۸) مبادی فلسفہ (۵۹) فلسفہ گیسان

(۶۰) فلسفہ عجم۔ (۶۱) ختم نبوت اور قادیانیت

(۶۲) وفاق اور ریاستیں۔

۳۴۔ حسن احمد بنائی۔

(۶۳) ابن الدولی (غیر مطبوعہ)

۳۵۔ حمید اللہ محمد۔

(۶۴) روحی واسلامی ادارۂ غلامی۔

(۶۵) قانون بین الممالک کے اصول ونظیریں

(۶۶) عربوں کے تعلقات غیر سلطنتی حکومت سے۔

(۶۷) آبادی۔ (۶۸) امام ابوحنیفہ کی تدوین

قانون اسلامی۔ (۶۹) مجموعة الوثائق

السیاسة فی العهد النبوی

والخلافة الراشدة (عربی)

۳۶۔ حمید احمد، خواجہ

(۷۰) رہبر نمائش۔ (۷۱) تحریک ترقی

مملکت آصفیہ (۷۲) جمہوریت کا سراب

۳۷۔ حمید الدین شاہد خواجہ،

(۷۳) سرگذشت ادارۂ ادبیات اردو۔

(خ)

۳۸۔ خلیل الرحمن محمد۔

(۷۴) اسباق کیمیا حصہ اول، (۷۵) اسباق

کیمیا حصہ دوم۔

۳۹۔ خواجہ معین الدین۔

(۷۶) اتحاد عرب

(ر)

۴۰۔ رام راؤ، وی

(۷۷) حیدرآباد اور کساد بازاری (غیر مطبوعہ)

۴۱۔ رادھکا پرشاد۔

(۷۸) مدارس کی تعلیم سائنس میں مدرس کے

انصباحی طریقے۔ (غیر مطبوعہ)

۴۲۔ رتن لعل۔

(۷۹) جدید ابتدائی ریاضی حصہ اول و دوم

۴۳۔ رحیم الدین کمال، شیخ

(۸۰) خطابیات۔

۴۴ - رحیم الدین، قریشی محمد
(۸۱) ہندوستان کے میٹھے پانی کی مچھلیوں کے خاندان (غیر مطبوعہ)

۴۵ - رشید ترابی -
(۸۲) طب معصومین

۴۶ - رشید الحسن، سید
(۸۳) سر سید کے لکچرز (غیر مطبوعہ)

۴۷ - رشید عباس -
(۸۴) پست چال والے اہتزاز سے پیدا ہونیوالے بلند ترین برقی اہتزازات کی تحقیقات (غیر مطبوعہ)

۴۸ - رشید قریشی -
(۸۵) حسن کی دنیا -

۴۹ - رضی الدین، محمد صدیقی
(۸۶) محدودان کا ہندسہ (۸۷) نظری علم ہندسہ - (۸۸) تفرقی و تکملی احصا - (۸۹) خطبہ صدارت چھٹی سالانہ کانفرنس طیلسانیین عثمانیہ - (۹۰) اضافیت -

۵۰ - روی سنگھ -
(۹۱) ابتدائی نباتیات حصہ اول

(ز)

۵۱ - زاہد حسن - (۹۲) تعلیم بالغان ہند - (غیر مطبوعہ)

۵۲ - زہرا خانم -
(۹۳) تذکرہ خوشنویسان و نقاشان (غیر مطبوعہ)

(س)

۵۳ - سجاد علی، میر
(۹۴) غیر خالصہ علاقہ جات کے چند تعلیمی پہلو - (غیر مطبوعہ)

۵۴ - سدرشن راج -
(۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸) علم طبیعیات حصہ اول و دوم و سوم و چہارم -

۵۵ - سردار خاں
(۹۹) جدید نصاب کیمیا -

۵۶ - سراج الدین -
(۱۰۰) علاؤالدین محمد شاہ خلجی (غیر مطبوعہ)

۵۷ - سعادت علی رضوی، میر
(۱۰۱) سالنامہ بزم اردو (۱۰۲) کلام الملوک (۱۰۳) طوطی نامہ (۱۰۴) سیف الملوک بدیع الجمال - (۱۰۵) میر نوازش علیخاں شیدا کی روضۃ الاحیاء (غیر مطبوعہ)

۵۸ - سعادت علیخاں، میر
(۱۰۶) خطبہ صدارت تیسری سالانہ کانفرنس طیلسانیین عثمانیہ (۱۰۷) حجاج بن یوسف ثقفی (غیر مطبوعہ)

۵۹ - سید حسین ڈاکٹر

(۱۰۸) خطبہ صدارت چوتھی سالانہ کانفرنس طیلسانیین عثمانیہ -

۶۰ - سید حسین -

(۱۰۹) قصص القرآن تاریخی حیثیت سے (غیر مطبوعہ)

۶۱ - سید محمد -

(۱۱۰) گلشن گفتار (۱۱۱) ابتدائی قواعد فارسی

(۱۱۲) ایمان سخن -

۶۲ - سید محمود فضل -

(۱۱۳) نذر عقیدت -

۶۳ - سید محمد حسن عسکری -

(۱۱۴) اورنگ زیب کی اہمیت بحیثیت صوبہ دار دکن (غیر مطبوعہ)

(ش)

۶۴ - شاہد حسین سید

(۱۱۵) مملکت جدید میں ہمہ گیری رجحان (غیر مطبوعہ)

۶۵ - شام سندر ، بی

(۱۱۶) خطبہ صدارت کل حیدرآباد پست اقوام کانفرنس پربھنی

۶۶ - شرف الدین ، محمد

(۱۱۷) موضع پھول مری کی معاشی تحقیق

۶۷ - شنکر راؤ ، ہیں

(۱۱۸) بعض عطری ہیلائیڈز کی آب پاشیدگی اور الکحل پاشیدگی پر مگنیسیم کلورائیڈ کا اثر - (غیر مطبوعہ)

۶۸ - شہاب الدین محمد

(۱۱۹) حکومت ہند اور والیان ریاست کے تعلقات (غیر مطبوعہ)

۶۹ - شیخ چاند مرحوم -

(۱۲۰) ملک عنبر -

(ص)

صفی الدین -

(۱۲۱) ابوالفیض فیضی (غیر مطبوعہ)

(ض)

۷۰ - ضیا الدین انصاری

(۱۲۲ و ۱۲۳) تعمیرں کا نظریہ اور تجویز - حصہ اول و دوم - (۱۲۴ و ۱۲۵) مضبوطی اشیا حصہ اول و دوم - (۱۲۶) محکم کنکریٹ کی تجویز -

(ظ)

۷۲ - ظفر الحسن ، مرزا -

(۱۲۷) محبت کی چھاؤں -

۷۳ - ظہیر یار جنگ بہادر ، نواب

(۱۲۸) سیاحت نامہ (حالات سفر یورپ و امریکہ)

(۱۲۹) خطبۂ صدارت حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس

۷۴ - ظہیر الدین احمد -

(۱۳۰) سرسید احمد خان (۱۳۱) دفتری معلومات (۱۳۲) دادا بھائی نوروزجی -

۷۵ - ظہیر الدین حسن، سید -

(۱۳۳) احمد شوقی بک اور انکی شاعری (غیر مطبوعہ)

۷۶ - ظہیر الدین، محمد -

(۱۳۴) سلطان احمد شاہ ولی بہمنی -

۷۷ - ظہیر احمد -

(۱۳۵) پرچہ جات سائنس کے جوابات

ع

۷۸ - عابد علی خاں، میر

(۱۳۶) گزشتہ پچاس سال سے حیدرآباد میں اردو کی ترقی (غیر مطبوعہ)

۷۹ - عاقل علی خاں، محمد

(۱۳۷) ٹیگور کے تمدنی و سیاسی خیالات (غیر مطبوعہ)

۸۰ - عباس حسین نقوی سید

(۱۳۸) احوال و تصانیف نعمت خان عالی (غیر مطبوعہ)

۸۱ - عباس حسین لطفی،

(۱۳۹) مصنوعی بیوی -

۸۲ - عباس رضا زیدی، سید محمد،

(۱۴۰) اورنگ زیب کا نظم و نسق دکن میں - (غیر مطبوعہ)

۸۳ - عباس علی رضوی سید -

(۱۴۱) گارساں دی تاسی (غیر مطبوعہ)

۸۴ - عبد الحفیظ، محمد

(۱۴۲ و ۱۴۳) مبادیات سائنس حصہ اول و دوم

۸۵ - عبد الحفیظ، قتیل

(۱۴۴) اردو غزل کے جدید رجحانات (غیر مطبوعہ)

۸۶ - عبد الحفیظ صدیقی

(۱۴۵) رفتار زمانہ (۱۴۶) بلقان -

۸۷ - عبد الحلیم حسینی، سید

(۱۴۷) موضع پرتاب سنگھارم کی معاشی تحقیق - (غیر مطبوعہ)

۸۸ - عبد الخالق محمد سعید -

(۱۴۸) میسور میں اردو

۸۹ - عبد الرحمن، سید

(۱۴۹) نقشہ کشی (۱۵۰) جدید معلومات -

۹۰ - عبد الرحمن، رئیس،

(۱۵۱) سیرت و کردار

۹۱ - عبد الرحمن، سعید

(۱۵۲) لسان الاست -

۹۲ - عبد الرشید قریشی، سید

(۱۵۳) جدید اردو افسانوں کا ارتقاء (غیر مطبوعہ)

۹۳ ۔ عبدالرزاق قادری جعفر سید

(۱۵۴) معانی الآثار ۔ امام طحاوی (غیر مطبوعہ)

۹۴ ۔ عبدالستار نائب

(۱۵۵) کارنوالس (۱۵۶) خطبۂ افتتاحیہ انجمن اتحاد جامعہ عثمانیہ (۱۵۷) داستان نندکما (۱۵۸) ہند کے سیاسی مسلک کا نشوونما ۔

۹۵ ۔ عبدالسلام ذکی ۔

(۱۵۹) چمن زار حکایات ۔ (۱۶۰) گلزار الف لیلیٰ (۱۶۱) تحفۂ رمضان (۱۶۲) آصفی کہانیاں (۱۶۳) شہادت نامہ (۱۶۴) جذبات عالیہ (۱۶۵) پیام حق ۔ (۱۶۶) و (۱۶۷) شرح نصاب اردو حصہ اول و دوم ۔ (۱۶۸) گلشن اخلاق ۔

۹۶ ۔ عبدالعلی ۔

(۱۶۹) سنہ ۱۸۵۷ء کا اتحاد ثلاثہ (غیر مطبوعہ)

۹۷ ۔ عبدالقادر سروری، محمد

(۱۷۰) کردار اور افسانہ (۱۷۱) جدید اردو شاعری (۱۷۲) پھول بن (۱۷۳) قصۂ بے نظیر (۱۷۴) دنیائے افسانہ ۔ (۱۷۵) انگریزی افسانے (۱۷۶) رات کا پھول اور دیگر افسانے (۱۷۷) سراج سخن ۔

۹۸ ۔ عبدالقدوس ۔

(۱۷۸) نظریۂ خیر و شر (۱۷۹) اسلامی وحدۃ الوجود ۔ (غیر مطبوعہ)

۹۹ ۔ عبدالقیوم خاں باقی، محمد

(۱۸۰) فاؤسٹ اردو نظم میں ۔ (۱۸۱) ادبی تنقید کے چند اصول (۱۸۲) عہد اکبری کے فارسی گو شعراء (۱۸۳) یوسف زلیخا لباس نو میں ۔

۱۰۰ ۔ عبدالجبار سجانی ۔

(۱۸۴ و ۱۸۵ و ۱۸۶ و ۱۸۷) اسباق الانشاء حصہ اول و دوم و سوم و چہارم ۔

۱۰۱ ۔ عبدالمجید صدیقی، محمد ۔

(۱۸۸) خطبۂ استقبالیہ چوتھی حیدرآباد معاشی کانفرنس (۱۸۹) تاریخ گولکنڈہ (۱۹۰) مقدمۂ تاریخ دکن ۔ (۱۹۱) عبدالملک ولید (غیر مطبوعہ)

۱۰۲ ۔ عبدالمنعم ۔

(۱۹۲) سلطان محمد عادل شاہ (غیر مطبوعہ)

۱۰۳ ۔ عبدالوہاب، محمد

(۱۹۳) جداول ریاضیہ اور طبعی مستقلات ۔

۱۰۴ ۔ عبدالوہاب محمد ۔

(۱۹۴) تسخیر گولکنڈہ ۔ (غیر مطبوعہ)

۱۰۵ ۔ عزیز احمد ۔

(۱۹۵) کالج کے دن (۱۹۶) فرانس کے افسانے

۱۰۶ - عظیم الدین، محمد، محبت۔

(۱۹۷) شاعر کی دنیا۔ (۱۹۸) امجد حیدر آبادی (غیر مطبوعہ)

۱۰۷ - عزیز الرحمن محمد،

(۱۹۹ و ۲۰۰ و ۲۰۱) مشاہدات جلد اول و دوم و سوم

۱۰۸ - علی احمد،

(۲۰۲) داستان گو

۱۰۹ - علی حسنین، زیبا، سید

(۲۰۳) اردو ادب بیسویں صدی میں

۱۱۰ - علی شبر حاتمی، سید

(۲۰۴) سوالات و جوابات کیمیا۔

۱۱۱ - علی شاکر، سید

(۲۰۵) حیات و کلام صائب (غیر مطبوعہ)

۱۱۲ - علی ضامن نقوی، سید

(۲۰۶) سر سید کے مضامین،

۱۱۳ - علی محسن، سید

(۲۰۷) عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی کے متولیات ریاست

۱۱۴ - علی محمد، سید۔

(۲۰۸) تسخیر بیجاپور (غیر مطبوعہ)

۱۱۵ - عنایت حسین، محمد

(۲۰۹) جامع فتح آباد کی معاشی تحقیق (غیر مطبوعہ)

۱۱۶ - علی موسیٰ رضا مہاجر۔

(۲۱۰) مبادیات کشافہ

۱۱۷ - عمر مہاجر، محمد

(۲۱۱) اردو افسانوں کے جدید رجحانات (غیر مطبوعہ)

۱۱۸ - عیسیٰ احمد خواجہ۔

(۲۱۲) ہندوستانی سیاسی فضا اور اس کا اثر دستور پر (۱۸۵۷-۱۹۳۹) (غیر مطبوعہ)

(غ)

۱۱۹ - غازی الدین۔

(۲۱۳) سیرت طیبہ۔

۱۲۰ - غلام حسن۔

(۲۱۴) لیونارڈو وگر گرود

۱۲۱ - غلام دستگیر رشید، محمد،

(۲۱۵) شمس معنوی (۲۱۶) اسلامی تہذیب کیا ہے۔

(۲۱۷) حیات طیبہ (۲۱۸) حضرت خواجہ بندہ نواز

۱۲۲ - غلام قادر۔

(۲۱۹) جغرافیہ ریاست حیدرآباد۔

۱۲۳ - غلام محمد خاں۔

(۲۲۰) خواجہ میر درد دہلوی (غیر مطبوعہ)

۱۲۴ - غوث الدین علی محمد

(۲۲۱) اسباق الاشیاء

(ف)

۱۲۵۔ فخر نواز جنگ بہادر، نواب

(۲۲۲) خطبۂ صدارت پہلی کانفرنس طیلسانین عثمانیہ

۱۲۶۔ فخر الحسن، سید،

(۲۲۳) موضع ریپور کی معاشی و معاشرتی تحقیق (غیر مطبوعہ)

۱۲۷۔ فضل اللہ احمد۔

(۲۲۴) تبویب حیدری۔

۱۲۸۔ فیض محمد صدیقی، ابوالمکارم

(۲۲۵) خلاصۂ کیمیا، (۲۲۶) جدید نصاب کیمیا، (۲۲۷) حفظ صحت (۲۲۸) معلمان تعلیم، (۲۲۹) آب دوز کشتیاں و سرنگ۔ (۲۳۰) پانی کی کہانی۔ (۲۳۱) نواب عماد الملک (۲۳۲) سید حسن بلگرامی۔

۱۲۹۔ فصیح الدین احمد قاضی۔

(۲۳۳ و ۲۳۴ و ۲۳۵ و ۲۳۶) اسباق الاشیاء حصہ اول و دوم و سوم و چہارم۔

(ق)

۱۳۰۔ قادر علی، میر،

(۲۳۷) حیدرآباد میں چوڑی کے جوڑوں کی صنعت (غیر مطبوعہ)

۱۳۱۔ قدرت اللہ بیگ، مرزا،

(۲۳۸) ادبی تاثرات۔

(ک)

۱۳۲۔ کاظم رضا، سید،

(۲۳۹) مسلمانوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے تعلقات (غیر مطبوعہ)

۱۳۳۔ کلیم الدین انصاری۔

(۲۴۰) خطبۂ استقبالیہ تیسری سالانہ کانفرنس طیلسانین عثمانیہ۔ (۲۴۱) خطبۂ صدارت پانچویں سالانہ کانفرنس طیلسانین عثمانیہ۔

(گ)

۱۳۴۔ گردداس۔

(۲۴۲) جیون چرتر۔ (۲۴۳) خطبۂ استقبالیہ چوتھی سالانہ کانفرنس طیلسانین عثمانیہ (۲۴۴) خطبۂ استقبالیہ دوسری عثمانیہ بلدی جماعت (۲۴۵) خطبۂ صدارت کانفرنس طیلسانین عثمانیہ۔

۱۳۵۔ گوبند راؤ کیوار

(۲۴۶) ویدانت و وحدۃ الوجود (غیر مطبوعہ)

ل

۱۳۶۔ لطیف النساء بیگم۔

(۲۴۷) دلی کا تخیل (۲۴۸) من کی بپتا۔

(۲۴۹) اردو شاعری اور تصوف (غیر مطبوعہ)

(م)

۱۳۷۔ مدن موہن لعل۔

(۲۵۰) خطبۂ استقبالیہ چھٹی سالانہ کانفرنس طیلسانین عثمانیہ۔

۱۳۸۔ محسن بن شبیر۔

(۲۵۱) یوسف ہندی قید فرنگ میں۔

(۲۵۲) حج زینب۔

۱۳۹۔ محمد احمد انصاری۔

(۲۵۳) سلطان علاؤالدین حسن گنگو بہنی۔

۱۴۰۔ محمد احمد خواجہ۔

(۲۵۴) خطبہ صدارت نویں سالانہ کانفرنس طیلسانین عثمانیہ۔

۱۴۱۔ محمد احمد عثمانی۔

(۲۵۵) تجربی طبیعات (۲۵۶) مبادیات طبیعات حصۂ اول۔

۱۴۲۔ محمد احمد سبزواری، سید

(۲۵۷) موضوع: دیال کی معاشی تحقیق (غیر مطبوعہ)

(۲۵۸) لوکارتھمی اور طبعی جدول۔

۱۴۳۔ محمد علیخاں بیکش، میر

(۲۵۹) کاغذ کی ناؤ (۲۶۰) گریہ و تبسم۔

۱۴۴۔ محمد علی خاں۔ مرزا

(۲۶۱) گذشتہ نصف صدی میں دکنی مرثیہ نگاری (غیر مطبوعہ)

۱۴۵۔ مہدی حسین، سید

(۲۶۲) ہندوستان

۱۴۶۔ محمد امیر۔

(۲۶۳) من کی بانسری۔ (۲۶۴) شیب و شاب

(۲۶۵) سلیم۔

۱۴۷۔ محمد علی انصاری، شیخ

(۲۶۶) لبید بن ربیعہ اور اس کی شاعری (غیر مطبوعہ)

۱۴۸۔ محمد غوث۔

(۲۶۷) مدراس کے بعض کتب خانے۔

(۲۶۸) کرناٹک کی دو فارسی تاریخیں

(۲۶۹) ہندوستان کی ابتدائی فرانسیسی اور انگریزی کش مکش میں خاندان انوری کا حصہ

(۲۷۰) جنایات بر جائداد

۱۴۹۔ محمد غوث۔ (محبوب نگری)

(۲۷۱) امام غزالی کے کلامی خصوصیات

۱۵۰۔ محمد فاروق۔

(۲۷۲) افکاری تقریریں (۲۷۳) خطبہ استقبالیہ نویں سالانہ کانفرنس طیلسانین عثمانیہ۔

(۲۷۴) قرآنی دعائیں۔

۱۵۱۔ محمد حسن اسید محشر عابدی۔

(۲۷۵ و ۲۷۶ و ۲۷۷) مطالعۂ قدرت حصہ اول و دوم و سوم۔

۱۵۲۔ محبوب علی امیر۔

(۲۷۸) شاہ ولی اللہ بحیثیت متکلم و صوفی (غیر مطبوعہ)

۱۵۳۔ محمود علی، میر

(۲۷۹) گلدستۂ تاریخ ہند (۲۸۰) خطبہ صدارت پہلی نمایش مصنوعات ملکی۔ (۲۸۱) آصفنامہ ثانی

۱۵۴۔ محی الدین قادری زور۔ سید

(۲۸۲) ہندوستانی کا ارتقا، (۲۸۳) جواہر سخن (۲۸۴) گارسان دی تاسی (۲۸۵) شاہ ظہور الدین حاتم۔ (۲۸۶) روح تنقید (۲۸۷) تین شاعر (۲۸۸) ہندوستانی لسانیات (۲۸۹) روح غالب (۲۹۰) میر محمد مومن۔ (۲۹۱) اردو شہ پارے (۲۹۲) تنقیدی مقالات (۲۹۳) اردو اسالیب بیان۔ (۲۹۴) عہد عثمانی میں اردو کی ترقی (۲۹۵) طلسم تقدیر

(۲۹۶) مرقع سخن حصہ اول (۲۹۷) مرقع سخن حصہ دوم (۲۹۸) تاریخ ادب اردو (۲۹۹) فیض سخن (۳۰۰) مکتوبات شاہ عظیم آبادی (۳۰۱) گارسان دی تاسی (طبع ثانی)، (۳۰۲) بادۂ سخن (۳۰۳) شاد اقبال (۳۰۴) سرگذشت غالب۔

۱۵۵۔ مختار الدین احمد مرزا۔

(۳۰۵) عہد عالمگیر میں دکن کی سیاسی اور تمدنی حالت (غیر مطبوعہ)

۱۵۶۔ مخدوم علی۔

(۳۰۶) عثمانیہ جغرافیہ عالم (۳۰۷) حفظان صحت (۳۰۸) جغرافیہ سلطنت آصفیہ۔ (۳۰۹) رفیق مدرسین، (۳۱۰) ذہنی حساب (۳۱۱) معلومات عامہ (۳۱۲) بچوں کی کہانیاں حصہ اول۔

۱۵۷۔ مخدوم محی الدین، محمد۔

(۳۱۳) اردو ڈراما اور اسٹیج (غیر مطبوعہ) (۳۱۴) ٹیگور اور ان کی شاعری۔ (۳۱۵) ہوش کے ناخن۔

۱۵۸۔ مخدوم علی خاں، میر

(۳۱۶) عہد عثمانی تا ۱۹۰۷ء اور حیدرآباد (غیر مطبوعہ)

۱۵۹۔ معین الدین قریشی، سید

(۳۱۷) غالب (۳۱۸) نغمہ۔

۱۶۰۔ منیر الدین خواجہ

(۳۰۹) دور شاہ جہانی کا تمدنی ارتقاء (غیر مطبوعہ)

۱۶۱۔ منیر الدین محمد۔

(۳۲۰) حل پرچہ جات ریاضی (۳۲۱) کمل ہندسہ عملی۔

۱۶۲۔ مہندر راج سکسینہ،

(۳۲۲) جیوتی۔

۱۶۳۔ میر حسن۔

(۳۲۳) درد سوز رقت اور اس کی شاعری

(۳۲۴) ہوش کے ناخن۔ (۳۲۵) مغربی تصانیف کے اردو تراجم (۳۲۶) سائنس کے کرشمے۔

(ن)

۱۶۴۔ نارائن پرشاد، سری واستوا

(۳۲۷) آربند و گھوش کا فلسفہ (غیر مطبوعہ)

۱۶۵۔ ناصر علی، محمد

(۳۲۸) موضع پٹنہ کی معاشی تحقیق۔ (۳۲۹) موضع ودپلی کی معاشی تحقیق۔ (۳۳۰) جاپان کی صنعتی ترقی۔

۱۶۷۔ نبی الحسن، شمیم

(۳۳۲) عالم حیات (۳۳۳) شمیم سخن۔

(۳۳۴) شعاع امید

۱۶۸۔ نجم الغنی

(۳۳۵) اسباق الاشیاء

۱۶۹۔ نجم النساء بیگم۔

(۳۳۶) کلام ولی اور تصوف (۳۳۷) سرسید کی نثر (غیر مطبوعہ)

۱۷۰۔ ندیم الحسن

(۳۳۸) مومن کی شاعری (غیر مطبوعہ)

۱۷۱۔ نذیر الدین، محمد

(۳۳۹) علم مثلث کروی (۳۴۰) مساواتوں کا نظریہ۔ (۳۴۰) علم مثلث مستوی (۳۴۱) اسکونیات (۳۴۲) علم ہیئت کروی۔ (۳۴۳) مخروطی تراشیں (۳۴۴) نظری علم الحیل (۳۴۵) علم مثلث کروی۔ (۳۴۰) علم ہندسہ نظری۔

۱۷۲۔ نعیم النساء بیگم۔

(۳۴۷) ولی کی معلومات اور خصوصیات شاعری

(۳۴۸) علامہ شبلی از یاں کی نثر (غیر مطبوعہ)

۱۷۳ انقش عالمی۔

(۳۴۹) شفق آرا۔ (۳۵۰) مختصر تاریخ انگلستان

۱۷۴۔ نور اللہ، محمد

(۳۵۱) داغ۔

۱۷۵۔ نو شابہ خاتون۔

(۳۵۲) سوچ تخیل

(و)

۱۷۶۔ وحید اللہ خاں۔

(۳۵۳) سلطان محمد تغلق (غیر مطبوعہ)

۱۷۷۔ ویا کرکہ اچ ایشورچند۔

(۳۵۴) برطانوی ہند میں صوبہ جاتی حکومت کا ارتقا (غیر مطبوعہ)

۱۷۸۔ ولی الدین، میر

(۳۵۵) سندر کی پہلی کتاب (۳۵۶) تاریخ فلسفہ اسلام۔ (۳۵۷) مقدمہ فلسفہ حاضرہ۔ (۳۵۸) رہنمائے قرآن۔ (۳۵۹) قرآن اور علاج خوف (۳۶۰) قنوطیت (فلسفہ یاس)، (۳۶۱) مقدمہ مابعد الطبیعات۔ (۳۶۲) قرآن کا فلسفہ مذہب (۳۶۳) قرآن اور سیرت سازی

(۳۶۴) اقبال از حدیث جبر و قدر۔

(۳۶۵) خلق حق۔

۱۷۹۔ ونکٹ راؤ، چاری

(۳۶۶) مہادیو سندھیا کے سیاسی منصوبے (غیر مطبوعہ)

(ھ)

۱۸۰۔ ہیمنت راؤ۔ ام

(۳۶۷) از منہ وسطی ہندمیں ترک و افغانی دور کی عمرانی زندگی کے چند پہلو (غیر مطبوعہ)

۱۸۱۔ ہیروال کرگنڈے راؤ۔

(۳۶۸) خطبۂ استقبالیہ پانچویں سالانہ کانفرنس طیلسانیین عثمانیہ۔

(ی)

۱۸۲۔ یوسف الدین، محمد

(۳۶۹) اسلام کے معاشی نظریے۔

مجلۂ طیلسانیین کے ناظرین سے

۱۔ مجلّہ کے خریداروں سے استدعا ہے کہ اپنے پتہ کی تبدیلی سے بروقت اطلاع دیں۔
۲۔ تنقید کے لیے کتابیں بھیجی جائیں تو مدیر کے پاس راست دفتر مجلہ پر بھیجی جائیں۔
۳۔ مجلہ کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعہ سے جامعۂ عثمانیہ کے ایم اے اور ایم ایس سی کے امتحانات کی غرض سے لکھے ہوئے مقالے طبع ہوں، چنانچہ اب تک مجلہ نے ۶ مقالے شائع کر دئے ہیں۔ جو صاحب اپنا مقالہ مجلہ میں طبع کرانا پسند فرمائیں وہ براہ کرم مدیر مجلہ سے مراسلت فرمائیں۔

مجلس نمائش معاشی کمیٹی حیدرآباد دکن

حساب آمدنی وخرچ ختم ۳۱ امرداد ۱۳۵۲ف

اخراجات	روپیہ	آنہ	پائی	روپیہ	آنہ	پائی
تنصیب اسٹالس						
اداشدہ	۱۹۵۱	۱۳	۵			
اداشدنی	۷۲	–	–	۳۰۲۳	۱۳	۵
اخراجات برقی روشنی				۳۲۷۱	۱۳	۶
تشہیر وطباعت				۲۲۷۶	۱۱	۱۰
تفریحات				۵۴۷۹	۱	۶
مشغلۂ فنون لطیفہ				۴۳۵	۵	۸
معاشی کانفرنس				۲۵۰	۰	۰
مظاہرات				۴۷۰۲	۶	۱۰
اخراجات یوم خواتین						
اداشدہ	۴۳۰	۶	۰			
اداشدنی	۵۰	–	–			
				۴۸۰	۶	۰
امداد صناعان				۲۶۳	۸	۰
انعامات صناعان				۳۶۶	–	
طعام رضاکاران						
اداشدہ	۵۵۵	–	–			
اداشدنی	۱۹۸	۶	–	۷۵۳	۶	
اخراجات یوم افتتاح				۹۰۵	۱۲	۸
مرکزی اسٹال						
اداشدہ	۲۶۱	۴	۱۰			
اداشدنی	۲	۳	۸	۲۶۳	۸	۶

اخراجات	روپیہ	آنہ	پائی	روپیہ	آنہ	پائی
انتظاماتِ دفتر اور تنخواہ ملازمین						
ادا شدہ	۲۹۰۰	۴	۴			
ادا شدنی	۵۵	–	–	۲۹۵۵	۴	۴
وارھنڈ				۱۱۷۰	۱۲	۱
امداد آموں کی نمائش				۳۵۰	–	–
امداد عثمانیہ بلدی جماعت (برائے نمائش اطفال)				۲۰۰	–	–
دیگر اخراجات						
نمائش کلب	۵۰	–	–			
آہک پاشی و آب رسانی	۳۶۱	–	۶			
مزدوری	۹۶۳	۱۰	–			
بقایا غیر وصول شدنی	۱۸	۱۲	۷			
متفرق	۱۳۰	۱	۴	۱۵۲۳	۸	۵
مطالبات فرسودگی				۶۱۶	۹	۸
زاید آمدنی بر اخراجات متعلقہ ذخیرہ عام				۱۷۰۹۰	۱۰	–
میزان				۴۲۳۲۸	۱۰	۵

حیدرآباد دکن

مورخہ ۳ر آذر ۱۳۵۳ف مطابق ۹ر اکتوبر ۱۹۴۳ء

آمدنی	روپیہ	آنہ	پائی
فروخت ٹکٹ داخلہ	۲۷۹۰۵	۰	۳
فیس شرکت وکرایہ اسٹال	۵۸۹۱	۱۱	۸
امداد از انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ	۸۰۰۰	—	—
عطیہ جات	۹	—	—
چندہ اراکین	۴۰۲	—	—
منافع فروخت حصص	۳۱	۸	—
سود	۸۹	۶	۵
میزان	۴۲۳۲۸	۱۰	۵

حسابات کی جانچ کی گئی ۔ درست پائے گئے ۔ فقط

(دستخط) وی ۔ کے ڈھگے اینڈ کمپنی

رجسٹرڈ اکونٹس آڈیٹرس

فرد واصل باقی بتاریخ ۳۱ رامرداد ۱۳۵۲ ف

سرمایہ دیون	روپیہ	آنہ	پائی	روپیہ	آنہ	پائی
ذخیرۂ عام						
باقی بتاریخ یکم شہریور ۱۳۵۱ ف	۹۶۲۱	۸	۵			
اضافہ آمدنی براخراجات	۱۷۰۹۰	۱۰	۰	۲۶۷۱۲	۲	۱
ذیلی اخراجات				۳۷۲	۵	-
دیگر رقومات اداشدنی						
سید اسماعیل اینڈ سنس	۲۴	۸	—			
رضاکار کمیٹی	۲۴	۲	—			
عبدالرؤف صاحب	۲	۳	۸			
مسرت گاہ ہوٹل	۳۱	—	—	۸۱	۱۳	۸
میزان				۲۷۱۶۶	۵	۱

ہم نے فرد واصل باقی کی تنقیح مجلس کے رجسٹرات اور حسابات کی مدد سے کی ہے اور اس سلسلہ میں وہ سب معلومات اور کیفیتیں حاصل کی ہیں جن کی ہم کو ضرورت تھی۔ ہماری رائے میں یہ فرد واصل باقی بالکل صحیح اور قانون کے مطابق مرتب ہوئی ہے۔ اس کی ہم نے علٰحدہ رپورٹ بھی پیش کی ہے۔ ہم نے ممکنہ حد تک مجلس کے رجسٹرات اور بیانات کے ذریعہ اس امر کا اطمینان کرلیا ہے۔ فقط

(شرح دستخط) ڈی۔ کے۔ ڈھگے اینڈ کمپنی
رجسٹرڈ اکونٹس آڈیٹرس

حیدرآباد دکن
مورخہ ۳ رآذر ۱۳۵۳ ف مطابق ۹ راکتوبر ۱۹۴۳ء

(شرح دستخط)

احمد محی الدین صاحب صدر مجلس نمائش	میر اکبر علی خاں صاحب ۔ رکن	ظہیر الدین احمد صاحب ۔ رکن
رائے گرد واس صاحب نائب صدر	خان صاحب محمد عارف صاحب ״	ایل۔ این۔ گپتا صاحب ״
شرف الدین صاحب اعزازی معتمد	محمد غوث صاحب ״	خواجہ حمید احمد صاحب ״
عبدالعلی صاحب ۔ نائب معتمد	رائے شنکر جی صاحب ״	ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی صدر سال ماسبق۔
میر محمود علی صاحب ۔ خازن	برہان الدین حسین صاحب ״	بی۔ کے۔ بھگوان صاحب ۔ رکن

اثاثہ جائداد و سامان	روپیہ	آنہ	پائی	روپیہ	آنہ	پائی
نقد در دست و بنک						
نقد در دست	۳۹۰	۱۱	۱۱			
سنٹرل بنک آف انڈیا لمٹیڈ	۱۵۱۳	۱	۱			
حیدرآباد کواپریٹو ڈومینین بنک لمٹیڈ	۱۱۲۳	۶	۲	۳۰۲۷	۳	۲
تمغہ جات وڈائی پنچ				۱۳۲	۱۲	۰
حصص						
۱۰۱ حصص حیدرآباد اسٹیٹ بنک قیمتی یک صد روپیہ				۱۳۹۹۱	۸	۰
فرنیچر ۶۶۸-۴-۴						
اضافہ بوجہ خریدی ۱۲۵-۰-۰	۷۹۳	۴	۴			
کمی بوجہ مطالبات فرسودگی دس فی صدی	۷۹	۵	۲	۷۱۳	۱۵	۲
فلم و البم ۱۶۸۶-۸-۰						
اضافہ بوجہ خریدی ۳۳۵-۱۳-۲	۲۰۲۲	۵	۲			
کمی بوجہ مطالبات فرسودگی ۱۲ فی صدی	۲۴۲	۱۰	۲	۱۷۷۹	۱۱	۰
اشیائے پکوان	۱۹۹	۲	۰			
کمی بوجہ مطالبات فرسودگی دس فی صدی	۱۹	۱۴	۴	۱۷۹	۳	۸
پارچہ اور پردے	۱۰۹۹	۶	۲			
کمی بوجہ مطالبات فرسودگی ۲۵ فی صدی	۲۷۴	۱۲	۰	۸۲۴	۱۰	۲
کتب	۱۴	۸	۰			
اضافہ بوجہ خریدی	۹۸	۱۵	۰	۱۱۳	۷	۰

اثاثۂ جائداد و سامان	روپیہ	آنہ	پائی	روپیہ	آنہ	پائی
اسٹور روم				۱۲۱	۳	۵
کاغذ				۶۰۶	۸	۰
فرنسدہ مرکز مصنوعات ملکی امداد باہمی				۴۴۹	۸	۰
قرضہ جات				۴۷۲	۵	۰
رقومات وصول شدنی از داعی صاحبان						
بابتہ سنہ ۱۳۵۱ ف ۹۳۵ — ۰ — ۸						
منہائی بقایا غیر وصول شدنی ۱۸ — ۱۲ — ۷	۹۱۶	۴	۱			
زائد رقوم وصول شدنی بابتہ سال حال	۵۹	۶	۱۱	۹۷۵	۱۱	
رقومات وصول شدنی از دیگر مجالس						
انجمن طیلسانین عثمانیہ بابتہ سنہ ۱۳۵۱ ف	۳۷۶	۱۲	۰			
نمائش کلب بابتہ سنہ ۱۳۵۱ ف	۱۸۲	۸	۰	۵۵۹	۴	۰
دیگر دین دار						
سالبین اینڈ کمپنی	۵۴۳	۰	۰			
اے۔ اے حسین	۱۰	۰	۰			
ترقیات نظام ساگر	۱۸	۸	۰			
سالبین اینڈ کمپنی	۵۹	۰	۰			
مسرت گاہ	۲۹	۰	۰			
ٹکنیکل کالج	۱۰۶	۴	۰			
عبدالبصیر صاحب	۲۹	۱				
سررشتۂ جیل	۶۱	۰	۰	۸۵۵	۱۳	۰
دیگر رقومات وصول شدنی بابتہ سنہ ۱۳۵۱ ف	۸۵۰	۰				
بابتہ سنہ ۱۳۵۲ ف	۱۵۱۳	۱۰	۶	۲۳۶۳	۱۰	۶
میزان				۲۷۱۶۶	۵	۱

مجلہ طیلسانین

حصہ

معاشیات

دوسری جلد ۔ آبان ۱۳۵۲ف ۔ اکتوبر ۱۹۴۳ء ۔ شوال ۱۳۶۲ھ ۔ چوتھا شمارہ

مدیر مجلہ طیلسانین محمد غوث ام اے ال ال بی (عثمانیہ)

فہرست مضامین

حرفِ آغاز

مجلے کی یہ اشاعت ناظرین کے ہاتھوں میں جس وقت پہنچے گی مصنوعاتِ مملکت آصفیہ کی چھٹی نمائش کا آغاز ہو چکا ہوگا۔

رضاکارانہ اصول پر اس نمائش کی داغ بیل رکھی گئی اور پانچ چھ سال کے دوران میں اس کو جو فروغ ہوا وہ دراصل حضرت پیرو مرشد بندگان عالی مدظلہ العالی کے توجہات عالی کا پرتو ہے اعلیحضرت خسرو دکن کو مملکت آصفیہ کے صنعتی ارتقاء کا جو خیال ہے وہ ایک نہایت ہی خوش آئند مستقبل کا ضامن ہے اسی کے پیش نظر حضرت جہاں پناہ بہ نفس نفیس نمائش کے افتتاح کی زحمت گوارا فرماتے ہیں ملک اور اہل ملک پر بالعموم اور صناعوں اور صنعتی کاروبار میں مشغول ملک کے خادموں پر ایک احسان عظیم فرماتے ہیں۔

نمائش کے کاروبار میں ہر سال جو نمایاں ترقی حاصل ہو رہی ہے اس کے مدنظر یہ امر نہایت ضروری تھا کہ ایک مستقل نمائش گاہ کی تعمیر عمل میں آئے۔ بہت ہی مسرت کا مقام ہے کہ مجلس آرائش بلدہ اور انڈسٹرل ٹرسٹ فنڈ کی مشترکہ اعانت و تائید سے آئندہ سال تک نمائش گاہ کی مستقل طور پر تعمیر عمل میں آجائے گی اور یہ عمارت ملک کی صنعتی ترقی کے لئے ایک نشان راہ ثابت ہوگی۔

چھٹی نمائش مصنوعات مملکت آصفیہ کا کامیاب انعقاد دلی اور مخلصانہ مبارکباد کا مستحق ہے دنیا کے ہر کاروبار میں مشکلات اور دقتیں پیش آتی ہیں لیکن صاحبان عزم اپنی ہمت اور استقلال سے مشکلات پر غالب آجاتے اور کامیابی کا نقارہ بجاتے ہیں۔ سعدیؒ نے کیا خوب کہا ہے ؎

ہر کارے کہ ہمت بستہ گردد اگر خارے بود گلدستہ گردد

دنیا کے غیر معمولی اور اس کے ان بدلنے والے حالات کے پیش نظر نمائش کی کامیابی میں گوناگوں دقتوں کا سامنا ہوتا اور ایک مشکل کے بعد دوسری مشکل پریشان کرتی تھی لیکن خدا کے فضل اور اعلیحضرت بندگانعالی کے

اقبال سے سب مشکلیں آسان ہوگئیں اور اخلاص مندانہ کام کی فیروزمندی ایک اور مرتبہ مسلّم ہوگئی
سب سے بڑی مشکل جو حائل تھی وہ برقی روشنی تھی، سررشتۂ برقی کا مطالبہ تھا کہ مجلس نمائش
کیماب سے روشنی کی ڈھائی ہزار اکائیاں فراہم کیجائیں تو اس صورت میں برقی روشنی کا انتظام کیا جائیگا
بڑی خوشی کی بات ہے کہ مجلس نمائش کے ہمدردوں نے ایک ایک دو دو اکائیوں سے ایک ہزار اکائیوں
کا ایثار کیا اور مطلوبہ اکائیاں فراہم کردیں ملک کی ترقی کے لئے یہ جذبات ہر آئینہ مبارکباد اور ستائش
کے مستحق ہیں۔

جس طرح دنیا میں ہر کام کی تکمیل میں کسی نہ کسی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اسی طرح وہاں ہر
قسم کے کاروبار برابر جاری رہتے ہیں۔ خود نمائشیں بھی ہندوستان میں برابر منعقد ہورہی ہیں۔ چنانچہ
میسور میں ابھی گذشتہ مہینے میں ایک صنعتی نمائش بڑے اہتمام سے منعقد ہوئی حمل ونقل کی مشکلات کے
باوجود ۱۹۴۲ء و ۱۹۴۳ء کے دوران میں ہندوستان کے مختلف مقامات پر مویشیوں کی
(۳۳) نمائشیں منعقد ہوئیں۔ جاڑے کے آئندہ موسم میں مویشیوں کی ہندوستان
کے مختلف مقامات پر (۴۰) نمائشوں کا تہیہ کیا گیا ہے خود کلکتے میں جہاں قحط نے الم ناک
حالات پیدا کردیے ہیں برماشل کمپنی نے کی ایک نمائش کا
جنوری ۱۹۴۴ء میں اہتمام کیا ہے۔ گورنر بنگال اس کے سرپرست قرار پائے ہیں اور
انعامات کے لئے جو رقم مختص کیگئی ہے وہ بیس ہزار روپے سے زیادہ ہے۔ اس گراں قدر رقم کے معطی حسب ذیل ہیں۔
حکومت ہند، حکومت بنگال، حکومت بمبئی، ریلوے بورڈ، کلکتہ وار کمیٹی، بنگال کیمیکل کمپنی، جنرل
موٹرس کمپنی، حکومت کشمیر، برٹش انڈیا کارپوریشن، سمنٹ مارکٹنگ کمپنی، ٹیٹاگڑھ کا
کارخانہ کاغذسازی، امپیریل ٹوباکو کمپنی، ساسون کمپنی، کوڈاک کمپنی، ٹاٹا کمپنی، باٹا کمپنی، نامر
آف انڈیا، بنگال چیمبر آف کامرس وغیرہ۔

انعامات جو مقرر کئے گئے ہیں اس کے سلسلہ میں معلوم ہوا ہے کہ ہر شعبے میں تین انعامات
دئے جائیں گے۔ نمائش (۳۹) شعبوں میں تقسیم کیگئی ہے۔ پہلا انعام (۲۵۰) روپے، دوسرا انعام

(۱۵۰) روپے تیسرا انعام (۵۰) روپے۔ علاوہ ازیں دوسرے خاص خاص (۲۵) انعامات جن کی مقدار زیادہ سے زیادہ (۵۰۰) روپے اور کم سے کم (۵۰) روپے مقرر کئے گئے ہیں۔ ان انعامات سے قطع نظر ایک ایک ہزار روپے کے (۴) وظائف علیحدہ قرار دئے گئے ہیں۔

غور کرنے کی بات ہے کہ کلکتہ جیسے آفت رسیدہ مقام میں صرف اشتہارات کی نمائش اس عظیم الشان پیمانے پر منعقد ہو رہی ہے کہ بیس ہزار سے زیادہ رقم صرف انعامات پر صرف کی جا رہی ہے۔

ہمارے ملک کے بڑے بڑے صنعتی اداروں نے ملک کی مجلس نمائش کو انعامات یا دوسرے اغراض کے لئے کیا عطیات دئے؟ ہمارے ملک کے جاگیردار، زمیندار اور امراء نے کیا رقم بطور عطیہ مرحمت فرمائی؟ انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ نے جو امداد کی ہے وہ اگر حاصل نہ ہوتی تو مجلس نمائش کی کشتی ابھی بھنور میں ہی رہتی۔ ضرورت ہے کہ ہمارے ملک کے روشن خیال مالدار اصحاب اور ادارے مجلس نمائش کے توسط سے صنعت اور صنّاع کی ہمت افزائی کے لئے شاندار عطیات سے آگے بڑھیں اور یہ ثابت کر دیں کہ ان کے دل میں ملک کی صنعتی ترقی کا درد اور تڑپ موجود ہے۔

ہندوستان سے قطع نظر دوسرے اقطاع عالم میں جو نمائشیں ہو رہی ہیں ان میں بھی ہندوستان کی جانب سے حصہ لیا جا رہا ہے مثلاً متحدہ اقوام کی صنعتی نمائش صنعت و فنون لطیفہ میں جس کا افتتاح نیویارک میں نومبر کے آخر میں ہوگا ایک ہندوستانی شعبہ بھی قائم کیا جا رہا ہے۔ اس شعبہ میں ہندوستان سے متعلق ضروری معلومات بہم پہنچانے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ مثلاً سمرنا میں ایک بین الاقوامی تجارتی نمائش ۲۰ اگست سے منعقد ہوئی جو اپنی قسم کی بارہویں نمائش ہے۔ اس نمائش میں نہ صرف حکومت ہند نے حصہ لینے کا اہتمام کیا تھا بلکہ خود برطانیہ عظمیٰ کی حکومت نے بھی حصہ لیا۔ بیان کیا گیا ہے دو سال پہلے یہ نمائش منعقد ہوئی تھی اس کا آٹھ لاکھ افراد نے معائنہ کیا تھا، ایک لاکھ افراد اضلاع سے آئے تھے۔

بہرحال ہر طرف حرکت ہے اور ہر قوم جنگ کے غیر معمولی حالات کے باوجود عام قومی اور رفاہی کاروبار کو برابر انجام دئے جا رہی ہے۔ حیدرآباد کو بھی اس سے مستثنیٰ نہ ہونا چاہیئے

معاشیات کی الف بے

از
محمد ناصر علی ام اے (عثمانیہ)
لکچرار شعبہ معاشیات جامعہ عثمانیہ

تعارف

ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے اردو امتحانات کا مفید اور سودمند سلسلہ قائم کیا گیا ہے امیدواران امتحان کی سہولت کیلئے سنہ ۱۳۴۹ف میں چند عام فہم تقریروں کا اہتمام بھی کیا گیا تھا چونکہ اردو فاضل کے امتحان میں معاشیات کا مضمون بھی شریک ہے اس لئے اس موضوع پر بھی جناب محمد ناصر علی صاحب ام اے استاذ معاشیات جامعہ عثمانیہ کی دو تقریروں کا انتظام ۴ اور ۵ تیر سنہ ۱۳۴۹ف کو عمل میں آیا تھا ان تقریروں کا مقصد یہ تھا کہ نہ صرف ادارہ کے امتحانات کے امیدواروں بلکہ دوسرے شایقین کو بھی معاشیات کے مفہوم اور اس کی اہمیت سے آگاہی حاصل ہوجائے۔

ان تقریروں کو جناب محمد ناصر علی صاحب نے نظر ثانی کے بعد مرتب کیا ہے ان کو مجلہ میں اس طور سے شائع کیا جارہا ہے کہ نہ صرف ناظرین مجلہ بلکہ دوسرے شایقین بھی استفادہ کرسکیں معاشیات کے اصول اور اس کے معلومات کی اہل ملک میں زیادہ سے زیادہ اشاعت کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کی پیشرفت میں یہ کوشش عمل میں لائی جارہی ہے۔

محمد غوث

مدیر مجلہ طیلسانین

فہرست

معاشیات کی الف بے

(۲) معاشیات کس قسم کا علم ہے

موجودہ زمانے میں علم کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے سہولت کی خاطر علوم کی وسیع تعلیم دو طرح پر کی گئی ہے :-

(الف) علوم فطری اور (ب) علوم عمرانی

علوم فطری سے مراد وہ علوم ہیں جن میں قدرتی اشیا پر بحث کیجاتی ہے ان کا موضوع بحث مادہ ہوتا ہے۔ فلکیات جس میں اجسام فلکی کا حال معلوم کیا جاتا ہے۔ ارضیات جس میں زمین کے مختلف حالات اور کیفیات پر بحث کیجاتی ہے۔ طبعیات جس میں روشنی، حرارت اور برق سے بحث کیجاتی ہے نباتیات جس میں مختلف پودوں کی خصوصیات اور نشو و نما کی کیفیت سے بحث کیجاتی ہے علوم فطری میں شامل ہیں علوم فطری کے برعکس علوم عمرانی کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کا تعلق انسان اور اسکی جماعتوں سے ہوتا ہے۔ اخلاقیات، عمرانیات، سیاسیات، تاریخ اور نفسیات وغیرہ عمرانی علوم ہیں معاشیات بھی ایک عمرانی علم ہے۔ اخلاقیات میں انسانی جماعتوں کے اخلاقی پہلو کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ عمرانیات میں معاشرتی حالات پر بحث کیجاتی ہے اسی بنا پر عمرانیات کو معاشرتی تعلقات کا علم کہا جاتا ہے سیاسیات میں سلطنت یا حکومت کی ماہیت اس کے اصول اور راعی و رعیت کے باہمی تعلقات کا مطالعہ کیا جاتا ہے تاریخ میں گذشتہ اور موجودہ حالات کا بالتفصیل ذکر کیا جاتا ہے اور نفسیات میں انسان کی ذہنی اور نفسی کیفیتوں پر بحث کیجاتی ہے۔ جہاں تک معاشیات کا تعلق ہے اس میں

لہ یہ مقالہ ان تقاریر کا خلاصہ ہے جو ۱۹۴۶ء میں ادارہ ادبیات اردو کے زیر سرپرستی شائع کی گئی تھیں۔

انسان کی معاشی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے بحث کی جاتی ہے۔ اگر ہم معاشیات کے متعلق صرف یہ کہہ دیں کہ اس میں انسان کی معاشی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو اس سے ہماری تشفی نہیں ہوتی اور ہم اس کے نفس مضمون یا موضوع بحث کو اچھی طرح سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔

(۳) معاشیات کا نفس مضمون یا موضوع بحث

معاشیات کے نفس مضمون کے متعلق ابتداءً بہت کچھ غلط فہمی پائی جاتی تھی اور اب بھی ناواقف لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ معاشیات دولت پرستی کا علم ہے اور اس میں دولت جمع کرنے اور کنجوس بننے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ ڈکنس، کارلائل اور رسکن نے اپنی تصانیف میں علم معاشیات پر طرح طرح سے حملے کئے ہیں۔ کارلائل نے اس کو "گاسپل آف میمونزم" یا "کتاب فاروئیت" کے نام سے تعبیر کیا ہے۔

معاشیات درحقیقت ایسی کتاب نہیں ہے جس کے پڑھنے سے "فارونیت" کی ترغیب ہوتی ہے۔ معاشیات کے متعلق یہ خیال کہ وہ دولت پرستی، کنجوسی یا خود غرضی کا علم ہے صحت پر مبنی نہیں۔ اس کے بارے میں یہ بدظنی محض غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ ابتداءً یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس کا نفس مضمون یا موضوع بحث صرف دولت ہے۔ لیکن معاشیات کا براہ راست اور حقیقی نفس مضمون دولت نہیں بلکہ انسانی احتیاجات اور ان کی بہتر طریق پر تکمیل ہے۔ دولت کو اس میں شک نہیں کہ معاشیات سے بہت قریبی تعلق ہے لیکن یہ براہ راست معاشیات کا نفس مضمون نہیں۔ معاشیات کو دولت سے بس یہی تعلق ہے کہ یہ انسانی احتیاجات کو پورا کرنے کا ایک ذریعہ ہے! اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ معاشیات میں دولت پس انداز کرنے کے شرائط اور ذرایع پر بحث کی جاتی ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ معاشیات میں بہر صورت دولت جمع کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ اگر ایک شخص اپنی ناگزیر احتیاجات کی پابجائی نہ کرکے دولت جمع کرے تو معاشیانی نقطۂ نظر سے اس قسم کی پس اندازی کبھی جائز نہیں قرار دی جا سکتی۔

کیونکہ ناکافی اور غیر صحت بخش غذا، لباس اور مکان کی وجہ سے قوت کارگذاری متاثر ہوتی ہے اور انسان قبل از وقت از کار رفتہ ہوکر پیدایش کے کاروبار میں حصہ لینے سے محروم ہو جاتا ہے۔ چونکہ اس قسم کی پس اندازی سے بجائے فائدے کے بالآخر نقصان ہوتا ہے اس لیے ایسے غیر معاشی پس اندازی کہیں گے۔ معاشیات کا اصل مقصد دولت جمع کرنے کی ترغیب دینا نہیں بلکہ دولت کی بہتر پیدایش یا بہتر تقسیم، بہتر مبادلہ اور بہتر صرف کے اصول اور نظریے پیش کرنا اور بحیثیت مجموعی بنی نوع انسان کی عام مادی خوشحالی کے اسباب کی تشریح و توضیح کرنا ہے۔

(۴) معاشیات کے مباحث

مادی زندگی کو خوشحال بنانے کے لیے چونکہ دولت کی مناسب مقدار ناگزیر ہے اس لیے ابتداءً معاشیات میں اُن مختلف امور پر بحث کی جاتی ہے جن کے ذریعہ کم سے کم مصارف میں زیادہ سے زیادہ دولت پیدا کی جاسکتی ہے۔ جس شعبہ میں دولت کی پیدایش اور اس کی زیادتی کے اسباب پر بحث کی جاتی ہے اُسے اصطلاحاً "پیدایش دولت" کا شعبہ کہتے ہیں۔

معاشیات کے مباحث کا دوسرا شعبہ "تقسیم دولت" ہے۔ فرض کیجیے ایک کارخانے میں جملہ (۔۔۔۔۱) روپے کی مصنوعات فروخت ہوئیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام قیمت کارخانہ دار کی جیب میں نہیں جاسکتی کیونکہ مصنوعات کی تیاری میں ایک طرف تو زمین سے مدد لی گئی، دوسری طرف سرمایہ سے، تیسری طرف مزدوروں سے اور چوتھی طرف خود کارخانہ دار نے منتظم کی حیثیت سے کام کیا۔ لہٰذا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مذکورہ قیمت (یعنی ۔۔۔۔۱ روپے) میں سے زمین، مزدور اور سرمایہ کا کس قدر معاوضہ ہوگا اور کارخانہ دار کو کتنی رقم ملنی چاہیے۔ زمین کے حصے کو لگان یا کرایہ کہتے ہیں، مزدوروں کا حصہ اُجرت کہلاتا ہے، سرمایہ کے حصے کو سود کہتے ہیں اور کارخانہ والے کا معاوضہ منافع کہلاتا ہے۔ تقسیم دولت کے شعبہ میں اُن اصول و نظریوں کی تشریح کی جاتی ہے جن کے تحت اُجرت، سود، لگان اور منافع کا تعین ہوتا ہے۔

معاشیات کے مباحث کا تیسرا شعبہ "مبادلہ دولت" کہلاتا ہے۔ روزمرہ زندگی میں

ہم اس امر کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ کاشت کار ۔ جلاہے ۔ بڑھئی ۔ لوہار اور معمار وغیرہ بالعموم اپنی محنت کے نتیجے (یعنی مصنوعات) سے براہ راست خود مستفید نہیں ہوتے بلکہ اُسے دوسروں کے ہاتھ فروخت کرتے ہیں ۔ حاصل شدہ قیمت سے مختلف اشیاء خرید کر اپنی گوناگوں احتیاجات رفع کرتے ہیں ۔ مبادلۂ دولت کے شعبہ میں یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ افراد کو مبادلہ کی ضرورت کیوں لاحق ہوتی ہے ! اس سے کس قسم کے فوائد حاصل ہوتے ہیں ۔ مبادلے کے کاروبار کیونکر عمل میں آتے ہیں لیکن مختلف اداروں کی بدولت مبادلے کے کاروبار میں سہولت بہم پہنچتی ہے ۔ اشیاء کی قیمتیں کیونکر معین ہوتی ہیں وغیرہ وغیرہ ۔

معاشیات کے مباحث کا چوتھا شعبہ "صرف دولت" ہے ۔ اس شعبہ میں احتیاجات کی نوعیت اور ان کی خصوصیات پر بحث کی جاتی ہے اور اُن اصول و قوانین کی تشریح کی جاتی ہے جن پر ہم دولت صرف کرتے وقت عمل کرتے ہیں ۔ معاشیات کے مختلف مباحث میں صرف دولت کا شعبہ بہت اہمیت رکھتا ہے ۔ جدید معاشئین اسے سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اسی کو معاشیات کے تمام مباحث کا مرکز اور محور بتاتے ہیں ۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ صرف دولت کی احتیاج کی وجہ سے ہیں دولت پیدا کرنے تقسیم کرنے اور اس کا مبادلہ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے ۔ عام مرفہ الحالی اور خوشحالی کے نقطۂ نظر سے معاشیات کے مباحث کا ہر شعبہ اپنی اپنی جگہ خاص اہمیت رکھتا ہے ۔ ان سب شعبہ جات کے مسائل براہ راست یا بالواسطہ جزوی یا کلی طور پر ہماری معاشی زندگی کی خوشحالی سے متعلق ہوتے ہیں ۔ معاشیات کا حقیقی مقصد بنی نوع انسان کی معاشی خوشحالی ہے ۔ اسی مقصد کے پورا کرنے کے لئے اس میں دولت کی پیدائش تقسیم ، مبادلے اور صرف پر بحث کی جاتی ہے کیونکہ جب تک دولت کی معقول مقدار پیدا نہ کی جائے یا اُس کی مناسب تقسیم نہ ہو اس کے مبادلے کا بہتر انتظام نہ کیا جائے یا صرف کا طریقہ ٹھیک نہ ہو تو پھر معاشیات کا حقیقی مقصد بطور احسن نہیں پورا ہوسکتا ۔

مذکورہ چار شعبوں کے علاوہ معاشیات کے مباحث کا ایک اور شعبہ بھی ہے جس کو "مالیات" یا فینانس کہتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ کسی ملک کے باشندوں کی مرفہ الحالی کو حاصل کرنے اسے برقرار رکھنے یا اس میں اضافہ کرنے میں حکومت کی جد وجہد کو بہت بڑا دخل ہے۔ ملک میں امن وامان قائم رکھنے کے لئے فوج اور پولیس رکھنی پڑتی ہے۔ علوم وفنون کی اشاعت کے لئے وسیع پیمانے پر مدارس قائم کرنے پڑتے ہیں۔ زراعت۔ صنعت وحرفت۔ تجارت اور نقل وحمل کی ترقی کے لئے گوناگوں تدابیر اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان تمام امور کی تکمیل کے لئے حکومت کو آمدنی کی ضرورت ہوگی۔ لہذا حکومت مختلف قسم کے محاصل اور ٹکس عاید کرکے آمدنی حاصل کرتی ہے اور اسے رعایا کی مرفہ الحالی اور خوشحالی پر صرف کرتی ہے۔ مالیات کے شعبہ میں یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ حکومت کے معاشی فرایض کیا ہیں۔ ان فرایض کو انجام دینے کے لئے حکومت کن مختلف ذرائع سے آمدنی حاصل کرتی اور کن مدات پر صرف کرتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر مالیات میں ان مسائل پر بحث کی جاتی ہے جو حکومت کے ذرائع آمدنی اور خرچ سے متعلق ہیں۔

(۵) معاشیات کی قسمیں

معاشیات کے متعلق یہ معلوم کرنے کے بعد کہ یہ کس قسم کا علم ہے۔ اس کا نفس مضمون یا موضوع بحث کیا ہے۔ اس کے مباحث کو کن مختلف شعبوں میں تقسیم کیا گیا ہے ---- اس کی قسموں کا مختصر تذکرہ بھی ضروری ہے۔ مسائل کی نوعیت کا لحاظ کرتے ہوئے معاشیات کی دو قسمیں کی جاسکتی ہیں (۱) نظری معاشیات اور (۲) عملی معاشیات۔ نظری معاشیات کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں معاشی قوتوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ معاشی رجحانات کی تشریح وتوضیح کی جاتی ہے۔ اور معاشی خوشحالی کے اصول اور نظریے پیش کئے جاتے ہیں نظری معاشیات کا کام اس امر کی وضاحت کرنا ہے کہ "کیا ہے"۔ برعکس اس کے "کیا ہونا چاہیے" کا مسئلہ نظری معاشیات کے مباحث سے خارج ہے۔ نظری معاشیات میں

معاشی قوتوں، اصول و قوانین اور نظریوں کو بیان کیا جاتا ہے لیکن معاشی اصلاح کے متعلق کسی قسم کی رائے زنی نہیں کی جاتی۔ "کیا ہونا چاہیے" کا مسئلہ عملی معاشیات سے تعلق ہے۔ عملی معاشیات کو معاشی اصول، قوانین اور نظریوں کی تحقیق اور ترتیب سے سروکار نہیں ہوتا بلکہ اس میں عملاً معاشی مسائل کو حل کرنے اور معاشی زندگی کے روزمرہ الجھے ہوئے حالات کو سلجھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگر نظری معاشیات "کیا ہے" سے بحث کرتی ہے تو عملی معاشیات میں "کیا ہونا چاہیے" سے بحث کی جاتی ہے۔ عام طور پر "کیا ہے" کا مسئلہ اتنا اہم نہیں معلوم ہوتا جتنا کہ "کیا ہونا چاہیے" کا۔ اسی لحاظ سے بظاہر نظری معاشیات سے زیادہ عملی معاشیات اہم معلوم ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ ہم ایک کو زیادہ اہمیت دے کر دوسری کو زیادہ گھٹا نہیں سکتے۔ معاشیات کا حقیقی مقصد یعنی بنی نوع انسان کی عام معاشی خوشحالی، اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک کہ نظری اور عملی معاشیات سے مدد نہ لی جائے۔ جس طرح کپڑے کی تراش کے لیے قینچی کے دونوں پھلوں کا اشتراک ناگزیر ہے اسی طرح معاشی مسائل کی تحلیل کے لیے نظری اور عملی معاشیات کا اشتراک ضروری ہے۔ جس طرح ڈاکٹر جراحی کے اصول اور طریقوں سے واقف ہوئے بغیر کامیاب اپریشن نہیں کر سکتا اسی طرح ایک مصلح معیشت نظری معاشیات کے اصول و قوانین کو جانے بغیر معاشی اصلاح کا معقول اور متوازن پروگرام نہیں مرتب کر سکتا۔ نظری معاشیات سے ناواقف شخص کے ہاتھ میں معاشی اصلاح کا پورا اقتدار دے دینا ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک اناڑی کے ہاتھ میں عمل جراحی کے آلات و اوزار کا پکڑا دینا۔

(۶) معاشیات ہند

معاشیات ہند عملی معاشیات ہے۔ اس کا مقصد ہندوستانی باشندوں کی مادی زندگی کو خوشحال بنانا ہے۔ سہولت کی خاطر نظری معاشیات کے مباحث کی طرح معاشیات ہند کے مباحث کو بھی چار عنوانات کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) ہندوستان اور پیدائش دولت (۲) ہندوستان اور تقسیم دولت (۳) ہندوستان اور مبادلہ دولت (۴) ہندوستان اور صرف دولت۔

پہلے عنوان کے تحت یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ یہاں کے وسائل معاش کیا ہیں۔ بہ الفاظ دیگر یہاں کی زمینات۔ دریا۔ پہاڑ۔ آبشار۔ جنگلات۔ معدنیات اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کا معاشی افادیت کے نقطۂ نظر سے تفصیلی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ نیز یہاں کی آبادی کے تفصیلی حالات بلحاظ تعداد اور بلحاظ قسم معلوم کئے جاتے ہیں۔ پیدائش دولت کے مختلف طریقوں مثلاً زراعت۔ صنعت وحرفت۔ تجارت اور نقل وحمل کے بھی مکمل حالات معلوم کئے جاتے ہیں۔ ان میں جو خرابیاں ہیں ان کے اسباب دریافت کئے جاتے ہیں اور انھیں دور کرنے کی تجاویز پیش کی جاتی ہیں۔ مختصر یہ کہ اس عنوان کے تحت اُن تمام امور پر بحث کی جاتی ہے جن کے ذریعہ ملک کے وسائل سے ممکنہ استفادہ کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ دولت پیدا کی جاسکتی ہے۔

دوسرے عنوان کے تحت یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ ہندوستان میں سالانہ کس قدر دولت پیدا ہوتی ہے! اگر اس دولت کو یہاں کی جملہ آبادی پر تقسیم کیا جائے تو فی کس سالانہ کس قدر اوسط آمدنی ہوتی ہے۔ دیگر ممالک کے مقابلہ میں یہاں کی اوسط آمدنی کا کیا حال ہے۔ مزدوروں کی اُجرتوں حکومت اور زمین داروں کی اراضیات کے معاوضے یعنی مالگزاری اور لگان کے تفصیلی حالات اسی شعبہ میں معلوم کئے جاتے ہیں۔ سرمایہ داروں کی آمدنی یعنی سود، کارخانہ داروں کی آمدنی یعنی منافع کی نوعیت بھی اسی شعبہ میں معلوم کی جاتی ہے۔

تیسرے عنوان کے تحت تین امور کی تشریح کی جاتی ہے۔ پہلا یہ کہ یہاں کے آلات مبادلہ کیا ہیں۔ دوسرے یہ کہ مبادلے کے کاروبار میں کن مختلف اداروں کے ذریعہ سہولت بہم پہنچ رہی ہے۔ تیسرے یہ کہ یہاں پر مختلف سنین یا مختلف ادوار میں قیمتوں کا کیا حال رہا ہے۔

آلات مبادلہ سے مراد وہ مختلف سکے اور نوٹ ہیں جن کے ذریعہ اشیا کی خرید وفروخت میں ناگزیر مدد ملتی ہے۔ ہندوستان میں سکے اور نوٹوں کے استعمال کی موجودہ نوعیت، ان کے

استعمال کی ابتدا اور نشو ونما کا تفصیلی حال معلوم کیا جاتا ہے۔

مبادلے کے کاروبار میں سہولت بہم پہنچانے والے اداروں سے ہماری مراد بنک ہیں۔ یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ ہندوستان میں نظام بنک کاری کی موجودہ نوعیت کیا ہے۔ یہاں پر کن مختلف اقسام کے بنک کام کر رہے ہیں۔ ان کا باضابطہ آغاز کب ہوا اور اس کے بعد سے ان کی نشو ونما کا کیا حال رہا ہے مختصر یہ کہ ہندوستان میں زر۔ بنک اور قیمتوں کے تفصیلی حالات اسی شعبہ میں معلوم کئے جاتے ہیں۔

صرف دولت کے شعبہ میں یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ ہندوستانی باشندے کس قسم کی غذا لباس اور مکان استعمال کرتے ہیں۔ بلحاظ قسم اور بلحاظ مقدار ان کی کیا نوعیت ہے۔ مستعملہ اشیاء کے لحاظ سے ان کے معیار رہائش کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ اگر معیار رہائش مقابلتہً ادنیٰ اور معمولی ہے تو اس کے اسباب معلوم کئے جاتے ہیں اور اسے بلند کرنے کی تدابیر پیش کی جاتی ہیں۔

معاشیات ہند کے مباحث کا ایک اور شعبہ مالیات ہے۔ اس شعبہ میں یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ حکومت ہند کے ذرائع آمدنی کیا ہیں۔ ان سے سالانہ کس قدر آمدنی ہوتی ہے اور حکومت اس آمدنی کو باشندوں کی فلاح و بہبود پر کیونکر صرف کرتی ہے۔ مالگزاری۔ انکم ٹکس۔ کروڑ گیری چنگی۔ سرکاری قرضہ جات وغیرہ کا تفصیلی حال اسی شعبہ میں معلوم کیا جاتا ہے اور بجٹ کی بہتر ترتیب پر بحث کی جاتی ہے۔

معاشیات کے متعلق اب تک جن مختلف امور کی توضیح کی گئی اس سے اندازہ ہوگا کہ معاشیات کس قسم کا علم ہے۔ اس کا نفس مضمون یا موضوع بحث کیا ہے۔ اس کے مباحث کی تقسیم کیوں کر کی گئی ہے۔ اس کی قسمیں کیا ہیں۔ معاشیات ہند سے کیا مراد ہے اور اس میں کن مختلف امور پر بحث کی جاتی ہے۔ اب ہم اس علم کی مختصر تاریخ بھی بیان کریں گے تاکہ اس کے متعلق اہم ابتدائی امور ذہن نشین ہو جائیں۔

(۲) معاشیات کی ابتدا اور نشو و نما

معاشیات ایک جدید علم ہے اس کی ابتدا وسط اٹھارھویں صدی سے ہوتی ہے۔ لیکن عہد قدیم میں بھی مختلف عالموں نے اپنے مضامین اور کتابوں میں معاشی خیالات کا اظہار کیا ہے چنانچہ یونان کے مشہور فلسفی افلاطون۔ زنوفن اور ارسطو نے اپنی تصانیف میں معاشی خیالات کا اظہار کیا ہے اسی طرح رومی فلسفیوں مثلاً سسرو، سنیکا اور پلینی اعظم وغیرہ کی تصانیف میں بھی معاشی مباحث ملتے ہیں۔ نیز رومی مقننوں نے بھی معاشی مسائل کے متعلق اظہار خیال کیا ہے اس میں شک نہیں کہ قدیم مفکرین نے معاشیات کو علمی بنیادوں پر نہیں قائم کیا تاہم معاشیات کی تاریخ کے بیان کرتے وقت ان کی خدمات کو خواہ وہ کس قدر معمولی کیوں نہ ہوں کسی طرح نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

سولھویں صدی سے لے کر وسط اٹھارویں صدی کا زمانہ معاشیات کی تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے اس دور کو عہد تجاریت کہا جاتا ہے! اس زمانے میں جن عالموں نے معاشی خیالات کا اظہار کیا ہے انھیں تجارئیین یا مرکنٹیلسٹ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ علمار ملک کی مادی ترقی کے لئے تجارت پر بہت زور دیتے تھے اس لئے انھیں تجارئیین کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تھامس من۔ ولیم پٹی اور جوشیا چائلڈ وغیرہ ممتاز تجارئیین گزرے ہیں۔ تجارئیین کے اہم خیالات یہ تھے ــ (۱) جہاں تک ہو سکے ملک میں سونا چاندی زیادہ سے زیادہ مقدار میں جمع رکھے جائیں۔ (۲) ملک کے باشندوں کو چاہیے کہ وہ جس قدر اشیا دیگر ممالک سے اپنے ہاں منگواتے ہیں ان سے زیادہ اشیا اپنے ملک سے دیگر ممالک کو روانہ کریں تاکہ ملک میں سونے چاندی کی درآمد ہو سکے۔ (۳) یہ لوگ صنعت کو زراعت پر غیر ضروری ترجیح دیتے تھے۔ (۴) چونکہ آبادی قومی طاقت کا ایک عنصر ہے لہذا اس خیال کے حامی تھے کہ ملک کی آبادی زیادہ سے زیادہ ہو۔ (۵) ہر قسم کی ترقی کے لئے حکومت کی امداد ضروری تصور کرتے تھے۔

وسط اٹھارویں صدی میں معاشی مفکرین کا ایک گروہ نمودار ہوا جس کو فطرآئین یا

فزیوکراٹس کہتے ہیں معاشیات کی ترقی میں فطرائین کی خدمات بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ انھیں بانیان معاشیات کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ چونکہ فطرائین قانون فطرت کے حامی تھے لہذا انھیں فطرائین کہنا مناسب سمجھا گیا۔ کوئنے۔ گورنے اور ترگو اہم فطرائین گذرے ہیں۔ فطرائین کے اہم خیالات یہ تھے (۱) انسان اپنی ہر جد وجہد میں کسی خود ساختہ نظام کے تابع نہیں ہوتے بلکہ وہ ایک قدرتی نظام پر عمل کرتے ہیں۔ اس قدرتی نظام کو وہ "قانون فطرت" کہتے تھے (۲) ان کے نزدیک حکومت کا کام بس اسی قدر تھا کہ وہ رعایا کی جان و مال اور آزادی کی حفاظت کرے اور دیگر معاملات میں مداخلت نہ کرے۔ فطرائین عدم مداخلت کی پالیسی کے حامی تھے اور یہ اصطلاح انھیں کی ساختہ ہے۔ (۳) ان کے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت زراعت کو حاصل تھی اور وہ یہ کہتے تھے کہ زراعت ہی ایک ایسا پیشہ ہے جس کے ذریعہ ہر سال دولت پیدا ہوتی ہے اور اس سے تمام قوم کی کفالت ہوتی ہے۔ (۴) زراعت کے ذریعہ جس قدر دولت پیدا ہوتی ہے وہ تمام افراد قوم کے مابین تقسیم ہوتی ہے۔ اسی بناء پر وہ صرف زراعت کو پیدا آور پیشہ تصور کرتے تھے۔ دیگر پیشے ان کے نزدیک غیر پیدا آور تھے یعنی ان پیشوں سے کسی قسم کی جدید دولت نہیں پیدا ہوتی۔ (۵) چونکہ وہ یہ خیال کرتے تھے کہ صرف زراعت ہی کے ذریعہ ہر سال جدید دولت پیدا ہوتی ہے لہذا ٹکس بھی صرف زراعت ہی پر عاید کیا جانا چاہیے۔ فطرائین کی سب سے اہم خدمت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے پیشرووں کے غلط خیالات پر تنقید کی اور اس کی بدولت معاشیات کو ترقی ہوئی۔

معاشی تاریخ میں جو نام سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے وہ آدم اسمتھ (۱۷۲۳ تا ۱۷۹۰) کا ہے۔ اس نے ۱۷۷۶ء میں ایک مشہور کتاب "دولت اقوام" لکھی۔ یہ کتاب دو جلدوں میں لکھی گئی ہے جس میں ۵ حصے اور بحیثیت مجموعی (۳۲) ابواب ہیں۔ پہلے حصہ میں اس نے ان امور پر بحث کی ہے جن کے ذریعہ افراد کی دولت پیدا کرنے کی قابلیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ مزید برآں یہ بھی بتلایا ہے کہ جب زمین۔ مزدور اور سرمایہ وغیرہ کی اجتماعی جد وجہد سے دولت پیدا

کی جائے تو پیدا شدہ دولت مذکورہ ارکان کے مابین کیونکر تقسیم ہوگی۔ دوسرے حصہ میں سرمایہ کی ماہیت پر بحث کی گئی ہے۔ نیز یہ بتلایا گیا ہے کہ سرمایہ کے اجتماع کے لئے کن حالات کا ہونا ضروری ہے اور جمع کیا ہوا سرمایہ مختلف کاروبار میں کیونکر مشغول کیا جا سکتا ہے۔ تیسرے حصے میں یہ بتلایا گیا ہے کہ قوموں کی دولت مندی کے کیا اسباب ہو سکتے ہیں۔ اگر ان پر مصنوعی تحدیدات عاید کی جائیں تو اس کے کیا نتائج برآمد ہوں گے۔ شہروں اور دیہاتوں کے مابین تجارت کے مفید نتائج پر بھی اسی حصے میں بحث کی گئی ہے۔ چوتھی کتاب میں اس نے اپنے پیش رو مفکرین یعنی تجارئین کے اہم نظریات کو مختلف دلائل کے ذریعہ غلط ثابت کیا ہے۔ پانچویں کتاب میں حکومت کی آمدنی کے ذرائع اور مدات خرچ پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

"دولت اقوام" کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کا ترجمہ دنیا کی تقریباً تمام ترقی یافتہ زبانوں میں ہو چکا ہے۔ خود آدم اسمتھ کے زمانے میں یہ کئی مرتبہ چھپ چکی تھی۔ اس کتاب کا اس زمانے کے سیاست دانوں پر بہت گہرا اثر پڑا اور اس کا شمار دنیا کی بڑی کتابوں میں ہوتا ہے۔ یہی کتاب درحقیقت علم معاشیات کا سنگ بنیاد ہے۔ اس کی تصنیف کے ذریعہ چونکہ آدم اسمتھ نے معاشیات کو علمی بنیادوں پر قائم کیا لہذا اسے معاشیات کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔

آدم اسمتھ کے بعد دوسرے اہم نام بنتھم اور مالتھس کے ہیں۔ جرمی بنتھم (۱۷۴۸ء تا ۱۸۳۲ء) نے معاشیات پر مختلف کتابیں اور رسالے لکھے ہیں۔ ان میں "ربا کی وکالت" بہت مشہور ہے۔ بنتھم ایک معاشی سے کہیں زیادہ ایک فلسفی تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس نے معاشیات کی ترقی میں جو اہم خدمت انجام دی ہے اسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

روبرٹ مالتھس (۱۷۶۶ء تا ۱۸۳۴ء) کی سب سے اہم خدمت یہ ہے کہ اس نے عوام کی توجہ ایک ایسے مسئلہ کی جانب منعطف کرائی جو معاشی لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یہ مسئلہ آبادی کا ہے۔ ۱۷۹۸ء میں اس نے آبادی پر ایک مضمون شائع کیا۔ اس کی اشاعت کے بعد وقتاً فوقتاً اس میں مختلف قسم کی تبدیلیاں کی گئیں چنانچہ اسی مضمون کو جدید شکل میں ۱۸۰۳ء میں پیش کیا گیا۔ اس مرتبہ اس کا نام "اصول آبادی"

رکھا گیا۔ مالتھس کے اس مضمون کو بہت اہمیت حاصل ہوئی۔ چنانچہ اس کی زندگی میں کوئی چھ مرتبہ اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ آخری مرتبہ یہ مضمون ۱۸۲۶ء میں شائع ہوا اور آج کل یہی نسخہ باقی ہے۔ نہایت مختصر طور پر ہم مالتھس کے نظریۂ آبادی کو اس طرح بیان کرسکتے ہیں "جس رفتار سے آبادی میں اضافہ ہوتا ہے اسی رفتار سے ذرائع معاش میں زیادتی نہیں ہوتی۔ لہذا ایسی صورت میں آبادی کی روک تھام کے لئے اگر اخلاقی ضبط (مثلاً شادیاں دیر سے کرنا اور ساتھ ہی ساتھ ناجائز طریق پر جنسی جذبات کی تکمیل سے احتراز کرنا) سے کام نہ لیا جائے تو دوسرے ذرائع مثلاً مختلف قسم کی بیماریوں، قحطوں، زلزلوں اور جنگ وجدال وغیرہ کی بدولت خود بخود آبادی میں مناسب تخفیف ہوگی"۔ آبادی کے اس نظریہ کو چونکہ مالتھس کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے لہذا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ مالتھس ہی نے سب سے پہلے اس نظریہ کو پیش کیا۔ مالتھس سے قبل وقتاً فوقتاً مختلف مفکرین نے اس مسئلہ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ لیکن مالتھس کا امتیاز یہ ہے کہ اس نے اس نظریہ کو سب سے پہلے منظم اور مدلل طریق پر پیش کیا۔ اسی بنا پر اس نظریہ کو مالتھس کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔

مالتھس کے بعد دوسرا اہم معاشی ڈیوڈ ریکارڈو (۱۷۷۲ء تا ۱۸۲۳ء) گذرا ہے۔ ریکارڈو آدم اسمتھ کا پیرو تھا۔ معاشی مسائل کے متعلق اس نے بہت سے مضامین اور کتابچے لکھے ہیں لیکن اس کی سب سے اہم تصنیف "اصول معاشیات" ہے۔ اس کتاب میں ریکارڈو نے مختلف معاشی مسائل پر بحث کی ہے۔ لیکن ان میں مسئلہ لگان کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ ریکارڈو کے مسئلہ لگان کا خلاصہ یہ ہے "استعمال زمین کی بنا پر کاشت کار جو معاوضہ زمیندار کو ادا کرتا ہے وہ لگان ہے۔ اور یہ لگان قیمت پیداوار میں سے جز مصارف کاشت منہا کرنے کے بعد جو کچھ بچ رہے اس کے مساوی ہوتا ہے"۔ تجارت بین الاقوام اور زر وغیرہ کے متعلق بھی ریکارڈو نے قابل قدر خیالات کا اظہار کیا ہے۔

ریکارڈو کے بعد جیمس مل اور میکلاک کے نام قابل ذکر ہیں لیکن ان میں زیادہ

اہمیت ناسو دلیم سینیر (۱۷۹۱ء تا ۱۸۶۴ء) کو حاصل ہے۔ اس کی ایک مشہور کتاب اصول معاشیات کا خاکہ ۱۸۳۶ء میں شائع ہوئی۔ سینیر کے بیان کردہ مسائل میں نظریۂ سود کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ سود کے متعلق اس نے "اجتناب کا نظریہ" پیش کیا، وہ کہتا ہے کہ سود اجتناب کا معاوضہ ہے۔ اجتناب سے مراد رقم جمع کرنے والوں کا یہ فعل ہے کہ وہ اپنی موجودہ احتیاجات میں سے چند کی تکمیل کرنے سے پرہیز کرتے ہیں اور رقم جمع کرتے ہیں۔

تاریخ معاشیات میں دوسرا اہم نام جان اسٹورٹ مل (۱۸۰۶ء تا ۱۸۷۳ء) کا ہے۔ مل کی اہم کتاب "اصول معاشیات" ہے۔ مل کا مقصد دراصل ایسی تصنیف پیش کرنا تھا جو عام استعمال میں آدم اسمتھ کی کتاب "دولت اقوام" کی جانشین بن جائے۔ اگرچہ مل اس تدبیر میں ناکام رہا تاہم اس کی خدمات اس قدر اہم ہیں کہ آدم اسمتھ کے بعد اُسے دنیا کے بڑے معاشیین میں جگہ دی جانی چاہیے۔ تعین اُجرت کے متعلق اس کا ایک نظریہ بہت مشہور ہے جسے "نظریہ اجرت فنڈ" کہتے ہیں! اس نظریہ کا خلاصہ یہ ہے ہر ملک میں مزدوروں کی اجرتیں ادا کرنے کے لئے سرمایہ کا ایک ذخیرہ ہوتا ہے۔ اس ذخیرہ کے مقابلے میں مزدوروں کی تعداد جس قدر زیادہ ہوگی اجرتوں کی شرح میں کمی ہوگی! اس کے برعکس مزدوروں کی تعداد جس قدر کم ہوگی اُسی لحاظ سے اجرتوں کی شرح بھی زیادہ ہوگی" موجودہ زمانے میں یہ نظریہ غلط ثابت ہو چکا ہے تاہم اسے تاریخی اہمیت ضرور حاصل ہے۔

مذکورہ معاشیین کے علاوہ وقتاً فوقتاً اور بھی بہت سے مشہور معاشیین گذرے ہیں انھوں نے اپنی مختلف تصانیف کے ذریعہ معاشیات کی ترقی میں حصہ لیا۔ ان معاشیین میں حسب ذیل نام اہم ہیں۔ (۱) کیری۔ لستا۔ سے۔ راؤ۔ فان تھیونن سسمنڈی۔ ڈر۔ فریڈرک لسٹ۔ ماڈرڈیل اور فان ہرمن وغیرہ۔

(۲) راڈبرٹس۔ لاسیل اور کارل مارکس وغیرہ۔

(۳) رچرڈ جونس۔ ڈاکٹر بجہٹ۔ انگرام اور ٹائن بی وغیرہ۔

(۴) زوشر ۔ ہلڈی براانڈ ۔ کارل کینز ۔ شالرا ورشفلے وغیرہ ۔

(۵) گاسن ۔ جیونس اور والراس وغیرہ ۔

(۶) منجر ۔ وینزرا ور بوہم بارک وغیرہ ۔

جدید معاشیین میں ڈاکٹر مارشل (سنہ ۱۸۴۲ء تا سنہ ۱۹۲۴ء) کا نام بہت اہمیت رکھتا ہے ۔ قدیم معاشیین میں جو اہمیت آدم اسمتھ کو حاصل ہے جدید معاشیین میں تقریباً وہی اہمیت ڈاکٹر مارشل کو حاصل ہے اسی بناء پر ڈاکٹر مارشل کو جدید معاشیات کا بانی کہا جاتا ہے ۔ مارشل کی سب سے اہم تصنیف "اصول معاشیات" ہے ۔ یہ کتاب سنہ ۱۸۹۰ء میں شائع ہوئی ۔ اسے طبع ہوکر کوئی پچاس سال سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے لیکن اب بھی اسے بہت ممتاز حیثیت حاصل ہے چنانچہ اس کو مختلف جامعات میں نصابی کتاب کی حیثیت سے استعمال کیا جاتا ہے ۔ مارشل کی سب سے اہم خدمت یہ ہے کہ اس نے قدیم نظریات کو جدید حالات کی روشنی میں صحت اور عمدگی کے ساتھ پیش کیا ہے ۔

ڈاکٹر مارشل کے بعد بیلگر بو ۔ پیگو ۔ وکسٹیڈ ۔ وکسل ۔ کیس ۔ رابرٹ سن ۔ ہابسن ۔ ہنڈرسن ۔ راجنس ۔ کوئن اور گریگری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں ۔ پروفیسر گریگری اس وقت ہندوستان کے معاشی مشیر ہیں ۔ مذکورہ معاشیین کے علاوہ ٹیبٹن ۔ اڈمس ۔ سلگمن ۔ ٹاسگ ۔ فشر ۔ ایلی ۔ کارور ۔ ٹیلر ۔ ڈیونپورٹ اور سیگر بھی اہمیت رکھتے ہیں ۔

(۸) عہد حاضرہ میں معاشیات کی اہمیت

پچھلے چند صفحات میں معاشیات کی جو تاریخ بیان کی گئی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس علم کی ابتدا ہوکر ابھی بہت زمانہ نہیں گزرا ۔ اگر آدم اسمتھ کی کتاب "دولت اقوام" کی اشاعت (سنہ ۱۷۷۶ء) سے اس علم کی باضابطہ ابتدا کا دور شمار کیا جائے تو پھر اس کی عمر صرف ڈیڑھ سو سال سے کچھ زیادہ نظر آتی ہے ۔ لیکن اس کے باوجود موجودہ زمانے میں اس کی اہمیت بہت زیادہ ہوگئی ہے اور ہوتی جارہی ہے ۔ یوں تو تمام عمرانی علوم انسانی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کا مطالعہ کرتے ہیں اور ان سے ہمیں ناقابل انکار

مددملتی ہے لیکن معاشیات براہ راست ایک ایسے پہلو کا مطالعہ کرتا ہے جسے زمانۂ قدیم سے لے کر اب تک ہر زمانے اور ہر دور میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس پہلو سے ہماری مراد انسانی زندگی کا معاشی پہلو ہے۔ تہذیب اور شائستگی کے ابتدائی دور میں زندگی کے جہاں اور مسائل سیدھے سادے اور معمولی تھے معاشی مسائل بھی کچھ پیچیدہ نہ تھے۔ زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ خاندانی زندگی قبیلہ داری زندگی میں اور قبیلہ واری زندگی قومی زندگی میں تبدیل ہوگئی ہے۔ موجودہ زمانے میں ذرائع نقل وحمل اور ذرائع خبر رسانی کی غیر معمولی ترقی کی وجہ سے بین الاقوامی تعلقات بھی بہت وسیع اور مستحکم ہوچکے ہیں۔ لہذا اب ہماری زندگی بہت بڑی حد تک بین الاقوامی ہوگئی ہے۔ معاشرتی تعلقات کی اس ترقی کی وجہ سے معاشیات کے مسائل خاندانی، قبیلہ داری یا قومی معیشت تک محدود نہیں رہے بلکہ ان کا دائرہ بین الاقوامی معیشت تک وسیع ہوگیا ہے۔ بحیثیت مجموعی آبادی کے اضافے، ذرائع معاش کی قلت۔ معاشی کش مکش کی شدت نے خاندانی، قبیلہ داری، قومی اور بین الاقوامی معیشت کے نقطۂ نظر سے نئے نئے اور پیچ در پیچ مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ ان تمام مسائل کا مطالعہ اور تحلیل کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاشیات کے مباحث کا دائرہ روز بروز وسیع ہورہا ہے۔ اس کے لٹریچر میں دن بدن ترقی ہورہی ہے اور اسی مناسبت سے اس کی اہمیت بھی بڑھتی جارہی ہے۔ موجودہ زمانے میں معاشیات کی نمایاں اہمیت کا حقیقی سبب معاشی کش مکش کی شدت اور زیادتی ہے۔ معاشیات کا مطالعہ نہ صرف بین الاقوامی اور قومی نقطۂ نظر سے مفید ہے بلکہ اس کے ذریعہ خانہ داری معیشت کو بھی بہت کچھ بہتر بنایا جاسکتا ہے۔

(۹) کنن کی کتاب مبادی معاشیات[1]

ایڈون کنن (۱۸۶۱ء تا ۱۹۳۵ء) کی کتاب ایلمنٹری پولیٹیکل اکانمی پہلی مرتبہ ۱۸۸۸ء میں

---

[1] ادارۂ ادبیات اردو کی ایماء کے مطابق نقاریر کا ایک حصہ ایڈون کنن کی کتاب ایلیمنٹری پولیٹیکل اکانمی پر مشتمل تھا یہ کتاب ادارے کے اردو فاضل کے طلبا کے نصاب میں شریک ہے۔ ابتدائی معلومات کے لئے اس کتاب کا مطالعہ مفید ہوگا۔

شائع ہوئی اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً اس کی طباعت ہوتی رہی۔ "مبادی معاشیات" کے نام سے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب صدر جامعہ ملیہ نے اس کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ کینن نے مذکورہ کتاب میں بتلایا ہے کہ "معاشیات کا اصل مقصد بنی نوع انسان کی مادّی خوش حالی کے اسباب کی تشریح و توضیح کرنا ہے"۔ خوش حالی کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (الف) عام خوش حالی اور (ب) انفرادی خوش حالی۔ کتاب کے پہلے حصے میں عام خوش حالی پر بحث کی گئی ہے۔ اور دوسرا حصہ انفرادی خوش حالی سے متعلق ہے۔ انفرادی خوش حالی اور عام خوش حالی کے حاصل کرنے میں کسی ملک کی حکومت کو بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ لہذا اس اہمیت کے پیش نظر کتاب کے تیسرے حصے میں خوش حالی اور حکومت کے باہمی تعلق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی ترتیب کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم ابتداً عام خوش حالی پر بحث کریں گے۔

(۱) پہلا حصہ۔ عام مادّی خوش حالی

عام مادّی خوش حالی کا مفہوم عرف عام میں اُس قوم کو خوش حال سمجھا جاتا ہے جس کے پاس مجموعی طور پر زیادہ سے زیادہ دولت ہو لیکن کسی قوم کی خوش حالی کا یہ معیار صحیح نہیں۔ ایک ملک اپنی مجموعی دولت کے نقطۂ نظر سے کس قدر فوقیت کیوں نہ رکھے اس کو اس وقت تک خوش حال نہیں کہا جا سکتا جب تک کہ ہمیں یہ نہ معلوم ہو کہ اس ملک میں تقسیم آمدنی کا کیا حال ہے۔ فرض کیجئے دو ملک ہیں۔ ہر دو کی آبادی مساوی ہے اور ہر دو کی مجموعی دولت بھی مساوی ہے۔ یہ بھی فرض کیجئے کہ ایک ملک کی مجموعی دولت کا ¾ حصہ مجموعی آبادی کے ¼ حصے کے ہاتھ میں ہے اور دوسرے ملک کی مجموعی دولت تمام باشندوں کے مابین بڑی حد تک مساوی مساوی طور پر منقسم ہے۔ اس صورت میں پہلے ملک کے مقابل دوسرے ملک کو خوش حال سمجھا جائے گا۔ گو کہ پہلے ملک میں بھی اُسی قدر دولت ہے جس قدر کہ دوسرے ملک میں۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ پہلے ملک میں دولت کی تقسیم انتہائی درجہ ناقص ہے اور دوسرے ملک میں

مناسب ہے۔ اگر کسی ملک کی آبادی کا محدود حصہ آرام و آسایش کی زندگی بسر کرے اور باقی افراد مصیبت اور کوفت کی زندگی بسر کریں تو ایسا ملک خوش حال نہیں کہلایا جا سکتا۔ کسی ملک کی خوش حالی کے لئے دیگر امور کے علاوہ دو اہم چیزیں ضروری ہیں پہلا یہ کہ اُس ملک میں اس قدر دولت پیدا کی جانی چاہئے کہ اس کے ذریعہ تمام ملک کے باشندے انسانوں کے شایان شان ایک معقول معیار آرام پر زندگی بسر کر سکیں۔ دوسرے یہ کہ پیدا شدہ دولت کی تقسیم بھی مناسب ہو۔ اگر دولت تو زیادہ پیدا کی جائے اور اس کی تقسیم غیر مساوی ہو تو اس کا مخالف اثر عام خوش حالی پر پڑے گا۔ باشندگان ملک کی ایک محدود تعداد دولت سے مستفید ہوگی اور باقی باشندے غربت۔ افلاس اور ناداری کی زندگی بسر کریں گے۔

دولت کی زیادتی کے شرائط جب ہم یہ کہتے ہیں کہ باشندگان ملک کی خوش حالی کے لئے دولت کی مناسب مقدار کا ہونا ضروری ہے تو پھر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیا ذرائع ہیں جن کی بدولت ملک میں دولت کی مناسب مقدار پیدا کی جا سکتی ہے۔

(۱) وسائل قدرت ـــــ دولت کی مناسب مقدار پیدا کرنے کے لئے سب سے پہلے وسائل قدرت یا وسائل معاش کا مناسب مقدار میں پایا جانا ضروری ہے۔ وسائل قدرت یا وسائل معاش سے مراد کسی ملک کے وہ تمام ذرائع معاش ہیں جو قدرت نے اس ملک کو عطا کئے ہیں۔ کسی ملک کی زمینات۔ دریا۔ پہاڑ۔ آبشار۔ جنگلات۔ معدنیات وغیرہ قدرتی وسائل میں شامل ہیں جس ملک میں وسائل قدرت کی جس قدر بہتات ہوگی اسی مناسبت سے اس ملک میں زیادہ دولت پیدا کرنے کے امکانات ہوں گے۔ برعکس اس کے جس ملک میں وسائل قدرت کی مقدار جس قدر محدود ہوگی اسی مناسبت سے دولت بھی کم پیدا کی جا سکے گی۔

(۲) وسائل قدرت سے پورا پورا استفادہ کرنے کی صلاحیت ـــــ دولت کی مناسب مقدار پیدا کرنے کے لئے دوسری شرط یہ ہے کہ باشندوں میں اس امر کی پوری صلاحیت ہو کہ وہ اپنے ملک کے خداداد وسائل سے مکمنہ استفادہ کر سکیں۔ کیونکہ کسی ملک میں

وسائل قدرت کی کس قدر زیادتی کیوں نہ ہو اگر وہاں کے باشندے ان وسائل سے پورا پورا استفادہ نہ کرسکیں تو دولت کی مناسب مقدار پیدا نہ ہوسکے گی۔ پس معلوم ہوا کہ دولت کی زیادہ مقدار پیدا کرنے کے لئے ایک طرف وسائل معاش کا ہونا ضروری ہے اور دوسری طرف باشندگان ملک میں ایسی صلاحیت بھی ہونی چاہئے کہ وہ ان وسائل سے بدرجۂ اتم استفادہ کرسکیں۔ ایسی حالت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسے ذرائع ہیں جن کی بدولت کسی ملک کے باشندوں میں اپنے وسائل سے پورا پورا استفادہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں تعلیم کا مسئلہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ تعلیم کی وسیع تقسیم دو طرح پر کی جاسکتی ہے۔ فنی تعلیم اور عام تعلیم۔ فنی تعلیم سے ہماری مراد ایسی تعلیم ہے جو خاص خاص پیشوں سے متعلق ہو۔ مثلاً زراعت۔ صنعت وحرفت۔ تجارت وغیرہ کی تعلیم۔ عام تعلیم سے مراد ایسی تعلیم ہے جس کی نوعیت ادبی و نظری ہو۔ مادّی ترقی کے لئے ہر دو قسم کی مناسب تعلیم ضروری ہے۔

تعلیم کے علاوہ عمدہ صحت کا مسئلہ بھی کافی اہمیت رکھتا ہے۔ کسی قوم کے قدرتی وسائل خواہ کس قدر زیادہ کیوں نہ ہوں اُس ملک میں تعلیم کا معیار بھی کس قدر بلند کیوں نہ ہو۔ اگر وہاں کے باشندوں کی صحت ٹھیک نہ ہو تو دولت کی خاطر خواہ مقدار نہیں پیدا کی جاسکتی۔ عمدہ صحت کے لئے تین چیزیں ضروری ہیں — صحت بخش غذا صحت بخش لباس۔ اور صحت بخش مکان۔ یعنے قوت کارگذاری میں دولت پیدا کرنے کی صلاحیت بڑھانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایک طرف تو پیٹ بھر غذا میسر ہو اور دوسری طرف اُس غذا میں صحت اور توانائی میں اضافہ کرنے والے اجزا بھی مناسب مقدار میں موجود ہوں۔ اسی طرح لباس بھی اس نوعیت کا ہونا چاہئے کہ اس کی بدولت موسمی اثرات سے اچھی طرح بچ سکیں خصوصاً سرد ممالک میں لباس کا مسئلہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ عمدہ صحت کے لئے صاف اور ہوادار مکان بھی ضروری چیز ہیں۔ اگر مکانات تاریک غیر ہوادار اور گندے ہوں تو ظاہر ہے کہ اس سے صحت متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

(۳) مفید مادّی اشیاء کا استعمال — دولت کی زیادہ مقدار پیدا کرنے کے لئے

مفید مادّی اشیاء کا استعمال بھی ضروری ہے۔ مفید مادّی اشیاء دو قسم کی ہیں۔ غذا، لباس اور مکان براہ راست مفید مادّی اشیاء ہیں۔ برعکس اس کے وہ اشیاء جن سے غذا، لباس اور مکان کی تیاری میں مدد ملتی ہے، بالواسطہ مفید مادّی اشیاء کہلاتی ہیں مختلف قسم کے آلات و اوزار اور مشین وغیرہ بالواسطہ مفید مادی اشیاء میں شامل ہیں۔ براہ راست مفید مادّی اشیاء کو اشیائے صرف اور بالواسطہ مفید مادّی اشیاء کو اشیائے پیدائش بھی کہا جاتا ہے۔ پیدائش دولت کے نقطۂ نظر سے بالواسطہ مفید مادّی اشیاء یا آلات و اوزار اور مشنری وغیرہ کا استعمال بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اگر اشیاء ہاتھ سے تیار کی جائیں تو وہ نہ صرف بعدّی قسم کی تیار ہوں گی بلکہ ایک مقررہ وقت میں مقابلتاً بہت کم تیار ہوں گی۔ برعکس اس کے اگر ان کی تیاری میں عمدہ قسم کے آلات و اوزار اور مشین استعمال کئے جائیں تو نہ صرف یکساں اشیاء تیار ہوں گی بلکہ وہ خوبصورت بھی ہوں گی اور ایک مقررہ وقت میں مقابلتاً زیادہ تیار کی جاسکیں گی۔ مثال کے طور پر کپڑے کی بُنائی کو لیجئے۔ کپڑا ہاتھ سے بھی تیار کیا جاسکتا ہے اور مشین کے ذریعہ بھی۔ لیکن دوسری صورت میں نہ صرف نفیس اور عمدہ کپڑا تیار ہوگا بلکہ اس کی مقدار بھی مقابلتاً زیادہ ہوگی۔ یہی حال دیگر اشیاء کی پیدائش کا ہے۔ اسی بنار پر کہا جاتا ہے کہ اشیاء کی پیدائش میں آلات و اوزار اور مشنری وغیرہ سے جس قدر زیادہ کام لیا جائے گا اسی قدر زیادہ دولت پیدا ہوسکے گی۔ ہندوستان کے مقابل ترقی یافتہ ممالک میں زیادہ دولت پیدا کی جاتی ہے جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں پیدائش دولت کے لئے جس قسم کے آلات و اوزار استعمال کئے جاتے ہیں وہ بالعموم بہت ادنیٰ اور معمولی قسم کے ہوتے ہیں۔ برعکس اس کے ترقی یافتہ ممالک میں معمولی معمولی اشیاء کی تیاری کے لئے بھی مشین استعمال کی جاتی ہے نتیجہ یہ کہ دولت بھی زیادہ پیدا ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ معاشیات میں دولت سے مراد صرف سکّے اور نوٹ نہیں بلکہ اس کی تعریف میں وہ تمام اشیاء شامل ہیں جن سے ہماری کوئی نہ کوئی احتیاج پوری ہوتی ہے اور جنھیں ہم خریدتے اور بیچتے ہیں۔

(۴) باہمی تعاون عمل یا تقسیم عمل ۔۔۔ جس طرح آلات و اوزار اور مشین وغیرہ کے استعمال کی وجہ سے زیادہ دولت پیدا ہوتی ہے اسی طرح باہمی تعاون یا تقسیم عمل کے طریق سے کام لینے کی وجہ سے بھی دولت کی پیدائش میں اضافہ ہوتا ہے۔ تقسیم عمل سے مراد دولت پیدا کرنے کا وہ طریقہ ہے جس کے تحت ہر چیز کی تیاری متعدد کاموں میں تقسیم کر دی جاتی ہے اور ان میں سے ہر ایک کام جداگانہ مزدور کے سپرد کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جوتا سازی کے کام کو لیجئے۔ بڑے بڑے کارخانوں میں اس کام کو متعدد افراد کے مابین تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک شخص صرف چمڑا صاف کرتا ہے، دوسرا اس کے مناسب ٹکڑے کرتا ہے، تیسرا تلے کاٹتا ہے، چوتھا ایڑیاں تیار کرتا ہے۔ اسی طرح جوتے کی تیاری سے متعلق دیگر کام جزوی طور پر متفرق افراد کے سپرد کر دئے جاتے ہیں اور متعدد افراد کی اجتماعی کوشش سے جوتا تیار ہو کر فروخت کرنے کے قابل بنتا ہے۔ یہ سوال کہ تقسیم عمل کے طریق سے کام لینے کی بدولت مقدار پیداوار میں کیوں اضافہ ہوتا ہے تو اس کے چند وجوہ ہیں۔

پہلا یہ کہ اس کی وجہ سے بڑا کام چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور ہر شخص کو اس کی قابلیت اور استطاعت کے مطابق کام ملتا ہے۔ مرد مشکل کام انجام دیتے ہیں، عورت اور بچے معمولی کام کرتے ہیں۔ چونکہ ہر مزدور کو اس کے کام کی نوعیت کا لحاظ کرتے ہوئے زیادہ یا کم اجرت دی جاتی ہے۔ لہذا مصارف پیدائش میں کمی ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ آلات و اوزار اور پیداوار خام وغیرہ کی بھی کفایت ہوتی ہے۔ تیسرے یہ کہ ایک ہی کام بار بار کرنے کی وجہ سے مزدور کو مہارت حاصل ہوتی ہے اور وہ مقررہ وقت میں مقابلتہً زیادہ کام کرتا ہے اور مجموعی طور پر دولت زیادہ پیدا ہوتی ہے۔

واضح رہے کہ تقسیم عمل کے فوائد کے ساتھ ساتھ اس کے نقائص بھی ہیں۔ پہلا نقص یہ ہے کہ اس کے تحت چونکہ مزدور ایک ہی کام انجام دیتا ہے لہذا اس کی واقفیت کا دائرہ بہت محدود ہو جاتا ہے۔ اگر کسی وجہ اس کے کام کی مانگ نہ رہے تو چونکہ وہ دوسرا کام نہیں

انجام دے سکتا ہذا بے روزگار رہنا پڑتا ہے۔ دوسرا نقص یہ ہے کہ ہر وقت ایک ہی کام کرنے کی وجہ سے مزدور کو اپنے پیشے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی اور وہ ایک مشین کی طرح کام کرتا ہے۔ تیسرا نقص یہ ہے کہ اس کی بدولت چونکہ عورتوں اور بچوں سے کام لینے کے امکانات نکل آئے ہیں۔ لہذا اکثر معاشرتی خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ کارخانوں میں آئے دن حادثات کا ہونا۔ بچوں اور حاملہ عورتوں وغیرہ کی کارکردگی کا متاثر ہونا ــــ عورتوں اور مردوں کے یکساں کام کرنے کی وجہ سے مخرب اخلاق عادتوں کا پڑنا وغیرہ ــــ تقسیم عمل کی ترقی اور استعمال مشین کا نتیجہ ہے۔

(۵) آبادی کی متناسب تعداد ــــ کسی ملک کے وسائل معاش سے پورا پورا استفادہ کرنے اور دولت کی ممکنہ مقدار پیدا کرنے کے لئے آبادی کی ایک خاص تعداد ضروری ہے۔ فرض کیجئے کسی ملک کے وسائل قدرت سے خاطر خواہ استفادہ کرنے کے لئے چار کروڑ آبادی مطلوب ہے۔ اب اگر آبادی چار کروڑ کی بجائے چھ کروڑ ہو جائے یا صرف دو کروڑ رہ جائے تو ہر دو صورتوں میں دولت کی ممکنہ مقدار نہیں پیدا ہو سکے گی۔ پہلی صورت میں آبادی زائد از ضرورت ہوگی اور دوسری صورت میں ضرورت سے کم۔ اس کی تعداد اس قدر ہونی چاہئے کہ اس کے ذریعہ ملک کے وسائل سے بیشترین استفادہ کرتے ہوئے بیشترین دولت پیدا کی جا سکے۔ آبادی کی ایسی تعداد جو کسی ملک کے وسائل سے اتم استفادہ کرنے کے لئے موزوں ترین ثابت ہو ــــ متوازن آبادی کہلاتی ہے۔ اگر آبادی اس حد سے بڑھ جائے یا گھٹ جائے تو ہر دو صورتوں میں اس کی حالت غیر متوازن ہوگی۔ عملی طور پر کسی ملک میں متوازن آبادی کا ٹھیک طور پر تعین بہت ہی دقت طلب بلکہ محال ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ متوازن آبادی کا نظریہ عملی حیثیت سے بے کار ہے۔ اس کی مدد سے آبادی کے مسئلہ کو حل کرنے میں قابل لحاظ مدد ملتی ہے۔

(۱۰) دوسرا حصہ ـ انفرادی خوش حالی

جس طرح اجتماعی خوش حالی کے نقطۂ نظر سے دولت ضروری چیز ہے اسی طرح انفرادی

خوش حالی کا مدار بھی (دیگر امور کے علاوہ) دولت کی مناسب مقدار پر ہوتا ہے۔ جہاں تک انفرادی طور پر دولت یا آمدنی حاصل کرنے کا تعلق ہے اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں:
(۱) ذاتی محنت اور (۲) ذاتی جائداد۔ ذاتی محنت سے آمدنی حاصل کرنے کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں (الف) خود اپنے استعمال کے لئے اشیاء تیار کرنا۔ (ب) دوسروں کے پاس ملازمت یا نوکری کرنا۔ (ج) کوئی کارخانہ یا کاروبار جاری کرنا۔ اسی طرح ذاتی جائداد سے آمدنی حاصل کرنے کی بھی تین صورتیں ہیں (الف) ذاتی جائداد کو خود استعمال کرنا۔ (ب) اس کے استعمال کا حق دوسروں کو دینا۔ (ج) یا اپنے قبضے میں ایک خاص قسم کی املاک اس وقت تک رکھنا کہ وہ قابل استعمال ہو جائے یا دوسرے اس کو طلب کریں۔ محنت اور جائداد سے آمدنی حاصل کرنے کی جو مختلف صورتیں بیان کی گئیں، اب ہم ان کی جدا جدا تشریح کریں گے۔

محنت سے آمدنی حاصل کرنے کی تین صورتیں

(الف) جیسا کہ اس سے قبل ہم معلوم کر آئے ہیں محنت سے آمدنی حاصل کرنے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ ہم خود اپنے لئے کوئی چیز تیار کریں مثلاً اگر کسی شخص کی بیوی اپنے شوہر اور بچوں کے کپڑے سی لے یا ماما رکھنے کی بجائے ذاتی طور پر پکوان کا انتظام کرے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ زیر بحث شخص کی بیوی کپڑوں کی سلائی کی اجرت اور ماما کی تنخواہ کے مساوی آمدنی حاصل کر رہی ہے۔ ایڈون کنن نے اسی خیال کو دو مدرسین کی مثال سے واضح کیا ہے۔
فرض کیجئے دو مدرسین ہیں ــــ الف اور ب۔ (الف) کو ذاتی جائداد سے ۲۰۰ روپے سالانہ آمدنی ہوتی ہے اور دوسروں کے بچے پڑھانے سے سالانہ ۲۵۰ روپے ملتے ہیں۔ خود اپنے بچے کی تعلیم کے لئے وہ دوسرے شخص کو سالانہ ۵۰ روپے دیتا ہے۔ (ب) کو بھی ذاتی جائداد سے (الف) کے مساوی آمدنی ہے اور بچے پڑھانے سے سالانہ ۲۰۰ روپے ملتے ہیں۔ لیکن اپنے بچوں کو ذاتی طور پر اسی حیثیت کی تعلیم دے لیتا ہے جیسی کہ (الف) کے بچوں کو دی جاتی ہے۔ ایسی صورت میں (الف) اور (ب) کی آمدنی مساوی ہوگی۔ گو بظاہر

(الف) کو (ب) کے مقابل ۵۰ روپے زائد ملتے ہیں۔ اس قسم کی آمدنی کو عام طور پر نظر انداز کیا جاتا ہے حالانکہ اس کا پورا پورا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ آمدنی حاصل کرنے کا یہ طریقہ خصوصاً ایسے افراد کے لئے بہت مفید ہے جو دوسروں کے ہاں محنت کرکے اپنی آمدنی میں اضافہ نہیں کرسکتے۔ مسلمان معاشرے کی عورتوں میں بالعموم یہ نقص پایا جاتا ہے کہ وہ اندرون خانہ اپنا ذاتی کام کرتے ہوئے بھی عار کرتی ہیں۔ اس قسم کی عورتیں حالات کا لحاظ کرتے ہوئے اگر پکوان کا انتظام خود کرلیں، صفائی اور اسی قسم کے معمولی کاموں کا انتظام اپنے بچوں کے تفویض کردیں، شوہر اور بچوں کا لباس ممکنہ طور پر خود ہی سی لیں تو خاندان کی مجموعی آمدنی میں قابل لحاظ اضافہ ہوسکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض سمجھ دار اور محنتی عورتیں اس قسم کا گھریلو کام انجام دے کر اپنی زندگی کو قابل لحاظ حد تک خوش حال بناتی ہیں لیکن بہت سی کم سمجھ سست اور کاہل عورتیں ایسی ہیں جو اپنے شوہروں پر غیر معمولی طور پر بار ثابت ہوتی ہیں۔

(ب) محنت سے آمدنی حاصل کرنے کا دوسرا طریقہ ملازمت یا مزدوری ہے۔ ملازمت کے معاوضے کو تنخواہ اور مزدوری کے معاوضہ کو اُجرت کہا جاتا ہے۔ اُجرت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک وہ جو بہ شکل زر ادا کی جائے مثلاً آٹھ آنے روز یا (۱۵) روپے ماہانہ۔ دوسرے وہ جو ضروریات کی شکل میں دی جائے، مثلاً کھانا کپڑا اور رہنے کے لئے مکان وغیرہ۔ پہلی قسم کی اُجرت کو اجرت متعارفہ اور دوسری قسم کی اجرت کو اجرت صحیحہ کہتے ہیں۔ مزدور کے نقطۂ نظر سے اجرت صحیحہ بہت اہمیت رکھتی ہے کیونکہ مزدور کی خوش حالی کا مدار زر کی اس مقدار پر نہیں ہوتا جو اسے روزانہ یا ماہانہ ملتی ہے بلکہ مایحتاج زندگی کی اشیاء کی مقدار یا تعداد پر ہوتا ہے جو اسے اس زر کے معاوضے میں حاصل ہوتی ہے۔ مایحتاج زندگی کی مختلف اشیاء جس قدر زیادہ ملیں گی اسی لحاظ سے مزدور کی مادی خوش حالی کے امکانات نکل آئیں گے۔ برعکس اس کے مقدار زر کے معاوضے میں مایحتاج زندگی کی مختلف اشیاء جس قدر کم ملیں گی اس کا مخالف اثر مزدور کی خوش حالی پر پڑے گا۔ اگر غلہ روپے کو ۱۰ سیر ملنے کی بجائے (۱۵) سیر ملنے لگے تو اس سے

مزدور کی خوش حالی بڑھ سکے گی۔ برعکس اس کے اگر غلہ ۱۰ سیر کی بجائے ۵ سیر ملنے لگے تو اس سے مزدور کی خوش حالی گھٹے گی۔ ایسی صورت میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر غلہ اور دیگر اشیاء کی گرانی کے ساتھ ساتھ اجرتوں اور تنخواہوں میں متناسب اضافہ نہ ہو تو اس کا مخالف اثر مزدور کی خوش حالی پر پڑے گا۔ برعکس اس کے غلہ اور دیگر اشیاء کی ارزانی کے ساتھ ساتھ اجرتوں اور تنخواہوں میں تخفیف نہ ہو تو مزدور کی خوش حالی بڑھ سکے گی۔ بہرطور اشیائے ضروریات کی گرانی کے ساتھ مزدوروں کی اجرتوں اور تنخواہوں میں اضافہ ضروری ہے۔ اشیاء کی گرانی کے ساتھ بہت عرصہ تک اجرتوں اور تنخواہوں میں متناسب اضافہ نہ کیا جائے تو اس سے مزدوروں کی قوت کارگزاری متاثر ہوگی اور وہ سابقہ معیار پر زندگی نہیں بسر کرسکیں گے۔ مزدوروں کو اس قدر اجرت ملنی چاہئے کہ جس کے ذریعہ وہ اپنی اور اپنے اہل و عیال کی صحت اور قوت کارگزاری کو بڑھا سکیں اور ایک خاص معیار پر برقرار رکھ سکیں۔

(ج) محنت سے آمدنی حاصل کرنے کا تیسرا طریقہ کاروبار جاری کرنے کا ہے مثلاً پارچہ بافی۔ صابن سازی۔ بٹن سازی یا کسی اور قسم کا کارخانہ قائم کرنا۔ کارخانہ دار کو معاشیات کی اصطلاح میں آجر کہا جاتا ہے اور اس کی محنت کے معاوضے کو اجرت نہیں بلکہ منافع کہتے ہیں۔ کارخانہ دار اور مزدور کی جدوجہد اور ذمہ داری میں فرق ہوتا ہے۔ اسی لئے ایک کی محنت کے معاوضہ کو منافع اور دوسرے کی محنت کے معاوضے کو اجرت کہتے ہیں۔ کارخانہ دار کو قیام کارخانہ کے لئے مکان کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ رقم کا انتظام کرکے آلات و اوزار اور پیداوار خام کی خریدی کرنی پڑتی ہے۔ مزدور مہیا کرنا پڑتا ہے اور اشیاء کی تیاری یا فروخت سے قبل اجرت دینی پڑتی ہے۔ کارخانہ دار بحیثیت مجموعی کارخانے کی ترقی یا دیوالیہ کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ برعکس اس کے مزدور بہت بڑی حد تک آزاد ہوتا ہے۔ مقررہ وقت تک کام کرتا ہے اور اجرت پاتا ہے۔ کارخانے کی ترقی یا دیوالیہ کی براہ راست ذمہ داری مزدور پر نہیں ہوتی۔

محنت سے حاصل ہونے والی آمدنی میں فرق کے اسباب | یہاں تک اس امر کی

تشریح کی گئی کہ محنت سے آمدنی حاصل کرنے کے مختلف طریقے کیا ہیں لیکن روز مرہ زندگی میں ہم اس امر کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ محنت سے حاصل ہونے والی آمدنی میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ بعض افراد کو ان کی محنت کا بہت ہی کم معاوضہ ملتا ہے اور بعض کو بہت زیادہ۔ لہذا اب دیکھنا یہ ہے کہ اس فرق کے کیا اسباب ہیں۔

اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ خاص خاص کاموں کو عمدگی کے ساتھ انجام دینے کی تمام افراد میں یکساں قابلیت نہیں ہوتی۔ اس قابلیت میں جس قدر فرق ہوگا اس مناسبت سے آمدنیوں میں بھی فرق پایا جائے گا۔ جو افراد اپنے کام کو جس قدر عمدگی کے ساتھ انجام دیں گے انھیں اسی قدر زیادہ معاوضہ ملے گا۔ برعکس حالت میں معاوضہ کم ہوگا۔ جہاں تک کہ مختلف کارخانہ داروں کی شرح منافع میں فرق کا تعلق ہے اس کی بھی اہم وجہ یہ ہے کہ بعض کارخانہ داروں میں خداداد کاروباری صلاحیت ہوتی ہے اور اکثر اس سے محروم رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ بعضوں کو بہت زیادہ منافع ملتا ہے اور اکثروں کو بہت کم۔

آمدنیوں میں فرق کی دوسری وجہ یہ ہے کہ بعض کام سیدھے سادے اور معمولی ہوتے ہیں — اور بعض مشکل اور مہارت طلب۔ جو کام آسان اور معمولی ہوتے ہیں ان کا معاوضہ بھی کم ہوتا ہے لیکن مشکل اور مہارت طلب کاموں کا معاوضہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ یہاں پر ایک سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ جب مشکل اور مہارت طلب کاموں کا بہت زیادہ معاوضہ ملتا ہے تو سب لوگ اسی نوعیت کے کام انجام دینے کی کوشش کیوں نہیں کرتے تاکہ انھیں زیادہ معاوضہ ملے۔ واضح رہے کہ سب لوگ یکساں محنت پسند نہیں ہوتے۔ نیز ہر شخص بالعموم اپنے معاشرے کی مناسبت سے کوئی پیشہ اختیار کرتا ہے۔ ادنیٰ طبقہ کے لوگ بالعموم اسی نوعیت کے کام کرتے ہیں جو ان کے معاشرے کے افراد انجام دیتے ہیں۔ یہی حال متوسط اور اعلیٰ طبقے کے لوگوں کا ہے۔ علاوہ ازیں مشکل اور مہارت طلب کام انجام دینے کے لئے خاص قسم کی تعلیم ضروری ہوتی ہے لیکن سب افراد کو تعلیم حاصل کرنے کے یکساں مواقع (بالخصوص پس ماندہ

ممالک میں) حاصل نہیں ہوتے۔ ان وجوہ کی بناء پر تمام افراد کی صلاحیت اور قابلیت یکساں نہیں ہوسکتی اور محنت سے حاصل ہونے والی آمدنیوں میں فرق کا پایا جانا لازمی ہوتا ہے۔

املاک سے آمدنی حاصل کرنے کی تین صورتیں

پیچھے ہم معلوم کر آئے ہیں کہ املاک یا جائداد سے آمدنی حاصل کرنے کی بھی تین صورتیں ہیں (الف) پہلا طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنی جائداد کو خود استعمال کریں۔ اگر ہم اپنے مکان میں خود رہیں یا اپنی موٹر کو ذاتی سواری کے لئے رکھیں تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ ہمیں مکان اور موٹر سے آمدنی حاصل ہورہی ہے۔ بظاہر یہ خیال عجیب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک ایسی چیز سے جسے ہم خود استعمال کر رہے ہیں کیونکر آمدنی حاصل ہوسکتی ہے۔ اگر ہم ذرا غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ہمیں ذاتی جائداد سے بھی جسے ہم خود استعمال کر رہے ہیں آمدنی حاصل ہوتی ہے۔ فرض کیجئے ایک شخص کی (۱۰۰۰) روپے تنخواہ ہے۔ اس کا ایک ذاتی مکان بھی ہے اور اس مکان میں وہ خود رہتا ہے لیکن اگر اس مکان کو کرایہ پر دیا جائے تو (۱۰۰) روپے ماہانہ کرایہ وصول ہوسکتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ کہنا بالکل بجا ہوگا کہ شخص زیر بحث کی حقیقی آمدنی (۱۱۰۰) روپئے ہے بالعموم اس قسم کی آمدنی کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ حالانکہ حقیقی آمدنی کا حساب لگاتے وقت اس کا پورا پورا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

(ب) املاک سے آمدنی حاصل کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس کے استعمال کا حق دوسروں کو دیا جائے اور اس کے عوض کچھ آمدنی حاصل کی جائے۔ مثلاً مکان یا ملگیات وغیرہ کا کرایہ پر دینا۔ سیکلوں کا کرایہ پر چلانا یا موٹروں کو کرایہ پر دینا۔ واضح رہے کہ املاک دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک بہ شکل زر اور دوسرے مکانات۔ ملگیات۔ موٹر یا سیکل وغیرہ کی شکل میں۔ ملک کی نوعیت کا لحاظ کرتے ہوئے ان سے حاصل ہونے والی آمدنی کے نام بھی مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً سکونتی زمین کے استعمال کے معاوضے کو کرایہ کہا جاتا ہے۔ لیکن زراعتی زمین کے استعمال کا معاوضہ لگان کہلاتا ہے۔ اسی طرح زر کے استعمال کے معاوضے کو لگان یا کرایہ نہیں کہتے بلکہ

اسے "سود" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

(ج) املاک سے آمدنی حاصل کرنے کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم کسی چیز کو اس وقت تک بطور ذخیرہ محفوظ رکھیں جب تک کہ وہ زیادہ کارآمد نہ ہو جائے۔ اس کی بہترین مثال ہمارے ہی ماحول سے لی جاسکتی ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا جب کہ نارائن گوڑہ۔ حیدر گوڑہ اور حمایت نگر کی آبادی بہت ہی ناقابل لحاظ تھی۔ ہر طرف جنگل ہی جنگل تھا۔ زمینات کی قیمت بہت ادنیٰ اور معمولی تھی۔ چنانچہ اکثر لوگ یہاں کی زمینات کو چار آنے گز کے حساب سے خریدنا بھی خلاف منفعت سمجھتے تھے۔ لیکن جوں جوں اس طرف آبادی کا رجحان بڑھتا گیا زمینات کی قدر و قیمت میں بتدریج اضافہ ہونے لگا۔ اس رجحان کو دیکھ کر اکثر افراد نے منافع کی خاطر وسیع آراضیات خرید لیں۔ چنانچہ اب اس نواح میں زمینات کی قیمت تین روپے گز سے لے کر پانچ روپے گز ہے۔ جن افراد نے دوراندیشی سے ارزاں زمینات خریدی تھیں انھیں اس وقت معقول نفع مل رہا ہے۔ نہ صرف اراضیات بلکہ دیگر اشیاء کے لین دین سے بھی لوگ اسی طرح کی آمدنی حاصل کرتے ہیں۔ مثلاً فصل پر غلہ بالعموم ارزاں ہوتا ہے۔ لہٰذا تجارت پیشہ افراد وسیع پیمانے پر اس کی خریدی کرتے ہیں۔ اور کچھ عرصہ تک اسے بطور ذخیرہ محفوظ رکھتے ہیں۔ جب طلب خوب بڑھتی ہے اور قیمتیں گراں ہو جاتی ہیں تو اس وقت کافی منافع سے فروخت کر دیتے ہیں۔

املاک سے حاصل ہونے والی آمدنی میں فرق کے اسباب

جس طرح محنت سے حاصل ہونے والی آمدنیوں میں مختلف وجوہ کی بنا پر فرق پایا جاتا ہے اسی طرح املاک سے حاصل ہونے والی آمدنیوں میں فرق کے مختلف وجوہ ہیں۔

اس فرق کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ بعض افراد دولت کمانے اور پس انداز کرنے کی مقابلۃً زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا اس قابلیت کا لحاظ کرتے ہوئے بعض افراد کے ہاں زیادہ جائداد ہوگی اور بعض کے ہاں کم۔ ایسی صورت میں بعض کو املاک سے زیادہ آمدنی حاصل ہوگی تو بعض کو

بہت ہی کم اور اکثر تو اس سے محروم نظر آتے ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ بعض افراد کو وراثتاً زیادہ جائداد ملتی ہے جن افراد کو ورثہ میں زیادہ جائداد ملے گی ظاہر ہے کہ انھیں دوسروں کے مقابل املاک سے زیادہ آمدنی ہوگی۔

تیسرے یہ کہ جائے وقوع کی مناسبت کا بھی املاک سے حاصل ہونے والی آمدنیوں پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ فرض کیجئے کسی شخص کی ایک ملگی عابد روڈ پر واقع ہے اور اس کا کرایہ ماہانہ (۴۵) روپے آتا ہے۔ دوسرے شخص کی ملگی اسی نمونے گنجایش اور مالیت (صرفہ تعمیر ملگی) کی یاقوت پورہ میں واقع ہے اور اس کا کرایہ صرف (۲۰) روپے ماہانہ وصول ہوتا ہے۔ ہر دو ملگیوں کے نمونے، گنجایش اور صرفہ تعمیر کی یکسانیت کے باوجود کرایوں کا یہ فرق محض جائے وقوع کا نتیجہ ہے۔

انفرادی خوش حالی کے بیان کو ختم کرتے ہوئے مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا مدار انفرادی آمدنی کی نوعیت اور اس کے صرف پر ہوتا ہے جس شخص کی آمدنی جس قدر زیادہ ہوگی اسی لحاظ سے اس کی زندگی بھی خوش حال ہو سکے گی، بشرطیکہ آمدنی کا صرف بھی مناسب اور مفید ہو۔ اگر آمدنی تو زیادہ ہو اور صرف کے طریقے ٹھیک نہ ہوں تو اس سے خاطر خواہ نتائج نہیں برآمد ہو سکیں گے۔ جہاں تک آمدنیوں کی زیادتی کا تعلق ہے اس کا مدار زیادہ تر افراد کی قوت پیدا آوری پر ہوتا ہے۔ اگر ہم ایک خوش حال زندگی بسر کرنا چاہیں تو ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے اندر وہ صلاحیت پیدا کریں جس کے ذریعہ ہم زیادہ دولت پیدا کر سکتے ہیں۔ اس صلاحیت کے لئے مفید تعلیم و تربیت صحت بخش غذا۔ لباس۔ مکان اور عمدہ ماحول ضروری چیزیں ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ مناسب اور مفید طریقۂ صرف کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

(۱۱) تیسرا حصہ۔ مادّی خوش حالی اور حکومت

حکومت کے فرائض خوش حالی سے خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی حکومت کا بہت قریبی تعلق

حکومت سے بھی ہے۔ جس ملک کی حکومت روشن خیال اور حقیقی معنی میں رعایا کی ہمدرد ہوگی اس ملک کی خوش حالی نسبتاً آسانی کے ساتھ اور مقابلۃً جلد حاصل کی جا سکے گی۔ بشرطیکہ بعض دیگر موافق حالات بھی موجود ہوں۔ کسی ملک کے وسائل قدرت خواہ کس قدر زیادہ کیوں نہ ہوں اور اور وہاں پر زیادہ دولت پیدا کرنے کے کس قدر امکانات کیوں نہ پائے جائیں ان سے حقیقی استفادہ صرف اُس وقت کیا جا سکتا ہے جب کہ وہاں کی حکومت اچھی ہو۔ غیر ذمہ دار اور غیر فرض شناس حکومتوں کی وجہ سے بھی ملک میں افلاس اور ناداری پھیلتی ہے اور آزاد ممالک غیروں کے غلام بن جاتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں حکومت کے فرائض بہت وسیع ہو گئے ہیں۔ اب عدم مداخلت کی پالیسی کا زمانہ نہیں رہا۔ ہر روشن خیال اور ہمدرد حکومت ملک کی خوش حالی کو حاصل کرنے کے لئے تقریباً تمام معاملات میں دخل دیتی ہے۔ اچھی سیاست کے علاوہ اچھی معیشت اور اچھی معاشرت کو حاصل کرنا یا برقرار رکھنا ہر ذمہ دار حکومت کا فریضہ ہے۔ سہولت کی خاطر حکومت کے فرائض کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) حکومت کا ایک اہم فریضہ یہ ہے کہ باشندگان ملک کو دشمنوں کے حملے سے بچائے۔ اگر کسی ملک پر آئے دن مختلف قوموں کے حملے ہوتے رہیں تو اس کی وجہ سے ملک خاطر خواہ طور پر ترقی نہیں کر سکتا۔ خوش حالی کے حاصل کرنے کے لئے امن ضروری چیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر حکومت اپنی استطاعت کے مطابق قومی مدافعت اور قومی تحفظ کے لئے مناسب فوج اور آلات حرب مہیا رکھتی ہے۔ تاکہ وقت ضرورت ان سے کام لیا جا سکے۔

(۲) خوش حالی کے لئے نہ صرف یہ ضروری ہے کہ ملک کو بیرونی حملہ آوروں سے بچایا جائے بلکہ اندرونی امن وامان کا قائم رکھنا بھی لازمی ہے۔ اندرون ملک چوری۔ لوٹ مار۔ غارت گری۔ دغابازی اور حق تلفی عام ہو تو بھی ملک ترقی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا حکومت کا دوسرا فریضہ یہ ہے کہ اندرون ملک امن قائم رکھے۔ اس غرض کے لئے حکومت مختلف قسم کی عدالتیں قائم کرتی ہے اور پولیس رکھتی ہے۔

(۳) اس میں شک نہیں کہ اندرونی اور بیرونی امن کی وجہ سے باشندگان ملک کی مادی خوش حالی کے حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے لیکن اس کے علاوہ دیگر امور بھی ضروری ہیں۔ مثلاً ہم جانتے ہیں کہ خوش حالی کے نقطۂ نظر سے "دولت" بھی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ لہٰذا حکومت کا یہ بھی فریضہ ہے کہ باشندگان ملک کو معقول دولت پیدا کرنے کے قابل بنائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے حکومت کو گوناگوں تدابیر اختیار کرنا پڑتا ہے۔ عام اور فنی تعلیم کا معقول انتظام کرنا۔ صحت کا عمدہ معیار برقرار رکھنا۔ زراعت صنعت و حرفت۔ تجارت اور نقل و حمل کی ترقی میں براہ راست یا بالواسطہ مدد دینا حکومت کا فرض ہے۔

حکومت کے ذرائع آمدنی

ظاہر ہے کہ مذکورہ فرائض کے انجام دینے کے لئے حکومت کو آمدنی کی ضرورت ہوگی۔ فوج۔ پولیس اور آلات حرب کا مہیا رکھنا۔ عدالتیں قائم کرنا اور ان کے کاروبار کو چلانا۔ زراعت صنعت و حرفت۔ تجارت اور نقل و حمل کی ترقی کے لئے مختلف تدابیر اختیار کرنا معقول اخراجات کے بغیر ناممکن ہے۔ لہٰذا حکومت مختلف ذرائع سے آمدنی حاصل کرتی ہے۔

(۱) ہر ملک کی حکومت کو وہاں کے آبشار۔ جنگلات۔ معدنیات۔ دریا۔ پہاڑ اور اس قسم کے دیگر قدرتی ذرائع سے آمدنی ہوتی ہے۔ زمینات کا کافی حصہ حکومت کی ملک ہوتا ہے۔ سکونتی انصبات سے حکومت کو کرایہ حاصل ہوتا ہے اور زرعی زمینات سے لگان یا مالگزاری وصول ہوتی ہے۔

(۲) عام مفاد کا لحاظ کرتے ہوئے حکومت بعض کام خود انجام دیتی ہے۔ مثلاً آب رسانی۔ خبر رسانی۔ برقی رسانی اور سکہ سازی وغیرہ کے کام حکومت سے متعلق ہوتے ہیں۔ ان کاروبار سے بھی حکومت کو آمدنی حاصل ہوتی ہے۔

(۳) مختلف نظم و نسق کے محکموں سے بھی حکومت کو کچھ نہ کچھ آمدنی ہوتی ہے۔ مثلاً عدالت۔ پولیس اور تعلیمات وغیرہ۔ اگرچہ حکومت ان محکموں کو نفع کمانے کی خاطر قائم نہیں کرتی تاہم ان سے تھوڑی بہت آمدنی ہوجاتی ہے۔

(۴) حکومت کی آمدنی کا ایک اہم ذریعہ ٹکس یا محصول ہے۔ ٹکس سے مراد کسی شخص یا جماعت کی دولت کا وہ حصہ ہے جو بلا لحاظ اس کی رضامندی یا ناراضگی کے سرکاری اغراض کے لئے حاصل کیا جائے۔ ٹکس یا محصول کی دو قسمیں ہیں ــــ بالواسطہ اور بلا واسطہ محصول بلا واسطہ کی خصوصیت ہوتی ہے کہ اس کا بار براہ راست ادا کرنے والے پر پڑتا ہے۔ مثلاً انکم ٹکس ۔ اس کا بار براہ راست ادا کرنے والے پر پڑتا ہے۔ چنانچہ اسی بناء پر اس قسم کے محصول کو محصول بلا واسطہ کہا جاتا ہے۔ برعکس اس کے محصول بالواسطہ کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ اس کا بار ادا کرنے والے پر قائم نہیں رہتا بلکہ دوسرے اشخاص پر منتقل ہو جاتا ہے۔ دیگر ممالک سے جو مال درآمد کیا جاتا ہے اس کا محصول تاجر ادا کرتے ہیں لیکن یہ بار تاجروں پر نہیں پڑتا بلکہ اشیاء کے خریداروں پر منتقل ہو جاتا ہے کیونکہ تاجر اسے قیمتوں میں شریک کرکے خریداروں سے وصول کر لیتے ہیں۔ محصول بالواسطہ بظاہر تاجروں کی جیب سے ادا ہوتا ہے لیکن اس کے حقیقی ادا کرنے والے اشیاء کے خریدار ہوتے ہیں۔ اسی خصوصیت کی وجہ سے اس محصول کو بالواسطہ محصول کہتے ہیں۔

(۵) فاتح حکومتوں کو محکوم ممالک سے سالانہ خراج وصول ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک قسم کی آمدنی ہے۔

(۶) نیز اکثر حکومتیں دیگر ممالک سے قرض بھی حاصل کرتی ہیں۔ قرض کے مقاصد مختلف ہوتے ہیں۔ بعض مرتبہ اندرون ملک مفاد عامہ کے کاروبار مثلاً زراعت صنعت و حرفت۔ تجارت اور نقل و حمل کی ترقی کے لئے قرض حاصل کیا جاتا ہے۔ بعض وقت جنگ جاری رکھنے کے لئے کثیر مقدار میں قرضے لئے جاتے ہیں۔ تعمیری قرضوں کا مفید اثر باشندگان ملک کی خوش حالی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ برعکس اس کے جنگی قرضوں کا بار بالخصوص مفتوح ممالک پر بہت ہی نمایاں ہوتا ہے۔

بہرطور باشندگان ملک کی خوش حالی کے لئے حکومت کی امداد ناگزیر ہوتی ہے چنانچہ ہر ذمہ دار حکومت کا اہم فریضہ ملک میں امن و امان قائم رکھنا اور وہاں کے باشندوں کو مرفہ الحال اور خوش حال بنانا ہوتا ہے۔ اس کام کو انجام دینے کے لئے حکومتیں مختلف ذرائع سے آمدنی حاصل

کرتی ہیں اور اسے رعایا کی فلاح اور بہبود کے لئے صرف کرتی ہیں۔ واضح رہے کہ "بہتر صرف دولت" کا مسئلہ نہ صرف انفرادی حیثیت سے بہت اہمیت رکھتا ہے بلکہ حکومت کے مدات خرچ میں بھی اس کا لحاظ رکھنا انتہائی درجہ ضروری ہے۔ جس حکومت کا بجٹ غیر متناسب ہوگا (غیر متناسب بجٹ سے مراد ایسا بجٹ ہے جس میں آمدنی کی تقسیم قومی احتیاجات کی اہمیت کا لحاظ کرتے ہوئے نہ کی گئی ہو۔ کم اہم کاموں کے لئے تو زیادہ رقم مختص کی جائے اور زیادہ اہم کاموں کے لئے مقابلۃً کم رقم رکھی جائے) اس ملک میں حصول خوش حالی کے خاطر خواہ نتائج نہیں برآمد ہو سکیں گے۔

چھٹی معاشی کانفرنس کا لک مکرو سرکار عالی

چھٹی معاشی کانفرنس بہ دوران نمائش مصنوعات ملکی ماہ بہمن کے دوسرے ہفتہ ہو رہی ہے۔ جس میں حسب ذیل مباحث پر مقالہ جات پڑھے جائیں گے۔

(۱) تنظیم مابعد جنگ میں حیدرآباد کا معاشی موقف (۲) حیدرآباد میں فراہمی اغذیہ کا مسئلہ

(۳) حیدرآباد میں بنک کاری کی ترقی کے مسائل (۴) صنعتی فروغ میں حکومت کی امداد

(۵) حیدرآباد کی معاشی تعمیر میں امداد باہمی کا حصہ

امید کہ جناب براہ کرم اس کانفرنس میں خاص طور پر حصہ لیں گے اور مباحث بالا سے متعلق کوئی مقالہ کانفرنس میں پڑھیں گے۔ نیز اپنے ارادہ سے قبل از قبل مطلع فرمائیں گے۔

مقالہ (۸) فلسکیپ صفحات سے زائد نہ ہو۔ براہ کرم ۳۰ر دے تک دفتر معاشی کمیٹی پر روانہ کیا جائے۔ وقت اور افتتاح سے متعلق منعاقب مطلع کیا جائے گا۔

خواجہ حمید احمد معتمد معاشی کمیٹی

التماس برائے امداد طلبہ

مملکت آصفیہ کے تعلیمی اداروں میں جو طلبہ شریک ہوتے ہیں ان کو اپنی تعلیم کی تکمیل کے دوران میں بیسویں مالی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔

تعلیمی سال کا آغاز ہوتا ہے تو طلبہ کسی نہ کسی امداد کی توقع میں تعلیمی اداروں میں شریک ہو جاتے ہیں، لیکن جب کوئی امداد نہیں ملتی تو مجبوراً تعلیم ترک کر کے مدت العمر علم جیسی لازوال دولت سے محروم ہو جاتے ہیں۔

تعلیم اور بالخصوص اعلیٰ تعلیم کی مشکلات پہلے کی طرح آج بھی قایم ہیں۔ سرکاری امداد و اعانت میں بھی کمی پیدا کر دی گئی ہے۔ ملک کا معاشی توازن بھی بگڑا ہوا ہے۔ ہونہار افراد ملک کے لئے اعلیٰ تعلیم کی ضرورت بھی باقی ہے موجودہ نازک حالات میں ملک کے اہل خیر اصحاب طالب علموں کی امداد و اعانت کے لئے آگے بڑھیں [illegible] مالی مشکلات [illegible] کرنے کے لئے سیرچشمی اور فیاضانہ طور سے ہاتھ بٹائیں تو توقع ہے کہ طالب علموں کے بعض مشکلات دور ہو جائیں۔

ملک میں حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا ادارہ (٣٠) سال سے قایم ہے اور اپنے مقدور بھر طالب علموں کی دقتوں کو دور کر رہا ہے اگر جناب اپنے عطیوں سے اس ادارہ کا ہاتھ بٹائیں تو امید ہے کہ اس سود مند کام میں مزید وسعت پیدا ہو سکے گی، یا یہ بھی ممکن ہے کہ راست جامعہ عثمانیہ یا دوسرے تعلیمی اداروں کو شرائط مقرر کر کے عطیے بھیجے جائیں۔ یہ ادارے شرائط مقرر کر کے عطیے بھیجے جائیں۔ یہ ادارے شرائط مقررہ کے تحت طالب علموں کے لئے ہر مالی امداد مسرت اور خوش دلی سے قبول کر سکیں گے۔

بہر حال ملک کے مخیر اصحاب کے لئے اس سے بہتر اور امر ہو سکتا ہے کہ طالب علموں کی امداد کیلئے آئیں اور اس طرح ملک کی حقیقی ترقی اور خوش حالی کا سامان بہم پہنچائیں۔ توقع ہے کہ اس مخلصانہ التماس پر ضرور توجہ فرمائی جائے گی۔

مسائل معاشیات حیدرآباد

از جناب مولوی حافظ محمد مظہر صاحب اعزازی معتمد حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس

(بسلسلۂ شمارہ ۳ جلد ۷)

صنعتی مدارس کے قیام کی سرگزشت

معاشی کانفرنس بابتہ ۱۳۵۱ف کے خطبۂ صدارت میں بیان کیا گیا ہے کہ :-

"ایک اہم کمی ہمارے ملک میں کاریگروں کی ہے جس کے بغیر کوئی صنعتی کارخانہ قایم نہیں ہو سکتا۔ اس کمی کو محسوس کر کے حکومت نے ایک ماہر فن صنعتی تعلیم مسٹر ابیٹ کے خدمات حاصل کئے تھے، اور ان کی سفارشات کے بموجب سررشتۂ تعلیم صنعتی قایم کر کے ممالک محروسہ میں صنعتی مدارس کھولے جارہے ہیں اور کارہائے جنگ کے ضمن میں بھی ٹریننگ سنٹر قایم کر کے ان میں تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔ مگر اس وقت تک اہل ملک کما حقہٗ ان شعبوں سے استفادہ نہیں کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل ملک کا رجحان ملازمت سرکاری کی طرف زیادہ ہے۔"

صنعتی مدارس کی سرگزشت میں یہ واضح کیا جا سکتا ہے کہ دراصل ملک میں صنعتی مدارس اس قدر کم ہیں کہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ستر سال قبل تک ملک میں خاصکر اضلاع میں دستکاریوں کا وجود تھا، جو مال تیار ہوتا تھا وہ فروخت ہو جاتا تھا۔ بکثرت لوگ اس کاروبار میں مشغول تھے۔ اہل حرفہ کی اولاد آبائی پیشوں میں مصروف رہتی تھی۔ یوروپ کی بنی ہوئی چیزیں سیلاب کی طرح آنے لگیں تو ملکی دستکاریاں متاثر ہونے لگیں۔

ان حالات کا اثر روز بروز زیادہ محسوس ہوا تو ۶۰ سال قبل مدار المہام وقت نواب عماد السلطنت سالار جنگ ثانی کی سرپرستی میں یہ تحریک آغاز ہوئی تھی کہ لارڈ رپن ویسرائے وقت کی

یادگار میں صنعت و حرفت کی ایک بڑی تعلیم گاہ ملک میں سرکار اور رعایا کی مشترک کوششوں سے قائم کیجائے۔ مگر لارڈ رپن کے ہندوستان سے چلے جانے پر یہ تحریک فراموش کردی گئی۔

چند سال کے بعد نواب اصف یار الملک وزیر علی پاشا مرحوم نے کونسل آف اسٹیٹ میں یہ تحریک پیش کی کہ ملکی دستکاریوں کا زوال فوری توجہ کے قابل ہے اور یہ کہ مدارس صنعت و حرفت بھی جابجا قایم کئے جائیں۔ کہا جاتا ہے کہ نواب آصف یار الملک نے نواب تلاوت جنگ بہادر کے مشورہ اور ان کے مرتبہ مسودہ کی بنا پر یہ تحریک پیش کی تھی۔ نواب سر آسمان جاہ مرحوم مدارالمہام وقت نے یہ تحریک پسند کی اور عملی کارروائی آغاز کی۔ ایک مدرسہ صنعت و حرفت ورنگل میں قایم کیا گیا اور مزید مدارس کے قیام کی تجویز تھی۔ ایک انجینرنگ اسکول بھی ورنگل میں قایم کیا گیا۔ نواب سر آسمان جاہ مرحوم وزارت سے سبکدوش ہوئے تو مدارس صنعت و حرفت کے قیام کی اسکیم بھی ملتوی بلکہ ختم ہوگئی۔ ورنگل کے دونوں مدرسے کچھ مدت کے بعد حیدرآباد میں منتقل کر لئے گئے جو معمولی حیثیت کے تھے۔ اس دوران میں ملکۂ وکٹوریہ ان جہانی کی یادگار میں یتیم خانہ سرورنگر میں قایم ہوا۔ اس کو یتیموں کے لیے صنعت و حرفت کی اعلیٰ تعلیم گاہ بنانے کا خیال پیش نظر رہا۔ سرڈیوڈ بار رزیڈنٹ وقت نے بوقت افتتاح صنعت و حرفت کی ترقی کی بڑی بڑی امیدیں ظاہر کی تھیں۔

مہاراجہ سرکشن پرشاد آں جہانی نے اپنے دور مدارالمہامی میں بمقام نظام آباد ۱۳۱۲ف میں ایک سرکاری تقریر میں یہ واضح کیا کہ بمقام نظام آباد اور ہر ضلع میں ایک ایک مدرسۂ صنعت و حرفت قایم ہونے کی ضرورت ہے، مگر سررشتۂ مال و فینانس سے اس کی عملی تائید نہ ہوئی۔ اورنگ آباد میں نواب سراج یار جنگ مرحوم صدر مہتمم تعلیمات اور نظام آباد میں نواب رفعت یار جنگ مرحوم اول تعلقدار کی ذاتی دلچسپی سے معمولی پیمانہ پر مدارس صنعت و حرفت قایم ہوئے۔ نواب رفعت یار جنگ کا تبادلہ بیدر میں ہوا تو ان کی کوشش سے وہاں بھی ایک مدرسۂ صنعتی قائم ہوا۔ اورنگ آباد کا مدرسہ ترقی پانے لگا تو حیدرآباد کا مدرسہ بھی اسی مدرسہ میں ضم کردیا گیا۔

مولوی عزیز مرزا مرحوم معتمد تعلیمات نے نواب سراج یار جنگ مرحوم کی مشورت سے

تعلیمات کی ترقی کے لیئے ایک بڑی اسکیم مرتب کی۔ اس اسکیم میں حرفتی مدارس کا بھی لحاظ رکھا گیا تھا۔ سررشتۂ فینانس نے رقم بھی موازنہ میں شریک کردی مگر محض اس بنا پر کہ نواب عماد الملک مرحوم کی وظیفہ یابی پر نواب سراج یار جنگ مرحوم ناظم تعلیمات مقرر کئے گئے جن کو سر اکبر حیدری معتمد فینانس اور سر کیسن واکر معین المہام فینانس پسند نہیں کرتے تھے اور ان کی کوشش کہ مسٹر سیٹن پرنسپل نظام کالج ناظم تعلیمات بنائیں جائیں بار آور نہیں ہوئی۔ مولوی عزیز مرزا اور نواب سراج یار جنگ مرحوم کی کوششوں میں مزاحمت پیدا کرنے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ یہ امر طے کر دیا گیا کہ اولاً برطانوی ہند سے ایک ماہر تعلیمات طلب کیا جائے۔ وہ جو اسکیم مرتب کرے گا اس کے نفاذ کے لئے سررشتۂ فینانس رقم مہیا کرے گا۔ اس وقت تک کوئی رقم سررشتۂ تعلیمات کو نہیں دی جائے گی۔ کہا جاتا ہے کہ سر اکبر حیدری کے ایما اور مشورت سے ڈاکٹر الماطلیفی نے اس خدمت کے لیے درخواست پیش کی لیکن سر کیسن واکر کا اثر غالب ہوگیا اور خود سر اکبر حیدری کو مثل میں ڈاکٹر الماطلیفی کے خلاف رائے لکھنی پڑی۔ بالآخر مسٹر میھو جو مدارس کی ایجوکیشنل سرویس کے رکن اور نواب سراج یار جنگ سے کم درجہ اور کم تجربہ رکھتے تھے بلائے گئے۔ انھوں نے جامعۂ مدراس کے دو مسلمان طیلسانیوں کی مدد سے اپنی اسکیم مرتب کی۔ اس اسکیم کے نفاذ کا وقت آیا تو سر اکبر حیدری فینانس کی معتمدی سے تعلیمات کی معتمدی پر بدل گئے تھے۔ ان کے اثر سے سراج یار جنگ مرحوم نظامت تعلیمات سے رکنیت عدالت العالیہ پر بھیج دیئے گئے اور نظامت تعلیمات پر ڈاکٹر الماطلیفی کا تقرر کرایا گیا۔ ڈاکٹر الماطلیفی سول سرونٹ اور پنجاب کے سررشتۂ مالگزاری میں کارگزار تھے۔

بطور ایک جملۂ معترضہ کے یہ امر واضح کرنا بے محل نہیں کہ سراج یار جنگ مرحوم کی ملازمت کا بڑا حصہ سررشتۂ تعلیمات میں بسر ہوا تھا۔ گو قانونی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کی تھیں لیکن سررشتۂ عدالت کا کوئی خاص عملی تجربہ حاصل نہیں تھا۔ ایسے شخص کو بلا کسی پہلے تجربے کے رکنیت عدالت العالیہ پر بھیج دیا گیا اور ان کی جگہ پر سررشتۂ مالگزاری کے ایک عہدہ دار کو جس کو تعلیمات کا کسی قسم کا تجربہ نہیں تھا ناظم تعلیمات بنا دیا گیا۔

ڈاکٹر الماللطیفی نے کام شروع کیا اور جس جانفشانی اور ہمدردی سے کام کیا وہ ہنوز فرا
نہیں ہوا ہے۔ فنی تعلیم کی بھی ایک اسکیم ان کے پیش نظر تھی لیکن اس دوران میں سر اکبر حیدری کو ڈ
الماللطیفی سے اختلاف پیدا ہوگیا۔ اب سر اکبر نے نظامت تعلیمات کے لیے سر راس مسعود مرحوم کو نا
کیا اور ہر طرح یہ کوشش کی کہ سر راس مسعود کے آنے تک ڈاکٹر الماللطیفی کی مجوزہ اسکیمیں نافذ نہ ہو
اس طرح زمانۂ ماموری ڈاکٹر الماللطیفی یعنی ۳ سال کا عرصہ رائگاں گزر گیا۔

آخر کار سر راس مسعود نواب مسعود جنگ مرحوم نے سررشتۂ تعلیمات کی کایا پلٹ دی ا
اس کو سطح سے بلندی پر پہنچا دیا۔ سب اسکیمیں نافذ ہوگئیں حتیٰ کہ جامعۂ عثمانیہ کا خواب بھی پورا ہوگیا
لیت و لعل میں پڑگئی تو حرفتی مدارس کی اسکیم۔ عام خیال یہ ہے کہ سررشتۂ فینانس اور کارفرما
سررشتۂ تجارت و حرفت و برقی و دارالضرب اس کی راہ میں حایل ہو جاتے تھے۔ البتہ مسٹر گیا
ناظم سررشتۂ برقی نے اپنے سررشتہ کے ساتھ مکانکل اور برقی انجینیرنگ کی ایک علحدہ تعلیمگ
اپنی نگرانی میں قایم کرلی۔ یہ تعلیمگاہ ایک اچھی تعلیمگاہ بتدریج ہونے لگی۔

دورِ عثمانی کے آغاز پر بلدہ میں عامۃ الناس اور سرکار کی امداد سے مولانا انوار اللہ خا
فضیلت جنگ مرحوم کی سرپرستی میں بھی ایک مدرسۂ صنعت و حرفت قایم ہوا۔ اس طرح چار مدا
حرفتی اور یتیم خانہ سرورنگر تمام ممالک محروسہ میں قایم تھے۔ بعض مشنری زنانہ مدارس میں طالبات
زنانہ دستکاری کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اور اس کے بعد سے سر راس مسعود کی مدت ملازمت سرکار عالی
افتتاح مدارس صنعت و حرفت کی تجاویز صرف مثلہ سرکار عالی میں نظر آتی ہیں۔

بالآخر مسٹر میکنزی جامعۂ عثمانیہ کے پرو وائس چانسلر ہوئے تو انھوں نے اعلیٰ تعلیم
تجدید اور پیشہ وری کی تعلیم کا خیال آگے بڑھایا۔ انھوں نے بھی باشتراک خان فضل محمد خان صا
ناظم تعلیمات ایک رپورٹ اور اسکیم مرتب کی۔ اس اسکیم کے نفاذ سے قبل مسٹر میکنزی کا انتقال ہوگ
بالآخر اسکیم کو منظوری حاصل ہوئی اور یہ قرار پایا کہ اس اسکیم کا وہ جزو جو حرفت و پیشہ کی تعلیم
متعلق ہے ایک علحدہ سررشتہ کے ذریعے نافذ کرایا جائے اور خان فضل محمد خان صاحب

نظامت تعلیمات سے منتقل ہو کر اس جدید سررشتہ کے کمشنر و معتمد قرار پائے جہاں تک دفتر کا تعلق تھا نہایت فیاضی کے ساتھ منظوری صادر ہوئی۔ شریک معتمد کا بھی ایک جدید عہدہ قایم ہوا اعلیٰ اور ثانوی تعلیم کی تجدید شروع ہوگئی، مگر جہاں نفس مدارس حرفت و پیشہ کا تعلق تھا کارروائی برابر لیت و لعل میں پڑی رہی اور سررشتۂ فینانس نے یہ شرط لگائی کہ کسی اور ماہر کو بلایا جائے۔ یہ تقریب تھی مسٹر ایبٹ کے آنے کی۔ انھوں نے بھی اپنی رپورٹ اور اسکیم مرتب کی لیکن پھر بھی محکمۂ فینانس نے اُس کے مصارف کی سبیل نہ کی۔ خان فضل محمد خاں صاحب نے اپنی ایک رپورٹ میں یہ امر واضح کیا ہے کہ ایک کے بعد دوسری اسکیم کس طرح بنتی اور پھر غور طلب ہوتی چلی گئی۔ بہرحال یہ ہے ۱۰ سالہ سرگزشت ملک میں حرفتی مدارس کے قیام کی۔ چند معمولی مدارس خان فضل محمد خاں صاحب نے ابتدا میں قایم کرادئے مگر جو مدارس کھلے وہ معمولی حیثیت کے ہیں۔ ان مدارس کو کسی خاص سلسلہ میں مربوط بھی نہیں کیا گیا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ کل ممالک آصفیہ سے ہزاروں طلبہ ان چند مدارس میں سمیٹ کر آجائیں۔ اور مرکزی اسکیم کا اصل مقصود تعلیم پیشہ وری اُس سے حل ہوسکے۔

عثمانیہ ٹکنیکل انسٹیٹیوٹ

اس سلسلہ میں دارالضرب اور سررشتۂ برقی کی تعلیم گاہ عثمانیہ ٹکنیکل انسٹیٹیوٹ کی سرگزشت بھی قابل تذکرہ ہے۔ یہ تعلیم گاہ اپنے نقائص کے باوجود ایک اچھی تعلیم گاہ تھی۔ بتدریج اس کو ترقی حاصل ہو رہی تھی، ایک شاندار عمارت بھی اس کے لیے تعمیر ہوئی۔ طلبہ بھی زیادہ ہونے لگے۔ مگر مسٹر گیالمن کے آخری دور میں اس تعلیم گاہ کی ترقی مسدود ہوگئی۔ سررشتۂ تعمیرات و برقی اضلاع نے یہ بحث پیدا کی کہ وہ سررشتۂ دارالضرب و برقی، بلدہ کے ورک شاپ سے کام نہ لے گا۔ دوسری جانب سررشتۂ تجارت و حرفت نے جب کہ مسٹر کالنس اس کے صدر ناظم تھے دارالضرب اور اسکی ملحقہ ورک شاپ اور سررشتۂ برقی بلدہ پر مخالفانہ نکتہ چینی آغاز کی۔ سررشتۂ ریلوے سے بھی اس ورک شاپ اور تعلیم گاہ کے متعلق کچھ اختلافی رجحان ظاہر ہونے لگا۔ مسٹر میکنزی نے اس کو جامعۂ عثمانیہ میں کھینچنے کی کوشش کی۔ بالآخر مسٹر گیالمن کی وظیفہ یابی پر ورک شاپ کا کام بڑی حد تک

محدود ہوگیا۔ دارالضرب اور برقی کے سررشتے علحدہ کردئے گئے۔ تعلیم گاہ جامعۂ عثمانیہ ہی منتقل کردی گئی۔ اور اب توجنگ کی ضروریات کے تحت کام ہو رہا ہے۔ کچھ سنٹر قایم ہوئے ہیں۔

اس توضیح کے بعد راقم کو یہ عرض کرنا ہے کہ کارہائے جنگ کے ٹریننگ سنٹروں سے اہلِ ملک کما حقہ استفادہ نہ کررہے ہوں تو اس کی وجہ علحدہ تلاش کرنی چاہیئے۔ اس کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کرنا درست نہ ہوگا کہ اہلِ ملک حرفتی تعلیم گاہوں سے استفادہ نہیں کررہے ہیں۔

ملک میں حرفتی مدارس کے قیام پر ذمہ دار اصحاب نے کیوں کافی توجہ نہیں کی، یہ ایک معمہ ہے۔ اس موقع پر ایک واقعہ کا اظہار بے محل نہ ہوگا۔ سر راس مسعود مرحوم جاپان کی سیاحت سے واپس ہورہے تھے۔ مدراس سنٹرل اسٹیشن پر راقم الحروف کی ان سے ملاقات ہوئی۔ تاثرات سفر دریافت کرنے پر مرحوم سراپا جوش بن گئے، اور پُرجوش الفاظ میں جاپان کی ترقی کا حال بیان کرکے اپنے ارادوں کا بھی اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ جاپان میں صنعت و حرفت کے لیے حکومت پوری توجہ کرتی اور ہر ممکن طریقے سے مدد کرتی ہے۔ پھر کہا کہ مدارس حرفت کے بارے میں نے ایک اسکیم مرتب کی تھی مگر اب اس کو نظر انداز کرکے جاپان کے نمونہ پر میں ایک بڑی اسکیم مرتب کروں گا۔

حیدرآباد میں مرحوم راس مسعود کے مماثل مجسم عملیت اور قوت سے کام کرنے والے اور کام کو کامیاب بنانے والے اعلیٰ عہدہ دار کم ہوئے ہیں۔ انھوں نے جو کام اپنے ہاتھ میں لیا اس کو کامیاب بنادیا۔ سر اکبر حیدری ان کی ہر بات سُنتے تھے۔ کیا بات تھی کہ صنعت و حرفت کی تعلیم کے بارے میں راس مسعود مرحوم کامیاب نہ ہوسکے؟ جاپان سے واپس آکر کئی سال وہ حیدرآباد میں رہے لیکن ان کے ارادے قوۃ سے فعل میں نہ آسکے۔ بالآخر وہ حیدرآباد سے چلے گئے۔

قیاس یہ قایم ہوتا ہے کہ سر اکبر حیدری اور سر راس مسعود میں اختلافات پیدا ہوگئے تھے۔ حیدرآباد میں رہنا اور باوجود امکان دوبارہ حیدرآباد کے بجائے بھوپال میں ملازمت کرنا اسی کی وجہ تھی اور یہ تو واقعہ ہے کہ سر اکبر حیدری نے مدارس حرفت و صنعت سے متعلق سر راس مسعود کی تحریکوں میں ایک پیچیدہ طریقے سے مزاحمت پیدا کردی جس میں سر اکبر کو کمال تھا

سراکبر حیدری کے بعد سالہا سال نواب فخر یار جنگ اور جناب نواب مہدی یار جنگ بہادر اور مولوی محمد لیاقت اللہ خاں صاحب معتمد فینانس کے دور میں بھی سررشتۂ تعلیم صنعت وحرفت کی اسکیمیں نامعلوم اسباب کی بنا پر منظور نہ ہوسکیں۔ اور بظاہر یہ عذر پیدا کیا گیا کہ مدارس تہیں کارخانے ضروری ہیں۔ یہ ممکن تھا کہ جس وقت فینانس وتعلیمات کی ذمہ داری ایک ہی صدرالمہام صاحب سے وابستہ تھی۔ ذمہ داران تعلیمات وفینانس کے مشورت سے اس کی مشکل حل کر دی جاتی۔

عامۃ الناس کا رجحان ملازمت کی طرف۔

اس خطبۂ صدارت میں آگے چلکر یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ اہل ملک کا عام رجحان سرکاری ملازمت کی طرف زیادہ ہے کیونکہ اس میں دلکشی زیادہ ہے۔ اور یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ ملازمت کی دلکشی کو کم کر دینا چاہیئے۔ یہ خیال کہ ملک کے تعلیم یافتہ افراد ملازمت سرکاری کی طرف متوجہ ہیں اور ملازمتیں امید داروں سے کم ہیں اور سب کو نہیں مل سکتیں۔ عام طور پر سب اعلیٰ عہدہ دار ظاہر کرتے ہیں لیکن اس کے بارے میں تمام ضروری امور پیش نظر نہیں رہتے۔

یہ واقعہ بالکل صحیح ہے کہ ہر نوجوان اپنی تعلیم سے فارغ ہوتے ہی کسی ذریعۂ معیشت پر نظر ڈالتا ہے اور اگر سرکاری ملازمت نہ مل سکے تو نیم سرکاری یا غیر سرکاری ملازمت کو بھی قبول کرنے سے انکار نہیں کرتا۔ چنانچہ سررشتۂ ریلوے، معدنیات کی کمپنیوں، بنکوں اور کارخانوں کی ملازمت میں بھی ہزاروں آدمی روزگار حاصل کرتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد بھی ایسے افراد کی بڑی تعداد باقی رہ جاتی ہے جن کو کوئی ملازمت یا کام نہیں ملتا۔

یہ امر مد نظر رہنا چاہیے کہ بے روزگاروں کی کثرت حکومتوں میں انقلاب پیدا کر دیتی ہے۔ یوروپ اور امریکہ کی ہر حکومت بے روزگاروں کے لیے روزگار فراہم کرنا اپنا ایک فریضہ سمجھتی ہے۔ اس کے برخلاف ہندوستان اور ہمارے ملک میں اس جانب سے کافی توجہ نہیں کی گئی۔ حکومت چاہے تو تعمیرات کے کاروبار بڑھا سکتی ہے۔ ریلوے کی توسیع کر سکتی ہے۔ معدنیات اور جنگلات سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کے اسباب مہیا کر سکتی ہے۔

بڑے کارخانوں کے قیام میں سہولتیں اور ترغیبات فراہم کرسکتی ہے۔ ان امور کو عمل میں لانے سے بے روزگاری خود بخود کم ہو جائے گی۔ صرف وعظ و نصیحت نہیں بلکہ حقیقی عملی کام نوجوانوں کو خود بخود ملازمت سے ہٹاکر کاروبار کی طرف راغب کرسکیں گے۔

اس سے قطع نظر ملازمت کی دلکشی تو اب بظاہر چند اعلیٰ گزیٹیڈ خدمات کی حد تک، جہاں ترایدازاسکیل اٹھارہ سو، دو ہزار، اکیس سو، بائیس سو کی تنخواہیں میسر آتی ہیں، جہاں مکان، سواری، ٹیلیفون، برقی قوت اور خدمتگار حاصل ہیں اور جہاں عزیزوں اور احباب کو ایک ترقی کے بعد دوسری ترقی دینے یا دلانے کے اسباب فراہم ہوجاتے ہیں، محدود رہ گئی ہے۔ ورنہ عام ملازمین بلکہ کوتوالی اور فوج کے سپاہیوں تک کی حالت کاریگروں سے بھی گئی گزری ہے۔ بڑھائی، لوہار، معمار اور کارخانوں کے کاریگر ماہانہ اوسطاً تیس چالیس روپے کما لیتے ہیں۔ اور اپنے بال بچوں کو بھی ساتھ ساتھ کاروبار میں لگا دیتے ہیں، مگر سرکاری ملازمت ادنیٰ کی صورت میں جس میں کوتوالی اور فوج کے جوان بھی ہیں بڑی سے بڑی شرح ماہوار میں پچیس روپے ماہانہ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ معمولی صورتوں میں تو بارہ روپے سے پندرہ روپے تک ماہوار ہوتی ہے۔ اہلکاروں کی عام شرح تنخواہ تیس تا ساٹھ یا چالیس تا اسی روپے ہوتی ہے[لہ]۔ جو افراد تجارت و کاروبار کرتے ہیں اس سے بڑھ کر پیدا کرتے ہیں۔ اگر ملک میں فنون اور پیشوں کی تعلیم کا انتظام ہوتا اور کارخانے قایم رہتے تو یقیناً زیادہ افراد سرکاری ملازمت کی طرف نہ دوڑتے۔ اس صورت میں سرکاری ملازمت کی دلکشی کو کم کرنا بجائے خود صحیح نہیں ہوسکتا۔

آگے چلکر جناب صدر صاحب نے اپنے خطبہ میں فرمایا ہے کہ:۔

جنگ کی وجہ سے بیرون ملک سے اشیا کی درآمد رُک گئی ہے اور یہی موقع ہے حیدرآباد میں مختلف کارخانے فوراً قایم کئے جائیں۔ چنانچہ

لہ۔ یہ مضمون الونس گرانی منظور ہونے سے قبل لکھا گیا تھا، تاہم کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔

سرکار عالی نے بھی حیدرآباد ڈیولپمنٹ کارپوریشن کے نام سے ایک بہت بڑے
ادارہ کے قیام کی منظوری دے دی ہے جس کے زیرنگرانی مختلف کارخانے قائم
کئے جائیں گے جس میں پچاس فی صدی سرمایہ حکومت کا ہوگا۔ اب یہ اہل ملک کا
کام ہے کہ ان کمپنیوں کے قیام میں حصہ لیں جس سے نہ صرف ملک کے ضروریات زندگی
ملک میں مہیا ہو جائیں گے بلکہ اہل ملک کے لیے روزی کے ذرائع کھل جائیں گے،
اور بے روزگاری کا مسئلہ بڑی حد تک حل ہو جائے گا۔"

اس نوعیت کے کارپوریشن کے متعلق پھر کچھ معلوم نہ ہوا۔ غالباً اس کی کامیابی مشتبہ خیال کی گئی۔ اس ڈیولپمنٹ کارپوریشن سے ملک کے بہترین ماہرین اور اصابت رائے والے افراد کی رائے و شرکت سے بظاہر دانستہ اغماض کیا گیا۔

ہمارے ملک کا زرعی ملک ہونا۔

اس خطبۂ صدارت میں زراعت پیشہ طبقہ کی معاشی حالت کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ:۔

سب سے پہلے یہ امر ذہن نشین رکھنے کے قابل ہے کہ حیدرآباد ایک زرعی
ملک ہے اور زراعت کو پس پشت ڈال کر محض صنعت وحرفت پر ہی ساری
توجہ منعکس نہیں کی جاسکتی۔"

برطانوی ہند میں کبھی کبھی کسی نے اس قسم کی لغاظی کی ہے مگر اب علانیہ کوئی یہ نہیں کہتا کہ ہندوستان زرعی ملک ہے اور ہندوستان کو تقسیم عمل کے اصول پر زرعی اور اشیائے خام بہم پہنچانے والا ملک رہنا چاہیے۔ اسی طرح آج تک کسی کارفرمائے حکومت نے حیدرآباد کے متعلق یہ نہیں کہا کہ حیدرآباد ایک زرعی ملک ہے اور صنعت وحرفت پر ساری توجہ منعکس نہیں کیجا سکتی۔

ہر شخص یہ جانتا ہے کہ خود امریکہ بڑی حد تک زرعی ملک ہے اور وہ زراعت پر ہر قسم کی توجہ مرکوز کرنے کے باوجود بھی ہمہ تن اس کوشش میں محو ہے کہ جہاں تک ممکن ہو صنعت وحرفت کی ترقی کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرے۔ آخر بنگال، بہار اور صوبجات متحدہ بھی زرعی ملک ہیں۔

کیا ان ممالک میں سن اور شکر کی حرفتوں پر توجہ مرکوز نہیں کی گئی ہے ۔ پھر کیوں حیدرآباد کو زراعتی ملک رکھے جانے پر اصرار کیا جائے ۔

انتقال اراضی ۔

یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ زراعتی اراضی کی منتقلی غیر زراعتی طبقہ میں ہونی چاہئیے یا نہیں ۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سود خوار پیشہ ور قرض خواہوں میں اراضی کی منتقلی بآسانی ، سود در سود قرضہ کی وجہ سے نہ ہونے کے لیے کامل مزاحمت ہونی چاہیے ۔ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ عملی طور پر دشوار ہوتا جا رہا ہے کہ "چار ذاتوں" کا قدیم ہندی اصول اب قایم رہ سکے ۔ بہت سے افراد اور خاصکر وظیفہ یاب و تجارت پیشہ افراد اپنی دولت کو باغ لگانے یا کاشت کرنے میں صرف کرنا چاہتے ہیں ۔ اسی طرح ایک طبقہ کا فرد دوسرا پیشہ اختیار کرنا جاتا ہے ۔

یہ خیال بھی معرض بحث میں آسکتا ہے کہ :۔

"تول دار کو زمین میں دلچسپی اس لیے نہیں رہتی کہ اس کا تول دوامی نہیں ہوتا"

صورت حال یہ ہے کہ موروثی کاشت کار اپنے کاروبار میں اپنی جہالت اور افلاس کی وجہ سے ہمت نہیں کر سکتا ۔ اس کے برخلاف زمین کا شوقین اپنی دولت باولیوں کی کھدائی ، پمپ کی فراہمی ، زمین کی ہمواری ، عمدہ تخم اور اچھے جانوروں کی فراہمی میں کافی طور پر لگا سکتا اور اپنے تول دار کو اس کی محنت کا کافی معاوضہ دے سکتا ہے ۔ ممالک محروسۂ آصفیہ میں جا بجا نظر آتا ہے کہ نیک دل سرمایہ داروں نے زمین پر اپنی پونجی لگائی اور زرعی پیداوار اور زرعی کاروبار کو ترقی دینے میں اپنے روپیہ اور وقت کا کافی حصہ صرف کیا مگر اسکو تول داروں اور کاشتکاروں نے نقصان پہنچایا ۔ سیلون میں نظر آتا ہے کہ غیر موروثی زراعت پیشہ سرمایہ داروں نے موسمبی ، کونلہ اور انگور کے بڑے بڑے باغ لگائے ، ور اپنی کوشش میں کامیاب ہوئے ہیں ۔ اور یہ نظر آنے لگا ہے کہ ردی اور مجوب روغن دار کے مقابل

یہ کاروبار زمانۂ جنگ میں حوصلہ افزا ہے۔ دوسرے مقامات پر بھی غیر زراعت پیشہ سرمایہ داروں کا زراعت میں سرمایہ لگانا فایدہ مند پایا گیا ہے۔

ہندوستان کو امریکہ، کناڈا اور نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا وغیرہ کی طرح زرعی ترقی حاصل کرنے کے لیے متمول زمینداروں اور سرمایہ داروں کی ضرورت ناگزیر ہے۔ ہمارے ملک میں برطانوی ہند کے خیالات کو کافی تجربہ کے بغیر اختیار کرنے میں بہت کافی احتیاط برتنی چاہیے۔ انتقال اراضی کا مسئلہ خاص اہمیت اور خاص غور و تحقیقات کے قابل ہے۔ اگر ایک طرف بے رحم ساہوکار سود در سود میں جاہل کاشت کار اور پٹہ دار کو تھوڑی سی رقم کے لیے اراضی کی ملکیت سے بے دخل کر دیا کرتے ہیں تو دوسری جانب ایسے افراد بھی موجود ہیں جو زمین پر کافی سرمایہ لگا کر ملک کے زرعی کاروبار کو بلندی پر لانا چاہتے ہیں اور اپنے قولداروں اور زرعی مزدوروں سے نہایت فیاضانہ سلوک کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس کے عملی نمونے اہل ملک کے سامنے ہیں۔

زمین کی حالت روز بروز گرتی جاتی ہے اور پیداوار کی مجموعی مقدار کم ہوتی جاتی ہے تو اس کا اصلی سبب انتقال اراضی نہیں بلکہ یہ ہے کہ کاشت کار اس قدر مفلس ہیں کہ عمدہ کھاد اور عمدہ تخم مہیا نہیں کر سکتے۔ اس لحاظ سے انتقال اراضی کی ممانعت پر احتیاط کے ساتھ عمل پیرائی ہونی چاہیے۔

کاشت کاروں کا قرضہ۔

قرضہ کی گراں باری سے کاشت کاروں کی سبکدوشی کے لیے وسیع پیمانہ پر کام کرنے کی اور اس کے متعلقہ مسایل پر زیادہ غور و خوص کی ضرورت ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ امداد باہمی کے بنک زیادہ کامیاب نہ ہو سکے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ مصالحت قرضہ کا قانون اور اس کے مجالس نے بھی نمایاں کامیابی حاصل نہیں کی۔ اور یہ تجویز بھی کہ زمین گروی بنک قایم ہو اور پچاس لاکھ روپے کی ذمہ داری سرکار عالی کے

سرر ہے گی کامیاب ہوتی نظر نہیں آتی ۔

اول تو سرکار عالی نے دیوانی عدالتوں اور رجسٹری کے دفاتر کے ذریعہ کاشتکاروں میں سودی کاروبار کرنے والے ساہوکاروں کی عملاً ہمت افزائی فرمائی۔ اب اس کے برخلاف منفی عمل ہو رہا ہے کہ ساہوکاروں کی راہ میں مشکلات پیدا کی جائیں۔ اس قسم کی افراط و تفریط سے مفید نتائج پیدا نہ ہوسکیں گے۔

مسٹر بھروچہ نے اپنی تحقیقات سے مزارعین کے قرضہ کی مقدار ۰ ۶ کروڑ کے لگ بھگ ظاہر کی ہے۔ ایسی حالت میں امداد باہمی کی انجمنیں اور صدر بنک جن کا کل کاروبار ایک کروڑ سے کچھ زیادہ ہے حالت کی حقیقی اصلاح نہیں کرسکتے۔ اور زمین گروی بنک جس کی ذمہ داری ۵۰ لاکھ کی ہوگی کیونکر مزارعین کی قرضداری کا حساب چکتا کردے گا۔

فرض کرلیا جائے کہ مجالس مصالحت قرضہ اس بات میں کامیاب ہوجائیں کہ قرضہ کی مقدار گھٹ جائے۔ اور نصف یا ثلث رقم لینے پر باقی رقم سے دست بردار ہوکر ساہوکار رضامند ہوجائے تو یہ رقم بھی کیونکر بیک وقت فراہم ہوسکے گی۔ صرف قانون کے الفاظ سے یہ امر ممکن نہیں کہ مزارعین قرضہ سے سبکدوش ہوجائیں۔ اور اگر قوانین کے ذریعہ ساہوکاروں پر پابندیاں عائد کی جائیں تو دوسری طرف کاشتکار کو روپیہ ملنا اور اس کا کام چلنا مشکل ہوجائیگا۔ فی الوقت کاشتکار کا تمام کاروبار مثل تخم کی فراہمی، مال گزاری کی ادائی اور روزانہ قوت لایموت کی فراہمی سب ساہوکار کی امداد پر منحصر ہے۔ یہ بھی فی الوقت ممکن نہیں کہ ہر موضع میں انجمن امداد باہمی قایم ہوجائے۔ پچیس سال کی مدت میں یہ کام پورا نہ ہوسکا۔ اور اگر یہ بھی ہوجائے تو اپنے ماہانہ حصص کی قلت سے مزارعین فوراً اپنے قرضہ سے سبکدوش نہ ہوسکیں گے۔ ظاہر ہے کہ ابتدائی حصص کی رقم بہت قلیل رہے گی۔

جہاں تک راقم الحروف نے غور کیا اور زرعی طبقہ کی قرضداری کا حل معلوم کرنے کی کوشش کی وہاں وہ یہی رائے قایم کرسکا کہ کافی سرمایہ کے بغیر اس قسم کے قوانین سے کوئی اصلاح

نہ ہو سکے گی۔ زرعی طبقہ کی اصلاح صرف اس امر پر منحصر ہے کہ سود درسود کے عظیم بار گراں سے اسکی گلو خلاصی کی جائے۔

ممالک محروسۂ آصفیہ کے زرعی طبقہ کے قرضہ کا بیک وقت تصفیہ یکشت ادائی کی صورتمیں ۲۵ سے ۳۰ کروڑ روپے میں ہو سکتا ہے۔ کروڑوں روپے کے معاملات کا تصفیہ صرف چند لاکھ روپے کو ہاتھ میں لے کر نہیں ہو سکتا۔ یہ تو محض وقت ضائع کرنا ہے پچیس تیس کروڑ روپے کی رقم بہت بڑی رقم نظر آتی ہے لیکن اس کا سرانجام ہو سکتا ہے۔

یہ ہو سکتا ہے اور بہت آسانی سے ہو سکتا ہے کہ اولاً ہر صوبہ میں دو دو اس طرح ممالک محروسہ میں جملہ آٹھ تعلقے ایسے چنے جائیں جو زرعی قرضہ داری میں بہت زیادہ گراں بار ہوں۔ ہر تعلقہ کی زرعی قرضہ داری کا بوقت واحد تصفیہ کم و بیش تیس لاکھ روپے میں ہو جا سکتا ہے۔ آٹھ تعلقات کے لیے ڈھائی کروڑ کا سرمایہ کافی ہو جائیگا۔ سرکار عالی کو زمین گروی بنک کی پچاس لاکھ روپے کی حد تک نہیں بلکہ سردست ڈھائی کروڑ روپے کی حد تک منافعہ کی ذمہ داری لینی چاہیے۔ ان آٹھوں اضلاع میں جن کے تعلقات کے قرضہ کی ادائی پیش نظر ہو زمین گروی بنک قومی بنک کے اصول پر قایم ہوں ضلع کی ہر بنک کا اصل سرمایہ پندرہ میں لاکھ روپے کی حد تک حسب ضرورت مقرر کیا جائے اور باقی روپیہ پبلک میعادی امانتوں یا میعادی قرضوں سے جو اسٹیٹ بنک مہیا کرے حاصل کیا جائے۔ تمام ضلع میں سرکار کی ذمہ داری منافع کی بنا پر یہ جذبات پیدا ہو سکتے ہیں کہ تمام سرمایہ دار خواہ وہ مہاجن ہوں یا وکیل، زمیندار ہوں یا کاشتکار، ملازم سرکار ہوں یا معاش دار، سب اس میں حتی الوسع کم از کم ایک ایک حصہ کا سرمایہ لگائیں۔ اس طرح بیس پچیس لاکھ روپے کا مستقل سرمایہ مہیا ہو جانا کسی طرح مشکل نظر نہیں آتا۔ اس سے بوقت واحد پورے تعلقہ کی قرضداری کا تصفیہ ہو جائے گا۔ دو تین سال کے بعد باقی اضلاع و تعلقات میں یہ کام پھیلایا جا سکتا ہے۔ اور دس سال کے پروگرام میں تمام مملکت آصفیہ کے مزارعین سودی قرضہ کے

مہیب بار گراں سے سبکدوش ہو جائیں گے، اور ان کے بنک کے قرضہ کے وصول کے لیے وہی انتظامات عمل میں آسکتے ہیں جو زمین گروی بنک معمولاً عمل میں لائے ہیں۔ قرضہ کی یکسوی سے کاشتکار اپنے زمینوں کی اصلاح، باؤلیوں کی کھدائی، عمدہ تخم اور کھاد کی فراہمی، اچھے جانوروں کی خریدی اور دیگر امور کی جانب متوجہ ہو سکے گا۔

دس سال میں کل مملکت آصفیہ کے زرعی قرضہ کی ادائی کے انتظامات اور اس کے لیے ہچیس تیس کروڑ روپے کے سرمایہ کی فراہمی بڑی نزاکتوں اور مشکلات سے مملو ہے مگر یہ مشکلات ہمت وعزم صمیم اور صحیح طریقۂ کار سے حل ہو سکتے ہیں۔

اس ضمن میں معاشی ترقی کے دو اہم ذریعے بھی بآسانی فراہم ہو جا سکیں گے۔ اول تو یہ کہ اس عمل سے ہر موضع میں بنک کا کاروبار کچھ نہ کچھ قایم ہو جائے گا۔ اور ۲۲ ہزار مواضع کے قرضہ کی دریافت، ادائی، اور پھر حصول اقساط و منافع قرضہ کے لیے ہر ضلع کی بنک کا کاروبار مواضع میں بہت کچھ پھیل جائے گا۔ اس کی وجہ سے سیکڑوں نہیں ہزاروں تعلیم یافتہ افراد کے لیے ذرایع روزگار مہیا ہو جائیں گے۔ دوسرے یہ کہ جب تمام مواضع کی زرعی قرضہ داری کا بوقت واحد تصفیہ عمل میں آجائے گا موضع کے ساہوکاروں کے پاس کافی روپیہ مہیا ہو جائے گا۔ اس کو وہ بیکار نہیں رکھ سکتے۔ اور مناسب کوشش سے ان کا یہ روپیہ ضلع کی بنک کے توسط سے زرعی و حرفتی کاروبار میں لگایا جا سکتا ہے۔ اس طرح ہم اپنے ملک کے زرعی کاروبار کو امریکہ اور کناڈا وغیرہ ممالک کی سطح پر پہنچانے میں کامیاب ہو جائیں گے، اور بنک کاری موضع بموضع پھیل جائیگی۔

لیکن اس موقع پر یہ سوال پیدا ہونا لامحالہ ضروری ہے کہ:۔

"اس کی کیا ذمہ داری ہے کہ آیندہ پھر کاشتکار جدید قرضے لے کر اپنے لیے پھر وہی مصیبت پیدا نہ کرلیں"۔

اس سلسلے میں یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ جب کاشتکار کے زراعتی کاروبار کا اصل سرمایہ یعنی "زمین" جب قومی زمین گروی بنک کے پاس مکفول ہو جائے گی تو قواعد و ضوابط میں

ایسے امور کی نگہداشت کا انتظام رکھا جاسکتا ہے کہ کاشتکار پھر کسی اور قرضہ کا کاروبار زمین گروی بنک کے سوا دوسرے سے نہ کرے۔ اور جب موضع کے ساہوکار وغیرہ کیلئے بھی زمین گروی بنک میں سرمایہ لگانے کی سہولتیں مہیا ہو جائیں گی تو سود در سود کے امتناع اور سود کی حدبندی کے متعلق بھی قوانین کے نفاذ پر غور ہو سکتا ہے۔

آیندہ سے مواضع کے کاشتکاروں اور اہل حرفہ میں بلا سودی امداد باہمی کی انجمنوں کے اصول کو کامیابی سے رائج کرنے کی تبلیغ اور کوشش کامیابی کے ساتھ کیجا سکتی ہے۔ بڑے قرضہ کا کاروبار ضلع کی قومی بنک اور زمین گروی بنک سے کم سود سے کرنے کی اور موضع کے اندرونی اور معمولی ضرورتوں کی پابجائی خود موضع کی بلا سودی انجمن امداد باہمی کے ذریعہ سے کرنے کا اصول نہایت کامیاب ہو سکتا ہے۔ ابتداءً چند سال تک بلا سودی امداد باہمی کا کام زیادہ کامیاب نہ دکھائی دے گا مگر جیسے جیسے ہر سال سرمایہ زیادہ ہوتا جائے گا ویسے ویسے یہ کام ایک ایسے عظیم معیار پر پہنچ جائے گا کہ سردست اس کا تخیل بھی نہیں ہو سکتا۔ عموماً مواضع میں دس پندرہ سال میں سالانہ ایک ہزار روپے کے حساب سے پندرہ ہزار روپے جمع ہو سکتے ہیں اور کسی موضع کے لیے اس قدر رقم اس کے باشندوں کی فوری ضرورتوں اور کاروبار قرضہ کے لیے کافی ہو سکتی ہے۔ اور بتدریج موضع کی جانب سے اس رقم مجتمعہ کا نصف حصہ نفع آور کاروبار مثلاً موضع کی پیداوار کو زرعی مارکٹوں تک لانے اور موضع کی دوسری ضروریات کو فراہم کرنے میں لگائی جا سکتی ہے۔ جو کچھ محدود تجربہ حیدرآباد میں سررشتۂ بندوبست اور محکمۂ معتمدی مالگذاری وغیرہ کی بلا سودی انجمن ہائے امداد باہمی کے عمدہ نتائج کے متعلق ہو چکا ہے وہ اس امر کی قوی اُمید دلاتا ہے کہ تبلیغ و کوشش سے بہت اعلیٰ نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ مواضعات کی خوش حالی کے لیے اس سے بہتر اور اس سے آسان تر کوئی اور کوشش نہیں ہو سکتی البتہ ہر ایک کوشش اور تحریک کی طرح لازمی ہے کہ یہ تحریک بھی سرکاری رہنمائی میں آگے بڑھے۔ سررشتۂ امداد باہمی جس طرح سودی انجمنوں کی جانب متوجہ ہے اسی طرح

بلاسودی انجمنوں کے متعلق بھی متوجہ ہو سکتا ہے۔

ابتدائی زمانہ میں جب کہ رجسٹر شدہ سررشتۂ امداد باہمی کی بلاسودی انجمن کے لیے سرمایہ محدود ہوتا اور ماہانہ قسطیں کم مقدار میں وصول ہوتی ہیں یہ سہولت رکھی جا سکتی ہے کہ ناگزیر حالات میں کوآپریٹو بنک یا کسی دوسرے مقامی ادارہ سے کم منافع پر قرضہ لیا جائے۔ اُس کے لیے قواعد مرتب ہو سکتے ہیں اور آہستہ آہستہ جیسے جیسے انجمن کا سرمایہ زیادہ ہوتا جائے سودی قرضہ کو کم کرتے ہوئے بالکلیہ بے باق کر دیا جائے۔

اسراف و فضول خرچی کا انسداد۔

ان مباحث کے بعد جناب مولوی محمد لیاقت اللہ خان صاحب نے یہ رہنمائی فرمائی کہ چند امور کی تبلیغ زراعت پیشہ طبقہ میں ہونی چاہیے۔ اُن کی ایک بات یہ ہے کہ:-

کفایت شعاری کی عادت پیدا کریں اور شادیوں اور دوسری تقریبوں میں جو فضول خرچی ہوتی ہے اس کو روکیں۔"

مناسب ہونے میں کوئی کلام نہیں مگر صورت حال یہ ہے کہ خالص زراعت پیشہ طبقہ اپنی مالی حالت اور مفلسی کی وجہ سے شادی بیاہ اور دوسری تقریبوں میں فضول خرچی نہیں کر سکتا۔ گاؤں والے مزارعین کی شادیاں محدود پیمانے پر ہی مبنی ہوتی ہیں۔ حقیقت دریافت کی جائے تو مزارعین نہیں بلکہ سرمایہ دار طبقہ اور خاصکر حکام، جاگیردار، معاش دار، وکلا اور ساہوکاروں کے پاس شادیوں اور دوسری تقریبوں میں اسراف ہوتا ہے۔

صورت حال یہ ہے کہ چھوٹے طبقہ کے نوجوان جو خوش قسمتی سے تعلیمی اسناد حاصل کر لیتے ہیں یا تعلیمی کامیابی کے بعد مزید خوش قسمتی سے سیول سین یا گزیٹیڈ عہدہ دار ہو جاتے ہیں، ان میں ہی بعض افراد اس تماش کے ہوتے ہیں کہ شادی کو حصول دولت کا ذریعہ بنایا جائے ۔ ان کی فرمائش ہوتی ہے کہ جہیز میں کافی تعداد میں قیمتی ملبوسات دیے جائیں۔ مرصع زیورات دیے جائیں، فرنیچر دیا جائے۔ چاندی کا سامان ملے۔ موٹر ملے، بنگلہ ملے اور اگر ابھی متعلم ہیں تو یہ خواہش ہوتی

ہے کہ ولایت کی تعلیم کے اخراجات کا بار بھی سسرال اُٹھائے۔ دعوتوں اور نام و نمود رنگ میں جو فضول خرچی ہوتی ہے وہ جداگانہ ہے۔ جناب بیگم صاحبہ نواب ولی الدولہ مرحوم نے اپنے ایک لکچر میں جو خواتین کے کسی جلسہ میں دیا گیا ان مذموم امور پر کافی روشنی ڈالی ہے جن افراد کے گھر میں دختروں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اگر وہ اہل ثروت ہیں تو ناگزیر دامادوں کی ان خواہشوں پر توجہ کرنی پڑتی ہے اور اس کے لیے قرض داری یا حصول مایہ الاختلاط کی مذموم روش اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اور بھی ناجائز اور قابل نفرت مطالبات ہیں جن کے پورے نہ کرسکنے کی وجہ سے شرفا کے خاندانوں میں بکثرت لڑکیاں کافی عمر کے بعد بھی ناکتخدا بیٹھی ہوئی ہیں۔ اور بکثرت افراد شادیوں کی قرض داری کی وجہ سے زیر بار ہیں۔ طبقۂ مزارعین میں نہیں، بلکہ متمول طبقہ میں ترک مراسم اور مطالبۂ جہیز کے مذموم رواج کو ترک کرانے کے لیے خود چند متمول سنجیدہ افراد کو میدان عمل میں آجانا چاہیے اور اپنے عمل کا کوئی بلند نمونہ قایم کرنا چاہیے تاکہ قومی معاشرت کی اصلاح سے عام معاشی خوش حالی کا بھی دور دورہ ہو۔

مزارعین اور گھریلو صنعتیں۔

ایک خیال عام طور سے یہ ہے کہ مزارعین اپنے فرصت کے زمانے میں گھریلو صنعتوں کا کام انجام دیں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ بہت سے زراعت پیشہ افراد جب زراعتی کاروبار سے فارغ ہوجاتے ہیں قصبات وغیرہ میں مزدوری کے لیے چلے جایا کرتے ہیں۔ اور اگر کام مہیا ہو تو ضرور کام کریں گے۔ یہ خیال کہ گھریلو صنعتوں کا کام اختیار کرنا چاہیے کچھ زیادہ آسان نہیں ہے۔ اس کے سلسلے میں مشکلات بھی ہیں۔ ایک پیشہ ور کو دوسرے پیشہ کا کام کرنا آسان نہیں ہے۔ ایک زراعت پیشہ سے بافندگی یا کسی اور حرفت کا کام کافی مہارت کے بغیر نہیں چل سکتا۔ علاوہ ازیں دوسرے پیشہ کے آلات فراہم کرنا، کاروبار کے لیے رقم مہیا کرنا اور پھر جو سامان تیار ہو اس کو بازار میں فروخت کے لیے روانہ کرنا۔ غرض یہ اور دوسری مشکلیں درپیش ہوتی ہیں۔ پھر جو منافع حاصل ہوتا ہے وہ بھی حوصلہ افزا نہیں ہوتا۔ گاندھی جی

کانگریس اور دوسرے ادارے بائیس سال سے اس کا پرچار کر رہے ہیں لیکن کامیابی ایسی نہیں حاصل ہوئی جو خاص اہمیت رکھتی ہو

میوہ کی کاشت۔

یہ خیال بھی ظاہر کیا جاتا ہے کہ اہل دیہات کو اس بات کی بھی ترغیب دینی چاہیے کہ اپنے مکانات کے صحن میں میوہ کے دو ایک درخت لگائیں، اور ایک آدھ بیل ترکاری کی اپنے مکان یا صحن کی دیوار پر چڑھائیں۔

یہ چیز ثانوی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے مفید ہونے میں کوئی کلام نہیں، البتہ میوہ کے بہتر درخت اور ترکاریوں کے عمدہ تخم کی فراہمی کا انتظام ہونا چاہیے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بات ذہن پر ارکھنی چاہیے کہ ہمارے ملک میں میوہ کی درآمد بھی کثرت سے ہوتی ہے۔ سالانہ جو تر اور خشک میوہ درآمد ہوتا ہے اس کی قیمت پچاس لاکھ سے زیادہ ہوتی ہے جس کثرت سے بے نشان، طوطا پری، نیلم آم، موسمی، کونلہ اور موز وغیرہ کی درآمد بیرون ملک سے ہوتی ہے وہ بڑی حد تک کم ہو جا سکتی ہے، اگر ملک میں میوہ کی پیداوار کو ترقی دی جائے۔ ہمارے ملک کی زمین میں اچھے میوے اور عمدہ ترکاری کی قوت روئیدگی کافی موجود ہے۔ سررشتۂ زراعت اور محکمۂ مال کے باہمی تعاون اور مشورے سے بہت کچھ کام ہو سکتا ہے۔ چند سال تک دوبارہ کی کمی سے بھی کوئی صورت پیدا کی جا سکتی ہے۔

محاصل مالگذاری۔

ملک کے معاشی مسایل کے سلسلے میں محاصل مالگذاری کا مسئلہ بہت غور و خوص کا محتاج ہے۔ بعض حلقوں میں محاصل مالگزاری کی گرانباری اور اس کو کم کرنے کی خواہش کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔ نیز محصول کروڑگیری اٹھا دینے اور انکم ٹکس جاری کرنے کا مطالبہ بھی ہوتا رہتا ہے اس لحاظ سے مناسب ہوگا کہ مسایل ذیل پر صاحبان ذوق و علم تفصیلی طور سے غور و تامل کریں۔

۱۔ مالگزاری میں گزشتہ (۱۰) سال میں کس قدر اضافہ ہوا، اور اس اضافہ میں

الف ۔ رقبۂ جاگیرات و انعامات جو علاقۂ خالصہ میں شریک ہوگیا کس قدر ہے اور اس کی بنا پر آمدنی مالگزاری میں کس حد تک اضافہ ہو اکس حد تک منہائی عمل میں آنی چاہیے ۔

ب ۔ ذرایع آبپاشی میں جو اضافہ ہوا ہے اس کی وجہ سے منہائی کس قدر ہونی چاہیے ان دونوں منہائیوں کے باوجود جو اضافہ ہوا ہے وہ ۔ ۶ سالہ گرانی اجناس ۔ ترقی ذرایع رسل و رسایل کے مد نظر کہاں تک واجبی یا نا واجبی خیال کیا جا سکتا ہے ۔

۲ ۔ محصولات مالگزاری ادا کرنے کے بعد مزارعین کے لیے جو رقم باقی رہ جاتی ہے وہ ان کی بسر بہر و کیلئے کافی ہے یا نا کافی ۔

۳ ۔ گزشتہ دور میں گرانی قیمت اجناس کا جو فایدہ ہوا ہے اس سے تمتع کس طبقہ کو ہوا ہے اور اگر خود مزارعین واجبی تمتع سے محروم رہے ہیں تو اس کے وجوہات کیا ہیں ۔

۴ ۔ موجودہ محاصل کروڑگیری اور مالگزاری اور جنگلات وغیرہ میں کیا کسی بنیادی تغیر کی ضرورت ہے ۔

۵ ۔ اس ملک کے لیے انکم ٹکس کا طریقہ مناسب ہو سکتا ہے یا نہیں ، اور اس سے کن فوایدکی توقع ہے ۔

۶ ۔ آبکاری کی بنیادی پالسی سے حقیقت میں استعمال مسکرات کم ہو رہا ہے یا زیادہ ۔ استعمال مسکرات میں کمی کے لیے صحیح چارۂ کار کیا ہو سکتا ہے ۔

ان امور کے متعلق راقم الحروف کی ذاتی رائے یہ ہے کہ ۔

۔ گزشتہ ۶۰ سال کے مقابل جب کہ محاصل مالگزاری دو کروڑ تھے اب تین کروڑ ہیں بتذکرۂ بالا ہر دو منہائیوں کے بعد محاصل میں جو اضافہ جدید بندوبستوں کی وجہ سے ہوا ہے وہ گرانی قیمت اجناس اور ذرایع رسل و رسایل کی ترقیوں کے مقابل چنداں نا قابل برداشت نہیں ہے ۔ لیکن وہی ساہوکار اور تاجر مزارعین کو فایدہ پہنچانے کے بجائے خود فائدہ حاصل کر لیتے ہیں ۔ نقص سرمایہ داری اور درمیانی واسطہ کا ہے ۔ اس سلسلہ میں مزارعین کی قرض داری کے لیے

حقیقی چارہ کار دریافت کرنا ناگزیر ہے۔

محاصل مالگزاری و جنگلات میں کوئی بنیادی تغیر بہت کچھ غور و خوض کا محتاج ہے۔ برطانوی ہند کے نظریات پر آنکھ بند کرکے عمل نہ کرنا چاہیے۔

راقم الحروف کے خیال میں اس ملک میں محصول کروڑگیری بہترین طریقۂ محصول اندازی ہے۔ اور اس کی وجہ سے اصل بار ہر طبقۂ رعایا پر حسب حصۂ رسدی قلیل مقدار میں پڑتا ہے۔ محصول کروڑگیری برخاست کردیا جائے تو اس سے یوروپ و امریکہ کی مصنوعات کو اور محدود تجارتی طبقہ کو فایدہ ہوگا۔ رعایا کو اس کا فایدہ چنداں محسوس نہ ہوگا۔

انکم ٹکس اس ملک میں بالکل اجنبی محصول ہے۔ اس ملک میں وہ زیادہ مقدار میں وصول نہ ہوسکے گا۔ محصول کروڑگیری کے مقابلہ میں انکم ٹکس کے وصول کرنے میں خیانت اور رشوت کے زیادہ امکانات رہیں گے۔ اس کے وصول کرنے میں مصارف بھی زیادہ عائد ہوں گے۔ انکم ٹکس کا اس ملک میں نہ لیا جانا ایک عظیم ترین برکت اور بہترین خصوصیت ہے جس پر ہم فخر کرسکتے ہیں۔ ہم پر لازمی اور واجبی نہیں ہے کہ اس طریقۂ محصول کو ہم اس بنا پر جاری کرنا چاہیں کہ دوسرے ممالک میں یہ طریقہ رائج ہے۔ اس ملک میں حکومت جو عام محاصل وصول کرتی ہے وہ اس کے مصارف جاریہ کے بعد بھی بچ رہتے ہیں۔ کروڑوں کی ملکیت اور اثاثے اس کے نتائج ہیں۔ پھر کیوں یہ محصول لیا جائے۔ دنیا کی ہر حکومت کا مسلمہ اصول ہے کہ اُسی قدر محصول لیا جائے جس کی ضرورت ہے۔

آبکاری کی پالیسی جو کچھ ہے اس سے قطع نظر بہرحال منشیات کی جو کچھ کثرت ہے اور خاصکر ولایتی شرابوں کی روز بروز گرمئ بازار موثر تدابیر انسداد کی متقاضی ہے مگر ان طریقوں سے نہیں جو کانگریسی وزراء کی جانب سے چند روز برطانوی ہند کے چند صوبجات میں اختیار کئے گئے تھے۔

مسائلِ مالگزاری بہت کچھ تحقیق و تفحص کے محتاج ہیں۔ نواب محسن الملک مرحوم کے

رسایل مالگزاری کے بعد ہمارے ملک میں مالگزاری کے معاملات پر کوئی قابل استناد ادب وجود میں نہیں آیا۔ ضرورت ہے کہ ملک کے نوجوان معاشیات داں اور ذوق سلیم رکھنے والے حکام مالگزاری و بند وبست اس جانب متوجہ ہوں۔

دست کاریاں۔

یہ امر کہ زراعت پیشہ افراد اپنے فرصت کے وقت میں گھریلو صنعتوں کا کام انجام دیں۔ اس کے متعلق اوپر کچھ اشارہ کیا گیا ہے۔ اس سے قطع نظر مشینوں سے دستکاریوں پر جو اثر پڑا اس کی بنا پر دستکاریوں کی تباہی لازمی ہے لیکن صورت حال یہ ہے کہ برطانوی ہند میں مشکلات کے باوجود بہت سی دستکاریاں اچھی حالت میں موجود ہیں، اوران کی حالت اس قدر بہتر ہے کہ خود حیدرآباد اور ممالک محروسہ کے بازاروں میں یہ چیزیں فروخت ہوجاتی ہیں۔ ہماری ہر قسم کی دست کاریاں برباد ہوگئی ہیں۔ مثلاً پٹن، اورنگ آباد، ناندیڑ، نارائن پیٹ، اور سنگاریڈی وغیرہ مقامات کی زرین، ریشمی پارچہ بافی، گوٹا کناری وغیرہ ہیں۔ ان کی پہلے کیا حالت تھی کس قدر زیادہ تعداد میں یہ چیزیں فروخت ہوتی تھیں اب کس قدر اُجڑی ہوئی حالت ہے۔ بنارس، احمد آباد، سورت، مدہرہ وغیرہ سے کس قدر وافر سامان ملک میں آتا ہے کیوں ان مقامات کی دست کاریاں فروغ پر ہیں۔ اور کیوں ہمارے ملک کی دستکاریاں تباہ ہوچکی ہیں۔ ان امور پر متعدد مرتبہ اظہار خیالات کیا جاچکا ہے۔ بنارسی زرین پارچے یا دوسرے مقامات کی ریشمی اور سوتی ساڑیاں اس لیے ہمارے ملک میں آتی ہیں کہ وہاں کافی مقدار میں سرمایہ لگا ہوا ہے اوران کی آڑتیاں یہاں موجود ہیں۔ اور آسانی کے ساتھ تیار مال لاکر فروخت کرتی ہیں۔ ملک کی دست کاریوں کو یہ سہولتیں حاصل نہیں ہیں۔ حال حال میں اورنگ آباد و حیدرآباد میں ترقی یافتہ دستی پارچہ بافی کے مشینوں کو برقی قوت سے چلانے اور ریشمی پارچے تیار کرنیکی کوشش کامیاب نتائج کا اظہار کرتی ہے۔

دست کاریوں کی کامیابی کے لیے زمانۂ حال میں تین چیزیں ضروری ہیں:-

۱۔ دست کار کی رہنمائی مال کی وضع ارنگ بافت اور جدید طریقۂ دست کاری اور جدید آلات کے بارے میں مسلسل ہوتی رہنی چاہیے۔

۲۔ سرمایہ موجود ہو کہ خام مال خرید سکے اور مال کافی مقدار میں تیار کر سکے۔

۳۔ مال فروخت کرنے کے لیے بازار آسانی سے مل جائے۔

ان تینوں امور میں ہمارے ملک کے دست کار کس قدر مبتلائے مشکلات ہیں وہ روشن ہے۔ ہمارے ملک کی سالانہ نمائشوں میں ملک کی اور خاصکر اضلاع کی دست کاریاں کس قدر مقدار میں فروخت ہوتی ہیں اور ان کی کیا حالت ہے وہ عیاں ہے۔ فروخت گاہ مصنوعات ملکی میں کچھ سامان فرمائش سے تیار کر کے رکھ دینا اصلی مشکل کو حل نہیں کر سکتا ہے۔ نیز تین چار لاکھ روپے کی قلیل امدادی رقم سے جو زراعت کی تقاوی کے طور پر منظور اور تقسیم کی جائے کوئی حقیقی فائدہ نہیں حاصل ہو سکتا اب یہ کام معاشی کمیٹی کا ہے کہ صناعوں اور تاجروں سے براہ راست تبادلۂ خیالات کے بعد ان ذرائع کو دریافت کرے کہ جن سے مملکت آصفیہ کے دست کاروں کی مشکلات حل ہوں اور بازاروں میں ان کے تیار شدہ مال کی فراہمی بآسانی ہو سکے۔

طبقۂ ملازمین و طبقۂ اناث۔

اس خطبۂ صدارت کے آخر میں ملازم پیشہ طبقہ اور طبقۂ اناث کے متعلق بھی اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ملازم پیشہ طبقہ سے قطع نظر معاشی اور معاشرتی حالات کے اعتبار سے ملک کے تمام طبقات کی حالت یکساں ہے۔ چائے خانہ اور سینما کا شوق علی الاکثر تمام ملک پر محیط ہے اور ملازموں سے زیادہ مزدور پیشہ اور دیگر غیر ملازم طبقات کو ان امور سے دلچسپی ہے۔ یہ شوق مغرب زدگی کا لازمی نتیجہ ہے۔ مدارس اور تعلیم سے خوف خدا، اخلاق کی پاکیزگی اور تربیت کے عنصر کو خارج کرتے جائیں اور مغربی آزاد خیالی بڑھاتے جائیں تو اس کا لازمی نتیجہ وہی طرز زندگی ہے جس کی شکایت کی جاتی ہے۔ ایک طرف آبکاری کے کاروبار با قاعدگی کے ساتھ کھلے بندوں چل رہے ہیں، دوسری طرف سینما کی حد بندی کے بغیر عیش پرستانہ اور جذبات کو ابھارنے والے مناظر دکھا رہے ہیں۔ ساتھ ہی موجودہ زمانہ کی ضروریات زندگی کیلئے

چائے خانے اور طعام خانے لازمات سے ہو گئے ہیں۔ جب یہ سب ترغیبات کھلے بندوں نظر فریب بنے ہوئے ہیں اور کوئی روک ٹوک نہیں تو عام طور سے لوگ اس سے باز نہیں رہ سکتے خواہ کوئی اپنی جگہ کتنا ہی تاسف کیوں نہ کرے۔ قانون کے ذریعہ مناسب حد بندیاں پیدا کر دی جائیں اور تعلیم و تربیت میں اخلاق اور خوف خدا کے عنصر کو ترقی دی جائے تو بدی کے نشانات خود بخود مدھم پڑ جائیں گے۔ محض معاشی کلب گھروں سے حالات کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ آخر اعلیٰ طبقہ کے افراد ملک کیلئے کلب گھر کھلے ہوئے ہیں، وہاں اخبارات، کتب، ٹینس وغیرہ مفید مشاغل موجود ہیں لیکن سب سے زیادہ اجتماع تاش کی میز پر نظر آئے گا۔ عمال سے بڑھ کر حکام تاش اور گھوڑ دوڑ میں بازی لگانے کے شوق میں مبتلا ہیں۔ سرکاری فرائض سے زیادہ انھاک اس تاش اور دوسرے لہو و لعب میں نظر آئے گا۔ اسکی اصلاح دفترواری معاشی کمیٹیوں کے بجائے موجودہ دفتری انجمن ہائے امداد باہمی کے ذریعہ زیادہ آسانی سے ہو سکتی ہے۔ حکام چاہیں تو عمال اور ملازم پر اپنا اخلاقی اثر ڈال سکتے ہیں۔ اگر اعلیٰ حکام و عہدہ دار خود اصلاح معاشرت اور ترک رسوم کا نمونہ بنیں تو حالات بہتر ہو سکتے ہیں۔

جناب مولوی لیاقت اللہ خان صاحب نے متوسط اور اعلیٰ طبقے کی خواتین کی نسبت فرمایا ہے کہ:۔

> "کوئی کام جسمانی محنت کا نہیں کرتیں، متعدد ملازمین کی ان کو ہر آن محتاجی رہتی ہے جیسے کہ مریض کو نرس کی۔ گھر کے کاروبار سب ملازمین کے تفویض رہتے ہیں اور ہر قسم کی فضول خرچی ہوا کرتی ہے۔ بچے آیاؤں کے سپرد ہو جاتے ہیں۔ ماں باپ کے ساتھ نہ اُٹھتے بیٹھتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ ماں کی ذاتی توجہ و تربیت سے یہ محروم ہو کر بڑے ہوتے ہیں۔ رسم و رواج کو ہماری مستورات اس درجہ اہمیت دیتی ہیں کہ چاہے کل اثاث البیت فروخت ہو جائے مگر مقررہ تقاریب نہ ٹلیں۔"

یہ امور بڑی حد تک صحیح ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ دنیا کے ہر ملک اور قوم میں ہر زمانہ میں اعلیٰ طبقہ کی خواتین کی زندگی تقریباً اسی طرح گزرتی رہی ہے۔ وہ عیش و نشاط اور راحت و تنعم اور لطف زندگی کا ذریعہ سمجھی جاتی ہیں، البتہ اگر ہمارے دور میں اس میں زیادہ ابتری نمایاں ہے تو اس لیے کہ

مغرب زدگی کا دور ہے۔ مدارس میں نسوانی ضروریات اور روایات قومی وملکی اور خدا پرستی کی تعلیم اور اس نقطۂ نظر سے تربیت ہو تو یہ معائب خود بخود دُور ہو جائیں گے مستورات کو خود مرد نمونہ بنکر اصلاح حالات پر مائل کرسکتے ہیں۔

جناب مولوی لیاقت اللہ خان صاحب کے خطبۂ صدارت کے بعد اور بھی بعض تقریریں ہوئیں۔ مثلاً ایوانِ تجارت کے عشائیہ میں آنریبل صدرالمہام بہادر فینانس کی تقریر سے بھی ملک کے خود مکتفی ہونے کے نظریہ اور سرکاری امداد صنعتی کاروبار میں شامل کرنے کی جو نفی کی گئی ہے اُس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ ہمارے ملک کو زیادہ تر خام پیداوار فراہم کرنے والا ملک بنے رہنے پر قانع ہونا چاہیے۔

آخر میں مجھ کو یہ عرض کرنا ہے کہ تمام دنیا میں انقلابی طوفان چل رہا ہے۔ ہمارے ملک اور ہماری حکومت کے لیے معاشی امور میں صرف غور وخوص نہیں بلکہ حرکت اور سعیٔ عظیم کی ضرورت ہے۔ بہرحال گزشتہ ۶۰ سال میں اگر ہم درحقیقت کام کرتے تو آج حیدرآباد کہاں رہتا۔ اس ۶۰ سال کی مدت میں ہم ایک کے بعد دوسرے مدارالمہام یا وزیر سلطنت کے خلاف انٹریگ کرتے رہے۔ ہم شخصی منافع اور مصالح میں اُلجھے ہوئے رہے۔ بلند نظری، ایثار اور جسارت سے ہم دور رہے۔ ہم اپنے سایہ سے ڈرتے رہے۔ معاشی اور تمدنی ترقی سے قطع نظر دوسرے اور شعبہ جات میں بھی ہم پیچھے رہ گئے۔ گزشتہ ۶۰ سال کی مدت تو خیر دور کی بات ہے۔ گزشتہ ۲۲ سال کو ہی لیجیے۔ ہم کس قدر بیدار ہوئے اور کتنی مسافت طے کی۔ غرض اب مستقبل کا مقابلہ کرنا ہے۔ اگر ہمت، اولوالعزمی اور عزم صادق پیدا ہو جائے تو پھر ترقی کا ہر میدان کامیابی سے سر ہو سکتا ہے۔

حیدرآبادی روغنی تخم کی اہمیت

از ڈاکٹر امیر علی خاں صاحب پی۔ ایچ۔ ڈی چیف مارکٹنگ افیسر سرکار عالی

"یہ مضمون ۱۹۴۳ء کی معاشی کانفرنس میں پڑھا گیا تھا۔ اس کے بعد حالات میں بہت بڑا تغیر ہوگیا ہے بریں ہمہ مضمون کی اہمیت آج بھی کسی طرح کم نہیں ہوئی"۔ مجلہ

حضرات! مجھے افسوس ہے کہ گزشتہ دو ہفتوں کی علالت کی وجہ اس دلچسپ موضوع پر میں آپ کے لئے اب مضمون نہ لکھ سکا جیسا کہ لکھنے کا ارادہ تھا۔ علالت کے مابعد کمزوری کی وجہ آپ مجھے معاف فرمائیں گے اگر میں اس وسیع مضمون کے چند پہلو کا مختصر ذکر کرنے پر اکتفا کروں۔ البتہ میری مختصر تقریر کے بعد اگر آپ میں سے کوئی بھی اس بارے میں سوال کرنا چاہیں تو بہ حتی الامکان جواب دینے کی کوشش کروں گا۔

یہ آپ لوگوں سے پوشیدہ نہیں کہ اب ہمارا ملک دنیا کی تجارتی گردش میں آچکا ہے۔ ہم از خود نہ اپنے پورے ضروریات مہیا کر سکتے ہیں اور نہ اپنے ملک کی صنعتی یا خام پیداوار کو باہر جانے سے روک سکتے ہیں۔ بلکہ یوں کہئے کہ اس تجارتی دور میں ہماری فلاح و بہبود، بلکہ ہماری بقا ہی اس میں ہے کہ زیادہ سے زیادہ تجارت کو فروغ دیں، اپنا مال باہر بھیجیں اور باہر سے اپنے ضروریات بھی مہیا کریں۔ البتہ کونسی اشیا کو برآمد کرنے میں ملک کا فائدہ ہے اور کونسی چیزوں کو درآمد کرنا چاہیے اس کا تمیز کرنا ہمارا فرض ہے۔

اس نقطۂ نظر سے ہمارے ملک کے درآمد و برآمد کے اعداد کو ملاحظہ فرمایئے تو ایک عبرتناک منظر دکھائی دیتا ہے۔ اس منظر کو آپ کی نمائش کے بانیان نے ابتدائی اشتہاری کارڈ میں بخوبی ظاہر کیا تھا۔ یہ کارڈ آپ کی نظروں سے ضرور گذرا ہوگا اور آپ نے ضرور محسوس کیا ہوگا کہ ہماری برآمد تقریباً پوری خام پیداوار پر مبنی ہے، اور ہماری درآمد میں زیادہ تر صنعتی اشیا موجود ہیں۔

اپنے ملکیوں کو پارچہ بافی سے فائدہ اٹھانے سے محروم رکھ کر ہم روئی برآمد کرتے ہیں اور باہر کے ملکوں کو اسی روئی سے کپڑ بنا کر ہم ہی کو فروخت کرنے کا موقعہ دیتے ہیں۔ اس طرح ہم اپنے تیلیوں کو بے روزگار رکھ کر تخم ہائے روغن برآمد کرتے ہیں اور ہمارے ہی ملک کے تخم سے دوسرے ملکوں میں نکالا ہوا تیل خوشی خوشی خرید کر استعمال کرتے ہیں اگر یہ خام پیداوار برآمد شدہ کی مقدار قلیل ہوتی تو زیادہ مضائقہ نہیں تھا لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ ہماری برآمد کی جملہ قیمت پندرہ کروڑ روپیوں کے منجملہ پانچ کروڑ روپے کے تو ہم صرف تخم روغن برآمد کرتے ہیں۔

اسی طرح خام پیداوار برآمد کر دینے سے نہ صرف ملک کے باشندوں کو صنعتی کاروبار کا موقعہ نہیں ملتا بلکہ اراضیات کو بھی اس قیمتی جزو سے محروم کیا جاتا ہے جو روغن نکالے جانے کے بعد بحیثیت کھلی اراضیات میں ڈالا جانا چاہیے تھا۔

اس اندھی برآمد کی وجہ نہ صرف ہماری آبادی بلکہ ہماری زمین بھی مفلس ہوتی جاتی ہے۔

اس عام تبصرہ کے بعد مختلف تخم ہائے روغن کے متعلق مختصر تذکرہ بے جا نہ ہوگا۔ ان میں آج کل سب سے زیادہ اہمیت رکھنے والا تخم روغن مونگ پھلی ہے۔ پندرہ بیس سال ہوگئے یہ تخم کا رقبہ ممالک محروسہ میں بہت کم تھا بلکہ کہئے کہ اسکی کاشت ہمارے ملک میں ہوتی ہی نہیں تھی لیکن اس قلیل مدت میں مونگ پھلی کا شمار اس ملک کی اہم ترین پیداواریوں ہونے لگا ہے۔ آج ہمارے ملک میں اس کی کاشت (۶) لاکھ ایکڑ پر ہوتی ہے اور چار لاکھ ٹن یعنی (۳۲) لاکھ پلے تخم پیدا ہوتا ہے جس کی قیمت تقریباً ساڑھے چار کروڑ ہوتی ہے اس پیداوار کا ۳/۴ حصہ ہم تخم کی شکل میں بمبئی اور مدراس کو برآمد کرتے ہیں ان مقامات پر اس تخم سے روغن نکالا جاکر کچھ تو بیرون ممالک کو روانہ کردیا جاتا ہے اور کچھ مصنوعی گھی کی صورت میں ہندوستان ہی میں فروخت ہوتا ہے۔

اب تک ہماری مونگ پھلی اور اس کے تیل کے خریدار فرانس۔ اٹلی۔ جرمنی تھے لیکن جنگ کی وجہ یہ مارکٹیں ہمارے لئے بند ہوگئے ہیں اور گورنمنٹ کے لیے یہ اہم سوال آپڑا ہے کہ اپنے ملک کی پیداوار سے کیا کیا جائے۔ اس کی ملک ہی میں کس طرح کھپت ہوسکتی ہے، اور طلب کی کمی کی وجہ

نرخ بہت کم ہو جائیں گے تو کاشت کار کو کافی رقم کس طرح ہاتھ آئے گی۔

مختلف طریقے اس کو حل کرنے کے لئے پیش نظر ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ سرکار کو چاہیے کہ مونگ پھلی خریدے اور جب قیمتیں زیادہ ہوں تو اس وقت فروخت کرے۔ دوسرا کہتا ہے کہ رقبہ کو ہر طرح کم کرنا چاہیے۔ تیسرے کا خیال ہے کہ کاشت کار کو اپنا مال روک رکھنے کے لیے رقمی سہولتیں بہم پہنچانا چاہیے۔ دقت یہ ہے کہ ان سب تحریکوں میں ذرا سی جانچ پر کوئی نہ کوئی بڑا نقص دکھائی دینے لگتا ہے جس کی وجہ کوئی خاص تحریک قبول کرنے میں سرکار کو تامل ہوتا ہے۔

چار و ناچار ایک ہی صورت نظر آتی ہے وہ یہ کہ اس ہی کی صنعت کو ہر طرح فروغ دیا جائے تاکہ خام پیداوار بجائے باہر جانے کے ملک ہی میں صنعتی کارخانہ جات قائم ہو جائیں۔

آپ کو یہ سنکر مسرت ہوگی کہ سرکار کی اس جانب توجہ ہے صنعت روغن ہی کو کس قدر فروغ دیا ہے۔ ۱۳۴۲ف میں سرکار نے روغن کی برآمد پر سے چالیس ہزار روپے کا نقصان برداشت کرکے محصول کروڑ گیری برخواست کر دیا۔ اس ایک حکم کی بنا پر مابعد (چھ) سال میں ملک کے گوشہ گوشہ میں روغن کشی کی [illegible] کرنیاں قائم ہوئیں کہ جب ۱۳۴۶ف میں نصف محصول عائد کیے جانے لگا تو اس کی آمدنی چار لاکھ ہوگئی اور آج صرف روغن مونگ پھلی کی برآمد سے سرکار کو تقریباً آٹھ لاکھ روپیہ کروڑ گیری محصول وصول ہو رہا ہے۔

صرف تیل کشی کے لئے نہیں بلکہ اس تیل سے بناسپتی گھی بنانے کے کارخانے کیلئے بھی سرکار عالی منظوری دے دی ہے اور عنقریب یہ کاروبار بھی آغاز ہو جائیں گے

چند ہی سال قبل ہمارے ملک سے تخم ارنڈی کافی مقدار میں برآمد ہوتا تھا بلکہ کہنا چاہیے کہ دنیا میں سب سے زیادہ ارنڈی ہماری ہی مملکت میں پیدا ہوتی تھی۔ یوں تو اب بھی کافی مقدار میں یہ تخم پیدا ہوتا ہے لیکن گذشتہ دس سال میں ملک برازیل میں اس کی کاشت کو فروغ ہونے کی وجہ اس کی قیمت نہایت گر گئی ہے جس کی وجہ کاشت میں بھی انحطاط شروع ہو گیا ہے۔ لیکن اس کے روغن کے استعمال کے لئے ایسے نئے نئے ذریعے پیدا ہو رہے ہیں کہ عنقریب ممکن ہے کہ اس کی طلب میں زیادتی ہو کر

اس کی قیمتوں میں اور اس کے تحت رقبہ میں کافی اضافہ ہو۔

ارنڈی کے بعد ہمارے ملک میں تل، السی اور کرڈی کی پیداوار ہوتی ہے ان میں سے تل اور کرڈی کا تیل جو میٹھا تیل کہلایا جاتا ہے اکثر غذا کی طرح استعمال ہوتا ہے لیکن السی کا تیل ہزاروں صنعتی مرکبات جیسے وارنس مختلف قسم کے پینٹ وغیرہ بنانے جاتے ہیں۔

لڑائی کی وجہ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے ان اشیاء کی برآمد میں کمی ہو کر ان کی قیمتیں گرنے کا اندیشہ ہے لیکن یہ قیمتوں کے گرنے سے ہمیں چاہیے کہ دوسری طرح فائدہ اٹھائیں تیل کے نئے نئے استعمال ڈھونڈ نکالیں اور ان طریقوں کو صنعتی جامہ پہنا کر خود کو اور ملک کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کریں۔

مجھے اپنے فرائض کی انجام دہی میں زیادہ تر ملک کے تجارتی اور صنعتی طبقوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے ان اہم پیشوں میں ہمارے ملک کے باشندے بہت کم ہیں۔ جو ہندو ہیں وہ مارواڑ، گجرات، کاٹیاوار سے آکر یہاں بسے ہیں، جو مسلمان ہیں وہ بھی گجراتی یا کچھی ہیں حیدرآباد کے باشندوں کو ابھی تجارت کی طرف توجہ ہی نہیں ہوئی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ جب ملازمت کا دائرہ روز بروز محدود ہوتا جائے گا تو اکثر کو تجارت کی طرف توجہ ہوگی اور یہ اس شعبۂ زندگی میں خود کو کامیاب ثابت کریں گے میں آپ لوگوں کو اس طرف دعوت دیتے ہوئے یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ فن تجارت آسان نہیں۔ تجارت پیشہ کو کامیابی کے لیے ہشیار ہونا ضروری ہوتا ہے۔ روپیہ تو کجا آنہ آنہ پائی پائی کی نگہداشت پر تجارت میں کامیابی منحصر ہے۔ تجارت و صنعت میں "پڑتل" ایک ایسا لفظ ہے جو سوتے جاگتے تجار کے کانوں میں بھنبھناتا رہتا ہے۔ اخراجات میں تھوڑی سی کمی یا فائدے میں تھوڑا سا اضافہ لوگوں کو مالا مال کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تجارت پیشہ حساب میں عموماً ماہر ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ہمیں نہ بھولنا چاہیے کہ ہر انسان جس طرف خاص توجہ کرے اس طرف ماہری حاصل کر سکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے وطن کے باشندے اور تعلیم یافتہ طبقہ اگر تجارت کی طرف توجہ کرے تو علم حساب کے اہم نکات سے بھی جلد از جلد واقف ہو جائیں گے۔

ہندوستان میں افراطِ زر

از جناب خواجہ شمس الدین صاحب ایم۔ اے (ابتدائی)

جنگ کی وجہ سے جو پیچیدہ معاشی مسائل پیدا ہوتے ہیں ان میں افراطِ زر کا مسئلہ اپنی ہمہ گیری اور دور رس اثرات کے، اعتبار سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ زر کے مسائل ویسے ہی بہت مشکل ہوتے ہیں لیکن جنگ نے انھیں مشکل تر بنا دیا ہے۔ گذشتہ آٹھ دس مہینوں سے ہندوستان میں غیر معمولی حالات کی رفتار اتنی تیز رہی ہے کہ ہر شخص اسی طرف متوجہ ہے معاشی حلقوں میں افراطِ زر کے اسباب و نتائج مرکز توجہ بن گئے ہیں۔ یہ مسائل اپنی پیچیدگی کے باوجود ہماری روزمرہ زندگی سے اتنا گہرا تعلق رکھتے ہیں کہ ان کا جاننا نہایت ضروری ہے۔

افراطِ زر سے عموماً یہ مراد لی جاتی ہے کہ کسی ملک میں زر یا قوت خرید کے مقابلے میں اشیاء یا ایسی چیزوں کی کمی پڑ جائے جن کو خریدا جا سکے۔ افراطِ زر کی کوئی جامع تعریف نہیں ہے لیکن مختلف معاشئین نے زر کی پالیسی کے سلسلے میں اس کو استعمال کیا ہے۔ فیڈرل ریزرو سسٹم کے ڈاکٹر گولڈن وبزر نے افراطِ زر کی یہ تعریف کی ہے کہ "زر کی افراط اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ زر کی مقدار جو اشیاء اور خدمات کے لئے مختص ہے ممکن الحصول رسد کے مقابلے میں بہت بڑھ جائے یا قومی آمدنی زر کی اکائیوں میں مادی اکائیوں سے زیادہ ہو جائے"۔ افراطِ زر کے اسباب یہ ہوتے ہیں کہ حکومتیں اپنے جنگی اغراض پورے کرنے کے لئے فرضی اعتبار پر زیادہ نوٹ رائج کر دیتی ہیں یا وہ نظام بنک کاری سے قرض لیتی ہیں اور بنک اپنے اعتبار میں توسیع کر دیتے ہیں۔ ان دونوں کا نتیجہ زر کی مقدار میں اضافہ ہوتا ہے لیکن اشیاء کی مقدار میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا اس طرح سے زر کی قدر گھٹ جاتی ہے اور اشیاء گراں ہو جاتی ہیں جس کے باعث غیر منظم مزدوروں اور مستقل تنخواہ پانے والوں کو نقصان ہوتا ہے۔ بچتوں پر اس کا برا اثر پڑتا ہے کیوں کہ ان کی قدر بہت گھٹ جاتی ہے ملک کے کارخانہ داروں،

بڑے بڑے ٹھیکیداروں اور تاجروں کو اس سے بہت فائدہ پہنچتا ہے لیکن بحیثیت مجموعی ملک کا معاشی نظام تباہ ہو جاتا ہے اور ملک کی دنیا میں ساکھ گھٹ جاتی ہے۔

زر کی مقدار میں اگر پیدائش دولت اور کار و بار کی ترقی کی وجہ سے اضافہ ہو تو اُس کو افراطِ زر نہیں کہیں گے کیونکہ ایسی صورت میں تو ہر اچھے نظامِ زر اور اچھی حکومت کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ زر کی مقدار میں اشیاء اور خدمات کی رسد کی زیادتی کے تناسب سے اضافہ کرے ورنہ تفریطِ زر کی صورت پیدا ہو جائے گی جس سے قیمتیں گر جائیں گی، کار و بار بُری طرح متاثر ہوں گے اور ملک میں بے روزگاری پھیل جائے گی۔ ہندوستان میں جنگ کی ابتداء میں کوئی ۲۰۰ کروڑ کی مالیت کے نوٹ جاری تھے لیکن یہ بڑھتے بڑھتے اب ۶۰۰ کروڑ ہو گئے یعنی ۴۰۰ کا اضافہ ہوا۔ مندرجہ فہرست بنکوں کے چالو کھاتوں میں اکتوبر ۴۲ سے دسمبر ۴۲ تک ۱۳۶ کروڑ سے بڑھ کر رقم ۲۲۳ کروڑ ہو گئی لیکن ان بنکوں کے صرف چالو کھاتوں میں اضافہ ہوا ہے میعادی امانتوں میں کمی ہو گئی ہے یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ عوام میں اب بنکوں کا اعتماد گھٹ گیا ہے، وہ اپنے سرمایہ کو زیادہ سے زیادہ رقیق حالت میں رکھنا چاہتے ہیں اس کا ثبوت پوسٹل سیونگس اور کیاش سرٹیفکٹس کی رقم سے بھی ہو سکتا ہے، جنگ سے پہلے ان مدات میں ۱۴۱ کروڑ کی رقم جمع تھی لیکن اب صرف ۵۹ کروڑ رہ گئی ہے، اس سے دوسری بات یہ واضح ہوتی ہے کہ موجودہ گرانی کے سبب سے لوگوں کے اخراجات میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے اور اس کا اثر بچتوں پر پڑ رہا ہے۔ نوٹوں کی زیادتی کے علاوہ ۶۰ کروڑ کی مالیت کے نئے روپے اور روپے والے نوٹ جاری کئے گئے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ زر کی مقدار میں یہ اضافہ آیا پیدائش دولت میں اضافے کے باعث ہے؟ لیکن قیمتوں میں غیر معمولی اضافے کی رفتار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اشیاء کی مقدار میں زر کے تناسب سے اضافہ نہیں ہوا۔ ایسے ملک میں جہاں کا نظامِ زر محض زر وضعی اور زر کاغذی پر مشتمل ہو افراطِ زر کا پتہ چلانے کے لئے اشاری اعداد (انڈکس نمبر) ہی پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ ذیل کے اشاریہ سے ہندوستان میں قیمتوں کی گرانی کا اندازہ ہو سکے گا۔

اساس جنگ سے پہلے = اگست ۱۹۳۹ = ۱۰۰
جنگ کا پہلا سال ۱۱۹
دوسرا سال ۱۲۳
تیسرا سال ۱۵۳
دسمبر ۴۲ء ۲۳۵

اس طرح سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ جنگ شروع ہونے کے بعد سے اب تک قیمتوں میں ۱۰۶ بز کا اضافہ ہوا ہے اور دوسرے ملکوں کی طرح یہاں پر کوشش کے باوجود قابو حاصل نہیں کیا جا سکا انگلستان میں پہلے سال قیمتوں میں ۵۰ بز اضافہ ہوا، دوسرے سال صرف ۸ بز اضافہ ہوا اور تیسرے سال ۳ ½ بز اور اب قیمتوں پر قابو پالیا گیا ہے اور مزید اضافے کی گنجائش نہیں ہے۔ انگلستان ہندوستان کی بہ نسبت جنگ سے زیادہ متاثر ہے لیکن وہاں پر صرف ۶۲ بز کا اضافہ ہوا ہے۔ ذیل کی جدول سے معلوم ہوگا کہ دنیا کے مختلف برسر جنگ ممالک میں جنگ کے ابتدائی سالوں میں قیمتوں میں کس قدر اضافہ ہوا

ٹھوک فروشی کی قیمتوں کے اشاری اعداد:۔

(اساس) ۱۹۲۹ = ۱۰۰

سال	کلکتہ	بمبئی	برطانیہ	ممالک متحدہ امریکہ	کینیڈا	جرمنی	جاپان
۱۹۳۸	۶۸	۷۰	۸۹	۸۲	۸۲	۷۷	۱۱۴
۱۹۳۹	۷۶	۷۵	۹۰	۸۱	۷۹	۷۸	۱۲۶
۱۹۴۰	۸۵	۸۱	۱۲۰	۸۲	۸۷	۸۰	۱۴۲
۱۹۴۱	۹۹	۹۴	۱۳۴	۹۲	۹۴	۸۲	۱۵۰

اس سے معلوم ہوا کہ جنگ کے ابتدائی سالوں میں کلکتہ میں ۳۶ بز بمبئی میں ۳۴ بز کینیڈا میں

۴۱بز ممالک متحدہ میں ۱۲ بز جاپان میں ۔ ۳بز اور جرمنی میں ۶۴ بز قیمتوں میں اضافہ ہوا ہے۔ ان ممالک میں جو جنگ سے زیادہ متاثر ہیں قیمتوں کے اضافے پر قابو پالیا گیا ہے لیکن ہندوستان میں اضافے کی رفتار مستقل حیثیت رکھتی ہے چنانچہ کلکتہ کے اشاری اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپریل ۱۹۴۲ء میں یہ ۱۵۷ تھا لیکن اکتوبر ۱۹۴۲ء میں بڑھ کر ۲۰۶ ہوگیا یعنی صرف مہینوں میں ۳۱ بز کا اضافہ ہوا ان اعداد سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ہندوستان میں افراط زر بہت خطرناک صورت اختیار کر رہا ہے اور اگر اس کا مناسب سدباب نہ کیا گیا تو یہ غریب طبقے کے لئے تباہ کن ثابت ہوگا۔ قیمتوں کے اضافے سے تو یہ ثابت ہوچکا ہے کہ پیدائش دولت کے اعداد سے یہ معلوم ہوگا کہ کہاں تک زر کی مقدار میں اضافہ پیدائش دولت کی زیادتی کی بدولت ہوا ہے۔

صنعتی پیداوار کے اشاری اعداد

اساس = ۱۹۳۸-۱۹۳۹ = ۱۰

سال	ہندوستانی روئی کا صرف	جوٹ کی مصنوعات	فولاد	کاغذ
۱۹۳۹-۱۹۴۰	۹۶	۱۰۵	۱۱۰	۱۱۸
۱۹۴۰-۱۹۴۱	۱۰۷	۹۱	۱۲۳	۱۸۵
۱۹۴۱-۱۹۴۲	۱۲۵	۱۰۰	۱۳۰	۱۵۴

اس کے علاوہ دوسرے صنعتی کاروبار میں بھی اضافہ ہوا ہے اور اس طرح سے کل اضافہ ۳۰ بز ہوا۔ ریلوے کی سرگرمیوں سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ خدمات کی حد تک ۲۰ بز کا اضافہ ہوا ہے۔ ان کا مقابلہ اگر زر کی مقدار کے اضافے سے کیا جائے تو یہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہندوستان میں زراعت کی اہمیت کے مدنظر یہ دیکھنا چاہیے کہ زراعت کے کاروبار میں

کس قدر اضافہ ہوا ہے۔ ذیل کی جدول سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

جنس	۱۹۳۹-۱۹۴۰	سنہ ۴۰، ۴۱، ۴۲ء کا اوسط	سنہ ۳۹، ۴۰ء کے مقابلہ میں فیصد تخفیف یا اضافہ
جوٹ کے گٹھے	۹۷۵۰	۹۳۰۵	۴٫۶ -
روئی کے گٹھے	۴۹۴۲	۵۸۰۲	۱۷٫۴ +
نیشکر ٹن	۴۶۶۲	۴۸۷۶	۴٫۶ +
مونگ پھلی ٹن	۳۱۶۵	۳۱۲۴	۱٫۳ -
تل ٹن	۴۱۵	۴۰۹	۱٫۴ -
السی ٹن	۴۶۶	۳۹۶	۱۵٫۰ -
کھلی اور رائی ٹن	۱۱۱۷	۱۰۹۶	۱٫۹ -

اس جدول سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف روئی اور نیشکر میں سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء کی بہ نسبت اضافہ ہوا ہے جو در اصل جنگ سے پہلے کا زمانہ ہے۔ زرعی کاروبار میں عدم ترقی کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ عام حالات میں بھی زرعی پیداوار پر قیمتوں کے اضافے کا بہت آہستہ اثر پڑتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہندوستان کی تجارتی فصلوں کے لئے جو بیرونی مارکٹ ہاتھ سے جاتے رہے اُن کا کوئی مناسب بدل نہیں معلوم کیا گیا۔ تیسرا سبب یہ ہے کہ حکومت پروپگنڈا کے ذریعہ غلہ زیادہ اُگانے کی ترغیب دے رہی ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہندوستان میں افراطِ زر کی جو صورت پیدا ہوگئی ہے وہ اشیا کی غیر معمولی طلب۔ اور ان کی قیمتوں میں اضافے کے سبب سے ہوئی ہے! اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کے باشندوں کی قوت خرید اور آمدنیوں میں پیدائش دولت کی ترقی کے باعث اضافہ ہوا ہے۔ ہندوستان میں کمانے والوں کی کل تعداد ۹ کروڑ ۷۰ لاکھ ہے ان میں سے ۴ کروڑ ۸۰ لاکھ کاشت کار ہیں اور ۲ کروڑ ۵۰ لاکھ زرعی مزدور۔ ان کی آمدنی کا اہم ذریعہ

جوٹ، روئی، تیل کے بیج، کھالیں اور چمڑے ہیں۔ زراعت پیشہ لوگوں کی آمدنی میں اضافہ اگر ہوسکتا ہے تو ان ہی اشیاء کی قیمتوں کے اضافے کے سبب سے۔ مگر ذیل کی جدول سے معلوم ہوگا کہ ۱۹۳۹ء سے ان کی قیمتوں میں کوئی قابل لحاظ اضافہ نہیں ہوا۔ برخلاف اس کے ان کی روزمرہ ضروریات کی قیمتیں بہت بڑھ گئی ہیں۔

کلکتہ کے تھوک فروشی کے اشاری اعداد

اساس جولائی ۱۹۱۴ = ۱۰۰

سال	غلہ	دالیں	شکر	چائے	اشیاء	تیل کے بیج	خام جوٹ	روئی کی مصنوعات	خام روئی	چمڑے اور کھالیں	دیگر خام و تیار اشیاء
۱۹۳۹	۸۶	۹۹	۱۶۴	۱۴۳	۱۲۵	۱۰۶	۸۰	۱۰۶	۷۵	۶۷	۹۵
۱۹۴۰	۹۹	۱۰۱	۱۵۷	۱۴۹	۱۴۶	۱۰۶	۷۹	۱۲۲	۸۷	۷۲	۱۱۵
۱۹۴۱	۱۱۲	۱۰۵	۱۴۵	۲۰۲	۱۷۸	۱۰۳	۷۷	۱۷۹	۷۷	۷۴	۱۲۶
۱۹۴۲ مارچ	۱۱۵	۱۲۷	۱۷۷	۲۲۲	۲۱۳	۱۰۰	۷۰	۱۹۰	۷۰	۸۶	۱۴۰

جنوری سنہ ۴۲ء میں جنوری سنہ ۴۱ء کے مقابلے میں روئی کی برآمد میں ۸۸ بز اور مالیت میں ۹۰ بز کمی ہوئی۔ جوٹ کی برآمد میں ۲۷ بز کمی اور مالیت میں ۴ بز اضافہ ہوا۔ تیل کے بیجوں کی برآمد میں ۸۴ بز اور مالیت میں ۴۳ بز کمی ہوئی۔ گائے کی خام کھالوں کی برآمد میں ۸۲ اور مالیت میں ۹ بز کمی ہوئی۔ بھیڑوں کے چمڑوں کی برآمد میں ۳ بز کمی اور مالیت میں ۶ بز اضافہ ہوا۔ ہندوستان کی اہم برآمدی چیزوں کی اتنی پست حالت ہے اور اب تک کوئی دوسرا بازار میسر نہ آسکا۔ موجودہ گرانی کی وجہ سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ زرعی آمدنی میں اضافہ ہوا ہے لیکن ہم زرعی اجناس کی شہروں میں جو قیمت ادا کرتے ہیں وہ اُس قیمت سے بہت مختلف ہے جو کاشت کار کو دیہات میں ملتی ہے اور ان دونوں قیمتوں کے فرق سے

درمیانی اشخاص فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ مزید برآں قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ صرف گذشتہ آٹھ یا دس مہینوں میں ہوا ہے۔ ہندوستان کی ۷۵ فی صد آبادی کی قوت خرید اور آمدنیوں کی جب یہ ناگفتہ بہ حالت ہے تو نہیں معلوم کس طبقے کی قوت خرید میں اتنا زیادہ اضافہ ہوا ہے کہ پورے ملک کے حالات متاثر ہو رہے ہیں۔ ہندوستان میں صنعتی کاروبار میں بھی کوئی قابل قدر اضافہ نہیں ہوا ہے۔ ذیل کی جدول سے ہندوستان کی صنعتی مصروفیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

اساس ۱۹۳۵ = ۱۰۰　　—　　۱۹۳۸ - ۱۹۳۹ - ۱۱۱٫۱

۱۹۳۹ - ۱۹۴۰ - ۱۱۴٫۰　　—　　۱۹۴۰ - ۱۹۴۱ - ۱۱۷٫۳

مارچ ۱۹۴۲ - ۱۱۸٫۹

یعنی ۱۹۳۵ء سے اب تک صنعتی مصروفیت میں صرف ۱۹ اعداد کا اضافہ ہوا ہے۔ ان صنعتوں میں روئی، جوٹ، فولاد، خام لوہا، سمنٹ، کاغذ، کوئلہ دریائی اور ریلوں کے حمل ونقل کا کاروبار اور جہازرانی شامل ہے۔ دوسرے کاروباروں کی حالت بھی رُو بہ انحطاط رہی۔ اسٹاک اور شیرس میں اگست ۱۹۳۹ء کے مقابلے میں اگست ۱۹۴۲ء تک صرف ۷٫۴۴ اعداد کا اضافہ ہوا ہے۔ درآمد میں ۱۹۳۸-۳۹ء کی بہ نسبت ۱۹۴۰-۴۱ء میں ۲۵٫۸ فی صد اور برآمد میں ۶٫۶ فی صد کی کمی ہوئی۔ مزدوروں کے حالات بھی نہایت مایوس کن ہیں۔ اُجرتوں میں ۶ تا ۱۰ فی صد اضافہ ہوا ہے، لیکن اُن کے مصارف زندگی بہت بڑھ گئے۔ ذیل کے اشاری اعداد سے صحیح اندازہ ہوسکتا ہے۔

مزدوروں کے مصارف زندگی کا اشاریہ

	اساس		فروری ۱۹۴۲ء	فروری ۱۹۴۱ء
بمبئی	اساس جون ۱۹۳۴ء	= ۱۰۰	۱۳۵	۱۱۹
پٹنہ	″ ۱۹۱۴ء کے پہلے پانچ سال کا اوسط	″	۱۴۱	۱۲۱
جمشید پور	″ ″ ″ ″ ″	= ″	۱۳۸	۱۱۶
جھریا	″ ″ ″ ″ ″	= ″	۱۴۴	۱۲۴
رانچی	″ ″ ″ ″ ″	= ″	۱۴۱	۱۰۸
مدراس	″ سال تا ختم جون ۱۹۳۶ء	= ۱۰۰	۱۱۵	۱۰۸
کانپور	″ اگست ۱۹۳۹ء	= ۱۰۰	۱۴۴	۱۰۸

ہندوستان میں افراطِ زر کی شدت کی وجہ یہ ہوئی کہ ایک تو زر کی مقدار میں بیحد اضافہ کیا گیا، دوسرے اشیاء اور خدمات کی رسد میں عام حالات کی بہ نسبت کمی ہوگئی ہے، مثلاً گیہوں ۱۲۲ ہزار کم ہے اور برما کے ہاتھ سے جانے کے بعد سیلون کے لئے چاول بھی ہندوستان کو ہی فراہم کرنا پڑ رہا ہے۔ کچھ ان وجوہ کی بنا پر اور کچھ فصل کی خرابی کے سبب رکن تجارت نے اندازہ کیا ہے کہ ہندوستان میں اس سال ۵ لاکھ ٹن چاول کی کمی پڑے گی۔ علاوہ اس کے ملک سے سونا اور چاندی بھی بہت بڑی مقدار میں باہر گئی ہے ورنہ لوگ روپیہ لگانے کی طرف راغب ہوتے۔ ملک کے باشندوں کی قوت خرید میں جس قدر بھی اضافہ ہوا ہے اس رقم کے چلن کی رفتار بہت کم ہے ورنہ اگر یہ قوت خرید بھی بازار میں مسابقت کے لئے آتی تو قیمتوں میں اور اضافہ ہو جاتا۔

حکومتِ ہند کو افراطِ زر کا کلیتہً ذمہ دار نہیں ٹھیرایا جا سکتا کیوں کہ حکومت نے خسارے کو دور کرنے کے لئے نوٹ نہیں چھاپے بلکہ حکومتِ ہند کے گذشتہ تینوں جنگی موازنے کافی متوازن تھے اور حکومت اپنے اخراجات محاصل یا محاصل کے اضافے سے پورے کرتی رہی اس کے باوجود بھی اگر اخراجات اور آمدنی میں کوئی تفاوت رہتا تو حکومت قرض لیتی رہی اور اخراجات پورے کرتی رہی۔ لیکن حکومتِ ہند حکومت برطانیہ کی خاطر افراطِ زر کی خرابیوں کو ملک میں راہ دینے پر مجبور ہوئی۔ حکومتِ برطانیہ اور ممالکِ متحدہ امریکہ کو کامیاب انصرامِ جنگ کے لئے اشیاء کی غیر معمولی مقدار درکار ہوتی ہے اور چونکہ ہندوستان کے وسائل بہت وسیع ہیں اس لئے یہ کام حکومتِ ہند کے ذمے ہے کہ وہ روپیہ فراہم کرے اور اشیاء مہیا کرے اس کے معاوضے میں حکومتِ ہند کو اسٹرلنگ ملتے ہیں جو خود سونے میں غیر نقد پذیر ہے اور ایک اعتباری زر ہے۔ ریزرو بنک کے پاس اس طرح سے کروڑوں روپے کا اسٹرلنگ جمع ہو رہا ہے اندازہ ہے کہ اب تک ۶۲۷ کروڑ کا اسٹرلنگ جمع ہو چکا ہے۔ ریزرو بنک ان کے اعتبار پر یعنی اعتباری زر کے اعتبار اور بنیاد پر مزید نوٹ جاری کر رہا ہے اس کی وجہ سے مرکزی بنک کے پاس اعتباری حصے میں اسٹرلنگ اور اسٹرلنگ کے تمسکات بہت بڑھ گئے ہیں لیکن سونا اور

سونے کا تناسب وہی ہے جو جنگ کے شروع میں تھا۔ ذیل کی جدول سے صورت حال کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

حکومت کا زر کاغذی اور اس کے تمسکات :۔ کروڑ روپیوں میں :۔

سال	مجموعی جاری شدہ نوٹ	سونے کے سکے اور اینٹیں	اسٹرلنگ کے تمسکات	سونا اور تمسکات	سونا فی صد	اسرلنگ فی صد
۱۹۳۸ - ۱۹۳۹	۲۱۰٫۵۸	۴۴٫۴۲	۶۸٫۸۸	۵۲٫۸۵	۲۱٫۱	۳۱٫۷۱
۱۹۳۹ - ۱۹۴۰	۲۲۷٫۷۵	〃	۸۷٫۳۲	۵۳٫۸۹	۱۹٫۵	۳۴٫۳۴
۱۹۴۰ - ۱۹۴۱	۲۵۸٫۷۷	〃	۱۲۹٫۹۷	۶۹٫۳۹	۱۷٫۱	۵۰٫۲۹
۱۹۴۱ - ۱۹۴۲	۳۲۰٫۶۷	〃	۱۶۵٫۴۵	۶۵٫۴۵	۱۳٫۹	۵۱٫۵۵
یکم جنوری سنہ ۱۹۴۳ء	۵۹۱٫۷۷	〃	۴۱۲٫۸۳	۷۶٫۶۹	۴٫۷	۶۹٫۸۶

اس جدول سے ظاہر ہوتا ہے کہ نوٹ فرضی اعتبار کی بناء پر جاری کئے گئے ہیں اور اعتبار کا زیادہ حصہ اسٹرلنگ پر مشتمل ہے اور سونے کی مقدار صرف ۴٫۷ جز ہے۔ سرکاری ہنڈیوں کی مقدار میں بھی کافی اضافہ ہوا ہے۔ دسمبر سنہ ۱۹۴۲ء میں ان کی مقدار ۱۱۹ کروڑ تھی یعنی سرکاری ہنڈیاں مجموعی قرضے کے ۶٫۵ جز سے بڑھ کر ۱۴٫۵ جز ہوگئیں۔ ریزرو بنک کے قانون کی رو سے اعتبار کے طور پر سونے اور سونے کے تمسکات اسٹرلنگ اور اسٹرلنگ کے تمسکات کے علاوہ روپیہ اور اس کے تمسکات بھی رکھے جاتے ہیں۔ جنگ کی وجہ قانون میں یہ ترمیم کردی گئی ہے تاکہ روپیہ اور اس کے تمسکات زیادہ مقدار میں رکھے جاسکیں، اس ترمیم سے فائدہ اٹھا کر ریزرو بنک نے سرکاری ہنڈیوں کے اعتبار پر نوٹ جاری کردیے، اس کا مطلب یہ ہے کہ خود ریزرو بنک کے روپے کے اعتبار پر نوٹ جاری کئے گئے ہیں۔ یہ تمام کاروبار فرضی اور غیر مستحکم ہونے کی وجہ سے

صورت حال خراب ہوتی جارہی ہے۔ ہندوستان کو امریکہ سامان کے بدلے میں سونا یا ڈالر دیتا ہے لیکن ان دونوں کو انگلستان اپنے لئے مختص کرلیتا ہے اور ہندوستان میں چونکہ نگرانی تبادلہ قایم ہے اور ہندوستان اسٹرلنگ بلاک سے تعلق رکھتا ہے اس لئے پھر اسٹرلنگ حاصل ہوتے ہیں۔ اب ہندوستان میں یہ اہم سوال پیدا ہوگیا ہے کہ اسٹرلنگ کی اس غیرمعمولی مقدار کا جو اب تک ۷۲۲ کروڑ وصول ہوچکی ہے اور ماہانہ تقریباً ۲۰ کروڑ وصول ہورہی ہے کیا کیا جائے ہندوستان پر اسٹرلنگ کے دو طرح کے قرضے ہیں، ایک تو وہ قرضے جو حکومت ہند نے اپنے اغراض کے لئے انگلستان میں حاصل کئے ہیں، ان کو اسٹرلنگ کے قرضے کہتے ہیں جن کی مقدار ۳۶۹ کروڑ تھی اور یہ قرضہ جنوری ۱۹۴۳ء کے پہلے ہفتے میں ادا ہوچکا ہے۔ دوسری قسم کا اسٹرلنگ کا قرضہ وہ ہے جو ہندوستان نے ریلوں کی تعمیر، نہروں وغیرہ کے بنانے کے لئے انگلستان میں لیا تھا، اس کی کل مقدار کارخانوں اور دوسرے کاروباروں کے برطانوی مشغولات کو شامل کرنے کے بعد ۸۰۰ کروڑ روپے ہوتی ہے جس پر ۱۰۰ کرڑ سالانہ منافع ملتا ہے۔ ان قرضوں کو اسٹرلنگ قرضے کہتے ہیں۔ پہلے قرضے کی ادائی کے بعد روپیہ کے قرضے میں جو اُس وقت ۷۰۹ کروڑ تھا اضافہ کردیا گیا اور یہ بڑھ کر ۱۰۲۶ کروڑ ہوگیا۔ اس طرح سے شرح مبادلہ میں تبدیلی کی وجہ سے نقصان کا اندیشہ دور ہوگیا۔ ہندوستان میں افراط زر کی وجہ سے غریب اور مفلوک الحال ہوگئے ہیں! اس کے خلاف بڑے بڑے کارخانہ دار تاجر اور ٹھیکہ دار اس موقع سے فائدہ اٹھارہے ہیں اور وہ اب اس قابل ہیں کہ بڑے پیمانے پر تخمینی کاروبار کرکے قومی معیشت کو درہم برہم کردیں۔ اگر ہندوستان میں یہی حالت رہی تو جنگ کے بعد انتہا درجہ کی معاشی پستی پیدا ہوگی۔ زر کی قدر بے حد گھٹ جائے گی اور وہی صورت حال پیدا ہوجائے گی جو جرمنی میں گذشتہ جنگ عظیم کے بعد ہوئی تھی یعنی کئی ہزار مارک کے بدلے ایک روٹی بھی ملتی تھی۔ اُن غریب لوگوں کو بہت نقصان ہوگا جنھوں نے کچھ پس انداز کیا ہے۔ افراط زر کے موقعہ پر سرمایوں کو تباہی سے بچانے کی ایک ہی صورت ہوسکتی ہے، وہ یہ کہ حصص کو ان کی موجودہ حالت کو نظرانداز کرتے ہوئے خرید لینا چاہئے اور اسی ذہنیت کی وجہ سے

گذشتہ جون اور جولائی میں بمبئی کے اسٹاک ایکسچیج میں کافی سرگرمی رہی۔

ان حالات کی وجہ سے ملک کے مختلف معاشی اداروں نے اس صورت حال سے نپٹنے کے لئے تجویزیں پیش کی ہیں ایک تجویز تو یہ ہے کہ اسٹرلنگ کے ذرائع سے اسٹرلنگ کا دوسرا قرضہ بھی ادا کر دینا چاہیے اور اس پر عمل شروع ہو چکا ہے اور حکومت نے چند ریلوں کو خریدنے کا ارادہ کر لیا ہے، اسی طرح سے برطانوی حکومت کو چاہیے کہ وہ ہندوستان میں اپنے مشغولات فروخت کر دے اور اس طرح سے جو رقم حاصل ہو اُس سے اپنی ضرورت کی اشیاء خریدے۔ ہندوستان کی حیثیت اس وقت لین دار ملک کی ہے اور حسب عملدر درآمد ہندوستان کو حق حاصل ہونا چاہیے کہ وہ تجارت کی شرائط طے کرے۔ ہندوستان کو اشیاء کے معاوضہ میں یا تو سونا ملنا چاہیے یا مشنری وغیرہ تاکہ یہاں صنعتوں کو فروغ دیا جاسکے مشنری وغیرہ تو ذرائع حمل و نقل کی دشواریوں کی وجہ سے نہیں آسکتی اور سونے کی کل مقدار کا ۹ جز امریکہ کے پاس جمع ہے اس لئے یہ صورت بھی تقریباً ناممکن ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ جس طرح ہندوستان نے اپنی ضرورت کے وقت انگلستان میں اسٹرلنگ کے قرضے جاری کئے تھے اور خود انگلستان نے اپنی ضرورت کے مدنظر امریکہ میں ڈالر کے قرضے جاری کئے تھے اسی طرح اب وہ ہندوستان میں روپے کے قرضے جاری کرے اور اگر انگلستان اُس کے مشغولات کو ضمانت کے طور پر پیش کرے گا اور خود حکومت ہند مزید ضمانت دے گی تو کافی رقم ان قرضوں میں وصول ہو سکتی ہے اور انگلستان اس رقم سے اور اپنے مشغولات کو فروخت کرکے اپنی ضرورتوں کی چیزیں خرید سکتا ہے۔ یہ صورت اس لئے ممکن بھی ہے کہ کنیڈا نے خود انگلستان سے اس قسم کا مطالبہ کیا ہے ورنہ اس سے کیا فائدہ کہ ہندوستان کی مادّی دولت تو باہر چلی جا رہی ہے اور محض کاغذ کے پُرزے اُس کے بدلے میں مل رہے ہیں۔ روپے کے قرضے جاری کرنے کا دوسرا فائدہ یہ ہو سکتا ہے کہ اگر جنگ کے بعد شرح مبادلہ ا شلنگ ۲ پنس کی بجائے ۲ پنس ہو جائے تو ہندوستان کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ حکومت ہند افراط زر کو روکنے کے لئے یہ بھی کر سکتی ہے کہ محاصل اور قرضوں کے ذریعہ سے عوام کی قوتِ خرید کو حاصل کر لے، لیکن

ہندوستان چونکہ اس جنگ کو اپنا قومی مسئلہ نہیں سمجھتا اس لئے اس قسم کے قرضوں میں صرف ۱۲۵ کروڑ روپے وصول ہوئے ہیں۔ محاصل اس لئے عائد نہیں کئے جاسکتے کہ عوام کی آمدنی میں اضافہ نہیں بلکہ اُن کی قوت خرید اثاثوں کو رقیق حالت میں رکھنے کی وجہ سے بڑھی ہے۔ ان کے علاوہ حکومت ایسے طریقے اختیار کرسکتی ہے کہ عوام زیادہ صرف نہ کرنے پائیں۔ امریکہ میں افراطِ زر کو روکنے کے لئے قرضے حاصل کئے گئے اور کانگریس کے زیرِ غور اس وقت ایک مسودۂ قانون ہے جس سے ۲۶ ارب ڈالر بطور محاصل حاصل کئے جائیں گے اور اس کے ساتھ ہی پریسیڈنٹ کو مخالف افراطِ زر قانون کے ذریعہ سے اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ۱۵ ستمبر ۱۹۴۲ء کو معیار بنا کر قیمتوں اور اُجرتوں کا تعین کریں۔ ہندوستانی زر کا اعتبار کم قدر اور غیر مستحکم اسٹرلنگ پر منحصر ہے۔ ہندوستان کے زر کے اعتبار کو مستحکم کرنے کے لئے اسٹرلنگ کی بجائے ڈالر حاصل کئے جائیں۔ حکومتِ ہند افراطِ زر کو روکنے کے لئے فروخت کا محصول بڑھا سکتی ہے اور صوبوں کو مشورہ دیا جاسکتا ہے کہ وہ عوام سے قرض لیں اور مرکز کا قرض ادا کریں۔

دوسرے ممالک میں افراطِ زر کو روکنے کے لئے نگرانی قیمت اور راشننگ کے طریقے بہت کارگر ثابت ہوئے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں حکومت کو ان طریقوں میں سخت ناکامی ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ افراطِ زر کو روکتے ہوئے ان طریقوں کو اختیار کیا جائے تو کامیابی ہوتی ہے لیکن حکومتِ ہند عجیب منطقی مخمصے میں پھنس گئی، وہ خود افراطِ زر کی پالیسی پر کاربند ہے اور ساتھ ہی ساتھ نگرانی قیمت اور رسد بندی کے لئے جد و جہد کرکے اپنے آپ کو دھوکا دینا نہیں چاہتی۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ یہاں پر نگرانی قیمت کا طریقہ سخت نہیں ہے۔ انگلستان میں اسکاٹ لینڈ یارڈ کی مدد سے چور بازاروں پر قبضہ کیا گیا لیکن حکومتِ ہند ایسا کرنا نہیں چاہتی جیسا کہ رکن تجارت کی ایک تقریر سے ظاہر ہوتا ہے، نہ صرف یہ بلکہ حکومتِ ہند قومی اغراض کے لئے چور بازار سے خریدتی ہے اور اس کے مطابق نرخ کا تعین کرتی ہے۔ حکومتِ ہند چونکہ افراطِ زر کی پالیسی پر عمل کرنے کے لئے مجبور ہے اس لئے وہ نگرانی قیمت اور رسد بندی کے مسائل میں اتنی سختی نہیں برتتی جتنی کہ ضروری ہے

گذشتہ بجٹ کو پیش کرتے ہوئے حکومتِ ہند کے رکن مالیہ سر جرمی رئیسمین نے افراطِ زر پر اپنی تقریر میں جو روشنی ڈالی وہ کچھ زیادہ امید افزا نہیں تھی کیونکہ اس میں افراطِ زر کے وجود ہی سے تقریباً انکار کر دیا گیا تھا اور قیمتوں کی موجودہ گرانی کی یہ توجیہہ کی گئی تھی کہ حکومتِ برطانیہ اور حکومتِ امریکہ کی غیر معمولی خریداریوں کا نتیجہ ہے۔ اس کے علاوہ حکومتِ ہند نے یہ بتلا کر کہ افراطِ زر بجٹ کے خسارہ کی وجہ سے نہیں پیدا ہوئی ہے، اپنے آپ کو افراطِ زر کی ذمہ داریوں سے بچانے کی کوشش کی ہے۔ اسٹرلنگ کے ذرائع جو ہندوستان کے حساب میں انگلستان میں جمع ہو رہے ہیں اُن کے مابعد جنگ استعمال کے متعلق سر جرمی نے بتلایا کہ اسٹرلنگ کے اُن ذریعوں کو ہندوستان کی صنعتی ترقی کے لئے مشنری خریدنے کے لئے استعمال کیا جائے گا۔ اس پر ہندوستان میں یہ اعتراض کیا گیا کہ ہندوستان کو اس کا پابند نہیں کرنا چاہیے کہ وہ ان اسٹرلنگ کے ذریعوں سے صرف انگلستان میں مشنری خریدے، بلکہ اُس کو اس بات کی آزادی ملنی چاہیے کہ جہاں وہ مناسب سمجھے اور جہاں سے سستے داموں مشنری ملے وہیں سے خریدے۔

ہندوستان میں جب افراطِ زر کی وجہ سے صورتِ حال بہت زیادہ خراب ہو گئی تو حکومتِ ہند اس بات پر مجبور ہوئی کہ افراطِ زر کی سختی کو روکنے کے لئے چند اقدامات عمل میں لائے۔ یہ مخالف افراطِ زر اقدامات کہلاتے ہیں۔ ان اقدامات کی وجہ سے زر کی گردش کی رفتار میں کمی ہوئی اور لوگوں کے پاس جو بیکار زر تھا اور جو قیمتوں میں مزید اضافے کا باعث بن سکتا تھا اُس کو حکومت نے حاصل کر لیا تاکہ قیمتوں میں کمی ہو۔ حکومتِ ہند نے مشغولی سرمایہ پر پابندی عائد کی تاکہ نئے کاروبار جاری نہ ہو سکیں اور قیمتوں کی سطح میں کوئی غیر معمولی تبدیلی نہ واقع ہو۔ علاوہ ازیں حکومت نے محصول زائد منافع کی شرح میں اضافہ کر کے ایک تو اپنے غیر معمولی اخراجات کے لئے رقم حاصل کی اور دوسرے اس محصول کو ایک مخالف افراطِ زر حربے کے طور پر استعمال کیا۔ برطانوی ہند میں یکم ستمبر ۱۹۳۹ء سے یہ محصول عائد کیا گیا ہے۔ یہ محصول اُس کاروبار پر عائد ہوتا ہے جس کا منافع مقررہ مدت کے دوران میں ۳۶ ہزار روپے سالانہ کی ابتدائی حد سے متجاوز ہو۔ یہ محصول ۵۰ فیصد رکھا گیا تھا اور باقی ۵۰ فیصد سے

انکم ٹکس اور سوپر ٹکس کے لئے گنجایش نکالنے کے باوجود بھی صنعتوں کے پاس کافی رقم بچ رہتی تھی، اس لئے یہ شرح بڑھا کر ۶۶ فیصد مقرر کی گئی بستہ ۱۹۴۳ء کے محصول زائد منافع کے آرڈیننس کے ذریعہ سے زائد منافع کے ۱/۱۴ ۱ بز کی لازمی بچت ضروری قرار دی گئی۔ اس طرح سے زائد منافع کے ۱/۴ بز کے علاوہ تمام کا تمام ۱/۳ ۹ بز زاید منافع حکومت کے خزانے میں چلا جاتا ہے۔

حکومت نے نگرانی پارچہ اور معیاری کپڑے کے ذریعہ سے پارچہ کی قیمتوں پر کڑی نگرانی قائم کی ہے اور جس کی وجہ سے قیمتیں ۲۰ بز تک کم ہوگئی ہیں لیکن پھر بھی ہندوستان میں اشیائے احتیاج کی قیمتیں اس قدر زیادہ ہیں کہ اُن کا حاصل کرنا غریب طبقے کے لئے بہت دقت طلب بلکہ بعض صورتوں میں ناممکن ہے، اس لئے ان تمام اقدامات کے ساتھ حکومت کو چاہیے کہ وہ زر کی مقداروں میں نوٹوں کے شائع کرنے کی وجہ سے جو زیادتی ہو رہی ہے اُس کو روکے۔

چھٹی نمائش مصنوعات مملکت آصفیہ

بمقام باغ عام حیدرآباد دکن

۲۴ ردے ۱۳۵۳ف تا ۲۴ ربہمن ۱۳۵۳ف

اغراضِ نمائش

مملکت آصفیہ کی معاشی ترقی کے لئے ملک کے مصنوعات اور قدرتی ذخائر و پیداوار کے نمونے اور ان کی کیفیت و حالات اہلِ ملک کے سامنے پیش کرنا۔ قدرتی ذخائر اور وسایل سے استفادہ کرنے اور مصنوعات تیار کرنے کے مختلف طریقوں اور ترکیبوں کا عملی مظاہرہ کرنا اور ملک میں صنعتی و بیوپاری ترقی کے امکانات کو ظاہر کرنا اور ان سے دلچسپی پیدا کرنا اور ملکی مصنوعات خریدنے اور استعمال کرنے کا شوق دلانا۔ نیز صناعوں اور تاجروں کی ہمت افزائی کرنا اور ان کو ترغیب دینا کہ جدید صنعتیں آغاز کریں اور مصنوعات تیار کرنے کے جدید طریقے اختیار کرنے کے لئے کوشاں رہنا۔

ہر محب وطن اور ہر صناع سے التماس ہے کہ اس قومی اور رضاکارانہ کام میں ہاتھ بٹائے۔

معاشی ناکہ بندی

از سعید احمد صاحب فینائی متعلم ام - اے (عثمانیہ)

بیسویں صدی میں سائنس کی حیرت انگیز ترقی نے طریق جنگ میں عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا ہے فن جنگ کو پہلی سی اہمیت نہیں حاصل رہی ہے اور جنگ نے بڑی حد تک معاشی حیثیت اختیار کر لی ہے[1] ظاہر ہے کہ اسکے باعث معاشی ناکہ بندی کی اہمیت میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے۔

قبل اس کے کہ معاشی ناکہ بندی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے اسکے حقیقی مفہوم کی مختصر صراحت مناسب ہے۔ یہ امر قابلِ خیال ہے کہ موجودہ زمانے میں ناکہ بندی کے تصور کو زمانۂ قدیم کی مثل محدود حیثیت حاصل نہیں بلکہ اس میں رفتہ رفتہ غیر معمولی وسعت پیدا ہو چکی ہے اور یہ ضروری ہے کہ اسکے قدیم محدود مفہوم اور جدید وسیع معنوں میں امتیاز کیا جائے۔

اصولاً معاشی ناکہ بندی کی تشریح انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں مندرجۂ ذیل الفاظ میں[2] کی گئی ہے

"معاشی ناکہ بندی سے مراد غنیم کے نقل و حمل اور لین دین کا دنیا کے دوسرے خطوں سے انقطاع ہے جو ہر فریق جنگ کا اولین مقصد ہوتا ہے۔ اسکی رو سے غنیم اور غیر جانب دار ممالک کے درمیان مبادلے کو غیر قانونی اور ناجائز قرار دیا جاتا ہے ـــــ غرض اسکی تمامتر غایت یہ ہوتی ہے کہ خود دشمن کے اپنے ملک تک یا مقبوضہ ممالک تک اشیاء کی رسد غیر ممکن بنا دی جائے"۔

---

[1] ملاحظہ فرمائیے جیوفری کرار تھ کا مشہور پمفلٹ THE SINEWS OF WAR "دی سینوز آف وار"

[2] سرٹامس بارکلے کا مضمون " ناکہ بندی پر" انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں۔ [3] معاشی ناکہ بندی کے حقیقی مفہوم کے مسئلے پر سرٹامس بارکلے نے اپنی مشہور تصنیف "PROBLEMS OF INTERNATIONAL PRACTICE AND DIPLOMACY" میں اور مارسیس پا مرلی نے ENCYCLOPAEDIA OF SOCIAL SCIENCES میں تفصیلی بحث کی

موجودہ زمانے میں معاشی ناکہ بندی کی اصطلاح محض اپنے لفظی یا قانونی مفہوم میں استعمال نہیں ہوتی ہے بلکہ اُسکے دائرے میں تمام ایسے امور شامل ہوتے ہیں جنکا مقصد دشمن کی تجارت خارجہ کا خاتمہ ہوتا ہے۔ معاشی ناکہ بندی سے یوں تو ہوائی، بحری اور بری تینوں اقسام کی ناکہ بندی مراد ہوسکتی ہے لیکن چونکہ تجارت خارجہ کی اہم ترین راہ سمندری ہے اسلئے بحری ناکہ بندی کو نسبتاً زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

معاشی ناکہ بندی کا تصور کسی طرح جدید نہیں جیسا کہ عام طور سے خیال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ گذشتہ دو صدیوں سے ناکہ بندی طریق جنگ کا ایک نہایت ناگزیر جزو بنی رہی ہے۔ اٹھارویں اور اُنیسویں صدی سے طاقتور بحری دستوں کے ذریعے دشمن کی بندرگاہوں پر اسکا عملدرآمد کیا جارہا ہے چنانچہ نپولین کا کونٹنیٹل سسٹم یا براعظمی نظام زمانۂ ماضی میں معاشی ناکہ بندی کے ایک ناکام تجربے کی حیثیت سے کافی اہم ہے۔

گذشتہ صدی میں معاشی ناکہ بندی کے طرز اور طریق میں نمایاں تغیرات ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ناکہ بندی کی اوّلین شرط یہ ہوتی ہے کہ بحری قوت اتنی کافی ہو کہ کامیابی سے دشمن کے تجارتی راستے پوری طرح روکے جاسکیں۔ معاشی ناکہ بندی کے حدود کا باضابطہ تعین پہلے سے کر دینا ہوتا ہے تاکہ غیر جانبدار ممالک کے جہازوں کو بے کار وقت کا سامنا نہ کرنا پڑے[2]۔ اسکے علاوہ ہر جہاز پر قبضہ کرنے سے قبل طویل اور گہری تحقیق کی جاتی ہے۔

زمانۂ قدیم میں جبکہ نقل وحمل کے وسائل آسان اور ترقی یافتہ نہ تھے تو معاشی ناکہ بندی پر عمل زیادہ دشوار نہ ہوتا تھا کیونکہ دشمن کے لئے غیر جانبدار ممالک کے توسط سے رسد حاصل کرنے کا امکان نہ تھا۔ لیکن آج جبکہ ذرائع حمل ونقل ہماری گذشتہ نسلوں کے خواب وخیال سے بھی کہیں زیادہ ترقی کر چکے ہیں کامیاب ناکہ بندی کے لئے محض یہی لازمی نہیں کہ دشمن کے جہازوں کو سامان لیجانے سے باز نہ رکھا جائے بلکہ اس اندیشے کے پیش نظر کہ کہیں غنیم غیر جانبدار ممالک کے ذریعہ رسد نہ حاصل کرے

لے۔ دیکھئے اڈمرل سرہربرٹ رچمنڈ کا پمفلٹ تحریر کردہ بعنوان حصۂ موجودہ طریق جنگ میں (NAVAL ROLE IN MODERN WARFARE)

اس سے متعلق بھی شدید ترین نگرانی کی ضرورت ہوتی ہے کہ غیر جانبدار ممالک اپنی ضروریات سے زاید اشیا درآمد کرکے اُسے دشمن تک تو نہیں پہنچاتے۔ چنانچہ گذشتہ جنگِ عظیم کے دوران میں جب یہ محسوس کیا گیا کہ ناکہ بندی میں شریک اشیاء کی جو فہرست قانون بین الاقوام کی روشنی میں اعلان لندن[۵۱] کے بعد مرتب کی گئی تھی اور جو تقریباً ایک صدی پیشتر کے حالات پر مبنی تھی برآمد اور درآمد کے ترقی یافتہ طریقوں کے سامنے موثر ثابت نہیں ہو رہی ہے تو برطانیہ نے ایک جدید طریقہ اختیار کیا۔ اسکے تحت تمام غیر جانبدار ممالک میں تجارتی اداروں کا قیام عمل میں آیا اور یہ ادارے چونکہ برطانیہ کی وزارت تجارت سے راست تعلق رکھتے تھے اس لئے ان کا فرض یہ تصور ہوتا کہ اس امر کی کامل نگرانی کریں کہ اپنی ضروریات سے زائد اشیاء درآمد کرکے غیر جانبدار ممالک انہیں دشمن کے علاقے میں تو نہیں بھیجتے۔

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بحری تجارت کا نظام موجودہ زمانے میں اس قدر پیچیدہ ہوچکا ہے کہ .... ناکہ بندی کے سلسلے میں اس پر کافی قابو برقرار رکھنا سہل نہیں۔ اول تو سمندری راستوں پر تسلط قائم کرنے کے لئے ایک طاقتور بحریہ ناگزیر ہوتا ہے علاوہ ازیں غیر جانب دار ممالک کو اس کا یقین دلانا ہوتا ہے کہ اُن کی ضروری رسد کے حصول میں قطعاً رخنہ اندازی نہ ہوگی ورنہ اسکے برخلاف صورت میں ان سے بھی دشمنی مول لینے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس طرح درحقیقت معاشی ناکہ بندی سمندروں کی نگرانی تک محدود نہیں بلکہ اس میں یہ غرض بھی شامل ہے کہ غیر جانب دار ممالک کے توسط سے رسد حاصل کرکے غنیم کو معاشی ناکہ بندی کے انتہائی شدید اثرات سے نجات حاصل کرنے کا موقع نہ دیا جائے[۵۲]۔

۵۱۔ ملاحظہ فرمائیے جے۔ بی۔ اسکاٹ J. SCOTT کی تصنیف "اعلان لندن" (DECLARATION OF LONDON)

۵۲۔ یہاں اس امر کا اعادہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ گزشتہ جنگ عظیم کے دوران میں مشہور جہاز "EMDEN" اور جنوبی سمندروں کے دوسرے جہازوں کو رسد غیر جانبدار بندرگاہوں سے حاصل ہوتی رہی۔ چنانچہ اس جنگ میں بھی ایسے واقعات ہوئے ہیں لیکن اسکے باوجود بہت سے ممالک نے اپنے فرض کو سختی سے پورا کیا ہے مثلاً مغربی آفریقہ میں پرتگالی افسروں نے اس ذریعے کو توڑنے سے صاف انکار کردیا اور ۱۶ اکٹوبر ۱۹۳۹ء کو ان جہازوں کو راستہ نہیں دیا۔

اس احساس کے پیشِ نظر کہ ہر بندرگاہ پر جہازوں کی مکمل تلاشی لینے کے طریقے میں بہت وقت ضائع ہوتا ہے اور فضول طوالت ہوتی ہے برطانیہ نے ناکہ بندی کا بہتر اور جدید طریقہ ایجاد کیا ہے یہ طریقہ اس اصول پر مبنی ہے کہ کوئی جہاز ناکہ بندی کے منطقے کا رخ نہیں کرسکتا تاوقتیکہ اسکے پاس بحری اجازت نامہ موجود نہ ہو۔ یہ اجازت نامے روانگی کے مقام پر کامل تحقیق کے بعد اجرا ہوتے ہیں۔ چنانچہ برطانیہ کی یہ جدت نہایت کامیاب ثابت ہوئی ہے اور اسکی بدولت ایک طرف ناکہ بندی بہت زیادہ موثر بن چکی ہے تو دوسری طرف غیر جانبدار ممالک کی تجارت میں سہولت ہوگئی ہے۔[۱]

معاشی ناکہ بندی کا اولین مقصد یہ ہوتا ہے کہ دشمن کی معاشی زندگی کو انتہائی شدید طور پر متاثر کیا جائے یقیناً غنیم کی جنگی تیاریوں میں کامل انجماد پیدا کرنے کا یہ موثر ترین ذریعہ ہے اور ظاہر ہے کہ اس طرح بالواسطہ طور پر معاشی ناکہ بندی سے حصول فتح میں نمایاں کامیابی ہوتی ہے۔ جیسے جیسے دشمن پر معاشی ناکہ بندی کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں اسی قدر اس کے لئے جنگی سامان کی پیدائش دقت طلب بنتی جاتی ہے۔ معاشی ناکہ بندی کے سبب سے جو قلت ظہور پذیر ہوتی ہے اسکے باعث ملک کی معاشی زندگی میں کچھ ایسا تغیر ہوتا ہے اور ایسے شدید حالات پیدا ہوجاتے ہیں کہ سامانِ جنگ کی تیاری میں جمود کی سی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ قلت اور فاقوں کی مصیبت کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملک انقلاب، لوٹ مار اور بغاوت کا شکار ہوجاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسے نازک حالات میں جبکہ ضروریات کی قلت کیا بعض صورتوں میں کامل نقدان ہو لوگوں کی ہمت اور حوصلے قائم رکھنا نہایت دشوار بلکہ اکثر غیر ممکن ثابت ہوتا ہے۔

اس واقعے نے کہ موجودہ جنگ میں کامیابی کا انحصار بجائے شجاعت اور دلیری کے بڑی حد تک آلات حرب اور معاشی ذرائع پر ہے معاشی ناکہ بندی کی اہمیت میں مزید اضافہ کردیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جن ممالک کو معاشی ناکہ بندی کا زیادہ اندیشہ ہوتا ہے وہ قبل سے خود مکتفی بننے کی سعی کرتے ہیں۔ اس مقصد کی تکمیل کیلئے جو مختلف و پیچیدہ طریقے اختیار کئے جاتے ہیں اُن سے یہاں بحث نہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ ایسی اشیاء جو ضروریات میں شامل ہیں اُنکے بدل معلوم کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ غرض معاشی ناکہ بندی

---

[۱] اس طریقے کی تفصیلات کیلئے ملاحظہ فرمایئے کلارک کا پمفلٹ "برطانیہ کی ناکہ بندی" "BRITAIN'S BLOCKADE"

اثرات سے محفوظ رہنے کیلئے جو طریقے اختیار کئے جاتے ہیں وہ نہایت دشوار اور گراں ہوتے ہیں سب سے پہلے تو سارے ذخیروں یعنی توفیری مقداروں کو استعمال کیا جاتا ہے پھر اصول بدل پر عمل ہوتا ہے اور بالآخر مصنوعی کیمیاوی بدل ایجاد کئے جاتے ہیں[۵]۔ دوسری جانب معاشی ناکہ بندی کے ذریعے کوشش یہ ہوتی ہے کہ اشیا کے بدل معلوم کرنے کیلئے دشمن کی مساعی کو انتہائی مشکل اور محض ناکام بنایا جائے۔

اس طرح اس مسئلے کی بخوبی تشریح ہوتی ہے کہ ناکہ بندی کے اثرات فوری کیوں نہیں ظاہر ہوتے۔ ظاہر ہے کہ فوری نتائج کی توقع اسی صورت میں ہو سکتی ہے جبکہ ایک شئے کے عوض دوسری شئے کے استعمال کا نتیجہ خود اسی شئے کی قلت میں رونما نہ ہو۔ چنانچہ مسٹر کلارک اپنے پمفلٹ "برطانیہ کی ناکہ بندی" میں رقمطراز ہیں "اشیا کی قلت کچھ اس طرح رونما ہوتی ہے کہ ایک شئے کی قلت، دوسری شئے کی قلت پیدا کرتی ہے۔ اس طرح یہ طریقہ نائن پنس کے کھیل سے بہت مشابہ ہے"۔

یہاں یہ امر قابل توجہ ہے کہ معاشی ناکہ بندی خواہ کس قدر شدید اور موثر کیوں نہ ہو اس امر کی ضمانت نہیں ہوتی کہ اشیا کی رتی برابر مقدار بھی ناکہ بندی کے منطقوں سے نہیں نکل رہی ہے۔ دشمن کی تجارت خارجہ چاہے کتنی بھی کم رہ جائے اشیا کی تھوڑی بہت مقدار کے حصول کا امکان برابر قائم رہتا ہے۔

معاشی ناکہ بندی کا ایک طریقہ جس پر جرمن مدت سے عمل پیرا ہیں یہ ہے کہ آبدوز کے ذریعے بغیر کسی امتیاز کے جہازوں کو غرق کیا جائے۔ بلاشبہ یہ طرز عمل بغیر یہ یقین کئے کہ جہاز اتحادیوں کا ہے یا کسی غیر جانب دار ملک کا علاوہ بین الاقوامی قانون سے صریح انحراف کے برطانیہ کی موثر ناکہ بندی کے طریقے کے سامنے ہرگز کامیاب ثابت نہیں ہو سکتا۔

معاشی ناکہ بندی کا ناگزیر نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ علاوہ تجارت درآمد کے دشمن کی ساری تجارت برآمد بھی ختم ہو جاتی ہے جسکے باعث نت نئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دشمن اپنی زاید یا توفیری پیداوار سے متناسب و موزوں استفادہ نہیں کر سکتا اور اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسکی صلاحیت بحیثیت ایک درآمد

---

[۵]۔ ان طریقوں کی مزید تفصیلات معلوم کرنے کیلئے دیکھئے سر ولیم بیورج "WILLIAM BEVERIDGE" کا مشہور پمفلٹ ناکہ بندی اور شہری آبادی THE CIVILIAN POPULATION

کرنے والے ملک کے متاثر ہوتی ہے۔ ڈاکٹر شاشت کی وہ تجویز جسے جرمنی کے حامیوں نے "برطانیہ کی بری ناکہ بندی" کا دل خوش کن لقب دیا ہے اگر غور کیا جائے تو ایک ایسی سعی مبہم سے زاید حیثیت نہیں رکھتی جس کا مقصد یہ ہے کہ "برطانیہ کی ناکہ بندی" سے جرمنی کی تجارت برآمد پر جو شدید اثرات مترتب ہوئے ہیں ان کا ایک حد تک ازالہ کیا جائے۔

فوری اور نمایاں نتائج کیلئے محض غنیم کے ملک کی معاشی ناکہ بندی کافی نہیں بلکہ ایسے تمام رقبوں کو بھی ناکہ بندی کے منطقے میں شامل کرنا ہوتا ہے جن پر دشمن کا قبضہ ہو چکا ہے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مقبوضہ ممالک میں معاشی انتشار و بےچینی شدت اختیار کرکے بغاوت کی حد تک پہنچ جاتی ہے اور اس طرح دشمن کو ایک مستقل مصیبت کا سامنا رہتا ہے۔

معاشی ناکہ بندی کے ضمن میں موجودہ زمانے میں یہ مسئلہ مورد بحث بنا رہا ہے کہ مقبوضہ آبادی کو جو دشمن کے مظالم کا شکار پہلے سے ہی ہے ناکہ بندی کے منطقے میں شامل کرکے مزید مصائب میں مبتلا کر دینا کس حد تک انصاف پر مبنی ہے[۱]۔ اس میں شک نہیں کہ سطحی طور سے تو یہ چیز بڑی ظالمانہ معلوم ہوتی ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو یقیناً یہ طرز عمل ہر طرح حق بجانب بلکہ ناگزیر ہے۔ کیونکہ اگر مقبوضہ علاقوں کو ناکہ بندی سے مستثنیٰ قرار دیا جائے تو اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کے توسط سے دشمن کو رسد پہنچا کرے گی۔ مزید برآں اسطرح مقبوضہ علاقوں میں امن اور تسلط برقرار رکھنے میں نمایاں سہولت ہوگی اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں صورتیں ناکہ بندی کرنے والی قوت کے مفاد کے قطعاً منافی ہیں۔

معاشی ناکہ بندی کے باعث، اشیاء کی جو عام اور مجموعی قلت پیدا ہوتی ہے اُس سے مفتوحہ علاقوں کے شدید استحصال کے مواقع کم ہو جاتے ہیں۔ غرض ناکہ بندی ہٹا کر مقبوضہ ممالک مثلاً فرانس کے مصائب کے ازالے کی تجاویز قابلِ توجہ ضرور ہیں لیکن بنیادی اسباب کی بنا پر قابل عمل کسی طرح بھی نہیں۔

اعلان لندن کے بعد جو جدول ترتیب دیا گیا تھا اُسکی پابندی کی صورتیں ناکہ بندی کا مسئلہ بہت دشوار بن گیا تھا کیونکہ اس کی رو سے معاشی ناکہ بندی کے تحت محض تیار سامان جنگ کو شامل کیا جا سکتا تھا اور ایسی عام

---

[۱] - دیکھئے گڈ ہارٹ GOOD HART کا پمفلٹ "جنگ کے کونسے افعال مبنی برانصاف ہیں" "WHAT ACTS OF WAR ARE JUSTIFIABLE?" اور کلیرنڈن پریس CLARENDON PRESS کی مرتب کردہ تصنیف "جنگ کا پس منظر اور اس سے متعلقہ مسائل" "THE BACKGROVND AND ISSUES OF THE WAR"

اشیاء جو جنگی سامان کی تیاری میں کام آتی ہیں اُنکی روک تھام اصولاً جائز نہ تھی[1]۔ ظاہر ہے کہ اس طرح معاشی ناکہ بندی کو موثر نہیں بنایا جاسکتا تھا اور اسی لئے بالآخر اس اعلان کی پابندی نہ ہوسکی۔

پروفیسر پیگو کے اس خیال کے باوجود کہ "معاشیات اخلاقیات کی خادمہ ہے" ہمیں یہاں اس مسئلے کے اخلاقی پہلو سے زیادہ سروکار نہیں لیکن پھر بھی یہ مسئلہ کافی جاذب توجہ ہے کہ معاشی ناکہ بندی کی فہرست میں آخر کن کن اشیاء کو منصفانہ طور پر شامل کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ موجودہ جنگ میں بھی یہ مسئلہ مباحثے کا مرکز بنا رہا ہے۔ اتحادیوں کا اور یہ خیال ہے کہ نازی خطرے کا مقابلہ ہر ممکنہ طریقے سے کرنا چاہئیے۔ چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر برطانیہ نے معاشی ناکہ بندی کے اصول پر آغاز جنگ سے ہی سختی کے ساتھ عمل شروع کردیا اور اسکے نتائج بھی رفتہ رفتہ نمایاں ہوتے جارہے ہیں کیونکہ ہٹلر کی جرمنی نے وجود خود کفالت کے پُرزور دعوں کے برطانیہ کے اس عمل کے خلاف احتجاج شروع کردیا ہے چنانچہ اس امر کا اعادہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ روس بھی اتحادیوں کی صف میں شامل ہونے کے قبل برطانیہ کے اس طرز عمل کو ناپسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھتا تھا[2]۔ اُسکا استدلال تھا کہ شہری آبادی کو فاقے مارنا اُسی قدر وحشیانہ فعل ہے جسقدر کھلے شہروں کی بمباری۔

موجودہ زمانے میں جبکہ جنگ مملکتوں کی ساری ساری آبادیوں کے درمیان ہوتی ہے شہریوں اور فوجیوں کے درمیان کامل تفریق ممکن نہیں۔ گذشتہ جنگ عظیم میں جنرل لیوڈنڈراف نے یادداشت میں لکھا تھا "اس جنگ میں یہ اندازہ کرنا غیر ممکن ہے کہ کہاں فوج و بحریئے کا دائرہ ختم ہوتا ہے اور کہاں عوام کی ابتدا ہوتی ہے۔ فوج اور عوام ایکساں ہیں"۔

اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ آج سے پچیس برس قبل جنگ اس قدر ہمہ گیر تھی تو موجودہ جنگ میں یہ پہلو کس درجے نمایاں ہوگا۔ اس ضمن میں خورخان اسٹائن کا یہ بیان کہ[3] موجودہ زمانے میں کشمکش فقط

---

[1] سنہ ۱۹۰۰ء کی جنوبی آفریقہ کی جنگ کے دوران میں لارڈ سیلسبری نے یہ کُلیہ بنا دیا تھا کہ "غذائی اجناس کی روک تھام اُسی وقت ہو جبکہ وہ دشمن کی فوجوں کیلئے استعمال ہوں۔ اسکے ساتھ اس نے یہ بھی صراحت کردی کہ صرف یہ کہنا کافی نہیں کہ ان اجناس کو فوجی اغراض کیلئے استعمال کیا جاسکتا ہے بلکہ یہ ثابت کردینا ہوگا کہ سامان پر قابض ہوتے وقت ہی ہو بھی رہا تھا۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ لارڈ سیلسبری کے اس خیال کا انطباق موجودہ متغیرہ حالات پر ممکن نہیں۔ [2] ملاحظہ فرمائیے روس کی حکومت کا ۲۵ اکتوبر سنہ ۱۹۳۹ء والا مراسلہ جو برطانیہ کے ۶ اور ۱۱ ستمبر والے اعلانات کے خلاف احتجاج کیا گیا تھا اور جس کا متن سر ولیم بیورج کے ـــــ " ناکہ بندی اور شہری آبادی " کے پمفلٹ "BLOCKADE AND THE CIVILIAN POPULATION" میں ملتا ہے صفحہ ۲۔ [3] دیکھئے جیمز گارنر کی تصنیف بین الاقوامی قانون اور عالمگیر جنگ "INTERNATIONAL LAW AND THE WORLD WAR" جلد اول صفحہ ۳۱۹۔

فوجوں کے مابین نہیں بلکہ عوام کے درمیان ہوتی ہے، معاشی ناکہ بندی کے خلاف جرمنی کی جو دلیل ہے اسکی کافی تردید کرتا ہے۔[1]

اسکے علاوہ معاشی ناکہ بندی کے سلسلے میں یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ آج کل جنگ میں اسقدر مختلف اور متعدد اشیاء استعمال ہوتی ہیں کہ کسی شئے کے متعلق بھی یقین نہیں ہوسکتا کہ اُسے جنگ کے سلسلے میں استعمال نہ کیا جائے گا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ خواہ کوئی شئے کتنی ہی غیر اہم کیوں نہ ہو اُسے ناکہ بندی سے مستثنیٰ نہیں قرار دیا جاسکتا یہانتک کہ اسکی ضمانت نہیں ہوسکتی کہ ایسی اجناس جنہیں معاشی ناکہ بندی کی بندشوں سے آزاد کردیا جائے اُن سے فاقہ کش شہریوں کا پیٹ بھر جائیگا یا فوجوں کیلئے غذا فراہم کیجائیگی۔[2]

اس میں شک نہیں کہ معاشی ناکہ بندی اگر موثر اور کامیاب ہو تو حصول فتح میں نہایت ممد و معاون ثابت ہوتی ہے اس سے متعلق گذشتہ جنگ عظیم سے دنیا نے جو سبق حاصل کئے ہیں انکے پیش نظر مزید شبہات کی قطعاً گنجائش نہیں حقیقت یہ ہے کہ گذشتہ جنگ میں برطانیہ کی فتح کی بڑی وجہ کامیاب ناکہ بندی تھی فیلڈ مارشل ہمٹس نے معاشی ناکہ بندی کے شدید اثرات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا تھا[3] "یہ تاریخ کا انتہائی المناک منظر ہے اور کوئی ایسا شخص جسکے دل میں واقعی انسانی ہمدردی کے جذبات موجود ہوں اس سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

فریڈرک اعظم کا قول ہے کہ "فوج بھی سانپ کی مثل پیٹ کے بل چلتی ہے" اور اس جنگ میں بھی آثار صاف طور سے یہی بتاتے ہیں کہ برطانیہ ناکہ بندی کے ذریعے جرمنی کو شکست دے کر فریڈرک اعظم کے اس مقولے کی صداقت کو ثابت کریگا۔ علاوہ ازیں گذشتہ تجربہ جو مستقبل کا سب سے بڑا رہبر ہے جرمنی کے خود ملتفی ... ے کے متعلق گوئرنگ کے پُر زور دعوٰں اور ہٹلر کے اس خیال کی کہ معاشی ناکہ بندی کے ذریعے جرمنی کی معاشی قوت کا خاتمہ ہرگز ممکن نہیں، کامل تردید کرتا ہے۔ چنانچہ حالات کی رفتار سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان دعوٰں کے محض فرضی و باطل ثابت ہونے میں شاید زیادہ عرصہ باقی نہیں۔[4] بہر صورت اس حقیقت سے کسی طرح چشم پوشی نہیں اختیار کی جاسکتی کہ ماضی کی مثل اس جنگ میں بھی معاشی ناکہ بندی نہایت فیصلہ کن ثابت ہوگی اور بحیثیت عمل جنگ کا ایک ناگزیر و لازمی پہلو کے اسکی اہمیت میں مزید اضافہ ہو گا فقط

---

[1] خود جرمنوں کا یہ عقیدہ کہ KRIEGSMONNIEH 'KRIEGSRISON CHET VAR یعنی ضرورت کے سامنے جنگ کے سارے قوانین سے انحراف جائز ہے، برطانیہ کی معاشی ناکہ بندی کو مبنی بر انصاف قرار دیتا ہے۔ [2] چنانچہ چارلز ہائڈ CHARLES HYDE نے اپنی مشہور تصنیف "بین الاقوامی قانون جیسے کہ اُسے ممالک متحدہ امریکہ نے استعمال اور تعبیر کیا ہے" LAW, CHIEFLY AS APPLIED AND INTERPRETED BY THE U.S.A میں اس خیال کی تائید کی ہے کہ ہر وہ شئے جس سے غنیم کو مدد ملتی ہے معاشی ناکہ بندی کے تحت شامل کی جاسکتی ہے۔ [3] دیکھئے آرنلڈ فورسٹر ARNOLD FORSTER پیمفلٹ "ناکہ بندی ۱۹۱۴–۱۹۱۹" THE BLOCKADE 1914-19 صفحہ ۴۔ [4] دیکھئے سر ولیم بیورج SIR WILLIAM BEVERIDGE کا پیمفلٹ "BRITAIN'S BLOCKADE" برطانیہ کی ناکہ بندی اور R. W. B. CLARKE کا پیمفلٹ

مجلۂ طیلسانین کے مقاصد و قواعد

(۱) "مجلۂ طیلسانین" انجمن طیلسانین عثمانیہ حیدرآباد دکن کا ترجمان ہے۔

(۲) اغراض انجمن کے لحاظ سے مجلہ میں مضامین مقالے اور نظمیں شائع ہوں گی۔

(الف) جامعۂ عثمانیہ کے منظورہ مابعد طیلسان مقالے شائع کئے جائینگے۔

(ب) اردو مطبوعات پر تنقید و تبصرہ کیا جائیگا۔

(ج) انجمن طیلسانین عثمانیہ اور اسکے ملحقہ اداروں کی سرگرمیوں اور کاروبار کے تفصیلات کی اشاعت عمل میں آئیگی۔

(د) علمی اور ہر جہتی ترقی کے معلومات و اطلاعات شائع کیجائینگی۔

(ھ) سیاسیات حاضرہ اور اختلافی مذہبی امور کے متعلق مضامین وغیرہ کسی صورت میں شائع نہ کئے جائینگے۔

(۳) حسب ضرورت مجلہ کے مختلف حصے خاص خاص علم و فن سے مختص ہونگے۔ فی الوقت مجلہ کے دو حصے ہونگے ایک علمی حصہ دوسرا [illegible]

(۴) مجلہ بہمن۔ اردی بہشت۔ امرداد۔ آبان مطابق جنوری۔ اپریل۔ جولائی۔ اکتوبر میں شائع ہوگا۔

(۵) مجلہ کے ہر حصہ کی ضخامت کم از کم ۶ جزو ہوگی۔

(۶) مضمون یا مقالہ نگاروں کو انکے مضمون یا مقالہ کے ۲۵ نسخے بلاقیمت ارسال ہونگے اور ایم اے کے مقالہ کے ۔ا نسخے بلاقیمت ارسال بشرطیکہ پہلے مطلع کردیا جائے اگر ان نسخوں سے زاید نسخے درکار ہوں تو کاغذ کی قیمت قبل از قبل ادا کرنے پر انتظام عمل میں آئیگا

(۷) اگر مضمون یا مقالہ نگار پہلے سے مجلہ کے خریدار نہوں تو مجلہ کا وہ شمارہ جسمیں مضمون شائع ہو بلاقیمت ارسال کیا جائے

(۸) سال بھر میں کسی صاحب کے دو مضمون یا مقالے شائع ہونیکی صورت میں سال مابعد کیلئے اگر قواعد انجمن طیلسانین عثمانیہ مانع نہ ہوں، مجلہ بلاقیمت جاری کیا جائیگا۔

(۹) اگر کوئی مضمون یا مقالہ یا نظم قابل اشاعت قرار نہ پائے تو اسکو واپس کردیا جائیگا۔

(۱۰) اگر کسی مضمون یا مقالہ کیلئے مجلہ اپنے خرچ سے تصاویر کے بلاکس تیار کرے تو ان کو مناسب قیمت پہ جسکا تصفیہ مہتمم مجلہ کریگا فروخت کیا جاسکیگا۔

(۱۱) اگر مجلہ کا کوئی شمارہ اشاعت کے مقررہ مہینہ میں وصول نہو تو اسکی اطلاع مہتمم کو دوسرے مہینہ میں کردینی چاہئے۔